حجاب



اس دائرے میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ نے حجاب کے لیے جو زرِ تعاون عنایت فرمایا تھا اس کی مدت اس پرچے کے ساتھ ختم۔ آئندہ کے لیے جلد سے جلد زرِ تعاون مرحمت فرمائیے

جلد ۹ | جنوری ۷۹ء | مائل خیرآبادی | صفر ۱۳۹۹ھ | شمارہ ۱۲

قیمت ۔۔۔/3 | سالانہ ۔۔/26 | V.P سے 30/

(کتبہ: الیاس حسین)

ڈٹ کر مقابلہ کیا اور جسم و جان کی ساری توانائیاں اسی مقصدِ عظیم میں کھپا دیں اور بس یہی آرزو رہی کہ اللہ تعالیٰ میری سعی اور میری تگ و دو کو قبول فرمائے اور میری لغزشوں اور کوتاہیوں سے صرفِ نظر کرے۔ حق کے راستے پر چلنے کے سارے ہی عواقب و نتائج اُن کے سامنے تھے۔ چنانچہ اُن کی تحریروں اور اُن کی تقریروں میں واضح اشارے اور نقشے ملتے ہیں۔ ایک موقع پر اُن کے الفاظ یہ تھے:

"حق کے متعلق یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ وہ بجائے خود حق ہے۔ وہ ایسی مستقل اقدار کا نام ہے جو سراسر صحیح اور صادق ہیں اگر تمام دنیا اس سے منحرف ہو جائے تب بھی وہ حق ہی ہے۔ مصائب حق پر نہیں اہلِ حق پر آتے ہیں لیکن جو لوگ سوچ سمجھ کر کامل قلبی اطمینان کے ساتھ یہ فیصلہ کر چکے ہوں کہ انہیں بہر حال حق ہی پر قائم رہنا ہے اور اسی کا بول بالا کرنے کے لئے اپنا سارا سرمایۂ حیات لگا دینا ہے وہ مصائب میں مبتلا ضرور ہوتے ہیں لیکن ناکام کبھی نہیں ہو سکتے۔"

مولانا کو اپنے مقصد کی سچائی، اللہ تعالیٰ کی تائید و حمایت اور حق و صداقت پر قائم رہنے والوں کی کامیابی پر اس قدر پختہ یقین تھا کہ بدترین حالات میں بھی وہ گھبراتے نہ تھے کیا کیا وقت نہیں گزرا اُن پر۔ حکومت شدید مخالف عوام سخت برہم اور حق پرستوں کی مٹھی بھر جماعت۔ راہ چلتے تو لوگ کاٹنے کو دوڑتے۔ یہ عہد طویل تر تھا مگر مولانا یہی فرماتے رہے کہ ہم حق پر ہیں اور ایک دن قوم اپنی غلطی محسوس کرے گی۔ حق کے لئے یہ استقامت دامنِ رسولؐ کے دبستان ہی میں پیدا ہو سکتی ہے۔

*

سیرتِ رسولؐ میں رزقِ حلال، حمیت اور عزتِ نفس کو غیر معمولی مقام حاصل ہے مولانا نے اپنی زندگی میں ان تینوں باتوں کا خاص طور پر خیال فرمایا۔ وہ تاریخ کے حوالے سے اس حقیقت تک پہنچ گئے تھے کہ دعوتِ حق وہی شخص لے کر اُٹھ سکتا ہے اور اسے آبرومندی سے آگے بڑھا سکتا ہے جس کے پاس جائز وسائل

درپردۂ حجاب

ایمانیات

مقالات ومضامین

تاریخ وسیر

زمانے کی گواہی

افسانے اور کہانیاں

اور اچھے انسانوں کی ایک جماعت ہو۔ وہ قائد جو اپنے اخراجات کے لئے دوسروں کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا ہو۔ کم ہی آزادی بے خوفی اور خودداری سے کام کرسکتا ہے۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے سب سے پہلے اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے رزقِ حلال کا باعزت انتظام کیا۔ کتابوں کی تصنیف واشاعت کے ذریعے شروع میں بس اتنا میسر آگیا کہ تنگی ترشی سے بسر ہو سکے۔ خاصی طویل مدت تک یہی عالم رہا۔ مولانا کے کپڑوں پر بسا اوقات پیوند لگے ہوتے۔ پھر اپنی آمدنی کا کثیر حصہ جماعتِ اسلامی کے لیے وقف کردیا۔ دعوتِ حق کی خاطر وہ جس ایثار کا مطالبہ دوسروں سے کرتے تھے سب سے پہلے اُس ایثار کا نمونہ خود قائم کیا۔ برسوں جیل میں رہے لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی کہ اُن کا گھر کس حال میں ہے۔ جاں نثار رفقا نے از خود اُن کے معاملات میں دلچسپی لی، مگر اُن کی طرف سے کبھی تقاضا نہ ہوا۔

خودداری اس قدر کہ حکومت سے کبھی کوئی درخواست نہ کی جیل کے حکام نے بتایا کہ ہم نے مولانا کی زبان سے کبھی کوئی حرفِ شکایت نہ سنا۔ خدا کے سوا کسی اور سے التجا کرنا یا اس کے آگے ہاتھ پھیلانا اُن کے تصورات ہی سے خارج تھا۔ جب وہ پہلی بار جیل گئے تو اپنے مضبوط کیرکٹر کے انمٹ نقوش چھوڑ کر آئے۔ اُس زمانے کا ایک سینئر وارڈن مجھ سے ملا۔ اُس نے بتایا کہ مولانا کو جیل خانے میں جو کمرہ دیا گیا وہ بڑا ہی گرم تھا۔ سخت گرمیوں میں بالکل تندور کی مانند تپنے لگتا۔ مولانا نے اُف تک نہ کی اور پنکھے کا مطالبہ بھی نہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد انھیں ٹیبل فین فراہم کیا گیا مگر وہ چلتا کم اور شور زیادہ کرتا تھا مگر وہ عذاب بھی خندہ پیشانی سے برداشت کر گئے اُن کی پیشانی پر کوئی بل تھا نہ کوئی عکسِ ملال۔ وہ تو رضائے الٰہی کی لذتوں سے سرشار تھے۔

مولانا نے دعا کی قبولیت کے زیرِ عنوان تفہیم القرآن میں اپنا ایک واقعہ درج فرمایا ہے اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی اور موت کے نازک ترین لمحات میں بھی اپنی عزتِ نفس کے کس حد تک پاسدار تھے اور

یہ کارواں ہمارا

سارے جہاں کا مالک ربِ جہاں ہمارا — عرشِ بریں ہمارا کون و مکاں ہمارا

یہ مہر و ماہ و انجم، یہ آسماں ہمارا — یہ کرۂ ہوائی ہے سائباں ہمارا

یہ سرزمیں ہماری ہے آشیاں ہمارا — گوشہ اس آشیاں کا ہندوستاں ہمارا

لائے گئے زمیں پر ہم امتحاں کی خاطر — اس دارِ امتحاں میں ہے امتحاں ہمارا

قائم اصولِ رب سے ہے یہ جہاں کہ اسکا — قائل ضرور ہوگا سائنس داں ہمارا

آئین ہے ہمارا قانون ربِ اکبر — اس پر یقین محکم ہے بے گماں ہمارا

ہر ذرہ اس جہاں کا پابندِ بندگی ہے — ہر شئے سمجھ چکی ہے لفظِ اذاں ہمارا

تب یہ زمیں نہ روئے اور آسماں نہ ٹوٹے — آئین ہر بشر پہ جب ہو عیاں ہمارا

امریکی ہوں کہ روسی ہوں جرمنی کہ چینی — پی کر گلے ملیں گے جامِ اماں ہمارا

ہر ایک شئے جہاں کی شامل ہے کارواں میں
حامد رواں دواں ہے یہ کارواں ہمارا

(شمس الدین حامد ناگپوری)

رہنمائی اعلان

مکتبہ حجاب رامپور کی طرف سے

مولانا مودودیؒ کی لکھی ہوئی کچھ کتابوں کی قیمت زیادہ ہے۔ ہم ایسے صاحبان کے لئے جو ان کتابوں کو یکمشت نہیں خرید سکتے، ایک رہنمائی اعلان شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس اعلان سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

● ارکان جماعت اسلامی۔ حسب ذیل کتابوں کی قیمت کس طرح قسطوں میں ادا کر سکتے ہیں۔

(۱) تفہیم القرآن۔ ۶ جلدیں۔ موجودہ ہدیہ 127/- ہے۔ اس کا آئندہ ایڈیشن کاغذ کی گرانی کی وجہ سے اندازاً -/۱۰۰ ہوگا۔ مکتبہ حجاب سے تفہیم القرآن کا یہ سٹ چھ قسطوں کے وعدے پر حاصل کریں۔

(۲) سیرت سرور عالمؐ۔ ۴ جلدوں میں۔ اس وقت صرف ۲ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ دونوں جلدوں کی قیمت سو روپیہ ہے۔ یہ دونوں جلدیں پانچ قسطوں۔

(۳) رسائل مسائل۔ ۴ حصے۔ موجودہ قیمت 34/- ہے۔ یہ سٹ دو قسطوں میں۔

(۴) محسن انسانیت۔ قیمت 22.50۔ دو قسطوں میں۔

(۵) تفہیمات۔ ۳ حصے۔ موجودہ قیمت 28.50۔ دو قسطوں میں۔

نوٹ ۱۔ ارکان جماعت فہرست ارکان سے اپنا نمبر ضرور رکھیں۔

نوٹ ۲۔ جماعت اسلامی کے ارکان اور غیر ارکان صاحبان نقد رقم بھیجیں تو محصولڈاک مکتبہ حجاب کے ذمہ۔

مکتبہ حجاب کی مطبوعات پر -/۱۰۰ یا اس سے زائد کی کتب منگانے پر ۴۰٪ کمیشن۔ سو سے کم -/۲۵ کی کتابیں منگانے پر ۳۳٪ اور -/25 سے کم منگانے پر ۲۵٪۔ محصولڈاک بذمہ خریدار مکتبہ حجاب کی مطبوعات۔ دیکھئے اسی شمارے کے آخر میں

(مینیجر مکتبہ "حجاب" رامپور یوپی۔ ۲۴۴۹۰۱)

مالک وایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد اسحق مائل خیرآبادی۔ مطبوعہ ... پریس دہلی۔ مقام اشاعت محلہ ... رامپور یوپی

لمعات

ادارہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

غلامی کا مسئلہ

"خیال تھا کہ آپ رسم و رواج نمبر میں غلامی کے رواج پر سیر حاصل تبصرہ فرمائیں گے لیکن آپ نے صرف یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ غلامی کا رواج بھی تھا جسے اسلام نے ختم کیا۔ جہاں تک یہ مسئلہ ہے کہ اسلام نے اس رواج کو ختم کیا، آپ نے قرآنی احکام کے بالکل برعکس فرمایا جبکہ قرآن میں غلامی کے مسئلہ کو برقرار رکھا گیا ہے اور اس کی نظیریں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رض کے حالات میں ملتی ہیں۔ میرے خیال میں یہ سہرا کارل مارکس اور ابراہیم لنکن کے سر ہے۔ براہ کرم آپ اپنے بیان کی تائید میں تفصیل سے لکھئے۔ مسلمان ہوتے ہوئے میرے دل میں اس مسئلے کی طرف سے کھٹک ہے۔"

تمہید اوپر ایک طویل اور مدلل خط کا نفس مطلب نقل کیا گیا ہے۔ میرے پاس اس مضمون کا صرف یہی خط آیا ہے اور یہ خط ایک عالم صاحب کا ہے۔ اس سلسلے میں جہاں تک "رسم و رواج نمبر" کا تعلق ہے۔ میں نے صرف یہی عرض کیا کہ جس طرح ستی، جوہر، لے پالک اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا رواج دنیا میں تھا، اسی طرح غلامی کا رواج بھی تھا۔ میں نے ستی، جوہر، لے پالک کے اصل مسئلے پر رسم و رواج نمبر میں

رعایتی اعلان

مکتبہ حجاب رامپور کی طرف سے

مولانا مودودیؒ کی لکھی ہوئی کچھ کتابوں کی قیمت زیادہ ہے۔ ہم ایسے صاحبان کے لئے جو ان کتابوں کو یکمشت نہیں خرید سکتے، ایک رعایتی اعلان شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس اعلان سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

● ارکان جماعت اسلامی۔ حسب ذیل کتابوں کی قیمت اس طرح قسطوں میں ادا کر سکتے ہیں۔

(۱) تفہیم القرآن۔ ۶ جلدیں موجودہ ہدیہ -/127 ہے۔ اس کا آئندہ ایڈیشن کاغذ کی گرانی کی وجہ سے اندازاً -/۱۵۰ ہوگا۔ مکتبہ حجاب سے تفہیم القرآن کا یہ سٹ چھ قسطوں کے وعدے پر حاصل کریں۔

(۲) سیرت سرور عالمؐ۔ ۴ جلدوں میں۔ اس وقت صرف ۲ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ دونوں جلدوں کی قیمت سو روپیہ ہے۔ یہ دونوں جلدیں پانچ قسطوں۔

(۳) رسائل مسائل۔ ۴ حصے۔ موجودہ قیمت -/34 ہے۔ یہ سٹ دو قسطوں میں۔

(۴) محسن انسانیت۔ قیمت 22.50۔ دو قسطوں میں۔

(۵) تفہیمات۔ ۳ حصے۔ موجودہ قیمت 28.50۔ دو قسطوں میں۔

نوٹ ۱۔ ارکان جماعت فہرست ارکان سے اپنا نمبر ضرور لکھیں۔

نوٹ ۲۔ جماعت اسلامی کے ارکان اور غیر ارکان صاحبان نقد رقم بھیجیں تو محصولڈاک مکتبہ حجاب کے ذمہ۔

مکتبہ حجاب کی مطبوعات پر -/100 یا اس سے زائد کی کتب منگانے پر 40% کمیشن۔ سو سے کم -/۲۵ کی کتابیں منگانے پر 33% اور -/25 سے کم منگانے پر 25%۔ محصولڈاک بذمہ خریدار مکتبہ حجاب کی مطبوعات۔ دیکھئے اسی شمارہ کے صفحہ

(مینجر مکتبہ "حجاب" رامپور یوپی۔ ۲۴۴۹۰۱)

مالک و ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد اسحٰق مائل خیرآبادی۔ مطبوعہ ... پریس ... دہلی۔ مقام اشاعت ... رامپور یوپی

کسی طرح کی علمی گفتگو نہیں کی بلکہ ان کے مضر اثرات تک بات کہہ کر ختم کر دی۔ اسی طرح غلامی کے متعلق بھی عرض کیا۔ اب مجھ سے تقاضا کیا جا رہا ہے کہ میں علمی انداز پہ سیر حاصل بحث کروں۔ سیر حاصل اور وہ بھی علمی گفتگو کرنے کے لیے ایک طویل مضمون کی ضرورت ہے۔ سیر حاصل بحث تو مجھے کرنا چاہیئے بشرطیکہ میں آسان زبان میں اُسے ڈھال سکوں۔ لیکن علمی بحث کے لیے "عالم صاحب" کو کسی عالم صاحب ہی سے رجوع ہونا چاہیئے تھا۔ بہر حال میں علمی مباحث کو نظر انداز کر کے سیر حاصل تو نہیں، مجاب کے پڑھنے والوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن ہمارے "عالم صاحب" نے جن لوگوں کے اعتراض کو اپنے لفظوں میں سمویا ہے۔ ان لوگوں کو مطمئن کرنا میرے بس میں نہیں، یہ اللہ کی توفیق پہ ہے۔ اس ذہنیت کے لوگ آخرت اور معراج پر اعتراض کرتے ہیں اور جب ہماری طرف سے جواب دیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہاں یہ تصور ہے تو عقل کو اپیل کرنے والا لیکن ہو کیسے سکتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے ان کو کون مطمئن کر سکتا ہے۔ بہر حال میرے ذمہ یہ فرض ہے جس سے میں عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔

غلامی کا غیر اسلامی مطلب غلامی کے بارے میں اسلامی اور غیر اسلامی معنی میں بڑا فرق ہے۔ غیر اسلامی معنی یہ ہیں کہ جس طرح ترکاریاں، اجناس، جانور اور دوسری اشیا خریدی اور بیچی جاتی ہیں، اسی طرح انسان بھی خریدا اور بیچا جاتا ہے یا بیچا اور خریدا جاتا رہے یا بیع اور فروخت ہوتا تھا۔ عملاً اس معنی کی تشریح غیر اسلامی دنیا میں اس طرح ہوتی تھی یا ہوتی رہی یا آگے چل کر میں ثابت کروں گا کہ غیر اسلامی افکار کی دنیا میں آج بھی ہوتی ہے۔

● غیر اسلامی طور پر کسی انسان کو غلام بنانے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک قبیلہ یا ایک قوم یا ایک بادشاہ اپنے جنگجو لوگوں کو لے کر دوسرے قبیلے، دوسری قوم یا دوسرے ملک پر کسی وجہ کے بغیر حملہ کر دیا کرتا تھا۔ اس حملے کے نتیجے میں جس کی جیت ہوتی تھی وہ دوسرے

قبیلے، قوم اور ملک کے لوگوں کو پکڑ لے جاتا تھا۔ چاہے وہ قیدی بچے ہوں یا جوان یا بوڑھے ورتیں یا سپاہی۔ ان سب بے چاروں کو فاتح لوگ اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتے تھے ں طرح جانوروں سے کام لیا جاتا ہے، اس طرح ان سے کام لیتے تھے۔ جوان قیدیوں کو وں پر لگا دیتے، بچوں اور عورتوں سے خدمت لیتے۔ خوبصورت عورتوں سے کسب اتے اور انہیں زیادہ سے زیادہ آمدنی کا ذریعہ بناتے۔ بوڑھے لوگ جو کچھ نہ کر سکتے تھے نہیں قتل کر دیتے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں، یاد ہوگا کہ ضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ایک ایسے ن بچے کو پیش کیا تھا جو لوٹ میں ڈاکوؤں کے ہاتھ آیا تھا اور اس کو حضرت خدیجہؓ کے مائی نے خریدا تھا اور بہن کو دے دیا تھا۔ اس بچے کا نام زید بن حارثہ تھا۔

لڑائیوں میں صرف یہی نہیں کہ غلام حاصل کئے جا سکتے تھے بلکہ اور بہت سا ٹ کا مال بھی ہاتھ آتا تھا۔ عیش و عشرت کا سامان، ٹھنڈے اور گرم قیمتی ملبوسات اور رائش نیز زندگی کو رنگین اور لذیذ بنانے کے دوسرے سامان، جن سے لطف اندوز ہونے کے لیے کہیں تو (آجکل کی زبان میں عرض کرتا ہوں) اونچے کوٹھوں پرجگری ن بزم عیش سجائی جاتی۔ کہیں شراب نوشی اور رقص و سرود (گانے بجانے) کی محفلیں ربائی جاتیں۔ میلے ٹھیلے ہوتے اور ان میں غلاموں کا بازار لگتا۔ ثقافتی اور کلچرل پروگراموں ی مجلسیں منعقد ہوتیں۔ ان محفلوں میں فخریہ وہ کارنامے بیان کئے جاتے کہ کس طرح ہم بہادروں نے فلاں قبیلے، فلاں قوم اور فلاں ملک سے یہ غلام (مرد اور عورت) حاصل کئے۔ عورتوں کے پوز دکھائے جاتے۔ ان کے بھرے بھرے شرین اور سینوں کا معائنہ کرایا جاتا اور بتایا جاتا کہ یہ اس قوم کی ہیں جو اپنی ذات کے اعتبار سے ایسے اور ایسے ہیں۔ اس تشریح کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ان غلاموں کے

وام وصول کئے جائیں۔

(۱) ہائے یہ مجبور! رومی استعمار کی حرص و ہوس کے لیے سامان عیش و عشرت فراہم کرنے کی خاطر غلاموں کے ریوڑ دن بھر کھیتوں میں جتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود انھیں پیٹ بھر کھانے کو بھی نصیب نہ ہوتا تھا۔ صرف اتنا دیا جاتا جس سے ان کا رشتہ جسم و روح برقرار رہے تاکہ وہ اپنے آقاؤں کے لیے کام کرتے رہیں۔ بے جان درختوں اور وحشی درندوں سے بھی ان کی حالت گئی گزری تھی۔ دن کے کام کرنے کے اوقات میں انھیں بیڑیاں پہنادی جاتی تھیں تاکہ وہ اپنے نگرانوں کی آنکھ بچاکر نکل نہ بھاگیں۔ ان کی پیٹھوں پر بے تحاشا کوڑے برسائے جاتے کیونکہ ان کا آقا یا ان کا مقامی کارکن انھیں ستانے اور اذیت دینے میں لذت محسوس کرتا تھا۔ شام کو جب کام ختم ہوجاتا تو دس دس، بیس بیس، پچاس پچاس کی مختلف ٹکڑیوں میں بانٹ کر مویشیوں کی طرح انھیں غلیظ، بدبودار اور چوہوں اور کیڑے مکوڑوں سے پٹے ہوئے باڑوں میں بند کردیا جاتا تھا۔ ان کے ہاتھ پاؤں اس حالت میں بھی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے آزاد نہیں ہوتے تھے مویشیوں کو کھلے، وسیع اور ہوادار باڑوں میں رکھا جاتا تھا مگر یہ بے چارے زندگی کی اس سہولت سے بھی محروم تھے۔

(۲) ہائے یہ درندگی! غلاموں کے بارے میں آقاؤں کے اس ظالمانہ رویے کی مکروہ ترین اور انتہائی گھناؤنی تصویر ہمیں ان کی محبوب اور دل پسند تفریح میں نظر آتی ہے۔ اس سے اس وحشت اور بربریت اور درندگی کا بخوبی اظہار ہوتا ہے جو غلاموں کے آقاؤں کے مزاج میں رچی بسی تھی۔ یہ آقا رومی بھی تھے، یورپی بھی اور امریکن بھی۔ کہا جاتا ہے کہ یوروپ اور امریکہ نے اپنے جملہ استعماری ذرائع و وسائل کے ساتھ (رومیوں سے یہی تہذیب) ورثے میں پائی تھی۔

آقاؤں کی ضیافت طبع کے لیے کچھ غلاموں کو تلواریں اور نیزے دیکر ایک اکھاڑے میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ اکھاڑے کے چاروں طرف تماشائیوں کے لیے نشستیں بنی ہوتی تھیں۔ ان نشستوں پر ان غلاموں کے آقا اور بسا اوقات خود شہنشاہ روم جل جلالہٗ رونق افروز ہوتے تھے کھیل شروع ہوتا تھا تو غلام تلواروں اور نیزوں سے ایک دوسرے پر پل پڑتے تھے (غلاموں کے آقا اپنے غلاموں کو شہ دیتے تھے کہ ہاں! شاباش، لینا، وہ مارا، ہاں اور جم کر گویا لکھنؤ کے بٹیر باز تھے کہ اپنی اپنی بٹیروں کو بڑھاوا دیتے تھے) نتیجہ یہ ہوتا کہ ان غلاموں کا قیمہ بن جاتا۔ آخر میں ایک خوش قسمت غلام موت کے اس کھیل سے زندہ بچ جاتا، وہ نہیں اس کا آقا اس فتح کی داد پاتا۔ صدہا صدہا تالیاں پٹتیں اور خوشی کے نعروں اور قہقہوں سے اُسے کندھوں پر بٹھایا جاتا۔ رہا وہ اصل فاتح غلام جو اس کھیل میں زخموں سے چور چور ہو جاتا اس کے علاج و معالجہ کی کسی کو پروا بھی نہ ہوتی۔ آقا زیادہ خوش ہوتا تو ایک جام شراب اُسے پلا دیتا۔

(۳) نہتے غلام شیروں کے کٹہروں میں۔ یہ ظالم آقا اسی ایک دل پسند کھیل پر بس نہ کرتے اس سے زیادہ دہشت انگیز اور خوفناک کھیل رچاتے۔ میدان میں بھوکے شیروں کے بڑے بڑے کٹہروں میں غلاموں کو کسی ہتھیار کے بغیر دھکیل دیتے۔ ہر غلام اپنے مدمقابل شیر کا مقفل کٹہرے کے اندر مقابلہ کرتا۔ اس سے کشتی لڑتا۔ کشتی کیا لڑتا اپنے کو بچانے کی جد وجہد اور فکر کرتا۔ شیر کے تھپیڑوں کو سہتا، اس کے گوشت نوچ لینے والے ناخونوں سے بچنے کے لیے کٹہرے کے اندر راہ فرار تلاش کرتا۔ اس کے خونخوار جبڑوں کی گرفت سے محفوظ رہنے کے لیے جان پر کھیل کر اس سے لپٹ جاتا۔ یہ کشتی اس وقت تک ہوتی جب تک کہ شیر اس کے جسم کی تکا بوٹی نہ کر دیتا۔ آدمی کا خون پی کر یہ شیر فاتحانہ انداز کا نعرہ مارتا (ڈکارتا) اور ہل من مزید کا اشارہ کر کے کٹہرے میں سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا کہ اسے انسان لاؤ اور اسے

انسانوں کے خداؤ! میرے شکم کے جہنم کے لیے کوئی اور گنہگار ہو تو بھیجو!

(۴) غلاموں کی حیثیت۔ روم، یورپ، ایران، ہندوستان اور دنیا کے دوسرے ملکوں کے غلام بھی مظلومی اور بے بسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جزوی اختلافات کے باوجود دنیا کے مختلف ملکوں میں غلام کی حیثیت اور اس کے معاشرتی مقام کے بارے میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ اس کی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، نہ اس کا قتل کوئی ایسا جرم تھا، جس پر قصاص لازم آتا ہو۔ غلاموں پر فرائض اور ذمہ داریوں کا کمر شکن بار تھا۔ مگر ان کے مقابلے میں ان کے حقوق بمنزلہ صفر تھے۔ دنیا کے ان تمام ممالک میں غلاموں کے متعلق نہ نقطۂ نظر کا اختلاف تھا اور نہ ان کے معاشرتی حقوق میں کچھ فرق تھا بلکہ فرق جو کچھ تھا وہ غلاموں کے بارے میں ان کے طرزِ عمل کی شناخت اور ظلم کی سنگینی کے مدارج تھے۔ کہیں وہ ظلم و ستم کے زیادہ گھناؤنے مظاہرے سے دوچار تھا اور کہیں ذرا ہلکے اور نسبتاً کم گھناؤنے ہتھکنڈوں کا شکار۔ شناخت کے لیے آقا اپنے لوہیا ٹھپے کو گرم کرکے غلام کا جسم داغ دیا کرتا تھا تاکہ سند رہے کہ یہ کس کا غلام ہے اور بوقت ضرورت کام آئے یعنی اگر کہیں بھاگ کر چلا بھی جائے تو لوگ پہچان لیں اور پکڑ کر پھر آقا کے حوالے کر دیں (چہ خوش! کتنا اتفاق رائے تھا اس اصول میں)

غلاموں پر نفسیاتی اثر۔ غلاموں پر مظالم اور غلاموں کی مجبوری کی مختصر داستان اوپر بیان کی گئی۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں جب لوگ مدتوں رہتے بستے ہیں اور چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں پاتے تو ان مظالم کے خوگر ہوتے رہتے ہیں۔ ان پر ناامیدی اور یاس طاری ہو جاتی ہے۔ وہ پابدست دیگرے دست بدست دیگر ہو جاتے ہیں۔ وہ خود سمجھنے لگتے ہیں کہ واقعی پیدا کرنے والے نے ہمیں غلامی اور مظالم برداشت کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ آقا جو حکم دے، وہی کریں۔

یہ احساس پیدا ہونے کے بعد وہ سوچتے ہیں تو آقا کی عقل سے۔ اٹھتے بیٹھتے ہیں تو آقا کے اشاروں پر۔ کماتے پیتے ہیں تو آقا کی مرضی کے مطابق۔ مرتے جیتے ہیں تو آقا کے حکم سے جیسا کہ کسی نے کہا ہے

کہا جو مرنے کو مر گئے ہم کہا جو جینے کو جی اٹھے ہم   بس اور کیا چاہتا ہے ظالم ترے اشاروں پہ چل پڑے ہم

نفسیات کا یہ اثر سمجھنا ہو تو ہمارے ملک کے اچھوتوں کی نفسیات پر غور کرنا بہت مناسب ہوگا۔ برسہا برس پنڈت گروہ نے اسے اچھوت بنائے رکھا۔ یہ عقیدہ دیا کہ پنڈت ایشور کے منہ سے پیدا ہوا۔ چھتری چھاتی اور بانہوں سے۔ ویش پیٹ سے۔ رہے شودر تو وہ ... پیدا ہوئے۔ اس لیے وہ ناپاک ہوئے نجس ہیں۔ ان کا سایہ بھی ناپاک ہے۔ ان کا ذہن بھی ناپاک ہے۔ ان کے کان بھی ناپاک ہیں۔ اگر کوئی اچھوت کوئی منتر سن لے تو سیسہ پگھلا کر اس کے کان میں ڈال دینا چاہیے۔

ان تصورات میں رہتے رہتے اچھوتوں کی عادت ثانیہ یہی بن گئی۔ آج بھی اچھوت کتنا ہی تعلیم یافتہ اور کیسے ہی بڑے عہدے پر ہو، اپنی کمتری محسوس کرتا ہے اور اعلیٰ سوسائٹی میں جھجکتا رہتا ہے جب کہ سیاسی تعاون بھرپور اسے حاصل ہے۔

اسی سے آپ سمجھ لیجیے کہ غلاموں کی نفسیات کیا بن گئی ہوں گی۔ دائمی غلامی (برسہا برس تک لگاتار غلام بنے رہنے) سے ان کا مزاج بن گیا کہ وہ آقا کے سچے فرماں بردار رہیں۔ آزادی کا تصور تک نہ کریں۔ یہ مزاج پختہ ہو جانے پر سوچ اور فکر کی قوت گھٹ گھٹ کر مر جاتی ہے۔ وہ آزادانہ طور پر سوچ نہیں سکتا۔ پھر وہ اپنے بل بوتے پر کوئی اقدام نہیں کر سکتا ہے۔ وہ یہ صلاحیت ہی کھو دیتا ہے۔ اس کی ادنیٰ مثال ایک ملازم پیشہ آدمی کو سامنے رکھ کر سمجھیے۔ ملازم پیشہ ایک مدت تک ملازمت کرتے کرتے اپنے افسر کی عقل سے سوچتا ہے۔ افسر جو حکم دیتا ہے، چاہے وہ عقل کے مطابق ہو یا نہ ہو تا حکمت

کو کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ آج کل ماتحت اور دوسروں کے اثر میں رہنے والوں کے لیے اس طرح کے لفظ بولے جاتے ہیں: "یہ شخص فلاں کا چمچہ ہے" "یہ چمچہ زلہ باش کا ترجمہ ہے یعنی جس کا کھائے اس کی گائے" "یہ شخص جی حضوریوں میں سے ہے" یعنی اس کا افسر جو کچھ کہتا ہے وہی یہ بھی کہتا ہے۔ افسر دن کو رات کہے تو یہ تصدیق کرتا ہے کہ جی حضور! مجھے دن میں تارے نظر آ رہے ہیں" یہ لفظ چمچہ، زلہ باش، جی حضوری اور ایسے ہی سارے کے سارے الفاظ لفظ "غلام" کا ترجمہ ہیں۔ چنانچہ ملازم پیشہ آدمی کے متعلق سو فیصدی یہ تجربہ ہے کہ وہ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد ہر کام سے ریٹائرڈ ہو جاتا ہے۔ اُسے جو پنشن ملتی ہے یا پراویڈنٹ فنڈ ہاتھ آتا ہے اسے بیٹھے بیٹھے کھا جاتا ہے۔ اس کی ہمت نہیں ہوتی کہ یہ رقم کسی بیوپار میں لگا دے۔ وہ ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں گھاٹا نہ ہو جائے۔ اس کے برخلاف آزاد پیشہ آدمی بڑے سے بڑے اقدام کر بیٹھتا ہے۔ آزاد پیشہ امید کا حامل ہوتا ہے۔ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ کا قائل اور غلام امید سے خالی۔

ہاں! افسر حکم دے تو سمندر میں کود پڑے۔ افسر کا اشارہ پائے تو آگ میں چھلانگ لگا دے۔ میں نے ہزار ہا ایسے لوگ دیکھے ہیں جنھوں نے افسروں کے اشارۂ ابرو پر دین اور عقیدہ قربان کر دیا۔ بڑے بڑے مولویوں اور تہجد کی نماز پڑھنے والے ملازموں اور دوسروں کے اثر میں رہنے والے لیڈروں کو تلک لگواتے اور بتوں کی پرستش کرتے دیکھا ہے۔ یہ سب اسی ذہنی غلامی کے اثرات نہیں تو اور کیا ہیں؟

تو ـــ اب کہنا چاہیے کہ غلام اسی وقت تک بڑھ بڑھ کر کام انجام دے سکتا ہے جب تک اس کو خود نہ سوچنا پڑے بلکہ اس کا آقا حکم دے۔ غلام کی ذمہ داری میں کوئی کام دے دے اور کہے کہ وہ خود سوچ کر انجام دے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ غلام ہمیشہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔ آزادانہ ذمہ داری والا کام انجام نہ دے سکا۔ غلام پر جب

نہ ذمہ داری ڈالی گئی تو اس کی حالت ریہانی (دیکھنے کے لائق) ہو گئی۔ اس کا دماغ ماؤف
۔غلام اپنی نجی زندگی کی نہایت معمولی سی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے احساس کے پیچھے
مردانہ وار آنکھیں چار کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا۔ وہ بے چارہ اس وقت بھی
مبتلا ہو کر اخلاقی جرأت سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ ایسے خطروں سے ڈرتا رہتا ہے جن
ہ تک نہیں ہوتا۔ ایسی کٹھنائیوں سے گھبراتا رہتا ہے جن کا گمان آزاد آدمی کو بھی نہیں
تا۔ بے چارہ خواہ مخواہ یہ سمجھ کر بیٹھ رہتا ہے کہ ان پر قابو پانا اس کے بس سے باہر ہے
نفسیاتی اثر سے اس کی آمادگی سمٹتے سمٹتے اس کی ذات کے خول میں گم ہی ہو جاتی ہے
ا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی جد و جہد سے محروم ہو جاتا ہے۔

آج ذہنی غلامی کے نمونے۔ اب ہم یہ ایک اور ضمنی عنوان قائم کر کے اس کی تشریح کرتا
تے ہیں۔ اس کے بعد غلامی کے اس معنی پر بحث کریں جو قرآن نے ہمیں دیا ہے۔

میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ اپنے اوپر، اپنے آس پاس کے لوگوں پہ
مشرقی ملکوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں۔ آپ کو اندازہ ہو گا کہ مغربی اقتدار کے ماتحت
سی پہلے جسمانی پھر ذہنی غلامی نے مشرقی اقوام کی زندگیاں کس قدر بے اثر کر دی
۔۔ بے اثر ہی نہیں بے وقعت۔ مغربی سامراجیوں نے اپنے گھناؤنے سیاسی مقاصد
حاصل کرنے کے لیے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سیاسی چالبازیوں سے
تہ ذہنی اور جسمانی غلامی کا ایسا جال بچھایا کہ اس کے جاتے جاتے مشرق آپ سے
ب اس کے مضبوط بندھنوں میں کس گیا۔ حکیم مشرق نے کیا خوب تنقید کی ہے فرمایا

طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا
اپنی منقاروں سے پھندہ کس رہے ہے جال کا

چنانچہ یہی ذہنی غلامی ہے جس کا اظہار مغرب زدہ یا مغربی اولاد (بظاہر مشرقی انسان) کی

بات چیت اور تقریروں سے ہوتا ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ بعض مسلّم اور مفید قوانین کو بے کار اور گھسے پٹے قرار دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ آج ان کو لاگو کرنا رجعت پسندی اور حکمت سے باہر ہے۔ غور فرمائیے اس کی تہہ میں کیا ہے۔ وہی غلامانہ ذہنیت کام کر رہی ہے جس کی بدولت ایک غلام اپنی آزاد مرضی (یہ سیاسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں بذاتِ خود یا اپنے آپ) فیصلہ کرنے اور اس کے پھل حاصل کرنے کا مردانہ وار مقابلہ کرنے سے عاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ انگریز یا امریکی یا روسی ماہر قانون کسی گھناؤنے سے گھناؤنے قانون کی حمایت کر دے تو یہ لوگ بخوشی اس کو لاگو کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح وہ اپنی آزاد مرضی سے آزاد فیصلے کرنے اور اپنے بل بوتے پر لاگو کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے سے بچ جاتے ہیں۔ مشرقی ممالک میں اس وقت جو قانونی دفتری نظام پایا جاتا ہے وہ اسی عہد غلامی کی یادگار ہے۔ ان دفتروں کا بے جا طریقِ کار اور اس کے مرعوب عمّال (حاکم جو اس کا نفاذ کرتے ہیں) کو دیکھ کر اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ غلامی کا منحوس سایہ کس طرح اب بھی مشرقی لوگوں کی روح پر چھایا ہوا ہے۔ آج کے کسی گورنر میں آزادی سے آزاد فیصلے کرنے کی اہلیت ہے ہی نہیں اُسے جب تک وزارت (جو خود مغرب کی پرستار ہے) سے کھلے احکام اور واضح ہدایات نہ ملیں وہ بطور خود کوئی ذمہ دارانہ فیصلے نہیں کر سکتا۔ اگر ایسے عمّال (گورنروں) کی ذہنیت غلامانہ نہ ہوتی تو وہ یوں بے جان پتلیاں بن کر نہ رہ جاتے اور نہ یوں بے بس ہو کر غیروں کے محتاج ہوتے کیونکہ ان کی اپنی ذہنیت اپنے سے بڑے حاکم کے حکموں کو بے چوں و چرا بجا لانے کے لیے تو خوب سے خوب تر ہے مگر آزاد فیصلوں سے کوری۔ اس کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں۔

کل کی بات ہے! کل کی بات ہے جو اخبارات کے صفحات پر حرف بحرف لکھی ہے

ران مردوں کی روشنائی ابھی خشک نہیں ہوئی۔ روس کی ایک "بیٹی" نے اپنی استعماری
ت کو بچانے کے لیے ایمرجنسی کا نفاذ کیا تو جہاں اس نے اپنے حریفوں کو جیلوں میں
ونسا دہیں ایسے سیدھے سادے، بھولے بھالے، معصوموں کو بھی دھکیل دیا جو سب سے
ے الگ تھلگ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ جب تم مسلمان ہو تو پورے مسلمان بن جاؤ۔ غیر
سلموں سے کہتے ہیں کہ تم ہماری نالائقیوں پر نہ جاؤ، تمہارے خدا کا آخری فرمان ہمارے
س محفوظ ہے۔ اسے دیکھو، اس میں تمہارے لیے ایک پیغام ہے اس سے دین و دنیا دونوں
بھلا ہوگا۔

ان عزیزوں کو گرفتار کرکے ان کو خطاوار ثابت کرنے کے لیے من مانے ثبوت خود
ائے اور ایسے لوگوں کو گواہی کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا جو بہترین نمونے، بے غرض نلنشا
پچے جی حضوری اور غلامانہ ذہنیت کے مالک تھے۔ ایک پہلے سے تیار شدہ مولویان کی
یب نے بڑھ بڑھ کر خوب گواہیاں دیں۔ اپنے اخباروں میں بغلیں بجائیں۔ جی حضور!
بنا پکڑنا یہ نالائق اس سے بھی بدتر ہیں جیسا کہ آپ نے گردانا ہے۔ انھوں نے پرانے
ردے اکھیڑے۔ فتنہ مودودیت بڑے طنطنے سے چھاپی۔ اس فتنہ پرور دور میں اللہ کے ایک
بندے نے جان کو قلم کی نوک پر رکھ کر کیا خوب کہا تھا، جبکہ جماعت اسلامی کے
اکابرین جیل میں ہیں اور وہ اس موقف میں نہیں کہ "فتنہ مودودیت" کا جواب دیں، ایسے
موقع پر ایسی کتاب شائع کرنا شریف آدمی کا کام نہیں ہے۔ (برہان) اس بے چارے
کو پھر اپنوں سے بہت کچھ سننا پڑا، گویا یہی دو سطریں مورخ کو دے گیا۔

غلامانہ ذہنیت کو اگر کمینگی پر اُبھارا جائے تو یہ کمینہ پن بھی اپنا لینے میں نہیں چوکتے
جیل میں شہید ہونے والے ایک رکن جماعت اسلامی کو جب گرفتار کیا گیا تو ایک چیچے
کو لوگوں نے اس کے خلاف گواہی دیتے دیکھا، شرعی پاجامہ پہنے ہوئے۔ لمبا کرتا زیب تن

لیے ہوئے۔ چہرۂ مبارک پر لمبی ڈاڑھی، پیشانی پر سجدوں کا نشان۔ عمامہ باندھے اور سب سے بڑی ستم ظریفی یہ کہ رمضان شریف کا مہینہ اور منہ میں روزہ اور خود ذات شریف دعوت و تبلیغ کے اعلیٰ درجہ کے کارکن ان بزرگ نے مولانا عبدالسلام شہیدؒ کے خلاف گواہی ان لفظوں میں فرمائی کہ میں نے دیکھا اور میرے کانوں نے سنا ہے کہ ملزم حکومت الٰہیہ کا نعرہ لگا رہا تھا۔ تفو! بر غلام زمانہ تفو!

ایک لطیفہ! میرے مخدوم اور ہم وطن مولانا فضل الحق خیرآبادی کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف فتویٰ دینے کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ انگریزوں کو اندیشہ تھا کہ اگر مولانا شہید ہے تو بغاوت کو فروغ ہوگا۔ وہ ایک چمچے کو سکھا پڑھا کر لائے کہ وہ یہ کہہ دے کہ جس مولوی مسمی فضل حق نے فتویٰ دیا ہے وہ یہ ملزم نہیں ہے۔ تاکہ مولانا کو بری کر دیا جائے اس شخص نے جیسے ہی یہ کہا تو مولانا گرجے اور فرمایا "یہ گواہ جھوٹا ہے۔ میں وہی فضل حق ہوں جس نے فتویٰ دیا ہے۔ ایسا ہوتا ہے آزاد ذہن۔

عباسی دور حکومت میں فتنۂ خلق قرآن اٹھا۔ عباسی خلیفہ کے چمچوں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ہزاروں میل کے رقبے میں پھیلی ہوئی حکومت میں سے صرف ایک بندۂ خدا ایسا ملا جسے عباسی خلیفہ نے گرفتار کیا۔ یعنی صرف ایک بہادر نے خلیفہ سے اختلاف کیا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ اس کو ایسے زبردست کوڑوں کی چوٹ دی گئی کہ اگر ہاتھی ہوتا تو چیخ اٹھتا مگر وہ ہر کوڑے کی چوٹ پر خلیفہ کی طرف انگلی اٹھا کر کہتا تھا

"قرآن و حدیث سے ثبوت لاؤ تو مانوں گا ورنہ انکار انکار انکار"

دوسرا لطیفہ۔ میدان کربلا میں حسین رضہ کے خلاف چھ ہزار یزیدی لشکر "بزن" کا حکم سنتے ہی حملہ آور ہوا تو اس شان سے کہ اس کے دل میں حسین رضہ کا احترام بدرجہ اتم موجود لیکن تلواریں یزید کی طرفدار۔ ان چمچوں نے نواسۂ رسولؐ کو محض اس جرم میں شہید کر دیا

سا نے یزید کے بارے میں یہ کہا تھا کہ وہ غلط طریقے سے خلیفہ بنا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ چاہے پچھلا زمانہ ہو یا آج کا غلامانہ ذہنیت کے لوگ اپنی مرضی سے کام کرنے کے اہل رہتے ہی نہیں۔ اس کے ثبوت اور نمونے ہر دور میں دیکھے گئے اور آج بھی ملتے ہیں۔

اختصار کے باوجود آج کا اداریہ طویل ہو گیا اور ہم اصل موضوع پر نہ آ سکے خاص موضوع جس پر اعتراض کیا گیا ہے وہ ہنوز تشنہ ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں ہم اس پر گفتگو کریں گے۔

خبر برسوں کی نہیں پرسوں کی

سہارنپور۔ ایڈیشنل سیشن جج شری آر۔ کے اگروال نے اپنی بیٹی کو قتل کرنے کے الزام میں موضع بھرت پور تھانہ ننگلور کے ایک شخص ڈاکٹر سبودھ کمار کو عمر قید اور ثبوت تلف کرنے کے الزام میں مزید تین سال قید کی سزا دی ہے۔ دونوں سزائیں ساتھ چلیں گی۔ عدالت نے ملزم کے باپ کو بھی ثبوت تلف کرنے کے الزام میں تین سال قید با مشقت کی سزا دی ہے۔ باقی ۹ ملزمان کو بری کر دیا گیا ہے۔ واقعات یوں بیان کئے جاتے ہیں کہ جہیز کم لانے کی وجہ سے ڈاکٹر سبودھ کمار نے اپنی بیٹی اور شادی شدہ بیوی کو بہت تنگ اور پریشان کیا اور جب اس کا سالا اسکے گھر آیا تو اس شبہ میں کہ اسکی بیٹی نے اپنے بھائی سے شکایت کی ہے آدھی رات کو اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا اور یہ ظاہر کیا کہ اچانک حرکت قلب بند ہونے سے وہ مر گئی ہے۔ ملزمان نے لڑکی کے گھر والوں کا انتظار کئے بغیر ثبوت ختم کرنے کیلئے اسکی لاش جلا دی۔ دوسرے دن پولیس نے موقع پر پہنچ کر لاش کی جلی ہوئی ہڈیوں اور راکھ پر قبضہ کر لیا۔ جنکے کیمیکل معائنہ سے تین ہڈیوں میں چھرے پائے گئے۔ ایڈیشنل جج نے استغاثہ کی کہانی کو درست مانتے ہوئے دو ملزمان کو سزا دی اور ۹ کو

زمانہ قدیم میں ماں بننا آسان کام نہیں تھا

بچے کی پیدائش ایک عورت کی تکمیل کرتی ہے عورت کے لئے ماں بننا ایک فطری خواہش ہے بانجھ عورت کو سماج میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ آج کل فیملی پلاننگ کا زور ہے لیکن اس کا مقصد بھی بچوں کی تعداد پر کنٹرول کرنا ہے، ماں بننے پر نہیں۔ آئیے دیکھیں کہ دنیا کے مختلف ممالک میں بچے کی پیدائش پر کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔

جنوبی امریکہ میں دریائے ایمزن کے کنارے رہنے والے ایک قبیلے میں یہ رسم عام ہے کہ زچہ بچے کی پیدائش سے چند روز پہلے اپنے قبیلے سے کہیں دور چلی جاتی ہے۔ وہ تنہائی میں کسی کی مدد کے بغیر بچہ پیدا کرتی ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد وہ اپنے بچے کے ساتھ اپنے قبیلے میں واپس آجاتی ہے اگر کسی عورت کے یہاں جڑواں بچے پیدا ہوں تو ان میں سے ایک کو مار دیا جاتا ہے۔

آسٹریلیا کی قبائلی عورتوں میں یہ رسم ہے کہ حاملہ عورت بچے کی پیدائش سے پہلے اپنے شوہر کے گھر سے چلی جاتی ہے وہ پیدل چل کر اپنے والدین کے گھر پہنچتی ہے اور بچے کی پیدائش کے بعد جب بچہ دودھ پینے لگتا ہے تو اُسے چھاتی سے لگائے پیدل چل کر واپس اپنے شوہر کے گھر آجاتی ہے۔

میکسیکو کے قدیم قبیلے آزٹک میں حاملہ عورتوں کو خاص مراعات حاصل ہوتی ہیں حاملہ کو ایک مقدس عورت سمجھا جاتا ہے اگر حمل کے دوران اس کی موت ہو جاتی ہے تو اُسے پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفنایا جاتا ہے۔

جنوبی بحرالکاہل میں جزائر پولی نیشیا کے قبیلے

حاملہ عورت کو ایک خاص مکان میں رکھتے ہیں مسلح افراد اس مکان کی رات دن حفاظت کرتے ہیں کسی بھی مرد کو۔ یہاں تک کہ اس کے شوہر کو بھی اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

بحر اٹلانٹک میں واقع جزیرہ توبریان کے لوگ مادری سماج سے تعلق رکھتے ہیں یہ لوگ باپ کی نسبت کو اہم نہیں سمجھتے وہ صرف ماں کی نسبت کو اہم سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہاں مردوں کو اس طرح تربیت دی جاتی ہے کہ شترکہ زندگی بسر کرتے وقت وہ اپنی عورتوں کی عزت کریں۔ یہاں جب عورت پہلی بار حاملہ ہوتی ہے تو اس کو کیلے کے پتوں کے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ پھر اس کے چہرے پر سُرخ اور سیاہ رنگوں سے نقش و نگار بنائے جاتے ہیں اس کے بال پھولوں سے گوندھے جاتے ہیں اس کے گلے اور ہاتھوں میں پھول پہنائے جاتے ہیں۔ اس تمام عرصے میں مذہبی گیت گائے جاتے ہیں ان دعاؤں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچہ بغیر کسی تکلیف کے پیدا ہو۔ حاملہ عورت کو مچھلی اور میوے کھانے سے پرہیز کرایا جاتا ہے وہ اپنے شوہر کے قریب نہیں جا سکتی۔ جب اُسے درد شروع ہوتا ہے تو ایک تخت پر آگ روشن کی جاتی ہے اس تخت پر آگ کے قریب ایک چٹائی بچھی ہوتی ہے حاملہ عورت کو اس چٹائی پر لٹایا جاتا ہے۔ بچے کا چٹائی پر پیدا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو ماں کے سوا کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ اسے ہاتھ لگائے۔ بچے کی پیدائش کے ایک مہینے بعد تک ماں برہنہ حالت میں اس بچے کے ساتھ تنہا رہتی ہے۔ کسی کو اس کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس دوران تخت پر رکھی ہوئی آگ جلتی رہتی ہے۔

ایک مہینے کے بعد ماں کو کمرے سے باہر نکلنے اور نہانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ تین دن کے بعد اُسے پھر بچے کے ساتھ دوبارہ "قید" کر دیا جاتا ہے جب تک بچہ چلنا شروع نہ کرے۔ شوہر اور بیوی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے یہی نہیں، یہ احتیاط اس لئے کی جاتی ہے کہ باپ کی موجودگی میں بچے کے سر پر کوئی بلا نازل نہ ہو جائے۔ دو سال کی عمر میں بچے کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے۔ ماں اس قدر قربانیوں اور آزمائشوں سے گذر کر جس بچے کو پیدا کرتی ہے وہی بچہ اس سے جدا کر دیا جاتا ہے اور اُسے

جزیرے سے کسی اور علاقہ میں بھیج دیا جاتا ہے۔

قدیم یونان اور روم کی عورتیں زچگی کے وقت آگ کے گرد چکر لگاتی تھیں۔ اس آگ میں ایک خوشبودار گھاس جلائی جاتی تھی۔ کچھ صدیوں کے بعد اس آگ کی جگہ ایک دیگ نے لے لی۔ اس دیگ میں اُبلتا ہوا پانی رکھا جاتا تھا۔ قدیم مصر کی عورتیں ایسے وقت ایک خاص کرسی پر بیٹھتی تھیں حاملہ عورتیں بچہ پیدا ہونے کے ۱۵ دن بعد تک سب کی نظروں سے پوشیدہ رہتی تھیں۔ عبرانیوں اور قدیم یہودیوں کے زمانے میں اگر لڑکا پیدا ہو تو ماں کو چالیس دن تک خود کو پردے میں رکھنا پڑتا تھا، اگر لڑکی پیدا ہو تو ستر دن تک پردہ لازمی تھا حضرت عیسیٰ کی ماں مریم بھی زچگی کے بعد ۴۰ دن تک لوگوں کی نگاہوں سے چھپی رہی تھیں۔ ۲ فروری کو ہر سال عیسائی جو عید مناتے ہیں وہ اسی سے متعلق ہے۔

اسلام سے پہلے عربوں میں ایک رسم تھی کہ بچہ ہونے کے ایک مہینہ بعد تک کسی کو پتہ نہ چلتا کہ لڑکا پیدا ہوا ہے یا لڑکی، کیونکہ لڑکا پیدا ہونے کی صورت میں یہ خطرہ تھا کہ لوگ اس کو نظر نہ لگادیں بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ وہ ۱۲ روز تک نہ اپنے بال دھو سکتی تھی اور نہ آگ کے پاس بیٹھ سکتی تھی وہ اس قدر ناپاک تصور کی جاتی تھی کہ اس کا دروازے کے باہر جانا بھی منع تھا۔ لوگوں کو ڈر رہتا تھا کہ اس کے گھر سے نکلتے ہی چشموں کا پانی خشک ہو جائے گا۔

بچے کی پیدائش قدیم انسان کے لئے ایک معمہ تھا۔ وہ عورت کو ایک جادوگر سمجھتے تھے جو ایک جیتے جاگتے انسان کو جنم دیتی ہے اور اسی لئے اس سے خوف زدہ رہتے تھے۔

عرب لوگ بچے کو ماں سے چھین کر دائی کے حوالے کر دیتے۔ اُسے دودھ کی بجائے مکھن اور شہد کھلایا جاتا۔ ماں کو آٹا، گھی اور انگور کھانے کو دیتے۔ بچے کو دودھ پلانے کے لئے ماں کو ایک مہینے تک انتظار کرنا پڑتا۔ پیغمبر اسلامؐ کے دور میں یہ رسم تھی کہ بچے کو دیہات میں ایک دائی کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ وہ دو سال تک اُسے اپنا دودھ پلاتی اور پالتی تھی۔ تاکہ دیہات کی کھلی فضا میں بچہ تندرست رہ سکے۔ ہر سال دیہاتی عورتیں مکہ کے بچوں کو دیہات لے جانے کے لئے آتیں۔ پیغمبر اسلامؐ حلیمہ دائی کے

حصے میں آئے تھے۔

ہمارے آباؤ اجداد حاملہ کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن یہ احترام بچے کی پیدائش کے اسی وقت تک باقی رہتا تھا جب عورت لڑکا پیدا کرتی۔ اگر لڑکی پیدا ہو جاتی تو یہ احترام ناراضگی میں بدل جاتا۔ ہندوستان میں زمانۂ قدیم میں متواتر لڑکیاں پیدا کرنے والی عورت کو طلاق مل جاتی تھی۔ یونان میں لڑکی پیدا ہوتی تو اس کا باپ اُسے کھیتوں میں چھوڑ کر گھر چلا جاتا۔ وہ بے چاری سردی سے ٹھٹھر کر مر جاتی۔ چین میں باپ اپنی بیٹیوں کو بلا تکلف مار ڈالتے۔ عرب میں کچھ قبائل ایسے تھے جہاں باپ اپنی بیٹیوں کو زندہ ہی زمین میں گاڑ دیتے تھے۔

زمانۂ قدیم میں سیاسی مصلحتوں اور شاہی قوانین نے بچے کی پیدائش کے مرحلے کو اور زیادہ تکلیف دہ بنا دیا تھا۔ ہر بادشاہ ولی عہد پیدا کرنے کے لئے بے تاب رہتا تھا۔ ولی عہد اس کا اپنا لڑکا ہونا چاہئے۔ اس شرط کو پورا کرنے کے لئے وہ بے شمار شادیاں کرتا۔ لڑکا پیدا ہوتے ہی سارے ملک میں شادیانے بجتے۔ یہ اس بات کا اظہار ہوتا کہ تاج شاہی بادشاہ کے اپنے خاندان میں ہی رہے گا جس ملکہ کے بچہ پیدا ہوتا اس کے وارے نیارے ہو جاتے۔ وہ بادشاہ کی نظر میں قابل احترام بن جاتی۔ ہر ملکہ کی یہ کوشش ہوتی کہ وہ جلد سے جلد لڑکا پیدا کر کے عزت اور افتخار کا مقام حاصل کر لے۔ محل ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا مرکز بن جاتا۔ بعض دفعہ یہ مشہور کر دیا جاتا کہ ملکہ حاملہ ہے اور نو مہینے کے بعد کسی اور عورت کا بچہ لے کر بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیا جاتا۔ کبھی کبھی یہ بھید بعد میں کھل جاتا۔

ایسا ہی ایک واقعہ فرانس میں ہو گیا تھا جس کی اس طرح کا بھید کھلنے کے بعد سے فرانس کے بادشاہوں نے حکم دے دیا کہ ملکائیں ڈاکٹر کے سامنے ہی نہیں بلکہ درباریوں کی موجودگی میں بچہ پیدا کریں۔ یہ سلسلہ ختم ہوا تو ایک آدمی مقرر کر دیا گیا۔ وہ بچے کی پیدائش کے وقت موجود رہتا اور گواہی دیتا کہ واقعی ملکہ کے یہاں بچہ پیدا ہوا ہے۔ حاملہ کے کمرے کے چاروں طرف سپاہی کھڑے رہتے، تاکہ اس دوران کوئی اندر نہ آ سکے۔ زچہ کے لئے وہ دور دہشت کبھی کا تمام ہوا۔ لیکن قدیم قبیلوں میں اس کے آثار آج بھی نظر آ جاتے ہیں۔

■ ■ ■ ■

سرسید کی والدہ

۱۸۸۲ء میں برصغیر کی تعلیمی حالت کی تحقیقات کے لیے ایک ایجوکیشن کمیشن قائم کیا گیا۔ سرسید احمد خاں اس کے ممبر تھے ان سے تعلیم نسواں کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے اثنائے شہادت میں فرمایا:

"خود میں نے فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنی ماں سے پائی۔ نیز اوائل عمر میں مجھے بہت سے مفید اور اخلاقی سبق میری والدہ نے دیے جو اب تک بعینہٖ مجھے یاد ہیں۔"

سرسید احمد خاں کی والدہ کا نام عزیز النساء بیگم تھا۔ وہ نواب دبیرالدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ اگرچہ صرف قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں۔ لیکن نہایت لائق، منتظم، ذہین رحم دل اور با اخلاق تھیں۔ سرسید احمد اپنی ابتدائی تعلیم کا جو انھوں نے اپنی والدہ سے حاصل کی اس طرح ذکر کرتے ہیں:

"میں نے خود گلستاں کے سبق ان سے پڑھے ہیں اور اکثر ابتدائی فارسی کتابوں کے سبق ان کو سنائے ہیں مجھ کو خوب یاد ہے جب میں ان کو سبق سناتا یا نئے سبق کا مطالعہ ان کے پاس بیٹھ کر کرتا تو وہ سوت کی گوندھی ہوئی تین لڑیں ایک لکڑی میں بندھی ہوئی میری تنبیہ کو اپنے پاس رکھ لیتیں۔ اگرچہ وہ خفا تو کئی بار ہوئی ہوں گی، مگر ان سوت کی لڑیوں سے مجھے کبھی مار نہیں پڑی۔"

ایک دفعہ کا ذکر ہے ایسے شخص نے

سید احمد خاں سے بدی کی جس سے انھوں
نے کبھی بہت بڑا سلوک کیا تھا۔ اتفاق
سے وہ تمام ثبوت جس سے اُسے پوری سزا
عدالت سے مل سکتی تھی۔ ان کے ہاتھ آگئے
اور سرسید انتقام لینے پر آمادہ ہوگئے۔ اُن
والدہ نے جب سنا تو کہا۔

"اگر تم اُس کو معاف کردو تو اس
سے عمدہ کوئی کام نہیں اور اگر تم اس کو
بدی کی سزا حاکم سے دلوانی ہے تو نہایت
نادانی ہے کہ اُس قوی اور زبردست احکم
الحاکمین کے چھل سے جو ہر ایک اعمال کی سزا
دینے والا ہے، چھوڑ کر دنیا کے ضعیف فانی
حاکموں کے ہاتھ ڈالنا چاہتے ہو۔"

سرسید کہتے ہیں اس نصیحت کا میرے
دل پر ایسا اثر ہوا کہ اس وقت سے میرے
دل میں کبھی کسی شخص سے انتقام لینے کا
خیال نہیں آیا۔

سرسید ایک اور واقعے کا ذکر کرتے
ہوئے کہتے ہیں:

"جس زمانے میں میری عمر گیارہ بارہ
برس کی تھی، میں نے ایک نوکر کو جو بہت
بڈھا اور پرانا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔
جس وقت میری والدہ کو خبر ہوئی اور
تھوڑی دیر بعد میں گھر گیا تو میری والدہ
نے ناراض ہوکر کہا، اس کو نکال دو جہاں
اس کا جی چاہے چلا جائے، یہ گھر میں
رہنے کے قابل نہیں رہا، چنانچہ ایک
ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور
باہر سڑک پر چھوڑ دیا۔ اسی وقت ایک
دوسری ماما میری خالہ کے گھر سے جو قریب
تھا نکلی اور مجھے میری خالہ کے گھر لے گئی
میری خالہ نے کہا دیکھو تمہاری والدہ تم
سے کس قدر ناراض ہیں اور اس سبب
سے جو تم کو گھر میں رکھے گا اس سے بھی
خفا ہوں گی۔ مگر تم کو میں چھپائے رکھتی
ہوں اور کوٹھے پر کے ایک مکان میں
چھپا دیا۔ تین دن تک میں اس کوٹھے
میں چھپا رہا۔ میری خالہ میرے سامنے
نوکروں اور سہنوں سے کہتی تھیں: "دیکھنا
آپا جی کو خبر نہ ہو کہ یہاں چھپے ہوئے ہیں۔"

تین دن کے بعد میری خالہ میری والدہ کے پاس قصور معاف کرانے کے واسطے لے گئیں۔ انھوں نے کہا، اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے تو میں معاف کروں گی! وہ نوکر ڈیوڑھی میں بلایا گیا، میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے جب تقصیر معاف ہوئی۔"

سرسید اپنے ایک دوست سے ہمیشہ ملنے جایا کرتے لیکن اتفاق سے وہ دوست ناراض ہو گئے اور انھوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ سرسید بدستور ملتے رہے۔ لیکن ایک بعد مدت انھوں نے جانا چھوڑ دیا۔ جب ان کی والدہ کو خبر ہوئی تو انھوں نے سبب دریافت کیا۔ سرسید نے جو بات تھی کہہ دی۔ انھوں نے کہا۔ نہایت افسوس ہے جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے وہی بات تم بھی کرتے ہو۔ جب دوستی ہے تو اسے پورا کرنا چاہیئے۔ تمہارا فرض ہے۔ تم کو بدستور اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے۔ اس سے تم کو کیا دوسرا بھی فرض ادا کرتا ہے یا نہیں؟

عزیز النساء بیگم غریب اور مسکین عورتوں کو ہمیشہ خبر گیری کرتی تھیں اور مکان کا ایک حصہ اُن کے رہنے سہنے اور علاج کے لیے وقف کر رکھا تھا اُن میں سے ایک غریب اور لاوارث بڑھیا زیبن تھی، جو مرتے دم تک اُن کے ساتھ رہی۔ اتفاق سے وہ اور زیبنؔ ایک ہی زمانے میں بیمار ہو گئیں جو دوا حکیم اُن کے لیے تجویز کرتا تھا وہی زیبنؔ کو پلاتی تھیں۔ دونوں کو صحت ہو گئی۔ اس کے بعد حکیم نے ایک قیمتی معجون تجویز کیا جو سرسید تیار کرا کر لائے چونکہ انھیں یقین تھا کہ زیبنؔ کو یہ قیمتی معجون کوئی تیار کر کے نہیں دے گا۔ وہ خفیہ خفیہ زیبنؔ کو کھلاتی رہیں اور خود چکھتی تک نہیں۔ اس سے زیبنؔ کی صحت میں بہت کچھ تسلی ہوئی اور ساتھ ہی اُن کی صحت بھی اچھی ہو گئی۔ چند روز بعد جب سید صاحب نے کہا۔ اس معجون

ے تو آپ کو بہت فائدہ کیا ؟ تو انھوں نے
س کر جواب دیا: "کیا تمہارے نزدیک خدا
یر دوا کے صحت نہیں دیتا؟" سید صاحب
و یہ سن کر بہت تعجب ہوا اور پھر سارا قصہ
علوم ہوا۔

ان کے بڑے بیٹے یعنی سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں کا انتقال عین جوانی میں ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر کوئی ۲۷ سال کی ہوگی جیسا کچھ انھیں رنج ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ سب لوگ گریہ و زاری میں مصروف تھے۔ ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہتے تھے اور زبان سے صرف یہ الفاظ نکلے "خدا کی مرضی!" لیکن بڑا کام جو انھوں نے کیا، وہ یہ تھا کہ اتفاق سے انھی دنوں میں قریب کے عزیزوں میں ایک بیٹی کی شادی تھی۔ سامانِ شادی ہو چکا تھا۔ تاریخ بھی مقرر ہو چکی تھی جب یہ موت واقع ہوئی۔ اس سبب سے حسب دستور ان لوگوں نے اس شادی کو ملتوی کرنا چاہا۔ مگر سید احمد خاں کی والدہ اس انتقال کے تیسرے روز ان کے گھر گئیں اور کہا:

"تمہاری شادی میں آئی ہوں۔ تین دن سے زیادہ ماتم کرنا منع ہے۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ تم شادی ہرگز ملتوی نہ کرو اور جب میں تمہیں اجازت دیتی ہوں تو پھر تمہیں کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟"

وہ کبھی کسی مقصد کے لئے منت یا نیاز نہیں مانتی تھیں اور نہ انھیں فال گنڈے تعویذ پر اعتقاد تھا۔ تاریخوں اور دنوں کی سعادت یا نحوست کی وہ ذرہ برابر پرواہ نہیں کرتی تھیں۔ انھیں خدا پر پورا بھروسہ تھا۔ سید احمد خاں کہتے ہیں:

"میرے ننھیال کے بعض لوگ توہمات میں مبتلا تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب (جن کے وہ معتقد تھے) کے یہاں جو کچھ ہوتا تھا اس پر اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو بعض بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لیے ایک گنڈا دیا کرتے تھے جس میں ایک تعویذ ہوتا تھا۔ اس تعویذ میں ایک حرف یا ہندسہ سفید

سفید مرغ کو ذبح کرکے اُس کے خون سے لکھا جاتا تھا اور جس لڑکے کو پہنایا جاتا تھا بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مُرغی کھانے کی اس کو ممانعت ہوتی تھی۔ سید حامد اور سید محمود میرے دونوں بیٹوں کو بھی اُن کے ننھیال والوں نے وہ گنڈا پہنایا، مگر میری والدہ کو یہ خیال تھا کہ اس گنڈے کے سبب انڈا یا مُرغی نہ کھانا اور یہ سمجھنا کہ اگر کھائیں گے تو کوئی آفت آئے گی، خدا پر ایمان رکھنے کے خلاف ہے۔ وہ دونوں لڑکے جب کبھی اُن کے ساتھ کھانا کھاتے اور کوئی ایسی چیز بھی موجود ہوتی جس میں انڈا پڑا ہو یا مرغی کا سالن یا مرغ پلاؤ ہوتا تو وہ بے تامل ان کو کھلا دیتیں۔"

عزیز النساء بیگم بڑی دوراندیش تھیں۔ سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد خاں نے وزارت سے استعفادے دیا، تو کچھ دنوں بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے معتمد کو ان کے پاس بھیجا اور تیس ہزار دینار سفرخرچ کے لیے پیش کیے اور لاہور بلوایا۔ سب دوستوں اور عزیزوں کی کمال خواہش تھی کہ وہ اسے منظور فرمالیں، خود بھی ان کی کسی قدر مرضی تھی، لیکن ان کی بیٹی یعنی سرسید احمد خاں کی والدہ نے کہا:۔

"آپ کے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے اور اس قدر کہ اپنی بقیہ زندگی نہایت آرام و آسائش سے بسر کرسکتے ہیں۔ خود لاہور جانا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے اختیارات ہاتھ میں لینا اور ہم سب کا انگریزی عملداری میں رہنا خلافِ مصلحت معلوم ہوتا ہے نہ معلوم کیسے اتفاقات اور کیسے انقلابات درپیش آئیں۔ دوسرے آپ کا زمانہ ضعیفی کا ہے اور طبیعت بھی اچھی نہیں رہتی۔ اس لیے یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں رہیں۔"

دبیرالدولہ کے دل پر اس قدر اثر ہوا کہ انھوں نے وہاں جانے سے

کار کر دیا اور سفر خرچ واپس بھیج دیا۔

وہ بڑی ہی نیک اور عابد متقی خاتون تھیں۔ سر سید لکھتے ہیں۔

" انتقال سے پہلے صرف دو وصیتیں ں۔ ایک یہ کہ ان کو بغلی قبر میں جو مسنون ہے دفن کیا جائے۔ دوسری یہ کہ ان کے تے نہ تو کوئی روزہ قضا کا ہے اور نہ کوئی د۔ صرف بیماری کے دنوں کی نمازیں نا ہوئیں۔ اگر زندہ رہتی تو ان کی قضا ی پڑھتی۔ میرے مرنے کے بعد تم اس مد نمازوں کا حساب کر کے کفارے کے گیہوں غریبوں کو بانٹ دینا۔ دوسرے ن انھوں نے قضا کی تو ہم نے ان ی دونوں وصیتیں پوری کر دیں۔" ان ی نصیحتیں نہایت حکیمانہ ہوتی تھیں وہ کہتی تھیں:

" مصیبتیں جو انسانوں پر پڑتی ہیں اس میں کچھ خدائی حکمت ہوتی ہے مگر بندے اس حکمت کو نہیں سمجھتے۔"

انھوں نے ایک مرتبہ سید صاحب کو نصیحت کی:

" جہاں جہاں تم جانا لازمی سمجھتے ہو ایسا لازمی کہ ہر حالت میں جانا ہوگا، تو وہاں تم کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پا پیادہ۔ زمانے کا کچھ اعتبار نہیں ہے کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اس کو نباہ سکو۔"

ایک مرتبہ کہا:

" اگر کسی نے ایک دفعہ تمھارے ساتھ نیکی کی ہو اور پھر برائی کرے یا دو دفعہ نیکی کی ہو اور دو دفعہ برائی کرے تو تمھیں آزردہ نہ ہونا چاہیے، کیونکہ ایک یا دو دفعہ نیکی کرنے والا کیسی ہی برائی کرے اس کی نیکی کے احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔"

لطیفہ: نئی ملازمہ کو ہدایات دیتے ہوئے مالکہ نے کہا: "ہم ناشتہ ٹھیک آٹھ بجے کرتے ہیں۔" نوکرانی بولی: "بہت اچھا بی بی جی لیکن اگر اس وقت تک میری آنکھ نہ کھلے تو میرا انتظار نہ کریں۔"



ابو صفوان

بائیس تیئس سال کی بات ہے کینیڈا جانے کا اتفاق ہوا۔ مقصد اعلیٰ تعلیم تھا۔ یونیورسٹی ہوسٹل میں رہائش ملی۔ میرے کمرے میں ایک اور صاحب تھے۔ نیک، دیندار۔ اس سے پہلے ایک سال امریکہ میں گزار چکے تھے۔ ان کی ذات اور تجربے سے کئی مسائل حل ہوئے۔ میں تنہا ہوتا تو اُلجھ جاتا اور دل برداشتہ ہو کر کینیڈا سے بھاگ اٹھتا ایک وقت آیا کہ تعلیم وغیرہ سے دل اچاٹ ہو گیا اجنبی ماحول اور معاشرت سے ہم آہنگی بے حد دشوار نظر آئی۔ کمرے کے حوصلہ مند ساتھی نے ہمت بندھائی اور گتھیاں سلجھتی گئیں۔ ہوسٹل میں ہم دو ہی مسلمان تھے اور دونوں ہی روایات کے کڑے بندھن میں پابستہ۔ شراب اور خنزیر کے گوشت سے انھیں بھی عداوت اور مجھے بھی دونوں اعلیٰ سوسائٹی کے آداب سے بہرور اور حظ اٹھانے سے محروم۔ پہلی ہی ملاقات میں میرے ساتھی نے میری کمزوریاں مجھ سے اگلوالیں۔ ذہنی طور پر میں شدید پریشانی میں مبتلا تھا کہ اس کٹر عیسائی ملک میں لحم خنزیر سے بچاؤ کی کیا صورت ہوگی؟ کیا اس سے انکار تہذیب کے ماتھے پر بل ڈال دے گا؟ کیا اس سے ہماری 'دقیانوسیت' اور معاشرتی پسماندگی کا مذاق اُڑے گا؟ میرے ساتھی نے کہا ایسی کوئی بات نہیں، عیسائی ہونے کے باوجود یہ لوگ فراخدل ہیں اور کسی شخص کو نا پسندیدہ کام کرنے پر مجبور نہیں کرتے۔ یہاں کے بیش

ہری سبزی خور ہیں جن کی خواہش کا احترام کیا جاتا ہے۔ یہ مسلمان نہیں کہ بکروں کی بجائے کتوں اور رنڈیوں کے بہانے کوؤں کا گوشت کھا کر خوش ہوں۔

میں مطمئن ہو گیا۔ تین دن کے سفر اور لندن کے عارضی قیام نے اعصاب پر بوجھ ڈال رکھا تھا۔ راستے میں بمشکل لحم خنزیر سے بچتا آیا تھا روم میں تو نادانستگی میں کھا ہی جاتا، لیکن قدرت نے بروقت متنبہ کر دیا۔ ہوائی کراچی سے پی اوا ے سی کا طیارہ آتا تو روم جا سکا۔ معلوم ہوا طیارے میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ جس کی اصلاح میں کچھ وقت لگے گا سطے یہ پایا کہ اس دوران میں مسافروں کو روم کے تاریخی مقامات کی سیر کرا دی جائے۔ کمپنی نے سب کو اپنی بس میں لادا۔ ایک گائیڈ ساتھ کیا اور چلتے ہی چلتے سیر ہونے لگی۔ راستے میں کہیں اترنے کی اجازت نہ تھی۔ بس میں ہر مسافر کو ایک ٹوکری تھمادی گئی جس میں لنچ تھا۔ نیپکن اٹھا کر دیکھا تو اس میں ایک خوشنما سیب (جس کی لذت ذہن آج تک نہیں بھولا) کیک کا آٹھواں حصہ شراب کی ننھی منی بوتل اور پلاسٹک کے لفافے میں چار سینڈوچ۔ شراب کی بوتل ٹوکری میں دھری رہی۔ سینڈوچ کا لفافہ کھولنے لگا تو اوپر ہی کے سینڈوچ سے عجیب قسم کا سرخ رنگ کا گوشت جھانکتا نظر آیا۔ سور کے گوشت سے کتابی تعارف غیر ملکی رسالوں کے ذریعہ ہو چکا تھا۔ شکل سی پہچانی۔ لفافہ بند ہی رہنے دیا۔ لنچ میں اکتفا کیک پیس اور سیب پر کیا۔ ساتھ کی سیٹ پر ایک بوڑھی میم میری ٹوکری کو مسلسل گھور رہی تھی۔ میں کیک اور سیب کھا چکا تو میم نے پہلی اور آخری بار مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

"نوجوان! تم شراب اور سینڈوچ چھوڑے دیتے ہو؟ روم کی شراب تو لاجواب ہے، برسوں ہونٹ چاٹتے رہو گے!"

مجھے ہونٹ چاٹنے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ میم سے صرف اتنا کہا:

"مجھے ان چیزوں سے پرہیز ہے!"

اور ٹوکری فرش پر رکھنے لگا، تو اچانک بے تکلفی سے میم نے میرے ہاتھوں سے

چھین لی: "تمہیں پرہیز ہے، مجھے تو نہیں، لاؤ میں استعمال کروں گی۔"

دوسرے دن صبح کے ناشتے پر میں اور میرا ساتھی ہوسٹل کے ڈائننگ ہال میں پہنچے۔ صاف ستھرا، کشادہ، سیلف سروس۔ پہلے ٹرے اٹھائیے، پھر دودھ کا گلاس، پھر توس مکھن وغیرہ اور بعد میں کاؤنٹر سے انڈے "بیکن" یا کوئی اور بدل۔ دودھ، توس، مکھن تک تو معاملہ جائز حدود میں تھا تلے ہوئے انڈے اور بیکن سے طبیعت متعفن ہو گئی میں نے خواجہ خضر کو کہنی ماری اور اشاروں ہی اشاروں میں بچاؤ کی ترکیب پوچھی میرے ساتھی نے خاتون نگران خوراک سے مخاطب ہو کر کہا: "معاف کیجئے، ہم دونوں مسلمان ہیں، اس لیے بیکن وغیرہ، نہیں کھا سکتے ہیں۔"

خدا اس خاتون کو خوش رکھے اس نے کوئی سوال جواب نہیں کیا، تیوری نہیں چڑھائی رعونت سے انکار نہیں کیا، چپکے سے بیکن کی پلیٹ ہٹالی اور کہا:

"آپ کو ابلے ہوئے انڈے مل جائینگے آئندہ بھی آپ کو شکایت نہ ہوگی میں نوٹ کروا دوں گی۔" چنانچہ سال بھر کے قیام میں واقعی ہمیں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔

ہمارے اسلام کا چرچا ہوسٹل میں پھیل گیا۔ ہوسٹل میں واقفیت تو سبھی سے تھی، لیکن چند عیسائی طلبہ دوست بن گئے انہیں اسلام اور مسلمانوں کا احوال جاننے سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ بعض عیسائیت کی تنگ نظری اور لایعنی باتوں (مثلاً حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا ماننا) سے بیزار تھے۔ ایک دو صاحب ایسے بھی تھے جو ہمیں مشرف بعیسائیت فرمانے کے درپے ہو گئے کہ ہم لوگ جو اتفاق سے کینیڈا آگئے ہیں تو بچ کر نہ جائیں، وہ روزانہ ہمیں تبلیغ فرماتے، لیکن یہاں رنگ خام نہ تھا۔ جوابی تبلیغ سے ان کا اپنا ایمان متزلزل ہونے لگا۔ ایک بات جو ہم نے نوٹ کی اور جس سے ایمان کو توانائی ملی یہ تھی کہ عموماً یہاں کے لوگ کردار کی پختگی کو سراہتے اور پسند کرتے۔ بالخصوص اس بات کی تعریف کرتے کہ ہم شراب وغیرہ سے اس لیے محترز ہیں

کہ اسلام میں حرام ہے اور اس کے برعکس کوئی مسلمان ان کی معاشرت کا جزو بننے کی خاطر شراب وغیرہ استعمال کرتا تو اُسے ناپسند کرتے اور برملا کہتے تم کیسے مسلمان ہو کر حرام چیزوں کو جائز سمجھتے ہو؟

ہمارا ایک دوست مارٹن، پادری بننے کی تربیت حاصل کر رہا تھا اور اتوار کے اتوار مضافات کے کسی نہ کسی گرجے میں وعظ کرتا ایک دن اس نے مجھے بھی دعوت دے ڈالی کہ مانسٹریال سے تیس چالیس میل دور ایک قصبے میں جاتا ہے گیارہ سے ایک بجے تک عبادت ہوگی اور پھر مستقل پادری کے گھر پہنچ۔ میں تیار ہو گیا۔ مختصر سا سفر تھا۔ جلد کٹ گیا۔ اسٹیشن سے سیدھے گرجا گھر پہنچے، مارٹن نے وعظ کیا۔ عبادت ہوئی اور ہم لوگ مقامی پادری صاحب کے گھر پہنچ گئے۔

راستے میں لے مارٹن سے کہا:

"تمہیں معلوم ہے میں سور کا گوشت نہیں کھاتا، اس لیے اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ یہ خوراک میرے سامنے نہ آئے۔"

مارٹن نے کہا: "اتوار کو پادری صاحب کے گھر پر عموماً مرغی وغیرہ پکتی ہے، اس لیے بے فکر رہو۔"

ہم چار آدمی کھانے پر بیٹھ گئے۔ میں اور مارٹن آمنے سامنے اور بوڑھا پادری اور اس کی بیوی آمنے سامنے۔ دعا اور بسم اللہ کے بعد کھانا آیا، پلیٹ میں دو آلو اور چانپ کی دو عمدہ بوٹیاں۔ میں ان کے بارے میں مخمصے میں پڑ گیا، یہ مرغی تو نہیں، خدا جانے کیا چیز ہے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں مارٹن کو اشارہ کیا۔ اس نے بڑے تذبذب سے کھنکھار کر مسز پادری سے کہا: "معاف کیجیے، میرے دوست مسلمان ہیں، اس لیے سور کا گوشت نہیں کھاتے"

یہ سنتے ہی مسز پادری نے "اوہ!" کہہ کر میرے سامنے سے پلیٹ اُچک لی اور معذرت کے ساتھ صرف دو چار اُبلے ہوئے آلو لے آئی کہ گھر میں اور کچھ نہیں۔ میں نے کہا یہ بھی خدا کی نعمت ہے۔ بہت بھوکا تو نہیں رہوں گا، لیکن بوڑھا پادری ایک دم گرم ہو گیا! "یہ کیسا مذہب ہے؟ یہ کھاؤ، وہ نہ کھاؤ

ہونہہ!" میں نے مسکرا کر طرح دی، لیکن پادری صاحب گرم سے گرم تر ہو گئے۔ مسز پادری نے بے حد کوشش کی کہ محفل کا رنگ نہ بگڑے لیکن توبہ کیجئے، پادری صاحب عیسائیت کا پورا پرچار کر رہے تھے اور بے چارے اسلام کو مجھ جیسے گنہگار انسان سے نسبت دے کر بدنام۔ جب ان کی تندی حد سے بڑھ گئی اور آلو میرے حلق میں پھنسنے لگے تو میں نے پانی کا گھونٹ بھر کر کہا:

"جناب! کیا عیسائیت میں کسی کھانے وغیرہ پر پابندی نہیں؟"

اکڑ کر کہنے لگے! "عیسائیت انسانوں کا مذہب ہے، جانوروں کا نہیں، ہمارے مذہب میں بے ہودہ پابندیاں نہیں!"

میں نے بے حد ادب اور لجاجت سے گزارش کی! "جناب! اگر آپ کے ہاں کوئی پابندی نہیں، تو از راہ کرم یہ فرمایئے کہ آپ کتے کا گوشت کیوں نہیں کھاتے؟" میرا جواب مناظرے کے انداز میں تھا۔ لیکن پادری صاحب کی فصاحت کو بریک لگ گئی، او جیسے ہوتے ہوئے کہنے لگے: "بھلا سور اور کتے کے گوشت کا کیا مقابلہ؟ ہماری عقل نے بتایا ہے کہ کتے کا گوشت انسانی خوراک بننے کے قابل نہیں!"

میں نے عرض کیا "جناب! آپ کی عقل تو اس قابل ہے کہ کتے کا گوشت رد کر دے، لیکن کیا آپ کے نزدیک خدا کی عقل آپ کی عقل سے کم تر ہے کہ (نعوذ باللہ) یہ نہ بتا سکے کون سی غذا انسان کے لیے مفید ہے اور کون سی مضر!" الحمد للہ کہ پادری صاحب اس کے فوراً بعد تلملاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور یوں ہم نے اسلام کی ایک بازی سر کر لی۔

کینیڈا سے واپسی ہوئی۔ سہ پہر کو جہاز مانٹریال سے اڑا، ساری رات بحر اوقیانوس کا سفر کیا اور صبح اسکاٹ لینڈ کے ہوائی اڈے پر لیسٹ وِک (PRESTWICK) جا اترے۔ جہاز کمپنی نے اعلان کیا ناشتہ اڈے پر ہوگا۔ میں بھی مسافروں کے ساتھ کھانے کے

کمرے میں پہنچا آنے اور جانے والے مسافروں کی بھیڑ تھی۔ کونے میں ایک خالی میز نظر آئی جس پر صرف دو آدمی بیٹھ سکتے تھے میں نے جلدی سے ایک کرسی سنبھالی۔ ویٹرس آرڈر لینے آئی ہی تھی کہ پچپن ساٹھ سال کے ایک معزز صاحب لپکتے ہوئے آئے، مجھ سے پوچھا: "جگہ خالی ہے؟" میں نے کہا "ہاں" کہنے لگے "آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں یہاں بیٹھ جاؤں، اور کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی!" میں نے کہا "شوق سے تشریف رکھئے!" وہ بیٹھ گئے۔ ویٹرس نے ناشتے کے بارے میں پوچھا میں نے کہا "چائے، توس، مکھن، جام، اُبلا ہوا انڈا" دوسرے صاحب سے پوچھا انھوں نے بھی کہا "بس یہی کچھ!" جب تک ناشتہ آیا، ہم خاموش رہے۔ ناشتہ لگ گیا تو میرے معمر رفیق طعام نے کہا:

"معاف کرنا نوجوان! میں تعارف کے بغیر تم سے مخاطب ہو رہا ہوں! لیکن کیا میں ایک ذاتی بات پوچھ سکتا ہوں؟" میں نے مسکرا کر کہا: "ضرور پوچھئے"

اس پر بزرگ نے کہا "میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم ناشتے میں صرف انڈے کیوں کھا رہے ہو؟"

"جی! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" میں نے حیرت سے کہا اور دل میں سوچا کس خبطی سے پالا پڑ گیا ہے اور پاگل کتے شرابی اور دیوانے سے میری جان نکلتی ہے

"میرا مطلب ہے ہمارے ہاں عام طور پر ناشتے میں انڈے کے ساتھ بیکن ضرور کھایا جاتا ہے، میں دیکھ رہا ہوں تم یہ نہیں کھا رہے ہو۔ کیوں؟"

شاید میرا ہم سفر مجھے میکسیکو یا اس سے جنوب کے کسی ملک کا عیسائی باشندہ تصور کر رہا تھا! بہرحال میں نے بڑے ادب سے کہا۔

"حضور! گستاخی نہ ہو تو یہی سوال میں آپ سے کر سکتا ہوں؟ آپ بھی تو بیکن نہیں کھا رہے؟"

"یہ منصفی نہیں، میں نے پہلے پوچھا تھا" بزرگ نے کہا۔

"بہتر!" میں نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔" میں بیکن اس لیے نہیں کھاتا کہ میں مسلمان ہوں۔"

"کیا تمہارے مذہب میں ممنوع ہے؟"

"جی ہاں!"

یہ سنتے ہی بزرگ ہم سفر ایک دم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جوش سے میز پر دو تین بار مکا مارا اور کہا" خدا کی قسم! تمہارا مذہب سچا ہے تمہارا مذہب سچا ہے، تمہارا مذہب سچا ہے۔"

اُن کے طرزِ عمل سے پہلے ہی سراسیمہ تھا، اس بات نے اور پریشان کر دیا۔ ایک انگریز دوسرے وحشت زدہ! میں نے اپنی وحشت ناکام مسکراہٹ کے دامن میں چھپاتے ہوئے پوچھا۔" مجھے خوشی ہے آپ میرے دین کی حقانیت کے قائل ہیں لیکن اگر بُرا نہ مانیں تو یہ بھی فرمادیں آپ اتنی جلدی اور آسانی سے کس طرح مان گئے؟"

معمر ہم سفر نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا" یہ طویل داستان ہے لیکن مختصر طور پر یہ بتاتا ہوں کہ میں پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہوں۔ گزشتہ پندرہ برس سے میں سرطان پر ریسرچ کر رہا ہوں اور اب بھی اسی سلسلے میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے سری لنکا جا رہا ہوں۔ میرے تجربے اور تحقیق نے واضح طور پر ثابت کر دیا کہ سور کا گوشت انسانی صحت کے لیے مضر ہے اس میں ایسے جراثیم ہیں جو بالآخر کینسر پیدا کرتے ہیں۔ جب یہ بات متحقق ہو گئی تو میں نے اسی دن سے سور کا گوشت ترک کر دیا۔ سائنس داں ہوں، اس لیے تاریخ اور ادبیات سے آشنا نہیں۔ اسلام کے بارے میں میرا علم بالکل صفر ہے۔ صرف اتنا جانتا ہوں اس نام کا کوئی مذہب ہے جس کے ماننے والے دنیا بھر میں ہیں اور شاید یہ بھی قبائلی طرز کا کوئی طریقِ عبادت ہے۔ آج تم نے غیر ارادی طور پر یہ بتایا کہ تمہارے مذہب میں سور کا گوشت حرام ہے، نہ صرف میری تحقیق کی صحت کا اعلان کیا ہے بلکہ مجھ پر یہ بھی روشن کر دیا ہے کہ اسلام یقیناً خداوندی پیغام ہے۔

زمانے کی گواہی

تہذیب و شائستگی کے مرکز میں

ہندوستان کے دارالمملکت اور تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے ایک ممتاز شہر دلی میں [illegible]ء میں ۲½ سو عورتوں کی آگ سے جل مرنے کی وجہ سے موت واقع ہوئی۔ ہر دس ہزار شہریوں میں سے ایک شہری خاتون کا اس طرح موت کا نشانہ بن جانا اور سب لوگوں کے لیے باعث تشویش ہو یا نہ ہو مگر یہاں کے لفٹنٹ گورنر مسٹر کرشن چندر نے (جو ایمرجنسی کے بعد رسوائی کی تاب نہ لاکر خودکشی کر چکے ہیں) ان واقعات کو خودکشی کے بجائے قتل کی وارداتیں قرار دیا اور یہ کوشش کی کہ قانونی اور سماجی سطح پر ان کی اصلاح ہو۔

اسی زمانے کی یادگار کے طور پر ایک پہلا کمیٹی بھی بنائی گئی تھی جس کی سکریٹری مسز پرمیلا ڈنڈوتے نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ خودکشی کی جو رپورٹیں پولیس میں کی گئی تھیں ان میں سے بیشتر جہیز کی وارداتیں تھیں۔ یہ بے بس عورتیں شوہروں اور سسرال والوں کی فرمائش پر سونا یا دوسرا قیمتی سامان اپنے میکے سے نہیں لاسکی تھیں اور روزمرہ کے طعنوں سے بچنے کے لیے انھوں نے موت ہی کے دامن میں پناہ لینے میں اپنی عافیت سمجھی۔

جہیز کی خاطر خودکشیاں

جہیز کی انتہاپسندی کو روکنے کے لیے حکومت نے بلاشبہ ایک قانون بھی بنایا ہے

جس کی رو سے اس کی خلاف ورزی کرنے والوں
کو ۲ ماہ قید با مشقت اور دو ہزار روپیہ جرمانے
تک کی سزا دی جا سکتی ہے لیکن سیمبی کی رائے
میں یہ سزا کم ہے۔ اس کی نظر میں اس کو بڑھایا
جانا چاہیے۔ سیمبی نے جہیز کو شمالی ہند اور اس
میں بھی متوسط طبقے کی ایک لعنت قرار دیا
ہے۔ غریب عوام میں اس طرح کا لین دین
کم ہے۔ رہا خوش حال طبقہ تو اس کے لیے
داماد کی ضروریات پوری کرنا ایک تو مشکل
نہیں۔ دوسرے اپنے ہی معیار کے لوگوں
میں شادی بیاہ کرنے سے اس طرح کے
تقاضے ابھر کر سامنے بھی نہیں آنے پاتے
اصل مصیبت درمیانی طبقے کی ہے جو خوش
حال افراد کی نقالی میں اپنا معیار بلند کرتے
چلے جا رہے ہیں اور اس مصنوعی سطح کو قائم
رکھنے کے لیے اس نے دوسری ناجائز آمدنیوں
میں ایک "مد" سسرال پر دباؤ ڈال کر
وہاں سے سرمایہ حاصل کرنا بھی شامل کر لیا ہے۔
مسلم سماج کا جذبہ رحمیت۔ خدا کا بہت بڑا
فضل و کرم ہے

کہ [illegible] کمزوریوں کے باوجود
مسلمانوں [illegible] بہ خیریت موجود ہے
ان کا ایک [illegible] بیویوں سے کچھ وصول کرنے
کی بجائے ان کے حقوق کی ادائیگی کا زیادہ
خیال رکھتے ہیں۔ ہیلا سیمبی نے دہلی کے
واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ جو
عورتیں کافی جہیز نہیں لاتیں خواہ وہ لکچرار
ہوں یا پروفیسر یا اچھی تعلیم یافتہ ان کے
ساتھ گاؤں کی ان پڑھ عورتوں جیسا توہین
آمیز سلوک ہوتا ہے اور اگر وہ اس بدسلوکی
کی تاب نہ لا سکیں اور اپنے گھروں پر بیٹھ
جائیں تو ان کے شوہر وہاں بھی ان کو برابر
ستانے کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ سیمبی کا
خیال ہے کہ اس کے کارکن اگر کسی شوہر
اور اس کے کہنے والوں کو کچھ سمجھانے کی
کوشش کرتے ہیں تو بھی کوئی کامیابی
نہیں ہوتی۔ ہاں پولیس کے خوف سے
ضرور لوگ اثر قبول کر لیتے ہیں لیکن پولس
کی دلچسپیاں ان معاملات میں محدود ہیں۔
سروجنی نگر (دہلی) کی ایک خاتون کے

یہاں ولادت کے تین ماہ کے بعد اس کی سسرال والوں نے کچھ رقم طلب کی اور مزید دباؤ ڈالنے کے لیے اس سے اس کے دودھ پیتے بچے کو الگ کر لیا۔ پھر اسے ایک کوٹھری میں بھی بند کر دیا۔ اس واقعہ کی اطلاع جب میکے والوں کو پہنچی تو انھوں نے سسرال والوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کا خاطر خواہ اثر نہیں پڑا۔ ہاں جب پولیس کی مداخلت کا ڈر سامنے آیا تو اس کا بچہ بھی اسے واپس کر دیا گیا اور اسے قید خانے سے بھی رہائی مل گئی۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے واقعات سے میتی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس کی اصلاح کے لیے پولیس کا ہی سہارا لینے کی ضرورت ہے۔

مسلمانانِ ہند عرصہ دراز سے نظم وضبط سے محروم ہیں لیکن ان کے خاندانوں میں اب بھی بحمداللہ یہ احساس موجود ہے کہ وہ قانون کے دباؤ کے بجائے اور سماج کے دباؤ کا اثر زیادہ قبول کرتے ہیں۔ عورتوں اور مردوں کے حقوق کا جو شعور ان کے تمام افراد میں رچا بسا ہوا ہے اس پر اگر کبھی کسی وقت حالات کے تحت کچھ رنجش بھی ہو جائے تو بھی معمولی سی بدمزگی کے بعد انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور ان کی معاشرتی زندگی معمول پر واپس آجاتی ہے۔ مسلمانوں کے یہ خاندان ملک کے ہندو خاندانوں کے شانہ بشانہ زندگی بسر کر رہے ہیں اور شاید ملک کی اکثریت کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنے پڑوس کے ان روشن چراغوں سے ہدایت حاصل کرنے کی بجائے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ (دعوت دہلی)

جہیز وسوال شوہر کے لئے حلال حرام؟

ہمارے معاشرے کا ایک اہم سوال

(ابن مجید)

ایک جگہ روح پرور مذہبی کانفرنس منعقد تھی۔ سربرآوردہ مقررین اسٹیج کی زینت بنے بیٹھے تھے۔ سامعین کی تعداد بھی قابلِ لحاظ تھی۔ اجتماع گاہ سے تھوڑی دوری پر اسلامی نمائش (Islamic Exhibition) لگی ہوئی تھی۔ جہاں ایک گائیڈ مولی تہول والی کا غذول پر خوشنما بنے ہوئے نقشوں، جس میں معاشرہ میں پھیلے ہوئے ان گنت خرابیوں اور اس جانب نشان دہی اور اس کی اصلاح کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی پیرا انداز مصلحانہ سمجھا رہا تھا۔ کچھ حضرات یہاں بھی موجود تھے۔ اور اصلاح معاشرہ کے اس انوکھے انداز کو بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ ان ہی نقشوں میں سماج کا ایک اہم مسئلہ اور حلیہ (جہیز) کی مخالفت میں ایک ڈیزائن اور اس کی قربت حاصل کئے ہوئے چند کلمات تھے۔ اس ڈیزائن کے مفہوم ومطالب اتنے واضح تھے کہ ناظرین ایک نظر دیکھتے ہی بنا استفسار کئے سب کچھ سمجھ جاتے تھے کیا خوب ہے۔ ترازو کے ایک پلڑے پر سائیکل ریڈیو، گھڑی اور نوٹوں کے گٹھے بے ترتیبی سے رکھے ہوئے ہیں۔ دوسری جانب دولہا میاں براجمان ہیں — نیچے ٹیپ ریکارڈر ٹیلیویژن وغیرہ ہیں۔

ستم در ستم دیکھئے کہ دولہا میاں کا پلڑا پھر بھی بھاری ہے اور مزید قیمتی چیزوں کی فرمائش کر رہے ہیں اور سب سے اوپر جلی حروف ...

لکھا ہوا ہے۔ چند لوگ اس ناگفتہ بہ نقشہ سے متاثر ہو کر سرگوشی کر رہے ہیں کہ واقعی آج شادی کے پردہ میں سودا ہو رہا ہے جس میں چند ہزار روپیوں کی چیزوں کے عوض دولہا میاں کی نیلامی ہو رہی ہے۔ اگر صرف اس پہلو پر غور کیا جائے تو اس سے زیادہ تضحیک آمیز باتیں اور کیا ہو سکتی ہیں کسی نوجوان کی شان میں؟

دولہا کو عام طور سے نوشہ بھی کہا جاتا ہے جس کے لفظی معنی "نیا بادشاہ" کے ہوتے ہیں تو کیا بادشاہوں کے تذکرے میں کبھی یہ سننے کو ملا کہ بادشاہ بھی دوسروں کے سامنے دست دراز کیا کرتے ہیں؟ جب کہ شانِ بادشاہت یہ رہی ہے کہ بادشاہ ہر وقت لوگوں کو انعام و اکرام سے نوازتے رہتے تھے۔

شادی بیاہ کے موقعوں پر لین دین کا اعلیٰ پیمانے پر اہتمام کرنا نمود و نمائش کے زمرے میں آتا ہے اور یہ بھی باتیں تباہی و بربادی کی جانب لے جانے والی ہیں۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس نمائش نے ہمارے معاشرہ میں چین و سکون کی جگہ اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی ہے جب کہ آج سے تقریباً چودہ سو سال قبل ہادیٔ اعظم رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو راہ منتخب فرمائی تھی بلاشبہ اس کی افادیت میں کوئی کلام نہیں جو آج بھی اظہر من الشمس ہے۔

لہٰذا اس بنا پر ملت کے باشعور سلیم الطبع اور سنجیدہ فکر نوجوان دوستوں سے تین سوالات بلا تکلف کرنا چاہوں گا کہ آیا کہ دولہا اپنی نیلامی جیسے طوق کو اتار پھینکنے کے لیے تیار ہیں؟ نوشہ جیسے خوبصورت لفظ کے لغوی معنی کو کیا برقرار رکھنا نہیں چاہیں گے؟ انسانیت کی فلاح و نجات کی خاطر محسنِ انسانیت ؐ نے جو اصولِ حیات متعین کیے تھے یا جس راستے کا انتخاب فرمایا تھا اسے فلاح کا ضامن ہونے کا صرف زبانی ورد کے بجائے عملاً اس کی کوشش نہ کی جائے؟؟

اگر ان سبھوں کے جوابات ہمیں اثبات میں ملتے ہیں تو یہ بڑی خوش آئند بات

ہوں گی کیونکہ آج ہماری سوسائٹی میں امن وسکون کا خون ہو چکا ہے۔

جہیز جو محض عیب پوشی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ حقیقت میں جہیز کے معنی اب مثلاً تجارت یا کاروبار ہے۔ سوال یہ ہوتا ہے جہیز یا شادی کے نام پر جو تجارت کی جا رہی ہے حلال ہے یا حرام؟ اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ جو اس طرح کی شادیوں سے زن وشوہر کی ملاقات ہوتی ہے پھر بچے جنم لیتے ہیں ان کو کس زمرے میں رکھا جا سکتا ہے؟ یورپ میں حرامی بچوں کو دستور کے ذریعہ جائز اور حلال قرار دیا گیا ہے۔ لیکن کیا اللہ اپنے دستور قرآنی کے ذریعہ اس طرح کے بچوں کو جائز مقام دینے کے لیے تیار ہے؟ (تحریک ملت کلکتہ)

(نوٹ: ابن حمید صاحب نے یہ سوال اٹھایا ہے۔ علماء کرام سے گزارش ہے کہ اس سوال پر غور فرمائیں حجاب کے صفحات ان کے افکار عالیہ کے منتظر رہیں گے۔

کہانیوں ہی کہانیوں میں

حکمت کی باتیں

مراسلت ... ...

...سے ... انسانی

کہتے ہیں عباسی خلیفہ امیر مہدی کے
...ہد میں بڑا زبردست قحط پڑا۔ آدمی آدمی کو
...ماتا، غریبوں کا جی نکلا جاتا تو تحمل اور صبر و
...قناعت کا قدم ڈگمگاتا۔ لخت دل اور خون جگر
...مفلسوں کا کھانا پینا تھا۔ خلیفہ مہدی نے ہر چند
...فی سبیل اللہ خزانے کا منہ کھلوا اور غلے کے
...ڈھیر کے ڈھیر خیرات کروائے لیکن قحط کی
...وبا کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی چلی گئی مخلوق
...خدا پر عذاب دیکھ کر خلیفہ کو اپنی جان شیریں
...بھی تلخ معلوم ہوتی۔ پیٹ بھر کر نہ کھاتا نہ
...چین سے بچھونے پر سوتا۔

ایک روز شب کو اپنے بستر پر حیرت
اور حسرت کی تصویر بنا لیٹا تھا اور خادم ہاتھ

پاؤں ... ... ہے
کوئی کہانی کہہ تاکہ دل بہلے۔

خادم نے جواب دیا: "غلام کی کہانی
خلیفہ معظم کی سماعت کے لائق کہاں، بھلا
حقیر چیونٹی سلیمان کی کیا قدر کرے" خلیفہ
مہدی نے کہا: "کچھ مضائقہ نہیں، جیسی
تجھے یاد ہو بیان کر۔" یہ حکم پاکر خادم کہنے
لگا: "اے امیرالمومنین کسی جنگل میں ایک
شیر ژیاں رہتا تھا۔ سب درندے چرندے
اس جنگل کے شیر کی خدمت میں حاضر
رہتے جو شکار یہ شیر کرتا اس کے بچے کھچے
سے اپنا پیٹ بھی بھر لیتے۔ ایک دن
لومڑی نے اس شیر سے کہا: "تو ہمارا بادشاہ
ہے اور ہم تیری رعیت۔ بادشاہ پر

رعیت کی رعایت واجب اور لازم ہے مجھے ایک سفر درپیش ہے، جانا بہت ضروری ہے اس کے سوا چارہ نہیں۔ اب مشکل یہ درپیش ہے کہ میں اپنے ننھے بچے کو کہاں چھوڑوں؟ کسے سونپوں؟ چاہتی ہوں وہ بچہ تیرے سپرد کر دوں تاکہ تو اسے اپنی حفاظت اور پناہ میں رکھے۔ کسی دشمن کی نگاہ اس تک پہنچنے نہ پائے۔"

شیر نے لومڑی کی یہ درخواست قبول کی اور وہ اپنا بچہ اس کے حوالے کر کے کسی طرف چلی گئی۔ شیر نے لومڑی کے بچے کو پیٹھ پہ بٹھا لیا تاکہ جنگل کا کوئی جانور اسے گزند نہ پہنچائے۔ ناگاہ ایک بھوکا عقاب اُدھر سے پرواز کرتا ہوا گزرا۔ اس کی نگاہ لومڑی کے بچے پر پڑی اسی وقت غوطہ لگایا اور شیر کی پیٹھ سے جھپٹا مار، بچے کو اپنے پنجوں میں داب لے اُڑا۔ کچھ عرصے بعد لومڑی سفر سے واپس آئی، بچے کو نہ دیکھا، شیر سے بولی: میرا بچہ کہاں ہے؟ کیا تو نے اس کی حفاظت کا ذمہ نہ لیا تھا؟"

شیر نے اقرار کیا اور جواب دیا کہ اسے ایک عقاب اٹھا کر لے گیا ہے۔ یہ سن کر لومڑی بہت روئی اور کہنے لگی کہ میں نے اپنا بچہ تیری حفاظت اور پناہ میں دیا تھا اور تو نے اسے ضائع کر دیا۔ شیر نے کہا "بے شک میں نے یہ ذمہ لیا تھا کہ جنگل کا کوئی جانور یا زمین پر رہنے والا کوئی درندہ اس بچے کو نقصان نہ پہنچائے گا، مگر جو بلائے ناگہانی آسمان کی طرف سے نازل ہو، تو میں کیا کروں؟"

خلیفہ مہدی نے یہ کہانی یہیں تک سنی تھی کہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور رو رو کر جناب کبریائی میں التجا کرنے لگا کہ الٰہی جو کچھ فتنہ و فساد زمین سے اٹھے۔ اسے تو تدبیر سے رفع کروں لیکن قضائے آسمانی اور قدرت یزدانی میں اس ناچیز بندے سے کیا ہو سکتا ہے؟ آخر مہدی کی گریہ وزاری بارگاہ ایزدی میں قبول ہوئی اور چند روز میں وہ قحط خدا کے فضل و کرم سے دور ہوا اور لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

خدا مہربان تو کل مہربان

حجاج بن یوسف کے جلاد غنیسہ کا بیان ہے کہ ایک دن حجاج باغیوں کے ایک گروہ کو سزائیں دے رہا تھا۔ میرے ہاتھ سے اس نے ان سب کی گردنیں قلم کرائیں۔ ابھی ایک شخص کی گردن اڑانی باقی تھی کہ موذن نے اذان دی تب حجاج نے مجھ سے کہا: اب وقت تنگ ہو گیا۔ اس شخص کو کل سزا دی جائے گی۔ تو اسے اپنے پاس رکھو۔ میں اس شخص کو اپنے ساتھ لے کر چلا۔ راہ میں وہ شخص مجھ سے کہنے لگا: "اے غنیسہ، میں تجھ سے نیکی کی توقع رکھتا ہوں۔" میں نے جواب دیا: "خدا توفیق دے تو نیکی سے دریغ نہ کروں گا۔" وہ بولا میں بے گناہ ہوں۔ جس باغی گروہ کو سزا دی گئی ہے میں اس میں شریک نہ تھا مجھے حجاج کے سپاہیوں نے ناحق گرفتار کیا لیکن مجھے خدا سے اب بھی قوی امید ہے کہ مجھے اس عذاب سے بچا لے گا۔ اگر تو مجھ پر اعتماد کرے اور رات کی رات مجھے چھوڑ دے تو میں گھر جا کر اپنے بال بچوں کو وصیت کروں اور ان سے رخصت ہو کر پھر یہاں حاضر ہو جاؤں۔" اس کی یہ بات سن کر میں مسکرایا اور کچھ جواب نہ دیا تب اس نے دوبارہ پُر اثر الفاظ میں اپنی بات دہرائی۔ میرے دل میں آیا کہ اسے چھوڑ دوں خدا نے چاہا تو یہ کل ضرور واپس آجائے گا۔ آخر اس سے قول و قرار لے کر اور خدا کو درمیان دے کر میں نے رہا کر دیا۔ جب وہ چلا گیا۔ میں پچھتایا کہ ارے غضب ہو گیا یہ کیا کیا؟ وہ اپنی جان کے ڈر سے اب ادھر منہ نہ کرے گا اور اس کے عوض حجاج مجھے مروا ڈالے گا۔ اسی اندیشے سے لرزاں و ترساں گھر آیا اور اپنی بیوی سے سارا احوال کہا۔ وہ بھی سن کر رونے دھونے لگی۔ اور مجھے لعنت ملامت کی کہ یہ کیا تیری عقل ماری گئی تھی۔ جو دوسرے کی بلا اپنی جان پر لی؟

غرض وہ رات جیسے تیسے میں نے آنکھوں [illegible]

بھوک پیاس، طرح طرح کے خدشوں اور وہم میں شب تمام کی۔ اِدھر صبح ہوئی، اُدھر میں نے جانا کہ گویا قیامت ٹوٹی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہی شخص روشن ضمیر تڑکے تڑکے آموجود ہوا۔ میں نے متعجب ہو کر اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ "اے جواں مرد، یہ کیا ماجرا ہے؟ تجھے اپنی جان کی پروا نہیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "جو خدا کو حاضر و ناظر جانتا ہے ہرگز وعدہ خلافی نہ کرے گا۔ اگر یہ سارا جہان ڈگمگا جائے وہ ثابت قدم رہیگا"

غرض میری جان میں جان آئی اور اسے حجاج کے روبرو لے گیا، جو کچھ احوال بیتا تھا، سچ سچ کہہ سنایا۔ حجاج نے کہا آفرین ہے اس شخص پر۔ اے فقیہ، یہ شخص میں نے تجھے بخشا ۔ اسی وقت میں نے اسے آزاد کیا۔ اس بندۂ خدا نے کچھ شکر گذاری نہ کی۔ اپنا راستہ پکڑا۔ مجھے خیال گذرا یہ کہیں دیوانہ تو نہیں۔ دوسرے دن وہ یکایک آیا اور کہنے لگا۔ میں نے کل اس لیے تیرا شکر ادا نہ کیا کہ شکر الٰہی کے شریک نہ ہو جائے۔ کل میں سارا دن فقط شکر الٰہی میں مشغول رہا کہ جو کچھ ہوا خدا کی مدد سے ہوا۔ آج تیری خدمت میں آیا ہوں کہ حق شناسی بجا لاؤں۔ میں نے کہا، سچ ہے، خدا مہربان تو کل مہربان۔

عقل، علم اور شراب

خلیفہ مامون الرشید کا دستور تھا کہ ہفتے میں ایک روز عالموں کو اپنی مجلس میں جمع کرتا اور نت نئے مشکل مسائل ان سے پوچھتا۔ ایک روز ایسی ہی مجلس جمی ہوئی تھی کہ ایک فقیہ بے بدل، علم کا بحر ناپید کنار پھٹے پرانے کپڑے بدن پر لگائے وہاں آیا اور سب سے پچھلی صف میں بیٹھ گیا۔ مامون الرشید نے ایک مشکل مسئلہ علماء کے سامنے رکھا۔ ہر ایک نے اپنے علم اور بصیرت کے مطابق جواب دیا، لیکن خلیفہ کی کسی جواب سے تسلی نہ ہوئی۔ آخر میں اس کہنہ لباس فقیہ کی باری آئی۔ اس نے ایسا عمدہ جواب دیا کہ سب علماء خلیفہ سمیت عش عش کرنے لگے۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ اس شخص کو اگلی صفوں میں بٹھایا جائے۔

تھوڑی دیر بعد مامون نے ایک اور مسئلہ دریافت کیا۔ اس کا جواب بھی اسی مردِ فقیر نے بہت معقول دیا۔ مامون نے خوش ہو کر اس کا ہاتھ تھاما اور مسند خلافت پر اپنے برابر بٹھالیا۔ اور لطف و کرم کی باتیں کرتا رہا۔ جب مجلس برخاست ہوئی۔ سب عالم رخصت ہوئے۔ اس نے بھی اُٹھنے کا ارادہ کیا مگر خلیفہ نے اسے بٹھائے رکھا۔ اور کہا کہ ابھی مجھے کچھ کہنا ہے۔ آپ تشریف رکھئے۔ اتنے میں خلیفہ کے لیے شراب لائی گئی۔ خلیفہ نے ایک جام اس کی طرف بھی بڑھایا۔ یہ ماجرا دیکھتے ہی وہ فقیہ حق گو ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

"آپ نے اپنی قدر دانی سے مجھ کنگال شکستہ حال کو ذرا سی عقل کے سبب اتنے درجے کو پہنچایا کہ مسند خلافت پر اپنے برابر بٹھایا اب میں ڈرتا ہوں کہ شراب پینے سے میری عقل سلب نہ ہو جائے اور کوئی ایسی حرکت مجھ سے صادر ہو جو آپ کو پسند نہ آئے اور میں اپنی جان سے جاؤں۔ لہٰذا مجھے اس چیز سے معاف رکھئے"

مامون اس صاف گوئی سے بہت متاثر ہوا۔ جامِ شراب جو اس کے ہاتھ میں تھا فرش پر پھینک دیا اور آئندہ کے لیے صدق دل سے توبہ کی اور کہا کہ اے شخص، یہ تیرے علم کی برکت ہے جس نے مجھ سے آج توبہ کرائی۔

فقیہ نے کہا "نہیں، یہ محض اللہ کا فضل ہے جس نے مجھے اور تجھے شراب سے بچایا۔

حاصل مطالعہ

عشرت جہاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا :- اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو

امامت کا اعلان

یہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کا اعلان ہے "اسی طرح" کا اشارہ دونوں طرف ہے۔ اللہ کی اس رہنمائی کی طرف بھی، جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کرنے والوں کو سیدھی راہ معلوم ہوئی اور وہ ترقی کرتے کرتے اس مرتبے پر پہنچے کہ "امت وسط" قرار دیئے گئے اور تحویل قبلہ کی طرف بھی کہ نادان اسے محض ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف پھرنا سمجھ رہے ہیں، حالانکہ دراصل بیت المقدس سے کعبے کی طرف سمت قبلہ کا پھرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو دنیا کی پیشوائی کے منصب سے باضابطہ معزول کیا اور امت محمدیہ کو اس پر فائز کیا۔

"امت وسط" کا لفظ اس قدر وسیع معنی اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا اس سے مراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے جو عدل و انصاف اور توسط کی روش پر قائم ہو، جو دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو، جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہو اور ناحق ناروا تعلق کسی سے نہ ہو۔ پھر یہ جو فرمایا کہ تمہیں "امت وسط"

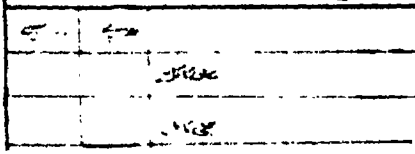
اس لئے بتایا گیا ہے کہ "تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو" تو اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں جب پوری نوعِ انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا۔ اس وقت رسول ہمارے نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکر صحیح اور عمل صالح اور نظام عدل کی جو تعلیم ہم نے اسے دی وہ اس نے تم کو بے کم و کاست پوری کی پوری پہنچا دی اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا۔ اس کے بعد رسول کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اٹھنا ہوگا اور یہ شہادت دینی ہوگی کہ رسول نے جو کچھ تمہیں پہنچایا تھا وہ تم نے انھیں پہنچانے میں اور جو کچھ رسول نے تمہیں دکھایا تھا وہ تم نے انھیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اس طرح کسی شخص یا گروہ کا اس دنیا میں خدا کی طرف سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا ہی درحقیقت اس کا امامت اور پیشوائی کے مقام پر سرفراز کیا جانا ہے اس میں جہاں فضیلت اور سرفرازی ہے وہیں ذمہ داری کا بہت بڑا بار بھی ہے اس کے معنی یہ ہیں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس امت کے لئے خدا ترسی، راست روی، عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت بنے، اسی طرح اس امت کو بھی تمام دنیا کے لئے زندہ شہادت بننا چاہیے حتیٰ کہ اس کے قول و عمل اور برتاؤ کو دیکھ کر دنیا کو معلوم ہو کہ خدا ترسی اس کا نام ہے، راست روی یہ ہے، عدالت اس کو کہتے ہیں اور حق پرستی ایسی ہوتی ہے پھر اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ جس طرح خدا کی ہدایت ہم تک پہنچانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری بڑی سخت تھی، حتیٰ کہ اگر وہ اس میں ذرا سی بھی کوتاہی کرتے تو خدا کے ہاں ماخوذ ہوتے، اسی طرح دنیا کے عام انسانوں تک اس ہدایت

کو پہنچانے کی نہایت سخت ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم خدا کی عدالت میں واقعی اس بات کی شہادت نہ دے سکے کہ ہم تیری ہدایت، جو تیرے رسول کے ذریعے ہمیں پہنچی تھی تیرے بندوں تک پہنچانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔ تو ہم بہت بری طرح پکڑے جائیں گے اور امامت کا فخر ہمیں وہاں لے ڈوبے گا۔ ہماری امامت کے دور میں ہماری واقعی کوتاہیوں کے سبب سے خیال اور عمل کی جتنی گمراہیاں دنیا میں پھیلی ہیں اور جتنے فساد اور فتنے خدا کی زمین میں برپا ہوتے ہیں۔ ان سب کے لئے ائمہ شر اور شیاطین انس و جن کے ساتھ ساتھ ہم بھی ماخوذ ہوں گے۔ ہم سے پوچھا جائے گا کہ جب دنیا میں معصیت، ظلم اور گمراہی کا یہ طوفان برپا تھا تو تم کہاں مر گئے تھے۔ (ماخوذ از تفہیم القرآن)

اور جو لوگ پاکیزگی اور
فرمانبرداری کی زندگی بسر کرتے رہے
ان کے جتھے جنت کی طرف روانہ کر دیئے جائیں گے
اور جب وہ وہاں پہنچیں گے تو اس کے دروازے پہلے ہی
کھلے ہوئے ہوں گے تو جنت کے ذمہ داران سے کہیں گے۔
سلام علیکم طبتم: تم پر سلامتی ہو، تم بہت اچھے رہے۔ جنت
ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ (زمر۔ ۴)
دروازے سے آگے استقبال کرانے اور [illegible]
[illegible]
[illegible] کیسا اچھا ہے

گھریلو بجٹ



اے۔ راشد

ہر سال مارچ، اپریل میں حکومت اپنے بجٹ اعلان کرتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سال کتنی آمدنی متوقع ہے اور کتنا خرچ۔ کتنے نئے منصوبے اس برس مزید شروع کیے جا سکتے ہیں، یہ سب آمدنی ہی کے مطابق ارباب حکومت کو سوچنا پڑتا ہے۔ ایک ملک کے بجٹ کے گوشوارے تیار کرنا ایک مشکل مرحلہ ہے۔ ان گوشواروں کی جانچ پڑتال کے لیے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتی ہے کہ آپ جب مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ کی رقم سامنے رکھ کر تیس دن کا بجٹ بنانے کی کوشش کرتی ہیں تو کتنی الجھنوں اور ذہنی پریشانیوں کا سامنا آپ کو کرنا پڑتا ہے۔ جھنجلا کر آپ کئی اہم چیزوں پر پنسل پھیر دیتی ہیں، کئی بار کاٹتی اور لکھتی ہیں۔

کبھی کبھی جھنجلاہٹ حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو آپ پورے صفحے کو کاٹ کر رکھ دیتی ہیں "ہونہہ! بھلا اتنے کم پیسوں میں کوئی کیا کر سکتا ہے۔ مہنگائی" اور اشیاء کی کم یابی کی وجہ سے ہماری بہنوں کو سب سے زیادہ پریشانی ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مرد کی پریشانی سے کئی گنا زیادہ پریشانی عورت کے سر پر آتی ہے۔ خاص طور سے ان عورتوں کو تو بہت ہی زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن کو ٹکی بندھی آمدنی میں پورے گھر کا سارا خرچ چلانا پڑتا ہے لیکن جو عورتیں ایک خاص بجٹ کی حدوں کے اندر چلتی ہیں وہ بہت ساری ایسی پریشانیوں کو پس پشت ڈالتی چلی جاتی ہیں جو بجٹ کے مطابق نہ چلنے والی عورتوں کو قدم قدم پر پیش آتی ہیں۔

اس لیے عام اور پرسکون زندگی گزارنے میں بجٹ نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بہت سی عورتیں محض یہ سوچ کر پنسل اور پیڈ نہیں سنبھالتیں کہ ہمیں ملتا ہی کیا ہے؟ تین سو روپے کا بجٹ ہی کیا؟ بجٹ تو وہ لوگ بناتے ہیں جن کی بھاری بھرکم آمدنی ہوتی ہے لیکن یہ بات صاف طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ بجٹ دس روپے کا ہو یا دس کروڑ کا، دونوں ایک سی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

بجٹ بناتے وقت آمدنی اور خرچ میں توازن اور ہم آہنگی رکھنا بہت ضروری ہے۔ آپ اپنی فضولیات میں کمی کر کے بھی اپنے بجٹ میں ایک خاص توازن پیدا کر سکتی ہیں۔ اگر آپ اپنی زندگی کو مسرت اور سکون سے ہم کنار دیکھنا چاہتی ہیں تو آپ کی آمدنی کتنی ہی محدود کیوں نہ ہو، اس میں سے کچھ نہ کچھ بچت ضرور کیجیے۔

گھریلو بجٹ تیار کرنے کا کارگر طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنی آمدنی کا دسواں حصہ الگ اُٹھا کر رکھ دیجیے۔ اب بجٹ بناتے وقت اُس دس فی صد کو نہ شمار کیجیے۔ مثلاً اگر آپ کے شوہر کی تنخواہ پانچ سو روپے ہے، تو پچاس روپے آپ کو یقیناً سیف ڈپازٹ میں رکھنے ہیں۔ اس کے بعد آپ جس طرح چاہیں بجٹ قائم کر سکتی ہیں۔ اس کے لیے اگر آپ باضابطہ ایک فائل رکھیں تو بہت اچھا ہے۔ کچھ تو ہر ماہ کے یکساں اور مستقل خرچ ہوتے ہیں۔ اُن کے بارے میں تو سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

جیسے مکان کا کرایہ، پانی اور بجلی کے بل کی ادائیگی وغیرہ۔ یہ سب آپ اسی طرح لکھ لیجیے۔ اس کے بعد آپ پرچوں پر حسب ضرورت (آمدنی کے تناسب سے ہی) خرچ کر سکتی ہیں۔ معمولی کپڑے کی خریداری کی حد بھی آپ اپنے بجٹ میں رکھ سکتی ہیں اور نہ ایک دم کپڑا خریدنے کے لیے ایک بڑی رقم درکار ہوتی ہے) آمدنی کے تناسب سے ہی آپ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خرچ کیجیے۔ اگر آپ کی آمدنی چار یا پانچ سو روپے

کے درمیان یا اس کے آس پاس ہے تو آپ اپنے بچوں کو کانونٹ وغیرہ جیسے مہنگے اسکولوں میں داخل کرانے کا خواب نہ دیکھئے۔ قرض کا بوجھ چڑھا کر ایسے اسکولوں میں تعلیم دلانا محض حماقت ہے۔ درمیانی مدارس میں پڑھ کر بھی آپ کے بچے معقول انداز سے تربیت پا سکتے ہیں۔

کچھ لوگ بیماری کے خرچ سے اپنے بجٹ کو بالکل متزلزل رکھتے ہیں۔ اپنے بجٹ میں کچھ لچک اس کے لیے بھی رکھئے۔ اس سے دو فائدے ہیں۔ اگر خدا کے فضل وکرم سے دوا علاج کی ضرورت پیش نہیں آئی تو آپ کی وہ رقم مفت میں بچ رہے گی اور اگر خدا نہ کرے ضرورت پڑ بھی گئی تو آپ کو قرض کی غار دار وادی میں اترنا نہیں پڑے گا۔

اگر آپ آمدنی کا پانچ فی صد متفرق مدات کے واسطے رکھ دیں (جیسے ریڈیو سیٹ کی مرمت، مہمان داری وغیرہ) تو اور بھی بہتر ہے۔ ایک ضروری پہلو اور رہ گیا ہے قرض یاد رکھئے بجٹ بناتے وقت اس پہلو پر خاص طور سے دھیان رکھئے کہ کسی بھی صورت میں قرض میں آپ کا دامن نہ پھنسے۔ جو لوگ قرض کے عادی ہوتے ہیں ان کے حالات ہمیشہ خراب ہی دیکھے گئے ہیں آپ کچھ بھی کیجئے لیکن قرض سے دامن بچانے کی مقدور بھر کوشش کیجئے۔ وہ لوگ جو اپنے گھر کا خرچ قرض پر چلاتے ہیں۔ کم از کم دس فی صد اپنی آمدنی میں کمی بھی کر لیتے ہیں کیونکہ قرض سے ہر شے تقریباً دس فی صد زیادہ داموں میں ملتی ہے۔ یعنی اگر آپ کی آمدنی پانچ سو روپے ہے۔ تو اپنی آمدنی کے چھ سو روپے ہر سال گنوا دیتے ہیں۔

اگر ابھی تک آپ بجٹ نہیں بناتی تھیں تو ایک بار اس طرح کی اصولی زندگی شروع کر کے ضرور دیکھئے۔ آپ دیکھیں گی کہ آپ کا ذہنی انتشار جس کی وجہ آپ کبھی نہیں سمجھ سکی تھیں، ختم ہو گیا ہے۔ (بانو بی)

● خط و کتابت کرتے وقت اپنا نمبر خریداری یا ایجنسی نمبر ضرور لکھئے۔ (مینجر)

(مائل خیرآبادی)

بنتاج کے خطوط

(۲)

شمو پیاری!

میں تم کو تمہاری ہی مدماتی آنکھوں کی جھیلوں کا واسطہ دیتی ہوں. تم اپنے کالے گھونگر کے بِس بھرے ناگوں سے کسی بھی کنوارے شہزادے کو ڈسا دو، میں تم کو کچھ نہ کہوں گی لیکن کسی سہاگن کے پاک اور پوتر سہاگ کو گندلا نہ کرو. کسی بھری ہوئی مانگ سے ارمانوں بھرا سیندور نہ چھٹاؤ. معصوم، بھولے بھالے، پھولے پھولے گلابی گالوں والے بچوں سے ان کا باپ نہ چھینو —— ورنہ —— !؟

پیاری شمو! تمہارے ہی بھلے کو لکھتی ہوں. پورے بارہ سال بیت گئے پھر میرے ہونٹ نہیں مسکرائے. وہ میرا وہ مدہوش شباب تھا جس میں انسان تڑپے اور جھومتا جائے. تمہاری ہی طرح میں بھی قدم رکھتی یہاں پڑتا وہاں تھا. مست جوانی میں کچھ ایسی اندھی ہوگئی تھی کہ میں نے کچھ نہ دیکھا. میں اپنے جسم پر برستی ہوئی شرابی گھٹا کو لے کر جمال پر ٹوٹ پڑی. وہ بے چارہ حسن کی گھنگھور گھٹا کی موسلا دھار برکھا سے ایسا بھیگا کہ پھر اپنے ایک روئیں کو بھی نہ سکھا نہ سکا.

جمال ان دنوں کالج میں انگریزی ادب کا لکچرر تھا. تیس برس کا نہایت حسین وجمیل گبرو جوان. اس کے گھر میں ہر روز سکون واطمینان کی نئی صبحیں جاگتیں اور ہر شام چاندنی کی دودھیا روشنی جنم لیتی. اس کی نہایت نیک اور فداکار بیوی سورج چھپنے سے پہلے بنی سنوری

ہلکی ہلکی شگفتہ پیشانی کے ساتھ اس کا انتظار کرتی اور اپنے دونوں بچوں کو استقبال کے لیے گلی کے موڑ تک بھیجا کرتی۔ پھر جب اس کے ارمانوں کا سنسار دہلیز پر قدم رکھتا تو خوشی کے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے اس کے گالوں پر لڑھک آتے۔ جمیل ان قطروں کو اپنے ہونٹوں میں جذب کر لیتا اور اپنے جذبات کو چھپانے کے بہانے بچوں کو اٹھا کر سینے سے چپٹا لیتا۔ ہائے! کیا پُر بہار اور مہکا مہکا تھا اس کا جیون جسے میں نے اجاڑ کر رکھ دیا۔ شکیلہ پچیس برس کی شکیلہ حسن و جمال کے اعتبار سے اب بھی کسی سے کم نہ تھی۔ بس فرق اتنا ضرور تھا کہ دو بچے ہونے کے بعد اس کے شجر شباب کے دونوں پھل ذرا ڈھل گئے تھے جن کے دودھیائی رس سے ماتا کا جیمپر سینے پر بھیگ بھیگ جاتا تھا۔ ان ڈھیلے یا ڈھلے پھلوں کا رس چوسنے والے جب اپنے ہونٹوں سے چسر چسر کی آواز نکالتے تو شکیلہ جمیل کے ان دونوں عطیوں پر جھوم جھوم جاتی لیکن انگریزی ادب کا لکچرار آنکھوں کے چھوٹے سکوڑ کر نہ جانے کہاں پہنچ جاتا۔

میں تم کو بتاؤں جمیل کہاں پہنچ جاتا۔ جانے خدا کو ہی یہ منظور تھا یا حسن اتفاق یا سوئے اتفاق۔ وہ کلاس میں مغربی ادب کے چنچل اور شوخ معشوقوں کے سنہرے اور مشرقی ادب کے بھولے بھالے اور سیدھے سادھے معشوقوں کے سیاہ بالوں پر بے تحاشا تبصرہ کر رہا تھا۔ اس نے تقریر ایسی تیار کی تھی کہ اس تقریر میں سبق کا میٹر کم تھا مگر جذبات زیادہ۔

میں اس دن اپنے گورے گورے سٹریر بدن پر کالی ساڑی لپیٹ کر کلاس میں گئی تھی جمال نے مشرقی معشوق کے سیاہ بالوں کو گھنگھور گھٹا سے تشبیہ دیتے ہوئے ایک نازیبا بات کہہ دی یا اس کی زبان سے نکل گئی۔ اس نے کہا کہ مشرقی معشوق کے سیاہ بال گھنگھور گھٹا تو ہوتے ہی ہیں لیکن اگر مشرقی معشوق مزید برآں ایک اور گھٹا اپنے جسم پہ پڑھالے تو اسے کیا کہئے گا۔ جیسے یہ جو بیٹھی ہیں مس صبا!

کلاس کے سارے طالب علموں اور طالبات کی نگاہیں ایک دم مجھ پر پڑیں اور مجھے کچھ

ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سینے میں دل سے کچھ پھوٹ پڑا۔ میں اس "کچھ" کو اس وقت تو نہ سمجھی لیکن جب تیسرے دن پارک میں جمال ملا تو اس نے کہا "پرسوں تم نے غضب ہی ڈھا دیا۔ میں اصل سبق پڑھاتے پڑھاتے کیا کہہ گیا۔ بس صبا! آپ نے بُرا تو نہ مانا! جواب میں میں نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پھر نہ جانے کیوں میں نے کہہ دیا یا میرے اندر کی اِندریوں نے کہلوا دیا "آپ کو اس سے زیادہ کہنے کا حق ہے"

بس، اس دن اتنی ہی بات ہوئی۔ اس کے بعد ہم دونوں قریب ہوتے گئے، قریب ہوتے گئے۔ اتنا قریب ہو گئے کہ اپنے اپنے جسم ایک دوسرے کو سونپ دیے۔ پھر میں نے اس شریف لیکچرر کی زبان سے نہایت رذیل شعر سنا۔ شمو! میں نے تم سے کہا نہ کہ شکیلہ کی جوانی کے دونوں پھل ذرا ڈھل گئے تھے جنھیں وہ ناپسند کرنے لگا تھا۔ اب میرے باغ حسن میں بدل مل گیا تو ایک دن ان کی طرف اشارہ کر کے شعر سنایا:۔

گلزارِ حسنِ یار میں کیسی بہار ہے دو پھل لگے ہوئے ہیں نہالِ شباب میں

آج میں سمجھتی ہوں کہ یہ کیسا عریاں اور لاج ہین شعر ہے مگر اس دن بہت کھل گئی تھی کھل ہی نہیں اس کے سامنے کھُل گئی تھی۔ میرے کھُل کھیلنے نے اسے ایسا اندھا کر دیا کہ اب وہ ہر وقت اپنے من مندر کے گرد پرکرما کرنے لگا۔ شکیلہ کو بھی بھولا اور اپنے بھولے اور معصوم بچوں کو بھی۔ وہ میرے ساتھ رہتا، میرے ساتھ تفریح کرتا

شمو! تم جانتی ہو، مد، پان اور پریم چھپائے نہیں چھپتا۔ بات پھیلی شکیلہ نے بھی سنا مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ اس کے دل پر کیا بیتی۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ سن کر بے ہوش ہو کر گری یا سکتہ ہو گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے اپنا سینہ پیٹا یا سر پھوڑا۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس کے بچوں نے "پاپا" کو یاد کر کے اپنی کیا حالت بنائی ہو گی۔ مجھے تو بس اتنا معلوم تھا کہ جمال مجھ میں کچھ ایسا کھویا ہوا تھا کہ اسے اپنی صحت کی بھی پروا نہ رہی۔ یہاں تک کہ وہ

ایک دن بیمار ہو کر اسپتال میں جا لیٹا۔ وہ بیمار ہوا تو مجھے محسوس ہوا کہ جس سے پیار کیا جاتا ہے اس کی بیماری بے چینی کا روپ دھارن کر کے اپنے تمام پل اتشی ہے۔ سچ مچ وہ بیمار ہوا تو میں بہت بے چین ہو گئی۔ میرے ارمانوں کی دنیا ابھی تو جمیل ہی تھا۔ اگر اُسے کچھ ہو گیا تو؟۔

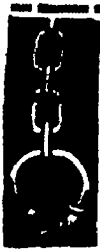
"تو اس کے بعد بتاؤں کیا ہوا۔ ایک دن میں اسپتال جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ ایک پریشان حال عورت جس نے اپنے کو اُجاڑ لیا تھا اپنے دو دُبلے پتلے اور میلے کپڑوں والے بچوں کو لے کر آ گئی۔ اس نے دونوں بچوں کو میرے قدموں میں ڈال دیا اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر بلک بلک کر کہا۔ پیاری بہن صبا! میں تم سے اپنا سہاگ واپس لینے نہیں آئی ہوں۔ تم اِن بچوں کا باپ انھیں دے دو۔ یہ جب پاپا، پاپا کہہ کر انھیں یاد.....؟

شمو! تم سمجھ گئی ہو گی کہ یہ عورت کون تھی؟ یہ شکیلہ تھی جو دو تین برس میں چالیس سال سے اوپر کی بوڑھیا لگ رہی تھی۔ وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ میں نے دیکھا کہ پہلے وہ کانپی، تھرتھرائی اور پھر بے سدھ ہو کر زمین پر گر گئی۔ شمو! پھر وہ ہوش میں نہ آئی۔ اور پھر——!

یہ دنیا ہے۔ لوگ بیمار ہوتے ہیں اچھے بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی۔ جمال اچھا ہو گیا۔ لیکن اب وہ بیماروں سے بدتر تھا۔ انگریزی ادب کے لکچرر نے چپ سادھ لی تھی۔ وہ ٹکر ٹکر آسمان کی طرف دیکھتا۔ جانے کیا وہاں دیکھنے کی کوشش کرتا۔ اور میں—— میں تو عورت تھی ہی۔ میں سب سمجھ گئی تھی۔ بچوں کو میں نے سنبھال لیا۔ بچے میرا پیار پا کر پھر پھول کی طرح کھل گئے۔ ایک دن میں انھیں بنا سنوار کر جمال کے پاس لے گئی کہ شاید انھیں دیکھ کر کچھ بولے۔ آہ! میں کیا جانوں کہ ابھی کچھ اور ہونے کو ہے۔ بچے اپنے باپ کے پاس "پاپا پاپا" کہہ کر دوڑتے ہوئے گئے تو ان کے پہنچنے سے پہلے ہی "پاپا" گم سم ہو گئے میں نے بڑھ کر ہاتھ لگایا تو وہ اب صرف لاش تھے۔

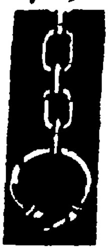
شمو پیاری! اب آگے کچھ کہہ کر میں کسی کو رُلانا نہیں چاہتی۔ صرف تم سے اتنا کہتی ہوں کہ تم کو اپنے کالے گیسوؤں کے بس بھرے ناگوں کی قسم! تم کسی کنوارے کو ڈس لو۔ یہ اچھا ہے مگر کسی سہاگن کے پاک اور پوتر سہاگ کو گندلا نہ کرو۔ کسی بھری ہوئی مانگ سے ارمانوں بھرا سیندور نہ چھٹاؤ۔ معصوم، بھولے بھالے، پھولے پھولے گالوں والے بچوں سے ان کا باپ نہ چھینو! ورنہ ——— !؟"

پیاری شمو! تمہارے ہی بھلے کو کہتی ہوں، پورے بارہ سال بیت لئے۔ پھر میرے ہونٹ نہیں مسکرائے!



اسے

توڑ کیوں نہیں دیتے!



"پیارے مورخ! یہ ہے تمہارا قلم، لو اور تاریخ لکھو!"

"مجھے پریشان نہ کرو۔" مورخ جیل کے پھاٹک سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اونگھنے لگا۔

جنتا گھبرا گئی کہ اگر مورخ سو گیا تو تاریخ کون لکھے گا۔ اس نے مورخ کو جھنجھوڑا۔

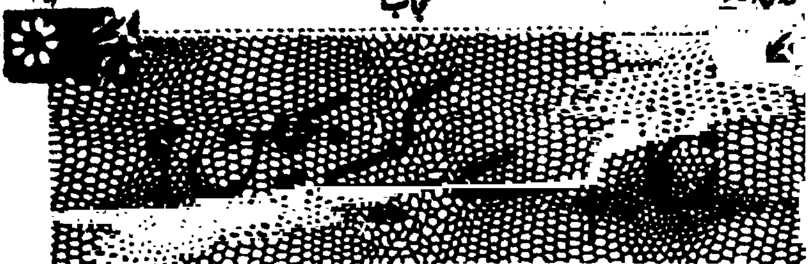
"پیارے مورخ! تاریخ ادھوری رہی جا رہی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" مورخ نے کہا۔ تاریخ کو باہر لاؤ تو لکھوں۔"

"تاریخ کہاں بند ہے؟" جنتا نے پوچھا۔

"مورخ بولا۔ اس پھاٹک کے اندر۔ اسے توڑ کیوں نہیں دیتے! یہ کہکر مورخ سو گیا۔

پھر جنتا نے تاریخ کو کس طرح آزاد کرایا۔ یہ جاننے کے لیے سنہ کی عظیم کہانی نظر بند ضرور پڑھئے مقامی بکسیلرس سے طلب کیجئے یا براہ راست ہمیں لکھئے۔ قیمت ایک روپیہ (مینجر حجاب رامپور)



پچھلے سال نیویارک سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں زکام کے اسباب اس سے حفاظت وغیرہ پر سائنس کے نقطہ نظر سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا نام ہے "گہری سانسیں لیجیے اور زکام سے اپنی حفاظت کیجیے" اس کتاب کے مصنف ایمینوئل ایم جوزف سن نے کتاب کے پہلے ہی جملے میں عام لوگوں کو حیرت زدہ کر دینے والی ایک غیر معمولی بات لکھی ہے۔ بات غیر معمولی اس لیے ہے کہ ڈاکٹروں اور دواؤں کے اس دور میں سہل الحصول صداقت غیر معمولی ہی مانی جاتی ہے۔

ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں۔

"گہری سانسوں کی ورزش کے ذریعے دس میں سے نو زکام روکے جا سکتے ہیں۔

یا ابتدائی حالات میں ٹھیک کئے جا سکتے ہیں"

انھیں یہ تجربہ اس طرح ہوا کہ ایک بار زکام سے بے حد پریشان ہو جانے پر انھوں نے تہیہ کیا کہ وہ ناک ہی سے سانس لیں گے۔ بس زکام سے چھٹکارا پانے کا ایک علاج ان کے ہاتھ آگیا۔ وہ سانس تو منہ ہی سے لے سکے۔ لیکن کچھ کوشش کرنے پر سانس ناک کے ذریعے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ بہت کوشش کر کے یہ عمل دہراتے رہے اور کچھ دن کے بعد ناک ہی سے سانس لینے اور نکالنے میں انھیں کامیابی حاصل ہو گئی۔ اس تجربے سے معلوم ہوا کہ ان کی ناک اسی وقت تک صاف اور کھلی رہی جب تک وہ ناک سے سانس

لیتے رہے۔ یہ عمل بند ہوتے ہی ناک بند ہو جاتی اور تکلیف بڑھ جاتی تھی۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ زکام سے چھٹکارا پانے کے لیے اس وقت تک ناک ہی سے سانس لینا اور نکالنا ضروری ہے جب تک اس کی عادت نہ پڑ جائے۔ یہ عادت ڈالنے میں چھ سات ہفتے سے زیادہ نہیں لگتے۔ ان سات ہفتوں کی احتیاط اور توجہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ زکام کی جڑ کٹ جانے کے ساتھ ہی جسم کے تمام اعضاء پر بھی اچھا اثر پڑا اور صحت بہتر ہوگئی۔

اس عمل کے لیے ڈاکٹر جوزف سن نے کچھ شرطیں رکھی ہیں۔

(۱) جہاں تک ممکن ہو سانسیں گہری لی جائیں لیکن اتنی گہری نہیں کہ تھکاوٹ محسوس ہو۔

(۲) سانسیں ناک ہی سے لی جائیں۔ جب تک ناک بند ہونے کی وجہ سے ایسا کرنا بالکل ناممکن نہ ہو۔ ایسی حالت میں سانس منہ سے لیا اور ناک سے نکالا جائے۔ ایسا اسی وقت تک کیا جائے جب تک ناک سے سانس لینے کی عادت نہ پڑ جائے۔

(۳) سانسیں اس طرح لی جائیں کہ تھکاوٹ محسوس نہ ہو۔

(۴) کوشش کرکے سانسیں اس طرح لی جائیں کہ ناک کی دونوں نالیاں کھل جائیں۔

(۵) سانس لیتے وقت سر سیدھا رکھنا چاہیے۔

اس عمل سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے لگن چاہیے۔ ڈاکٹر جوزف سن کے مشورہ پر عمل کرکے بے حد فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ہر گھنٹے اس کا جائزہ لے لینا چاہیے کہ ناک کی دونوں نالیاں کھلی ہیں۔ اگر دو میں ایک بھی بند ہوگئی ہے تو مندرجہ بالا عمل اس وقت تک جاری رکھنا چاہیے جب تک دونوں نالیاں کھل نہ جائیں۔

میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اشفاق احمد ظلی

میرے دکھ کی دوا تبھی ہو سکتی ہے جب بیماری یا دکھ کی صحیح تشخیص ہو۔ اگر ایک دفعہ ایسا ہو جائے تو پھر ہر دکھ کی دوا موجود ہے مگر افسوس کہ ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی اپنی بیماری کی صحیح تشخیص نہ کر سکا اور در بدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے بیماری کی تشخیص کے لیے ضروری ہے کہ علامات کی طرف توجہ دی جائے۔ مثلاً ملیریا ہو تو بخار سردی کے ساتھ ہوگا۔ یرقان میں آنکھیں زرد ہوں گی۔ نمونیے میں کھانسی اور چھاتی کا درد ہوگا اس قسم کی علامتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کسی نتیجے پر پہنچ گئے تو پھر سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ آپ کی تکلیف یا بیماری کا تسلی بخش علاج ہو سکتا ہے لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ مجھے علامتیں معلوم ہیں، لیکن پھر بھی مرض کی تشخیص سے قاصر ہوں اور ظاہر ہے جب بیماری معلوم نہیں تو علاج کیسے ہو؟ میں اپنے مرض کی علامتیں مشتہر کر رہا ہوں کہ شاید کوئی ڈاکٹر، حکیم، پیر، فقیر یا عامل کوئی علاج، تعویذ، وظیفہ یا دعا تجویز کر سکے۔

جسمانی طور پر میں بالکل صحت مند ہوں۔ بظاہر کوئی عارضہ نہیں۔ میری عمر تقریباً ساٹھ سال ہے۔ اب بھی دو تین گھنٹے لگاتار گھوڑے کی سواری کر سکتا ہوں۔ پیدل چلنے میں آج کل کے جوانوں کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ کھانا بھی خوب ہضم ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ آپ مجھے دیکھ کر یا مجھ سے گفتگو کر کے یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ مجھے کوئی بیماری ہے۔ میرا انداز گفتگو بھی لوگوں کے خیال میں اتنا برا نہیں۔ میری

مصیبت یہ ہے کہ میرے سوچنے سمجھنے اور عمل
کرنے کے انداز بدل گئے ہیں۔ میں جب ہندستان
اور پاکستان دو الگ الگ مملکتیں نہیں میں پاکستان
کے لیے تن من دھن سب کچھ قربان کر دینے کو
تیار تھا۔ صرف تیار ہی نہ تھا بلکہ مجھ سے جو کچھ بن
آیا وہ میں نے کیا۔ مجھے ان دنوں ماں باپ بھائی
بہنوں اور بچوں کا تو کیا، خود اپنا خیال تک
نہ تھا۔ میرے ذہن میں کبھی یہ بات نہ آئی
کہ میں ان کے اور اپنے لئے کچھ روپیہ پیسہ
بچا کر رکھوں یا ملک اور قوم کی خاطر اپنی جان
جوکھوں میں نہ ڈالوں۔ میری ماہانہ آمدنی آجکل
سے بہت کم تھی، مگر مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات
پر پورا ایمان اور بھروسہ تھا۔ مجھے یقین تھا
کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہی سب
کو روزی دینے والا اور ان کا نگہبان ہے۔
میں غریبوں، مفلسوں، بیواؤں اور یتیموں کی
دیکھ بھال کیا کرتا۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں نے
ایک معذور آدمی کو بھیک مانگتے دیکھا اور
اپنی جیب کی ساری پونجی اس کی نذر کر دی۔
کسی مصیبت زدہ کو دیکھ کر میری آنکھوں

میں آنسو آجاتے۔ دنیا کے کسی بھی
مسلمانوں پر کوئی آفت ٹوٹتی تو یہ
تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتا۔ ہندوستا
کی تکالیف اور مصیبتوں کا ذکر سن کر
لگتا، مگر اب . . .

خون تو اب بھی میری رگوں :
ہے لیکن محبت کا وہ جنون باقی
میں خود غرض ہو گیا ہوں۔ میری
انداز بدل گئے ہیں۔ مستحق، معذور ا
سے کتراتا ہوں۔ ہر وقت یہ فکر دا
رہتی ہے کہ بال بچوں کے لیے کچھ
ورنہ نہ جانے کل میرے بعد ان کا کیا
میں اکثر سوچتا ہوں، اللہ تو
پر وہ پہلا سا بھروسہ کیوں نہیں ر
۴۸-۱۹۴۷ء والا جذبہ کہاں کھو گیا؟
اتنا تنگ نظر کیوں ہو گیا ہوں :
بھی اپنا کام ایمانداری سے سرانجا
کوشش کرتا ہوں۔ حلال کو حلال ا
حرام سمجھتا ہوں، مگر پھر بھی اپنے
کو چھوڑ کر باقی مسلمانوں پر جان د

کرنے سے کیوں ہچکچاتا ہوں؟ یہ کس بیماری کی علامتیں ہیں؟ کیا میرا دل سیاہ ہو گیا ہے؟ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا ہوں؟ مجھے نفسیاتی بیماری ہے؟ آخر ہے کیا! نفسیاتی بیماری؟ تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ کیا یہ محدود ماحول کا اثر ہے؟ مگر میں تو ملک کے کونے کونے میں پھرا ہوں اور ہر قسم کے ماحول سے گزرا ہوں۔ سرکاری ملازمین، تاجر حضرات، زمینداروں، مزارعے سیاست داں ہر ایک سے گہرا تعلق رہا ہے لیکن اس کے باوجود میری بیماری بڑھتی ہی گئی۔ ایک خاص علامت تو بتلانا تو میں بھول ہی گیا۔ آج کل اکثر یہ خواب دیکھتا ہوں کہ ایک سمندر میں ہم سب تیر رہے ہیں۔ ہم میں سے ہر وہ شخص دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جو آگے ہے، پیچھے والا شخص اس کی ٹانگ کھینچ کر پیچھے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کشمکش میں سب لوگ ایک دوسرے سے الجھے ہوئے ہیں۔ تیر کر آگے بڑھنے کی رفتار تو بہت سست بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن ہر شخص ایک دوسرے سے گتھم گتھا نظر آتا ہے میں خود بھی اس تگ و دو میں شامل ہوں تھک کر ہانپ رہا ہوں۔ نہ صرف یہ کہ آگے بہت کم بڑھ رہا ہوں ——— اپنے اور پیچھے والوں کے لیے بھی رکاوٹ ثابت ہو رہا ہوں۔ اس حالت میں عموماً میری آنکھ کھل جاتی ہے اور اپنے آپ کو پسینے میں شرابور پاتا ہوں۔

میں نے اپنی مندرجہ بالا علامتوں کا ذکر اپنے دوستوں، بہی خواہوں اور بزرگوں سے کیا، ڈاکوؤں، پیروں، فقیروں اور علماء کے پاس بھی گیا، مگر بے نیلِ مرام یہ شعر گنگناتا ہوا واپس لوٹا۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و میری و پیری

میرے بعض دوست تو مجھے 'crank' (دیوانہ) کہتے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ میرا مرض لادوا ہو چکا ہے اور ضمیر مردہ . . +

وزارت کو سونے سے پہلے اس مرض پر غور کیجیے۔

آواز

کرنل مسعود اختر شیخ

"پولیس، پولیس، بھاگو، مدد!"

ہر آنے جانے والا رک گیا۔ لوگ۔ اس شخص کے اردگرد جمع ہونا شروع ہوگئے بھیڑ میں پولیس کے سپاہی بھی موجود تھے، مگر وہ اس غریب کی چیخ وپکار کی پروا کیے بغیر لوگوں کو دھکے دیتے آگے نکل گئے۔

"پولیس۔ پولیس!"

بڑی عجیب بات تھی۔ وہ پولیس کو پکار رہا تھا اور پولیس کے سپاہی وہاں موجود ہوتے ہوئے بھی اس کی مدد کو نہیں آرہے تھے۔ ایک سپاہی تو بالکل سامنے فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ یقیناً اس کے کانوں تک بھی آواز جارہی تھی، کیونکہ یہ بے چارہ منہ کے آگے دونوں ہاتھوں کو کپی بنا کر چلا رہا تھا۔

"پولیس. مدد. پولیس!"

آخر اس نے ہمت کی اور سامنے کی بھیڑ کو چیرتا ہوا فٹ پاتھ پر کھڑے سپاہی کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔

"بھائی صاحب! ذرا مہربانی سے میرے ساتھ چلیے۔"

"کیا بات ہے؟"

"اس سامنے والی بلڈنگ میں ایک آدمی کو قتل کیا جارہا ہے۔"

"میں اس معاملہ میں دخل نہیں دے سکتا۔"

"وہ کیوں؟"

اس لیے کہ میں ٹریفک پولیس میں ہوں۔ یہاں سے ہٹا تو ٹریفک کون سنبھالے گا؟"

اس شخص نے دوبارہ چلانا شروع کردیا۔

"پولیس. پولیس! ہے کوئی جو ایک انسان کی جان بچا سکے؟"

اتنے میں ایک اور سپاہی ادھر سے تیز تیز گزرتا نظر آیا. وہ شخص بھاگ کر اس کے پاس پہنچا.

"بھائی صاحب سنئے. یہاں قریب ہی ایک آدمی کو قتل کیا جا رہا ہے. آپ ذرا میرے ساتھ چلئے."

"میں اس میں دخل نہیں دے سکتا. یہ جرائم کے شعبے کا کام ہے. میں آج کل محکمۂ پاسپورٹ میں ڈیوٹی دے رہا ہوں."

اس بے چارے نے گھبرا کر ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا. بھاگتا جاتا تھا اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتا جاتا تھا.

"پولیس. قتل. قتل. مدد!"

اتنے میں اس کی نظر سامنے سے آتے ایک اور سپاہی پر پڑی. وہ بھاگا: "بھائی صاحب! خدارا میرے ساتھ چلئے. قتل کی واردات سرزد ہو رہی ہے."

"میں دخل نہیں دے سکتا. میں تو وزارت داخلہ کی طرف سے بیرونی ملکوں سے آنے والے مہمانوں کی ذاتی حفاظت پر مامور ہوں."

اُدھر بجز ہر آن زیادہ ہوتی جا رہی تھی. تھوڑی دور پر ایک سپاہی ریڑھی پر سبزی بیچنے والے کا چالان کرتا دکھائی دیا. وہ شخص بھاگا اور سپاہی کے پاس پہنچ کر بلند آواز سے چلایا: "بھائی صاحب. بھاگ کر چلئے. ایک آدمی کو قتل کیا جا رہا ہے."

"میں اس میں دخل نہیں دے سکتا. میں تو آج کل بلدیہ کے مقرر کردہ نرخوں کی چیکنگ پر لگا ہوا ہوں. اس علاقے کی صفائی بھی میرے ذمے ہے."

کتنے افسوس کی بات ہے کہ ارد گرد پولیس کے اس قدر سپاہی موجود ہوتے ہوئے بھی کوئی اس واردات میں دخل دینے کو تیار نہیں. وہ پھر چلایا.

"پولیس. پولیس. بچاؤ. قتل ہو رہا ہے بچاؤ!"

خدا کا شکر ہے ایک اور سپاہی نظر آ گیا اس دفعہ اس شخص نے مایوسی سے بچنے

کی خاطر خود ہی سپاہی سے پوچھا: "جناب آپ کا تعلق پولیس کے کس شعبے سے ہے؟"

"میں جرائم کے شعبے سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"خداوندا، تیرا ہزار بار شکر ہے۔ بھائی صاحب یہاں قریب ہی ایک آدمی کو قتل کیا جا رہا ہے۔ جلدی چلیے میرے ساتھ۔"

"جناب میں دخل دینے سے معذور ہوں۔ اگرچہ میں جرائم کے شعبے میں ہوں۔ لیکن میرا کام صرف چوری کی وارداتوں سے متعلق ہے۔"

وہ شخص مایوس ہو کر اور آگے بھاگا۔ راستے میں ایک اور سپاہی ملا۔ اس نے سپاہی سے مدد کی فریاد کی: "بھائی صاحب ایک آدمی کو قتل کیا جا رہا ہے، میرے ساتھ چلیے یہ قریب ہی ہے۔"

"جناب میں دخل نہیں دے سکتا۔"

"کیوں آپ جرائم کے شعبے میں نہیں ہیں کیا؟"

"ہوں تو اسی شعبے میں، لیکن میں اسمگلنگ کی روک تھام پر مامور ہوں۔"

وہ پھر واپس بھاگا۔ بازار لوگوں کے ہجوم سے بھر چکا تھا۔ اسے ایک سپاہی اور دکھائی دیا۔ اس نے پوچھا: "جناب کیا آپ جرائم کے شعبے میں ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"کیا آپ قتل کی وارداتوں کی روک تھام پر مامور ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"اوہ خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ بھائی جان ذرا بھاگ کر میرے ساتھ چلیے۔ وہاں ایک شخص کو قتل کیا جا رہا ہے۔"

"کہاں؟"

"وہ سامنے گلی میں، تیسری بلڈنگ کے اندر۔"

"جی میں اس کیس میں دخل نہیں دے سکتا، کیونکہ وہ میرا علاقہ نہیں ہے۔ وہ گلی بی ڈویژن تھانے کی حدود میں ہے اور میں سی ڈویژن میں ہوں۔"

اس کی امید کا ٹمٹماتا دیا پھر بجھ گیا۔ گھبرا کر واپس پلٹا تو ایک اور سپاہی پر نظر پڑی

"بھائی صاحب، معاف کیجئے. کیا آپ جرائم کے شعبے سے ہیں؟"

"جی ہاں."

"کیا قتل کی روک تھام بھی آپ کے فرائض میں آتی ہے؟"

"جی ہاں."

"کیا وہ سامنے والی گلی آپ ہی کے تھانے کی حدود میں ہے؟"

"جی ہاں، مگر بات کیا ہے؟"

"جلدی چلو میرے بھائی. خدا کے لیے میرے ساتھ آؤ. اس گلی میں قتل ہو رہا ہے."

"جناب، میں آج چھٹی پر ہوں. اس معاملے میں دخل دینے سے معذور ہوں."

اتنے میں ایک آدمی اس شخص کے قریب آیا اور اس کے کان میں بولا: "میرے بھائی یہ سب کچھ مجھ پر بھی بیت چکی ہے. یوں تلاش کرنے سے بھی کبھی پولیس ملی ہے؟ اگر واقعی پولیس کی ضرورت ہے. تو اس سامنے والے میدان میں چلے جاؤ. ایک خالی کھوکھے پر کھڑے ہو جاؤ اور زور سے تقریر کرنا شروع کر دو. تقریر کی بھی کوئی ضرورت نہیں بس یہی کہہ دو: یہ کیا رذالت ہے؟"

اس نے فوراً اس محسن کے مشورے پر عمل کیا. میدان میں کھڑے ہو کر تقریر شروع کی: "بھائیو! یہ کیا رذالت ہے اس ملک میں؟ کیا آج تک کبھی کسی نے ایسی رذالت دیکھی تھی؟"

ابھی وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ہجوم میں سے چند شخص آگے بڑھے. کسی نے اس کا ہاتھ کسی نے کوٹ کا دامن اور کسی نے کان پکڑ کر کہا: "چلو تھانے."

اس نے ایک آدمی سے پوچھا "بھائی صاحب آپ کون ہیں؟"

"میں سیاسی پولیس کا انسپکٹر ہوں. یہ لوگ سیاسی پولیس کے سپاہی ہیں جو اس وقت یہاں ڈیوٹی پر ہیں."

اتنے میں سیٹیاں بجنی شروع ہو گئیں. سیٹی کی آواز سنتے ہی سب سے پہلا سپاہی، جو وہاں پہنچا وہی تھا جو اس روز چھٹی پر ہونے کی وجہ سے قتل کی واردات میں دخل،

دینے سے معذرت کر چکا تھا۔ پھر وہ سپاہی پہنچ گیا جس کا علاقہ سی ڈویژن تک محدود تھا۔ کچھ دیر بعد بلدیہ کے زخموں کی جانچ پڑتال کرنے والا، پھر پاسپورٹ آفس والا۔ وزارتِ داخلہ کے بیرونی مہمانوں کی حفاظت کا ذمہ دار اور کئی دوسرے سپاہی آپہنچے۔ سب اس شخص کو غور سے دیکھ رہے تھے جو تھوڑی دیر پہلے ان سے مدد کی درخواست کر چکا تھا۔

ہجوم میں اس کی نظر اپنے اس محسن پر بھی پڑی جس نے چند منٹ پہلے، اسے تقریر کا مشورہ دیا تھا۔ اس نے مشورہ دینے والے سے پوچھا: "کیا آپ بھی پولیس مین ہیں؟"

"جی ہاں، میں تھانیدار ہوں۔"

پولیس اسے پکڑ کر تھانے لے جا رہی تھی یہ پارٹی اسی بلڈنگ کے سامنے سے گزری جہاں ایک انسان کا خون بہایا جا چکا تھا۔ ایک شخص زخمی حالت میں زمین پر تڑپتا نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی گرفتار شدہ آدمی بولا: "افسوس، صد افسوس، بے چارہ!"

ٹریفک پولیس کے سپاہی نے اس سے پوچھا، "وہ تمہارا کیا لگتا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں تو اسے پہچانتا بھی نہیں۔ محض انسانیت کے نام پر اس کی جان بچانے کے لیے پولیس کو بلانے کی کوشش کر رہا تھا۔"

بلدیہ پولیس کے سپاہی نے اُسے پیچھے سے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"جلدی چلو۔ اس کمبخت کا خون گلی میں بہہ کر ساری گلی کو گندہ کر رہا ہے۔ تمہیں تھانے پہنچا کر مجھے واپس لوٹنا ہوگا تاکہ محلے میں گندگی پھیلانے کے جرم میں اس مردود کا چالان کر سکوں۔"

لمحے کا انعام

سال، دو سال، پانچ سال میں کسی شخص میں جسمانی، روحانی یا اقتصادی انقلاب آجائے تو آپ اس سبب کو اس شخص کی ذاتی محنت لیاقت یا بعض دوسرے ذرائع کی بروقت اعانت پر محمول کرتے ہیں لیکن جب کسی انسان کی قسمت میں بلاوجہ بلاسبب یکدم فوری تبدیلی دیکھتے ہیں۔ تو عقلی استدلال کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ شاید ایسے ہی مواقع پر ہم اس غیبی طاقت کے قائل ہونے لگتے ہیں جو آنِ واحد میں ایسے کرشمے دکھاتی ہے جنھیں انسان کی محدود عقل سمجھ نہیں پاتی۔ ایسے وقتوں میں ہر دلیل لنگ ہو جاتی ہے اور انسان کو احساس ہونے لگتا ہے کہ

کہ تیرے بھی ہے ہاتھ پر کوئی ہاتھ

انسانی ہاتھوں کے اوپر ایک دستِ غیب بھی ہے جو کبھی کبھی شاید اپنی ہستی کے اظہار کے لیے انسانی ہاتھ میں معجزے کی سکت پیدا کر دیتا ہے۔

آئیے! آج آپ کو ایک ایسا سچا واقعہ سنائیں جسے پڑھ کر آپ اپنی اپنی عقل کے مطابق مختلف نتائج اخذ کرنے لگیں گے۔

رمی کے بچپن ہی کچھ ایسے تھے اس کے شریف ماں باپ اسے زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے اُسے ایک ایک عدالتی نوٹس کے ذریعہ عاق (جائداد سے بے دخل) کر دیا تھا۔ ۲۱ سالہ رمی بچپن ہی سے پرلے درجے کا اکھڑ مزاج واقع ہوا تھا۔ بات بات پر اپنے ساتھیوں سے آمادۂ جنگ ہو جانا اس کی فطرت تھی

کئی بار لندن پولیس نے دنگا فساد کرنے پر
اس کا چالان کرنا چاہا تھا۔ شرافت کا مارا
بڈھا باپ ہر بار اپنے اثر و رسوخ سے اس
کے آڑے آتا تھا۔ متلون مزاج اس قدر کہ
کہیں ٹک کر کام نہ کر سکتا تھا۔ کالج کے پرنسپل
نے اسے پہلے سال کے دوران ایکسپل
[illegible] کر دیا تھا۔ کافی عرصہ تک بیکار
رہا۔ بیکاری کے دنوں میں ماں باپ کے
لیے نت نئی آفت لاتا تھا۔ دو تین اسکول
میں ملازم بھی ہوا لیکن اس کی شوریدہ سری
نے کہیں اس کے پیر جمنے نہ دیے۔

ہوتے ہوتے وہی کچھ ہوا جو اس قسم
کے مفت خوروں کا ہوتا ہے۔ منشیات
کے اسمگلروں کے ایک خوفناک گروہ
تک اس کی رسائی ہو گئی۔ وہ لوگ پرانے
گھاگ تھے۔ یہ ابھی نیا نیا اُن میں پھنسا تھا
یہ نہیں سمجھتا تھا کہ جرائم پیشہ لوگ اور خاص
طور پر ماہر جرائم پیشہ جب کبھی پولیس کی زد
میں آنے لگتے ہیں تو اپنی چمڑی بچانے
کے لیے کیسے کیسے بھولے بھالے آدمیوں
کو جیل میں جھونک دیتے ہیں۔ یہی کچھ اس
کے ساتھ ہوا۔

پچھلے نومبر میں رسک روڈ پر واقع
اسمگلروں کے ڈین "[illegible]" پر پولیس
نے چھاپہ مارا۔ نہ جانے کس طرح چھاپے
کی اطلاع صرف پانچ منٹ پہلے ان
اسمگلروں کو مل گئی۔ اتنی مہلت میں وہ
اپنا قیمتی مال سبھی ایک جگہ سے دوسری
جگہ نہیں پہنچا سکتے تھے۔ وقت بہت
کم تھا۔ ان سب کی گرفتاری یقینی تھی۔
گروہ کا سرغنہ بہت تیز طرار دماغ کا
مالک تھا۔ فوراً اپنے ساتھیوں سمیت
عقبی زینے سے نیچے اتر گیا اور رمی کو یہ
کہہ کر وہاں تعینات کر گیا کہ وہ ابھی ایک
نئی کھیپ لے کر واپس آ رہے ہیں اُسے
پولیس کی آمد کی کچھ خبر نہ تھی۔ رمی ان گرگوں
کے ہتھے میں آ گیا۔ وہ حشیش کے پیکٹوں
کو سنبھال سنبھال کر ایک شیلف میں
رکھ رہا تھا کہ پولیس دستے نے آ دبوچا
اُسے مع مال گرفتار کر لیا۔

مقدمہ کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ ضمانت کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پولیس نے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا۔ کئی دن تک وہ حوالات میں رہا۔ ہزار کوششوں کے باوجود پولیس باقی ممبروں کو گرفتار نہ کر سکی۔ اس اثنا میں پولیس بھی جان گئی تھی کہ یہ نوجوان اصل مجرم نہیں، لیکن اصل مجرموں کی گرفتاری اور تفتیش تک اس کی گلو خلاصی بھی ممکن نہ تھی۔

رمی اس صورت حال کو دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ نہ وہ اسمگلر گرفتار ہوں گے نہ اس کی جان چھوٹے گی۔ وہ حوالات سے فرار ہونے کی سوچنے لگا۔ اس کے رویہ میں بڑی تبدیلی آگئی تھی۔ اس نے اتنے دنوں میں کچھ پولیس مینوں کے دل میں بھی اپنے لیے ہمدردی پیدا کر لی تھی۔

اسی حوالات میں ایک امریکن اسمگلر جیمز اے کسی اور مقدمے میں زیر حراست تھا۔ رمی اور جیمز میں دو ایک دن میں دوستی پیدا ہو گئی۔ رمی کو جیمز کی اتنی ضرورت نہ تھی جتنی جیمز کو رمی کی تھی۔ آخر ایک رات وہ دونوں پولیس کی حراست سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ پتہ نہیں اُن کے پاس کیا سحر تھا۔ کیا روپ بدلا، کیا حربہ اختیار کیا کہ دو ماہ بعد لندن پولیس کو سرکاری طور پر اطلاع ملی کہ یہ دونوں مجرم امریکہ میں زیر حراست ہیں۔

امریکن پولیس نے رمی کو لندن پولیس کے حوالے کر دیا۔ پولیس نے اسے ہتھکڑی لگا کر ۲۸ جنوری کو اُسے بذریعہ ہوائی جہاز لندن لا رہی تھی۔ فلائٹ نمبر ۳۰۲ کینیڈی ائرپورٹ سے لندن تک مخصوص تھی۔ اس فلائٹ میں ۲۰۰ مسافر تھے۔ ان ۲۰۰ مسافروں میں ایک رمی بھی تھا۔ جسے پولیس نے ہتھکڑی پہنا رکھی تھی۔ مسافروں کی نظریں بار بار اس مجرم کی ہتھکڑی پر مرکوز ہو رہی تھیں۔ وہ مجرم تھا۔ شریف شہریوں میں ایک مجرم۔ اس میں شک ہی کیا تھا؛ پولیس کے نرغے میں وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا نامعلوم کن خیالوں میں

کھو بیٹھا تھا کہ یکبار جہاز کے مسافروں میں شور
اٹھنے لگا۔

رمی نے گردن اٹھا کر کاک پٹ کی
طرف دیکھا۔ وہ پائلٹ سے خالی تھا۔ پائلٹ
کی عدم موجودگی تمام مسافروں کی روح قبض
کئے جا رہی تھی۔ آخر وہ پائلٹ کہاں چلا
گیا تھا؟

اس جہاز کے دو پائلٹ تھے۔ ایک
کی طبیعت بے حد خراب ہوگئی تھی۔ وہ
پاخانہ میں چلا گیا تھا۔ اور دوسرا پائلٹ
جہاز کو کنٹرول پیول میں رکھ کر دوسرے
کمرے میں پانی پینے گیا تھا۔ اب اُسے
سوءِ اتفاق کہئے کہ آٹومیٹک سسٹم کے
تحت وہ کمرہ اپنے آپ مقفل ہوگیا۔ کمرے
کے اندر رُکے ہوئے پائلٹ نے شور
مچانا شروع کر دیا۔

"نکالو! مجھے باہر نکالو!! ورنہ۔۔۔"

کچھ مسافروں نے کمرہ کا دروازہ
کھولنے کی کوشش کی لیکن تالہ ٹس سے
مس نہ ہوا۔ مسافروں کی بے چینی دم بدم
بڑھتی جا رہی تھی۔ بچوں نے چلانا شروع کر
کچھ عورتیں غش کھا کر بے ہوش ہوگئیں
پائلٹ کے بغیر جہاز کسی لمحہ بھی حادثہ کا شکا
ہوسکتا تھا۔ موت منہ کھولے کھڑی تھی
عجیب شور محشر بپا تھا۔

پولیس مینوں کے ہاتھ کانپنے لگے
انھوں نے ہتھکڑی کی زنجیر رمی کی گود میں
رکھ دی۔

لیکن رمی دوسرے مضطرب مسافرو
کے برعکس متانت کے ساتھ اپنی سیٹ پر
اپنی ہتھکڑی کے آہنی حلقوں پر نگاہیں
جمائے بیٹھا تھا۔ ایک کانسٹبل نے حواس
باختگی میں اس سے پوچھا۔

"رمی! اب کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں سر! میں سوچ رہا ہوں کہ
اگر میرے ہاتھ کھلے ہوں اور مجھے کسی
لیڈی مسافر سے اُس کا ایک ہیئر پن
" ہی مل جائے، تو میں یہ تالہ فوراً کھول
کر رکھ دوں۔"

ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ایک نازنین

نے بی الفورا اپنے بالوں سے ہیئر پن اتار کر پیش کر دیا اور روتے ہوئے بولی:

"کھول دو بھیا! اسے شاید یہ ہی ہم سب کو بچا لے!!"

"اگر تم تالا کھول سکو تو ہم تمہیں رہا کر دیں گے۔"

پولیس انسپکٹر نے ملتجی انداز میں کہا۔

رمی نے وہ ہیئر پن ہاتھ میں لیا اور اس کمرے کی طرف لپکا۔ جہاز میں چاروں طرف دفعتاً خاموشی طاری ہو گئی۔

بچے عورتیں مرد سب دم سادھے رمی کے ہاتھوں کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے ہر مسافر کی آس رمی پر لگ رہی تھی۔ ایک کروڑ پتی امریکن مسافر نے چلا چلا کر کہا: "اگر تالا کھل گیا تو میں تمہیں پچاس ہزار ڈالر کا چیک دوں گا۔"

رمی نے ہیئر پن کو تالے کے سوراخ میں رکھ کر اس استادی سے دبایا کہ تالا کھٹ سے کھل گیا اور دوسرے لمحے پائلٹ بند کمرے سے باہر اچھل کر کاک پٹ میں جا پہنچا۔ مسافروں کی جان میں جان آگئی پائلٹ نے ڈگمگاتے جہاز کو اپنے کنٹرول میں لیا تو مسافر فرط مسرت سے جھوم اٹھے

"رمی زندہ باد" کے نعروں سے فضا معمور ہو گئی۔

یہ جہاز لندن میں ہیتھرو ائرپورٹ پر اترا تو رمی کے بدن پر ایک بیش قیمت سوٹ تھا جسے ایک اور مسافر نے بڑی محبت سے اس محسن کے گلے میں لٹکائی باندھی تھی جو بیش بہا ہیروں سے مرصع تھی۔

جہاز سے اترتے ہی اس امریکن کروڑ پتی نے اپنے وعدے کے مطابق جلدی جلدی اسے پچاس ہزار ڈالر کا چیک تھما دیا۔

اسی جہاز میں ایک ادھیڑ عمر کی امیر عورت بھی لندن آئی تھی۔ اس کے گھر والے اپنی بینیز کار (Bengan) لے کر اسے ائرپورٹ سے لینے آئے تھے۔ وہ عورت رمی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کار تک لے گئی اور احسان مندانہ نگاہوں سے

دیکھتی ہوئی بولی۔
"بیٹیا! یہ کار اب تیری ہے۔"
اُس عورت نے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا اور رمی کو بڑے پیار سے اس میں سوار کرایا۔

ہیتھ برو ائرپورٹ سے بینز کار رمی کے گھر کی طرف روانہ ہوئی تو رمی فاتحانہ انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر تماشائیوں کی محبت کا جواب دے رہا تھا۔ مسرت کے مارے اس کی باچھیں کھل رہی تھیں۔ کیوں نہ کھلتیں، اس نے ۱۷۰ مسافروں کی جان بچائی تھی۔ لندن کا یہ ہیرو اب کم و بیش دو کروڑ ڈالر کا مالک بن چکا تھا۔

رمی کی کار گھر پہنچی تو بوڑھے والد نے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ اس کی رہائی اور بے انداز انعام و اکرام کی خبر آنِ واحد میں پھیل گئی تھی۔ اس کی منگیتر کاریٹا بڑی بیتابی کے ساتھ اس سے بغل گیر ہوئی۔

رمی اور کاریٹا کی دنیا بدل چکی تھی لیکن افسوس اس وقت تک رمی کی ماں مر چکی تھی۔

"ہیرپن سے تالا کیسے کھلا؟" اس کے جواب میں اس نے اتنا ہی بتایا کہ یہ کرشمہ اسے اُس امریکی اسمگلر نے سکھایا تھا، جس کے ساتھ وہ لندن سے فرار ہو کر امریکہ پہنچا تھا۔ (ماخوذ)

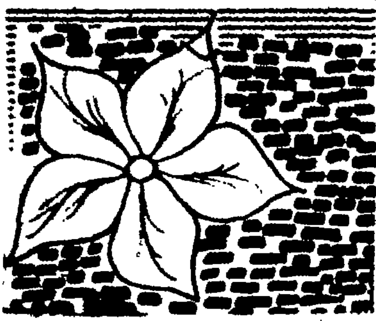
حکیمانہ مشورہ

• تین چیزیں محبت بڑھاتی ہیں۔
(۱) سلام (۲) مخاطب کو بہتر لقب سے یاد کرنا (۳) مجلس میں دوسروں کے لیے جگہ خالی کرنا۔ (حضرت عمر فاروقؓ)

• عمدہ اور لطیف بات میرے نزدیک یہ ہے کہ جو بات مجھے معلوم نہ ہو اور پوچھی جائے تو میں صاف کہہ دوں "میں نہیں جانتا۔" (حضرت علیؓ)

• بابرکت نکاح وہ ہے جس میں خرچ کم سے کم ہو۔

(بشارت حسین ہاشمی ہمت حیدرآباد)



اشلے آپہاٹ

پگھلا منصوبہ

المیسری اور اس کی بیوی ہر طرح خوش و خرم تھے۔ دنیا کی تقریباً وہ تمام آسائشیں انھیں میسر تھیں جن کے خواب لاکھوں کروڑوں افراد روزانہ دیکھتے ہیں۔ نیویارک میں مشرق کی جانب سترہویں شاہراہ پر ان کا اپنا محل نما مکان تھا۔ اس میں بے شمار کمرے تھے اور لاکھوں ڈالر کا قیمتی سامان سجا ہوا تھا۔ سمندر کے کنارے ناریل کے اونچے اونچے درختوں کے درمیان ان کا ایک اور خوش نما گھر تھا۔ اس گھر میں وہ سردیوں کا موسم گزارا کرتے تھے۔ المیسری کے پاس بے اندازہ دولت تھی، اتنی کہ اس کا گننا بھی آسان نہ تھا۔ اور سچ پوچھئے تو اسے اب یاد بھی نہیں رہا تھا کہ دنیا کے کس کس بنک میں اس کا اکاؤنٹ کھلا ہوا ہے اور وہاں کتنی کتنی رقم جمع ہے۔ اُسے دراصل یہ سب کچھ سوچنے کی فرصت ہی نہ تھی۔

المیسری نے یہ تمام دولت، یہ عالی شان مکان، بیش قیمت کاریں سب بڑی کچھ حال کر لیے تھے اور اب وہ یہ پروگرام بنا رہا تھا کہ پنتالیس سال کا ہونے سے پہلے یہ دولت کم از کم دگنی ہو جائے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ابھی امریکہ میں اس سے زیادہ کئی دولت مند موجود تھے۔ لہٰذا وہ دن رات دولت کو بڑھانے کے منصوبے سوچتا اور ان پر عمل کی راہیں نکالتا رہتا تھا۔ ابتدا میں وہ اپنی بیوی سے ہنس بول لینے کا وقت بھی نکال لیا کرتا تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ وقت بھی اس کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اُدھر ہیلن نے بھی المیسری کی طرف توجہ دینی چھوڑ دی۔ اس کا بیشتر وقت مہنگے سے مہنگے بیوٹی سیلونوں میں گزرتا تھا یا

کو اپنے شباب اور حسن کی بڑی فکر تھی۔ بلاشبہ وہ چھتیس برس کی ہو چکی تھی۔ لیکن دیکھنے میں تیس برس سے بھی کم عمر کی لگتی تھی۔ غرض دونوں میاں بیوی اپنی دھن میں مست اور خوش تھے اور کسی کو کسی سے شکایت نہ تھی۔

سبھی کچھ ٹھیک ٹھاک رہتا اگر المیسری نے اپنی خاتون سکریٹری کو ملازمت سے ایکاایکی جواب نہ دیا ہوتا۔ وہ مدت سے اس مفروضے پر ایمان رکھتا تھا کہ تمام عورتیں "عقلمند بے وقوف" ہوتی ہیں اور اسی لیے اس نے عورت کے بجائے اس مرتبہ ایک خوش شکل اور کم عمر نوجوان مرد کو سکریٹری کی حیثیت سے ملازم رکھا تھا۔ اس کا نام تھا پال فنٹن۔ جو خوبصورت، خوش اطوار ہونے کے ساتھ ساتھ کنوارا بھی تھا۔

اپنے شاندار مکان کی تیسری منزل کے ایک سجے سجائے دفتر میں بیٹھ کر المیسری اپنی دولت کو مزید بڑھانے کے منصوبوں پر غور وخوض کیا کرتا تھا۔ اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ حکومت بدل جاتی ہے یا کوئی صدر قتل ہو جاتا ہے یا امریکہ اور روس میں ایٹمی جنگ کا خطرہ لوگوں کے سروں پر منڈلانے لگتا ہے۔ اُسے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اس کا پرائیوٹ سکریٹری زندہ سلامت رہے۔ اپنے آقا کے دفتری اور ذاتی امور کی دیکھ بھال کے علاوہ نوجوان پال فنٹن کے ذمے یہ کام بھی تھا کہ وہ ہیلن کے معاملات کی چھان بین اور نگرانی خفیہ طور پر کرتا رہے اور کھلے عام ہیلن کے دوستوں کو دی جانے والی دعوتوں کا اہتمام سلیقے سے کرے۔ جیسا کہ بتایا گیا پال ایک خوش پوش، خوش کلام اور خوش شکل نوجوان تھا۔ آہستہ آہستہ ہیلن نے اُسے اپنے قریب کر لیا اور اس کے نزدیک ہونا شروع کر دیا لیکن اس احتیاط سے کہ نہ تو اس کے شوہر کو کوئی شک ہو اور نہ پال کسی اضطراب میں مبتلا ہو۔ ایک دو موقعوں پر ہیلن اُسے اپنے ساتھ تھیٹر میں بھی لے گئی، مگر المیسری کی اجازت سے۔

رفتہ رفتہ پال پر بھی منکشف ہونے لگا کہ اس کے آقا کی بیوی کی بڑھتی ہوئی نوازشوں اور کرم فرمائیوں کا مطلب کیا ہے۔ پال کی

چیٹی جس نے اُسے حوصلہ دیا اور وہ کھُل کر اُس کے اشاروں پر چلنے میں مسّرت محسوس کرنے لگا۔ ہیلین اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی ہے۔ لیکن اس کھیل میں ایک لذت انگیز خطرہ بھی تھا جس سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہیلین نے اسے مزید دلچسپ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن یہ جو کچھ بھی خاموشی سے شروع ہوا تھا۔ اچانک جذبات کا آتش فشاں بن کر دونوں پر چھا گیا اور انھیں بے بس کر دیا۔ ہیلین اور پال کو یقین ہونے لگا کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے ہیں اور المیری کا وجود ان دونوں کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ مگر محض یہ سوچ ہی لینے سے کچھ فائدہ نہ تھا۔ پال کو المیری یا ہیلین کی دولت سے دلچسپی نہ تھی اسے واقعی اپنے سے دُگنی عمر کی عورت سے محبت ہو گئی تھی اور وہ ہر قیمت پر اُسے پا لینا چاہتا تھا۔ یہی حال ہیلین کا تھا اگرچہ وہ بھی پال کے عشق میں اندھی ہو رہی تھی لیکن عقل کا خانہ بہر حال خالی نہ تھا۔ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ذہین بھی تھی۔ اُسے کسی قسم کی بھی غلط فہمی نہ تھی کہ اگر وہ اپنے شوہر سے طلاق طلب کرے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ہیلین کے پاس مال و دولت مزید تھی مگر اتنی نہیں جو پال اور اس کے لیے مستقل عیش و عشرت کی ضامن ہوتی۔ بھوک میں قائم کی ہوئی محبت کی عمارت اس کے نزدیک محض حماقت تھی۔ پھر وہ یہ بھی ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ المیری کی بے پناہ دولت سے محروم ہو جائے۔

چند ہفتے وہ بے حد الجھن اور اضطراب میں رہی۔ بے شمار تدبیریں اور طریقے اس کے زرخیز ذہن میں آئے جن پر عمل کر کے ایک پنتھ دو کاج والے محاورے کو سچ کر دکھایا جا سکتا تھا۔ لیکن ذرا سے غور و فکر کے بعد ہر طریقے اور ہر تدبیر میں کوئی نہ کوئی خامی یا خطرہ برآمد ہو جاتا اور وہ اُسے ترک کر کے دوبارہ سوچ بچار کرنے لگتی۔ کھانے کی میز پر جب کبھی المیری اور ہیلین کا آمنا سامنا ہوتا تو المیری کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ

دیکھ کر ہیلن اکثر بوکھلا جاتی۔ اسے خیال ہوتا شاید المیسری سب کچھ جانتا ہے، سب کچھ سمجھتا ہے اور اب واقعات کی رفتار دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہا ہے۔ کیا واقعی ایسا تھا؟ اسے اپنے شوہر کی سفاکی اور اعلیٰ درجے کی ذہانت کا بخوبی علم تھا۔ اگر یہ دونوں صفات اس میں نہ ہوتیں تو وہ صرف بتیس برس کی عمر میں ایک معمولی آدمی سے کروڑپتی نہ بن سکتا تھا۔ دولت مند بننے کے لیے سفاکی اور ذہانت کتنی ضروری ہیں۔ اگر سچ مچ ایسا ہی تھا، تو المیسری بلی کی طرح چوہے سے کھیل رہا تھا۔

ایسی باتیں فرض کر کر کے ہیلن کی بے تابی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ غضبناک نظر آنے لگتی تھی یہاں تک کہ وہ المیسری سے ہمیشہ کے لیے نجات پانے کی تدبیروں پر غور کرنے لگی وہ لفظ "قتل" کو پسند نہیں کرتی تھی، مگر جو تدبیر بھی سامنے آتی اس میں بہرحال یہ ناپسندیدہ لفظ ضرور چمک رہا ہوتا۔۔۔ لیکن ہیلن آسانی سے ہار ماننے والی عورت نہ تھی۔ سوچتے سوچتے وہ ایک بہترین اور خامیوں سے بالکل مبرا منصوبے پر پہنچ ہی گئی۔ اس روز اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

منصوبے پر عمل کرنے کا موقع اس دن تک نہیں آیا جس دن وہ موسم سرما والے مکان میں جانے کے لیے سترہویں شاہراہ والے محل سے رخصت ہونے کے لیے ضروری سامان تیار کر رہے تھے ہیلن تیسری منزل پر اپنے شوہر کے دفتر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ المیسری اپنی میز پر پال کے ساتھ کاغذوں کی الٹ پلٹ میں الجھا ہوا تھا۔ ایک گھنٹے سے کم وقت میں انہیں رخصت ہونا تھا۔ تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ فرنیچر پر غلاف چڑھایا جا چکا تھا۔ ساتھ جانے والا اسباب نیچے کے بڑے کمرے میں تھا اور نوکروں کو تنخواہیں دی جا چکی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد حساب کتاب سے فارغ ہو کر پال فنٹن، ہیلن کے نزدیک آیا۔

"یہ آپ کے ہوائی جہاز کے ٹکٹ ہیں۔" اس نے ٹکٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ہیلن

نے بڑی متانت سے ٹکٹ لے کر اپنے پرس
ں رکھ لیے۔ پھر اس کی نظریں غیر شعوری
ور پر المیسری کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ ہیلن
ی کو غور سے دیکھ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں
پر وہی معنی خیز طنزیہ مسکراہٹ تھی جو اب
ہیلن کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی
تھی۔ وہ کچھ اندازہ نہ کر سکی کہ المیسری اس وقت
کیا سوچ رہا ہے۔ اتنے میں المیسری کی آواز
سنائی دی۔

"کاغذات لے کر پال کو سیدھے جانا
ہے۔ اس لیے میں نے جانسن سے کہہ دیا
ہے کہ اسے اپنے ساتھ کار میں لیتا جائے۔
ہمیں کار کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ہوائی اڈے
تک ٹیکسی میں چلے جائیں گے۔" یہ کہہ کر المیسری
پال سے مخاطب ہوا،
"برٹن سے کہہ دو پندرہ منٹ بعد ایک
ٹیکسی لا کر باہر کھڑی کر دے۔"

پال نے انٹرکام پر برٹن کو المیسری کے
حکم سے مطلع کیا۔ ہیلن کا دماغ اس وقت
نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا جب پال
چلا جائے گا تو وہ گھر میں المیسری کے ساتھ
اکیلی رہ جائے گی۔ وہ اٹھ کر دروازے تک
گئی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا
ویسے وہ بظاہر پرسکون نظر آ رہی تھی۔ اس
نے المیسری سے کہا۔ "ہمیں برٹن کی بھی ضرورت
نہیں رہے گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

المیسری نے اثبات میں گردن کو جنبش
دی اور اس کے لبوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ
گہری ہو گئی۔

ہیلن کے ذہن میں جو منصوبہ تھا اب
اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا وقت آ رہا تھا
اگر اب نہیں، تو پھر کبھی نہیں۔ یہ طے پایا
تھا کہ وہ المیسری ساتھ ہی ہوائی اڈے
تک جائیں گے۔ وہاں سے وہ فلوریڈا
کے لیے روانہ ہو جائے گی جہاں ہنڈرسن
فیملی کے ساتھ ایک مہینے تک رہے گی۔
اس کے بعد اپنے سمندر کے کنارے والے
مکان میں واپس آئے گی۔ المیسری شکاگو
جا رہا تھا جہاں مونا ہن کلب میں تین ہفتے
ٹھہر کر وہ بھی ہنڈرسن فیملی کے پاس ہیلن

سے ملنے فلوریڈا پہنچ جاتا۔ پال اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنے کے لیے فلاڈلفیا جا رہا تھا۔ سب کچھ مکمل اور قطعی درست تھا۔ تین ہفتوں تک کسی کو بھی کچھ معلوم نہ ہو سکے گا اور جب المیری مونا ہی کلب میں نہیں پہنچ پائے گا تو وہ لوگ زیادہ سے زیادہ یہ خیال کریں گے کہ اُس نے اپنا پروگرام بدل دیا ہے اور جب المیری کے غائب ہونے کی خبر پھیلے گی تو اس وقت خاصی دیر ہو چکی ہوگی۔۔ اب جو کچھ بھی اُسے کرنا تھا، وہ نہایت آسان تھا۔۔۔ہاں۔ فقط ۔۔۔ ایک معمولی وقفے کا سوال تھا۔۔۔ اور جب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، تو بس ٹیلی فون پر ایک خاص نمبر ڈائل کرنا ہوگا۔۔ سارا پلان محفوظ اور شک و شبہ سے بالا تر تھا۔

کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر وہ اچانک کھڑی ہو گئی اور جب وہ لپک کر کھڑکی کے پاس پہنچی تو کار اس وقت نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی۔ اِس کا مطلب ہے پال جا چکا ہے ــــ اب ہیلن کو صرف برٹن سے پیچھا چھڑانا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی تاکہ اپنا کوٹ، ہینڈ بیگ اور دستانے اٹھا لے۔ ایک آخری نظر آئینے پر ڈالے اور سر پر فر کا قیمتی ہیٹ اچھی طرح جما لے تاکہ زیادہ خوبصورت نظر آئے۔۔ اس کے بعد وہ سیڑھیاں اُترتی ہوئی نچلی منزل میں آگئی۔

"مسٹر المیری نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے برٹن۔۔۔!" اس نے گھر کے پرانے قابلِ اعتماد ملازم سے کہا۔ "وہ ابھی خاصی دیر دفتر میں رکیں گے۔ اُن کا سامان یہیں بڑے کمرے میں رہنے دو۔۔ اور صرف میرا سامان ٹیکسی میں رکھ دو۔۔۔ ہاں ٹیکسی ڈرائیور سے کہہ دو کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں!"

پھر جب برٹن واپس آیا تو ہیلن نے اُسے حکم دیا کہ اب مزید انتظار کی ضرورت نہیں وہ جا سکتا ہے۔ برٹن نے ادب سے ٹوپی کو چھوا اور رخصت ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی ہیلن نے سامنے والے دروازے کو دھکا دے کر اطمینان کر لیا کہ وہ اچھی طرح بند ہے اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ انھیں ٹھیک ساڑھے دس بجے رخصت ہونا تھا اور ابھی

چھ منٹ باقی تھے۔ اس نے کوریڈور کی بتی جلائی
یہ اندرونی کوریڈور ٹب سے کمرے سے باورچی
خانے تک جاتی تھی۔ پھر ایک دراز کھولا۔ جہاں
پر مین سوئچ اور فیوز پینل لگے ہوئے تھے۔
پینل کے نیچے ایک ڈبے میں فیوز کا سب
سامان رکھا تھا۔ وہ اس سامان کو دیکھنے لگی
ان میں کچھ ٹھیک تھے، کچھ جل چکے تھے
ایک جلا ہوا فیوز اس نے نکال لیا اور اُسے
فٹ کر کے آہستہ سے بڑے کمرے میں چلی آئی
اور زینے کے قریب کھڑی ہو کر انتظار کرنے لگی۔

اس کے چاروں طرف مکان کی فضا
بھیانک، خاموش اور سرد تھی۔ ہیلن کو ایسا لگ
رہا تھا جیسے وہ زندگی بھر سے وہیں کھڑی
ہے اور وہیں کھڑی رہے گی۔ وہ کچھ نہ کچھ
سوچنے کی کوشش کرنے لگی، لیکن ذہن
حیرت انگیز طور پر خالی تھا۔ دفعتاً اس نے
سانس روک لیا، اوپر کی منزل سے دروازہ
بند ہونے کی آواز آئی تھی۔ المیری اپنے
آفس سے نکل آیا تھا، پھر بھاری قدموں
کی آواز سنائی دی۔ جیسے وہ اندرونی کوریڈور

میں داخل ہو رہا ہو۔ پھر وہ پھرتی سے فیوز
پینل کے قریب گئی اور فیوز کا کھٹکا کھینچ لیا
جو اس اندرونی راستے کے لیے مخصوص تھا
اس جگہ اس نے وہی کھٹکا لگا دیا جو جل چکا
تھا۔ اچھا کھٹکا اس نے اسی ڈبے میں رکھ کر
دروازہ بند کر دیا تھا۔ ہیلن نے گہرا سانس لیا۔ اب
منصوبے کے اس حصے کا انتظار تھا جس سے
وہ بیحد خوفزدہ تھی۔

اتنی ہولناک چیخ..... وہ اچھل پڑی۔
اندرونی راستے سے ہو کر تیزی سے جب وہ
آگے بڑھی تو اس نے راستے کا پہلا دروازہ
دھڑ دھڑ پیٹے جانے کی آواز سنی اور پھر وہ
بڑے کمرے میں آئی تو دروازہ پیٹنے کی آوازیں
ہتھوڑے کی طرح اس کے سر پہ بج رہی تھیں
ہیلن ایک لمحہ کے لیے بدحواس ہو گئی۔ سنگِ مرمر
کے فرش پر اس کے اونچی ایڑیوں والے
جوتے کی آواز پیدا ہوئی تو اچانک اُدھر سے
آتی ہوئی آوازیں بند ہو گئیں اور جب وہ
سامنے والے دروازے پر پہنچی تو وہی آوازیں
بند ہو گئیں اور جب وہ سامنے والے دروازے

پر پہنچی تو وہی آوازیں بڑی شدت سے دوبارہ شروع ہو گئیں۔ اندوہناک چیخوں کی متواتر آواز نے ہیلن کے کلیجے میں برف سی بھر دی تھی۔

اس نے دروازہ کھولا اور اپنے پیچھے بند کر دیا۔ جب زینے پر کھڑی ہوئی وہ سانس درست کر رہی تھی تو اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی ہی طرف گھورتے ہوئے پایا... وہ لرز گئی... کیا ڈرائیور نے چیخوں کی آواز سن لی؟ اپنے پرس میں کچھ تلاش کرنے کا بہانہ کرتے ہوئے اس نے غور سے سنا۔ ناممکن تھا کوئی آواز اندر سے سنائی دیتی اور دروازہ بھی تو بس ایک لمحے کو کھلا تھا۔

ہیلن نے اپنے آپ کو سنبھالا اور سیڑھیاں اُتر کر ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

"جلدی کرو، نہیں تو میرا ہوائی جہاز چھوٹ جائے گا۔"

طیارے کے اندر اس نے نیند کی ایک گولی کھالی اور ہوسٹس کو ہدایت کر دی کہ اسے جگایا نہ جائے۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو طیارہ فلوریڈا پر پرواز کر رہا تھا۔ ہوائی اڈے پر ہنڈرسن فیملی اُس کے استقبال کے لیے آئی ہوئی تھی۔ سرما کی خوشگوار دھوپ میں وہ سب کے ساتھ ہی سمندر کے کنارے چلی گئی وہاں اس کا وقت بہت اچھا گزرا اور عارضی طور پر وہ اس حادثے کو بھول گئی۔ بعد کے چند دنوں تک ہیلن نے کوشش کی کہ وہ کچھ نہ سوچے۔ اپنے ذہن کو ہر غم اور فکر سے آزاد رکھے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے آپ کو حد درجہ مصروف رکھنا شروع کر دیا۔ زیادہ سے زیادہ وقت سمندر میں تیرنے کا شغل جاری رکھتی، ٹینس کھیلتی یا بازاروں میں بلا مقصد اور غیر ضروری چیزوں کی خریداری میں مصروف رہتی۔ وہ کبھی تنہا نہیں رہی۔ ہر رات کہیں نہ کہیں کسی پارٹی میں ضرور شریک ہوتی اور جب تھک ہار کر بستر پر لیٹتی تو خواب آور گولی کھانا نہ بھولتی... وہ اس قابل تھی کہ سمندر کے کنارے خود کو زندہ دل اور بے فکر رکھے، البتہ چھٹی رات اُس نے ایک خواب دیکھا کہ جیسے کوئی اُس کی خوابگاہ کا دروازہ پیٹ رہا ہے۔ بڑی مشکل سے وہ

خود پر قابو پا سکی اور جب اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو ہینڈل ٹوٹ کر اس کے ہاتھ میں آگیا۔ دروازہ پیٹنے کی آواز بدستور آ رہی تھی اور خوف سے بے قابو ہو کر اس نے دیوانہ وار دروازہ کھولنے کی جدوجہد کی، مگر وہ اس سختی سے بند تھا جیسے کسی چٹان کا حصہ ہو۔

پسینے میں تر بتر وہ چیختی ہوئی بھاگ گئی اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور اوسان خطا تھے۔ بستر پر بیٹھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ مکان گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کسی نے بھی اس کے چیخنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ وہ تمام خدشے جو وہ اب تک ٹالتی چلی آئی تھی۔ یکایک اس کے سامنے ہجوم در ہجوم آن کھڑے ہوئے تھے۔ اُف .... تو کیا وہ مرگیا ہوگا؟ یہ سوال سب سے آگے تھا اور وہ اُسے ٹال نہیں سکتی تھی۔ اس کا ذہن آہستہ آہستہ قابو سے باہر ہوتا جا رہا تھا اس نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ مکان کے اندرونی کوریڈور میں المیسری پھنس چکا ہے اور مدد کے لیے چیخ رہا ہے۔ کبھی فرش کھرچنے لگتا ہے اور کبھی دروازہ پیٹتا ہے اور اس طرح بے بسی سے دم توڑ رہا ہے۔

یہ سب کچھ ہیلن کی قوت برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ کاش وہ کسی سے یہ روداد کہہ سکتی... یکایک اس کی نگاہ سرہانے رکھے ہوئے ٹیلی فون پر پڑی... وہ اسے گھورنے لگی... کیا میں سب کچھ پال کو بتا دوں؟ اس نے دفعتہً فیصلہ کر کے ریسیور اٹھا لیا اور ڈائل گھما کر سلسلہ قائم کیا، لیکن اس سے قبل کہ آپریٹر جواب دیتا اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ باتیں ہمیشہ اپنے سینے ہی میں دفن کر کے رکھنی پڑیں گی۔ اس نے اٹھ کر ایک گلاس پانی پیا۔ خواب آور گولی کھائی اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے بعد وہ ایک بچے کی طرح گہری نیند میں کھو چکی تھی۔

دن ایک ایک کر کے گزرنے لگے ہیلن کی طبیعت پرسکون ہوتی چلی گئی اور تین ہفتے بعد... جو کچھ بھی ہوا وہ اس کے

لیے قصہ ماضی بن چکا تھا۔ اب اُسے کوئی پریشانی نہ تھی۔

ہینڈرسن فیملی ایک پارٹی دے رہی تھی یہ پارٹی اس کی سالگرہ کے سلسلے میں دی جارہی تھی۔ وہ لوئس ہینڈرسن کے ساتھ جب زلفیں سنوارنے والے سیلون تک جارہی تھی تو اس نے پوچھا تھا: "المیری کب تک یہاں پہنچے گا؟" یہ سوال سن کر ہیلن ایک دم چونک پڑی۔ اُسے تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ آج کے دن المیری کو اپنے پروگرام کے مطابق فلوریڈا پہنچنا تھا۔

"میرا خیال ہے اسی سہ پہر کو کسی وقت پہنچے گا۔ اس نے لوئس کو بتایا لیکن اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"کیا اسے یاد ہوگا آج تمہاری سالگرہ ہے؟" لوئس نے ہنس کر پوچھا۔

ہاں، ہاں ضرور یاد ہوگا۔ وہ مجھ سے بڑی محبت کرتا ہے اور ہر سالگرہ پر کوئی نہ کوئی بیش قیمت تحفہ دیتا ہے۔"

کہنے کو تو یہ بات ہیلن نے کہہ دی، مگر اس کی طبیعت کا سکون اندر سے ہل گیا تھا۔ اسے یاد آرہا تھا کہ ابھی دو ماہ پہلے جب وہ دونوں نیلم کا ایک خوبصورت ہار دیکھ رہے تھے تو المیری نے کہا تھا: "یہ بہت مہنگا ہے۔" یہ سن کر ہیلن کو بڑا طیش آیا تھا۔ آخر المیری کی بے پناہ دولت کے سامنے اس ہار کی کیا حیثیت تھی تاہم اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ نیویارک پہنچ کر وہ خود یہ ہار اپنے پاس سے خریدے گی۔

سہ پہر کو پارٹی سے پہلے وہ اپنے کمرے میں آرام کرنے گئی۔ خیال آیا کہ المیری جب تقریب میں نہیں پہنچے گا تو وہ کون سی بات بنائے گی.... ٹھیک.... وہ کچھ یوں ظاہر کرے گی کہ شاید المیری کو مصروفیات کی وجہ سے آنے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ ایک آدھ دن میں بہرحال وہ آہی جائے گا.... اس طرح دو ایک دن گزارنے کے بعد وہ شدید پریشانی کا اظہار کرے گی اور ٹسکاگو میں موناہن کلب والوں کو فون کرکے پوچھے گی کہ المیری کہاں ہے.. پھر وہ

پال کو بھی فلاڈلفیا فون کرے گی اور اسے بتائے گی کہ وہ نیویارک واپس جارہی ہے اور پال، برٹن کو ہدایت کردے کہ ستر ہویں شاہراہ والا مکان کھول دیا جائے۔ وہ پال کو یہ ہدایت بھی کرے گی کہ المیسری کے غائب ہونے کی رپورٹ پولیس کو دے... ... یہ سب کام بطریق احسن ہو جائے گا، اور جب وہ وہاں پہنچے گی تو کام کا ناخوشگوار حصّہ ختم ہو چکے گا، پھر ہیلن سہانے خواب دیکھنے لگی... وہ اور پال دونوں یورپ کی سیر کررہے ہیں اور ان کی شادی ہوگئی ہے...

انہی خیالوں میں مگن جب وہ لباس بدل کر نیچے آئی، تو سیدھی ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ سامنے ہی اس کا شوہر المیسری کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہیلن کا سانس رک گیا اور زمین نے جیسے پاؤں پکڑ لیے۔ اس کا سر چکرانے لگا ــــ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لب تو ہلے، مگر آواز نہ نکلی۔ المیسری کے ہاتھوں میں کسی مشروب کا گلاس تھا اور اس کے ہونٹوں پر وہی طنزیہ مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی: "ہیلن؟" اس نے کہا: کیا بات ہے؟ تم خوفزدہ نظر آتی ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

ہیلن کے حواس ہی ٹھکانے نہیں تھے وہ جواب کیا دیتی۔ المیسری اس کے سامنے ایک بھوت کی طرح اچانک نمودار ہو گیا تھا۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ یہ کیا ہو گیا ہو بھی کیسے سکتا تھا؟ کیا ٹیکسی ڈرائیور نے اس کی مدد کی تھی یا برٹن نے؟ صرف وہی تھا جس کے پاس کنجی تھی۔ ممکن ہے برٹن جاتے وقت اپنی کوئی چیز بھول گیا ہو اور دوبارہ مکان میں واپس آیا ہو...

اُسے پھر چکر سا آیا لیکن فرش پر دھڑام سے گرنے کے بجائے وہ دھم سے ایک کرسی میں دھنس گئی۔

"میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔" اس نے کہنا چاہا، مگر الفاظ سرگوشیوں سے آگے نہ بڑھے۔ المیسری ہنستا ہوا ایک میز کی طرف بڑھا اور گلاس میں پانی لے کر آیا۔ اس نے کچھ کہے بغیر گلاس ہیلن کے ہاتھ میں دے دیا۔

ہیلن نے پانی اس طرح پیا جیسے برسوں کی پیاسی ہے۔ المیسری دوسری کرسی پر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور سگار سلگا لیا۔ آہستہ آہستہ ہیلن کے حواس بحال ہونے لگے... توانائی واپس آگئی.... پلکوں کی آڑ سے اس نے المیسری کا جائزہ لیا اور اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی، تو دیکھا کہ المیسری خود اس کا چہرہ پڑھنے میں مصروف ہے۔ تبھی اس نے اپنا سگار ایش ٹرے میں رکھ دیا اور کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"ہیلن اس بار میں نہیں بھولا۔" المیسری نے کہا اور جیب میں سے سیاہ رنگ کا چھوٹا سا خوش نما ڈبہ نکال کر آگے بڑھایا۔ "لو، یہ تمہارا سالگرہ کا تحفہ۔"

کچھ حیرت، کچھ اندیشے اور کچھ تذبذب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ہیلن نے وہ ڈبہ لے لیا اور اسے کھول کر دیکھا۔ اندر سفید ساٹن کے کیس میں نیلم کا وہی بیش قیمت ہار جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ از حد تعجب کے ساتھ ہیلن نے پہلے ہار کو دیکھا، پھر اپنے شوہر کو ـــ وہ برابر مسکرا رہا تھا۔

"تم... تم نے کب یہ خریدا؟"

"میں نے اسی دن خرید لیا تھا۔ جس صبح کو ہم روانہ ہونے والے تھے۔ میں شکاگو جانے سے پہلے اُسے خریدنا چاہتا تھا۔"

"تم اسی دن یہ خریدنے گئے تھے؟" ہیلن نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"ہاں.... اسی لیے میں تمہارے ساتھ ہوائی اڈے بھی نہیں گیا تھا۔" المیسری نے کہا: "میں نے پال سے کہہ دیا تھا کہ وہ تمہیں مطلع کردے کہ کاغذات میں خود ہی لے کر جا رہا ہوں۔ میں تمہیں اچانک یہ تحفہ دے کر حیران کر دینا چاہتا تھا۔"

ہیلن کے کانوں میں شائیں شائیں ہونے لگی۔ المیسری کی آواز کسی اندھے کنوئیں میں سے آرہی تھی۔

"اوپر والی منزل میں پال تھا کیا؟" ایک دم وہ چلائی۔

"ہاں ـــ میں نے اُسے دفتر ہی میں چھوڑ دیا تھا کہ باقی ماندہ کام ختم کر لے۔"

وہ بڑی مشکل سے اُٹھ کر کھڑی ہوئی

جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ الیسری مسکرا رہا تھا۔۔۔ وہی طنزیہ۔۔۔۔۔۔ فاتحانہ مسکراہٹ۔۔۔۔۔۔ اس نے کہا:

میں اپنا بیگ لینے کے لیے واپس گھر گیا تھا۔۔۔ پال اس وقت وہیں موجود تھا۔۔۔"

ہیلن کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ وہ بالکل گونگی ہو چکی تھی اور چہرہ دھواں دھواں تھا۔

"اور جب میں دوبارہ گھر سے جانے لگا تب بھی پال وہیں تھا" الیسری نے سادگی سے کہا اور مسکرانے لگا۔

مغربی تہذیب کا ماخذ

اس میں شک نہیں کہ مغربی تہذیب گذشتہ چند صدیوں میں یورپ ہی سے نکل کر ساری دنیا میں پھیلی ہے لیکن اسکی پیدائش بالعلم یورپ میں نہیں ہوئی اور نہ یہ کوئی نئی تہذیب ہی ہے بلکہ ہزاروں سال سے جو تہذیبی سرمایہ نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا چلا آرہا تھا اسی کی ایک نئی اور ترقی یافتہ شکل ہے نیز اسکے تعمیر میں یورپ کے علاوہ ایشیا اور افریقہ کی قومیں بھی شریک رہی ہیں اسکی تاریخ ایک لاکھ اور بعض کے نزدیک دس لاکھ سال پرانی ہے اسکی ابتدا اس وقت ہوئی جب انسان وجود میں آیا اور اسکی ابتدائی نشوونما اس دور میں ہوئی جب انسان غاروں میں رہتا اور شکار پر اپنی زندگی بسر کرتا تھا اس طرح اسکی بنیادیں "غیر مہذب" اور "وحشی" انسانوں نے استوار کیں۔ اب سے تقریباً چھ ہزار سال پہلے لوگ لکھنے پڑھنے کے فن سے آشنا ہوئے۔ تب ہی سے تاریخی دور کا آغاز ہوا۔ (مغربی تہذیب مرتبہ محمد ذکی پہلا باب صا)

نوٹ:۔ جب فکری بنیاد وحشی انسانوں کی تہذیب سے ماخوذ ہوگی تو ویسے ہی نتائج ہمارے سامنے آئیں گے پھر جو کچھ آج ہو رہا ہے اُسے برداشت کیجئے یا پھر فکری بنیاد کا کوئی تعمیری ماخذ تلاش کیجئے۔ (م)

ناقابلِ فراموش

نیکی کا صلہ

اتوار کے روز دریا گنج دہلی میں ایک طرف فٹ پاتھ پر دور تک کتابوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک خزانہ بکھرا پڑا ہے۔ ردی کے برابر کوڑیوں کے مول جن کو لکھنے کے لیے لوگوں کی عمریں صرف ہو گئیں۔ ان کی کاوشیں سڑک پر دور تک پھیلی دکھائی دیتی ہیں۔ اتوار کے روز سیر و گشت کرتا ہوا خاکسار کہیں سے کہیں نکل جاتا ہے۔

میں کتابوں کے ایک ڈھیر کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ میرے برابر دو بچے آ کر بیٹھ گئے جن کی عمر ۱۲-۱۳ سال کی تھی۔ وہ بھی پرانے رسالے دیکھنے لگے۔ میں بھی پرانے رسالوں کا مریض ہوں۔ ان بچوں نے دو چار رسالے خریدے جن کی قیمت ڈھائی روپے ہوتی تھی۔ لڑکے نے پانچ کا نوٹ کتاب والے کے حوالے کر دیا۔ کتاب بیچنے والا یا تو کسی نشہ میں ہوگا یا اس کا دھیان کہیں اور ہوگا۔ اس نے ان بچوں کو ساڑھے سات روپے واپس کر دیے۔ بچے نے ہاتھ میں پیسے لیے اور پانچ کے نوٹ کا اضافہ دیکھ کر سوچنے لگا۔ اس کے ضمیر نے فوراً جھنجھوڑا کہ یہ رقم زائد آ گئی۔ فوراً پانچ کا نوٹ واپس کر کے بولا۔ بھائی! میں نے پانچ کا نوٹ دیا اور آپ پانچ روپے فالتو دے رہے ہیں۔ کتاب والے نے ہنس کر نوٹ واپس لے لیا۔ اور فرمایا کہ مجھ سے مغالطہ ہو گیا اور بچوں کی ایمانداری پر آفرین کے

جلے کہے۔ اس پر بچہ نے بھولے پن سے کہا بھیا۔ تمہارا پانچ کا نوٹ رکھ کر کونسا بھلا ہوجاتا۔ اگر ہم ایسا ہو کر دیں تو ہمارا پڑھنا ہی بیکار ہے۔

میں نے اس کے شیریں اور حسین جملے کی طرف بہت دھیان دیا کہ ہمارا پڑھنا ہی بیکار ہے۔ میں ان بچوں کی معصوم صورت کو دیکھ کر سوچنے لگا۔ ان بچوں کے سامنے زندگی کا صحیح مقصد ہے۔ یہ معصوم ہیں۔ دنیا کے دھوکے، فریب، چالبازی کی ان کو کوئی خبر نہیں۔ یہ فرشتوں کی عادت ہوتی ہے۔ بچے اٹھ کر چل دیے۔ دل نے چاہا خواہ یہ بچے ہندو کے ہوں یا مسلمان کے۔ ان کو دل میں بسا لوں اور آنکھوں میں بٹھا لوں وہ آگے نکل گئے۔ میں بھی اٹھ کر ان کے تعاقب میں چل دیا۔ کہاں جاتے ہیں۔ کس محلے کے رہنے والے ہیں۔ ان کے کون سے خوش نصیب ماں باپ ہیں۔

وہ دونوں پٹودی ہاؤس کی طرف چل دیے۔ پٹودی ہاؤس کی طرف آمد و رفت کم رہتی ہے۔ میں بھی ادھر کو ہو لیا۔ چلتے چلتے راستے میں ان کو ایک پلاسٹک کا تھیلا ملا لڑکی نے ادھر ادھر دیکھ کر گویا گھبراتے ہوئے اس تھیلے کو اٹھا لیا۔ دونوں اس کو کھول کر دیکھنے لگے۔ اتنے میں قدم بڑھا کے میں بھی پہنچ گیا۔ فوراً بولے۔ یہ تھیلا آپ کا تو نہیں۔

میں نے کہا بیٹے۔ میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔ میرا کیسے ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کھول کر دیکھا تو اس میں چند کاغذات اور ایک پاسپورٹ تھا۔ میں نے ان بچوں کو کہا کہ یہ کاغذات اور پاسپورٹ تمہارے لیے بیکار ہیں جس کے کھو گئے ہوں گے وہ بے چارہ بہت پریشان ہوگا۔ اس کو اپنے پاس احتیاط سے رکھو۔ اخبار میں گمشدہ کی تلاش کی خبریں آتی رہتی ہیں جس کا ہوگا اس کے گھر پہنچا دینا۔ یا ایک خط لکھ دینا۔"

وہ اپنے گھر چلے گئے۔ میں کلاں محل کی طرف چل دیا۔ تین روز کے بعد اخبار میں ایک گم شدہ تھیلے کے بارے میں اشتہار

پڑھا میں نے پہچان لیا یہ وہی صاحب ہیں انھوں نے پچاس روپے کا انعام رکھا۔ ایک اخبار لے کر میں نے ان بچوں کو دکھایا کہ اس پتہ پر ایک خط لکھ دو۔"

ان دونوں بچوں کو علم نہیں تھا کہ کتاب خریدتے وقت میں بھی ان کے برابر بیٹھا تھا اور ساری باتیں سن رہا تھا۔ یہ پانچ کا نوٹ واپس کر دینے کی نیکی کا غائبانہ صلہ تھا جن کے سامنے زندگی کے صحیح اور نیک مقصد ہوتے ہیں۔ ان کو قدرت ہر طرح سے فیض پہنچاتی ہے اور پھر دو روز کے بعد ایک صاحب نے دونوں بچوں کو ۵ روپے دے دیے اور بچوں کا شکریہ ادا کیا۔ کہ انھوں نے قیمتی کاغذات اور پاسپورٹ کو برباد نہیں کیا!" (عثمان شاکر دریا گنج دہلی)

گناہ سے بچ گیا

یہ واقعہ ۱۹۶۲ء کا ہے۔ ان دنوں میں ضلع گوالیار میں بطور ہیلپر کام کرتا تھا میری ڈیوٹی ڈرائیوروں کے ساتھ ہوا کرتی تھی ڈرائیوروں کے سبھی کام مجھے کرنے پڑتے تھے۔ میری ڈیوٹی ایک بار جوزف نامی ایک مدراسی ڈرائیور کے ساتھ لگ گئی۔ وہ ڈرائیور روزانہ شراب پینے کا عادی تھا۔ مجھے روزانہ شام کو ۴ بجے اپنے کوارٹر کی چابی دیتا تھا اور ایک شیشی جس میں مجھے روزانہ شراب لانی پڑتی تھی ایک روز میں کوارٹر میں بوتل سے شیشی میں شراب انڈیل رہا تھا کہ میری نیت بدل گئی۔ پاس ہی میز پر رکھا ہوا ایک گلاس اٹھایا اور تھوڑی شراب گلاس میں ڈالکر شراب پینے کا ارادہ کر لیا مگر ضمیر نے فوراً روکا۔ چونکہ شراب ہمارے مذہب میں حرام چیز مانی گئی ہے چنانچہ میرے دل نے شراب پینا گوارا نہیں کیا اور میں ایک بہت بڑی غلطی سے بچ گیا۔ (قدیر احمد دہلی)

جس کو راکھے سائیاں

سینکڑوں افراد آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے جبکہ ایک ہوائی جہاز ہوا میں قلابازیاں کھا رہا تھا۔ یہ کسی ہواباز کے کرتبوں کا مظاہرہ نہیں تھا، بلکہ انجن میں خرابی کے باعث پائلٹ کے قابو سے باہر ہوگیا تھا اور مہلک حادثہ ناگزیر تھا۔

یکایک جہاز نے غوطہ کھایا اور نیچے کھڑی ایک مال گاڑی پر زوردار دھماکے کے ساتھ گر کر پاش پاش ہوگیا۔ پولیس ایمبولینس گاڑیاں اور فائر بریگیڈ کا عملہ جائے حادثہ کی طرف لپکا لیکن ان کی حیرانی کی حد نہ رہی کہ ماسوائے پائلٹ کے، باقی سب لوگ محفوظ تھے۔ معمولی خراشوں کے علاوہ کسی کا بال بیکا نہ ہوا تھا۔

یہ حادثہ انگلینڈ کے لی بوریاگیٹ ہوائی اڈہ کے قریب گزشتہ دسمبر کو ہوا تھا۔

اب پائلٹ کی تلاش شروع ہوئی۔ بچاؤ ٹیموں نے جہاز کا سارا ملبہ چھان مارا۔ مگر اس کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ لوگ حیران تھے کہ آیا اسے زمین نگل گئی یا وہ ہوا میں غائب ہوگیا۔ مگر گلاسکو کا باشندہ ۲۷ سالہ پائلٹ آرنلڈ فروش تھوڑی دیر بعد ریلوے کینٹین میں بڑے مزے سے کافی پیتے پایا گیا۔ بچاؤ ٹیم کے ممبروں نے جب آرنلڈ فروش سے پوچھا تو اس نے نہایت اطمینان سے بتایا کہ ہوائی اڈہ سے تھوڑی دور جہاز کا انجن خراب ہوگیا میں نے بہت کوشش کی کہ جہاز حادثہ سے بچ جائے مگر بات میرے بس سے باہر ہوگئی۔ ہم سب لوگوں نے اپنے آپ

کو خدا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، اتنے میں جہاز مال گاڑی پر دھڑام سے جا گرا۔

نہ جانے کس طاقت نے مجھے کاک پٹ سے اچھال کر ریلوے لائن کے اس پار لا پھینکا۔ میں اُٹھا، اپنے کپڑے جھاڑے اور گڈز یارڈ کی کینٹین میں جا بیٹھا۔"

موت کے منہ سے بال بال بچنے کی بیسیوں وارداتیں آئے دن پڑھنے اور سننے کو ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقتور ہے۔

ایک اور واقعہ سنئے:۔

پیپتا ہیریسن نامی لڑکی اپنی کار میں بیٹھ کر امتحان دینے کے لیے سنٹر کی طرف روانہ ہوئی۔ جب وہ دریائے کریو کے پل کو پار کر رہی تھی کہ اس کی کار کا اسٹیرنگ خراب ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کار ۲۰ فٹ نیچے دریا میں جا گری۔

ایک اور کار والے نے جب یہ حادثہ دیکھا تو اس نے نزدیکی پولیس چوکی کو مطلع کیا۔ پولیس کو ساتھ لیکر جب وہ جائے حادثہ سے جا پہنچے دو میل پہنچا تو وہ لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کوئی سو گز دور ایک لڑکی پانی سے بھیگی ہوئی دریا کے کنارے ایک درخت کی شاخیں تھامے کھڑی ہے۔ پولیس کرمچاریوں نے وہاں پہنچ کر اُسے اٹھایا اور فوراً ہسپتال لے گئے۔ جہاں پیپتا نے سہمی ہوئی آواز میں بتایا کہ جب بے قابو کار دریا میں گری تو اس کا دروازہ کھل گیا جس سے وہ باہر گر پڑی اور پانی کے بہاؤ کے ساتھ کنارے پر کھڑے اس درخت کے نزدیک جا پہنچی اُس درخت کی بڑی بڑی شاخیں پانی کو چھو رہی تھیں۔ میں نے جھٹ سے شاخوں کو پکڑ لیا اور اس طرح ڈوبنے سے بچ گئی۔"

پیپتا نے نہایت معصومیت کے ساتھ بسورتے ہوئے کہا کہ "میری ساری کتابیں اور امتحان کے لیے بڑی محنت سے تیار کیے گئے نوٹ پانی میں بہہ گئے ہیں۔"

(ماخوذ)

ایسا بھی ہوتا ہے

شین مظفرپوری

آج خلافِ معمول کانپور کے پلیٹ فارم پر جنتا ایکسپریس کے لئے زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ رگھوبیر سنگھ بڑی بے چینی کے ساتھ ٹرین کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے بڑی عجلت تھی۔ لکھنؤ سے آنے والی لوکل ٹرین میں ایسی کھچا کھچ بھیڑ میں سفر کرنا پڑا کہ رگھوبیر سنگھ کی طبیعت بدمزہ ہو گئی۔ اس کی بڑی بڑی مونچھوں اور موٹی موٹی آنکھوں والی بارعب صورت سے کسی اندرونی پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کے پُرگوشت اور بھاری گلوں پر شیو بڑھا ہوا تھا، لباس ملگجا سا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ سامان بھی نہیں تھا۔ بس ایک تھیلا ہاتھ میں جھول رہا تھا۔ جس میں شاید ایک دو جوڑے کپڑے ہوں گے۔ دیکھنے سے ایسا لگتا تھا جیسے کسی فوری کاروباری ضرورت سے اس نے دلّی جانے کا ارادہ کیا ہو اور پھر دوسری ٹرین سے واپس لوٹنے والا ہو۔

ٹرین پندرہ منٹ لیٹ تھی۔ رگھوبیر سنگھ نے ہونٹ پچکا کر جیسے زیرِ لب کہا:

بہت ترے کی! کم بخت ٹرین کو بھی آج ہی لیٹ ہونا تھا —! گویا اس وقت رگھوبیر سنگھ کا ہر منٹ قیمتی تھا۔

جب ٹرین کے پہنچنے میں دس منٹ رہ گئے اور آؤٹر سگنل ڈاؤن ہو گیا تو بے چینی کے ان لمحات کو چائے کی پیالی میں غرق کر دینے کے لئے ٹی اسٹال پر جا کھڑا ہوا

"کہئے رگھوبیر جی، لکھنؤ سے یہاں کیسے پدھارے؟"

ارے بھائی کیا بتاؤں۔ دلی میں

کر مال کی ڈیلیوری کرانا ہے۔ بینک میں بلٹی سڑ رہی ہے اور پارٹی کان میں تیل دیئے پڑی ہے۔ آدھی پونجی پھنس کر رہ گئی ہے بڑا نقصان ہو رہا ہے، اسی لئے مجھے چلنا پڑ رہا ہے۔" رگھوبیر سنگھ نے دوسری چسکی بھرتے ہوئے کہا "منحوس ٹرین کو بھی آج ہی لیٹ ہونا تھا۔ جنتا پکڑتا ہے کیا تم بھی کہیں چل رہے ہو؟"

ملاقاتی نے ذرا مسکرا کر سرگوشی میں کہا: نہیں، میں ایک مال کی ڈیلیوری لینے آیا ہوں۔ اپنا کاروبار تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا پڑتا ہے۔ مال گودام میں اپنا ایک آدمی ڈیلیوری لے رہا ہے۔ میں ادھر ادھر کھسک آیا ہوں۔"

رگھوبیر سنگھ آدھی چائے ختم کر چکا تھا پلیٹ فارم پر ٹرین کے پہنچنے سے پہلے والی ہلچل شروع ہو گئی۔ وہ چائے کو چھوڑ کر پیسے دیئے بغیر ایسی بدحواسی سے لپکا جیسے اسے ڈر ہو کہ ٹرین اسے چھوڑ کر بھاگ نکلے گی۔ جب ٹی اسٹال والے نے پیچھے سے آواز دی تو وہ جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوا ہڑبڑا کر پلٹا۔

ابھی وہ پیسے دے ہی رہا تھا کہ ایک شخص نے پیچھے سے اس کے ملاقاتی کا کالر تھام کر کہا "چلو۔" یقیناً یہ سادہ لباس میں پولیس کا سپاہی تھا۔

رگھوبیر سنگھ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

اور جب اس کے ملاقاتی نے مری ہوئی آواز میں احتجاجاً سوال کیا۔ "کیا بات ہے؟" تو پکڑنے والے نے ذرا دور پر پیچھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"چلو۔ مال کی ڈیلیوری لے لو!"

ریلوے کانسٹبل نے اس آدمی کو گرفتار کر رکھا تھا جس کو رگھوبیر سنگھ کے ملاقاتی نے گانجے کی ڈیلیوری لینے پر مامور کیا تھا۔ رگھوبیر سنگھ کے چہرے کا رنگ تو پلٹ آیا مگر وہ اتنا خوفزدہ ہو گیا

کہ ذرا بھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ گرفتار ہونے والا اس کا شناسا سا تھا۔ ٹی اسٹال والے کو اس نے پانچ روپے کا نوٹ دیا مگر واپسی کی رقم لئے بغیر ہی وہ چل پڑا۔ چائے والے نے آواز دی تو رگھوبیر سنگھ نے پلٹ کر صرف اتنا کہا "پھر لے لوں گا۔"

ٹرین پہنچی تو اس نے جونہی کمپارٹمنٹ میں داخل ہونا چاہا ایک بڑے سے ٹرنک نے اس کا رستہ روک دیا۔ دو مضبوط قلیوں نے ایک کے بعد دوسرا ٹرنک لادا۔ تب جا کر رگھوبیر سنگھ کو اندر جانے کا راستہ ملا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک گھریلو ڈھنگ کی جواں عورت ہاتھ میں چھوٹی سی اٹیچی لئے داخل ہوئی۔ دونوں نئے اور وزنی ٹرنک اسی کے تھے۔ ایک لکڑی کا تھا، دوسرا اسٹیل کا بنا تھا۔

اتفاق سے اس عورت کو رگھوبیر سنگھ کے سامنے ہی سیٹ ملی۔ ٹرین چل پڑی تو رگھوبیر سنگھ کو قدرے سکون ہوا اس نے اپنے تھیلے کو گود میں سنبھال کر پکڑا۔ اس تھیلے کو وہ اِدھر اُدھر رکھ بھی کیسے سکتا تھا۔ اس میں تو پانچ ہزار روپے تھے یہ روپے بڑی قیمت اور اہمیت کے تھے۔ ایک انسانی زندگی کی قیمت، ایک قتل کا معاوضہ۔

ٹرین ہوا سے باتیں کرتی بھاگ رہی تھی۔ رگھوبیر سنگھ خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔ اس نے اپنی زندگی میں کئی قتل کئے تھے، مگر خوف اور پریشانی کا احساس آج اس کو پہلی بار ہوا تھا۔ وہ بھی شاید اس لئے کہ اس بار اس نے ایک جوان لڑکی کو قتل کیا تھا۔ لڑکی کی دولت پر نظر رکھنے والے نامراد عاشق نے رگھوبیر سنگھ کو پانچ ہزار روپے دیکر اس کو قتل کروا دیا تھا۔ کل رات کو رگھوبیر سنگھ اس کو اکیلے میں قتل کر کے اس کی لاش اپنے ایک پرانے دشمن کلو استاد کے گھر کے آس پاس پھینک دی تھی تاکہ ایک پنتھ دو کاج ہو جائے اور خود لکھنؤ سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ وہ کلو استاد کی خبر دلّی میں سننا چاہتا تھا۔

سامنے بیٹھی ہوئی عورت رگھو بیر سنگھ کی خوفناک شکل کو بار بار گھور رہی تھی۔ زیورات اور کپڑوں سے وہ متمول گھرانے کی نظر آتی تھی۔ رگھو بیر سنگھ کو عورت سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ پیشہ ور قاتل ہونے کی وجہ سے اس کو بس شراب اور جان لیوا ہتھیار عزیز تھے۔ مگر یہ عورت اس کو بھی اچھی لگی۔

رگھو بیر سنگھ نے کسی بہانے سے اس عورت سے گفتگو شروع کر دی۔ عورت بے تکلف اور زندہ دل نکلی۔ باتوں باتوں میں رگھو بیر سنگھ نے اس کا سارا حال معلوم کر لیا۔ وہ ساس کے مظالم سے تنگ آ کر اور دائم المریض شوہر کو چھوڑ کر اپنے میکے واپس جا رہی تھی۔ نقدی زیورات، قیمتی کپڑے اور چاندی کے برتن وغیرہ سب اس نے سسرال والوں سے واپس لے لئے تھے۔ اس نے رگھو بیر سنگھ کے کریدنے پر دبی زبان سے یہ بھی بتا دیا کہ اب کچھ دن میں وہ اپنی پسند کے آدمی سے دوسری شادی کا ارادہ رکھتی ہے۔ بشرطیکہ وہ مرد تیار ہو۔

رگھو بیر سنگھ بھی تنہا تھا۔ چند گھنٹوں کی ملاقات میں اس عورت کی طرف سے لگاوٹ کے کچھ ایسے اشارے ملے کہ رگھو بیر سنگھ بھی جھوم اٹھا۔ پھر وہ اور گھر گرہستی کے خیالوں میں کھو گیا۔ اس نے یہ بھی طے کر لیا کہ اب وہ جرائم کی دنیا تیاگ کر بھلا آدمی بن جائے گا۔

علی گڈھ کے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو وہ عورت کھڑکی سے جھانک کر اچانک گھبرا اٹھی اور پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے ایک خوش پوش آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "وہ میرے پتی کا بڑا بھائی ہے۔ یہیں علی گڈھ میں رہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ان لوگوں نے میرے گھر سے چلے جانے کا تار دے دیا ہے۔ اگر اس نے مجھے دیکھ لیا تو ضرور گڑبڑ کرے گا۔ وہ دیکھ ڈبوں میں جھانکتا رہا ہے۔" یہ کہتے کہتے اٹھ کھڑی

اور اوپر کی برتھ سے اٹیچی اتار کر رگھوبیر سنگھ کے ہاتھ میں دیتی ہوئی بولی۔ ”میرا سامان آپ کی امانت میں۔ میں نیچے اتر کر جب جاتی ہوں۔ جب گاڑی چھوٹنے لگے گی تو میں اس کی نظر بچا کر کسی بھی ڈبے میں چڑھ جاؤں گی، پھر دلی اسٹیشن پر مل جاؤں گی۔“

وہ عورت نکل کر بھیڑ بھاڑ میں کھو گئی۔

جب ٹرین چل پڑی اور رفتار بڑھنے لگی تو رگھوبیر سنگھ نے اس عورت کو ٹرین کی طرف لپکتے دیکھا، مگر وہ سوار نہ ہو سکی تھی۔ رگھوبیر سنگھ کھڑکی سے سر نکال کر دور تک اس عورت کو بے تابی اور بے بسی کے عالم میں دیکھتا رہا۔ ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی۔

غازی آباد پہنچتے پہنچتے رگھوبیر سنگھ کی نیت بدل گئی۔ اس نے ایک لمبی سانس لے کر دل ہی دل میں کہا ”چلو عورت نہ سہی، مال تو ہاتھ آیا۔“ پھر وہ مال کا تخمینہ لگانے لگا۔ پانچ ہزار، دس ہزار پچاس ہزار — ایک لاکھ۔ نقدی زیورات قیمتی کپڑے، چاندی کے برتن۔ سب ملا کر ایک لاکھ کے نہ سہی دس بیس ہزار کے تو ہوں گے ہی۔

اس کے ضمیر نے کہا۔ ”مگر اس کے اعتماد کو دھوکا دینا ٹھیک نہ ہوگا۔ وہ خود تو اپنی ہو ہی جائے گی، پھر مال بھی ہاتھ آ جائے گا۔“ مگر بدنیتی نے مشورہ دیا ”نہیں نہیں، عورت کا کیا ٹھکانا — جیسا تھا ویسی ساتھ۔“

دلی پہنچ کر جب وہ پلیٹ فارم سے باہر نکلنے لگا تو ٹکٹ کلکٹر نے اس کے دونوں بڑے بکسوں کے وزن کی رسید طلب کی۔ رگھوبیر سنگھ نے کہا ”وزن تو میں نے نہیں کرایا، جو واجب محصول ہو وہ آپ لے لیجئے۔“

پاس کھڑے ہوئے ریلوے کے سپاہی نے دونوں بکسوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ”ان کے اندر کیا ہے؟“

”کپڑے، برتن وغیرہ ہیں۔“ (باقی

فقیر سائیں



جاوید لطیفی

ظہور نواب کا ایک آخری بنگلہ جو انھوں نے ایک ساہوکار کے پاس رہن رکھ دیا تھا آج قرقی کی زد میں تھا۔ ساہوکار نے بنگلہ میں رہنے والوں پر کرائے کا ایک لمبا چوڑا بقایا نکال کر اور اپنا حق ملکیت ثابت کر کے ڈگری حاصل کر لی تھی۔ بنگلہ کے باہر پرانا سالخوردہ سامان جو فروخت ہونے کے قابل بھی نہیں تھا لاکر رکھا جا رہا تھا۔ میلی اور پھٹی ہوئی چادریں تکیے اور چادریں پرانے برتن اور مٹی کے گھڑے بھی باہر پڑے ہوئے تھے ایسا لگتا تھا کہ ظہور نواب کے مرنے کے بعد ان کے بنگلے کی اندرونی حالت جھونپڑوں میں رہنے والے والوں جیـ ہو گئی تھی۔ ویسے بنگلے کی ظاہری حالـ بھی بدترین ہو چکی تھی، اندرونی باغ! چکا تھا، خودرو گھاس بے ترتیبی سے ا ہوئی تھی، دیواروں پر برسوں سے آکـ پاشی اور داغدوزی نہیں ہوئی تھی، بـ کے پھاٹک کے دروازے ٹیڑھے ہو کر لٹک گئے تھے اور چبوترے۔ پتھر جگہ جگہ سے اکھڑ گئے تھے۔ ... اور اور اب تو قصہ ہی پاک تھا۔

اس اچانک افتاد کی خبر بیگم ظہور کـ نہیں تھی۔ دوپہر کا وقت تھا اور بڑو میں رہنے والے ایک نیک انسان کـ

بھائی جب مسجد سے نماز پڑھ کر لوٹ رہے تھے کہ اسی وقت عدالت کے کارندے بنگلہ کا تخلیہ کرانے اور ساہوکار کو قبضہ دلانے کی کارروائی کرنے آ گئے تھے پنچوں میں برکت بھائی کو شریک کر لیا گیا تھا۔ وہ بہت حیران تھے کہ معاملہ قرقی تک پہنچ گیا۔ انھوں نے سُن رکھا تھا کہ ظہور نواب کا یہ بنگلہ رہن ہے، اب جب وہ پہنچ بنے تو انھیں حقیقت کا علم ہوا کہ بنگلہ تو ساہوکار کے نام بیع کر کے رجسٹری بھی ہو گئی تھی۔ حالانکہ اقرار بیع کا ایک کاغذ بھی لکھا گیا تھا، ساہوکار کی طرف سے جو نواب صاحب نے نہ جانے کہاں کھو دیا تھا اور اگر معلوم بھی تھا تو اپنی فالج کی بیماری کے سبب زبان اور ہاتھ پاؤں ناکارہ ہو جانے پر کسی کو کچھ نہ بتا سکے خدا معلوم وہ اقرار بیع کا کاغذ کہاں تھا اور اب تو ظہور نواب ہی دنیا میں موجود نہیں تھے۔

بیگم ظہور ابتدا ہی سے منہ مری اور نیم پاگل سی تھیں، ان کو نواب صاحب کے کارناموں کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ شوریدہ سر نواب نے نہ کبھی کسی معاملہ میں مشورہ لیا اور نہ کبھی کسی کارروائی سے آگاہ کیا۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد ساہوکار نے مکان حاصل کرنے کے لئے عدالتی چارہ کار اختیار کر کے مکان حاصل کر لیا۔

بیگم ظہور کو پچھلے صدمات نے پہلے ہی نڈھال کر رکھا تھا اس اچانک اور زبردست حادثے نے تو انھیں گنگ کر دیا۔ برکت بھائی نے انھیں دلاسا دیا اور بعد کی قانونی کارروائی کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ بے سہارا اور ستم رسیدہ بیگم ظہور کو انھوں نے اپنے گھر کی ایک کوٹھری دیدی اور کہا کہ اس جگہ جب تک آپ کا دل چاہے رہیں میں آپ سے کوئی کرایہ نہیں لوں گا — اور اس طرح بیگم ظہور اپنے خستہ اور پرانے مکان کو لے کر برکت بھائی کی دی ہوئی کوٹھری میں منتقل ہو گئیں۔ جب انھوں نے اس بنگلے پر

الوداعی نظر ڈالی کہ جہاں برسوں انھوں
نے عیش و آرام کے دن بھی کاٹے
تھے تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو
جاری ہو گئے۔

فقیرا سائیں ایک ایسا معذور آدمی
تھا کہ جسے عرصہ ہوا ظہور نواب نے اپنے
بنگلے کی چوکیداری پر رکھ لیا تھا۔ برسوں
پہلے جب بنگلے پر رونق ہی رونق تھی کہ
ایک دن فقیرا سائیں پھدکتا پھدکتا آیا
تھا اور روٹی مانگنے کے لئے اپنے دونوں
ہاتھ نواب صاحب کے سامنے پھیلا دیئے تھے
ظہور نواب نے بڑی رعونت سے پوچھا تھا
ابے خوب ہٹا کٹا ہے کام کاج کیوں
نہیں کرتا۔ سرکار دیکھنے میں ہٹا کٹا ہوں
مگر دراصل معذور ہوں، دونوں پاؤں
کے تلوؤں میں گوکھرو ہیں تندرست
آدمی کی طرح چل پھر نہیں سکتا آنکھوں سے
بھی کم نظر آتا ہے ہمیشہ پانی میں بھیگی رہتی
ہیں نہ جانے کیا بیماری ہے دھندلا دھندلا
لگتا ہے۔

یہاں تیرا اور بھی کوئی ہے؟
سرکار: میں یہاں کا نہیں ہوں اور جہا
کا ہوں وہاں بھی میرا کوئی نہیں ہے
بس اللہ ہی اللہ ہے۔

تو پھر ایک کام کر۔ ہمارے بنگ
کے دروازے پر پڑا رہ، تجھے کھا
پانی مل جایا کرے گا اور اس د
فقیرا سائیں ظہور نواب کے بنگلے کا چ
بن گیا۔

ظہور نواب مزاجاً بہت خود سر
فرعون صفت تھے اس لئے دور نز
کے رشتہ داروں سے ان کے تعلق
کبھی بھی اچھے نہیں رہتے تھے جس
میں ان کی شادی ہوئی تھی وہ لوگ
صرف ایک لڑکی والے تھے۔ لڑ
کچھ کچھ دیوانی سی تھی چونکہ لڑکی والوں
لڑکی کے جہیز میں کافی مال و اسبا
اور ایک بڑی جائداد رکھی تھی اسی
جائداد اور مال و زر کے لالچ میں "
نواب نے زرینہ بیگم سے شادی ر

تھی، زرینہ کے ماں باپ نے نواب کے دور کے عزیزوں میں ایک پرخلوص تاثر دیا وہیں مستقبل میں ایک اچھی خاصی دولت کو ہتھیانے کا پروگرام بھی بنالیا تھا اسلئے کہ زرینہ بیگم اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں اور قدرے دیوانی بھی۔ زرینہ بیگم کا اپنا ذاتی اثاثہ اور پھر ان کے والدین کے انتقال کے بعد ان کا بھی اثاثہ ظہور نواب کے ہی قبضہ میں آنے والا تھا۔

ظہور نواب کو بچپن ہی سے قماربازی کا شوق تھا، ماں باپ کی زندگی میں وہ چھوٹے موٹے جوئے کھیلتے رہے اور جب ان کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو وہ جیسے آزاد ہو گئے۔ گھوڑ دوڑ کی شرطیں لگانا اور فلیش اور رمی کھیلنا ان کی عادت ثانی بن چکا تھا۔ کاروبار تو کچھ بھی نہیں تھا بس اپنی بیوی اور خود کی جائداد سے جو آمدنی ہوتی تھی اسی سے وہ اپنا شوق پورا کیا کرتے تھے لیکن جب ضرورتیں زیادہ ہوتی گئیں تو پہلے اپنی، پھر بیوی اور نسرمانگی بیوی کو جانے

کو ٹھکانے لگایا اور پھر رفتہ رفتہ خود کی بھی جائداد فروخت کرنے لگے۔ جائداد کے بعد گھر کے زیورات اور ان کے بعد جو کچھ قابل فروخت اسباب تھا وہ بھی فروخت کردیا۔

اس عرصہ میں ظہور نواب کو دو اولادیں ہوئیں، پہلے لڑکی ہوئی اور بعد میں لڑکا پیدا ہوا، لڑکا چار پانچ سال کی عمر میں ایک شدید مرض کا شکار ہو کر انتقال کر گیا لڑکے کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد ہی نواب صاحب پر فالج کا زبردست حملہ ہوا اور وہ زبان بند کئے اور ہاتھ پاؤں بے حرکت کئے پلنگ پر فرشیں ہو گئے۔ شہلا بی بی اس عرصہ میں سیانی ہو چکی تھی اس نے خوب دلکش ناک نقشہ پایا تھا۔ شہلا کو اس کی ایک سہیلی نے بہکا دیا کہ وہ فلموں کے لئے بہت موزوں رہے گی اور اگر کامیاب ہوگئی تو گھر کی آسودگی اور راحت لوٹ آئے گی۔ شہلا بہک گئی اور اس کے بھائی کے ساتھ بمبئی چلی

لی اور ایسی گئی کہ پھر کبھی گھر واپس نہیں ہوئی
ظہور نواب پر وقت نے ستم پر ستم ڈھا دیا تھا۔ زرینہ بیگم ان کی وفادار اہلیہ نے ان کا بہت علاج کروایا گھر کے قیمتی برتن تک بکوا دیئے مگر وہ کسی بھی طرح اچھے نہ ہو سکے، ظہور نواب کے عزیز اقارب کے ساتھ انکا سلوک کبھی اچھا نہیں رہا تھا اس لئے وہ ایسے وقت بھی ان کا ساتھ دینے نہیں آئے اور اس طرح وہ ایک دن دنیا سے سدھار گئے۔
جب ان کا انتقال ہوا تو گھر کا نقشہ ہی پلٹا ہوا تھا۔ گھر میں کچھ بھی تو نہ تھا۔ فقیرا سائیں نے اڑوس پڑوس میں اطلاع دی۔ خدا ترس برکت بھائی آگے بڑھے۔ بیگم ظہور کو دلاسا دیا اور خیرات پر نواب کی میت اٹھوائی
فقیرا سائیں نے ظہور نواب کی شان و شوکت اور کروفر کا سماں بھی دیکھا تھا اور بعد میں رفتہ رفتہ ان کا زوال بھی دیکھا۔ نواب صاحب کے کمسن فرزند کی موت اور شہلا بی بی کی بھی بھاگ جانے کی واردات نے اس کے بھی دل کو مروڑ کر رکھ دیا تھا مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ جب وہ اپنی بیگم صاحب کو اداس و ملول ہو کر روتے ہوئے دیکھ لیتا تو وہ خود بھی رو پڑتا اور پھر چپکے سے آنسو پونچھتا اپنے گوکھرو والے پاؤں سے پھدکتا اور دوازے پر بنے ہوئے اجاڑ سنگی چبوترے پر جا بیٹھتا اور آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا دیتا
ظہور نواب کے انتقال کے بعد بیگم ظہور کے حالات اور بھی ناگفتہ بہ ہو چکے تھے وہ بھولی اور دیوانی ہی سہی غیور بھی بہت تھیں، فاقوں کی نوبت پر بھی وہ کسی کے سامنے دست طلب دراز نہیں کرتی تھیں اب ان کے گھریلو حالات کا راز دار صرف فقیرا سائیں رہ گیا تھا۔
فقیرا سائیں نے جب دیکھا کہ اب تو ایک وقت کا کھانا بھی ملنا مشکل ہو گیا ہے تو اس نے بنگلے کی چوکیداری چھوڑ دی اور شہر کے ایک مصروف ہوٹل کے سامنے بھیک مانگنے کی ڈیوٹی دینا شروع کر دی۔

پہلے بھی تو وہ بھیک ہی مانگا کرتا تھا اور ایک دن بھیک مانگتے مانگتے ہی ظہور نواب کے بنگلے پہنچ گیا تھا اور چوکیدار بن گیا تھا مگر اب اس نے یہ چوکیداری چھوڑ دی تھی۔

فقیرا سائیں بڑی جانفشانی سے بھیک مانگتا، ہوٹل کے پاس آنے والے موٹر کے آگے پیچھے بھاگتا اور ہوٹل کے سیٹھ کو بھی سلام کرتا رہتا تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ کھانے کو مل جائے۔

ہوٹل کا شریر ملازم بابو باہر والا فقیرا سائیں سے چھیڑ چھاڑ کرتا تھا۔ اس نے تمام ہوٹل میں یہ خبر پھیلا دی تھی کہ سالا فقیرا بڑا بدمعاش ٹائپ آدمی ہے۔ خیرات کے پیسے خوب احتیاط سے جمع کرتا ہے اور روٹی سالن بھی خوب اکٹھا کر لیتا ہے مگر یہاں کھاتا نہیں ساتھ میں باندھ کر لے جاتا ہے نہ جانے کیا کرتا ہے شاید دوسرے غریبوں کو بیچ دیتا ہوگا۔

فقیرا سائیں کا مینڈک کی طرح پھدک پھدک کر چلنا اور کسی بات پر بے ساختہ ایسے بے ڈھنگے طریقے سے ہنسنا کہ اس کی ہنسی سن کر دوسروں کو بھی ہنسی آجائے۔ ہوٹل کے سیٹھ کو اچھا لگتا تھا۔ اچھے موڈ میں وہ فقیرا سائیں سے ہنسی مذاق کی باتیں بھی کر لیا کرتا، اور اسے بچا کھچا کھانا دے دیا کرتا تھا۔ سیٹھ کو یہ بات بھی معلوم ہو گئی تھی کہ فقیرا کھانے کی چیزیں جمع کر لیتا ہے اور لے جاتا ہے خود نہیں کھاتا۔ نہ جانے کیوں......

جس دن ظہور نواب کا بنگلہ قرق ہوا اس کی صبح سے فقیرا سائیں حسب معمول غائب تھا اور اگر وہ آتا بھی تو اب اسے پھاٹک کے اندر گھسنے کون دیتا۔ بنگلہ پر تو ساہوکار کا قبضہ ہو چکا تھا۔

فقیرا سائیں ادھر دو چار دن سے علیل تھا اسے بخار بھی تھا اس حالت میں بھی وہ ہوٹل پر بھیک مانگنے کی ڈیوٹی کے لئے جا رہا تھا۔ بنگلہ قرق ہونے کی صبح جب وہ ہوٹل پہنچا تھا تو وہ زیادہ علیل تھا۔ ہوٹل کے آخری کونے کی فٹ پاتھ

پر جاکر وہ لڑھک گیا تھا شدت کے بخار نے اس پر غشی طاری کر دی تھی۔

فقیرا سائیں دن بھر بے سدھ پڑا رہا، اس نے بھیک بھی نہیں مانگی سب سمجھے کہ کچھ نشہ وشہ کر کے سو گیا ہے۔ اسی حالت میں وہ رات بھر وہیں پڑا رہا۔ ۱۱ بجے رات کو ہوٹل بھی بند ہو گیا اور اس کی طرف کسی نے اتفاق سے دھیان بھی نہیں دیا۔

سویرے سویرے جب ہوٹل کھولا جا رہا تھا تو ہوٹل کے سیٹھ نے دیکھا کہ ہوٹل کے آخری حصہ پر فٹ پاتھ پر فقیرا سائیں پڑا ہوا ہے سیٹھ نے اچھے موڈ میں اپنے منہ چڑھے ملازم بابو کو آواز دی اور کہا۔

"ارے بابو وہ دیکھ فقیرا سائیں تو سالا یہیں سوتا پڑا ہے رات کو گھر نہیں گیا تھا ——؟"

بابو باہر والا بولا۔

سائیں نے اپنی عورت سے لڑائی کر لی ہوگی سیٹھ، ورنہ وہ تو روز رات کو ہی کھانا پوٹلی میں باندھ کر سیدھا گھر بھاگتا ہے۔

جاکر ذرا پوچھو سالے سے کہیں دارو وارو تو پی کر نہیں پڑا ہے۔ اچھا سیٹھ پوچھتا ہوں۔

اور جب بابو باہر والے نے فٹ پاتھ پر پڑے فقیرا سائیں کو جگایا تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا بخار ٹوٹ چکا تھا۔ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر بابو زور سے ہنس پڑا اور بولا۔

"ابے فقیرا کیا عورت سے لڑائی ہو گئی ہے یا خوب نشہ کر رکھا تھا، دن بھر سویا اور رات بھر سویا۔ اٹھ اب صبح ہو گئی ہے۔

تو کیا..... تو کیا میں رات بھر یہیں پڑا رہا؟ ابے ایسا بولتا ہے جیسے تجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔

نہیں بابو بھائی میں نے کوئی نشہ نہیں کیا، قسم خدا کی میں تو کل سے بخار میں بہک پڑا تھا۔ غضب خدا کا، دن بھر اور رات بھر، آج دوسرا دن ہو گیا۔ باپ رے باپ، مجھے گھر چلنا چاہیے۔

یہ کہہ کر فقیرا سائیں بڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا مگر
کمزوری اور نقاہت سے اپنے دونوں ہاتھ
پاؤں پر لہرا کر جھول گیا اور گرتے گرتے
بچا۔

ابے سنبھل جا، گر پڑے گا نہیں تو چل
تجھے سیٹھ صاحب بلاتے ہیں۔

اور جب فقیرا سائیں سیٹھ صاحب
کے پاس پہنچا تو ان کے قدموں میں جا
پڑا اور گڑگڑا کر کہنے لگا۔

سیٹھ جی، کل دن بھر اور پھر رات بھر
بخار میں غافل پڑا رہا۔ خدا کے واسطے
مجھے روٹی سالن دیدو گھر جانا ہے۔ کل
بھیک بھی نہیں مانگی۔......

سیٹھ نے کہا۔ فقیرا سائیں اب گھر دور
کہاں جائے گا سالے مرا جا رہا ہے۔
روٹی سالن دیئے دیتا ہوں۔ یہیں بیٹھ
کر کھا لے۔

بابو نے اس کو روٹی سالن لا کر دیدیا
تو فقیرا سائیں فوراً اٹھا اور پھدکتا ہوا بھاگا
جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

سیٹھ نے کہا۔ ارے بابو جا اس
کے پیچھے، بیمار ہے، سالا کہیں گر گرا
جائے گا۔ اور جب بابو نے بھاگتے
ہوئے فقیرا سائیں کو جا لیا تو اس نے
بہت خوشامدانہ طریقے سے کہا۔

بابو خدا کے واسطے میرا پیچھا مت
کرو۔ مجھے جانے دو۔ مجھے جانے دو۔

یہ دردناک التجائیں کر بابو تعجب میں
پڑ گیا کہ آخر معاملہ کیا ہے یہ فقیرا سائیں کل
سے بھوکا ہے مگر کھانا کیوں نہیں کھاتا
کھانے کی پوٹلی لئے آخر بھاگا کہاں جاتا
ہے۔ پھر اس نے ارادہ کیا کہ اس کی
جاسوسی کرے اور جو کچھ معلوم ہو اپنے سیٹھ
کو جا کر بتا دے۔

فقیرا سائیں تیزی سے پھدکتا اور
ڈگمگاتا جب بنگلے پر پہنچا تو اسے پتہ چلا
کہ بنگلہ تو قرق ہو چکا ہے اور وہاں اس کی
مالکن بیگم صاحبہ بھی نہیں ہیں۔ پھر اس
نے معلوم کر لیا کہ بیگم صاحب کو از راہِ انسانیت
برکت بھائی کے گھر میں پناہ مل گئی ہے

وہ پھدکتا پھدکتا وہاں پہنچ گیا۔ بیگم ظہور نواب اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی نہ جانے کس سمت دیکھ رہی تھیں۔

بیگم سرکار........ بیگم سرکار میں آگیا...... میں کل سے بیہوش تھا، بہت بخار تھا مجھے، ابھی ابھی بنگلے پر گیا تھا، بیگم سرکار بنگلہ بھی چلا گیا۔ چھوٹ گیا۔ مولا کی مرضی۔ برکت بھائی کو خدا اچھا رکھے۔ میں نے کل سے ایک دانہ بھی نہیں کھایا ہے بیگم سرکار۔ چلئے اندر چلئے میں کھانا ساتھ لایا ہوں......

الگ ایک طرف بابو باہر والا جو فقیرا سائیں کا چھپ کر پیچھا کر رہا تھا یہ سب کچھ سن رہا تھا اور لرز رہا تھا، لرز رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ فقیرا سائیں۔

اب میں سیٹھ کو جا کر کہوں۔ کیا کہوں۔ کیا بتاؤں؟؟

نیکی کر اور دریا میں ڈال

بقیہ مضمون ایسا بھی ہوتا ہے

سپاہی نے گہرے شک کی نظر سے بکسوں کو دیکھ کر کہا" میں وغیرہ دیکھنا چاہتا ہوں، ذرا کھول کر دکھاؤ۔"

چابیاں۔ رگھو بیر سنگھ کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ مگر اس نے بڑے اطمینان سے پُر اعتماد لہجے میں کہا" چابیوں کا گچھا تو جلدی میں گھر پر رہ گیا۔ آپ چاہیں تو تالا توڑ کر دیکھ سکتے ہیں۔"

"جب چابیاں نہیں ہیں تو تالے توڑنے ہی پڑیں گے۔" بکسوں پر چند مکھیوں کو بھنبھناتے دیکھ کر سپاہی کے کان کھڑے ہو گئے۔

اور تھوڑی دیر بعد رگھو بیر سنگھ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور کمر میں ڈوری لگی ہوئی تھی۔ ان بکسوں سے اس لڑکی کی لاش کے ٹکڑے نکلے جس کو قتل کر کے رگھو بیر سنگھ بھاگا تھا۔

براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر ضرور لکھ دیا کریں۔

صحت کی ڈائری

حکیم دیو کرشن شرما پھو رتھلہ

• اجوائن

۱۔ اجوائن، سیندھا نمک، ہینگ، ہلیلہ زرد ہموزن سفوف بنالیں۔ خوراک بقدر ۵ رتی غذا کے بعد کھلائیں، قولنج اور ہضم میں مفید ہے۔

۲۔ اجوائن بصوبستہ ½ سیر کو پانی چھ کوارٹر میں پانچ چھ گھنٹے تر رکھیں۔ عرق کشید کریں۔ خوراک ½ ۲ تولہ، قولنج، نفخ، اسہال قے اور ہیضہ میں مفید ہے۔

۳۔ عرق اجوائن ½ ۲ تولہ، لائم واٹر ½ ۲ تولہ ٹنکچر افیم ۵ منم ملاکر پلائیں۔ اسہال میں مفید ہے

۴۔ اجوائن ۶ ماشہ، دانہ الائچی ایک تولہ۔ فلفل سیاہ ۶ ماشہ، زنجبیل (سونٹھ) ۶ ماشہ سفوف بنائیں اور بقدر تین ماشہ استعمال کریں۔ ہاضم اور قولنج میں مفید ہے۔

۵۔ اجوائن ۱ تولہ۔ نمک سیندھا ۹ ماشہ ثمر حنظل (تمہ) تازہ ایک عدد۔ اجوائن اور حنظل اور نمک میں ملفوف کر کے سایہ میں رکھیں اور خشک کرلیں اور پھر اجوائن نکال کر شیشی میں محفوظ رکھیں۔ مقوی معدہ ہے۔

• پھٹکری (شب یمانی)

۱۔ پھٹکری ۳ گرین پانی ایک اونس ملاکر آنکھوں میں ڈالیں۔

۲۔ پھٹکری ۵ گرین۔ کات ۵ گرین دارچینی ۵ گرین۔ سفوف بنالیں۔ اسہال میں بہت مفید ہے۔

۳۔ پھٹکری ایک ڈرام، سہاگہ ایک ڈرام واٹر (پانی) دس اونس۔ اس سے مسوڑھوں کے دانتوں کو دھوئیں۔

• نوشادر

۱۔ نوشادر ۱۰ گرین، جوشاندہ حبشہ ایک اونس۔ یہ ایک خوراک ہے۔ امراض جگر و مزمن وجع المفاصل کو نہایت مفید ہے۔ لال مرچ تیل، کھٹائی، بادی اشیاء سے پرہیز کریں۔

۲۔ نوشادر ۱۵ گرین۔ آب کافور آمیز ایک اونس یہ ایک خوراک دردِ شقیقہ کے لیے مفید ہے۔

۳۔ نوشادر ۱۰ گرین، رب السوس سیال ½ ڈرام ایکوا ایک اونس۔ یہ ایک خوراک کھانسی میں مفید ہے۔

۴۔ نوشادر ۲ ڈرام۔ آب گرم ۵۰ تولہ۔ ورم پر ایک بوتل میں ڈال کر یا روئی کے پھایہ سے ٹکور کریں۔ دافع التہاب ہے۔

اڑوسہ (بانسہ)

۱۔ آب برگ اڑوسہ ۲ تولہ، شہد ۲ تولہ ایک چمچہ چائے بھر کر پلائیں۔ کھانسی میں مفید ہے۔

۲۔ برگ اڑوسہ خشک کر لیں ایک اونس اُبلتا پانی ایک پائنٹ (۵۰ تولہ) جوش دیں اور سرد کر کے چھان لیں۔ پھر اس میں سفوف زنجبیل ۲۰ گرین، سفوف فلفل سیاہ ۲۰ گرین قند سفید ۲ ڈرام ملا لیں اور ایک ایک اونس کی مقدار میں پلائیں۔ اسہال مزمن اور ضیق النفس میں مفید ہے۔

۳۔ برگ اڑوسہ سفوف کردہ ۴ ڈرام پانی ۵ اونس۔ جوشاندہ بنا کر ایک ایک اونس دن میں تین مرتبہ پلائیں۔ کھانسی میں مفید ہے۔

• بادیان

۱۔ بادیان ½ ڈرام، قند سیاہ ایک ڈرام دونوں کو ایک خوراک بنا لیں۔ ملین ہے۔

۲۔ بادیان ۶ ماشہ، زیرہ سیاہ بریاں ۶ ماشہ، ان کو پیس کر ایک خوراک بنا لیں بھوک بڑھاتی ہے اور قوتِ ہاضمہ کو قوی کرتی ہے۔ (ماخوذ دولت کی بات، مرسلہ احمد لطیف کوٹلہ)

نوٹ: براہ کرم اس طرح کے مضامین کہیں سے نقل کرنے والے صاحبان آجکل کی زبان استعمال کریں خصوصاً بیماریوں کے نام [illegible]

اللہ کی نعمتیں

ند گوبھی کے رول

بند گوبھی کے پتے ۱۲ عدد
بکرے کا باریک قیمہ ۵۰۰ گرام
پیاز ایک عدد (درمیانہ سائز)
چاول پونی پیالی
ٹماٹر ۴ عدد (درمیانہ سائز)
ہری مرچیں ۲ عدد
لہسن آدھا چائے کا چمچہ
لیموں کا عرق ۲ چائے کے چمچے
ہرے دھنیے کی پتیاں ۲ چائے کے چمچے
گرم مسالہ ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ آدھا چائے کا چمچہ
دہی آدھی پیالی
نمک حسب ذائقہ
گھی حسب ضرورت

چاولوں کو دھو کر ایک گھنٹے کے لیے بھگو دیں پھر ابال کر پانی نکال دیں۔ پیاز کا باریک چوپر کاٹ لیں۔ ٹماٹروں اور ہری مرچوں کا بھی باریک چوپر کر لیں اب ایک دیگچی میں ۴ چائے کے چمچے گھی اور ایک چائے کا چمچہ پیاز کا چوپر ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ پیاز بادامی ہو جائے تو اس میں قیمہ لہسن، لال مرچ، گرم مسالہ اور نمک ڈال کر بھونیں جب قیمہ کا بساندہ پانی بھن جائے تو دہی پھینٹ کر ملا دیں۔ دہی بھن جائے تو گلنے کے انداز کا پانی ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں۔ جب قیمہ گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو آنچ سے اتار لیں تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے تو اس میں پیاز ہری مرچ اور ہری مرچ اور ٹماٹروں کا

کھوپرا، اُبلے ہوئے چاول، ہرے دھنیے کی پتیاں اور لیموں کا عرق ملا لیں۔ اب ایک دیگچی میں پانی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں جب پانی اُبلنے لگے تو گوبھی کے پتے دھو کر اس میں ڈال دیں۔ پھر پتوں کو فوراً ہی احتیاط سے پانی سے نکال لیں۔ یہ خیال رکھیں کہ پتے نہ ٹوٹیں۔ اب قیمہ کے بارہ حصہ کر لیں۔ اس کے بعد ایک پتے کو پھیلائیں اور اس کے بیچ میں ایک حصہ قیمہ کا رکھ کر پتے کو دونوں طرف سے اندر کی طرف موڑ دیں۔ پھر اس کا رول بنا لیں اور اوپر کی طرف ٹوتھ پک کا تنکا لگا دیں تاکہ رول کھل نہ سکے۔ اسی طرح تمام رول بنا لیں۔ فرائنگ پان میں ایک چائے کا چمچہ گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں گھی گرم ہو جائے تو اس میں ایک یا دو رول احتیاط سے رکھ دیں۔ جب ایک طرف سے ہلکے بادامی ہو جائیں تو پلٹ دیں سب طرف سے ہلکے بادامی ہو جائیں تو فرائنگ پین سے نکال لیں۔ اسی طرح تمام رول تل لیں۔ (یاسمین، بمبئی)

لیموں اور ہری مرچ کا اچار

۸ عدد لیموں کاغذی
۲۵۰ گرام ہری مرچ
۱۲۵ گرام لہسن
آدھا لیٹر سرسوں کا تیل
نمک حسبِ ذائقہ

لیموں کو دھو کر صاف کپڑے سے پونچھ لیں اور ان کے چار چار ٹکڑے کر لیں لہسن کے جووں کو چھیل لیں۔ اب ایک صاف مرتبان میں لیموں کے ٹکڑے لہسن کے جوے اور نمک ڈال کر مرتبان کا منہ بند کر دیں اور تین دن تک دھوپ میں رکھیں۔ چوتھے دن سرسوں کے تیل میں ہری مرچوں کو ڈنڈیوں سمیت ہلکا سا تل لیں۔ جب ٹھنڈا ہو جائے تو مرچیں اور تیل لیموں میں ملا دیں۔ مزید تین چار دن دھوپ میں رکھنے کے بعد استعمال شروع کر دیں۔ (ریحانہ پروین، کلکتہ)

خواتین

نوبل پرائز حاصل کرنے والی خواتین

دنیا کا سب سے بڑا اعزاز نوبل پرائز صرف مردوں کو ہی نہیں، عورتوں کو بھی ملا ہے۔ پہلی بار نوبل پرائز ۱۹۰۱ء میں دیا گیا تھا۔ اور پہلی بار کسی عورت کو یہ انعام ۱۹۰۳ء میں ملا۔ اس وقت سے آج تک دنیا کی چودہ عورتوں کو یہ اعزاز مل چکا ہے۔ سائنس میں پانچ، عالمی امن کی کوششوں میں تین اور ادب میں چھ۔

پہلی بار نوبل پرائز حاصل کرنے والی خوش نصیب عورت پولینڈ کی میڈم میری کیوری تھیں۔ جن کو آج ساری دنیا "ریڈیم خاتون" کہتی ہے۔ میڈم کیوری پہلی بار نوبل پرائز حاصل کرنے والی عورت ہی نہیں بلکہ ان عورتوں میں بھی شامل ہیں جن کو یہ عالمی اعزاز دوبارہ بھی دیا گیا۔ پہلی بار یہ اعزاز حاصل کرتے وقت ان کی عمر صرف ۳۵ سال تھی، اور دوسری بار ۴۴ سال کی عمر میں انھیں یہ اعزاز حاصل ہوا۔ اس لحاظ سے سب سے کم عمر نوبل پرائز یافتہ خاتون بھی وہی ہیں۔

عالمی امن کے سلسلے میں پہلی بار نوبل پرائز حاصل کرنے والی خاتون مسز برتھا وان سٹنر تھیں۔ برتھا وان ایک آسٹریلین ناول نگار تھیں لیکن ناول نگاری سے زیادہ ان کو عالمی امن کوششوں کے میدان میں شہرت حاصل ہوئی۔ انھیں یہ انعام ۱۹۰۵ء میں دیا گیا تھا۔

کہتے ہیں کہ نائیٹرو گلیسرین اور ڈائنامیٹ جیسے آتش گیر مادہ کے موجد الفریڈ نوبل کو عالمی امن کی طرف راغب کرنے کا سہرا برتھا وان ہی کے سر ہی تھا۔ وہ برتھا کی عالمی امن کے لیے کی جانے والی جدوجہد اور کوششوں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ انھوں نے برتھا کے ایک ناول کو پڑھنے کے بعد لکھا تھا "دل چاہتا ہے کہ کوئی ایسی دھماکہ کی چیز ایجاد کر دوں کہ جنگ کے میدان میں آمنے سامنے کھڑی ہوئی فوجیں ایک لمحے میں ختم ہو جائیں۔ اسی وقت ہماری آنکھیں کھلیں گی اور ہم جنگ کی تباہ کاری کو پوری

طرح محسوس کرسکیں گے۔" پھر اس کے کچھ دن بعد ہی انھوں نے برتھا کو لکھا: "میں اپنی دولت کا ایک حصّہ ایک انعام کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں۔ ہر پانچ سال کے بعد یہ انعام اس شخص کو دیا جائے جو دنیا سے جنگ کے میلان کو ختم کرنے کے لیے اہم ترین پارٹ ادا کرے یا عالمی امن کے لیے سب سے زیادہ زوردار تحریک چلائے، تیس برس میں صرف چھ بار یہ انعام دیا جائے۔ اگر اتنی طویل مدّت کے بعد بھی دنیا نے جنگ سے توبہ نہیں کی تو ہر انسان درندہ بن جائے گا اور پھر اس انعام کو دینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔"

عالمی امن کے لیے دیا جانے والا نوبل پرائز برتھا کو اسی ناول پر دیا گیا تھا۔ انعام حاصل کرتے وقت برتھا ۶۲ سال کی تھیں۔

۱۹۰۹ء میں ادب میں نوبل پرائز حاصل کرنے والی خواتین کا نام تھا سیلما لاگرلوف۔ وہ سویڈش ادیبہ تھیں۔ ساڑھے تین سال کی عمر میں ہی وہ فالج کا شکار ہو کر اپاہج ہو گئی تھیں۔ اسی احساسِ کمتری کو سیلما نے اپنی تحریک کے ذریعہ دور کیا تھا۔

ان کے علاوہ ادب میں جن خواتین کو نوبل پرائز ملا، ان کے نام یہ ہیں۔ گریسیا ڈیلیڈا (۱۹۲۶ء) سگرڈ انسیٹ (۱۹۲۸ء) پرل بک (۱۹۳۸ء) گبریلا مسترال (۱۹۴۵ء) اور نیلی سا کس (۱۹۶۶ء)

گریسیا ڈیلیڈا اٹلی کی مشہور ادیبہ تھیں۔ ان کی زیادہ تر کہانیاں دکھ بھری ہیں۔ انھوں نے نوبل پرائز ۵۵ برس کی عمر میں حاصل کیا۔

چلی کی شاعرہ گبریلا مسترال جنوبی افریقہ کی پہلی خاتون تھیں جن کو یہ اعزاز ملا۔ ۵۶ برس کی عمر میں ان کو یہ اعزاز دیا گیا۔ چینی عوام کی زندگی کو پیش کرنے والی مشہور ادیبہ پرل ایس بک کو ان کی تخلیق "گڈ ارتھ" پر یہ اعزاز دیا گیا۔

ناروے کی ناول نگار خاتون سگرڈ انسیٹ کو ۴۶ سال کی عمر میں نوبل پرائز دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ نوبل پرائز ملنے کی اطلاع ملنے کے بعد بھی یہ خاتون ادیبہ اپنے چھوٹے بچے کو سلا رہی تھیں۔ اسی وقت کچھ اخبار والے ان کے پاس انٹرویو لینے پہنچ گئے۔ انھیں ایسے

وقت میں اپنی گھریلو زندگی میں دخل اندازی قطعاً ناقابل برداشت محسوس ہوئی اور انھوں نے کسی سے بھی ملنے سے انکار کردیا اور اپنے بچے کو ساتھ رہیں.

سائنس کے میدان میں جن خواتین کو یہ عالمی اعزاز حاصل ہوا ان کے نام ہیں، آئرین جولیٹ کیوری (۱۹۳۵ء) گرٹی تھریسا کوری ۱۹۴۷ء ماریا جیوپرٹ میئر (۱۹۶۳ء) اور ڈوروتھی کروفٹ ہاجکن (۱۹۶۴ء)

عالمی امن کے لیے یہ انعام حاصل کرنے والی دو خواتین تھیں، جین ایڈمس اور ایملی والکب ہو خواتین امریکہ کی مشہور سماجی کارکن تھیں. جین ایڈمس اپنی "پیس پارٹی" اور "ہل ہاؤس" نام کی انجمنوں کی وجہ سے مشہور ہوئیں. ان کی "پیس پارٹی" تمام خطرات مول لے کر جنگ کی مخالفت کیا کرتی تھیں. ان کی موت ۱۹۳۵ء میں ۷۵ سال کی عمر میں ہوئی.

اس طرح دنیا کا سب سے بڑا اعزاز نوبل پرائز حاصل کرنے میں بھی خواتین پیچھے نہیں رہیں

غزل

(اقبال کوثر انصاری)

گلشن کے بے وفا تو وفادار ہو گئے
اور ہم جو مین گل تھے ہمیں خار ہو گئے
جس پر اٹھی برائے نشیمن مری نگاہ
اس شاخِ گل کے اور بھی حقدار ہو گئے
کیا جانے کس نے چھین لی معصومیٔ حیات
آئے اور اس جہاں میں گنہگار ہو گئے
رہتی ہیں ان کی یاد میں آنکھیں ہماری تر
ہم بھی مثالِ نرگسِ بیمار ہو گئے
اچھے رہے خزاں میں مگر آئی جب بہار
پیدا جنوں کے پھر وہی آثار ہو گئے
جلوؤں کا حشر وادیٔ ایمن سے پوچھ و
تم کس کے لب پہ طالبِ دیدار ہو گئے
اقبال آئے پرچمِ صدق و وفا لئے
لیکن شکارِ سازشِ اغیار ہو گئے

تقیش۔ امی احساس ... [illegible]

Regd. No. ... R. D. 54

MONTHLY HIJAB RAMPUR U.P.

... دلی آرٹ پریس میں چھپا

خواتین اور طالبات کا ماہنامہ

حجاب

رامپور

ماہنامہ

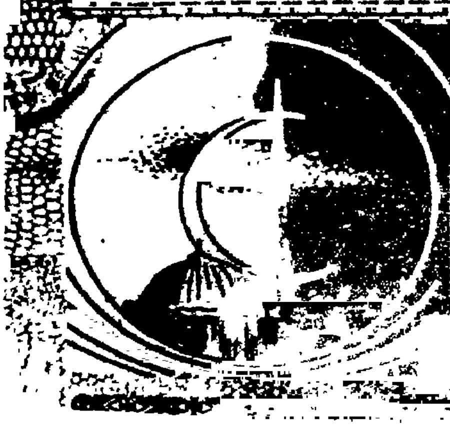
حجاب

اس دائرے میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا مدت خریداری ختم۔ اب آپ آئندہ کے لیے جلد سے جلد زر تعاون مرحمت فرمائیں۔ والسلام — منیجر حجاب رامپور۔ یوپی۔

فروری [illegible] ربیع الاول [illegible]

جلد [illegible] شمارہ [illegible]

قیمت 3/- سالانہ 20/- [illegible]



حجاب

[illegible]

مقالات و مضامین

افسانے اور کہانیاں

کس کے لیے؟

بنت مجتبیٰ مینا

مانا کہ میں کنجشک فرومایہ کے قابل
پر سایۂ شاہین و ہما کس کے لیے ہے؟

اے دل کبھی دیکھا، کبھی سوچا، کبھی سمجھا؟
یہ چاند یہ تارے یہ فضا کس کے لئے ہے؟

کیا چیز ہے یہ عالم خوش رنگ یہ دنیا
یہ ابر یہ سبزہ یہ ہوا کس کے لئے ہے؟

ساقی کی اجازت ہو تو پوچھوں کبھی اتنا
اس دور میں یہ جام وفا کس کے لئے ہے؟

کس ظرف قدح خوار پہ ہیں تیری نگاہیں
ساقی تری آنکھوں میں فضا کس کے لئے ہے؟

لے خون رگِ جاں کی ضرورت ہے اگر دوست
کیا پوچھتے پھرتے ہو حنا کس کے لئے ہے؟

پیغام مریضِ شبِ ہجراں کو بتا دوں؟
پیغام سحر بادِ صبا کس کے لیے ہے؟

اے عشق بلا خیز بتا کون ہے وہ شوخ
یہ معرکۂ بیم و رجا کس کے لئے ہے؟

پیمانہ و ساقی بھی ہیں مے خوار بھی ہے بھی
مینا ترے ہونٹوں پہ دعا کس کے لئے ہے؟

گردوں کا سفر

اداریہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ربیع الاول کے مہینے میں!

"دو جنوری [illegible]ء کی مبارک شام کو مسز عثمان علی خاں (مدراس) کے مکان پر خواتین نے کچھ اہم فیصلے کئے تھے۔ طے کیا گیا تھا کہ اس سال میلاد کے جشن کے ساتھ کچھ غریب اور یتیم لڑکیوں کی شادی کر دینی چاہئیں۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے "اسلامک کلچرل سوسائٹی" بنائی گئی۔ اس سوسائٹی کے اغراض و مقاصد میں غریب اور یتیم لڑکیوں کی شادیاں کرانا اور غریب لڑکوں اور لڑکیوں کو روزگار فراہم کرنے کے لیے اسکیمیں بنانا وغیرہ طے کیا گیا۔

اسلامک کلچرل سوسائٹی نے پچھلے سال غریب اور یتیم لڑکیوں کی شادیاں کرانے میں بڑی شاندار کامیابی حاصل کی تھی۔ ایک تقریب کا حال حلقہ حجاب نے اکتوبر [illegible]ء کے حجاب میں "سترہ دلہنوں کی سچی کہانی" کے عنوان سے پڑھا۔ بہت پسند کیا۔ اس سے متعلق ہمارے پاس بہت سے خطوط آئے اور ہمیں مشورہ دیا گیا کہ "اسلامک کلچرل سوسائٹی کے اغراض و مقاصد آج کے معاشرے کے دھڑکتے دلوں کی آوازیں ہیں اور عید میلاد النبیؐ کے موقع پر اہل مدراس نے سترہ دلہنوں کی شادیاں کر کے جو سادگی اور دریا دلی کا نمونہ پیش کیا ہے اس کی پیروی سارے ملک میں ہونا چاہیے۔"

ربیع الاول کے مبارک مہینے میں، اس مہینے میں جس میں اللہ کے آخری رسولؐ کی پیدائش

ہوئی، اللہ کے وہ آخری نبی، جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا قرآن نازل فرمایا۔ قرآن جو انسانوں کو ٹھیک ٹھیک زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھاتا ہے جس پر عمل کرنے سے اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ جی ہاں، اسی مبارک مہینے میں مسلمان نہایت خوشی اور جوش کے ساتھ سیرۃ النبیؐ کے جلسے اور عید میلاد النبیؐ کی محفلیں منعقد کرتے ہیں۔ دور دور سے واعظ اور مقرر بلائے جاتے ہیں۔ تقریروں کا معاوضہ دینے، پبلک میں شیرینی تقسیم کرنے اور جلسوں اور محفلوں کو سجانے کے بارے میں اندازہ کیجیے۔ پورے ملک میں لاکھوں روپیے سے کم کا تخمینہ نہ ہوگا۔

اگر اسی مبارک تقریب کے ساتھ ساتھ غریب اور یتیم لڑکیوں کی شادیوں کا پروگرام بھی بنا لیا جائے اور اس رقم کا کچھ حصہ ان غریبوں کا گھر بسانے پر خرچ کر دیا جائے تو سوچیے کتنے دکھے دلوں سے دعائیں ملیں گی اور اللہ تعالیٰ کس درجہ ثواب عطا فرمائے گا۔

اس طرح کے اصلاحی کاموں کے بارے میں یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ پہلے کوئی کرے، پہلے کہیں ہو تو ہم بھی کریں، نہیں، خود بڑھ کر پہل کرنا چاہیے۔ نیک کاموں میں پہل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ ثواب عطا فرماتا ہے لیکن اگر آپ کا اصرار ہے تو بھائیو اور بہنو! مدراس کے بھائیوں اور بہنوں نے پہل کر تو دی۔ آپ نے سترہ دلہنوں کی کہانی میں پڑھا ہے کہ چند خواتین نے ایک عزم کر لیا۔ پھر اللہ نے ان کی مدد فرمائی۔ دیکھتے دیکھتے مردوں کو بھی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ عمل سے زندگی بنتی ہے۔ زندگی میں حرکت آئی۔ پھر دیکھا آپ نے کہ کس شان سے یہ شادیاں ہوئیں۔ غریب جوڑے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ حرکت میں برکت ہوتی ہے۔ عین شادی کے دن اُن جوڑوں کے لیے جو اس دن رخصت نہ ہو سکے تھے۔ مدراس کے سب سے بڑے

ہوٹل نے ان کے قیام کا اہتمام اپنے ذمے لے لیا۔ سچی بات یہ ہے کہ کام کرنے سے اللہ کی توفیق بھی حاصل ہوتی ہے۔ پاؤں توڑ کر بیٹھے رہنے والوں کو توفیق نہیں ملتی۔

ربیع الاول کے جلسوں اور محفلوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات بیان کیے جاتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بگڑی ہوئی دنیا کے سدھار کے لیے آخری نبی کو عرب میں مبعوث فرمایا۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ نے شرک و کفر دنیا سے مٹایا، اسلام پھیلایا۔ واعظ اور مقرر اپنے اپنے بیانوں میں اسلام کے بنیادی عقیدوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ ایمان، اسلام اور آخرت کے بارے میں کھلی تعلیم پیش کرتے ہیں۔ نیز سیرت پاک کے نمونے پیش کرتے ہیں۔

یہ ساری باتیں اور سارے بیانات بہت ہی قدر اور احترام کے لائق ہیں۔ دل کے کانوں سے سننا چاہیئے۔ یہ بھی خیال رہے کہ یہ سارے ذکر اور بیانات اس لیے نہیں ہوتے کہ آپ واہ واہ کر کے رہ جائیں بلکہ اس لئے ہوتے ہیں کہ ہم آپ ان پر عمل کریں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نمونہ پیش فرمایا ہے ہم اسی نمونے کے مطابق زندگی بسر کریں۔

ربیع الاول کے ان جلسوں اور محفلوں میں آپ نے ایک بات اور محسوس کی ہوگی بہت سے لوگ نام و نمود اور واہ واہ حاصل کرنے کے لیے حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ بے جا اسراف کر ڈالتے ہیں۔ جلسوں کی سجاوٹ میں بہت سارا روپیہ خرچ کر دیتے ہیں۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ فلاں سے بڑھ کر ہمارے یہاں سجاوٹ ہو۔ پھر یہ کہ

فلاں جلسے میں دو دو لڈو تقسیم ہوئے تھے تو ہم چار چار لڈو بانٹیں گے۔

بھائیو! اس نام و نمود سے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دین کا نقصان اور دنیا کا بھی۔ دین کا نقصان یہ کہ نام و نمود کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔ نام و نمود کو ریاکاری کہا جاتا ہے۔ ریاکار آدمی اللہ کی نظر میں مبغوض ہوتا ہے یعنی وہ اللہ کی نظر میں بیحد ناپسند۔ ریاکار کی ساری نیکیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔

ایسے بھائیوں اور بہنوں کو سوچنا چاہیے کہ ہزاروں روپیہ عید میلاد النبی کی تقریبوں میں خرچ کر ڈالیں اور فائدہ کچھ نہ ہو بلکہ الٹے گھاٹا ہو تو یہ بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے ضرورت ہے کہ جو کچھ خرچ کیا جائے وہ نیک سے لگے۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے۔

اس بارے میں ہمارا مشورہ وہی ہے جو ہم اوپر لکھ چکے ہیں یعنی یہ کہ یہ جلسے سادگی کے ساتھ کئے جائیں اور ان کے ساتھ غریب اور یتیم لڑکیوں کی شادیوں کے پروگرام کو بھی شامل کر لیا جائے۔ آپ جو رقم سجاوٹ پر خرچ کرتے ہیں اگر صرف وہی ان غریبوں کے دکھ درد کو دور کرنے کے لیے وقف کر دیں تو پھر دیکھئے آپ کو کتنی خوشی حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ تو خوش ہوگا ہی۔ اللہ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کمزور جان کی بڑی سفارش فرمائی ہے۔ اس کمزور جان کی حمایت کرنے والوں کو جنت کی بشارتیں سنائی ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور صحابیات عظام نے غریب اور یتیم لڑکیوں کو کیسا کیسا سہارا دیا۔ آپ بھی ان مبارک ہستیوں کی پیروی میں اٹھ کھڑے ہوں۔ مل جل کر یہ کام کریں۔ اللہ آپ کی مدد کرے گا اور پھر اسی سادگی میں اللہ تعالیٰ ایسی پرکاری فرما دے گا کہ آپ چکا چوند ہو جائیں گے جو کچھ دیکھیں۔ سچ کہتا ہوں۔ دلی مسرت اور زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنا ہو تو ان بے چاریوں کو گلے سے لگا لیجئے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق عطا فرمائے۔

مصنف۔ [illegible]
مترجم۔ [illegible]



شوقِ دیدار



ایک نومسلم انگریز کے جذبہ ایمانی کی کہانی جو دل کو متاثر کرتی

ہمارے لئے یہ قطعی ناممکن ہے کہ آپ کو مکہ کے لئے ویزا دیا جائے۔

لندن میں متعین سعودی کونسلر نے پاسپورٹ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی طرف بڑھا دیا اور خود کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یہ گویا اس امر کا اعلان تھا کہ انٹرویو ختم ہو گیا۔

کونسلر کے سامنے بیٹھے ہوئے لمبے تڑنگے انگریز نے پاسپورٹ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور نہ ہی اس نے عرب کونسلر کے جواب "نہیں" کا کوئی نوٹس لیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق نظر آ رہا تھا۔ اس نے محض اس ویزے کے حصول کے لئے دس ہزار میل کا سفر طے کیا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی بات کے پیچھے لگ جائیں تو اسے پورا کئے بنا نہیں چھوڑتے۔

وہ ان مشکلات سے بخوبی واقف تھا جو اسے مکہ کا ویزا حاصل کرنے میں پیش آنے والی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ مکہ مکرمہ مسلمانوں کا ایک نہایت ہی مقدس مقام ہے جہاں کوئی غیر مسلم پھٹک بھی نہیں سکتا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہ انگریز۔ ڈیوڈ چالی ایک پکا مسلمان تھا اور مکہ کا ویزا حاصل کرنے کے بعد حج کرنا وہ اپنا حق سمجھتا تھا۔

ڈیوڈ چالی اسلام کا نہایت اچھی طرح اور بہت قریب سے مطالعہ کرنے کے بعد مسلمان ہوا تھا۔ اس نے بہت سا عرصہ مشرق بعید میں ہراوک سے راجہ کی ملازمت میں اس کے مشیر کی حیثیت سے گزارا تھا۔

یا کے مسلمانوں کے درمیان کام کرتے ہوئے
وہ ان کے مذہب اسلام کے بہت قریب
گیا۔ وہ اسلام کی اس طاقت کا دل سے
ئل ہو گیا جو ایک سچے مسلمان کو روزانہ
پانچ وقت اپنے خدا کی عبادت پہ مجبور
رتی ہے وہ ان کی مہمان نوازی "اعلیٰ ظرفی
دوسروں کی غلطیوں کو معاف کر دینے
ن قدرت، خود پر مکمل کنٹرول، والدین
کے لیے احترام اور عزیزوں کے لیے ہمدردی
یسی عادتوں سے بے حد متاثر ہوا۔ وہ
س بات سے بھی بڑا متاثر ہوا کہ مسلمان
ورت کو خدا کی طرف سے برحق سمجھتے ہیں
ور اس سے قطعی خائف نہیں ہوتے
س کے علاوہ خدا کی وحدانیت پر اُن
کے پختہ یقین نے اُسے بڑا متاثر کیا۔

ان سب باتوں کو تسلیم کرنے کے
باوجود اس نے بڑی دیر تک اسلام قبول
نہ کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسلام لانے
کے بعد اُسے کسی خلش یا کمی کا احساس ہو
لہٰذا وہ خود کو ہر طرح مطمئن کرنے کے
بعد مسلمان ہونا چاہتا تھا اور جب وہ
اسلام اور اس کی صفات کا تہہ دل سے
قائل ہو گیا تو پکار اُٹھا:

"میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا ایک ہے
اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سچے اور
آخری رسول ہیں"

اُسے عبدالرحمٰن کا اسلامی نام دیا گیا۔
اسلام لانے کے تھوڑے ہی عرصے بعد
اس کے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ وہ حج کرے
وہ مقدس فریضہ جسے بجا لانے کی ہر مسلمان
کے دل میں آرزو ہوتی ہے اُسے گمان بھی
نہیں تھا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے
اُسے مشکلات کا ایک پہاڑ عبور کرنا پڑے گا
اُسے بتایا گیا کہ عرب لوگ یورپین مسلمانوں
کو خصوصاً اُن کو جو حال ہی میں اسلام لائے
ہوں شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے رہیں۔
لیکن اُسے اپنی ذات پر مکمل یقین تھا اور
وہ جانتا تھا کہ وہ یقیناً ان کا اعتماد حاصل کر لے
گا۔ اس سلسلے میں اُسے عربی زبان سے بھی
جو وہ بخوبی جانتا تھا کافی مدد مل سکتی تھی۔

پوری طرح کوشش کرنے سے پہلے اس نے اپنے ایک ملائی دوست محمد علی سے مشورہ لینا مناسب سمجھا۔

بوڑھا آدمی اس کی باتیں سننے کے بعد چند ثانیے خاموش رہا۔ پھر وہ خلاؤں میں تکتا ہوا بولا۔

"اگر کوئی شخص بغیر ہتھیار لیے جنگل میں شکار کے لیے جائے تو بے نیل و مرام واپس پلٹے گا کہ نہیں ۔ ؟"

ڈیوڈ چالی بوڑھے کی بات کا مطلب سمجھ گیا اور پوچھا:

"تمہارا مطلب ہے مجھے ایک بیوی بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہیے؟"

"ہاں میرے بچے ایک مسلمان بیوی!"

چالی کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ بوڑھے نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس نے تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ کسی نومسلم کی بیوی جو پیدائشی مسلمان ہو اس کے ساتھ اگر ہو تو اسے باآسانی مکہ کا ویزا مل سکتا ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی اس [illegible] ارادہ کیا کہ وہ کسی مسلم گھرانے میں اُن کے رسم و رواج کے مطابق شادی کرے گا۔

اس کا انتخاب ایک خوبصورت ملائی لڑکی منیرہ تھی۔ جسے وہ اس کے بچپن سے جانتا تھا۔ ہر مسلمان کی طرح منیرہ کی بھی یہ خواہش تھی کہ وہ حج کرے۔ جب وہ ہر سال لوگوں کو حج کے لیے جاتے دیکھتی تو وہ رو دیتی کیونکہ وہ اتنی غریب تھی کہ اخراجات برداشت کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ جب چالی نے اُسے اس کی مقدس خواہش اور فرض کے پورا کرنے میں مکمل تعاون کا یقین دلایا تو خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں اور وہ فوراً رضامند ہو گئی۔

وہ دونوں سنگاپور میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے مقدس اور بابرکت سفر کی تیاری شروع کر دی لیکن جونہی چالی نے سنگاپور کے حکام سے جدہ کے لیے ویزا حاصل کرنے کی کوشش شروع کی اُسے بڑی سرد مہری اور نامہربانی کا سامنا کرنا پڑا۔ مجبور ہو کر

...زہ نیرہ کو لے کر انگلستان آگیا تاکہ لندن میں سعودی عرب کے قونصل خانہ سے ویزا حاصل کرے۔ اگرچہ اب اس کے دل میں خاص تشویش پیدا ہو چکی تھی تاہم اُسے اتنا یقین ضرور تھا کہ ویزا لینے میں بحیثیت ایک مسلمان کے وہ پُورا پُورا حق دار ہے۔

انہی سوچوں میں مستغرق دسمبر ۱۹۷۶ء کی اس تخ بستہ صبح کو جب اُس نے عرب قونصلر کا انکار سنا تو ایک لمحے کے لیے وہ بپھر گیا۔ قریب تھا کہ وہ غصّے میں قونصلر سے اُلجھ پڑتا لیکن اُسے اسلام کی سکھائی ہوئی ایک بات یاد آگئی۔

"پہلوان وہ نہیں جو اکھاڑے میں اپنے حریف کو شکست دے، بلکہ پہلوان تو وہ ہے جو غصّے کے وقت خود کو قابو میں رکھے!"

یہ یاد آتے ہی اُس کا سارا غصّہ فرو ہو گیا اور وہ بڑے ملائم لہجے میں سعودی قونصلر سے مخاطب ہوا۔

"میں نے ایسا کونسا گناہ کیا ہے جناب! جس کی پاداش میں مجھے حج جیسی عظیم سعادت سے محروم کیا جا رہا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" قونصلر نے جواب دیا۔ "لیکن بہرحال یہ ایک غیر متعلقہ سوال ہے!"

"غیر متعلقہ ــــ؟" چارلی کی حیوانی جبلت پھر عود کر آئی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے غصّے پر قابو پایا اور ملتجیانہ انداز میں بولا "لیکن خدا کے لیے اس انکار کی وجہ تو بتایئے ـــ؟"

"تمہیں مسلمان ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے"؟ سعودی قونصلر نے پوچھا۔

"چھ ہفتے ـــ"

"تو تمہارے سوال کا جواب یہ ہے" سعودی قونصلر نے کہنا شروع کیا۔ "ہمیں شاہ سعود کی طرف سے سخت احکامات ملے ہوئے ہیں کہ یورپین مسلم کو اُس وقت تک حجازِ مقدس کا ویزا نہ دیا جائے جب تک وہ بحیثیت مسلمان کے چھ سال نہ گزار لے۔"

ایک لمحے کو چارلی لڑکھڑا گیا اسے اپنی ساری محنت غارت ہوتی نظر آئی۔

ے ان برعکس مسلمانوں پر سخت غصہ آیا جن
حرکات سے مجبور ہو کر یہ سخت احکامات
ادر کرنے پڑے تھے۔ اس کا ذہن تیزی
ے کام کرنے لگا۔ فوراً ہی ایک خیال
ں کے ذہن میں آیا اور اس نے کونسلر
ے کہا:
"تب پھر آپ مجھے جدہ کا ویزا
ے دیں!"
"لیکن یہ آپ کے لیے قطعی بیکار
وگا کیونکہ آپ کو بہر حال جدہ میں ہی
ال گزارنے ہوں گے"
"لیکن آپ شاہ سعود کے حکم کو
ریں مسلمان بیوی پر کس طرح لاگو
ر سکتے ہیں؟" چالی نے غصے سے کہا۔
"غریب سراوک سے میرے ساتھ
ں امید پہ آئی ہے کہ حج کی سعادت
حاصل کرے گی!"
چالی نے محسوس کیا کہ وہ کونسلر
کچھ متاثر ہوتا نظر آیا ہے۔
[illegible]

کہ تمہارے ساتھ تمہاری بیوی بھی ہے؟"
"آپ نے اس بارے میں پوچھا
ہی نہیں!"
"کیا تمہارے پاس اس کا پاسپورٹ
ہے؟"
چالی نے پاسپورٹ نکال کر اسے دیا
کونسلر نے اس کا اچھی طرح جائزہ لیا۔
"اس بات سے تمہارے کیس کی
نوعیت ہی بدل گئی ہے مسٹر!" بالآخر وہ بولا
اس نے فوراً ہی ٹیلیفون پر اپنے کسی ماتحت
سے بات کی اور پھر کہنے لگا۔
"ان حالات کے تحت ہم تمہاری
بیوی کو حجاز کا ویزا دے رہے ہیں۔ اس
میں جدہ بھی ہے اور اس کا یقینی
مطلب یہ بھی ہے کہ وہ مکہ اور مدینہ بھی
جا سکتی ہے!"
"بہت بہت شکریہ!" چالی نے جواب
دیا "لیکن میرے بارے میں آپ نے کیا
فیصلہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ میری بیوی تنہا یہ
سفر نہیں کر سکتی!"

"ہم اس بات کو محسوس کر رہے ہیں" کونسلر نے کہا "اور اسی بنا پر ہم آپ کو جدہ کا ویزا دے رہے ہیں۔ ایک بار وہاں پہنچنے کے بعد یہ وہاں کے حکام پر منحصر ہوگا کہ وہ آپ کو حجاز مقدس جانے کی اجازت دیں یا نہیں۔ کیا تم اس سے مطمئن ہو؟"

"بڑی مہربانی" جالی نے کہا: "اگرچہ میں اس سے مطمئن تو نہیں ہوں لیکن پھر بھی کچھ نہ ملنے سے اتنا مل جانا ہی کافی ہے۔"

وہ کونسل خانے سے ملی جلی کیفیات میں گھرا ہوا باہر نکلا، اگرچہ ابھی تک وہ مکہ اور مدینہ جانے کی سعادت سے محروم رکھا جا رہا تھا لیکن اُسے خوشی تھی کہ کم از کم جدہ تک جانے کی اجازت تو ملی اس انٹرویو کا ایک حاصل یہ بھی تھا کہ اسے جدہ کے حکام سے ایک صبر آزما جنگ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

اب جالی کی خواہش تھی کہ جلد از جلد جدہ پہنچا جائے۔ حج کے دن نزدیک آ رہے تھے اور اسے نہیں معلوم تھا کہ جدہ کے حکام اُسے کتنی دیر رُکنے پر اصرار کرتے ہیں۔

وہ اور منیرہ بذریعہ طیارہ لندن سے پیرس پہنچے، وہاں سے ٹرین کے ذریعہ برنڈزی اور پھر وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعہ اسکندریہ، یہاں انھیں معلوم ہوا کہ جلد ہی ایک مصری جہاز حاجیوں کو لے کر نہر سویز کے راستے جدہ جا رہا ہے۔ انھوں نے فوراً اس میں اپنی نشستیں مخصوص کروا لیں۔

جہاز پر پہنچنے کے بعد انھوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ ترک مصری، مراکشی، افریقی اور شامی مسلمان اور افغانوں کی ایک پارٹی جو افغانستان سے دو سال میں پیدل چل کر یہاں پہنچی تھی جہاز پر موجود تھے۔ حج کے لیے آنے والے یہ لوگ ہر طرح کے تھے۔ غریب بھی اور امیر بھی۔ سادہ بھی تھے اور تیز طرار بھی کچھ لوگوں نے مصری سوٹ اور فر کیپ

پہنے ہوئے تھے جبکہ کچھ نے عبا اور عمامہ پہن رکھا تھا جو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے رائج تھا۔ اگرچہ روانہ ہونے میں تھوڑا وقت رہ گیا تھا لیکن جہاز پر آنے والوں کا ابھی تک تانتا لگا ہوا تھا، مائیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ آ رہی تھیں کچھ آدمی اتنے بوڑھے تھے کہ وہ چل بھی نہیں سکتے تھے اور عرشے پر رینگتے آ رہے تھے ان میں صحت مند لوگ بھی تھے اور بیمار بھی، آنکھوں والے بھی تھے اور اندھے بھی، پھر بھی ان سب کے چہرے خوشی کے ایک عجیب احساس سے دمک رہے تھے اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ وہ شہروں کے سردار شہر مکہ جا رہے تھے۔ ان کے دل خوشی کے اس بھرپور احساس سے لبریز تھے کہ جلد ہی خدا تعالیٰ انھیں اپنے گھر میں داخلے کی سعادت عطا فرمائے گا۔ پھر وہ اپنے پیارے رسولؐ کے روضہ مبارک پر حاضری دیں گے۔ وہ اس مقدس سرزمین کو جا رہے تھے جہاں سے آفتاب رسالت طلوع ہوا اور پھر اس نے تمام دنیا میں اپنا نور پھیلایا۔

جہاز پر تھرڈ کلاس کے مسافروں کے لیے کوئی کیبن نہیں تھے۔ ان کی وجہ سے عرشے پر ایک عجیب سی رونق بپا تھی۔ لوگوں نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق جگہ گھیری ہوئی تھی۔ کچھ نے چادریں باندھ کر اپنی خواتین کے لیے پردے کا بندوبست کیا ہوا تھا ایک آدمی خشک کی ہوئی مچھلی پکڑے کھڑا تھا۔ کچھ ان کریٹوں کو سنبھالنے اور سجانے میں مصروف تھے جن میں سفر کے دوران کھانے کے لیے مرغیاں اور بطخیں بند تھیں۔ بہت سے اپنی اپنی ٹوکریاں کھول کر پکانے کی تیاری کر رہے تھے۔

سفر کے دوران نماز کا منظر بھی بڑا روح پرور تھا۔ پہلے ایک مؤذن بڑی خوش الحان سے اذان دیتا۔ اذان کی آواز سنتے ہی سب لوگ اپنا کام چھوڑ کر نماز کی تیاری میں مشغول ہو جاتے۔ صفیں بچھائی جاتیں اور سب لوگ اپنے امام کی قیادت میں خانہ کعبہ

رُخ منہ کرکے اپنے خالق کے حضور جھک جاتے اس موقعہ پر کوئی غیر ضروری آواز سنائی نہ دیتی سوائے امام کی تلاوت کے یا جہاز کے انجنوں کی چھک چھک کے اور یا اس آواز کے جو نمازیوں کے جسموں سے اٹھتے بیٹھتے وقت نکلتی۔

جہاز نے بالآخر جدہ کی بندرگاہ سے کچھ فاصلے پر لنگر ڈال دیئے اس اثنا میں بندرگاہ سے کشتیاں آنا شروع ہو گئیں جن میں حاجیوں اور ان کے سامان کو بھر بھر کر بندرگاہ پہنچایا جاتا۔ اپنی باری آنے پر چالی اور منیرہ بھی بندرگاہ پہنچے۔ کسٹم چیکنگ کے لیے چالی جب مقررہ جگہ پہنچا تو وہاں کے انچارج نے اس کا اور اس کے کاغذات کا بغور جائزہ لینے کے بعد انھیں ایک گھنٹہ پولیس اسٹیشن رپورٹ کرنے کو کہا۔

باہر نکلنے کے بعد سامنے ہی انھیں ایک کئی منزلہ ہوٹل نظر آیا۔ انھوں نے اس میں کمرہ لینے کی ٹھانی۔ انھیں پانچویں منزل پر کمرہ دے دیا گیا۔ جو بڑے خوبصورت سامان سے آراستہ تھا۔ مختصر سے کھانے کے بعد جو چاولوں اور خوش ذائقہ کھجوروں پر مشتمل تھا۔ وہ فوراً پولیس اسٹیشن پہنچے جہاں ایک یک چشم شامی آفیسر موجود تھا۔ اس نے بڑی باریک بینی کے ساتھ ان کے کاغذات کو چیک کیا۔ بے شمار ضروری اور غیر ضروری سوالات پوچھنے کے بعد اس نے چالی سے کہا کہ اس کے کاغذات مزید تحقیقات کے لیے پولیس چیف کے پاس جائیں گے جو انھیں جدہ کے امیر کے پاس بھیجے گا۔ اور امیر جدہ باری آنے پر انھیں آخری منظوری کے لیے مکہ بھجوائے گا۔ چالی کے استفسار پر کہ اس سارے کام میں کتنا عرصہ لگے گا۔ شامی آفیسر کندھے اچکانے کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔

چالی نے جان لیا کہ اگر وہ حج کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے جدہ اور مکہ میں اپنے کاغذات کے پیچھے کچھ ایسے آدمی لگانے [illegible] جو کاغذات کو اِدھر اُدھر [illegible] سے [illegible] کہ سرکاری طور پر [illegible]

بنے چند بار شیوخ کے حوالے ہوتا ہے
جنہوں نے اسے پہلے سے بانٹ رکھے ہیں۔
ان شیوخ کے ایجنٹ جدہ میں موجود ہوتے
جب کوئی شخص حج کے لیے یہاں آتا ہے
تو اسے لازمی طور پر جدہ میں کسی نہ کسی ایجنٹ
سے معاملہ طے کرنا پڑتا ہے جو کہ اس کے
دوران حج کے قیام، آمد و رفت اور کھانے
پینے کا بندوبست کرتا ہے۔

چالی نے ابھی تک کسی ایجنٹ سے
بات نہیں کی تھی اس لیے کہ وہ کہیں غلط
ہاتھوں میں نہ پڑ جائے لیکن اب اس
نے ارادہ کیا کہ اسے فوراً کسی ایجنٹ سے
معاملہ طے کرنا چاہیے۔ پولیس اسٹیشن
مختلف شیوخ کے ایجنٹوں سے بھرا ہوا
تھا۔ چالی کو ان میں سے ایک آدمی اپنی
وضع قطع، چال ڈھال اور انداز گفتگو سے
بہت بھایا۔ اس کا نام محمد صالح بن مصطفیٰ
بابلی تھا۔ وہ مکہ کے ایک نہایت بارسوخ
شیخ عبدالرحمان کیتان کا ایجنٹ تھا۔
جبکہ انہوں نے کسی ایجنٹ سے معاملے

کیا ہے؟" یک چشم شامی آفیسر نے چالی
کے کاغذات دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"ابھی تک تو نہیں لیکن اب میں
شیخ عبدالرحمان کیتان کے ایجنٹ سے
بات کرنے والا ہوں،" چالی نے باآواز بلند
جواب دیا۔

"خدا تمہاری حامی و ناصر ہو۔" یک چشم
شامی نے اسے رخصت کرتے ہوئے کہا۔

چالی اور منیرہ محمد صالح کے ساتھ
پولیس اسٹیشن سے باہر نکلے۔ محمد صالح نے
یقین دلایا کہ وہ اور اس کا باپ شیخ عبدالرحمان
کیتان ہر ممکن کوشش کریں گے کہ جتنی
جلد ممکن ہو سکے کاغذات تصدیق ہو کر
واپس آ جائیں۔

وہ اپنے ہوٹل واپس آ گئے اور اپنے
کمرے میں بیٹھ کر بڑی دیر تک کاغذات
کے بارے میں لاحاصل گفتگو کرتے رہے۔

اچانک کمرے کے باہر فوجی بوٹوں
کی دھمک سنائی دی۔ پھر دروازہ کھلا اور
چھ مسلح پولیس مین رائفلوں سے مسلح

چڑھائے مارچ کرتے ہوئے اندر آ گئے۔ کے نان کمیشنڈ آفیسر نے اعلان کیا کہ اس کے پاس پولیس چیف کی طرف سے جالی کے لیے ایک ضروری پیغام ہے۔

پولیس چیف کا کہنا ہے۔ آفیسر نے پڑھنا شروع کیا کہ "تمہیں ایک لمبے عرصے تک جدہ میں قیام کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ عرصہ دس دن، دس ماہ یا دس سال بھی ہو سکتا ہے۔"

"الحمد للہ!" جالی خوش دلی سے مسکرایا "اللہ مالک ہے۔"

سپاہیوں نے رائفلیں دوبارہ کندھوں پر رکھیں اور پہلے کی طرح مارچ کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

صالح تھوڑی دیر بعد اپنے باپ مصطفےٰ بابلی سے ملانے لے گیا جو بڑا روایتی قسم کا عرب تھا اس نے جالی کو حوصلہ دیا کہ پولیس چیف کے پیغام سے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، پھر وہ کہنے لگا:

"ان مشکلات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں میرے بھائی! تکلیفیں اور مشکلات تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اللہ ہی کی تائید و نصرت کے ساتھ میں اور میرا بیٹا تمہیں اس سے نکال لیں گے۔"

اس نے پیش کش کی کہ کاغذات واپس آنے تک جالی اور منیرہ بلا تکلف اس کے مکان میں قیام کر سکتے ہیں۔ پھر اس نے تنبیہ کی کہ اول تو جالی کو گھر سے باہر نکلنا ہی نہیں چاہیے۔ اگر بہت ضروری ہو تو وہ صالح کو ساتھ لے کر نکلے اور شہر کی دیوار کے باہر جانے کا تو وہ خیال بھی دل میں نہ لائے۔

جالی نے سوچا باوجود ہر طرح آرام کے اس کی حیثیت ایک قیدی کی سی ہے۔ بہر حال اس نے اس صورت حال کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا اور وہ منیرہ کے ساتھ مصطفےٰ بابلی کے مکان میں منتقل ہو گیا۔ یہ مکان ایک پانچ منزلہ بلڈنگ تھی جس میں

...رفت کے لیے لکڑی کا بڑا سا پھاٹک ہوا تھا۔ چالی کو صالح کے ساتھ پہلی منزل میں کمرہ دیا گیا جس میں نہایت خوبصورت قالین بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ صوفوں کی قطاریں تھیں جن پر کڑھے ہوئے کشن رکھے تھے۔ میترہ کو زنان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ ...مردانے سے بالکل ہٹ کر تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد چالی نے اپنا یورپی طرز کا سوٹ اُتار پھینکا جس کی جگہ عربی طرز کے عبا اور عمامہ نے لے لی، یہ لباس چالی کو بے حد آرام دہ اور پُرسکون محسوس ہوا۔ وہ اب عربی بھی روانی کے ساتھ بولنے لگا تھا اور اکثر دیکھنے والے اُسے شامی یا ترک مسلمان سمجھتے تھے۔

جوں جوں دن گزرتے گئے چالی کی بے چینی بڑھنے لگی، ہکا خدات کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس مرحلے میں ہیں۔ چالی اکثر یہ سوچ سوچ کر رنجیدہ ہو جاتا تھا کہ پتہ نہیں اُسے یہ نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ اس کی بے چینی اور تشویش کو دیکھتے ہوئے صالح ایک روز اسے امیر جدہ کے پاس لے گیا جس نے بتایا کہ ہکا خدات مکہ بھجوا دیئے گئے ہیں اور جب تک واپس نہیں آ جاتے وہ کسی کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

چالی بڑی افسردگی کے ساتھ واپس گھر پہنچا، لیکن دو روز بعد اُسے یہ سن کر مسرت ہوئی کہ شیخ عبدالرحمن کیتان اُس سے ملنے کے لیے مکہ سے آ رہا ہے۔ شیخ عبدالرحمان درمیانے قد، ملائم لہجے اور بڑی بڑی ذہین آنکھوں والا ایک درمیانی عمر کا مرد تھا۔ صالح اور مصطفےٰ بادلی نے ہاتھ چوم کر شیخ کا استقبال کیا۔ شیخ نے آتے ہی اعلان کیا کہ مکہ کا امیر شہزادہ فیصل بن عبدالعزیز آج ہی جدہ آ رہا ہے اور یہ کہ اس نے چالی کی اس سے ملاقات کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔

امیر مکہ کا جدید طرز کا محل جدہ کی مضافاتی دیواروں کے پاس تھا جب چالی ملاقات

کے لیے اس کے پاس پہنچا تو ایک ہی نظر میں اس نے بھانپ لیا کہ شہزادہ فیصل ایک بارعب اور پُروقار شخصیت کا مالک ہے۔ گاؤ تکیے کا سہارا لے کر قالین پر بیٹھے ہوئے شہزادے نے چالی کی عرضداشت بڑے غور سے سنی اور وعدہ کیا کہ وہ خود اس کے کاغذات اپنے باپ شاہ ابن سعود کی خدمت میں پیش کرے گا۔ اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر کسی وجہ سے حج کے مقررہ وقت تک چالی کو مکہ جانے کی اجازت نہ مل سکی تو خود اپنی ذاتی مہر کے ساتھ چالی کو مکہ جانے کا اجازت نامہ دے گا۔ اس نے شہزادے کا شکریہ ادا کیا اور اجازت لے کر چلا آیا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ توں توں چالی کی پریشانی بڑھنے لگی۔ وہ روزانہ شیخ کپتان کو مکہ کو فون کرتا اور کاغذات کی بابت دریافت کرتا لیکن وہاں سے روزانہ نفی میں جواب ملتا۔ حج کے دن بالکل قریب آچکے تھے پورا جدہ حاجیوں سے بھر چکا تھا، لوگ سارا دن مکہ جانے والی شاہراہ پر رواں دواں رہتے۔ چالی بے چارہ شہر کے دروازے پر بیٹھا انھیں حسرت کے ساتھ تکا کرتا تھا۔ وہ سوچتا پتہ نہیں وہ دن کب آئے گا جب وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ اسی طرح سفر کرے گا۔

تب ایک صبح صالح شاداں و فرحاں چالی کے پاس آیا اور بتایا کہ بالآخر ان کی محنت رنگ لے آئی ہے۔ چالی کے بے تابانہ استفسار پر اُس نے بتایا کہ شاہ سعود نے اُس کے کاغذات دستخط کر کے جدہ بھیج دیے ہیں۔ چالی بھاگا دوڑتا ہوا امیر جدہ کے دفتر پہنچا اور کاغذات کی بابت دریافت کیا لیکن یہاں ایک افسوسناک خبر اس کی منتظر تھی۔

"تمہارے کاغذات منظور ہو کر واپس آ گئے ہیں۔" امیر جدہ نے اسے بتانا شروع کیا۔ "بالآخر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ایک مسلمان ہو۔ لیکن مجھے ایسے کوئی احکامات نہیں ملے جن کی رو سے یہ کاغذات تمہارے حوالے کر دیے جائیں یا تمہیں مکہ جانے کی اجازت دے دی جائے۔"

چالی نے بہت منت وسماجت کی بہت گڑگڑایا لیکن امیگریشن احکامات کے کاغذات دینے سے انکار کر دیا۔

چالی بڑی افسردگی کے ساتھ باہر نکلا لیکن وہ گھر پہنچا تو ایک خوش خبری اُس کی منتظر تھی۔ مصطفےٰ بابلی نے اُسے بتایا کہ شاہ ابن سعود والیٔ عرب ایک دورے کے لیے جدہ آ رہا ہے۔ یہاں ہمارے لیے ایک موقع ہے۔ مصطفےٰ بابلی نے مسکراتے ہوئے کہا: شاہ سعود سے تمہاری ملاقات تمہارے تمام مسئلے حل کر دے گی۔

تین دن بعد چالی شاہ ابن سعود کے جلوس کو جدہ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ شاہ کے قافلے میں تقریباً ایک سو فورڈ کاریں تھیں۔ شاہ کی گاڑی کے دونوں طرف فٹ بورڈز پر اس کے حبشی باڈی گارڈ ہاتھوں میں ننگی تلواریں اور ہولسٹرز میں بھرے ہوئے پستول رکھے کھڑے تھے۔ مصطفےٰ بابلی اور اس کے دوستوں کی کاوش سے چالی کو اسی روز ظہر کی نماز کے بعد شاہ سے ملاقات کا وقت مل گیا۔

جب چالی شاہ ابن سعود سے ملاقات کے لیے اسی محل میں پہنچا جہاں وہ شہزادہ فیصل سے ملا تھا تو وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تمام محل حبشی غلاموں سے بھرا ہوا ہے۔ شاہ سعود قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے اور اس پوزیشن میں بیٹھے ہوئے وہ اپنے جسم کو ہلکے ہلکے جھٹکے دے رہا تھا۔ باوجود اس عجیب پوزیشن کے چالی نے اندازہ لگایا کہ شاہ ایک سرو قد اور طاقت ور شخص ہے۔ اس کی جلد گندمی رنگ کی تھی اور چہرے پر سعری بھری، بارعب ڈاڑھی تھی۔ شاہ کی ایک آنکھ کسی حادثے میں ضائع ہو چکی تھی۔ چالی کو بادشاہ کے ایڈی کانگ نے اس کے سامنے پیش کیا۔ شاہ نے بیٹھے بیٹھے مسکرا کر اس سے مصافحہ کیا، اسے اپنے ہاتھ چومنے کی سعادت بخشی اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اجازت ملتے ہی جالی کا ظرف بھر آیا اور
اس نے بڑے پُر تاثر اور دلگداز انداز میں
اپنی کہانی شاہ کو سنائی۔
"اگر کوئی شخص واقعی حج کرنے کا
اہل ہے تو اسے میں کس طرح روک سکتا
ہوں!" شاہ نے جالی کی بپتا سننے کے بعد
کہا۔ "کیونکہ یہ بات خدائے بزرگ و برتر
کی ناراضگی کا سبب بن سکتی ہے لیکن اگر
کوئی اس کا اہل نہیں تو اُسے روکنا میرا
فرض ہے اور اس لیے میں نے یہ حکم
دے رکھا ہے کہ کسی نو مسلم کو چھ سال گزار
سے پہلے حج کرنے کی اجازت نہ دی
جائے اور یہ کہ اس کا چھ سال تک جدہ
تک رہنا بھی لازمی ہے۔"
اس موقع پر جالی نے اندازہ لگایا
کہ اس کا رونا اور گڑگڑانا بادشاہ کو قطعی
متاثر نہ کر سکا۔ شاہ ایک باوقار شخص
ہے اور یقیناً وہ ایک نڈر اور بہادر
شخص کو پسند کرے گا۔ یہ خیال آتے
ہی اس نے بغیر کسی ڈر کے اور خوف
کے کہنا شروع کیا،
"میں سعودی عرب اس لیے آیا تھا"
جالی نے بادشاہ کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈال کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہ حج کی سعادت
حاصل کروں گا جس کی خواہش میرے
دل میں اس وقت سے ہے جب سے
میں مسلمان ہوا ہوں۔ جناب والا آپ
جانتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے دل میں حج
کی شدت سے اور سچی خواہش ہو۔ لیکن
ایسا کرنے سے روک دیا جائے۔ تو بھی اس
کا حج قبول ہو جاتا ہے اگرچہ اس نے حج
کے ارکان ادا نہ کئے ہوں۔ قرآن کا ارشاد
ہے کہ کوئی شخص اگر ایک سچے مسلمان کو حج
کرنے سے روک دے تو موخرالذکر
کے سارے گناہ اول الذکر کے گناہ بن
جاتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ شخص حج کرتا تو
عرفات کے میدان میں اس کے گناہ
بالکل دھل جائے۔
جالی نے ایک لمحے کو توقف کیا تاکہ
اپنے الفاظ کا ردعمل دیکھ سکے۔ شاہ ابن سعود

بالکل خاموش اور غیر متحرک بیٹھا تھا۔ وہ
گہری سوچ میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔ جالی نے
سمجھتے ہوئے لوہے پر چوٹ لگانے کا
فیصلہ کیا۔ وہ تھوڑا سا آگے کی طرف جھکا
اور تقریباً سرگوشی کے انداز میں بولا۔
"جناب والا! مجھے حج کی سعادت
سے محروم رکھتے ہوئے کیا آپ میرے
گناہوں کا بوجھ اٹھانے کو تیار ہیں؟"
جالی نے دیکھا کہ شاہ ابن سعود والئی
عرب نے ایک جھرجھری لی۔ کیونکہ وہ
جان گیا تھا کہ قرآن پاک کے حوالے سے
جالی اپنے مطالبے میں بالکل حق بجانب
ہے۔
"تم بالکل درست کہہ رہے ہو عبدالرحمٰن"
بالآخر بادشاہ نے سکوت توڑا۔ "لیکن اس
کے ساتھ ساتھ بحیثیت ایک حکمران کے
حجاز مقدس کو غیر مسلموں سے محفوظ رکھنا
میرا فرض ہے، میں اپنا جواب تمہیں اس
وقت نہیں دے سکتا ہوں مکہ جا کر اپنے
مشیروں سے مشورہ لوں گا اور تمہیں فوری
جواب بھجواؤں گا۔"
لیکن دن گزرتے چلے گئے اور بادشاہ
کا کوئی جواب نہ آیا۔ جدہ اب تقریباً خالی
ہو چکا تھا۔ اسے رہ رہ کر منیرہ کا خیال آتا
تھا جو اس کی وجہ سے حج سے محروم ہو رہی
تھی۔۔۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ
اچانک صالح دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا اور
اسے بتایا کہ امیر جدہ اس سے ٹیلیفون پر
بات کرنا چاہتا ہے۔ جالی دوڑتا ہوا فون تک
پہنچا۔
"مجھے شاہ نے ذاتی طور پر حکم دیا ہے
کہ تمہیں مکہ جانے کا اجازت نامہ فوری طور
پر دے دیا جائے۔" جالی کو امیر کی آواز
بڑی پیاری لگی اور اس نے سرمستی سے
کہا۔ "الحمدللہ! بے شک تمام تعریفیں اللہ
ہی کے لئے ہیں۔"
"لیکن مجھے یہ حکم صرف ٹیلیفون پر ملا
ہے۔" امیر نے اسے بتایا۔ "میں باقاعدہ تحریری
حکم نامے کا انتظار کر رہا ہوں، اور جیسے ہی
یہ موصول ہوا تمہیں مکہ جانے کی اجازت

دے دی جائے گی۔"

"لیکن اس میں تو کئی دن لگ جائیں گے جناب!" چالی چیخا۔

"لیکن یہ ضروری ہے مسٹر!"

"لیکن اگر آپ نے مجھے وقت مقررہ سے پہلے مکہ جانے کی اجازت نہ دی تو ہو سکتا ہے کہ شاہ ناراض ہو جائے کیونکہ اب اس کی بھی یہ خواہش ہے کہ میں حج کروں۔"

اس کے دوسرے سرے پر خاموشی چھائی رہی۔

"اچھا پھر میں ابھی مکہ فون کرتا ہوں" بالآخر امیر جدہ کی آواز سنائی دی۔ "اور اس سے کہتا ہوں کہ وہ اجازت نامہ ڈاک کی بجائے کسی آدمی کے ہاتھ فوراً روانہ کر دیں اور میرا خیال ہے کہ اس طرح یہ آج رات تک پہنچ جائے گا۔"

شام کے وقت ایک چشم شاہی افسر چالی کے پاس آیا اور اجازت نامہ کا غذات اس کے حوالے کر دیے جنہیں شاہ سعود نے ایک خصوصی کے ذریعے بھجوایا تھا۔ اب ایسی کوئی شق باقی نہیں رہ گئی تھی جو چالی اور منیرہ کو علی الصبح حج کے لیے مکہ جانے سے روک سکتی۔

دوسرے دن علی الصبح اٹھے۔ مکہ کا جدہ سے فاصلہ تقریباً ستر میل ہے اور وقت پر وہاں پہنچنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ کوئی موٹر کرائے پر لی جائے لیکن ٹیکسی اسٹینڈ سے چالی کو یہ جان کر بڑی مایوسی ہوئی کہ تمام ٹیکسیاں اور کاریں مکہ جا چکی ہیں۔

چالی سوچ میں پڑ گیا۔ کار یا ٹیکسی کے بغیر وہ کسی صورت میں بھی وقت پر مکہ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ جدہ میں یقیناً کسی نہ کسی کے پاس موٹر کار ہو گی۔ چالی نے سوچا میں ہر قیمت پر اسے حاصل کر لوں گا۔

تلاش بسیار کے بعد بالآخر چالی ایک چھوٹی سی لاری ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا جس میں بیٹھنے کے لیے لکڑی کی سیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے فوراً اسے کرایہ پر حاصل کر لیا لیکن اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ ڈرائیور کے پاس [illegible] کہ جانے تک اجازت نامہ [illegible]

بالی وہاں سے فوراً پولیس اسٹیشن گیا اور اجازت نامہ حاصل کر کے آیا، جب کہ اس دوران جالی اور منیرہ غسل کر کے احرام باندھ چکے تھے اور ضروری سامان بھی تیار کر چکے تھے۔ مصطفےٰ بالی کے پہنچتے ہی انھوں نے اپنا سامان لاری میں رکھا اور اس مقدس سفر پر روانہ ہو گئے۔

لاری اچھلتی کودتی اس راستے پر رواں دواں تھی جو مکہ جاتا تھا اور جالی ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو پیدل ہی مکہ جا رہے تھے۔ اُن کے لبوں پر ایک ہی طرح کے الفاظ تھے: "لبیک اللّٰہم لبیک" میں حاضر ہوں۔ اے خدا میں حاضر ہوں۔ جب جالی نے بعض کمزور افراد کو ترس کھا کر لاری میں بٹھا لیا تو انھوں نے اس کا قطعاً شکریہ ادا نہیں کیا بلکہ وہ اپنے رب کا شکر بجا لائے جس نے اُن کے لیے وقت پر مکہ پہنچنے کا بندوبست کر دیا تھا۔

آخر کار وہ اس جگہ پہنچے جہاں سے مقدس شہر مکہ کی حدود شروع ہوتی تھیں۔ اس جگہ سے آگے کوئی غیر مسلم نہیں جا سکتا تھا۔ کاغذات کی چیکنگ کے بعد وہ پھر روانہ ہو گئے۔

بالآخر وہ مکہ پہنچ ہی گئے۔ چھوٹا سا خوبصورت شہر جس کے چاروں طرف پہاڑیاں تھیں۔ دھوپ میں چمک رہا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے اب اس کئی عمارتوں میں منقسم اور بغیر چھت کے صحن والی مسجد کو دیکھ سکتے تھے۔ جسے خدا تعالیٰ کا گھر ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔

جالی کی آنکھیں اس نظارے کی تاب نہیں لا رہی تھیں۔ اُس کے نزدیک مکہ ایک شہر نہیں بلکہ ایک ایسا نظریہ بھی تھا جس نے چودہ سو سال پہلے تمام دنیا کے رہنے والوں کو بھائی چارے اور امن و محبت کے حسین بندھنوں میں جکڑ دیا تھا۔

شہر میں داخلے کے دروازے سے پہلے انھوں نے لاری کو چھوڑ دیا اور چھوٹی چھوٹی خوبصورت گلیوں میں سے ہوتے ہوئے شیخ عبدالرحمٰن

کپتان کے گھر پہنچے۔

کپتان نے اُن کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔

"تم لوگ خدا کی مرضی سے آئے ہو!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے ان کے لیے ایک معلم کا بندوبست کر رکھا تھا جس نے جلدی جلدی انھیں مختصراً حج کے ارکان اور مناجات کے بارے میں بتایا چونکہ وقت تھوڑا تھا اس لیے مختصر سا آرام کرنے کے بعد وہ کعبے کے طواف کے لیے روانہ ہو گئے۔ کعبے کی عمارت اُس بڑی مسجد کے درمیان میں تھی اور اُس پر سیاہ رنگ کا ریشمی کپڑا چڑھا ہوا تھا جس پر سونے کے حرفوں سے قرآنی آیات لکھی ہوئی تھیں۔ یہ نظارہ بڑا ہی قابلِ دید تھا۔ طریقے کے مطابق کعبے کی عمارت کے سات چکر لگانے پڑتے تھے اور ہر چکر کے دوران اس میں لگے حجرِ اسود کو بوسہ دینا پڑتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق یہ پتھر جنت سے جب لایا گیا تو بالکل سفید تھا لیکن لوگوں کے متواتر چومنے یا اُن کے گناہوں سے جو جذب کر لیتا ہے کی وجہ سے اب یہ بالکل سیاہ ہو چکا ہے۔ یہ روایت بھی ہے کہ یہ پتھر اس عمارت کا ٹکڑا ہے جسے توڑ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے موجودہ خانہ کعبہ کی بنیاد رکھی تھی۔

جمالی اور منیرہ بھی طواف کرنے والوں کے ہجوم میں شامل ہو گئے۔ جب وہ حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے لیے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک بدو اس سے لپٹا کھڑا تھا۔ اور ہلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ ایک پولیس مین نے اُسے بڑی مشکل سے کھینچ کر ہٹایا۔ اور یوں منیرہ کو اُسے پہلی بار چومنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

سات چکر پورے کرنے کے بعد انھوں نے چاہِ زمزم سے پانی پیا اور عصر میدانِ عرفات کی طرف ایک جمِ غفیر اونٹوں، گدھوں، عربی گھوڑوں، کاروں

اور لاریوں پر سوار رواں تھا۔ کچھ لوگ پیدل ہی چلے جا رہے تھے۔ میدان عرفات میں ہر طرف خیمے لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی اپنا خیمہ نصب کیا اور اگلے روز کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ حج کی سعادت حاصل کرتے۔

دوسرے دن سب لوگ میدان عرفات میں جمع ہو گئے اور پھر لاکھوں آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں: "لبیک اللّٰہم لبیک، اے خدا میں حاضر ہوں، اے خدا میں حاضر ہوں!"

جب لبیک اللّٰہم لبیک کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، جب حاجی اپنے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہے تھے، جب سفید احرام کسی فاتح فوج کے جھنڈے کی طرح لہرا رہے تھے، تب ہوا کے وہ جھکڑ آتے ہوئے نظر آئے۔ میدان عرفات کے جھکڑ۔

جمالی نے انھیں آتے دیکھا۔ نیلے آسمان پر ایک بہت بڑا چکر کھاتی ہوئی ہوا کا جھکڑ جس کی آس میں عرفات میں موجود تمام مردوزن بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ پچھلے چھ سو سال سے یہ ہمیشہ آتا رہا تھا۔ حج کے موقع پر بالکل اسی وقت اور اسی دن لوگوں کی دعاؤں میں جوش پیدا ہوا: اے خدا میں حاضر ہوں کی صدائیں اور بلند ہو گئیں۔ ریت کا یہ جھکڑ دوڑتا ہوا اور میدان میں گھومتا ہوا ایک خوفناک آواز کے ساتھ ظاہر ہوا۔ اس نے آتے ہی بہت سے خیموں کو زمین بوس کر دیا۔ بانسوں کے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے اور خیموں کے پھٹنے کی آوازوں نے شور میں اور اضافہ کر دیا۔ احرام باندھے ہوئے حاجی جن کے آدھے جسم ننگے تھے ریت کے تھپیڑے چبھنے سے تکلیف کے ساتھ دوہرے ہوتے جا رہے تھے۔ کچھ نے خیموں کے رسوں کو پکڑنے کی کوشش کی، لیکن ہوا نے انھیں دھکیل کر دور پھینک دیا۔ کچھ خوفزدہ جانوروں کو پکڑنے کے لیے دوڑے۔ اونٹ اور دوسرے سواری

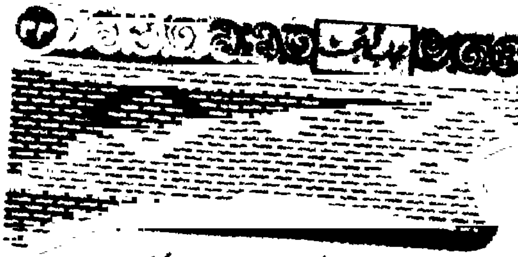
کے جانور خوف سے اندھا دھند بھاگنے شروع ہو گئے۔ قربانی کی بھیڑیں لوگوں کا ہجوم آندھی کی شدت سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگتا لڑکھڑاتا اور گرتا دکھائی دیتا تھا۔

تین دفعہ اُس آندھی نے میدان کا چکر لگایا اور پھر یہ طوفان یکلخت ختم گیا۔ چند لمحوں تک بالکل سکوت طاری رہا پھر تمام لوگوں نے گہرے اطمینان اور سکون کا سانس لیا اور سب نے ایک بار پھر یکجا ہو کر اپنے رب کا شکر ادا کیا۔

جاتا ہوا جھکڑ اپنے ساتھ حاجیوں کے گناہوں کو بھی اڑا لے گیا تھا اور اُس کے ساتھ ہی حج کا آخری رکن بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ انسانوں کا یہ ٹھاٹھیں مارتا سمندر آہستہ آہستہ میدان سے ہٹنا شروع ہوا، چالی ایک طرف کھڑا اُن سب کو جاتے دیکھتا رہا۔ اُس کی روح کو مکمل سکون اور آرام مل چکا تھا۔ ابھی حج کی چند رسوم باقی تھیں۔ ابھی انھوں نے مدینہ طیبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضری دینی تھی۔

★

چالی نے سوچا اس کے بعد وہ منیزہ کے ساتھ واپس تزادک جائے گا۔ اس کے لیے منیزہ کا انتخاب واقعی بالکل موزوں تھا۔ وہ بہت دلیر حوصلہ مند اور صابر تھی اور ضرورت پڑنے پر بہت ہی ذہین بھی۔ وہ اس کے یقین سے بھی بڑھ کر اس کے دل میں سما چکی تھی۔ اب جب کہ حج کے تمام مراسم پورے ہو چکے تھے اس نے اس سفر کے اختتام کی بجائے ایک نئی زندگی کی ابتداء محسوس کی۔ حج سے پہلے کی تمام فکریں اور تکلیفیں بالکل بھول گئیں۔ اس نے بالآخر تمام مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بعد اپنے عزم کو پا لیا تھا اور اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کو پورا کرنے کے بعد اُس پر ایک روحانی سکون طاری ہو گیا جس سے یقیناً وہ اپنی باقی ماندہ زندگی اطمینان سے گزار سکتا تھا۔



عبرت

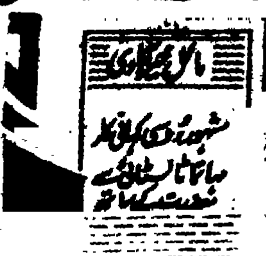
وہ راہِ حق سے بھٹک جائے بدنصیبی ہے ❁ جسے کتاب ملے صاحبِ کتاب ملے

آج دنیا میں مسلمان ہی وہ خوش قسمت گروہ ہے جس کے پاس اللہ کا کلام (قرآن مجید) ٹھیک اسی حالت میں موجود ہے جیسا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ آج قرآن مجید ہر ملک میں چھاپا جا رہا ہے۔ آپ ہر جگہ کے قرآن کریم اٹھائیے اور ایک ایک سطر، ایک ایک نقطہ، ایک ایک حرف ایک ایک زیر زبر اور پیش ملا لیجئے، آپ ذرا بھی فرق نہ پائیں گے۔ آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ قرآن شریف کی ایک سورہ ایسی ہے جس کے شروع میں "بسم اللہ" نہیں لکھی ہے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ شاید ہندوستان کے چھپے ہوئے قرآن شریف میں کاتب "بسم اللہ" لکھنا بھول گیا۔ لیکن جب آپ دوسرے ملکوں کے چھپے ہوئے قرآن پاک دیکھیں گے تو ان میں بھی اسی سورہ سے پہلے "بسم اللہ" لکھی ہوئی نہیں پائیں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے قرآن پاک لانے والے بزرگ فرشتے حضرت جبریلؑ کو جس طرح قرآن ملا انہوں نے اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کمی بیشی کے بغیر سنایا اور آپ نے کسی کمی بیشی کے بغیر لکھوا دیا۔
سورہ براءت لکھاتے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "بسم اللہ" نہیں لکھائی۔ آج تک سورۂ براءت بسم اللہ کے بغیر لکھی اور پڑھی جاتی ہے کیونکہ حضرت جبریلؑ نے اسی طرح یہ سورہ سنائی تھی۔ ایسی پاک اور بے میل کتاب جس کے پاس ہو وہ کتنے خوش قسمت ہیں کتنا اچھا ہے۔

یہی نہیں کہ قرآن مجید جس طرح نازل ہوا تھا ٹھیک اسی طرح مسلمانوں کے پاس ہے بلکہ قرآن مجید وہ صاف ستھرا کلام ہے کہ اس کو سمجھنے میں پریشانی نہیں ہوتی۔ اللہ کا حکم ہر صاف صاف۔ اللہ کی ہر مرضی کھلے کھلے لفظوں میں۔ نہ کوئی ٹیڑھ اور نہ پیچیدگی۔ صاف، سادہ اور بولے جانے والے بولوں میں بتایا گیا کہ اللہ کے بندو! یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ تمہارے فائدے کی بات یہ ہے اور یہ نہیں ہے۔ زندگی بسر کرنے کے لیے سیدھی راہ یہ ہے اور ٹیڑھی راہ یہ۔ اللہ اس بات سے خوش ہوتا ہے اور اس بات سے ناراض۔ ایسی صاف اور سیدھی تعلیم والی کتاب جس کے پاس ہو اس کی خوش نصیبی میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

پھر یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل فرما دیا ہو اور بس۔ کہ اسے یاد کر لو اور پڑھا کرو بلکہ حکم دیا کہ قرآنی تعلیمات پر عمل کر کے دکھاؤ اللہ کی عبادت کیسے کی جاتی ہے۔ اللہ کے بندوں سے معاملات کس طرح کیے جاتے ہیں۔ زندگی بسر کرنے کا ہر نمونہ پیش کرو اور کہہ دو کہ قرآن اور رسولؐ کی پیروی کروگے تو تم ہی سر بلند ہوگے اس دنیا میں بھی عزت پاؤگے اور پھر جب اللہ کے حضور جاؤگے تو اللہ تم سے خوش ہو کر ہمیشہ رہنے کی جگہ جنت عطا فرمائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی مرضی پر چل کر دکھا دیا۔ اللہ کے حکم پر عمل کر کے دکھا دیا۔ آپؐ نے مردوں اور عورتوں کا ایسا گروہ تیار فرما دیا جس نے آپؐ کی ایک ایک بات نوٹ کر لی اور جس طرح آپؐ ہر کام کرتے تھے اسی طرح کرنے لگے۔ حضورؐ کی یہ سنت آج مسلمانوں کے پاس محفوظ ہے۔ غور فرمائیے کہ جس گروہ کے پاس قرآن اور سنت دونوں موجود ہوں اور جسے دنیا و عقبیٰ میں عزت اور سربلندی کی ضمانت دی گئی ہو اس سے بڑھ کر خوش نصیب کون ہو سکتا ہے۔

لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا
ہے کہ آج دنیا میں سب سے زیادہ بد نصیب
گروہ یہی مسلمانوں کا گروہ ہے۔ دنیا میں
وہ کہیں سربلند نہیں۔ ہر جگہ پامال اور پست
دنیا میں کہیں ان کی عزت نہیں۔ ہر جگہ
ذلیل اور خوار۔ کہیں ان کا بول بالا نہیں
ہر جگہ تھڑی تھڑی ہو رہی ہے۔ کوئی انہیں
منہ لگانے والا نہیں۔ کوئی ان سے
بات کرنے کا روادار نہیں۔ ان کا کوئی
ہمدرد اور دوست نہیں۔ سبھی ان کے
دشمن۔ ہر جگہ ان کے دشمن قوی اور یہ کمزور
کمزور بھی ایسے گویا یہ غلام ہوں۔
سوچنے کی بات ہے کہ آج یہ نتیجہ
الٹا کیسے نکل رہا ہے۔ مسلمان اور پست۔
حیرت کی بات ہے۔ مسلمان اور ذلیل تعجب
ہے۔ مسلمان اور غلام، مسلمان اور کمزور۔
مسلمان اور تھڑی تھڑی ہوں۔ بڑی
حیرانی کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو
اس کے برعکس فرمایا۔ تو کیا (توبہ توبہ)
اللہ تعالیٰ نے غلط فرمایا۔ نہیں، اللہ
کا کلام پاک اور بے عیب۔ اللہ کا فرمان
محکم اور منضبط۔ اللہ کا فرمانا بجا اور درست
سچی بات یہ ہے مسلمان مسلمان نہیں رہا
مسلمان نے قرآن و سنت کو چھوڑ دیا۔ نبی
کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نمونہ پیش فرمایا
اور صحابہ کرام رض نے جس محنت اور مشقت
سے اس نمونے کو سمجھایا۔ مسلمانوں نے
وہ سب بھلا دیا تو پھر ذلیل نہ ہوں تو کیا
سر پر بٹھائے جائیں۔ تھڑی تھڑی ہو
تو کیا دلوں میں جگہ پائیں۔ جب انھوں
نے قرآن و سنت پر عمل کیا تھا۔ دنیا
کے امام ہو گئے تھے۔ اب انھوں نے
خدا اور رسول کو چھوڑ دیا تو دنیا کے غلام
ہو کر رہ گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔



کہانی کار

"کیا دے دوں بھائی!؟"... میں نے خوش ہو کر اس سے کہا۔

"صاحب! اتنے سے کام کے لیے کیا لوں اور پھر آپ سے؟" اس نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔ وہ اس وقت خوشی کے مارے کھلا جا رہا تھا۔

"مگر بھائی، دیکھو تو! تم رکشا پلٹ کر اس وقت تم نہ ہوتے تو میرے سارے کپڑے خراب ہو جاتے۔ گلی میں کتنا گندہ پانی بہہ رہا ہے۔ تم نے مجھے اس سے بچایا۔ کیا اس خدمت کی کچھ بھی قیمت نہیں؟"

"ہے، مگر آپ سے نہیں۔"

"مجھ میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں؟"

"کیوں نہیں، آپ نے ہمارے لیے، ہمارے بچوں کے لیے، ہماری عورتوں کے لیے اپنے کو وقف کیا ہے۔ کیسی کیسی اصلاحی کہانیاں اور نظمیں آپ نے لکھیں۔ ہم اور ہمارے بچے جھوم جھوم کر آپ کے لکھے ہوئے گیت گاتے ہیں۔ ہماری عورتیں بھی گنگناتی ہیں۔ بھائی صاحب آپ کو معلوم نہیں کہ آپ نے جو اصلاحی کام کیا ہے۔ اس سے کتنے گھر سدھر گئے۔ اب دیکھیے اس بچے کو بھی آپ کی نظمیں یاد ہیں۔"

"اچھا تو میں تم کو نہیں، اس بچے کو دیتا ہوں۔" اور یہ کہہ کر میں نے چاہا کہ رکشا کے پائدان پر بیٹھے ہوئے چار سالہ بچے کو ایک روپیہ دوں کہ اس نے پھر بڑی لجاجت اور ارادت سے کہا: "نہیں بھائی صاحب، نہیں!"

اگر میں کھڑا رہتا تو وہ ابھی اور میری تعریف کرتا لیکن اس وقت میں نے دیکھا مولانا حامد علی صاحب اسی طرف آرہے تھے۔ یقیناً وہ اس حدیث پر عمل کرتے جس میں ہے کہ جب تم دیکھو کہ کوئی کسی کے روبرو اس کی تعریف کر رہا ہے تو اس کے منہ میں ریت بھر دو۔

"اچھا تو تم مجھے جانتے ہو۔ کبھی میرے گھر آؤ۔" یہ کہتا ہوا میں وہاں سے چل دیا۔ میں اس سے بے حد متاثر تھا اس نے مجھے کہانی کا پلاٹ دیا تھا۔ یہ پلاٹ میرے دماغ میں بہت دنوں کلبلاتا رہا آخر میں نے دماغ کا بوجھ ہلکا کر دیا۔

"میرے شہر میں ایک عجیب آدمی رہتا تھا اس کا نام تھا خوشی محمد۔ وہ نام کا خوشی محمد تھا ویسے خوشی کا منہ اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بڑا نیک آدمی تھا نماز پڑھتا، روزے رکھتا، اپنے بس بھر دوسروں کی مدد کرتا اور ایسے کاموں کو وہ بڑے ثواب کے کام کہتا تھا۔ ایسے کام کر کے وہ دل ہی دل میں خوش ہو لیتا تھا مگر پھر وہ اچانک الٹ گیا۔

"بھائی صاحب! بھائی صاحب!" — میں نے مڑ کر دیکھا خوشی محمد بڑی تیزی سے رکشا لیے ہوئے میری طرف بڑھ رہا تھا "سنئے تو، سنئے تو!"

"ارے بھائی! میں بہت جلدی میں ہوں۔"

"اچھا تو آئیے، بیٹھ جائیے۔"

میں اس کی رکشا پر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی اس کی رکشا چالو ہو گئی۔ ساتھ ہی اس کی زبان بھی۔

"خدا، خدا، خدا! کس قدر دھوکا ہے۔ ہرگز نہیں۔ خدا وُدا کچھ نہیں!"

خوشی محمد کی زبان سے یہ سنا تو میں چونکا۔ میں نے پوچھا۔

"خوشی محمد کیا تم وہی خوشی محمد نہیں ہو جو کئی برس پہلے ملے تھے؟"

"ہوں تو وہی مگر اب میں نے جانا..."

بدل دیا ہے ؟

"اب تمہارا کیا نام ہے ؟"

"اب میں اپنے کو غمی محمد کہتا ہوں!"

"غمی محمد!"

"جی!!"

"یہ کیوں ؟"

"کیونکہ جب سے میں پیدا ہوا غمی محمدؐ نام نے میرا ساتھ دیا۔ خوشی محمد تو غلط نام تھا۔ سنئے تو بھائی صاحب! میں بچہ ہی تھا کہ میرے باپ کا انتقال ہوگیا۔ پھر میں ابھی دس بارہ برس ہی کا تھا۔ درجہ چار میں پڑھتا تھا کہ ماں بھی اللہ کو پیاری ہوگئی صاحب! اسی عمر سے رکشا چلا رہا ہوں۔ جوان ہوا۔ مجھے شادی کی خواہش ہوئی۔ مجھے لڑکی کون دیتا۔ پاس پیسہ نہیں۔ خاندان بھی بس یونہی ہے۔ پھر شکل و صورت جیسی ہے۔ آپ کے سامنے ہے۔ میں تیس برس کا ہوگیا تو ایک بیوہ سے شادی کی۔ اس سے دو بچے ہوئے۔ دوسرے بچے کے پیدا ہونے پر بیوی کی زچگی بگڑ گئی۔ میرے پاس جو کچھ تھا سب خرچ کر دیا۔ پھر رو رو کر خدا سے دعا مانگی مگر ہوتی بات یہ ہے کہ خدا ذرا ہو تو سنے۔ بیوی مرگئی۔ بچہ مرگیا۔ اب وہ بچہ زندہ تھا جسے آپ نے دیکھا تھا۔ اُسے ہر وقت میں رکشا پر ڈالے رکھتا۔ سوچیے تو اور کہاں چھوڑتا۔ ایک دن اس غریب کو ہوا لگ گئی۔ نمونیہ کا شکار ہوگیا اور دیکھتے دیکھتے چل بسا۔ میں نے رات بھر نماز پڑھی گڑ گڑا کر توبہ تلا کی مگر واہ رے خدا! خوب بدلہ دیا میری نیکیوں کا رہا سہا وہ لڑکا بھی گیا۔

بھائی صاحب! میرے محلے میں غفورا بھی رہتا ہے۔ پکا بدمعاش۔ جواری۔ چور پورا ادا۔ اس کی سب عزت کرتے ہیں خدا بھی اس سے خوش ہے۔ کیا مجال کہ اس کا کوئی کام نہ ہوسکے۔ مگر میں۔ میں ایک محروم۔ محروم۔ محروم ؟"

"تو پھر تم نے نماز بھی چھوڑ دی ہوگی ؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں!"

"اور نیکی کے کام بھی!"

خوشی محمد جھنجھلا گیا۔ صاحب! نیکی کیا نیکی کیا۔ وہ دیکھیے ماڈل ٹاؤن آ گیا۔"

"اچھا شکریہ۔ لو، یہ پانچ کا نوٹ پکڑ لو۔"

"آپ سے نہیں۔"

"کیوں؟"

"آپ میرے لیے خدا سے اچھے ہیں!"

"لاحول ولا قوۃ۔"

"مجھے ماڈل ٹاؤن میں سیرت محمدیؐ پر ایک مقالہ پڑھنا تھا۔ میں ادھر بڑھ گیا۔ جس وقت میں مقالہ پڑھ رہا تھا۔ اس وقت میں نے دیکھا۔ خوشی محمد سامنے کھڑا سن رہا تھا۔ پھر جب میں نے اپنے مقالے کا یہ پیراگراف پڑھا کہ:۔

کوئی چاہے خدا کا منکر ہی کیوں نہ ہو لیکن محمد رسول اللہ کو نہیں بھلا سکتا۔ محمد رسول اللہ نے جو کچھ کہا، کیا۔ اس کے اثرات دنیا پر پڑے۔ پڑتے رہے پڑتے رہیں گے۔ کون ہے جو اس سے انکار کرے....

"کوئی نہیں انکار کر سکتا۔" سامنے کھڑے ہوئے خوشی محمد نے چیخ کر کہا "مجھے دیکھو! میں خدا کا منکر ہوں۔ لیکن اب بھی میرے دل میں محمد رسول اللہؐ کی عزت ہے!"

میں اس کی طرف دیکھنے لگا اور لوگ اسے چپ کرنے لگے۔ وہ چپ ہو گیا۔ میں نے مقالہ ختم کیا اور پھر جب چلنے لگا تو خوشی محمد نے آ پکڑا۔ جب میں اس کی رکشا پر بیٹھا تو میں نے اس سے کہا:

"خوشی محمد! تم حدیث کی کوئی کتاب پڑھا کرو۔"

"تو دیجیے نا!"

اس وقت میرے پاس چالیس حدیثوں کا مجموعہ، جسے میں نے خود ترتیب دے کر چھپوایا تھا۔ موجود تھا۔ ایک نسخہ اسے دیدیا اس نے چوما اور رکھ لیا۔

اور پھر وہ ان حدیثوں کے مطالعہ میں غرق ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ حدیث پڑھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ حدیثوں کی

برکت ہے؟ اُسے پھر خیال تنگ کرنے لگا اور پھر ایک دن جب وہ حدیث پڑھنے میں محو تھا تو کسی نے پکارا۔ "میں کل تمہارے یہاں آؤں گا۔" وہ چونک پڑا۔ وہ دروازے پر گیا۔ اس نے دور تک نظر ڈالی۔ کوئی نظر نہ آیا۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ وہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔ فوراً آنکھ لگی تھی کہ پھر آواز آئی۔ "خوشی محمد! میں کل آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا!" خوشی محمد چونک پڑا۔ کھڑکی سے جھانکا۔ کوئی دکھائی نہ دیا۔

وہ رات بھر یہی آواز سن سن کر چونک چونک پڑتا رہا۔ صبح سویرے اٹھ کر اس نے اپنا پرانا کمبل اوڑھا اور چائے پینے ہوٹل کی طرف چل دیا۔ راستے میں اس نے ایک دردبھری آواز سنی۔

"بابا! پیارے رسول ﷺ کا صدقہ!"

خوشی محمد نے ادھر دیکھا۔ ایک بڈھا ایک دیوار سے لگا بیٹھا تھا۔ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ خوشی محمد نے اپنا کمبل اس پر ڈال دیا۔ دوڑتا دوڑتا ہوٹل گیا۔ وہ پیالیوں میں چائے لے آیا۔ سوچا تھا کہ ایک پیالی خود پیئے گا اور دوسری بڈھے کو پلائے گا مگر اس نے دونوں پیالیاں بڈھے کو پلا دیں اور خود بے پیئے گھر چلا آیا۔ اب اس کی جیب میں پیسے نہ تھے۔

میرا قلم بڑی روانی کے ساتھ کاغذ پر چل رہا تھا۔ افسانہ بڑی کامیابی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا تھا۔ خوشی محمد واپس گھر جا رہا تھا۔ راستے میں اس نے ایک عورت کو دیکھا۔ ایک بچہ اس کی گود میں تھا۔ بچہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔

"اسے بہلاتی کیوں نہیں؟" خوشی محمد نے عورت سے کہا۔ "اسے دودھ پلاؤ۔"

"بھیا۔ کل سے بھوکی ہوں۔ دودھ سو....."

عورت آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ خوشی محمد نے اس سے کہا۔ "اچھا، میرے ساتھ آؤ۔" وہ اُسے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ دہکتی ہوئی انگیٹھی کے پاس بٹھایا اور بولا۔ "میں ابھی آتا ہوں۔"

اب میری کہانی پورے عروج پر آگئی تھی۔
اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک
دی۔ میں نے بیوی سے کہا: "کہہ دو دس
بجے آؤ۔" بیوی نے جاکر کہا، پھر جواب لائی
"وہ کوئی سخت ضرورت مند ہے
اپنا نام خوشی محمد بتاتا ہے۔"
"اچھا کہہ دو کہ اس وقت گھر میں
نہیں ہیں۔"
دراصل بات یہ ہے کہ جب میں افسانہ
یا کہانی وغیرہ لکھتا ہوں تو کہانی کے تانے
بانے کا ایک طوفان میرے آس پاس ہوتا
ہے اگر اس وقت قلم رکھ دوں اور طوفان
چلا جائے تو پھر میں کبھی کہانی پوری نہیں
کرسکتا۔ اچھا تو ہاں!
خوشی محمد گھر واپس گیا تو رات اور سب بچے
کر پر سکون ہو چکا تھا۔ وہ سمجھی کر تھی سردی
کی ماری زیادہ تھی۔ انگیٹھی کی گرمی سے
خون کی گردش میں تیزی آئی تو وہ دو تین
دفعہ چار قطرے پیپ کے کر گیا اور وہ اس
کی گود میں سو گیا۔ خوشی محمد سردی سے

تھا کہ ایک صندوقچی نکال لایا۔ اس صندوقچی
میں وہ ہر روز دس پیسے ڈال دیا کرتا تھا
اس لیے کہ مرتے وقت تک کچھ رقم ہو جائے
گی اور کفن کے کام آئے گی۔
"لو بہن! یہی میرے پاس ہے۔ خدا
تمہاری مدد کرے۔" خوشی محمد کی زبان سے
مارے "خدا" کا نام نکل گیا مگر اس وقت اس
نے خدا کو گالی نہیں دی۔ عورت چلنے لگی تو
ایک پرانی کملی اس پر ڈال دی۔
سورج نکل کر کافی اونچا ہو چکا تھا۔
اب خوشی محمد کو خیال آیا کہ ابھی تک حدیث
کا مطالعہ نہیں کیا۔ وہ حدیث کے مطالعہ
میں غرق ہو گیا۔ اس نے ایک حدیث
کا تشریحی نوٹ دل لگا کر پڑھا۔
"نبی برحق فرماتے ہیں کہ اللہ لوگوں
سے مخاطب ہے جو دوسروں کے دکھ درد
میں شریک ہوتے ہیں: میں بھوکا تھا
اے میرے بندے! تو نے مجھے کھلایا۔ میں
پیاسا تھا اے میرے بندے! تو نے مجھے
پلایا۔ میں مجبور اور لاچار تھا اے میرے

بندے! تو نے بروقت میری مدد کی۔ اگر تو میری مدد نہ کرتا تو اے میرے بندے! میں مرجاتا۔"

"نہیں نہیں او میرے خدا!" خوشی محمد چیخ اٹھا۔ "تو زندہ جاوید ہے۔ نہیں نہیں او میرے خدا! تو خود سب کا پروردگار ہے نہیں نہیں۔ او میرے خدا تو قادر مطلق ہے۔ اے میرے خدا۔ تجھے نہ تو بھوک ستاتی ہے نہ پیاس اور نہ تو لاچار ہے تو پاک اور بے عیب ہے۔"

خوشی محمد سمجھ گیا کہ آج خدا اُسے دعا دے گا۔ پھر وہ سوچنے لگا شاید رات خدا ہی آواز دے گیا تھا کہ کل میں تیرے گھر آؤں گا وہ بہت خوش ہوا اور پھر وہ پہلا والا خوشی محمد ہو گیا۔

میں نے کہانی ختم کر دی۔ میرے دل اور دماغ کا بوجھ جو پلاٹ سے بوجھل ہو رہا تھا اتر گیا۔ اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ خوشی محمد میرے گھر آیا تھا میں نے خود اسے بلوا دیا تھا۔ "اچھا تم مجھے جانتے ہو۔ میرے گھر آنا!" اور جب خوشی محمد میرے گھر آیا تو میں نے کہلوا دیا کہ کہہ دو گھر پر نہیں ہیں۔" یہ میں نے اس لیے کہلوا دیا تھا کہ وہ اصلی خوشی محمد تھا اور میری کہانی کا خوشی محمد میں نقلی خوشی محمد کو لیے بیٹھا تھا۔ میں بہت خوش تھا کہ میری لکھی ہوئی یہ کہانی پڑھ کر لوگوں میں ہمدردی اور مواسات کے سوتے پھوٹ نکلیں گے۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ اچانک میرے کان میں آواز آئی۔ "لم تقولون مالا تفعلون" ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں بڑے گناہ کی بات ہے کہ تم وہ کہو جو خود نہ کرو۔

اسی وقت بیوی چائے لائی۔ میں نے چائے کی پیالی اٹھائی لیکن پیالی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی: "ارے!" کہہ کر بیوی نے مجھے دیکھا۔ میں نے گردن جھکالی بیوی سمجھی کہ یہ پیالی ٹوٹ جانے کی شرم ہے "آہ! اے بے کردار کہانی کار!" میرے اندر سے کسی مجبور نے لعنت بھیجی!

ابوجری جابر رضی اللہ عنہ بن سلیم سے روایت ہے کہ میں مدینہ پہنچا میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ لوگ اس کے پاس طالب بن کر حاضر ہوتے ہیں اور وہ ان کو جو کچھ بتا دیتا ہے اس کو عمل کر کے چلے جاتے ہیں۔ جو کچھ بھی اس کی زبان سے نکلتا ہے لوگ اسکی بات دل و جان سے مانتے اور تسلیم کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ لوگوں نے مجھے بتایا کہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ آپؐ اللہ کے رسولؐ ہیں؟ آپؐ نے فرمایا ہاں میں اللہ کا رسول ہوں اس اللہ کا جسکی شان یہ ہے کہ اگر تمہیں کوئی دکھ اور تکلیف ہو اور تم اس سے دعا کرو، تو وہ تمہارے دکھ کو دور کر دے اور اگر تم پر قحط سالی کی مصیبت آجائے اور تم اس سے دعا کرو تو تمہارے لیے وہ زمین سے پیداوار نکال دے اور جب تم کسی جنگل بیابان میں یا لق و دق صحراؤں اور تمہاری سواری کا جانور وہاں گم ہو جائے اور تم اس سے دعا کرو تو وہ تمہاری سواری کے جانور کو تمہارے پاس پہنچا دے؟

میں نے کہا" مجھے کچھ اور نصیحت اور وصیت فرمائیے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا "تم کبھی کسی کو گالی نہ دینا" جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے کبھی کسی کو گالی نہ دی نہ کسی آزاد کو نہ کسی غلام کو، نہ اونٹ بکری جیسے کسی جانور کو۔

پھر آپؐ نے فرمایا: "کسی احسان کو حقیر نہ سمجھو اپنے بھائی سے شگفتہ روئی کے ساتھ بات کیا کرو۔ یہ بھی ایک طرح کا احسان اور حسن سلوک ہے" اور اگر کوئی تمہیں گالی دے یا تمہیں کسی ایسی بات کا ذکر کر کے تم کو عار دلائے جو تمہارے بارے میں جانتا ہو تم ایسا نہ کرنا۔ اس صورت میں اسکی اس ساری زبان درازی کا وبال اسی پر ہوگا۔"

وصال سے پہلے

مرسلہ
محمد نیاز

نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا جو آپ کی زندگی کا سب آخری خطبہ تھا۔ آپ نے فرمایا:

خدا نے اپنے بندے کو اختیار فرما دیا ہے کہ خواہ وہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے یا خدا کے پاس (آخرت میں) جو کچھ ہے اس کو قبول کرے، لیکن اس نے ہی کے پاس کی چیزیں قبول کیں۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ رو پڑے۔ لوگوں نے کی طرف تعجب سے دیکھا کہ آپ تو ایک شخص کا واقعہ بیان کرتے ہیں، یہ رونے کون سی بات ہے.... لیکن رازدارِ نبوت سمجھ چکا تھا کہ وہ بندہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ نے اپنی تقریر کا سلسلہ آگے بڑھایا اور فرمایا: سب سے زیادہ جس کی دولت اور محبت کا ممنون ہوں وہ ابوبکرؓ ہیں۔ اگر میں دنیا میں کسی کو امت میں سے اپنا دوست بنا سکتا تو ابوبکرؓ کو بناتا۔ لیکن اسلام کا رشتہ دوستی کے لئے کافی ہے۔ مسجد کے رخ کوئی دریچہ ابوبکرؓ کے دریچے کے سوا باقی نہ رکھا جائے۔ ہاں تم سے پہلی قوموں نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنایا ہے۔ دیکھو تم ایسا نہ کرنا، میں منع کئے جاتا ہوں!

زمانۂ علالت میں انصار آپ کی عنایات اور مہربانیوں کو یاد کر کے روتے ایک دفعہ اسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عباسؓ کا گزر ہوا۔ انھوں انصار کو روتے دیکھا تو وجہ دریافت کی۔ انھوں نے بیان کیا، حضورؐ کی صحبتیں یاد ان میں سے ایک صاحب نے جا کر حضورؐ سے واقعہ بیان کیا۔ آج اس کی تلافی کا

اس لئے اس کے بعد آپ نے انصار کی نسبت لوگوں کی طرف خطاب کرکے فرمایا "ایھا الناس! میں انصار کے معاملے میں تم کو وصیت کرتا ہوں۔ عام مسلمان بڑھتے جائیں گے لیکن انصار اس طرح کم ہوکر رہ جائیں گے جیسے کھانے میں نمک۔ وہ اپنی طرف سے اپنا فرض ادا کر چکے۔ اب تمہیں ان کا فرض ادا کرنا ہے۔ وہ میرے جسم کا (بمنزلہ) معدہ کے ہیں، جو تمہارے نفع ونقصان کا متولی ہو (یعنی جو خلیفہ ہو) اس کو چاہیے کہ ان میں جو نیکوکار ہوں ان کو قبول کرے اور جن سے خطا ہوئی ان کو معاف کرے۔"

اوپر گزر چکا ہے کہ رومیوں کی طرف جس فوج کا بھیجنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز کیا تھا اس کی سرداری اسامہ بن زیدؓ کو تفویض فرمائی تھی۔ اس پر لوگوں نے (ابن سعدؒ نے تصریح کی ہے کہ وہ منافقین تھے) شکایت کی کہ بڑے بوڑھوں کے ہوتے ہوئے نوجوانوں کو یہ منصب کیوں عطا ہوا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلے کی نسبت ارشاد فرمایا:

"اگر اسامہ کی سرداری پر تم کو اعتراض ہے تو اس کے باپ (زیدؓ) کی سرداری پر بھی تم معترض تھے۔ خدا کی قسم وہ اس منصب کا مستحق تھا اور وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔"

اسلام اور دیگر مذاہب میں ایک نہایت دقیق فرق یہ ہے کہ اسلام شریعت کے تمام احکام کا واضع اور حاکم براہ راست خدائے پاک کو قرار دیتا ہے۔ پیغمبر کا فرض اسی قدر فرض ہے کہ احکام الٰہی کو اپنے قول و عمل کے ذریعہ سے بندوں تک پہنچا دے۔ چونکہ دوسرے مذاہب میں یہ غلط فہمی شرک و کفر تک منتج ہو چکی تھی اور اس کے نتائج پیش نظر تھے اس لیے ارشاد فرمایا:

"حلال و حرام کی نسبت میری طرف نہ کی جائے۔ میں نے وہی چیز حلال کی ہے جو

خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے اور وہی چیز حرام کی ہے جو خدا نے حرام کی ہے!
"انسان کی جزا و سزا کی بنیاد خود اس کے ذاتی عمل پر ہے۔ آپؐ نے فرمایا:
"اے پیغمبر خدا کی بیٹی فاطمہؓ!" اے پیغمبر خدا کی پھوپھی صفیہؓ! خدا کے ہاں کے
کچھ کر لو، میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔"

خطبہ سے فارغ ہو کر آپؐ حجرہ عائشہ رضؓ میں واپس تشریف لائے۔

آپؐ کو حضرت فاطمہ زہراءؓ سے بے حد محبت تھی۔ اثنائے علالت میں
کو بلا بھیجا۔ تشریف لائیں تو ان سے کچھ کان میں کہا۔ وہ رونے لگیں۔ پھر بلا کر
کان میں کہا تو ہنس پڑیں۔ حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا تو کہا۔ پہلی دفعہ
نے فرمایا کہ میں اس مرض میں انتقال کروں گا۔ جب میں رونے لگی تو فرمایا کہ
خاندان میں سب سے پہلے تم ہی مجھ سے آکر ملوگی تو ہنسنے لگی!

یہود و نصاریٰ نے انبیاء کے مزارات اور یادگاروں کی تعظیم میں جو افراط
وہ بت پرستی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اسلام کا فرض اولین بت پرستی کے رگ
کا استیصال کرنا تھا۔ اس لیے حالتِ مرض میں جو چیز سب سے زیادہ آپؐ کے
تھی یہی تھی (اتفاق سے بعض ازواجِ مطہرات رضؓ نے جو حبشہ ہو آئی تھیں اس
میں عیسائی معبدوں کا اور ان کے مجسموں اور تصویروں کا تذکرہ کیا۔ آپؐ نے
ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی مرجاتا ہے تو اس کے مقبرے کو عبادت گاہ بنا
اور اس کا بت بنا کر اس میں کھڑا کرتے ہیں۔ قیامت کے روز اللہ عزوجل کی نگاہ میں
بدترین مخلوق ہوں گے۔" عین کرب کی شدت میں جب کہ چادر کبھی منہ پر ڈال لیتے
کبھی گرمی سے گھبرا کر الٹ دیتے تھے حضرت عائشہؓ نے زبانِ مبارک سے یہ الفا

● —— لعنة الله على اليهود والنصارىٰ اتخذوا قبور انبيائهم

(یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا)

اسی کرب اور بے چینی میں یاد آیا کہ حضرت عائشہ رضہ کے پاس اشرفیاں رکھوائی تھیں دریافت فرمایا: عائشہ! وہ اشرفیاں کہاں ہیں؟ محمدؐ خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا؟ جاؤ ان کو خدا کی راہ میں خیرات کردو۔)

وفات سے ایک دن پہلے اتوار کو لوگوں نے دوا پلانی چاہی چونکہ گوارا نہ تھی آپ نے انکار فرمایا۔ اسی حالت میں غشی طاری ہوگئی۔ لوگوں نے منہ کھول کر پلادی۔ افاقہ کے بعد آپ کو احساس ہوا تو فرمایا کہ سب کو دوا پلائی جائے۔ معلوم ہوا جن لوگوں نے زبردستی دوا پلائی ان میں حضرت عباس شامل نہ تھے۔ اس لیے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ محدثین اس واقعے کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ یہ بشریت کا اقتضاء تھا یعنی جس طرح بیماروں میں نازک مزاجی آجاتی ہے، آپؐ نے بھی اسی طرح یہ حکم دیا تھا لیکن ہمارے نزدیک تو یہ تنگ مزاجی نہیں بلکہ لطفِ طبع تھا۔

مرض میں اشتداد اور تخفیف ہوتی رہتی تھی جس دن وفات ہوئی (یعنی دوشنبہ کے روز) بظاہر طبیعت کو سکون تھا حجرۂ مبارک مسجد سے ملا ہوا تھا۔ آپؐ نے (صبح کے وقت) پردہ اٹھا کر دیکھا تو لوگ فجر کی نماز میں مشغول تھے۔ دیکھ کر مسرت سے ہنس پڑے۔ لوگوں نے آہٹ پا کر خیال کیا کہ آپؐ باہر آنا چاہتے ہیں۔ فرطِ مسرت سے تمام لوگ بے قابو ہوگئے اور قریب تھا کہ نمازیں ٹوٹ جائیں (حضرت ابوبکر رضہ نے جو امام تھے چاہا پیچھے ہٹ جائیں) آپؐ نے اشارے سے روکا اور حجرے شریف میں داخل ہو کر پردے ڈال دیے۔ (صحیح مسلم میں ہے کہ اس قدر ضعف تھا کہ آپؐ پردے بھی اچھی طرح نہ ڈال سکے۔ یہ سب سے آخری موقع تھا کہ صحابہ رضہ نے جمالِ اقدس کی زیارت کی۔

حضرت انس رضہ بن مالک کہتے ہیں کہ آپؐ کا چہرہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ مصحف

کا کوئی ورق ... بھی سپید ہو گیا تھا۔

دن جیسے جیسے چڑھتا جاتا تھا، آپ پر غشی طاری ہو جاتی تھی اور پھر افاقہ ہو جاتا۔ حضرت فاطمہ زہرا رضہ یہ دیکھ کر بولیں: "واکرب ابا" (ہائے میرے باپ کی بے چینی!) آپ نے فرمایا: تمہارا باپ آج کے بعد بے چین نہ ہوگا۔

حضرت عائشہ رضہ فرماتی ہیں: "آپ جب تندرست تھے تو فرمایا کرتے تھے کہ نبی کو اختیار دیا جاتا ہے کہ خواہ وہ موت کو قبول کریں یا حیاتِ دنیا کو ترجیح دیں۔ اس میں آپ کی زبانِ مبارک سے اکثر یہ الفاظ ادا ہوتے رہے:

مع الذین انعم اللہ علیھم۔ ان لوگوں کے ساتھ جن پر خدا نے انعام کیا۔ اور کبھی فرماتے: اللھم فی الرفیق الاعلیٰ (خداوند بڑے رفیق ہیں)

وفات سے ذرا پہلے حضرت ابوبکر رضہ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن خدمتِ اقدس میں آئے۔ آپ حضرت عائشہ رضہ کے سینے پر سر ٹیک کر لیٹے تھے۔ عبدالرحمٰن رضہ کے ہاتھ میں مسواک تھی، اس کی طرف نظر جما کر دیکھا۔ حضرت عائشہ رضہ سمجھیں کہ آپ مسواک کرنا چاہتے ہیں۔ عبدالرحمٰن سے مسواک لے کر دانتوں سے نرم کی اور خدمتِ اقدس میں پیش کی۔ آپ نے بالکل تندرستوں کی طرح مسواک کی (اب وفات کا وقت قریب تھا۔ سہ پہر تھی، سینے میں سانس کی گڑگڑاہٹ محسوس ہوتی تھی۔ اتنے میں لبِ مبارک ہلے۔ تو لوگوں نے یہ الفاظ سنے: الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم (نماز اور تمہارے غلام)

پاس پانی کی چھاگل تھی، اس میں بار بار ہاتھ ڈالتے اور چہرے پر ملتے (چادر کبھی ڈال دیتے اور کبھی ہٹا دیتے) اتنے میں ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا اور تین دفعہ فرمایا: بل الرفیق الاعلیٰ (اب اور کوئی نہیں بلکہ بڑا رفیق درکار ہے) یہی کہتے کہتے ہاتھ لٹک آئے، پتلی چھت کر چھت سے لگ گئیں اور روح پاک عالمِ قدس میں پہنچ گئی۔ (انا للہ ...)

تین چیزیں

فاران حمیدانی

ایک روز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ بیٹھے تھے۔ آپ نے فرمایا، مجھے دنیا میں تین چیزیں محبوب ہیں۔ خوشبو، عورت اور نماز۔

حضرت ابوبکرؓ نے ارشاد فرمایا۔ یا رسول اللہ، مجھے تین چیزیں عزیز ہیں۔ آپ کے چہرۂ مبارک کو دیکھنا، اپنے مال کو آپ پر خرچ کرنا اور یہ کہ میری بیٹی آپ کے نکاح میں ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اے اللہ کے رسول! مجھے تین چیزیں پیاری ہیں۔ اچھے کاموں کا حکم دینا، بری باتوں سے روکنا اور پرانا کپڑا پہننا۔

حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا۔ یا رسول اللہ! مجھے تین چیزیں عزیز ہیں۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا، ننگوں کو کپڑا پہنانا اور قرآن حکیم کی تلاوت کرنا۔

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ مجھے تین چیزیں پسند ہیں۔ مہمان کی خدمت کرنا، گرمی میں روزہ رکھنا اور دشمن پر تلوار اٹھانا۔

اسی وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا:

• اے خدا کے رسول، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے اپنے بندوں کی تین باتیں پسند ہیں۔ خدا کی راہ میں طاقت کا خرچ کرنا (مال سے ہو یا جان سے)، گناہوں

توبہ کے وقت رونا اور فاقہ پر صبر کرنا۔"

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پھر فرمایا:

"اے اللہ کے سچے رسولؐ! اگر میں دنیا میں ہوتا تو مجھے تین چیزیں ہوتیں۔ بھولے بھٹکوں کو راستے کی رہنمائی کرنا، غریب عبادت کرنے محبت کرنا اور عیال دار مفلسوں کی مدد کرنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک کا احتر

سلطان محمود پر اپنے تقویٰ اور کسر نفسی کی وجہ سے حُبّ رسول کا ... وہ اپنی زبان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک لانے میں حد درجہ ... کرتا، اس کے ایک ندیم خاص کا نام محمدؐ تھا وہ اس کو ہمیشہ اسی نام ... کرتا تھا۔ ایک روز اس نے اس کو تاج الدین کہہ کر پکارا، وہ آیا اور ... تعمیل کر کے گھر گیا تو تین دن تک سلطان کی خدمت میں حاضر نہ ہوا، سلطا... کو گھر سے بلا بھیجا، اور اس سے غیر حاضری کا سبب دریافت کیا، تو اس ... کیا کہ خداوند مجھے ہمیشہ محمدؐ کے نام سے پکارا کرتے تھے، اس روز خلاف ... مجھے تاج الدین کے نام سے پکارا گیا، تو میں سمجھا کہ مجھ سے کوئی بدگمانی پیدا ... اس لئے میں نے اپنی صورت نہیں دکھائی اور یہ تین روز میں نے بڑ... اور بے قراری سے گذارے، سلطان نے اس کو یہ کہہ کر اطمینان دلایا کہ میں بدگمان نہیں ہوں، لیکن جب میں نے تم کو تاج الدین کہہ کر پکارا تھا۔ اس ... باوضو نہ تھا۔ مجھے شرم آئی کہ محمدؐ کا نام بے وضو لوں۔

اب تک یاد ہے

(فرزیدہ بانو۔ کانپور)

یہ واقعہ بھی میرے بچپن سے متعلق ہے جب کہ میری عمر دس سال کی تھی۔ میرے محلہ میں ایک لڑکی رہتی تھی اس کا نام شکیلہ تھا مگر میری ماں مجھے پردہ بٹھا چکی تھیں۔ شکیلہ اکثر گھر آجاتی اور میری ماں سے کہہ کر مجھے اپنے گھر لے جانے کے بہانے سے بلا لیتی تھی۔ ایک دن شکیلہ آئی اور امی سے کہنے لگی میں فرزیدہ کو ساتھ لیے جا رہی ہوں۔ روز کی طرح سے میری ماں نے کچھ نہ کہا کیونکہ اس طرح میری امی کو مجھ پر اعتماد ہو گیا تھا کہ اب میں نے تمام شرارتیں چھوڑ دی ہیں یہ ان کا وہم تھا اور میں روز اسی انتظار میں رہتی تھی کہ کب شکیلہ آئے اور کب مجھے ان سب جنجال سے چھٹکارہ ملے گا لہٰذا اس دن بھی اس نے اجازت مانگ کر مجھے ساتھ لے جانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ہم دونوں خوشی خوشی باہر نکل گئے اور اس روز شکیلہ مجھے اپنے گھر کے پیچھے ایک کھنڈر میں لے گئی۔ میں نے پوچھا یہاں کیا کریں گے اس نے کہا دیکھتی جاؤ۔ بس اس کھنڈر میں ایک بڈھا رہتا تھا اس کو سب لوگ نانا دو کہا کرتے تھے اور بہت ستایا کرتے تھے وہ بڈھا سب سے پریشان ہو کر وہیں بیٹھا رہتا تھا اور گاؤں کے لوگ اسے صدقہ اور خیرات کھانا وغیرہ دے جاتے تھے چنانچہ ہم دونوں وہیں دیوار کی آڑ میں بیٹھ گئے کہ وہ بڈھا گھسکتا ہوا آگے بڑھا اور ایک اینٹ کو اٹھانے لگا ہم دونوں کی دلچسپی اور بڑھی اور غور سے دیکھنے لگے

اس اینٹ کے نیچے بہت سے پیسے رکھے
تھے۔ اس نے تھوڑے سے پیسے نکال کر پھر
اینٹ رکھ دی۔ اب شکیلہ اٹھ کر نانا دو،
کے قریب گئی۔ نانا دو نے اسے بلایا اور
کہا: ان پیسوں سے کچھ کھانا لا دو۔ بڑا بھوکا
ہوں!

شکیلہ نے پیسے لے لئے اور چپکے سے
مجھے بلایا اور ہم دونوں بازار گئے قریب
دو تین روپے کے پیسے تھے۔ شکیلہ نے
ان پیسوں سے اپنی من پسند چیزیں خریدیں
اور آدھی ہم کو کھلائیں اور آدھی خود کھائیں
جب سب پیسے ختم ہو گئے۔ تب نانا دو
کی یاد آئی اب ڈر تھا کہ کیسے نانا دو کے
پاس جائیں گے لیکن شکیلہ نے سوچا
اینٹ کے نیچے سے اور پیسے لے آئیں
گے تب کھانا خریدیں گے اب کی بار
جب اس کھنڈر میں پہونچے تو بڈھا
بے خبر سو رہا تھا۔ شاید بھوک و پیاس
سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ شکیلہ نے بڑے
اطمینان سے سارے پیسے نکال لئے اس

ہی ایک گٹھری رکھی تھی جس
نئے کپڑے بندھے تھے شکیلہ
اٹھالی اور دونوں باہر نکل آ
پیسے تو سب اپنے پینے میں آ
لنگی وغیرہ کپڑے تھے جو کہ شاید
کر گیا تھا۔ شکیلہ نے کہا یہ کپڑ
گھر لے جاؤ۔ میں کل آ کر لے
گھر والے ڈانٹیں گے۔ کل
گے بہت انکار کرنے پر بھ
مجھ سے بہت خوشامد کرنے
کے ہاتھ سے میں نے سب
مغرب کا وقت ہو چکا تھا
نہیں آئیں۔ میں نے جلد
کپڑے چھت پر اچھال د
اتار لے گی۔ لیکن دوسرے
کا سارا دن انتظار کرتی رہ
میں سوئی نہیں تھی اور
کر نانا دو کے کپڑے میر
بھوکے ہوں گے۔ اب
بھی نہیں ہوں گے

ما۔ لیکن کئی دن تک شکیلہ میرے گھر نہ آئی۔ میں نے اپنی امی سے پوچھ کر اس کے گھر جانے کی بات سوچی۔ پچھلے سے چھت پر سے کپڑے اتارے اور شکیلہ کے گھر جانے سے پہلے میں اکیلے اسی کھنڈر میں گئی۔ کچھ لوگوں نے میرے ہاتھوں میں بندھے ہوئے بنڈل کو دیکھ کر سمجھا کہ میں کچھ خیرات کرنے کی غرض سے آئی ہوں۔ مجھ سے کہا۔ بیٹی۔ نانا دو، تو پرسوں مر گئے اب یہ کسی اور فقیر کو دے آؤ۔ میں بتا نہیں سکتی مجھ پر کیا بیتی۔ میرے ہاتھ سے بنڈل گر پڑا تھا اور میں رونے لگی تھی۔ لوگوں نے اسے میرا پیار سمجھا جو کہ نانا دو کے لئے تھا۔ مگر حقیقت کچھ اور تھی وہ سب کپڑے چھوڑ کر میں گھر آگئی اور دو دن تک لگاتار میں نے کھانا نہیں کھایا۔ جب کھانے چلتی تو نانا دو کی یاد آجاتی۔ اس صدمے سے میں بیمار پڑ گئی تھی۔ سوتے جاگتے مجھے ہر وقت نانا دو ہی دکھائی دیتے گویا کہ اشارے سے کہہ رہے ہوں۔ بھوکا ہوں کھانا کھلا دو اور پیسے بڑھا دو۔

آج یہ واقعہ بیتے ہوئے دس گیارہ سال ہو گئے ہیں لیکن مجھے لگتا ہے نانا دو مرے نہیں ہیں بلکہ میں نے اور شکیلہ نے انھیں مار ڈالا ہے بھوکا چھوڑ کر اور بڑی ندامت ہوتی ہے لیکن شکیلہ آج بھی یاد کر کے خوب ہنستی ہے اور میں حیرت سے اس کا منہ دیکھتی ہوں اور دعا کرتی ہوں۔ خدا کسی کو نانا دو نہ بنائے اور کوئی لڑکی انھیں بھوکا نہ مار ڈالے۔ آج بھی بڑی شرمندگی ہوتی ہے اور توبہ کرتی ہوں اور اپنی اس بڑی غلطی پر آنسو بہاتی ہوں اور نانا دو برابر یاد آتے ہیں اور ہر فقیر مجھے آج نانا دو ہی دکھائی دیتا ہے۔

(فریدہ بانو معرفت ڈاکٹر حسن یعقوب
اسلامیہ آنٹ اسکول ۹۲، اندر گنج کانپور)

غنیمت ہے

اگر ہمیں برائی کا احساس ہے

بنتِ تاج کے خطوط

(۳)

ڈیئر نجمہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

دیکھو تو! میں نے تم کو القاب و آداب میں کیا لکھا! "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ" اب میں سب کو یہی لکھتی ہوں۔ یہ میں نے کیوں اپنایا۔ وہ تم کو میرے اس خط سے معلوم ہو جائے گا۔ دھیان سے پڑھنا۔

میں خط کے شروع ہی میں تم کو نصیحت کرنا چاہتی ہوں کہ ریاکاری بڑی خراب بات ہے۔ دل میں کچھ، زبان پر کچھ، ہوں کچھ، اپنے کو دکھائیں کچھ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دو رنگ لوگوں کی نظروں سے کچھ دن چھپ جائے، زیادہ دنوں چھپنے کی نہیں۔ یہ میرا اپنا تجربہ ہے اور اس تجربے نے مجھے بڑا اچھا موڑ دیا۔ عجیب ڈرامائی انداز سے سبق ملا۔ وہی آج تمہارے خط کے جواب میں لکھ رہی ہوں۔

اب سے چھ سات برس پہلے تمہاری طرح مجھے بھی شوق چرّایا تھا کہ ہر طرح کے مضمون لکھوں اور رسالوں میں چھپواؤں۔ اس سلسلے میں میں نے بڑی احتیاط سے کام لیا تھا جس طرح کا رسالہ ہوتا اس کے لیے ویسا ہی مضمون لکھتی پھر اس کے ایڈیٹر کو خط لکھتی بالکل ایسا ہی جیسا تم نے "نشاط" کے ایڈیٹر کو لکھا۔

"سویٹ بھائی! ڈھیروں شکریہ! آپ نے میرا افسانہ "آگ اور انگارے" چھاپ دیا۔ اب دوسرا افسانہ لیجیے "پانی اور بلبلے" اس میں میں نے

ان جذبات کو اُجاگر کیا ہے جو کسی نوجوان کے دل میں اُٹھتے ہیں اور پرانی لکیر کے فقیر والدین کو توجہ دلائی ہے کہ اپنی اولاد کی امنگوں کی راہ میں رکاوٹ نہ کھڑی کریں کیونکہ رکاوٹ خوب نہیں طبع کی روانی میں کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں نیز یہ کہ یہ روک تمام فطرت کے خلاف ہے۔ امید ہے کہ یہ افسانہ بھی آپ کے معیار پر پورا اترے گا اور ... نظام کے زریں صفحات میں جگہ پائے گا۔"

یہ تو ہوئی ترقی پسند ایڈیٹروں سے بات۔ پھر شوق چرایا کہ مزید شہرت کے لیے مذہبی رسالوں میں بھی لکھنا چاہیے چنانچہ ان کے ایڈیٹروں کے پاس بھی مضمون بھیجنے لگی اور خط بھی۔ یہ خط اس طرح لکھتی تھی جس طرح تمہارا خط رسالہ "خاتون اسلام" میں چھپا:

"مکرمی و محترمی مولانا صاحب! اسلام واجب۔ آپ آج کے تاریک دور اور کالی کالی آندھیوں میں جس جرأت کے ساتھ رسالہ "دیندار" کی شکل میں شمع روشن کر رہے ہیں۔ یہ آپ کی دین پر استقامت کا ثبوت ہے۔ چونکہ میں بھی اپنے اندر اسلامی نظریات پر مضمون لکھنے کی صلاحیت پاتی ہوں لہذا بعنوان "پردہ" ایک مضمون بھیج رہی ہوں۔ اس مضمون میں میں نے ان مسلمانوں کی لڑکیوں کو نشانہ بنایا ہے جو گھر سے برقع اوڑھ کر کالج جاتی ہیں اور کالج کے احاطے میں پہنچنے سے پہلے برقع اتار پھینکتی ہیں۔ میں مسلمانوں کے قول و عمل میں یکسانیت دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنے مضمون میں یہی بات ابھارنے کی کوشش کی ہے۔"

اس طرح کے خطوط میں لکھا کرتی تھی کہ اچانک ایک واقعہ پیش آگیا۔ دلچسپ بھی۔ عبرت ناک بھی اور اب جب یاد کرتی ہوں تو ہنستی بھی ہوں کہ مجھے یہ کیا سوجھی ہے اسے میں نے اپنی ڈائری میں لکھ رکھا ہے کبھی کبھی عبرت حاصل کرنے کے لیے

پڑھ لیتی ہوں۔ لو۔ تم بھی پڑھو!

۲۵ر نومبر ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ میں کالج سے آئی تو بھائی جان ترکاری اور گوشت لینے بازار چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں ابھی ٹھیک سے لباس تبدیل نہ کر سکی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میرا خیال تھا کہ پڑوس کی للی ہوگی۔ وہ اس وقت دوسرے تیسرے دن آیا کرتی تھی۔ میں نے اسی طرح جیسی تھی، بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ کواڑ کھلے تو میں ایسی ہوگئی جسے کہتے ہیں کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ بات یہ تھی کہ میں نیم مغربی اور نیم مشرقی لڑکی تھی۔ اپنے لباس کے اعتبار سے مغربی اور شرم وحیا کے اعتبار سے مشرقی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا جب میں نے اچانک ایک مولوی صاحب کو سامنے کھڑے دیکھا۔ ۔ آ۔ ۔ آ۔ ۔ ۔ کرکے میرے حلق میں لفظ "آپ" اٹک کر رہ گیا۔ مولانا پاجامہ شیروانی پہنے ہوئے تھے، سر پر رامپوری ٹوپی اور ریش مبارک سفید، چہرے پر انوار برس رہا تھا۔ اَچکی ان کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے چہرے کو دیکھ کر ہر شخص سمجھ سکتا تھا کہ وہ کہیں دور سے تشریف لائے ہیں۔ وہ مجھے چند لمحے دیکھتے رہے اور میں نگاہیں نیچی کئے ان کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ سننے کی منتظر۔ آخر انھوں نے سکوت توڑا۔ یوں گہر فشاں ہوئے۔

"بیٹی! مولوی اشرف علی صاحب کا مکان کون سا ہے؟"

میری جان میں جان آئی۔ "وہ کروٹ میں پانچواں دروازہ انہی کا ہے۔" میں نے کہا اور کواڑ بھیڑ لیے۔ میرا دل اب بھی پُرسکون نہیں تھا۔ جیسے تیسے میں نے یونیفارم اُتارا اور ہاتھ منہ دھو کر بھائی جان کا انتظار کرنے لگی۔ بھائی جان آئے تو میں نے دیکھا کہ آج وہ ضرورت سے زیادہ سامان لے آئے ہیں۔ گوشت ترکاری کے ساتھ انڈے اور زمین بھی بھی تھے۔ بولے "اشو بی! آج ذرا کھانے میں تکلف رہے تو اچھا ہے۔ ایک

مہمان آ رہے ہیں؛ یہ کہہ کر گھڑی دیکھی۔ زبان سے نکلا " ارے دیر ہو گئی۔ ٹرین تو کب کی آ چکی ہوگی۔ میں جا رہا ہوں لینے " یہ کہہ کر پلٹے ہی تھے کہ کسی نے پکارا: جمیل صاحب آئیے چلئے یہاں پیچھے آ کر۔"

بھائی جان تو باہر چلے گئے۔ میں گوشت دھونے بیٹھ گئی۔ مولانا صاحب اب بھی میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں سوچ رہی تھی، ہو سکتا ہے یہی حضرت بطور مہمان تشریف لائے ہوں۔ مجھے نام تو پوچھ ہی لینا چاہئے تھا۔ اُف توبہ! میں نے بھائی جان سے بھی نہیں کہا کہ وہ مہمان کوئی بزرگ صورت فرشتہ ہیں یا کوئی اور صاحب اور یہ کہ اک بزرگ آئے تو تھے مگر یہ خضر کی صورت۔ مگر۔۔۔ اب کیا۔ وہ بزرگ دوسرے کے مہمان ہو چکے تھے اور بھائی جان جا چکے تھے۔

تھوڑی دیر میں فاطمہ، مولوی اشرف علی صاحب کی پوتی میری مدد کو آ گئی۔ اس نے بتایا کہ جمیل بھائی ہمارے یہاں کمرے میں ہیں۔ مجھے بھیج دیا ہے۔ اپی! لاؤ مسالہ پیس دوں۔ دس گیارہ برس کی فاطمہ اس وقت آ گئی تو مجھے بڑا سہارا ملا۔ پھر جلدی جلدی کام کرتے رہنے سے مولوی صاحب میری خیالی دنیا سے اوجھل ہو گئے۔ مغرب کے بعد بھائی جان آئے تو انھوں نے اپنا کمرہ دیکھا بھالا۔ پھر مجھ سے پوچھا "کیا کوئی بزرگ تشریف لائے تھے؟"

"ہاں، آئے تو تھے۔ کون صاحب ہیں وہ؟" اب میں نے عرض کیا۔

" ماہنامہ " دیندارہ" کے مدیر محترم جناب مولوی الیاس حسین صاحب قاسمی تشریف لائے ہیں۔ انہی کا مجھے انتظار تھا۔"

اب تو مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میری حالت ایسی ہو گئی کہ میں چاہتی تھی بھائی جان سامنے سے چلے جائیں اور مزید نہ پوچھیں۔ مگر بھائی جان فرمانے لگے

الیاس حسین صاحب تمہاری بڑی تعریف کر رہے تھے کہ بڑی شرمیلی لڑکی ہے۔ تم کو دعا کہی ہے۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ اس نے شرم کے مارے سلام بھی نہیں کیا۔ وہ جمیل صاحب کے یہاں چلے گئے تھے۔"

میں چیخ کر کہنا چاہتی تھی کہ بھائی جان آپ جائیے مگر میں کہہ نہ سکی۔ اتنے میں دروازے پر آہٹ ہوئی اور بھائی جان اپنے کمرے کی طرف بھاگے۔ فاطمہ نے جھانک کر دیکھا اُلٹے لوٹے ہی۔ وہیں سے پکاری "اپی! مولانا صاحب آئے ہیں۔"

"ہوں گے مولانا صاحب" میں نے جھنجھلا کر دل ہی دل میں کہا۔ اے کاش! یہ حضرت الیاس اس وقت نہ آتے، ذرا دیر میں آتے یا بھائی گھر پہ ہوتے۔ میں نے کواڑوں کی درار سے دیکھ لیا ہوتا۔ ہائے اب کیا کروں۔ خوب بھانڈا پھوٹا اور یہ سوچتے سوچتے میں نے ماتھے پر ہتھیلی ماری۔ مجھے یہ بھی خیال نہ رہا کہ انڈوں کے لیے پیاز کاٹی تھی۔ ہاتھ نہیں دھوئے تھے۔ ہتھیلی ماتھے پر ماری تو آنکھوں کو مزہ آگیا۔ آنسو جو بہنا شروع ہوئے تو فاطمہ پوچھنے لگی "اپی! آپ روتی کیوں ہیں؟"

"اری ہٹ! ذرا پانی لا۔ پیاز آنکھوں میں بھر لی میں نے۔" فاطمہ زور سے ہنسی۔ پانی لے کر آئی۔ میں نے پانی کے چھینٹے آنکھوں پر مارے۔ تولیہ سے صاف کیا تو آنسو رُکے مگر آنکھیں لال کی لال رہیں۔

نجمہ پیاری۔ آگے کا حال سنو! اب بھائی جان کمرے سے تشریف لاتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ الیاس صاحب! تمہارے مضمون "پردہ" کی بڑی تعریف فرما رہے تھے۔ کھانا تیار ہے نا؟"

میں پھر دل میں جھنجھلا گئی "بھاڑ میں جائے پردہ" یہ تو دل میں کہا اور زبان سے عرض کیا "ہاں کھانا تیار ہے۔ آپ چلئے میں بھیجتی ہوں۔"

میں اللہ سے دعا کرنے لگی کہ اب بھائی جان مولانا صاحب کے پھر اور ملفوظات میرے سامنے آکر نہ پیش فرمائیں۔ میں نے جلدی جلدی کھانا نکال کر فاطمہ سے کہا کہ دے آئے۔ وہ اپنا کام کر چکی تو بھائی جان سر پر آدھمکے۔

"اشوا چار کا پانی رکھ دینا" اتنا ہی کہتے تو غنیمت تھا۔ آگے فرمانے لگے کہ مولانا فرماتے تھے۔ عائشہ کی یہ بات بہت پسند آئی کہ وہ مسلمانوں کے اندر قول و فعل کی یکسانیت دیکھنا پسند کرتی ہے!

نجمہ! سچ کہتی ہوں کہ مرنے کو جی چاہنے لگا۔ مولانا بھائی جان کے کندھے پر بندوق رکھ کر مجھ پر چاند ماری کر رہے تھے اور میں تھی کہ اپنی جگہ کٹی جا رہی تھی۔ مولانا رات کی رات مہمان رہے صبح کو چلے گئے۔ چلتے چلتے وہ تیر مار گئے کہ میرے دل میں چھید کر رہ گیا۔ کاش! پار ہو جاتا مگر نجمہ! یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا۔ بتاؤں مولانا نے کیا کیا۔ ایک لفافہ بھائی جان کو دے گئے کہ عائشہ بی کو دینا۔ بھائی جان لفافہ دے کر باہر بھاگے۔ میں نے لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک سادہ پرچہ نکلا۔ کورا۔

نجمہ! تم اب ادبی دنیا میں قدم رکھ رہی ہو۔ سمجھ گئی ہو گی کہ میں نے اس سادہ پرچے میں کیا پڑھا۔ پڑھا ہی نہیں میں نے اس میں اپنی تصویر دیکھ لی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن۔ میں دو رنگی سے توبہ کر لی۔ میں تم سے بھی یہی کہنا چاہتی ہوں کہ دو رنگی چھوڑ دے اک رنگ ہو جا رہی یہ بات کہ ایک رنگ وہ کون سا ہے جس میں رنگ جاؤ تو جواب یہ ہے کہ اللہ کی محبت کے رنگ سے بڑھ کر کوئی رنگ چوکھا نہیں ہے۔ اب آگے تمہاری مرضی۔ میرے خط کا جواب ضرور دے دینا۔ والسلام

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۔ وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (١٣٨)

یادوں کے [illegible]

بنت عبداللہ

پچھلے دنوں مجھے اپنی ایک پرانی دوست سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان کو بہت شکوہ تھا کہ میں کبھی ان کے گھر نہیں آتی۔ میں نے کہا بہن مجھے گھر ڈھونڈنے کی بہت زحمت ہوتی ہے کیونکہ یادداشت بڑی خراب ہے۔ کافی دیر بھٹکتی رہتی ہوں بس اسی الجھن کی وجہ سے کہیں نہیں نکلتی مگر انھوں نے جلدی سے اس مسئلے کو یوں حل کر دیا کہ وہ مجھے لینے کے لیے اپنے گھر سے کسی کو بھجوا دیں گی۔ گھر کے دھندے ہی ہم لوگوں کے اس طرح کے ہوتے ہیں کہ باہر نکلنا دوبھر دکھائی دیتا ہے خیال تھا کہ دوپہر کے بعد چلوں گی مگر خدا جانے محترمہ کو کیا سوجھی کہ صبح نو بجے ہی آدمی بھجوا دیا۔ اب تو جائے بغیر چارہ ہی نہ تھا جلد جلد کام دوسروں کو سونپ۔ میں اس کے ساتھ چل دی۔ کیونکہ سختی سے پیغام بھی بھجوایا گیا تھا کہ کھانا میرے ہاں کھانا ہوگا۔ میں تین منزلوں کے زینے طے کرکے محترمہ کے دولت خانہ پر پہنچی۔ جتنی کوفت اوپر آنے میں ہوئی تھی۔ وہ ان کے گھر کے پرسکون ماحول اور عمدہ رکھ رکھاؤ کو دیکھ کر دور ہوگئی۔ اچھے خاصے چار بڑے بڑے کمرے اور پھر بالکونی تھی۔ مگر جب میری نظر باورچی خانے کی طرف گئی تو حیران رہ گئی اتنے بڑے مکان میں مکینوں کی سب سے بڑی ضرورت کی جگہ بے حد چھوٹی۔ اور اس پر طرہ یہ کہ ایک طرف بچوں کے بیٹھنے کی جگہ بھی صندوق وضع کی الماری پر بنا رکھی تھی۔ میں نے کہا ممتاز بہن۔ یہ تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اتنی تنگ جگہ میں یہ بچوں کی نشستیں بھی بنا ڈالیں۔

یہاں سے شامل رکھنا بہت ضروری کیا ہے؟" خوب ہنسی کہ ایک تم نے سوال نہیں کیا بلکہ پہلے بھی کئی لوگوں کو اس کا جواب دے چکی ہوں۔ دیکھو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ یہ برتن ہیں اس کی پر رکھتی مگر میں نے چوکی کو الماری صندوق کی طرح بند کر کے وہ سب چیزیں اس کے اندر رکھ لی ہیں۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ ہم زمیندار لوگ ہیں اور اپنے گھر اتنے بڑے اور کھلے تھے کہ باورچی خانہ بھی اچھا خاصا کمرے کے برابر ہوتا تھا ہم لوگوں کی یہ سب سے بڑی خواہش ہوتی تھی کہ موسم سرما میں ہم اپنے گھروں میں باورچی خانے کے اندر ہی بیٹھ کر کھانا کھائیں۔ اماں مرحومہ نے ہمارے لیے باورچی خانہ میں ایک طرف چوکی لگوا رکھی تھی اور کچھ پیڑھیاں رکھوا دی تھیں۔ وہاں بیٹھ کر ہم فرصت کے وقت آپس میں کہانیاں کہتے لطیفے سنتے۔ کھانے کی سوندھی سوندھی خوشبو ہماری بھوک کو تیز کرتی اور صبر کم کر دیتی۔ مثلاً مچھلی یا کباب تلے جا رہے ہیں یا گوشت بھن رہا ہے یا پراٹھے پک رہے ہیں۔ میٹھا بنایا جا رہا ہے ہم ان چیزوں کو پکتے بنتے دیکھتے اور ایسا معلوم ہوا کرتا کہ اگر ہم یہاں نہ بیٹھیں گے تو بھوک نہیں لگے گی۔ واقعی وہ بڑی مفید چیز تھی کتنی ہی چیزوں کے پکانے کا طریقہ بغیر سیکھے اور کوشش ہمارے دھیان میں بیٹھ گیا تھا۔ اب یہ میرے تین چھوٹے بچے ہیں۔ ان کو میں ناشتے کے وقت یہاں بٹھا لیتی ہوں۔ گرم گرم کھلا دیتی ہوں وہ بھی خوش ہوتے ہیں میری تسلی بھی ہو جاتی ہے۔ اگر ان کے ابا یا دوسرے افراد بھی چاہیں تو یہاں آ بیٹھتے ہیں۔ یہاں تک کہ کھانا تیار ہو کر میز پہ پہنچ جائے۔

میں نے کہا کہ یہ بات تو تم نے خوب بتائی۔ درحاصل ہماری زندگی میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جنھیں ہم لوگ نئے ماحول میں آ کر بھول بیٹھتے ہیں اور اس تاریکی کو دوسرا نام یاد نہیں رہتا۔ میں نے یہ طریقہ

اب اسی سے برتنا شروع کیا ہے کہ ہمیں اپنے بچپن کے احساسات یاد ہیں۔ جس طرح اس وقت ہماری یہ خواہش ہوا کرتی تھی کہ باورچی خانہ میں جا کر بیٹھیں اسی طرح ان بچوں کو بھی خواہش ہو گی۔ ہماری طرح یہ بھی اس طریقے سے ویسی ہی خوشی حاصل کریں گے۔

میں سوچ رہی تھی کہ کتنا صحیح نکتہ اس ... بہن نے پکڑا ہے۔ ہم اپنی حالت کیوں بھول جاتے ہیں۔ ہماری پرانی یادیں ہی ہماری بہترین رہبر ہیں۔ ہم ان سے زندگی کی روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم کیسے بچے تھے کن چیزوں سے رنج پہنچتا تھا۔ کیا چیزیں پسند خاطر ہوتی تھیں۔ اگر ہم اس راکھ کو کریدیں تو یقیناً ہم بہت کچھ دوسروں کے متعلق جان سکیں گے۔

بچپن کے بعد جوانی کا دور آتا ہے جس قسم کے ہمارے احساسات تھے ویسے ہمارے بچوں کے بھی ہوں گے۔ ہمیں بڑوں کی ہر وقت کی روک ٹوک سخت بری لگتی تھی۔ مگر اب ہم چاہتے ہیں کہ اپنی بیٹیوں کو خواہ کتنا بھی ڈانٹیں لیکن وہ برا نہ مانیں۔ یہ کرو اور وہ مت کرو۔ دن رات ہمارا تکیہ کلام ہے۔ مگر ہمیں اپنا ماضی کیوں یاد نہیں آتا کہ ہم کیا کیا کرتے تھے۔ بے وقت کتابیں رسالے بھی پڑھتے۔ جہاں لیٹے وہیں سو گئے۔ مگر اب کوئی ایسی بے پروائی کر کے تو دیکھے۔ جی چاہتا ہے کہ جو ہم چاہتے ہیں بس وہی ہوا کرے۔ جو وہ چاہتے ہیں وہ کبھی نہ ہو۔ کیونکہ ہمارے دماغ عمر، تجربات اور ٹھوکروں نے درست کر دیے ہیں۔ مگر ابھی وہ بے پروائی کے اس دور میں ہیں جہاں سوچیں اتنی گہری نہیں ہو سکتیں۔

ہم بھاوج بنتے ہیں تو بھول جاتے ہیں کہ جب ہماری بھاوج آئی تھیں تو ہم کیسی نند تھے۔ ہم کیوں ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کا برا مان بیٹھتے ہیں جیسی ہم نندیں تھیں ویسی ہماری نندیں ہیں۔ جب کیا س

بنتے ہیں. تو اپنا بھولنا بھول جاتا ہے آخر اتنی بے نیازی کیوں؟ ہم یادوں کے ان بھولے ہوئے خزانوں کے پٹ کیوں نہیں کھولتے. جن میں ہمارے دکھوں کا علاج ہے. ہم ہر ایک کے سامنے اپنا دکھ روتے ہیں. مگر یہ نہیں سوچتے کہ اس عمر میں اور اس وقت میں ہم کیسے تھے. کیا ہماری اس قسم کی حرکات سے ہماری ساس نندوں کو بھی اسی طرح پریشانی اور دکھ نہیں ہوتا ہوگا؟ اگر انھوں نے برداشت کیا تو ہم کیوں نہ برداشت کریں انسان اگر اپنے اعمال کا مواخذہ خود کرتا رہے تو بہت سے روحانی دکھوں سے بچ جاتا ہے. گلہ شکوہ انسان صرف زبانی ہی نہیں کرتا یعنی اس گلہ شکوہ کا اظہار زبان سے نہیں ہوتا. البتہ اس کے دل و دماغ میں چوبیس گھنٹے ایک کشمکش برپا رہتی ہے جہاں اظہار زبانی نہ ہو. مگر گلے شکوے سوچے جاتے رہے ہوں. ان سب کا علاج صرف اپنے ماضی کا مواخذہ ہے. اپنے پیچھے گزشتہ کتاب زندگی کے چند اوراق الٹنے سے آپ کو اس دنیا کی بے اعتنائی کا جواب خود آپ کا ضمیر دے گا. انسان اپنی ذات میں ایک پہیلی ہے جسے بوجھنا آسان کام نہیں. وہ اسی سڑک سے خود گزر آتا ہے. مگر جب دوسرو کو ادھر سے آتا دیکھتا ہے تو اس کو ان کی غلطی سمجھتا ہے. چنانچہ داناؤں کا مقولہ ہے کہ اپنے ماضی کو دیکھو اور حال و مستقبل کی پریشانیوں سے اپنے آپ کو محفوظ کر لو۔

سلیقہ مندی

(ناہید پروین)

(۱)

اگر خدا تمام انسانوں کو توفیق دے اور ساتھ ساتھ حسن ذوق بھی دے تو انہیں چاہیے کہ وہ اپنی عورتوں کو سلیقہ مند بنائیں کیونکہ گھر کے زیب و زینت اور سنوارنے میں سب سے بڑا دخل عورت کو ہے۔

سلیقہ مندی ایک ایسا جوہر اور کمال وصف ہے جو عورت کے تمام عیوب پر غالب آجاتا ہے خواہ کوئی بھی عورت کتنی ہی بدشکل و بدصورت اور بد مزاج کیوں نہ ہو لیکن سلیقہ شعار ہے تو یہ خوبی اس کی تمام برائیوں پر فوقیت لے جائے گی۔ برخلاف اس کے اگر وہ تعلیم یافتہ، پری رو گلبدن، سیم تن، خلیق اور خوش مزاج کیوں نہ ہو لیکن پھوہڑ، بدسلیقہ ہے تو اس کی وجہ سے تمام اوصاف حمیدہ خاک میں مل جائیں گے اور اس کی تمام خوبیوں پر پانی پھر جائے گا۔

اگر ایک عورت غریب و مفلس مہذب اور شائستہ گھرانے میں پلنے والی سلیقہ مند ہو تو اس کے گھریلو اثاثہ نیز معمولی سے معمولی بستر کی چادر اور ٹیبل کلاتھ وغیرہ بھی دھلے وشفاف اور سلیقہ سے اپنی جگہ پر ہی ملیں گے اور چاہے ان کے بچے بھی کیوں نہ کالے کلوٹے، بدصورت اور بھونڈے ہوں لیکن صاف ستھرے کپڑے میں ملبوس مہذب اور باادب ہوں گے۔

اس کے برعکس ایک امیر اونچے گھرانے سے تعلق رکھنے والی عورت جس کی فطرت میں بدسلیقگی اور پھوہڑپن داخل ہو تو اس کے گھر میں بیش قیمت اعلیٰ درجہ

کے اسباب ہی کیوں نہ ہوں لیکن وہ گرد غبار میں اَٹے چوکیوں اور چارپائیوں پر دھلے اور بے دھلے کپڑے پڑے، تمام در و دیوار پانی کے پیک سے رنگے آنگن اُسارے، سبزیوں کے چھلکے اور کوڑوں سے بھرے پڑے دکھائی دیں گے اور اس کے تعفن اور سڑاہند سے اسکے رشتے دار اور قرابت دار متنفر رہیں گے.

اگر آپ ان کے ڈرائنگ روم میں جائیں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ عمدہ عمدہ پھول پتیوں کے درختوں کے گملے مرجھائے ہوئے بے قرینہ پانی کے لیے ترس رہے ہوں گے. کتابوں کی عمدہ عمدہ الماریاں مگر کتابیں بکھری، گرد و غبار سے بھری ہوئی مالک مکان کی بدذوقی کا ثبوت پیش کر رہی ہوں گی. ایسا معلوم ہوگا کہ کبھی ڈرائنگ روم جھاڑن سے نوازا نہیں گیا ہے.

غرضیکہ اکثر و بیشتر چیزیں بے ترتیب اور منتشر دکھائی دیں گی. ان کے بچے خواہ کیسے ہی گورے چٹے، خوبرو اور حسین کیوں نہ ہوں، لیکن نامہذب اور غیر تربیت یافتہ. ان کے بدن کے کپڑے لتے گندے میلے ہوں گے اور ایسا معلوم ہوگا کہ انھیں مہذب اور شائستہ دنیا کی ہوا بالکل نہیں لگی ہے. کسی بھی صفائی پسند انسان کی نگاہ اس پر پڑے گی تو اس کے مزاج کے اندر کبیدگی پیدا ہو جائے گی اور وہ اس سے نفرت اور گریز کرنے لگے گا.

جب کبھی نووارد آدمی اس کے مکان پر آئے گا تو سلیقہ مند عورت کا مکان اور سر سبز و شاداب پھولوں سے سجے ہوئے گملے کی دلکشی دیکھتے ہی اس کو مسرت حاصل ہوگی اور بدسلیقہ عورت کا گھر دیکھتے ہی طبیعت متنفر اور مکدر ہو جائے گی. اس لیے سلیقہ مند غریب عورت امیر و کبیر پھوہڑ عورت سے ہزار درجہ بہتر ہے. (حسن صحت)

یہ بتلائیے!

آپ نے حجاب کتنے بھائیوں
اور کتنی بہنوں کو پڑھوا دیا؟

صدرالدین احمد صدیقی

چھوٹی چھوٹی کہانیاں

سائی گری

گذشتہ صدی کے اواخر کی بات ہے میرے والد صاحب ریاست مالیر کوٹلہ میں دیوان تھے۔ دہلی کسی سرکاری کام سے گئے تھے میں بچہ تھا۔ مجھے بھی ساتھ لے گئے دہلی میں قیام ایک حکیم صاحب کے یہاں ہوا جو والد صاحب کے ملنے والے تھے۔ ایک دن علی الصبح والد صاحب بالا خانے کی بالکونی میں آرام کرسی پر بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ میں جنگلے سے لگا کھڑا تھا اور گلی میں آنے جانے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک لمبی چھڑی جیسی چیز والد صاحب کے قریب جھنگلے پر پٹ سے آلگی۔ میں نے نیچے دیکھا تو ایک صاف ستھرے معزز سے آدمی گلے میں ایک بڑا اشیلا ڈالے ہاتھ میں نفیس سا حقہ لیے کھڑے تھے۔ حقے میں نے اتنی لمبی لگائی تھی کہ اس کا ایک سرا اوپر تک پہنچا دیا۔ والد صاحب حقہ نہیں پیتے تھے۔ پہلے نیچے ان صاحب کو دیکھا۔ پھر نے منھ سے لگائی اور اٹھتے ہوئے کہا! "صاحب عالم میں آداب عرض کرتا ہوں۔ انھوں نے بڑے ادب سے جواب دیا۔ والد صاحب نے اپنے جمعدار اللہ بخش کو چار روپے دیے اور اشارے سے سمجھایا کہ دونوں ہاتھوں پر رکھ کر ادب سے نیچے جاکر پیش کرے۔ وہ چلے گئے تو مجھ سے کہا: بیٹا یہ شہزادے ہیں زمانہ کی گردش ہے کہ سائی گری کرتے ہیں۔

رام پیاری، پیاری بیگم کیسے بنی؟

اس صدی کے اوائل میں نواب

برالدین مالیر کوٹلہ میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے
ز تھے۔ میرے والد صاحب دیوان اور
ن تھے۔ ایک عرصہ ساتھ رہا۔ مالیر کوٹلہ
رئیس ابراہیم علی خاں دیوانے ہو گئے
گورنمنٹ نے انتظام کے لیے ایک
ل بنائی جس کے صدر سپرنٹنڈنٹ تھے
ابراہیم علی خاں کا انتقال ہوا تو ان
فرزند احمد علی خاں صاحب جانشین
ئے مگر وہ نابالغ تھے اس لیے کونسل
رہی۔ ریاستوں کے دستور کے مطابق
تقریبات پر رقص و سرود کی محفلیں
ہوتی رہتیں۔ ایک دن ایک ہندو
ائف رام پیاری بلائی گئی جو گانے
ں مشہور تھی۔ خود شعر بھی کہتی تھی۔ اپنی
ہوئی نعت سنائی:

نعت

بہار آئی ہے گل پھولے ہیں بادل گھر کے آیا ہے
مدینے کا چمن کیا خوب آنکھوں میں سمایا ہے
مدینے میں مدام ہم نے صبح و شام آرام پایا ہے
بہ ہر پہلو سے سلایا ہے تو حوروں نے جگایا ہے

قدم رکھتا نہیں وہ ناز سے تخت سلیماں پہ
ترے کوچے میں جس درویش نے بستر لگایا ہے
شب معراج جبریلؑ امیں نے یہ کہا آ کر
حضورؐ اٹھئے شہنشاہ دو عالم نے بلایا ہے

یہ اشعار اس قدر خوش الحانی کے ساتھ گائے کہ محفل جھوم اٹھی۔ خصوصاً آخری شعر پر تو لوگوں کو وجد آ گیا۔ والد صاحب مرحوم نہایت متقی اور متدین آدمی تھے۔ ایسی محفلوں سے حتی الامکان احتراز کرتے مگر کبھی مجبوراً جانا بھی پڑتا تھا۔ اس وقت پر موجود تھے فرماتے تھے: میں نے رام پیاری کو غور سے دیکھا اور جب اس نے آخری شعر پڑھا تو دعا کی یا اللہ العالمین یہ عورت مسلمان ہو جائے۔ میری کوئی دعا اتنی جلدی قبول نہیں ہوئی۔ تھوڑے ہی دن بعد سننے میں آیا کہ نواب سر امیر الدین نے رام پیاری کو مسلمان کر کے اس سے نکاح کر لیا ہے۔ پیاری بیگم نام رکھا گیا۔

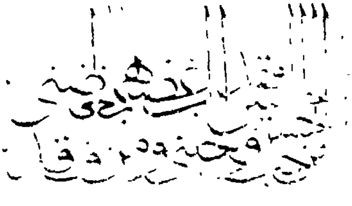
ایک بچے کی حاضر جوابی

سر امیر الدین لوہارو کے قصبے میں کہیں

کہیں جا رہے تھے۔ فاصلہ کم تھا اس لیے پیدل تھے۔ چند افسر بھی ساتھ تھے۔ ایک جگہ چند بچے کھیل رہے تھے۔ کسی نے ایک بچے کی طرف اشارہ کر کے کہا: "حضور یہ بچہ ہر سوال کا کچھ نہ کچھ جواب ضرور دیتا ہے۔" نواب صاحب نے اسے قریب بلوایا اور پوچھا: "تمھارا ریذیڈنٹ کون ہوتا ہے؟ اس زمانے میں ریاست کے ریذیڈنٹ دورے پر آنے والے تھے۔ بچے نے بے ساختہ جواب دیا "وہ ایک بہت موٹا انگریز ہوتا ہے۔ وہ آتا ہے تو سب ڈرتے ہیں۔ سرکار بھی ڈرتے ہیں۔" نواب صاحب اور دوسرے لوگ بہت ہنسے۔ حکم ہوا ایک سیر پیڑے اور ایک سیر میدے کی میٹھی کھجوریں منگا کر بچے کو انعام دیا جائے۔ دونوں چیزیں لوہاروں میں اچھی بنتی تھیں۔

قل ھو اللہ احد...

لڑائی کے زمانے میں کئی دفعہ مشرق وسطی سرکار عالی کے ہمراہ جانا ہوا۔ ایک بار میں اکیلے شام کے صدر سے ملنے گیا۔ شیخ تاج الدین اس زمانے میں حکومت فرانس کے بنائے ہوئے صدر تھے بڑے اخلاق سے ملے۔ میں سوٹ اور ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ مگر یہ وہاں اس وقت مسلمان عیسائی یہودی سب کا لباس تھا صدر کو شاید کچھ مغالطہ ہوا، مجھ سے دریافت کرنے لگے: "اچھا یہ بتائیے کہ خدا ایک ہے دو یا تین؟" میں نے فوراً سیدھا ہاتھ اٹھا کر انگشتِ شہادت بلند کی اور جواب دیا "قل ھو اللہ احد" وہ ہنسے اور پھر پوچھا کیا خدا کے کوئی بیٹا ہے؟" میں نے باقی سورۃ سنا دی۔ "اللہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد" بہت خوش ہوئے۔



حکمت کی ڈائری

رضی الدین اقبال

• گیہوں کے آٹے کی بھوسی بچھو کے کاٹنے کا شافی علاج ہے۔ بھوسی کو پانی میں گاڑھا کر کے زخم پر لگائیں۔

• خون کی کمی اور اختلاج قلب کے لیے سیب بے حد مفید ہے اس کے مسلسل استعمال صالح خون پیدا ہوتا ہے۔ گردے اور دانتوں کے لیے بھی فائدہ بخش ہے۔

• جسم کو صحت مند رکھنے کے لیے پاکبازی، معنوی دواؤں اور غذاؤں سے زیادہ ہے۔

• لہسن قبض کشا ہے آنکھوں کو طاقت بخشتا، معدے کی زائد رطوبتوں کو خشک، اور دماغ کو تقویت بخشتا ہے۔

• کھانا کھانے کے بعد پیشاب ضرور کرنا چاہیے اس سے سنگ مثانہ اور ریگ مثانہ سے انسان محفوظ رہتا ہے۔

• لونگ، دماغ کو قوت بخشتا، ہاضمہ کو طاقت دیتا اور بھوک بڑھاتا ہے۔ اس کا مزاج گرم ہوتا ہے۔ اس کا زائد استعمال سخت نقصان دہ ہے۔

• جھائیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے کیلے میں الی کا مرکب استعمال کرنا چاہیے۔

• بے خوابی کو دور کرنے کے لیے سونے سے قبل ایک آم کھا کر دودھ پی لینا، اس سے قبض بھی دور ہوتا ہے اور پیشاب بھی آتا ہے۔

• اصلی شہد قدرت کی عظیم نعمت ہے اس سے معدہ کو طاقت ملتی ہے اور معدہ کی کمزوری دور ہوتی ہے۔

آواز کا جادو

راز یوسفی

آفتاب پر رومانی موڈ طاری تھا۔
"اس کی آواز میں شعلے کی لپک اور ہر تان میں دیپک راگ کا سوز و گداز ہے۔"
آفتاب چینیز لنچ ہوم میں گائکی کی تلخ چسکیوں کے دوران میں بری طرح بہک رہا تھا۔
"مگر وہ محترمہ ہیں کون؟" میں نے کریدنے کی کوشش کی۔
"یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا ہوں بس یوں سمجھ لو کہ اُن کا نادیدہ شیدائی ہوں۔"
"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم صرف آواز پر فریفتہ ہو۔"
"کتنے بدذوق ہو۔ تم بھی ندیم! آواز کا شخصیت سے بہت گہرا تعلق ہے حسین آواز یقیناً حسین ہی سے نکل رہی ہے اگر اس رسیلی آواز کا شہد ایک بار تمہارے کانوں میں ٹپک جائے تو مجھے یقین ہے کہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھو گے۔"
"مجھے تو خدا اس افتاد سے محفوظ ہی رکھے۔ ابھی دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے مجھے اور پھر ایسی حسین وارداتوں کے لیے تم ہی کیا کم ہو؟"
"اوہو۔ جیسی تو کہتا ہوں۔ قانون کی خشک کتابیں پڑھتے پڑھتے نرے معجون فلاسفہ بن کر رہ گئے ہو۔ نہ کوئی اُمنگ نہ ترنگ ۔

جوانی اور ہنگاموں سے خالی
یہ جینا ہے یہ کوئی زندگی ہے؟

"تمہارے قول کے مطابق یہ جینا بھی کوئی جینا نہ ہوا۔ لیکن ندیم! یہ بلا صدا

یہ جینا بھی کیا جینا ہے کہ ہر وقت سائیکو
بھی بھاگتے رہو۔ بھلے آدمی سے
راتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
بس بھئی تمہاری یہ مشفقانہ نصیحتیں ایک
آنکھ نہیں بھاتیں۔ نہ جانے تمہارے سینے
میں دل کی جگہ کوئی برف کی سل رکھی ہوئی
ہے جس نے پگھلنا سیکھا ہی نہیں۔ میری
مانو تو قانون پڑھنے کی بجائے اسلامیات
کے ریسرچ اسکالر بن جاؤ۔ پھر یہ باتیں
تمہیں اچھی طرح زیب دیں گی۔"

آفتاب کے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا
تھا وہ لڑنے کے موڈ میں آ گیا تھا۔

"ارے میرے پیارے روٹھیا تم خفا
ہو گئے۔ اچھا ذرا گفتگو کرتا ہوں وہ کون ہے
کیا ہے اور تم نے اس کا دیپک راگ اور
اور کہاں سنا ہے؟"

اس کا غصہ فوراً ہی رفع ہو گیا اور
وہ پھر چہک کر بولا۔

"بات یہ ہے کہ وہ ایک پرائیویٹ
فرم میں ٹیلیفون آپریٹر ہے۔ اسے ریڈیو
پر بولنے کا بڑا شوق ہے۔ ایک روز اس
نے ٹیلیفون کیا تو اتفاق سے مجھے ہی
اس سے بات چیت کرنے کا موقع ملا۔
بس پھر کیا تھا بات بن گئی۔ میں نے
اس سے وعدہ کر لیا کہ کسی روز وہ دفتر میں
چلی آئے۔ میں آڈیشن کے موقع پر اس کی
پوری مدد کروں گا۔ اسے ریڈیو پر بطور اناؤنسر
ملازم کرانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔"

"مگر اس کی آواز میں غنائیت کا جو
جادو ہے اس کا تمہیں کیسے علم ہوا؟"

"تو تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے اس سے
صرف ایک ہی بار بات کر کے اس کے
بارے میں اتنی اونچی رائے قائم کر لی بھلے
آدمی اور پچھلے دو ہفتوں سے ہر روز ٹیلیفون
پر میرے ساتھ باتیں کرتی ہے اور کئی مرتبہ
ٹیلیفون ہی پر اس نے مجھے گا کر سنایا
ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا
ہوں کہ ہمارے پورے اسٹاف میں ایک
لڑکی بھی اس کی ٹکر کی نہیں ہے جس روز

پہلی بار اس کی آواز ریڈیو سے نشر ہوئی تو سد الملک حوم کر کہ "اور اس نئی دریافت کا سہرا تمہارے سر بندھے گا۔" میں نے ہلکی سی چٹکی لی اور دل ہی دل میں اس کی سادگی پر مسکرا دیا اور دیر تک یہ سوچتا رہا۔ اگر وہ آج کل کے عام نوجوانوں کی طرح اتنا دل پھینک اور لاابالی نہ ہوتا تو کتنا عظیم آرٹسٹ ہوتا۔

آفتاب ریڈیائی ڈراموں کی روح رواں تھا۔ اس کی آواز میں غضب کا سوز وگداز تھا۔ کوئی ڈرامہ اس کے بغیر کامیاب نہ ہوتا تھا۔ ایک عظیم آرٹسٹ کی تمام خصوصیات اس میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ لیکن ایک کمزوری اس کی تمام خوبیوں پر غالب تھی اور وہ تھی صنف نازک! شوخ ورنگین سایوں کے پیچھے بھاگنا اس کی فطرت ثانیہ تھی اور اپنی اسی کمزوری کے باعث وہ خاصا بدنام اور پست ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک مخلص دوست کی حیثیت سے اکثر اوقات دبے الفاظ میں تنقید کر کے میں اس کی انا کو جھنجھوڑتا رہتا تھا لیکن وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا اور میری معمولی سی چھیڑ چھاڑ سے بھی وہ شعلے کی طرح بھڑک اٹھتا تھا۔

کچھ دیر ہر طرف خاموشی طاری رہی پھر اچانک جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا اور اپنی سیمابی فطرت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔ آج نغمہ ناہید تین بجے آڈیشن کے لیے آ رہی ہے فرصت ملے تو چلے آنا ذرا تفریح رہے گی۔"

اور وہ ہاتھ ملا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا لنچ ہوم سے باہر نکل گیا۔

--- ❖ ---

میں بھی تین بجے ریڈیو اسٹیشن پر موجود تھا۔

آفتاب بے حد خوش تھا اس وقت وہ اپنے بہترین سوٹ میں ملبوس تھا اور اپنی میز کے پاس یوں جم کر بیٹھا تھا جیسے اس کا جسم کرسی کے ساتھ سل گیا ہوا ہو ایک

نمہ کے لئے کرسی سے علیحدگی اس کی جان پر بنا دے گی۔ اس کی نگاہیں بیرونی دروازے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ ہیجان و اضطراب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ بنا ہوا تھا اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے اُچک کر ریسیور اٹھا لیا۔ ایک بہت میٹھی اور رسیلی آواز میرے کانوں کے ساتھ ٹکرائی۔

"آفتاب صاحب تشریف رکھتے ہیں؟"

"جی آپ کی تعریف؟" میں نے بات کو آگے بڑھانے کی غرض سے پوچھا۔

"مجھے نغمہ ناہید کہتے ہیں۔"

"جی جی۔ لیجئے۔ بات کیجئے" میں ہکلاتے ہوئے بولا اور ریسیور آفتاب کی طرف بڑھا دیا۔

بے شک اتنی موہنی آواز میں نے آج تک نہیں سنی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ آفتاب نے اس آواز کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی، اُسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور ایسی حسین آواز کسی حسین ہی سراپے سے نکل سکتی ہے مجھ پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا اور میں دیر تک اس کے کیف و سرور میں ڈوبا رہا۔

آفتاب بول رہا تھا۔

"میں آپ کا ہی منتظر ہوں۔ فوراً چلی آیئے۔ آڈیشن میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگے گا اور پھر یہ تو صرف ضابطے کی کارروائی ہے آپ جیسی ملکوتی آوازیں قدرت کی خاص ودیعت ہوتی ہیں مجھے یقین ہے کہ آپ کی آواز "آواز کی دنیا" میں تہلکہ مچا دے گی۔"

"آفتاب صاحب! یہ تو قدر کو آفتاب بنانے والی بات ہے ورنہ میں کس قابل ہوں۔ ہاں! آپ کی توجہ سے کسی قابل ہو جاؤں گی۔ حالات نے آواز فروشی پر مجبور کر دیا ہے۔" دوسری طرف سے آواز آ رہی تھی۔

"آپ بے حد دکھی معلوم ہوتی ہیں۔ خیر اب باقی باتیں پھر ہوں گی فی الحال تو آپ تشریف لے آئیں۔"

آفتاب دوری کو قربت بنانے کے لیے بے چین تھا اس لیے وہ باتوں میں وقت ضائع نہ کرنا چاہتا تھا۔

"ابھی حاضر ہو رہی ہوں"

آفتاب کے لیے یہ لمحات بہت نازک تھے وہ اس طرح دم سادھے بیٹھا تھا جیسے قتل کا کوئی ملزم عدالت میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا جج کی زبان سے اپنی قسمت کا آخری فیصلہ سننے کے لیے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو اور آدھ گھنٹہ کے بعد آفتاب کی قسمت کا فیصلہ اس وقت ہوا جب ایک چیچک زدہ چہرے والی ادھیڑ عمر کی عورت نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا،

"اگر میں پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہی تو آفتاب صاحب آپ ہی ہیں" اس کا اشارہ ٹھیک آفتاب کی طرف تھا "میرا نام نغمہ ناہید ہے" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی اور آفتاب کا چہرہ فرطِ غم سے یوں سنولا گیا تھا جیسے برسات کے موسم میں کسی گہری سیاہ بدلی نے آفتاب کو اپنے دامن میں چھپا لیا ہو۔

نعت

یہی ہے ایک تمنا ہمارے سینے میں
بلا لیں ہم کو بھی آقا کبھی مدینے میں

نہ ہوگی اس کو میسر کبھی وسیع نظر
گزارا عمر کو جس نے ہمیشہ کینے میں

نبی کو جس نے عقیدت کے پھول پیش کیے
وہ کامیاب ہے مرنے میں اور جینے میں

یہ ان سے تم کو مکارم ولی تعلق ہے
کہ رہ رہے ہو یہاں اور دل مدینے میں

(مکارم الحق رامپوری)

تحفہ

محمد ابراہیم خان

ایک دن اچانک شاہدہ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ جب کافی دیر تک بس نہ آئی تو میں نے مشورہ دیا کہ بہن آٹو رکشا میں میرے ساتھ گھر چلو، وہاں میاں آ گئے ہوں گے تو کار میں تمہیں پہنچا دیں گے۔

شاہدہ میری کلاس فیلو رہ چکی ہے۔ ایک گرلز اسکول میں لنگویج ٹیچر ہے۔ شادی سے پہلے اکثر شاہدہ سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ آج کل یہی کبھی راہ میں ملاقات ہو جاتی ہے۔ اسے میرا مشورہ پسند آیا۔ غالباً اس لئے بھی کہ کافی عرصہ بعد اسے میرے گھر چلنے کا موقع مل رہا تھا۔ ہم نے آٹو رکشا کرایہ پر کیا اور چل دیے۔ شاہدہ نے راہ میں ہی مجھ سے معاہدہ کر لیا تھا کہ میاں کی کار میں اکیلی نہیں جاؤں گی ساتھ تمہیں بھی چلنا ہوگا۔

گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ آج کسی میٹنگ میں گئے ہوئے ہیں۔ کافی دیر بعد لوٹیں گے۔ شاہدہ پریشان۔ آخر میں نے اسے پریشانی کا حل بتایا کہ ابھی تم اپنے گھر فون پر اطلاع دے دو کہ تم میرے مکان پہنچی ہو، رات کھانے سے فارغ ہو کر ہی تم جا سکو گی۔ شاہدہ کے گھر کے سبھی افراد مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ شاہدہ نے میری بات کو پسند کیا۔ لہٰذا فون پر اطلاع دے دی گئی۔

اب میں نے اطمینان سے چائے اور مختصر سا ناشتہ تیار کیا۔ ہم چائے سے فارغ ہوئے تو شاہدہ نے اپنے پرس سے ایک پیکٹ نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگی لو بھئی تم بھی کیا یاد کرو گی لو اس سپاری کا مزا بھی چکھ لو۔ واقعی سپاری بڑی لذیذ تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے پرس چھین لیا اور بلا تکلف دو بسکٹ اس میں سے نکال لیے۔ دوسرے ہی لمحہ میں چونک پڑی۔ یہ کیا پرس میں

چاقو!! میں نے شاہدہ کو بڑی حیرت سے دیکھا اور اسی ایک لمحہ میں اسکول کے زمانے کے شاہدہ کی دلیری کے کچھ واقعات بھی ذہن کے پردہ پر نمودار ہونے لگے میں نے نہایت معنی خیز انداز میں سوال کیا۔ شاہدہ۔ تمہارے پرس میں۔ یہ چاقو؟؟؟

وہ مسکرائی اور کہنے لگی "نجمہ واقعی تم کو میرے پرس میں چاقو دیکھ کر حیرت ہو رہی ہوگی۔ ہونا بھی چاہیئے۔ ساتھ ہی نہ جانے کون کون سے اور بہت سے خیالات تمہارے دماغ میں آ رہے ہوں گے۔ میں تمہیں اس کی حقیقت بتاتی ہوں۔

میری ایک سہیلی ہے اُس کی ایک دلچسپ داستان تمہیں سنا رہی ہوں۔ میری اس سہیلی کے شوہر ایک دفتر میں کلرک تھے۔ میری سہیلی نہایت درجہ خوبصورت تھی اور ساتھ ہی اچھی سیرت کی مالک بھی۔ شوہر بھی شرافت میں کچھ کم نہ تھے۔ کسی طرح دفتر میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ فلاں صاحب کی بیگم صاحبہ تو بہت حسین ہے تب کچھ لوگوں نے مذاق بنانا چاہا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ بڑے افسر نے بھی مذاقاً کچھ کہہ دیا لیکن انھوں نے کبھی ان لوگوں کو آگے نہ بڑھنے دیا اور شروع میں ہی کافی تلخ لہجہ میں انہیں تنبیہہ کی۔ پھر کسی نے کبھی جرأت نہ کی۔ میری سہیلی اپنے میاں کے ساتھ تنہا رہتی تھی۔ کرایہ کا مکان تھا۔ کوئی بڑی بوڑھی ساتھ نہ تھی۔ ایک دفعہ افسر نے سہیلی کے میاں کو کسی کام کے لیے باہر گاؤں روانہ کرنا چاہا۔ میاں پریشان تھے کہ کس طرح بیوی کو تنہا چھوڑ کر باہر جائیں۔ پڑوس میں کوئی اس قدر معتبر نہ تھا۔ افسر نے ان کی پریشانی کو محسوس کیا۔ دریافت کرنے کے بعد انھیں اطمینان دلایا کہ آپ بے فکر رہیے میں اپنی بڑی لڑکی کو آپ کے گھر بھیج دوں گا۔ میاں اس ترکیب پر راضی ہو گئے اور جانے سے قبل بیگم صاحبہ کو بتا گئے کہ تمہارے ساتھ میرے افسر کی بڑی لڑکی یہاں آرام کرے گی۔

ان کی روانگی کے بعد ایک نقاب پوش خاتون رات کے وقت مکان پر آئی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے سہیلی نے دریافت کیا۔ جب معلوم ہوا کہ افسر کی لڑکی ہے تو دروازہ کھولا۔ گھر میں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا نہ تھا پڑوس میں سب لوگ سو چکے تھے جیسے ہی آنے والی لڑکی نے برقع اتار کر دیکھا سامنے ایک بش شرٹ میں ملبوس مرد کھڑا تھا۔ وہ چلانا چاہتی تھی مگر کچھ سوچ کر خاموش رہی اور اس کی زبان سے صرف اتنا نکلا آپ؟" اس نے جواب دیا۔ ہاں میں تمہارے شوہر کا افسر ہوں تم گھبراؤ نہیں میں صلہ میں تمہارے شوہر کو ترقی دلادوں گا... اور... اور.. اس وقت تمہارا شوہر بھی بہت دور میرے کام سے گیا ہوا ہے۔

لو... اور... یہ لو..." اور اس نے اس کی جانب ایک ہار بڑھانا چاہا۔ اس سہیلی نے نہایت اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

آپ تشریف رکھئے۔ میں ذرا فرصت سے فارغ ہو جاؤں۔ افسر یہ آمادگی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ وہ تھوڑی دیر بعد کمرے میں آئی اور... اور خود ہی لاش

سہیلی نے پھر لائٹ آن کی چاقو اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کے سامنے ایک لاش پڑی تھی۔

اس وقت جب کہ اس نے مجھے یہ داستان سنائی تھی میں نے اس دلیر اور عصمت و عفت کی محافظ سہیلی کے ہاتھوں کو چوم لیا تھا۔ شاہدہ نے یہ جملہ اس طرح مزا لیکر کہا گویا وہ اپنے جذبات کے اظہار کے لیے مناسب الفاظ کی تلاش میں لگی ہوئی ہو۔

میں نے پوچھا پھر اس قتل کے نتیجہ میں کیا ہوا؟

کہنے لگی۔ ہوتا کیا؟ میرے کمرے میں زندہ شہادت کے طور پر افسر کی لاش، اس کا لایا ہوا برقع پڑا تھا۔ سہیلی ہی پہنچی ہر

مجھے باعزت طور پر بری کر دیا گیا

بس بہن۔! میرے پرس میں چاقو۔ کی حقیقت یہی ہے۔ واقعی آج عورت کو اپنے تقدس اور عظمت کے تحفظ کے لیے خود بھی تیار رہنا چاہیئے۔ ہر حال میں اُسے اپنی عزت کو بچانا چاہیئے۔ نتیجہ میں چاہے اپنی جان دینی پڑے یا پھر کسی کی جان لینی پڑے..... اور..... اور.... شاہدہ آپا کی اس ملاقات کے بعد پھر میرے بھی پرس میں ایک عدد رامپوری چاقو نے جگہ پالی۔

"وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَكَ" (۱)

جہاں میں مصائب سے کس کو مفر ہے
کوئی اُن پہ صابر، کوئی نوحہ گر ہے
وہ فریاد و نالہ پہ مائل نہ ہوگا
عَلٰی مَا اَصَابَكَ پہ جس کی نظر ہے

(حافظ مکارم الحق رامپوری)

نوٹ:۔ مندرجہ بالا قطعہ اپنی والدہ ماجدہ غفر اللہ لہا کے سانحۂ ارتحال کا تاثر ہے۔ مکارم

(۱) اور تم پر جو مصیبت بھی واقع ہو اُس پر صبر کرو۔

● خودستائی سب سے بڑی حماقت ہے اور حلم سب سے بڑا رہنما ہے۔ (حضرت علیؓ)

● جو زبان کو قابو میں نہیں رکھتا وہ ضرور پشیمان ہوگا۔ (حضرت امام جعفرؒ)

حسنِ خیال

نعیم صدیقی

• جنگل میں ہر چیز بے طرح اُگتی ہے اور ہر جاندار گھس کر جو چاہتا ہے کرتا رہتا ہے۔ درندے سانپ، چڑیاں، انسان جس کا جو جی چاہے کرے کوئی پوچھنے والا نہیں، کوئی قانون نہیں، کوئی حفاظتی جنگلہ نہیں، سنتری پہرہ نہیں۔ لیکن چمن میں صرف کارآمد پودے ترتیب سے لگائے جاتے ہیں اور ناکارہ جڑی بوٹیوں کو جڑ نہیں پکڑنے دی جاتی۔ چمن کا مالی ہوتا ہے اور دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس کے گرد چاردیواری یا باڑھ ہوتی ہے اس میں وہی آتا ہے جسے مالک اذن دے۔

تم اپنے ذہن کو جنگل نہ بنائے رکھو، اسے باغ کی صورت دو۔ اس کی باڑ ہو، اس میں روشیں ہوں۔ اس میں کارآمد پھولوں کو پالا جائے اور زائد روئیدگی کو روکا جائے اور اس میں داخل وہی ہو جسے تم اذن دو۔ ذہن کو ترتیب سے رکھو۔ عقیدے، خیال، جذبے، یادیں، احساسات، اُمیدیں، اُمنگیں، میلانات، مقاصد جو جو کچھ تمہارے ہاں ہو، ہر چیز کا تمہیں علم ہو کہ وہ کیا ہے، کہاں سے آئی اور اس کا مقام کہاں ہے۔ جو کچھ اچھا ہے اسے خوب اچھی طرح رکھو اور جو کچھ بُرا ہے اسے چھانٹ کے باہر پھینک دو۔ اپنے اس سرمایۂ حیات کے گرد حفاظتی دیوار یا جنگلہ بناؤ اور دروازہ بند رکھو تاکہ جسے آنا ہو وہ دستک دے کے تمہاری اجازت سے آئے۔ جو خیال یا احساس بھی دروازے پر آئے اس کا پوری طرح جائزہ لو کہ آیا تمہارے ذہن کے چمن میں اس کی جگہ ہے وہ اس کی خوبصورتی میں اضافہ

کرسکے گا یا نہیں. پھر اسے اگر ایک اچھا اضافہ پاؤ تو لبیک کہو، ورنہ کہہ دو کہ جاؤ، بابا معاف کرو۔

حکومت کو دیکھتی ہو کہ سرحدوں پر چوکیاں بٹھاتی ہیں. باہر سے جو کوئی بھی آتا ہے اس کی پوری شناخت کی جاتی ہے۔ اس کے پاسپورٹ اور ویزا اور دوسرے کاغذات کی پڑتال ہوتی ہے۔ اس کے سامان کی تلاشی لی جاتی ہے۔ یہ اطمینان کیا جاتا ہے کہ آیا یہ اپنا شہری یا کسی دوست ملک کا پُرامن فرد ہے یا کوئی جاسوس اور دشمن. پوری تسلی ہو جانے کے بعد اسے آنے دیا جاتا ہے۔ اور پھر اُسے قانون اور ضابطے کے تحت رکھا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح تم اپنے ذہن کی سرحدیں کھلی نہ چھوڑ دو۔ ان پر چوکیاں بٹھاؤ اور آنے والے کاروان خیال کے ہر ہر فرد کی چھان بین کرو، تلاشی لو اور تسلی ہونے کے بعد اسے اندر آنے دو۔ اندر لا کر بھی اسے ضابطہ و قانون کا پابند رکھو۔

● جب ایک بار کسی ذہن میں نظم قائم ہو جاتا ہے۔ روح کے گھر میں دیکھ بھال ہونے لگتی ہے، گندے خیالات کی نگرانی شروع ہو جاتی ہے تو پھر وہ کئی کاٹنے لگتے ہیں، سامنے آتے ہیں اور پھر سٹک جاتے ہیں، نمودار ہوتے ہیں اور چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ مثلاً پہلے جو خیال بے تحاشا چکر کاٹا کرتے تھے بلکہ اطمینان سے رہا بسا کرتے تھے۔ وہ بھی مجبور ہو جاتے ہیں کہ جب چار دیواری کھڑی ہو جائے اور دروازہ لگ جائے تو دستک دیں۔ شروع شروع میں یہ تبدیلی ان کو سخت ناگوار ہوتی ہے اور وہ دروازہ نہیں چھوڑتے اور دھرنا مار کے پڑے رہتے ہیں لیکن اگر دربان مضبوط قسم کا ہو تو آخر بددل ہو کر چلے جاتے ہیں۔ پھر وہ عادی ہو جاتے ہیں کہ دستک دے کر فوراً پلٹ جائیں پھر وہ ادھر کا رخ کرتے ہوئے بھی جھجکنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کار برے خیالوں کا ورود بالکل ہی شاذ و نادر رہ جاتا ہے۔ روح میں اچھے عقیدے، اچھے جذبات

اچھے مقاصد کی طاقت خود اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ کسی مخالف خیال کا خود ہی مقابلہ کر لیتی ہے اور کوئی گندہ خیال بھولے سے اندر آ جائے تو اس کا وہی حال ہوتا ہے جیسا کسی چھتے میں دوسرے چھتے کی مکھی کے گھسنے پر اسے پیش آتا ہے۔

تم کہو گی کہ اچھے اور بُرے خیال کی — جو بہت باریک بھی ہوتے ہیں اور مرکب بھی — قطعی تمیز کیسے ہو؟

اس کی اصل کسوٹی تمہارا وہ بنیادی اعتقاد ہے جس پر روح کا اور کردار اور شخصیت کا پورا نظام کھڑا کر رہی ہو اور جو زندگی کا رخ متعین کرنے والا اور اس کی قدروں کا شعور دینے والا ہے۔ تم نے زندگی کو، اپنے آپ کو، دنیا کو، دوسرے موجودات کو کیا سمجھا ہے اور ہر ایک کو کیا کیا حیثیت اور کیا جگہ دی ہے۔ اگر تم نے بڑی حقیقت کو ٹھیک سمجھا ہے تو تمہارے پاس ایک سچی کامل اور کامیاب کسوٹی ہے۔ اگر تم نے بڑی سچائی ہی کو نہیں پایا اور کوئی غلط بنیادی عقیدہ بنا بیٹھی ہو تو پھر تمہاری کسوٹی ہی کھوٹی ہے، وہ کیا مدد کر سکے گی — سب سے بڑی سچائی ایک ہے اور وہ یہ کہ:

"ایک خدا ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے تم اس کی بندی اور رعیت ہو اور تمہیں اپنے اعمال کا حساب اس کی عدالت میں پیش کرنا ہے۔"

یہ سچائی اگر تم نے پالی تو تمہارے پاس بڑی قابلِ اعتماد کسوٹی ہے جو کبھی دھوکہ نہیں دے گی۔ اسی سچائی سے اور ساری سچائیاں شاخ در شاخ پھوٹتی ہیں اور یہی سچائی ہے جو اپنے سانچے میں خیالوں اور جذبوں، خواہشوں اور عادتوں کو ڈھال کر حسن و جمال دیتی ہے۔ یاد رکھو کہ خیال میں جو کچھ بھی حسن اور نور ہے وہ سچائی سے ہے اور کوئی سچائی، بغیر اس بنیادی سچائی کا پرتو لئے، پوری اور کامل سچائی نہیں ہو سکتی اور تمہارے خیالوں کو پورا پورا نور اور حسن نہیں دے سکتی۔

بیگم زاہدہ لودھی [illegible]

میں بھی وہاں موجود تھی!

دیکھا نہیں جاتا تھا مگر دیکھتی رہی

کئی دن ہوئے ایک شادی میں شرکت کی تھی۔ اس کا آنکھوں دیکھا حال آپ کو سناتی ہوں معاشرے کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر سے پردہ اٹھانا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ جب بارات آئی تو اس کے ساتھ ایک کار علیحدہ طبلے سارنگیوں اور ایک عدد طوائف اور ان کی نائیکہ صاحبہ کی تھی۔

لڑکی کے گھر میں ناچ شروع ہوا۔ مولوی صاحب نکاح پڑھانے لگے تو وقفہ ہوا اس کے بعد محفل اس زور کی جمی کہ گھر کا ہر فرد ناچ میں مگن ہو گیا یہاں تک کہ لڑکی کے بھائی صاحب بھی ناچنے لگے۔ دولہا صاحب کے بھائی تو اس حد تک جا پہنچے کہ طوائف کے کپڑوں میں نوٹ رکھنے کی پوری کوشش کرنے لگے مگر واہ ری طوائف زادی اس نے اپنے جسم کو ہاتھ لگانے نہیں دیا بلکہ ہاتھ دور ہی روک کر نوٹ چھین لیتی تھی۔

نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی ایک دوسرے کے گالوں پر نوٹ رکھے جا رہے تھے اور نیم عریاں طوائف ہر ایک کے گال کی چٹکی لے کر نوٹ اڑا رہی تھی۔ لوگ اپنے معصوم بچوں کو نوٹ دے رہے تھے۔ وہ نائیکہ سے اشارہ لیتے اور محفل میں جس کے چہرہ پر نوٹ چاہتے رکھتے اور چٹکیاں دلواتے۔ کوئی اپنی منگیتر کے سر پر نوٹ رکھتا کوئی اپنی بہن اور بھائی پر نوٹ وارتا، غرضیکہ نوٹوں کی بارش مسلسل جاری تھی۔ اس محفل میں بڑے بوڑھے بھی

تھیں جن کے سامنے ان کے پوتے بھتیجے بھانجے نواسے سبھی ناچ رہے تھے اور وہ منہ پر ڈوپٹے ڈھانکے سب تماشہ کنکھیوں سے دیکھ رہی تھیں۔ یہ بھی کہتا مزدوری سمجھتی ہوں کہ ناچنے والوں میں کچھ لوگ حاجی بھی تھے۔ یہ سب میرے واقف تھے جن کو میں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ ہر ایک اپنا کل سرمایہ لٹانے چلا آیا ہے۔

میں مسلمانوں سے سوال کرتی ہوں کیا بیٹیوں کے گھر پر بھی ناچ کروایا جاتا ہے؟ کبھی بھائی بھی ناچے ہیں بہنوں کی رخصتی پر؟ ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے ایسے رسم و رواج پر۔ ہم زبان ہلا کر کہہ دیتے ہیں کہ اسلامی نظام آئے اس ملک میں یہ ہونا چاہیے وہ ہونا چاہیے مگر اپنے گریبانوں میں نہیں جھانکتے۔

جب تک ہر فرد اپنا فرض نہیں سمجھے گا کچھ نہیں ہوگا۔ ہم اپنے بچوں کو غلط تربیت دیتے رہیں۔ جب وہ غلط راستہ اختیار کرنے لگیں تو معاشرے کے بگاڑ کا تذکرہ شروع کر دیں۔ حکومت کو برا بھلا کہیں کہ سختی نہیں کرتی۔ اصول نہیں بناتی۔ اچھی طرح لوگوں کو چلانا نہیں آتا وغیرہ وغیرہ۔ ہر انسان اگر اپنے گھر ہی کو سدھارنے کی کوشش کرے تو گلیاں، محلے، شہر بستیاں سنورنے لگیں۔ ہم خود غلط ہوتے ہیں الزام دوسرے کے سر جاتا ہے۔ میں حکومت سے التجا کرتی ہوں کہ جیسے جہیز کی لعنت کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اسی طرح بے خرچ پر بھی پابندی عائد ہونی چاہیے۔ ویسے تو ہماری جیب سے زکوٰۃ اور خیرات کے نام پر ایک پائی بھی نہیں نکلتی لیکن ایسی محفلوں کے لیے ہم کسی بات کی فکر نہیں کرتے۔

محفل میں ایک ڈاکٹر صاحب بھی موجود تھے۔ میرے خیال میں دو تین سو سے کم انھوں نے بھی نہیں وارے۔ کوئی غریب آ کر ان سے فریاد کرتا کہ خدارا میرے بچے یا بیوی کو بغیر فیس کے دیکھ لیں تو وہ صاحب بمشکل آمادہ ہوتے۔ آپ حیران ہوں

کے کہ ڈیڑھ فٹ کی ڈاڑھی والے مولوی صاحب اپنے گال اس طرح سے پچکوا رہے تھے جیسے یہ بھی کوئی اسلامی فریضہ ہو۔

میں یہ نہیں کہتی کہ ہمارے سب بھائی اس طرح کے ہیں۔ بہت سے نیک چلن نیک تربیت اور سیدھی راہ پر چلنے والے بھی ہیں جو عورت کی عزت کرنا جانتے ہیں لیکن ان میں سے بے راہ رو انسانوں سے سوال کرتی ہوں کہ کیا طوائف عورت نہیں ہوتی یہ بھی تو کسی کی بیٹی ہے۔ اسلام میں عورت کی کیا قدر ہے آپ جانتے ہی ہیں تو پھر کیوں اپنے گال سرِ محفل ایک عورت سے پچکوا رہے ہیں۔

میرے پسندیدہ اشعار

- یہ کمالِ زندگی ہے کہ جب آفتاب ڈھلے
  تو فلک کو نور دے کر نئی انجمن سجا دے
- اسے ہم آخرت کہتے ہیں جو مشغولِ حق رکھے
  خدا سے جو کرے غافل اسے دنیا سمجھتے ہیں
- سکھائے ہیں محبت کے نئے آداب مغرب نے
  حیا سر پیٹتی ہے، عصمتیں فریاد کرتی ہیں
- دریدہ پیرہنی پر بھی فقر جامہ زیب
  ہوس ہزار طرح کے لباس میں عریاں
- جو چاہیئے سو مانگیئے اللہ سے امیر
  اس در پہ آبرو نہیں جاتی سوال سے
- ہنس بول کر گزار دے انساں کو چاہیئے
  دو دن کی زندگی کا کوئی آسرا نہیں
- شہرت کی بلندی بھی پل بھر کا تماشہ ہے
  جس شاخ پہ بیٹھے ہو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے
- جن چراغوں سے تعصب کا دھواں اٹھتا ہے
  ان چراغوں کو بجھا دو تو اجالے ہونگے
- خدا نے نیک صورت دی تو سیکھو نیک باتیں بھی
  بُرے ہوتے ہو اچھے ہو کے یہ کیا بد زبانی ہے

(مرسلہ: فارن شیدائی ولایت علی)

مائل خیرآبادی

غلامی کا مسئلہ

تمہید حجاب کے پچھلے شمارے میں غلامی کے غیر اسلامی معنی و مطالب بیان کئے گئے اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج بھی سامنے لائے گئے تھے۔ آج ہم غلامی کے بارے میں اسلامی فکر پیش کریں گے۔ پچھلے شمارے میں ہم نے غلاموں کی بے بسی اور ان پر ہونے والے ہولناک مظالم کے جو واقعات اور حالات لکھے تھے۔ بالکل وہی حالات تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم عطا فرمایا اور حکم دیا کہ آپ قرآنی قانون کے مطابق غلامی کے مسئلے کا حل دنیا کے سامنے پیش کریں۔

غلامی کے بارے میں اسلامی احکام۔ غلامی کے بارے میں اسلام نے جو کچھ پیش کیا وہ سب قرآن کریم کے ان بنیادی اصول و نظریات سے ماخوذ ہے جن کو مسلمان عقیدے کے طور پر مانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو بنیادی عقیدہ عطا فرمایا وہ وہی ہے جو ہر مسلمان کی زبان پر رہتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ یہی وہ عقیدہ تھا جس پر اس وقت کی دنیا چراغ پا ہوگئی تھی اور آج بھی اسی دنیا کی اولاد نے یہ عقیدہ رکھنے والوں کو معاف نہیں کیا۔

اسلام کا بنیادی عقیدہ اور اس کے تشریحی احکام۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا حکم پاکر کسی خوف، کسی نقصان اور کسی لالچ کے بغیر صاف صاف اعلان فرمایا۔

- لوگو! تمہارا رب اللہ ہے، جس نے یہ زمین اور وہ آسمان اور جو کچھ ان

یں اور ان کے درمیان ہے، پیدا کیا۔ تم اسی کے بندے ہو، چاہے تم اپنے کو آقا کہو اور اپنے سے کمزور بندوں کو غلام قرار دو۔

● دوسری بات یہ کہ چاہے تم اپنے کو کچھ ہی کیوں نہ سمجھتے ہو، چاہے تم عرب ہو یا عجم، چاہے تم اپنے کو عالی نسب سمجھو اور دوسروں کو ذلیل۔ چاہے تم گورے ہو یا کالے لیکن تم میں شریف وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ اپنے اللہ سے ڈرنے والا ہے۔

● تیسری بات یہ کہ تم سارے کے سارے غریب و امیر، بادشاہ اور فقیر، متین و مہین، رخ انور اور کریہہ المنظر چہروں والے۔ چاہے تم عرب یا عجم کے ہو، چاہے چین جاپان کے، یورپ کے ہو یا افریقہ کے۔ مشرق کے ہو یا مغرب کے۔ سب کے سب ایک جان سے پیدا کئے گئے ہو۔ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے بنائے گئے اور سنو! تم سب کی تخلیق ایک حقیر بوند سے ہوئی۔

اوپر جو تین باتیں دس بارہ سطروں میں بیان کی گئی ہیں۔ ان کے لیے اسلامی لٹریچر میں دو بڑے اچھے لفظ استعمال کئے گئے ہیں۔

(۱) وحدت الٰہ (۲) وحدت آدم۔ وحدت الٰہ کے معنی ہیں اللہ ہی الٰہ ہے اعبادت کے لائق ہے۔ سارے انسان اللہ کے بندے ہیں۔ وحدت آدم کے معنی ہیں سارے انسانوں کا سلسلہ نسب ایک آدمؑ سے جا کر ملتا ہے۔

قرآن کے یہ حکم وہ ظالم کس طرح برداشت کر سکتے تھے جن کو غلاموں کے ستانے میں مزہ آتا تھا۔ جو غلاموں کو شیروں سے لڑا کر مزہ لیتے تھے۔ چنانچہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم سنائے تو شریفوں اور رئیسوں کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ انھوں نے کہا۔
" محمدؐ! سنو! تم شریف اور شریف کی اولاد ہو۔ ان کمینوں اور ذلیلوں کو اپنے سے الگ کرو تو ہم تم سے معاملہ کرنے کو تیار ہیں اور وہ معاملہ یہ کہ ان حکموں میں ذرا لچک

یکر لو کہ آج کل کے ذہنوں کے مطابق ہو جائے ـــــ دنیا والو! سنو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وقتاً فوقتاً قرآن کریم کے کیسے کیسے دو ٹوک فقرے سنائے۔ ان اللہ لا یحب من کان مختالاً فخوراً۔ اللہ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو گھمنڈی ہو اور اپنی بڑائی جتاتا پھرے۔ پھر یہ اعلان کہ جو کسی غلام کو قتل کرے گا اس کے بدلے وہی قتل کیا جائے گا۔ پھر یہ تنبیہ کہ جو اس کی ناک کاٹے گا، اس کی ناک کاٹی جائے گی۔ پھر یہ کہ جو اس کو خصی کرے گا اس کے بدلے وہ بھی خصی کیا جائے گا۔ کیوں؟ کیونکہ الخلق عیال اللہ۔ سارے لوگ اللہ کے گروہ کے ہیں۔ یا بعضکم علی البعض، تم سب ایک ہی گروہ کے ہو۔ جیسی تمہاری جان محترم ہے اسی طرح اس کی بھی۔

ظاہر ہے جس کے دانتوں کو غلاموں کا خون لگ چکا ہو وہ ایسے حکموں کو کیسے سُن سکتا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جن باتوں پر مخالفت ہوئی تھی۔ ان میں غلاموں کی طرفداری کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور آپؐ کے عملی کردار سے جو بات واضح ہوتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ کو لفظ غلامی یا غلام بالکل ناپسند تھا چنانچہ آپؐ نے اعلان فرما دیا کہ:۔

- مسلمانو! ان کے ساتھ احسان کا معاملہ رکھو (جن کو تم غلام کہتے ہو) یہ تمہارے بھائی ہیں۔ تو تم میں سے جس کے قبضے میں اس کا بھائی ہو اس کو چاہیے کہ وہ اس کو ویسا ہی کھلائے اور پہنائے جیسا وہ خود کھاتا اور پہنتا ہے اور اس سے کوئی کام کرنے کو نہ کہے جو وہ نہ کر سکتا ہو اور اگر ایسا کام آپڑے اور اس سے کرنے کو کہے تو اس کا ہاتھ بٹائے۔
- تم میں سے کوئی اس کے بارے میں یہ نہ کہے کہ یہ میرا غلام اور یہ میری لونڈی ہے

اس کے بدلے یوں کہے کہ یہ میرا خادم اور یہ میری خادمہ ہے۔

● بے شک خدا نے تم کو ان کا آقا بنایا ہے اگر وہ چاہتا تو وہ تم کو بھی ان کے بس میں دے سکتا تھا۔ (یعنی غلامی میں مبتلا کر سکتا تھا)

● خبردار! اس کے چہرے پر چانٹا ہرگز نہ مارو۔ (اگر سخت سزا کی ضرورت آپڑے تو یہ اور یہ سزائیں دی جا سکتی ہیں۔ ان سزاؤں کے حدود اور ضوابط کا فقہی تجزیہ علمائے کرام نے کیا اور نتیجہ یہ نکالا کہ وہ سزا جو بچوں کی شرارتوں پر بڑوں کی طرف سے کی جانے والی تادیبی کارروائی کی طرح ہوتی ہے۔ علماء نے اس سے ایک عجیب و غریب نکتہ غلامی سے آزاد ہونے کا نکالا ہے۔ فرماتے ہیں کہ" مگر یہی سزا اسلامی انقلاب کے بعد (یعنی جب سارے عرب اور جہاں جہاں اسلامی حکومت قائم ہوئی وہاں) غلام کے لیے آزادی کے حصول کی ایک قانونی وجہ جواز بن گئی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی آقا نے غلام کے چانٹا مارا تو یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف کیا لہٰذا وہ (یعنی غلام) آپ سے آپ آزادی کا حقدار ہو گیا۔ (لیکن یہ مقدمہ عدالت اسلامی میں جائے گا اور فیصلہ عدالت ہی کرے گی۔)

لطیفہ۔ ہم نے فقہی مقدمے چھان مارے لیکن اسلامی عدالتوں میں کبھی ایسا مقدمہ پیش ہی نہیں ہوا۔ انسانی مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے یقین نہیں آتا کہ کسی آقا نے اپنے غلام کے چانٹا نہ مارا ہو۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ رسولؐ کے حکم کی نافرمانی بھولے سے ہو گئی تو بطور معافی یا کفارہ خود آقا نے غلام کو آزاد کر دیا ہو اور نوبت عدالت تک نہ پہنچی۔ صدقہ، کفارہ، توبہ اور رضائے الٰہی کے طور پر آزاد کرنے کی ہزاروں مثالیں ہیں۔ مقدمے کی مثال ایک بھی نہیں۔ ہم آگے جب مسلمانوں کا عملی کردار پیش کریں گے اس وقت وہ ہزاروں تو نہیں (مشتے نمونہ از خروارے) کچھ مثالیں اور نمونے

پیش کریں گے۔

• مسلمانو! اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ خبردار! معصوم بچوں، عورتوں، بوڑھے معذوروں اور جو ہتھیار ڈال دے اور امان کا طالب ہو، لڑائیوں میں اس پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔

• کافروں کے معصوم بچے تم سے اچھے ہیں۔

• ان کی عورتوں کی عصمت اسی طرح محترم ہے جس طرح مسلمان عورت کی۔ (یہ فتویٰ نہیں ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا نچوڑ میں نے پیش کیا ہے۔ زنا کا حکم تو سرتاپا ہے)

جنگیں اور لڑائیاں اور ڈکیتی اور غریبی کی وجہ سے اپنے بچوں کو بیچ ڈالنا حرام ہے۔

• اگر کوئی ماں اس ڈر سے کہ وہ غریب ہے اور اس کا کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے اپنے بچے کو بیچ ڈالے تو اسلامی شریعت میں یہ بیع فاسد ہے یعنی وہ مال بکا ہی نہیں۔ اسلامی حکومت کا جج ایسے بچے کو آزاد قرار دے گا اور اپنی حکومت کے سربراہ کو متوجہ کرے گا کہ ایسی عورت کی کفالت کرے۔

• لوٹ مار اور ڈکیتی سے جو مال حاصل کیا جائے وہ اسلامی شریعت میں حرام ہے چنانچہ اس طرح لوٹ میں حاصل کئے گئے بچے اور عورتیں وغیرہ حاصل کرنا بھی حرام ہے اور انھیں لونڈی اور غلام بنا کر بیچنا بیع فاسد یعنی حرام ہے۔

• اپنی ریاست کو وسعت دینے کی غرض سے لڑی جانے والی ہر جنگ حرام ہے ایسی حملہ آور ریاست سے معاہدے کے باوجود اسلامی حکومت معاونت میں اپنی فوج نہیں بھیجے گی ہاں اگر وہ مظلوم ہے یعنی بلا وجہ اس پر حملہ ہوا ہے تو اسلامی حکومت معاہدے کو فرض سمجھ کر مدد کرے گی۔

• محض لونڈی غلام بنانے کے لیے جنگ برپا ہو تو ایسی لڑائیوں میں حصہ لینا،

بانی یا مالی مدد کرنا سب حرام ہے۔

● کسی حسینہ کو حاصل کرنے کے لیے اس کے وطن پر حملہ کرنا ناجائز ہے۔ مسلمان اگر حملہ آور کا ساتھ دے گا تو گناہگار ہوگا اور زبانی یا مالی حمایت بھی گناہ کا سبب بنے گی۔

جہاد کی حقیقت۔ جہاد کے معنی وہ لڑائیاں ہیں جو خدا کی راہ میں لڑی جائیں خدا کے لیے لڑی جائیں۔ اللہ کے دین کی حفاظت کے لیے لڑی جائیں۔ بے انصافی اور ظلم وستم کے خلاف لڑی جائیں۔ جو استعماری طاقتیں قبول حق کی راہ میں روڑا ہوں، یا دوسرے معنی ہیں وہ جو بندوں کو ان کے خدا سے منحرف کر کے خود ان کے خدا بن جائیں ان کا خاتمہ تلوار کے بل پر کر دیا جائے۔ اس کو جہاد کہتے ہیں۔ اسلام نے ایسی ہی جنگ جائز رکھی ہے۔ قرآن کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

وَقَاتِلُوا فِی سَبِیلِ اللّٰہِ الَّذِینَ یُقَاتِلُونَکُم۔ تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ یہ مدافعانہ جنگ ہے یعنی جو تم پر یعنی اسلامی حکومت پر حملہ آور ہوں یا اسلامی ریاست کے رہنے والوں پر دھاوا بول دیں ان سے لڑو جنگ قادسیہ ایرانیوں سے اسی حکم کے تحت لڑی گئی تھی جس کے سپہ سالار حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ تھے۔ اسی آیت کا آخری لفظ یہ ہے ولا تعتدوا۔ مگر تم زیادتی نہ کرو۔ اس شرط کا مطلب یہ ہے کہ ان حدود کی پابندی کرو جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے لگائی گئی ہیں یعنی وہی کہ بچوں، عورتوں، بوڑھے معذوروں سے مت بولو۔ کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِینَ۔ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یہ تو ہوئی مدافعانہ جنگ جو اسلامی اصطلاح میں "جہاد" ہے۔ دوسری صورت جارحانہ اس صورت میں جائز ہے جو جنگ یرموک میں عیسائیوں سے لڑی گئی تھی ابتداء میں وہ بھی مدافعانہ تھی لیکن پھر یہ حکم کہ وَقَاتِلُوهُم حَتّٰی لَا تَکُونَ فِتْنَةٌ وَّیَکُونَ الدِّینُ

ِلِلّٰہ۔ اور تم ان سے اس وقت تک لڑو جب تک پورا دین اللہ کے لیے نہ ہو جائے۔
انچہ اس آیت کی رو سے اسلامی لشکر نے بڑھ بڑھ کر وہ تمام قلعے فتح کر لیے جو دین کی
ہ میں حائل تھے۔

ان جہادوں کا مقصد اسلامی ریاست کے حدود بڑھانا نہ تھا اس لیے فتح کے
مہ ہر جگہ اصولی حکومت قائم کر کے وہیں کے لوگوں کو سونپ دی گئی۔ اس وقت
الفوں کی آنکھیں کھلیں کہ ارے ہم کس لیے لڑتے ہیں اور اسلام کیوں لڑتا ہے۔
جہاد کے علاوہ اسلام نے ہر جنگ کو مذموم قابل مذمت قرار دیا۔ علی الاعلان منع کر دیا کیونکہ
سلام کا پیغام امن و سلامتی ہے جس سے کوئی انسان بے نیاز نہیں یعنی ہر ایک کو امن
ی ضرورت ہے۔ یہ سب جہاد کا طفیل ہے کہ اس وقت جب اسلام کی تلوار کی دھار کا کوئی
امنا نہ کر سکتا تھا۔ وہ عیسائی ریاستیں محفوظ رہ گئیں جن پر حملہ کرنے کا جواز اسلامی لشکر کو
ل سکا۔ حضرت معاویہؓ نے ایک بار حیلہ کر کے حملہ کرنا چاہا تو علماء اسلام نے ان کو
روک دیا۔ چنانچہ ایسی ریاستیں محفوظ ہی نہیں رہ گئیں بلکہ اسلامی لشکر حفاظت کے ذمہ دار
ن گئے۔ رہے وہ لوگ جن سے اسلامی لشکر ٹکرائے تو وہ بھی اس وقت جب کہ صلح
آشتی کے سارے دروازے دشمن لشکر نے بند کر دیے۔ حکم ہے کہ جس سے جہاد کرو پہلے
س کے سامنے اپنا مقصد واضح کرو۔ غفلت میں اس پر نہ جا پڑو۔ پھر — وَاِنْ جَنَحُوْا
لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَہَا وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ۔ اور اگر وہ صلح پر مائل ہوں تو تم بھی صلح کی طرف جھک
جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو۔

جہاد کا اصل مقصد۔ یہ ہے اسلامی جہاد کی وضاحت۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ
دنیا میں انسانیت فروغ پائے۔ دبے ہوئے لوگ اوپر اٹھ سکیں۔ ملک گیری کا جذبہ
اور غلامی ختم ہو۔ اس مقصد کی اصل روح اللہ کی رضا حاصل کرنا تھا۔ اس کے سوا

کچھ نہیں۔ اسی اصل روح کو برقرار رکھنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ فرمان دیے جن کا اوپر تذکرہ ہوا یعنی "اللہ کا نام لے کر جاؤ اور اس کی راہ میں جا کر لڑو۔ معاہدہ نہ توڑو۔ عہد شکنی نہ کرو۔ لاشوں کو مثلہ نہ کرو یعنی ان کے ناک کان اور اعضا نہ کاٹو۔ لاشوں کی توہین نہ کرو۔ کسی بچے کو قتل نہ کرو۔ کسی عورت کی عصمت نہ لوٹو۔ امن پسند لوگوں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ ان کے شعائر پر حملہ نہ کرو۔ ان کی عبادت گاہوں کو بے حرمت نہ کرو۔ پھر جب تم کو اللہ تعالیٰ فتح دے تو یا تو بطور احسان ان کو چھوڑ دو۔ یا معاوضہ لے کر چھوڑ دو (لیکن یہ اس وقت تک) جب تک کہ لڑنے والے ہتھیار نہ ڈال دیں۔

ایک بات رہ گئی یہ کہ جو قیدی معاوضہ نہ دے سکتے ہوں اور وہ ایسے سخت ہوں کہ تم ان کو چھوڑنے میں فتنہ محسوس کرتے ہو تو ان کو قتل کر سکتے ہو یا پھر وہ "ما ملکت ایمانکم" کے تحت ہیں۔ ان کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرو جو خود کھاؤ پیو انھیں کھلاؤ پلاؤ......الخ

یہ "ما ملکت ایمانہم" جن کو تم غلام کا نام دیتے ہو، اسلامی قانون کی کوئی دفعہ نہیں بلکہ مصلحت ہے جس کی ضرورت کسی وقت بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً جہاد میں ایسے لوگ ہاتھ آئیں کہ وہ فدیہ بھی نہ دے سکیں اور اس ڈر سے کہ اگر انھیں چھوڑ دیا جائے تو پھر یہ شرارت کریں گے یا مدمقابل آئیں گے۔ ان کے لیے مجبوراً یہ صورت باقی رہ گئی اور انھیں مسلمانوں کی ذمہ داری اور نگرانی میں دے دیا گیا اور ان کے حقوق مقرر کر دیے گئے۔ چونکہ یہ شراب جوا، زنا کی طرح کا انفرادی مسئلہ نہیں کہ اسلام یکدم یک لخت حرام قرار دے دیتا بلکہ اس کے لیے فضا اور زمین ہموار ہونے کی ضرورت تھی (چنانچہ آگے چل کر اسلامی احکام کی دیکھا دیکھی چھ سات سو برس کے بعد جب عالمی رائے عدم غلامی کے لیے ہموار ہوگئی تو غلامی کا قانون متفقہ طور پر پاس ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر میں بہتوں

کو معاوضہ (جس کا اسلامی نام فدیہ ہے) لے کر چھوڑ دیا۔ کسی کو فدیہ کے بغیر آزاد کر دیا۔ کسی کا فدیہ مقرر کیا کہ دس مسلمانوں کو لکھنا اور پڑھنا سکھا دے۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء نے یہی رول ادا کیا۔ ان کے بعد جن کو حکمراں کہا جاتا ہے اور جن کے ہم مذہبوں اور رعایا کو رومیوں اور اہل یورپ نے کسی وجہ کے بغیر لاکھوں کی تعداد میں تہ تیغ کیا ان کی عزت لوٹی۔ ان کو بے گھر کیا جب سلطان صلاح الدین ان مظلوموں کی مدد کو پہنچا اور دشمنوں کے لاکھوں لشکریوں سے ٹکرایا اور ان کی عسکری طاقت کو پاش پاش کر دیا اور ہزاروں قیدی ہاتھ آئے تو اس نے اپنے رسولؐ کی پیروی کی۔ کوئی انتقامی صورت نہیں اپنائی بلکہ فدیہ لے کر چھوڑنا شروع کر دیا۔ جن قیدیوں کے پاس پیسہ نہ تھا ان کو اپنے پاس سے رقم دی۔ اپنے افسروں سے دلوائی۔ اپنے بھائی کو ابھارا کہ وہ بھی دے۔ اس طرح ہزاروں قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ ایک ناقابل معافی اور ظالم سردار کے متعلق طے کر لیا تھا کہ اُسے قتل کئے بغیر نہ رہے گا لیکن اس ظالم سردار کی بیوی روتی پیٹتی آئی۔ اس نے اپنی لڑکی کو قدموں میں ڈال دیا تو صلاح الدین رو دیا اور اس ظالم سردار کو اس کی بیوی کی فریاد پر فدیہ لیے بغیر چھوڑ دیا۔

عملی اقدام۔ شریعت اسلامی میں قانونی طور پر دو دفعات بنائی گئیں۔ (۱) آقا اور غلام میں تحریری معاہدہ (مکاتبت پڑھت) ہو جانے۔ معاہدے کی رو سے غلام آقا کو متعینہ رقم دے دے تو آقا اُسے آزاد کر دے۔ اگر اب آقا آزاد نہ کرے تو اسلامی حکومت مجبور کرے گی کہ وہ آزاد کر دے۔ اسلامی حکومت کو اس دفعہ سے بے حد دلچسپی پیدا ہو گئی تھی چنانچہ اسلامی حکومت ایسے غلاموں کی تلاش میں رہتی تھی اور اگر کہیں غلام رقم کا بند و بست نہ کر سکتا تھا تو اسلامی خزانے (بیت المال) سے اُسے رقم دے دی جاتی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلاموں کو آزادی دلانے میں اسلام نے کتنی گہری

دلچسپی لی۔ اس دفعہ کے سلسلے میں زکوٰۃ کی تقسیم کا فقہی مسئلہ ملاحظہ ہو۔ زکوٰۃ کی تقسیم کی جو مدیں ہیں ان میں "فی الرقاب" بھی ہے۔ یعنی گردنیں چھڑانے میں۔ یعنی غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ ہو۔

لطیفہ۔ ایک بار حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے (مشہور خلیفہ ہیں) یحییٰ بن سعیدؒ کو زکوٰۃ وصول کرنے افریقہ بھیجا۔ انھوں نے صدقات جمع کئے۔ زکوٰۃ کی تقسیم کے اولین مستحق چونکہ وہیں کے لوگ ہوتے ہیں اس لیے حضرت یحییٰؒ نے مستحقین کو تلاش کرنا شروع کیا۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے رعایا کو اتنا خوشحال بنا دیا تھا کہ انھیں ایک بھی مستحق نہ ملا تو انھوں نے اس رقم سے غلام خریدے اور انھیں آزاد کر دیا۔ جب رپورٹ خلیفہ کے حضور گزاری تو خلیفہ نے تحسین کی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

(۲) دفعہ دوم۔ دفعہ دوم یہ ہے کہ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی خوشنودی کے لیے غلاموں کو آزاد کرنے کی یہ راہ نکال دی کہ صدقہ کے طور پر اور گناہوں کے کفارے کے تحت مسلمان غلام آزاد کریں۔ اس دفعہ پر دفعہ ۱ سے زیادہ عمل ہوا۔ صحابہؓ نے ذرا ذرا سی غلطی پر غلام آزاد کرنا شروع کر دیے۔ کسی نے غلام کو غصے میں گالی دی پھر خیال آیا تو اسے آزاد کر دیا۔ کسی نے چانٹا مار دیا پھر خیال آیا تو اسے آزاد کر دیا۔ کسی مسلمان نے کسی مسلمان کو دھوکے میں قتل کر دیا تو کفارے میں غلام کو بھی آزاد کیا اور دیت بھی دی۔ کیونکہ قرآن کا حکم ہے "اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ "رقبۃ مومنۃ" ایک مومن گردن یعنی غلام آزاد کرے اور مقتول کے ورثہ کو جان کا بدلہ (دیت، خون بہا) بھی دے۔

لطیفہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہؓ کو سپہ سالار بنا کر ایک مہم پر بھیجا۔ وہاں جب جنگ شروع ہوئی تو ایک کافر اسامہؓ کی تلوار کی زد میں آگیا۔ کافر کی زبان

سے ڈر کے مارے کلمہ شہادت نکل گیا لیکن تلوار چل چکی تھی۔ وہ مارا گیا۔ وقائع نویس نے حضورؐ کو رپورٹ دی۔ آپ نے اسامہ رضؓ سے جواب طلب کیا۔ انھوں نے عرض کیا "یارسول اللہ! اس کافر نے ڈر کے مارے کلمہ شہادت پڑھا تھا" یہ سنکر حضورؐ نے فرمایا۔ اے اسامہ! کیا تو نے اس کا سینہ چاک کر کے دیکھ لیا تھا؟ اس کے بعد حضورؐ پر گریہ طاری ہوگیا۔ فرمایا "اے اللہ! میں اسامہ کے فعل سے بری ہوں۔ اے اللہ! میں اُسامہ رضؓ کے فعل سے بری ہوں"۔ اُسامہ رضؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ کا گریہ دیکھ کر میں اپنے اوپر لعنت بھیجنے لگا۔ "اے کاش! اس فعل سے پہلے مجھے موت آجاتی"۔ اس کے بعد اسامہ رضؓ نے قرآنی آیات پر عمل کیا اور جب یہ فعل یاد آتا غلام خریدتے اور آزاد کر دیتے۔

یہ اُسامہ رضؓ وہ عظیم صحابی تھے جن کو حضورؐ بے حد عزیز رکھتے تھے۔ دیکھنے والے (صحابہ رضؓ) کہتے ہیں کہ ہم کو نہیں معلوم، حضورؐ کو نواسۂ رسولؐ اور اسامہؓ میں سے کون زیادہ عزیز ہے۔ یہ اسامہ رضؓ حضورؐ کے منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہ رضؓ کے بیٹے تھے۔ زید رضؓ بچپن میں غلام بنائے گئے تھے۔

لطیفہ دوم۔ نواسۂ رسولؐ حضرت حسن رضؓ کھانا کھانے کے لیے دسترخوان پر تشریف فرما تھے۔ کچھ اصحاب اور بھی تھے۔ غلام شوربے کا پیالہ لایا۔ اچانک پیالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کا شوربہ حسن رضؓ پر گرا۔ غصے کے مارے چہرہ متغیر ہوگیا۔ گھبراہٹ میں غلام کی زبان سے نکل گیا "اللہ غصہ پی جانے والوں کو دوست رکھتا ہے" اس کا یہ کہنا تھا کہ حسن رضؓ کا غصہ جاتا رہا۔ غلام نے پھر کہا "اور معاف کرنے والوں کو بھی" آپ نے اُسے آزاد کر دیا۔ اب اس نے پھر کہا "اور انھیں بھی جو اللہ کی راہ میں انفاق کرتے ہیں" حضرت حسن رضؓ مسکرا دیے، اُسے زادِ راہ دیا اور رخصت کر دیا۔

لطیفہ سوم۔ خلیفہ دوم حضرت عمر رضؓ کے فرزند ارجمند حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ کے

پاس بہت سے غلام تھے۔ آپ جس غلام کو توجہ سے نماز پڑھتے دیکھتے تو اُسے آزاد کر دیتے ایک بار ایک صاحب نے کہا آپ جو اس طرح غلاموں کو آزاد کر رہے ہیں تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔ غلام ریاکاری کی نماز پڑھتے ہیں۔ محض آزادی کے لیے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضہ نے فرمایا۔ اے شخص! تو نے اچھا مشورہ نہیں دیا پھر اُٹھے اور اپنے سب سے بہتر غلام کو آزاد کر دیا۔

مواخات یعنی بھائی چارہ۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینے ہجرت فرما گئے تو آپ نے وہاں مسلمانوں میں بھائی چارہ قائم فرمادیا۔ اس بھائی چارہ میں انوکھی نرالی باتیں دیکھنے میں آئیں۔ آج تک دنیا دنگ ہے کہ یہ کیسے ہو گیا اور مسلمانوں کی کایا کس طرح پلٹی کہ اگر کسی آقا اور غلام کا بھائی چارہ کرا دیا گیا تو بس وہ بھائی بھائی ہی بن گئے اس طرح کے تین چار رشتے ملاحظہ ہوں۔ عرب کے مشہور بہادر اور فیاض عالی نسب حضرت حمزہ حضرت زید بن حارثہ رضہ کے بھائی بنائے گئے۔ وہی زید جو بچپن میں غلام بنا لیے گئے تھے حضرت حمزہ رضہ کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے اور سردار مکہ عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ ان دونوں میں جو گھر سے باہر جاتا وہ دوسرے کو وارث بنا جاتا۔

لطیفہ۔ جب حضرت حمزہ رضہ جنگ اُحد میں شہید ہوئے اور ان کی ننھی سی بیٹی کی سرپرستی کا مسئلہ درپیش ہوا تو تین دعوی دار تھے۔ حضرت زید بن حارثہ۔ ان کا دعوی یہ تھا کہ حمزہ رضہ میرا بھائی تھا لہٰذا بچی مجھے ملنا چاہیے۔ دوسرے حضرت علی رضہ ان کا دعوی تھا کہ حمزہ میرا نسبی بھائی تھا (یعنی میرے باپ ابو طالب کا سگا بھائی) اس لیے بچی مجھے ملنا چاہیے۔ تیسرے حضرت جعفر رضہ (علی رضہ کے بڑے بھائی) ان کا دعوی تھا کہ حمزہؓ میرا بھائی بھی تھا اور بچی کی خالہ میرے نکاح میں ہے۔ لہٰذا میں حقدار ہوں۔ چونکہ

خالہ کا رتبہ اسلام میں ماں کے برابر ہے اس لیے بچی حضرت جعفرؓ کو دے دی۔

دوسرا رشتہ ملاحظہ ہو۔ اسلام میں حضرت ابوبکرؓ کا جو مقام ہے وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ نیز مسلمان ہونے سے پہلے مکہ میں جو ان کا مقام تھا وہ بھی۔ خارجہ بن زیدؓ کو ان کا بھائی بنایا گیا۔ حضرت بلال رضؓ کو آپ جانتے ہیں ان کو مدینے کے رئیس حضرت خالد بن رویحہ خثعمی کا بھائی بنایا گیا۔ کسی کراہیت کے بغیر یہ رشتے ایسے پختہ ہو گئے تھے کہ خونی رشتوں سے کم نہ سمجھے جاتے تھے۔

غلاموں سے شادی بیاہ۔ غلامی مٹانے کے لیے ذہن کو ہموار کرنے کے بعد اسلام نے ایک اور بہت بڑا قدم اٹھایا۔ آپس میں آقاؤں اور غلاموں کے گھرانوں میں شادیاں کرائیں۔ سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نمونہ پیش فرمایا۔ ہاشمی خاندان کی رئیس زادی حضرت زینبؓ کی شادی حضرت زیدؓ سے کر دی۔ حضرت زینبؓ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ اس کے بعد غلاموں اور آزادوں میں یہ رشتے ہونے لگے حضرت بلال رضؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ بڑے بڑے رئیس خود ان سے استدعا کرتے تھے کہ ان کی لڑکی اپنے نکاح میں قبول فرمالیں۔

غلاموں کا سپہ سالار ہونا۔ کسی فوج کا کمانڈر انچیف ہونا معمولی بات نہیں ہے اس کے تقرر میں بڑی نزاکتیں ہوتی ہیں۔ اس معیار میں کہیں ذرا خامی پائی جاتی ہے تو اسکی زیر نگرانی میں فوج پورے جوش کے ساتھ نہیں لڑتی۔ ہم نے تو معمولی عہدوں پر آج کی روشن خیال دنیا میں دیکھا ہے کہ اگر ادنیٰ ذات کا آدمی کسی ذمہ دار پوسٹ پر آگیا تو اونچی ذات والے اس سے تعاون نہیں کرتے۔ کجا اس عہد میں جب غلام جانوروں سے بد تر تھا۔ اس وقت نبی کریمؐ نے سلطنت روم جیسی عظیم حکومت سے ٹکر لینے کے لیے جو لشکر ترتیب دیا اس کا سالار اعظم حضرت زید بن حارثہؓ

کو بنایا۔ زیدؓ بن حارثہ کی ماتحتی میں بڑے بڑے صحابہؓ تھے۔ (ابوبکرؓ، عمرؓ، جعفرؓ، خالدؓ بن ولیدؓ، عبداللہ بن رواحہؓ، ابوعبیدہؓ، حضرت زیدؓ، عمرؓ کے بھائی وغیرہ) اس معاملے میں آپؐ نے اس درجہ قدم آگے بڑھایا کہ دنیا حیرت میں رہ گئی۔ آپؐ نے حکم دیا: "سنو اور اپنے امیر کی اطاعت کرو چاہے تمہارا افسر کسی ایسے غلام حبشی کو بنایا جائے جس کا سر کشمش جیسا ہو"

جنگ میں جب حضرت زیدؓ شہید ہوئے اور حضرت خالد بن ولیدؓ تین ہزار مجاہدین کو تین لاکھ لشکر کفار سے صاف بچالائے تو دوسری بار حضورؐ نے حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کو امیر الافواج بنایا۔ اس فوج میں بھی وہی سب تھے جو پہلے تھے۔

سپہ سالاری سے بھی اونچی بات سنئے۔ حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ حضورؐ کی وفات کے وقت اگر حضرت زیدؓ زندہ ہوتے تو آپؐ انھیں خلیفہ بنانے کے لیے فرما جاتے۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کو جب اپنا جانشین چننے کی ضرورت پیش آئی تو آپؓ نے فرمایا: حضرت سالمؓ (حضرت ابوحذیفہؓ کے غلام) زندہ ہوتے تو میں ان کو خلیفہ مقرر کر دیتا۔

غلاموں کی تنقید خلیفہ پر۔ صرف ایک مثال۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ نے فے (جنگ کے بغیر جو مال ہاتھ آئے) کے مسئلے پر ایک رائے پیش کی۔ اس رائے سے حضرت بلالؓ نے ایسی زوردار مخالفت کی کہ بڑے بڑے صحابہ کی رائے بھی وہی بن گئی۔ جب حضرت عمرؓ کسی طرح حضرت بلالؓ کو قائل نہ کر سکے تو خدا سے دعا کرنے لگے: "اے اللہ! بلالؓ اور اس کے ساتھیوں کے لیے مجھے کافی بنا دے"۔ اصل لفظ یہ ہیں اللھم اکفنی بلالاً و اصحابہ۔ اکفنی کے معنی میں اگرچہ معنی پوشیدہ ہے۔ کہ اے اللہ! بلال اور ان کے ہمنوا لوگوں کو قائل کرنے کے لیے اپنی طرف سے مجھے دلیل عطا فرما، تو اسلام میں وہ مقام کتنا بلند نظر آتا ہے جہاں غلام لا کھڑا کر دیا گیا۔

لطیفہ۔ ایک بار حضرت عمرؓ کے گھر کچھ اصحاب موجود تھے۔ یہ سب بے تکلف دوست تھے۔ طے یہ ہوا کہ سب اللہ تعالیٰ سے اپنی سب سے بڑی تمنا بیان کریں۔ چنانچہ ایک صاحب نے دعا کی "اے اللہ! میں تیری راہ میں جہاد کروں اور شہید ہو جاؤں" دوسرے صاحب نے تمنا ظاہر کی کہ اگر میں اُحد پہاڑ کے برابر سونا پاؤں تو اللہ کی راہ میں لٹاؤں۔ ہر صاحب اسی طرح اپنی اپنی تمنا کا اظہار کرتے رہے۔ آخر میں حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا آپ کی تمنا کیا ہے۔ فرمایا "میری تمنا یہ ہے کہ میرے گھر کو اللہ تعالیٰ بلالؓ صہیبؓ اور سلمان فارسیؓ جیسے بزرگوں سے بھر دے۔"

غلاموں کی تربیت۔ اسلام نے غلاموں اور لونڈیوں کی دینی اور اخلاقی تربیت پر اس طرح توجہ دلائی جیسی توجہ اولاد کے لیے دلائی گئی ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ غلاموں میں ایک سے ایک صاحبان علم و فضل اور میدان جنگ کے دھنی ہوئے۔ حضرت بلالؓ، اور حضرت عمرؓ کی بحث آپ ملاحظہ فرما چکے۔ سلمانؓ و صہیبؓ کا جو مقام ہے وہ بھی آپ کو معلوم ہے۔ حضرت زید بن حارثہؓ اور اسامہؓ بن زیدؓ کے مقام بلند کا تذکرہ ہو چکا آگے چل کر محدثین اور اماموں میں زیادہ تر غلام اور غلام زادہ ہی تھے جن کی تربیت ان کے صاحب علم آقاؤں نے کی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں پھر ایک لطیفہ یاد آگیا۔

لطیفہ۔ عباسی دور کے ایک خلیفہ نے اپنے دربار کے فقیہ سے محدثین اور اماموں کا نام و نسب پوچھا۔ فقیہ نے بتانا شروع کیا کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نسلی اعتبار سے "زط" جاٹ تھے اور غلام زادہ بھی۔ امام صاحب کے ایک شاگرد ابو محمد یوسفؒ دھوبی کے لڑکے تھے۔ امام صاحب کے استاد امام جعفر صادقؒ کے دادا حضرت امام زید بن حسینؓ زین العابدینؒ لونڈی زادہ تھے۔ امام قدوری کمہار تھے۔ خواجہ امام حسن بصریؒ لونڈی زادہ تھے۔ حضرت نافع، حضرت سالم غلام تھے۔۔۔ فقیہ اس طرح اماموں کے نام گنا رہا تھا ان

ان میں کسی کو اونچی نسل کا نہ پاکر خلیفہ جھنجھلا کر بولا۔ کمبخت! ان میں کوئی ہاشمی نہیں ؟
فقیہ نے بتایا۔ ایک صرف ایک۔ پوچھا کون؟ بتایا امام محمد بن شافعیؒ ہاشمی۔

واضح رہے کہ خواجہ حسن بصریؒ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی لونڈی کے صاحبزا
تھے۔ ان کے بچپن میں ان کی والدہ اور ام المومنینؓ کام میں لگی ہوتیں اور آپ گھبرا
میں رونے لگتے تو ام المومنین دوڑ کر اٹھا لیتیں اور اپنا دودھ پلانے لگتیں۔ بہت سے
کہتے ہیں کہ خواجہ صاحب اسی دودھ کی بدولت سرتاج اولیاء ہوئے۔ ہم کہتے ہیں
اسلام کی بدولت وہ ایسے ہوئے۔ اسلام نے غلاموں کے متعلق جو ہدایات دی تھیں
کی بدولت خواجہ صاحب نے بچپن میں ایک طرف امہات المومنین سے تربیت
دوسری طرف صحابہ کرام سے اور سب نے بڑی فیاضی سے گویا گھول کر اسلام پلا
یہ اسلامی تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ موسیٰ بن نصیر کے نوجوان غلام طارق نے ا
فتح کیا۔ دور کیوں جائیے۔ اپنے ملک میں دیکھئے۔ یہاں غلام خاندان کے کئی ز
بادشاہ ہوئے۔ مورخین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں غلام خاندان
بہتر بادشاہ نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب بھی ان کی ٹکر کا بادشاہ نہ تھا
یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ ان میں کئی ولی اللہ تھے (ہمارے خیال میں اورنگ زیب
ایسے کام کئے جو غلام خاندان کے بادشاہ نہ کرسکے۔ اول یہ کہ عالمگیر نے متحدہ ہندو
قائم کیا۔ دوم یہ کہ فتاویٰ عالمگیری مرتب کرائی۔ تیسرے یہ کہ اس نے ایک ایسی لڑکی پیدا کی جس
اسلامی اکادمی قائم کی جس میں سیکڑوں علماء کام کرتے تھے اس لڑکی کا نام زیب النساء تھا۔ باقی باتو
بے شمار نمونوں اور مثالوں میں سے چند مثالیں اوپر دی گئیں۔ لیکن ان
ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے محض باتیں اور قانون ہی نہیں دیا بلکہ ان پر عمل ک
دکھلایا۔ سب سے پہلے ذہن کو وحدتِ الٰہ اور وحدتِ آدم کی تعلیم اور عقیدے سے

یا۔ پھر عملی اقدام سے تربیت کے نمونے دکھائے۔ اسلام نے ایک طرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے مسلمانوں کو ابھارا کر غلاموں کو آزاد کریں۔ دوسری طرف ان غلاموں کی روحانی تربیت کا بھی انتظام کیا۔ تیسری طرف سوسائٹی میں ان کو اونچے سے اونچا مقام دلایا۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی تاریخ ہے کہ یورپ کے متعصب مورخین کو بھی ماننا پڑا اور انھوں نے اعتراف کیا کہ:-

"اسلام میں غلاموں کو وہ بلند مقام حاصل ہوا۔ جس کی مثال دنیا کی کسی دوسری قوم یا کسی دوسرے خطے میں نہیں ملتی۔ مسلم معاشرے نے ان کو ایک باعزت جگہ بخشی پھر نفسیاتی اثر یہ کہ غلام آزاد ہونے کے بعد اپنے آقا کی طرف سے بے عناد ہوتا تھا۔ آقا تربیت کر کے اسے جو کچھ بنا دیتا تھا اس کا شکر گزار ہوتا تھا۔ آزاد ہونے کے بعد غلام اپنے آپ کو اپنے آقا کے گھرانے کا آدمی سمجھنے لگتا تھا۔"

یہ اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ ایک بار جب حضرت ابوہریرہؓ نے ایک آدمی کو گھوڑے پر سوار اور اس کے غلام کو پیدل دیکھا تو گھڑ سوار سے کہا۔ اس کو گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھا لو۔ کیونکہ وہ تمہارا بھائی ہے اور وہ بھی ویسی ہی روح رکھتا ہے جیسی تم رکھتے ہو۔

اور یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام کے ساتھ فلسطین کا سفر کیا تو طے کیا کہ باری باری سے اونٹ پر سوار ہوں گے یہ اتفاق ہی تھا کہ جب فلسطین میں داخلہ ہو رہا تھا تو غلام اونٹ پر تھا اور حضرت عمرؓ نکیل تھامے ہوئے تھے۔ غلام نے کہا بھی کہ یہاں آپ سوار ہوں مگر حضرت عمرؓ نے اپنا اصول نہ توڑا۔

یہ سب ٹھیک مگر؟ معترض کہتا ہے کہ اوپر جو کچھ بیان ہوا، وہ سب ٹھیک

ہے مگر اسلام نے جس طرح زنا کو حرام کر دیا۔ شراب کو حرام قرار دیتا ۔ سود کو حرام کی
طرح غلامی کے مسئلے کو اسی وقت کیوں نہ حرام فرما دیا۔ اس کا جواب اوپر ضمناً کہیں آ
ہے لیکن ممکن ہے کہ قاری کی نظر وہاں سے اُچٹ جائے۔ اس لیے یہاں لکھتے
ہم بیان کر چکے ہیں کہ جہاد کے علاوہ جنگوں کی جو صورتیں تھیں ان سب کو اسلام نے
قرار دے دیا۔ رہا جہاد تو اس میں جو قیدی ہاتھ آتے تھے ان کے چھوڑنے کی صو
اسلام نے یہ بتائی کہ انھیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ پھر احسان کر کے رہا کیا جائے
بھی کچھ قیدی اس طرح کے رہ جاتے تھے۔ جن کے بارے میں خطرہ ہو سکتا تھا کہ اگ
یونہی چھوڑ دے جائیں گے تو پھر مدمقابل آ سکتے ہیں۔ اور کچھ ایسے باقی رکھے جا
کہ ان کے بدلے میں اپنے ان لوگوں کو چھڑا لیا جائے گا جو دشمن کی قید میں جا چکے
اب اگر اس وقت اسلام غلامی کو حرام قرار دے دیتا تو اس کے معنی یہ ہو
مسلمان تو سارے قیدی چھوڑ دیتے اور ان کے آدمی دشمنوں کی قید میں رہتے۔ ی
کہ دشمن کا دل بڑھا رہتا اور وہ اس امید میں رہتا کہ اگر قید ہوں گے تو چھوڑ ہی دیے
گے لہٰذا نہ فدیہ، نہ معاوضہ، نہ قتل، چھوٹ کر پھر جتھا بنائیں گے اور اسلامی حکومت ک
بند کرتے رہیں گے۔ پھر چونکہ شراب کی طرح یہ انفرادی مسئلہ نہیں تھا کہ ہر شخص حرا
چھوڑ دیتا۔ غلامی تو اجتماعی مسئلہ ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ غلامی کے خلاف
فضا بنا دی جائے کہ آپ سے آپ اجتماعیت اس کی طرف متوجہ ہو۔ چنانچہ اسلا
اسی تدریجی طریقے سے کام لیا۔

ایک بے لاگ رائے ملاحظہ ہو: ان حالات میں اسلام کے لیے یہ ممکن ہی نہ
کہ وہ اپنے دشمنوں کے تمام قیدیوں کو فی الفور رہا کر دے کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا
سے بعید ہوتا اور اس سے دشمنوں کو مزید شہ ملتی اور وہ کسی جوابی کارروائی کے خ

بے نیاز ہو کر مسلمانوں کے اعزہ واقرباء کو غلام بناتے اور دل کھول کر انھیں اپنے مظالم اور انتقامی کارروائیوں کا تختۂ مشق بناتے رہتے۔ چنانچہ اس صورت حال میں اسلام کے لیے واحد معقول راہ یہی ہو سکتی تھی کہ وہ دشمن کے قیدیوں سے کم سے کم ویسا ہی سلوک کرے جیسا کہ وہ اس کے قیدیوں سے روا رکھتا تھا۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی یہ تدابیر اُس وقت تک ختم نہیں کی جا سکتی تھی جب تک دشمن بھی اس سلسلے میں اسلام کے ساتھ تعاون نہ کرتا۔ چنانچہ اسلام نے اس کے وجود کو اس وقت تک برداشت کیا جب تک حالات اس کے کلی خاتمے کے لیے سازگار نہ ہو گئے اور ساری دنیا کے لوگ جنگی قیدیوں کے متعلق ایک مشترکہ لائحۂ عمل پر متفق ہو گئے۔ یورپ میں غلاموں کو کئی صدیوں (چھ صدیوں) کے بعد جو آزادی نصیب ہوئی وہ بھی اس معاشرتی مرتبے کی ہمسر نہیں جو اسلام کئی صدی پیشتر غلاموں کو عطا کر چکا تھا۔ لطف یہ کہ اس وقت تک اسلام اپنی مملکت میں غلامی کی جڑ کاٹ چکا تھا۔ پھر یہ کہ کارل مارکس اور ابراہیم لنکن نے جن حالات میں غلامی کے خلاف قانون بنایا اس میں سراسر فریب تھا۔ وہ مجبور ہو گئے تھے لیکن اسلام نے کسی مجبوری کے بغیر ایسا کر دکھایا۔ اسلام کے یہاں یہ جو کچھ ہوا۔ اس میں رضائے الٰہی شامل تھی۔ اسلام کو آج بھی دینی اور معاشرتی اعتبار سے بلند ترین مقام حاصل ہے۔

اسلام چاہتا تھا کہ غلام کا دل بھی آزادی سے مطمئن ہو اور ظاہر میں بھی وہ مطمئن یعنی معاشرتی اور معاشی اور تہذیبی حقوق بھی اُسے ملیں۔ ابراہیم لنکن کی طرح نہیں کہ غلاموں کو ذہنی طور پر ذرا بھی اطمینان نہیں دیا۔ کاغذ پر صرف نیک خواہشات کے نقط لکھ دیے۔ اسلام نے غلاموں کو آزاد ہی نہیں کیا بلکہ تعلیم و تربیت سے نوازا۔ اسلام کی اس تعلیم سے سماج میں باہم تعاون، محبت اور ایک دوسرے کی خیر خواہی

کی خواہش اُبھری۔ یورپ کی طرح نہیں کہ وہاں کے غلام جب تک مرنے مارنے پر نہیں تُل گئے انھیں آزادی نہیں ملی۔ اسلام نے غلامی کو کسی مجبوری کے تحت ختم نہیں کیا۔ یورپ میں غلاموں اور آزادوں میں ایک کھنچاؤ رہا۔ شدید نفرت رہی۔ اسی کھنچاؤ اور نفرت میں وہاں غلام آزاد ہوئے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہاں غلاموں کے دلوں سے نفرت نہیں گئی۔ اسلام نے ایسی کسی بات کا انتظار نہیں کیا۔ اس نے جنگ بدر لڑی۔ یہ پہلی جنگ تھی قیدی ہاتھ آئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ احکام دیے جو پچھلے صفحات میں درج ہوئے۔ یہ غلام جب چھوٹ کر اپنے گھر گئے تو انھوں نے گواہی دی کہ ہمیں جس شخص کی نگرانی میں دیا گیا تھا اس نے ہمیں کھلایا، خود بھوکا رہا۔ ہمیں آرام دیا، خود تکلیف میں رہا۔ اس نرمی میں اسلام کو کیا مجبوری تھی؟ کوئی مجبوری نہیں تھی۔ صرف رضائے الٰہی مقصود تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ غلام آزاد ہونے کے بعد اسلام کے بہترین رضا کار بن جاتے تھے۔"

اسلام میں غلام بنانے کا حکم ہی نہیں!۔ اسلام میں غلام بنانے کا حکم ہی نہیں "فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَہَا" میں جو حکم پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ پھر اس کے بعد (یعنی جب جنگ میں قیدی ہاتھ آئیں تو) یا تو بطور احسان چھوڑ دینا اور یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینا جب تک لڑنے والے ہتھیار نہ رکھ دیں۔ "اس آیت میں غلام بنانے کا حکم ہی نہیں۔ اگر حکم ہوتا تو غلامی اسلامی قانون کی خاص دفعہ بن جاتی مگر غلامی کے بجائے یہاں صرف دو دفعہ لاگو کی گئیں۔ اول یہ ہے کہ فدیہ لے کر چھوڑ دو دوئم یہ کہ احسان کر کے چھوڑ دو۔ رہی یہ بات کہ پھر بھی قیدی باقی رہ گئے۔ وہ ان مصلحتوں کے تحت مسلمانوں کی نگرانی میں رہے جن کا ہم تذکرہ کر چکے ان کے لیے بھی ایک معاہدہ کی شکل پیدا کر دی کہ اتنی رقم دے دو اور آزاد ہو جاؤ۔ دوسری رضا کارانہ ترغیب

مسلمانوں کو دی کہ اللہ کی رضا کے لیے غلام آزاد کریں۔ جہاں جہاں اسلام کی حکومت ہو گئی وہاں غلام بنانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا۔ یہ اسلام ہی کا طفیل ہے کہ اسلامی قانون کے یہ روشن نتیجے سامنے دیکھ کر انسانیت رفتہ رفتہ اس قابل ہوئی کہ جنگی قیدیوں کے مسئلے کا کوئی خالص انسانی حل تلاش کرے۔

دشمن کی گرفتار شدہ عورتیں۔ کافر قوموں کا طریقہ رہا کہ وہ جب دشمن قوم کی عورتوں کو پکڑ پاتے تھے تو ان کے سارے انسانی حقوق چھین لیتے تھے ان کو ان تمام مظالم اور مصائب کا نشانہ بنایا جاتا جو اس زمانے میں غلاموں اور لونڈیوں کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ عورت کی عزت و آبرو کا ذرا بھی خیال نہ رکھا جاتا تھا۔ ان سے کسب کرایا جاتا اور اس سے آمدنی ہوتی اسے حلال سمجھتے۔ ان کے ساتھ یہ وحشی پن بھی کیا جاتا تھا کہ باپ بیٹے، دوست اور یار سب مل کر ایک ہی عورت سے ہوس پوری کرتے۔ ان عزیبوں میں کنواری اور بیاہتا کسی کا بھی احترام نہ تھا۔ جو بچے گرفتار کئے جاتے ان سے بھی وحشیانہ سلوک کرتے۔ اسلام نے ان عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اسے بھی ملاحظہ فرمایئے۔

- اسلام نے قیدی عورتوں سے کسب کرانے کو حرام قرار دیا اور اسے زنا کے برابر سمجھا۔
- اسلام نے کسی مسلمان سپاہی کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ قیدی عورتوں کی عزت لوٹے۔ ان کو گرفتار کرتے ہی ان پر قبضہ جما لے۔
- اسلام نے قیدی عورت کو مشترکہ ملکیت بھی نہیں بنایا بلکہ اس مشترکہ ملکیت کو حرام قرار دیا۔ اس کے برعکس امیر جو عورت بھی مسلمان کو دیگا وہ اس کی ملکیت ہوگی۔
- اس کے برعکس اسلام نے عورت کو صرف اس کے مالک کے لیے مخصوص کر دیا۔

اس کے علاوہ کوئی مسلمان اس عورت کی طرف نگاہ بد نہیں ڈال سکتا تھا۔

- ان عورتوں کے لیے وہی معاہدہ بھی قائم رکھا کہ عورت مالک میں رقم طے ہوجائے عورت رقم دے دے اور آزاد ہوجائے۔
- اسلام نے یہ دفعہ بھی بنادی کہ اس سے اولاد ہوجائے تو آپ سے آپ آزاد ہوجائے اور اس کا بچہ بھی آزاد۔ لطف یہ ہے کہ یہ بچہ وارث بھی بنے گا۔
- اور سب سے بڑی بات یہ کہ مسلمانوں کو ترغیب دی گئی کہ اللہ کی رضا کے لیے زیادہ سے زیادہ قیدی آزاد کرو۔

یہ ہے اسلامی خدمت۔ آج بھی جب کہ غلامی کے خلاف ساری دنیا متفق ہوچکی ہے اسلام کی گرد کو نہ پہنچ چکی۔ وقتی طور پر مصلحتاً اسلام نے غلام اور لونڈی کے وجود کو برداشت کرلیا تھا بعد میں جب دنیا کی ساری قومیں غلامی کے خلاف راضی ہوگئیں تو اسلام ہی نے سب سے زیادہ خیر مقدم کیا کیونکہ اس نے اپنا لائحۂ عمل پہلے سے یہی بنا رکھا تھا اگر اسلام قیدی عورتوں کو چھوڑ دیتا تو وہ بے چاری کیا کرتیں۔ اپنی عزت بیچ کر سوسائٹی کو گندہ کرتیں جیسا کہ کوریا میں ان عورتوں نے کیا جو لشکریوں کے تصرف میں دی گئی تھیں۔

دوسروں نے خوشنما اور خوبصورت قانون منظور تو کرلیا لیکن کیا ان کے یہاں سے غلامی ختم ہوگئی؟ انھوں نے غریبوں کو برابر کا درجہ دیا؟ الجزائر میں فرانسیسی کیا وحشی پن کرتے ہیں؟ آج سب کو معلوم ہے۔ امریکہ میں حبشیوں کے ساتھ جو کچھ ہورہا ہے اور وہاں آپس میں جو نفرت ہے وہ بھی چھپی نہیں۔ جنوبی افریقہ کے رنگ دار باشندوں کے ساتھ یورپ جو سلوک کرتا ہے وہ اسی پرانے دور کی یادگار نہیں تو اور کیا ہے؟ قانون بنا کر دنیا کو دکھانا کمال نہیں۔ کمال یہ ہے عمل کر کے غلامی

کو برابر کا درجہ دیا جائے۔ آزادی۔ بھائی چارگی۔ برابری کے رنگین لیبل لگا کر کسی چیز کی اندرونی خباثت اور گھناؤنے پن کو چھپانا فریب اور مکاری ہے۔ ابھی کل کی بات ہے تیونس، الجزائر، مراکش میں خوشنما لیبل لگانے والوں نے ہزاروں افراد کو محض اس لیے موت کے گھاٹ اتار دیا کہ وہ آزادی چاہتے تھے۔ اپنے وطن پر اپنی حکومت چاہتے تھے۔ اپنی زبان میں بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ اپنی مرضی کے مطابق اپنے مذہب اور عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ تہذیب جدید نے وہیں نہیں ہر جگہ ان بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگے۔ انھیں غلیظ جگہوں پر رکھ کر سڑا دیا۔ عورتوں کی آبرو لوٹی۔ آپس میں شرط بد بد کر حاملہ عورتوں کے پیٹوں میں سنگینیں ماریں۔ شرط یہی کہ کس کی سنگین کے وار سے سب سے پہلے بچہ باہر آتا ہے۔ بیسویں صدی کی اس دوغلی تہذیب کے علمبرداروں نے یہ سارے گھناؤنے اور خبیث جرم کیے۔ مگر ہر جگہ یہی کہا کہ ہم آزادی، بھائی چارگی اور برابری کا درس دینے نکلے ہیں۔

امریکہ میں ان کے ہوٹلوں اور تفریح گاہوں میں گورے لوگوں کے علاوہ کسی حبشی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ اگر کوئی وحشی ان میں سے کسی ہوٹل میں چلا جائے تو امریکی اُسے اس وقت تک ٹھوکریں مارتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ مر نہ جائے اور پولیس کھڑی تماشا دیکھتی رہتی ہے۔ آج کی تہذیب کی اولاد ایسی گھناؤنی حرکتوں سے داغدار ہے مگر وہ اب پر اصرار کرتے ہیں اور ان کی ترقی پر آنچ نہیں آتی۔ یہی حال انگریز کا ہے۔

اصل کھٹک کیا ہے؟ اسلام کی جو خدمات غلامی کے مٹانے کے سلسلے میں ہیں ان سے تہذیب جدید کے سپوتوں کو یہ کھٹک ہے کہ اسلام میں کہیں سے بھی زنا کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے ہر جگہ پابندی ہے اسی لیے وہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں

یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ و امریکہ و روس اسلام سے ناراض ہیں، اور اُلٹے سیدھے اعتراض کرتے رہتے ہیں اور خود یہ کر رہے ہیں کہ بدکاری اور عصمت فروشی اور چکلہ کو جائز قرار دیا۔ بلکہ اُسے قانونی تحفظ بھی دے دیا۔ چنانچہ اب یہ لعنت مشرق کی طرف بھی پھیلنا شروع ہو گئی۔ نام نئے ہیں۔ لیبل خوبصورت ہیں۔ پردے خوش رنگ ہیں۔ قحبہ گری اور چکلہ کی آمدنی کو تہذیب جدید "معاشرتی ضرورت" کا نام دے رہی ہے۔ زنا آپس میں، رضامندی سے ہو تو یہ "خواہش کا احترام ہے"

اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامی قانون سے اب بھی شکست کھا کر نئی تہذیب قحبہ گری اور چکلہ ختم کرنے والی ہے۔ اس نے ان کا بہت خوبصورت بدل تلاش کر لیا ہے۔ "سوسائٹی گرلز" کو وہ میدان میں لا رہے ہیں۔ سوسائٹی گرلز کا مطلب یہ ہے کہ وہ عورت سامنے لائی جا رہی ہے جو جس سے چاہے اور جو اس سے چاہے جسم بازی کر سکتا ہے۔ پھر ایسے ہوٹل بھی فروغ پا رہے ہیں جہاں بیویوں والے جوڑے سمیت جاتے ہیں اور "بیوی بدل" کی گھناؤنی حرکت رات بھر کرتے ہیں اور صبح پھر اپنے گھر۔ بہت سے ہوٹلوں سے سوسائٹی گرلز سپلائی ہونے لگی ہیں۔ دیکھ لیجیے گا جس دن پانچ فیصد آبادی سوسائٹی گرلز کی اسکیم کی حامی ہو گئی اس دن قحبہ گری اور چکلہ قانوناً بند کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ سوسائٹی گرلز اس سے بہت آگے بڑھ بڑھ کر کارنمایاں انجام دیں گی۔

یہ سوسائٹی گرلز نئی تہذیب میں لذت اور عیاشی کی اندھا دھند تبلیغ کر رہی ہیں۔ بڑی بے باکی سے دوسروں کو جسم سونپ دیتی ہیں۔ ایک شوہر سے نفرت لیکن ہر دن اور ہر رات نہ جانے کتنے شوہر بناتی ہیں۔ ایک شوہر کی بیوی ہونا غلامی اور ہزاروں شوہروں کی بیوی بننا آزادی۔ سوسائٹی گرلز اسے مزدوری کا معاوضہ کہتی ہے

اور مزدوری جائز (کیا خوب!)

چونکہ مذہب خصوصاً اسلام اس راہ کا روڑہ ہے اس لیے اب مذہبوں اور خصوصاً اسلام سے نفرت پھیلانے کا جال پھیلایا جا رہا ہے۔ منشا یہ ہے کہ اسلام میدان سے ہٹ جائے تو پھر آزادی ہی آزادی ہے مگر اسلام ہے کہ اسے موت نہیں آتی۔ وہ ان کی پالیسیوں کا پردہ چاک کر دیتا ہے۔ اشتراکیوں نے لوگوں کو غلام بنانے کا جو طریقہ ایجاد کیا کہ سب کچھ ریاست کا۔ ریاست کی طرف سے منظور شدہ پروگرام کے تحت یوں زندگی گزارو۔ اتنے وقت کام۔ اتنے وقت تفریح وہ بھی ریاست سے منظور شدہ پروگرام کے تحت۔ جو کھانا ریاست کھلائے وہ کھاؤ۔ مطلب یہ کہ ریاست کے سارے لوگ ایک طبقے کے غلام ہیں بالکل اس طرح جیسے جانور کہ انھیں مالک اپنی مرضی سے استعمال کرتا ہے۔ کیا ایسی تاریکی میں ضرورت نہیں کہ اسلام اپنی روشنی کو برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے اس دور میں بنہایت مبارک ہے وہ شخص جو اسلام کی شمع روشن رکھے اور انسانیت کو بربریت سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

عمدہ اور لطیف بات

• عمدہ اور لطیف بات میرے نزدیک یہ ہے کہ جو بات مجھے معلوم نہ ہو اور پوچھی جائے تو میں صاف کہہ دوں۔ "میں نہیں جانتا" (حضرت علیؓ)

دنیا کا مزہ!

• حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے فرمایا کہ "اہل دنیا، دنیا سے ایک خاص مزیدار چیز کا ذائقہ چکھے بغیر چلے گئے۔ لوگوں نے کہا کہ یہاں کی مزیدار چیز کونسی ہے؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کی معرفت" (مرسلہ: بشارت حسین، حیدرآباد)

جب مکڑیوں کے جالوں تلے شادی رچائی گئی

دُنیا میں غالباً سب سے زیادہ حیرت انگیز اور دلچسپ شادی مکڑی کے جالوں تلے انجام پائی۔ اس شادی کا اہتمام مشہور کروڑپتی چارلس ڈیو انڈ نے اپنے دو بیٹیوں کے لئے کیا تھا ان کی عادت یہ تھی کہ وہ اپنے عجیب وغریب کارناموں سے لوگوں کو چونکا کر دیا کرتے تھے۔

چارلس ڈیو انڈ نے بہت سے غلام جمع کرائے اور ایک جنگل کو صاف کرا کر اسمیں صنوبر اور شاہ بلوطوں کے درخت لگوائے اور اس کنارے پر ایک بڑی محل نما حویلی بنوائی۔ ان کی بگھی پر طلائی تاروں سے بنا کپڑا چڑھا ہوا تھا۔

جب اس نے اپنے دو بیٹیوں کی شادی کرنے کا اعلان کیا تو شادی کی تاریخ میں اس نے ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ انہوں نے شادی کی سجاوٹ کے لئے بڑی بڑی مکڑیوں کا ایک جہاز آرڈر دیکر منگوایا اور انہیں سر بفلک صنوبروں اور شاہ بلوطوں کے درختوں پر چھوڑ دیا۔ یہ لاکھوں مکڑیاں شاخوں کے درمیان جالے بنتی رہیں اس دوران چارلس کے غلام اور خادمہ شادی کے انتظامات میں لگے رہے۔

شادی کے دن صبح صبح خادموں نے درختوں کے تلے سڑک پر نرم مخملی قالین بچھانے شروع کئے۔ پھر بڑی بڑی پھونکیوں کے ذریعے سونے اور چاندی کی گرد (دھول) جالوں پر ڈالنا شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ عروسی جلوس کے لئے ایک زرق برق شامیانے کی شکل اختیار کر گئے جو اپنی مثال آپ تھے۔ سڑک کے ساتھ بینڈ باجے بجنے لگے۔ ہزاروں مہمانوں کے لئے انواع واقسام کے لذیذ کھانے اور نادر مشروبات حاضر تھیں۔ مہمان ہفتوں تک دادِ عیش دیتے رہے۔ اب صرف صنوبروں اور شاہ بلوطوں کا بنا ہوا یہ گلیارہ اور حویلی موجود ہیں جو چارلس ڈیو انڈ کی اس پرستانی شادی کے چشم دید واقعات کے شاہد ہیں۔ (از قیوم لدھانی) ●

ظفر اسحاق رشاد

انڈے کا پانی

دو تازہ انڈے کران کی سفیدی نکال کر آدھ سیر پانی میں آہستہ آہستہ ملائیں۔ جب اچھی طرح حل ہو جائے تو ذائقہ کے لیے تھوڑا سا نمک یا شکر ملائیں۔ بچوں کو قے دست آنے کے دنوں میں جب غذا ہضم نہیں ہوتی تو یہ انڈے کا پانی بہت مفید ہوتا ہے اس میں غذائیت بھی ہوتی ہے اور ہضم بھی جلدی ہوتا ہے۔

السی کی چائے

دمہ کھانسی اور پیشاب کی جلن میں السی کی چائے پلایا کرتے ہیں جس کی ترکیب یہ ہے کہ السی کو دھو کر صاف کر کے ایک چائے دانی میں ڈال کر اوپر سے آدھ سیر کھولتا ہوا پانی ڈال کر ڈھک دیں اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ تک پڑا رہنے دیں۔ اس کے بعد چھان کر بقدر ضرورت چینی ملا کر مریض کو دیں مجرب ہے۔

دال کا پانی

مونگ کی دھلی ہوئی دال ایک چھٹانک تین پاؤ پانی میں کسی قدر نمک ملا کر دو تین گھنٹہ تک خوب پکائیں۔ پھر سرد کر کے پانی اتار لیں اور استعمال کرائیں۔

دلیا

عمدہ گیہوں کو صاف کر کے بھنوائیں اور دلوا کر دلیا بنا رکھیں۔ بوقت ضرورت تھوڑا سا گھی میں بھون کر دودھ یا پانی میں پکائیں اور چمچہ سے ہلاتے جائیں۔ نیز قدرے شکر یا نمک ملا کر سرد کر کے مریض کو کھلائیں۔

دودھ انڈا

آدھ پاؤ گرم دودھ میں ایک انڈے

کی زردی پھینٹیں اور قدرے کھانڈ بھی ملالیں
اور مریض کو کھلائیں۔

دودھ سوڈا

اگر مریض خالص دودھ کو ہضم نہ کر سکے تو دودھ کے ساتھ سوڈا ملا کر دینا مفید ہوتا ہے چنانچہ پاؤ بھر جوش کیا ہوا دودھ لے کر اس میں ایک بوتل سوڈا واٹر بقدر ضرورت چینی اضافہ کرکے پلائیں۔

ساگودانہ

ساگودانہ مصفّٰی نصف چھٹانک کو نصف سیر دودھ میں یا پانی میں جوش دیں اور چمچہ سے ہلاتے رہیں۔ نیز تھوڑی سی کھانڈ بھی ملالیں اور ابھی غذا پتلا ہی ہو کر اتار کر مریض کو کھلا دیں۔ مریض کے لیے مفید اور بہتر غذا ہے۔

شوربا چوزہ مرغ

ایک یا دو ماہ کا چوزہ ذبح کرکے آلائش سے پاک کریں اور اس کا باریک قیمہ کرکے ایک قلعی شدہ دیگچی میں ڈال کر اس کے اوپر اس قدر سرد پانی ڈالیں کہ پانی دو تین انگل اوپر تیرتا رہے اس کے بعد نمک ملائیں اور اس دیگچی کے منہ کو ڈھکنے سے بند کرکے آٹے سے اچھی طرح بند کرکے آگ پر رکھیں اور تین چار گھنٹے تک آہستہ آہستہ جوش دیتے رہیں۔ اس کے بعد اتار کر ٹھنڈا کرکے چھان لیں اور مریض کو نیم گرم پلائیں۔

بے میل غذا سے بچیے

• کھٹے پھل اور خشک میوے ایک ساتھ نہ کھائیں۔

• دہی کے ساتھ مولی یا کوئی گرم چیز نہ کھائیں۔

• دہی کے ساتھ بلگری، ستو، گوشت، مچھلی، جامن، مولی یا تیل نہ کھائیں۔

• بھرے پیٹ یا کمزور ہاضمہ والے کو دہی اور کیلا ملا کر نہ کھانا چاہیے۔

• کیلا، اُڑد کی دال، چاول اور دہی ایک ساتھ ملا کر نہ کھانا چاہیے۔

• سرکہ اور چاول ایک ساتھ نہ کھانا چاہیے۔

• آلو ہمیشہ پکا کر کھائیں۔

(بشارت حسین ہاشمی ہمت حیدرآباد)

کتابوں اور رسالوں پر تعارف و تبصرہ

• خبرنامہ (تحریک اسلامی نمبر) مرتب۔ احمد اللہ صدیقی
• ناشر۔ اسلامک لائبریری شمشاد مارکیٹ علی گڑھ۔
• ضخامت ۲۵۶ صفحات۔ سائز ۱۸×۲۲ / ۴ ۔ قیمت پانچ روپیہ

عربی اور انگریزی کے طلباء اور نوجوانوں کی ایک ملی جلی تنظیم ہے جس نے باقاعدہ ایک تحریک کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اس تنظیم یا تحریک کا نام اسلامک موومینٹ آف انڈیا (س.ا.ا.م) اس کا نعرہ ہے "ادخلوا فی السلم کافۃ" اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو۔ اسلام کو ہر شعبہء زندگی میں اپناؤ۔ اس غرض کے لئے س.ا.ا.م اپنے تربیتی اور تنظیمی اجتماعات کرتی رہتی ہے۔ میں نے اس تنظیم کے عربی اور انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دیکھا ہے اور جب ان میں سے کوئی نظر آیا تو دل سے دعا نکلی۔ اے اللہ! اسلام کو ہر شعبہ زندگی میں اپنانے والے اس نوجوان کی مدد کر۔

چونکہ یہ سارے کے سارے نوجوان ہیں انھیں اس بات کا پورا احساس ہے کہ نوجوانی میں جوش زیادہ ہوتا ہے ہوش کم۔ اس لئے وہ اسلامی تنظیموں اور تحریکوں کے ہوشمند بزرگوں سے استفادہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ اسی استفادہ کی غرض سے س.ا.ا.م نے ایک ہفت روزہ اجتماع تربیتی کیمپ کے طور پر منعقد کیا جس میں جماعت اسلامی ہند کے مفکرین کو مدعو کیا گیا تھا۔ ان مفکرین میں سے بارہ حضرات نے شرکت کی۔

تربیتی کیمپ کو کامیاب اور پُر اثر بنانے کے لئے اہل تحریر و تقریر کو موضوعات پہلے سے بتا دیے تھے۔ ان بزرگوں نے بڑے جامع مقالات پیش کیے۔ ان مقالات کو خبر نامہ کی ایک خاص اشاعت "تحریک اسلامی نمبر" میں جمع کر دیا گیا۔ ان کے ساتھ وہ تمام کارروائی بھی دے دی گئی جو تربیتی کیمپ کے دوران عمل میں آئی تھی۔

تحریک اسلامی نمبر کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پروگرام بہت دلچسپ رہا۔ سنجیدہ مقالات کے ساتھ م۔ نسیم صاحب کا ایک مزاحیہ مضمون بھی تھا اور ایک رات مشاعرہ بھی۔ ان سب میں جو کچھ پیش کیا گیا وہ سب وہ تاثرات تھے جو قرآن و حدیث کے مطالعہ سے انسان پر پڑتے ہیں۔ مولانا سید عروج قادری صاحب مدیر زندگی نے "انبیائی تحریکوں کا مطالعہ" کے عنوان سے ایک جامع مقالہ پیش کیا۔ احمد اللہ صدیقی، امان اللہ خاں اور محمد رفعت (صاحبان) نے نوجوانوں کو اسلامی اور غیر اسلامی تحریکوں سے واقف کرایا۔ مولانا جلال الدین انصر صاحب نے بتایا کہ فکری دنیا میں اسلام کی مطلوبہ تبدیلی کس طرح لائی جائے۔ کچھ بزرگوں نے تقریریں کیں۔ درس قرآن و حدیث تربیتی کیمپ میں دیئے گئے۔ یہ سب کا سب مرتب کر کے تحریک اسلامی نمبر میں شامل کر دیا گیا۔ غرضیکہ کسی تنظیم یا تحریک کی رہنمائی کے جس اچھے سے اچھے مواد کی ضرورت محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ سب کچھ اس میں ہے۔ ہمیں امید ہے یہ صرف نوجوان طلبا ہی کے لئے نہیں، ہم سب کے لئے بہت مفید ہے اور ہم سب کو بھی اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ (م)

• ماہنامہ تحریک دہلی کا سلور جوبلی نمبر۔ مرتب گوپال متل۔ مخمور سعیدی۔ پریم گوپال متل صفحات ۸۱۶ سائز ۲۰×۳۰/۸ وزن سوا کلو۔ قیمت ۳۵ روپے۔

جی ہاں! یہ بھاری بھرکم اور نہایت ضخیم سلور جوبلی نمبر ادارہ تحریک کی طرف سے

ہمارے پاس تبصرے کے لئے آیا ہے۔ ہم نے اتنا ضخیم نمبر اب تک نہیں دیکھا۔ صاحبانِ تحریک بڑے عالی ہمت ہیں کہ ایسا نمبر اردو پڑھنے والوں کے لئے شائع کیا۔ یہی نہیں۔ کاغذ سفید عمدہ لگایا ہے۔ ہندوستان کے جتنے چوٹی کے ادیب ہیں سب نے اس میں حصّہ لیا ہے۔ ان سب کے فوٹو بھی شروع میں دے گئے ہیں۔ ہمارے جیسا مصروف آدمی اگر تبصرہ و تنقید کے لئے اسے پڑھے تو شاید اتنا وقت نہ نکال سکے گا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم اسے دیکھتے ہی مرعوب ہو گئے۔ ہم اگر اس نمبر کے صرف عنوان ہی لکھیں تو حجاب کے صفحات متحمل نہ ہوں گے۔ ہم صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ یہ نمبر 35/ میں بہت سستا ہے۔ اردو داں طبقہ کے لئے نہایت مفید اور لائبریریوں کے لئے اہم دستاویز ہے۔ اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ مرتبین جانے پہچانے بزرگ ہیں۔ ان کے نام اس بات کی ضمانت ہیں کہ سلور جوبلی نمبر سلور جوبلی نمبر ہی ہے۔ بس بھائی تبصرہ ہو گیا۔ این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ (م)

● اقبال کی نظمیں (بچوں کے لئے) سید محمد خالد علی نے اقبال کی نظموں میں سے بچوں کے لائق کچھ نظمیں منتخب کیں اور اس مجموعے کا نام رکھا "اقبال کی نظمیں"۔ ادارہ شہادت حق نے اس مجموعہ کو چھاپا۔ اس مجموعے میں نو نظمیں سولہ صفحوں پر مشتمل ہیں۔ قیمت چالیس پیسے ہے۔

اس مجموعے کے مرتب نے نظموں کے انتخاب میں ہندوستان کے ہر شہری کے ذہن کی رعایت رکھی ہے۔ چھ نظمیں اخلاقی ہیں۔ دو قومی اور ایک ترانۂ ملی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ سولہ صفحہ کا مجموعہ مقبول عام ہوگا۔ ہر نظم میں مشکل الفاظ آئے ہیں۔ مرتب نے نظم کے بعد ان کے معنی لکھ دئے ہیں۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ بچوں کے لئے

جو آسان نظمیں کہی جانی چاہئیں ان میں کیا صفات ہونی چاہئیں تو میرا جواب یہ ہو گا کہ نظموں میں جو مضمون اور خیال پیش کیا جائے وہ بچوں کے دلچسپ اور مفید ہو اور اس میں ایسی آسان زبان استعمال کی جائے کہ نظم کے بعد الفاظ مشکلہ کے معنی لکھنے کی ضرورت نہ پڑے۔ جیسے یہ اشعار:

- چوہے سب بلی کے ڈر سے بھاگ گئے ہیں میرے گھر سے ——— یا
- ایک خدا ہے، ہے نا ایک؟ جی جی جی جی جی جی جی

اس طرح کے آسان اشعار مجموعے میں نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بچوں کے لئے نظمیں لکھنے کا سلیقہ دو شاعروں کو عطا فرمایا۔ ایک مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی مرحوم اور دوسرے محمد شفیع الدین نیر مرحوم۔ ان دونوں کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بچوں کی عمروں اور صلاحیت کو مدنظر رکھ کر نظمیں کہیں۔ لوور کلاسز کے بچوں کے لئے الگ پرائمری کلاسز کے بچوں کے لئے الگ اور مڈل کلاسز کے بچوں کے لئے الگ۔ (م)

نعت

کیوں نہ ہم دل سے ہوں قربانِ رسولِ عربی   جب خدا خود ہے ثنا خوانِ رسولِ عربی
ناز ہے شافعِ محشر کی غلامی پہ ہمیں   فخر کرتے ہیں گدایانِ رسولِ عربی
جاں چلی جائے مگر آنچ نہ آئے ان پر   ایسے شیدا ہیں محبانِ رسولِ عربی

(انور یوسفی)

مالک پرنٹر پبلیشر و ایڈیٹر محمد اسلحق مائل خیرآبادی مطبوعہ جے۔ کے پرنٹرز دہلی مقام اشاعت محل ملہ اسکی محوطان رام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عقیدۂ شفاعت

شفاعت کے معنی ہیں "سفارش"۔ سفارش کا مطلب ہم آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یہ کہ ایک شخص کسی بڑے آدمی سے اپنا کام نکالنا چاہتا ہے لیکن خود اپنے میں اتنی سکت نہیں پاتا کہ اس بڑے آدمی کو ہموار کر سکے یا اسے منا کر کام کرا لے۔ ایسے موقع پر وہ شخص کسی آدمی کو تلاش کرتا ہے جو اس بڑے آدمی کا رشتہ دار یا دوست ہو یا اس کا اس پر دباؤ ہو۔ ایسے آدمی کو ڈھونڈ کر اس سے کہتا ہے کہ آپ فلاں بڑے آدمی سے کہہ دیجئے کہ وہ میرا یہ کام کر دے تو یہ آدمی جو بڑے آدمی سے جا کر کہے گا یہ سفارشی ہوگا اور یہ سفارشی جو کچھ کہے گا اسے "سفارش" کہیں گے۔ مثلاً:

- ایک ملازم ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا تبادلہ فلاں جگہ سے فلاں جگہ ہو جائے لیکن اس کا افسر اس کی درخواست پر توجہ نہیں دیتا تو ملازم اس افسر کے کسی دوست یا رشتہ دار کو سفارشی بناتا ہے یا کسی وزیر یا ایم ایل اے کو وہ جا کر افسر سے کہتا ہے کہ اس بیچارے کا تبادلہ فلاں جگہ کر دیجئے۔
- ایک ملزم ہے۔ اس نے ایک جرم کیا۔ پولیس نے اسے پکڑا۔ مقدمہ عدالت میں پہنچا۔ ملزم نے جج صاحب کی بیوی یا جج صاحب کے کسی دوست یا پھر کسی بڑے آدمی کو سفارشی بنایا اور اس نے جج صاحب سے جا کر کہا کہ یہ آدمی تو بڑا نیک ہے، اس پر جھوٹا الزام ہے، اسے سزا نہیں دینا چاہیئے۔ بری کر دینا چاہیئے۔
- بڑے لوگوں میں جو سفارشی بنتے ہیں۔ یہ سفارشی آپس میں سفارش کا ادلا بدلہ بھی کرتے ہیں کہ ہم جو سفارش کرتے ہیں اس کے بدلے میں آپ ہم سے کوئی کام نکلوا لیں
- سفارشوں کے ذریعہ رشوت بھی دی جاتی ہے۔

ان تین چار مثالوں سے معلوم ہوا کہ سفارش میں رشتہ داری کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ سفارش کا لین دین

(ادلا بدلا) بھی ہوتا ہے۔ سفارش کے ذریعہ رشوت بھی چلتی ہے اور یہ کہ ملزم کی طرف سے جھوٹ بھی بولا جاتا ہے اور افسر یا حاکم کو یقین دلایا جاتا ہے کہ ملزم ایسا نہیں۔

دنیا میں سفارش سے اس طرح کام نکالے جاتے ہیں۔ اس طرح کی سفارش کا عقیدہ بندے اور خدا کے درمیاں ہوتا ہے تو اسے شفاعت کہتے ہیں۔ یہ شفاعت اور سفارش اس وقت ہوگی جب آخرت میں اللہ تعالیٰ بندوں سے ان کے اس دنیا میں کئے گئے کاموں کا حساب لے گا۔ آخرت میں شفاعت کے بارے میں جو عقیدہ لوگوں میں پایا جاتا ہے اس کے بارے میں مختصر طور سے سنئے۔

○ یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہم (یعنی یہود) نبیوں کی اولاد اور ان کے پیارے ہیں اور نبی اللہ کے پیارے ہوتے ہیں اس لئے اللہ کے پیارے اپنے پیاروں کی سفارش کر کے آخرت میں بخشوالیں گے اور ہم جہنم کے عذاب سے بچ جائیں گے۔ بالفرض ہمارا کوئی ایسا گناہ ہے جس کی سزا ملنی ہی چاہیئے تو ہم چند دن دوزخ میں سزا بھگتیں گے اس کے بعد جنت تو ہمارے لئے ہے ہی۔ قرآن کریم میں یہودیوں کے اس عقیدے کے بارے میں جگہ جگہ تنقید کی گئی ہے۔ ہم صرف ایک آیت کا حوالہ دیتے ہیں۔ سورہ بقرہ آیت ۸۰ ملاحظہ ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٠﴾ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٨١﴾

وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز چھونے والی نہیں۔ لیکن یہ کہ چند روز کی سزا مل جائے تو مل جائے۔ ان سے پوچھو۔ کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے جس کے خلاف وہ نہیں کر سکتا یا یہ بات ہے کہ تم اللہ کے ذمہ ڈال کر ایسی باتیں کہہ دیتے ہو جن کے بارے میں تم کو علم نہیں ہے کہ اس نے اس کا ذمہ لیا ہے۔ آخر تم کو دوزخ کی آگ کیوں نہ چھوئے گی۔ جو بھی بدی کمائے گا اور اپنی خطاؤں میں گھرا رہے گا۔ وہ دوزخی ہے اور دوزخ ہی میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

○ عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ کے بیٹے حضرت عیسیٰ مسیح نے سولی پر چڑھ کر سارے عیسائیوں کے گناہوں

کا کفارہ ادا فرما دیا۔

- مشرکوں کا عقیدہ ہے کہ ہمارے یہ دیوی دیوتا اللہ کی اولاد ہیں۔ ہم ان کو اس لئے پوجتے ہیں کہ یہ ہم سے خوش ہو جائیں اور پھر ہمارے لیے اللہ کے حضور اٹھ جائیں کہ بخش دے۔

مشرکوں کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ یہ بزرگ جن کو خوش کرنے کے لئے چڑھاوے چڑھاتے ہیں، اللہ سے ہمیں بخشوا لیں گے۔ یہ اللہ کے پیارے ہیں۔ اللہ ان کی بات نہ ٹالے گا۔

حیرت یہ ہے کہ یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکوں کے ان عقیدوں پر قرآن میں بڑی سختی سے تنقید کی گئی ہے پھر بھی وہ مسلمان جو قرآن کو اللہ کا کلام سمجھتے ہیں ان میں سے بھی بہت سے لوگوں میں اس طرح کے عقیدے پائے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کی تعلیم نہیں جانتے۔ ان سے پیر جی اور حضرت جی صاحبان جو کچھ کہہ دیں وہی ان کا عقیدہ ہے۔ ان کمانے والے نقلی پیروں اور بناوٹی حضرتوں نے جاہلوں میں اس طرح کے غلط عقیدے پھیلا دیئے ہیں۔

- پیر جی اور حضرت جی کے مرید ہو جاؤ۔ قیامت کے دن پیر جی کے جھنڈے تلے ہوگے اور جہنم کی آگ تمہارا کچھ نہ کر سکے گی۔
- پیر جی اور حضرت جی صاحبان اللہ کے حضور اپنے مریدوں کی بخشش کے لئے اڑ جائیں گے اور اللہ تعالیٰ انکی ضد کو پورا کرے گا۔
- سیدوں میں ایک گروہ ایسا پایا جاتا ہے جو کہتا ہے کہ ہمیں دوزخ کی آگ جلا نہیں سکتی کیونکہ آل رسول ہیں۔
- امام حسین ؓ نے کربلا کے میدان میں شہید ہو کر امت کے گناہوں کا کفارہ ادا فرما دیا۔

قرآن اس طرح کی یہودیت زدہ، عیسائیت زدہ اور شرک زدہ عقیدت مندیوں کی دھجیاں اڑاتا ہے قرآن میں ایک جگہ نہیں جگہ جگہ ان عقیدوں پر تنقید اور تنقیص موجود ہے۔ ہم وہ ساری تنقیدیں اپنے مضمون میں پیش کرنے سے معذور ہیں ہاں

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ

وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿۴۸﴾

اور ڈرو اس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا۔ نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔

• سورہ بقرہ آیت ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶ قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ
دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا
قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ
عَلَىٰ حَيَاةٍ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ
بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿۹۶﴾

ان سے کہو کہ اگر یہ سچ ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک آخرت کا گھر (جنت) تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے لئے ہے تب تو تم کو چاہیے کہ موت کی تمنا کرو اگر تم (اپنے اس عقیدے میں) سچے ہو۔ (اے نبیؐ) یقین جانو کہ یہ کبھی اس (موت) کی تمنا نہ کریں گے اس لئے کہ اپنے ہاتھوں جو کچھ کما کر انھوں نے وہاں بھیجا ہے (اگر واقعی ان گناہوں کو سوچیں تو ہرگز وہاں جانے کی تمنا نہ کریں) اللہ ان ظالموں کو خوب جاننے والا ہے۔ تم انھیں سب سے بڑھ کر جینے کا حریص (لالچی) پاؤ گے۔ وہ تو اس معاملے میں مشرکوں سے بھی آگے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ کسی طرح ہزاروں برس جیے حالانکہ لمبی عمر کسی حالت میں ان کو عذاب سے دور نہیں کر سکتی۔ اللہ ان کے کرتوت دیکھ رہا ہے۔

سورہ بقرہ آیت (۱۱۱) وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ
تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۱۱﴾

ان کا کہنا ہے کہ کوئی جنت نہ جائے گا۔ جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال میں) عیسائی نہ ہو۔ (دراصل) یہ ان کی تمنائیں ہیں ان سے کہو، اپنی دلیل پیش کرو اگر اپنے دعویٰ میں سچے ہو۔

• اب قرآن کریم کی ایک بھرپور تنقید ملاحظہ ہو جس کی لپیٹ میں اس طرح کا عقیدہ رکھنے والے مسلمان بھی آ جاتے ہیں ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ٦٢

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾

یقین جانو نبیؐ کو ماننے والے ہوں یا یہودی ہوں۔ عیسائی ہوں یا صابی ہوں۔ جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔

اللہ کے نبیوں کی گواہی

جس طرح اوپر میں نے قرآن سے ایک مضمون کی صرف ایک ایک مثال لی۔ اسی طرح اللہ کے نبیوں کی گواہی اور شفاعت کے بارے صرف دو پیغمبروں کو پیش کروں گا۔

(١) سورہ مائدہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے اس طرح عرض کرتے ہیں۔

وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿١١٧﴾

میں اسی وقت تک ان کا نگران تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا جب آپ نے مجھے واپس بلا لیا تو آپ ان پر نگران تھے اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر نگران ہیں۔

(٢) اللہ کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جب سورہ شعراء کی آیتیں ٢١٤، ٢١٥، ٢١٦ نازل ہوئیں یعنی یہ کہ :-

" (اے نبیؐ) اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ تمہاری پیروی کریں ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ لیکن اگر وہ تمہاری نافرمانی کریں تو ان سے

کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں بری ہوں۔"

تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اپنے دادا کی اولاد کو پکارا:۔

"اے عبدالمطلب کی اولاد! اے عباس! (حضور کے چچا) اے صفیہ رسول کی پھوپھی! اے فاطمہ محمد کی بیٹی! تم لوگ (جہنم کی) آگ سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرلو۔
میں خدا کی پکڑ سے تم کو نہیں بچا سکتا۔ البتہ میرے مال میں سے تم لوگ جو کچھ چاہو مانگ سکتے ہو۔

پھر آپ نے صبح سویرے صفا کے سب سے اونچے مقام پر کھڑے ہو کر پکارا " یا صباحاہ " (ہائے صبح کا خطرہ) اے قریش کے لوگو! اے بنی کعب بن لوئی! اے بنی مرہ! اے آل قصی! اے بنی عبد مناف! اے بنی عبد شمس! اے بنی ہاشم! اے آل عبدالمطلب! اس طرح قریش کے ایک ایک قبیلے اور خاندان کا نام لے لے کر آپ نے آواز دی۔

عرب میں قاعدہ تھا کہ جب صبح تڑکے کسی بھیانک حملے کا خطرہ ہوتا تو جس شخص کو بھی اس کا پتہ چل جاتا وہ اسی طرح آواز دینا شروع کر دیتا اور لوگ اس کی آواز سنتے ہی ہر طرف سے دوڑ پڑتے چنانچہ حضور کی اس آواز پر سب لوگ گھروں سے نکل آئے اور جو خود نہ آسکا اس نے اپنی طرف سے کسی کو خبر لانے کے لیے بھیج دیا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا " لوگو! اگر میں تمہیں بتاؤں کہ پہاڑ کے دوسری طرف ایک بھاری لشکر ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے تو کیا میری بات سچ مانو گے؟" سب نے کہا " ہاں ہمارے تجربے میں تم کبھی جھوٹ بولنے والے نہیں رہے ہو" آپ نے فرمایا " اچھا تو میں خدا کا سخت عذاب آنے سے پہلے تم کو خبردار کرتا ہوں۔ اپنی جانوں کو اس کی پکڑ سے بچانے کی فکر کرو۔ میں خدا کے مقابلے میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ قیامت میں میرے رشتہ دار صرف متقی ہوں گے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ نیکیاں لے کر آئیں اور تم لوگ دنیا کا وبال سر پر اٹھائے ہوئے آؤ۔ اس وقت تم پکارو گے یا محمد! مگر میں مجبور ہوں گا کہ تمہاری طرف سے منہ پھیر لوں۔ البتہ دنیا میں میرا تمہارا خون کا رشتہ ہے اور یہاں میں تمہارے ساتھ ہر طرح کی صلہ رحمی کروں گا۔"

یہ ہے وہ بے لاگ بات جو اللہ کے دو عظیم پیغمبروں نے صاف صاف فرما دی۔ وہ لوگ جو سید ہونے پر پھولے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ جہنم کی آگ انھیں جلا سکتی۔ وہ لوگ جو پیروں اور حضرت جی کی باتوں میں مست ہیں، سب سوچیں۔

بھی کے گھرانے تک کی تو رعایت نہیں ہے۔ کسی کا نسب اور کسی کے ساتھ آدمی کا رشتہ ناتہ آخرت میں کچھ کام نہیں آسکتا اس لئے اپنا عقیدہ اور عمل درست رکھنا چاہیئے۔

شفاعت اور دنیاوی سفارش میں فرق

دنیا میں بادشاہوں، حاکموں، ججوں، افسروں سے سفارشی جو سفارش کرتے ہیں تو یہاں سارے حاکم اور جج وغیرہ انسان ہوتے ہیں۔ انسان رشتہ ناتہ کا اثر لیتا ہے۔ دباؤ اور لالچ میں آجاتا ہے۔ سفارشی حاکم اور افسر سے جھوٹ بھی بول سکتے ہیں کیونکہ انسان ہر بات کا جاننے والا تو ہے نہیں لیکن آخرت میں شفاعت کا معاملہ براہ راست اللہ سے ہے اور اللہ جو علیم و خبیر ہے، ہر بات جاننے والا ہے اور ہر بات کی خبر رکھنے والا ہے۔ اس سے کچھ بھی چھپا نہیں اور نہ چھپایا جا سکتا ہے۔ پھر اس دن اقتدار سارا کا سارا اللہ کا ہوگا۔ اس دن کس کی مجال ہے کہ دم مار سکے۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ ۔ سورہ انفطار آیت ۱۹

اس دن کسی شخص کے لیے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہوگا۔ فیصلہ اس دن اللہ کے اختیار میں ہوگا۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ ﴿٩﴾ فَمَا لَهُ مِن قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ ﴿١٠﴾ سورہ طارق آیت ۹،۱۰

جس روز لوگوں کے چھپے بھیدوں کی جانچ پڑتال ہوگی اس وقت انسان کے پاس نہ خود اپنا کوئی زور ہوگا اور نہ کوئی اس کی مدد کرنے والا ہوگا۔

سورہ یونس آیت ۱۸ میں یوں ہے:۔ یہ لوگ اللہ کے سوا ان کی پوجا کرتے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ فائدہ اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہوں گے۔ (اے محمد ﷺ) ان سے کہو کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے، نہ زمین میں۔

سورہ انعام آیت ۵۱ میں ہے :۔

"اے محمد ﷺ! تم اس (قرآن) کے ذریعہ ان لوگوں کو نصیحت کرو جو اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے سامنے کبھی اس حال میں پیش کیے جائیں گے کہ اس کے سوا وہاں کوئی (ایسا اقتدار والا)

نہ ہو گا جو ان کا حامی و مددگار ہو یا ان کی سفارش کرے۔ شاید وہ اللہ سے ڈریں۔

سورہ روم آیت ۱۱، ۱۲، ۱۳ میں ہے:-

" اللہ ہی خلق کی ابتدا کرتا ہے پھر وہی اسے دہرائے گا پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے اور جب وہ گھڑی آکھڑی ہوگی اس دن مجرم ہکا بکا ہو کر رہ جائیں گے۔ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ان کا سفارشی نہ ہوگا۔

سورہ سجدہ آیت ۴ میں ہے:-

اس کے سوا کوئی تمہارا سرپرست اور سفارشی نہیں پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے۔

سورہ زمر آیت ۴۳، ۴۴ میں ہے:-

کیا اس خدا کو چھوڑ کر ان لوگوں نے دوسروں کو سفارشی بنا رکھا ہے؟ ان سے کہو کہ کیا وہ سفارش کریں گے چاہے ان کے اختیار میں کچھ نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں۔ (اے نبی) کہو، سفارش ساری کی ساری اللہ کے بس میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اس کے لئے ہے پھر اس کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے۔

سورہ مومن آیت ۱۸، ۱۹، ۲۰ میں ہے۔

" (اے نبی) ڈرا دو ان لوگوں کو اس دن سے جو قریب آلگا ہے جب کلیجے منہ کو آرہے ہوں گے اور لوگ چپ چاپ غم کے گھونٹ پیئے کھڑے ہوں گے۔ ظالموں کا نہ کوئی سرگرم دوست ہوگا اور نہ سفارشی جس کی بات مانی جائے۔ اللہ نگاہوں کی چوری تک جانتا ہے اور وہ بھید بھی جو سینوں میں چھپا رکھے ہیں اور اللہ ٹھیک ٹھیک بے لاگ فیصلہ کرے گا اور جن کو اللہ کے سوا یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں۔ بے شک اللہ ہی سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

سورہ انعام آیت ۹۰ میں ہے:-

لو، اب تو تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے تم کو پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا، جو کچھ ہم نے تم کو دنیا میں دیا تھا وہ سب تم پیچھے چھوڑ آئے اور اب ہم تمہارے ساتھ ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے بارے میں تم سمجھتے تھے کہ تمہارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے۔ تمہارے آپس کے سارے تعلقات ختم اور وہ سب تم سے گم ہو گئے۔

سورہ انعام آیت ۷۰ میں ہے:۔

اور (اے محمدؐ) یہ قرآن سنا کر انھیں نصیحت اور آگاہ کرتے رہو کہ کہیں کوئی شخص اپنے کیے کرتوتوں کے وبال میں نہ پھنس جائے اور پھنسے بھی تو اس حال میں کہ اللہ سے بچانے والا کوئی سرپرست اور سفارشی نہ ہو اور اگر وہ کوئی چیز بدلے میں دے کر چھوٹنا چاہے تو وہ اس سے قبول نہ کی جائے کیونکہ ایسے لوگ تو خود اپنی کمائی کے نتیجے میں پکڑے جائیں گے۔

کسی کی مجال نہیں ——— اِلَّا

شفاعت کے بارے میں اوپر بہت سی آیتوں میں سے جو آیتیں پیش کی گئیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ حشر کے میدان میں کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی کی سفارش کر سکے۔ وہاں کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۔ دراصل بات یہ ہے کہ وہاں ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی۔ منظر ایسا ہولناک ہوگا کہ ہر شخص چاہے گا کہ وہ جہنم سے بچ جائے چاہے سارے لوگ دوزخ میں جھونک دیئے جائیں۔ قرآن میں ہے کہ جہنم اپنی ساری ہولناکیوں کے ساتھ سامنے لائی جائے گی۔

اب ہم کچھ ایسی آیتیں پیش کریں گی جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ دوسرے کسی کی سفارش کر سکے الّا یہ کہ اللہ کسی کو اجازت دے۔

اللہ کسی کو اجازت دے یہ اس جملے کی تفسیر میں علماء نے یہ لکھا ہے کہ اس دن اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کا اعزاز بڑھائے گا۔ اس دن ایک بڑا اعزاز یہ ہوگا کہ اللہ کے پسندیدہ بندے اللہ کی طرف سے اجازت پا کر اس گناہگار کی سفارش کریں گے جس کی طرف اللہ اشارہ فرمائے گا لیکن یہ یاد رکھیے کہ اللہ شرک کرنے والوں

کے بارے میں یہ اشارہ ہرگز نہیں کرے گا کیونکہ مشرک کسی حال میں نہیں بخشا جائے گا چونکہ شفاعت کا غلط عقیدہ انسان کو شرک میں مبتلا کر دیتا ہے اس لیے جسے فکر ہو کہ وہ قیامت کے دن اللہ کے پسندیدہ بندوں کی سفارش پائے۔ وہ اس دنیا میں شرک سے پاک ہو جائے۔ ملاحظہ ہو:-

سورہ بقرہ آیت ۲۵۵

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ ــــــــ اِلَّا بِاِذْنِہٖ

کون ہے جو اس (اللہ) کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔

• سورہ یونس آیت ۳ میں ہے:-

مَا مِنْ شَفِیْعٍ ــــــــ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِہٖ ط

کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہے لیکن اس (اللہ) کی اجازت کے بعد کر سکتا ہے۔

• سورہ ہود آیت ۱۰۵ میں فرمایا:-

یَوْمَ یَاْتِ لَا تَکَلَّمُ نَفْسٌ ــــــــ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ط

کسی کو بات کرنے کی مجال نہ ہوگی لیکن یہ کہ اس (اللہ) کی اجازت پاکر عرض کرے۔

اس جگہ ایک عالم کا یہ نوٹ بھی پڑھ لیجیے تو مناسب رہے گا:-

"یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ اللہ کے ہاں کوئی پیر فقیر یا کوئی اگلا پچھلا بزرگ یا کوئی جن یا فرشتہ ایسا زور آور ہے کہ تم چاہے کچھ ہی کرتے رہو، وہ تمہاری نذروں اور نیازوں کی رشوت لے کر تمہیں تمہارے برے اعمال کی پاداش میں بچا لے گا۔" (تفہیم القرآن جلد دوم ص۴۴۹ حاشیہ نمبر ۱۹ سورہ رعد)

• سورہ طہٰ آیت ۱۰۹ تا ۱۱۰ (عربی عبارت زیادہ ہے اس لئے صرف ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے)

"اس روز سب پکارنے والے کی پکار پر سیدھے چلے آئیں گے کوئی اکڑ نہ دکھا سکے گا اور ساری آوازیں رحمٰن (اللہ) کے آگے دب جائیں گی۔ ایک سرسراہٹ کے سوا تم کچھ نہ سنو گے! اس روز شفاعت کچھ فائدہ نہیں دے گی لیکن یہ کہ کسی کو رحمان اس کی اجازت دے۔ اور اس کی بات سننا پسند کرے۔

وہ اللہ لوگوں کا اگلا پچھلا سب حال جانتا ہے اور دوسروں کو اس کا پورا علم نہیں ہے

سورہ نبا، آیت ۳۸ میں اس طرح ہے :-

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا

"وہ دن جبکہ روح (حضرت جبریل) اور فرشتے صف باندھے کھڑے ہوں گے۔ وہ ذرا بھی بات نہ کر سکیں گے صرف وہی بول سکے گا جسے رحمٰن اجازت دے گا۔
(اور یہ بھی یاد رکھو کہ) وہ (اجازت پاکر) ٹھیک بات کہے گا۔"

• سورہ انبیاء آیت ۲۸ میں ہے :-

وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ﴿۲۸﴾

اور وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے سوائے اس شخص کے جس کے حق میں سفارش سننے پر راضی ہو اور وہ اس کے خوف سے ڈرے سہمے رہتے ہیں۔

• سورہ نجم آیت ۲۶ ملاحظہ ہو۔ فرمایا :-

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَّأْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ۝

کتنے ہی فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتی لیکن اس صورت میں کہ اللہ سے اجازت لینے کے بعد کی جائے اور ایسے شخص کے حق میں کی جائے جس کے لئے وہ (اللہ) سفارش سننا چاہے اور پسند کرے۔

میرے خیال میں قرآن کی کافی آیتیں آگئیں جن سے شفاعت کا مسئلہ سمجھ میں آسکتا ہے۔ بیچ بیچ میں وہ باتیں پیش کر دی گئیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شفاعت کے بارے میں فرمائی ہیں اور وہ باتیں بھی جن کی بنا پر شفاعت کا غلط مطلب سمجھ کر لوگ ایک جھوٹی سی آس لگائے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی شخص اور سچے

سی آیتوں کو دیکھنا چاہتا ہے وہ قرآن کریم اٹھا کر اس فہرست کے مطابق مطالعہ کرے اور خود فیصلہ کرلے۔

سورہ بقرہ آیت ۴۸ ۔ سورہ بقرہ آیت ۱۲۳ ۔ سورہ بقرہ آیت ۲۵۵ ۔ (پوری آیۃ الکرسی)

سورہ بقرہ ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱ ۔ سورہ بقرہ ۱۶۳ ۔ سورہ انعام ۵۱ ۔ سورہ انعام ۷۰

سورہ ہود ۲۱ ۔ سورہ ہود ۱۰۵ ۔ سورہ رعد ۱۱ ۔ سورہ طٰہٰ ۱۰۸ ۔ ۱۰۹ ۔ ۱۱۰

سورہ انعام ۹۴ ۔ سورہ یونس آیت ۳ ۔ سورہ اعراف ۵۳ ۔ سورہ توبہ ۸۰ ۔ سورہ یونس ۱۸

سورہ شعراء ۱۰۰ ۔ ۱۰۱ ۔ ۱۰۲ ۔ سورہ عنکبوت ۲۲ ۔ ۲۵ سورہ سجدہ ۔ ۴

سورہ سبا، ۲۳ ۔ سورہ زمر ۴۴ ۔ سورہ مومن ۱۸ ۔ ۱۹ ۔ ۲۰ ۔ سورہ زخرف ۸۶

سورہ یٰسین ۲۳ ۔ سورہ نجم ۲۶ ۔ سورہ منافقون ۶ ۔ سورہ مدثر ۴۸ سورہ نبا ۳۸

سورہ انفطار ۱۹ ۔ سورہ طارق ۱۰ ۔

ہمیں امید ہے کہ جو شخص سوچ سمجھ کر ان آیتوں کو پڑھے گا اس کے سامنے شفاعت کا مسئلہ نکھر کر آجائے گا اور کسی طرح کا شک وشبہ نہ رہے گا۔

اس کے بعد ان لوگوں کے لئے کچھ بشارتیں ہیں جن کا دامن شرک سے تو پاک ہے لیکن ایسے گناہ گار ہیں۔ کہ آخرت کے دن ان کے گناہ ان کی نیکیوں کو دبالیں گے۔ یہ بشارتیں اس طرح کی ہیں۔

• جس نے "لا الٰہ الا اللہ" کہہ دیا وہ جنت میں داخل ہو گیا۔

• "لا الٰہ الا اللہ" ایک قلعہ ہے، جو اس قلعہ میں آگیا وہ (جہنم سے) محفوظ ہو گیا۔

• جس نے اپنی تین یا دو بیٹیوں (بہنوں) کو اسلامی تعلیم وتربیت دے کر دیندار گھرانے میں شادیاں کر دیں وہ جنت کا حقدار ہو گیا۔ (ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اگر حضور سے ایک کے بارے میں پوچھا جاتا تو آپ یہی فرماتے)

• جس بیوہ عورت (حدیث میں سوکھی ساکھی اور پریشان حال کہا گیا ہے) نے محض اللہ کے لئے اپنے بچوں کی دینی تربیت کی خاطر نکاح نہ کیا وہ جنت میں رسول اللہ کے ساتھ ہو گی۔

• جس کے بچے کم عمری میں (نابالغی) میں وفات پا جائیں اور وہ صبر کرے تو وہ بھی جنت میں ہو گا۔

• جس کی دو پیاری چیزیں (اشارہ دونوں آنکھوں کی طرف ہے) اللہ تعالیٰ لے لے اور وہ صبر کرے تو وہ جنتی ہوگا۔

• معصوم متوفی بچے جنت کے دروازے پر مچل جائیں گے اور کہیں گے کہ والدین کے بغیر جنت میں نہ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی سفارش سنے گا۔

• اللہ تعالیٰ جنتیوں کو ان کے خاندان کے ساتھ رکھے گا۔

• قرآن اور روزے قیامت کے دن سفارش کریں گے اور اللہ ان کی سنے گا۔

• احادیث میں بہت سی اخلاقی باتوں کے کرنے کے بارے میں جنت کی بشارت دی ہے مثلاً ایک شخص نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا دیا۔ مثلاً ایک شخص نے ایک بھوکے کو کھانا کھلا دیا۔ یا مثلاً جنت کا آرزومند کون اس عورت سے شادی کرتا ہے جو یا مثلاً ماں باپ کا فرمانبردار جنتی۔ یا مثلاً عورتوں کے بارے میں حضورؐ نے بہت سی خوبیوں پر جنت کی بشارت دی ہے۔

یہ فہرست بہت لمبی ہے۔ یہ ساری حدیثیں ایمانیات سے متعلق ہیں یا اخلاق سے یا عمل سے ان کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ہرگز نہ بھولیں جو قرآن نے کہی ہے یعنی اِلَّا بِاِذْنِہٖ ط یعنی سب اللہ کی اجازت سے ہوگا۔ یہ جو کہا گیا کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا وہ جنت میں داخل ہوگیا۔ اس کے بارے میں علماء نے "بالقلب" کا لفظ بھی کہا ہے یعنی اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس نے دل سے لا الٰہ الا اللہ کہا۔ دل سے کہنے کا مطلب یہ لیا ہے کہ پھر اس نے شرک نہیں کیا۔ اور یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا کہ جو شخص شفاعت کے غلط معنی لے کر اس طرح کے عقائد رکھے جو اس مضمون میں بیان ہوئے۔ یعنی جو یہودیوں اور عیسائی کے عقیدوں سے ملتے ہیں تو وہ شرک میں لت پت ہے۔

یہ بھی یاد رکھئے، جنت کے دروازے پر مچلنے والے معصوم بچوں اور بیٹیوں کے بارے میں جو حدیثیں آئی ہیں ان سب کا مطلب بھی یہی ہے کہ بشرطیکہ وہ والدین مشرک نہ ہوں۔ اسی طرح جنتیوں کو خاندان کے وہی لوگ ملیں گے جو شرک سے پاک ہوں گے۔

لب فرمایئے! اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرے اور وہ قشقہ کھینچے، دیر میں بیٹھے، مشرکانہ منتروں کا جاپ کرے۔ پنڈتوں اور رمالوں سے غیب کی باتیں پوچھے اور ان پر یقین کرے۔ یہودیوں کی طرح یہ عقیدہ رکھے کہ ہم تو بخشے ہی جائیں گے کیونکہ ہمارا سلسلہ ارادت فلاں ابن فلاں حضرت سے ہے۔ عیسائیوں کی طرح یہ عقیدہ رکھے کہ امام حسینؓ نے میدان کربلا میں شہید ہو کر ہمارے گناہوں کا کفارہ کر دیا۔

دراصل شفاعت کے غلط عقیدے نے لوگوں کو آخرت کی باز پرس سے بے کھٹکے کر رکھا ہے۔ شفاعت کے بارے میں غلط عقیدہ رکھنے والے جنت سے مطمئن ہو کر دنیاداری اور بدکرداری میں ایسے پھنس جاتے ہیں گویا وہ رحمان کے بندے نہیں شیطان کے بندے اور ایجنٹ ہیں۔ ایسے لوگوں کا نہ تو ایمان ایمان ہے اور نہ ان کا کردار کردار۔ وہ ایمان دار اور صاحب کردار ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ پیر جی اور حضرت جی نے انہیں جنت کا ٹھیکیدار بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں غلط عقیدوں اور شیطان کے ایجنٹوں سے بچائے۔

میرے پسندیدہ اشعار

از: بشارت جمیل ہاشمی

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات ⁘ کلی نے یہ سن کر تبسم کیا — میر تقی میرؔ

آہ جب دل سے نکالی جائیگی ⁘ کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی — توفیق

اللہ اللہ تیرے غم کی وسعتیں ⁘ کوئی عالم درد سے خالی نہیں — جگرؔ مراد آبادی

جہاں ہر چیز پتھر بن گئی ہے ⁘ اک ایسے شہر میں حیران کھڑا ہوں — جامیؔ

بس توقع پہ کسی کو دیکھیں ⁘ کوئی تم سے بھی حسیں تر ہوگا — احمد ندیم قاسمی

خالی نہیں ہے خواہش دل سے کوئی بشر ⁘ جاتے ہیں سب جہان سے اک آرزو کے ساتھ — میر تقی میر

زہر ہے اس قوم کے حق میں مئے افرنگ ⁘ جس قوم کے بچے نہیں خود دار و ہنرمند — علامہ اقبال

جماعت اسلامی ہند

Jamaat-e-Islami Hind

HALQA-E-RAJASTHAN
... GANJ BAZAR JAIPUR

Ref. No.

مخدوم و محترم جناب مائل صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

مزاج گرامی؟ — شاید آپ کے علم میں یہ بات نہ آسکی ہوگی کہ محترم امیر حلقہ مولانا مظہر الحق صاحب مدظلہ پر اپریل کو دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اللہ نے اپنا فضل و کرم فرمایا اور مرض پر قابو پانے میں کامیابی ہوئی اب طبیعت ٹھیک ہے اور روبہ صحت ہیں لیکن ابھی کھانے کے پرہیز اور چلنے پھرنے پر پابندی بدستور عائد ہے البتہ بہت ہلکے مطالعہ کی اجازت ابھی دو تین روز پہلے ہی ملی ہے اس اجازت کے نتیجے میں جن اخبار و رسائل سے زیادہ شغف ہے اُن میں ایک حجاب بھی ہے۔ چنانچہ نومبر و دسمبر کو ماہ رواں کے شمارہ کا مطالعہ جو مولانا موصوف نے فرمایا اور اس کے بعد حسب معمول جب راقم مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو عجیب کیفیت و تاثرات سامنے آئے۔ مولانا کے انداز بیان میں بھی اور شکل و شباہت سے بھی ایک زبردست صدمہ کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی گفتگو کے بعد فرمایا "تم نے ماہ دسمبر کا حجاب دیکھا یا نہیں؟" جواب نفی میں ملنے پر فوراً ہی اندرون خانہ سے حجاب تقاضے کے ساتھ منگوالیا اور مجھے "پتا کہ سند ہے" کا صفحہ دیکھنے کو فرمایا۔ بعد ازاں بڑے درد بھرے انداز میں اپنے تاثرات آپ تک پہنچانے کی ہدایت فرمائی لہٰذا حسب الحکم آپ کی خدمت میں عریضہ ہٰذا ارسال کیا جا رہا ہے۔

محترم مولانا نے بڑے خلوص و محبت بھرے انداز میں فرمایا ہے کہ میں آپ کے اندر خلوص وللہیت، ایثار و قربانی کی جو صفات موجود ہیں اُن کا بہت پرانا واقف کار ہوں۔ میرا احساس ہے کہ آپ جیسے مخلص انسان کو اس قسم کی کمزوریوں پر گرفت نہیں کرنی چاہیئے بلکہ درگذر اور معاف

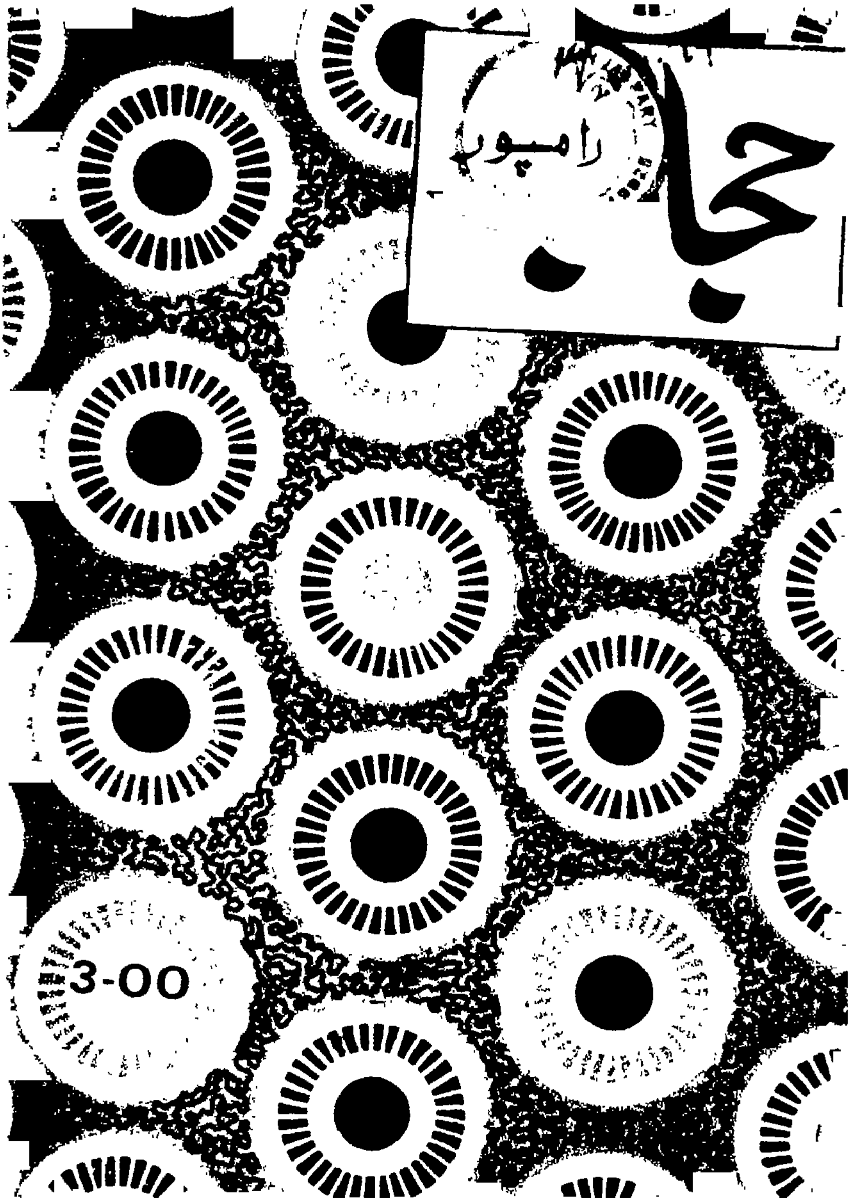
کرنے کا اجر حاصل کرنا چاہیئے ــــ ادعوحث عمن ظلمک ۔ اور واحسن الی من آساءَ الیک ۔ کا جیتا جاگا نمونہ پیش فرمانا چاہیئے ۔ آپ کی محبت و شفقت کے زعم میں یہ جرأت بے باکانہ کر رہا ہوں کہ آپ میری درخواست پر غور فرمائیں اور للہ فی اللہ اس بحث کو ختم فرمائیں اور اپنا تمام معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں جو بلاشبہ بندوں پر نظر رکھے ہوئے ہے ۔ میرے ناقص خیال میں ایسی بحثوں سے جماعت کے وقار کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے ۔

آپ جیسے صاحبِ نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ علمائے حق نے اپنی بیشتر تصنیفات کو مفادِ عام کے پیشِ نظر عام کر دیا اور حقِ تصنیف محفوظ نہ رکھا ۔ اب یہ شائع کرنے والوں کا اپنا اپنا ظرف تھا کہ وہ مصنف کا ہی نام دیتے رہے یا اس میں ضبن کرتے رہے ۔ ان ساری باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے میری آپ سے مخلصانہ درخواست ہے کہ آپ ان باتوں پر صبر فرمائیں ۔

محترم ! یہ وہ تاثرات ہیں جو مولانا نے مجھے قلم بند کرنے کی ہدایت فرمائی ۔ محترم مولانا کا ہدیۂ سلام مسنون بھی قبول فرمائیے ۔ مولانا نے فرمایا ہے کہ اگر ضرورت سمجھیں تو میرے تاثرات شائع بھی کر سکتے ہیں ــــ والسلام ــــ احقر ــــ عبد المجید خاں ۔ آفس سکریٹری جماعت اسلامی راجستھان ۔ جے پور ۔

MONTHLY **HIJAB** RAMPUR U.P.

Hijab


حجاب
رامپور
3-00

حجاب

[illegible]

مائل خیرآبادی

شمارہ [illegible]

جلد [illegible]

مارچ [illegible]

ربیع الثانی [illegible]

ایک شمارہ 3/

سالانہ چندہ 26/

V.P سے 30/

در پردہ حجاب

ایمانیات

منظومات

تاریخ و سیر

افسانے اور کہانیاں

مقالات و مضامین

حاصلِ مطالعہ

مرسلہ: عبیدالرحمن

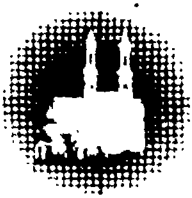
یہ بھی ایک دھوکا ہے کہ اسلام کی قیود تمہاری خوشحالی اور ترقی میں مانع ہیں۔ آخر تم اسلام کی کس قید کی پابندی کر رہے ہو؟ کونسی قید ہے جس سے تم آزاد نہیں ہوئے؟ اور کونسی حد ہے جس کو تم نے نہیں توڑا؟

تم کو جو چیزیں تباہ کر رہی ہیں ان میں سے کس کی اجازت اسلام نے تم کو دی تھی؟ تم تباہ ہو رہے ہو اپنی فضول خرچیوں سے۔ جن کے لئے کروڑوں روپیہ سالانہ کا سود تمہاری جیبوں سے ساہوکاروں کے خزانے میں جا رہا ہے اور کروڑوں روپیہ کی جائدادیں تمہارے قبضے سے نکلتی جا رہی ہیں۔

کیا اسلام نے تم کو اس کی اجازت دی تھی؟ تم کو خود تمہاری بُری عادتیں تباہ کر رہی ہیں۔ اس مفلسی کی حالت میں سینما اور کھیل تماشے تمہاری آبادی سے بھرے رہتے ہیں۔ تم میں کا ہر شخص لباس اور زینت و آرائش کے سامانوں پر اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتا ہے تمہاری جیبوں سے ہر مہینے لکھو کھا روپیہ بے ہودہ رسموں اور نمائشی افعال اور جاہلانہ اشغال میں صرف ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے کس کو اسلام نے تمہارے لیے حلال کیا تھا؟

سب سے بڑی چیز جس نے تم کو تباہ کر دیا ہے وہ ادائے زکوٰۃ میں غفلت اور آپس کی معاونت سے بے پروائی ہے۔ کیا اسلام نے یہ چیز تم پر فرض نہ کی تھی؟ پس حقیقت یہ ہے کہ تمہاری معیشت کی بربادی اسلامی قیود کی پابندی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس سے آزادی کا نتیجہ ہے۔

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی"



تربیت کا پہلا نشانہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا

اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ!

اللہ تعالٰی نے اپنی جس کتاب یعنی قرآن مجید میں یہ حکم دیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، اسی اللہ نے اپنی اسی کتاب قرآن مجید میں جہنم سے بچنے اور بچانے کا نسخہ بھی بتا دیا ہے۔ نسخہ یہ ہے۔ آمنوا وعملوا الصالحات۔ ایمان لاؤ اور اچھے کام کرو۔ ایمان لاؤ کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کا اقرار کرو۔ آپ پر جو قرآن اُترا ہے۔ اس کی ہر بات ٹھیک مانو۔ اللہ کو ایک مانو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اللہ کو ایک ماننے کے بارے میں فرمایا ہے۔ اس طرح اللہ کو ایک مانو۔

قرآن کریم میں اچھے کام ان کاموں کو کہا گیا ہے جن کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور وہ کام اس طرح کیے جائیں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔

ایمان لانے کے بعد اچھے کام نہ کیے جائیں تو انسان جہنم کی آگ سے نہیں بچ سکتا یا ایمان لائے لیکن جن کاموں کو اپنی سمجھ کے مطابق اچھا سمجھے وہ کام کرے تو بھی جہنم سے نہیں بچ سکتا۔

جس طرح ایمان لانا اور عمل صالح کرنا دونوں باتیں ضروری ہیں۔ اسی طرح اپنے

کو جہنم سے بچانا اور اپنے گھر والوں کو جہنم سے بچانا، یہ دونوں باتیں بھی ضروری ہیں۔ جس طرح ایمان لانے کے بعد عمل صالح نہ کرنے سے انسان پکّا اور سچّا مسلمان نہیں بن سکتا اسی اپنے کو جہنم سے بچانے کی کوشش کرنے اور اپنے گھروں کو جہنم سے بچانے کی کوشش نہ کرنے سے بھی انسان اس قابل نہیں ہو سکتا کہ جہنم سے بچ جائے جس طرح آمنوا وعملوا الصالحات ایک دوسرے کے لئے ضروری ہیں اسی طرح قوا انفسکم واہلیکم ایک دوسرے کے لئے ضروری ہیں۔ آج ہم اسی بات کو سمجھانا چاہتے ہیں۔

ہم آپ اپنے اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان سے ہمارا اور ہم سے ان کا لگاؤ قدرتی ہے۔ اسی قدرتی لگاؤ کو ہم محبت کہتے ہیں۔ محبت ہی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم گھر بنا کر ایک ساتھ رہیں۔ ہم ان کے آرام کے لئے محنت کریں اور وہ ہماری مدد کریں۔ اگر ہم اپنی تدبیروں سے ان کو جوڑے نہ رکھیں یا وہ کسی وجہ سے ہم سے کٹ جائیں تو گھر گھر نہیں رہتا۔ گھر کے معنی اینٹ پتھر کے بنے ہوئے مکان کے نہیں ہیں بلکہ گھر میاں بیوی اور بال بچوں کے جڑے رہنے کا نام ہے۔

چونکہ مرد گھر کا سب سے زیادہ طاقتور انسان ہوتا ہے اس لئے اسی کو اللہ تعالیٰ نے اس بات کا ذمہ دار بنایا ہے کہ وہ گھر والوں کی ہر ضرورت پوری کرے۔ گھر والے اس کا حکم مانیں اور اس کی مدد کریں۔ یہ بات سماج بھی تسلیم کرتا ہے۔ جس گھر کے لوگوں میں یا جس سماج میں ایسا نہیں ہوتا وہاں نہ مرد سکھی رہتا ہے اور نہ گھر والے اور نہ سماج اور وہ گھر گھر کہلانے کا حق دار نہیں ہوتا۔

مرد گھر کو سکھی رکھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ کمانے کی کوشش کرتا ہے یہ ضروری

کی چیزیں یا پیسہ گھر میں لاتا ہے۔ کھانے کے لئے اناج لاتا ہے۔ پہننے کے لئے کپڑا لاتا ہے۔ اگر کوئی گھر میں بیمار ہوتا ہے تو اس کے لئے دوا لاتا ہے۔ ان بنیادی ضرورتوں کے تحت اور بہت سی چھوٹی بڑی ایسی ضرورتیں بھی گھر کے اندر ہوتی ہیں کہ اگر مرد دن بھر محنت مزدوری کرنے کے بعد ان میں پھنس جائے تو دیوانہ ہو جائے گا۔ ان چھوٹی بڑی ضرورتوں کے بارے میں وہ بتا دیتا ہے کہ یوں پوری کر لی جائیں، یوں ان سے نبٹا جائے۔

ہم نے دیکھا ہے اور تجربہ بھی ہے۔ آپ نے بھی دیکھا ہوگا اور آپ کو بھی تجربہ ہوگا کہ گھر میں ضرورت کا سامان ضرورت سے زیادہ بھرا ہے۔ روپیہ پیسہ بھی ہے لیکن اس گھر میں سکھ نہیں ہے۔ چاہے اس گھر کے لوگ لذیذ سے لذیذ غذا کھائیں۔ اچھے سے اچھا پہنیں لیکن ان کا چہرہ بتاتا ہے کہ وہ سکھی نہیں۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ایک آنکھوں دیکھا حال اور کانوں سنی بات پیش کر رہا ہوں۔ ایک دن میں اپنے ایک ملنے والے مالدار دوست کے گھر بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ میرا یہ مالدار دوست سرمایہ دارانہ ذہنیت سے بہت کچھ دور ہے۔ فلاحی کاموں میں بہت کچھ روپیہ خرچ کرتا ہے۔

میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا اتنے میں ایک اور شخص آ گیا وہ بھی باتوں میں شریک ہو گیا۔ یہ شخص اس میرے مالدار دوست کی فیاضی سے بہت متاثر تھا۔ باتیں کرتے کرتے اس کی زبان سے نکلا: "آپ خوش نصیب ہیں، اللہ نے آپ کو سب کچھ دیا۔ آل اولاد گھر مکان دھن دولت اور شہرت سب کچھ۔"

یہ سن کر میرے مالدار دوست نے اس شخص سے پوچھا، "آپ کی غذا کیا ہے اور کتنی ہے؟" اس نے جواب دیا۔ روٹی کھاتا ہوں۔ چاول کھاتا ہوں۔ گوشت کھاتا ہوں۔ اللہ اور جو کچھ

دیتا ہے اس میں سے چار یا پانچ چپاتیاں اور کچھ دال ترکاری وغیرہ کھاتا ہوں۔
اس کے جواب میں میرے مالدار دوست نے اپنی خوراک بتائی۔ صبح ناشتے میں صرف ایک خشک پھلکا اور پیالی چائے جو سکرین سے میٹھی کی جاتی ہے۔ دودھ دہی گھی گوشت مرچ کھٹائی مٹھائی انڈا کیلا اور ایسی ہی دوسری چیزیں ڈاکٹروں نے میرے لئے حرام کردی ہیں۔
اچھا بھائی۔ کام کتنی دیر کرتے ہو اور کتنی دیر سوتے ہیں؟" اس شخص نے جواب دیا، دن میں آٹھ گھنٹے آپ ہی کے یہاں تو کام کرتا ہوں۔ رات کو آٹھ گھنٹے ہی سوتا ہوں۔
اس کے جواب میں مالدار دوست نے اپنا حال بتایا، صبح سے ۱۱ بجے رات تک کام کرتا ہوں۔ پھر سونے جاتا ہوں تو یقین کیجیے۔ رات بھر تارے گنتا رہتا ہوں۔ نیند نہیں آتی۔ اگر کسی وقت جھپکی آ بھی گئی تو چونک پڑتا ہوں۔ اچھا بھائی! یہ بتاؤ بال بچوں سے کیسی نبھتی ہے؟"
اس شخص نے بتایا: اللہ کا شکر ہے۔ گھر والی اور بچے دن بھر مجھے یاد کرتے رہتے ہیں میرے انتظار میں رہتے ہیں۔ عصر کو گھر پہنچتا ہوں تو بچے شور مچانے لگتے ہیں۔ ابا جان آگئے۔ ابا جان آگئے۔ اس وقت چائے تیار ملتی ہے۔ ہم سب مل کر چائے پیتے ہیں۔ چائے سے زیادہ میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں۔ کہیں باہر جاتا ہوں تو سب اللہ سے بخیریت واپس آنے کی دعائیں مانگتے ہیں۔
اس کے جواب میں مالدار دوست نے بتایا، میری سنو! میرے گھر والے میرے مرنے کی دعائیں کرتے ہیں۔ کب میں مروں اور سب دولت سمیٹیں۔ کوئی بات کرنے کا روادار نہیں۔ سب مجھ سے شاکی۔ سب میں باہم رقابت۔ مجھے تو مرنے کے بعد بھی چین نہ ملے گا

قبر میں کہوں گا۔ ہائے اولاد لڑائی ہوگی۔ تو بتاؤ بھائی میں سکھی ہو یا تم آسمان کے ان روشن ستاروں کے دھوکے میں مت آؤ۔ ہیں یہ کچھ لیکن نظر آتے ہیں کچھ۔

اوپر جو قصہ سنایا ہے یہ من گھڑت نہیں ہے۔ واقعہ ہے۔ اس قصے سے بتانا یہ تھا کہ سکھ روپیہ پیسے سے نہیں خریدا جاتا۔ قیمتی کپڑے پہن لینے سے اونچے محلوں اور بنگلوں کوٹھیوں میں رہ کر کوئی سکھی نہیں ہو سکتا۔

آپ پوچھیں گے کہ پھر سکھ کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ سکھ حاصل ہوتا ہے اللہ کا اچھا بندہ بننے سے جسے پکا اور سچا مسلمان آدمی کہا جاتا ہے۔ وہ انسان جو اپنے پیدا کرنے والے کو مانے اس کے حکموں پر چلے۔ اس کی مرضی کے مطابق اپنی زندگی ڈھالے اتنا ہی نہیں۔ اپنے گھر والوں کو بھی اسی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرے۔ ایسے کام کرے کہ اس دنیا میں بھی سکھی رہے اور پھر جب اپنے پیدا کرنے والے کے پاس پہنچے تو وہاں بھی سکھی رہے۔ خود بھی جہنم سے بچا رہے اور اس کے گھر والے بھی۔ آپ پوچھیں گے کہ ہم اپنی اولاد اپنے گھر والوں کی تربیت کس طرح کریں کہ اس دنیا میں سچا سکھ حاصل کریں اور آخرت میں جہنم کی آگ سے بچ جائیں اس کے جواب میں عرض کروں گا کہ آپ حجاب کا اگلا شمارہ ضرور پڑھیں۔

غزل

خلیق الزماں سحر

اخلاص بھی شرمندہ سا دنیا کو بھی حیرت سے ہے اب تو
تاثیر سے خالی اے واعظ کیوں تیری نصیحت ہوتی ہے

قارون کی دولت بھی کم ہے ہر حال ہوس کی نظروں میں
جو بندہ شاکر ہے اس کو ہر چیز غنیمت ہوتی ہے

جو لوگ مخالف ہیں تیرے تو ان کی پروا کر نہ سحر
لوگوں کی برائی کرنا ہی لوگوں کی عادت ہوتی ہے



عالم الغیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۗ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝ (سورۂ نمل)

ان سے کہو، اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب (کے بارے میں) نہیں جانتا ہے اور، وہ نہیں جانتے کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔

غیب کا جاننے والا

غیب کے معنی ہیں چھپی ہوئی۔ وہ چیز جو معلوم نہ ہو اور جس کو جاننے کا انسان کے پاس کوئی ذریعہ نہ ہو۔ مثال کے طور پر یہ بات کہ کوئی شخص کل کیا کہے گا؟ یا کسی شخص کی موت کب اور کہاں ہوگی یا یہ کہ قیامت کب آئے گی یا یہ کہ جنت ہے دوزخ ہے۔ فرشتے ہیں، جن ہیں۔ اور آسمانوں میں اللہ کے لشکر (جنود السمٰوات) ہیں وغیرہ۔ یہ ساری باتیں یا چیزیں انسان سے چھپی ہوئی ہیں۔ انسان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وہ ان باتوں اور چیزوں کو جان سکے۔ اوپر جو ہم نے سورہ نمل کی ایک آیت پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیب کا جاننے والا صرف اللہ ہے۔

غیب کے جاننے والے عالم الغیب کہتے ہیں
قرآن میں صرف یہی ایک آیت نہیں
ہے جس میں صرف اللہ کے عالم الغیب ہونے
کے بارے میں کہا گیا ہے اور بہت سی
جگہ ایسی ہی آیتیں ہیں۔ ایک جگہ ہے
"وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ
إِلَّا هُوَ" اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں
ہیں۔ غیب کی کنجیاں ہونے کا مطلب
یہ ہے کہ غیب کی باتوں کا کھولنے والا
اللہ ہی ہے۔ غیب کی باتوں میں سے
جس بات کو چاہے کسی اور پر کھول دے
نہ دے۔ اللہ کے بتائے بغیر کوئی غیب
کی کوئی بات جان نہیں سکتا۔ یہ جو جنت
دوزخ، فرشتوں، جنّوں، عرش و کرسی
وغیرہ کے بارے میں تھوڑا سا حال انسانوں
کو معلوم ہوا ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ اللہ
نے اپنے نبیوں کو ان کے بارے میں
بتایا۔ دکھایا تو نبیوں نے جانا اور پھر نبیوں
نے ہی لوگوں کو بتایا۔ اگر اللہ نبیوں کو نہ
بتاتا تو وہ بھی نہ جانتے۔ مثال کے لیے

ہمارے پاس سب سے بہتر دلیل یہ ہے
کہ ایک بار حضرت جبرئیلؑ انسان کی شکل
میں حضورؐ کے پاس آئے۔ حضورؐ کے
زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گئے۔ آپؐ سے
چار سوال کئے۔ ایمان کیا ہے۔ اسلام کیا
ہے۔ احسان کیا ہے۔ آخری سوال تھا
قیامت کب آئے گی؟ حضورؐ نے شروع
کے تین سوالوں کا جواب بتایا۔ قیامت
کب آئے گی کے سوال پر فرمایا کہ جس
سے پوچھا جا رہا ہے وہ خود پوچھنے والے
سے زیادہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا
پھر فرمایا کہ یہ ان پانچ چیزوں میں سے
ہے جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا
پھر آپ نے سورہ لقمان کی ۳۴ویں آیت
پڑھی جس میں ان پانچوں باتوں کے بارے
میں ہے۔ ملاحظہ ہو:-

إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ
مَا فِي الْأَرْحَامِ ۗ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۗ
وَمَا تَدْرِي نَفْسٌۢ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ

(۱) اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے

(یعنی قیامت کے بارے میں اللہ ہی جانتا
ہے کب آئے گی)
(۲) وہی بارش برساتا ہے۔
(۳) اور وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے
رحم میں کیا (پرورش پا رہا ہے)
(۴) اور کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ
کیا کمائی کرے گا۔
(۵) اور کسی کو نہیں معلوم کہ کس زمین
میں اس کو موت آئے گی۔

ایک اور دلیل بڑی خوبصورت اور
دلچسپ ہے۔ مشہور صحابی اور قرآن کے
بہت بڑے عالم حضرت عبداللہ بن عباس
کے ایک شاگرد تھے حضرت عکرمہ حضرت عکرمہ کے
شاگرد ابن المنذر۔ ابن المنذر نے حضرت عکرمہ
سے سنا اور حضرت عکرمہ نے حضرت عبداللہ
بن عباس رض سے کہ

"ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
سے پوچھا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
قیامت کب آئے گی؟ اور ہمارے علاقے
میں سوکھا پڑ گیا ہے۔ بارش کب ہوگی؟
اور میری بیوی حاملہ ہے۔ وہ لڑکا جنے گی
یا لڑکی؟ اور یہ تو مجھے معلوم ہے کہ میں
نے آج کیا کمایا ہے (یہ بتائیے کہ) کل میں
کیا کمائی کروں گا؟ اور یہ بھی مجھے معلوم
ہے کہ میں کہاں پیدا ہوا ہوں (یہ بتائیے
کہ) مروں گا کہاں؟ ابن المنذر اپنے استاد
الاستاد کی بات نقل کرتے ہوئے فرماتے
ہیں کہ حضور ص نے ان سارے سوالوں کے
جواب میں سورہ لقمان کی ۳۴ ویں آیۃ
پڑھ دی۔

اور سنئے، حضور ص کی زوجۂ محترمہ اور
قرآن کے سیکھنے میں براہ راست آپ کی
شاگردہ ام المومنین حضرت عائشہ رض فرماتی
ہیں کہ "جس نے یہ دعویٰ کیا کہ نبی صلی اللہ
علیہ وسلم جانتے ہیں، کل کیا ہونے والا
ہے۔ اس نے اللہ پر سخت جھوٹ کا
الزام لگایا کیونکہ اللہ تو یہ فرماتا ہے: اے
نبی ص تم کہدو کہ غیب کا علم اللہ کے سوا
آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں میں
سے کسی کو نہیں۔ (سورۂ نمل آیت ۶۵)

واضح رہے کہ کل کے معنی صرف یہ نہیں
یں کہ کل کا دن۔ بلکہ اس کے معنی آئندہ لمحہ
یا سکنڈ۔ تو مطلب یہ ہوا کہ اگلے سکنڈ کے
بارے میں اللہ کے سوا کسی کو نہیں معلوم
کہ اس سکنڈ میں کیا ہوگا۔
میں نے قرآن کریم کی بہت سی
آیتوں اور حضورؐ کی فرمائی ہوئی بہت سی
باتوں میں سے صرف دو دو مثالیں دلیل
کے طور پر پیش لیں۔ بات بالکل دو ٹوک
سامنے آگئی۔ اب صرف دو مثالیں اور
پیش کروں۔ جن میں یہ ہے کہ اللہ جسے
چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے غیب کے
بارے میں بتا دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔
(سورۂ بقرہ آیت ۲۵۵)
یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِ ....
.... اِلَّا بِمَا شَاءَ
"وہ جانتا ہے جو سب کے
سامنے ہے اور جو ان سے
اوجھل (چھپا ہوا) ہے اور اس
کے علم میں سے کسی چیز کو وہ
گھیر نہیں سکتے۔ الا بما شاء لیکن
جس چیز کا (جتنا) علم چاہے
انھیں دے دے"۔
سورہ جن رکوع ۲ میں ملاحظہ ہو:
عالم الغیب ... وصلت ربہم
"وہ (اللہ) عالم الغیب ہے اور
وہ اپنے غیب (کی باتیں) کسی
پر ظاہر نہیں کرتا۔ سوائے اس
رسول کے جس کے بارے میں
اس نے چاہا ہو (پسند کیا ہو)
پھر وہ اس رسول کے آگے
پیچھے نگرانی کرنے والے لگا دیتا
ہے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ ان رسولوں
نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے"
"رب کے پیغامات پہنچا دیئے" کے بارے
میں قرآن کی تشریح کرنے والے علماء کرام
نے لکھا ہے کہ رسولوں نے کچھ گھٹائے
بڑھائے بغیر رب کے پیغامات پہنچا دیئے
نگران اسی لیے مقرر ہوئے کہ رسول رب
کے پیغامات کا ایک لفظ بھی نہ بھولیں،

اور جن وغیرہ (جن بھوت) پہنچا دیں۔

اور پر قرآن و حدیث کی بہت سی باتوں میں سے چند باتیں جو پیش کی گئیں انہی کی بنا پر اسلام کے بنیادی عقیدے میں یہ بات شامل ہے کہ اللہ ہی عالم الغیب ہے۔ اس کے سوا کوئی غیب کا جاننے والا نہیں۔ ہاں اللہ جس کو چاہے اور جتنا چاہے غیب کا علم دے دے۔

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ یا تو رسولوں میں سے کسی کو چن لیتا ہے یا فرشتوں میں سے اور ان کو غیب کی کچھ باتیں بتا دیتا ہے۔ رسولوں اور فرشتوں کے علاوہ اللہ کسی کو غیب سے مطلع نہیں فرماتا اب اگر کوئی کہے کہ فلاں حضرت جی یا پیر صاحب یا پنڈت جی بھی غیب کے بارے میں جانتے ہیں تو یہ جھوٹ ہی نہیں اللہ پر الزام ہے اور شرک ہے۔

قرآن اور حدیث سے دو ٹوک بات تو سامنے آگئی۔ لیکن شیطان نے ہر زمانے میں لوگوں کو دھوکہ دیا اور وہ دھوکے میں آگئے۔ شیطان نے ان کو وہم میں مبتلا کیا اور وہ وہم میں پھنس گئے۔ ان کو پھانسنے کے لیے شیطان نے بڑا خوبصورت جال پھیلایا۔ کہیں یہ بات ذہنوں میں بٹھائی کہ اللہ کے فرشتے اللہ کی اولاد ہیں۔ یہ خدائی میں شریک ہیں اور غیب کی باتیں جانتے ہیں۔

بس پھر کیا تھا ان کو دیوی دیوتا مان کر لوگ ان کے پجاری بن گئے شیطان نے کہیں یہ بات سمجھائی کہ یہ جو پیر صاحب ہیں اور حضرت جی تشریف فرما ہیں یہ بھی غیب کی باتیں جانتے ہیں۔ یہ یہیں بیٹھے بیٹھے بتا دیتے ہیں کہ تمہارا گمشدہ مال یا بیٹا کہاں ہے کہیں یہ بات مشہور کر دی کہ یہ جو حضرت مزار شریف میں لیٹے ہیں۔ ان سے درخواست کرو۔ یہ بھی عالم الغیب ہیں۔ سب بتا دیں گے۔

شیطان کے اس جال کے پیچھے عالم الغیبی کی ایک دوکان بھی ہے جہاں بڑی سی بڑی رقمیں وصول کی جاتی ہیں۔

جہاں آدمی اپنا ایمان بھی خراب کرتا ہے اور مال بھی برباد کرتا ہے

انسان سہل پسند واقع ہوا ہے وہ چاہتا ہے کہ محنت مشقت کرنا نہ پڑے اور چٹکی بجاتے اور لب ہلاتے کسی غیبی طاقت کے ذریعہ کام بن جائے شیطان انسان کی اس کمزوری کو جانتا ہے بس اس نے اسی پر دھر لیا۔ وہ ایسے ویسے بزرگوں کو سامنے نہیں لاتا۔ ان بزرگوں کو سامنے لاتا ہے جن کی دینداری اور علم و تقویٰ کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے شیطان کے دھوکے کا کمال دیکھئے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح حنبلی تھے بدعات کے سخت دشمن۔ آپ نے تمام عمر شرک و بدعات کے رد میں گذار دی اور مسلمانوں میں بڑے پیر کا خطاب پایا۔

شیطان نے حضرت شیخ جیلانی رح کے بارے میں غلط سلط واقعات افسانوں اور کہانیوں کی شکل میں پھیلا دئے۔ بڑے پیر نے ماں کے پیٹ میں ۱۸ پارے حفظ کر لیے تھے جس دن آپ پیدا ہوئے اس دن لوگوں کو یہ شبہ تھا کہ آج یکم رمضان ہے یا نہیں تو جب بڑے پیر صاحب نے ماں کا دودھ نہیں پیا تو یہ ثبوت ہوا کہ روزے کا دن ہے۔ انھوں نے حضرت شیخ کی حاجت روائی۔ عالم الغیبی کی ایسی کرامتیں وضع کیں کہ ان کو سن کر افسوس ہوتا ہے

ایک افسانہ سننے میں آتا ہے کہ بڑے پیر صاحب بچے ہی تھے۔ والدہ محترمہ کسی بات پر خفا ہوئیں اور چھڑی لے کر پیچھے دوڑیں۔ آپ بھاگے تو قبرستان راستے میں پڑا۔ قبروں سے سارے مردے نکل بھاگے۔ ایک کہرام مچ گیا۔ ملک الموت بدحواس ہو کر دوڑا آیا اور عرض کی اگر یہی حال رہا تو آج ہی قیامت آجائے گی۔ خدا کے واسطے ابھی حشر برپا نہ کیجئے۔

دوسری کہانی سنئے۔ ایک بار آپ تشریف فرما تھے۔ مرید باادب پاس بیٹھے

تھے۔ اچانک آپ نے "اُف" کی مریدوں نے دیکھا کہ آپ کے کوھلے سے خون جاری ہے۔ عرض کیا "حضرت! یہ کیا ہوا" فرمایا میرا ایک مرید حج کو جا رہا ہے وہ جہاز گرداب میں (بھنور میں) پھنس گیا تھا۔ اس نے مجھے مدد کے لیے پکارا تو میں اس کی مدد کو آگیا۔ جہاز کو کولھا لگایا اور دھکیل دیا لیکن جہاز کی ایک کیل لگ گئی اور خون بہہ نکلا۔

اس طرح کی وضع کی ہوئی بہت سی کہانیاں ہیں۔ ایک شیخ جیلانی رح کے بارے ہی میں نہیں۔ شیطان کی پروپیگنڈہ کرنے والی ٹیم نے ایسے ہی افسانے خواجہ معین الدین چشتی رح۔ سید سالار رح۔ صابر کلیری رح۔ بابا فرید الدین شکر گنجی۔ نظام الدین اولیاء وغیرہ کے بارے میں مشہور کی ہیں۔ بھلا وہ لوگ جو قرآن اور حدیث کے علم سے واقف نہیں کیوں نہ ایسے بزرگوں کو عالم الغیب مانیں اور جو نہ مانے اُسے کافر کہیں۔ خوب سے گمان کا نام علم رکھ لیا اور علم کو گمان کہہ دیا۔

چنانچہ یہ بزرگ جو قرآن کے عقیدوں پر نہایت سخت تھے۔ افسوس صد افسوس انھی کو نادانوں نے قسمتوں کا بنانے والا اور بگاڑنے والا۔ دعاؤں کا سننے والا۔ حاجتیں پوری کرنے والا۔ اولاد مرحمت فرمانے والا مشہور کر دیا۔ ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ یہ صفات اسی کے ہو سکتے ہیں جس سے کچھ چھپا نہ ہو چنانچہ ان بزرگوں کے بارے میں عقیدہ ہو گیا کہ وہ عالم الغیب تھے اور اور اب بھی ہیں۔

افسوس ہوتا ہے۔ ایک طرف قرآن غیب کے بارے میں کیا اعلان کرتا ہے۔ دوسری طرف شیطان کے ایجنٹ دھوکے کی ٹٹی کے آڑ کس طرح شرک و بدعت کی دوکان لگائے بیٹھے ہیں اور ان سے زیادہ رحم کے قابل وہ بے علم لوگ ہیں جو جان و مال سے ان دوکانوں پر پھٹے پڑتے ہیں ہے کوئی جوان بے علموں کو قرآن اور حدیث کی مدد سے صحیح عقیدے بتائے اور سچا مسلمان بننے کی کوشش

غازی انور پاشا کا خط زندگیات کے نام

باسمہٖ سبحانہ

محترمی مائل صاحب السلام علیکم و رحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا بھلا کرے ماسٹر احمد نوری و مترجم قرآن کنٹرا کا کہ جب وہ ہمیں ابتدائی درجات میں تعلیم دے رہے تھے تو انھوں نے آپ کی چند کتابیں سنائی تھیں جس کا چسکا اب تک محسوس ہوتا ہے جب کہ اس پر ایک دہائی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا۔

المجتمع کویت کے نئے شمارہ میں آج میں نے انور پاشا کا خط دیکھا اس خط سے میں اتنا متاثر ہوا کہ بار بار پڑھنے کے باوجود دل سیر نہیں ہوا۔ اسلامی روح اور جذبہ ہے کہ آنکھوں کو ڈب ڈبا شدہ رہا ہے۔ جی چاہا کہ امت کے اس عظیم دانشور کا اردو میں ترجمانی کی سعادت حاصل کروں۔ یہ لو اس کی ترجمانی حاضر خدمت ہے۔ زبان کی اصلاح کریں تو مہربانی ہوگی۔ کیونکہ میری اردو بس ہماری کتاب پانچویں تک کی ہے اور وہ بھی غیر اردو ماحول میں کیونکہ میری مادری زبان بھی اردو نہیں ہے۔ میں نے کوشش تو بہی کی کہ غازی انور کی مجاہدانہ روح ترجمانی میں سرایت کرے۔ لیکن مجھ جیسے کم نصیب سے مقصد کے حصول میں جتنی کامیابی ہوئی ہے۔ یہ آپ جان سکتے ہیں۔ برائے کرم اس کی اشاعت قریب تر شمارہ میں کریں۔ اگر ملنے کی اطلاع کی رسید مل جائے تو اطمینان ہو سکتا ہے۔ شکریہ۔ والسلام عبدالمتین منیری

غازی انور پاشا کا تعارف | ایک زمانہ تھا کہ عثمانی ترک آدھی دنیا پر قابض تھے۔ ان کے نام کا ڈنکا سارے عالم میں بج رہا تھا۔ ان کا خلیفہ ساری دنیا کے مسلمانوں کا روحانی و دنیوی پیشوا

ناجاتا تھا۔ اسلام کی شان و شوکت کا وہ ایک دور تھا۔ جس کو اب آنکھیں ترس رہی ہیں۔ اس شان و شوکت اسلام اور ترکوں کی رفعت کا واحد سبب ان کا جذبہ جہاد تھا۔ جس میں یہ جیالی قوم سب سے بڑھ کر تھی۔ اس جذبہ نے ان کا نام روشن کیا اور ان کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ جب ان جذبہ جہاد جاتا رہا۔ سارے عالم اسلام پر اداسی چھا گئی۔ عالم اسلام کے بخئے ادھڑ گئے۔ دنیائے اسلام گم گشتہ راہ کی طرح نامعلوم مستقبل کی تلاش میں جا پڑی۔

غازی انور عثمان پاشا ان جیالے نوجوانوں میں سے تھے۔ جنہوں نے ترکوں کے نام کو اونچا لیا اور اپنی جان راہ خداوندی میں قربان کی۔ آپ ترکی فوج کے جنرل تھے۔ ملحد بالشویکوں سے جہاد کیا۔ یہاں تک کر جام شہادت نوش فرمانے میں کامیاب ہوئے۔ درد و محبت میں ڈوبا یہ خط انھوں نے اپنی چہیتی رفیقہ حیات نجیہ سلطان کو لکھا تھا۔ یہ ان کا آخری خط ہے۔ جس کے لکھنے کے دوسرے ہی دن حسب تمنا آپ نے راہ جہاد میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی۔ اسے پڑھئے اور ہر قاری کے لئے دعا کیجئے کہ وہ بھی انور عثمان سا غازی بنے۔ کیونکہ اس وقت عالم اسلام کو ایسے ہی غازیوں کی اشد ضرورت ہے اور ایسے ہی مجاہدوں نے اسلام کی لاج رکھی ہے۔

یہ خط دراصل ترکی میں تھا اور پہلے انگریزی اور دوسری زبانوں میں شائع ہو چکا ہے اب اسے عربی میں کویت کے باوقار اسلامی ہفت روزہ "المجتمع" نے اپنی قریبی اشاعت میں شائع کیا ہے۔ میں نے بھرپور کوشش کی ہے کہ انور پاشا کے جذبات کی عکاسی کر دوں۔ لیکن کہاں راہ حق کا مجاہد اور کہاں بندہ ناتواں جسے انور کے جذبہ کا عشر عشیر نصیب نہیں۔

عبدالمتین منیری۔ جامعہ اسلامیہ بھٹکل (دن کے)

● شریک حیات! سرچشم سعادت منبع مسرت عزیزہ نجیہ ــــ اللہ ہی قدرت والا۔ وہی تمہارا نگہبان ہے۔ اس وقت میرے سامنے تمہارا آخری خط ہے۔ تم یقین کر لو کہ تمہارا

لکھا ہوا یہ خط آخری دم تک میرے دل کے پاس رہے گا۔

اس سے پہلے میں نے تمہیں ایک خط میں لکھا تھا کہ اب میں تم کو بھول چکا ہوں اور اب تمہاری محبت کی میرے پاس کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ـــــ یہ لکھ کر میں نے تمہارے نازک دل کو چکنا چور کر دیا۔

میں اس وقت گھر سے دور دلوں سے بھری آگ و خون سے کھیل رہا ہوں۔ ایسے وقت میں میں اس عورت کو کوئی اہمیت نہیں دے سکتا جو غمزدہ ہو کر اپنی راتوں کو تارے گن گن کر گزارتی ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں جنگ سے پیار کرتا ہوں۔ مجھے اپنی تلوار عزیز ہے۔ میرے ان کلمات کو تم نے نہیں سمجھا۔ لیکن اس میں کوئی بھی شک نہیں کہ تم نے اپنے اس خط کو سچائی اور خلوص سے لکھا ہے اور تمہارے قلم سے نکلے ہوئے یہ کلمات شدید محبت و اخلاص سے بھرے جذبے سے نکلے ہیں۔ میں تمہیں کیونکر یقین دلاؤں۔ جب کہ میری زبان اس جذبہ کی صحیح عکاسی سے قاصر ہے کہ تم سے بڑھ کر اس دنیا میں مجھے کوئی عزیز نہیں۔ تم ہی میرے دل میں محبت کے شعور کو جگانے والی ہو۔ اب تک میں نے کسی سے پیار نہیں کیا۔ لیکن اکیلی تم ہو کہ تم نے میرے دل کو چھین لیا۔

آخر کس چیز نے مجھے تم سے دور کیا؟ آہ اے میرے دل کی دھڑکن! میری بات تو سنو میں کسی مادی نفع کو حاصل کرنے کے شوق میں تم سے دور نہیں ہوا ہوں اور نہ ہی میں شہرت و ثروت کا شائق ہوں۔ اور نہ حکومت بنانے اور گدی نشین ہونے کا ہی خواہشمند ہوں۔ جیسا کہ دشمنوں نے میرے بارے میں یہ افواہ گرم کر دی ہے۔ تم سے دوری اور میدان کارزار میں میری آمد کا واحد مقصد رضائے الٰہی کا حصول اور اس کے حکم کی تعمیل ہے۔

مجھ پر اس وقت ایک ایسا وقت آیا ہے کہ اس وقت پر راہ خداوندی میں جہاد سے بڑھ کر کوئی فرض نہیں اور اس فریضہ کی ادائیگی کا بدلہ فردوس بریں کا حصول ہے جو اللہ کا

ملا ہے کہ میں نے اس کے صرف پانے ہی کو پسند نہیں کیا بلکہ میں نے اس کے حصول کے لئے میدان جہاد میں قدم رکھ دیا۔

تمہاری دوری نوک سناں کی طرح میرے دل کو پارہ پارہ کر رہی ہے۔ تمہاری یہ دوری ہی میرے لیے سعادت ہے۔ کیونکہ تمہاری محبت میرے لیے ایک عظیم امتحان ہے اور یہ محبت راہ خدا میں جہاد کے میرے عزم و ارادہ کو اور پختہ کرتی ہے۔ میں ہزار بار خداوند تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ایسے کڑے وقت اور عظیم امتحان میں کامیابی سے نوازا۔ میں محبت و شوق کو پس پشت ڈال کر راہ جہاد میں قدم رکھنے میں کامیاب ہوا۔

جانِ من! تم پر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنا واجب ہو گیا۔ اس لئے کہ تمہیں ایسا شوہر ملا جو پختہ ایمان رکھتا ہے اور جو تمہاری محبت کو خدا کی محبت پر بھینٹ چڑھا سکتا ہے۔

اس کے باوجود کہ تم پر جہاد فرض نہیں ہے۔ اے میری چہیتی! اس سے یہ سمجھ نہ بیٹھنا کہ مسلمان مرد و عورت پر جہاد معاف ہو گیا۔ تمہارا جہاد تو یہ ہے کہ تم میری محبت پر خدا کی محبت کو مقدم رکھو اور تمہارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ میرے اور اپنے درمیان زیادہ سے زیادہ مناسبت پیدا کرو۔ تم دعا میں کبھی اس غرض سے نہ مانگنا کہ تمہارا شوہر میدانِ جہاد سے صحیح سالم تمہاری بانہوں میں آ پہنچے۔ ایسی دعا تو خود غرضی کی دعا ہے جو بارگاہ خداوندی میں کبھی مقبول نہ ہو گی۔ کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے شوہر کے جہاد کو مقبول کرے اور اسے صحیح سالم تمہارے پاس لوٹا دے۔

خبردار! کبھی تم نے ایسی دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ تمہارے شوہر کے جہاد کو اس وقت تک مقبول نہ کرے گا اور اس وقت تک کامران و بامراد نہیں کرے گا جب تک کہ اس کے ہونٹ جامِ شہادت کو نہ چوم لیں۔ اے میری محبوبہ! تم اس بات سے خوب واقف ہو کہ میرے یہ دونوں ہونٹ ساغر و مینا سے کبھی مس نہ ہوئے یہ لب تو ہمیشہ تلاوت کلام پاک

اور تحمید و تسبیح میں نغمہ ریز رہے۔

اے میری محبوب پیاری! وہ گھڑی کتنی ہی مبارک و مقدس ہوگی اور اس وقت اس میں کتنی ہی روحانیت بسی ہوگی جب کہ تم راہ خدا میں جہاد کی شیدا ہوگی اور یہ نازک دل جس کے بارے میں پیار سے میں نے لکھا تھا کہ یہ خوبصورت دل ہے جسم سے الگ ہوگا۔ یہ تم میرے جس جسم کو دیکھ رہی ہو یہ صرف کسی فوجی کا جسم نہیں ہے بلکہ یہ ایک عاشق کا دل ہے۔ اس کی عظیم تمنا ہے شہادت سے سرفراز ہونا اور حشر میں خالد بن ولید کا ساتھ ہونا۔

بلقیہ! کان کھول کر سن لے جب میں شہید ہو جاؤں تو تم میرے بھائی نوری پاشا سے ضرور شادی کرنا۔ یہ میری دلی تمنا ہے۔ میری وفات کے بعد نوری ہی تمہارا ایک مخلص رفیق حیات بن جائے گا۔

میری دوسری تمنا یہ ہے کہ تم اپنے رحم سے پیدا ہونے والے تمام بچوں کو میری داستانِ زندگی سنا دینا اور انھیں میدانِ جہاد میں روانہ کرنا۔ اگر تم میری اس وصیت پر عمل پیرا نہ ہوگی تو میں جنت میں تمہارا رقیب بن جاؤں گا۔

الوداع! اے عزیز جان۔ پتہ نہیں میں کیوں محسوس کر رہا ہوں کہ اس خط کے بعد کوئی دوسرا خط نہ لکھ سکوں گا۔ یہ بات بعید از قیاس بھی نہیں ہے کہ میں کل ہی شہادت سے سرفراز ہو جاؤں۔

دیکھو! صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور تم سعادت مند بن جاؤ۔ میری شہادت پر نہ نوحہ کرنا اور نہ ہی گریبان چاک کرنا۔ کیونکہ خدا کی راہ میں میری موت تمہارے لئے عزت و شرافت کی بات ہے۔

بلقیہ! میں تمہیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ آخرت میں تم سے ملنے کی دعا کرتا ہوں۔ انشاء اللہ عنقریب ہم جنت میں ملیں گے پھر کبھی علیحدہ نہ ہوں گے۔ خدا حافظ۔ والسلام علیکم۔ تمہارا انور

چھوڑی ہوئی منزل

محی الدین احمد

غرناطہ کا آخری مسلم فرماں روا ابو عبداللہ ہسپانوی افواج کے سامنے ہتھیار ڈال چکا تھا اور اب بحر روم کے کنارے جبل الطارق کی بلند چوٹی کے نیچے افسردہ و مغموم کھڑا تھا اس کے عزیز و اقارب اور بنو احمر کے امرا جلو میں تھے۔ قریب ہی سمندر میں وہ کشتی لہروں پر اٹھکیلیاں کر رہی تھی جو اس قافلے کو افریقہ لے جانے کی منتظر تھی۔ ابو عبداللہ نے اپنی چھنی ہوئی مملکت — غرناطہ کے سبزہ زاروں اور کوہ و دامن پر آخری نگاہ ڈالی اور جذبات آنسو بن کر ٹپک پڑے۔ اس نے اپنے کندھے پر پڑی ہوئی سفید چادر میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ پرسکون ساحل نے دیکھتے ہی دیکھتے ماتم کدے کا روپ دھار لیا۔ ہر طرف ہچکیاں اور آہیں تھیں۔

اچانک ایک تھرتھراتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ ابو عبداللہ نے چونک کر چہرے سے چادر ہٹائی۔ سامنے پہاڑی پر ایک معمر بزرگ سفید عربی چغے میں ملبوس کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں عصا تھا بوڑھے عرب کی آواز رفتہ رفتہ ہچکیوں اور آہوں پر غالب آگئی۔ وہ کہہ رہا تھا: "اے شکست خوردہ ننگ اسلام بادشاہ! تم غیرت مند مرد کی طرح مملکت کو اغیار کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ اب تمہیں عورتوں کی طرح بلک بلک کر رونا ہی زیب دیتا ہے۔ تم نے اس خوبصورت اور عظیم مملکت کو اپنے ذلیل ہاتھوں سے برباد کیا اور غداروں کی طرح دشمن کے حوالے کر دیا۔ اب زندگی بھر

ملامت و لعنت کے جہنم میں جلتے بھلستے رہو گے۔ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ خود انسان اپنی حماقتوں سے اللہ کی لاٹھی کو اپنی سرکوبی کی دعوت دیتا ہے۔ اس نے تمہیں ہر چیز سے نوازا تھا لیکن تم نے اس کی دی ہوئی نعمتوں پر قناعت نہ کی اور اپنی بڑھتی ہوئی ہوس جاہ کی تسکین کے لیے اپنے چچا کے خلاف تلوار اٹھا کر میدان میں آ گئے۔ دشمن نے حسین چال چل کر تمہارے سر اپنے چنگل میں جکڑ لیے اور انھیں اس طرح آپس میں ٹکرایا کہ تمہارے خون سے تمہاری اپنی مقدس سرزمین سرخ ہو گئی۔ اس کے صلیبی علاقے اس خون سے بھر گئے اور پھر اس نے تمہیں اس خون میں غرق کر دیا۔

اے بنی احمر! میں سات سال سے اس غار میں مقیم انتظار کر رہا تھا کہ کب تمہیں اب کرتوتوں کی سزا ملتی ہے۔ میری ان بوڑھی آنکھوں نے بدبختی کا یہ منظر بھی دیکھ لیا۔ جب ملک کی باگ ڈور ہوس پرست اور خود غرض حکمرانوں کے ہاتھ میں آ جائے اس کی بقا کی ضمانت کوئی نہیں دے سکتا۔ تم آپس میں خونریزی کرتے رہے اور ایک دوسرے کی گردنیں کاٹتے رہے۔ دشمن اسی وقت کے لیے صدیوں سے منتظر تھا۔ وہ گھات سے نکلا اور اس نے تمہارا صفایا کر دیا۔

اے مسلمان بادشاہو! تمہیں کل خدا تعالیٰ کے حضور کھڑا ہونا ہے وہاں تم سے یقیناً اس بات کی باز پرس ہو گی کہ تم نے اپنی خود غرضی اور ہوس اقتدار کی تلوار سے اس کی مقدس دین کو ذبح کر ڈالا۔ تمہیں ان بے گناہ مسلمانوں کے بارے میں جواب دینا ہو گا جنہیں تم نے ان کے صلیبی دشمنوں کے حوالے کر کے ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا ہے۔ قیامت کے روز تمہیں ان عظیم شہروں کے متعلق بھی جوابدہی کرنا ہو گی جن کی تعمیر میں مٹی کی جگہ تمہارے اجداد کا خون استعمال ہوا تھا اور روحوں کے عظیم نذرانے دے کر ان کا حسن خریدا

گیا تھا۔ تم نے جواں مردی کی طرح ان کی حفاظت کرنے کے بجائے انھیں گنوا دیا۔ اپنی ہی قوم کی رگوں پر تلوار چلائی اور تن آسانی اور عیاشی کو اپنا شیوہ بنا لیا۔ آج اس کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔

جن میناروں سے اذان کی مسحور کن پکار سنائی دیتی تھی۔ آج ان سے صلیبی ناقوس کی بے ہنگم آواز گونج رہی ہے مسجدیں قدموں تلے روندی جا رہی ہیں مسلمانوں کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں رہی۔ وہ اسلامی شعائر پر عمل نہیں کر سکتے۔

اے بنی احمر! تمھیں خدا کے حضور میرے ان مسلمان بیٹوں کے بارے میں جوابدہ ہونا پڑے گا جنھیں تم نے ہمارے نحیف ہاتھوں سے زبردستی چھین لیا اور خانہ جنگی کی آگ میں جھونک دیا تاکہ وہ اپنے ہی بھائیوں کے خون سے ہاتھ رنگیں۔ یہ لڑائی جس میں ہزاروں مسلمان کٹ مرے یقیناً فخر و شرف کا باعث نہ تھی۔ ان کا خون دشمن سے لڑتے ہوئے بہتا تو ہمیں کوئی رنج و غم نہ ہوتا، مگر افسوس تم نے دشمن کے آگے سپر ڈال دی اور اپنوں کا خون چاٹنے کے لیے میرے بچوں کو تیغ کا چارہ بنا ڈالا۔ اب اس بڑھاپے میں زندگی کے دن کیسے کاٹوں گا؟" بوڑھے کی آواز رندھ گئی۔ اس کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ لمحہ بھر کھڑا فضاؤں میں گھورتا رہا اور پھر اپنی لاٹھی ٹیکتا ہوا غار کی طرف چل دیا۔

ابو عبداللہ پہلے ہی اندرونی جھگڑوں سے تھا ہوا تھا، بوڑھے کی باتوں سے غم کی آنچ اور تیز ہو گئی۔ بدن میں رعشے کی لہر دوڑ گئی۔ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں چیخ اٹھا: "یہ انسان نہیں ہو سکتا یہ تو عدلِ الٰہی کی آواز تھی۔ حق اور سچائی کی آواز، جو صدیوں سے روپ بدل بدل کر لوگوں کے سامنے ان کے جرم کی نشاندہی کرتی چلی آئی ہے۔ خدایا! میرے متعلق تیرا جو بھی فیصلہ ہوگا، وہ بالکل سچا اور

منصفانہ ہوگا۔ میں نے امت مسلمہ کے ساتھ غداری کی ہے۔ میں نے اس خطۂ ارض سے اسلامی تہذیب اور ملت اسلامیہ کو مٹا ڈالا ہے۔ میں بہت بڑا مجرم ہوں میں بہت بڑا مجرم...." یہ احساسات کا یہی کرب لیے وہ کشتی میں سوار ہو گیا۔ بنی احمر کے امراء اس کے پیچھے پیچھے کشتی میں آ بیٹھے اور کشتی آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگی۔ ساتھ ہی مورخ نے سینۂ تاریخ پر لکھ دیا: "مسلمان عربوں نے آٹھ سو سال تک اپنی جواں مردی اور دانش مندی کے باعث اندلس پر حکمرانی کی، اب اپنی حماقتوں اور اندرونی خلفشار کے طفیل سرزمین اندلس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جلاوطن کر دیے گئے۔"

٭ ٭ ٭

جبل الطارق سے کشتی چل کر افریقہ پہنچ گئی۔ بنو احمر کا یہ خاندان اندوہناک مصائب جھیلتا رہا۔ ناز و نعمت سے بھرپور ماضی کا تصور انھیں تڑپاتا اور کربناک حال کے دکھوں میں اور اضافہ ہو جاتا۔ اس حادثے پر چوبیس برس گزر گئے۔ اس عرصے میں پورے خاندان کا صفایا ہو گیا۔ صرف ابو عبداللہ کے بیٹے یوسف کا بیٹا سعید اور اس کی والدہ دو افراد زندہ بچے۔ غرناطہ جب چھوڑا تھا تو شہزادہ سعید صرف چار برس کا تھا۔ وہ سرزمین اندلس کے حسن و جمال کا ذکر اپنے بزرگوں سے سنتا تو اسے دیکھنے کا شوق دل میں چٹکیاں لینے لگتا۔ قصر الحمراء کی یادیں اکثر اس کی ماں کی زبان پر آ جاتیں اور اس کا ننھا سا دل اس کے خوبصورت باغات کی سیر کرنے کے لیے تڑپنے لگتا، مغا[?] غرناطہ اور اس کے چشموں سے لطف اندوز ہونے کی خواہش ننھے سے ذہن میں کلبلانے لگتی۔ غرناطہ کا جلال و جمال، عین الرفیع کے سبزہ زار اور خوبصورت پہاڑ اس کی نگاہوں میں پھرنے لگتے۔ جبل الثلج کی برف باری کا منظر اس کی روح میں ایک خوش گوار سی بھر دیتا.... وہ انھی یادوں کے

سانسے اور ان نغموں کی مغموم ترنم ریزیوں
میں پروان چڑھا جو اس کے خاندان کی
عورتیں بچوں کو لوری کے طور پہ سناتی
تھیں۔ نغمے جن میں عظمت رفتہ کی
مرثیہ خوانی تھی۔ وہ جب یہ نغمے گنگناتا
تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے اور
یوں مضمحل ہو جاتا جیسے کسی بہت بڑے
بوجھ نے اسے پیس ڈالا ہو۔ اسی عالم
میں وہ کسی ریتیلے ٹیلے کے پہلو میں لیٹا
جاتا اور اپنی خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتا۔
آنکھ کھلتی تو آرزو کی آگ میں اپنے
آپ کو جلتے ہوئے پاتا۔ کاش! وہ اپنے
اجداد کے غرناطہ کا نظارہ کر سکتا۔ ان یادگارو
کو دیکھ سکتا جن کی یاد نغموں کی صورت
میں اس کے حافظے پر نقش ہو گئی تھی۔
کئی بار اس نے اس آرزو کی تکمیل کا ارادہ
کیا۔ لیکن بوڑھی اور ہمیشہ کی مریض ماں
اس ارادے کے آگے پتھر بن کر حائل
ہو جاتی ——— پھر ایک روز اچانک وہ
پڑا اور ماں اسے داغ مفارقت دے
گئی۔ ماں کی موت سعید کے لیے ر...
فرما تھی۔ وہ دنیا میں تنہا رہ گیا تھا۔
روز تک وہ افسردہ اور مغموم رہا۔ پھر ا
کیفیت سے ابھرا تو وارفتگی شوق
تیز ہو چکی تھی۔

سعید سبتہ پہنچا اور بحری جہاز ؛
سوار ہو کر اپنی آرزوؤں کی سرزمین ؛
اترا۔ اس نے عرب طبیب کا بھیس
رکھا تھا کہ صرف انہیں ہی اندلس۔
پہاڑوں پر جڑی بوٹیاں تلاش کر۔
کی اجازت تھی اور وہ اکثر اس مقصد
لیے سرگرداں رہتے تھے۔ جبل الثلج ؛
پوش پہاڑیوں میں سے ایک طرف
ہو کر اس نے ارد گرد کے حسین منا؛
نظر ڈالی تو اس کی روح وجد میں آگ
پہاڑی سے پانی انتہائی تیزی سے نش
میں گر رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی سنہ
کرنیں اس پانی پر پڑ رہی تھیں۔ او
سنہری چمک سے وادی کی دلک
اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ چلتی دمکتی تھی

پیچ وخم کھاتی لمبی گھاٹی تک چلی گئی تھی
یہاں وہ بڑی سرعت سے چھوٹی چھوٹی
نالیوں اور دراڑوں میں داخل ہو گئی تھی
جس طرح کوئی سانپ خطرات سے
بچنے کے لئے اپنے بل میں دوڑ کر گھس
جاتا ہے پھر اس نے غرناطہ شہر پر نگاہ
ڈالی۔ دور شام کی ملگجی فضا میں سرخ رنگ
کے مضبوط برج، آسمان کی بلندی کو
چھوتے ہوئے گنبد اور غرناطہ کی مسجدوں
کے بلند و بالا سنہری مینار دکھائی دے
رہے تھے۔ جلال و جمال کے اس منظر
سے وہ بے حد متاثر ہوا۔ سینے پر ہاتھ
باندھ کر مودب اور خاموش کھڑا ہو گیا
جیسے کوئی گناہگار محراب میں دستہ
بستہ مجسم گریہ وزاری بنا اپنے گناہوں
کی معافی مانگتا ہے۔ اس کا رواں رواں
کانپ رہا تھا وہ اس ہیجانی کیفیت
میں دیر تک مبہوت کھڑا رہا اور پھر
یک لخت اس کی دلدوز چیخ بلند ہوئی
جس کی صدائے بازگشت باغات اور
مرغزاروں میں سنائی دی۔ وہ دیوانہ
وار چیخا۔

"یہ میرے اجداد کی میراث ہے جسے میں
صرف ایک نظر دیکھ سکتا ہوں۔ میری
حالت اس شخص کی سی ہے جس کا سب
کچھ لٹ چکا ہو اور وہ ریگستانی ٹیلوں میں
حیران و سرگرداں پھر رہا ہو ان قیام
گاہوں کے مالک افریقہ کی ریت کی
دبیز تہوں کے نیچے ابدی نیند سو رہے
ہیں یہاں کے مرغزاروں میں ان کے کشن
محو خرام ہیں یہ محلات یقیناً انہی کے ہیں جو
بڑی بے تابی سے منتظر ہیں کہ وہ آئیں،
ان کی پرانی بہاریں آئیں رونقیں بحال
کریں۔ لیکن کاش ایسا ہو سکتا یہ عظیم گنبد
اور آسمان سے سرگوشیاں کرتے ہوئے
برج سر اٹھائے خدائے بزرگ و برتر
سے دست بدعا ہیں کہ خدا ان کے باسیوں
کو واپس بھیج دے۔ مگر کاش ان کی یہ
دعا قبول ہو جاتی اور پھر اس کی چیخ
سسکیوں میں بدل گئی۔

سسکیاں جو بہار کی کا منظر تھیں۔ مغرب
میں سورج افق سے جا لگا تھا۔ مشرق سے
رات کی تاریک فوجیں بڑھ رہی تھیں
اور ان کا روشن لشکر پسپا ہو رہا تھا۔ دن
اور رات کی اس کش مکش کے مشاہدے
نے اس کی بصیرت پر سے جیسے پردے
اٹھا دیے۔ نظام ہستی ایک لمحے میں اس
پر عیاں ہو گیا: "ٹھیک اسی طرح سلطنتیں
تباہی سے ہمکنار ہوتی ہیں اور تخت و تاج
پاؤں تلے روندے جاتے ہیں۔ بالکل
ایسے ہی ظلم کے اندھیرے عدل کی روشنی
کی جگہ لے لیتے ہیں اور موت کا سیاہ بادل
مہتاب زندگی کو اپنے دبیز پردوں میں
چھپا لیتا ہے۔"

رات کی سیاہی پھیل چکی تھی۔ سعید
وہیں درختوں کے ایک کنج میں لیٹ گیا
اور جلد ہی دنیا بھر سے غافل نیند کی پرسکون
وادی میں کھو گیا۔ علی الصبح آنکھ کھلی
اور وہ ٹہلتا ہوا نہر کے کنارے جا بیٹھا
جو جبل الثلج کی گھاٹیوں اور دیواروں
سے آنے والے پانی سے جنم لیتی تھی۔ وہ
اس نے صبح کی نماز پڑھی اور شہر کا دروازہ
کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کسی سرائے
کی تلاش میں تھا کہ وہاں قیام کر سکے کیونکہ
ابھی تک کوئی رہبر بھی میسر نہ آ سکا تھا۔ وقت
گزاری کے لیے وہ عربی طبیبوں کی طرح
جڑی بوٹیاں تلاش کرنے لگا۔

وہ خاصی دیر بے مقصد سرگردانی
کرتا رہا۔ پھر شہر کا دروازہ کھلا۔ ایک دوشیزہ
راہبہ چہرے پر سیاہ نقاب ڈالے باہر نکلی۔
ایک غلام اس کے ساتھ تھا جس نے کتاب
مقدس اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھی
تھی۔ دوشیزہ نے سونے کی چھوٹی سی صلیب
ہار کی طرح پہن رکھی تھی۔ اتنی صبح بیرون شہر
ایک اجنبی عرب طبیب کو دیکھ کر وہ گھبرا سی
گئی، مگر پھر سنبھلی، چہرے سے نقاب اٹھا
اور سعید سے عربی میں پوچھا: "آپ اس
شہر میں نووارد معلوم ہوتے ہیں؟" اپنائیت
کی یہ آواز اس کو جیسے خوابوں کی حسین دنیا
سے نکال لائی۔ "جی ہاں میں ابھی ابھی ادھر

شہر میں آرہا ہوں،" اس نے جواب دیا۔ "میں سرائے تک جانا چاہتا ہوں۔" سعید کی پروقار آواز چہرے کے خدوخال سے صاف جھلکتا تھا کہ وہ کسی اونچے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ حسین راہبہ لمحہ بھر سعید کے خدوخال گہری نظر سے دیکھتی رہی پھر اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اسے سرائے کے دروازے تک پہنچایا پھر ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھری "اے نووارد مسافر! کسی چیز یا مدد کی ضرورت پیش آئے تو مجھے یاد کرنے میں بخل سے کام مت لینا۔" اس نے کہا اور گرجا کی راہ پر ہو لی۔

٭٭٭

شبِ تاریک میں چھوٹے چھوٹے ستارے ٹمٹماتے ہیں تو تاریکی میں روشنی کی جھلک سے ایک حسین امتزاج جنم لیتا ہے۔ اس حسین اور دل کش منظر میں ٹوٹے شعلے شہاب اور اضافہ کر دیتے ہیں لیکن جوں ہی مشرق سے سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتی ہے۔ ان ننھی منی مشعلوں کا وجود نیلگوں آسمان میں تحلیل ہو جاتا ہے پھر سورج اپنی تمام تر توانائی کے ساتھ شب تاریک کو روشن دن میں تبدیل کر دیتا ہے بالکل یہی کیفیت انسانی دل کی ہوتی ہے اس میں خیالات و احساسات کے طوفان اٹھتے ہیں۔ کبھی کبھی محبت کا سورج طلوع ہو جاتا ہے اور ستاروں کی طرح دل میں پہلے سے موجود خیالات اس کے وجود میں مدغم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

سعید کی حالت بھی تبدیل ہو رہی تھی۔ اب اس کی آنکھوں میں فرنالڈو کو دیکھتے ہوئے خوشی کی وہ پہلی سی چمک نمودار نہیں ہوتی۔ محبت کے مضراب نے اس کے دل کے تار چھیڑ دیے تھے۔ جذبات و احساسات کا وہ طوفان جسے وہ افریقہ کے ساحل سے دل میں لے کر چلا تھا اب اتر چکا تھا۔ اب وہ کسی ایسی مسجد کے پاس سے گزرتا جسے گرجا میں تبدیل کیا جا چکا ہوتا تو اس کے قدم رک جاتے

اور آنکھیں دروازے پر جم جاتیں کہ شاید
وہ ہسپانوی دوشیزہ کہیں نظر آجائے جس
نے سرزمین غرناطہ پر اسے خوش آمدید
کہا تھا اور اس کی زندگی میں ہلچل مچا دی
تھی۔ مسجد کے مینار پر صلیب کا نشان
دیکھتا تو وحشت زدہ ہونے کے بجائے
اس حسینہ کے گلے میں آویزاں طلائی صلیب
یاد آجاتی۔ گرجوں سے اٹھنے والی گھنٹیوں
کی آوازیں اس کے ذہن میں حسین دوشیزہ
کی شیریں بیانی بن کر گونجنے لگتی۔

شہزادہ روزانہ نہر شنیل کے کنارے
چلا جاتا اور آنے جانے والی لڑکیوں
کے چہرے پڑھنے لگتا۔ مایوس ہو کر اپنے
خاندانی مقابر کا رخ کرتا۔ وہاں اس کا
دل کھول کر رونے بہنے لگتا لیکن کون جانتا
تھا کہ یہ آنسو واقعی اس خاندان کے لیے
بہتے تھے جو تباہی سے ہمکنار ہو چکا تھا
یا کسی اور شخصیت کی یاد میں جو تازہ فراق
کا زخم دے چکی تھی۔

گذشتہ دو برس سے فلورنڈا حادثات
زمانہ کا شکار ہو چکی تھی۔ اس کا باپ ایک
آزادی مذہب کا سربراہ تھا۔ اس تنظیم کا فلسفہ
نظریہ تھا کہ تمام مذاہب اور تمام شہریوں کو
یکساں طور پر مذہبی اور شخصی آزادی حاصل
ہونی چاہیئے۔ تنظیم اس مقصد کے لیے پچھلے
کئی سال سے سرگرم عمل تھی مگر اب اس کے
کام میں تیزی آگئی تھی اور حکومت اسے خطرہ
سمجھنے لگی تھی، چنانچہ فلورنڈا کے باپ کو
قتل کر دینے کا خفیہ منصوبہ تیار ہوا اور ایک
اندھیری رات میں اسے بڑی بے دردی
سے قتل کر دیا گیا۔ فلورنڈا کی ماں اس صدمے
کی تاب نہ لا سکی اور کچھ دنوں بعد وہ بھی
چل بسی۔ فلورانڈا زمانے کے آلام کا سامنا
کرنے کے لیے بالکل اکیلی رہ گئی تھی۔ وہ
اپنا زیادہ وقت کلیسا میں گزارتی۔ وہاں
سے نکلتی تو مسلمان بادشاہوں کی یادگاروں
میں چلی جاتی اور گھنٹوں وہاں گھومتی رہتی
کبھی کبھی غرناطہ کے حسین مرغزاروں اور
دلکش باغات میں حیران پریشاں سرگرداں
رہتی۔ اس کے شب و روز زندگی کی بہاریں

اور دلوں سے کٹ کر بالکل چپ چاپ گزر رہے تھے۔ لوگوں میں وہ "حسین راہبہ" کے نام سے مشہور ہو چکی تھی۔

معمول کے مطابق اس روز بھی فلورنڈا بنی احمر کے مقبروں میں گھوم رہی تھی اس نے دیکھا ایک قبر پر کوئی شخص اوندھے منہ پڑا ہے۔ قریب پہنچی تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ اس شخص نے عربی پوشاک پہن رکھی تھی۔ وہ قبر کو دیوانہ وار چوم رہا تھا۔ آنکھوں سے اشک جاری تھے۔ کبھی کبھی لمبی آہیں بھرنے لگتا۔ اس کی آہ و زاری سے فلورنڈا کے دل میں ہمدردی کی لہر موجزن ہو گئی وہ اور آگے بڑھی۔ اس کی آہٹ سے وہ شخص چونک پڑا۔ اٹھ کر آنے والے کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ایک ساتھ ملیں اور ایک دوسرے کو پہچاننے میں ذرا دیر نہ لگی۔ فلورنڈا نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی، پھر کہنے لگی: "تم اپنے بادشاہوں پر آنسو بہا رہے ہو۔ ان کی ... دل پر کوئی رونے والا نہیں رہا اور وہ خشک سالی کا شکار ہو چکی ہیں۔ اپنی آنکھوں کے سوتوں سے بہنے والے آبدار گوہر آبدار بھی ان پر نچھاور کر دو کہ یہ قبریں اسی طرح سیراب ہو سکتی ہیں۔"

اس کے ان الفاظ سے سعید کے دل و دماغ پر بجلی سی کوند گئی اور وہ بے اختیار پکار اٹھا "محترمہ! کیا آپ کے دل میں بھی ان بدنصیبوں کی ہمدردی کے جذبات مچل رہے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ وہ تو بہت عظیم لوگ تھے۔ حوادثاتِ زمانہ نے انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا تو کیا وہ اپنے تابناک کارناموں کی وجہ سے ہمارے چند آنسوؤں کے بھی مستحق نہیں رہے؟" جواب دیتے وقت اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ سعید کا تاثر اور گہرا ہو گیا۔ سرزمینِ غرناطہ میں وارد ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی اجنبی کی زبان پر اپنے دل کے احساسات الفاظ میں ڈھلتے ہوئے پائے۔

"کیا آپ نے ان بادشاہوں کے

محلات اور یادگاریں دیکھنا ہیں؟" فلورنڈا
نے پوچھا۔ سعید کچھ دیر گردن جھکائے
خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس کی آنکھوں سے
گرم گرم آنسو بہہ نکلے۔ ساتھ ہی لرزتی ہوئی
آواز سے کہا:
"نہیں! میں نے کئی بار ان آثار کو
دیکھنے کی کوشش کی، لیکن پھر پادری میری
اس آرزو کی تکمیل میں حائل ہو گئے ہیں
کیا معلوم ان آثار کو اگر دیکھنے کا کوئی حق
رکھتا ہے، تو وہ بدنصیب میں ہوں۔"
فلورنڈا کے دل میں سعید کے بارے
میں شوق جستجو پیدا ہو چکا تھا۔ اس نے
سعید سے معنی خیز انداز میں پوچھا "کیا آپ
کا ان سے کوئی خاندانی تعلق بھی ہے؟"
"محترمہ! میں تو ان کا ایک ادنیٰ غلام
ہوں۔ بھلا ایک غلام جیتے جی اپنے
آقاؤں کی یاد سے کیسے منہ پھیر سکتا ہے؟"
"اگر کل یہیں آ جائیں تو میں آپ
کو چھوڑی ہوئی منزل تک لے جاؤں گی"
فلورنڈا نے کہا۔

سعید نے گرمجوشی سے شکریہ ادا کیا اور
دونوں اپنی اپنی راہ پر ہو لیے۔ سعید
وہ دن اور رات انتظار کر کے کرب سے
کاٹے۔ اگلے روز سعید قبرستان پہنچا، تو
فلورنڈا کو منتظر پایا۔ وہ دونوں ماضی
یادگاروں کو دیکھنے نکل کھڑے ہوئے
اور پھر یہ ان کا روزانہ کا معمول بن
فلورنڈا کی معیت میں وہ ان تمام
پر پہنچا جہاں کسی عرب کے جانے کی
تھی۔ پھر پادری انھیں بے روک ٹوک
دیتے۔ پادریوں کو بھی اس پر کوئی
نہ تھا۔ ان کے خیال میں حسین راہبہ
کو اپنے مذہب کی طرف لا رہی تھی۔
دونوں محبت کی آگ میں پگھل کر ایک
روح میں تحلیل ہو چکے تھے لیکن کسی
اپنی اس اضطرابی کیفیت کو زبان
کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اب صرف
دیکھنا باقی تھا جس کے بعد بظاہر
کا یہ سلسلہ ختم ہو جانے والا تھا۔
سعید الحمرا کے سامنے کھڑا تھا۔

ہوتا تھا وہ حسین خواب دیکھ رہا ہے خوبصورت سرسبز و شاداب بلند پہاڑ پر ایک عظیم الشان عمارت نیلی فضا میں اڑتے ہوئے بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ اس پر حوادث زمانہ لوٹ پڑے تھے۔ لیکن وہ اسے ہزیمت سے آج تک دوچار نہ کر سکے۔ صدیاں، برسوں کا روپ دھار کر اور برس دنوں اور راتوں کی صورت میں اس عظیم قلعہ نما عمارت پر بیت چکے تھے۔ مگر یہ قلعہ ابھی تک قائم تھا۔ پھر شہزادہ محل میں داخل ہو گیا۔ اس کے خوبصورت ایوان، عظیم دالان، ستاروں سے محو گفتگو گنبد اور بلند و بالا برج دیکھ کر کچھ دیر کے لیے وہ دم بخود رہ گیا مگر جلد ہی عبرت کا پہلو اس کے تصور پر غالب آ گیا۔ اس کے خاندان کی چھنی ہوئی میراث اس کے سامنے تھی۔ ایک تہذیب اور ایک قوم کھنڈروں کی صورت میں دعوت نظارہ دے رہی تھی اور نظارہ کرنے والے کو عبرت کے سوا اور کیا حاصل ہو سکتا تھا۔ سوچ کی ایک لہر ابھری اور اس کی زبان پر نالہ و فریاد بن کر جاری ہو گئی۔

• میں الحمراء کے سامنے اکیلا کھڑا ہوں۔ کفِ افسوس ملتے ہوئے اپنا دامن عبرت سے بھر رہا ہوں۔

میں نے الحمراء سے پوچھا کیا اس کے بانی کبھی لوٹ کر آئیں گے؟

اس نے جواب میں کہا کبھی مر کر بھی کوئی واپس آتا ہے؟

ایسا محسوس ہوتا ہے یہ آثار پر آنسو بہا رہا ہوں۔ کیا میرے آنسو کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں؟

ایسا محسوس ہوتا ہے یہ آثار بھی غم زدہ ہیں جو اپنے مردوں کی جدائی پر ماتم کناں ہیں

سعیدان اشعار کی لذت کرب میں ڈوبا بڑے صحن تک پہنچ گیا۔ سرخ سنگ مرمر کے اس وسیع صحن کے ساتھ ساتھ چاروں طرف چلتے چلتے قطار اندر قطار ستون کھڑے ہیں۔ انہی کے ساتھ ساتھ حجروں کی قطار

اس دور کے مسلم فن تعمیر کی ترجمانی کر رہی تھی یہ حجرے اس کے خاندان کی رہائش گاہ تھیں۔

اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ شدت جذبات سے مضطرب آنسو آنکھوں سے چھلکا چاہتے تھے مگر ایک عورت کی موجودگی میں رونا بہت مشکل تھا۔ سعید، فلورنڈا کو پیچھے چھوڑتے ہوئے حجروں کی ایک قطار کی طرف چل دیا۔ ایک حجرے کے سامنے عربی میں لکھے ہوئے حروف پر اس کی توجہ مرکوز ہو کر رہ گئی۔ یہ اس کے دادا ابو عبداللہ کا کمرۂ خاص تھا۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ اور ارتعاش کی تیز لہر اٹھی۔ اس کے جذبات بے قابو ہو گئے ایک دلدوز چیخ سناٹے میں اس کے حلق سے نکلی۔ اس کے ساتھ ہی چند ٹوٹتے ہوئے الفاظ کی صدائے بازگشت سنائی دی۔ "ا.... با.... جی..." اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ فلورنڈا اس کی چیخ سن کر دوڑتی ہوئی آئی اور سعید کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگی۔

بڑی دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو فلورنڈا نے اسے تسلی دی اور کہا: "مجھے تو پہلے ہی دن سے شک تھا کہ تم ان بدنصیبوں کی اولاد میں سے ہو!"

اب یہ راز طشت از بام ہو چکا تھا اس لیے سعید نے اسے چھپانے کی کوشش نہ کی اور صاف صاف اپنی کہانی سنا دی غم کے بادل قدرے چھٹ گئے تو سعید نے فلورنڈا سے کہا: "زندگی میں بہت غم سہے لیکن اب سوچتا ہوں غم تازہ جان لیوا ثابت ہو گا!"

"غم تازہ اور جان لیوا" فلورنڈا نے سوالیہ لہجے میں کہا: "وہ ایسا کیا غم ہے؟"

"مجھے آخر ایک روز یہاں سے جانا ہے۔ تمہارے اور میرے درمیان سمندر حائل ہو جائے گا اور پھر شاید ہم زندگی میں کبھی نہ مل سکیں گے... وہ آنچ جس نے میرے دل کو گرما دیا۔ مجھے ہمیشہ تڑپاتی رہے گی"

"لیکن میرے اور آپ کے درمیان

پہلے ہی ایک سمندر حائل ہے۔ میں نہ تو آپ کی ہم مذہب ہوں اور نہ خاندان کے اعتبار سے ہمسر۔"

"نسل اور خاندان کے امتیاز کی ہمارے ہاں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ رہا مذہب، تو ہم مذہب نہ ہونے کے باوجود ہم ایک دوسرے سے متصادم ہوئے بغیر پورے اخلاص اور بے لوثی کے ساتھ زندگی کی شاہراہ پر چل سکتے ہیں۔"

رات کی تاریکی پھیل رہی تھی۔ وہ دونوں اپنی جگہ سے اُٹھے باتیں کرتے ہوئے وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں وہ عموماً جدا ہوتے تھے۔ جدائی سے پہلے فلورنڈا نے اپنا ہاتھ سعید کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کے سُرخ رخسار اور زیادہ سُرخ ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا وہ کوئی اہم فیصلہ کر رہی ہے۔ آخر اس نے اپنا فیصلہ سُنا دیا! "شہزادہ محترم! اگر آپ مجھے بے لوث محبت دینے کا وعدہ کر چکے ہیں تو میں بھی آپ سے جواب میں آپ کو اخلاص سے بھرپور محبت کا یقین دلاتی ہوں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اپنے راستے پر ہو لی۔

کاروانِ حیات چلتا رہا اور وہ اس کے جلو میں ایک دوسرے سے قدم ملائے رواں رہے۔ سعید کو چھوڑی ہوئی منزل میں جیسے سکون میسر آ گیا۔

* * *

ایک دن وہ دونوں عین الرفع سے نکلنے والی ندی کے کنارے بیٹھے اس کی ننھی منی موجوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ مستقبل کے بارے میں حسین منصوبے بنا رہے تھے اچانک حاکمِ شہر کا بیٹا جان روڈرک اِدھر آ نکلا۔ حسین راہبہ کو سعید کے ساتھ دیکھا تو لال بھبوکا ہو گیا۔ وہ فلورنڈا سے مدت سے واقف تھا اور جانتا تھا فلورنڈا باقاعدہ طور پر راہبہ نہیں بنی، بلکہ اس نے اپنے دکھوں کو بھلانے کی خاطر کلیسا میں پناہ

لے رکھی ہے۔ وہ اس کے حسن سے بہت متاثر تھا اور اس کی چاہت کا دم بھرتا تھا لیکن فلورنڈا نے اس کی شادی کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس نے کہا تھا وہ اپنے باپ کے قاتل کے بیٹے سے شادی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس جواب پر جان آگ بگولا ہو کر لوٹ گیا تھا۔ اب اسے انتقام لینے کا اچھا موقع ہاتھ آیا تھا اس کے دل میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ فلورنڈا اس عرب نوجوان کے ساتھ محبت کرتی ہے جبھی تو اس نے مجھے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اس کے دل میں اپنے رقیب سے انتقام لینے کا جذبہ بھڑک اٹھا۔

٭ ٭ ٭

چند روز بعد ابو عبداللہ کا پوتا، یوسف کا بیٹا اور بنی احمر کا آخری نوجوان اپنے عظیم الشان محلات اور خوبصورت باغات میں سے زنجیروں سے جکڑے ہوئے گزر رہا تھا۔ پولیس نے اسے محکمہ سراغرسانی کے ایک اعلیٰ افسر کے سامنے پیش کیا۔ اس کے خلاف ایک راہبہ کے اغوا اور اسے اپنے دین سے برگشتہ کرنے کا الزام تھا۔ یہ ایسا جرم تھا جس کی سزا موت تھی۔ شہزادے نے اس الزام کی صحت سے انکار کیا۔ اس کے جواب میں اعلیٰ افسر کے ساتھ بیٹھے جج نے کہا کہ شہزادے! تم محض انکار کر کے بری نہیں ہو سکتے۔ البتہ عیسائی مذہب قبول کر لو تو فیصلہ بدلا جا سکتا ہے۔

یہ سعید کی انا پر زبردست وار تھا جسے وہ برداشت نہ کر سکا۔ وہ پوری قوت سے چیخا اور عدالت میں موجود لوگوں کے سامنے جج سے مخاطب ہوا:

"کیا تمہارا مذہب اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ جو اس مذہب کو قبول نہ کرے، اس کا خون بے دریغ بہا دیا جائے؟ کیا تمہارے رسولوں کی کتابیں اسی مذہب کی دعوت دیتی ہیں؟ تم آج طاقتور ہو اور ہم کمزور ہیں اس لیے تمہاری ہر نازیبا حرکت سچائی اور صداقت کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ جب کہ اس کے حق میں ایک بھی دلیل

نہیں دی جا سکتی۔ قوت کے بل پر تمہیں یہ اختیار حاصل ہے کہ ہمارا خون بہا دو اور ہمارے حقوق سلب کر لو۔ یہی نہیں ہمارے شعائر کے ساتھ ساتھ ہماری اسلامی سوچ پر بھی پہرے بٹھا دو تا وقتیکہ ہم اس دین کو قبول نہ کر لیں جس میں آج صداقت نام کی کوئی چیز نہیں۔ ہماری بدقسمتی یہی تو ہے کہ ہم طاقتور نہیں اور طاقتور اپنا ہر فیصلہ منوایا کرتا ہے۔ ایک کمزور طاقتور کا فیصلہ سننے کے لیے بالکل تیار ہے۔"

ولی عہد شہزادے کی یہ کاٹ دار باتیں سننے کی تاب کہاں تھی۔ وہ بھڑک اٹھا۔ اسے فوراً اس مقتل میں لے جایا جائے جہاں اب تک ایسے ہی دس ہزار بے دینوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا۔"

عیسائی اس خونی تماشے کو دیکھنے کے لیے بھاری تعداد میں موجود تھے۔ جلاد نے تلوار بلند کی اور دوسرے ہی لمحے شہزادے کا سر تن سے جدا ہو چکا تھا۔ بنی احمر کا آخری فرزند اپنی منزل پا چکا تھا۔ وہ منزل جہاں صدیوں پہلے مسلمانوں کا اولین قافلہ اترا تھا اور پھر کوئی چوبیس برس پہلے ان کا آخری قافلہ روانہ ہوا تھا۔ آج وہ بنی احمر کے آخری فرزند کے خون سے رنگین ہو چکی تھی۔

سعید کا سر کٹتے ہی ایک نوجوان عورت کی چیخ بلند ہوئی۔ یہ فلورنڈا تھی۔

اگلے روز قبرستان میں ایک قبر کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اسی روز شدید بارش ہوئی اور قبر کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گڑھے پانی سے بھر گئے۔ قبر کے ایک طرف ایک تختی آویزاں تھی۔

"یہ بنی احمر کے آخری فرد کی آرام گاہ ہے ـــ منجانب فلورنڈا جو موت تک اس صاحبِ قبر سے کیے ہوئے وعدے پر قائم رہے گی۔"

تلک الایام نداولہا بین الناس

بڑھیا کی موت

ذاکر تونسوی

بڑھیا چارپائی پر پڑی اونگھ رہی تھی اونگھ بھی اور ایک حسین خواب بھی۔ کیونکہ اس نے آج اپنے اکلوتے بیٹے بنی کے لئے ڈبل ڈونڈ دودھ سے کھیر بنائی تھی۔ بیٹے کو تو یاد نہیں تھا، ماں کو یاد تھا کہ آج کے دن ہی میرے بنی نے میری کوکھ سے جنم لیا تھا کھیر کھلا کر پھر اُسے بتائے گی "بنی بیٹا آج سے تیرہ سال پہلے تو اس دنیا میں آیا تھا اور پھر تو بڑا ہوتا گیا، ہوتا گیا اور چند سال بعد تو اتنا بڑا ہو جائے گا کہ میں تیرے لئے چاند سی بہو اس گھر میں لاؤں گی اور

پھر ــــ اور پھر

بڑھیا، خوشگوار مستقبل کے خوابوں میں جھولا جھول رہی تھی کہ اچانک کالونی گونج اٹھی۔ "باڑھ آ گئی، جان بچاؤ، باڑھ آ گئی"

خواب اس تیز رفتار گونج میں منتشر ہو گیا وہ کمزور گھٹنوں پر اپنے کمزور ہاتھ رکھ کر اٹھی دروازے تک آئی، باہر جھانکا۔ کالونی کے سبھی گھونسلہ نما مکان بیک وقت چیخ رہے تھے۔ "باڑھ! باڑھ" جیسے گونگوں کو زبان مل گئی تھی۔ جیسے وہ زبان ملنے کے لئے باڑھ ہی کا انتظار کر رہے تھے

بڑھیا گھبرا گئی۔ باڑھ کا پانی اُس کے گھر کی چوکھٹ پر تابڑ توڑ حملہ کر رہا تھا اس نے گردن باہر نکال کر سارے گھونسلوں کو آواز دی: "تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے اپنی جان بچانے کے لئے کیوں کہہ رہے ہو میری جان تو میرے بنی بیٹے کے اندر بسی ہوئی ہے!"

بڑھیا کی آواز کا کوئی جواب نہیں آیا

کیونکہ سبھی مرد و زن باڑھ کی موت سے خوفزدہ ہونے میں مصروف تھے۔ نیم مردہ لوگ بھی مرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہر آدمی سامان کی گٹھڑی باندھنے میں مصروف تھا۔ ہر آدمی تیرتی ہوئی کشتیوں پر سوار ہونے کے لئے دوسرے آدمیوں کو پیچھے دھکیل رہا تھا۔ ہر آدمی دوسرے آدمی سے الگ ہو گیا تھا۔ ہر آدمی اپنے ہی چند سانسوں کے تاریک و تنگ خول میں بیٹھا تھا اور جیسے کہہ رہا تھا: "میں ابھی کچھ دیر جینا چاہتا ہوں۔ مجھے اس بے رحم باڑھ کی موت سے نکال کر لے چلو۔"

بڑھیا نے سوچا۔ کیا میں بھی اپنی گٹھڑی باندھ لوں۔ "اوئے شامے! او شامے! کیا میں بھی گٹھڑی باندھ کر نکل چلوں۔" اس نے پڑوسی شامے کو پکارا۔ جو گہرے پانی میں، ایک کندھے پہ اپنے بچے اور دوسرے کندھے پہ کچھ برتن لادے آ رہا تھا۔

"دیکھ لو چاچی اسکار کا حکم ہے نکلنا تو پڑے گا ہی۔ ورنہ باندھ میں تم اور سامان اور مکان سب ڈوب جائے گا۔"

"اچھا شامو، میں گٹھڑی باندھ کر لوں سنو، میں بنسی کے لئے کھیر بھی ساتھ لے چلوں گی اور اس کا پاجامہ بھی، کتابیں بھی ـــ وہ کمائی کے ساتھ پڑھائی بھی کرتا رہتا ہے نا شامے"

مگر شامے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کشتی کی طرف تیزی سے بڑھ گیا تھا۔ بڑھیا کے جذباتی فقرے سننے کے لئے فرصت ہی کس کے پاس تھی ـــ بڑھیا شامے کی بے نیازی دیکھ کر افسردہ ہو گئی۔ یہ کس پیار سے مجھے چاچی کہا کرتا تھا۔ آج اس کے پیار کو کونسا سانپ سونگھ گیا ہے۔

بنسی بیٹی! جب تک تو نہیں آئے گا میں بھی کہیں نہیں جاؤں گی۔ اس کے ضمیر میں کچھ لہریں سی اٹھیں۔ مگر بنسی کہاں ہوگا؟ وہ ضرور مجھے بچانے کے لئے آ رہا ہوگا مجھے اس کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ گھر کے اندر چلی گئی۔ اس کے تعاقب میں باڑھ کا پانی بھی چوکھٹ پار کر کے اندر چلا آیا۔ یوں چلا آیا جیسے موت غریبوں کے پیدا ہوتے ہی ان کا تعاقب کرنے لگتی ہے جو بھی

پچھلی سطح پر رہے کا سیلاب ہو یا سماج کے ڈبونے کے ہی در پے رہتے ہیں۔

بڑھیا نے پانی بڑھتے دیکھا تو اس نے جلدی جلدی بنسی کی کھیر، کتابیں اور کپڑے باندھ کر ایک گٹھری بنالی۔ جونہی میرا بنسی نمودار ہوا۔ گٹھری سمیت اس کے ساتھ چل دوں گی۔ گٹھری باندھ کر وہ بڑے اطمینان سے دروازے کے باہر گھٹنے گھٹنے پانی میں کھڑی ہو گئی۔

دس منٹ، پندرہ، آدھا گھنٹہ ایک گھنٹہ۔ بنسی نہیں آیا۔ ہائے رام! اسے بھی کہیں ظالم باڑھ نے نگل نہ لیا ہو۔ اس کا دم اس خوف سے گھٹنے لگا۔ وہ پانی میں گرنے ہی لگی تھی۔ بلکہ بہنے ہی لگی تھی کہ اچانک شامے پڑوسی پھر ادھر سے گزرا۔ اس کی بیوی ہمراہ تھی۔ بیوی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "وہ بیچاری بڑھیا....."

شامے نے کہا: "چاچی! ابھی کہا تو کشتی تک پہنچ جاؤ۔ مگر تم ابھی تک...؟"

"میں اپنے بنسی کا انتظار کر رہی ہوں!"

"ارے چاچی! بنسی نہ جانے کہاں ہوگا زندہ ہوا تو آجائے گا۔ تم تو سرکاری کیمپ میں چلو۔ یہاں موت کے منہ میں...؟"

اور یہ کہہ کر شامے، بڑھیا کو ہاتھ سے گھسیٹ کر بڑی مشکل سے کشتی تک لے گیا اور بولا۔

"اب چڑھ جاؤ اس پر!"

"ٹھہرو!" ایک سرکاری ادھیکاری کی آواز آئی۔ "بڑھیا! کیا تمہارے پاس راشن کارڈ ہے؟"

"راشن کارڈ؟ میں بڑھیا کیا جانوں بیٹا! میرے بنسی بیٹے کو معلوم ہوگا!"

"تو پھر اتر جاؤ، سرکار کا سخت حکم ہے۔ جس کے پاس راشن کارڈ نہ ہو اسے مت چڑھاؤ۔ ریلیف کیمپ میں بھی مت لے جاؤ۔ اترو۔ اترو"

اور راوی کہتا ہے کہ ریلیف کی کارروائی میں راشن کارڈ کی اہمیت انسان سے زیادہ تھی۔ ریلیف راشن کارڈ کو چاہیے جاندار انسان کو نہیں ہے۔ ادھر سے

راوی کا بیان ہے کہ کشتی کو چھوٹنے کی چونکہ بہت جلدی تھی۔ اس لئے بڑھیا کو کسی نے نہ کا دھکا دے دیا اور وہ گھڑ سمیت باڑھ کے پانی میں جا گری۔

اور تیسرا راوی کتھا کو سماپت کرتے ہوئے بولا — اور بھائیو! جب بڑھیا کا بیٹا بنسی اپنی ماں کی ریلیف کے لئے آیا تو اسے اس کی لاش تنکے کی طرح تیرتی ہوئی ملی اور جب دھرم کی مریادا کے انوسار وہ اس لاش کو شمشان گھاٹ کی طرف لے چلا تو اسے بتایا گیا۔ لاش کہیں اور لے جاؤ شمشان گھاٹ سیلاب کے پانی میں غرق ہو چکا ہے۔

مرزا ادیب نے کس خوبصورتی سے عورت کی نفسیات کا تجزیہ کیا ہے!

پیچ و خم

مرزا ادیب

سلادن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہر کی گلیوں اور محلوں میں آوارہ گردی کے بعد جب سورج ڈوبے اس نے ڈرتے ڈرتے، کانپتے کانپتے گھر کے دروازے پر اپنا پہلا قدم رکھا اور جھانک کر دالان میں دیکھا تو اسے سب سے پہلے اپنی ماں نظر آئی جو روز کی طرح پانی کے نل کے نیچے گندے کپڑوں کا ڈھیر لگائے بیٹھی تھی۔ ڈنڈا اس کے ہاتھ میں تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو پونچھتی جا رہی تھی۔ یہ منظر کوئی نیا نہیں تھا۔ وہ کم و بیش ماں کو روزمرہ اسی حالت میں دیکھتا تھا۔ کام کرتے کرتے اس کے ہاتھ یک لخت رک جاتے تھے اور پھر یا تو وہ چپ چاپ سر پہ ہاتھ رکھے کافی دیر تک اسی حالت میں بیٹھی رہتی تھی اور یا خاموشی کے ساتھ رونے لگتی تھی، وہ سوچتا تھا سوچتا اور سوچ سوچ کر رونا اس کی عادت بن گئی تھی، مگر کبھی یہ سوال ضرور ایک کانٹے کی طرح اس کے ذہن میں چبھنے لگتا تھا کہ آخر میری ماں کو ہو کیا گیا ہے۔ اس کی یہ حالت کیوں ہے؟ محلے میں اور بھی مائیں ہیں۔ سب خوش خوش دکھائی دیتی ہیں۔ اپنے بچوں سے بڑا پیار کرتی ہیں۔ مگر یہ میری ماں ہے کہ اسے رونے دھونے، بددعائیں دینے اور چپ چاپ گھنٹوں بیٹھے رہنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ کوئی دن بھی ایسا نہیں گزرا جب میری ماں نے کوئی نہ کوئی کام کرتے ہوئے آنسو نہیں بہائے اور کسی نہ کسی بہانے مجھے بددعائیں نہ دیں

وہ اپنی ماں کی اس عادت سے اس قدر بیزار ہو چکا تھا کہ اس کا جی بے اختیار چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور چلا جائے اور پھر کبھی واپس نہ آئے۔ اس گھر میں اسے ملتا ہی کیا ہے، گالیوں اور بددعاؤں کی بوچھاڑ اور طرح طرح کے طعنے۔ ہر روز گالیاں اور بددعائیں سن سن کر اُس کے کان پک چکے تھے اور آج بھی اُسے یقین تھا کہ جیسے ہی ماں کی نظر اُس پر پڑے گی گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو جائے گی جو اس وقت تک جاری رہے گی جب تک وہ اس کی نظروں سے دور نہیں ہو جائے گا۔

ماں سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ یہ موقع غنیمت تھا اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کوٹھری کے اندر چلا گیا۔ بھوک سے بے تاب ہو رہا تھا، چولہے کے ارد گرد روٹیوں کی چنگیر ڈھونڈنے لگا۔ آٹے کے کنستر کے اوپر چنگیر پڑی تھی اور پاس سالن کی ہانڈی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے چنگیر میں سے روٹی نکالی، ٹھنڈی روٹی کے ساتھ ہانڈی میں سے چنے کی دال نکالی اور یہ دال روٹی کے اوپر ڈال دی۔ سالن برتن میں ڈالنا اس کے نزدیک محض ایک تکلف تھا۔ ویسے بھی اُسے یہ فکر بھی رہی تھی کہ کہیں اس کی ماں اندر آ کر اس کا سارا منصوبہ خاک میں نہ ملا دے۔

وہ جلدی جلدی نوالے نگلنے لگا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے کہ اس کے کان میں ڈنڈے کی آواز آئی۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ اب ماں سارے کپڑے دھو کر اور الگنی پر سوکھنے کے لیے پھیلا کر ہی آئے گی۔ یہ سوچ کر اس کے ہاتھوں کی تیزی کافی حد تک کم ہو گئی۔

پوری روٹی پیٹ میں اتارنے کے بعد اس کی بھوک ختم ہو گئی۔ چولہے کے پیچھے تانبے کا گلاس پڑا تھا اور پانی کا گھڑا باہر تھا۔ اس نے گلاس اٹھایا اور جس انداز سے کوٹھری کے اندر آیا تھا، اسی انداز سے باہر آیا۔ گھڑے میں سے گلاس بھرا اور دوبارہ کوٹھری میں آ گیا۔ اس کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اب وہ بے فکر

ہوگیا تھا. ماں باہر تھی، روٹی پیٹ میں تھی
اور فی الحال کسی قسم کی الجھن اسے پریشان
نہیں کر رہی تھی. وہ ایک فلمی گیت گنگنانے
لگا۔

رات دن لیلیٰ پڑی رہتی ہے یوں
اپنے پہلو میں چھپائے درد دل

یکایک اس نے آواز روک لی. آنکھیں
بند کرلیں. ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے. اس
کی چھٹی حس نے اسے بتا دیا تھا کہ ماں کوٹھڑی
کے اندر آرہی ہے اور ماں سچ مچ اندر آگئی.
اندر آتے ہی وہ اس کی چارپائی کی طرف
قدم اٹھانے لگی.

اس نے اپنی طرف سے اتنی احتیاط
برتی تھی کہ سانس تک روک لی تھی مگر جیسے
ہی ایک گرم گرم قطرہ اس کی پیشانی پر گرا
تو وہ بے چین ہوگیا. اس نے اندازہ لگا لیا
کہ اس کی ماں رو رہی ہے. وہ اٹھ بیٹھا.

"اماں!" اس نے غنودگی کے عالم میں
ماں کو مخاطب کیا تھا.

اسے توقع تھی کہ گالیوں اور طعنوں
کا طوفان آجائے گا لیکن ایسا نہ ہوا. ماں
اسے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا اور
پیار سے بولی:

"برکت! روٹی نہیں کھائی؟"

"کھالی ہے اماں!"

اماں اس کے پہلو میں بیٹھ گئی. اس
نے محسوس کیا کہ ماں کے منہ سے جو سانس
نکل رہا ہے وہ گرم ہے. ماں اپنے مخصوص انداز
میں اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگی.

"دو سے برکتا!" پیار کے لمحوں میں
اسے اسی طرح مخاطب کیا کرتی تھی.

"جی اماں!"

"اللہ جانے سارا دن کہاں رہتے ہو
پاؤں کے چھالے کا کیا حال ہے؟"

برکت نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا. ماں
کی آنکھیں آنسوؤں سے نم آلود تھیں اور
گالوں پر جا بجا دھبے سے نظر آرہے تھے.

"پاؤں دکھاؤ!"

"ٹھیک ہوں اماں!"

"کرماں مارے دکھاتو!"

ماں کے اصرار پر اس نے اپنا دایاں
پاؤں آگے بڑھا دیا۔ ماں نے نیچے زمین
پر بیٹھ کر اس کا پاؤں دونوں ہاتھوں
سے اوپر اٹھایا اور اس کے چہرے پر
غم واندوہ کے سائے گہرے ہوگئے۔

"ہاں میں مرجاواں!"

"اماں اب تو ٹھیک ہوگیا ہے!"

ماں نے پھر رونا شروع کردیا۔ برکت
نے پاؤں زمین پر رکھ دیا۔

"تم سب لوگ ہاتھ دھو کر میری جان
کے پیچھے پڑے ہو!" اور اس کی آنکھوں
سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

"اماں! یہ چھوٹا سا تو۔۔۔"

"نامراد! چھوٹا چھالا ہی بڑا ہو جاتا
ہے۔ پھر ڈاکٹر آپریشن کرتا ہے!"

ماں کا ہاتھ اس کے دوپٹے پر سرخ
دھبہ پڑ گیا۔ اب برکت کو معلوم ہوا کہ ماں
کے ہاتھ سے لہو نکل رہا ہے۔

"اماں، تیرا ہاتھ۔۔۔" وہ سراپا استفہامیہ
نشان بن گیا تھا۔

"کپڑے دھو دھو کر ہاتھوں کا یہ حال
ہو جاتا ہے۔ پر اس سے کیا ہوتا ہے۔ معمولی
بات ہے!"

"اماں! تو اتنے سارے کپڑے کیوں
دھوتی ہے؟"

ماں نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔
اس کا چہرہ پیڑ سے ٹوٹی ہوئی ٹہنی کی طرح
سیاہ پڑ گیا۔ وہ کئی لمحے چپ چاپ اسے دیکھتی
رہی اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ
آگئی جیسے اندھیرے میں کوئی مدھم دیا اپنے
سینے سے بمشکل روشنی نکال رہا ہو۔

"کیوں دھوتی ہے اتنے سارے کپڑے؟"
برکت نے اپنا سوال دہرایا۔

"کیوں دھوتی ہوں۔۔۔ تو نہیں جانتا!"

"نہ دھویا کرو!"

ہوا چلنے سے جیسے موم بتی کی لو تھرتھرا
اٹھے، ماں کے ہونٹ حرکت کرنے لگے۔
مگر وہ الفاظ اس قدر دھیمے لہجے میں کہہ رہی
تھی کہ وہ کچھ بھی نہ سن سکا۔
اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا اور

ماں کا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کی ہتھیلی سوجی ہوئی تھی اور بڑی انگلی جس جگہ سے شروع ہوئی تھی وہاں سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔

اس کے اندر خون کھولنے لگا۔

"اماں! تو کپڑے نہیں دھوئے گی۔ تو ان کی نوکر نہیں ہے۔ تو۔۔۔"

ماں نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔

"پرے ہٹ کیا؟" وہ اس کا فقرہ کاٹ کر بولی: "ماں مرتی ہے تو مر جائے تیری بلا سے ساری دنیا کے دکھ میرے لیے ہیں۔ اللہ جانے کیا گناہ کر بیٹھی ہوں کہ نصیبوں جلی کو موت بھی نہیں آتی۔ آجائے تو جان عذاب سے چھوٹ جائے!"

یہ فقرہ سن کر اس کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا اور وہ گھبرا کر چارپائی سے اٹھ بیٹھا۔ ماں کے جذبات کا دھارا نہ جانے اب تک کہاں رکا رہا تھا اور سب نکلا تھا۔ وہ دل میں خوف زدہ تھا کہ اگر کچھ کہا تو قیامت برپا ہو جائے گی۔ وہ چپ چاپ کھڑا رہا اور ماں کے آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ اس کے آنسوؤں کے ساتھ اس کے ہونٹ بھی مسلسل حرکت کر رہے تھے۔

"فجر کی نماز کی بانگ ہوتی ہے تو کام کرنے لگتی ہوں۔ کونسا کام ہے جو میں نہیں کرتی۔ اس پر بھی ان لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ ذرا ذرا سی بات پر طعنے دے دے کر زندگی حرام کر دیتے ہیں اور وہ تمہاری چاچی!"

برکت کا جی چاہا کہ فوراً ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دے۔ وہ ڈرتا تھا کہ اگر اس کی چچی نے ایک لفظ بھی سن لیا تو وہ کنبے کے زندہ یا مردہ کسی کو بھی معاف نہیں کرے گی۔۔۔ مگر وہ ماں کے غصے سے بھی ڈرتا تھا اور جو کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی، فوراً کہنے لگا۔

"اماں، ہاتھوں پر گھی لگا لے، آرام آجائے گا۔"

مگر ماں کب رکنے والی تھی۔ جھولی پھیلا کر اور اوپر دیکھتے ہوئے بولی:

"اللہ کرے مہتاب بی بی، تیرا بیڑہ غرق

ہو جائے. کیڑے پڑ جائیں تیرے بدن میں!"

مہتاب بی بی، برکت کی چچی کا نام تھا.

اس کا دل بڑی طرح دھڑکنے لگا کئی بار اس نے اپنی ماں اور اپنی چچی کے درمیان لڑائی کا معرکہ دیکھا تھا اور ایسے موقع پر وہ سخت پریشان ہو جاتا تھا اور ان لمحوں میں بھی ہونے والی لڑائی کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا.

ماں بولتے بولتے تھک گئی تھی کیونکہ وہ خلاف توقع خاموش ہو گئی تھی.

برکت بڑی بے چینی سے اس طوفان کا انتظار کر رہا تھا جو ابھی سمندر کی تاریک گہرائیوں میں شاید اپنی طاقت مجتمع کر رہا تھا پھر وہ سر اٹھائے گا. اور ایک ایسا ہنگامہ بپا ہو جائے گا کہ اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے اور پھر وہ ساری رات سو نہیں سکے گا.

ماں اور بیٹا دونوں ایک دوسرے کے سامنے ایک ڈیڑھ فٹ کی مسافت پر کھڑے تھے. ماں اُسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی اور بیٹا بے ارادے کے اپنا دایاں ہاتھ سر کے بالوں میں پھیر رہا تھا.

ماں نے جھرجھری سی لی. وہ دوپٹے کے پلو سے آنسو اور ناک خشک کی اور اپنا دایاں ہاتھ برکت کے سر پر رکھ دیا. برکت اس غیر متوقع کارروائی پر حیران رہ گیا.

"برکت!"

برکت نے اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی.

"وے برکتا!"

"برکتا! وے برکتا! تیری غیرت کدھر گئی ہے؟ تجھے اپنی ماں کی عزت کا خیال نہیں ہے؟ بول ناں. وے برکتا بول ناں!"

ماں نے اس کے سر سے ہاتھ الگ کر لیا.

"تیرے باپ کو مرے تین سال اور سات مہینے ہو گئے ہیں. ہائے وہ کیا منحوس دن تھا جب وہ ہمیں تیری چاچی کے حوالے کر کے آپ قبر میں جا سویا تھا. وہ دن اور آج کا دن مصیبت ختم ہی نہیں ہوتی. کبھی سارا شہر

ہماری عزت کرتا تھا پر آج ہم گلیوں کے تنکے
ہیں۔ نہیں تنکے ہم سے سو درجہ اچھے ہیں!"
ماں نے انگلیوں سے آنسو پونچھے۔ جو
پھر آنکھوں سے نکل کر گالوں پر آ گئے تھے۔
"اماں! چاچی بڑی بُری عورت ہے!"
اس نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔
"پر ہم اس کے گھر میں بیٹھے ہیں!"
کیا بیٹے کو یہ بات معلوم نہیں تھی۔
جو وہ اسے بتا رہی تھی۔ اس کے جواب میں
وہ کیا کہہ سکتا تھا؟ ماں کہنے لگی۔
"برکتا! اب تو کوئی بچہ نہیں ہے اللہ
رکھے تیرہ چودہ برس کا ہو گیا ہے۔ اگر تو کہیں لگ کر
ہو جائے اور ہمیں روٹی کپڑا کی فکر نہ رہے تو
اللہ جانتا ہے۔ میں اس گھر میں ایک دن بھی
نہ رہوں یہ سب کچھ تیری وجہ سے ہو رہا ہے
یہ ساری مصیبت تیری وجہ سے ہے۔ میں
کیا کہہ رہی ہوں برکتا!"
"تو ٹھیک کہہ رہی ہے اماں!"
"ہائے اللہ! وہ دن کتنا اچھا ہوگا جب
تو مجھ سے آ کر کہے گا اماں میں نوکر ہو گیا
ہوں۔ مکان کرائے پر لے لیا ہے!"
ساتھ نکل اس گھر سے ہائے! تیرے
یہ بات کب سنوں گی؟"
اب ماں کا حلق سوکھ گیا تھا
پر گر پڑی۔ اس کا سر چھایا ہوا چہرہ وہ
آدھی رات ہو گئی جب اس کی
گئی۔ ماں اس کی چارپائی سے ذرا دو
تھی۔ فضا میں بارھویں اور تیرھویں
چمک رہا تھا اور اس کی روشنی روشن
سے گزر کر کمرے کے اندر آ رہی تھی۔
روشنی میں اس نے ماں کی طرف دیکھ
سہم سا گیا۔ اسے ماں کا چہرہ بہت
دکھائی دے رہا تھا۔
فرطِ جذبات سے اس کے دماغ
تن گئیں۔ گلا خشک ہو گیا۔ سر میں کانٹے
چبھنے لگے۔ اس سے پہلے کبھی اس کی
حالت نہیں ہوئی تھی۔
وہ دل میں اپنے آپ پر لعنت بھیج
ماں نے بالکل سچ کہا ہے وہ میری وجہ
دکھی ہے۔ میں بچہ نہیں۔ تیرہ چودہ برس

ہو گیا ہوں۔ میں کیا کر رہا ہوں۔ آوارہ گردی —
میں نے ماں کو بڑا دکھ پہنچایا ہے۔

ماں نے کروٹ بدل کر چہرہ دوسری طرف کر لیا اور وہ اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"ہائے"

کیا یہ اس کی ماں کی آواز تھی۔ اسی نے ہائے کہا ہے۔ بے چاری سوتے میں بھی ہائے ہائے کر رہی ہے۔

نہ جانے وہ کس وقت تھک کر لیٹ گیا اور کس وقت نیند اس کی آنکھوں میں آ گئی۔ صبح جب سورج کی کرنیں روشندان کے راستے سے اندر آ رہی تھیں اور اس کے چہرے کو چھو رہی تھیں تو وہ جاگ اٹھا۔ ماں اپنی چارپائی پر نہیں تھی۔ باہر کام کر رہی تھی۔ ماں سے کچھ کہے بغیر وہ گھر سے باہر نکل گیا اور اپنے دوست منیر کے گھر پہنچا۔ منیر کا ابا کرسی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

"چاچا جان، السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام! آؤ برکت! آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ رات سوئے نہیں تھے؟"

برکت نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔

"چاچا!"

"کہو! کیا بات ہے؟ ماں اچھی بھلی تو ہوئی ہے؟ مگر تمہارا یہ تو ہوتی ہی رہتی ہے۔"

"چاچا! میں آپ کے پاس آیا ہوں۔"

"میں دیکھ رہا ہوں تم آئے ہو۔ صاف صاف کہو کہنا کیا چاہتے ہو؟" منیر کے ابا نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نوکری کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم — نوکری —" منیر کا ابا ہنسنا چاہتا تھا، مگر دھواں اس کے حلق میں پھنس گیا اور وہ بے تحاشا کھانسنے لگا۔

"ہاں چاچا! میں نوکری کروں گا۔ چاچا کے گھر میں ہم کیلوں کے تنکے نہیں ہیں۔ تنکے بھی ہم سے سو درجہ اچھے ہیں۔" برکت نے ماں کے الفاظ دہرائے۔

منیر کے ابا اسے بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

کئی لمحے خاموشی طاری رہی۔
"کیسی نوکری کرو گے؟" منیر کے ابا نے

اس پر شکوک انگیز نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

"جیسی بھی مل جائے۔"

"میرے پریس میں ایک آدمی کی ضرورت ہے جو بازار سے ضرورت کی چیزیں خرید لایا کرے۔"

"اچھا۔"

"آدمی بڑا ایمان دار چاہیے۔ روپے پیسے کا معاملہ ہے۔" منیر کے ابا نے اسے اپنی طرف سے آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ "کرلوگے؟"

"اچھا جی۔"

منیر کا ابا اسے دیکھتا رہا اور برکت کے چہرے پر عزم و ارادہ کی پختگی لمحہ بہ لمحہ نمایاں ہوتی گئی۔

"اچھا، کل صبح منیر کو ساتھ لے کر پریس آجانا۔ پتہ ہے نا پریس کہاں ہے؟"

برکت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بات ختم ہوگئی۔ برکت نے طے کرلیا کہ جب تک مکان کی چابی اس کے ہاتھ میں نہیں آجاتی، وہ اپنی ملازمت کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں کہے گا۔ اور جب کرائے پر کوئی مکان مل جائے گا تو وہ چابی اماں کے قدموں پر پھینک کر کہے گا:

"اٹھو اماں! اب ہمارا یہاں کوئی کام نہیں۔"

برکت صبح سویرے نکل کر پریس میں چلا جاتا اور شام تک کام کرتا تھا۔ منیر کا ابا حیران تھا کہ اس میں ایسی تبدیلی کیونکر آگئی ہے۔ اور دوسری طرف اس کی ماں سمجھ رہی تھی کہ اس کا بیٹا حسب معمول آوارہ گردی کرتا رہتا ہے اور اس کی مصیبت کا اس پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوا۔

روزانہ بارہ سے ایک بجے تک پریس کے کارکنوں کو روٹی کھانے کے لیے چھٹی مل جاتی ہے۔ اس وقت برکت گھر کی تلاش میں مصروف ہوجاتا تھا۔ پندرہ بیس دن کی جدوجہد کے بعد اسے ایک گلی میں ایک چھوٹا سا مکان مل گیا اسی وقت وہ بھاگا بھاگا پریس پہنچا اور تنخواہ میں سے ایڈوانس رقم لے کر مالک مکان کو کرایہ ادا کردیا۔ ہاتھ میں چابی لئے جب وہ گھر کی طرف چلا تو اس کا جی چاہتا تھا کہ اسے پر لگ جائیں اور وہ اسی لمحے ماں کے پاس

پہنچ جائے۔ آج ماں کس قدر خوش ہوگی۔ اس خیال نے اس کی ٹانگوں میں بجلی سی بھر دی تھی۔

جب وہ گھر کے اندر پہنچا، تو اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ماں کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"کوٹھری میں ہوگی۔" اس نے سوچا اور واقعی ماں کوٹھری میں کھڑی تھی اور اپنا دوپٹہ کس کر سر کے اِرد گرد لپیٹ رہی تھی۔ چچی سے لڑائی کے بعد اس کے سر میں شدید درد ہونے لگتا تھا اور اس حالت میں وہ اپنا دوپٹہ سر پہ باندھ کر چارپائی پر لیٹ جاتی تھی۔

"اب تو فکر کی کوئی بات ہی نہیں۔" اس نے دل میں کہا اور ماں کے سامنے چلا گیا۔

"اماں!" فرطِ مسرت سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔"

ماں نے اسے دیکھا اور انگلیوں سے آنسو صاف کرنے لگی۔

"اماں! تیری میری مصیبت ختم ہو گئی ہے۔ مکان نے لیا ہے۔ یہ ہے چابی!"

اس نے چابی ماں کی طرف پھینک دی۔

"اماں میں نوکر ہو گیا ہوں اماں۔ سنا، میں نوکر بھی ہو گیا ہوں۔" اس نے دو بار یہ فقرہ کہا تاکہ ماں کو پوری طرح اپنا مطلب سمجھا سکے۔

ماں دو چار لمحے اسے گھورتی رہی اور اپنے سینے پر دو ہتڑ مار کر چیخ اٹھی۔

"ہائے اللہ! ان دشمنوں نے میرے معصوم بچے کو کیا پڑھا دیا ہے۔ اب گھر سے بھی نکال رہے ہیں۔ بے شرم! تو چاچا چاچی کی باتوں میں آ گیا ہے۔ اللہ کرے پہلا جنازہ نکل جائے۔ ہمیں کسی کی آئی آ جائے۔ ہمیں گھر سے دھکے دے رہے ہیں!"

اور وہ زور زور سے سینے پر دو ہتڑ مارنے لگی اور برکت اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بھیانک سپنا دیکھ رہا ہو۔ ◆

صبر، انسان کے بڑے پکے اور ٹھوس کاموں میں سے خاص کام ہے۔

اُمیدیں

حمیدہ بیگم

امیدیں

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کسی شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسا عمل بتلائیے جس سے میں خدا کا بھی پیارا بن جاؤں اور بندوں کا بھی پیارا بن جاؤں آپ نے فرمایا جو کچھ بندوں کے پاس ہے اس سے کلی طور پر مایوس ہو جا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے اس سے کبھی مایوس نہ ہو تو خدا اور خلق دونوں کا پیارا ہو جائے گا" (او کما قال)

سوچنے کی بات ہے کہ ایک انسان دوسرے کے لئے کر ہی کیا سکتا ہے اور سچ پوچھئے تو اپنے لئے کیا کر سکتا ہے کہ اس سے کچھ امیدیں باندھی جائیں اور ان کے پورا نہ ہونے پر آسمان سر پر اٹھا لیا جائے۔ انسان تو اتنا کمزور ہے کہ خود اپنی نہ عمر بڑھا سکتا ہے۔ نہ مرض دور کر سکتا ہے نہ اپنی شکل و صورت پر اُسے اختیار ہے۔ نہ اس کی قسمت اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ وہ تو اپنے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا چہ جائیکہ کسی دوسرے کے لئے بہت کچھ کر سکے۔ ایسی کمزور مخلوق سے جو شخص امیدیں باندھے گا وہ رنج و ناخوشی کو خود دعوت دے گا اور آرام و آسائش کے حصول کے چکر میں بالکل اسی طرح گم ہو جائیگا جس طرح ہم خود ہمیشہ اپنی ہی ضروریات اپنے ہی حقوق اور اپنے ہی آرام و آسائش کی فکر میں ڈوبے رہتے ہیں بلکہ دل ہی دل میں یہی گنتے رہتے ہیں کہ ہمارے متعلقین نے ہمارے فلاں فلاں حقوق ادا نہیں کئے اور ہماری فلاں فلاں امیدوں پر پانی پھیر دیا جب حال یہ ہے تو اس دنیا میں سکھی اور

مخلوقِ خدا کی آنکھوں کا تارا بن کر رہنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان سے کوئی امید نہ رکھی جائے ان سے کچھ نہ مانگا جائے بلکہ ہمیشہ کچھ دینے کو تیار رہیں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسرور و مطمئن رہنے کا یہی نسخہ تجویز فرمایا ہے کہ بندوں سے کلی طور پر مایوس ہو جاؤ۔

انسانوں سے امیدیں ختم کرنے کی مشق اپنے قریب ترین تعلق والوں سے شروع کرنی چاہیے جو بچہ طرح طرح کی فرمائشوں سے اپنے والدین کو زچ نہیں کرتا والدین خود اس کے لیے ہر اچھی چیز فراہم کر دیتے ہیں جو بیوی طرح طرح کے مطالبوں سے اپنے تئیں شوہر کے سامنے بے قدر نہیں کرتی بلکہ ہمیشہ اپنے آرام و آسائش پر میاں کے آرام و آسائش کو ترجیح دیتی ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں اپنی پسند کو اس کی پسند پر قربان کر دیتی ہے انجام کار اس کا شوہر از خود وہی کرنے لگتا ہے جو وہ چاہتی ہے۔ انتہائی کامیاب شادیوں کا راز یہی ہے کہ دونوں میاں بیوی نے اپنے اپنے حقوق یاد کرنے اور ان کی خاطر آپس میں جنگ کرنے کی بجائے اپنے اپنے فرائض کو پہچانا۔ یاد رکھا اور ادا کیا۔

فائدہ اس میں ہے کہ ہم دوسروں سے امیدیں رکھنے کی بجائے خود دوسروں کی امیدیں بڑھ بڑھ کر پوری کریں اور مثالی ماں، مثالی بہن، مثالی بیٹی، مثالی دوست مثالی ہمسائی اور مثالی مالکہ بننے کی جدوجہد کریں۔ اگر ہمارے والدین بہن بھائی اولاد ہمسائے اور عام رشتے دار بہت اچھے اخلاق کے مالک ہوں تو اس کا اجر ان کو ملے گا۔ ہم سے تو الٹی باز پرس ہوگی کہ تم نے فلاں فلاں کی طرف سے اتنے اتنے آرام پائے بتاؤ تم نے ان کی کیا قدر کی اور ان کا کس صورت میں کتنا شکر ادا کیا اور اگر ہمارے خیال میں خدانخواستہ خدانخواستہ ہمارے سب متعلقین خدانخواستہ کج خلق اور خود غرض ہیں تو خود ہی اندازہ

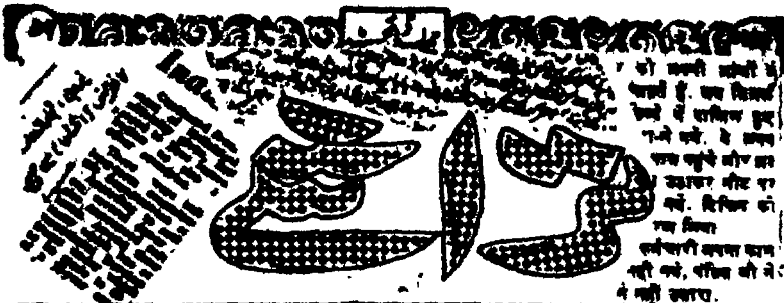
دیجئے کہ ایسی فضا میں ان کے ساتھ نیکی کرتا رہے
کرتے چلے جانا کتنے بڑے ثواب کا کام ہے
اور قرآن و حدیث اس پر کیا کیا انعامات
ملنے کی امید دلا رہے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ
علیہ وسلم نے احسان ناشناس رشتے داروں
کے ساتھ نیک سلوک کرنے کو اصل ایمان
اور بہت بڑا جہاد قرار دیا ہے۔ ورنہ
اچھا سلوک کرنے والے کے ساتھ اچھا
سلوک تو کافر بھی کر گزرتا ہے یہ کوئی
خاص خوبی نہیں ہے۔

یہ ساری نیکیاں اور ان پر ثبات
واستقامت اس صورت میں حاصل ہو سکتی
ہے کہ ہر حال میں اللہ سے پوری امیدیں
رکھی جائیں۔ اللہ سے امیدیں رکھنا بڑی
ہی معقول بات ہے کیونکہ اس کے خزانوں
میں ہر وہ چیز موجود ہے جو ہم کسی وقت
اس سے مانگ لیں، پھر وہ سخی کبھی ہے
مانگنے والوں سے خوش رہتا ہے اور بے
نیاز رہنے والوں سے ناخوش و ناراض
دل اور اس کی آرزوئیں بھی تو اسی نے
پیدا کیں ہمارے دل میں کسی آرزو کا پیدا
اس امر کی پختہ دلیل ہے کہ خدا نے اس
پورا کرنے کا سامان پہلے سے پیدا کر رکھا
اور یہ بڑی ہی نامعقول بلکہ شرمناک با
ہے کہ جو خود خالی ہاتھ ہیں اور اس سے
ساتھ کم ظرف ہیں ہم ان کے سامنے دامن
پھیلا پھیلا کر کہیں کہ ہمیں یہ چاہیے و
چاہیے اور وہ نہ دے سکیں تو ان کے
خلاف شکایت کریں۔ ان سے ناراض
ہو جائیں ان کی بے عزتی کریں بالکل
بدزبان اور کج خلق بھکاری کی طرح جو
خواہش بھیک نہ ملنے پر بڑبڑاتا اور کو
چلا جاتا ہے۔

ہمارا اگلا خاص نمبر

اوہام شکن نمبر

اپنے اطراف میں پھیلے ہوئے اوہام
لکھ کر ابھی سے بھیجنا شروع کر دیں۔ (ایڈیٹر)



گاندھی میلے میں | ۱۰ اکتوبر کے اخبارات کی اطلاعات کے مطابق لال قلعے کے سامنے گاندھی میلے میں پندرہ بیس غنڈوں نے میلے میں شریک ہونے والی چند نوجوان لڑکیوں کے ساتھ بڑی بدتمیزی کی۔ ان میں دو برطانوی نرسیں تھیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ شام کے ساڑھے سات بجے کے قریب میلہ دیکھنے گئیں تو پندرہ بیس نوجوانوں نے ان کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ان کے چٹکیاں بھی بھریں اور انھیں دھکے بھی دیئے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ انھوں نے مدد کے لیے بار بار پکارا لیکن کوئی ان کی مدد کو نہیں آیا۔ ان میں سے ایک کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ اسے زمین پر گرا کر اس کا کرتا پھاڑ دیا گیا۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ایک ملازم کا بیان ہے کہ وہ اپنی بیوی، بہن اور تین بچوں کے ساتھ میلے میں گیا تو کچھ غنڈے اس کے اور خواتین کے درمیان حائل ہو گئے اور انھوں نے خواتین کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔

حرامی بچے | سویڈن کے ایک تازہ ترین قانون کے مطابق اب کسی بچے کو حرامی نہیں سمجھا جائے گا۔ اس سے پیشتر حرامی بچوں کو حکومت کی طرف سے وہ مراعات حاصل نہ ہوتی تھیں جو دوسروں کو میسر تھیں یاد رہے اس دیس میں شادی کیے بغیر پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد کا نام پختہ طور پر معلوم ہو سکے! اس قانون کے نفاذ ہونے کے بعد امید کی جاتی ہے کہ وہ ماں باپ جو حرامی بچوں کی پیدائش پہ اپنا نام درج

دینے سے ہچکچاتے تھے۔ اب بآسانی اپنا نام دیتے دیا کریں گے۔

عجیب مقدمہ اولین ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی پیدائش کے کرشمے ہی میں نہ کھو جایئے یہ باور نہ کیجئے کہ اب دنیا میں بچوں کی پیدائش بآسانی طور پر ہوا کرے گی۔ سائنس کا یہ طریق حمل ابھی طرح طرح کی مشکلات کا حامل ہے۔ اس سلسلے کی ایک خبر سنئے:

نیویارک کی ایک گھریلو عورت ڈورس ڈیل ریو نے دو لاکھ روپے کا دعویٰ کر دیا کیونکہ ڈاکٹروں کی غفلت سے اس کی بچہ دانی میں رکھا گیا ٹیسٹ ٹیوب جنین (بچے کا ابتدائی ڈھانچہ) ضائع ہو گیا تھا۔ عدالت نے اسے پچاس ہزار ڈالر (چار لاکھ روپیہ) کی ڈگری دے دی ہے۔ اس عورت کو شکایت تھی کہ اس کی بچہ دانی میں تجربے کے طور پر جو کچا بچہ (EMBRIO) رکھا گیا تھا وہ بچہ دانی ہی میں ختم ہو گیا۔ اس مردہ بچے کے اخراج کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے ازدواجی لطف ہی سے محروم ہو گئی تھی۔ اس لئے اس عورت نے زندگی کی اس مزیدی لطیف چیز کے ختم ہو جانے پر عدالت سے رجوع کیا تھا۔

سور سے پھیلنے والی بیماری مشرقی یوپی کے اضلاع نیز ضلع بریلی میں کچھ عرصہ سے ایک نئی پراسرار بیماری پھیل گئی ہے جس میں مریض کو پہلے تیز بخار ہو کر اس کا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے اور اکثر بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ مریضوں کو متواتر ہچکیاں بھی آنے لگتی ہیں اور بدن میں رعشہ (کپکپی) اور اکثر اسی غفلت و بے ہوشی کے عالم میں مریض ختم ہو جاتا تھا۔ اس مرض کی تحقیق پر مامور ڈاکٹروں نے بہت سے مریضوں کو دیکھنے اور اس سلسلے میں ڈاکٹری جانچ پڑتال کے بعد یہ رائے اخذ کی ہے کہ اس نئی مہلک بیماری کے جراثیم سور کی کھال کے مسامات میں نشوونما پاتے ہیں اور یہی جراثیم جن ما

میں سور پلے ہوئے ہیں ہوا میں شامل ہو کر سانس کے راستے انسانی جسم میں داخل ہو کر مرض کا باعث ہوتے ہیں۔ ماہرین فن اس مرض کے استیصال کے لئے مشورے دے رہے ہیں کہ جن علاقوں میں یہ مرض پھیلا ہے وہاں کے سب سوروں کو ہلاک کر دیا جائے۔ بغیر اس انتہائی کارروائی کے اس مرض پر قابو نہیں حاصل ہو سکتا۔ اسلام نے سور (خنزیر) کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے اور اس جانور کو غلیظ اور نجس قرار دیا ہے۔ پہلے بھی متعدد بیماریوں کے بارے میں ڈاکٹری تحقیقات یہ نکل چکی تھی کہ سور کا گوشت کھانے والے ان بیماریوں میں کثرت سے مبتلا ہوتے ہیں اور اب اس نئی بیماری کے پھیلنے میں سور کے گوشت سے زیادہ زندہ سوروں کا دخل ثابت ہو گیا۔ اسلامی شریعت نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اُن کی طبی مصلحتیں بھی بے شمار ہیں اور بالآخر میڈیکل سائنس کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ (ق)

امانت ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانٰت الیٰ اھلھا۔ (نساء ۸)

"بے شک تم کو اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کر دیا کرو"

امانت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے کاروبار میں ایماندار ہو جس کا جس کسی پر جتنا ہو اس کو پوری دیانت سے رتی رتی دے دے۔

(۱) کوئی آدمی اگر مال رکھائے تو اس کو اسی طرح واپس کر دے۔

(۲) کوئی اپنا راز بتائے تو اس کو کسی پر ظاہر نہ کرے۔

(۳) کوئی کسی معاملہ میں مشورہ کرے تو سچا مشورہ دے۔

(۴) اپنے کو جس کام کے قابل نہ سمجھے اس سے الگ ہو جائے۔

اسی قسم کے آدمی امانت دار کہلاتے ہیں ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بڑے امانت دار تھے۔ عام طور سے لوگ آپ کو

امین کہتے تھے۔ دشمنوں کو بھی آپؐ پر بھروسہ
تھا۔ حضورؐ فرماتے تھے کہ امانت میں خیانت
کرنا ایمان کی کمی (نفاق) کی نشانی ہے۔ فرمایا
جس میں امانت نہیں ہے اس میں ایمان
نہیں ہے۔

ایک مرتبہ ایک شخص سے آپؐ نے
کچھ کھجوریں قرض لیں، چند روز کے بعد
وہ تقاضا کو آیا، آپؐ نے ایک انصاری
کو حکم دیا کہ اس کا قرض ادا کردیں، انصاری
نے کھجوریں دیں لیکن وہ ایسی عمدہ نہ تھیں
جیسی اس نے دی تھیں۔ اس شخص نے
لینے سے انکار کردیا۔ انصاری نے کہا کہ
تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی
کھجوریں لینے سے انکار کرتے ہو۔ بولا ہاں
رسول اللہؐ انصاف نہ کریں گے تو اور
کون کرے گا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ
جملے سنے تو آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے
اور فرمایا کہ بالکل سچ ہے۔

بجلی کی رضائیاں: امریکہ کی ایک کمپنی نے بجلی
سے جسم کو گرم رکھنے کے لیے اس قسم کی
صدریاں اور رضائیاں بنائی ہیں جن میں
کی حرارت بھری ہوتی ہے۔ رضائیاں
ہلکی پھلکی ہیں کہ ذرا بھی بوجھ معلوم نہیں
مزے کی بات یہ ہے کہ انھیں اوڑھنے
بجلی کا جھٹکا نہیں لگتا اور عام کپڑوں
طرح دھو بھی سکتے ہیں۔ ان میں بجلی
رَو اس طرح اور اس مقدار میں پہنچتی
کہ انسانی جسم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی

نہ جلنے والا کپڑا: روس کے ایک سائنس
نے ایسا ریشمی کپڑا بنایا ہے جس کو آگ
لگتی۔ اس کپڑے سے بنایا ہوا لباس پہ
آگ میں آسانی سے چل پھر سکتے ہیں
میں آگ بجھانے والوں کو اس کپڑے
وردیاں دی جاتی ہیں۔

کتے کا اثاثہ، کروڑ ڈالر: حال ہی میں ا
(کینیڈا) سے ہمیں ایک ایسی اطلاع ملی
جسے پڑھ کر ہم نے اپنے دانتوں میں ا
داب لی۔ شاید آپ بھی ایسا ہی کریں۔
اطلاع پیش خدمت ہے۔ سینی نامی ا
کتے کو کینیڈا میں ، اسٹار کی حیثیت

ہے۔ وہ فلموں میں اور ٹیلی ویژن میں کام کرتا ہے اس کا طرزِ زندگی ایسا ہے کہ جیسے وہ کتا نہ ہو بلکہ کوئی شہزادہ ہو۔ یہ کتا ہمیشہ طیاروں میں سفر کرتا ہے۔ عالی شان ہوٹلوں میں قیمتی بستروں پر سوتا ہے۔ نیز عمدہ ترین ریسٹورنٹوں میں کھانا کھاتا ہے۔ یعنی کے مالک اس سے سے ایسا سلوک کرتے ہیں کہ جیسے وہ کسی شاہی گھرانے کا فرد ہو۔ یہ کتا اب تک ۲/۱، کروڑ ڈالر سے بھی زیادہ رقم کما چکا ہے۔

جب بھی اس کتے کو طیاروں میں سفر کرنا ہوتا ہے اور کسی عالی شان ہوٹل میں ٹھہرنا ہوتا ہے تو اس کے مالک پہلے ائیرلائنز اور ہوٹلوں کے منتظمین سے خالی اجازت نامہ حاصل کر لیتے ہیں۔ جب یہ کتا عمدہ ترین ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتا ہے تو اس کے مالک خاص طور سے اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ اُسے کوئی ایسی چیز نہ دی جائے جو اس کے لئے مضرِ صحت ہو۔ یہ کتا پنیر اور آئس کریم بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ یہ کبھی اپنا آرام طلب ہو گیا ہے کہ اگر اس کے بستر پر ایک بھی شکن ہو تو اُسے ساری رات نیند نہیں آتی۔ دنیا کے اس مالدار ترین کتے کو جب کسی خیراتی شو میں پیش کیا جاتا ہے تو اس کی فیس (معاوضہ) ۵ ہزار ڈالر ہوتی ہے۔

ایک دفعہ اس کے مالکوں نے ایک ایسے ہی شو کے لئے دس ہزار ڈالر وصول کئے تھے۔ مالکوں نے اُسے ایسی تربیت دے رکھی ہے کہ ڈائریکٹر کتے سے جیسا کام لینا چاہے کتا وہ کام نہایت ہی خوبی سے سرانجام دیتا ہے۔

اس کروڑ پتی کتے کو صبح سویرے اسکے مالک عمدہ صابن سے نہلاتے ہیں۔ بعد میں اس کے بالوں میں کنگھی کی جاتی ہے اور برش سے انکو سنوارا جاتا ہے۔ اسکے بعد کتے کے مالک اس پر نہایت ہی عمدہ عطر چھڑک دیتے ہیں تاکہ نہ صرف یہ کتا صاف ستھرا نظر آئے بلکہ جہاں سے گزرے وہاں خوشبو ہی خوشبو پھیلا دے۔ اس کتے نے کبھی کوئی غلطی نہیں کی۔ لوگ اس کتے کی قسمت پر رشک کرتے ہیں۔

مِس سَروجہ

چچا میاں! میں ایک افسانہ ایک پرانے پرچے سے نقل کر کے بھیج رہی ہوں۔ یہ پرچہ عریاں افسانے شائع کرنے میں بدنام ہے اس لیے اگر میں اس کا حوالہ دوں گی تو شاید آپ بے پڑھے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں۔ اس افسانے میں عورت کی نفسیات پر گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ آج کل کے ماحول کو دیکھتے ہوئے افسانہ نگار نے واقعات کو کچھ ایسا افسانوی رنگ دیا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ یہ افسانہ حجاب میں چھاپ دیں گے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس افسانے کا انتخاب کرنے والی آپ کی کوئی کم عمر بھتیجی ہے۔ اب میں چالیس سال میں ہوں اور چچا سعدی کے شعر کی مصداق نہیں ہوں کہ چالیس سال کی ہو کر بھی طفلی نہ گئی۔ اب میں کافی سنجیدہ ہوں اسم با مسمیٰ۔

سنجیدہ وقار۔ اٹک ایم ایس

آخر کار اس ہنگامہ نے اپنی معراج پا ہی لی جس سے لڑکیاں کل ہی سے خوف زدہ تھیں۔ بات کا اختتام بھی آخر میں وہی ہوا جس کا کالج کی ساری لڑکیوں کو خدشہ تھا اور یہ خدشہ ایک طرح سے اپنی جگہ پر درست بھی تھا کیونکہ مسز سانیال کے ساتھ پرنسپل مس سروجہ کا کل کا رویہ کسی حد تک بھی مناسب نہ تھا۔ بات بہت معمولی تھی۔ بہت چھوٹی سی تھی۔ اگر وہ سانیال کو آٹھ دن کی رخصت دے دیتیں تو شاید یہ معمولی سا واقعہ اتنا غیر معمولی ہرگز بنتا اور نہ ان کے آفس کی دہلیز ہی

باہر نکلتا اور نوبت مسز سانیال کے استعفے تک نہ آتی۔ وہ کل ہی دس دن کی چھٹی کے بعد واپس آئی تھیں اور انھوں نے صبح ہی اپنی کالج ڈیوٹی جوائن کی تھی لیکن ان کے شوہر کے اچانک حادثہ کے تار نے انھیں پھر چھٹی لینے پر مجبور کر دیا تھا اور ان کے دل میں دہلی پہنچنے کی بہت بے چینی پیدا کر دی تھی۔

یہ کل کے چوتھے پیریڈ کا واقعہ ہے کہ انھیں ایک ٹیلی گرام ملا تھا جس میں انھیں اطلاع دی گئی تھی کہ مسٹر سانیال اچانک ایک کار سے ٹکرا گئے۔ ان کی حالت اچھی نہیں ہے اور وہ دہلی کے ولنگٹن ہاسپٹل میں داخل کر دیے گئے ہیں۔ وہ اس وقت فورتھ ایر انگلش لٹریچر کا کلاس لے رہی تھیں۔ ساری لڑکیوں نے دیکھا تھا کہ مسز سانیال اس غیر متوقع اور غم انگیز تار کو پاکر نیم پاگل سی ہو گئی تھیں اور انھوں نے اسی لمحہ آٹھ دن کی چھٹی کی درخواست مس سروجہ کے نام لکھی تھی۔ وہ تار بھی انھوں نے اپنی درخواست کے ساتھ منسلک کر دیا تھا — اور پھر وہ کلاس انھوں نے چھوڑ دیا۔

جب وہ اس درخواست اور تار کو لے کر پرنسپل مس سروجہ کے آفس میں داخل ہوئیں تو انھوں نے ہمیشہ کی طرح مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے مسز سانیال سے کرسی پر بیٹھنے کو کہا لیکن دوسرے ہی لمحے مس سروجہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ان کے غمزدہ چہرے کو دیکھ کر ایکدم مٹ گئی۔ انھوں نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں مسز سانیال سے پوچھا: "اس وقت تم اتنی پریشان کیوں ہو؟"

مسز سانیال نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے چھٹی کی درخواست اور وہ تار ان کی میز پر رکھ دیا۔ اور پھر خود بھی ہچکیوں کے درمیان اس المناک حادثے کے بارے میں انھیں سب کچھ بتا دیا۔ مس سروجہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ دیر تک ٹیلی گرام کو گھورتی رہیں اور کسی نئی فکر اور سوچ میں ڈوبی رہیں۔

سوچوں کے اس بیکراں سمندر سے نکلنے کے کچھ دیر بعد انھوں نے مسز سانیال کے چہرے پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالی اور بولی۔

"تم کل ہی دس دن کی چھٹی کے بعد ان کے پاس سے واپس آئی ہو اور تار کے مطابق کل ہی ایکسیڈنٹ بھی ہو گیا ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

مسز سانیال اُن کے منہ سے ہمدردانہ الفاظ کے بجائے یہ غیر متوقع جملے سن کر حیرت سے اُن کی طرف دیکھنے لگیں۔ اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔ "وہ مجھے اسٹیشن تک پہنچانے آئے تھے ہو سکتا ہے واپسی میں حادثہ ہو گیا ہو۔"

"میرے خیال میں یہ تار فرضی معلوم ہوتا ہے۔" مس سروجہ نے دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے اپنی روایتی صاف گوئی سے کام لے کر کہا۔

"لیکن مجھے ہر حالت میں وہاں پہنچنا ہے۔ میرے ساتھ کوئی ایسا مذاق نہیں کر سکتا۔ اگر یہ تار بھیجنے والے کا نام بسنت ہے اور اس نام کا میرا کوئی رشتہ دار یہاں نہیں ہے۔"

"جذباتی نہ بنو۔ میرے خیال کے مطابق پہلے تم خود ایک جوابی ٹیلی گرام یہاں سے اُن کے آفس کے پتہ پر کر دو۔ پوری بات معلوم ہو جائے تو چلی جانا۔ تمہیں معلوم ہ کہ پچھلے دنوں لڑکیوں کی پڑھائی کا کس قدر نقصان ہوا ہے۔ اب تم پھر چھٹی لینا چاہتی ہو!"

"اس کی ذمہ داری میرے اوپر ہے میں صحیح وقت پر اُن کا کورس ختم کرا دوں گی۔ آپ بے فکر رہیے۔"

"تمہارے آنا کہنے سے کچھ نہ ہوگا۔ کالج کی پرنسپل ہونے کی حیثیت سے رزلٹ کی ذمہ داری میرے اوپر ہے۔"

"لیکن میرا کیس سیریس ہے میڈم۔ میں ہر حالت میں جاؤں گی چاہے چند ہی لمحوں کے لیے جاؤں!"

"تم اگر جاؤ گی تو اس میں میری مرضی ہرگز شامل نہ ہوگی۔ تمہیں موجودہ حالت

ہرگز چھٹی نہیں دے سکتی۔ ہاں اگر تم ایک جوابی تار دہلی بھیج دو اور اس کے جواب میں بھی یہی لکھا ہوا آئے تو میں مزید چھٹی دے دوں گی۔ تم آج ٹیلی گرام دے کر کل تک کا انتظار کر سکتی ہو!

"لیکن میڈم، میرا سہاگ!" یہ کہتے کہتے وہ ایک دم خاموش ہو گئیں۔ جیسے کربناک خوابوں میں کھو گئی ہوں۔

مس سردیہ نے چہرہ پر بناوٹی غصہ لاتے ہوئے کہا: میرا دل اتنا کمزور نہیں کہ تمہارے آنسوؤں میں بہہ جائے۔ مجھے تم سے زیادہ لڑکیوں کی پڑھائی کا خیال ہے۔ تم لوگوں کو اپنے شوہر اتنے پیارے ہوتے ہیں تو پھر نوکری کرنے کیوں آتی ہو؟ ہمیں دیکھو ہم نے شادی صرف اسی لیے نہیں کی کہ میں اپنی پوری زندگی تعلیم کی راہوں پر قربان کر دینا چاہتی ہوں!

مسز سانیال خاموشی سے سب کچھ سنتی رہیں اور سوچتی رہیں کہ آخر آج مس سردیہ نے ایک معمولی بات پر کیوں الجھی ہیں۔ انھوں نے تو اس سے پہلے کبھی ان کی کسی بات پر غصہ نہیں کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا موڈ خراب ہو... لیکن... لیکن... وہ روتی ہوئی ان کے کمرے سے باہر آگئیں۔

ایک گھنٹہ اور گزر گیا تھا ـــــ دہلی جانے والی گاڑی کا وقت بھی گزر گیا تھا۔ نہ جانے کیوں پرنسپل مس سردیہ انہیں چھٹی دینے کے لیے راضی نہ ہوئی تھیں۔ مسز سانیال نے اسٹاف روم میں رو رو کر برا حال کر لیا تھا اور اس کے بعد کوئی کلاس بھی نہیں لیا تھا۔ ان کے اداس اور مضمحل چہرہ پر آنسوؤں کے بیشمار شبنمی قطرے تار پا کر موتیوں کی طرح گرنے لگے تھے۔ وقت جوں جوں گزر رہا تھا ان موتیوں کے گرنے میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کالج کی ہر دلعزیز اور پُروقار پروفیسر مسز ملک جن کی بات مس سردیہ نے کبھی نہ ٹالی تھی وہ بھی مسز سانیال کی سفارش میں بہت کچھ کہہ کر تھک چکی تھیں۔ لیکن مس سردیہ اس معاملے میں نہ جانے کیوں پتھر کی نہ پگھلنے والی چٹان بن کر رہ گئی تھیں۔

جس میں جذبات نام کی کوئی چیز جنم ہی نہ لے سکتی تھی۔ یہ دیکھ کر اسٹاف روم میں بھی اداسی چھا گئی تھی۔ ہر کوئی اُن کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا اور ہر پروفیسر کو اپنے مستقبل میں لینے والی ضروری چھٹیوں کے لمحے یاد آ گئے تھے۔ غم اور اداسی کی لہریں جب اسٹاف روم سے نکل کر کامن روم میں پہنچیں تو اُن لہروں سے سب سے زیادہ متاثر فورتھ ایئر کی لڑکیاں تھیں کیونکہ مسز سانیال کا سب سے زیادہ تعلق اُسی کلاس سے تھا۔ یہی وہ کلاس تھا جس کا ہر روز ایک پیریڈ وہ لیا کرتی تھیں۔ اس کلاس کی ہر لڑکی انھیں پروفیسر سے زیادہ اپنی بڑی بہن سمجھتی تھی۔ اُن کی چھٹیوں کی نامنظوری ہر ایک کے لیے حیران کُن بات تھی۔ کیونکہ ہر لڑکی جانتی تھی کہ اب سے دو سال پہلے مسز سانیال کو خود مس سردیہ نے کوشش کر کے کانپور سے اپنے کالج میں ٹرانسفر کرایا تھا۔ وہ اپنے ڈپارٹمنٹ میں ایک اسمارٹ اور محنتی پروفیسر کی حیثیت سے مشہور تھیں۔ اُن کی سروس زیادہ پرا نہ تھی پھر بھی وہ اتنی تجربہ کار مانی جاتی تھیں کہ وہ جس کالج میں جاتیں وہاں انگلش لٹریچر کا رزلٹ مثالی حیثیت بن جاتا۔ اس لیے اب اُن کے استعفے خبر ایک بھاری مسئلہ بن کر لڑکیوں کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔

ایسے نازک موقع پر جب اُن کے شوہر مسٹر سانیال کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہوا کی آٹھ دن کی چھٹی کی درخواست مس سر اتنی بے رحمی سے نامنظور کر دیں گی یہ کوئی سو بھی نہ سکتا تھا۔ اگرچہ مس سردیہ کالج میں اپنی اصول پسندی اور سخت گیری لیے مشہور تھیں پھر بھی لڑکیاں اُن نرم دلی کے بارے میں یہ بھی جانتی تھیں کہ انھوں نے ایک بار اپنی نئی اور قیمتی صرف اس بات پر اپنی ملازمہ کو دے دی تھی کہ اُس بے چاری نے سردی میں ٹھٹھر ہوئے اُن سے اس کی قیمت پوچھی

وہ نفسیاتی طور پر اس کا مقصد سمجھ گئی تھیں اور اپنی سٹرپ کی جرسی زبردستی اپنی اس اوڑ کو پہنا دی تھی۔ مسز سانیال سے اُن کے اچھے تعلقات تھے۔ وہ لڑکیوں میں بھی کافی گھلی ملی رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ لڑکیوں کی ضد پر کسی بھی پروگرام میں وہ کوئی گیت یا اپنے پسندیدہ شاعر تخشب کی غزلیں سنا دیتی تھیں اور آفس میں وہ ہمیشہ ایک گزیٹیڈ آفیسر کی طرح پیش آتی تھیں لیکن آج تک کسی لڑکی نے تصور میں بھی نہ سوچا تھا کہ وہ اتنی سخت بھی ہو جائیں گی کہ بے چاری مسز سانیال کے آنسوؤں سے بھی اُن کا دل نہ پسیجے گا۔

جب پانچویں پیریڈ کے بعد بہت سی لڑکیوں نے مسز سانیال کو اسٹاف روم میں روتے ہوئے دیکھ لیا تو اُن ساری لڑکیوں کے دل اُن کے لیے تیز تیز دھڑکنے لگے اور سب کی آنکھوں سے اُن کا غم چھلکنے لگا۔ رنگ برنگے دوپٹے فکر آمیز انداز میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

"کیوں نہ ہم سب پرنسپل صاحبہ کے پاس چلیں؟" ہر وقت مسکرانے والی نجمہ

قمر نے بتایا کہ وہ مسز ملک تک سے انکار کر چکی ہیں اور اب اُن سے کچھ کہنا بیکار ہی ہے۔

رابعہ نے اپنی رائے پیش کی۔ "جانے میں حرج ہی کیا ہے؟"

"اگر مسز سانیال نے استعفیٰ دے دیا تو ہم سب کی پڑھائی کا کیا ہوگا؟" نجمہ نے اپنی فکر کا اظہار کیا۔

"اتنی معمولی بات پر وہ ہرگز استعفیٰ نہیں دے سکتیں۔" افروز نے پُر یقین لہجہ میں کہا۔

"تمہیں شاید نہیں معلوم جب ہم پکنک منانے کالا گڑھ گئے تھے تو انھوں نے اپنی زندگی کے حالات بتاتے ہوئے ہم سے کیا کہا تھا؟" سب لڑکیوں نے اشتیاق بھری نظروں سے سوشیلا کی طرف دیکھا۔

ناہید ایک دم بولی۔ "کیا کہا تھا؟"

"وہ صرف شوق کی خاطر یہ نوکری کر رہی ہیں ورنہ اُن کے شوہر ہرگز اس نوکری کے حق میں نہیں ہیں۔ یہ سوچ لو کہ بجائے [illegible]

لڑکی شیشی نے جواب دیا۔

"تو۔۔۔ تو۔۔۔ وہ ضرور استعفیٰ دے سکتی ہیں!" سب لڑکیوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

آخر کار یہی طے ہوا کہ پرنسپل صاحبہ کے پاس جانا ہی چاہیئے۔ وہ سب آفس کی طرف چل پڑیں۔ کسی کو امید نہ تھی کہ مس سروجہ اس کی بات مان لیں گی۔ ان کی ضدی طبیعت سے سب واقف تھیں لیکن پھر بھی وہ ان کے پاس اس طرح جا رہی تھیں جیسے کسی نرم روندی کی لہریں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہوں۔ وہ سامنے کسی منہ زور چٹان سے ٹکرانے والی ہوں — ! یہ لہریں اس چٹان سے نہ کیا ٹکراتیں پہلے آفس کے دروازہ پر پڑے ہوئے نیلے پردے سے ٹکرائیں۔ مزجو اسٹوڈنٹ یونین کی صدر تھی اور دن میں کئی بار مس سروجہ کے پاس آئی جاتی تھی، لڑکیوں کے ہر معاملہ میں پیش پیش رہتی تھی اور ان سے بیباکانہ طور پر گفتگو کر لیتی تھی۔ آسی نے پردہ کو ہلکی سی جنبش دی۔ لیکن یہ دیکھ کر لڑکیوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ مس سروجہ کی جگہ انھیں مسز ناگر کا موٹے نقوش والا بھیانک چہرہ ان کی کرسی پر نظر آ رہا تھا۔ سب لڑکیاں ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ مس سروجہ آفس سے کیوں غائب ہو گئیں؟ اور ان کی جگہ غیر متوقع طور پر کالج کی وائس پرنسپل مسز ناگر کیوں کام کر رہی ہیں؟ مسز ناگر کے بتانے پر معلوم ہوا کہ مس سروجہ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے اور اس وقت وہ اپنے کمرہ میں آرام کر رہی ہیں — کالج بلڈنگ سے چند قدم کے فاصلہ پر پرنسپل صاحبہ کا بنگلہ تھا۔ سب لڑکیوں نے وہاں تک جست بھری۔ لیکن وہاں ان کے چپراسی سے یہ سن کر ساری لڑکیوں کے دل ڈوب گئے کہ پرنسپل صاحبہ نے کسی سے بھی ملاقات کرنے کے لیے منع کر دیا تھا۔ اس کے بعد یہ بات ایک پہیلی بن چکی تھی اور مسز سانیال کے ایک سنجیدہ مسئلہ کے لیے ان کا یہ رویہ کالج کے ہر فرد کے لئے گہری نفرت

کا باعث ہی کیا تھا۔

اس طرح پہلا گھنٹہ بھی بیت گیا۔

پھر چھٹی بھی ہوگئی۔

اور بات کل کے لیے ٹل گئی۔

اور یہ آج کی بات ہے کہ پہلا پیریڈ بھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ ریحانہ نے نہ جانے کہاں سے یہ خبر پاکر سنائی کہ پرنسپل صاحبہ گزشتہ شب کی کسی گاڑی سے کہیں چلی گئی ہیں۔ چوکیدار کے کہنے کے مطابق انھوں نے اس سے پہلے کبھی اس گاڑی سے سفر نہیں کیا تھا۔ رات جب وہ تنہا گئی ہیں ان کی آواز بھاری تھی۔ وہ اچھی طرح ل بھی نہیں پا رہی تھیں۔ انھیں رکشہ ہاری ہی نے لا کر دیا تھا لیکن وہ اسے ے ساتھ اسٹیشن تک بھی نہیں لے ں تھیں۔ یہ بات ہوا کی طرح سارے ج میں پھیل گئی اور پہلے ہی پیریڈ سے سز میں مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ شروع ئی۔ دوسرا پیریڈ کس قدر بے چینی کے میں گزرا۔ کالج کی پوری فضا کل کے

واقعہ کے اثر سے خاصی سوگوار تو تھی ہی لیکن اس سوگواری میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب یہ بات پوری طرح یقین کی حد کو پہنچ گئی کہ واقعی پرنسپل صاحبہ کالج نہیں آئی ہیں۔ اور ان کی جگہ وائس پرنسپل مسز ناگر کام کر رہی ہیں۔ تیسرے پیریڈ کو شروع ہوئے ابھی کچھ ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ رابعہ نے آکر یہ اطلاع بھی دے دی کہ ابھی ابھی جب وہ پانی پینے کے لیے باہر گئی تھی تو مہری نے اسے پورے یقین کے ساتھ یہ بتایا کہ مسز سانیال نے اپنا استعفیٰ لکھ کر مسز ناگر کو پیش کر دیا ہے۔

یہ سنتے ہی سب لڑکیوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

"اب کیا ہوگا؟" سلمیٰ کی بھاری آواز اداس ماحول میں ابھری۔

"ہمیں اس کلاس میں ابھی پورے ایک سال پڑھنا ہے۔" اوشا نے دور مستقبل کی طرف دھیان دوڑایا۔

"ایسا نہ ہونا چاہیے!" قدسیہ نے کہا۔

پیریڈ خالی تھا۔ ساری لڑکیاں اسٹاف روم کی جانب چلیں — ابھی اُن سب نے گیلری میں چند ہی قدم طے کیے ہوں گے کہ اسٹاف روم کے قریب مسز میسی نے انھیں بتایا کہ وہ سب بیکار جا رہی ہیں۔ اسٹاف کی سب ہی ممبر مسز سانیال کو سمجھا چکی ہیں۔ وہ کسی حالت میں بھی استعفے واپس لینے کے لیے تیار نہیں ہیں — اُن کی باریک آواز نے لڑکیوں کے دلوں کے حوصلے توڑ دیے۔ جب لڑکیاں مسز میسی کی بات کو نظر انداز کر کے کچھ اور آگے بڑھیں تو فلاسفی کی پروفیسر مسز نقوی سے ٹکرائیں۔ انھوں نے اسٹاف روم سے نکلتے ہوئے حسبِ عادت لڑکیوں سے وقت ضائع نہ کرنے کے لیے کہا اور تنبیہہ کی کہ وہ اپنی اپنی کلاسز میں چلی جائیں — لیکن لڑکیاں پھر بھی اسٹاف روم میں داخل ہو گئیں۔ مسز سانیال وہاں تنہا تھیں۔ کئی لڑکیوں نے رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا۔ سلمٰی نے تو اُن کے پاؤں تک پکڑ لیے تھے وہ پھر بھی اپنا استعفیٰ واپس لینے پر راضی نہ ہوئی تھیں۔

انٹرول میں ایک بار سب لڑکیوں نے پھر اُن کی خوشامد کی — لیکن اُن کے اپنے خیال کے مطابق ایسی نوکری بیکار تھی کہ اُن کے شوہر موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوں اور انھیں چھٹی نہ ملے۔ اُن کی پرنسپل اُن کے اتنے اہم معاملہ سے یوں منہ موڑ کر غائب ہو جائے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو یہ کوئی انسانیت نہیں۔

مسٹر سانیال سے انھیں بے پناہ محبت تھی۔ دس دن کی چھٹی اُن کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ پرسوں رات ہی تو واپس آئی تھیں۔ وہ دہلی کی کسی پرائیویٹ فرم میں ملازم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ گزشتہ رات وہ ایک لمحہ کو بھی نہیں سو سکی ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے انگنت ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر ان کے دامن میں گرتے رہے ہیں اور جبھی انھوں نے اپنی زندگی کا یہ اہم فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے پیارے سانیال کی

خاطر نوکری چھوڑ دیں گی اور کالج کی رومانی اور محبت بھری فضاؤں کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُن کے پاس چلی جائیں گی انھیں نوکری سے زیادہ اپنے شوہر کی زندگی عزیز ہے۔ انھوں نے انگریزی تعلیم ضرور حاصل کی لیکن وہ مثالی مشرقی عورت ہیں۔ وہ عورت جو اپنے شوہر کے لئے سب کچھ قربان کر دیتی ہے جو اس کی خاطر اپنی زندگی کی بھی بازی لگا سکتی ہے۔ وہ زندگی بھر اُبلی ہوئی دال کھا کر اپنا گزارا کر سکتی ہیں لیکن ایسی نوکری ہرگز نہیں کر سکتیں جس میں انھیں حلوہ کھانے کو ملے لیکن اُن کے وجود پر دوسروں کا حق ہو — اُن کے پاؤں غلامی کی زنجیروں سے بندھے ہوں — اب اُن کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ ان زنجیروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توڑ دیں اور یہ زنجیریں اسی صورت میں ٹوٹ سکتی تھیں کہ وہ اس نوکری سے مستعفی ہو جائیں اور وہ یہ استعفیٰ لکھ کر کالج کی وائس پرنسپل کو دے بھی چکی ہیں۔

"مگر آپ ایک دن اور یہ استعفیٰ اور پرنسپل صاحبہ کی واپسی کا انتظار کر" اوشا نے اپنی رائے دی۔

"ایک دن کی بات تو دور ہے، ایک ایک لمحہ بھاری ہے!" مسز رما نے پریشان کن لہجے میں جواب دیا۔

"میڈم جو قدم جلدی میں اٹھایا ہے معاف کیجیے گا وہ اکثر غلط ہوتا۔" قمر نے پھر ایک بار اندھیرے میں روشنی کی دیکھنے کی کوشش کی۔

"میں تم سب لوگوں سے کافی پہلے دنیا میں آئی ہوں۔ میری اپنی سمجھ کے مطا[illegible] میرا یہ قدم مجھے روشنیوں کی طرف لے جائے گا۔ جہاں میرے اوپر کسی کی غلامی کے اندھیرے سایہ نہ کر سکیں گے۔ میں آج تک نہ سمجھی تھی کہ نوکری کیا چیز ہوتی ہے؟ لیکن کل مجھے جس طرح احساس ہوا کہ نوکری نوکری ہی ہے وہ کسی بادشاہ کی ہو یا فقیر کی!"

"آپ استعفیٰ نہ دے کر کالج کو اجالا [illegible]

مسز ناگر سے چھٹی بھی لے سکتی ہیں۔" طاہرہ نے انھیں ایک نئی راہ دکھائی۔

"مجھے اب نوکری نہیں کرنی ہے یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔"

"لیکن ہمارا پورا سال اور اس سال کی پوری پڑھائی...." کہتے کہتے مسعودہ کی آواز خاموشیوں میں ڈوب گئی۔

مسعودہ کا یہ جملہ سنتے ہی کئی لڑکیوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ گئیں جیسے تصور میں انھیں اخبار میں اپنا رول نمبر ہی نظر نہ آیا ہو اور وہ فیل ہو گئی ہوں۔

سب ہی لڑکیاں خاموش تھیں کوئی کسی سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ ساری لڑکیاں ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔ جیسے اُن میں سے ہر ایک اس استعفے کی ذمہ دار ہے۔ آخرکار اس خاموشی کو توڑتے ہوئے گلوگیر آواز میں خود ہی مسز سانیال نے کہا:

"تمہارے اس پورے سال کی پڑھائی کی ذمہ داری میرے اوپر نہیں پرنسپل مس سروجنی کی ذات شریف پر ہے کاش وہ مس نہ ہوتیں اور اُن کا بھی کوئی شوہر ہوتا تو شاید یہ اندازہ کر سکتیں کہ ایک ہندوستانی بیوی کے لیے اس کا شوہر کیا ہوتا ہے انھوں نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے۔ میں مجبور ہوں۔ اگر مجبور نہ ہوتی تو کیوں تمہارا محبت بھرا ماحول چھوڑ کر جانے کے لیے قدم اٹھاتی۔ میں آج بارہ بجے کی گاڑی سے دہلی جا رہی ہوں۔ تم سب سے جدا ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔" کئی لڑکیاں آنکھوں میں آنسو بھر لائیں.........

.... کتنی ہی لڑکیوں نے آنسوؤں کی لڑیوں کو اپنے دوپٹوں میں چھپا لیا۔ مسز سانیال کی آنکھیں بھی کسی قدر نم ہو گئیں لیکن اس وقت اُن میں آنسوؤں کے قطرے نہیں آئے۔ شاید مسلسل روتے روتے اُن کے آنسو اب ختم ہو چکے تھے۔

گیارہ ہی بجے سے ان کے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ کالج میں ایسا ماتمی دن کبھی اس سے پہلے نہیں آیا تھا۔

سب ہی دل افسردہ تھے سب کی آنکھیں نمناک تھیں۔ کوئی کسی سے اپنی غمگین دھڑکنوں کا حال نہیں کہہ رہا تھا لیکن دل ہی دل میں کئی لڑکیاں خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگ رہی تھیں کہ خدا کرے اسی لمحہ مس سرورجہ آجائیں اور انھیں اپنے فیصلہ پر عمل کرنے سے روک دیں ــــ لیکن مس سرورجہ تو جیسے برسوں کے لئے چلی گئی تھیں۔ انھیں مسز سانیال کے جانے کے وقت تک نہ آنا تھا نہ آئیں۔ اگر وہ آنے والی ہوتیں تو پھر اس طرح جاتی ہی کیوں؟ ــــ چند لڑکیوں میں سرگوشیاں ہوئیں اور آخرکار وہ ساعت بھی آئی جب مسز سانیال اسٹیشن کے لیے روانہ ہوئیں ــــ اور وہ کالج سے کچھ اس طرح چلی گئیں جیسے کسی ارمانوں بھرے دل سے حسرت ہی نکل گئی ہو۔ نہ کوئی الوداعی پارٹی ہوئی، نہ کوئی فوٹو گروپ ہوا اور نہ ان کے کاموں کی تعریف ہی کی گئی ــــ نہ اُن کی خدمات کے سلسلے میں رسمی تقریریں ہوئیں۔ صرف غم کا سوگوار ماحول ساری فضا پر چھایا رہا۔ چند لڑکیوں اور کچھ ٹیچرس نے اسٹیشن تک اُن کا ساتھ دیا۔ گاڑی آئی۔ وہ اُس میں سوار ہوئیں اور اپنی پرنم آنکھوں میں یادوں کے سوگوار چراغ جلائے اپنی زندگی کے ہمسفر کے پاس دہلی پہنچنے کے لیے روانہ ہوگئیں۔

اور اس طرح پرنسپل مس سرورجہ کی ضد کے سامنے کتنی ہی لڑکیوں کا مستقبل اور مسز سانیال کی ملازمت اندھیروں میں گم ہوگئی۔

رات کا پورا سفر مسز سانیال نے بہت بے چینی سے گزارا اور جب گاڑی دہلی اسٹیشن پر پہنچی تو وہ جلدی سے ریلوے پلیٹ فارم سے باہر نکلیں اور اسکوٹر میں بیٹھ کر دھڑکتے ہوئے مضمحل دل کے ساتھ ولنگڈن کے لیے روانہ ہوئیں۔ ہوسپٹل کے انکوائری آفس میں معلوم کرنے پر انھیں پتہ چلا کہ مسٹر سانیال پرائیویٹ وارڈ کے روم نمبر چھبیس میں بیڈ نمبر دو پر ہیں۔ وہ تیز تیز قدموں سے روم نمبر

چھبیس کی جانب چل پڑیں۔ گیلری میں چلتے ہوئے جیسے جیسے مختلف نمبروں کے کمرے ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزر رہے ان کے دل کی دھڑکنیں بتدریج تیز ہوتی رہیں۔ روم نمبر اکیس" انھوں نے اپنی دائیں جانب دیکھ کر دل ہی دل میں دوہرایا۔

"روم نمبر چوبیس پچیس اور اس سے آگے چھبیس ہی ہونا چاہیے۔"

اور دوسرے لمحہ میں وہ روم نمبر چھبیس کے دروازہ پر تھیں۔ لیکن یہ کیا۔ اُف میرے بھگوان! میری آنکھیں کہیں دھوکہ تو نہیں کھا رہی ہیں؟" انھوں نے دل ہی دل میں سوچا۔ انھوں نے ایکبار پھر روم نمبر پر نگاہ ڈالی۔ انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ پھر بھی انھوں نے ہمت سے کام لیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھیں۔ مسٹر سانیال کے بیڈ کے قریب واقعی ایک بھاری بھرکم عورت ہری ساڑھی پہنے بیٹھی ہوئی

وہ انھیں دواپلا رہی تھی۔ وہ ایک لمحہ کے لیے پھر ٹھٹک گئیں کیونکہ ان کے دل میں یکلخت سینکڑوں خدشات جنم لینے لگے تھے۔ مسٹر سانیال کا کردار تو ہمیشہ ان کے سامنے ایک شفاف آئینہ کی طرح رہا تھا پھر یہ عورت کیوں؟ اگلے ہی لمحہ انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہ کچھ اور آگے بڑھیں۔ نہ جانے کیوں انھیں اپنے قدم کئی کئی من وزنی معلوم ہو رہے تھے۔ انھوں نے سوچا کہیں انکوائری آفس سے تو غلط اطلاع نہیں ملی؟ لیکن دوسرے ہی لمحہ ان کے دل نے تردید کی — نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ چند قدم اور — وہ اپنا ہر قدم اس طرح اٹھا رہی تھیں جیسے موت و حیات کا فاصلہ طے کر رہی ہوں — بیڈ نمبر دو! — ان کی جانب اس عورت کی پشت تھی۔ انھوں نے سوچا ہو سکتا ہے مسٹر سانیال کی رشتہ دار تلاش کرتے ان کے پاس آگئی ہو — لیکن نہیں — اب وہ اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گئیں — انھوں نے تیزی کے ساتھ

اپنا گھا قدم اٹھایا — اور پھر — وہ حیرت کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئیں۔ وہ... تو یہ نرس مس سروجہ تھیں! مسز سانیال کے ذہن میں ایک ثانیہ کے لیے خیال ابھرا — شاید میرے پاس آئے ہوئے اس تار کا انھیں یقین نہیں آیا اور خود مجھ سے پہلے رات کی گاڑی سے یہاں تک آگئیں؟ — دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں لیکن نہ جانے کیوں مس سروجہ کی نظریں شرم و حیا کے بوجھ سے جھک گئیں۔ وہ بالکل خاموش تھیں۔ مسٹر سانیال نیم بے ہوشی کے عالم میں سفید پٹیوں سے لپٹے پڑے تھے۔ مس سروجہ نے دوا کا آخری چمچہ مسٹر سانیال کے حلق میں ڈال کر ان کے سر کو آہستہ سے تکیہ پہ رکھ دیا اور ان کے آدھے منہ پہ چادر ڈال دی۔ مسز سانیال خاموش کھڑی تھیں۔ مس سروجہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

"مسز سانیال تم آ ہی گئیں اور تم نے مجھے دیکھ بھی لیا۔ اب میں تم سے کچھ چھپانا بھی نہیں چاہتی۔ تم نے تو شاید یہ سمجھا ہوگا کہ مسٹر سانیال میرے لیے اجنبی ہوں گے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ جان کر تمہیں حیرانی ضرور ہوگی کہ مسٹر سانیال کئی سال تک میرے کلاس فیلو رہے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی کی اکثر راہیں ان کے ساتھ چل کر طے کی ہیں لیکن میری بدقسمتی یا میرے حالات کے سنگدل تقاضے کہ میرے ارمانوں کی لاش پر تمہارے سہاگ کی شہنائیاں بج اٹھیں۔ ان کے ہاتھ میں تمہارا ہاتھ چلا گیا۔ تمہاری زندگی کی راہوں میں چراغ جل گئے اور میں آج تک اندھیروں میں بھٹک رہی ہوں۔ میں نے ان سے ایک وعدہ کیا تھا کہ میں شادی کروں گی تو صرف تمہارے ساتھ، ورنہ اپنی زندگی یوں ہی گزار دوں گی — اور میں آج تک اپنا وہ وعدہ نبھا رہی ہوں۔ اب میری خوشیوں کی دھوپ غم کے سائے میں بدل چکی ہے — میں نے آج تک تمہیں یہ راز نہیں بتایا

کرتھا اطرانس فر میں نے صرف اس لیے اپنے کالج میں کرایا تھا کہ تم میرے یہاں رہو گی تو اس بہانہ کبھی دکبھی مسز سانیال کو میں بھی دیکھ کر اپنے من کے دیوتا کی پوجا کر لیا کروں گی ـــ۔“ اتنا کہتے کہتے وہ خاموش ہو گئیں شاید کچھ اور سوچنے لگی تھیں ـــ مسز سانیال کو خاموش دیکھ کر انھوں نے پھر بات آگے بڑھائی ـــ”کل میں نے تمہاری چھٹی کی درخواست نامنظور کر کے اپنے دل پر بڑا جبر کیا تھا لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی کیونکہ ٹیلی گرام دیکھنے کے بعد کئی گھنٹوں تک میری آنکھیں آنسو بہاتی رہی تھیں۔ میں چاہتی تھی کہ تم سے پہلے اس موقع پر مسٹر سانیال کے پاس پہنچوں۔ میرے اس عمل سے تمہارے دل میں بہت سی بدگمانیاں پیدا ہو گئی ہوں گی لیکن تم اپنے دل میں انھیں جگہ نہ دینا کیونکہ بات دل کے رشتوں کی ہے۔ ہر کوئی دل کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہمیشہ ان سب باتوں کو ایک راز ہی

طرح اپنے دل میں رکھوں گی مسٹر حالت اب خطرے سے باہر ہے رہو اور جب تک یہ اچھے نہ ہوں پاس رہ سکتی ہو۔ میں اب واپس جا ـــ“ اور پھر وہ کمرہ سے تیزی سے گئیں لیکن مسز سانیال خاموشی کے کھڑی ششدر بنی یہی سوچتی رہیں مس سرورجہ اُن کی خوشگوار زندگی کی میں پڑا ہوا پتھر ہیں؟ ـــ یا پھر ان میں اُن کی ذات مس سرورجہ کی زندگی لیے تاریکیوں کا پیکر بن گئی ہے۔

رنگ بدلنے کی دوائی

● جرمنی میں عجیب قسم کی ایک د گئی ہے۔ اس کا ٹیکہ کسی انسان کے میں لگا دینے سے اس کا رنگ س لے کر پاؤں تک ہرا ہو جاتا ہے۔ دوا کا اثر صرف دو گھنٹے تک رہتا ہے کے بعد آدمی اپنی اصلی رنگت پر آجاتا ہے

آج جس طرف دیکھئے جہاں جائیے مسلمانوں کو جہالت اور معاشی بدحالی کا شکوہ ہے۔ نہ تنظیم ہے نہ تعلیم۔ ہر جگہ خود غرضی، خودنمائی، افراط برادری کے جھگڑے، رسم ورواج کے بکھیڑے ہیں۔ ان تمام رسوم میں چڑھاوے اور جہیز کی لعنت سرفہرست ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ چڑھاوے اور جہیز کے نام سے ہم دولہے کی قیمت چکاتے اور دلہن کی قیمت بڑھاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ حسین و خوبصورت لڑکیاں کثیر جہیز نہ ہونے کی وجہ سے غریب ماں باپ کے سر پہ ایسا بوجھ بن گئی ہیں کہ بوجھ اٹھائے نہ اٹھے اور اتارے نہ بنے کا مصداق بن کر رہ گیا ہے۔ ان کی چاند سے زیادہ حسین جوانی اور بے داغ جوانی کو گھن لگ گیا ہے۔ عصمت و عفت کی دیوی اپنی خرماں نصیبی اور قوم کی ستم ظریفی پہ خون کے آنسو بہا رہی ہے۔

ماں باپ کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں وہ سوچتے ہیں کہ اس ہوشربا گرانی کے دور میں جب کہ سونے کا بھاؤ سات آٹھ سو روپے تولہ اور اسی طرح دیگر سامان تانبا اور کپڑا وغیرہ کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں لڑکی کی شادی کا انتظام ہو تو کیونکر جب کہ بمشکل تمام زن و بچے سے محنت و مشقت

کرنے کے بعد کمانے، کپڑے کا انتظام ہوتا ہے۔ بچت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ایسی صورت میں ایک لڑکی کی شادی کے لئے آٹھ دس ہزار روپے کا انتظام کہاں سے ہو۔ جب اس کا ذکر چیدا امراء، قوم ورؤسا کے سامنے کیا جاتا ہے تو بعض مند
سے سنجیدہ مزاج ورد
قسم کے حضرات
اصلاح رسوم کی باتیں
کرنے لگتے ہیں لیکن بلی کی گردن
میں گھنٹی باندھنے کی کسی میں جرات نہیں ہوتی۔

اس ہوا و ہوس کے دور میں جب کہ غریب سے لے کر امیر تک لمبے چوڑے جہیز کا خواہش مند ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی غریب آدمی اپنی حیثیت کے مطابق اپنی لڑکی بیاہ کر ساحل عافیت سے ہمکنار ہو سکے گفتن آسان و کردن دشوار۔ کوئی ایسا نوجوان جو اپنے منہ سے یہ اعلان کرے کہ مجھے جہیز نہیں چاہئے مجھے صرف بیوی چاہئے۔ اس کا جواب آپ کو صرف نفی میں ملے گا۔ ان حالات میں غریب کے لئے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔

یا تو اپنی لڑکی کو عمر بھر بٹھائے رکھے جن کے دو خطرناک نتائج برآمد ہوں گے
الف۔ لڑکی امراض نسواں یا ٹی بی کا شکار ہو جائے۔ ب۔ جذبات سے مغلوب ہو اور دیگر غلط نتائج برآمد ہوں۔

یا لمبے چوڑے سودی قرضے لے کر
یا جائداد رہن رکھ کر اور
زندگی بھر کی مشقت
کی کمائی جو
اس نے کوڑی کوڑی
جوڑ کر اکٹھا کی ہے ایک ہی دن میں خرچ کر کے بیٹھ رہے اور پھر زندگی بھر اس کمر توڑ قرض کا خمیازہ بھگتتا رہے۔ اسی پر بس ہو جائے تو بھی خیریت ہے لیکن اگر کسی غریب کے گھر بدقسمتی سے چار چھ لڑکیاں پیدا ہو جائیں تو اس کے لئے تو ایک شادی کے بعد قرض کے بھی دروازے بند ہو جاتے ہیں اب تو نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ کیا کرے کہاں جائے۔

ب ماں باپ تنہائی میں بیٹھ کر اپنے مقدر
ہوتے ہیں کبھی زمانے کی ستم ظریفی دیکھ کر
ہتے ہیں کہ کیا معلوم تھا یہ دن دیکھنا
یب ہوں گے ورنہ ہم پیدا ہوتے
گلا گھونٹ دیتے اور کبھی خدائے رحیم
م کی بے رخی اور ظلم وستم کے نوحے
کر دامن کو تار تار اور سینہ کو داغدار
یتے ہیں۔

ت جہیز، مہر اور ولیمہ شریعت کے آئینہ میں:

جہاں تک قرآن وحدیث کا مطالعہ
رنے سے پتہ چلتا ہے کہ جہیز کا عہد رسالت
ہد صحابہؓ میں کوئی وجود نہیں ملتا۔ اگر
ب سوال کریں کہ سیدۃ النساء حضرت فاطمہ
ہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حضور نبی کریم
ی اللہ علیہ وسلم نے گھڑے، مشکیزہ چکی
بستر کی شکل میں جہیز دیا تھا تو کیا وجہ ہے
ہم جہیز نہ دیں؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چار بیٹیاں
ضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت
کلثومؓ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں۔
سوائے حضرت فاطمہؓ کے جہیز کے کسی کے
جہیز کا ذکر حدیثوں میں نہیں آیا تو کیا نعوذ
باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹیوں
کے ساتھ ناانصافی کی؟ ہرگز نہیں بلکہ
حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں جہیز نام کی کسی
شے کا وجود ہی نہیں ہے۔ حضرت فاطمہؓ
کا جہیز، جہیز نہ تھا۔ واقعہ یوں ہے کہ جب
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یتیم ہوئے تو آپ
کے دادا عبدالمطلب آپ کے سرپرست
ہوئے جب عبدالمطلب کا انتقال ہوا تو
آپ کے چچا ابو طالب آپ کے کفیل ہوئے
حضرت علیؓ آپ
کے چچا زاد بھائی
تھے جب ابو طالب
کا انتقال ہو گیا
تو حضور صلی اللہ
علیہ وسلم بڑے
ہو چکے تھے اور حضرت علیؓ بچے تھے حضور
علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کی پرورش کی اور
پوری پوری سرپرستی فرمائی، جوان ہو گئے

کے بعد اپنی لڑکی حضرت فاطمہؓ
سے ان کا نکاح کر دیا۔ چونکہ
دونوں طرف سے ولی تھے
اور ازدواجی زندگی میں منسلک
ہو جانے کے بعد میاں بیوی
کی ضروریات زندگی کو فراہم کرنا حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کے لئے ضروری تھا اس لئے آپ
نے یہ چند چیزیں بطور جہیز نہیں بلکہ بطور
ایک منتظم اور سرپرست کے حضرت فاطمہؓ

کو مرحمت فرمائیں۔ اگر
بطور جہیز ہوتا تو یہ نا
کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّ
کو دیتے اور کسی بیٹی کو
نہ دیتے اس لئے کہ
فرمان ہے "اپنی اولاد کے سا
کر کے انصاف سے کام لو۔" چھ دیگر سا
صحابہ کرام کی شادیوں کے تذکرے ملتے
کا کہیں ذکر نہیں حضورؐ کی بیویاں تیار

الزبتھ ماڈ

ترجمہ ضیا رشاہد

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

"میری کہانی دن میں خواب دیکھنے والی ایک لڑکی کی داستان ہی نہیں پوری تہذیب کی روداد الم ہے کیونکہ آج متمدن ممالک کی لاکھوں کروڑوں لڑکیاں میرے ہی نقشِ قدم پر چل رہی ہیں۔ ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو میرا ہوا اور اس تہذیب کا ہونے والا ہے جس کی خوبصورت قبروں تلے سڑی ہوئی ہڈیاں چھپی ہوئی ہیں۔"

میرا نام الزبتھ ماڈ ہے، میری عمر اس وقت ۴۴ برس کی ہے۔ آج کل میں جیل میں ہوں۔ میں نے اس جیل میں اپنی زندگی کے ۱۲ برس گزارے ہیں اور سچ پوچھئے، تو اب مجھے اس کے در و دیوار سے ایک گونہ محبت سی

ہو گئی ہے۔ سوچتی ہوں جیل سے نکلوں گی تو باہر کی دنیا مجھے اجنبی اجنبی سی دکھائی دے گی کیا وہ خوشیاں جنہیں میں جیل کے دروازے سے باہر چھوڑ آئی تھی دوبارہ مل سکیں گی۔ کیا دوستوں کے وہ جمگھٹے جن میں ہر ایک

میرا ہم رقص بننے کے لئے تیار اور بے چین دکھائی دیتا تھا۔ اسی شکل میں ہوں گے ناچ گھروں کی تیز موسیقی، شراب کی لذت بخش تلخی جوان جسموں کے عارضی خمار، جوش و خروش ہنسی، مسلسل ناچتے چلے جانے کی خواہش اور نیم تاریکی میں ہم رقص کی باہوں میں بھولنے کا لطف گرمجوشی، صنفِ مخالف کی جسمانی کشش، قہقہے بے معنی باتیں، اجنبی سے اجنبی شخص کے ساتھ پہلی ہی ملاقات میں بے تکلفی زبان کے بجائے جسم کی گفتگو، اور پھر ان سارے دھندوں کے بعد مضبوط بازوؤں کی گرفت، اور رات کے بقیہ حصے اور دن چڑھنے تک کے لئے طویل آرام اور پُر کیف لمحے، کیا زندگی کی یہ نعمتیں مجھے دوبارہ مل سکیں گی اور کیا یہ واقعی نعمتیں ہیں کیا ان سے مسرت و سکون مل سکتا ہے۔ میرا ذہن دھندلا رہا ہے۔ یادیں ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو رہی ہیں۔ لیکن احساس پوری طرح سے کارفرما ہے وہ رنگین زندگی جس کے لئے عام لوگ بے چین ہوتے ہیں میرے لئے انتہائی بیزاری کا باعث بن گئی ہے۔

اسی زندگی سے اُکتا کر میں نے وہ ر اختیار کیا تھا جو مجھے جیل کے درواز لے آیا۔ لیکن ٹھہریئے، اس طرح آپ نہیں سمجھ سکیں گے۔ مجھے تھوڑی د دیکھئے میں دل میں اُمڈنے والے طو روک لئے اور پُرانی یادوں کو سمیٹنے کرتی ہوں۔

میری کہانی اُس وقت سے شرو ہے۔ جب میں پندرہ برس کی تھی۔ میرے چہرے پر جھریاں نہیں تھیں میں بے رونقی بھی نہیں تھی۔ جوا آ رہی ہے اور جسم یوں اُجڑا نہ تھا، گاؤں کی خوبصورت ترین نہ سہی، اچھ لڑکی تھی، اور پھر پندرہ برس کی تو عمر ہوتی ہے۔ لیکن میں خوش نہ تھی۔ ہمار حالات بہت خراب تھے۔ ابا ایک مزدوری کرتے تھے اور اماں لانڈ استری کرنے پر ملازم تھیں، ہم چھ بہ مختلف جگہوں پر چھوٹے موٹے کام کا خرچ چلاتے۔ جب میں اپنی ہم عمر

لمبی لمبی کاروں میں گھومتے اور ساحل پر نوجوان لڑکوں کی معیت میں پکنک مناتے دیکھتی تو آنکھوں میں بے اختیار آنسو آجاتے، میں گھر میں سب سے بڑی تھی۔ اس لئے لازمی طور پر چھوٹوں کی دیکھ بھال کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے، دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد رات کو بستر میں لیٹتی تو تھکن کے مارے جسم کا جوڑ جوڑ درد کرنے لگتا۔ ایسے میں چھوٹے بہن بھائیوں کی ضد، ماں کا غصہ اور باپ کی جھڑکیاں کانوں میں زہر ٹپکاتیں۔ یہی وجہ تھی کہ بچپن ہی سے میرے دل میں اس خواہش نے جنم لینا شروع کر دیا کہ ایک ایسا چاہنے والا ہونا چاہئے جو اپنی ساری محبت میرے حوالے کر دے جو مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھے، جو میرے لئے جان تک قربان کرنے کو تیار ہو لیکن اپنی عمر کی دوسری لڑکیوں کے برعکس میرا کوئی دوست نہ تھا اور سچی بات یہ ہے کہ محنت مزدوری سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ اپنے کسی ہم عمر لڑکے کے ساتھ ہفتے اور اتوار کے دن تفریح منا سکتی۔ دو ایک بار اماں نے کہا بھی گھوما پھرا کرو مگر میں شدید قسم کے احساس کمتری کا شکار تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا، کوئی شخص مجھ جیسی معمولی لڑکی کے لئے وقت اور پیسہ برباد کرنا پسند نہ کرے گا۔

انہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہماری تلخ زندگیوں میں مزید تلخی گھول دی۔ ایک حادثے کا شکار ہو کر آبا مفلوج ہو گئے اور ایک طویل مدت کے لئے بستر میں لیٹنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ گھر کا خرچ پہلے ہی مشکل سے چل رہا تھا۔ اب تو اور بھی پریشانیوں نے آلیا۔ اماں چند ماہ تک جیسے تیسے گھر کو چلاتی رہیں۔ پھر ان کی ہمت بھی جواب دے گئی اور پھر صبح سو کر اٹھے تو معلوم ہوا وہ گھر سے غائب ہو چکی ہیں۔ مفلوج آبا کے مزاج میں اس واقعہ سے اور چڑچڑا پن پیدا ہو گیا۔ اب وہ بات بے بات پر ہمیں بری طرح ڈانٹتے اور میری تو ایسی پٹائی کرتے تھے کہ ڈر کے مارے میں نے ان کے کمرے میں جانا چھوڑ دیا۔

اماں چھوٹے بچے کو اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ بڑے چاروں ہمارے پاس تھے۔ ہم

تین بہنیں تھیں، اور دو بھائی، دو بہنیں اور ایک بھائی قصبے ہی میں مختلف دوکانوں اور گھروں میں کام کر رہے تھے۔ خود میں بچوں کے ایک اسکول میں کمروں کی صفائی اور چیزوں کی دیکھ بھال پر مامور تھی۔ اس کام سے مجھے بہت تھوڑا معاوضہ ملتا تھا۔ میں نے بڑی کوشش کے بعد اماں کی وہ ملازمت حاصل کرلی جسے وہ چھوڑ کر گئی تھیں۔ دن بھر کوئلے کی استری سے کپڑوں پر استری کرنا پڑتی، تاہم یہ اطمینان ضرور تھا کہ تنخواہ زیادہ ملے گی۔ چند ماہ کام کرتی رہی۔ پھر ملازموں میں تخفیف ہوئی اور مجھے فارغ کر دیا گیا۔ بیکاری سے تنگ آکر میں نے دوبارہ اسکول میں کام شروع کر دیا، انہی دنوں میری ملاقات مسٹر رے سمتھ سے ہوئی۔

مسٹر رے سمتھ اس کان میں جہاں میرے ابا ملازم تھے، چیف انجینیر کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی عمر چالیس سے کچھ اوپر تھی، مگر ابھی تک شادی نہ کی تھی۔ ایک روز میں اسکول کی سالانہ تقریب کے موقعہ پر شرکت کے لئے گئی، تو وہ مجھے ملے۔ انہوں نے مجھے گھر تک چھوڑنے کی پیش کش کی۔ ابا کی وجہ سے میں انھیں پہچانتی تھی، میں نے شکریے کے ساتھ یہ دعوت قبول کرلی، لیکن گھر لیجانے کی بجائے وہ مجھے مقامی کلب میں لے گئے، جہاں ہم نے بہت دیر تک رقص کرتے ہوئے جوڑوں کو دیکھا، مجھے یہ ماحول بہت پسند آیا، اور میں نے مسٹر سمتھ سے پوچھا:

"کیا میں روزانہ یہاں آسکتی ہوں؟"

اُنھوں نے کہا "کیوں نہیں، البتہ اس کے لئے تمہیں دوستوں کی ضرورت ہوگی...... جب تک کوئی ہم عمر دوست نہ مل جائے تم میرے ساتھ رقص کرنا، اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو؟"

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، گھر کے تلخ ماحول سے کلب کا یہ رنگین ماحول مجھے پسند آیا۔ میں اگلے روز پھر سمتھ کے ساتھ کلب گئی، اور پھر روزانہ جانے لگی۔ مسٹر سمتھ مجھے بہت پسند آگئے، اُن کے بارے میں جو باتیں میں نے آبا سے سُنی تھیں، سب غلط ثابت ہوئیں۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ سخت گیر، چڑچڑے اور بدمزاج ہیں لیکن میرے ساتھ وہ ہمیشہ بہت

سی، محبت اور پیار سے پیش آئے اور جلد ہی
ں دل ہی دل میں ان کی پوجا کرنے لگی۔

پھر ایک شام کلب سے واپسی پر مجھے
ہنے گھر لے گئے یہاں میں نے پہلی مرتبہ تیز شراب
' اور ایسے مزے کی نیند سوئی کہ اگلے روز دس
بجے آنکھ کھلی۔

اب تو میں زیادہ تر انھیں کے گھر رہنے
ی۔ یوں بھی گھر جاتے ہی ابا کی گھڑکیاں سُننا
رتی تھیں۔ اس لئے بہتر یہی سمجھا کہ سمتھ کے
ہاں روپوش ہو جاؤں۔ یہاں مجھے کوئی تکلیف
تھی۔ اچھا سے اچھا کھانے کو ملتا۔ اچھا سے اچھا
پہننے کو۔ ہم ایک ساتھ پارٹیوں پر جاتے، بازاروں
یں گھومتے اور ناچ کی تقریبات میں حصہ لیتے
تھے۔ مجھے مسٹر سمتھ کے روپ میں دنیا بھر کی
وشیاں مل گئی تھیں۔ دو ایک بار پُرانی واقف
اروں نے اشارتاً کہا بھی کہ میں انھیں شادی
کے لئے کہوں۔ مگر مسٹر سمتھ شادی کے سخت
مخالف تھے، وہ ہمیشہ مجھے نصیحت کرتے ۔
" دیکھو پیاری تتلی، انسان شادی بیاہ کے
چکر میں پڑ جائے، تو اس کی سب صلاحیتیں
ختم ہو جاتی ہیں، کھاؤ، پیو، اور عیش کرو۔ انسان
فطرتاً آزاد پیدا ہوا ہے اور آزاد ہی رہنا
پسند کرتا ہے۔ جب تک جی چاہے گا، ہم ساتھ
رہیں اور جب ہم میں سے کوئی ایک اکتاہٹ
محسوس کرے گا تو فوراً جدا ہو جائیں گے اور
اپنی مرضی کا ساتھی چُن لیں گے "

مجھے ان کی باتیں اچھی لگیں اور میں نے
فیصلہ کر لیا، اپنی زندگی ایک آزاد اور خودمختار
پرندے کی طرح بسر کروں گی جو حسین اور
خوبصورت وادیوں میں منڈلاتا اور دانے
پانی کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ
اُڑتا پھرتا ہے۔

دو ماہ اسی طرح گزر گئے پھر مسٹر سمتھ کی
تبدیلی ایک دوسرے اور نسبتاً بڑے شہر میں
ہو گئی۔ انھوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہا
میں نے بلا تکلف حامی بھر لی۔ اس دوران میں
اپنے بہن بھائیوں اور ابا سے نہ ملی تھی؛ اور
سچ پوچھئے تو مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہ رہی
تھی، البتہ جس روز میں تقسیم نے منتخب ہونے
والی تھی، میری بارہ سالہ بہن مجھ سے ملنے آئی۔

وہ حیرت سے میرے کپڑوں کی طرف دیکھتی، اور میرے رہن سہن پر غور کرتی رہی۔ میں نے اپنے اور مسٹر سمتھ کے تعلقات پر روشنی ڈالی تو اس کی آنکھیں حریصانہ جذبات سے چمک اٹھیں اور اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا:

"کاش، مسٹر سمتھ مجھے اپنا ساتھی بنا لیتے۔"

مجھے بے اختیار اس پر رحم آگیا۔ میں نے کہا:

"للی، اگر تم چاہو تو میں مسٹر سمتھ سے کہہ کر تمہاری دوستی بھی کسی مالدار آدمی سے کرا دونگی، ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے اور اس میں کئی امیر کنوارے شامل ہیں۔"

"ٹھیک ہے، لیکن میرے پاس نئے کپڑے نہیں ہیں۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، میں تمہیں اپنے چند کپڑے لا دیتی ہوں، تم انھیں پہن کر تیار ہو جاؤ، مسٹر سمتھ آنے والے ہیں۔"

للی نے کپڑے پہن لئے اور اُمید و بیم کے عالم میں انتظار کرنے لگی، مسٹر سمتھ گھر میں داخل ہوئے تو میں نے اپنا مدعا بیان کیا، انھوں نے میری بیدار مغزی اور بصیرت کی داد دیتے ہوئے تحسین آمیز نظروں سے للی کی طرف دیکھا اور اُسے لے کر اپنے ایک دوست کے گھر چل دیئے جو ایک کنسٹرکشن کمپنی میں اسسٹنٹ منیجر کے عہدے پر فائز تھے، مجھے انھوں نے تیاری کے لئے کہا اور دو گھنٹے بعد لوٹے، تو میں سامان باندھ چکی تھی۔ للی کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ اب وہ مسٹر کنگز کے پاس رہے گی اور وہ بہت خوش ہے۔

لندن پہنچ کر ہم نے ایک خوبصورت فلیٹ کرایے پر لیا اور زندگی میں رنگینیاں ہی رنگینیاں محسوس ہونے لگیں، ہر آنے والی صبح ہمارے لئے مسرتوں کا سامان لے کر آتی، تھیٹر، سینما، ناچ گھر، کلب، ساحلِ سمندر کی تفریح، غرض ہم ساری شام معروف رہتے، اور ہفتے اور اتوار کو تو دن بھر عیش کرتے، میرے شوق کے پیشِ نظر مسٹر سمتھ نے مجھے سینما گھروں کے لئے اشتہاری فلمیں تیار کرنے والے ایک ادارے میں بطور ماڈل رکھوا دیا، یہاں سے میں نے کچھ روپیہ بھی کمایا اور یہ روپیہ بالخصوص اس لئے میرے پاس جمع ہو گیا کہ میرے

ب اخراجات مسز سمتھ پورا کر رہے تھے۔ اس
د بار میں فوٹو گرافر جونی چارمر سے ملاقات ہوئی
رہنہ تصویروں کا کاروبار کرتا تھا۔ اس نے
ہ بھی معقول معاوضے کی پیش کش کی۔ میں
مسز سمتھ کے ڈر سے انکار کر دیا، مگر جلد ہی
ے حالات پیدا ہو گئے کہ مجھے مسز سمتھ سے
دہ ہونا پڑا۔

یہ دل خراش واقعہ اس وقت پیش آیا جب
معلوم ہوا کہ میں مسٹر سمتھ کے بچے کی ماں بننے
ل ہوں، مسز سمتھ کو پتہ چلا تو انھوں نے مجھے
ت سست کہا اور بولے:

"تم جس طرز پر زندگی بسر کرنا چاہتی ہو،
ں میں بچے کے لئے گنجائش نہیں ہے اور پھر
ں مجھ لو کہ میں قانونی طور پر اس بچے کا باپ
یں ہوں اور نہ اس کی ذمہ داری لینے کو تیار
ں، بہتر یہی ہے کہ اس قصے کو یہیں ختم کر دو
ں تمہیں اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے پاس
لے چلتا ہوں جو ایسے کاموں میں بہت ماہر ہے۔"

مجھ میں سمتھ کو ناراض کرنے کا حوصلہ
ں تھا، میں فوراً اس کے ساتھ چلنے پر رضامند

ہو گئی، بقول اس کے قصے کا خاتمہ تو ہو گیا لیکن
میں ایسی بیمار پڑی کہ پورے دو ماہ تک بستر سے
نہ اُٹھ سکی، اور اس بیماری میں پہلی مرتبہ مجھے
احساس ہوا کہ سمتھ سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔
پہلے چند روز وہ باقاعدگی سے سپتال آتا رہا
پھر اس کے معمول میں کمی آنے لگی، اب وہ
ہفتے میں بمشکل ایک بار نظر آتا، پہلے مہینے
کے اختتام پر وہ بیس روز کے لئے غائب ہو گیا
پھر آیا تو معذرت کی کہ میں لندن سے باہر چلا
گیا تھا، لیکن مجھے اپنے طور پر معلوم ہو چکا تھا کہ
وہ جھوٹ بول رہا ہے اور آج کل اعلیٰ سوسائٹی
کی ایک بیوہ مسز سارا ہولٹ سے اس کا رومانس
زوروں پر ہے، فوٹو گرافر جونی کے علاوہ مسز
برتھا اور ہماری ملازم ایمی نے بھی مجھے سارا ہولٹ
کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ سارا کی اکثر
راتیں ہمارے فلیٹ میں گزرتی تھیں۔ اس
کمرے میں جہاں میں رہتی تھی۔ لیکن نہ جانے مجھے
اس فلیٹ کو اپنا کہنے کا حق بھی تھا یا نہیں میں
نے سمتھ سے شکایت کرنا چاہی، لیکن الفاظ
ہونٹوں تک آ کر رک گئے۔ جی میں آیا شکایت

کرنا بے سود ہے، آخر میں اس کی بیوی تو ہوں نہیں ہم نے تو محض وقت گزارنے کے لئے دوستی کی تھی، پھر اس نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ جب تک جی چاہے گا ایک ساتھ رہیں گے اور جب کسی ایک کا دوسرے سے دل اُکتا گیا، تو اچھے دوستوں کی طرح الگ ہو جائیں گے، ان باتوں کے پیش نظر میں نے سارا امولٹ سے اس کی دوستی کا ذکر کئے بغیر صرف اتنا کہا:

"مسٹر سمتھ مجھے آپ کی مصروفیتوں کا پتہ چل گیا ہے آپ دوبارہ یہاں آنے کی زحمت نہ کیجئے گا۔"

مسٹر سمتھ پہلے تو بھونچکا رہ گئے، پھر جیسے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

"پیاری ایلزبتھ، مجھے تم سے یہی اُمید تھی سچ تو یہ ہے کہ تم ایک نہایت حقیقت پسند لڑکی ہو، میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنا چاہئیے۔ سو میں تمہاری صحت کی دعا کرتے ہوئے خدا حافظ کہتا ہوں، تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے ضرور کہنا، اچھا میری تتلی خدا حافظ۔"

"خدا حافظ" میں نے رندھے ہوئے گلے سے کہا اور اس کے جانے کے بعد نہ جانے کیوں میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، میں جانتی تھی یہ دن ضرور آئے گا۔ لیکن نہ جانے کیوں جب یہ دن آگیا تو میں خود پر قابو نہ رکھ سکی، رو رو کر بیٹھی ہی تھی کہ جونی فوٹو گرافر آن پہنچا، اس نے بیماری کے دوران میں جس خلوص سے ساتھ میری عیادت کی اور ہر روز آتا رہا، اس کے لئے میں بہت شکر گزار تھی اور میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح سے مجھے اس کے احسانات کا بدلہ چکا دینا چاہئیے اس کی ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ میں اس کی پیش کش کو منظور کر لوں۔

ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد میں نے جونی کے یہاں رہائش اختیار کی، وہ کچھ زیادہ اچھا دوست نہ تھا، البتہ کاروبار کے معاملے میں بہت کھرا اور صاف گو واقع ہوا تھا۔ کام کے فوراً بعد نقد ادائیگی کر دیتا۔ یہ کام کیا تھا اس کی تفصیل مجھ سے نہ پوچھئے، ا عمر کی اس منزل میں نہ تو مجھ میں بیان کرنے کی

سکت ہے نہ آپ میں سننے کی۔ مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ مجھ ایسی لڑکی کے لئے بھی زندگی میں کبھی ثواب یا گناہ کے چکر میں نہ پڑی تھی، بقائمی ہوش دحواس اس حد تک جانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ جونی مجھے اور میرے ساتھیوں کو خوب شراب پلاتا، اور جب ہم پر از خود رفتگی کا عالم طاری ہوجاتا، تو اس کی مطلوبہ تصویروں کے لئے ماڈل تیار ہوجاتے، یہ بے شرمی اور بے ہودگی کے دن تھے یہ اخلاق باختگی اور رذالت کا زمانہ تھا سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں ذلت کی انتہائی گہرائیوں کی طرف تیزی سے لے جارہی تھی میری روح پر منوں بوجھ تھا اور میری آنکھیں شراب نوشی کی کثرت سے زرد پڑ چکی تھیں، رات میں جو کام میں کرتی تھی، دن میں اسے ذہن سے فراموش کرنے کے لئے دُھت رہنے لگی۔ اس کے باوجود چند ماہ سے زیادہ میں جونی کے یہاں نہ رہ سکی۔ میرے اندر جیسے ایک طوفان بپا تھا اور کوئی شئے مجھے مجبور کر رہی تھی کہ میں یہاں سے، اس فلیٹ سے بدی اور تاریکی کے اس ماحول سے فرار ہوجاؤں، لیکن مجھے ایک سہارے کی تلاش تھی اور میں اس کے بغیر اپنے آپ کو تنہا سمجھتی تھی ٹیکسی ڈرائیور بردلی نے میرے لئے سہارے کا کام دیا۔ یہ شخص اکثر اوقات جونی فوٹو گرافر کے پاس آیا کرتا تھا۔ جونی کے ذاتی اسٹوڈیو ہی میں پہلی بار اسے دیکھا اور یہیں بے تکلف ہوئی ہوئی۔ میں نے اپنی مشکل بیان کی تو اس نے فوراً امداد کی پیشکش کی۔ ایک روز جونی باہر گیا تو میں نے اپنا مختصر سامان جمع کیا اور بردلی کے ساتھ چل دی۔

بردلی، نگائیوں کے ایک باڑے میں بنے ہوئے چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا، کمائی کا زیادہ تر حصہ عیاشی کی نذر کر دیتا۔ جونی کے ہاں بھی اکثر وہ آوارہ لڑکیوں کی تلاش میں جاتا تھا۔ عادات کے اعتبار سے انسان کم اور درندہ زیادہ تھا۔ میں نے نباہنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی، مطلب براری کے لئے اُس نے مجھے گھر میں پناہ ضرور دی لیکن نشے میں ہوتا تو بُری طرح پیٹتا اور گالیاں بکتا۔ تنگ آکر میں نے اُسے چھوڑ دیا اور ایک بار پھر کام کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ ایک بہت

بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں مجھے سیلز گرل کی جگہ مل گئی، تنخواہ کے علاوہ کمیشن الگ ملتا۔ اچھی خاصی گزر ہونے لگی۔ میں نے ایک قریبی عمارت میں کمرہ کرائے پر لے لیا اور زندگی کے دن بڑے بھلے کاٹنے لگی، لیکن نہ جانے کیوں، مجھے محنت کی زندگی سے نفرت ہو گئی تھی۔ کولہو کے بیل کی طرح صبح سے شام تک ایک ہی کاؤنٹر پہ کھڑے ہو کر اور زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر بکھیر کر ہر گاہک کا استقبال کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ کام کاج سے اکتا کر میں نے ایک بار پھر دکان کے سیلز منیجر سے دوستی گانٹھی اور ہم ایک ناچ گھر میں شامیں بسر کرنے لگے۔ یکسانیت سے بھی نجات مل گئی اور میں نے ایک بار پھر خود کو تیز مشروبات اور رقص و موسیقی کے سپرد کر دیا۔ عیش و عشرت کے ان تمام ذرائع کے باوجود میں خود کو تنہا اور مجبور محسوس کرتی تھی۔ پچھلے پہر شراب کا نشہ ٹوٹنے اور جسم کے سب حصوں میں درد ہونے لگتا، تو محسوس ہوتا، میں کس قدر غمزدہ ہوں۔ اکثر اوقات تکیے میں سر چھپا کر دیر تک روتی رہتی۔ لیکن جونہی صبح ہوتی، رات کے دکھ درد بھول کر زندگی کی گہما گہمیوں میں گم ہو جاتی۔ نہ جانے کب تک میری زندگی اسی نہج پر بسر ہوتی، لیکن ایک واقعہ پیش آیا اور میں یک بیک ایک بہت مالدار امریکی تاجر کی بیوی بن گئی۔

اس کا نام ولیم تھا۔ پورا نام میں نہیں لوں گی۔ کیونکہ اس کے بیٹے آج کل بھی نہایت معزز اور قابلِ احترام سمجھے جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی ایک فرم میں میرے بھی کچھ حصے ہیں اور میں ان سے مراسم بگاڑنا نہیں چاہتی۔ بہرکیف وہ اپنے کسی کام سے لندن آیا، اس نے ایک سینما گھر میں میری ایک اشتہاری فلم دیکھی اور فوراً اپنے سیکریٹری کو حکم دیا اس لڑکی کو تلاش کیا جائے، چنانچہ ایک رات جب میں اپنے کمرے میں پہنچی، تو ڈاک میں ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ فلاں فلاں لکھ پتی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ دو روز بعد فلاں پتے پر پہنچ جائیں۔ سفر کے اخراجات کے لئے ۵۰ پونڈ کا ایک چیک ساتھ رکھا تھا اگر یہ چیک ساتھ نہ ہوتا، تو شاید میں مقررہ جگہ

نہ پہنچی، لیکن مجھے پیسوں کی ضرورت تھی میں نے بینک کیش کروالیا اور خط میں لکھے ہوئے پتے پر جا پہنچی، وہاں میرے ہونے والے شوہر کے سکریٹری نے سارے حالات بیان کئے اور بتایا کہ وہ صاحب مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں اور انھیں کس قسم کی بیوی کی ضرورت ہے میں نے چند روز کی مہلت چاہی، لیکن اس نے کہا ہم لوگ دو روز بعد واپس جا رہے ہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے۔ میں نے شام کو ملنے کا وعدہ کیا اور واپس کمرے میں آکر سوچنے لگی۔ شام تک میں اپنے دل میں ایک فیصلہ کر چکی تھی میں نے اپنا سارا سامان جمع کیا اور اُسے ایک کباڑیے کے یہاں فروخت کر دیا کپڑے اور جوتے تک بیچ ڈالے جو رقم ملی اس سے ایک نہایت اچھا لباس خریدا اور اُسے پہن کر مقررہ وقت تک سکریٹری سے ملنے چلی گئی۔۔۔ ہونے والا شوہر وہاں موجود تھا۔ سب سے پہلے ہم اعلیٰ قسم کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں گئے اور وہاں سے میرے لئے ڈھیر سارے کپڑے زیور اور آرائش کے لوازمات خریدے گئے۔ میں نے اپنے لئے ایک عروسی جوڑا بھی منتخب کیا میرے ہونے والے شوہر نے ان سب چیزوں کی قیمت ادا کی۔ بعد ازاں میرا پاسپورٹ بنوایا گیا اور بعض قانونی امور طے کرنے کے بعد دوسرے روز علی الصبح ہم فرانس جانے کی تیاریاں کرنے لگے، پیرس میں بڑی دھوم دھام سے ہماری شادی ہوئی۔ پریس فوٹو گرافروں کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے میں نے اپنا رشتہ برطانیہ کے ایک قدیم اور معزز خاندان سے ملایا اور مختلف پوز بنا بنا کر تصویریں کھنچوائیں۔ پھر ہم امریکہ روانہ ہو گئے۔

میرے شوہر عمر میں مجھ سے باون برس بڑے تھے۔ میری عمر اٹھارہ برس تھی اور وہ ۷۰ برس کے تھے۔ کئی ایک تجارتی فرموں کے حصہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک جہاز کمپنی کے بلا شرکت غیرے مالک تھے اور ان کا شمار امریکہ کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ پہلی بیوی سے ان کے دو لڑکے، جوان اور صاحب اولاد تھے۔ اس بیوی کی جائیداد سے

انھوں نے کاروبار کا آغاز کیا تھا اس کے مرنے
کے بعد چھ سات شادیاں کیں۔ یہاں یہ بتا دوں
ہمارے درمیان یہ طے ہو چکا تھا کہ میں ان کی
بیوی ہونے کے باوجود ان کے ساتھ نہیں
رہونگی۔ البتہ جب کبھی وہ کسی دعوت یا تقریب
میں جانا چاہیں گے تو مجھے ایک روز قبل بتا دیا
جائے گا۔ مجھے بن سنور کر ان کے ہاتھ میں ہاتھ
ڈال کر تقریب میں جانا ہوگا اور تقریب کے
خاتمے تک ان کے پاس بیٹھنا ہوگا۔ البتہ اگر ان
کے کوئی میزبان یا مہمانوں میں سے کوئی معتبر
ہستی میرے ساتھ رقص کی خواہش ظاہر کرے
تو اس کی خواہش پوری کرنا ہوگی۔ مجھے تقریب
میں ان کی خوشنودی کا خیال رکھنا اور یہ ظاہر
کرنا ہوگا کہ میں ان سے بہت محبت کرتی ہوں
ان کے اصل نام کے بجائے پیار سے کے نام
سے بلانا ہوگا اور تقریب کے خاتمے پر ان کے
ساتھ ہی گھر واپس جانا ہوگا۔ البتہ انھیں گھر پہنچا
کر جہاں چاہوں جا سکوں گی۔ مجھے اعلیٰ سے اعلیٰ
سوسائٹی میں رہنا ہوگا۔ اچھے سے اچھے کلب
میں جانا ہوگا اور شوہر کی پوزیشن کا خیال

رکھتے ہوئے چند رفاہی ادارے
مجھے اپنا ذاتی اسٹاف رکھنے کی ا
جس میں ایک نوجوان سکریٹری ہم
کا عہدہ مرد کو دیا جائے گا۔ البتہ
میں اپنی پسند کے مطابق منتخب
اسٹاف اخراجات، کلب، ہوٹل
خرید و فروخت کے بل میرا شوہر
اس کے علاوہ ہر ہفتے مجھے ایک معق
جائے گی، تاکہ میں اپنے ذاتی اخرا
کر سکوں نہ میں کسی ادنیٰ شخص
نہ اس کے ساتھ گھوموں گی، البتہ
کے اندر میں اپنی مرضی کے مطابق
کر سکتی ہوں اس کے علاوہ اور بھی
شرائط تھیں، جنہیں میں بھول گئ
قصہ مختصر یہ کہ میرے شوہر ک
ایک خوبصورت گڑیا کی ضرورت
زنجیر پکڑ کر وہ باہر گھومنے کے
مجھے چونکہ عیش و عشرت کی زندگی
جی بھر کے زندگی کے لطف اٹھا
تھی اس لئے میں نے اس کی دعوت

اس بوڑھے کو معلوم تھا کہ نوجوان لڑکیوں کی ضرورت کیا ہے، اچھا کھانا، اچھا کپڑا، اونچی سوسائٹی اور ایک چاہنے والا چنانچہ اس نے شرائط میں پہلے سے گنجائش رکھی تھی کہ یہ سب چیزیں مجھے مل جائیں۔

مسٹر ولیم کی بیوی کی حیثیت سے میں نے ایک سال اور تین ماہ بسر کئے۔ زندگی کی وہ نعمتیں جن کا تصور کیا جا سکتا ہے مجھے ملیں، لیکن میں جلد ہی اس اداکاری سے اکتا گئی، جھریوں بھرے ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر دعوتوں میں اڑانے سے مجھے نفرت ہو گئی۔ لوگوں کے سامنے ایک بڈھے کھوسٹ کی ہر بات پر واہ واہ کرنا اور اس کے پلپلے رخسار چومنا میرے لئے آسان کام نہ تھا یہ سچ ہے کہ میرے نوجوان، خوبصورت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ سکریٹری مسٹر ڈائم میری تنہائیوں کے رفیق اور مونس و غم خوار تھے، لیکن نہ جانے کیوں ان کی محبت پا کر بھی تسلی نہ ہوتی تھی، یوں لگتا جیسے اس محبت کی انھیں تنخواہ مل رہی ہے، وہ اس مشاہرے کے لئے میری ناز برداریاں کر رہے ہیں جو مسٹر ولیم کی طرف سے ملتا تھا۔ رفتہ رفتہ میں بیزار ہونے لگی، اداکاری مسلسل اداکاری

تخوف، پابندیاں چار دیواری کے اندر مسٹر ڈائم میرے سب کچھ تھے اور چار دیواری کے باہر مسٹر ولیم۔ اس تضاد سے میرے ذہن پر بہت برا اثر پڑا اور بالآخر مجھے اس زندگی سے نفرت ہونے لگی، میں نے فیصلہ کر لیا، مسٹر ڈائم کے گھر چلی جاؤں گی، اور جو رقم بچائی ہے اس پر دونوں گزر اوقات کریں گے، میں نے وہ رقم مسٹر ڈائم کے حوالے کر دی تاکہ وہ ابتدائی انتظامات مکمل کر سکیں، اور اپنے شوہر سے آخری ملاقات کا فیصلہ کر لیا۔

خیال تھا میرا شوہر پریشان ہو جائے گا لیکن میری تقریر سن کر اس پر ذرہ برابر اثر نہ ہوا۔ اس نے جذبات سے عاری لہجے میں صرف اتنا کہا۔

"کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"ہاں، یہ میرا آخری فیصلہ ہے اور اب میں کسی قیمت پر تم جیسے منحوس ـــــ"

فضول باتیں نہ کرو، آج شام کو میں تمہیں قانونی طور پر طلاق دے دوں گا، تمہارے تعاون کا بہت بہت شکریہ، میں نے اپنی ایک فرم کے

کچھ حصہ بھی تمہارے نام منتقل کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ تمہیں مالی پریشانی نہ ہو، البتہ میں ایک مخلص دوست کی طرح مشورہ دوں گا کہ ڈائم کی باتوں میں نہ آنا، تم سے پہلے بھی وہ میری دو بیویوں کا سکریٹری رہ چکا ہے زیادہ بہتر یہ ہے کہ برطانیہ واپس چلی جاؤ تمہیں فرم سے معقول معاوضہ ملتا رہے گا۔"

"میں مسٹر ڈائم کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔"

"اب تم جا سکتی ہو۔" یہ کہہ کر میرے شوہر نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

اس وقت میں اسے دنیا کا ذلیل ترین انسان سمجھتی تھی، لیکن آج غور کرتی ہوں تو خیال آتا ہے، وہ کتنا حقیقت پسند تھا۔ اس نے مجھے خریدا، مگر ساری شرائط بتا کر۔ اس نے مجھ سے چھپا کر کچھ نہیں رکھا اور نہ میرے ساتھ کوئی بدعہدی کی۔ شام کو حسبِ وعدہ اس نے مجھے طلاق دے دی۔ طلاق کے فوراً بعد حسبِ وعدہ میں مسٹر ڈائم کے یہاں پہنچی، تو معلوم ہوا وہ میری ساری جمع پونجی لے کر فرار ہو گیا ہے، فلیٹ اس نے چھوڑ دیا ہے اور سامان ساتھ لے گیا ہے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں واپس برطانیہ چلی جاؤں، لیکن میرے پاس تو ڈھانپنے کے کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ معاہدے کے مطابق قیمتی جیولری بھی میں واپس کر چکی تھی، تاکہ مسٹر ڈیم اسے اپنی اگلی بیوی کو تحفہ دے سکیں، مجبور ہو کر میں نے مسٹر ڈیم سے مدد چاہی۔ انہوں نے نہایت شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے سفر کے اخراجات سے بھی زائد رقم دی اور میں برطانیہ آ گئی۔

لندن پہنچ کر میں ایک بار پھر بے کار گھومنے لگی۔ میں نے ایک کار خریدی اور راتوں کو ویران سڑکوں پر تیز رفتاری سے چلانے لگی۔ یہ میرا دل پسند مشغلہ تھا۔ اس کے سوا مجھے کسی شئے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ رقص اور موسیقی بھی میرے لئے بیزار کن چیزیں تھیں۔ عیش و عشرت کے سارے لوازمات سے میں اس حد تک لطف اندوز ہو چکی تھی کہ ان میں کوئی دلکشی باقی نہ رہی تھی۔ اب میں کوئی نیا کام کرنا

چاہتی تھی۔ بالکل نیا۔ ایسا کام جس میں بلا کی سنسنی ہو، ایڈونچر ہو جسے کرنے کے بعد میں دنیا بھر میں مشہور ہو جاؤں، میں جواب تک بڑے لوگوں کے طفیلی کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہی تھی، خود بڑی بن جاؤں، لیکن اس کے لئے کونسا نیا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے، یہ بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔

انہی شبانہ آوارگیوں کے دوران میں میری ملاقات ہلٹن سے ہوئی۔

ہلٹن فوج سے بھاگا ہوا ایک سپاہی تھا جو خود کو سابق کیپٹن ظاہر کرتا تھا۔ اس کے پاس کیپٹن کی ایک وردی اور تمغے بھی تھے۔ جو غالباً اس نے کہیں سے چرائے تھے۔ ایک رات میں اپنی کار میں آہستہ آہستہ ایک پل پر سے گزر رہی تھی کہ انسانی چیخیں سنائی دیں، اُتر کر دیکھا، تو ایک لمبا تڑنگا مرد کسی شخص کو بُری طرح زدوکوب کر رہا تھا۔ میرے پہنچنے سے پیشتر اس نے اپنے شکار کی تلاشی لی اور رقم اپنے قبضے میں کر لی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور بولا۔

"پارٹنر، کافی رقم ہے، ففٹی ففٹی کر لیں گے"

اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی اور وہ بُری طرح بہک رہا تھا، نہ جانے کیوں مجھے اس پر رحم آ گیا۔ اسے سہارا دیکر کار تک لے گئی، اپنے فلیٹ میں لے جا کر میں نے اُسے گرم گرم کافی بنا کر دی۔ اس دوران میں کئی بار میرا خیال اس بدنصیب کی طرف گیا۔ جو پل کے پاس اندھیرے میں بے ہوش پڑا تھا۔ مگر ہر بار میں نے خود پر قابو پا لیا اور جی جان سے ہلٹن کی خدمت کرنے لگی۔ اس وحشی انسان سے مجھے اچانک ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اور جس بُری طرح وہ اپنے شکار کی پٹائی کر رہا تھا۔ اس سے مجھے یک گونہ تسکین ملی تھی۔ اس رات کے بعد وہ میرے فلیٹ ہی میں رہنے لگا۔ اور ہم دونوں نے مل کر رات گئے سڑکوں پر آوارگی اور راہگیروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ خدا گواہ ہے میں نے یہ کام روپے پیسے کی خاطر نہیں، محض یکسانیت سے اُکتا کر اور اپنے اندر پیدا ہونے والے جمود کو توڑنے کے لئے شروع کیا تھا، تیز ی

منسی، دہشت پکڑے جانے کا خوف، ایذادہی کا جذبہ یہ اس کام کے ثمر تھے۔ وہ ایک بار ہم نے راہگیروں کی اتنی پٹائی کی کہ وہ موقع ہی پر مر گئے لیکن مجھے اپنے کئے پر کوئی ندامت نہ ہوئی میں بنی نوع انسان سے بیزار ہو چکی تھی، میں اپنی محرومیوں، اپنی تلخیوں اور لوگوں کی بیوفائیوں کا بدلہ کسی ایک انسان کو تکلیف پہنچا کر، اُسے لوٹ کر یا قتل کر کے لے رہی تھی۔ ہم نے پانچ قتل کئے اور درجنوں ڈاکے ڈالے اور پھر ایک روز ہم اپنے فلیٹ میں بیٹھے شراب پی رہے تھے کہ پولیس آ گئی اور ہمیں گرفتار کر لیا گیا۔

ہلٹن نے پہلی ہی پوچھ گچھ میں سارے حالات بیان کر دئیے۔ اب میرے لئے بھی سوائے اقرار کے اور کوئی چارہ نہ تھا، ویسے بھی میرا ضمیر سچ بولنے پر مجبور کر رہا تھا، وہ مجھے گناہوں کا بدلہ سزا کی صورت میں دینا چاہتا تھا۔ عدالت سے ہلٹن کو سزائے موت اور مجھے عمر قید کا حکم سُنایا گیا۔ مجھ پر یہ فیصلہ سُن کر بھی کوئی خاص اثر نہ ہوا زندگی میرے لئے ایک ایسی طویل اور بیزار کُن رات کی طرح تھی جس کی صبح کبھی نہیں ہوتی یا شاید اس

وقت ہوتی ہے جب مسافر تھک [...]
اور آگے بڑھنے کی اُمنگ دم [...]
کہتے ہیں اچھے چال چلن [...]
کم کر دی گئی ہے اور مجھے رہا [...]
مجھے رہائی کی خوشی ہے نہ قید کا [...]
چاہتی ہوں کہ خوشی کسے کہتے ہیں [...]
میرے اندر چھپی ہوئی عورت [...]
کرتی ہے کہ جب تم اپنے باپ کے [...]
کے بعد دن بھر محنت کر کے جسم [...]
کی ضرورتیں پوری کرتی تھیں [...]
لئے محنت کروں، اس ظاہر پہ [...]
میری مثال ڈھلتے ہوئے سورج [...]
اس کو کون سر آنکھوں پر بٹھائے [...]
شاید اپنے حصے کی خوشیاں میں [...]
کر چکی ہوں اور اب میرے لئے [...]
کے سوا کچھ نہیں بچا لیکن کیا [...]
تھیں، اس کا جواب میں نہ [...]
کیونکہ جواب اس قدر [...]
برداشت کا حوصلہ نہیں

بنتاج کے خطوط

(۴)

نشاط! پیاری نشاط!

پرسوں میں انجم کے گھر گئی تو وہاں ایک نیا نیا رسالہ "امنگ" نظر پڑا۔ اٹھا کر دیکھا۔ اس میں تمہارا لکھا ہوا افسانہ "کونپلیں" شائع ہوا ہے۔ ایڈیٹر نے ابھرتے ہوئے فنکاروں میں تمہارا تعارف کرایا ہے۔ یقیناً اس تعارف سے تمہارا دماغ ابھی آسمان پر تو نہیں پہنچا ہوگا لیکن وہ تمہارے سر میں بھی نہ ہوگا۔ آج کل تم اسم بامسمٰی نشاط بن گئی ہوگی۔ ایک ایک کو امنگ دکھاتی پھرتی ہوگی۔ تم امنگ کی تعریف کر کر کے کہتی ہوگی، اس کے افسانے دل کو چھونے والے ہوتے ہیں اور تم نے "کونپلیں" کے صفحہ پر کوئی ایسی نشانی رکھ دی ہوگی تاکہ رسالہ امنگ کھولنے والے کے سامنے پہلی ہی بار افسانہ کونپلیں آجائے اور پھر تمہاری کیفیت وہی ہوگی جو کسی نے کہا ہے کہ نہ پئے اور جھومتا جائے۔

عزیز نشاط! یہ میں یونہی نہیں کہہ رہی ہوں۔ اپنے تجربے کی باتیں لکھ رہی ہوں۔ جب میں بی۔اے میں تھی تو مجھے بھی افسانہ نگار بننے کا شوق ہوا تھا۔ شہرت کے شوق میں میں نے بھی الٹا سیدھا ایک افسانہ لکھا۔ پھر سوچنے لگی کس پرچے میں چھپنے کے لئے بھیجوں۔ میں نے ماہنامہ "مست متوالا" میں بھیجنا طے کیا ہے۔ اس کا سالانہ چندہ بھیجا۔ پھر افسانہ اور ایڈیٹر کو لکھا:

"سویٹ بھائی! میں پہلے پہل ایک افسانہ لکھ کر آپ کی خدمت میں بھیج رہی ہوں

یہ افسانہ "مست و متوالا" کے معیار کا تو نہیں لیکن اگر آپ حوصلہ افزائی فرمائیں گے تو ایک دن میں کسی خدمت کے لائق ہو جاؤں گی۔ ماہنامہ "مست و متوالا" مجھے پسند ہے۔ آپ اُسے بڑے سلیقہ سے ترتیب دیتے ہیں۔ دراصل آپ کی صلاحیت نے اُسے چار چاند لگائے ہیں۔ امید ہے کہ آپ اپنی بہن کو مایوس نہ کریں گے۔"

اور اس کے بعد میں نے تین افسانے لکھے۔ تینوں "مست و متوالا" میں چھپے اور اب میرے پاس "مست و متوالا" پڑھنے والوں کے خطوط آنے لگے۔ ان خطوط میں میری بڑی تعریف کی جاتی۔ میرے افسانوں کے پلاٹ کی تعریف۔ میری نئی تلاش اور جدت کی تعریف میری زبان اور بیان کی تعریف وغیرہ۔

ایسے تمام خطوط میں مسٹر عزیز کے خطوط میری توجہ کا خاص مرکز بن گئے۔ مسٹر عزیز اپنے خطوط میں لکھتے "آپ کے لکھے ہوئے افسانے کسی مغربی افسانہ نگار کے افسانوں سے کم نہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے ملک میں آپ جیسی افسانہ نگار کی قدر نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنے افسانوں کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اجازت دیں پھر دیکھیں گے مغرب کے لوگ کہ ہمارے ملک کے لکھنے والے کسی سے کم نہیں۔"

مسٹر عزیز کے خطوط پڑھ پڑھ کر میرے پاؤں زمین سے اٹھ گئے اور میں نے یہ محسوس کیا کہ میں آسمان کی بلندیوں میں اوپر اٹھ رہی ہوں۔ میں نے مسٹر عزیز کا شکریہ ادا کیا پھر انھوں نے جب میرے ایک افسانے "انگاروں کی آنچ" کا ترجمہ کر کے میرے پاس بھیجا تو میں اپنے کو بھول گئی اور مجھے ایسا لگا کہ یورپی اُفق پر چھائی جا رہی ہوں۔

نشاط! تم سمجھ گئی ہوگی کہ میں بہت مسرور ہوئی تھی۔ میں نے ڈھیروں شکریہ مسٹر عزیز کو لکھ بھیجا۔ اب میرا جو افسانہ شائع ہوتا اس کا ترجمہ انگریزی میں ہو جاتا۔ چار پانچ افسانوں کا ترجمہ ہونے کے بعد مسٹر عزیز نے مجھے لکھا کہ ماڈرن انگلش پریس سے

معاملہ ہو رہا ہے۔ وہ آپ کے افسانوں کا مجموعہ چھاپنے کے لئے تیار ہے لیکن رائلٹی پر بات آکر رک گئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ رائلٹی ٪25 ہونا چاہئے وہ ٪10 سے زیادہ نہیں دینا چاہتا۔ اب اس دس فیصدی میں اگر پانچ فیصدی آپ کے اور پانچ فیصدی میرے ہوں گے تو یہ آپ کی صحیح قدردانی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ٪15 آپ کو ملنا ہی چاہئے اور ٪10 مجھے۔ اس طرح رائلٹی کا معاملہ طے ہو جائے اور پہلا ایڈیشن پچاس ہزار کا چھپے تو بات بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ افسانہ نگار انگریزی ادب میں غیر معروف ہے۔ نہیں معلوم کتاب چلے یا نہ چلے تو؟

یہ خط ملا تو میری بے چینی کی انتہا نہ رہی۔ میں نے لکھا "ہائے اللہ! عزیز بھائی منظور بھی کر لیجئے جو رائلٹی ملے وہ سب آپ کی۔ میں تو بس ادب کی خدمت ہی کو بھرپور صلہ سمجھتی ہوں۔

پانچویں دن جواب آگیا کہ معاملہ طے ہو گیا۔ آپ اپنا فوٹو بھیجئے۔ جو ٹائٹل پر چھپے گا اور یہ بتائیے کہ آپ کی منظوری کے دستخط کس طرح حاصل کئے جائیں۔ پریس کا منیجر کہتا ہے کہ مصنف کے دستخط رو در رو کئے جائیں گے۔ کیا آپ یہاں تشریف لا سکتی ہیں؟ امید ہے کہ جلد جواب دیں گی اور آپ کا جواب "ہاں" میں ہوگا۔ اگر آپ اپنے پروگرام سے مطلع کر دیں تو یہاں آپ کے ٹھہرنے کا انتظام کر دیا جائے۔ آپ کے دستخط ہونے اور معاہدہ طے ہو جانے کے بعد چھپائی کا کام شروع ہو جائے گا"

نشاط! اب میری حالت اس شرابی کی سی ہو گئی جس نے سو بوتلیں چڑھالی ہوں اور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہو۔ ملک اور بیرون ملک میں شہرت کے شوق نے میرے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کو ماؤف کر دیا تھا۔ میں کلکتہ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ میں نے گھر میں کسی کو نہیں بتایا۔ کالج سے سیدھی اسٹیشن گئی،

ریزرویشن کا ٹکٹ خود منوا لائی۔ مسٹر عزیز کو تار دیا کہ فلاں گاڑی سے آرہی ہوں۔ اپنا فوٹو رجسٹرڈ ڈاک سے بھیج دیا اور اس کے جواب میں مسٹر عزیز نے اپنا فوٹو مجھے بھیج دیا۔ فوٹو کے نیچے لکھا تھا "تاکہ آپ مجھے اسٹیشن پر پہچان لیں"

پھر جب میں گھر سے چلی تو میں نے اپنا سب سے اچھا سوٹ زیب تن کیا۔ ٹرین پر ایک شخص نے مجھے دیکھا تو "شعلہ جوالہ" کہا۔ میں سچ مچ شعلہ جوالہ بن کر چلی تھی۔ کون جانتا تھا کہ یہ "شعلہ جوالہ" دوسروں کو جلانے کے بجائے خود اپنی آگ میں بھسم ہو جائے گی۔ اپنی آگ میں بھسم ہونے کی کہانی اس طرح ہے۔

ٹرین پلیٹ فارم پر رکی۔ ریزرویشن کے ڈبے کے سامنے مسٹر عزیز سلیٹی سوٹ پہنے۔ بائیں طرف اوپر کی جیب میں پھول لگائے۔ ڈبے پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ اچانک وہ بڑھے اور اس سے پہلے کہ میں کھڑکی سے باہر آؤں۔ خوش آمدید کہتے ہوئے بے تکلف مجھے سہارا دے دیا۔ انھوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے ان کے ہاتھ میں دے دیا اور پھر ٹیکسی کے ذریعہ کلکتے کے مشہور ہوٹل "نازونہ" میں ایک ایسے کمرے کے اندر پہنچی جو نسائی ذوق کو مدنظر رکھ کر بڑے سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ میں مسٹر عزیز کی بہت شکرگزار ہوئی۔ انھوں نے کہا آپ غسل فرمالیں اس کے بعد چائے ساتھ پئیں گے۔ میں نے غسل کیا کپڑے بدلے اور اب میں کالی ساڑی پہن کر جو نکلی تو مسٹر عزیز مجھے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے "آپ بہت جامہ زیب ہیں" ان کی زبان سے نکلا اور میری زبان سے شکریہ! پھر ہم دونوں نے کچھ کھایا پیا۔ پھر باتیں شروع ہوئیں۔

مسٹر عزیز نے زبانی وہ تمام باتیں دہرائیں جو خطوط میں ظاہر کر چکے تھے اور میرے لطف میں اضافہ ہوتا رہا۔ پروف کا ایک صفحہ دکھایا۔ میں نے ٹائپ پسند کیا

انھوں نے بتایا کہ پہلا ایڈیشن پچیس ہزار چھپے گا۔ رائلٹی اتنی بنتی ہے اور پھر سارے حالات کو اتنا طویل دیا کہ یہ بھی خیال نہ رہا کہ رات کے بارہ بج چکے ہیں۔ اچانک انھوں نے سامنے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی: معاف کیجئے گا بڑا وقت آپ کا لیا۔ اب کل باتیں ہونگی؟

انھوں نے کہا اور اٹھنا چاہا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ وہ میرے افسانوں کے بارے میں کہتے رہیں اور میں سنتی رہوں۔ میں نے گزارش کی کہ ابھی تشریف رکھیے۔ نیند کسے آرہی ہے۔ چلے جائیے گا!

"نہیں! کل آپ کو بہت کام کرنا ہے۔ اب آپ سو جائیے" عزیز صاحب اُٹھکر چلنے لگے تو آپ سے آپ میری زبان سے نکل گیا۔ "تو یہیں آپ بھی سو جائیے نا۔ جب تک نیند نہ آئے باتیں کریں" اور پھر میرے اصرار پر وہ راضی ہو گئے۔ ہم آمنے سامنے منہ کئے لیٹے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے نہ جانے کب نیند کی گود میں چلے گئے۔ صبح کو دن چڑھے میں جاگی تو مسٹر عزیز نہ تھے۔ شائد وہ ضروریات سے فارغ ہو رہے ہوں۔ میں انتظار کرتی رہی۔ وہ "ناز و نیاز ہوٹل" میں کب۔ اب میں نے چاہا اٹھوں کہ سرہانے ایک لفافہ پڑا دکھائی دیا۔ میں نے لفافہ اٹھایا اندر سے خط نکالا۔ یہ خط مسٹر عزیز کا لکھا ہوا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ:

"مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں اپنے منصوبے میں فیل ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ آج رات میں آپ سے کم سے کم پچاس ہزار ضرور وصول کروں گا لیکن آپ کی اٹیچی سے آپ کا زیور اور نقد ملا کر کل دس ہزار ہی ملا۔ یہ میری شرافت ہے کہ میں نے آپ کے سفر خرچ کے لئے رقم چھوڑ دی۔ آپ یہاں سے سیدھی آگرہ تشریف لے جائیں میری تلاش کے چکر میں نہ پڑیں۔ آپ جس وقت جاگیں گی۔ میں آپ سے تقریباً دو سو میل دور پہنچ جاؤں گا۔ میرا نام بھی عزیز نہیں ہے۔ میں آج دن بھر اور آپ کے ساتھ

رہتا لیکن مجھے آج ہی ایک شکار اور کرنا ہے۔ اپنے منصوبے کے مطابق پچاس
بنانا ہے۔ اگر خدا سے ہے تو خدا کے فضل و کرم سے آپ جیسی بہت سی بنتا ج میری
یں ہیں۔ آپ میرے اس احسان کو کبھی نہ بھولیں کہ میں آپ کو آپ کی بہترین آ
بیتی دیئے جا رہا ہوں۔ اچھا خدا حافظ۔

نشاط! یہ ہے میری آپ بیتی۔ خدانخواستہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی صیاد تمہارے
پیچھے پڑ جائے اس لئے ذرا اپنے کو بچائے رکھنا۔ ویسے یہ مشکل۔ تم اس وقت شہ
کے شوق میں مبتلا ہو۔ تمہارے پاس تعریفی خطوط آنے لگے ہوں گے اور امیر مینائی
گئے ہیں کہ سو بوتلوں کا نشہ ہے اک واہ واہ میں۔

اور اس وقت تم واہ واہ کے ہجوم میں ہوگی۔ خدا تم کو محفوظ رکھے۔ والسلام

سائنس کی دنیا

● بولنے والا اخبار

یہ اخبار ایک معمولی کاغذ سا ہوتا ہے جس کے کناروں میں آواز بند ہوتی ہے جیسے گانے والی مشین کی پلیٹوں میں ہوتی ہے مگر گانا سننے کے لئے جس طرح پلیٹ کو مشین پر چڑھاتے ہیں اس کو کسی مشین پر چڑھانے کی ضرورت نہیں۔

اخبار خرید کر اس کا ایک کونہ پھ دو۔ ایک ایک کر کے دن بھر کی خبر ہنسنے ہنسانے کی باتیں اور مدھ بھر گانے سبھی کچھ سن لو۔

مزے کی بات یہ ہے کہ یہ اخ عام اخباروں سے مہنگا بھی نہیں ہے۔ امیر، غریب، اندھے، ان پڑ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں

ڈاکٹر عبدالحفیظ ایوبی

یہ تباہ کن رسمیں

اسلام ایک سادہ اور شائستہ مذہب ہے اس نے اپنے متبعین کو بھی سادہ اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی ہدایت کی ہے۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ عہدِ رسالت کے مسلمان بے انتہا سادہ مزاج اور سادہ طبیعت تھے۔ اُن کی معاشرت بھی آج کل کی سی تباہ کن رسموں سے یکسر بے نیاز تھی۔ اسی لئے وہ اطمینان اور سکون کی زندگی بسر کرتے تھے، اور ان کی عظمت و جلالت کا آفتاب ساری دنیا کو اپنی شعاعوں سے منور کر رہا تھا۔

حضور کے بعد ایک عرصہ تک تو بیہودہ قسم کی رسمیں نہ پنپ سکیں۔ لیکن بعد میں دھیرے دھیرے مفاد پرستوں نے ان بے ہودہ رسموں کو ایجاد کرنا شروع کر دیا۔ جس سے آج ۹۵ فی صدی مسلمان متاثر ہیں، ان لغو اور بے بنیاد رسموں سے اسلامی معاشرت بہت مجروح ہو چکی اور ہو رہی ہے، بے مقصد روپیہ خرچ کر کے مسلمان خوشی خوشی اپنے لئے جہنم تیار کر رہے ہیں۔ اس معاملہ میں مسلم خواتین بہت آگے ہیں۔

زیر نظر سطروں میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے اور موجودہ زمانے سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے، کہ ہمیں اور آپ کو اسلامی طرز کی زندگی گذارنے کے لئے کیا ان رسموں کی پابندی ضروری ہے جس کے لئے ہمیں ہمارا سچا مذہب روکتا ہے لغو اور بے بنیاد

رسموں میں بے جا اسراف کرکے کیا آپ کو کچھ ذہنی سکون مل سکتا ہے؟ قطعی نہیں، آپ از خود پریشانیوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ رسم نبھانے کے شوق میں آپ جتنا زیادہ خرچ کرتے ہیں اتنا ہی زیادہ پریشانیاں آپ پر آتی ہیں۔ جس کے انجام میں اکثر و بیشتر بہت زیادہ خوفناک منظر سامنے آجاتے ہیں اور آپ بے ساختہ اپنی پریشانیوں کا رونا ہر ایک سے رونا شروع کر دیتے ہیں جو اور بھی مصیبت ہے، آئیے دیکھئے! آج کی اور حضور کے دور کی زندگی کس طرح گزرتی تھی۔

عہدِ رسالت میں سب سے پہلا مظاہرہ عبودیت یہ تھا کہ اگر کسی فرزند اسلام کے گھر بچہ پیدا ہوتا تھا تو وہ دربارِ خداوندی میں سربسجود ہوکر حق تعالیٰ کی تقدیس بیان کرتا تھا اور چالیس دن کے بعد بچہ کے ماں باپ شکریہ کے نوافل پڑھتے تھے اور بقدرِ استطاعت غریبوں کی امداد کرتے تھے لیکن آج کے دور میں جاہ و جلال شان و شوکت کا اس طرح مظاہرہ ہوتا ہے کہ بچے کی ولادت کے فوراً بعد نغمہ و رقص کی محفل منعقد ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ کبھی کبھی ۶ روز تک چلتا رہتا ہے

اس کے بعد چھٹی کی رسم ادا کی جاتی ہے، اس میں مہمانوں کا عظیم الشان اجتماع ہوتا ہے۔ طرح طرح کے تکلفات اختیار کئے جاتے ہیں، اگر رقم موجود نہیں ہوتی تو سودی قرض سے کام چلایا جاتا ہے۔ یعنی بچے پر ابتدائی دنوں ہی سے سود جیسی لعنت کا سایہ ڈال دیا جاتا ہے، پھر ختنے کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس میں بھی اگر مہمانوں کو بڑے پیمانے پر نہ بلایا جائے اور رنگ برنگی بیہودگیوں کا انعقاد نہ ہو تو گویا بقول گھر والیوں کے ختنہ کا صحیح حق ادا ہی نہ ہوا۔

عہدِ رسالت میں بھی ختنہ ہوتا تھا لیکن اس میں ایسی فضول رسمیں نہیں ہوتی تھیں۔ انتہائی سادگی سے سب کام ہوتا تھا جس کا مقصد صحت کی اصلاح تھی نہ کہ مظاہرہ وجاہت، اس منزل کے بعد بسم اللہ خوانی کا اہتمام ہوتا ہے۔ اور اس رسم کو نبھانے کے لئے بچے کے والدین کو زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ ایسا نہ کرنے پر انہیں یہ خدشہ لاحق ہے کہ خاندان بھر میں ان کی بڑی سبکی ہوگی۔ لوگ انہیں خسیس اور نہ جانے کیا کیا القابوں سے نوازینگے۔

اور جب خدا خدا کر کے بچہ شادی کے لائق ہو گیا تو اس کا انتظام، خصوصاً لڑکیوں کے لئے جہیز کا انتظام نہایت اہتمام سے کریں گے، اگر جہیز نہ اکٹھا کریں گے تو ان کی لڑکی کنواری رہ جائے گی، چاہے اس انتظام کے لئے کتنا ہی سودی روپیہ انھیں کیوں نہ لینا پڑے اور مکان تک بیچنا پڑے۔ اس لئے کہ خاندان میں ناک رہ جائے۔

عہدِ رسالت میں بھی شادیاں ہوتی تھیں صحابۂ کرام بھی اولاد سے محروم نہیں تھے، ان کے پہلو میں بھی دل تھا۔ خود ہمارے سرکار بھی چار لڑکیوں کے والد تھے۔ اگر چاہتے تو حضرت فاطمہ زہرہ رضؓ کو ساری دنیا کی دولت وحشمت دے سکتے تھے۔ لیکن آپؐ نے وہ طریقہ استعمال کیا جو اسلام کے شایانِ شان تھا جس سادگی سے آپ نے اپنی نورِ نظر اور لاڈلی بیٹی کی شادی کی اس کی مثال آج دنیا میں نہیں مل سکتی ہے۔ آپ کے صحابہ نے بھی تاحیات اسی سادگی کو برقرار رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ آج کے مسلمانوں کی طرح پریشان نہیں ہوتے تھے۔

اس زمانہ میں مرنے کے لئے بھی "خاص اہتمام" کی ضرورت ہے۔ ابھی جسدِ خاکی سے روح پرواز بھی نہ کرنے پائی تھی کہ ادھر ادھر انتظام کی فہرست تیار ہونے لگتی ہے۔ تیجہ، دسواں، بیسواں، اور چالیسواں کے فاتحہ کا خرچ جوڑا جانے لگتا ہے آدمیوں کی فہرست زیرِ بحث ہونے لگتی ہے، کہ کتنے آدمی کھانا کھائیں گے۔ کتنا دیگر مصارف میں خرچ ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔ ادھر احباب تیار بیٹھے ہیں کہ کب فاتحہ ہو۔ کب ہمیں پلاؤ بریانی اور دیگر کھانے کی چیزوں پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع ملے۔ آخر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ فاتحہ کافی قرض دار ہو گئے ہیں۔ اب اللہ ہی عزت رکھے۔

عہدِ رسالت میں میت کے ورثاء کو کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ بلکہ وہ قرآن خوانی و دعائے مغفرت کو اصل چیز سمجھتے تھے۔ ان تباہ کن رسموں کا نتیجہ اس طرح سامنے آرہا ہے کہ مسلمان جو کبھی انتہائی بلندی پر تھا آج انتہائی پستی کی طرف بڑھتا جارہا ہے۔ ضرورت سے زیادہ اسراف کر کے خود ہی پریشانیوں کا شکار بن رہا ہے پھر بھی نہیں سوچتا کہ رہبرِ انسانیت نے کیا سبق دیا تھا؟ (کاش! ہم بھی صحابہ کے طرز کی زندگی گزارتے) ❊

مس شگفتہ احمد دہلی

وقت قدرت کا ایک انمول عطیہ

انسان کا سب سے بیش قیمت سرمایہ وقت ہے۔ وقت ایک ایسی دولت ہے کہ جس سے ادنیٰ سی غفلت بھی برتی جائے تو پھر اس غفلت کے نتیجے میں جو نقصان ہوتا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔

ہماری زندگی بھی وقت کے دھارے کے ساتھ رواں دواں ہے لیکن یہ دھارا گزرتا ہی جاتا ہے واپس نہیں ہوتا۔ پھر ایسی حالت میں وقت کا جو حصہ بھی ہم ضائع کرتے ہیں۔ اس کے واپس ملنے کی کوئی توقع نہیں ہوتی۔ ہر کھوئی چیز مل سکتی ہے لیکن جو وقت چلا جاتا ہے وہ واپس نہیں آتا۔

اس لئے جو لوگ وقت کی اس اہمیت سے آگاہ ہیں وہ ایک ایک پل کی قدر کرتے ہیں اور زندگی کا کوئی نہ کوئی کام اس سے وابستہ رکھتے ہیں۔

دنیا میں جتنے بڑے لوگ ہوئے ہیں ان کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ انھوں نے وقت کی صحیح قدر کی۔ اسلام نے بھی ہمیں یہ بتلایا ہے کہ زندگی کی یہ مہلت جو وقت کی شکل میں ہمیں ملی ہوئی ہے۔ ہر شخص کو اس کا حساب دینا ہوگا۔

وقت کی یہی اہمیت ہمیں یہ بتلاتی ہے کہ اس سے نہ صرف بھرپور فائدہ ہی اٹھایا جائے بلکہ ایسے کام کرنا چاہئے جس سے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پورے انسانی سماج کو سکھ اور چین نصیب ہو۔

جو لوگ وقت کی قدر نہیں کرتے وہ صرف اپنا ہی وقت ضائع نہیں کرتے بلکہ اپنے سماج کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔ وقت کی کوتاہیوں سے جو تاریخ تاریخ میں برآمد ہوئے ہیں۔ اس کا اندازہ لگانے کے لئے یہ بات کافی ہے۔ بقول مورخین

"آخری معرکہ میں نپولین اس لئے شکست کھا گیا کہ انتہائی نازک محاذ پر اس کی فوجیں ایک منٹ بعد میں پہنچیں۔ ایک منٹ کی تاخیر نے نپولین کو آسمان سے زمین پر گرا دیا۔"

ہمیں پانچ وقت کی نمازوں سے، رمضان کے روزے سے اور حج کی عبادت سے اجتماعی زندگی ہی کا شعور پیدا نہیں ہوتا بلکہ وقت کی پابندی کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو کام جس وقت کرنا چاہئے اگر اس وقت نہ کیا جائے اور دوسرے وقت پر ٹال دیا جائے تو کام کی تکمیل کے باوجود بھی اس سے بھرپور فائدہ نہیں ہوتا۔

اس بات کو واضح طور پر یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ربیع کی کاشت کے لئے جو وقت سازگار ہوتا ہے اگر اس وقت کو گنوا دیا جائے تو لاکھ کوشش کے باوجود بھی ربیع کی بھرپور پیداوار حاصل نہیں ہوسکتی۔

قدرت کی جس چیز پر بھی نگاہ ڈالئے تو پتہ چلے گا کہ ہر چیز کا ظہور وقت کی پابندی سے ہو رہا ہے۔ سورج کا طلوع و غروب، موسموں کا الٹ پھیر پھولوں اور پھلوں کا ظہور ان میں سے کون سی چیز ایسی ہے جو وقت کی پابندی سے آزاد ہو۔ کیا فطرت کے یہ اشارے یہ سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہیں کہ ہمیں بھی وقت کی قدر کرنی چاہئے۔ اس لئے جو وقت چلا جاتا ہے وہ ہاتھ نہیں آسکتا اور نہ اس سے دوبارہ فائدہ اٹھانے کے لئے مہلت مل سکتی ہے۔

وقت کا دھارا ایک رواں دریا ہے۔ ہمارے لئے اس کی روانی رک نہیں سکتی۔ ہمیں زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے وقت کی پوری قدر کرنی ہوگی ورنہ وقت کی بے قدری

کا رویہ اچھی تمناؤں اور آرزوؤں سے زندگی کو باغ و بہار نہیں بنا سکتے۔

زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے۔ سماج کو اوپر اٹھانے کے لئے، انسانیت کو سکھ پہنچانے کے لئے۔ تاریک جگہوں میں علم و ہنر کا اجالا پھیلانے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے اندر وقت کی قدر و قیمت کا احساس ہو۔

یہی احساس ہمیں آمادہ کرتا ہے کہ وقت کو ضائع نہ کیا جائے اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے۔ (۱۵۲۵، سوئیوالان۔ دہلی)

مطلوب احمد

یورپ میں گھریلو زندگی ناخوش گوار کیوں ہے؟

یہ مادی ترقی کا دور ہے۔ اور یہ ترقی بلاشبہ ہمارے لئے باعثِ رحمت بھی ہے شرط صرف یہ ہے کہ یہ ترقی سماجی اخلاقی اور مذہبی اقدار کو بھی اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہو۔ لیکن اگر یہ ترقی اخلاقی اور مذہبی قدروں کو روندنے لگے تو اس سے خاندانی اور سماجی زندگی کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے اور پھر آگے چل کر یہی ترقی ننگِ انسانیت اور پورے سماج کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بن جاتی ہے۔

آج کل یورپ کے انتہائی ترقی یافتہ ممالک اسی دور سے گزر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی ترقی پسندی کے زعم میں اپنی تمام پرانی روایات اور اخلاقی قدروں کا جنازہ نکال دیا ہے۔ جس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ ان ملکوں کی سماجی زندگی کے تار و پود بکھر کر رہ گئے ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ اکثر شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں اب باقاعدہ شادی بیاہ کے بندھنوں میں جکڑنے کے بجائے آزاد شادی کو پسند کرتے ہیں، جس میں دونوں میاں بیوی کی طرح رہنے کے باوجود قانونی طور سے میاں بیوی نہیں ہوتے۔ ایسی صورت میں بچوں کے وجود اور منصوبہ بند زندگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس صورتِ حال سے ان ملکوں کے ماہرینِ سماجیات بہت پریشان ہیں کیونکہ آگے چل کر یہ بات پورے سماج اور پھر پورے ملک کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن حالات کے سخت بہاؤ کے سامنے وہ ابھی تک کوئی بندھ باندھنے میں کامیاب نہیں

ہو سکے ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اخلاقی بے راہ روی کا سیلاب برابر بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے سماجی ماہرین اور حقیقت پسند لوگوں کی نیند اور ان کا سکون برباد ہو کر رہ گیا ہے۔

حال ہی میں جرمنی کے ایک میگزین اور فرانس کے دو عورتوں کے جریدوں نے اپنے اپنے ملکوں میں ہمہ گیر اخلاقی بے راہ روی اور لڑکے لڑکیوں کی آزادی پسندی کی بڑی گمبھیر تصویر پیش کی ہے۔ جرمن میگزین نے سترہ سال سے ستر سال کی شادی شدہ عورتوں کی اپنے شوہروں اور بچوں وغیرہ کے بارے میں ۱۹۶۳ء اور پھر ۱۹۷۶ میں عام رائے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۱۹۶۳ میں ۹۴ فی صد عورتیں سماجی حدود میں رہنا اپنے لئے ضروری سمجھتی تھیں۔ لیکن اب صرف ۷۳ فی صد عورتیں سماجی قدروں کو مانتی ہیں اسی طرح پہلے ۱۹ فی صد لڑکیاں شادی کو ضروری سمجھتی تھیں لیکن ۱۳ سال کے اندر ایسی عورتوں کی تعداد گھٹ کر ۱۰ فی صد رہ گئی ہے۔ پہلے صرف ایک فی صد عورتیں اپنے شوہروں سے بے وفائی کرنے کو صحیح سمجھتی تھیں لیکن اب اس خیانت کا صریحی اقرار کرنے والی عورتوں کی تعداد ۷ فی صد کی حد تک بڑھ گئی ہے۔ پہلے ہر ۲۳ شادی شدہ عورتوں میں سے صرف ایک عورت اپنے شوہر کے ساتھ ازدواجی خیانت کا اقرار کرتی تھی۔ لیکن اب یہ تعداد بڑھ کے ہر گیارہ میں سے ایک عورت تک پہنچ گئی ہے۔ اسی طرح پہلے اس مدت میں کُل پانچ لاکھ عورتیں شادی کرتی تھیں لیکن اب شادی کے بندھنوں میں بندھنے والی لڑکیوں کی تعداد گھٹ کر تین لاکھ ستر ہزار رہ گئی ہے اس کے برعکس طلاق کے واقعات پچاس ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ ہو گئے ہیں۔ ۱۹۶۳ میں کُل دس لاکھ بچے پیدا ہوئے تھے ۱۹۷۵ میں صرف چھ لاکھ ہوئے۔ ۱۹۶۳ میں گرجا گھر سے ناطہ توڑنے والوں کی تعداد صرف ۶۰ ہزار تھی لیکن ۱۹۷۵ میں یہ تعداد بڑھ کر ۳ لاکھ تک پہنچ گئی۔

ان اعداد و شمار کو پیش کرنے کے بعد اس

جرمن میگزین نے اس قیامت خیز صورتِ حال کا ذمہ دار ۱۹۶۴ء میں وسیع پیمانے پر مانعِ حمل گولیوں کی فروخت ۱۹۶۵ء کے دوران منی اسکرٹ اور نیم عریاں کپڑوں کے استعمال، ۱۹۶۶ء میں ہپیوں کے سیلاب اور ۱۹۶۷ء میں عریاں فلموں کی زیادہ نمائش کو قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ باقی رہی سہی کمی کو ۱۹۷۱ء میں اسقاطِ حمل کو غیر مشروط طور پر قانونی بنانے نے پورا کر دیا۔

اس طرح اخلاقی اور مذہبی قدروں سے تہی دامن لڑکیوں کو اب حمل کا کوئی بھی خطرہ نہیں رہا تھا۔

اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ ۱۹۷۳ء میں امریکہ کی عریاں فلمیں کثرت سے درآمد کی گئیں جنھیں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں نے خوب دیکھا اور وہ بھی اسی بے راہ روی کو اختیار کرنے لگے۔ اس کے بعد ۱۹۷۴ء میں امریکہ کے عریاں پرچے میدان میں آئے اور اپنی فروخت کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے ایک سروے سے پتہ چلتا ہے کہ جرمن لڑکوں کے علاوہ جرمن لڑکیاں بھی ہر ماہ ۲۸ لاکھ ایسے پرچے خریدتی ہیں۔

اس طویل مقابلے کے بعد جرمنی میں عورتوں کے اس میگزین "اشیترین" نے اپنی ۲۹ اپریل کی اشاعت میں لکھا ہے کہ کیا یہ صورتِ حال دھماکہ خیز نہیں ہے۔ اگر نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی پر جلد ہی کوئی روک نہیں لگائی گئی تو یورپی ملکوں کا پورا سماجی نظام تباہ ہو کے رہ جائے گا۔

یہ تو تھی جرمنی کی بات۔ اب آیئے فرانس کی طرف، جہاں اپریل ۱۹۷۶ء میں عورتوں کے دو پرچوں "لاوی کرستان" اور "میری کلیر" نے نوجوان لڑکے لڑکیوں میں شادی نہ کرنے کے بڑھتے ہوئے رجحان اور میاں بیوی کی ازدواجی خیانت کے بارے میں لرزہ خیز حقائق پیش کرتے ہوئے مذہبی اور اخلاقی بنیاد پر سماج کو از سرِ نو استوار کرنے پر زور دیا ہے۔ عورتوں کے ان دونوں رسالوں نے متفقہ طور سے لکھا ہے کہ اگر جلد ہی اس مسئلے کا کوئی حل تلاش نہ کیا گیا تو پورے کا پورا معاشرہ کسی گھن کھائی ہوئی لکڑی کی طرح ناکارہ بن کر رہ جائے گا۔

"لادی کرسٹیان" نے نوجوانوں میں آزاد شادی کی روز افزوں مقبولیت پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آج سے صرف پچاس سال قبل سائمن کمیشن نے فرانس کی معاشرتی اور سماجی حالت پر اطمینان ظاہر کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا تھا کہ فرانس کی ۹۷ فی صد عورتیں شادی کے بعد روایتی بیویوں کی طرح رہنا پسند کرتی ہیں۔ اور فرانس میں شادی کے قابل لڑکے اور لڑکیاں عام طور سے شادی شدہ زندگی گزارنا پسند کرتی ہیں چنانچہ یہاں شادی کا تناسب ۹۹ فی ہزار سالانہ تھا جو بہت حد تک اطمینان بخش تھا لیکن پچھلے پچاس برس میں یہاں کے لڑکے اور لڑکیوں کے خیالات میں جس تیزی کے ساتھ انقلاب برپا ہوتا رہا ہے، اس نے ان تمام قدروں کی جڑیں ہلا کے رکھ دی ہیں۔ آج کل نوجوان لڑکا اور لڑکی ایک کمرے میں میاں بیوی کی طرح تو ضرور رہتے ہیں۔ لیکن میاں بیوی کہلانے کی بجائے صرف دوست کہلانا پسند کرتے ہیں۔

اس کے بعد "لادی کرسٹیان" کی مدیرہ لکھتی ہیں کہ نوجوان کی بلڈنگ میں ۲۵ سالہ جان پیر روز ۲۳ سالہ کیتھرین کافی دنوں سے ایک ساتھ رہتے ہیں اور جب انہوں نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو ان دونوں نے یک زبان کہا تھا کہ جتنے دن تک ممکن ہو سکا وہ دونوں میاں بیوی کی طرح رہیں گے، ورنہ پھر ان کی راہیں الگ الگ ہو جائیں گی۔ جب انہوں نے شادی نہ کرنے کی اصل وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ "ہمارا یہ سمجھوتہ شادی سے زیادہ قابل قبول ہے۔ اور پھر سفید کپڑے پہن کر کسی کلیسا میں چلے جانے اور پادری کی دعائیں لینے سے بھی شادی ہی ہوتی ہے وہی شادی اس طرح بھی ہو جاتی ہے۔ پھر ان سب خرافات کو بھگتنے سے فائدہ ہی کیا ہے۔ ہاں اگر چند برس کے بعد ہم نے اولاد کی ضرورت محسوس کی تو ہم کسی چرچ میں جا کر باقاعدہ شادی کر لیں گے۔

اس کے بعد "لادی کرسٹیان" کی مدیرہ لکھتی ہیں کہ اب یہ وبا اس قدر تیزی کے ساتھ

پھیل رہی ہے کہ بہت سے نوجوان چرچ میں پادری کے سامنے نکاح کرنے کا برسرِ عام مذاق اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صدیوں پرانی اس روایت کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہی ہے۔ کیونکہ پادری کے سامنے نکاح کرنے سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ اس طرح باہمی سمجھوتہ کرنے کے نتیجے میں بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ لہذا اس دقیانوسی تہذیب کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لیکن شاید وہ اس رح کی سمجھوتے کی شادیوں کے سب سے خوش گوار پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہی یں سمجھتے اور وہ ہے بچوں کا عدم وجود، ں کہ اس طرح کی شادیوں میں بچوں کی کوئی ائش ہی نہیں رہتی۔ جس کے نتیجے میں شرح ائش خطرناک حد تک کم ہو کر رہ گئی ہے رانسیسی معاشرے اور خود فرانس کے لئے دہ چل کر باعثِ تباہی بن سکتا ہے۔

عورتوں کے دوسرے رسالے "میری کلیئر" فرانسیسی معاشرے کی ایک دوسری دکھتی رگ پر انگلی رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ آج کل شادی شدہ جوڑوں میں ازدواجی خیانت ایک وبا کی طرح پھیلتی جا رہی ہے۔ شوہر بغیر کسی احساسِ گناہ کے دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگتا ہے۔ اور اپنی بیوی کو وہ آج بھی کوئی ذاتی جائیداد یا جاگیر سمجھتا ہے لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ اب بیوی اس میدان میں بھی مکمل مساوات کا ثبوت دیتی ہے اور وہ بھی ازدواجی خیانت کا اسی طرح استعمال کرتی ہے جیسے اپنا جائز حق استعمال کر رہی ہو۔

اس رسالے نے ۴۸۴ شادی شدہ جوڑوں کے جوابات کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر کوئی شوہر چھ ماہ یا اس سے زیادہ مدت تک بے وفائی کا مرتکب ہو تو اس کا یہ جرم اس کی بیوی کے لئے ناقابلِ معافی بن جاتا ہے لیکن اگر جرم کی مدت اس سے کم ہو تو وہ معاف کر دیتی ہے۔ اسی طرح بیوی کی خیانت کو ۵۶ فی صد شوہر معاف کر دیتے ہیں۔ اگر اس کا بار بار اعادہ ہو تو معاف کرنے والے شوہروں کی تعداد گھٹ کر صرف پانچ فی صد رہ جاتی ہے۔ اس میگزین کے

حافظ محمد عبدالسمیع حافظ دھام پوری۔ احمد علی روڈ دھام پور بجنور

مورکھ کی پہچان یہ ہے بے سوچے سمجھے بولے ہے
گیانی مان جو بولے ہے تو پہلے بول کو تولے ہے

دھوکے کی اس دنیا میں اب نام محبت جھولے ہے
دل بھی کتنا سادہ ہے بس ساتھ اسی کے ہولے ہے

تول میں ہلکا مول میں بھاری دل ٹکڑا ہے سونے کا
دل کی قیمت دے بھی سکے گا تو جوہری تولے ہے

اس سنسار میں بکھرے پڑے ہیں پتھر بھی اور موتی بھی
پتھر پتھر چھوڑے دانا موتی موتی رولے ہے

پریم نگر استھان ہمارا پریم نگر کے باسی ہیں
ہے مایا کے لوبھی بندے ہم سے کیا تو ٹٹولے ہے

دور کنارہ تیز ہیں موجیں مانجھی تھک کر بیٹھ گیا
کٹھنائی کے ساگر میں اب جیون نیا ڈولے ہے

تیری میٹھی میٹھی بولی یوں لگتی ہے حافظ کو
تان مدھر کوئل کی جیسے کانوں میں رس گھولے ہے

کیف احمد صدیقی ایم اے بی ایڈ

شیشۂ دل پر حوادث کا اثر ہوتا نہیں
اور ذرا سی ٹھیس لگ جائے تو چکنا چور ہے

مجھ سے تم پوچھو نہ کیا ہے میرے دل کا مدعا
بس وہی میں چاہتا ہوں جو تمہیں منظور ہے

کیف میں پا کر بھی اس کو چھین پا سکتا نہیں
جتنا وہ نزدیک ہے اتنا ہی مجھ سے دور ہے

کیف احمد صدیقی ایم اے بی ایڈ

وہ اس مقام سے دیتے ہیں دعوتِ جلوہ
جہاں نگاہِ تصور بھی کام کر نہ سکے

نہ جانے کتنی شکایات دل میں تھیں لیکن
ترے حضور جو پہنچے کلام کر نہ سکے

وہ خاک بدلیں گے اے کیف قسمتِ دوراں
جو اپنے وقت کو اپنا غلام کر نہ سکے

غزلیں

کیف احمد صدیقی ۹۰ شیخ سرائے سیتاپور (یوپی)

میں اب بھی حسین ہوں

مس ہیلن گاہگن

ڈاکٹر محمد فضل الرحمن قمر

● مس ہیلن گاہگن: آپ دنیا کی حسین عورتوں میں سے ایک ہیں۔ ان سے ایک بار پوچھا گیا کہ آپ خوبصورت بنے رہنے کے لئے کیا کرتی ہیں۔ جواب میں انھوں نے کہا۔

"میں نہ تو دودھ سے نہاتی ہوں اور نہ ہی شیمپین استعمال کرتی ہوں۔ اس طرح کی بناوٹی چمک دینے والی چیزوں سے کوئی عورت خوبصورت نہیں بن سکتی میں تو بس خوبصورتی کی دلدادہ ہوں۔ میرے خیال میں صاف ہوا اور آکسیجن خوبصورتی حاصل کرنے کے لئے سب سے ضروری ہیں، ان کے بغیر چہرے کی قدرتی خوبصورتی پھیکی پڑ جاتی ہے۔ چہرا بغیر ہوا اور غسل کے میلا پھٹا سا اور موٹا پڑ جاتا ہے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لئے ہمیں کافی صاف ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاؤں کی رہنے والی لڑکیوں کے چہرے پر جو رونق دکھائی دیتی ہے وہ شہر والیوں کو نصیب ہی نہیں ہوتی۔ شہر میں رہنے والی عورتوں کا چہرا گورا ہوتا ہے مگر ہم انھیں خوبصورت نہیں کہہ سکتے۔ یہی عورتیں اگر گاؤں میں چلی جائیں تو کافی مقدار میں آکسیجن پانے سے وہ کھل اٹھیں۔

خوبصورتی حاصل کرنے کے لیے صاف ہوا اور سورج کی کرنوں کا غسل دودھ اور گلاب کے پانی سے غسل سے کہیں بڑھ کر ہے۔ میں ہر اتوار کو یا چھٹی کے دنوں میں

شہر میں رہنے کے بجائے دیہات میں چلی جاتی ہوں۔

خوبصورتی حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ نیند ہے۔ اس کے بغیر سر بھاری ہوتا ہے۔ آنکھیں چڑھ جاتی ہیں، چہرے پر جھریاں نظر آنے لگتی ہیں اور دماغ کام کرنے سے جواب دے جاتا ہے۔ کوئی بھی تھکا ہوا شخص خوبصورت دکھائی دینے کی امید نہیں کر سکتا۔ میری رائے میں خوبصورتی جسم کے ساتھ جڑی ہوئی ایک چیز ہے جو اپنی روشنی ہمیشہ پھیلاتی رہتی ہے۔ نیند نہ آنے سے یا نیند نہ لینے سے یہ روشنی ماند پڑ جاتی ہے اور کبھی کبھی بالکل غائب ہو جاتی ہے۔ میں کتنی ہی ایسی عورتوں کو جانتی ہوں جو کافی نہیں سوتی ہیں اور اس لیے وہ خوبصورت نہیں ہو سکتیں اگر وہ کافی سویا کریں تو وہ سکھی جوان اور من موہنی بن جائیں۔ مناسب آرام کر لینے سے آپ کے جسم کے چہرے میں ملائمت اور آپ کی رگوں میں تازہ خون آ جائے گا اور آپ کی خوبصورتی پھوٹ پڑے گی۔

تیسرا طریقہ ہے غسل، میں سمجھتی ہوں کہ ہم لوگ کافی نہیں نہاتے۔ میں دن میں تین یا چار بار گرم یا ٹھنڈے پانی سے غسل کرتی ہوں۔ گرم پانی کے غسل سے تھکان دور ہو جاتی ہے اور ٹھنڈے پانی کے غسل سے جسم کو طاقت حاصل ہوتی ہے۔ غسل چمڑے کے لئے نہایت ضروری ہے اس سے وہ چست یا زہر سے بری اور صحت مند ہو جاتا ہے۔ دیر تک پانی میں پڑے رہنا میرے لئے دل بہلاؤ کا ذریعہ ہے، جب میں اپنے گاؤں میں جاتی ہوں تب دریا میں تیرتی اور کھیل کود کرتی ہوں۔ لڑکپن سے ہی مجھے تیرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ تیرنا خوبصورتی حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ ورزش ہے

جو خوبصورت بننا چاہتی ہیں انھیں اپنے کھانے پر دھیان رکھنا نہایت ضروری ہے کھانا سادہ ہلکا اور زود ہضم ہونا چاہیے۔ آپ کو کافی پانی پینا چاہیے۔ پانی آپ کے جسم کو صاف اور زندہ رکھتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ اپنے جسم میں زہر داخل کریں اور خوبصورت بننے کی کوشش

کاٹے کا علاج

بچھو:۔ چونہ اور شہد ملا کر کاٹے کی
جگہ پر لگا دیں۔ فائدہ ہوگا۔
چیونٹی:۔ جس جگہ پر کاٹے مٹی کا تیل لگا دیں
شہد کی مکھی:۔ اگر شہد کی مکھی کاٹ لے تو
گائے کے گوبر کا پانی لگا دیں۔
کنکھجورا:۔ اگر بدن پر چپک جائے تو
پیتہ پانی میں پیس کر لیپ کر دیں۔
چھپکلی:۔ اگر چھپکلی کاٹ لے تو چولہے
ل رالکھ پانی میں گھول کر کاٹی ہوئی جگہ پر لگا دیں
گرگٹ:۔ اگر گرگٹ کسی کو کاٹ لے
نوشادر کو پانی میں گھول کر لگا دیں۔
چوہا:۔ اگر چوہا کاٹ لے تو سوکھی
مک کو پانی میں پیس کر لیپ کریں۔
کتا:۔ اگر کتا کاٹ لے تو لہسن سرکہ
ں پیس کر زخم پر لیپ کریں۔ دیوانہ ہو

تو ہسپتال میں مریض کو لے جا کر ٹیکے لگوائیں۔
بلی:۔ اگر بلی نے کاٹ لیا ہو تو کالے
تل کو پانی میں پیس کر لگا دیں۔
بندر:۔ اگر بندر نے کاٹا ہو تو مردار سنگ
اور نمک پانی میں پیس کر لیپ کریں۔
نیولا:۔ اگر نیولا کاٹ لے تو پیاز پیس کر
لگا دیں۔
لومڑی:۔ اگر لومڑی کاٹ لے تو پیاز
پیس کر لیپ لگا دیں۔

مصفی خون کا نسخہ:۔

شاہترہ۔ سرپھوکا۔ سنائے۔ سونف۔ چرائتہ
نیم کی چھال۔ ہموزن لے کر سفوف بنائیں
اس سے ۵ ۲ گرام رات کو پانی میں بھگوئیں۔
صبح چھان کر پی لیں۔ پھوک کو دوبارہ بھگو کر
رات کو سوتے وقت چھان کر پی لیں۔ خون کے امراض

بُوا کی باتیں

اے ہے، بہو بیگم! پڑھی لکھی ہو کر مجھ سے پوچھتی ہو ٹماٹر کی بھاجی بنانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے میری بچھتوا!

کتنے ٹماٹر ہیں؟ آدھا کلو! تو دیکھو نا! سو گرام ہری مرچ کتر لو۔ پاؤ سیر پیاز لو۔ چائے کے چمچہ بھر پسا ہوا لہسن۔ پاؤ چمچہ ادرک اور اتنی ہی ہلدی۔ نمک واجبی اور گھی۔ اف اللہ میرے، گھی تو بہت گراں ہے۔ دو تین چمچے پھر بھی ہونا ہی چاہیے۔

اب آگے سنو، ٹماٹروں کو دھو ڈالو۔ کچھ دیر کے لئے گرم پانی میں ڈال دو۔ پھر ایک ایک نکالتی جاؤ اور ان کا چھلکا اتارتی جاؤ۔ پھر سب کے ٹکڑے کر لو۔ ایک دیگچی لو اس میں اللہ جتنا دے، اتنا گھی ڈال دو۔ اس گھی میں پہلے ہری مرچیں تل لو۔ ہری مرچیں تل کر نکال لو۔ اب اس گھی میں پیاز کے لچھے ڈال دو۔ یہ لچھے بادامی ہو جائیں تو اس میں لہسن، ادرک ہلدی، نمک اور ٹماٹر ڈال دو۔ اتنا بھونو کہ ٹماٹر گل جائیں۔ اب اس میں آدھی پیالی پانی ڈالو۔ تین چار منٹ پکا کر تلی ہوئی ہری مرچیں ڈال دو اور دم پر رکھ دو۔ ذرا دیر میں گھی چھوڑ دے تو اتار لو۔

بہو بیگم! ایسی مزے دار بھاجی بنے گی کہ جی کہے گا اور کھاؤ اور کھاؤ۔ اے لو میرے منہ میں پانی آگیا۔ اچھا ذرا مجھے ایک پان تو دینا۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔

کم قیمت بالا نشین

اقبال رفیق ایم اے

آج کے دور میں گرانی اپنے شباب پر ہے اور یہ گرانی سماج واد کی دین ہے۔ سماج واد لیڈران کی دین ہے اور لیڈر حضرات ہماری اور آپ کی کوششوں کی دین ہیں۔

یہ کمر توڑ مہنگائی کس رفتار سے بڑھ رہی ہے کچھ کہا نہیں جا سکتا جو چیز ایک ہفتہ قبل دس روپے کی تھی ایک ہفتہ بعد پندرہ اور بیس کی ہو جاتی ہے اور کچھ دنوں بعد مارکیٹ سے بالکل غائب ہو جاتی ہے۔ ایک بڑی دلچسپ خوبی ہماری سرکار میں یہ ہے کہ جرائم کو ختم کرنے پر لاکھوں روپیہ صرف کرتی ہے لیکن جرائم کرنے والوں پر کوئی پابندی عائد نہیں ہو پاتی، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا مصیبت ہے تمام ضرورت کی اشیاء کی دو گنی اور تین گنی پیداوار ہو گئی ہے لیکن مارکیٹ سے چیز غائب کیوں ہو جاتی ہے۔ آج کی یہ حالت ہے کہ ۹۰ فیصد لوگ رات کو بھوکے سو جاتے ہیں یا ایک وقت کا کھانا تھوڑا تھوڑا کر کے دو وقت کھاتے ہیں۔ جس گھر میں صرف ایک کمانے والا ہو اس کا خرچ کیونکر چل سکتا ہے، اب تو وہ وقت آ گیا ہے کہ گھر کے دوسرے لوگ بھی خواہ وہ بچے ہوں یا گھر کی عورتیں کچھ کام کریں تب کہیں دو وقت کھانے کا انتظام ہو سکتا ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب مہنگائی اس قدر ہو اور خرچ کی یہ حالت ہو تو کہاں سے زندگی گزارا جائے کہ کچھ دوسرا کام کیا جائے، آخر کوئی گھریلو صنعت شروع بھی کی جائے تو روپے کی ضرورت سب سے

پہلے پڑے گی۔

میں آپ کی توجہ ایسے کاموں کی طرف دلانا چاہتا ہوں جن میں کم سے کم پیسہ لگتا ہے اور مستقل مزاجی اور استقلال سے کیا جائے تو بڑی اچھی رقم اکٹھی کی جا سکتی ہے اور یہ کام بھی ایسے ہیں جن میں گھر کے بچے اور عورتیں مل کر کر سکتی ہیں، باہر سے کسی کاریگر کی ضرورت نہیں ہوگی۔

بہت سی ایسی اشیاء ہیں جن کو ہم پھینک دیا کرتے ہیں یا کم قیمت میں بیچ کر کوئی معمولی سے کام میں استعمال کر لیتے ہیں، کبھی اس کے آگے ہمارا دھیان بھی نہیں گیا۔

سجاوٹ کا سامان :-

آپ نے دیکھا ہوگا کہ آرا مشین کی دوکانوں سے یا ٹمبر والوں کے یہاں سے لوگ بے کار لکڑی خرید کر جلانے کے کام میں لاتے ہیں کبھی آپ نے سوچا کہ اس سے دوسرے کیا کام نکل سکتے ہیں۔ میں آپ کو کچھ ضروری سامان بنانا بتاتا ہوں۔

آپ جلانے کی غرض سے لکڑی خرید لائیے اس میں سے ایسی لکڑی جو بکل لگی بھی ہوں تو کوئی حرج نہیں لیکن چوڑی ہوں الگ کر لیجئے، آدھی لکڑی پر لمبائی میں بکل لگا رہنے دیجئے اور آدھی لکڑی کو رندے سے چھیل کر صاف کر لیجئے اس کو ریگ مال سے رگڑ کر چکنا کر لیجئے، اس چکنے حصے کو ہلکا کتھئی اور بکل لگے حصے کو گہرا کتھئی رنگ دیجئے۔ اب اس چکنے حصے پر خوبصورت سینری بنوا لیجئے۔ یہ سینری بنانے کا کام آپ کے گھر کی لڑکیاں جو اسکولوں میں پڑھتی ہیں بخوبی کر سکتی ہیں۔ اس طرح اگر ہفتہ میں دس سینریاں تیار کر لیں تو کم از کم ۲۵ روپئے کا کام ہو گیا۔

ابھی ان لکڑیوں کو جلائیے نہیں جو خریدی تھیں۔ اس میں سے موٹے موٹے بے ڈھنگے ٹکڑے نکال لیجئے ان کو آری سے تکونہ یا چوکور جیسے بن سکیں کاٹ لیجئے پھر ان کو ریتی سے رگڑ کر ہر طرف سے برابر کر لیجئے اب آپ ان کو ریگ مال سے چکنا کر لیجئے ان پر

خوبصورت پھول بنا لیجیے، یہ کام بھی گھر کی لڑکیاں کرسکتی ہیں۔ یہ پھول آئل پینٹ سے بنیں گے اب یہ آپ کے میز پر رکھنے والے پیپر ویٹ تیار ہوگئے۔ اب خالی اوقات میں جنرل سٹور کی دوکانوں پر سپل کردیجیے۔

نئے ڈیزائن کے گلدان

بانس کی دوکانوں سے موٹے بانس کے ٹکڑے خرید لایئے بہت سستے مل جاتے ہیں۔ ان کو گانٹھوں پر سے کاٹ لیجیے یہ گانٹھیں تقریباً ایک فٹ لمبی ہوتی ہیں۔ ان ٹکڑوں کو قلم کی طرح آری سے کاٹ لیجیے۔ اب اس قلم کا ٹکڑے کو ریگ مال سے رگڑ کر چکنا کر لیجیے۔ یہ ٹکڑے صرف ایک طرف سے قلم کی طرح ترچھے کاٹے جائیں گے دوسری طرف کا حصہ ویسا ہی ہوگا ورنہ آپ کا گلدان کھڑا کیسے ہوگا۔ اب ان پر ریگ مال کرنے کے بعد خوبصورت پھول بنا دیجیے۔ یا خوبصورت بیل بنا لیجیے۔ عمدہ قسم کے نئے فیشن کے کم لاگت ۔ یہ گلدان ہونگے۔ اور اچھی قیمت میں فروخت ہونگے۔

ویسلین:۔ جاڑوں کے دنوں میں ویسلین کی بہت ضرورت پڑتی ہے چونکہ سرد ہوائیں ہاتھ پیروں میں خشکی پیدا کردیتی ہیں جس کی وجہ سے ہاتھ پیر پھٹنے لگتے ہیں۔ جاڑے کے موسم میں آپ گھر میں عمدہ قسم کی ویسلین تیار کرسکتے ہیں۔

موم لایئے اس کو کسی برتن میں گرم کرلیجیے۔ جب پگھل جائے تو اس میں سستا والا مونگ پھلی کا تیل ڈال دیجیے۔ یوں سمجھئے کہ دو چھٹانک تیل ہو تو تین چھٹانک موم ہو۔ اب ٹھنڈا ہونے کو رکھ دیجیے۔ ٹھنڈا ہونے پر اس میں کوئی معمولی سی خوشبو ملا دیجیے ویسلین تیار ہوگئی اس کو شیشیوں میں بھر کر فروخت کردیجیے۔

اسنو:۔ اسنو کا استعمال دوبارہ چلنے لگا ہے فیشن کی اشیاء میں یہ اہم چیز ہے۔ ہر لڑکا ہیرو بننے کے لیے اسنو کا استعمال ضرور کرتا ہے۔ اس کو بنانا بھی آسان ہے۔ اسٹیرک ایسڈ لایئے اس کو کسی

برتن میں رکھ کر اس برتن کو کسی بڑے برتن میں پانی بھر کر آگ پر رکھ دیجئے یعنی اس بڑے برتن میں پانی گرم ہوتا رہے گا اور ایلومینیم والا برتن میں گرم پانی میں رکھا جائے گا۔ پانی گرم ہونے پر ایڈ موم کی طرح پگھل جائے گا اس کو اتار لیجئے اور وہ عمدہ خوشبو جو آپ پسند کرتے ہیں ملا دیجئے۔ چمچے سے اس کو خوب پھینٹئے خوشبو ساری اس میں مل جائے تو اس کو شیشیوں میں بھر کر بازار میں فروخت کر دیجئے۔

اب آپ خود فیصلہ کیجئے ان چھوٹی صنعتوں میں کتنا خرچ آیا جو کچھ ان میں خرچ آیا اس قدر پیسہ تو کم از کم آپ جمع ہی کر سکتے ہیں۔

بہر حال کچھ تو کرنا ہے ورنہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ گرانی کی کشتی کب اور کہاں کنارے لگے۔ ابھی تو آگے ہی بڑھ رہی ہے۔

(ابشکریہ نرگس سنگ کانپور)

قطعات ... کنور خانی ملوآبادی

کیا زمانہ ہے کہ ناموس بشر خطرے میں ہے
عصمت داماں ہی کس قدر خطرے میں ہے
حسن عریاں سے نہیں محفوظ کوئی رہ گزر
ہم تو کیا شیخ و برہمن کی نظر خطرے میں ہے

....

وضع اپنی بدل رہے ہیں ہم
کس کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں ہم
پھر بھی خوش ہیں کہ لڑکھڑاتے ہوئے
وقت کے ساتھ چل رہے ہیں ہم

....

جو نہ کرنا تھا کر رہے ہیں لوگ
دل کو نفرت سے بھر رہے ہیں لوگ
زہر ہے زندگی کے ساغر میں
موت سے پہلے مر رہے ہیں لوگ

....

دل انساں ہے ارمانوں سے خالی
حقیقت اور افسانوں سے خالی
بنی تھی جو فقط انساں کی خاطر
وہی دنیا ہے انسانوں سے خالی

گنا

فاران شیدائی

سردی کا موسم ہے۔ گنا بکثرت ملے گا۔ جس گنے سے شکر، گڑ اور کھانڈ تیار کر کے ہم بے شمار فائدے حاصل کرتے ہیں وہی گنا اپنے اندر ان گنت طبی فوائد بھی رکھتا ہے۔

گنا کا رس کھانے کو ہضم کرتا ہے۔ بھوک بڑھاتا ہے اور جسم کو قوت بخشتا ہے۔

گنے میں کیلشیم، فولاد اور مینگنیز کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے گنے کا رس بہت مفید ہے۔ قبض کو دور کرتا ہے۔ پیٹ کی گرمی اور جلن کو مٹاتا ہے عام کمزوری والے لوگوں کے لئے گنے کا رس بہت فائدہ بخش چیز ہے۔ اس سے قوت بحال ہوتی ہے اور بدن فربہ ہوتا ہے۔

گنے کے رس سے اگر زیادہ فائدہ حاصل کرنا چاہیں تو اس میں دودھ یا چھاچھ ملا کر پئیں۔ ادرک اور لیموں بھی ملا کر پینا چاہیے۔ اس سے ریاح اور بدہضمی کی شکایت جاتی رہتی ہے۔

گنے کا مزاج سرد ہے۔ گنا دانتوں سے چوسنا مفید ہے۔

- ادرک کے رس میں پرانا گڑ ملا کر استعمال کرنے سے تمام بدن کی سوجن دور ہو جاتی ہے۔
- ادرک کے ٹکڑے کو داڑھ کے نیچے دبانے سے داڑھ کے درد کو آرام پہنچتا ہے۔
- ادرک کا رس گرم کر کے کان میں ڈالنے سے درد کو فائدہ ہوتا ہے۔

پیشین گوئیاں

اکبر الہ آبادی مرحوم

اکبر الہ آبادی کا دور ہندوستانی معاشرت میں انقلاب کا دور تھا۔ قدیم تہذیب کی بساط سمٹ چکی تھی اور جدید تہذیب کی بساط بچھائی جا رہی تھی۔ مغربی تہذیب کے حکمراں سمندر پار سے آئے اور اپنے جلال و جمال کے ساتھ پورے ملک (ہندوستان) پر چھا گئے

یہ نئے حکمراں اپنے محکوموں کے لئے تہذیب جدید کا ایسا نیا کھلونا لائے تھے جو دیدہ زیب بھی تھا اور ہوش ربا بھی، اس نئے کھلونے کی تابانی اور اس کا رنگ و روپ دیکھ کر وہ ایسا لٹو ہوئے کہ ان کی ساری عملی قوت ختم ہو گئی اور وہ ان کے ہاتھوں کا کھلونا اور کٹھ پتلی بن گئے۔ غلام بن کر انھیں کی زبان سے بولنے، انھیں کی آنکھوں سے دیکھنے انھیں کے دماغ سے سوچنے لگے۔

اکبر نے اہل وطن کا یہ حال دیکھ کر سر پیٹ لیا وہ کٹر مشرقی تھے۔ انھوں نے مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہا اس لئے فرط جوش میں قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ گئے اور مغربی تہذیب کا جو ڈراؤنا خواب دیکھ رہے تھے اس کی تعبیر سے مسلمانوں کو آگاہ کرنے لگے۔ ان اشعار میں اکبر کی پیشگوئیاں ملاحظہ ہوں:۔

(۱)

یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملک عدم ہونگے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے

(۲)

نئے انداز سے شوخی دکھائیں گے حسینان
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہونگے

(۳)

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہونگے

(۴)

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہونگے

(۵)

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی
لغات مغربی بازار کی بھاکھا میں ضم ہونگے

(۶)

بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ ہیں جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے

(۷)

گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائینگے
کتابوں میں ہی دفن افسانۂ جاہ و حشم ہونگے

(۸)

تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

اکبر نے جو پیشین گوئیاں کی تھیں وہ آج

چکا ہے۔ حرم سراؤں کا حجاب انکی شرم و حیا بے نقاب ہو چکی ہے۔ گھونگھٹ جو پردہ حجاب تھا وہ کھل چکا ہے۔ نئے نئے صنم خانوں میں نئے نئے اصنام نظر آتے ہیں۔ مغربی طرز معاشرت ہی ہماری شرافت کا معیار ہے۔ عورتیں اپنے مکانات کی چہار دیواری سے نکل نکل کر نہایت آزادانہ مردوں کو دعوت نظر دے رہی ہیں۔ ہندوستانی عورتوں کی معاشرت کا سامان مستی، سرمہ، حنا اور عطر تھے وہ سب ختم ہو چکے ہیں ان کی جگہ پاؤڈر، غازہ لپ اسٹک اور لونڈر موجودہ دور کی عورتوں کا سامان آرائش ہیں۔

اللہ اللہ! یہ کیسا انقلاب ہے، ہماری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ آج اگر اکبر زندہ ہوتے تو وہ اپنے خواب کی تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔ (ملک سنگم)



اسکول میں لڑکے رالف کو "گاجر والا" کہتے تھے۔ کیونکہ گاجریں کھانے کی وجہ سے اس کی بصارت محفوظ ہو گئی تھی اور وہ اندھا ہونے سے بچ گیا تھا اس لڑکے کی ایک ہی آنکھ خراب ہوئی تھی اور دوسری خراب ہونے کو تھی کہ قدرتی علاج کی طرف توجہ دلائی گئی اور سبزیوں کے ذریعہ سے بینائی کو برقرار رکھنے کے تجربات کئے گئے۔ ۱۹۴۱ء میں نیویارک کے ایک ہسپتال میں اس لڑکے کا ایک بڑا آپریشن ہوا تھا جس میں اس کی بائیں آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ آنکھ میں کوئی پھوڑا اس قسم کا ہو گیا تھا کہ وہ بڑھتا ہی جاتا تھا اور ڈاکٹر حیران تھے کہ کس طرح اس کو روکیں۔ آخر یہ ہوا کہ اس کے مرض نے اس کے ڈھیلے کو بٹھا! اور یہ ضروری سمجھا گیا کہ آپریشن کر کے اس کی ساری آنکھ نکال دی جائے۔

اس کے بعد دوسرے ہی سال رالف کی دوسری آنکھ میں بھی یہی مرض پیدا ہو گیا! ی بصارت کئی سال سے کمزور تھی، اور اسے ایک ایسی کلاس میں بھیج دیا گیا تھا جہاں کمزور بینائی کے بچوں کو نہایت معمولی سے کام پر لگایا جاتا تھا اور جس میں آنکھ سے کام کم لیا جاتا تھا۔ مجھے اس بچے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور آنکھ کی حالت دیکھ کر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ یہ علامت مرض ان حالات میں سے معلوم ہوتی ہے جو وٹامن اے کی غذا میں کمی کی وجہ سے ہو جاتے ہیں۔ اس خیال کی تصدیق کرنے میں کوئی دقت نہ تھی۔ میں نے اس لڑکے کے لیے پہلی کا تجویز کیا اور یہ بھی بتایا کہ روزانہ کم سے کم تین گاجریں کچی یا اچھی طرح ابلی ہوئی ضرور کھا۔ رالف روزانہ گاجریں اپنے ساتھ لایا کرتا تھا اور مزے سے کھاتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اسکی آنکھ بچ گ

R... G. H. R. D. 34

MONTHLY HIJAB RAMPUR U.P.

تفہیم القرآن

جلد پنجم کے دو حصے

• سورہ محمد تا واقعہ • سورہ حدید تا طلاق 6/-

جلد ششم کے دو حصے

• سورہ تحریم تا مرسلات • پارہ عم 7/-

جلد چہارم کا ایک حصہ

• سورہ لقمان تا صٰفٰت 3/-

حجاب کے عظیم خاص نمبر

(۱) حمیدہ بیگم نمبر

حمیدہ بیگم مرحومہ قیمہ جماعت اسلامی پاکستان کی

دعوتی، تحریکی سرگرمیوں کا آئینہ دار 6/-

(۲) نظم بند ر 3.25

(۳) حضرت عائشہ نمبر

خواتین اور طالبات کے لیے عظیم نمونہ 2.25

خواتین اور طالبات کا پاکیزہ ڈائجسٹ

حجاب رامپور

• آسان زبان، دلچسپ انداز بیان، معیاری مضامین، تعمیری نظمیں اور افسانے۔

• خواتین کے ہر شعبہ زندگی کے لیے اسلامی رنگ میں ڈوبی ہوئی گھریلو تخلیقات۔

• مردوں کے لیے بھی مفید، کارآمد اور رہنما اصول۔

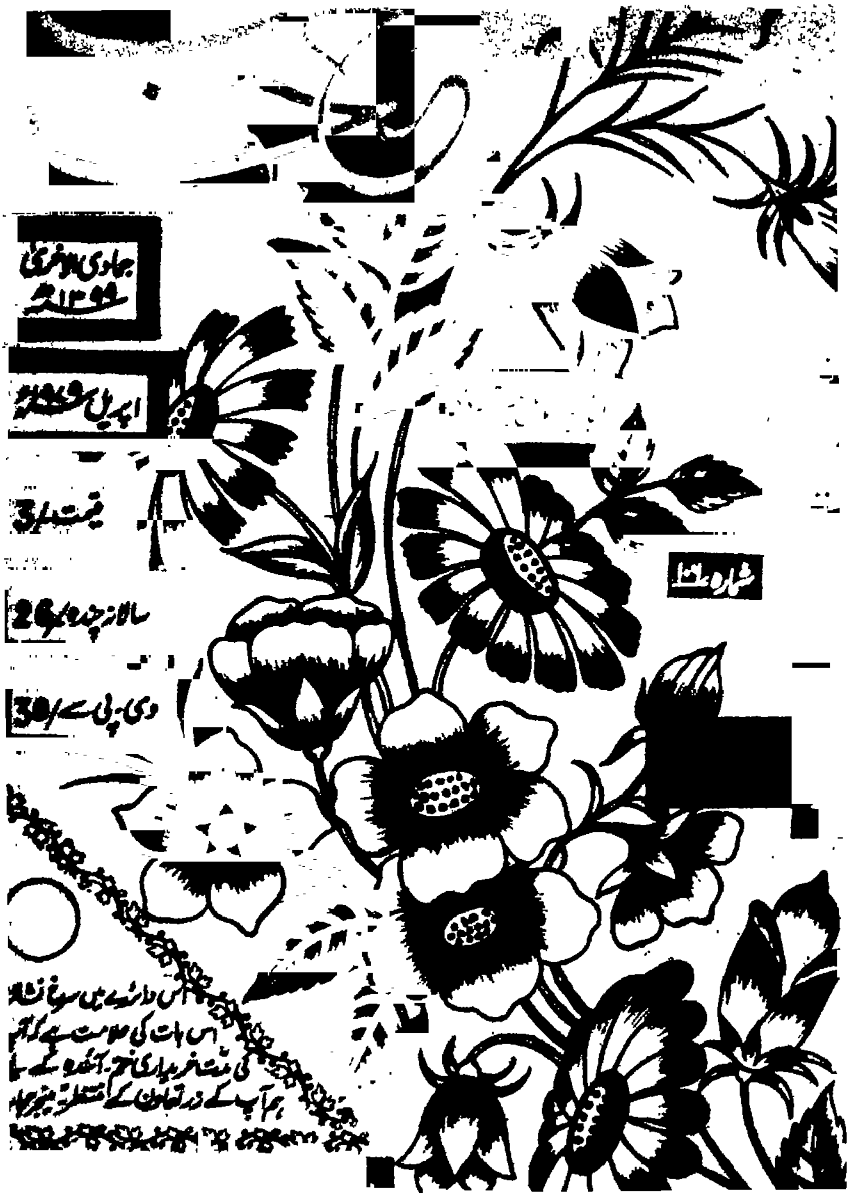
• نہایت خوبصورت، رنگین ٹائٹل، بہترین کتابت، آفسیٹ کی عمدہ طباعت۔

• نمونہ کی کاپی منگا کر خود رائے قائم کریں، سالانہ چندہ 2/- ایک پرچہ 50 2

(منیجر حجاب رامپور، یوپی ۲۴۴۹۰۱)



3


جمادی الاخری
۱۳۹۹ھ
اپریل
قیمت 3/-
سالانہ چندہ 26/-
وی۔پی سے 30/-
اس دائرے میں سرخ نشان
اس بات کی علامت ہے کہ آپ
کی مدت خریداری ختم۔ آئندہ کے لیے
ہم آپ کے تعاون کے منتظر رہیں گے

حمد

اب کے بادل جتنا برسے ۔۔۔ اتنا ہی پیاسے پودے ترسے
مانگ کے دیکھو دنیا والو! ۔۔۔ بھر پاؤ گے دنیا بھر سے
دل میں جھانکا تو ہم سمجھے ۔۔۔ سارے طوفاں آٹھے گھرے
ایک اللہ کو سجدہ کرنا ۔۔۔ لڑ جاتا ہے دنیا بھر سے

موج رہی کرتا ہے تائل
جو ٹکر لیتا ہے بھنور سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ارتوں کا
آداریہ
ادارہ

امومت صالحہ کے بغیر

(قسط اول)

اُمّت صالحہ کا مطلب ہے مسلمانوں کی ایسی جماعت جو نیکیاں اپنائے اور بُرائیاں بچائے
ومت صالحہ کا مطلب یہ ہے کہ گھر والی صالحہ ہو۔ گھر والی نیکیوں کو اپنائے اور برائیوں سے بچے۔

اس طرح پوری بات کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک مسلمانوں کے گھروں کی عورتیں صالحہ نہیں ہوں گی اس وقت تک مسلمانوں کی جماعت بھی صالح نہیں بن سکتی۔

یہ بات میں نے اپنی طرف سے نہیں لکھی بلکہ ہمارے بزرگوں نے یہی کہا ہے صحابہ کرامؓ زندگی کے حالات سے بھی ہمیں یہی بات ملتی ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی بات پنے پیارے ساتھیوں (صحابہ کرامؓ) کے ذہنوں میں بٹھادی تھی۔

---

(۱) اس سلسلے میں سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہٗ فرماتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر ں تھے۔ سفر ہی میں آیت وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ۹ : ۳۴ نازل ہوئی تو ہم ں سے کچھ لوگوں نے کہا، یہ آیت سونا چاندی جمع کرنے کے سلسلے میں اُتری ہے۔ یہ آیت تی ہے کہ سونا چاندی جمع کرنا کچھ اچھی بات نہیں ہے۔ اگر ہمیں معلوم ہوجائے کہ کونسا ل اچھا ہے تو اُسے جمع کرنے کے بارے میں سوچیں؟ (اس سوال کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا: سب سے اچھا مال ہے، زبان جو اللہ کا ذکر کرنے والی ہو۔ دل جو اللہ کے

شکر و احسان سے بھرا ہوا ہو اور سچی مومن بیوی جو دین کی راہ پر چلنے میں شوہر کی مدد کرے۔ (ابن ماجہ)

(۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک راعی (نگراں اور دیکھ بھال کرنے والا) ہے اور تم میں سے ہر ایک سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ جو اس کی نگرانی میں ہوں گے (اس کے بعد آپ نے نگران اور دیکھ بھال کرنے والوں کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی)

• امیر نگراں ہے • مرد اپنی گھر والی کا نگراں ہے • عورت اپنے شوہر کے گھر کی اور اس کے بچوں کی نگراں ہے۔ (مطلب یہ کہ) ہر ایک نگراں ہے اور تم میں سے ہر ایک سے (قیامت کے دن) پوچھا جائے گا کہ جو لوگ تمہاری دیکھ بھال اور نگرانی میں تھے ان کو کس طرح رکھا۔

• ایک اور روایت یہ بھی ہے • اور نوکر اپنے مالک کے مال کا نگراں ہے۔

بہترین اور ذمہ دار گھر والی کے بارے میں یہی دو حدیثیں نہیں ہیں جو ہم نے اوپر لکھی ہیں۔ اور بہت سی حدیثیں ہیں۔ ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے۔ صحابیات اور صحابہ دونوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ جب تک گھر والی صالحہ نہ ہوگی اس وقت تک مسلمانوں کا معاشرہ بھی صالح نہ بن سکے گا اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان "قوا انفسکم واہلیکم ناراً۔ (اپنے کو اور اپنے اہل خانہ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ) ملا لیا جائے تو گھر والوں کو صالحہ بنانے کی کوشش کرنا ہر مسلمان مرد پر فرض ہو جاتا ہے۔ گھر والوں میں اصل والی ہی ہے۔

---

۱ اس فرض کو ادا کرانے کے لئے حضورؐ نے صحابہ کرام رضٰ کو ایسے اچھے لفظوں میں تربیت دی جن میں فصاحت و بلاغت کوٹ کوٹ کر بھری معلوم ہوتی ہے فرمایا:

"آدمی کو گناہ گار کرنے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ضائع کردے جن کو وہ کھلاتا ہے"۔

"جن کو وہ کھلاتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ گھر کے لوگ لیکن ان سب میں اصل نشانہ ہے گھر والی۔ جو مرد کمائی کرکے اپنے بال بچوں کو کھلاتا ہے لیکن اگر ان کو وہ سچا مسلمان بننے کی تعلیم نہ دے اور ان کی تربیت نہ کرے اور وہ اسلام سے دور جاپڑیں تو اس کا مطلب حضور کی نظر میں یہ ہے کہ اس نے ان کو برباد کردیا۔

ذرا اس حدیث کو اس حدیث سے ملا کر سوچئے جس میں فرمایا گیا ہے کہ مرد اپنی بیوی کا نگراں ہے۔ تو بات کہاں پہنچتی ہے۔ بے شک ہر شوہر سے قیامت کے دن پوچھا جائے گا کہ اس نے اپنی گھر والی کو جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کی؟ سوچئے، اس وقت اگر جواب نہ بن پڑا تو کیا انجام ہوگا؟

جو مرد اپنی گھر والی کو دین کی باتیں بتاتا ہے۔ دین کی راہ پر خود چلتا ہے اور بیوی کو چلاتا ہے۔ حضور ایسے شخص کی تعریف فرماتے ہیں۔

"تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنی بیوی کے لئے اچھا ہے۔ بیوی کے لئے اچھا ہونے میں جہاں تمام اخلاقی باتیں ہیں وہیں یہ بات سب سے زیادہ ذمہ داری کی ہے کہ مرد اپنی بیوی کو بہترین مسلمان بیوی بنانے کی کوشش کرے۔ حضور اس نصیحت کے ساتھ ایک نہایت بلیغ فقرہ اور فرماتے ہیں۔ میں تم میں سب سے اچھا شوہر ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو اپنی بیوی کے حق میں ہر حیثیت سے اچھا ثابت ہوگا۔ وہ ہر حیثیت سے حضور کا سچا پیرو ہوگا۔ صحابہ کرام کوشش کرتے تھے کہ حضور کی پیروی میں اچھے سے اچھا شوہر بنیں۔ ہم جب صحابہ کرام رض کی زندگی کے حالات پڑھتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو آپ صحابہ رض کو سناتے تھے۔ صحابہ کرام رض اپنی بیویوں کو سناتے ہیں۔ آپ کو وہ مشہور واقعہ یاد ہوگا جب حضرت عمر رض ایمان نہیں لائے تھے۔ ایک دن غصے میں حضور ﷺ کو قتل کرنے کی نیت سے چلے۔ راستے میں بہن کے گھر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں حضرت فاطمہ (حضرت عمر رض کی بہن) اپنے شوہر اور حضرت خباب سے نئی نازل شدہ آیات سیکھ رہی تھیں۔

قرآنی آیات کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نجی صحبتوں میں صحابہ کرام رض کو جو نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ صحابہ کرام رض گھر آکر اپنی بیویوں کو بتاتے تھے۔ صحابیات کا عالم یہ تھا کہ جب کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو خود خدمت میں جاتیں اور حضور ﷺ سے پوچھتی تھیں۔ حضور ﷺ صحابیات کے لئے ان کے اجتماعات میں جاکر ان کو نصیحت فرماتے یا کسی صحابی کو بھیج دیا کرتے تھے۔ عید کے دن مردوں کے سامنے خطبہ دینے کے بعد حضور ﷺ عورتوں میں بھی تشریف لے جاتے اور ان کے سامنے خطبہ دیتے تھے۔

حضور ﷺ اور صحابہ کرام رض کی اس طرح کی کوششوں کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ صحابیات نے گھر سنبھال لیا۔ وہ گھر کی بہترین راعی (نگراں) ثابت ہوئیں۔ یہاں میں ایک معرکے کی بات یاد دلاؤں۔ حضور ﷺ کی پہلی بیوی حضرت خدیجۃ الکبریٰ رض کا انتقال ہوا۔ ان سے چار بچیاں تھیں۔ حضور ﷺ پر نبوت کی ذمہ داری کا بھاری بوجھ تھا۔ نبوت کی ذمہ داری کی وجہ سے حضور ﷺ کو اتنی فرصت نہیں ملتی تھی کہ گھر کی طرف توجہ فرماتے۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں کی تربیت فرماتے ان کے کھانے پینے کا انتظام فرماتے۔ اس وقت آپ ﷺ کے خاندان کی ایک تجربہ کار خاتون نے آپ ﷺ کو مشورہ دیا کہ آپ ﷺ حضرت سودہ رض سے نکاح کرلیں۔ حضرت سودہ رض پختہ عمر کی ہیں گھریلو زندگی کا انتظام کرنے میں بہت ہوشیار ہیں۔ وہ آپ ﷺ کا گھر سنبھال لیں گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشورہ پسند آیا۔ اُنہی خاتون کے ذریعہ پیغام بھوایا۔ حضرت سودہ رضہ کے کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ یہی بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے حضور کو گھر سے فارغ کردیا تھا۔ انھوں نے بچوں کو سنبھال لیا۔ بچوں میں سب سے چھوٹی حضرت فاطمہ رضہ تھیں۔ اس وقت وہ کچی عمر کی تھیں۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ حضرت فاطمہ رضہ کو جو سیدۃ النساء کا خطاب ملا، ان کو سیدۃ النساء بنانے میں حضرت سودہ رضہ کی محنت اور مشقت کو کتنا دخل ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ حضورؐ کی اولاد جو آگے چل کر نمونے کی اولاد بنی۔ ان کی تربیت کرنے میں سب سے پہلا ہاتھ حضورؐ کی پہلی گھروالی، یعنی ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا تھا اور پھر اسی اولاد کو تربیت دینے کا شرف حضرت سودہ رضہ کو ملا۔ اسلامی تاریخ میں لکھا ہے کہ حضورؐ جب باہر سے تشریف لاتے اور مکے کے سرداروں کے ملعون تشنوں سے اُداس آتے تو حضرت سودہ رضہ ایسا پیارا مزاح فرماتیں کہ حضورؐ مسکرا اُٹھتے۔ حضورؐ کی مشہور عالمہ فاضلہ بیوی حضرت عائشہ صدیقہ رضہ نے حضرت سودہ رضہ کے سلیقے، گھریلو تجربے اور حضورؐ کے ساتھ نباہ کرنے کے بارے میں بڑی تعریف کی ہے ام المومنین حضرت عائشہ رضہ فرماتی ہیں کہ ایک بار تو ایسا خوش مزاح فرمایا کہ حضورؐ ہنس پڑے اور آپؐ کے دانت نظر آئے۔ (یہ حضورؐ کی بڑی سی بڑی ہنسی ہوتی تھی)

حضرت سودہ رضہ سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضہ نے دین کو آگے بڑھانے اور حضورؐ کو گھر سے فارغ کردینے میں جو کارنمایاں انجام دیا، اُسے حضورؐ آخری دم تک بھولے حضرت عائشہ رضہ فرماتی ہیں کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ آپؐ ان کی اتنی تعریف فرماتے کہ مجھے رشک ہوتا تھا۔ فرماتی ہیں کہ ایک بار تو میں جھنجھلا گئی۔ میری زبان سے نکل گیا، کیا آپ ایک بوڑھی عورت کی تعریف کرتے ہیں۔ اللہ نے آپؐ کو ان سے اچھی بیویاں دیں تو حضور

نے جواب دیا۔ نہیں عائشہ! خدا کی قسم، خدیجہ رضہ نے اس وقت میری تصدیق کی جب کوئی میری تصدیق کرنے والا نہ تھا۔ خدیجہ رضہ نے مجھے دین کی راہ میں لگانے کے لئے مال دیا۔ جب کوئی مجھے مال دینے والا نہ تھا۔۔۔۔ اور۔۔۔ یہ بھی حضرت عائشہ رضہ ہی فرماتی ہیں کہ حضورؐ کفار کے ہاتھوں ستائے ہوئے گھر آتے تو حضرت خدیجہ رضہ ایسی باتیں کرتیں کہ آپؐ کا غم ہلکا ہو جاتا۔

غور فرمائیے۔ اگر حضورؐ کو اللہ تعالیٰ صالح بیویاں عطا نہ فرماتا تو آپؐ کیسی مصیبت میں پڑ جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یہ تجربہ بھی کرا دیا اور امت کے سمجھانے کے لئے عملاً دکھا دیا، کہ گھر والیاں اگر ذرہ برابر بھی تعاون سے دریغ کریں تو مرد کی کیا حالت ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک بار میں ابوبکر رضہ کے ساتھ حضورؐ کے گھر گیا۔ اس وقت آپؐ بیویوں کے درمیان تشریف فرما تھے اور چہرے سے پریشانی ظاہر ہوتی تھی۔ حضورؐ نے ہمیں دیکھ کر فرمایا کہ دیکھو، یہ سب مجھ سے خرچ مانگتی ہیں اور میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تو میں نے حفصہؓ (اپنی بیٹی) کو ڈانٹا اور حضرت ابوبکر رضہ نے عائشہ رضہ (اپنی بیٹی) کو ڈانٹا کہ تم حضورؐ سے وہ چیز مانگتی ہو جو آپؐ کے پاس نہیں ہے۔

دراصل یہ ایک نمونہ دکھانا تھا اس لئے ام المومنین کے ذہن اس طرح سوچنے لگے تھے۔ ورنہ ان کی اصل شان وہی فدا کارانہ رہی۔ اسی واقعہ میں ہے۔ حضورؐ نے اپنی بیویوں سے کہا کہ تم مال اور میرے مقابلہ میں ایک چیز پسند کر لو تو تمام ام المومنین نے آپؐ کو پسند کیا اور مال ٹھکرا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی بیویوں کے ذریعہ یہ سبق دیا اس سے نتیجہ یہی نکالا جاسکتا ہے کہ اگر گھر والی ذرا ڈھیل دے دے اور گھر میں چوکس نہ رہے تو امت کے لوگوں کی حقیقت تو الگ رہی۔ اللہ کا نبی بھی پریشان ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضہ کی بیویاں تن من دھن سے بہترین گھریلو عورتیں تھیں اور انہوں مردوں کو گھر

سے اتنا مطمئن کر دیا کہ وہ جان و دل سے حضورؐ کا ساتھ دیتے رہے تھے۔ بہت سی خواتین ایسی تھیں کہ وہ مالدار تھیں لیکن ان کے شوہر غریب تھے وہ اپنا مال شوہر کو دیتیں تاکہ وہ پیسے اطمینان سے باہر دین کا کام کریں۔ ایک بار ایک صحابیہؓ حضورؐ کے پاس آئیں عرض کیا کہ میرا شوہر غریب ہے۔ میرے پاس مال ہے اگر میں اسے قرضہ دوں یا مال سے اس کی مدد کر دوں تو مجھے ثواب ملے گا؟ حضورؐ نے جواب دیا بے شک۔ تم کو صدقے کا ثواب ملے گا۔

بہت سے وہ صحابہؓ جو آگے چل کر بڑے صحابہ میں گنے جاتے ہیں۔ پڑھیے تو ہر ایک کا یہ قول سامنے آتا ہے کہ مجھ پر میری ماں کا یہ احسان ہے۔ مشہور صحابی حضرت انسؓ کو ان کے بچپن میں ان کی والدہ نے حضورؐ کی خدمت میں دے دیا تھا۔ حضرت انسؓ ماں کا یہ احسان عمر بھر نہ بھولے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میری والدہ نے مجھ پر سب سے بڑا یہ احسان کیا کہ تربیت کی غرض سے مجھے حضورؐ کی خدمت میں دے دیا۔ حضرت انسؓ کی والدہ کا ہی وہ واقعہ ہے کہ ان کا بچہ فوت ہو گیا۔ شوہر طلحہؓ (جو خود بڑے صحابہ میں سے تھے) گھر آئے تو ام سلیم (حضرت انسؓ کی والدہ) نے ان سے کہا "طلحہ! اگر کوئی ہمارے پاس امانت رکھے اور پھر طلب کرے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے" حضرت طلحہؓ نے جواب دیا کہ خوشی خوشی دے دینا چاہیے۔ یہ سن کر ام سلیمؓ نے کہا تو سنو تمہارا بیٹا جو اللہ کی امانت تھا۔ اللہ نے اسے واپس لے لیا۔

حضرت طلحہؓ خود یہ واقعہ بیان کر کے اپنی صالح بیوی کی تعریف کیا کرتے تھے۔ اس طرح کے واقعات تو بہت ہیں۔ ایک واقعہ اور سنیے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ایک صحابی کو ایک صوبے کا گورنر بنا کر بھیجا۔ ان کے انتظام اور کارناموں سے خوش ہو کر چار ہزار دینار (سونے کے سکے) بھیجے۔ وہ صحابی دینار دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ اس پریشانی میں زبان

سے نکل گیا: قیامت آگئی؟ بیوی گھبرا کر دوڑیں۔ پوچھا۔ خیریت ہے امیر المؤمنین بخیریت ہیں؟ بولے ہاں وہ تو بخیر ہیں لیکن اس سے بڑی بات ہوگئی۔ پوچھا کیا؟ بتایا۔ یہ دیکھو عمر رضؓ نے میرے پاس سانپ بچھو بھیجے ہیں۔ اب دیکھئے گھر والی کیا جواب دیتی ہے۔ ہم کو یہ جواب اور یہ کردار یاد رکھنا چاہیئے۔ بیوی کہتی ہیں۔ اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ کل صبح مجاہدین کا قافلہ جائے گا۔ انھیں دے دو۔ اب پھر صحابی ان سے کہتے ہیں۔ تم بڑی اچھی گھر والی ہو۔ اچھا دیکھو تو۔ تم ہی مجاہدین کو دے دینا اور یہ کہہ کر شکرانے کی نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے۔

عزیز بھائیو اور بہنو! اس واقعہ میں جو طمانیت پائی جاتی ہے اس سے آپ کا دل شائد مسکرائے تو آپ کا یہ مسکرانا بے جا نہیں ہے۔ لیکن اس دلچسپ واقعے میں گھر والی کے کردار کو ہرگز نہ بھولئے۔ یہ اسوۂ صالحہ کے بہترین نمونے ہیں۔

میں نے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے صحابی رضؓ کا نام نہیں لکھا۔ اس لیے کہ پھر مجھے اس سلسلے کے اور بھی واقعات لکھنا پڑتے۔ اس طرح مضمون بہت طویل ہو جاتا۔

جب ہم صحابہ اور صحابیات کے نمونے پیش کرتے ہیں تو بہت سے ایسے لوگ جن کی طبیعت میں حیلہ ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ بھائی! ہم ان کی برابری کیسے کر سکتے ہیں۔ ان کو تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹرینڈ فرما دیا تھا۔ یہ سُن کر ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ حیرت یہ کہ آخر اللہ تعالیٰ نے یہ نمونے کے لوگ کیوں پیدا فرمائے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پاکیزہ گروہ کے لئے دن رات کیوں محنت و مشقت فرمائی تھی؟ اسی لئے تو کہ امت کے لوگ ان نمونوں کی پیروی کریں۔ یہ ٹھیک ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا ولی ان پاکیزہ لوگوں کے تلووں

وہ کیا مٹائیں گے ظلمت کدوں کی تاریکی ۞ جو اک چراغ بھی گھر کے لئے جلا نہ سکے (صائب)

کی خاک کے برابر بھی نہیں ہو سکتا لیکن پیروی تو بہرحال انہی کی کرتا ہے۔ اچھا آئیے۔ دوسرے درجے کے نہیں تیسرے درجے کے بزرگوں میں سے ایک دلچسپ اور نصیحت سے بھرا ہوا قصہ سنائیں

حضرت واقدی رح کا نام سنا ہوگا۔ اسلامی تاریخ میں جنگوں کا حال لکھنے میں مشہور ہیں بہت ہی فصیح و بلیغ بزرگ تھے۔ وہ بہت فیاض تھے۔ ان کی فیاضی کی وجہ سے گھر میں اکثر فاقہ ہوجاتا تھا۔ اب سنئے۔

ایک بار عید آئی۔ گھر میں کچھ نہ تھا۔ بیوی نے متوجہ کیا کہ ہماری آپ کی بات نہیں بچوں کا دل رکھنے کے لیے کچھ کرو۔ بات ٹھیک تھی۔ حضرت واقدی رح گھر سے نکلے۔ اپنے ایک تاجر دوست کے گھر پہنچے۔ اس سے حال کہا۔ دو تھیلیاں اس کے سامنے رکھی تھیں اس نے پیش کیں۔ واقدی رح لے کر گھر آئے۔ اتنے میں ایک ہاشمی آگیا اس نے اپنی بپتا سنائی۔ واقدی رح نے بیوی سے کہا کہ اس کی مدد کرنا چاہیے۔ ایسا کرو کہ ایک تھیلی اسے دے دو۔

اب بیوی (گھر والی) کا جواب سننے کے لائق ہے: "تم عالم آدمی۔ ہر وقت قال اللہ قال الرسول میں زبان تر رہتی ہے مگر تم سے وہ بے پڑھا تاجر اچھا جس نے اپنا کل اثاثہ تم کو دیدیا۔" واقدی رح شرما گئے۔ بیوی سے معافی مانگی۔ دونوں تھیلیاں ہاشمی کو دے دیں۔

ہاشمی لے کر چلا۔ تو وہی تاجر اسے ملا: تاجر نے کہا کہ میرا مال آیا ہوا بندرگاہ پر پڑا ہے رقم کی سخت ضرورت ہے۔ ہاشمی نے اسکی بپتا سنی تو دونوں تھیلیاں اسے دیدیں: تاجر نے تھیلیاں پہچان لیں۔ اس واقعہ کا چرچا ہوا۔ واقدی کے دوست وزیر اعظم نے سنا تو واقدی رح کو بلایا۔ واقعہ کی تصدیق کے بعد دس ہزار دینار دیئے اور کہا کہ دو دو ہزار تم لے لینا اور چار اسے دینا جس نے سب سے بڑا ایثار کیا۔ واقدی رح رقم لے کر آئے۔ تینوں نے دو دو ہزار لئے۔ اب چار ہزار بچے۔ سوچنے لگے کہ یہ کس کو ملنا چاہیے؟ واقدی رح اور ہاشمی نے کہا کہ تاجر کا ایثار مقدم ہے۔ یہ چار ہزار

تاجر کو ملنا چاہیے لیکن تاجر نے کہا کہ یہ چار ہزار واقدی رح کی استانی کو ملنا چاہیے۔ واقدی رح نے کہا کہ میری کوئی استانی ہی نہیں۔ اس پر تاجر نے کہا کہ دراصل تمہاری گھر والی نے سب سے بڑا ایثار کیا۔ یہ سب نے تسلیم کیا۔ چار ہزار دینار بیوی کو ملے۔

کیا خیال ہے آپ کا۔ واقدی رح اور واقدی رح کی گھر والی نے اس رقم سے محل بنوایا ہوگا ہم جواب دیتے ہیں جی ہاں! انھوں نے محل بنوایا لیکن اینٹ پتھر کا نہیں ہیرے جواہرات کا اور جنت میں بنوایا۔ اس طرح کہ وہ اجی رقم سے گھر عید منائی اور اسی رات حصہ رسد غریبوں میں تقسیم کردی۔

یہ مسلمانوں میں اول نمبر کے صحابہ کا واقعہ نہیں۔ دوسرے نمبر پر تابعین کا نہیں تیسرے نمبر کے بزرگ کا واقعہ ہے۔ اگر واقدی رح کی گھر والی ایسی نہ ہوتی تو واقدی رح تاریخی دفتر کے دفتر نہ تیار کر پاتے اور یہ مقام نہ پاتے۔ ہمارے بزرگوں میں ایک سے ایک بڑھ کر ایسے ہی تھے۔ ان سے نیچے مرتبے کے لوگوں کو دیکھئے بہت دور نہ جائیے کل کے بزرگوں کو دیکھیے۔ واقعات نہیں لکھوں گا۔ سید احمد شہید رح (رائے بریلوی) کو سید احمد رح ان کی والدہ نے بنایا۔ علامہ اقبال رح کو اقبال رح ان کی والدہ نے بنایا۔ سرسید کو سرسید ان کی والدہ نے بنایا۔ محمد علی جوہر رامپوری کو محمد علی ان کی والدہ نے بنایا۔ کہاں تک گناؤں۔ آج کے بزرگوں کو دیکھیے۔ ابوالحسن علی میاں کو علی میاں ان کی والدہ نے بنایا۔ ابوالاعلیٰ مودودی کو ابوالاعلیٰ ان کی والدہ نے بنایا۔ آپ تلاش کریں گے تو آج بھی آپ کو بہت سے بزرگ ایسے ملیں گے جو امومت صالحہ کی گود میں پلے۔

میں اپنے مطالعہ کی ایک بات پیش کردوں۔ ان ساری امومت صالحہ میں میں نے ایک بات مشترک پائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ انھوں نے انھیں حلال روزی کھلائی۔ آپ ان بزرگوں کے واقعات پڑھیں۔ حلال روزی اول نمبر پر ملے گی۔ اب اگر ہم ان بزرگوں کی تقلید میں بھی

حیلہ کریں تو ہم سے زیادہ بدنصیب دوسرا نہیں ہو سکتا۔

امور صالح کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ گھر کا مرد جس پر گھریلو اور اخلاقی بوجھ بھی ہوتا اور جس پر قوا انفسکم واہلیکم نارا کا فرض عائد ہوتا ہے۔ اچھی بیوی کی بدولت اس کا دل ہر وقت ٹھنڈا رہتا ہے۔ اس کی ہمت بڑھی رہتی ہے۔ ایسے گھر والوں کا کہنا ہے کہ مددگار بیوی کی وجہ سے ہمارے اندر دس گنی طاقت آجاتی تھی اور ہم بڑے اطمینان اور محنت و مشقت سے دین و دنیا کے کام کرتے ہیں۔ اگر ہماری گھر والی ایسی نہ ہوتی تو ہم بھی کچھ نہ ہوتے۔ دوسرا بڑا فائدہ اولاد کی تربیت کا ہوتا ہے۔ بچہ سب سے زیادہ اثر ماں کا لیتا ہے۔ ماں جیسا چاہے اُسے بنا دے۔

نوٹ:۔ دنیاوی ترقی کے اعتبار سے بہت سے سیاست والوں، تاجروں اور سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے گھر والی کی مدد ہی سے یہ نام پایا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھی گھر والی دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مذہب اسلام محاسن اخلاق اور محاسن اعمال سے گھرا ہوا ہے جن میں سے بعض یہ ہیں۔

• دوستوں، عزیزوں اور تمام ملنے والوں سے اچھا سلوک کرنا یعنی ان کو ہر قسم کی تکلیف سے محفوظ رکھنا۔

• نیک عمل کرنا۔ • سب سے نرمی کا برتاؤ کرنا۔ • سب پر احسان و بخشش کرنا۔

• لوگوں کو کھانا کھلانا اور سلام کو عام کرنا یعنی جان پہچان ہو یا نہ ہو ہر مسلمان کو سلام کرنا۔

• بیمار کی عیادت کرنا، خواہ نیک ہو یا بد (اپنا ہو یا بے گانہ) • مسلمان کے جنازے کے پیچھے چلنا۔

• پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر۔

• ہر مسلمان بڑے آدمی کی تعظیم کرنا۔ • لوگوں کی خطاؤں اور زیادتی کو معاف کرنا۔

• جن لوگوں میں اختلاف ہو ان میں صلح کرا دینا۔ • سلام کرنے میں سبقت کرنا۔

• سخاوت اور شرافت اور ہمت کو اختیار کرنا۔

• غصے کو پی جانا، یعنی غصے کے مقتضے پر عمل نہ کرنا (اور اس کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ اس جگہ سے علیحدہ ہو جائے اور کسی دوسرے کام میں مشغول ہو جائے)

• لوگوں کی خطائیں معاف کرنا۔

زمانے کی گواہی

اسی اکتوبر کے آخری ہفتے میں لاہور
ہائیکورٹ بارایسوسی ایشن کے ایک جلسے
ین سعودی عرب کے شاہ خالد کے خصوصی
شیر ڈاکٹر معروف دوالیبی نے ساڑھے
ین سال پہلے کا ایک واقعہ بتایا۔ انھوں
نے کہا ڈبلن یونیورسٹی کے ایک پروفیسر
ی قیادت میں بین الاقوامی شہرت کے
امل ماہرین قانون اور دانشوروں پر
شتمل ایک وفد نے سعودی عرب آکر
اسلامی قوانین کا جائزہ لینے اور تعزیری
نظام کے بارے میں بات چیت کرنے
ی خواہش کا اظہار کیا۔ اس وقت مرحوم
شاہ فیصل زندہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ
س استدعا کو منظور نہ کیا جائے۔ کیونکہ ان
کے ذہن میں اسلام کے خلاف یہ روایتی
اور پیدائشی تعصب پایا جاتا ہے۔ دوالیبی
نے شاہ فیصل مرحوم کو مشورہ دیا کہ وہ وفد
کو سعودی عرب آکر اسلامی نظام قانون
کا جائزہ لینے کی اجازت دے دیں۔ چنانچہ
یورپی دانشوروں اور ماہرین قانون کا وفد
سعودی عرب آیا اور انھیں کھلے دل سے
دعوت دی گئی کہ وہ محکمہ داخلہ میں جرائم کی
رفتار کا جائزہ لیں۔ جب ان لوگوں نے
وہاں جرائم کی صورت حال کا جائزہ لیا تو
وہ حیران رہ گئے اور انھوں نے اعتراف
کیا کہ یورپ کے ان شہروں میں جن کی
آبادی سعودی عرب کے شہروں کے برابر
ہے۔ جرائم کی وارداتوں کی نسبت ایک
اور ہزار کی ہے۔ وہ لوگ قطع ید اور سنگسار
کرنے کی سزا (کو) غیر انسانی اور وحشیانہ

قرار دیتے تھے۔ انھیں یہ دعوت بھی دی گئی کہ وہ کروڑوں ڈالر کی رقم کسی ایک آدمی کو دے کر اس یقین کے ساتھ نہ بھیج سکتے ہیں کہ رقم محفوظ طریقے سے پہنچ جائے گی جب کہ یورپ کا یہ حال ہے کہ روزانہ مسلح ڈکیتیوں کی واردائیں ہوتی ہیں جن میں بے شمار لوگ قتل کئے جاتے ہیں۔ اپنا جائزہ مکمل کرنے اور اسلامی قوانین کی حقیقی روح سے آشنا ہونے کے بعد وہ لوگ اپنے پہلے خیالات پر بے حد شرمندہ ہوئے اور انھوں نے واپس جاکر پریس میں بیان دیا کہ اسلامی شریعت جرائم کا انسداد کرسکتی ہے اور مسلمان بے شک اپنی شریعت پر فخر کرسکتے ہیں۔

انہی دوالیبی صاحب نے اس کتاب کے مصنف سے مل کر ان سے کہا کہ وہ اپنی بات کے ثبوت میں اسلامی قانون شریعت یا مذہبی کتابوں میں سے کوئی حوالہ پیش کرے تو وہ شخص لاجواب ہوگیا۔ پہلے قرآن مجید کے فرانسیسی ترجمے میں وہ آیت کریمہ دکھائی گئی جس میں حکم دیا گیا ہے کہ اگر مقروض مالی پریشانیوں کا سامنا کر رہا ہو تو قرض کی واپسی کے لئے مناسب مہلت دو۔ اور بہتر یہ ہے کہ قرض کو صدقے کے طور پر معاف کر دیا جائے۔

صورت حال کچھ ایسی بن چکی ہے کہ بہترین پانی کا کنواں ہمارے اپنے گھر میں موجود ہے لیکن اس کا پانی چکھے بغیر بلکہ بسا اوقات اس سے قطعًا ناواقف ہونے کی بنا پر ہم خالی برتن لئے ہوئے گدلے پانی کے چند چلو حاصل کرنے کے لئے قطار در قطار دوسروں کے دروازے پر کھڑے رہتے ہیں۔ ہمیں جہاں حکومتیں ملی ہوئی ہیں وہاں بھی ہم اپنے قوانین کو نافذ نہیں کرتے اپنے وہ مقامات جہاں ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں۔ وہاں ہم اپنے خول میں اتنا سمٹ کر رہ گئے ہیں کہ ہم خود اپنے آپ کو پہچان نہیں پار ہے ہیں۔ ہمیں اپنی ہی صفوں میں یہ دوسری شریعت کے وکیل اور دوسرے

نظام کے متوالے جائیں گے۔ رہا اسلامی نظام و شریعت پر یقین رکھنے والے قرآن سے چلاوں کے لئے قدامت پسند اور رجعت پرست کے القاب گھڑ لئے گئے ہیں۔ مسلم ممالک کے باشندے تو اپنی اپنی جگہ مختلف محاذوں پر جدوجہد میں مصروف ہیں لیکن اپنے دور کی اس ذمہ داری کو ادا کرنے میں ہمیں بھی سوچنا چاہئے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ تحفظ دین و ملت یقیناً ایک بڑا کام ہے اور پچھلے سالوں میں الحمدللہ یہ کام انجام پاتا رہا ہے لیکن تعارف دین کے میدان پر بھی ہم اس طرح توجہ نہیں کر سکے جیسا کہ اس کا حق ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝ (سورہ زمر آیت ۴۵)

جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کڑھنے لگتے ہیں اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکدم وہ خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔

یہ بات قریب قریب ساری دنیا کے مشرکانہ ذوق رکھنے والے لوگوں میں مشترک ہے حتیٰ کہ ہم میں بھی جن بدقسمتوں کو یہ چھوت لگ گئی ہے وہ بھی اس عیب سے خالی نہیں ہیں۔ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ صرف ایک اللہ کا ذکر کیجیے تو ان کے چہرے بگڑنے لگتے ہیں کہتے ہیں۔ مزید یہ شخص بزرگوں اور اولیاء کو نہیں مانتا۔ جبھی تو بس اللہ ہی اللہ کی تاثیر کیے جاتا ہے اور اگر دوسروں کا ذکر کیا جائے تو ان کے دلوں کی کلی کھل جاتی ہے اور بشاشت سے ان کے چہرے دمکنے لگتے ہیں۔ اس طرز عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اصل میں دلچسپی اور محبت کس سے ہے۔

علامہ آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں اس مقام پر خود اپنا ایک تجربہ بیان کیا

کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے دیکھا، ایک شخص اپنی کسی مصیبت میں ایک وفات یافتہ بزرگ کو مدد کے لئے پکار رہا ہے۔ میں نے کہا، اللہ کے بندے! اللہ کو پکار۔ اللہ خود فرماتا ہے۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ۔

میری یہ بات سن کر اُسے غصہ آگیا۔ بعد میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ کہتا تھا، یہ شخص اولیاء کا منکر ہے اور بعض لوگوں نے اس کو یہ کہتے بھی سنا کہ اللہ کی نسبت یہ ولی اور بزرگ جلدی سن لیتے ہیں۔ (تفہیم القرآن جلد ۴ صفحہ ۳۷ حاشیہ ۱۱)

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مولانا عزیز صاحب امیر مقامی رامپور نے پچھلے مہینے میری تربیتی و دعوتی رپورٹ پر یہ ریمارک فرمایا امید ہے کہ بجابی بھائیوں اور بہنوں کے لئے بھی مفید رہیگا (اہل)

برادر محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

عالم الغیب والشہادۃ سے ملاقات کا شوق وخوف نہ بڑھا ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے
ل میں لگی آتش شوق مومن کو چین سے نہیں پڑا رہنے دیتی۔ وہ تو جب سارا عالم خواب میں ڈوبا ہوتا ہے نہ جانے کیا اور کون اس کی آنکھوں کی نیند بھی اڑا لیتا ہے۔

اکیلا بالکل یکہ وتنہا صورت شمع اندھیاریوں سے لڑا کرتا اور اپنا وجود روشنی بنا کر گھلا دیتا ہے، ایسے ایمانی چراغ کسی بھی آندھی سے نہ بجھتے ہیں اور نہ بجھائے جا سکے ہیں۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک۔

کاش! کہ میرا مولا مجھے اور آپ کو حشر کی رسوائی سے بچا لے۔ آمین!

(محمد عزیز)

ولی

مائل خیرآبادی

قرآن پاک کا مطالعہ کرنے کے بعد ولی" کے جو معنی سمجھ میں آئے ہیں وہ یہ ہیں (میں مضمون کو مختصر ہی رکھنا چاہتا ہوں اس لئے قرآن کا متن نہیں دوں گا۔ ہاں سورہ اور آیات کا حوالہ دے دوں گا۔ متن آپ قرآن پاک میں دیکھ لیں)

(۱) وَلی، اسے کہتے ہیں جس کے کہنے پر آدمی چلے۔ جس کی ہدایتوں پر عمل کرے اور جس کے مقرر کئے ہوئے طریقوں رسموں اور قانونوں کی پیروی کرے۔ (سورہ نساء ۱۱۹ ۱۲۰— سورہ اعراف آئت ۳۔ ۲۷۔ ۳۰)

(۲) وَلی اسے کہتے ہیں جس کی رہنمائی پر آدمی اعتماد کرے اور یہ سمجھے کہ وہ اُسے ٹھیک ٹھیک راستہ بتانے والا اور غلطی سے بچانے والا اور منزل پہ پہنچانے والا ہے۔ (سورہ بقرہ آئت ۲۵۷، سورہ بنی اسرائیل آئت ، سورہ کہف آئت ۱۷، ۵۰، سورہ جاثیہ آئت ۱۹

(۳) جس کے بارے میں آدمی یہ سمجھے کہ میں چاہے کچھ کرتا رہوں۔ دنیا میں وہ مجھے اس کے برے نتیجوں سے اور آخرت میں خدا کے عذاب سے بچا لے گا۔ (النساء ۱۲۳۔ ۱۰۳، الانعام الرعد ۳۷، عنکبوت ۲۲۔ احزاب ۶۵ زمر ۳)

(۴) جس کے بارے میں آدمی یہ سمجھے کہ دنیا میں ان طریقوں سے اس کی مدد کرتا جو انسانی طاقت سے باہر ہیں۔ جیسے آفتوں اور مصیبتوں سے بچانا۔ بٹیا بیٹی دینا۔ روزگار دلوانا۔ مرادیں پوری کرنا اور تمام حاجتیں لانا وغیرہ۔ (ہود ۲۰۔ رعد ۱۴۔ عنکبوت ۴۱)

قرآن کا مطالعہ کیجئے تو سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہی چاروں معنوں میں ولی ماننا چاہیے۔ یعنی (۱) اللہ ہمارا ولی ہے۔ ہمیں اللہ کے کہنے پر چلنا چاہیے۔ اللہ ہی کی ہدایتوں پر عمل کرنا چاہیے۔ اللہ ہی کے مقرر کئے ہوئے طریقے اور قانون کی پیروی کرنی چاہیے (۲) اللہ ہی ہمارا ولی ہے ہمیں اللہ نے

اسلام کی راہ دکھائی ہے، ہم یہ سمجھیں کہ اسلام کی راہ پر چل کر ہی ہم اللہ کو راضی کر سکتے ہیں.

اسلام کی راہ پر چل کر ہم جنت میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہم یہی سمجھیں کہ ٹھیک ٹھیک راستہ بتلانے والا ہمارا اللہ ہی ہے. وہی غلطیوں سے بچانے والا ہے اور اسی کی مدد اور توفیق سے ہم منزل پر پہنچ سکتے ہیں. چاہے وہ منزل آخرت کے لحاظ سے جنت ہو چاہے وہ منزل دنیاوی اعتبار سے بمبئی، کلکتہ یا مکہ مدینہ ہو۔ (۳) اللہ ہی ہمارا ولی ہے یعنی دنیا میں جو غلطیاں اور برے کام کرتا ہوں۔ ان کے برے نتیجے سے بچانے والا اللہ ہی ہے اور ان غلطیوں اور برائیوں کے نتیجے میں جو عذاب آخرت ہو سکتا ہے اس سے بھی اللہ ہی بچانے والا ہے. (۴) اللہ ہی ہمارا ولی ہے یعنی ہماری حاجتیں پوری کرنے والا اللہ ہی ہے کوئی اور ہماری کوئی حاجت پوری کرنے کی طاقت نہیں رکھتا. اسی طرح اللہ ہی ہماری مرادیں پوری کرتا ہے اس کے سوا کوئی ہماری مرادیں بر لانے والا نہیں سکتا. اسی طرح بیٹا بیٹی دینے والا، رزق دینے والا، روزگار سے لگانے والا. آفتوں اور مصیبتوں سے بچانے والا اللہ ہی ہے. یہ کام کسی انسان، چاہے وہ بڑے سے بڑا پیر ہو، چاہے وہ بڑے سے بڑا سادھو ہو یا کوئی اور بڑا ہو. کسی کے بھی بس کے نہیں ہیں.

اوپر ولی کے چار معنی بتاتے ہوئے ہم نے جن آیتوں کی طرف اشارہ کیا ہے آپ ان کا مطالعہ کیجیے تو سمجھ میں آئے گا کہ قرآن کہیں پہلے معنی میں اللہ کو ولی کہتا ہے کہیں دوسرے تیسرے معنی میں اور کہیں چاروں معنوں میں. رہے ولی کے وہ معنی جو ہم اردو میں لیتے ہیں جیسے نکاح کے وقت دولھا اور دلہن کا ولی کون ہے؟ تو اردو میں ولی کے معنی ہوتے ہیں سربراہ. سردھرا. ذمہ دار. سرپرست. ہم یوں جملے بولتے ہیں. فلاں شخص فلاں کا سرپرست ہے فلاں فلاں لوگوں کی ذمہ داری میں نکاح ہو رہا ہے اس گھر کا سردھرا فلاں شخص ہے وغیرہ۔

اردو میں ولی کے معنی یہ بھی سمجھے جاتے ہیں کہ وہ شخص جو صاحب کرامت ہو. جو کرامتیں

دکھاتا ہو۔ تو ولی کے یہ معنی سمجھنا بالکل غلط ہے آپ تمام بزرگوں کے حالات پڑھ جائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ کسی بزرگ نے صاحب کرامت ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ کسی بزرگ نے نہیں فرمایا کہ میرے پاس فلاں کرامت ہے۔

اب یہ سوال باقی رہتا ہے کہ یہ کیا بات ہے جو بزرگوں کے بارے میں کہی جاتی ہے کہ انھوں نے "جو کچھ" کہہ دیا وہی ہوگیا اور آج بھی فلاں بزرگ ہیں وہ "جو کچھ" کہہ دیتے ہیں وہی ہو جاتا ہے۔

اس سوال کے جواب میں ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ "جو کچھ" کہا گیا ہے، بالکل غلط ہے کوئی انسان کتنا ہی بڑا بزرگ ہو جائے صحابہ کرام رض سے بڑا بزرگ نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ نے صحابہ کرام (جن سے اللہ راضی ہوا) کے حالات میں پڑھا کہ وہ "جو کچھ" فرما دیتے تھے وہی ہو جاتا تھا اور آگے بڑھ کر سوچئے، صحابہ کرام رض سے اونچا مقام نبی کا ہوتا ہے اور یہ مقام انسانوں میں سب سے اونچا مقام ہے کیا کسی نبی کے بارے میں کہیں یہ پڑھا ہے کہ فلاں نبی "جو کچھ" فرما دیتے تھے وہی ہو جاتا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ ایسا نہیں ہے تو نبیوں اور صحابہ کرام رض سے کمتر درجے کے لوگوں کا یہ مرتبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ "جو کچھ" کہہ دیتے ہیں وہ ہو جاتا ہے۔

ہاں کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ کسی شخص نے ایک بات کہی اور وہ بات ہوگئی تو اسے حسنِ اتفاق کہا جاتا ہے۔ آپ اسی شخص سے پوچھئے کہ کیا آپ کو پہلے سے معلوم تھا جو آپ نے فرمایا اور یہ بات ہوگئی۔ وہ شخص اگر سچا ہے تو اقرار کرے گا کہ نہ بھائی، میں آئندہ ہونے والی باتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا یہ بات حسن اتفاق سے ہوگئی۔ یہ کوئی کرامت نہیں ہے۔ بہت سے تجربہ کرنے والوں اور کرامتوں کی حقیقتوں کو کھنگالنے والوں نے اسی لئے یہ کہا ہے۔ پیراں نمی پرند مریداں می پرانند کسی بزرگ نے صاحب کرامات ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یہ سب مرید لوگ

اڑاتے پھرتے ہیں۔

آپ دور کیوں جائیں۔ ذرا اپنی باتوں پر غور کیجئے۔ آپ نے بھی کبھی کوئی ایسی بات کہی ہوگی اور وہ ہوگئی ہوگی تو سچ کہئے کیا وہ آپ کی کرامت تھی یا حسن اتفاق تھا۔ کیا آپ کو معلوم تھا کہ آئندہ لمحہ یہ ہونے والا ہے آپ یقیناً یہی کہیں گے کہ حسن اتفاق ہی تھا۔

سچی بات یہ ہے کہ آئندہ ہونے والی بات اللہ ہی جانتا ہے۔ آئندہ ہونے والی بات "غیب" سے تعلق رکھتی ہے اور "غیب" کا جاننے والا صرف اللہ ہے۔

بات پوری طرح کھل کر سامنے آگئی

اب آپ کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ کرامتوں کے پھیر میں پڑے رہتے ہیں۔ ان کے ایمان میں کمزوری ہوتی ہے۔ وہ قرآن کی تعلیمات نہیں جانتے۔ جو لوگ قرآن پڑھتے اور سمجھتے ہیں ان پر واجب ہے۔ کہ وہ لوگوں کو ولی کے ٹھیک ٹھیک معنی بتائیں۔ اور یہ حضرت اس قسم کے لوگ جو روحانیت کا ڈھونگ رچا رہے ہیں۔ حاصل انھوں نے ہی اپنا کاروبار پھیلانے کے لئے یہ پروپگنڈا کر رکھا ہے کہ فلاں بزرگ کو غصہ مت دلاؤ یہ قسمت بگاڑ دیں گے تختہ اُلٹ دیں گے۔ یہ جو کچھ کہہ دیتے ہیں وہی ہو جاتا ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ خدا سے نہ ڈرنے والے بناوٹی پیروں اور مصنوعی حضرتوں نے جاہلوں میں غلط عقیدے پیدا کر دئے ہیں اور اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ خدا سے ڈرنے والا اگر ان کی باتوں سے انکار کر دیتا ہے تو اس کے طرح طرح کے نام دھرتے ہیں۔ ان ناموں میں ایک نام "وہابی" کا چل پڑا ہے۔ آخر میں قرآن کی بہت سی آیتوں میں سے صرف ایک آیت تلاوت فرمالیجئے اور ترجمہ ملاحظہ فرمالیجئے۔ سورہ شوریٰ آیت ۹ یہ ہے

أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ۖ فَاللَّهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

"کیا یہ ایسے نادان ہیں کہ انھوں نے اُسے (یعنی اللہ کو) چھوڑ کر دوسرے ولی

بنا رکھے ہیں۔ ولی تو اللہ ہی ہے۔ وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے"
اسی سورہ شوریٰ کی آیت ۱۱ یہ ہے:۔
لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ
وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝
"آسمانوں اور زمینوں کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ (اللہ) جسے چاہتا
ہے نپا تُلا دیتا ہے۔ اُسے ہر چیز کا علم ہے"
اس طرح آپ ہر وہ آئت پڑھ جایئے جو شروع میں نمبر دے دے کر ہم نے گنائی
ہے۔ آپ ولی کے معنوں کو اچھی طرح سمجھ لیں گے۔ اللہ آپ کو توفیق عطا فرمائے۔

مختصر ترین کہانی

امریکہ کے ایک اخبار نے ڈرامائی انداز کی نہایت مختصر کہانی لکھنے کا اعلان کیا اور سب سے بہتر کہانی کے لئے ایک بڑا انعام مقرر کیا۔ اس مقابلہ میں ہزاروں آدمیوں نے حصّہ لیا ۔ مندرجہ ذیل کی کہانی کو انعام ملا۔

"جولیا کو اپنے بھائی کا تار ملا جو اس کے شوہر کے ساتھ شکار پر افریقہ گیا تھا۔ تار کے الفاظ یہ تھے: "تمہارا شوہر شیر کے شکار میں کام آگیا" جولیا نے فوراً تار دیا کہ: "اسکی لاش گھر بھیج دو" تین ہفتے بعد ایک بڑا بکس افریقہ سے پہونچا جس کے اندر شیر کی لاش تھی۔

جولیا نے پھر تار دیا: "تم سے غلطی ہوئی، میرے شوہر کی لاش بھیجو" اس کا جواب آیا۔
"غلطی نہیں ہوئی، تمہارا شوہر بھی شیر کے اندر ہے۔" (ماخوذ۔ رفیق پٹنہ)

ایک ہوں میں

(ادارہ)

(۱) میں ایک اسکول میں نوکر ہوں. یہ چھوٹی بچیوں کا اسکول ہے. میں ان بچیوں کو ان کے گھر تک پہنچانے اور لانے کے لئے ملازم ہوں. میں اصلاح و تبلیغ کا کام کر سکتی ہوں اور کرتی بھی ہوں میں کوشش کرتی ہوں کہ بچیوں کو ٹھیک وقت پر اسکول لے آؤں. آتے اور جاتے وقت انہی پر نگاہ رکھتی ہوں. انھیں تہذیب سے چلنا سکھاتی ہوں. بدتمیز لونڈوں سے بچاتی ہوں. اگر کوئی بچی مضر صحت چیز جیسے سڑی گلی مٹھائی خریدنے کو چلتی ہے تو میں اس کے نقصان اُسے سمجھاتی ہوں. راستے میں کوئی اچھی سی کہانی سناتی ہوں. میں بچیوں سے کہتی ہوں کہ نماز پڑھا کرو. سچ بولا کرو. ایک دوسرے کی مدد کیا کرو. اگر کسی ساتھی کے پاس پنسل، پٹری وغیرہ نہ ہو تو اُسے کام کے لئے دے دیا کرو. گالی گلوچ نہ کیا کرو. تم سب اچھی بچی ہو. اچھے کام کیا کرو. اللہ خوش ہوتا ہے. پھر جب تم اللہ کے حضور جاؤگی تو اللہ میاں تم کو جنت دیں گے. یہی ایک مسلمان کی سب سے بڑی کامیابی ہے

(۲) اور میں ایک عورت ہوں. ایک رئیس کے گھر کام کاج کرتی ہوں میں بڑی محنت سے کام کرتی ہوں. بازار سے سودا لاکر دیتی ہوں اور پائی پائی کا حساب سمجھاتی ہوں. میں سودا لانے میں چوری نہیں کرتی ہوں اور نہ کھانا پکاتے وقت اچھی بوٹیاں ہڑپ کرتی ہوں. بڑی صفائی ستھرائی سے کام کرتی ہوں. مجھے ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ مسلمان ہوں. میری کسی غلطی سے مسلمان

ذات بدنام نہ ہو۔ میں اپنی مالکہ کی بات غور سے سنتی ہوں اور نرمی سے جواب دیتی ہوں میری نرمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ میری مالکہ بھی نرم ہو گئی ہیں۔ اور بتاؤں۔ میں نماز کو کسی وقت نہیں چھوڑتی میری دیکھا دیکھی میری مالکہ بھی نماز پڑھنے لگیں اور اس سال تو تین روزے بھی رکھے۔ کہتی ہیں کہ اگلے سال پورے روزے رکھونگی۔

(۳) میں ایک دھوبن ہوں میں بھی اصلاح و تبلیغ کا کام کرتی ہوں میں بہت صاف کپڑے دھوتی ہوں۔ استری بھی ٹھیک ٹھیک کرتی ہوں اور پیسے اتنے ہی لیتی ہوں۔ جو سب دھوبی لیتے ہیں۔ پھر یہ کہ پیسے پیسے کا حساب رکھتی ہوں۔ اچھے برے سب ہی گھروں میں جاتی ہوں۔ مجھے اچھی باتیں سننے کا شوق ہے۔ اچھے گھروں میں اچھی باتیں سنتی ہوں۔ ایک گھر کی اچھی باتیں دوسرے گھروں میں بتاتی ہوں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ کسی کا کوئی کپڑا گم نہ ہو۔ گم ہوتا ہے تو کہتی ہوں "بی بی اس کے پیسے کاٹ لو"، لیکن کسی بی بی نے مجھ سے ڈانڈ نہیں لیا۔ ایسے موقع پر مجھے ایک نئی بات معلوم ہوئی کہ یہ کپڑے میرے پاس امانت ہوتے ہیں۔ اسلامی شریعت میں ڈانڈ نہیں لیا جاتا ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ امانت میں خیانت کرنے والا عذاب کا مستحق ہوتا ہے تو بات یہ ہے کہ میں اللہ سے ڈرتی ہوں۔ میں غیبت نہیں کرتی۔ نہ ایک گھر کی بات دوسرے گھروں میں پہنچاتی ہوں۔ ہاں اچھی اور نیکی کی بات ضرور مشہور کرتی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ میں اصلاح و تبلیغ کا کام کر رہی ہوں اور اللہ سے ثواب کی امیدوار ہوں۔

(۴) اور میں ہوں ایک دائی۔ بچے جنواتی ہوں۔ میں زچہ اور بچہ کو اپنی اولاد سمجھتی ہوں۔ تمام بچے مجھے نانی کہتے ہیں۔ میں نال کاٹنے کے لئے بہترین نشتر رکھتی ہوں اور اسے اسپرٹ میں رکھتی ہوں۔ زچہ اور بچہ کی خوب دیکھ بھال کرتی ہوں۔ زچہ کو بچہ پالنے کی تربیت دیتی ہوں بچہ کو پہلی بار نہلا کر بتاتی ہوں کہ اب کسی مسلمان کو بلا کر بچے کے ایک کان میں اذان اور دوسرے کان میں تکبیر کہلاؤ۔ میں بتاتی ہوں کہ چھٹی کے

دن عقیقہ کر لینا بڑے ثواب کا کام ہے۔ مجھے دھیرے دھیرے بہت سے مسئلے مسائل اور بیماریوں کے علاج معلوم ہو گئے ہیں۔ میں یہ سب زچہ کو بتاتی ہوں۔ میں زچہ کو شوہر سے خوشگوار تعلقات رکھنے کی تدبیریں بتاتی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے ہاتھ کی تمام زچہ مائیں مجھ سے خوش ہیں۔ میری صفائی سے خوش۔ میرے کام سے خوش۔ میں لالچی نہیں ہوں۔ اس سے بھی سب خوش ہیں۔ میں اپنے ہاتھ کی زچہ اور بچہ دونوں کو اللہ کی امانت سمجھتی ہوں۔

ہاں، ایک بات بھی بتا دوں۔ میں رسم ورواج کی سخت مخالف ہوں۔ میں ہر گھر میں رسم ورواج کے خلاف بھی بولا کرتی ہوں تو جو عورتیں جاہل ہیں وہ مجھ سے خوش نہیں ہوتیں لیکن میری دوسری خوبیوں کی وجہ سے مجھی کو بلاتی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ میں اصلاح وتبلیغ کا کام کرتی ہوں۔ اب اللہ تعالیٰ میرا کوئی کام قبول فرمالے تو یہ میری خوش نصیبی ہے۔ مجھے اللہ سے بڑی بڑی امیدیں ہیں۔

(۸) اور میں ہوں ایک مہترانی۔ میرا کوئی دین دھرم نہیں۔ مسلمانوں کے گھروں میں جاتی ہوں تو میں اللہ کی قسم کھاتی ہوں۔ غیر مسلموں کے گھروں میں جاتی ہوں تو بھگوان کی قسم کھاتی ہوں۔ مسلمان اور غیر مسلم اپنے اپنے گھروں کا بچا کھچا کھانا مجھے دیدیتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی کپڑا کہیں سے مل جاتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں کسی دھرم اور دین کی ہو جاؤں مگر کوئی مجھے منہ نہیں لگاتا۔ میں نے مسلمانوں میں دیکھا ہے کہ چھوت چھات نہیں مانتے۔ صاف ستھرے ہو تو ہمارے ہاتھ کی چیز بھی لے لیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر ایک دن میں مسلمان عورتوں کے ایک اجتماع کے کنارے جا بیٹھی۔ وہاں میں نے سُنا کہ جو مسلمان ہو جاتا ہے اسکے پچھلے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ یہ سُنکر ایک دن میں نے ایک مسلمان بی بی سے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے مسلمان ہو جاؤں کیا مسلمان ہونیکے بعد میرا کہیں ٹھکانہ بن سکے گا۔ مجھ سے یہ سُنکر وہ بی بی چپ رہیں۔ کچھ جواب نہ دیا۔ تو میں یہ سمجھتی ہوں کہ مسلمان جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔ معاف کیجئے گا۔ میں ایک مہترانی ہوں۔

ٹیلی ویژن

راحت یا عذاب

● جو ایجاد ایک مرتبہ انسانی معمولوں میں داخل ہو جائے اس کا خارج کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ٹیلی ویژن نے زیادہ ترقی جنگ عظیم دوم کے بعد حاصل کی۔ اندازہ ہے کہ پوری دنیا میں ٹیلی ویژن سیٹ موجود ہیں صنعتی ممالک میں شاید ہی کوئی گھر ہو جس میں ٹیلی ویژن نہ ہو۔ بعض گھروں میں دو دو اور تین تین سیٹ ہیں۔ پسماندہ ممالک بھی اس کے شوق سے محروم نہیں رہے ہیں۔ ایک محقق نے لکھا ہے کہ میں نے ایک ایسے مکان میں ٹیلی ویژن دیکھا جس میں پانی کا نل موجود نہ تھا۔ گویا اہلِ خانہ کے نزدیک پانی کی اتنی اہمیت نہ تھی۔ جتنی ٹیلی ویژن سیٹ کی تھی۔

ٹیلی ویژن کتنا وقت لیتا ہے؟

ایک تحقیق کے مطابق ٹیلی ویژن ایک شہری کی زندگی کے دو اہم مشاغل کے بعد تیسرے درجے پر ہے یعنی اس کی زندگی کا زیادہ تر وقت یا تو اپنے پیشہ ورانہ کام میں گذرتا ہے یا سونے میں۔

جاپان میں عورت کی روزمرہ زندگی کے پانچ گھنٹے ٹیلی ویژن دیکھنے میں صرف ہوتے ہیں۔

امریکی شہری کی روزمرہ زندگی کے چھ گھنٹے ٹیلی ویژن کے لیے وقف ہوتے ہیں

لیکن اس سے بھی بڑھ کر جو چیز اہلِ مغرب کے لیے پریشان کن ہو گئی ہے وہ یہ ہے کہ:

اس کے ہر بچے کا وقت ٹیلی ویژن

کے لیے وقف ہوتا ہے۔ یعنی بچے بڑوں سے زیادہ ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں۔ اگر بڑے ٹیلی ویژن دیکھنے کا اوسط وقت چھ گھنٹے ہیں تو بچے کم از کم سات گھنٹے ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں۔

ٹیلی ویژن سے دلچسپی

● اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ٹیلی ویژن جدید زندگی پر کس قدر اثر انداز ہو رہا ہے۔ یہ اتنی بڑی قوت ہے کہ زندگی کو جس سانچے میں چاہے ڈھال دے اس کا ایک اور خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس کے اثرات ایکس ریز کی طرح سرایت کر گئے ہیں کہ آدمی کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ عصر جدید میں عام زندگی پر اتنے بڑے اثرات کی حامل کوئی اور قوت نہیں ہے۔ ایک مصنف لکھتا ہے کہ:۔

پچھلے تین عشروں میں ٹیلی ویژن خاندانی مراسم، تفریح، تعلیم، سیاست اشتہار بازی، خبروں کھیلوں اور دوسری انسانی سرگرمیوں پر نمایاں طور پر اثر انداز ہوا ہے۔

اسی مصنف نے بیان کیا ہے کہ ایک عورت کا ٹیلی ویژن گر کر ٹوٹ گیا۔ وہ بے ساختہ پکار اٹھی۔ "یہ ٹیلی ویژن نہیں ٹوٹا میرا عزیز مر گیا ہے۔"

یورپ میں جہاں ان منشیات کو گنایا جاتا ہے جس میں مغربی نوجوان مبتلا ہو کر متاعِ زندگی لٹوا رہے ہیں۔ وہاں اب ٹی وی کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے ٹی وی ایک نشہ بن گیا ہے تنخواہیں ٹی وی کی ضروریات کے پیش نظر ہونی چاہیئے اور تنخواہوں کا مناسب تعین ہونا چاہیے جونہی وقت شروع ہوتا ہے دیکھنے والے اس کی جانب بے اختیار کھنچنے لگتے ہیں۔

ایک شخص نے اعتراف کیا کہ اسے ٹیلی ویژن دیکھنے کی عادت ایسی ہی ہو گئی ہے جیسی شراب خوری کی عادت۔

امریکہ میں حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے THE PLUG-IN DRUG —

اس کی مصنف میری ون لکھتی ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کو جانتی ہے جو بعض اوقات مسلسل چار دن تک ٹی وی دیکھتا رہتا ہے۔

ہمارے ہاں تو ٹیلی ویژن کے اوقات بعد شام کے ہیں لیکن یورپ اور امریکہ میں ٹیلی ویژن چوبیس گھنٹے چلتا رہتا ہے۔

<u>نقصانات</u>

● ٹیلی ویژن کی اسی عوامی وابستگی کی بناء پر ارجنٹائن کے ایک کارٹونسٹ نے ایک کارٹون بنایا جس میں ایک باپ، ایک ماں اور ایک بچہ ٹی وی کے سامنے اس طرح سربسجود ہیں جس طرح بت پرست اپنے معبود کے سامنے عبادت میں سر جھکاتے ہیں۔

امریکہ کے ایک جریدے نے ٹیلی ویژن کے مضر اثرات پر قوم کو توجہ دلاتے ہوئے لکھا:۔

اگر ہم تیس برس قبل جیسے ذہین خود اعتماد اور خوش نہیں رہے ہیں تو اس کی بڑی وجہ ٹیلی ویژن ہے۔

میری ون ٹیلی ویژن کے اثرات کی ... دراز تک تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ... ٹیلی ویژن کی وجہ سے بچوں میں پڑھائی کا رجحان کم ہو گیا ہے۔ محنت میں دل کم ... ہے۔ خاندانی محبت معدوم ہو رہی ہے ... منشیات کی عادت زیادہ ہو گئی ہے ... مجرمانہ ذہنیت فروغ پانے لگی ہے ... معلوم ہوتا ہے گویا اجتماعی ذہنی توازن باقی نہ رہا ہے۔

میری ون بتاتی ہے کہ ایک شخص ... آہ سرد بھر کر کہا۔ زمانہ گیا جب پورا گھرانہ ... کو انگیٹھی کے قریب جمع ہو جاتا تھا۔ ... اپنا اسکول کا کام کرتے تھے۔ ماں سینے پرو... سکتی اور باپ اپنے مطالعہ میں مصروف ہوتا تھا۔ ٹیلی ویژن نے خاندان کو بکھیر دیا ہے۔ جب ٹی وی چلتا ہے تو کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہتا۔ حالانکہ اس سے پہلے ان خاندانی اجتماعات میں ایک کو دوسرے کے دکھ درد کا علم ہوتا تھا۔ باہمی ہمدردی بڑھتی تھی اور اخلاقی تربیت کا ایک ...

حل ہوتا تھا۔

ٹیلی ویژن کے انہی مضر اثرات کو دیکھ کر بعض ممالک میں ٹیلی ویژن اصلاحی مجالس قائم ہو گئی ہیں۔ جاپان میں ایک سوسائٹی ہے جس کا نام SOCIETY FOR RESPONSIBILITY۔ اس کے صدر نے سوسائٹی کے مقاصد بیان کرتے ہوئے افسوس سے کہا کہ ٹیلی ویژن نے ہماری ثقافت کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔

آسٹریلیا میں بھی ایک ایسی ہی اصلاحی انجمن موجود ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے آسٹریلیا کے ایک موقر جریدے "سن" نے لکھا ہے۔

• ٹیلی ویژن کے ایسے ہی اثرات ہیں جیسے کسی کو دماغ پر سخت چوٹ آئی ہو۔

ٹیلی ویژن کے اثرات

• جب ٹیلی ویژن نیا نیا آیا تھا اور بعض لوگوں نے اس کے نقصان دہ پہلوؤں کی جانب اشارہ کیا تھا تو جواب میں کہا گیا تھا کہ دیکھنے والوں کے بے راہ روی ٹیلی ویژن کا نتیجہ نہیں ہے مار کٹائی اور جنگ و جدل کے مناظر تو بچوں کے جذبات کے لیے نکاس کا محفوظ ترین ذریعہ ہیں۔ اس سے تشدد کے رجحان میں کمی آئے گی، اضافہ نہیں ہوگا لیکن یہ جواب جلد ہی غلط ثابت ہو گیا اس کی تردید ٹیلی ویژن کے عملی نتائج نے خود کر دی۔ بتدریج اس کے اثرات نمایاں ہونے لگے اور غیر مبہم طور پر دیکھا گیا کہ موجودہ بگاڑ میں سب سے گہرا ہاتھ ٹیلی ویژن کا ہے۔ ٹیلی ویژن صرف نقصانات ہی نہیں پہنچاتا بلکہ شدید نقصان پہنچاتا ہے۔ ٹیلی ویژن کی حیثیت ایک غذا کی سی ہے۔ جس طرح غذا انسانی جسم کی صحت و ساخت پر اثر انداز ہوتی ہے اسی طرح ٹیلی ویژن کی مسلسل عادت بھی انسانی خصائل پر اپنے اثرات دکھاتی ہے۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنا نمبر خریداری یا کم از کم
[illegible]

Shafi Ullah Khan Raz
M. A.
S. H. INTER COLLEGE,
Moh. Katra Purdal Khan
ETAWAH U.P.
Dated 9.10.78

محتشم جناب مائل صاحب! السلام علیکم

میری غزل کے دو مصرعوں کو آپ نے جو جلا بخشی ہے اس کے لیے میں بیحد ممنون ہوں۔ سرقوں کے سمندر میں میں موج کرتے ہوئے لفظ موج میں جو فصاحت و بلاغت ہے اس کا جواب نہیں اور انقلاب کے آنے میں نے بھی کیا ہے، بہت خوب ہے۔ میرا مجموعۂ کلام تنہائی زادے، اردو اکاڈمی اتر پردیش کے مالی اشتراک سے شائع ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ خدمت میں ضرور پیش کروں گا۔ قبلہ محترم نشور واحدی صاحب، ڈاکٹر بشیر بدر صاحب نیز ملک کے دیگر ممتاز فنکاروں نے اپنی بیش بہا آرا سے مجموعہ کو زینت بخشی ہے۔ ایک غیر مطبوعہ اور تازہ غزل اپنے محبوب ماہنامہ حجاب کے لیے خاص طور سے بطور نذرانہ پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ شائع فرمائیں گے۔ میرے لائق کوئی خدمت۔ حکم دیجئے....... نیاز آگیں...... شفیع اللہ خاں راز اٹاوی

غزل

ہم ایسے حرص و ہوس کے بندوں کو دو ہی [illegible]
زمیں تو کیا ہے جو بس چلے تو فلک کو بھی اپنے نام کرلیں

کوئی عمل ہو یہ طے ہے اک دن ضرور ردِ عمل بھی ہوگا
ہمیں مٹانا جو چاہتے ہیں وہ اپنا بھی انتظام کرلیں

ابھی غلاموں کی بیکسی پر جو خون کے آنسو بہا رہے ہیں
ذرا بھی قابو چلے جو ان کا تو ساری دنیا کو رام کرلیں

غمِ محبت کو اپنے سینے میں ہم چھپائے ہوئے ہیں لیکن
کدھر ہے اے گردشِ زمانہ ترا بھی کچھ انتظام کرلیں

دلوں کی پستی سے اٹھ کے انساں فلک کی رفعت کو چھو رہا ہے
سنہری موقع ہے آؤ چل کر طوافِ ماہِ تمام کرلیں

ندائے حق سے لرزنے والے نظامِ باطل کو چاہتے ہیں
سحر سے لگتا ہے خوف جن کو وہ اپنی دنیا میں شام کرلیں

عذابِ دوزخ کے مرتکب ہیں مگر یہ دل میں تڑپ ہے باقی
اللہ کے رحمت کو پیار آئے چلو کچھ ایسے بھی کام کرلیں

اپریل فول

راشد جیسے ہی گھر میں داخل ہوا شاہدہ نے اُسے ایک رنگین لفافہ دیتے ہوئے بتایا "ایک صاحب یہ لفافہ دیکر کہہ گئے ہیں کہ آج شام کو سنگیتا ٹاکیز پر ملاقات کریں۔"

لفافہ چاک کیا۔ لکھا تھا۔

ڈیر راشد!

کئی دن سے گھر آیا ہوا ہوں اور کل ہی واپسی کا پروگرام ہے۔ اس وقت بذریعہ اسکوٹر بریلی جا رہا ہوں۔ اس لئے بے حد معروف ہوں۔ واپسی میں گھر کے بجائے سنگیتا ٹاکیز پر آخری شو میں ملاقات کا پروگرام بنایا ہے۔ فلم میری طرف سے رہے گی۔ دھوکہ نہ ہو، ضرور ضرور آئیں۔ تمہاری بھابی کو بھی ضرور ساتھ لائیں۔ تمہاری بھاوج بھی میرے ساتھ ہیں۔ فلم دیکھتے ہی ہم دونوں فوراً واپس گھر لوٹ آئیں گے۔ ہاتھ میں درد ہونے کی وجہ سے یہ خط بھی تمہاری بھابی سے لکھوا رہا ہوں۔

(تمہارا زیدی)

زیدی کا خط پڑھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ کمبخت اتنے دن بعد آیا بھی اور واپس بھی جا رہا ہے، وہ زیر لب بڑبڑایا۔ خیر دیکھا جائے گا۔ آ تو جائے پھر دیکھ لوں گا کیسے لوٹ کر جاتا ہے آج۔

شام کو کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر ساڑھے آٹھ پر ہی شاہدہ کو لے کر پکچر ہاؤس پہنچ گیا اور بے چینی سے زیدی کی راہ تکنے لگا جیسے جیسے وقت گزرتا رہا اس کا اضطراب بھی بڑھتا رہا لیکن وہ نہ آیا

پکچر اسٹارٹ بھی ہو گئی مگر راشد صاحب کو اس کی صورت دکھائی نہ دی اس کو غصہ بھی آیا اور افسوس بھی۔ اچانک کچھ لڑکے اپریل فول کے لطیفے سناتے ہوئے سامنے سے گزرے تو اسے اپنے بے وقوف بن جانے پر خفت سی ہوئی۔

"خیر اب یہاں تک آ ہی گئے ہیں تو فلم دیکھ کر ہی چلیں گے" راشد نے کہا اور جلدی سے ٹکٹ لے کر وہ دونوں ہال میں جا گھسے۔ اختتام فلم پر ہال سے نکل کر ایک بار پھر کچھ یوں ہی تماش بینوں پر نظر ڈالی اور گھر واپس ہو گئے۔

دروازہ پر پہنچ کر ان کا ماتھا ٹھنکا۔ تالا کھلا ہوا تھا۔ اندر پہنچ کر اس کے ہوش وحواس بھی جاتے رہے۔ اس عرصے میں کسی نے اس کا زر نقد اور قیمتی سامان چوری کر کے اچھی طرح "اپریل فول" منایا تھا۔ ★★★

بادشاہت میں عسرت

سلطان ناصر الدین محمود اپنے تمام ذاتی اخراجات کلام پاک کی کتابت سے پورے کیا کرتا تھا، اس لئے اس کی زندگی عسرت اور تنگی میں گذرتی تھی، اس کے محل میں کوئی خادمہ نہ تھی، ایک روز اس کی ملکہ نے اس سے شکایتاً کہا کہ میں آپ کے لئے روٹی پکاتی ہوں تو میرے دونوں ہاتھ جل جاتے ہیں اور ان میں آبلے پڑجاتے ہیں۔ سلطان یہ سن کر رونے لگا، پھر اس نے یہ کہا کہ دنیا گذر جانے والی ہے یہاں اس تکلیف کو برداشت کر کے صبر کرو، قیامت میں خداوند تعالیٰ اس کے اجر میں تم کو تمہاری خدمت کے لئے ایک حور دے گا، ابھی تو میں بیت المال سے تمہارے لئے کوئی کنیز نہیں خرید سکتا، سلطان کی بیوی نے یہ سنکر سلطان سے اتفاق کیا۔

تقسیم اوقات

علامہ راشد الخیری، مرسلہ محمد منشی القریشی

منجلی بچی ماجرہ یوں تو کئی دن سے سر ہو رہی تھی۔ مگر خدا نے آج صبح کو اس کے دل میں کیا آئی۔ میں بیٹھی پان بنا رہی تھی۔ دوڑی دوڑی آ، گلے میں باہیں ڈال کہنے لگی۔

"اچھی باجی! نانی جان کے ہاتھ کی کڑھی ہوئی گڑیا آج ضرور ہی نکال دو۔"

کام تو بڑے جھمیلے کا تھا مگر بچی نے کچھ اس طرح کہا کہ مجھ سے انکار نہ ہو سکا۔ ارادہ تو دو تین دن سے کر رہی تھی۔ مگر اللہ رکھے میرا بچہ دم بھر کو پیچھا چھوڑتا تھا۔ آج خدا خدا کر کے وہ تایا کی انگلی پکڑ کر باہر گیا اور میں نے برسوں کی بندھی گٹھریاں کھولنی شروع کیں۔ اصلی ستی گڑیا ڈھونڈنے۔ گڑیا اور پڑیا تو خاک نہ ملی۔ ہاں ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک بستہ ہاتھ لگ گیا۔ کھول کر دیکھتی ہوں تو کنوار پنے کا روزنامچہ۔ اس وقت وہ باتیں کیا معلوم ہو رہی تھیں۔ کیسے مزے کے دن تھے ہے ہے۔ اپنی نیند سونا اور اپنی نیند اٹھنا کسی کی منت نہ خوشامد۔ بے فکری کا وقت، آزادی کا زمانہ۔ آج ان باتوں کو بارہ چوبیس برس ہو گئے۔ عمر کا وہ حصہ ایک خواب تھا۔ آنکھ کھلی تو کچھ نہیں۔ اب وہ اطمینان کہاں اور وہ ناز اٹھانے والے ماں باپ کہاں۔ زمانہ بدل گیا۔ ہوا کچھ کی کچھ ہو گئی۔ ننھا ہر وقت کس طرح لپٹا رہتا تھا۔ اماں بعض دفعہ خفا بھی ہو جاتی تھیں۔ مگر اس کو بغیر میرے چین نہ پڑتا تھا۔ آج وہی سگا بھائی ہے۔ شہر کے شہر میں مہینوں ہو جائیں، صورت دیکھنے کو ترسوں اور اسے گھڑی کے گھڑی آنا نصیب نہ ہو۔ رہی بہن! اس بے چاری کا کیا قصور۔

کالے کوسوں حیدرآباد۔ اُسے بچوں ہی سے اتنا
چھٹکارا کہاں کہ ہفتے کے ہفتے خط لکھے۔ ساتھ
کھیلی، ساتھ پلی، برس، دن کے فرق سے بیاہی
گئی۔ آج اُس سے ملے چھ برس ہو گئے۔ دل
نہ ہوا پتھر ہوا۔ کس کس کو یاد کروں۔ وہ سماں
ہی درہم برہم ہو گیا۔

اسی بستہ میں ایک تختی ملی جس میں
موٹے لفظوں میں اوپر لکھا ہوا تھا۔

"لڑکیو! وقت کی قدر کرو"

یہ وہ تختی تھی جو اماں جان نے اپنے
ہاتھ سے لکھ کر بیچ کے طاق میں لگا دی تھی
اور میرے تمام کام کاج کا وقت مقرر کر دیا تھا
گو خالی تو اب کبھی کبھی بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا
مگر اُس وقت کے کاموں اور اس وقت
کے کاموں میں زمین و آسمان کا فرق۔ جو
شوق اور اُمنگیں اس وقت دل میں تھیں
اب دنیا کی فکروں نے سب زائل کر دیں۔ وہ
رفتارِ موٹر کار تھی اور اب کولھو کا بیل۔ دن
بھر چلیں اور شام کو پھر وہیں۔

اُس تختی کو اماں جان موسم کے ساتھ
تبدیل کیا کرتی تھیں۔ یہ گرمیوں کی تختی تھی جس
میں میرا وقت اس طرح تقسیم تھا۔

۵½ سے ۶½ تک نماز و قرآن — ۶½ سے ۷ تک گھر کی صفائی — ۷ سے ۹
پکانا ریندھنا — ۹ سے ۹½ تک مردوں
کو کھانا کھلانا — ۹½ سے ۱۰ تک عورتوں کا
کھانا اور دینا — ۱۰ سے ۱۰½ تک سب کام
نمٹانا — ۱۰½ سے ۱۱ تک آرام — ۱۱ سے
۱ تک خطوط، اخبار و رسالے کتابیں دیکھنا
— ۱ سے ۲ تک لکھنا — ۲ سے ۲½ تک
ظہر کی نماز — ۲½ سے ۳¾ تک سینا پرونا۔
۳¾ سے ۴¼ تک غسل و نماز عصر — ۴¼
سے ۴½ تک پانی کی دیکھ بھال — ۴½
سے ۵ تک کھیل کود — ۵ سے ۵½ متفرق
— ۵½ سے ۶½ تک کھانا پکانا — ۶½
سے ۷ تک تیل بتی — ۷ سے ۷½ تک نماز
۷½ سے ۸ تک بستر کی درستگی — ۸ تا ۹ کھانا
نکالنا اور تقسیم کرنا — ۹ سے ۹½ مردوں کو
کھلانا — ۹½ سے ۱۰ تک نمازِ عشاء — ۱۰
سے ۱۰½ کوئی کتاب — ۱۰½ سے ۵½ آرام

جس دن سے ہوش سنبھالا، اُس دن سے اور اس وقت تک جب تک سسرال آئی مجھے یاد نہیں کہ اس تقسیم میں دکھ، بیماری یا کبھی ایسے ہی اتفاق کے علاوہ کبھی ناغہ ہوئی ہو۔

تھی اس وقت آگے بیتی اور کھاتے پیتے کا زمانہ آنکھوں کے سامنے، کیا وقت تھا کہ پھر نہ آیا اور کیا لوگ تھے کہ آج آنکھیں اُن کے لیے ترس رہی ہیں۔ وہ برسات میں جھولوں کا پڑنا۔ کڑھائی کا چڑھنا۔ لہک لہک کر سہیلیوں کا ملہار گانا اور ابا جان کا شاباش دینا سب ختم ہو گیا۔ بس یہ باتیں اسی وقت کی تھیں۔ اب تو دنیا کے جھگڑے ہیں اور ہم۔ ایک وہ وقت تھا کہ چودہ پندرہ گھنٹے کام میں بھی ولولہ تھا ایک آج کا دن ہے کہ مامائیں اور نوکر چاکر سب موجود ہیں اور پھر بھی ہاتھ پاؤں ہر وقت ڈھیر۔ کام کرنے کی ہمت ہی نہیں وہی میں ہوں کہ ابا جان کے لیے ٹھنڈے پانی کی صراحیاں لیے کوٹھے پر تین تین چار چار پھیرے کرتی تھی۔ اب تو ایک لوٹا لے جانا دوبھر ہے۔ خدا بخشے اماں، ابا کو کہ

جن کی وجہ سے نماز کی عادت پڑ گئی ہے ورنہ ان ڈھنگوں میں کہ تو نماز بھی جیسی ادا ہوتی، میں ہی جانتی ہوں، یہ اُن کی شرافت ہے کہ منہ پر نہیں لاتے۔ مگر دل میں تو ضرور کہتے ہیں کہ عجب آرام طلب بیوی ہے۔ کام کی نہ کاج کی۔ ڈیڑھ سیر اناج کی۔ میرا یہ عذر کہ گود کے بچے ہی سے کبھی چھٹکارا نہ ملا کتنا نامعقول ہے۔ عورت کا فرض صرف یہی تو نہیں کہ بچہ پال لیا اگر میری طرح سب کام کریں تو دنیا کے کام ہی ختم ہو جائیں۔ گو کھانا پکانے کے واسطے باورچی اور کام کاج کے لیے مامائیں ہیں مگر ہیں تو میری نگرانی میں۔ اُن کی نگرانی ہے تو اُن کے کاموں کی ذمہ دار میں ہوں اور کیوں نہ ہوں۔

میں نے اسی وقت تقسیم اوقات کا چارٹ بنا لیا۔ خیر میں کس طرح عمل کر رہی ہوں۔ میرا دن تو اس طرح گزر رہا ہے۔ ادھر صبح ہوئی اُدھر شام۔ خدا بچی کا بھلا کرے۔ سارے دن ایک ٹانگ سے پھرتی ہے، جو بڑھ سا

کام سمٹ جاتا ہے۔ نہیں تو وہ مٹی پلید ہوتی کہ آیا گیا سب ہنسی اُڑاتا۔ خیر کل سے اس تقسیم پر عمل کروں گی۔ اس تختی کو سامنے رکھوں گی اور ہر وقت یہ پڑھوں گی۔

"عورتو! وقت کی قدر کرو۔ ورنہ بعد میں پچھتاؤ گی اور بعد میں پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں۔"

دو نسخے

مندرجہ ذیل دو نسخے جو متعدد بار میرے عملی تجربہ میں آئے ہیں۔ ارسال خدمت ہیں اس درخواست کے ساتھ کہ آپ خدمت خلق کے سلسلے میں اپنے موقر جریدہ حجاب میں شائع فرماکر عنداللہ ماجور ہوں اور مجھے بھی وہاں کچھ مل سکے۔ والسلام۔ افتخار احمد بلگرامی بارہ بنکی

عرق النساء ہلیلہ سیاہ ۶ ماشہ۔ ہلیلہ زرد ۶ ماشہ۔ ہلیلہ کابلی ۶ ماشہ۔ سونٹھ ۶ ماشہ۔ مرچ سیاہ ۶ ماشہ۔ کالا زیرہ ۶ ماشہ۔ مغز کرنجوا ۶ ماشہ۔ ان ساتوں چیزوں کو کوٹ پیس کر کپڑ چھان کر کے منقیٰ ۶ ماشہ دانے کسی کھرل کے ذریعہ ملا کر لبدی سی بنا کر باریک (مثل ہومیوپیتھک) گولیاں بنا کر سایہ میں خشک کر کے ساری گولیوں کی چالیس خوراکیں بنا کر روزانہ نہار منہ سادے پانی کے ساتھ چالیس دن تک ایک خوراک کھالیا کریں۔ انشاءاللہ شفاء کلی حاصل ہوگی۔

کُتے کاٹے کا مجرب نسخہ (زہر) کچلے کی دو ٹکیاں لے کر چالیس ٹکڑے کر لئے جائیں۔ روزانہ نہار منہ ایک ٹکڑا سادہ پانی کے ساتھ بلا ناغہ چالیس دن کھالیا جائے۔ بس کافی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

افتخار احمد بلگرامی۔ دسہرہ باغ بارہ بنکی

نشتر

ایم۔ اے خیام

سفید ڈاکو

• بنگلور شہر کے ایک علاقے میں پچھلے دنوں ایک ڈاکو کا کافی چرچا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ڈاکو نو سالہ سفید بلی ہے جو کھلی کھڑکیوں سے کود کر گھروں میں گھس جاتی ہے اور عورتوں کے سونے کے زیورات و بچوں کے قیمتی کھلونے اپنے دانتوں میں دبا کر بغیر آہٹ واپس آجاتی ہے۔ اس بلی کا نام بسو ہے جس کی مالک ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہے جو اس بلی ڈاکو کے ذریعہ دستیاب اشیاء کو بڑی احتیاط سے اپنی الماری میں سجا لیتی ہے۔ (ماخوذ روزنامہ "آج" وارانسی ۱۷ جولائی ۱۹۸۹ء)

• اب ڈاکوؤں کو مزید جاں فشانی سے سنبھالنا پڑے گا۔

ایک اور چوٹ

اومن کے سلطان کے نئے فرمان سے مسلم تہذیب اور مسلم معاشرے پر ایک اور چوٹ۔

حال ہی میں اومن کے سلطان نے وہاں کی خاتون کھلاڑیوں کی مسلسل مانگ پر کوئی بھی کھیل کھیلتے وقت نیم عریاں تیراکی لباس پہننے کی انھیں اجازت دے دی ہے۔" (ماخوذ روزنامہ اخبار "آج" وارانسی ۱۷ جولائی ۱۹۸۹ء)

• لو، مخالف اسلام کو ایک اور ثبوت مل گیا کہ جب مسلم ملک کے ایک سلطان نے نیم عریاں لباس کی اجازت دے دی تو یہ اسلام میں جائز ہے۔ ع چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔

عجیب لڑکی اور بھوت

حال ہی میں لندن کی عدالت میں دو رومن کیتھولک پادریوں کو ایک دوشیزہ کی جان لینے کے جرم میں سزا دی گئی ہے یہ دونوں پادری اس بائیس سالہ دوشیزہ این مائیکل کے سر پر سوار بھوت اتارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پورے گیارہ ماہ اس دوشیزہ کو صرف چند بوند پانی ہی پر رکھا گیا جس کے نتیجے میں وہ مر گئی۔ لیکن پادریوں کا دعویٰ ہے کہ وہ دوشیزہ دوسروں کو عذاب و سزا سے نجات دلانے کے لیے ہی اپنی قربانی دے گئی۔

اس دوشیزہ کی پیدائش ہی سے تین چھاتیاں تھیں اس کے والدین کو یہ وہم اور عقیدہ ہو گیا تھا کہ اس پر بھوت کا سایہ ہے۔ اس کی موت کے بعد اس کے والدین کو یقین ہوا کہ وہ بھوت کو شکست دے چکے ہیں اور اب ان کی بیٹی بہشت میں ہے لیکن عدالت عالیہ ان پادریوں کو چھ مہینے کی سخت سزا دے رہی ہے!

(ماخوذ روزنامہ اخبار آج، وارانسی جولائی ۱۷ر ۱۹۷۸ء)

یہ ہے انجام وہم و جہل عقیدے کا۔

آنے والا وقت

۱۸ر جون ۱۹۷۸ء کا واقعہ ہے کہ دن میں ظہر کے وقت بجلی کڑکی۔ بجلی کی کڑک دل دہلا دینے والی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہیں قریب ہی گری ہے۔ لوگوں کو اس کی چمک آسمان پر صاف نظر آئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بجلی کچھ ہی فاصلہ پر گری۔ اور وہ اس طرح سے کہ ایک صاحب اپنے گھر کی لکڑیاں اتار رہے تھے۔ بجلی کڑکی اور وہ اس کا شکار ہو گئے۔

اسی طرح کے واقعات ہماری نظروں سے گزرتے ہیں لیکن نہیں سوچتے کہ کب اچانک موت آجائے۔ مومن تو ہر وقت موت کا خیال رکھتا ہے۔

(ارجمند بانو۔ ایم پی)

(مائل خیرآبادی)

مس ارملا دیوی! میری اچھی اور پیاری سہیلی۔ سدا سکھی رہو۔

میری دعا تو یہی ہے کہ تم سدا سکھی رہو لیکن تم نے اپنے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے اس سے سدا کی بات تو الگ رہی، تم ایک دن بھی سکھ سے نہ رہ سکو گی۔ "میں ساری عمر بن بیاہی رہوں گی کیونکہ آج کل اچھا شوہر نہیں ملتا۔ کیونکہ منگنی تلک اور بیاہ میں جو ہزاروں روپے چاہئیں وہ کہاں سے آئیں؟ کیونکہ شادی کا مطلب ہے شوہر کی لونڈی بن جانا۔ کیونکہ شادی کرنے کے بعد حسن اور جوانی دونوں کا بہت جلد خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پھر بچے کچے ہوئے تو لباس بستر، کمرے، صحن صاف ستھرے نہیں رہ سکتے۔ ابھی نئی ساری باندھی تھی کہ بچے نے پہلو دے دیا۔ ہر وقت دھونا نہانا جگہ جگہ صاف کرنا ایک مصیبت، راتوں کو اچھی نیند نہیں آتی۔ کھیل، تماشے تفریحیں سب ختم۔ اچھی بھلی عورت قید ہو کر رہ جاتی ہے۔"

دیوی جی! یہ وہ کارن تم نے لکھے ہیں جن کے ڈر سے تم بیاہ نہ کرو گی۔ میں تمہاری بات مانے لیتی ہوں۔ تم نے جو کچھ لکھا ہے، وہ سب ٹھیک ہی مگر میں تم کو بن بیاہی رہنے کے نقصان بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں۔ ضروری اس لئے سمجھتی ہوں کہ تم سے مجھے محبت اور پیار ہے۔ تم ان باتوں کو سوچتی رہنا اور اگر تمہارے بس میں ہو تو ان نقصانات سے بچنا۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ بن بیاہی عورت کا کہیں گھر نہیں بن پاتا۔ بن بیاہی عورتیں عام طور پر نوکری کرتی ہیں۔ نوکری میں تھے تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ تبادلوں کے [illegible] آج وہ یہاں

ہیں تو کئی وہاں. کرائے کے مکانوں میں رہتی ہیں. کرائے کے مکانوں کا ملنا آج کل کتنا مشکل ہو گیا ہے یہ بات سب جانتے ہیں. مجبوراً ایسی جگہ پر رہنے کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے جہاں جی نہیں چاہتا دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ ایسی جگہ کوئی بھلا مانس رہنا پسند نہیں کرتا. غلط جگہ رہنے سے جان و مال اور آبرو تینوں کا نقصان ہوتا ہے. یہ بات بہلانے کی نہیں. دیکھی بھالی اور سمجھی سمجھائی ہے. میں اپنی ایک پیاری سہیلی کی کہانی سناؤں.

میں انہیں فرحت دیدی کہتی تھی. وہ مجھ سے کئی برس بڑی تھیں. بی ایڈ کرنے کے بعد ایک گرلس اسکول میں ٹیچر ہو گئیں. کسی اچھی جگہ کے لئے سفارش پر سفارش کرا کے تبادلہ کراتی رہتی تھیں. ابھی تین چار برس ہوئے بجنور میں ان سے ملاقات ہوئی تھی. بتلا رہی تھیں کہ ایک مکان کی چھت پر کرایہ کا کمرہ لیا ہے. باپ کے مرنے کے بعد ماں کو یہیں بلا لیا. چھوٹی بہن بھی یہیں آ گئی ہے. شاہجہاں پور میں جو اپنا گھر تھا. وہ گر گرا گیا. بے چاری فرحت دیدی نے دبے لفظوں میں یہ اندیشہ بھی ظاہر کر رہی تھیں کہ ریٹائرڈ ہونے کے بعد کہاں رہیں گی؟ جھینپی جھینپی سی ہنسی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اب بیاہ بھی تو نہیں ہو سکتا. چھیالیس کی تو ہو گئی ہوں. سچ کہتی ہوں ارملا دیوی! فرحت دیدی کو کوئی بوڑھا پیغام دے تو وہ اچھا برا بھی نہ دیکھیں گی. جھٹ اس سے شادی رچا لیں گی اور جو آزادی کی زندگی بسر کر رہی ہیں اس پر گھریلو قید و بند کی زندگی کو ترجیح دیں مگر اب وہ شادی کریں بھی تو کیسے کریں؟ اب کون ان سے شادی کرے گا پھر یہ کہ ماں کو کیا کریں گی. بہن شادی کے لائق ہو گئی ہے اس کے لئے بھی تو پیغام نہیں آتے. ایک دن اس کی زبان سے بھی نکل گیا: "باجی کی طرح میں بھی یوں ہی بڑھی ہو جاؤں گی"

(۲) اوپر جو ملازم پیشہ عورت کی مثال دی ہے وہ عورت کے لئے سب نوکریوں میں اچھی نوکری ہے. ورنہ کسی دفتر میں کلرک بنتا، کسی کی پرائیویٹ سکریٹری بنتا. ماڈل گرل یا سیلس گرل بنتا، ان جگہوں پہ تنخواہ تو زیادہ ملتی ہے لیکن دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ایسی جگہوں پر ہر وقت

کی بڑی بڑی ٹائیں پلتی ہیں اور سارے کے سارے اس مرض کو پیدا کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ میری ملاقاتیں ایسی عورتوں سے ہے۔ میں نے سب کو پریشان دیکھا۔ ان سب نے مجھ سے کہا کہ بہن اتم اچھی رہیں۔ وہ چار قلابازیوں کے بعد پھر آگئی اور ایک کی ہوگئیں۔ اس ایک کی پوتر آنکھوں کی جھیل میں چاہے تیر دو چاہے ڈوبو پھر تو دو جانے کتنی ناپاک نظریں پہنچتی ہیں اور نہ جانے کیا کیا گندی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔

(۳) بن بیاہی عورت اگر نیک ہو، وہ مرد سے اپنے کو بچائے رکھے۔ مرد کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دے تو اس ایٹم بم کو کیسے دبائے گی جو بالغ ہونے کے بعد آج کے گندے اور آزاد سماج میں پھٹنے کے لئے بے چین ہوتا اور بے چین کرتا رہتا ہے۔ اگر عورت اسے دباتی ہے تو طرح طرح کے روگ اس کے اندر پیدا ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا کہ بن بیاہی نیک عورتیں زیادہ سے زیادہ بیس برس کی عمر تک تو تندرست رہتی ہیں۔ اس کے بعد اگر ان کو "جائز خوراک" (ارملا دیوی! تم سمجھ گئی ہو گی کہ "جائز خوراک" کا کیا مطلب ہے) نہیں ملتی تو خون میں حدت پیدا ہو جاتی ہے۔ حدت کا مطلب گرمی نہیں بلکہ خون میں "بھڑکن" یا "جلن" کے ہیں۔ پھر آگے پیچھے بے خوابی۔ بد خوابی۔ پیشاب میں جلن۔ داد۔ کھاج۔ درد گردہ۔ ہسٹریا کے دورے۔ سکتہ۔ رتوندا اور ایسی ہی بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ معدے میں تیزابیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر اس کا علاج ٹھیک سے نہیں ہوتا تو پھر آخر عمر میں برص کا روگ لگ جاتا ہے یہ درگت ان عورتوں کی ہوتی ہے جو بد چلن نہیں بلکہ نیک رہتی ہیں۔ لیکن جو عورتیں اپنے کو مرد سے نہیں بچا پاتیں۔ ان کے بارے میں ڈاکٹروں کی رپورٹ یہ ہے۔

(۴) جو بن بیاہی عورتیں کہیں خوشی سے، کہیں مجبوری سے مرد سے مات کھا جاتی ہیں اور تجربہ کاری کی وجہ سے پاؤں بھاری کر لیتی ہیں تو وہ اس ناجائز اولاد کو قبل از وقت ضائع کرتی ہیں۔ ضائع کرنے میں ان کی صحت ہمیشہ خراب ہو جاتی ہے

(۵) جو عورتیں ایک شوہر کے خوف کے مارے بن بیاہی زندگی بسر کرنے لگتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ مردوں سے وہ خاص لطف حاصل کریں جس کا حق دار شریف سماج میں شوہر کو حاصل ہے۔ وہ پھر ایک مرد پر قناعت نہیں کرتیں۔ ان کی حالت ایک رنڈی کی طرح ہو جاتی ہے۔ پھر وہ سارے روگ جو رنڈیوں میں ہوتے ہیں۔ ایسی بن بیاہی بدکار عورتوں کو بھی لگ جاتے ہیں ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ پہلے خیالات خراب ہوتے ہیں۔ خیالات آزاد ہونے سے زندگی میں آزادی آتی ہے پھر مختلف مردوں کے میل جول سے سب سے پہلے خون میں گرمی اور تیزی پیدا ہوتی ہے۔ پھر راتوں کی نیند حرام ہوتی ہے۔ اس کے بعد جسم پر روگوں کا حملہ ہوتا ہے۔ بدکار عورت سوزاک، آتشک اور گرمی دانوں جیسے خبیث روگوں میں گھر جاتی ہے۔ آنتوں کی سوزش حلق اور زبان تک ظاہر ہوتی ہے۔ پیاری ارملا میں شانتی کو بہت بہت سمجھایا اس نے میری ایک نہ سنی۔ آج کل وہ صرف دودھ پر گزارا کر رہی ہے۔ اس کی آنتوں میں دانے حلق اور زبان تک ہیں۔ اور ہاں! تمہاری وہ جو استانی ہیں۔ زیبا جہارانی۔ ان کو ابھی حال میں تم نے دیکھا یا نہیں۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئیں اور ساری جسم سفید۔ خون کا نام نہیں۔ وہ نوکری سے الگ کر دی گئیں۔ بڑا برا حال ہے ان کا۔ کچھ بے چاری کو سمجھو۔ تم اچھا خاصا کما رہی ہو۔

(۶) بن بیاہی عورت چاہے جیسی نیک ہو، اسے کوئی بھولے کی عورت نہیں سمجھتا اچھے لوگ اپنی بہو بیٹیوں کو اس سے ملنے نہیں دیتے۔ سماج میں بن بیاہی عورت کی عزت نہیں ہوتی۔ لوگ ان کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ بیاہی عورت پر کسی کی ہمت نہیں کہ بدنظر ڈالے لیکن بن بیاہی عورت پر جوان مرد بری نظر تو ڈالتے ہی ہیں۔ بچے اور بوڑھے سبھی ان کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ پھر یہ کہ نہ ان کا کوئی رشتہ دار، نہ ان کا کوئی گھر والا، نہ کوئی غمخوار۔ ہماری ارملا دیوی! یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے سب سچ ہی سچ ہے تم چاہو تو ڈاکٹروں

سے پوچھ لو۔ تم چاہو تو ساری ہڑتال کرنا ماننے کو گواہ بنا لو۔ پھر اگر تمہارا فیصلہ ہو کہ لڑکی
تو میں بڑے اچھے مشورے دوں گی۔ تم کو یاد دلا دوں گی کہ پچھلے سال جب تم میرے سکول
بن کر آئی تھیں اور دس بجے رات کو میرے گھر بلا چون کو کر یہ کر تم نے کہا تھا۔ بکا عشق
جیسے بھابی ہیں ایسے ہی سب مرد ہوتے ہیں!
یاد ہے کچھ۔ میں تمہارے بھابی کو تمہارا بھابی بتایا ہے۔ کیسے؟ یہ تو اسی وقت
بتاؤں گی جب تم بیاہ کے لئے تیار ہو گی اور اپنے لئے بر تلاش کرنے میں مجھ سے مشورہ
لو گی۔ اچھا بس ڈھیروں آشیرواد۔

اسے توڑ کیوں نہیں دیتے!

پیارے مورخ! یہ ہے تمہارا قلم، لو اور تاریخ لکھو!"
"مجھے پریشان نہ کرو!" مورخ جیل کے پھاٹک سے ٹیک لگا کر بیٹھ
گیا اور اونگھنے لگا۔
جنتا گھبرا گئی کہ اگر مورخ سو گیا تو تاریخ کون لکھے گا۔ اس نے مورخ کو جھنجھوڑا۔
"پیارے مورخ! تاریخ ادھوری رہی جا رہی ہے"
"تو میں کیا کروں؟" مورخ نے کہا "تاریخ کو باہر لاؤ تو لکھوں"
"تاریخ کہاں بند ہے؟" جنتا نے پوچھا۔
"مورخ بولا۔ اس پھاٹک کے اندر۔ اسے توڑ کیوں نہیں دیتے!" یہ کہہ کر مورخ سو گیا۔
پھر جنتا نے تاریخ کو کس طرح آزاد کرایا، یہ جاننے کے لئے سعیدہ کی عظیم کہانی "آنند مٹھ"
پڑھئے۔ مقامی بکسیلروں سے طلب کیجئے یا براہ راست ہمیں لکھئے۔ قیمت ایک روپیہ (ایمرجنسی...)

۲۸۱ افراد پر مشتمل

افریقہ کا ایک قبیلہ اب بھی دنیا والوں سے الگ تھلگ ہے

وسطی افریقہ کے جنگلوں میں حال ہی میں ایک ایسے قبیلے کا سراغ ملا ہے جو اب تک بیرونی دنیا سے بالکل کٹا ہوا تھا اور جس کے باسی عہد جدید سے ناآشنا تھے وسطی افریقہ میں واقع اس علاقے کا نام کیرل ہے ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ قبیلہ تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا ہے۔ اس علاقہ کا یہ سب سے پرانا قبیلہ ہے۔ اب اس کے ارکان کی تعداد صرف ۲۸۱ رہ گئی ہے لیکن خود اس قبیلہ کے لوگوں کو اپنی نسل کے خاتمے کے امکان سے ذرہ برابر تشویش نہیں ہے۔ اس قبیلہ میں شرح پیدائش بہت کم ہے۔ اس قبیلہ کے لوگ موت سے نہیں ڈرتے بلکہ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں کیونکہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ موت زندگی کی مشقتوں سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ جب اس قبیلہ کا کوئی شخص مر جاتا ہے تو اسے دفن کرتے وقت یہ کہا جاتا ہے کہ "اب تم روزانہ روٹی کے غم سے آزاد ہو گئے" اور مرنے والے کو چاہے وہ عورت ہو یا مرد ہمیشہ کے لیے فراموش کر دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ مردے کو دفن کرنے کے سلسلے میں کسی اصول یا قاعدے کے پابند نہیں ہیں لیکن یہ لوگ ان جگہوں کو ضرور یاد رکھتے ہیں جہاں کسی کو دفن کیا گیا ہوتا ہے اس قبیلہ میں زیادہ اموات جنگلی درندوں کے حملوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ شکار کے لئے لوگ تیر کمان استعمال کرتے ہیں۔ وہ اچھے نشانہ باز بھی ہیں لیکن ہاتھیوں شیروں اور دوسرے جنگلی درندوں کے سامنے بے بس ہیں۔ جب کوئی جنگلی درندہ ان پر حملہ آور ہوتا ہے تو

تندرست مرد تو درختوں پر چڑھ جاتے ہیں لیکن عورتیں اور بچے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں اور عام طور پر جنگلی درندے انہیں کو شکار کرتے ہیں اس قبیلے میں عورتوں کی تعداد کم ہے۔ اس لئے مرد اپنی بیویوں کو نعمت سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ خاندانی منصوبہ بندی کے اصول پر عمل کرتے ہیں اور ایک خاص قسم کے درخت کے پتے اور پھل استعمال کرتے ہیں تاکہ حمل قرار نہ پائے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قبیلہ پتھر کے زمانے کا ہے۔

سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ کیرل کے جنگلی اس قبیلہ کے وجود کا علم ۱۹۷۴ء سے پہلے کسی کو بھی نہ تھا۔ یہ قبیلہ پانچ حصوں میں بٹا ہوا ہے اور ہر حصہ کا ایک سردار ہوتا ہے اور ایک حصہ کے لوگ دوسرے حصے کے لوگوں کے علاقوں کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ مہذب لوگوں کی طرح یہ لوگ لالچی اور خود غرض نہیں ہیں۔ یہ لوگ شہد اور دوسری جنگلی اشیاء فروخت کرتے ہیں۔ دوسرے قبیلوں کے مقابلہ میں یہ لوگ گورے اور تندرست ہوتے ہیں۔ ان کے بال گھنگرالے ہوتے ہیں اور عورتیں کافی پُرکشش ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک نوجوان عورت کے سینے پر ایک بیوپاری نے ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی جسے ہلاک کر کے اس قبیلے کے لوگوں نے ایک ندی میں ڈال دیا تھا۔

کچھ عرصہ قبل تک اس قبیلہ کی عورتیں اور مرد بالکل ننگے رہتے تھے اور صرف درخت کی چھالوں اور جانوروں کی کھالوں سے اپنے جسم کے مخصوص حصوں کو چھپاتے تھے لیکن مہذب دنیا سے رابطہ قائم ہونے کے بعد اب کچھ لوگوں نے لنگوٹی باندھنا شروع کر دیا ہے۔

ایسے تھے بہادر سرھے

جون ۱۹۸۰ء کی بات ہے میں اپنے گھریلو معاملات سے سخت پریشان تھا۔ زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ میرے چاروں لڑکے آپسی نااتفاقی کے کارن مجھ سے بھی کچھ گستاخی سے پیش آنے لگے تھے۔ بڑے لڑکے اور بڑی بہو کا رویہ مجھے سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ انھوں نے مجھ سے تلخ کلامی بھی کی تھی جس کا میرے دل پر بڑا اثر تھا۔ ہر وقت غصے میں بھرا رہتا تھا۔ دل میں اپنے لڑکوں کی بدسلوکی کے کارن میں عجیب عجیب ہولناک پروگرام سوچ رہا تھا۔ ایک دن میرے ایک ہم عمر دوست نے بتایا کہ برہم پورہ گھاٹ پر ہردوار سے ایک ننگ مہاتما آئے ہیں وہ درشن کے قابل ہیں۔ ان کے درشنوں سے من کو بڑی شانتی ملتی ہے۔ غصے میں آدمی کو کوئی بات اچھی نہیں لگتی۔ اس لئے پہلے تو میں نے اپنے دوست کی یہ بات ان سنی کر دی۔ لیکن بعد میں سوچا ان دنوں میرے لئے سخت پریشانی کا وقت ہے۔ ہو سکتا ہے ان مہاتما کے درشنوں سے مجھے کچھ تسکین مل جائے۔

اگلے دن اتوار تھا۔ میں اپنے دوست کے ہمراہ برہم پورہ گھاٹ پہنچا۔ مہاتما سے اپنی مشکل بیان کی۔

مہاتما بڑی شانتی سے میری باتیں سنتے رہے۔ جب میں اپنی سنا کر چپ ہو گیا تو بولے ارے بھائی! آپ نے کئی بار دیکھا ہوگا سبزی چھیلتے دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھری بائیں ہاتھ کی انگلی کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ میں نے کہا: جی ہاں ایسا ہوتا ہے۔

"اور کئی بار اپنے داہنے ہاتھ کی ہتھوڑی
بائیں ہاتھ پر جا لگتی ہے؟"
"بالکل ٹھیک"
"اور کئی بار اپنے ہی دانت اپنی زبان کو
کاٹ دیتے ہیں"
"جی"
"کئی بار اپنی انگلی اپنی آنکھ میں چبھ جاتی
ہے"
"ہاں جی کئی بار ایسا ہوتا ہے"
"اور جب ایسا ہوتا ہے تو آپ اپنے
دائیں ہاتھ کو جو بائیں کو زخمی کرتا ہے یا اپنے
دانتوں کو جو آپ کی زبان کو کاٹ کھاتے
ہیں کیا سزا دیتے ہیں؟"
"کچھ نہیں مہاراج"
"کیوں؟"
"اس لئے دایاں بایاں ہاتھ دونوں
اپنے ہیں۔ دانت اپنے اور زبان بھی اپنی۔
انگلی اپنی اور آنکھ بھی اپنی۔ کس پر غصہ کیا جائے
اور کس کو سزا دی جائے؟"
"تو راجہ جی اچھا تھا جی مسکرا کر کہنے لگے
"اسی طرح آپ کے بالک بھی آپ کے
جو آپ ہی کے ہیں۔ آپ ہی کے جسم کا حصہ
ہیں۔ آپ ان پر معمولی معمولی باتوں پر ناراض
کیوں ہوتے ہیں اور انہیں سزا دینے کی
کیوں سوچتے ہیں؟"
مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ یکدم آنکھیں
کھل گئیں۔ اس دن کے بعد میرے رویے میں
غیر معمولی تبدیلی آگئی اور جن کا مجھے پہلے کبھی
سے مجھے شکایت تھی ان کا مزاج بھی بدل
گیا۔ اگر ہم اپنے پریوار کے بارے میں بلکہ سارے
سنسار کے بارے میں ایسا سوچنا شروع
کردیں تو زندگی صحیح طور پر خوشگوار ہو جائے
(کشن لال آہوجہ راجہ گارڈن دہلی)

اقوال زریں!

• جو نقصان پر صبر کرتا ہے خدا اس کو اجر دیتا ہے۔

• یقین دل میں رکھنے کی چیز ہے۔

• جو اپنے لئے جائز نہیں وہ دوسروں کے لئے بھی جائز نہ سمجھو

طاہرہ فہد فلاحی

مدرسہ نسواں بلریا گنج کے ایک جلسہ میں مولانا سید حامد علی کی ولولہ انگیز تقریر

آج ۲۹ر نومبر ہے۔ مدرسہ نسواں جامعۃ الفلاح طالبات و معلمات اور قصبہ کے معزز خواتین سے بھرا ہوا ہے۔ دین کو غالب کرنے کا جذبہ اسلام کے لئے مرمٹنے کی تڑپ اور خدمت انسانیت کے لئے کام کرنے کی اُمنگ ہر ایک کے دل میں اُمڈ رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چند بے مایہ خواتین و طالبات یہاں روحانی خوراک لینے آئی ہیں اور پھر یہاں سے لوٹ کر پوری آمادگی، جوش و جذبہ اور ہمت و جرأت رندانہ کے ساتھ سرگرم عمل ہو جائیں گی اور ایسا کیوں نہ ہو کہ آج تحریک اسلامی ہند کا ایک عظیم فرزند ان سے خطاب کرنے جا رہا ہے؟ دلوں میں جذبۂ خدمت دین انگڑائی کیوں نہ لے کہ آج وہ ہندوستان میں تعلیم و تربیت جیسی اہم ذمہ داری پوری کرنے کے لئے

قواعد و اصول سیکھنے آئی ہیں۔ آج مولانا سید حامد علی صاحب کا خطاب ہے وہ اپنی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کو اسلام کا پیغام پہونچانا چاہتے ہیں۔ انھیں ان کی ذمہ داری اور امور خانہ کے فرائض سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں وہ آج بتائیں گے کہ اسلام میں خواتین کی کیا اہمیت ہے؟ اسلام نے انھیں کتنی اہم ذمہ داری عطا کی ہے؟ انھیں عزت و رفعت کے کس رفیع منزلت تک پہونچایا ہے؟ موجودہ الحادی اور منکر خدا دنیا میں ان کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ بچوں کی تربیت اور معاشرہ کی اصلاح و تعمیر میں انھیں کیا رول ادا کرنا چاہیے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو آج ہر مسلم طالبہ اور خاتون کے سوچنے کے ہیں۔ اس لئے کہ انھیں پر ساری دنیوی و اخروی فلاح کا انحصار ہے۔ انھیں

کی بنیاد پر ہم اصلاح معاشرہ اور تطہیر ماحول کی ذمہ داری نبھا سکتی ہیں اگر ہم ان کے جوابات تلاش کرنے میں صحیح و راست رہیں تو توقع ہے کہ ہمارا قدم بھی صحیح ہوگا اور اگر اس پہلے ہی مرحلہ میں ہم راہ راست سے ہٹ گئیں تو ع

تا ثریا می رود دیوار کج

اس لئے میں چاہتی ہوں کہ مولانا سید حامد علی صاحب کی ندریں نصیحتیں ہماری تمام "حجابی بہنوں" کے سامنے آجائیں۔ الفاظ تو میرے ہیں لیکن احساسات و جذبات افکار و خیالات سب مولانا کے ہیں۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنون
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں

محترم ماؤں، بہنوں اور بیٹیو!
یہ محض اللہ کا کرم ہے کہ آج اس نے ہم سب کو اکٹھا ہونے اور دین کی سیکھنے کی توفیق دی۔ اس پر ہم اس کا جتنا بھی شکر ادا کر دیں کم ہے اور حقیقت یہ ہے اس نے ہم پر اتنے احسانات کئے ہیں کہ اگر ہمارا رواں رواں اس کی حمد و تسبیح میں مصروف لگا رہے اور یہی ہمارا شب و روز کا وظیفہ حیات ہو جائے تب بھی ہم اس کا حق ادا نہیں کر سکتے یہاں تک کہ اگر ہم اس راہ میں جان بھی دے دیں تو بھی کوئی خاص کارنامہ نہ ہوگا کیونکہ

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اللہ کے ان بے پایہ احسانات کا تقاضا ہے کہ ہم زندگی میں اسی کی اطاعت کریں اسی کو لائق عبادت اور قابل تعظیم سمجھیں۔ اسی کے احکام و قوانین کو اپنی زندگیوں میں نافذ کریں۔ اس کی پسند ہماری پسند ہو۔ اس کی ناراضگی کا خوف ہمیں برائیوں کے قریب نہ جانے دے۔ ہم ازدواجی زندگی گزار رہے ہوں، بچوں کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ ہو، معاشرے کی اصلاح و تعمیر کا کام کرنا ہو،

ہر عمل کو پاکیزہ بنانے کا مقصد کہ عبادت حقیقی
رکھنے کی ذمہ داری ہو۔ غرضیکہ ہر حالت میں
ہم قرآن حکیم کو اپنے لئے لائحہ عمل بنائیں اسی
کی روشنی سے اپنی زندگیوں کی تاریکیاں دور
کریں۔

معزز ماؤں اور بہنو! آپ تاریخ اسلام کا
مطالعہ کریں گی تو معلوم ہوگا کہ اسلام نے عورت
کی بہت اہمیت دی ہے۔ انھیں ذلت و پستی
کے گڑھے سے نکال کر عزت و رفعت کے قصر
رفیع تک پہنچا دیا ہے۔ انھیں اسلامی سوسائٹی
اور مسلم تہذیب کا ایک پہیہ قرار دیا ہے جس
کے بغیر تہذیب و تمدن کی گاڑی آگے نہیں
بڑھ سکتی۔ انھیں حقوق مساوات عطا کی ہے
مال و جائیداد اور تمام معاشی حقوق عطا
کئے ہیں البتہ جو تھوڑی سی پابندیاں عائد
کی ہیں تو اس لئے نہیں کہ ان کی آزادی
چھیننی مقصود ہے بلکہ اس لئے کہ یہ نادان
انسان اپنی حماقت سے خود اپنے ہی پیروں
پر کلہاڑی نہ چلا لے اور تاکہ اس کی آزادی
بھیڑیوں کی دست برد سے محفوظ رہے۔

تحریک اسلام کا کام کرنے والوں کو بھی
خواتین کو بہت اہمیت دینی چاہئے اس لئے
کہ ہم آپ کی مکمل معاونت و تعاون کے بغیر منزل
مطلوب تک نہیں پہنچ سکتے۔ آپ کو معلوم
ہے کہ حضورؐ کی دعوت توحید پر سب سے پہلے
لبیک کہنے والی ایک معزز خاتون تھی۔ خدا کی
راہ میں شہادت حاصل کرنے کی سعادت سب
سے پہلے ایک عورت کے حصہ میں آئی حبشہ
کی طرف ہجرت کرنے والوں میں عورتیں
بھی تھیں۔ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں
نے بھی دین حق کی راہ میں مصیبتیں جھیلیں انھیں
بھی مال و دولت، اعزا و اقربا اور ملک و وطن
کو خیر باد کہنا پڑا۔ مکہ کے مہاجرین میں عورتوں
نے بھی بھاری تعداد میں شرکت کی وہ اپنی
مثال آپ ہے۔ پھر غزوات میں عورتوں
نے بھی محنت و جدوجہد کے ساتھ زخمیوں
کی مرہم پٹی کی۔ انھیں پانی پلایا شہادت کے
حصول کے لئے مردوں کو للکارا۔ انھیں بے غیرت
بزدل بنا اور بھگوڑا کہہ کر ان کی بے غیرتی کا طعنہ
دیا بلکہ یہاں تک کہ [illegible] حضورؐ کے

کے کارنامے عمل مؤرخوں کے لئے ہیں۔ یہ سب
کارنامے دنیا کی اور کسی قوم کی تاریخ پیش کر سکتی
ہے۔ طرابلس کی جنگ میں ایک عرب
دوشیزہ فاطمہ بنت عبداللہ غازیوں کو پانی
پلاتے ہوئے شہید ہو گئی۔ اقبال نے کس
قدر کے ساتھ اسے خراج عقیدت پیش کیا ہے

فاطمہ! تو آبروئے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

آپ چاہیں تو قوم کی تقدیر بدل سکتی ہیں
ایک زمانہ وہ تھا جب آپ جیسی ہی اسلام
پسند خواتین نے [illegible] سے خالد بن ولید
طارق بن زیاد، عبداللہ بن زبیر، موسیٰ
بن نصیر، محمد بن قاسم اور محمود غزنوی
جیسے جانباز سپوت جنم دئے تھے۔ انھوں
نے اپنی چھاتیوں سے صرف دودھ ہی
نہیں پلایا تھا بلکہ آزادی، مساوات، حریت
و خودداری اور غیرت و حمیت کے جذبات
کے [illegible] کے ملی

[illegible]
کی آغوش میں پل کر قوم کے سردار، ملت اسلامیہ کے پاسبان
اور اسلام کے مجاہدوں کی پرورش کرتی تھیں
عالم طفلی میں وہ ساری سختیاں صرف اس لئے
برداشت کرتی تھیں کہ ان کا بچہ بڑا ہو کر پرچم
اسلام کو لہرائے گا اور طاقت کو جھکا کر حق کو
بلند و بالا کرے گا۔ آج بھی اگر ہم چاہیں تو ملت
کا کھویا ہوا وقار واپس آسکتا ہے۔ جب تک
ہماری قوم میں فاطمہ بنت خطاب، عائشہ صدیقہ
خدیجہؓ جیسی بیوی اور صفیہؓ جیسی خواتین نہیں
پیدا ہوں گی، ہم اسلام کی اس کھوئی ہوئی
عظمت واپس نہیں لا سکتے۔ سب سے اہم
کام یہ ہے کہ آپ اپنے بچوں کو اسلام کے
ہوئے اصول و اقدار کی روشنی میں ایک
مومن و مسلم بنانے کی کوشش کریں۔ آپ
کا گھر ایک ایسا قلعہ ہو جہاں سے نکلیں تو
راہ حق کے سپاہی بن کر نکلیں۔ آپ کا خاندان
ایک ایسا خاندان ہو جہاں سے دین و ایمان
کی دولت حاصل کر کے قوم کے سر بلند
[illegible] غرضیکہ آپ کی تربیت اچھی

اور جاندار ہوکر آپ کا بچہ دنیائے حرص و
ں میں خدا کا بندہ بن کر رہ سکے اور دین
کی پوری خدمت کرسکے۔

پھر دوسرا کام یہ ہے کہ آپ اپنے اندر
ے تمام بدعات و خرافات اور توہم پرستی
ے جراثیم نکال کر پھینک دیں۔ خدا پر کامل ایمان
ں اس کے رسول کی سنت صحیحہ پر عمل کرنے
کوشش کریں اور غیر اللہ کی اطاعت ہرگز
کریں۔

پھر آخر میں سب سے زیادہ ضروری
ت یہ ہے کہ آپ اپنے دائرہ کار میں رہتے
دے حق کی قولی و عملی گواہی دیں۔ ایک
رف آپ اپنی زبان سے لوگوں کو دین کی
تیں بتائیں اور دوسری طرف آپ کا کردار
ا تین کا آئینہ ہو۔ آپ کے قول و عمل میں
رنگی نہ ہو بلکہ کامل موافقت ہو۔ آپ خود بھی
ین پر عمل کریں اور اپنے احباب و متعلقین اعزا
و اقربا، اور تمام پاس پڑوس میں رہنے والوں
کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دیں۔ اگر آپ
اتنا کام کرلیں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا
ہوں کہ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائیگی
شبنم افشانی تری پیدا کریگی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہوجائیگی
پھر دلوں کو یاد آجائیگا پیغام سجود
پھر جبین خاک حرم سے آشنا ہوجائیگی

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

جلد بازی

چچا میاں. السلام علیکم. آپ میرا یہ مضمون حجاب میں چھاپ دیجئے. بڑا مزیدار ہے. مجھے مضمون لکھنا نہیں آتا ہے. میں سیدھے طور پر جیسا سامنے دیکھا لکھ رہی ہوں. میں نہ اپنا نام لکھ رہی ہوں، نہ اپنے ابا اور امی کا. میں چاہتی ہوں کہ کوئی مجھے جان نہ سکے. میرے ابا اماں بھی نہ جان سکیں. مجھے یاد ہے کہ آپ نے کبھی "محترمہ کوئی"... کے نام سے کچھ مضمون چھاپے تھے. بس میرے مضمون پر "کوئی" ہی لکھ دیجئے گا. والسلام.... آپ کی بھتیجی "کوئی"

(۱) ایک دن کی بات ہے. ہم سب ایک ساتھ بیٹھے صبح کے وقت ناشتہ کر رہے تھے میرے بھائی، بہن بھی تھے. ابا تھے. امی سب کو ناشتہ اور چائے دے رہی تھیں. امی کچھ جلدی میں تھیں. جب ہم سب ناشتہ کر چکے تو ابا بیٹھے رہے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے. امی جلدی میں تھیں نا! تو انھوں نے اکتا کر کہا. "اب ہلو یہاں سے"

ابا جان جس جگہ بیٹھے تھے، وہیں بیٹھے بیٹھے ہلنے لگے. دائیں بائیں آگے پیچھے بدن کو ہلانے لگے. ہم سب دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئے کہ یہ کیا حرکت ہے پھر ہم سب ہنسنے لگے امی نے ابا کو ہلتے اور جھومتے دیکھا تو بولیں "یہ ہل کیوں رہے ہو" ابا جان نے کہا کہ تم نے ہی تو کہا تھا "اب ہلو یہاں سے. تو میں ہل رہا ہوں"

یہ سن کر امی اور ہم سب ہنسنے لگے!

پھر ہم سب بھی جاگے اور جھومنے لگے۔ امی جان
نے ہنس کر کہا کہ اچھا لو میاں سے۔ ابا جان
اٹھ کر چلے گئے۔ اس دن سے امی جان
نے کسی سے یہ نہیں کہا کہ یہاں سے ہلو۔

کہیے چچا میاں، مزہ آیا نا! اسی طرح کی
ایک بات اور سنیے:

(۲) ایک دن، ہاں جاڑوں کے دن
تھے۔ نصیرہ آپا آئی تھیں۔ رات کے وقت
عشاء کے بعد ہم نے ان سے کہانی کی فرمائش
کی۔ وہ کہانی سنانے لگیں۔ ہم سب آس
پاس بیٹھ گئے۔ ابا جان امی کے پاس بیٹھے
تھے۔ کہانی سننے میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔ اچانک
امی نے ابا جان سے کہا۔ اوہو، تو میرے
گدوں میں کیوں گھسے چلے آ رہے ہو۔
ابا جان نے جواب دیا کہ بھئی واہ! میں تو
تمہارے دل میں گھسنے کی کوشش کرتا ہوں
اور تم ہو کہ گدوں میں گھسا رہی ہو۔

یہ سن کر بھی ہم سب ہنس پڑے۔

اب تیسری بات سنیے:

(۳) ایک دن ابا جان نل سے پانی لا کر
گھڑوں میں ڈال رہے تھے۔ جب گھڑے پانی
سے بھر گئے تو امی نے کہا۔ سنتے ہو ابا جان
بولے، بالکل سن رہا ہوں!

امی جان نے پھر کہا کہ پانی بھر چکے؟ ابا جان
نے جواب دیا۔ ابھی تو نہیں۔ اب ہم سب
کو اور امی کو بھی حیرت ہوئی کہ گھڑے تو بھر گئے
اب کیا بھریں گے۔ لیکن ابا جان کا اپنا جملہ
سنیے: بولے۔ ابھی تو نہیں۔ پندرہ برس
سے تمہارا پانی بھر رہا ہوں اور عمر بھر بھرتا
رہوں گا!

امی جان سن کر مسکرا دیں۔ ہم سب بھی
مسکرا دیے۔ چچا میاں! آہا! ابا جان کا جملہ
کتنا اچھا لگتا ہے نا! اچھا، اور سنیے:

(۴) ایک دن ابا جان بیٹھے ہم سب کو
پڑھا رہے تھے۔ اچانک امی جان چیخیں۔ ہائے
گڑیا کو مار کے ڈال دیا!

چچا میاں! گڑیا ہماری ننھی سی بہن ہے
اسے سعید نے پیٹ دیا تھا۔ ابا جان نے جو
امی کی چیخ سنی تو گھبرا گئے۔ پوچھا، کس نے مار
ڈالا؟ اور پھر اِدھر دیکھا۔ امی گڑیا کو چپ

کرنا بھی اور دوسری ہی ۔ ابا جان نے کہا۔ تم نے گھر دیا ہم کو کرنا [illegible]

ہم سب سمجھ گئے کہ ماننا اور سمجھنا میں کیا فرق ہے۔ چچا میاں! اس طرح کے لطیفے اور ابا جان میں ہوا کرتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو اور لکھ کر بھیجوں۔ ہمارے آبا جان اصلاح پر بہت زور دیتے ہیں۔ آپ اس کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ آپ یہیں خواہ مخواہ لکھنے کا اور الفاظ لکھے گا اور میرے اسکول اور رشتوں کے پتے پر لکھنے کا الفاظ ابا کے ہاتھ میں دے دیجئے۔ سمجھ گئے آپ! اچھا السلام علیکم۔ میرے اسکول کا پتہ ہے......

کہیں یہ مطلب نہ لیجئے گا کہ میرا پتہ لکھ دیا۔ اچھا میرے اچھے چچا میاں۔ والسلام

جواب: عزیزہ [illegible] صاحبہ وعلیکم السلام۔ آپ اپنے ابا جان کے ایسے لطیفے ضرور لکھ کر بھیجئے بلکہ ایک کام کیجئے۔ آپ اس سلسلے میں جو کچھ بھی لکھیں وہ اپنے ابا امی کو ضرور دکھا دیا کریں۔ دیکھو منی گھر کی ہر بات باہر والوں کو نہیں بتائی جاتی۔ گھروں میں ہر طرح کی باتیں ہوتی ہیں ان میں سے وہ باتیں بیان کرنا چاہئے جن سے کوئی اخلاقی اور تربیتی فائدہ ہو، کوئی ادبی یا اصلاحی فائدہ ہو، کوئی تفریحی فائدہ ہو۔ میں نے آپ کے ابا کی باتوں میں سے جو باتیں قابل اشاعت نہیں تھیں ان کو نکال دیا

دوسری بات یہ ہے کہ آپ میری فہرست میں نام دیجئے تاکہ ابا جان دادا جان [illegible] تو یہ سارے واقعات وہ پڑھیں گے تو کیا حال دیکھیں گے۔ آپ ابھی بچی ہیں اس لئے سمجھتی نہیں کوئی بات سمجھ سکے گا کہ [illegible] کون ہیں۔ آگے جب [illegible] آپ کبھی کی [illegible] نہ دیتے۔ کچھ سمجھیں گا۔ سمجھیں آپ!

بہت سی بچیاں ہم سے پوچھا کرتی ہیں کہ کہانیاں کیسے لکھیں۔ ان سے پہلا کہنا یہ ہے کہ آپ اپنی دیکھی سنی باتیں لکھ کر [illegible] ہمارے پاس بھیجا کریں۔ کہانیاں لکھنے کی ابتدا اسی طرح ہوتی اس طرح لکھنے سے آپ [illegible] (۳)

محمود شیت خطاب

حرام و حلال روزی

اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے۔ (قرآن)

سورہ بقرہ کی یہ آیت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ایک طرف تو ریاضی دانوں اور اعداد و شمار کے ماہرین کو حیرت میں ڈال دیا ہے اور ان کے نظریات کو یکسر باطل قرار دیا اور دوسری طرف یہی آیت مسلمانوں میں دینی جذبات پیدا کرتی ہے اور انھیں سعادت و اطمینان کی دولت سے نوازتی ہے۔

عددی منطق اور حساب و کتاب کرنے کا آلہ (کمپیوٹر) اس طرح حساب لگاتا ہے کہ اگر کوئی شخص مثلاً ایک ہزار پونڈ کا مالک ہو پھر وہ اس رقم کو کسی دوسرے کو دے دے یا ایسے بنک میں جمع کر دے جہاں سے اسے سالانہ فی صد ۵ پونڈ سود ملتا ہے تو اس کو ایک ہزار پونڈ پر ہر سال ۵۰ پونڈ سود رقم ملے گی۔ اس طرح اس کی رقم جو صرف ایک ہزار تھی اب بڑھ کر ایک ہزار ۵۰ پونڈ ہو جائے گی۔ دوسری صورت میں اگر اسی مقدار کی رقم کا مالک کوئی مسلمان ہو اور وہ ہر سال چالیسویں حصہ کے اعتبار سے ۲ ½ فی صد زکوٰۃ نکالتا ہے۔ اس طرح ہر سال اپنی رقم ایک ہزار پونڈ سے ۲۵ پونڈ زکوٰۃ میں نکالے گا تو اس کی وہ رقم جس کی مقدار ایک ہزار تھی سال بھر کے بعد ۹ سو ۷۵ رہ جائے گی اور اگر زکوٰۃ کے ساتھ یہی شخص صدقہ کے طور پر بھی مثلاً ۷۰ پونڈ نکال دے تو اب اس کی رقم صرف ۹ سو پونڈ بچے گی حالانکہ وہ اس سے پہلے ایک ہزار پونڈ تھی۔

لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد منطق علمار ریاضی کے فلسفے اور حساب کرنے والے آفات کے نتائج کو جھٹلا دیتا ہے اور تلخ حقائق بھی ان چیزوں کی تکذیب کرتے ہیں۔ ہر وہ شخص جسے زندگی کے بارے میں کچھ تجربہ ہے۔ وہ بہت سے ایسے واقعات بیان کر سکتا ہے جو ان کے اعداد وشمار کو باطل قرار دینے کے لئے کافی ہوں گے۔ کیونکہ یہ تجربہ اور حقائق صرف مسلمانوں ہی کے نقطہ نظر سے مسلم نہیں ہے بلکہ غیر مسلموں کے نزدیک بھی مسلم ہے۔

جو شخص مال حرام کا عادی ہوتا ہے اور حرام چیزیں اس کی خوراک بنتی رہتی ہیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے دنیا ہی میں مال واولاد کے فتنے یا صحت وعقل کی خرابی میں مبتلا فرما دیتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ

حرام کی عادت صرف سود ہی میں منحصر ہو کر نہیں رہ جاتی بلکہ تجاوز کر کے ہر اس صورت کی خوگر ہو جاتی ہے جس میں مال حرام حاصل کیا جا سکتا ہو، خواہ رشوت ودھوکہ دفریب کی صورت سے ہو یا ذخیرہ اندوزی ونفع خوری سے ہو یا جائز ناجائز خرید وفروخت اور جوئے کے ذریعے ہو یا بغیر اجرت کام اور بلا عوض چیز لینے کی صورت میں ہو یا اس کے علاوہ اور دوسرے طریقوں سے ہو۔

مال حرام کے عادی اور اس کے پسند کرنے والوں کے واقعات پیش کرنا چاہوں تو کافی تفصیل درکار ہوں گی۔ یہاں چند واقعات پر اکتفا کرتا ہوں۔

- میں ایک ایسے تاجر کو جانتا ہوں جس نے چند سال سودی کاروبار کیا اور خوب مالدار ہو گیا۔

یہ سود خور تاجر گائے بکریوں کے تاجروں کو روپے قرض دیا کرتا تھا۔ اتفاق سے موصل کے علاقہ میں ۱۹۲۵ء میں بے انتہا

بہت بڑی بیماری پھیلی جس کی وجہ سے ساری گائیں
بکریاں ختم ہو گئیں، سارے تاجر مفلس ہو گئے
سودی معاملہ کرنے والے شخص سے جس
نے ایک بڑی رقم لے کر سود پہ ان تاجروں
کو قرض دیا تھا۔ مطالبے شروع ہوئے
جس کی ادائیگی سے وہ قاصر رہا۔ عدالت
نے اسے دیوالیہ قرار دیا۔ تاجر پر صدمہ
برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے فالج کا اثر
ہو گیا۔ اب وہ خانہ نشین تھا۔ نہ اس کی
عیادت کو کوئی جاتا نہ اس کی خیریت کوئی
پوچھتا۔ کچھ ہی دن بعد فقر و فاقہ کی نوبت
آگئی۔ اس نے اپنے بعض رشتہ داروں سے
مدد چاہی لیکن نہ کسی رشتہ دار نے
اسے پوچھا اور نہ کسی دوست نے مدد کی
حتیٰ کہ اس کے جنازے میں صرف اس
کے لڑکے تھے اور وہ لوگ جنہیں ان لوگوں
نے جنازہ اٹھانے کے لئے کرایہ پر بلایا تھا۔
جنازہ ایک مسجد میں لے گئے تو امام نے
نماز پڑھانے سے انکار کر دیا۔

○ اسی طرح میں ایک اور شخص کو جانتا
ہوں جو سودی کاروبار کرتا تھا اس کے دو
لڑکے تھے ایک ڈوب کر مر گیا اور دوسرے
نے خودکشی کر لی، باپ اس صدمہ کی تاب
نہ لا سکا اور چند ہی دنوں میں مر گیا۔ اب اس کی
دولت کے وارث اس کے دور کے رشتہ دار
ہو گئے جنہوں نے اس مال کو اللہ کی نافرمانی
میں جا بجا خوب صرف کیا۔

○ اسی طرح ایک اور شخص تھا جو سود
خوری کی وجہ سے پاگل ہو گیا اور اپنی اولاد
و بیوی کے لئے مصیبت بن گیا۔ اس کے
لڑکے اسے مارتے پیٹتے اور بیوی ہر دم یہی
بددعا کرتی کہ کسی طرح یہ مر جائے۔

○ اسی طرح ایک پوری پارٹی تھی جن
کے درمیان شیطان نے ایک مختصر مدت
کے لئے اتفاق و اتحاد پیدا کر دیا۔ سب نے
مل کر ایک سودی بینک قائم کیا پھر ان میں
پھوٹ پڑ گئی۔ ان میں سے ایک کار کی
کی زد میں آکر مر گیا۔ دوسرا مرض سل میں مبتلا
ہو گیا اور بقیہ بھی اسی طرح مر گئے ان کی
اولاد کا بھی برا حال ہوا۔ کوئی قتل سے

ماری تو لگتا ہم ماری اور کوئی خرابی ہو جو
سب کے سب پورے معاشرے کے لئے
مصیبت اور بوجھ بن کر رہ گئے۔

سود خور کے ظاہری حالات سے ہرگز متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ ان میں سے اکثر یا تو کسی نہ کسی قسم کے جسمانی مریض ہوتے ہیں یا کوئی ایسا روگ لگا ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کی راحت حرام اور جینا دشوار ہوتا ہے جو قوم بھی سودی معاملات کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر سے برکت اٹھا لیتا ہے۔

مجھے مسلسل ایسے لوگوں کی تلاش رہی ہے جن کی روزی حلال ہوتی ہے۔ جس شہر میں بھی جاتا ہوں وہاں کے نیک لوگوں کے بارے میں ضرور پوچھتا ہوں ان سے مل کر مجھے خوشی ہوتی ہے ان کی نیکی کا اثر اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہوں جسے میں اپنے لئے بہت بڑا سرمایہ سمجھتا ہوں۔

اب میں ان لوگوں کے کچھ واقعات پیش کرتا ہوں، جن کے احوال میں صدق

زکوٰۃ نکالنے اور سود و حرام سے پرہیز کرنے سے اللہ تعالیٰ نے برکت عطا فرمائی ہے۔

شیخ محمد الرضوانی رح بہت بڑے بزرگ عالم تھے۔ زکوٰۃ پابندی سے نکالنے کے ساتھ اپنی دولت سے صدقہ کے طور پر اس قدر خرچ کرتے تھے کہ جیسے انہیں فقر و غربت کا اندیشہ ہی نہ ہو۔ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر جب کہ شہر موصل کو زبردست گرانی نے تباہ کر رکھا تھا۔

• وہ رات میں اپنی پیٹھ پر کھانے پینے کا سامان لادتے اور غریبوں کا دروازہ کھٹکھٹاتے، جب دروازہ کھلتا وہ سامان اندر ڈال کر رات کی تاریکی میں روپوش ہو جاتے۔

اسی طرح ایک اور بہت بڑے تاجر تھے۔ ان کو اس قدر آمدنی ہوتی کہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا، وہ فقراء اور مساکین اور یتیموں و بیواؤں میں خوب بانٹا کرتے تھے، جب ان کی وفات ہو گئی تو شہر موصل کے دو سو

فقرا جن کی وہ کفالت کرتے۔ بے سہارا ہو گئے۔

خود مجھے بارہا ذاتی تجربہ ہوا کہ جب بھی میں نے اپنے محدود مال سے صدقہ نکالا ہے۔ اس میں زیادتی ہوئی ہے اور مجھے جب بھی تنگ دستی کا احساس ہوا اللہ تعالیٰ نے فوراً خوشحالی کے ایسے مواقع عطا فرمائے جن کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ بچپن سے میری یہ عادت رہی ہے کہ میں نے کسی سائل کو یا ایسے شخص کو جو مجھ سے سفارش کا طالب ہوا یا اپنے کسی کام میں میری مدد چاہی اسے واپس محروم نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اللہ بندے کی مدد کرتا رہتا ہے جب تک کہ بندہ اپنے بھائی کی مدد و نصرت میں لگا رہتا ہے۔"

اپنے ساتھ پیش آنے والے ایک عجیب و غریب واقعہ کو میں آج تک نہیں بھول سکا۔ حالانکہ اس طرح کے بے شمار تجربے ایسے بھی ہوئے جو مجھے یاد نہیں رہے۔

● ۱۹۸۸ء میں میں نے ادائے حج سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ کا قصد کیا۔ میرے ساتھ میری والدہ مرحومہ بھی تھیں۔ ظہر کی نماز مسجد نبوی میں ادا کرنے کے بعد اپنی ضعیف والدہ کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ وہ ضعف کی وجہ سے جب چلتے چلتے رُک جاتیں تو میں بھی کھڑا ہو جاتا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر سہارے سے چل رہی تھیں اور میں ادھر اُدھر نظر دوڑا رہا تھا کہ شاید کوئی شناسا نظر آجائے۔ مسجد نبوی کے باب النساء کے مقابل سڑک پار کرنے کے بعد میں نے ادھیڑ عمر کے ایک مصری مرد اور ایک عورت کو اپنے اپنے بیگ پر ٹیک لگائے فٹ پاتھ پر بیٹھے دیکھا اگرچہ میں ان دونوں کو پہچانتا نہیں تھا پھر بھی میرا دل ان کی طرف مائل ہوا۔ میں نے ان دونوں ہی کے لئے غیر شعوری طور پر اپنے دل سے محبت و مہربانی کا جذبہ، اس شخص کے چہرہ پر وجاہت تقویٰ اور ایمانداری کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے ان دونوں کو سلام کیا۔ میری ماں نے بھی

ـزرت کو سلام کیا پھر میں نے دونوں کو
کھانے کی دعوت دی، اس آدمی کے چہرے
پر مسکراہٹ نمودار ہوئی، پھر دونوں اپنی
جگہ سے اُٹھنے لگے. میں نے بھی ان کا سامان
اُٹھانے میں مدد کی اور لیجا کر ہوٹل میں
اپنے کمرے میں رکھ دیا. پھر سب نے
ساتھ کھانا کھایا. کھانے کے دوران میں
نے اندازہ لگایا کہ یہ مصری شخص مالدار
لوگوں میں سے ہے اور یہ بھی معلوم ہوا
کہ اس کا وہاں کپڑے کا ایک کارخانہ ہے
اور اس وقت اس کے پاس روپے
ختم ہو گئے ہیں کیونکہ حاجیوں پر نقد مبادلہ
لے جانے کی مقدار میں پابندی ہوتی
ہے جس سے ساری ضرورتیں بآسانی
پوری نہیں ہوتیں. اس نے چند ہی
گھنٹے قبل اپنے پاس بچا ہوا آخری سعودی
ریال خرچ کر دیا تھا اور پانچ دن کے بعد
بذریعہ ہوائی جہاز اس کی روانگی متعین تھی
اس نے دوران گفتگو میں بتایا کہ اس نے
اپنے اس چھوٹے ہوٹل کو جس میں اس کا
قیام تھا. آج ہی بعد فجر چھوڑا ہے کیونکہ اس
کے پاس صرف آٹھ روپیہ بچا تھا کرایہ ادا
کرنے کے بعد ناشتہ کے لئے کچھ بچ جاتا اس
نے بتایا کہ میں نے اللہ سے دعا کی کہ میرے
لئے کوئی تدبیر پیدا فرما دے اور اپنی دعا کو
ان الفاظ میں ختم کیا.

ترجمہ: اے اللہ! اگر میں نے
اپنے پاس سائل بن کر آنیوالے
کسی محتاج کو نامراد واپس کیا ہو
تو مجھے بھی ناکام فرما، اے
سب سخیوں سے بڑھ کر سخی.

پھر میں سو گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سرکارِ
نامدار سید المرسلین فرما رہے ہیں کہ
ترجمہ: یعنی گھبراؤ نہیں جلد
ہی اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کوئی
سہولت پیدا فرما دے گا.

جب میری آنکھ کھلی تو اپنے منہ میں مٹھاس
دل میں نور اور طبیعت میں اطمینان پایا.
پھر جب میں نے تم کو اپنی طرف آتے دیکھا
اور دیکھا کہ تم اپنی ماں کو سہارا دیے ہوئے

ہوا اس کا جو حق ہے وہ ادا کرے ہو تو میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ شاید تمہارے ہی ہاتھوں میری مشکل آسان ہوگی اور اللہ تعالیٰ نے اسے سچ کر دکھایا۔ کھانے کے بعد سب لوگ کمرے میں واپس گئے اور آپس میں بات چیت کرتے رہے اور میری والدہ بھی اس شخص کی بیوی سے گفتگو کرتی رہیں اور اس سے اس قدر مانوس ہوگئی تھیں گویا برسوں کی جان پہچان ہے۔ مجھے مدینہ منورہ سے عشاء کی تقریباً ایک گھنٹہ بعد ہوائی جہاز سے جدہ جانا تھا میں نے ان دونوں سے رخصت ہوتے ہوئے کہا کہ آپ کی طرف سے پانچ دن کا کرایہ ادا کر دیا ہے، آپ بے فکر رہیں۔ اب یہ کمرہ گویا آپ کا کمرہ ہے۔ میرے پاس خرچ کے علاوہ بھی کافی رقم تھی۔ لہٰذا میں نے کچھ پیش کرنا چاہا لیکن اس نے انکار کیا، آخر کار جب میں نے کہا کہ اچھا بطور قرض ہی لے لیجئے تو اس نے مجھے

اپنا پتہ دیتے ہوئے قبول کر لیا۔ کار تک رخصت کرنے آیا۔ میں دو ہ پہنچ چکا تھا۔ وہاں سے بغداد جا والے جہاز سے دو گھنٹے بعد بغداد پہنچ مجھے عراق میں رہنا ہوا۔ وہاں طرح طرح کی مشغولیات نے اس کو بھلا دیا۔ مجھے قاہرہ کئی مرتبہ جا۔ اتفاق ہوا۔ ایک مرتبہ وہاں ایک کام کی وجہ سے پانچ سال رکنا ہو ۱۳۹۲ھ میں عراق واپس آگیا۔ اتفا ۱۳۹۵ھ میں تین سال کے بعد جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں رہتا تھا اور اب اپنے اندر ضعف کرنے لگا تھا۔ مجھے ۶ سال کے کئی قسم کی آزمائشوں سے گزر بہت بڑے عہدہ کی پیش کش سے دوچار ہوا تو خودداری کا مال وغیرہ کی کثرت ہوئی تھی زہد و قناعت کا دامن نہیں چھو مزمت ہوئی تو صبر کیا۔ صحت دو

و تحمل و بردباری سے کام لیا۔ نیک و صالح بیوی کا انتقال ہوا تو بھی فکر و صبر سے غافل نہیں ہوا۔ قسم قسم کی پریشانیاں آئیں تو ثابت قدم رہا۔ آخر میں پریشان کر دینے والی تنہائی ملی تو بھی سب سے بس ظاہر نہیں کی۔

میرے لئے اب سوائے خدا کے اور کوئی سہارا نہیں تھا۔ مسجد میں نماز کے لئے آمد و رفت وعظ و تقریر سننا، کتابیں خریدنا اور مطالعہ کرنا، دن رات کا مشغلہ تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا تو دن گذر چکے تھے۔ میں گھر میں تنہا تھا۔ اس دن اتفاق سے مجھے بخار بھی تھا جس کی وجہ سے میں بستر پر پڑا ہوا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ظہر یا عصر کے بعد باہر نکلوں اور کچھ افطار کے لئے خریدوں لیکن کمزوری کی وجہ سے اتنا بھی نہ کر سکا حتیٰ کہ مغرب کا وقت ہو گیا۔ وقت افطار کے اعلان کے لئے توپ داغی گئی پھر مسجد سے موذن کی اذان سنی تو کسی طرح بستر سے اٹھا۔ قدم بوجھل ہو رہے تھے۔ بمشکل تمام تھوڑا سا پانی پیا اور پھر تنہا ہی کمرے میں مغرب کی نماز ادا کی اور بستر پر دوبارہ لیٹ گیا۔ اس وقت مجھے دو چیزوں کا بہت شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ ایک تنہا دوسری بھوک، حالانکہ میرے پاس کافی روپیہ تھا۔ میں نے جی میں کہا کہ لعنت ہے اس دولت پر اور ان لوگوں پر جو اس کے پیچھے مرے مٹے جاتے ہیں کیا یہ دولت اس وقت میری تنہائی دور کر سکتی ہے یا میری بھوک ختم کر سکتی ہے؟

رات کے وقت مجھ سے ملنے کے لئے شیخ سلیمان ربیع آئے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ازہر شریف کے شیخ عبدالحلیم محمود جمعہ کے دن اپنی مسجد میں آئیں گے۔ نماز جمعہ کے بعد ایک نئے دینی ادارے کے قیام کے سلسلے میں لوگوں سے خطاب کریں گے اور انھیں اس سلسلے میں مدد کرنے کی ترغیب دیں گے۔

لہٰذا اس دن میں نے بھی شیخ الازہر کی مسجد کا رُخ کیا۔ نماز سے فراغت کے بعد

چندہ شروع ہوا لوگوں نے خوب دل کھول کر دیا۔ جب میری باری آئی تو میں نے صرف ۲۰ پونڈ بچا کر ساری دولت کو چندہ میں دے دیا۔ اب میرے پاس جو معمولی رقم بچی تھی اس سے بس چند ہی روز گزارہ ہو سکتا تھا۔ پھر میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے ایک دوست شیخ المبارک کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میرا دل سکون واطمینان سے معمور تھا۔ میں دلی مسرت محسوس کر رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ سے ایک بہت بڑا بوجھ اٹھا لیا گیا ہے۔ جس کے نیچے میں دبا ہوا تھا۔ میں شیخ المبارک کے پاس کچھ ہی دیر بیٹھا تھا کہ پیچھے سے دو ہاتھ بڑھے اور مجھے لپٹا لیا۔ پھر خوشی سے بے خود کسی شخص کے پے در پے بوسوں کی گرمی محسوس کی۔ میں حیرت سے مڑا کہ دیکھوں کون ایسا شخص ہے جو مجھ سے اس قدر اظہار محبت کر رہا ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ یہ تو وہی شخص ہے جس سے مدینہ منورہ میں ملاقات ہوئی تھی جس کی سب استطاعت میں نے مدد کی تھی۔ اس واقعہ کو ہوئے پورے گیارہ سال بیت چکے تھے۔ وہ مجھے جوش محبت میں بار بار لپٹاتا اور کہتا "تم کہاں چلے گئے تھے میں نے تمہیں ہر جگہ ڈھونڈا" پھر اس نے ایک تھیلی جس میں پانچ سو مصری پونڈ تھے۔ میری جیب میں باصرار ڈال دی اور کہا لو اپنی امانت سنبھالو۔ میں اتنے دنوں کے بعد آج واپس کر رہا ہوں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ تھیلی اسے واپس کر دوں لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا میں اس کا محتاج نہیں۔ خدا کے فضل سے بہت مالدار ہوں۔

مدینہ منورہ میں اس شخص کی مدد کرتے وقت میں نے نیت کی تھی کہ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے مجھے قیامت میں دے جب کہ نہ اولاد کام آئے گی اور نہ مال ودولت ہی کچھ سہارا بن سکیں گے لیکن اللہ کے فیصلے کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ آخر میں نے اپنی ساری دولت کس جذبہ کی وجہ سے چندہ میں دے ڈالی

اور اپنے لئے سوائے ایک معمولی رقم کے کچھ بھی نہ بچایا جو میرے صرف چند ہی دن کام آسکتی تھی۔ میں نے سنا وہ شخص آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا کہ خدا کا شکر ہے کہ آج میں نے اپنے محسن کو یہاں پالیا۔ ورنہ شاید ہی کبھی پاسکتا۔ اس نے میرے بارے میں ہر شخص سے پوچھا۔ لیکن چونکہ وہ میرے والد یا گھر والوں کا نام پتہ نہیں جانتا تھا۔ اسی لئے کوئی اس کی رہنمائی نہیں کرسکا۔ میرا پتہ پوچھنے پر ہر شخص اسے یہی جواب دیتا کہ اس کے والد یا دوسرے گھر والوں کے نام پتہ بتاؤ تو کچھ پتہ چلے گا۔ اس نام کے آدمی کو عراق میں سینکڑوں ہوں گے۔

اس شخص کا پہلا اتفاق تھا کہ اس نے اس مسجد میں نماز جمعہ ادا کی۔ اس کا تو اپنے محلہ میں واقع مسجد ہی میں نماز پڑھنے کا معمول تھا اور جب اسے قاہرہ آنا ہوتا تو وہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے نام سے موسوم مسجد میں جمعہ پڑھا کرتا تھا۔ اس مرتبہ قاہرہ آنے کے وقت بھی ارادہ یہی تھا کہ وہ نماز جمعہ مسجد سیدنا حسین میں پڑھے گا لیکن راستے میں اسکی کار خراب ہوگئی اپنے ڈرائیور کو اس کی درستگی کے لئے چھوڑ کر وہ انتظار کرنے لگا حتیٰ کہ نماز کا وقت ہوگیا اور وہ اس مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے چلا آیا پھر مجھ سے ملاقات ہوگئی۔

اس واقعہ کو میں محض اتفاق پر ہرگز نہیں محمول کرسکتا بلکہ مجھے اس کا کامل یقین ہے کہ ہر چیز اللہ ہی کے کرنے سے ہوتی ہے۔ یہ میرا تجربہ تھا جسے بیان کیا ہے۔ اس طرح نہ جانے کتنے انفرادی و اجتماعی واقعات و تجربات ہوں گے لیکن میری آنکھ پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ایسے لوگوں کی تعداد جو صدقہ و زکوٰۃ کے پابند اور مال حرام سے بچتے ہیں۔ بہت ہی معمولی ہے حتیٰ کہ انہیں انگلیوں پر شمار کرنا کوئی مشکل نہ ہوگا تو اس طرح کی جماعتیں اور جلوتیں کہاں پائی جاسکتی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ان تمام [illegible]

اسلامی تربیت

صفاء محمود رفعت

دنیا کی قدیم و جدید قوموں میں کوئی قوم ایسی نہیں ملتی جس نے ایسے نوجوان تیار کیے ہوں جیسے کہ عہد رسالت میں اور پھر اس کے بعد عہد خلافت راشدہ میں امت مسلمہ نے تیار کیے تھے۔ چنانچہ اس وقت کے تربیتی نظام نے انتہائی مختصر مدت میں سرفروش نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت تیار کر دی۔ جو اپنے دین و عقیدے کو ہی اپنا سرمایۂ حیات سمجھتی تھی اور یہ دین و عقیدہ اس کی رگوں میں خون بن کر گردش کرتا تھا۔ چنانچہ وہ اس دین و عقیدہ کی راہ میں قربان ہو جانے کی خاطر میدان جنگ کے لئے ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے تھے۔

اس بات میں کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ انھوں نے قرآن سے یہ زندۂ جاوید خدائی تعلیم پائی تھی کہ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تمہارے لیے اچھا نمونہ ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہو اور اللہ کو زیادہ تر یاد رکھتا ہو۔"

واقعہ کے اس پہلو کا مطالعہ کیا جانا چاہیے کہ آخر وہ کون سے ذرائع تھے جن کی مدد سے اسلامی نظام تربیت نے کمسن اور کم عمر نوجوانوں کو بھی جذبۂ جہاد سے سرشار کر دیا تھا چنانچہ بدر کے لئے کوچ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راستہ میں کچھ بہت کم عمر کے نوجوان ملے جو فریضۂ جہاد میں شرکت کے متمنی تھے۔

کاش ہمارے دور کے نوجوان اس

ہ کے نوجوانوں کی زندگی سے کچھ سبق لیتے

اسی طرح غزوۂ اُحد کے موقع پر
ول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راستے میں چند
جوان ملے جن میں عبداللہ بن عمرؓ زید بن
بت رضؓ اسامہ بن زیدؓ، براء بن عازب
ید بن حضیرؓ، عرابہ بن اوس رضؓ، زید بن
رضؓ اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم
میں شامل تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
ان سے دریافت فرمایا کہ کہاں جا رہے
، تو معلوم ہوا کہ ارادۂ جہاد لے کر نکلے
اور جنگ میں شریک ہونا چاہتے تھا
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو ان
وں کے ساتھ واپس کر دیا جو معذور تھے۔
کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سب
نتیجہ تھا صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت
نا چنانچہ جب آپ دنیا سے تشریف لے
گئے تو نہ وہ نظام تربیت باقی رہ گیا نہ
نوجوان۔ لیکن ایسا کہنے والے حضرت
تعالیٰ کی وہ بات بھول جاتے ہیں
س نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان
کہلوائی کہ

۔ آج تمہارے لئے تمہارے
دین کو ہم نے مکمل کر دیا اور اپنی
نعمت تم پر پوری کر دی اور
تمہارے لئے اسلام دین پسند
کیا ہے

نوجوانوں کی رہنمائی کے لئے محمد صلی اللہ
علیہ وسلم کا پیش کیا ہوا نظام تربیت ہر زمانہ
اور ہر جگہ کے لئے مفید اور قابل اتباع ہے
وہ کبھی بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے
ساتھ مخصوص یا آپ کی زندگی تک ہی
محدود نہ تھا۔

نوجوانوں کی صحیح خطوط پر تربیت یا
ان کے لئے کوئی تربیتی نظام مرتب کرنے
کے سلسلے میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ علم
نفسیات اور فن تربیت دونوں پر بیک
وقت دستگاہ رکھتے تھے اور ایسا کیوں نہ ہو
جب کہ وہ خود درسگاہ نبوت کے تربیت
یافتہ تھے اور عشرۂ مبشرہ میں سے تھے
حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے تربیت کا جو

طریقہ اختیار کیا تھا اس کے اہم بنیادی نکات درج ذیل ہیں۔

(۱) اللہ کا تقوی اختیار کرو کیونکہ وہ تمہارے ظاہر و باطن دونوں سے یکساں طور پر باخبر ہے۔

(۲) جب کسی جماعت کے پاس تمہارا آنا ہو تو ان کے ساتھ اچھی ہم نشینی اور خیر سگالی کے جذبات کا مظاہرہ کرو اور ان سے بھلائی کا وعدہ کرو۔

(۳) جب انھیں نصیحت کرو تو کم لفظوں میں کرو کیونکہ زیادہ بولنا ایک بات دوسری بات کو ذہن سے محو کر دیتا ہے اور آدمی اسے بھول جاتا ہے۔

(۴) اپنے آپ کو درست کر لو تو سارے لوگوں کو اپنے لئے درست پاؤ گے۔

(۵) جب تم سے کسی معاملہ میں مشورہ طلب کیا جائے تو سب سے اچھی بات صحیح مشورہ ہے۔

(۶) نیک لوگوں کے پاس بیٹھو۔

ان چھ شرطوں یا قیمتی نصیحتوں نے ان تمام شرائط کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے جو نوجوانوں کے کسی قائد یا مسلمانوں کے کسی ذمہ دار میں پائی جانی ضروری ہیں۔

مذکورہ بالا ان چھ اصولوں کا ہم کچھ گہرائی سے مطالعہ کریں گے۔

اللہ کا تقوی

یہ ایک مجمل جملہ ہے جو ہر طرح کی نصح و خیر خواہی پر مشتمل ہے۔ حضرت ابو بکر رض اپنے سپاہیوں کو اس کی ترغیب دیا کرتے تھے ایک دفعہ آپ نے اپنے کسی سپہ سالار سے فرمایا کہ اپنے آپ کو ظلم و جور سے دور رکھو کیونکہ ظالم قوم کو کبھی فلاح نہیں ملی اور نہ ہی دشمن کے مقابلہ میں ان کی مدد کی گئی۔ متقی کی بات میں یہ صفات داخل ہیں کہ وہ عدل و انصاف کرنے والا ہو۔"

حضرت ابو بکر صدیق رض ہر سپہ سالار کو اس کے اپنے ضمیر کے حوالے کر دیتے تھے کیونکہ ضمیر کا اللہ کے سوا کوئی نگراں نہیں ہوتا اور اللہ انسان کے ظاہر و باطن دونوں کو یکساں طور پر جانتا ہے۔

دوسری نصیحت

جب کسی جماعت کے پاس تمہارا آنا ہو تو ان کے ساتھ اچھی ہم نشینی اور اچھے جذبات کا مظاہرہ کرو اور اچھائی بھلائی کا ہی ان سے وعدہ کرو۔ کیونکہ نفسیاتی تسکین سے انسان کے اندر شجاعت اور سچی ہمدردی کی روح پیدا ہوتی ہے جو ظلم و کینہ پروری کے تمام جذبات محو کر دیتی ہے اور انسان محبت و شرافت کا پیکر بن جاتا ہے کسی سے اسے بدگمانی نہیں ہوتی۔

تیسری نصیحت

جب انھیں نصیحت کرو تو مختصر ہو

کیونکہ یہ اختصار ہی ایسے موقعوں پر سود مند ہوتا ہے۔ یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ نصیحت کا موقع ایسا نہیں ہوتا کہ طویل گفتگو یا لکچر بازی کی جائے بلکہ یہ وہ موقع ہوتا ہے جہاں سنجیدگی سے صرف ضروری باتیں کہہ دینے کی ہوتی ہیں کیونکہ یہاں سننے والا بحث و تکرار میں نہیں الجھتا بلکہ یقین اور عبرت حاصل کرنے کے موڈ میں ہوتا ہے

چوتھی نصیحت

تم اپنے آپ کو درست کر لو تو سارے لوگ تمہارے حق میں درست ہو جائیں گے

سبحان اللہ! یہ کتنی قیمتی نصیحت ہے اور کتنا ہی عمدہ دستور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ صرف سنتے ہی نہیں بلکہ دیکھنا بھی چاہتے ہیں........ کہ قائد و مصلح یا مربی کی زندگی خود اس نصیحت کا صحیح مصداق اور اس کے عین مطابق ہے کیونکہ جب لوگ دیکھیں گے کہ قائد و مصلح یا مربی کی عملی زندگی خود اس کی اپنی نصیحتوں کے برعکس ہے تو اس کی نصیحتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور نہ ہی اس سے اصلاح کا داعیہ کسی میں پیدا ہوگا۔ بلکہ ایسے شخص کی نصیحتوں کی کھوکھلے الفاظ سے زیادہ کوئی وقعت و اہمیت نہیں ہوتی اور ایسے قائد کی قیادت کا کوئی اثر اور نتیجہ بھی نہیں ہوتا۔ اس موقع پر شاعر کا یہ شعر یاد آتا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ

جب گھر کا نگران اعلیٰ دف

بجائے گا تو گھر کے دوسرے

لوگ ناپنا شروع کردیں گے و
ہم روزمرہ کی زندگی میں آئے دن تقریریں
ُنتے رہتے ہیں جو ہوا میں گم ہو جاتی ہیں اور
ن کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ان نصیحتوں کی
نی قیمت بھی نہیں ہوتی جتنی کہ اس ایک
رق کاغذ کی ہوتی ہے جس پر وہ لکھی جاتی
ہیں۔ بسا اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ لوگ
ن نصیحتوں سے گھن محسوس کرتے ہیں،
یونکہ وہ جانتے ہیں کہ حقیقی ناصح کون ہے؟

پانچویں نصیحت

جب تم سے مشورہ کیا جائے تو سچا
مشورہ دو۔ اس کا تقاضا ہے کہ جو لوگ
منصب قیادت پر فائز ہوں ان کا حکمت
و دانائی، تجربات و آگہی کی صفات سے
متصف ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ انسان
کسی سے مشورہ اسی وقت طلب کرتا ہے
جب کہ اس کے پاس علم ہو، دانائی ہو جس
کی مدد سے وہ معاملات کو سلجھا سکے یا مسائل
کے حل کی تدابیر بتا سکے۔ لیکن اس سے زیادہ
ضروری بات یہ ہے کہ جس شخص سے
مشورہ کیا جائے وہ سچا ہو اور امانت دار ہو۔
دھوکا باز، منافق یا شخصی مصلحت اندیشی اس
کے اندر نہ ہو۔

چھٹی نصیحت

وفا شعار اور سچے لوگوں کی ہم نشینی
اختیار کرو کیونکہ قائد کے لئے شبہات سے دور
رہنا ضروری ہوتا ہے اس لئے کہ جب وہ جھوٹے
اور بد طینت لوگوں کی ہم نشینی سے دور رہے
گا تو ان کی دوستی اور ان کے ساتھ کسی
معاملے سے بدرجۂ اولیٰ دور رہے گا۔
بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مسئلہ کا ظاہری
پہلو ہے ورنہ انسان اگر خود خلوص اور مضبوط
شخصیت کا مالک ہو تو اس پر غلط سوسائٹی
کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن حضرت ابوبکر
صدیق رضی اللہ عنہ کے مذکورہ انداز تربیت
سے یہ بات میل نہیں کھاتی۔ یہ بات اگر فرض
کر لی جائے کہ قائد شر پسند لوگوں کی صحبت
میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو ان کے
بُرے اثرات سے بچا لیتا ہے تو پھر ان دوسروں
کو کون روک سکتا ہے جو غلط سوسائٹی اختیار

نے کے سبب اس کے بارے میں دوسرے لوگوں کے اندر پیدا ہوں گے۔ شاعر کی بات
رکھنے کے قابل ہے کہ آدمی کے بارے میں خود اس آدمی سے کچھ نہ پوچھو بلکہ اس
کے دوست سے پوچھو۔ کیونکہ ہر دوست اپنے دوست کے طور طریقہ کا پابند ہوتا ہے۔

یہ بہت ہی اہم اصول ہے، ضروری ہے کہ ہم اس سے غفلت نہ برتیں اور
نے دوستوں کے انتخاب میں اس کو اپنے لئے دلیل راہ بنائیں۔

یہ چند باتیں تربیت کے ذمہ داروں کے غور و فکر کے لئے تحریر کی گئی ہیں تاکہ
ان کو اپنا کر ایک ایسی عمارت برپا کرنے میں کامیاب ہو سکیں جس کا نصب العین
م انسانیت کا مفاد ہو۔

اپنی تلاش

(دعوت سے ماخوذ)

کروڑوں انسانوں کے اس بکھرے ہوئے سماج میں ہاتھ پاؤں، ناک کان چہرہ اور دماغ رکھنے والے ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب انسان ہیں۔ ان میں پڑھے لکھے بھی ہیں اور ان پڑھ بھی۔ دولت مند بھی ہیں اور غریب بھی۔ وہ بھی ہیں جن کے پاس وسیع مکانات ہیں جنھیں رہنے والے نہیں ملتے اور وہ بھی ہیں جن کو پاؤں پسارنے کے لئے سات فٹ جگہ میسر نہیں۔

صبح سے شام تک مجھے ان انسانوں سے واسطہ پیش آتا رہتا ہے۔ دکان داروں سے راہگیروں سے مزدوروں اور کسانوں سے حاکموں اور محکوموں سے یہ سب میرے بھائی ہیں۔ میرے جد امجد سیدنا آدمؑ کی اولاد ہیں۔ میں اور یہ ایک ہی دور میں پرورش پا رہے ہیں۔ تقریباً ایک جیسی غذا کھاتے ہیں اور ہم سب پر پیدائش اور موت کے یکساں فطری قانون لاگو ہیں۔ انھیں اور مجھے کھانے اور پینے اور دوسری چیزوں کی ایک ہی طرح کی ضرورتیں ہیں جو گرتے پڑتے پوری ہوتی رہتی ہیں۔

انسانوں کے اسی ہجوم میں پھر بھی مجھے انسانوں کی تلاش ہے۔ ان انسانوں کی جو اپنی خودی کو پہچانتے ہوں۔ جو اپنے اندر چھپی ہوئی طاقت پر قابو پا سکتے ہوں اور اس کو صحیح رخ پر موڑ سکتے ہوں۔ مجھے ان دل والوں کی تلاش ہے جو دل سے صرف خون دوڑانے کا کام نہ لیتے ہوں بلکہ جن کے دل ہر وقت اس بات پر تڑپتے رہتے ہوں کہ ان کے

جودے خدا کی مخلوق کو کس طرح فائدہ
ہو پہنچے۔
کتنی سچ بات کہی تھی دنیا کے ایک
سب سے سچے انسان نے کہ دل کا یہ قطرہ
ر ٹھیک ہو جائے تو اس کا وجود سدھر
جاتا ہے اور اگر بگڑ جائے تو پورا وجود
ڈ کر رہ جاتا ہے۔ اسی دل کے اندر سے
ں دوسروں کا مال مار کھانے کا جذبہ بھی
یدا ہوتا ہے اور دوسروں کی مدد کرنے
بھی۔ اس میں ظلم کرنے کی بھی تاثیر ہے
مظلوم کی مدد کرنے کی بھی۔ اور یہ دونوں
ریں برابر کام کرتی رہتی ہیں اس کی جمالی
ان اُبھر آئے اور اس کو اُبھار دیا جائے
یہ انسان دنیا کے لئے سرمایہ بن جاتا ہے
ر اس کی شیطانی صفت جاگ جائے
دنیا کے لئے اس سے بڑا کوئی نہیں
تا۔ یہی دل تاریخیں بناتا اور بگاڑتا
ہے۔ اسی سے رحمتیں بھی اُبلتی ہیں اور زحمتیں
ی پھوٹتی ہیں۔ مجھے اسی دل پر دستک
نی ہے۔ اسی کی شریفانہ رگ کو طاقت

بخشنی ہے اور اسی شیطانی رگ پر قابو پانا ہے۔
میں نے اس دل پر بارہا دستکیں دی ہیں
اور دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی میں نے
اس دل کو ڈھونڈ نکالا ہے اسی زمانے میں
اونٹ اور بکریاں چرانے والے گرے
پڑے انسانوں کو میں نے دنیا کے مصلح کا
روپ بخش دیا ہے۔
میں نے بلال رضؓ جیسے غلام کے دل پر
آواز دی تو اسے سردار کا منصب دلوایا۔
ابوہریرہؓ کو جگایا تو علمی تحقیقات کا محور بنایا
ایک تاجر ابوبکر رضؓ اور ایک گلہ بان عمر رضؓ کی
اسی دھڑکن کو تیز کیا تو وہ دنیا کی مثالی حکومتوں
کے لئے ایک فلاحی نمونہ بنے۔ میں نے
بادشاہوں کے دلوں پر دستک دی تو
انہیں ٹوپی بن کر اور کلام مجید لکھ کر روزی
کمانے پر آمادہ کیا۔ میں نے راجستھان
کے ریگزار میں ڈیرہ ڈالا تو ہزار دل راجپوتوں
کو حلقہ بگوش کر لیا۔ سوات میں تجربہ کیا تو
لٹیروں کو امین بنا دیا۔
میں ہر انسان کو اپنی توجہ کا مرکز سمجھتا

ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میری بستی کے رکشہ والوں، مزدوروں اور کھیتوں پر کام کرنے والوں میں بہت سے شیر دل اور تاریخ ساز انسان سوتے رہتے ہیں لیکن میں خود ہی قصوروار ہوں کہ داستان کہتے کہتے خود ہی نیند کے خراٹے لینے لگا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو پہچاننا چھوڑ دیا ہے۔ میں کوہ نور ہیرے کا مالک ہوں لیکن جھوٹے موتیوں کا سودا کرنے میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ مجھے کسی کی لاٹھی کسی کی وردی۔ کسی کی کرسی کسی کی فوج کسی کے کاروبار اور کسی کے اقتدار نے مرعوب کر رکھا ہے اور میں نے اسی مرعوبیت کی وجہ سے اپنے گرد و پیش کے انسانوں کے دلوں کو دستک دینا چھوڑ دیا ہے۔ بیماروں کے عفنت اور پاگلوں کے دیوانہ پن پر مجھ میں معالج کی سی ہمدردی نہیں پیدا ہوتی ہے بلکہ میں بھی انہی کی طرح بیمار اور پاگل بن جاتا ہوں۔ یہ ایک حادثہ ہے المناک حادثہ تاریخی حادثہ۔ بلاشبہ میں اسی حادثہ کا مرتکب خود ہی ہوں۔ یہ دنیا والے میری پکڑ شاید نہیں کر سکتے لیکن اس ہستی کے سامنے جس کی نظر سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ میں مجرم ہوں کہ میں چارہ گر ہو کر مریض کا علاج نہیں کیا میرے پاس پانی کے کٹورے بھرے رکھے تھے لیکن میں نے پیاسوں کا منہ تر نہیں کیا۔ وہ بھوک سے بلبلاتے تھے لیکن مجھ پر جوں تک نہیں رینگتی تھی۔

کاش میں اپنے آپ کو ڈھونڈ سکوں کاش میں کل اپنے آقا کے حضور شرم سے گردن نہ جھکا سکوں کہ انھوں نے تو مجھے اپنا جانشین بنا کر دین کا شاہد بنوایا تھا لیکن میں اس پیغام کی تلاوت سے آگے کچھ نہ کر سکا۔ میں دانائی کا نااہل وارث ہوں۔ کاش میں اپنے بزرگوں کے ورثے کا صحیح امین ثابت ہو سکوں۔ مجھے یہ تو یقین ہے کہ جب بھی میں اس وراثت کا حق ادا کروں تو میں اپنے گرد و پیش کو بدل سکتا ہوں۔ نہیں بلکہ میں اس دور کا چلن بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہوں لیکن میں خود منتظر بیٹھا ہوں کہ کوئی آئے اور مجھے یاد دلائے کہ

مولانا عبدالماجد دریابادی

کوئی صاحب اگر آج یہ کریں کہ از راہ ہمدردی و غمخواری جنگل سے شیر اور چیتے پکڑ پکڑ کر لائیں اور ان کے پنجوں اور دانتوں پر نہایت قیمتی سونے کے خول چڑھا دیں ان کے لیے اپنے عالی شان اصطبل کو خوب جھاڑ پونچھ کر صاف کردیں۔ ان کے آگے سرسبز و شاداب گھاس کے گٹھے ڈلوا دیں ان پر بڑے بڑے ہوشیار سائیس مقرر کردیں کہ وہ ان کی خوب مالش کیا کریں، ان کے پیروں میں نعل ٹھکوا دیں۔ بہترین چنا ان کے کھانے کے لئے بھجوا دیں۔ چاندی کی بالٹیاں ان کے پانی پینے کے لئے مہیا کردیں تو اس ساری خوش انتظامی کے باب میں آپ کیا رائے قائم فرمائیں گے؟ اور پھر اگر وہ ہمدردِ مزعوم خیالی اور مساوات پسندی کے نعرے لگاتے ہوئے انھیں اور تقریریں کچھ اس قسم کی فرمانے لگیں کہ:

"یہ کیسا ظلم اب تک ہوتا رہا کہ جنگل کے درندوں کو اپنی ہمدردی کے دائرے سے باہر سمجھتے رہے آخر یہ بھی تو اسی خدا کی مخلوق ہیں جس کے بنائے ہوئے ہمارے گھوڑے ہیں۔ انھیں کی طرح یہ بھی جان رکھتے ہیں انھیں کی طرح بھوک رکھتے ہیں۔ معدہ رکھتے ہیں۔ گرمی، سردی، نرمی، سختی، تکلیف و راحت کا احساس رکھتے ہیں۔ یہ کیسی خودغرضی ہے کہ گھوڑوں کے لئے نرم گھاس اور دانے کا بہترین انتظام رکھیں اور اس شریف مخلوق کو جنگل میں دھوپ اور لو کی لپٹیں سہنے اور رات کی اندھیریوں میں ٹھوکریں کھانے کو چھوڑ دیں!"

آپ ان نازک خیالوں کی داد کے لئے الفاظ کہاں سے لائیں گے؟

....

فرضی مثال پڑھ کر آپ ہنستے ہیں ہکلاتے ہیں۔ لیکن عملی دنیا میں واقعات کے عالم میں اس سے کہیں بڑھ کر ستم ظریفی آپ خود یہ کرتے ہیں کہ اپنی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں بیویوں کو عورت سے مرد بنا دینے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ فوج کا سپاہی انھیں آپ بنا دینا چاہتے ہیں۔ وکیل، بیرسٹر، مجسٹریٹ اور جج انھیں آپ بنا رہے ہیں۔ پولیس میں بھرتی انھیں آپ کرا رہے ہیں۔ اسمبلی اور کونسل میں تقریریں اُن کی آپ کرا رہے ہیں۔ وزارت کا منصب انھیں آپ دلا رہے ہیں۔ اسپیکر اور ڈپٹی اسپیکر کی کرسی پر آپ انھیں بٹھا چکے ہیں۔ کالج پہ کالج اُن کی اعلیٰ تعلیم کے لئے آپ کھلواتے چلے جا رہے ہیں اور سب چیزوں پر آپ خوش ہو ہو کر چاروں طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ دیکھو ہم نے ترقی کی کتنی منزلیں طے کر لیں!

"صاحب" کے قائم کئے ہوئے معیار کے کتنے قریب آگئے۔ عورت اگر باورچی خانہ میں رہے۔ زچہ خانے میں رہے۔ آئندہ نسل کی پرورش و پرداخت میں لگی رہے تو عین پستی اور گھر سے نکل عین چوراہے پر کھڑی ہو جائے۔ ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں پہنچ جائے۔ بیوی اور ماں بننے سے انکار کر دے تو عین اس کے حقوق کی بازیافت ہے

....

عورت عورت نہ رہے۔ عین عین مرد بن جائے۔ چال ڈھال میں مرد۔ وضع قطع میں مرد، ہنر اور پیشہ میں مرد تحصیل معاش میں زنانہ لطافتیں رخصت ہو جائیں۔ مردانہ کرختگی آجائے: "حقیقت" ضائع پر ضائع ہوتی چلی جائے۔ اولاد کا مسئلہ رُک جائے۔ حمل کا قرار پانا بند ہو جائے۔ رضاعت کا نام لینا گناہ قرار پا جائے۔ عصمت و عفت افسانہ بن جائے۔ شرم و حیاداری کا خون ہو کر رہے۔ غیر قدرتی طور پر زندگی اختیار کر کے صحت غارت ہوتی رہے۔ دوران

میں اضافہ رضاعت کی لذتیں سب اپنے اوپر حرام کرلی جائیں۔

یہ ہے "روشن خیالی" کا تقاضا اور تجدد نوازی کا منتہیٰ۔ آپ شیر کو پالتو بنانے کے ذکر پر شیر کو شیرینی سے محروم کرنے کی ترکیب پر ہنستے تھے۔ عورت کو "نا عورت" بنا دینے کی جسارت پر فطرت کو اتنا بڑا چیلنج دینے پر ہنسی کی جگہ رونا نہیں آتا۔

قطعات

(اے غفور عثمانی مرادآبادی)

کیا زمانہ ہے کہ ناموس بشر خطرے میں ہے — عصمت دامان ہستی کس قدر خطرے میں ہے
حسن عریاں سے نہیں محفوظ کوئی رہ گزر — ہم تو کیا شیخ و برہمن کی نظر خطرے میں ہے

وضع اپنی بدل رہے ہیں ہم — کس کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں ہم
پھر بھی خوش ہیں کہ لڑکھڑاتے ہوئے — وقت کے ساتھ چل رہے ہیں ہم

جو نہ کرنا تھا کر رہے ہیں لوگ — دل کو نفرت سے بھر رہے ہیں لوگ
زہر ہے زندگی کے ساغر میں — موت سے پہلے مر رہے ہیں لوگ

دلِ انساں ہے ارمانوں سے خالی — حقیقت اور افسانوں سے خالی
بنی تھی جو فقط انساں کی خاطر — وہی دنیا ہے انسانوں سے خالی

احسان

طاہرہ بیگم شبلی

پانچویں صدی ہجری کا وہ زمانہ تھا جب خلافت عباسیہ کا آفتاب اقبال ڈھل چکا تھا۔ آپس کی خانہ جنگیوں نے مسلمانوں کا شیرازہ منتشر کر دیا تھا اور قسطنطنیہ کی عیسائی حکومت ایشیاء و افریقہ پر دوبارہ اپنا اقتدار قائم کرنے کے حسین خواب دیکھ رہی تھی۔ اس نازک دور میں رحمت خداوندی بن کر سلجوقی میدان سیاست میں آئے۔ انھوں نے خلیفہ بغداد کا دایاں ہاتھ بن کر مسلمانوں کے اقتدار کی گرتی ہوئی دیوار کو تھام لیا۔

سلجوقیوں کا پہلا بادشاہ طغرل بیگ تھا۔ اس نے رومیوں کو کئی بار شرمناک شکست فاش دی۔ اس کے انتقال کے بعد ۴۵۵ھ میں اس کا نیک بہادر اور لائق بھتیجا الپ ارسلان مسند بادشاہت پر بیٹھا۔ اس کے زمانے میں شہنشاہ روم ایک لاکھ سوار فوج اور یورپین ملکوں کے والنٹیئر کی ایک بہت بڑی تعداد لے کر اسلامی علاقہ پر حملہ آور ہوا۔ سلطان الپ ارسلان بھی بیس ہزار مجاہد لے کر آگے بڑھا۔ دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ آخر کار خنجر ہلال نے صلیب کو پاش پاش کر دیا۔ ہزارہا عیسائی مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوئے۔ مگر سلطان نے سب کو بغیر فدیہ پر رہا کر دیا۔ اس پر ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ شہنشاہ روم سلطان کا احسان مند اور مشکور ہوتا لیکن اس شرمناک شکست سے اسے اور زیادہ طیش آیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ تیاریوں کے ساتھ دوبارہ اسلامی علاقہ پر حملہ آور ہوا۔ سلطان الپ ارسلان عوام کا خون بہتا پسند نہ کرتا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ جنگ نہ ہو اور روم کا بادشاہ اپنے ارادے

بڑھا جائے۔ مگر اس کو اپنی زیادتی فوج پر گھمنڈ تھا۔ دونوں صورت واپس نہ ہوا نتیجہ میں مجبوراً سلطان ارسلان کو بھی جنگ کے لئے آمادہ ہونا پڑا۔ سلطان اپنے تخت سے نیچے اُترا اور اپنا چہرہ خاک پر رکھ دیا۔ اور خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں رو رو کر ظالموں کے مقابلے میں کامیابی کی دعا کی پھر اپنی فوج کے مٹھی بھر مجاہدوں کی جن کی تعداد صرف بارہ ہزار تھی اس طرح خطاب کیا۔

مجاہدین اسلام! مجھے تمہاری وفاداری اور جان نثاری پر پورا بھروسہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم شہادت کو ہر صورت میں ترجیح دو گے لیکن میں پھر بھی اجازت دیتا ہوں کہ تم میں سے جو شخص لڑنے کے لئے تیار نہ ہو وہ واپس جاسکتا ہے۔" مگر یہ مجاہدین بھی ایمان کے پختہ اور الپ ارسلان کے تربیت یافتہ تھے۔ ایک بھی واپسی پر تیار نہ ہوا اور اس طرح رومیوں کے جتھوں میں گھس گئے۔ جس طرح بکریوں کے گلے ہوں۔ تھوڑی ہی دیر میں ناقوس کی صدا دھیمی پڑ چکی تھی۔ میدان جنگ نعرہائے تکبیر سے گونج رہا تھا اور مغرور بادشاہ روم سلطان الپ ارسلان کے سامنے زنجیروں میں جکڑا ہوا کھڑا تھا۔

جب الپ ارسلان کی نگاہ شہنشاہ روم پر پڑی تو سلطان تخت سے اُترا قدم آگے بڑھاتا ہوا نہایت پرتپاک انداز میں اس سے معانقہ کیا اور بڑی عزت کے ساتھ اپنے پاس تخت پر بٹھایا۔ سات دن تک لشکر میں فتح کا جشن رہا اس کے بعد سلطان نے شاہ سے کہا۔

"اے شہنشاہ روم! اب تم مجھ سے کیسے سلوک کی امید رکھتے ہو؟"

شہنشاہ نے جواب دیا۔ "اگر تم ظالم ہو تو مجھے قتل کر دو۔ مغرور ہو تو قید میں ڈال دو اور اگر دور اندیش اور وسیع القلب ہو تو آزاد کر دو۔"

سلطان نے کہا کہ "اگر خدانخواستہ مجھے شکست ہو جاتی اور میں اسی طرح تمہارے سامنے گرفتار ہو کر پیش ہوتا تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟"

شہنشاہ روم نے گستاخانہ جواب دیا کہ "میں بہت سخت سزا تجویز کرتا۔"

یہ گستاخانہ جواب سن کر بجائے اس کے کہ سلطان غصہ ہو کر اس کے لئے سزا تجویز کرتا ہنس پڑا اور جواب دیا کہ "یہ دستور عیسائیوں کو مبارک ہو" اسلام ہمیں اس کی تعلیم نہیں دیتا۔ کا شکر ہے کہ میں آج تمہارے قبضہ میں نہیں۔ جاؤ! میں تمہیں آزاد کرتا ہوں!"

یہ تھا ایک فاتح اسلام کا سلوک ایک مفتوح کے ساتھ کیا کیا کسی قوم کی تاریخ بھی ا... رحمدل اور منصفانہ سلوک کی مثال پیش کر سکتی ہے؟

غزل

(نظام الدین نظام)

گلا ہے فقیروں کا شمشیر سے ہے
غریبی مٹانے کی تدبیر ہے

وہ چہرہ تو میں نے کہیں کھو دیا
میرے پاس پھر بھی وہ تصویر ہے

میری شخصیت پر بھی تنقید کر
کہ ترکش میں یہ آخری تیر ہے

نئے خواب بُننے کی کوشش کرو
یہی شب گزاری کی تدبیر ہے

کسی دن گلا میرا کٹوائے گی!
گلے میں جو سونے کی زنجیر ہے

یہاں سب عقیدے کے کمزور ہیں
یہاں ہر گلی میں کوئی پیر ہے

خدا پر کسی کو بھروسہ نہیں
بندھی ہاتھ پر جیسے تقدیر ہے

مگر کیا کروں دل نہیں مانتا
بہت پُر اثر تیری تقریر ہے

کسی دن خدا بھی سُنے گا اِسے
غزل میں دعاؤں کی تاثیر ہے

میرے ہاتھ کانپے تھے، لیکن نظامؔ
نشانے پہ بیٹھا وہی تیر ہے

دیا جلے

محترمی مائل صاحب آداب عرض!

قرآن کریم میں میاں بیوی کے مقدس رشتہ کو لباس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ لباس جس کا کام جسم سے متعلق رہنا جسم کے سارے عیوب چھپانا اسے گرمی اور سردی سے بچانا اور اس کے حسن کو نکھارنا سنوارنا ہے۔ اسی لباس کے تعلق سے یہ نظم حاضر خدمت ہے اگر پسند آئے تو جگہ کے لیے آئندہ بھی اس قسم کی کوششیں کرتا ہوں گا۔ جواب سے مزید نوازئے گا۔ (حمید سیلانی)

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ط (البقرہ ۱۸۷)

"وہ عورتیں تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔"

کتنا پیارا لباس ہے اپنا

عیب وہ جسم کے چھپاتا ہے — بد نظر سے ہمیں بچاتا ہے
خوش نمائی عطا کرے سب کو — یعنی ہر زاویہ سجاتا ہے
سردیوں میں وہ مہرباں ہے — گرمیوں میں وہ سائباں رہے
ہے بدن سے قریب تر اتنا — گویا دو جسم ایک جان رہے
حسن کو پیرہن نکھارے ہے — شرم کو ذہن میں ابھارے ہے
ہے سراپا عکس حسن کا ضامن — دین و دنیا سبھی سنوارے ہے
کتنا پیارا لباس ہے اپنا

تاریکی بن کر چھا جائیں گے!

مولانا عبدالمالک

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ظلم قیامت کے دن تاریکیاں بن کر نمودار ہوگا۔ (متفق علیہ)

ظلم جہالت کی وجہ سے کیا جاتا ہے ظالم کے دل و دماغ پر جہالت، تعصب اور عناد کے پردوں کے چھا جانے کی وجہ سے حقیقت اس کے سامنے سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ وہ حقیقت کو نہیں جانتا ہوتا یا حقیقت کو جاننے کے باوجود اس کے انجام سے بے خبر ہوتا ہے اس لئے وہ ظلم کرتا ہے۔ اس لئے اس کی سزا بھی ایسی ہی ہونی چاہیے جو اس کے فعل کی حقیقت سے مناسبت رکھتی ہو۔ ظاہر ہے وہ سزا تاریکیاں ہو سکتی ہیں کہ وہ قیامت کے روز اسے گھیرے میں لے لیں اور نجات کی تمام راہوں کو اس پر مسدود کر دیں۔ اس طرح ظلم کی ظلمات کے ساتھ لفظاً اور معناً مناسبت ہوگی۔

ظلم کی تعریف

کسی کے مقام کو نہ پہچاننا، نہ ماننا، اس کے حقوق کو نہ ماننا، نہ ادا کرنا، غیر مستحق کو اس کے مقام پر فائز کر دینا، ایک کے حقوق دوسرے کو دے دینا یا خود غصب کر لینا یہ سب ظلم ہے۔

اللہ تعالیٰ کائنات اور نسل انسانی بلا شرکت غیرے مالک و خالق و مدبر ہے وہ کسی کی مدد کے بغیر اپنی کائنات پر حکومت کرتا ہے اس کا حق ہے کہ ہم اس کو ذات و صفات میں وحدہٗ لاشریک مانیں۔ اس کی

حاکمیت کا اقرار کریں۔ اس کی بندگی کو تسلیم کریں۔ الوہیت کے مقام پر کسی اور کو فائز نہ کریں اور بندگی و اطاعت کو اس کے لئے خالص کریں۔ اگر ہم اس کا یہ مقام اسی کو دیں اور اس کے ان حقوق کو اسی کے ساتھ خاص کریں تو یہ عدل ہے ورنہ ظلم، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "شرک سب سے بڑا گناہ ہے"

پس اللہ کی بندگی اور اس کی محبت کو اصل مقصد بنانا اور اس کے تقرب کے لئے جدوجہد کرنا عدل ہے اور ایسا نہ کرنا ظلم ہے۔

(ب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان آپ کے ساتھ محبت، آپ کی محبت کو باقی مخلوق کے ساتھ قائم شدہ محبتوں پر غالب کرنا۔ آپؐ کی اطاعت و فرماں برداری کرنا۔ آپؐ کے فرامین کو دوسروں کے فرامین پر ترجیح دینا۔ آپؐ کے تعلق کو دوسرے کے تعلقات سے مقدم سمجھنا عدل ہے اور ایسا نہ کرنا ظلم ہے۔

(ج) ایمان اور اطاعت کو دنیاوی مفادات پر ترجیح دینا عدل ہے اور دنیوی لذائذ و منافع کو ایمان و اطاعت کے مقابلے میں ترجیح دینا ظلم ہے۔

(د) نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد فی سبیل اللہ تواصی بالحق، تواصی بالصبر کو قائم کرنا عدل اور ان کی پرواہ نہ کرنا ظلم ہے۔

(د) عدل کا دوسرا نام شریعت الٰہی ہے جو سراسر عدل ہے اور عدل کا حکم دیتی ہے۔ اس کے احکام عادلہ ہیں اور ظلم سے روکتے ہیں۔ کہہ دیجئے میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے۔ اللہ انصاف کا حکم دیتا ہے اس لئے کسی شخص کا شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا عدل ہے۔ شریعت کے مطابق کاروبار کرنا اور نظام حکومت چلانا عدل ہے اور شریعت الٰہی کو چھوڑ کر انسانی شریعتوں کو اپنانا ظلم ہے۔

(س) شریعت نے انسان کو جو بنیادی حقوق عطا کئے ہیں وہ انھیں دینا عدل ہے اور اس سے ان حقوق کو چھیننا ظلم ہے۔

(ص) ماں باپ، عزیز و اقارب کو ان کے

حقوق دینا، ان سے حسن سلوک کرنا عدل ہے اور ایسا نہ کرنا ظلم ہے۔

(س) میاں بیوی کا ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنا عدل ہے اور ان کی ادائگی میں کوتاہی کرنا گناہ ہے۔

(ط) انسانوں کے ساتھ اپنے ایمانی تعلقات کو دوسرے تعلقات پر ترجیح دینا عدل ہے اور دوسرے رشتوں کو ایمانی رشتہ پر ترجیح دینا ظلم ہے۔

(ظ) حکمران کا رعیت کے ساتھ شریعت کے مطابق سلوک کرنا اور رعیت کا حکمراں کے ساتھ شریعت کے مطابق سلوک کرنا عدل ہے۔ حکمراں کا فرض ہے کہ وہ ان کے حقوق شریعت کے مطابق ادا کرے اور رعیت کا فرض ہے کہ وہ اس کی اطاعت اطاعت کرے اور منکر میں اس کی روک ٹوک کرے۔ ایسی حکومت عادل حکومت ہوگی اور ایسا معاشرہ منصف معاشرہ ہوگا ایسا نہ ہو تو ظلم ہوگا۔

ظلم کی اقسام:۔ ظلم کی تین اقسام ہیں

(۱) ایک ظلم وہ ہے جسے قرآن پاک میں ظلم عظیم کہا گیا ہے۔ اس ظلم کے حامل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی بنیاد ظلم پر قائم ہے اور زندگی انصاف سے خالی ہے۔ یہ ظلم کفر و شرک ہے اس ظلم کی مغفرت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ایسا شخص جو اس ظلم کا مرتکب ہو سراسر ظالم ہے۔ عدل کا اس کی زندگی میں نام و نشان تک نہیں جس چیز کو اس کی زندگی میں لوگوں نے عدل سمجھا ہے انھوں نے غلطی کی ہے۔ بیت الخلاء میں اگر خوشبو لگا دی جائے تو اس سے مکان کو خوشبودار نہیں کہا جا سکتا۔

(۲) دوسرا ظلم وہ ہے جس کی مغفرت سزا کے بعد اور سزا کے بغیر ہو سکتی ہے اس کا فیصلہ اللہ کی مشیت پر ہے۔ وہ ظلم ایمان کے بعد باقی حقوق اللہ سے متعلق ہے جیسے نماز روزہ حج وغیرہ۔

(۳) تیسرا ظلم وہ ہے جس کا بدلہ چکائے بغیر نجات نہ ہو سکے گی وہ ظلم حقوق العباد سے متعلق ہے۔ مظلوموں کو اللہ تعالیٰ لازماً ظالموں سے یا اس کی رحمت ہو تو اپنے پاس

سے بدلے دیکر ظالموں کو معاف فرمائے گا اس کے بغیر اس کی معافی ممکن نہ ہوگی۔ اس مضمون کو ایک جگہ حضرت انس رض سے مرفوعاً نقل کیا گیا ہے اس سلسلہ میں چند دوسری احادیث کا تذکرہ بھی مناسب ہوگا، مثلاً ترمذی شریف اور مسلم شریف میں حضرت ابوذر رض سے مرفوعاً یہ حدیث قدسی نقل کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ اے میرے بندے! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اس لئے تم بھی آپس میں ظلم نہ کرو۔" اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ سے بھی روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جس نے اپنے کسی بھائی پر ظلم وزیادتی کی ہو۔ اس کی عزت پر حملہ کیا ہو یا کچھ اور زیادتی کی ہو وہ ابھی آج ہی اس کے بوجھ سے اپنے آپ کو آزاد کرالے اس وقت سے پہلے جب کہ درہم و دینار اس کے پاس نہ ہوں۔ اگر اس کے پاس نیک اعمال ہوئے تو ظلم کی مقدار کے برابر اس کے اعمال صالحہ اس سے لیکر مظلوم کو دیئے جائیں گے اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوئیں تو مظلوم کی برائیاں اس پر ڈال دی جائیں گی۔ ایک اور روایت حضرت ابوہریرہؓ سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مفلس ہمارے نزدیک وہ ہے جس کے پاس درہم و دینار نہ ہوں اور دیگر ساز و سامان نہ ہو۔ آپؐ نے فرمایا مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز نماز، روزہ اور زکوٰۃ لے کر آئے گا۔ اس حال میں کہ کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا ہوگا تو ان مظلوموں کو اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی۔ اگر اس کی نیکیاں ان کے حقوق ادا کرنے سے پہلے ختم ہوگئیں تو ان کی خطائیں اس پر ڈال دی جائیں گی اور پھر اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اسی نوع کی حدیث ترمذی شریف اور مسلم شریف میں پائی جاتی ہے۔

محمد رضی الدین اقبال

اچھے بہن بھائیو!

• اگر کھانا کھانے کے بعد سونف میں قدرے شکر ملا کر کھانے کی عادت اختیار کرلیں تو معدہ ٹھیک رہے گا۔ بینائی قائم رہے گی۔ سونف تین گرام سے زیادہ نہ کھائیں۔

• چاندی کے زیور کو دہی کی لسی میں ۲۰ منٹ یا نصف گھنٹہ بھگو دیں۔ بعد میں کپڑے سے صاف کرلیں۔ نئے زیور کی مانند چمک دیں گے۔

• گنا بلڈ پریشر میں بہت مفید ہے۔ یہ جسم کو فربہ کرتا اور طاقت بخشتا ہے۔

• شہد پھیپھڑوں اور سینے کے امراض میں بے حد فائدہ مند ہے۔ شہد سے جسم کے زہریلے اثرات دور ہوتے ہیں۔ یہ جراثیم کو مارتا اور دماغ و جسم کو تقویت پہنچاتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ شہد اصلی ہو۔

• جامن کھانے سے خون صاف ہوتا ہے اور دانت مضبوط ہوتے ہیں۔

• ہر صبح لیموں عرق کے پانی سے کلی کرنے، مسواک یا برش کو لیموں کے عرق میں بھگو کر دانت صاف کرنے سے دانت مضبوط ہوتے ہیں اور دانتوں سے خون آنا بھی بند ہو جاتا ہے۔

• برسات کے دنوں میں لوہے کی اشیاء مثلاً چاقو، چھری وغیرہ کو ویزلین لگا کر رکھنا چاہیے تاکہ زنگ نہ لگے۔

• اگر ترکاری یا دال وغیرہ نہ گلتی ہو تو خربوزہ کے چھلکے کا سفوف چٹکی بھر ڈال دیں۔

جلد گل جائے گی۔

• ملیریا کے دنوں میں تلسی کے خشک پتوں کی دھونی دیں۔ اس کے دھوئیں سے مچھر بھاگ جاتے ہیں۔

• گرم اونی کپڑوں کو جراثیم سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو ان میں نیم کے خشک پتے رکھ دیں۔

• کانچ کے برتنوں کو اگر کبھی کبھی سرکہ اور نمک ملا کر صاف کیا جائے تو برتن کے داغ دور ہو جاتے ہیں اور یہ بالکل نئے ہو جاتے ہیں۔

• اگر آپ مطالعہ بہت کرتے ہیں یا کتابت کرتے ہیں تو اپنی آنکھوں اور دماغ کو تھکن سے بچانے کے لئے ہر آدھے گھنٹے بعد لکھنا پڑھنا پانچ منٹ کے لئے چھوڑ دیجئے یا آنکھیں بند کر کے بیٹھیے یا گھوم پھر کر آئیے۔ اس طرح اگر آپ سارا دن بھی لکھتے پڑھتے رہے تو زیادہ تھکن و سستی محسوس نہ کریں گے اور اپنے اعضاء کو چست پائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

غزل

دن نمودار ہوا ہے جیسے	رات پہ دار ہوا ہے جیسے
سوچ بڑھتی ہی نہیں خود سے پرے	جسم دیوار ہوا ہے جیسے
آدمی کیا ہوا بیدار کہ اب	ظلم بیدار ہوا ہے جیسے
کیا ملے اب تیرے سنسار سے لعل	خود ہی سنسار ہوا ہے جیسے

نت نئی سرخیاں پیشانی پر
چہرہ اخبار ہوا ہے جیسے

(نظام الدین نظام)

ہیرے کا ہار

فرانس کے ایک خوبصورت گاؤں میں ایک دلکش اور چنچل لڑکی میڈ لڈا نے گلاب کے پھول کی طرح کھل کر فضا میں بہت دور تک اپنی مہک پھیلا رکھی تھی حالانکہ یہ دلکش اور پیارا گلاب کیچڑ میں کھلا ہوا تھا۔ خدا نے میڈ لڈا کو حسن و جمال دینے میں کوئی کمی نہیں کی تھی لیکن بدقسمتی سے اس کی ولادت ایک معمولی غریب خاندان میں ہوئی تھی۔ اس کی بے شمار آرزوئیں اور تمنائیں دل ہی دل میں مچل رہی تھیں۔ وہ دنیا کے تمام عیش و مسرت پانے کے لئے آرزومند و بیتاب رہتی تھی لیکن غربت میں ہونے کی وجہ سے اس کی شادی عوامی اطلاعات کے وزیر کے ایک معمولی کلرک لوئیزل سے ہو گئی کیونکہ میڈ لڈا کے والدین زیادہ جہیز نہیں دے سکتے تھے۔

میڈ لڈا نام اور شہرت کے لئے بے چین تھی وہ خوشحال اور پر مسرت زندگی گزارنا چاہتی تھی اس کے دل میں آرزوؤں کا سمندر لہریں مار رہا تھا۔ وہ رہنے کے لئے خوبصورت محل چاہتی تھی جس کے ہر کمرے رنگ و ڈیزائن سے آراستہ ہوں جس میں ایک اچھا ڈرائنگ روم بھی ہو۔ بھڑکیلے اور دلکش لباس اور قیمتی زیور کی ہر وقت تمنا کیا کرتی تھی اور چاندی کے چمکتے ہوئے برتنوں میں لذیذ کھانوں کے خواب وہ اکثر دیکھتی

کرتی تھی لیکن میڈلڈا کی یہ تمنائیں دل کی دل ہی میں رہ گئیں کیونکہ ان میں سے کوئی چیز اس کے پاس موجود نہیں تھی۔ جس کی وجہ سے وہ بے چین اور مایوس رہتی تھی۔ اس کا خاوند لوئنرل جو اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ ہمیشہ اپنی بیوی کو خوش دیکھنا چاہتا تھا وہ میڈلڈا کو اپنی جان سے زیادہ پیار کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی بیوی ہمیشہ خوشحال زندگی بسر کرے اور دکھوں سے دور رہے۔

ایک دن میڈلڈا کے خاوند لوئنرل کو وزیر اطلاعات کے محل سے دعوت نامہ موصول ہوا۔ ایک بہت بڑے فنکشن میں دونوں کو دعوت دی گئی تھی۔ لوئنرل کا خیال تھا کہ اس کی بیوی اس خبر سے بہت خوش ہوگی اور فنکشن میں شرکت کے لئے بے چین ہو گی۔ اسے یقین تھا کہ اس دعوت سے بیوی کا اکیلا پن بھی دور ہو جائے گا اور وہ اپنی زندگی کی مسرتوں میں کھو جائے گی لیکن لوئنرل کی امیدوں کے برخلاف میڈلڈا رونے لگی۔ روتے ہوئے اس نے اپنے خاوند سے شکایت کی کہ فنکشن میں شرکت کے لئے اس کے پاس کوئی اچھی پوشاک نہیں ہے۔

لوئنرل بہت پریشان اور ناامید ہوا۔ اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے کیونکہ اچھے اور قیمتی لباس کے لئے اس کے پاس روپے نہیں تھے وہ اپنی بیوی کی آرزوؤں کو بھی پورا کرنا چاہتا تھا۔ کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے اپنی بیوی کو چار سو فرینک دیئے تاکہ وہ فنکشن میں شامل ہونے کے لئے اچھے لباس خرید سکے۔ لوئنرل نے یہ روپیہ اپنی بندوق کے لئے جمع کیا تھا لیکن اپنی بیوی کی خوشی کے لئے اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

فنکشن کا دن قریب آ گیا لیکن میڈلڈا اب بھی مایوس اور پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ اب اس کے پاس پہننے کے لئے کوئی بھی زیور نہیں تھا۔ اس نے اپنے خاوند سے کہا کہ بغیر زیور کے وہ رقص کے پروگرام میں نہیں جائے گی۔ اس پر اس کے خاوند نے یہ صلاح دی کہ زیور کے بجائے وہ قدرتی پھول کا ہار پہن لے۔ میڈلڈا کو یہ رائے پسند نہیں آئی اور اس کے لئے وہ رضامند نہیں ہوئی۔ اپنے خاوند کی اجازت سے

میڈلنڈا نے اپنی ایک امیر سہیلی فارسٹیر سے ہیرے کا ہار ایک دن کے لئے مانگ لیا۔

اپنے گلے میں ہار پہن کر وہ آئینہ کے سامنے آئی۔ آج میڈلنڈا پری لگ رہی تھی۔ اسے خوبصورتی پر رقص آ رہا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی رقص کے پروگرام کے لئے اپنے خاوند کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ بزم رقص میں آئی۔ سبھی عورتوں سے زیادہ وہ خوبصورت نظر آ رہی تھی اس نے سبھی مہمانوں اور یہاں تک کہ وزیر صاحب کا بھی دل جیت لیا۔ فنکشن میں آئے ہوئے سبھی مہمانوں کے ساتھ وہ رات بھر ناچتی رہی۔ صبح جب وہ اپنے خاوند کے ساتھ فنکشن سے لوٹی تو وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش ہو رہی تھی لیکن اس کی یہ خوشی چند لمحے ہی برقرار رہی۔ جب وہ اپنے کپڑے اتارنے لگی تو اس کی نظر اپنے گلے پر پڑی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں اس کے گلے سے وہ ہیرے کا ہار غائب تھا۔ دونوں میاں بیوی بدحواس ہونے لگے۔ اس ہار کو فوراً تلاش کرنے لگے لیکن وہ ہار نہیں مل سکا۔

آخر لوئنزل اور میڈلنڈا دونوں نے فارسٹ
لکھا کہ اس کے ہار کا کانٹا ٹوٹ گیا ہے اور وہ ا
ٹھیک کرانے کے بعد اسے لوٹائے گی۔ انھوں نے
دوکان پر دوسرا ہیرے کا ہار دیکھا جو کھوئے
ہار کی طرح تھا جس کی قیمت ۲۰ ہزار فرینک تھ
بڑی قیمت سن کر وہ دونوں گھبرائے کیونکہ اس
خریدنے کے لئے اس کے پاس روپیہ نہیں تھا۔
نے بڑی مشکل سے ادھار لے کر اس ہار کو خرید
اور فارسیٹر کو واپس کر دیا۔

اب دونوں کے سامنے اس بات کا سوال
اس دولت کو کیسے چکائیں۔ دونوں نے اس
کو چکانے کے لئے محنت و مشقت شروع کر دی۔
اپنے دفتر میں دن رات کام کرنے لگا۔ میڈلنڈا
کو ہٹا کر گھر کا سارا کام خود کرنے لگی۔ اس طرح
دس سال تک وہ محنت و مشقت کرتے رہے او
دوران اپنی حیات کو بہت ہی کفایت شعاری سے
آخر دس سالوں میں اس قرض سے سبک دوش
میڈلنڈا اب اپنے حسن و جمال کو اور جوانی

باقی مضمون گھوڑا کے بعد ملاحظہ

گھوڑا

رات کو ۹ بجے جب جمن نے سواری کو گھر چھوڑا اور سیمسن کو آگے کی طرف بڑھنے کے لیے لگام سے اشارہ کیا تو وہ اڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "چل بیٹے" کہہ اس نے پھر لگام ہلائی لیکن سیمسن ٹس سے مس نہ ہوا ایک دو بار پچکارنے اور پھر ڈانٹنے اور چابک کے ڈر سے بھی سیمسن آگے نہ بڑھا تو جمن نیچے اترا۔ چکنے چمڑے سے پسینہ بہہ رہا تھا منہ کے دونوں طرف جہاں لوہے کی لگام لگی تھی جھاگ نکل رہا تھا اور دانتوں سے سیمسن لوہے کو چبانے کی کوشش کر رہا تھا جمن نے اس کی گردن تھپتھپائی۔ "تھک گیا بیٹے؟ کب تک گھاس کھا کر بوجھ کھینچے گا؟" — جمن اس سے باتیں کرتا رہا اور سیمسن سمجھتا رہا۔ "آج سے تجھے چنا کھلاؤں گا سمجھا؟ آٹھ گھنٹے کی دوڑ اور کھانے صرف گھاس ہٹہ ہی مہینے میں چل بسا۔"

سیمسن نے کان پھڑپھڑا دیے۔ سمجھ گیا تھا، میری بات؟" جمن نے اس کی لگام تھام لی اور اسے پکڑے آگے آگے چلنے لگا۔ کئی لوگوں نے راستے میں آ لیکن اس نے کہہ دیا کہ تانگہ خالی نہیں۔

جمن منڈی میں آ کر رک گیا۔ تانگے کے سامنے سے گھاس نکال کر سیمسن کے منہ کے سامنے ڈال کر اس کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

بیڑی سلگائی اور قمیص کی جیب سے اپنی دن بھر کی کمائی نکالی۔ گیارہ کے نوٹ نکلے اور کچھ ریزگاری، ایک دوکان میں کچھ امید دکھائی دے رہی تھی۔ دو روپے کے چنے لیے۔ پوٹلی میں باندھ کر تانگے کے سامنے رکھے۔ بچی ہوئی گھاس سمیٹ کر اٹھالی۔ تانگے پر چڑھ کر لگام ہاتھ میں لی اور گھر کی طرف موڑ دیا۔

دو روپے کے چنے اور دو روپے کی گھاس روز کھلاؤں گا تو سیمسن کو آٹھ کے بدلے دس گھنٹے بھی جوت سکتا ہوں۔ تقدیر نے اگر ساتھ دیا تو دو تین روپے اور پیٹ لوں گا۔

گھر کی گلی میں تانگہ موڑ دیا۔ دروازے پر فریدہ کھڑی تھی۔ تانگہ رکا اور اس کی آواز گلی میں گونج گئی۔ "کیوں اتنی جلدی آ گئے؟ دو گھڑی تم کو گھر کے باہر نہیں رہا جاتا؟ اگر ایسا ہی ہے تو کل سے بہتر سوچ کر تم گھر چلے جانا۔ تانگہ

میں ہانکو گی۔

جمن کے ہونٹ کچھ بولنے کی کوشش میں بدبدائے
پھر تھوک نگل کر اس نے جواب دینے کی سعی نہیں کی۔
تانگے پر سے ہی اس نے چنے کی پوٹلی اٹھا کر فریدہ
کی طرف بڑھا دی۔ وہ جیسے کھڑی تھی ویسی ہی کھڑی
رہی پوٹلی لینے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔
کیا ہے یہ؟ اس نے پوچھا۔
جمن کی ہمت نے پھر ساتھ چھوڑ دیا۔ زندگی میں
پہلی بار اپنی خواہش سے کچھ خرید کر لایا تھا۔ جب سے
اس کی شادی فریدہ کے ساتھ ہوئی تھی تمام باتوں کی
ذمہ داری اس نے اپنی طرف لے لی تھی تانگہ بھی اس نے
اپنے زیورات فروخت کر کے بنوایا تھا۔ سیمسن کے
پہلے، "موتی" تھا۔ موتی فریدہ کے ماموں جان کا گھوڑا
تھا۔ گدھے کا قد، مریل، ہڈیوں پر پیلا چمڑا، بڑھاپے کی
کے ساتھ منڈھا ہوا۔ جب موتی کی قیمت رفتہ رفتہ
ادا کر دی گئی تو فریدہ نے سوچا کہ اسے کچھ زیادہ قیمت
میں فروخت کر کے بڑا اور مضبوط گھوڑا خرید لیا جائے۔
"موتی" فروخت کیا گیا اور سیمسن آیا بقیہ رقم قسطوں
میں ادا کر دی گئی۔
تانگے کی مرمت کروانا، ٹوٹا ہوا سامان بدلوانا
سیمسن اور گھر کے افراد کے کھانے کا انتظام کرنا فریدہ
کام تھا اور صبح گھوڑے کو جوت کر تانگہ ہانکنا اور
کما کر فریدہ کے ہاتھ میں لا کر رکھنا جمن کا۔
اپنی مرضی سے دو روپیہ کے چنے خرید کر لانا
کے اختیارات میں دخل دینا تھا۔ وہ خاموش رہا
نے سوچا شاید بغیر بولے کام چل جائے۔ فریدہ
خاموشی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔
"منہ باندھے کیوں بیٹھا ہے مردے؟
بولتا کیوں نہیں؟
"چنا ——!" صرف ایک ہی لفظ اس کے
سے نکل سکا۔
"مردہ ہو میاں کہ —— فریدہ چلائی "کیا
گھگھی بندھ گئی؟ —— آسمان سے چنے کی پوٹلی ٹپک
تانگہ پر گری نہ ہو گی؟ کہاں سے لائے ہو؟ کس لئے
جلدی بتاؤ کیوں بیکار میرا وقت ضائع کر رہے ہو
روٹی بھی پکانا ہے!"
اچھا اب سیمسن چنے کھائے گا گھاس سے پیٹ
نہیں بھرتا اس کے کا۔ اس چنے کو ناکوں نہ چبوا
میرا نام فریدہ نہیں —— ایک لمحہ کے آرام کے بعد
نے پوچھا —— کتنے روپے پھونک آئے اس میں

"وہ" بجن نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تمہارے بیٹے کی عقل گھاس چرنے جاتی ہے۔ اور تمہارا گھوڑا گھاس پھنکتا ہے۔ دس روپے روز کا چنا اگر سیس کھائے گا تو بچوں کو ایک شام بھوکا رہنا پڑے گا سمجھے! تم جیسے بیوقوف سے شادی کرکے تو میری زندگی تباہ ہو گئی۔ غصہ میں فریدہ نے بجن کے ہاتھ سے چنے کی پوٹلی چھین لی۔

"تم سمجھتی نہیں ہو فریدہ۔!"

"میں نہیں سمجھتی تو پھر کیا تمہارا باپ سمجھتا ہے جو پانچ سال سے پلنگ توڑ رہا ہے۔ فریدہ کی زبان بے لگام ہو چکی تھی۔ وہ سوچ سوچ کر بجن کا دل دکھانے کی باتیں کر رہی تھی۔

"چل بیٹے" کہہ کر بجن نے گھوڑے کی پیٹھ پر لگام چھنکائی اور تانگہ آگے بڑھا دیا۔

"گیارہ بجے کے قبل گھر میں قدم بھی نہ رکھنا کہے دیتی ہوں" یہ پلنگ پر لیٹے لیٹے بجن کے والد نے سب سن لیا تھا۔ فریدہ زور سے چیخنے کے باعث ہانپتی ہوئی اندر آئی اس کے دماغ کی گرمی کم کرنے کے ارادے سے انھوں نے کہا۔

"بجن کو پتہ نہیں کب عقل آئے گی؟"

"تم قبر میں پیر لٹکائے ۷۰ سال سے بیٹھے ہو جب بھی تمہیں عقل نہیں آئی تو تمہاری اولاد کو کیا آئے گی" یہ کہہ کر فریدہ دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"کیا کیا اس نے فریدہ؟" ابا میاں پھر بولے۔

"بیوقوفی کے سوا اور کیا کر سکتا ہے۔ دو روپے کھو آیا۔ آج سے سیس چنا کھائے گا اور گھر کے لوگ فاقہ کریں گے۔"

ابا میاں تھوڑی دیر خاموش رہے۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ طوفان تھم گیا تو بولے "سیس جو چنا کھائے گا تو محنت بھی زیادہ کرے گا۔ چنے کے دو روپے تو نکل آئیں گے اس کے بعد بھی فائدہ ہے۔"

فریدہ پھر کڑکی لیکن اس کی کڑک میں پہلے جیسی گرمی اور تیزی نہیں تھی۔ "خاک فائدہ ہے آٹھ گھنٹے تو کام ہوتا نہیں میاں دس گھنٹے کھا کر تانگہ چلائیں گے"

"یہی تو سوال ہے فریدہ؟" ابا میاں نے کروٹ بدلی اور فریدہ کے دماغ میں ایک نیا سوال گونجا۔

سوا گیارہ بجے بجن نے تانگہ کھول دیا۔ گدیاں اور چمڑے کے پٹے اٹھا کر کمرے میں رکھے۔ سیس کو سامنے کے کمرے سے اندر لے جا کر برآمدے میں باندھا

پانی کا پیالہ اٹھائی تو دیکھا کہ چنے جھکڑے گئے ہیں۔ جمن مسکرایا۔ فریدہ سے کہے کیونکہ بھول کی بہت اچھی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا سیمسن کے سامنے چنے کی بالٹی ڈال کر بولا۔ "لے کھا بیٹا آج سے روزانہ تیری دعوت ہوگی۔ ہاتھ منہ دھو کر کمرے میں گئے لالٹین جلانے کے لئے ماچس کی تیلی ڈبیہ میں رگڑ رہی تھی کہ فریدہ اپنے کونے سے چلائی گھنٹے بھر سے پتہ نہیں کیا کر رہے ہو۔ اب بتی مت جلانا۔ کھا کر چپ چاپ پڑ رہو۔

جمن غریب گھبرا کر اندھیرے ہی میں کھانا کھانے لگا۔ دال اور روٹی تھی۔ مگر رات کے سناٹے میں نوالوں کے چبانے سے ایسی آواز نکل رہی تھی جس سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بہت بھوکا ہے اور مزے لے کر کھا رہا ہے برآمدے میں سیمسن کی دعوت ہو رہی تھی وہ بالٹی پر منہ مار اور منہ سے ادھر ادھر سرکا کر جمن کے برابر ہی شور کر رہا تھا۔ فریدہ تھوڑی دیر تک سنتی رہی پھر بولی کھا چکے کیا؟"

ابھی نہیں۔ جلدی ختم کئے دیتا ہوں۔" ذرا لالٹین تو جلاؤ" فریدہ بولی۔

جمن کو کچھ حیرت تو ہوئی لیکن بغیر وجہ دریافت کئے اس نے لالٹین جلادی۔ فریدہ اچھی چھینکے پر سے چھوٹی سی ہنڈیا اتار کر آہستہ سے جمن کے پاس بیٹھ کر ہنڈیا کے اوپر سے بندھا کپڑا کھولا اور کٹوری میں دوپ بھر کر گھی ڈال دیا۔ اچانک جمن کو احساس ہوا کہ جیسے وہ بھی گھوڑا ہے جس کی باگ ہمیشہ فریدہ کے ہاتھ رہتی ہے۔ (بشکریہ گل کدہ)

ملکہ کا الٹا سنہرا ہیرے کا ہار

تھی۔ وہ بوڑھی نظر آنے لگی تھی۔ اب وہ صرف غریب اور خانہ دار خاتون ہی رہ گئی تھی۔ ساری خوبصو نزاکت و دلکشی ختم ہو چکی تھی۔ ایک دن میڈ لڈا نے اپنی امیر سہیلی فارسٹیر کو دیکھا جو اب بھی جوان ا خوب رو لگ رہی تھی۔ فارسٹیر میڈ لڈا کو پہچا سکی کیونکہ وہ اپنی صورت بدل چکی تھی۔ فارسٹ میڈ لڈا سے اس کے حالات زندگی پوچھے۔ ج کی وجہ سے وہ اتنی کم عمر میں بوڑھی ہو گئی تھی۔ م نے ہار کے گم ہونے اور خریدنے کا قصہ کہہ س اس حادثہ کو سن کر فارسٹیر حیرت زدہ رہ اور وہ میڈ لڈا پہ افسوس کرنے لگی۔ اس نے ک ہائے بیچاری میڈ لڈا میرا نیکلس ہیرے کا صرف اچھے کانچ کے شیشے کا تھا جو ہیرے لگ رہا تھا وہ نقلی ہار تھا جس کی قیمت صرف

کیا آپ کو علم ہے؟

مرسلہ: کے ایم راگی

• برف کے زیادہ استعمال سے معدہ کمزور ہو جاتا ہے۔ بھوک میں کمی ہو جاتی ہے اور قوت ہاضمہ میں فتور پیدا ہوتا ہے۔ برف دانتوں کو کمزور اور ان کی جڑوں کو خراب کر دیتی ہے پائیوریا کو بنائے رکھتی ہے۔ نزلہ زکام کی تحریک کرتی ہے۔ کھانسی۔ بلغم۔ تشنج اور درد وغیرہ کے امراض میں سخت مضر ہے۔

• جن لوگوں کو روزانہ خوراک میں گیہوں کی روٹی، خالص گھی یا مکھن، دودھ، دہی لسی، سبزیاں اور دالیں شامل رہتی ہیں۔ ان میں طاقت جرأت، عزم اور حوصلہ اور قوت برداشت پیدا ہوتی ہے اور وہ طویل عمر پاتے ہیں۔

• امرود اختلاج قلب کے لیے بے حد مفید ہے۔ روزانہ نہار منہ ایک تازہ امرود کھا لیا جائے تو دل کو فرحت حاصل ہوتی ہے اس کے مستقل استعمال سے اختلاج قلب کی شکایت ہی رفع ہو جاتی ہے۔ امرود دل دماغ اور معدے کو طاقت دیتا ہے۔

• پانی میں لیموں کے چند قطرے ملا کر پی لینے سے معدہ صاف رہتا ہے۔ موسمی بخار میں لیمو بے حد مفید ہے۔ لیموں کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر آتا ہے اور عام صحت بھی اچھی رہتی ہے۔

• آلو بخارا دل کے لیے بے حد مفید ہے دل کے سارے امراض خفقان اور اختلاج میں بے حد مفید ہے۔

دل کے ایسے مریضوں کو جو قبض میں مبتلا ہوں آلو بخارا خاص طور پر مفید ہے آلو بخارا قبض کو دور کرتا ہے۔ دل کو طاقت دیتا ہے۔

دو غزلیں

(نجم منظر نگری)

ایک ایک بوند کو ترسا کے گزر جائیگا
یہ گرجتا ہوا بادل سے بے اتر جائیگا

بنکے چٹان جو طوفاں میں ٹھہر جائیگا
اک نہ اک دن وہ سمندر سے ابھر جائیگا

موت کو ہنس کے گلے سے جو لگا لیتا ہے
بے خطر آگ کے دریا سے گزر جائے گا

زخم پر آپ نہ الفاظ کا مرہم رکھئے
وقت آئے گا تو یہ آپ ہی بھر جائیگا

میں ہی اب انکی نگاہوں میں ہوں مجرم وفا
اب تو الزام ہر اک میرے ہی سر جائے گا

نجم آ جائے گا پل بھر میں وہ تنکے کی طرح
جو کوئی وقت کے طوفان سے ڈر جائیگا

دیوانے جب وفا کی حدوں سے گزر گئے
وہ ڈھونڈتے پھرے کہ مسافر کدھر گئے

الزام سارے اس لئے رہبر کے سر گئے
رہرو جو ساتھ تھے وہ غلط راہ پر گئے

بیٹھے تو فرشِ خاک کی تہ میں اتر گئے
اٹھے تو ہم حدودِ فلک سے گزر گئے

ہر تلخ بات ان کی گوارا تو کی مگر
کچھ لفظ نیشتر تھے جو دل میں اتر گئے

با پردہ ملزموں کی طرح خاموشی سے ہم
منہ ڈھانپ کر ہجومِ جہاں سے گزر گئے

اے نجم مجھ کو کیوں نہ بصد شوق ہو قبول
جاگیر غم کی جب وہ میرے نام کر گئے

اقوال زرّیں

بشارت حسین

۱۔ آسمان اونچا ہے مگر انسان کا تخیل اس سے بھی اونچا ہے۔

۲۔ سمندر گہرا ہے اس کی تہہ میں غوطہ زن غوطہ مارتے ہیں اور طرح طرح کے بیش بہا موتی نکالتے ہیں۔ مگر انسان کا دل اس سے بھی گہرا ہے کیونکہ اس میں کسی غوطہ زن کا گزر نہیں۔

۳۔ موتی بیش قیمت چیز ہے۔ مگر آنکھ انمول موتی ہے۔

۴۔ معمر شخص بزرگ ہے۔ مگر دانا شخص بزرگ تر۔

۵۔ آگ کی لپیٹ جسم کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ مگر غصہ کی لہر روح تک کو جلا کر سیاہ کر دیتی ہے۔

۷۔ تلوار گہرا زخم کر دیتی ہے مگر زبان کا زخم اس سے بھی گہرا ہوتا ہے۔

۸۔ آئینہ نازک ہے مگر انسان کا دل نازک تر۔

۹۔ پہاڑ بھاری ہے مگر مصیبتوں کا پہاڑ اس سے بھی زیادہ بوجھل۔

۱۰۔ برا کام گناہ ہے مگر برے کام کا خیال کرنا یا تصور باندھنا گناہ عظیم ہے۔

۱۱۔ نیل سے کپڑے سیاہ ہو جاتے ہیں مگر گناہوں سے دل کی گہرائی تک میں سیاہی جم جاتی ہے۔

۱۲۔ کالی گھٹا والی رات سخت اندھیری ہوتی ہے مگر بے یار و مددگار انسان کی دنیا اس سے بھی زیادہ تاریک ہوتی ہے۔

۱۳۔ عطر کی مہک دل خوش کن ہے مگر انسانی نیکیوں کی خوشبو ایک عالم کو معطر کر دیتی ہے۔

۱۴۔ یادداشت اچھی چیز ہے مگر دماغ بہترین کیمرہ ہے۔

۶۴ سالہ بوڑھا نس بندی کا شکار

اس کی بیوی کا درد بھرا خط!

محترم ایڈیٹر صاحب۔ سلام مسنون

میرے شوہر جناب محبوب صاحب، مہتاب صاحب پرفیع، ایک سیدھے سادھے غریب اور ان پڑھ ۶۵۔۶۴ سالہ ضعیف آدمی ہیں۔ دو ڈھائی سال پیشتر زبردستی اور مکاری سے کی گئی نس بندی ایکم کے شکار ہو گئے ہیں اور اس وقت سے ابتک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔

میرے شوہر کو نوکری سے ریٹائرڈ ہو کر بھی چھ سال کا عرصہ ہوا ہے ہمارے تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ آخری بچے کی عمر ۱۲ سال ہو چکی ہے۔ ہمارے چھ پوتے اور گیارہ نواسے نواسیاں ہیں۔ اس عمر کے بوڑھے شخص (میرے شوہر) کا جس زبردستی اور مکاری سے نس بندی آپریشن کیا گیا ہے اور اس آپریشن کے بعد سے میرے شوہر پر کیا کیا تکالیف گزری ہیں۔ وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے جب میرے شوہر نے مرکزی وزیر صحت کے نام اپنی تکالیف کا ذکر کیا اور اپنے علاج کے لئے عرض کیا تو اس کے جواب میں (ہمارا خط) بمبئی کی وزارت کا جو ایک جواب آیا ہے جس میں ہمیں پرسہ دینے کی کوشش کی گئی ہے اس کے ایک ایک پیراگراف سے تسلی کے بجائے ہمارے دل سے دل خراش ہائے ہی نکلی ہے۔

بمبئی کے وزارت صحت کے مذکورہ خط کا خلاصہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر میرے شوہر مر جاتے تو ان کی بیوی، بچوں کو اس کا معاوضہ ملتا چونکہ وہ ابھی زندہ ہیں لہٰذا ہمیں

ہیں، حالانکہ ان کی زندگی موت سے بدتر بنی ہے، ان کو معاوضہ نہیں ملتا۔ شاید اب اگر مر بھی جائیں (ایسی ہی ان کی حالت ہے) تو بھی یہ کہا جائے گا کہ اگر وہ جلدی سے مر جاتے تو اس کا معاوضہ ملتا۔ تڑپ تڑپ کر اور اتنے دن لگا کر مرنے سے کچھ نہیں ملے گا۔

میرے شوہر کے ساتھ جس بے دردی سے ظلم کیا گیا ہے اس کی درد بھری داستان اس خط سے ہو سکتی ہے جو اس وقت کے مرکزی وزیر صحت جناب راج نرائن جی کو میرے شوہر نے لکھا تھا اور جس کا خلاصہ آپ کو بھی بھیج رہی ہوں۔

ہم نے تو کہا تھا کہ جلد سے جلد تحقیق ہو اور جلدی سے جلدی میرے شوہر کا اس طرح سے علاج ہو کہ انھیں موت کے منہ سے بچا لیا جائے۔ ہمیں ان کی زندگی عزیز ہے۔ میرے شوہر کی موت کے بعد بھی یہ ڈھنڈورہ پیٹنے والے کس طرح اس عظیم نقصان کی بھرپائی کر سکتے ہیں؟ جان جانے کے بعد تو واپس آ نہیں سکتی۔ اگر یہ کچھ کر سکتے ہو تو ہمیں یہ ہے کہ کسی طرح ان کی جان بچانے کی کوشش کرو نہ کہ ٹال مٹول میں قیمتی وقت چلا جائے۔ میرے شوہر کی یکم مئی ۱۹۷۰ء کی درخواست کا جواب بمبئی کی وزارت صحت نے یکم جولائی ۱۹۷۰ء کو دیا ہے۔ جس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ میرے شوہر کا زبردستی سے نیلی پیلا تک کا آپریشن کیا گیا ہے یا نہیں اس کی انکوائری کرنے کا حکم پونا کے "سسنپالک" آروگیہ کلتب کلیان" کو دیا گیا ہے۔

جو تحقیق کرکے ہمیں جواب دیں گے مگر پانچ مہینے بھی گذر گئے۔ ابھی تک ان کا کوئی جواب نہیں آیا اور اگر آئے گا بھی تو شاید وہ میرے شوہر کی موت کے بعد آئے گا اور کوئی ٹال مٹول کی باتیں لکھ کر آئے گا

کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ ہم غریب جنتا پر جو بھی ظلم ہوا ہے اسے صرف سہتے ہی جائیں زبان سے اُف تک نہ کریں مگر دل نے نہیں مانا۔ دل کی آخری بھڑاس نکالنے کے لئے

… کے ذریعہ اس کی تشہیر چاہتی ہوں۔

بمبئی کی وزارت صحت نے ہمیں یہ … مشورہ دیا ہے کہ ہم اپنے شوہروں کسی … سرکاری دوا خانے میں لے جا کر صلاح … مشورہ لیں اور علاج کرالیں۔ جس سرکاری … ٹر اور جن سرکاری دوا خانوں میں اس … ح کا بے دردانہ عمل ہوتا ہے وہاں جانے … ے لئے ہمارے پیر بھی کیسے اٹھیں … لے؟ یہ ہمارے قاتل ہیں مسیحا کیسے بن … سکتے ہیں؟

کسی طرح ہم "فرن ہاسپٹل" … نہ جاتے ہوئے "مولے" ہاسپٹل گئے … ہاں کے ڈاکٹر نے میرے شوہر کی حالت … ی بگڑی ہوئی دیکھ کر کہا کہ "مریض کو … یہاں تک لانے کی ضرورت نہیں۔ میں … نجکشن لکھ کر دیتا ہوں۔ یہ انجکشن مکان کے قریب کے کسی ڈاکٹر سے لگوالو۔

مگر اب تو حالت اتنی بگڑ گئی ہے … مکان سے دو فرلانگ دور والے ڈاکٹر … ب بھی چلا نہیں جا سکتا۔ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ کسی سواری کا انتظام کر سکیں۔

پکڑ دھکڑ کر کسی طرح دو تین دن سے لے جاتے ہیں تو ان کو دواخانہ تک پہنچتے پہنچتے بخار چڑھنے لگتا ہے اس طرح وہ ڈاکٹر منع کرتا رہتا ہے "آج نہیں کل انجکشن کریں گے"۔ اس طرح ہی دن بیت رہے ہیں اس حالت کو دیکھ کر مجھے ابھی سے وہ دن یاد آ کر رونا آ رہا ہے کہ علاج سے محرومی کی وجہ سے میرے شوہر اب زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکیں گے۔

اگر موجودہ حکومت حقیقی معنوں میں جنتا کی غم خوار ہے تو کیا یہ ضروری نہ ہوگا کہ ایک ایسے مظلوم کی خاطر جس طرح کے مظلوموں کی وجہ سے ہی آج وہ گدی نشین ہے کسی اچھے ڈاکٹر کو مکان پہنچ کر علاج کرانے کا انتظام کرے یا مریض کو کسی اچھے دواخانے آتے اور علاج کروانے کا پیسوں سے انتظام کرے۔

بمبئی کی وزارت صحت کا خط پڑھ کر

سب سے بڑا دکھ تو اس وقت ہوا جب خط میں دیکھا کہ:۔

میرے شوہر کا زبردستی سے فیملی پلاننگ کا آپریشن کیا گیا (اگر ثابت بھی ہوجائے) تو نقصان بھرپائی کرنے کا. بھارت سرکار کا کوئی حکم نہیں ہے!

ہمیں اس بات پر یقین ہی نہیں آرہا ہے کہ جنتا کی سرکار اپنی جنتا کے ساتھ اس طرح کی ناانصافی کرسکتی ہے کہ بمبئی کی وزارت کو تو اس بات کا افسوس ہے مگر دہلی کی وزارت کو اس کا احساس نہیں. جسے خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کا نام بدل کر خاندان بہبود پروگرام رکھا ہے کیونکہ اسکے وسیع معنی ہیں۔ اس خط کا خلاصہ جسے میرے شوہر نے اس وقت کے مرکزی وزیر صحت راج نرائن جی کو لکھا تھا.

تھوڑا پیسہ تو چھوٹی بیٹی کی شادی میں خرچ ہوا اور باقی پیسہ ہمارے کھانے پینے اور بڑے بیٹے (T.B کے مریض) کے علاج میں بڑی بیٹی اور اس کے بچوں کو سنبھالنے میں خرچ ہوا کیونکہ اس کا شوہر مہنگائی سے تنگ آکر کئی سالوں تک بے پتہ چلا گیا تھا۔ ایسی پریشانی کے عالم میں ایک شخص (فیملی پلاننگ کا ایجنٹ) ڈشکال فنڈ سے پیسہ (الاؤنس) دلانے کے بہانے میرے شوہر کو ڈفرن ہاسپٹل کے عملہ کے تابع دے دیا. میرے شوہر نے جب ڈرتے ڈرتے، قحط سالی (ڈشکال فنڈ) کا ذکر کیا تو ڈاکٹر نے کہا کہ پہلے ٹیبل پر سو جاؤ۔ اس طرح ان کا زبردستی اور مکاری سے نس بندی کا آپریشن کیا گیا اور انھیں (میرے شوہر کو) کہا گیا کہ ان کا صرف خون ٹسٹ کرنا ہے (آپریشن نہیں کیا) اب ہر ہفتہ آکر پیسے لے کر جاتے جاؤ: یہ کہہ کر دلال نے پورا پیسہ آپریشن الاؤنس کا خود رکھ لیا اور میرے شوہر کے ہاتھ میں صرف بیس روپئے دئے اور اس میں سے بھی شراب پینے اور سوڈا واٹر پینے کی فرمائش کرکے خرچ کرایا.

اس روز سے میرے شوہر کا مزاج بگڑنا شروع ہوا۔ انھوں نے (میرے شوہر

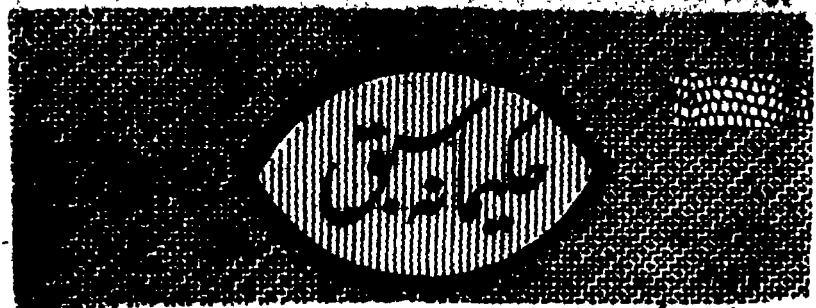
نے اس بارے میں مکان میں کچھ نہیں سنایا تھا۔ ان کا سر چکرا رہا تھا۔ پیٹ میں مروڑ ہو رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں میں دم نہیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ دوسرے دن سے پاخانے اور پیشاب کی کثرت ہونے لگی۔ مزاج میں چڑچڑاہٹ آگئی تھی اور رفتہ رفتہ وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے تھے اور بار بار موت کی دعا مانگ رہے تھے۔ آٹھ دن کے بعد معلوم ہوا کہ ان کا نس بندی کا آپریشن کیا گیا ہے۔

آپریشن کے دو مہینہ بعد انہیں بلڈ پریشر کے مریض کی حیثیت سے کچھ دنوں تک دواخانے میں انڈور پیشنٹ بناکر رکھا گیا۔

دواخانے سے ڈسچارج ہونے کے بعد پتلے پاخانے شروع ہوئے جو پاخانہ تک پاجامے میں ہی ہونے لگے۔

ان پر پورے کنبہ کی بھاری ذمہ داری کا بوجھ اور اپنے علاج کے لئے پیسوں کے لالے وغیرہ کا ذکر کرکے مرکزی وزیر صحت سے التجا کی کہ تحقیق کرنے کے بعد کسی اچھے ڈاکٹر سے ان کا علاج کرایا جائے اور اگر صحت یاب نہ ہو سکے تو اپنے پریشان کنبہ کو وزارت صحت کے سپرد کئے جانے کی بات لکھ کر خط کا اختتام کیا تھا۔

مالن جی زوجہ محبوب صاحب مہتاب صاحب شیخ ۲۴، لکشمی پیٹھ (بلاری چالی)، شولاپور (مہاراشٹر)



ایک مرتبہ کچھ امرا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے یہاں مہمان ٹھہرے۔ آپ نے باورچی سے کہا کہ کھانا دیر سے لانا۔ چنانچہ جب کھانے کا وقت آیا اور مہمانوں کو بھوک لگی تو وہ کھانا نہ پاکر پریشان ہونے لگے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان کے چہروں کو بھانپ لیا۔ مگر کھانا منگوانے میں اور دیر کردی۔ جب مہمانوں کو بھوک بہت ستانے لگی تو عمر بن عبدالعزیزؒ نے باورچی سے کہا کہ جو کچھ حاضر ہے وہی لاؤ۔ باورچی کچھ ستو اور کھجوریں لایا۔ بھوک بہت ہونے کی وجہ سے مہمانوں نے بڑے مزے سے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ تھوڑی دیر کے بعد اصل کھانا لایا گیا جس میں قسم قسم کی لذیذ چیزیں تھیں۔ مگر مہمانوں نے کہا کہ ان کا پیٹ بھر چکا ہے وہ نہیں کھائیں گے۔ حضرت عمرؒ نے بہت اصرار کیا۔ آخر مہمانوں نے چند لقمے لیے اور کہنے لگے ہم کھجوروں اور ستوؤں سے سیر ہو چکے ہیں اس لیے یہ لذیذ کھانا اب نہیں کھا سکتے۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا:

"جب ایسی سادہ غذا انسان کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہے تو پھر پیٹ بھرنے کے لیے عمدہ غذا کی طرح لوگ ناجائز وسائل کیوں تلاش کرتے ہیں۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے یہ حکیمانہ نصیحت سن کر مہمانوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

خواہش نفس

جو کچھ ہمارا جی چاہتا ہے۔ اسی کو خواہش نفس کہتے ہیں۔ اس کو مثالوں سے سمجھئے۔ ایک شخص کا جی چاہتا ہے کہ اس کے پاس بہت سارو پیہ ہو۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ مالدار ہو جائے۔ اسی طرح ایک شخص کا جی چاہتا ہے کہ وہ بڑے ٹھاٹھ سے رہے۔ اچھا کھائے اچھا پہنے۔ اچھے مکان میں رہے۔ رنگ رلیاں منائے۔ اس کے بہت سے نوکر چاکر ہوں۔ اس کے بال بچے آرام سے رہیں۔ لوگ اس کی عزت کریں۔ اسے بڑا سمجھیں۔ اسی طرح اور بہت سی باتیں ہیں جن کو جی چاہتا ہے تو اس طرح جو کچھ جی چاہے گا اس کو خواہش نفس کہیں گے

خواہش نفس کا محرک:۔ خواہش نفس کا محرک یعنی خواہش نفس کیسے پیدا ہوتی ہے۔ کسی بات کے لئے انسان کا جی کیوں اور کیسے چاہنے لگتا ہے۔ اس کے دو سبب ہیں۔

اول ایسی خواہشیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرتے وقت ہی اس کے اندر رکھدی ہیں جیسے بھوک۔ جب بھوک لگتی ہے تو انسان کا جی چاہتا ہے کہ کچھ کھائے۔ جیسے لباس۔ جب انسان کو سردی گرمی ستاتی ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ گرمی سردی سے بچنے کے لئے جسم کو کسی چیز سے ڈھانکے۔ یہ خواہشیں قدرتی کہلاتی ہیں۔

دوسری چیزیں وہ ہیں جن کو انسان دوسروں کی دیکھا دیکھی چاہنے لگتا ہے جیسے ایک آدمی نے کسی بڑے آدمی کو ٹھاٹ سے رہتے بستے دیکھا تو اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ بھی اسی طرح رہے بسے۔ ایک آدمی نے کسی کے گھر کوئی خاص طریقہ دیکھا۔ اس کا جی چاہنے لگا کہ اس طریقے کو اپنالے۔

کہیں جوا ہوتے دیکھا، ناچ گانا ہوتے دیکھا۔ کسی کو شراب پیتے دیکھا۔ تماشا ہوتے دیکھا۔ اسی طرح کی اور بہت سی باتیں دیکھیں تو اس کا جی وہی باتیں کرنے کو چاہنے لگا۔

<u>اچھی بری خواہشیں</u>:۔ اوپر مثال کے طور پر جو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ان کے بارے میں سوچیے تو ان میں سے کچھ خواہشیں تو بری نہیں ہوتیں اور کچھ بری ہوتی ہیں۔ بھوک لگے اور کھانے کو جی چاہے تو یہ قدرتی مانگ ہے اور یہ خواہش بری نہیں۔ یہ خواہش بری اس وقت کہلاتی ہے جب انسان دوسروں سے چھین کر اپنا پیٹ بھرے۔ اسی طرح سردی لگنے پر لباس کی خواہش بری نہیں لیکن چوری کرکے لباس حاصل کرے اور پہنے تو یہ بری بات ہے۔ خود اس آدمی کے لئے بری ہو۔ جیسے ایک شخص کا جی چاہے کہ وہ زہر کھالے یا ندی میں چھلانگ لگادے اور ڈوب کر مرجائے تو اس طرح وہ اپنی جان کا نقصان کر بیٹھے گا۔ اس طرح کی خواہش خود اس کے اپنے نفس کے لئے بری ہوگی لیکن ایسی خواہش بہت ہی بری ہوتی ہے جو پورے معاشرے اور سماج کے لئے بری ہو۔ لوگوں کے ذہنوں پر برا اثر ڈالے۔ اس سے لوگوں کی صحت خراب ہو اور دنیا میں برائیاں پھیلیں۔ مثال کے طور پر چکلے کو لیجئے۔ ایک شخص کا جی چاہا کہ کوٹھوں کو رنگ رلیوں اور طوائفوں سے سجائے اور وہاں چکلہ قائم کرکے کمائے اور کموائے۔

<u>دین و مذہب میں خواہش کا مقام</u>:۔ جو لوگ دین اور مذہب کے ماننے والے ہیں۔ ان کا یقین یہ ہے کہ خدا نے ان کو اچھی اور بری باتیں بتا دی ہیں۔ دین و مذہب میں حرام اور حلال چیزیں اور کام گنا دئے گئے ہیں۔ بتا دیا گیا ہے کہ یہ کر سکتے ہو اور یہ نہ کرنا چاہیے۔ اگر خدا کی مرضی کے مطابق کام کروگے جو خدا کا حکم ہوگا اور وہی تمہارا جی چاہے گا، وہی تمہاری خواہش ہوگی تو یہ اچھی بات ہے اس سے خدا خوش ہوگا۔ لیکن اگر خدا کا حکم کچھ ہے اور تمہارا جی کچھ کرنے کو چاہتا ہے تم کو معلوم ہے کہ خدا نے یہ کام کرنے سے روکا ہے تو اگر تم نے خدا کا حکم ٹھکرا دیا جو جی چاہا کر گزرے تو یہ بری بات ہوئی۔ خواہش نفس دراصل اسی کا نام ہے۔ اب کہا جائیگا کہ

تم خدا کے بندے نہیں بلکہ اپنی خواہش کے بندے ہو۔

خواہش نفس سے نقصان:۔ آدمی کو اگر یہ بات نہ بھی معلوم ہو کہ خدا نے فلاں کام کرنے سے یا فلاں بات سے روکا ہے اور وہ کر گذرے تو وہ اس کے نقصان سے نہیں بچ سکتا۔ ایک شخص کو اگر یہ معلوم نہ ہو کہ زہر نقصان کرتا ہے لیکن اس کا جی چاہے اور زہر کھالے تو وہ اپنی جان کا نقصان کرے گا۔ یہ تو ہوا اس کا اپنا نقصان۔

بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ ان کے کرنے سے صرف ایک شخص کی اپنی جان کو ہی نہیں بلکہ اس سے دوسروں کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی جگہ جوے کا پھڑ لگادے یا ایسا کاروبار شروع کردے جس سے بے حیائی کی باتیں پھیلیں تو ایسے کاموں سے دوسرے لوگوں کے ذہن بھی خراب ہوتے ہیں اور ان کی عادتیں بھی بگڑتی ہیں۔ پھر پورا سماج گندہ ہو جاتا ہے۔

اس طرح کے بڑے کام ایک ایسا شخص کرتا ہے جو جاہل ہے۔ وہ خدا کے حکموں کو نہیں جانتا تو ایسے شخص کو جب نصیحت کی جاتی ہے اُسے انجام سے ڈرایا جاتا ہے تو اکثر یہ لوگ توبہ کر لیتے ہیں لیکن ایک عالم آدمی جو خدا کے حکموں کو جانتا ہے اور سمجھتا ہے اور وہ اپنی خواہش نفس میں پڑ کر بُرے کام اپناتا ہے تو اس کا سنبھلنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ جاگتے کو جگانا دالی شئ ہے جان بوجھ کر کوئی بُرائی کرتا ہے اور اُسے ٹوکا جاتا ہے تو وہ اس کی تاویل کر لیتا ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں لوگوں میں مشہور ہو جاتا ہے کہ اس کی تو مت اللہ نے ماردی۔ اس کے دل پر ٹھپہ لگ گیا۔ یہ آنکھیں رکھتے ہوئے اندھا بن گیا۔

جو شخص خواہش نفس کا بندہ ہو جاتا ہے۔ جو اس کا جی چاہتا ہے وہی کرنے لگتا ہے تو وہ اول نمبر کا خود غرض ہو جاتا ہے۔ وہ ہر وقت اپنے فائدے کی بات سوچتا ہے اُسے دوسروں کا حق مارنے میں ذرا بھی جھجک نہیں ہوتی۔ وہ شخص بڑا ظالم اور کمینہ ہو جاتا ہے۔ اس کے

رکے لوگ بھی اس سے پریشان رہتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی حق اور انصاف کی قدر وہ نہیں کرتا۔ ایسا شخص اپنی خود غرضی سے دنیا کو ظلم و ستم سے بھر دیتا ہے۔

قرآن کریم میں بندۂ نفس کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اُسے ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کو بھی دکھائی دیا گے کہ یہ اس بگڑے ہوئے شخص کی ہو بہو تصویر ہے۔

سورہ جاثیہ آیت ۲۳ میں ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوٰىهُ وَأَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○

پھر کیا تم نے کبھی اس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنالیا اور اللہ نے علم کے باوجود اُسے گمراہی میں پھینک دیا اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اسے ہدایت دے۔ کیا تم لوگ (اس سے) کچھ سبق نہیں لیتے۔

بڑائی کا نسخہ

جو شخص چاہتا ہو کہ سب سے بڑھ کر طاقتور ہو جائے اُسے چاہیئے کہ اللہ پر توکل کرے اور جو شخص چاہتا ہو کہ سب سے بڑھ کر غنی ہو جائے اُسے چاہیئے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے اس پر زیادہ بھروسہ رکھے بہ نسبت اس چیز کے جو اسکے ہاتھ میں ہے اور جو شخص چاہتا ہو کہ سب سے زیادہ عزت والا ہو جائے اُسے چاہیئے کہ اللہ عزوجل سے ڈرے۔ (حدیث) (تفہیم القرآن جلد ۲ صفحہ ۲۳۷ سے)

گڈریا اور بھیڑیا

کرنل مسعود اختر شیخ

ایک دفعہ کا ذکر ہے مشرق اور مغرب کے سنگم پر، شمال سے فنا نزدیک، جنوب سے فنا دور ایک جگہ پہ ایک گڈریا رہتا تھا اس کے پاس بھیڑوں کا ایک ریوڑ اور دو کتے تھے۔ یہ گڈریا عام گڈریوں سے بالکل مختلف تھا۔ بڑا ہی سنگدل، نہایت ظالم۔ نہ اسے کسی کے دکھ درد کا احساس تھا نہ کسی کی آہ و فغاں کی پروا۔ دوسرے گڈریوں کے ہاتھوں میں بانسری ہوتی ہے جس سے وہ میٹھی میٹھی سریں نکال کر سارا دن اپنے ریوڑ کی نگرانی کرتے ہیں اس گڈریے کے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا ہوتا۔ اس ڈنڈے سے وہ اپنی بھیڑوں کی دن رات کم بختی بلایا کرتا۔ بھیڑوں کا دودھ، اون، گوشت، کھال، انتڑیاں غرضیکہ ان کے جسم کی ہر چیز سے فائدہ حاصل کرتا، مگر کبھی اس کے دل میں اپنی بھیڑوں سے ہمدردی کا خیال نہ آتا تھا۔

گڈریا صبح، دوپہر اور شام، دن میں تین دفعہ بھیڑوں کا دودھ دوہتا۔ پھر بھی اسے یہی گلہ رہتا کہ یہ کم بخت دودھ کم دیتی ہیں۔ اس کی بھوکی نظریں کبھی نہ بھرتیں۔ ہر بھیڑ کے دودھ کا آخری قطرہ تک نکالنے کی غرض سے اسے اس وقت تک دوہتا رہتا جب تک اس کے تھنوں سے خون نہ نکل آتا۔ ایسی حالت میں اگر بھیڑ درد سے کراہتی یا آنکھوں میں آنسو ہی بھر لاتی، تو بے رحم گڈریا اس کی کمر پہ ڈنڈوں کی بوچھاڑ کر دیتا۔ ساتھ ہی ساتھ چلا چلا کر کہتا۔

"ذلیل بھیڑو، تمہاری کھال ادھیڑ کر اندر سے دودھ کا آخری قطرہ تک نہ نکال لوں تو

مجھے گڈریا نہ کہنا۔"

ظالم گڈریا چاہتا تھا کہ ہر بھیڑ وں میں کم از کم چالیس کلو دودھ ضرور دے خواہ اس کا اپنا وزن تیس کلو ہی کیوں نہ ہو۔

گڈریے کے مظالم اتنے بڑھتے گئے کہ بعض بھیڑوں نے تو ان کی تاب نہ لاتے ہوئے موت کے ذریعے اس کے ظالم ہاتھوں سے نجات حاصل کرنا شروع کر دی۔ یہ خوش قسمت بھیڑیں تو گڈریے سے بچ جاتیں، مگر گڈریا ان کے حصے کا ظلم باقی ماندہ زندہ بھیڑوں پر ڈھانا شروع کر دیتا۔ وہ مرنے والی بھیڑ کے نقصان کی تلافی ہر زندہ بھیڑ سے کرنا چاہتا تھا۔ مرنے والی بھیڑوں کی دیکھا دیکھی زندہ بھیڑوں نے بھی وہی راہِ نجات اختیار کرنا شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھیڑوں کی تعداد روز بروز کم سے کم تر ہوتی چلی گئی۔ مگر پھر بھی ظالم گڈریے کو عقل نہ آئی۔ اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اگر ایک بھیڑ بھی زندہ بچ گئی تو تمام بھیڑوں کا دودھ اور ساری بھیڑوں کی اون اس اکیلی بھیڑ کے جسم سے وصول کر کے چھوڑے گا۔

ریوڑ میں ایک میمنا بھی تھا۔ میمنا کیا تھا بے چارہ چند ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ جب بھیڑوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تو گڈریے نے اپنی توجہ اس میمنے کی طرف کی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح میمنے سے بھی دس بیس کلو دودھ حاصل ہو جائے، لیکن بھلا ایک میمنا کیسے دودھ دے سکتا تھا۔ دس بیس کلو تو کجا جب گڈریے کو میمنے سے دودھ کا ایک قطرہ بھی وصول نہ ہوتا تو وہ غصے سے پاگل ہو جاتا۔"

ایک روز گڈریے کو میمنے پر اس قدر غصہ آیا کہ اس نے ڈنڈے مار مار کر بے چارے میمنے کا بُرا حال کر دیا۔ گڈریا چاہتا تھا کہ میمنا باقی بھیڑوں کی طرح تیز تیز بھاگے لیکن میمنے میں اتنی جان کہاں تھی کہ وہ بھاگ سکتا۔ آخر مجبور ہو کر میمنے نے اپنی زبان میں گڈریے سے التجا کی۔

"اے گڈریے میں ایک ننھا سا میمنا ہوں۔ میری ٹانگیں اللہ میاں نے بنائے

لیے نہیں، بلکہ چلنے کے لیے بنائی ہیں۔ خدا کے واسطے مجھے ڈنڈے مار مار کر بھگانے کی کوشش نہ کرو۔

گڈریا کہاں میمنے کی زبان سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تو یہ تھا کہ جو بھیڑیں مرگئی ہیں وہ سب بے وفا اور غدّار تھیں۔ وہ محض اس لیے مری تھیں کہ گڈریے کو مالی نقصان پہنچے۔ انہی غدّار بھیڑوں کا بدلہ اب وہ میمنے سے لینا چاہتا تھا۔

آخر کار ظالم گڈریے کے ڈنڈے سے بچنے کی خاطر میمنے نے بھاگنا شروع کردیا۔ جان بچانے کی خاطر پتھریلی چٹانوں پر بھاگتے بھاگتے رفتہ رفتہ اس کے ننھے ننھے پاؤں کی شکل تبدیل ہونا شروع ہوگئی پھر اس کی ٹانگیں بھی آہستہ آہستہ لمبی اور پتلی ہوتی گئیں۔ اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ تیز بھاگنے کے قابل ہوگیا۔ پھر بھی ظالم گڈریے کے ہاتھوں سے نہ بچ سکا۔ مجبوراً اس نے اور زیادہ تیز بھاگنے کی کوشش شروع کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نوکیلی چٹانوں اور پتھریلی زمین سے رگڑ کھا کھا کر میمنے کے نرم نرم سُم نوکدار سینگوں میں تبدیل ہوگئے۔ گڈریا تھا کہ کسی طرح بے چارے میمنے کی جان نہ چھوڑتا تھا۔ میمنا کبھی موقع پاکر گڈریے سے یوں التجا کرتا۔

"محترم گڈریے۔ میں ایک میمنا ہوں خدا اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو میمنا ہمیشہ میمنا ہی رہتا ہے۔ کبھی بھیڑ نہیں بن سکتا۔"

گڈریا میمنے کی ایک نہ سنتا۔ بدستور ڈنڈا لے کر اس کے پیچھے پیچھے جھاڑ کر پڑا رہتا۔ مسلسل بھاگنے سے میمنے کا پیٹ اندر کو دھنس گیا۔ اس کا قد بھی پہلے سے لمبا ہوگیا پھر ایک وقت ایسا آیا کہ میمنے کے جسم کی اون بھی جھڑنی شروع ہوگئی۔ جھڑتے جھڑتے جسم پر اون کا نام و نشان باقی نہ رہا بلکہ اون کی جگہ بھورے رنگ کے بال نکل آئے۔

اب گڈریے کے لیے میمنے کو پکڑنا دشوار مشکل ہوگیا۔ وہ اس کے پیچھے کتے چھوڑتا مگر کتے بھی اکثر اسے پکڑنے میں ناکام

ہو جاتے۔ جب کبھی گڈریا چالاکی سے گھات لگا کر میمنے کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا تو مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیتا۔ میمنا پھر میا میا کر فریاد کرتا:

"اے گڈریے میں آخر ایک میمنا ہی تو ہوں۔ مجھے بھیڑ بنانے کی تمام کوششیں بے سود ہیں۔"

گڈریا میمنے کی فریاد پر کان نہ دھرتا بلکہ اور ناراض ہوتا۔ غصے سے اس کے منہ سے جھاگ نکلنا شروع ہو جاتی۔

جب میمنے کو احساس ہوا کہ گڈریا یا اس کے کتے چپکے سے گھات لگا کر اسے پکڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے کانوں سے اور زیادہ کام لے گا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اس میں اتنی قابلیت آ گئی کہ گڈریے اور کتوں کی آمد کا پتہ چلانے کی خاطر وہ جس طرف چاہتا اپنے کان آسانی سے گھما سکتا۔ رفتہ رفتہ اس کے کان پہلے کی نسبت لمبے بھی ہو گئے اور اس کی سننے کی حس بھی پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی اب اسے گڈریے اور کتوں کی آمد کا دور سے پتہ چل جاتا اور وہ جان بچا کر بھاگ نکلتا۔

گڈریا جانتا تھا کہ میمنے کی آنکھیں اندھیرے میں دور تک نہیں دیکھ سکتیں چنانچہ اب وہ رات کے اندھیرے میں چپکے سے جاتا اور میمنے کو پکڑ لیتا۔ جونہی میمنا قابو میں آتا گڈریا مار مار کر اس کی درگت بناتا بے چارہ میمنا پھر رو رو کر گڈریے سے کہتا۔

"اے گڈریے۔ میں ایک میمنا ہوں خدا کے لیے مجھے بھیڑ بنانے کی کوشش نہ کر۔"

گڈریے کے دل پر ان التجاؤں اور فریادوں کا کچھ اثر نہ ہوتا۔ اب میمنا ڈر سے ساری ساری رات جاگتا رہتا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دور تک دیکھنے کی کوشش کرتا کہ کہیں گڈریا تو نہیں آ رہا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اس کی آنکھیں پہلے کی نسبت بہت بڑی ہو گئیں۔ اندھیرے میں مسلسل دیکھنا

رہ رہ کر اس کی بینائی اتنی تیز ہو گئی کہ اب وہ رات کو بھی بخوبی دور دور تک دیکھ سکتا تھا اب اس کی آنکھوں سے انگارے برستے دکھائی دیتے۔

اب میمنے کی چکتی بڑھ چکی تھی۔ جب وہ گڈریے سے دور ڈر کر بھاگتا تو اس کی چکتی ٹانگوں سے ٹکرا کر فرار کی راہ میں حائل ہوتی۔ وہ سوچتا کاش اگر یہ چکتی بھی نہ ہوتی تو گڈریا مجھے کبھی بھی نہ پکڑ سکتا۔ عرصہ دراز تک تیز تیز بھاگنے کی وجہ سے آخر چکتی کی چربی پگھل گئی اور پھر چکتی کی جگہ میمنے کی ایک لمبی سی، پتلی دم نکل آئی۔ اب تو میمنے کے بھاگنے کی رفتار بہت ہی تیز ہو گئی۔ وہ بھاگتے وقت دم کو چھڑی کی طرح ہوا میں کھڑا کر لیتا تاکہ ٹانگوں سے نہ ٹکرائے اس کے باوجود بعض اوقات گڈریا اسے پیچھے سے نوکدار پتھر مار کر زخمی کر کے پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا۔ میمنا پھر فریاد کرتا۔

"اے گڈریے۔ میں ایک میمنا ہوں میں میمنا پیدا ہوا تھا اور اگر کچھ عرصہ اور زندہ رہا تو شاید دنبہ بن جاؤں اور پھر مرتے تک دنبہ ہی رہوں گا۔ آخر تم کیوں ایک میمنے کو بھیڑیا بنانے کے درپے ہو۔ خدا کے لیے مجھ پر اتنے ظلم نہ ڈھاؤ!"

گڈریا اب بھی میمنے کی بات نہ سمجھا

میمنا اب اس کے ظلم و ستم سے اس قدر تنگ آ چکا تھا کہ جب کبھی اسے خطرہ ہوتا کہ پکڑا جاؤں گا تو اپنی جان کی حفاظت کے لیے پنجوں اور ناخنوں سے گڈریے پر حملہ کرنے میں بھی دریغ نہ کرتا۔ گڈریا ایسی حالت میں غصے سے لال پیلا ہو جاتا۔ میمنا مجبور ہو کر گڈریے کو دانتوں سے کاٹنے کی کوشش کرتا۔ مگر اس کے جبڑوں کی بناوٹ ایسی تھی کہ دانتوں سے گڈریے کو کاٹنے میں کچھ کامیاب نہ ہو پاتا۔ اسی قسم کی چند جھڑپوں کے بعد میمنے کے جبڑوں اور تھوتھنی کی بناوٹ میں تبدیلی آ گئی۔ اس کے دانت بھی پہلے کی نسبت زیادہ لمبے اور تیز ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد اس کی زبان بھی لمبی ہو گئی۔ اب وہ ممیاتا تو اس کی آواز میمنوں کی آواز سے مختلف ہوتی

بچپن ہی سے گڈریے کے مظالم کے خلاف آواز اٹھاتے اٹھاتے اب اس کی آواز میں پختگی اور تندی پیدا ہو گئی تھی۔

جب گڈریے نے دیکھا کہ اسے میمنے کا مقابلہ کرنے میں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے تو وہ کتوں کو شہ دے کر میمنے پر حملہ کرواتا۔ لیکن اب تو کتے بھی میمنے کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے۔ میمنا ایک کتے کو پنجوں میں دبوچ کر زمین پر پچھاڑ دیتا اور دوسرے کی گردن میں اپنے لمبے لمبے تیز دانت گاڑ کر زخمی کر دیتا۔ اس کے بعد جب ایک آدھ بار گڈریا میمنے کو پکڑنے میں کامیاب ہوا تو میمنے نے غرّا غرّا کر اسے خبردار کیا:

"خبردار اے گڈریے۔ ان ذلیل حرکتوں سے باز آ جا ورنہ تیرا انجام بہت بُرا ہو گا۔"

گڈریا میمنے کی یہ دھمکی سن کر آپے سے باہر ہو جاتا۔

سردیوں کے دن تھے۔ ہر طرف برف کا سفید غلاف چڑھا ہوا تھا۔ ایک روز گڈریا حسبِ معمول علی الصباح سو کر اٹھا۔ ڈنڈا ہاتھ میں لیا۔ سوچا آج تو ایک ایک بھیڑ سے دس دس گانے جتنا دودھ وصول کروں گا۔ اسی سوچ میں جھونپڑی سے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ سفید برف پر ادھر ادھر خون کے سرخ نشان نظر آ رہے ہیں۔ ذرا آگے بڑھا تو دائیں بائیں کئی مردہ بھیڑوں کے خون آلود ڈھانچے دکھائی دیے۔ پورے ریوڑ میں ایک بھیڑ بھی زندہ باقی نہ تھی۔ اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دور دور تک نظر دوڑائی۔ ایک چٹان پر اسے میمنا دکھائی دیا۔ میمنا اپنی اگلی ٹانگوں پر سر رکھے برف پر لیٹا ہوا تھا۔ اپنی لمبی زبان منہ سے نکال کر پنجوں اور تھوتھنی پر لگا ہوا خون چاٹ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دور گڈریے کے دونوں کتے مردہ پڑے تھے۔

میمنے کی نظر گڈریے پر پڑی۔ وہ اٹھا اور غرّاتا ہوا آہستہ آہستہ گڈریے کی طرف

بڑھا۔ گڈریا خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس
نے ایک دو قدم پیچھے کو لیے اور کانپتے
کانپتے ہکلاتی آواز میں بولا:
"اے میمنے۔ اے میرے پیارے میمنے!"
میمنا غرایا اور بولا:
"اے گڈریے۔ آخر اب میں میمنا
نہیں رہا!"
گڈریے نے پھر خوشامدانہ لہجے میں ہکلاتے
ہوئے کہا:
"اے میرے پیارے میمنے۔ میرے
خوبصورت میمنے!"
میمنا غرایا۔
"میں کبھی میمنا ضرور تھا مگر خدا تمہارا
بھلا کرے کہ اب میں میمنا نہیں رہا اب
میں بھیڑیا بن گیا ہوں!"
"لیکن میری جان میمنے۔ تم اب بھی
میرے پیارے، میرے ننھے منے میمنے ہو!"
"افسوس ظالم گڈریے۔ تمہیں میرا
خیال ذرا دیر سے آیا ہے!" اس نے یہ کہا
اور غرا کر گڈریے پر حملہ کر دیا۔ گڈریے
نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی، مگر اس میمنے
کے پنجوں سے نہ بچ سکا۔ جو اب بھیڑیا بن
چکا تھا۔ بھیڑیے نے اپنے لمبے لمبے تیز دانت
گڈریے کی کانپتی ہوئی گردن میں گاڑ دیے
اور مزا لے لے کر اس کا گرم گرم خون پینا شروع
کر دیا۔ سفید برف خون کے قطروں سے
سُرخ ہو گئی۔

کئی روز بعد ایک ایسے شخص کا گزر ادھر
سے ہوا جو سفید برف پر گڈریے کے خون
سے لکھی ہوئی عبارت پڑھ کر گڈریے اور
میمنے کی یہ داستان سمجھ گیا۔ اب صدیوں سے
اس علاقے میں یہ داستان پشت در پشت
سننے میں چلی آ رہی ہے۔

اور پھر جب ایک ظالم قوم اکثریت
کے زعم میں اس طرف سے گزری
تو ایک جیالے نے سردار قوم کو یہ
پوری کہانی سُنائی۔

یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس ظالم قوم
کا کیا حشر ہوا!

• • • • • • •

غزل

([illegible])

تختۂ دار پہ چمن کی خاطر چڑھے، کوئی دیکھے ذرا اُن کا بانکا پن
ہم تو کانٹوں سے دامن کو سیتے رہے، پھول چنتے رہے وہ چمن در چمن
لوگ نالاں ہیں آج اپنی تہذیب پہ، ایسی تہذیب جس نے سکھائے یہ فن
ہاتھ آجائے کوئی بھی موقع اگر آدمی بیچ دے آدمی کا کفن
سوئے منزل چلے جب نئے راہبر، جانے کتنی امیدوں کی شمعیں جلیں
کارواں جب لٹا تب یہ عقدہ کھلا، یہ فرشتے بھی ہیں صاحبِ مکر و فن
مدتوں سے رہے جس کے ہم منتظر، اک عجب شان سے وہ بہار آئی ہے
سوکھ کر ہو گئے پھول کانٹے مگر قابلِ رشک کانٹوں کا ہے بانکپن
حوصلوں کی ہمارے یہ توہین ہے سر جھکا کر چلیں، ہونٹ سی کر جئیں
بزدلو مت ڈراؤ ہمیں موت سے ہم نے دیکھے ہیں کتنے ہی دار و رسن
اس سے بڑھ کر بھی کیا انقلاب آئے گا ایک شاعر اور اپنا قلم بیچ دے
بات منہ سے نکالے وہ جب بھی کوئی "ان داتا" کے ماتھے پہ دیکھے شکن
تم ہو مانا کہ فرعونِ دوراں سہی، قاتلِ ابنِ آدم ہو نہ بھولو مگر!
وقت کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں جانے کمھلا گئے کتنے پتھر بدن
غالب و میر کی یہ تو دلی نہیں، راستہ بھول کر میں کہاں آ گئی
کوئی چہرہ نہیں ہے شناسا یہاں، اجنبی سی لگے دل کو ہر انجمن
ایک آنسو نہ ٹپکا کسی آنکھ سے اک صدا تک نہ اٹھی زباں سے کہیں
جب کہ ہر روز دنیا کے بازار میں کوڑیوں مول بکتے رہے علم و فن
ظلمتوں کی تو پیہم ہی یلغار ہے، میں ہی تنہا کہاں تک جلاؤں دیئے
اور بھی لوگ نکلیں لئے مشعلیں ورنہ پائیں گے ہر موڑ پر راہ زن

زندگی کی خوشبو

میمونہ راہی

ٹیکسی سے اُتر کر جب میں نے لوہے کا گیٹ پار کر کے اندر قدم رکھا تو ملحقہ کمرے میں ایک دو مانوس سی نسوانی آوازیں سنائی دیں۔ میں ڈرائنگ روم میں چلا گیا کہ ہو سکتا ہے وہاں کچھ پردہ نشین خواتین موجود ہوں۔ میری اور اس کا چھوٹا بھائی اٹیچی اٹھائے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی میں نے خود کو صوفے پر گرا دیا۔ بدن ویسے بھی کچھ گرا گرا سا تھا۔ ادھر لاہور سے کراچی کے طویل سفر کی تھکان بھی کچھ کم نہیں تھی — میں اپنے برادر نسبتی کی شادی میں شرکت کی غرض سے وہاں پہنچا تھا۔

شادی بیاہ اور ولیمہ ہنگاموں سے میں ہمیشہ دور رہنے کا عادی تھا۔ اس لیے ایسے مواقع پر مختلف نوع کے بہانوں سے کام لے کر خود کو بچا لیا کرتا۔ لیکن اس بار میرے دوست عباس احمد کی کوشش بار آور ہو گئی اور میں جو اس ضمن میں تذبذب اور ہچکچاہٹ کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا ایک فیصلے پر پہنچ گیا اور یہ فیصلہ تھا رسم شادی میں شمولیت کا۔

دراصل ان دنوں میں ایک بار پھر عجیب بیزاری اور بے کیفی کا شکار تھا۔ مایوس مایوس سا، ناتواں اور افسردہ سا رہتا۔ بیشتر اوقات ہر شے، ہر رسم، غرضیکہ زندگی اور کائنات کا سب کچھ بے معنی اور بے رنگ سا لگنے لگا تھا۔ عباس احمد نے مجھ سے

لیا تھا۔ تم نے اپنے اندر سیاہ دیواریں کھڑی کر لی ہیں اور ان میں کسی خوشی اور مسرت کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر اس نے ایک خاص تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھا تھا اور تھوڑے سے وقفے کے بعد مزید کہا تھا: تمہاری مشکل یہ ہے کہ تم اذیت پسند ہو۔ کسی نہ کسی طرح خود کو غمگین اور دکھی بنائے رکھتے ہو۔ میرے بھائی چھوٹی چھوٹی باتوں کی خاطر جلنے اور کڑھنے کی عادت چھوڑ دو۔ ان کو نظر انداز کر دیا کرو۔ اہمیت ہی مت دو ان کو۔ بڑی بڑی خوشیوں کی آرزو میں گھلتے ہوئے جنہیں حاصل کرنا تمہاری دسترس میں نہیں، ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا گلا مت گھونٹو جو اکثر تمہارے درِ دل پر دستک دیتی رہتی ہیں۔ زندگی کو انجوائے کرنا سیکھو۔ سمجھے میرے بھائی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم یہ خوشی منانے کراچی ضرور جاؤ گے۔"

عباس احمد کی یہ باتیں میرے دل کو لگیں، میں نے غور کیا اور کراچی کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔

کچھ دیر بعد میری ساس آگئیں۔ سلام دعا اور سفر کا حال معلوم کرنے کے بعد بولیں: "یہاں کیوں بیٹھے ہو اکیلے اندر کیوں نہیں آجاتے؟"

"میں نے سوچا کوئی پردہ نشین خاتون نہ ہوں اندر۔"

"نہیں، ایسی تو کوئی عورت نہیں ہے وہاں۔ دلہن بھابی آئی ہوئی ہیں گھر سے۔ تم بالکل تکلف مت کرو، وہ بھلا تم سے پردہ کریں گی؟ اور ہاں پانی گرم کرنے کو رکھ دیا ہے، نہا لینا۔"

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ پھر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

دلہن بھابی سے ملنے کا تو کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا البتہ ان کے بارے میں اتنا ضرور علم تھا کہ وہ میری ساس کی بھاوج ہیں اور ایک دو برس کے اندر ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ یوں بھی ان

کی شادی بڑی بے جوڑ تھی۔ یعنی ان کے شوہر بوڑھے تھے اور وہ کسی طور بھی ان کی بیوی نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ وہ سکھر میں اپنے چھوٹے بھائی خالد اور چھوٹی بہن سعیدہ کے ساتھ رہتی تھیں بھائی کوئی بزنس کرتا تھا۔ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ حالانکہ اس کی عمر ڈھلتی جا رہی تھی۔ بہن اپنے شوہر کا گھر نہ جانے کن وجوہ کی بنا پر چھوڑ کر اپنے میکے میں آن بیٹھی تھی۔ اس کے بھی کوئی اولاد نہیں تھی۔ انہی حالات کے پیش نظر میرے تصور میں دلہن بھابی کی جو تصویر ابھری تھی۔ اس کے رنگ بڑے پھیکے اور اداس تھے۔ کتنا طویل عرصہ انھوں نے اپنے عمر رسیدہ شوہر کے بغیر گزارا تھا۔ شوہر جس نے ان کی بقایا زندگی کے لیے کچھ بھی تو نہیں چھوڑا تھا۔۔۔ نہ جائیداد۔۔۔ نہ اولاد۔

میں ابھی انہی سوچوں میں گم تھا کہ میری ساس کے ساتھ ادھیڑ عمر کی ایک بھاری بھرکم عورت اندر آئی اور میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میری ساس نے کہا۔ یہ دلہن بھابی ہیں۔

میں نے سلام کیا جس کا انھوں نے بڑی محبت سے جواب دیا۔ وہ فیروزی رنگ کا غرارہ سوٹ پہنے ہوئے تھیں ان کا اپنا رنگ گندمی تھا۔ جسم بھرا بھرا ناک نقشہ بس گوارا، چہرے پر کوئی ایسی کیفیت ہرگز نہیں تھی جسے میں نے اپنے خیالوں میں دیکھا تھا۔ وہ مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھ رہی تھیں اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ مجھ سے باتیں کر رہی تھیں۔ کتنی صحت مند اور زندگی سے بھرپور نظر آ رہی تھیں اس وقت۔

شادی کے ہنگاموں میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نوجوان لڑکی کی چھیڑ چھاڑ میں بھی خوب خوب شریک ہوئیں ایک خوبی جوان میں دیکھی وہ ان کا گرہستی پن اور سلیقہ تھا۔ اس افراتفری میں بھی وہ واحد ہستی تھیں جو گھر کی صفائی بھی کرتی تھیں اور جہاں تک ممکن ہوا چیزوں کو قرینے

سے رکھی رہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں پر بھی
ان کی کڑی نظر رہتی۔ مجال ہے جو کوئی چیز
خراب یا ضائع ہو یا کوئی برتن ٹوٹا ہو۔

شادی کے ہنگامے میں تو میں نے
کوئی دھیان ہی نہ دیا۔ البتہ جب یہ ہنگامے
سرد ہوئے تو ایک صبح میں نے دیکھا۔
دلہن بھابی سات آٹھ برس کے ایک
لڑکے کے بالوں میں تیل لگا رہی تھیں
اس کام سے فارغ ہو کر وہ کنگھے سے اس
کے بال بنانے لگیں تب ہی میری ساس
نے مجھے بتایا کہ کچھ عرصہ ہوا دلہن بھابی
نے محلے کے ایک غریب گھرانے کے
اس لڑکے کو اپنے پاس رکھ لیا ہے اور
وہ اس سے اس طرح پیار کرتی ہیں جیسے
وہ انہی کا بیٹا ہو۔ وہ اس کی ہر بات کا
خیال رکھتی ہیں، لباس کا خیال — تعلیم
کا خیال — کھانے پینے اور سیر و تفریح
کا خیال۔

سکھر جاتے وقت انھوں نے بڑی
اپنائیت کے ساتھ اپنے گھر آنے کی دعوت
دی جو میں نے قبول کر لی۔ اس لیے کہ میرے
پاس خاصا وقت تھا کہ اس بار طویل رخصت
پر کراچی گیا تھا۔

لاہور واپسی سے ایک ہفتہ قبل جب
میں بیوی بچے کو لے کر سکھر جانے کا پروگرام
طے کر چکا تھا۔ مجھے اپنی ساس کی زبانی
معلوم ہوا کہ وہ لڑکا جس کا نام بشیر تھا اور
جسے دلہن بھابی نے جی جان سے عزیز
رکھا تھا اپنے گھر چلا گیا ہے۔ میری غیر موجودگی
میں دلہن بھابی کے بھائی کچھ دیر کے لیے
آئے تھے۔ انہی سے یہ اطلاع ملی تھی —

اس لمحے مجھے دلہن بھابی کے اوپر بڑا
ترس آیا۔ بے چاری کا کیا حال ہوا ہوگا؟
کتنی دکھی ہوں گی وہ — جنھیں محبت کے
صلے میں بے اعتنائی اور بے وفائی کا
داغ ملا۔

سکھر کے سفر کے دوران بیشتر وقت
میرے روبرو دلہن بھابی کا اداس اداس
چہرہ ابھرتا رہا۔

جب میں نے دلہن بھابی کے گھر میں

میں قدم رکھا تو پہلے وہاں کی خاموشی نے ہمارا استقبال کیا۔ فوراً ہی میری نگاہیں گھر کے کشادہ آنگن کے اس حصے پر جم کر رہ گئیں جہاں دلہن بھابی صاف ستھرا رنگین لباس پہنے کھڑی چڑیوں کے لیے دانہ ڈال رہی تھیں۔ ان کے ارد گرد بہت چڑیاں بلاخوف وخطر چہک چہک کر دانہ چگ رہی تھیں۔ قریب ہی ایک لکڑی کی چوکی پر سفید براق چادر بچھی ہوئی تھی جس پر گہرے نیلے رنگ کا ایک گاؤ تکیہ رکھا ہوا تھا۔ اس تخت کے نزدیک ہی برابر برابر تین مونڈھے رکھے ہوئے تھے۔ صحن میں ایک دیوار کے ساتھ ساتھ گملوں کی قطار نظر آ رہی تھی جن میں گلاب، موتیا اور کئی شوخ رنگوں کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس قطار سے مخالف سمت والی دیوار کے ساتھ ساتھ چند پھلوں کے درخت ہولے جھونکوں کے ساتھ جھوم رہے تھے ں طرف ایک گوشے میں کبوتروں کی کابک سی تھی جس میں چند سفید کبوتر غٹر غٹرغوں کر رہے تھے۔ دلہن بھابی کی محویت کا جائزہ لینے کے لیے میں نے بیوی بچے کو چپ رہنے کا اشارہ کیا پھر دلہن بھابی لوٹے سے مٹی کے گملوں میں پانی ڈالنے لگیں۔ پانی ڈال کر جیسے ہی وہ مڑیں ہم آگے بڑھ گئے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرانے لگیں۔ سلام علیک ہوئی۔ پھر انھوں نے میرے ہاتھ سے اٹیچی لے کر کمرے میں رکھ دی۔ ہم لوگ مونڈھوں پر بیٹھ گئے اور وہ واپس آ کر چوکی پر بیٹھ گئیں۔ ہمارے آنے کی خوشی کا وہ الفاظ کے ذریعے اظہار کیے بغیر نہ رہ سکیں۔ بہت بہت دعائیں دینے لگیں سب سے کہ میں نے ان کی خواہش کا خیال رکھا۔ پھر وہ میری بیوی سے نئی نویلی دلہن، میری ساس اور دیگر لوگوں کی خیر خیریت دریافت کرتی رہیں۔

اس دوران جب میں متلاشی نگاہوں سے گرد و پیش کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بولیں "کیا

کیوں رہے ہو ادھر اُدھر؟"

"کچھ بھی نہیں"

"میں سمجھ گئی"

"کیا؟"

"یہی سوچ رہے ہو گے کہ یہاں سناٹا کیوں ہے؟" دلہن بھابی نے پان بنانے کے لیے پاندان کھولا: "سعیدہ بازار گئی ہے، ابھی آجائے گی اور خالد کے بارے میں تو تم جانتے ہی ہو دکان سے فارغ ہو کر دیر سے گھر لوٹتا ہے۔"

"اور وہ — لڑکا؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا کہ میں ان کے تاثرات ان کی زبانی سننا چاہتا تھا۔

"وہ — وہ بشیر؟"

"ہاں"

"وہ تو چلا گیا"

"کیوں؟"

"اس کے باپ کو حیدرآباد میں کام مل گیا۔ بیوی اور دوسرے بچوں کے ساتھ وہ بشیر کو بھی لے گیا۔" انھوں نے

پان کا بیڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا: "اور ہاں، ایک خوش خبری سنانا تو میں بھول ہی گئی۔" ان کا رخ میری بیوی کی طرف تھا

"کیسی خوش خبری؟" میری بیوی کی۔

"اگلے مہینے خالد کی شادی طے ہو گئی ہے — تم لوگ آسکو گے؟"

میری بیوی نے کچھ سوچا: "اب تو اتنی جلدی آنا مشکل ہے دلہن بھابی۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا: "ان کو اتنی جلدی چھٹی نہیں مل سکتی۔ بہرحال یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ گھر میں رونق بڑھ جائے گی۔"

"وہ تو ظاہر ہے"

"رشتہ کہاں ہوا ہے؟"

"عزیزوں میں۔ بہت بھلے لوگ ہیں لڑکی بھی اچھی خاصی ہے۔" پھر اچانک اُٹھیں: "تم بیٹھو، میں ذرا چائے کی کیتلی چولہے پر رکھ آؤں۔"

جب وہ باورچی خانے میں پانی کی کیتلی چولہے پر رکھ کر واپس آئیں، تو دو چھوٹے
[illegible]

کتابیں پکڑے ان کی چوکی کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ دلہن بھابی نے باری باری ان کے سروں پر ہاتھ پھیر کر ان کو پیار کیا۔ لڑکوں کو چوکی پر بیٹھنے اور اپنا کل کا سبق دہرانے کی ہدایت کی اور لڑکی کی کتاب اپنے ہاتھ میں تھام کر اسے چائے بنانے کے لیے کہا۔ پھر وہ مسکرا کر میری بیوی سے بولیں: "محلے کے بہت سے بچے میرے پاس آ جاتے ہیں پڑھنے کے لیے۔ دن کا بڑا حصہ ان کے ساتھ مصروف رہتی ہوں۔" پھر وہ ایک بچے کو نیا سبق پڑھانے لگیں۔

انہی لمحات کے دوران میرے اندر جذبات کا ایک نیا ریلا آمڈنا شروع ہو گیا — دلہن بھابی، کتنی محرومیوں کا شکار رہی ہو تم، غم بھی سہے، دکھ بھی جھیلے تم نے، اور اب — اب کتنی اکیلی ہو تم، لیکن — لیکن تم اکیلی کہاں ہو دلہن بھابی، تم نے تو ایک محفل سجا رکھی ہے ایک دنیا آباد کر رکھی ہے اپنے لئے کہ تمہارے اندر جینے کا قرینہ ہے، ان سے انسیت ہے حوصلہ ہے، خود اعتمادی ہے — اور اسی لئے تم کسی نہ کسی طرح اپنے عزیز و اقارب اور ہمسایوں کے ساتھ ساتھ زندگی سے بھی وفا کئے جا رہے ہو — اور جینا شاید اسی کو کہتے ہیں — عباس احمد نے بھی تو یہی کچھ کہا تھا۔ اس نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ زندگی کو انجوائے کرنا سیکھو اور ان بڑی بڑی خوشیوں کی آرزو میں گھلتے ہوئے جو تمہاری دسترس سے باہر ہیں، ان چھوٹی چھوٹی معصوم خوشیوں کا گلا مت گھونٹو جو اکثر تمہارے در دل پر دستک دیتی رہتی ہیں — میں نے دیکھا دلہن بھابی بڑی اپنائیت اور بڑی چاہت کے ساتھ دوسرے بچے کو کتاب پڑھا رہی تھیں۔ میری نگاہیں ان کے چہرے کی غیر معمولی چمک دمک پر مرکوز ہو کر رہ گئیں — پھر ایکا ایکی عجیب سی مہک نے مجھے مسحور سا کر دیا اور ایک انوکھا سا، انجانا سا احساس توانائی بن کر میرے انگ انگ میں سرایت کر گیا۔

اچار

(ادارہ)

اے بی! یہ مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جہاں کہیں کچھ کھایا پیا، بس چاہتے ہیں کہ گھر میں بھی ویسی ہی چیز بنتا چاہیے۔ تمہارے میاں بھی تو آخر مرد ہی ہیں نا۔ گاجر، شلجم، مولی کھیرا بازار سے لائے اور لا پٹکا کہ ان کا اچار بناؤ۔ مگر بی بی تم پریشان کیوں ہو۔ ان کا اچار بنانا بہت آسان ہے۔

دیکھو، ایسا کرو، آدھا آدھا کلو گاجر اور شلجم لے لو۔ دو عدد مولی، دو عدد کھیرے کھیرے کا کڑوا پن نکال دو یا اتنا حصہ کاٹ دو۔ ایک چمچہ ہلدی۔ دو چمچہ گرم مسالہ نمک جیسا تمہارے میاں پسند کرتے ہوں۔

اچھا ترکاریوں کو اچھی طرح دھو ڈالو۔ گاجر اور شلجم کے گول گول قتلے روپیہ کی طرح کاٹ لو۔ مولی اور گاجر کو لمبائی سے کاٹ لو اور ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لو۔

یہ سب ہو گیا اب ایسا کرو کہ یہ ساری ترکاریاں اور وہ سب مسالے ایک مرتبان میں بھر دو۔ دو لیٹر سفید سرکہ ڈال کر مسالہ تلے اوپر کر کے ملا دو۔ دھوپ میں رکھ دو آٹھ دس دن دھوپ میں رکھو۔ اچار تیار ہے۔

دیکھا بی بی۔ کتنا آسان طریقہ ہے۔ مزیدار چیز تھوڑے پیسوں میں بن گئی اب خود تھوڑا تھوڑا کھاؤ، سکھی سہیلیوں کو کھلاؤ، ثواب لوٹنا ہو تو پاس پڑوس کے غریبوں کو تحفے میں دو انشاء اللہ وہ بھی خوش، اللہ کا رسول خوش اور تمہارا دل بھی۔ اللہ کا شکر ادا کرو۔

سوال و جواب

دھنباد۔ ۱۰/دسمبر ۱۹۸۰ء محترم چچا مائل صاحب! السلام علیکم

بفضلہٖ تعالیٰ بخیر ہوں۔ امید کہ آپ کا مزاج گرامی بھی بخیر ہوگا۔

کئی برسوں سے حجاب ہم لوگوں کے زیر مطالعہ ہے۔ رسالے تو گھر میں اور بھی آتے ! لیکن حجاب کی بات ہی الگ ہے۔ دن بدن حجاب اپنی مثال آپ بنتا جا رہا ہے۔ آپ کی ترقی پر ہم لوگ آپ کے شکر گزار ہیں۔ ذہن سبھوں کا ایک سو ہو گیا ہے لیکن حجاب میں ایک چیز کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ کئی بار سوچا کہ اپنے حقیر مشورے آپ کو بھیجوں لیکن ڈر لگا کہ چھوٹا منھ بڑی بات ہوگی۔ آج قلم حرکت میں آ ہی گیا۔

ہم سب کی رائے ہے کہ حجاب میں ایک صفحہ سوال و جواب کے لئے بھی مختص کیا جائے۔ سوال دینی معلومات سے وابستہ اور دو سے زیادہ سوال کی اجازت نہ دی جائے۔ نام رکھا جائے "آئینۂ گفتگو"

امید کہ ہم لوگوں کا مشورہ پسند آئیگا۔ جواب سے ضرور نوازیئے گا۔ والسلام۔ محمد اسرائیل۔ دھنباد

جواب:۔ ہمارے پاس سوال و جواب کے سلسلے میں اور بھی خطوط آچکے ہیں اور آتے رہتے ہیں۔ کچھ خطوط کے جوابات "الجھنوں کے گرفتار" کے عنوان سے دیا جا رہا ہے۔ اگر آپ مسلسل چاہتی ہیں یا چاہتے ہیں تو ہمارے پاس سوالات لکھ کر بھیج دیجئے۔ سوالات اصلاح اور سدھار سے متعلق ہوں۔ بچوں کی تربیت سے متعلق ہوں۔ دینی فہم ابھارنے والے ہوں اور اس قسم کے ہوں وغیرہ۔ (م)

مالک و ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد اسحٰق مائل خیرآبادی مطبوعہ [illegible] سے پرنٹ کرا کر مقام اشاعت محلہ [illegible] سے شائع کیا

MONTHLY [illegible] RAMPUR U.P.

حجاب

Rs. [illegible]

ماہنامہ حجاب رامپور یوپی



ایک شمارہ ۳/

سالانہ ۲۶/

V.P سے ۳۰/

مئی ۱۹۶۵ء - جمادی الاخری ۱۳۸۵ھ - جلد ۹ - شمارہ ۱۰

اس دائرے میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ نے حجاب کے لئے جو زرتعاون عنایت فرمایا تھا اس کی مدت اس پرچے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے اور یہی سرخ نشان آپ کو یاددلاتا ہے کہ آئندہ کے لئے جلد از جلد زرتعاون مرحمت فرمائیں۔ ہم آپ کے زرتعاون کے منتظر ہیں۔ والسلام منیجر حجاب رامپور

در پردہ حجاب

کرنوں کا سفر

ایمانیات

تاریخ و سیر

مقالات و مضامین

اللہ کی نعمتیں

افسانے اور کہانیاں

خطوط اور مراسلات

منظومات

معلومات

صحت و تندرستی

مرد کی ذمہ داری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گھروالی کی اصلاح کیسے کریں؟

(قسط دوم)

قرآن میں ہے کہ مرد قوام ہے اور حدیث میں آتا ہے کہ ہر شخص راعی ہے۔ راعی اور قوام میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ راعی کہتے ہیں ماتحت کے نگراں کو۔ ماتحت کی دیکھ بھال کرنے والے کو۔ قوام گھر کے ناظم اعلیٰ کو کہتے ہیں جس کی نگرانی میں پورا گھر ہوتا ہے چونکہ گھروالی قوام کے گھر کی راعی اور نگراں ہوتی ہے اس لئے مرد وہ سارے انتظامات کرتا ہے جو گھر بنانے میں گھروالی کے لئے ضروری ہیں۔ قوام اور راعی ہونے کی حیثیت سے مرد پر واجب ہے کہ وہ گھروالی کو اس قابل بنائے کہ وہ ایسا گھر بنانے کی کوشش کرے جو اللہ کو پسند ہو۔ مرد ایسی گھروالی بنانے کی کوشش نہ کرے گا تو خدا کے حکم کی نافرمانی کرے گا اور گناہگار ہوگا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کرے گا۔ یہ تو ہوئی آخرت کی بات۔

دنیا میں اگر گھروالی ان گھڑ اور الھڑ ہوتی ہے تو گھر سارے گھر والوں کے لئے بے چینی کا گھر ہوتا ہے۔ نہ مرد خوش رہتا ہے اور نہ دوسرے لوگ۔ نہ گھر میں کوئی سلیقہ نظر آتا ہے اور نہ صفائی ستھرائی۔ بچوں کی تربیت بھی نہیں ہو پاتی۔ گھر کی اخلاقی حالت خراب ہوتی ہے۔ گھر میں برکت نہیں ہوتی۔ یوں سمجھئے کہ وہ گھر گنواروں جیسا گھر ہوتا ہے۔ سماج میں پھیلے ہوئے رسم و رواج اور وہم اس گھر کا مذہب ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ ایسے گھر والوں کی آخرت بھی برباد اور دنیا بھی تباہ۔

بیوی کو اعتماد میں لینا آخرت کی پکڑ اور دنیا میں تباہی سے بچنے کے لئے کون مرد ہوگا جو نہ

سوچتا ہو۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کی گھر والی گھر سنبھال لے تاکہ مرد بے فکری کے ساتھ اپنے کام انجام دے۔ ایسے مردوں کو کچھ مشورے پیش کئے جاتے ہیں یہ مشورے قرآن و حدیث اور بزرگوں کے حالات سے لئے گئے ہیں۔

اعتماد اور محبت کی فضا: سب سے پہلے بیوی کو اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کرے، بیوی کو جلد سے جلد یہ یقین ہو جائے کہ اس کا شوہر سچے دل سے اُسے چاہتا ہے۔ اس کی قدر کرتا ہے اس کی بھلائی چاہنے والا ہے اور جہاں تک اس کے بس میں ہے اس کی ضرورتیں پوری کرتا ہے اُسے بیوی پر بھروسہ ہے۔ وہ بیوی کو شک کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ اسکی ٹوہ میں نہیں رہتا۔ اس کے سامان اور اس کے بکس کو ٹٹولتا نہیں۔ وغیرہ۔

عورت چاہے وہ غریب کی بیوی ہو یا امیر کی۔ وہ شوہر سے بھرپور محبت چاہتی ہے۔ اگر اسے شوہر سے محبت مل جائے تو زیور اور کپڑوں اور روپیہ پیسہ پر نہیں جھگڑتی۔ محبت کرنے والا شوہر اگر روکھی سوکھی کھلاتا ہے۔ موٹا جھوٹا پہناتا ہے۔ جھونپڑوں میں رکھتا ہے تو بھی بیوی خوش رہتی ہے۔ محبت کے ساتھ اگر اسے شوہر سے پورا پورا بھروسہ اور اعتماد مل جائے تو وہ شوہر کی عزت کرنے لگتی ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ جو مرد اپنی بیوی کی نظر میں باعزت ہوتا ہے اس پر بیوی فدا رہتی ہے۔ اس کا اشارہ پا کر اپنی بساط سے بڑھ کر کام کرتی ہے اور شوہر کو زیادہ سے زیادہ سکھ پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ یہ دیکھتی ہے کہ اس کا شوہر کس بات سے خوش ہوتا ہے۔ بس وہ وہی کچھ کرنے لگتی ہے۔

زمین کا نرم ہونا

جس گھر میں میاں بیوی اعتماد اور محبت سے رہتے ہوں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ گھر ایک ایسا کھیت بن گیا جس کا بنجرپن ختم ہو گیا۔ زمین نرم ہو گئی اب اس میں جو بیج ڈالا جائے گا وہ پھولے پھلے گا۔ سوچئے تو ہر میدان کے لوگ چاہے وہ تجارت کرنے والے ہوں۔ چاہے وہ کاریگر ہوں۔ چاہے وہ سماج سدھار کرنے والے ہوں چاہے وہ اسکول چلانے

لے ہوں. چاہے وہ سیاست میں کوئی مقام حاصل کرنے والے ہوں. یہ سارے کے سارے سب
سے پہلے پبلک میں اپنا اعتماد قائم کرتے ہیں. جو لوگوں کا جتنا اعتماد حاصل کر لیتا ہے اتنا ہی کامیاب
ہوتا ہے. یہ سب دنیاداری کی مثالیں ہیں. اگر آپ ان سے اچھی مثالیں اور بہتر نمونے چاہتے
یں تو اللہ کے نبیوں کو دیکھئے، اپنے بزرگوں اور اماموں کو دیکھئے. نبیوں میں سب سے کھلی
نال حضورؐ کی ہے. آپ کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا فرمائی گئی. آپ کی چالیس سال زندگی
اللہ تعالیٰ نے ایسا پاک صاف رکھا کہ تمام لوگوں کی نظر میں آپؐ معتمد ہو گئے. آپؐ سے
فیصلے کرائے جاتے تھے. سب سے زیادہ وہ نازک معاملہ جب حجر اسود نصب کرنا تھا اور
ریب تھا کہ تلواریں فیصلہ کریں. اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا کہ مکے والوں نے آپؐ کو حکم بنایا. حکم
مطلب یہ کہ آپؐ جو فیصلہ کریں گے سب کو منظور ہو گا. چالیس سال کی عمر سے پہلے ہی آپؐ سب
اچھے انسان مان لئے گئے تھے. آپؐ کو امین اور صادق کا خطاب دیا گیا تھا. ان دونوں
ہوں میں وہ ساری خوبیاں شامل ہیں جو انسانیت کے لئے ضروری ہیں.

سب کا اعتماد حاصل ہونے کے بعد جب آپؐ نے توحید کا نعرہ بلند فرمایا تو کسی میں یہ
ت نہ تھی کہ وہ آپؐ کو جھوٹا کہتا. یا برا آدمی بتاتا. زیادہ سے زیادہ جو بات کہی گئی وہ یہ تھی کہ
دادا سے ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے اور محمدؐ کی بات سمجھ میں نہیں آتی. آپؐ کے بعد آپؐ کے
یرہ کا نمبر آتا ہے. مکے کے رہنے والے سارے کے سارے اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ
ہ بہترین انسانوں کا گروہ ہے. ہاں باپ دادا کے دین سے پھر گیا ہے. سوال یہ ہے کہ پھر
خت مخالفت کیوں ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مخالفت جو ہوئی وہ اس بنا پر تھی کہ توحید
ار کرنے کے بعد بتوں پر چڑھاوے کا روزگار ٹھپ ہو جائے گا. اس لئے پروہت قسم
ک آپؐ پر ایمان لانے کے لئے تیار نہ تھا. دوسرے وہ لوگ. جو یہ جانتے تھے کہ توحید
کرنے کے بعد چھوٹے بڑے سب برابر ہو جائیں گے اور بڑا وہ جو سب سے زیادہ

اللہ سے ڈرنے والا ہو تو منور لوگ آپ کے مخالف رہے۔ تیسرے وہ لوگ جو غریبوں کا خون چوسنے والے تھے۔ سود خوار تھے۔ غلاموں کی کمائی کھانے والے تھے۔

یہ سب تو تھا لیکن تاریخ اسلام سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کو اور صحابہؓ کو جو اعتماد حاصل ہو گیا تھا وہی آئندہ کے لئے زمین ہموار کرنے کا سبب بنا۔ اسلام پھیلتا گیا اور کوئی اسے روک نہ سکا۔

بڑوں کی گھریلو زندگی

گھریلو اعتبار سے بھی ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو ساری بیویوں (امہات المومنین) کا اعتماد حاصل تھا۔ اعتماد کی وجہ سے اُمہات المومنین سادہ زندگی پر راضی رہیں۔

صحابہ کرامؓ کے گھروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی بیویاں ان پر پورا پورا بھروسہ کرتی تھیں۔ ہم نے صحابہ اور صحابیات کے حالات پڑھے اور جب کسی صحابی کا انتقال ہو گیا تو (ہم نے پڑھا) اس کی زبان سے نکلا کہ اللہ کا یہ بندہ بہترین شوہر تھا۔ ایک لطیفہ سنئے۔ ایک بزرگ صحابی نے اپنی موت سے پہلے بیوی سے کہا کہ میرے بعد تم مجھ سے بہتر شخص سے شادی کر لینا۔ پھر جب ان کا انتقال ہوا تو بیوی کو ان سے بہتر شوہر دکھائی نہ دیتا تھا (میرے خیال میں یہ اعتماد کی آخری حد ہے) پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے پیغام بھیجا تو ان کی سمجھ میں آیا کہ او ہو، یہ اللہ کا رسول ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ آپؐ سے ان کی شادی ہو گئی۔ واضح رہے کہ یہ بزرگ خاتون حضرت اُم سلمہؓ تھیں جو بعد کو ام المومنین بنیں۔

میں زیادہ مثالیں نہ دوں گا لیکن دو ایسی مثالیں دینا چاہتا ہوں جو طلاق کی ہیں۔ میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ طلاق کے بعد عورتیں طلاق دینے والے کی شکایت ہی کرتی ہیں لیکن صحابیات کو اپنے اپنے شوہر کا جو اعتماد حاصل تھا۔ اس کی بنا پر طلاق پانے والی صحابیہؓ نے کیا اعلان کیا؟

مشہور صحابی حضرت زبیرؓ کی شادی حضرت ابو بکرؓ کی بڑی صاحبزادی حضرت اسماءؓ سے ہوئی تھی۔ حضرت زبیرؓ ذرا تیز مزاج تھے۔ جب عمر زیادہ ہو گئی تو دماغ اور بھی نازک

ہوگیا۔ ایسی حالت میں انھوں نے حضرت اسماءؓ کو طلاق دے دی۔ پھر جب حضرت زبیرؓ شہید ہوئے تو حضرت اسماءؓ کی زبان سے یہی نکلا کہ وہ بہترین شوہر تھا۔ اس کے بعد مرثیہ کہا جو نہایت دردناک ہے۔

دوسری مثال ملاحظہ ہو۔ حضرت زید بن حارثہؓ کی شادی حضرت زینبؓ سے ہوئی تھی ان سے طلاق حضرت زینبؓ نے اپنے اصرار پر لی تھی لیکن جب حضرت زیدؓ نے طلاق دی اور حضرت زینبؓ کو خبر ملی۔ اس وقت وہ آٹا گوندھ رہی تھیں۔ برجستہ ان کی زبان سے نکلا "زیدؓ بہترین مسلمان تھا۔ یا شائد یہ کہا کہ بہترین شوہر تھا۔

عزت نفس

اعتماد کے بعد نمبر ہے عزت نفس کا۔ عزت نفس کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کو کبھی ذلیل نہ کیا جائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تاکید فرمائی ہے۔ بیوی کے طمانچہ ہرگز نہ مارو۔ اُسے تنہائی میں نصیحت کرو۔ بیوی کو ہر دن ستر بار معاف کرو۔ عورت کمزور جان ہے اور شوہر کے بس میں ہے۔ شوہر کو چاہیے کہ کمزور جان کی حفاظت کرے۔ جو خود کھائے اُسے کھلائے۔ جیسا خود پہنے اُسے پہنائے اسے بے عزت اور شرمندہ نہ کرے۔ یہ اور اس طرح کی باتیں عزت نفس میں آتی ہیں۔

حضورؐ نے صحابہؓ کو اس طرح کی نصیحتیں کیں تو عورتیں شیر ہوگئیں۔ صحابہؓ نے حضورؐ سے شکایت کی تو آپؐ نے پیٹنے کی اجازت دی تو عورتیں آپؐ کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا کہ مرد ہمیں اس طرح سے پیٹتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا جو لوگ عورتوں کو پیٹتے ہیں وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔

حضورؐ نے صحابہ اور صحابیات کو عزت نفس کے سلسلے میں جو تربیت دی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہؓ کے گھر جنت کا نمونہ بن گئے۔ صحابہؓ مہینوں جہاد پر رہتے تھے اور یہاں گھر باقاعدہ چلتا رہتا تھا۔ بیوی بچوں کی تربیت سے غافل نہیں ہوتی تھی اور نہ گھر کا نظم بگڑتا تھا۔

ایک دلچسپ واقعہ :۔ ہمارے بزرگوں کے حالات میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ ملتا ہے۔

مشہور تابعی حضرت ربیعہؒ کی ولادت میں چند مہینے باقی تھے کہ ان کے والد ایک جہاد پر گئے وہاں کچھ ایسے پھنسے کہ ۲۷ برس تک مدینہ واپس نہ آسکے۔ سینتیس ہزار دینار گھر پر تھے۔ حضرت ربیعہ پیدا ہوئے تو یہ ساری رقم بیوی نے بچے کی تربیت میں صرف کرڈالی۔ حضرت ربیعہؓ بہت بڑے عالم اور امام ہوگئے۔ مسجد نبوی میں لوگوں کو خطاب کرنے لگے۔

۲۷ برس کے بعد گھر آئے تو ٹھیک اس وقت جب وہ گھر میں بدھڑک گھسنے لگے تو حضرت ربیعہؓ آگئے اور انھوں نے نامحرم سمجھ کر روکا۔ باپ بیٹوں میں جھگڑا ہونے لگا۔ مشہور صحابی حضرت انسؓ زندہ تھے۔ وہ آگئے۔ اندر سے بیوی نے بھی آواز سنی۔ دونوں بزرگوں نے حضرت ربیعہؓ کے باپ کو پہچانا۔ پھر جب گھر میں پہنچے تو بیوی سے ۳۵ ہزار دیناروں کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے کہا "جاؤ پہلے نماز پڑھ آؤ" بیوی پر بھروسہ ملاحظہ ہو۔ میاں نے حجت نہیں کی سیدھے مسجد نبوی پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ بیٹا درس دے رہا ہے اور بڑے بڑے لوگ درس سن رہے ہیں۔ لوٹ کر گھر آئے تو بیوی نے کہا، مسجد نبوی میں کیا دیکھا۔ انھوں نے بیٹے کی فضیلت کا اقرار کیا۔ اب بیوی نے کہا، بتاؤ ایسا بیٹا پسند ہے یا ۳۵ ہزار دینار؟ میں نے وہ سب اس کی تعلیم و تربیت میں خرچ کر ڈالے۔

حضرت ربیعہؓ کے والد بہت خوش ہوئے اور کہا "واقعی تم بہترین گھر والی ہو" غور فرمایئے کتنا بھروسہ تھا شوہر کو بیوی پر اور وہ بیوی کی کس درجہ عزت کرتے تھے۔ اعتماد محبت اور عزت کا فائدہ اس واقعہ سے ظاہر ہے۔

بیوی کے عزیز و اقربا کی عزت کرنا

بیوی کے میکے والوں، رشتہ داروں اور اس کی سکھی سہیلیوں کی عزت کرنا، سچ پوچھئے تو بیوی کی عزت نفس ہی کی کرنی ہے۔ ان سب کی عزت کرنے کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ شوہر بیوی ہی کی عزت کرتا ہے جو شوہر اپنی بیوی کے عزیزوں کی عزت نہیں کرتا خود اس کی عزت نہیں

ہوتی۔ کبھی کبھی ایسے موقع آتے ہیں کہ شوہر کو ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں میرے ایک دوست نے عبرتناک آپ بیتی سنائی، انھوں نے بتایا کہ:۔

ایک بار غصّے میں بیوی سے جھڑپ ہو گئی۔ اس جھڑپ میں میری زبان سے نکل گیا کہ ساجد (بیوی کا بھائی) آئے دن ہمارے گھر میں گھسا رہتا ہے۔ چوٹ بیوی کے دل پر بُری طرح لگی۔ پھر ساجد آیا تو بیوی نے اُسے آنے سے روک دیا۔ اب دیکھئے دو تین دن ہوئے تھے کہ میرے ایک کلاس فیلو محض مجھ سے ملنے کے لئے ۶ سو میل دور ناگپور سے آئے۔ تعلیم کے بعد پہلی بار تشریف لائے تھے تحفے تحائف بھی لائے تھے۔ میرے دل میں بھی تواضع کے جذبات اُبھرے۔ میں نے بیوی کو اطلاع دی اور پڑوسی کو بھیج کر بازار سے پھل اور مٹھائی منگوائی۔ یہ سب گھر کے اندر بھجوا دیا اور ساتھی سے باتیں کرنے لگا۔ ہاتھ منھ دھونے کے لئے پانی میں نے خود دیا لیکن پھر دیر پر دیر ہو گئی۔ گھر کے اندر سے نہ چائے آئی اور نہ دوسری چیزیں۔ اندر جاکر دیکھا تو بیوی صاحبہ چاول بنا رہی تھیں۔ یہ موقع اتنا نازک تھا کہ میں بیوی کو جھڑک بھی نہ سکتا تھا اور نہ غصّہ ہی کر سکتا تھا۔ میں نے ساتھی سے دو منٹ کی اجازت چاہی اور ہوٹل میں کہا آیا کہ چائے بھیجدے۔

میرا پرانا ساتھی بھانپ گیا کہ یہ گھر ایسا نہیں، جہاں میزبان بن کر رہا جائے چنانچہ بے چارہ دو گھنٹے کے اندر ہی واپس چلا گیا اور میں بھی اُسے روک نہ سکا۔

میرے دوست نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ بیوی نے اس موقع پر میری عزت نفس کو جس طرح مجروح کیا وہ آج تک یاد ہے اور یہ سب میری ہی آواز بازگشت ہے۔ میں نے بیوی کی عزت نفس مجروح کی اس نے بدلہ لے لیا۔

شوہر کو چاہیے کہ بیوی کے عزیزوں اور اس کی سہیلیوں کی خاطر تواضع میں دلچسپی لے۔ اس سے گھر کی اصلاح کے لئے زمین ہموار ہوتی ہے۔ اس کے اثرات اچھے ہوتے ہیں۔ بیوی اپنے شوہر کی تعریف کرتی ہے۔ تعریف کرنے سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ اس کا

شریکِ حیات بہت ہی اچھا ہے۔ تعریف کرکے اپنی سہیلیوں میں فخر محسوس کرتی ہے۔ وہ شوہر کو اپنے سر کا تاج سمجھتی ہے۔ چاہا کرتی ہے کہ یہ سر کا تاج برقرار رہے۔ ہر شوہر کو بیوی کے اس جذبے کا احساس رہنا چاہیے۔

خود اچھا نمونہ پیش کرنا

بیوی کو اعتماد میں لینا، بیوی سے محبت کرنا، بیوی کی عزت نفس برقرار رکھنا۔ ان تینوں باتوں کے ساتھ ساتھ مرد کو اپنے عمل سے اچھے مسلمان ہونے کا نمونہ پیش کرنا چاہیے تاکہ بیوی یہ سمجھے کہ یہ سب اسلام کی برکت ہے۔ اسلامی زندگی میں ایسا ہی شوہر ہونا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور کردار کے اچھے ہونے کی گواہی آپ کی تمام ازواج مطہرات نے دی ہے۔ آپؐ کی سب سے پہلی بیوی ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضہ نے آپؐ کے اخلاق وعمل کے اچھے ہونے کی گواہی اس وقت دی جب آپؐ نبی ہوئے۔ آپؐ نے جیسے ہی حضرت خدیجہ رضہ سے کہا کہ اللہ نے مجھے اپنا نبی بنایا ہے تو حضرت خدیجہ رضہ نے آپؐ کے اخلاق وکردار کو سراہتے ہوئے فرمایا آپؐ کو نبی ہونا ہی چاہیے۔ بیشک آپؐ اللہ کے نبی ہیں۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی مرد کی عملی زندگی کو اس کی بیوی سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا۔ بیوی اپنے شوہر کی ہر خوبی اور کمزوری جانتی ہے۔ کوئی مرد اپنی بیوی سے اپنے کو چھپا نہیں سکتا۔ ایک واقعہ یاد آیا۔ یورپ کا ایک بڑا فلاسفر مسلمان ہوا۔ اس سے لوگوں نے پوچھا۔ "محمدؐ کے نبی ہونے کا کیا ثبوت ملا جو تم مسلمان ہوگئے" اس نے کہا "یہ ثبوت کیا کم ہے کہ محمدؐ کی بیوی تصدیق کرتی ہے!"

ام المومنین حضرت عائشہ رضہ سے پوچھا گیا کہ حضورؐ کا اخلاق کیسا تھا۔ حضرت عائشہ رضہ نے جواب دیا۔ کیا تم لوگ قرآن نہیں پڑھتے۔ کان خلقہ القرآن۔ نبیؐ کا اخلاق قرآن کے عین مطابق تھا۔ اسی طرح کی شہادتیں تمام امہات المومنین رضہ نے دیں۔ یہی وجہ تھی کہ امہات المومنین رضہ

حضور ؐ کے اخلاق کے سانچے میں ڈھل گئیں جو کچھ حضور ؐ کو کرتے دیکھا وہی خود کرنے لگیں. جس طرح حضور ؐ کو رہتے بستے دیکھا، اسی طرح رہنے بسنے لگیں. حضور ؐ کی ازواج مطہرات میں ساری کی ساری عرب سرداروں کی بیٹیاں اور اعلیٰ گھرانے کی خواتین تھیں لیکن حضور ؐ کے ساتھ رہنے کی برکت دیکھئے. جس طرح حضور ؐ سادہ طریقے سے رہتے تھے اسی طرح کی زندگی سب نے اپنالی. پیروی کا یہ عالم تھا کہ اگر آپؐ نے اپنی کسی بیوی کو ایک چھوٹا سا ہی عمل کرنے کو بتایا یا بیویوں نے کرتے دیکھا بس گرہ میں باندھ لیا. پھر مرتے دم تک نہیں چھوڑا. تمام ازواج مطہرات رضہ کے حالات میں یہ جملہ پایا جاتا ہے. خدا کی قسم میں یہ عمل نہیں چھوڑ سکتی کیونکہ یہ بات میں نے اپنے محبوب میں دیکھی ہے یا کرتے دیکھا ہے. یہ بات ازواج مطہرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد فرمایا کرتی تھیں.

مرنے کے بعد عام طور پہ خاص اپنے لوگ مرنے والے کو بھول جاتے ہیں لیکن ازواج مطہرات رضہ نے حضور ؐ کے انتقال کے بعد حضور ؐ کی تعلیم کو خوب پھیلایا. زبان سے بھی عمل سے بھی. دین پھیلانے میں حضرت عائشہ رضہ تمام ازواج مطہرات سے آگے بڑھ گئیں. یہ کام امہات المومنین رضہ نے ایسا کیا کہ علمائے اسلام فرماتے ہیں. اگر ازواج مطہرات خصوصاً حضرت عائشہؓ یہ کام انجام نہ دیتیں تو ہم تک آدھا دین پہنچتا. حضرت عائشہ رضہ کے بارے میں حضور ؐ اپنی زندگی میں فرمایا کرتے تھے کہ "دین کا علم اس گوری عورت سے سیکھو"

عملی زندگی میں یہی حال صحابہ کرام رضہ اور تابعین (صحابہؓ کے شاگردوں) کا تھا. ان کے بعد ہمارے اور جو بزرگ اور امام گزرے ہیں، ان کا بھی یہی کردار رہا. ان کی سب بیبیاں ان سے متاثر ہوئیں. سارے حالات یہاں کس طرح لکھے جاسکتے ہیں. ایک دلچسپ لطیفہ سنئے:

حضرت اسماء بنت عمیس رضہ مشہور صحابیہ ہیں. ان کا پہلا نکاح حضرت علیؓ کے بڑے

بھائی حضرت جعفر طیار رضؓ سے ہوا تھا۔ حضرت جعفر رضؓ جوانی میں شہید ہو گئے تھے۔ ان کے بعد حضور ﷺ نے حضرت اسماء رضؓ کا نکاح حضرت ابو بکر رضؓ سے کر دیا۔ حضرت ابو بکر رضؓ کی وفات کے بعد حضرت علی رضؓ نے ان سے نکاح کیا۔

اب سنئے حضرت جعفر رضؓ کے ایک صاحبزادے تھے ان کا نام محمد تھا (محمد بن جعفر) حضرت ابو بکر رضؓ سے بھی ایک صاحبزادہ ہوئے ان کا نام بھی محمد تھا (محمد بن ابو بکر رضؓ) ایک بار بچوں بچوں میں باپ کی بڑائی کے بارے میں بحث چھڑ گئی۔ فیصلہ نہ ہو سکا تو دونوں ماں کے پاس پہنچے اور تصفیہ چاہا۔ اس وقت حضرت علی رضؓ بھی گھر میں موجود تھے۔ اس دلچسپ بحث کا تصفیہ سننا چاہتے تھے۔ حضرت اسماء رضؓ نے بچوں کی تقریریں سنیں۔ دونوں نے اپنے اپنے باپ کی بڑائی میں خوب خوب تقریر کی۔ اب ماں نے فیصلہ کیا: "میں نے جوانوں میں جعفر رضؓ کو سب سے بہتر پایا اور بوڑھوں میں ابو بکر رضؓ کو۔" یہ فیصلہ سن کر حضرت علی رضؓ ہنس پڑے۔ فرمایا: "ادھیڑ کو چھوڑ دیا۔" حضرت علی رضؓ اس وقت ادھیڑ عمر میں تھے۔ بڑا لطیف مزاح فرماتے تھے۔ حضرت اسماء مسکرا دیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ محبت سے، اس پر بھروسہ کر کے، اس کی عزت نفس کو برقرار رکھتے ہوئے اور خود عملی نمونہ پیش کرتے ہوئے بیوی کو اپنا بنا لیں۔ پھر دیکھئے ایک نرم اور زرخیز زمین کی طرح گھر میں کس طرح بہار آتی ہے۔ آپ جو تعلیم دینا چاہیں گے بیوی بڑھ کر قبول کرے گی۔ جس ڈھنگ پر لانا چاہیں گے بیوی اسی راہ لگ جائے گی۔

اگلے صفحات میں ہم وہ بنیادی باتیں پیش کریں گے جن کو اگر بیوی کے ذہن نشین کر دیا جائے تو وہ دوسروں کی تعلیم و تربیت کر سکتی ہیں اور یہ جو کہا گیا ہے کہ عورت بھی راعی ہے یعنی وہ شوہر کے گھر کی راعی ہے۔ نگراں ہے۔ دیکھ بھال کرنے والی ہے۔ تو بھلا گھر میں مال اسباب کے ساتھ بال بچے بھی ہوتے ہیں۔ بنیادی تعلیم کے بغیر عورت گھر کی راعی نہیں بن سکتی۔ (باقی آئندہ)

دو غزلیں

فیروز نظامی

ہاں اسمِ شہنشاہِ کرم اچھا لگے ہے
اے دل تو لئے جا کہ یہ نام اچھا لگے ہے

یہ محفلِ سلطانِ دو عالم ہے یہاں پر
ہر لب پہ درود اور سلام اچھا لگے ہے

ہے جس کی تجلی سے دو عالم میں اُجالا
ہم کو تو وہی ماہِ تمام اچھا لگے ہے

ہم خوگرِ آدابِ محبت ہیں ہمیں تو
جو اُن کو پسند آئے وہ کام اچھا لگے ہے

کیونکر نہ کریں ذکر سرِ عرش فرشتے
اللہ کو محبوب کا نام اچھا لگے ہے

ہر چیز محبت کے قرینے میں ڈھلی ہے
دربارِ محمدؐ کا نظام اچھا لگے ہے

جنت میں بلالؓ آئے تو کہنے لگیں حوریں
شاہوں سے محمدؐ کا غلام اچھا لگے ہے

شعروں میں ہے نعتِ شہِ والا کی خوشبو
فیروزؔ نظامی کا کلام اچھا لگے ہے

شائستہ شمیم

ہر ایک سمت ہی کہرا دکھائی دیتا ہے
تمام شہر اندھیرا دکھائی دیتا ہے

افق پہ ایک کرن بھی نہیں اُجالے کی
ابھی تو رات کا پہرا دکھائی دیتا ہے

تمام رات ہی جاگے تھے جس سحر کے لئے
وہ شب گزیدہ سویرا دکھائی دیتا ہے

تھکا تھکا ہوا آزردگی کا بوجھ لئے
ہمارے خوابوں کا چہرا دکھائی دیتا ہے

نہ سوئیں ڈھانپ کے منھ اپنے قافلے والے
امیرِ شہر لٹیرا دکھائی دیتا ہے

نہ جانے کون سے غم کے شکار ہیں سب لوگ
ہر ایک چہرا ہی اُترا دکھائی دیتا ہے

کچھ ایسی دور نہیں رہ گئی ہے اب منزل
وہ سامنے ہے وہ صحرا دکھائی دیتا ہے

شمیمؔ کوئی بھی سنتا نہیں صدا میری
زمانہ جیسے کہ بہرا دکھائی دیتا ہے

رخصتی

شائستہ شمیم

اے میرے بچپن کی ساتھی، ماں کی چہیتی سب کی دلاری
آئی ہے تم کو رخصت کرنے آج اُمنڈ کے خلقت ساری
سب کے چہرے اُترے اُترے آنکھ سے سب کی آنسو جاری
میکہ چھوڑ کے جانے والی بستی دور بسانے والی
میری نازش، میری پیاری یاد میں رکھنا بھول نہ جانا

یاد کرو وہ پیارے لمحے سات رہے ہم شام سویرے
خوشیوں کی سوغات بھی پائی جانے کتنے غم بھی جھیلے
کانٹوں سے بھی دامن اُلجھے لالہ و گل کے ساتھ بھی کھیلے
یادوں کی انمول یہ دولت ساتھ میں لے کر جانے والی
میری نازش، میری پیاری یاد میں رکھنا بھول نہ جانا

اب بھی اپنے صحن چمن میں رنگ برنگے پھول کھلیں گے
خوشیاں ہر سو رقص کریں گی نغموں کے سیلاب اُٹھیں گے
لیکن تم بن سارے جلوے پتھر سے بے جان رہیں گے
میرے چمن کی تم تھیں زینت میرے چمن سے جانے والی
میری نازش، میری پیاری یاد میں رکھنا بھول نہ جانا

ہونٹ ہیں سب کے لرزاں لرزاں گھر والوں کی آنکھیں نم ہیں
تیری جُدائی دل پہ گراں ہے لوگ بنے تصویرِ غم ہیں
ضبط کی نبضیں چھوٹ گئی ہیں ہوش نہیں کس حال میں ہم ہیں
صبر و رضا کی پیکر بن کر سب کے ناز اٹھانے والی
میری نازش، میری پیاری یاد میں رکھنا بھول نہ جانا

حسنِ عمل کی رابعہ بصری، راہِ عمل دکھلاتی رہنا
زیست کا مقصد طاعتِ رب ہے لوگوں کو سمجھاتی رہنا
بادِ سحر کی فرحت بن کر سب کو سکوں پہنچاتی رہنا
پھول کی نازک خوشبو بن کر سارا گھر مہکانے والی
میری نازش، میری پیاری یاد میں رکھنا بھول نہ جانا

پاسِ وفا ہر حال میں رکھنا، حرفِ شکایت لب پہ نہ لانا
زخمِ جگر کا مرہم بننا، ٹھیس نہ کسی کے دل کو لگانا
باطل کی پروا مت کرنا حق کی خاطر سر بھی کٹانا
دور بہت ہی دور بھی جا کر ہر لمحہ یاد آنے والی
میری نازش، میری پیاری یاد میں رکھنا بھول نہ جانا

سارے گھر کی جان بنو تم، سارے گھر کو یاد رہو تم
خوشیاں پاؤں تمہارے چومیں، فکروں سے آزاد ہو تم
میرے چمن کی بلبل رنگیں، شاد رہو آباد رہو تم
سب کی دعائیں ساتھ میں لے کر دلہن بن کر جانے والی
میری نازش، میری پیاری یاد میں رکھنا بھول نہ جانا

زمانے کی گواہی

دماغی امراض کے ایک سرجن کے تجربات اور مشاہدات

خدا پر اعتقاد کے بغیر کسی معاملے کو سمجھنا میری طاقت سے باہر ہے

(۱) وہ واقعی ایک بڑی پیاری ننھی منی لڑکی تھی، اس کی عمر صرف چھ سال تھی لیکن وہ غیر معمولی طور پر خوبصورت، ذہین اور خوش و خرم تھی۔ ہمیں معائنے سے معلوم ہوا کہ اس کے دماغ میں ایک بڑی سی رسولی ہے۔ آپریشن کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ دماغ کا نصف حصہ (شطر دماغ) رسولی کے ساتھ جڑی ہوئی فاسد مادے کی ایک بہت بڑی تھیلی کی وجہ سے کافی زیادہ پھیل چکا تھا۔ میں نے دقیق اور سیال مادے کی اس تھیلی یا انبار کو نکال پھینکنے کے لیے اپنا کام شروع کیا لیکن کیا ہوا؟ ایک پریشان کن صورت حال کا سامنا دفعتاً شطر دماغ اپنی جگہ سے ہٹ گیا نیچے گر گیا اور اس کی سطح پر واقع بڑی بڑی شریانیں فوراً پھٹ گئیں اور آپریشن کا کمرہ خون سے لت پت ہو گیا۔

میں اور میرے ساتھیوں نے خون کے اس سیلاب کے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن ہمیں ناکامی ہوئی، آخرکار مایوسی ہم پر طاری ہو گئی۔ میں نے روئی کی چھوٹی چھوٹی کچھ گدیاں لیں اور انھیں پھٹی ہوئی شریانوں پر رکھ کر اپنی انگلیوں سے نہایت مضبوطی سے دبائے رکھا اور بڑی تندہی سے خون روکنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر اپنے اس مشن میں کامیاب ہو گیا لیکن میں نے اپنی انگلیوں کو شریانوں پر سے ہٹانے کی ہرگز جرأت نہیں کی اور سوائے دعا کے اور کچھ نہ کر سکا۔ ادھر ننھی لڑکی کے بدن میں خون داخل کیا جاتا رہا۔ میں اس وقت کے دوران خود کو بہت حقیر اور بے بس محسوس کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ میری کیا حیثیت

ہے کہ تم نے اتنے خوفناک کام کو ہاتھ لگایا اور کبھی یہ سوچا کہ کیا یہ میری اور محض میری ذمہ داری تھی کہ اس ننھی سی لڑکی کے دماغ سے جو کہ اس کے اعلیٰ ترین فرائض، اس کی حیرت انگیز شخصیت، ذہانت، حافظہ، جذبات اور قوت ارادی کا منبع تھا۔ فاسد پھوڑے کو نکالتا؟ ہم جس جگہ کا آپریشن کر رہے تھے وہاں ہی اس کی شخصیت تھی۔ اس مقام پر اس کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔

آدھا گھنٹہ گزرا آپریشن والے کمرہ میں خوفناک قسم کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھ سمیت کسی کو یہ یقین نہ تھا کہ اگر میں نے شریانوں پر سے انگلیاں ہٹا دیں تو دوبارہ خون بہنا شروع نہیں ہو جائے گا۔ میں نے اپنی انگلیوں کا دباؤ جاری رکھا اور خداوند تعالیٰ سے دعا کرتا رہا کہ وہ میرے ہاتھوں میں قوت قائم رکھے۔

اور پھر بالکل اچانک میں نے خود کو مطمئن محسوس کیا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے وہ سب کچھ کیا ہے جو میری قوت میں تھا۔ میرا دل اب اطمینان بخش یقین سے پُر تھا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح خدا ہمارے ساتھ کمرے میں موجود تھا۔ نہایت احتیاط سے اور آہستہ سے میں نے شریانوں پر سے دباؤ ہٹالیا ایک انگلی کو ایک ہی وقت میں ہٹایا۔ آخر کار میں نے تمام انگلیاں شریانوں پر سے ہٹالیں لیکن ذرا بھی خون نہ بہا۔ البتہ صرف ایک شریان سے خون بہنے لگا لیکن اس پر آسانی سے قابو پالیا گیا۔

رسولی کو نکالنے میں مجھے ساڑھے چار گھنٹے لگے۔ میں آئندہ ایک ہفتے تک اس ننھی لڑکی کے بستر کے قریب ہی ٹھہرا رہا۔ اس کے زخم اچھی طرح مندمل ہو گئے تھے شریانیں بالکل درست ہو گئیں۔ ان سے کوئی خون نہیں بہہ رہا تھا۔ نہ ہی کوئی اعصابی درد تھا۔ اور نہ دماغ کو کوئی ضعف پہنچا تھا۔ نتیجہ وہی برآمد ہوا جس کی توقع کی جا رہی تھی اور آج وہ لڑکی بالکل خوش و خرم اپنے دورِ شباب میں داخل ہو رہی ہے۔

(۲)۔ میں نے ۱۹۶۲ء میں ایک لڑکے کا

آپریشن کیا تھا جس کی دماغ کی دو بڑی شریانیں پھٹ گئی تھیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس کے دماغ کے عین درمیان میں ایک چھوٹی سی رسولی ہے۔ شریانوں والی جگہیں بڑی طرح متاثر ہوئی تھیں۔ بچہ بے چارہ بیہوش تھا وہ مر رہا تھا۔ ہم نے دماغ کے دونوں طرف نلکیاں رکھیں اور دماغ کی خالی جگہ کو حقیقی طور پر ٹھنڈے جراثیم کش محلول سے صاف کر دیا۔ یہ ہماری اپنی ایک نئی اور انقلابی تکنیک تھی۔ اس کے بعد ہم نے لڑکے کو سانس لینے والی ایک مشین میں رکھا اور اس کے جسم کا ٹمپریچر کم کیا۔ ہفتوں تک زندگی بچانے کی کوشش جاری رہی۔ اس دوران میں نہ صرف لڑکے اور اس کے والدین کے لئے بلکہ اس افسوسناک اور ستکادینے والے کیس میں تمام میڈیکل ٹیم کو قوت اور ہمت عطا کرنے کی بھی دعا مانگتا رہا۔ پھر اچانک غیر محسوس طور پر اور بعض انجانی وجوہات کی بنا پر لڑکے کی حالت بہتر ہونی شروع ہو گئی۔ چند دن بعد ہم نے ٹھنڈا رکھنے والا کمبل ہٹا دیا۔ مزید دو ہفتوں کے بعد ہم نے اسے سانس لینے والی مشین سے نکالا اور اس کے بعد اس کے دماغ سے نلکیوں کو بھی ہٹا لیا۔ اب بچے کے مضطرب والدین سے اپنی ہر روز کی ملاقاتوں میں میں نے اس خیال کا اظہار کرنا شروع کر دیا کہ ممکن ہے کہ ان کا لڑکا موت سے بچ جائے۔ چاہے اس کی معمولی زندگی میں کچھ فرق ہی کیوں نہ پڑ جائے تاہم اس کی حالت بڑی تیزی سے بہتر ہو رہی ہے۔ اس وقت جب کہ ہم نے اسے اسپتال سے رخصت کیا تو میں اس کے بارے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ تشنج اور شدید ذہنی انحطاط کا شکار تھا۔ تاہم وہ ہماری توقع سے بھی زیادہ صحت یاب تھا۔ کئی ماہ بعد بچے کے والدین اسے دوبارہ میرے پاس معائنہ کے لئے لائے۔ اس بچے کے معائنہ میں جس نتیجہ پر پہنچا اس پر میں اب تک حیران ہوں۔ وہ ہر لحاظ سے اور مکمل طور پر صحت یاب اور ایک عام انسان کی طرح تھا۔ وہ خوش و خرم

اور چپت تھا۔ رسولی ابھی تک اس کے دماغ
کے وسط میں موجود ہے۔ ہم نے اس پر کڑی
نظر رکھی ہوئی ہے لیکن تقریباً چار سال کے
دوران اس سے نہ تو مزید کوئی تکلیف پیدا
ہوئی ہے اور نہ ہی وہ بڑھی ہے۔

اگر میں یہ کہوں کہ میں نے معجزات دیکھے
ہیں تو یہ میرے عقیدے کی بات نہیں لیکن
یقیناً میں آپریشن روم میں کئی بار انتہائی
خطرناک صورت حال سے دوچار ہوا ہوں
ان میں سے بعض کی حالت بظاہر مایوس کن
تھی لیکن مجھے حیرت تھی کہ یہ مریض موت
سے بچ گئے اور عام انسانوں کی طرح رہنے
لگے لیکن ان کامیابیوں کو کسی "معجزانہ"
امر سے تعبیر نہیں کرتا، میں نہیں سمجھتا وہ
کامیابیاں تمام طبی ماہرین کی مشترکہ اور
بہترین کوششوں کے بغیر حاصل ہو سکتی
تھیں لیکن کامیابی کے مقابلے میں حالات
اتنے ناسازگار ہوتے تھے کہ میرا یہ پختہ یقین
ہے کہ مریض کے بارے میں فیصلہ کرنے
میں اور عملی طور پر علاج میں یہ کامیابی
غیبی مدد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

بہت سے محقق سائنسدانوں کا اپنی
علمیت میں اضافے کے ساتھ خدا پر یقین کم
ہوتا جاتا ہے لیکن میری حالت اس کے برعکس
ہے۔ مریضوں پر اپنے تجربے کی بنا پر
اور دماغ کے متعلق پوشیدہ راز معلوم کرنے
کے لئے اپنی تحقیق کے دوران مجھ پر علم
کی طاقت کا خوف طاری ہو جاتا ہے اور
مجھے ایک ایسی اعلیٰ ترین ذہانت کا وجود
کرنا پڑتا ہے جس نے ذہن اور دماغ کے درمیان
ایک ناقابل یقین رشتہ پیدا کیا ہے ایک ایسی
صورت جو انسان کی فہم و فراست سے
بالاتر ہے۔

اس حیرت انگیز عضو یعنی انسانی دماغ
کے بارے میں ذرا غور کیجئے انسان آئندہ
خواہ کتنا ہی اعلیٰ ترین کمپیوٹر تیار کرے لیکن
وہ تقریباً تین پونڈ وزنی اس لیس دار ریشوں
کے ڈھیر کی پیچیدگیوں کارکردگی اور صلاحیت
کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چھوٹی پہاڑیوں اور
تنگ وادیوں کی یہ سطح مرتفع جس میں سرخ

اور ہائی نسیں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ دماغ ایک دوسرے سے کافی مشابہت رکھتا ہے بہر حال اس میں کسی جگہ ایسی کوئی چیز مزید ہے جو ہم میں سے ہر ایک کو منفرد بناتی ہے کیوں کہ دماغ ہی ذہن کی آماجگاہ ہوتا ہے جو ہمارے جسم کا جوہر ہے۔ دماغ و ذہن کے اس رشتہ کے بارے میں سائنس اب تک تقریباً ناواقف ہے۔

مجھے یقین ہے کہ دماغ حیات انسانی یعنی روح کا گھر ہے۔ اس لیے میرے نزدیک دماغ ایک مقدس جگہ ہے اس کے باوجود یہ زخمی یا بیمار ہو سکتا ہے اور بعض اوقات ہمارے لیے رسولیوں، جریان خون یا بیماریوں کی تلاش کے لیے اس کی گہرائیوں میں جانا ضروری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس شعبہ میں کام کرتے ہوئے مجھ پر ایک طرح کی مذہبی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے جس کے لیے اعلیٰ ترین مہارت درکار ہے مجھے ایسے کام میں سہارا دینے کے لیے یقین محکم کی ضرورت ہے۔

(۳) مجھے کافی عرصہ پہلے کا موسم بہار کا ایک خوش گوار دن یاد آتا ہے جب مجھے ایک اسپتال میں ایک تیس سالہ نوجوان کے کیس میں مشورہ کے لیے بلایا گیا تھا اس نوجوان کے دماغ میں ایک شدید قسم کی رسولی تھی۔ کمرہ رنگ برنگے گھریلو صحت یابی کے کارڈوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں سے بعض میں ایک سیاہ بالوں والی خوب صورت بچی کی تصاویر بھی تھیں اور وہ بار بار یہ کہہ رہی تھی "ابو جلدی سے صحت یاب ہو جائیے۔ جلد گھر آجائیے! مجھے آپ کی یاد بہت ستا رہی ہے!" لیکن جب میں نے اس نوجوان کا ریکارڈ پڑھا اس کا معائنہ کیا تو مجھے جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ وہ اب گھر واپس نہیں جا سکے گا۔

میرا دل صدمہ سے نڈھال ہو گیا۔ اس قسم کے لمحات اس وقت تک گزارنے کی کوشش نہیں کر سکتا جب تک یہ احساس میرے دل میں جاگزیں نہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ

پر اعتقاد کے بغیر کسی معاملہ کو سمجھنا میری طاقت سے باہر ہے اور یہ کہ مریض اور اس کے تمام متعلقین اپنی اپنی منزل کی طرف گامزن ہیں اور یہ کہ فی الوقت زمان و مکان کے ایک ایسے عظیم ڈرامہ کا مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں جس میں ہر ایک شخص کو اپنا اپنا کردار ادا کرنا ہے۔

میرے نزدیک علاج معالجہ اور عقیدہ میں باہمی طور پر ناقابل شکست رشتہ موجود ہے۔ میں اکثر عبادت کرتا رہتا ہوں۔ خصوصاً آپریشن سے قبل اور اس کے بعد مجھے عبادت سے خاص سکون ملتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے مجھے میرے پیچھے وسائل کا وہ خزانہ موجود ہے جس کی مجھے ضرورت اور خواہش ہوتی ہے۔

میں اپنے ساتھیوں میں سے ان عظیم اور اچھے ساتھیوں سے واقف ہوں جو ریاضی اور کیمیائی فارمولوں کے ذریعہ بہت سی باتوں کی خود وضاحت کر سکتے ہیں اور مخلصانہ طور پر سمجھتے ہیں کہ جس بات کی آج وضاحت نہیں ہو سکی سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ واضح ہو جائے گی تاہم یہ استدلال مجھے قطعاً غیر منطقی معلوم ہوتا ہے کہ برقی قوت کی مدد سے فقط ذرات کے ایک دوسرے سے ملنے کے ذریعے انسانی زندگی وجود میں آئی۔

ایک حقیقی سائنسی نقطہ نظر سے مجھے انسانی دماغ اور ذہن ہر چیز سے بالاتر نظر آتا ہے جو سائنس نے کبھی تیار کی ہو۔ کیونکہ انسان کی اپنی ایک علیحدہ حیثیت اور انفرادیت کی اسی وقت توضیح کی جا سکتی ہے جب عقل کل یعنی خالق حقیقی کا وجود تسلیم کر لیا جائے ہم دماغ کے بارے میں خواہ کتنی ہی معلومات کیوں نہ حاصل کر لیں لیکن پھر بھی ہم ذہن کی مکمل وضاحت نہیں کر سکتے اور ان سب باتوں کے بارے میں مجھے یہ یقین ہے کہ ان تمام مخلوقات کی بنیاد پر عقل و دانش کی مرہون منت ہے اور ایک ذات واحد نے یہ کائنات قائم کی ہے اس تجویز کو ہرگز قبول

نہیں کرسکتا کہ ذہانت شخصیت، یادداشت اور انسانی جسم کا یہ مجموعہ یعنی انسان اتفاقی حادثات کا نتیجہ ہے۔

میرے خیال میں یہ فرض کرلینا بھی غیر منطقی ہوگا کہ دماغ کی موت سے ذہانت شخصیت اور یادداشت کا وجود بھی ختم ہوجاتا ہے بلکہ یہ یقین کرنا زیادہ معقول ہوگا کہ ہماری روح ایک ڈھانچہ یعنی دماغ سے پرواز کرجاتی ہے اور ایک نئی سمت میں پناہ حاصل کرتی ہے۔

دماغ کی موت کے بعد روح کی کیا کیفیت ہوتی ہے میں اس پر کوئی رائے زنی نہیں کرسکتا۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ منطق لازمی طور پر ایک عقیدہ کی طرف میری رہنمائی کرتی ہے۔ یہ عقیدہ کہ انسان کی حیثیت اس کی انفرادیت روح کی صورت میں قائم رہتی ہے

غزل

عزیز بگھروی

خیال اگر تلاش میں ذوق خلیل ہے
ہر ذرہ کائنات کا ایک سنگ میل ہے

سوچوں پہ اس کا قبضہ ارادوں پہ اختیار
اک موج خوں کی طرح وہ مجھ میں دخیل ہے

پیدا کیا گیا ہوں مٹایا بھی جاؤں گا
میرا وجود میرے عدم کی دلیل ہے

وقت فنا بھی کم نہیں ہوتا تیرا خمار
اے زندگی تو کتنی حسین و جمیل ہے

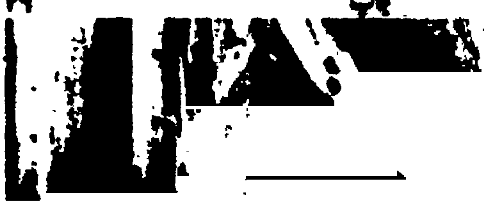
میں ہوں اور ایک جرم تمنا ہے اے ندیم
شہر جفا میں جو بھی ہے اس کا وکیل ہے

حاقی ہے شکوہ سنج کہ میکش ہیں تنگ ظرف
رندوں کو یہ گلہ ہے کہ ساقی بخیل ہے

اے بیکسی تشنہ لبی اسکو کیا کروں
جس سمت دیکھتا ہوں سرابوں کی جھیل ہے

آئے نظر کہاں سے وہ جان آفریں کرن
آنکھوں کے گرد تیرہ شبی کی فصیل ہے

دیکھو تو ایک پل کے برابر ہے زندگی
سوچو عزیز اس پہ تو صدیوں طویل ہے



اس کی منگنی تیسری بار بھی ٹوٹ گئی

جب میں نے یہ سُنا کہ تزئین کی تیسری منگنی بھی ٹوٹ گئی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اتنی پیاری طبیعت کی یہ پیاری سی لڑکی۔ آخر کیا چیز انھیں پسند نہیں آئی اس کی۔ اگر بعد میں ناپسند کرنا ہے تو پہلے ہی پسند کیوں کرتے ہیں یہ آنیوالے اور میں سوچنے لگی پہلے زمانے میں منگنی نکاح کا

رہی جو بذات خود نسوانیت کی تزئین تھی جس کے ہاتھ میں ایک خاتون خانہ بننے کے لئے ہر قسم کا ہنر تھا۔ جس کی طبیعت میں ہمدردی اور محبت کے جذبات تھے جس کی نگاہوں میں حیا کی تابندگی تھی جس کی پیشانی شعور سے روشن تھی جس کی شخصیت میں کچھ عجب وقار اور پاکیزگی تھی۔ اس

وہ صرف دُلہن بننے کا خواب دیکھا کرتی ہے

رہ رکھتی تھی۔ چاہے کچھ ہو جائے ۔ مگر زبان سے دی ہے اس لئے سو فیصد یقین پر اس کی پابندی زمی ہے۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں لڑکی کو ں بار پسند یا ناپسند کیا جا سکتا ہے۔ دل میں سا کسک۔

کی طرف اُٹھنے والی ہر نگاہ پسندیدگی کے احساسات لے کر ہی لوٹتی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اس کو مستقل طور پر پسند کرنے کے لئے جو لوگ بھی آگے بڑھے وہ پسندیدگی کا اعلان کر کے بھی —

شادی یا دخترِ نیک اختر کی رخصت پر جہان داری میں تمام تر فیاضی اور جہیز دینے اور لینے میں کمال عالی حوصلگی کا ثبوت دیتے ہیں وہ اپنے جائز و ناجائز طریقے پر حاصل کردہ مال کی نمائش کا اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں سمجھتے کہ ایسی تقریبات اور رسوم کو اعلیٰ پیمانہ پر نئے سے نئے انداز میں ترتیب دیں مالی بحران کے اس دور میں انہیں اسراف سے ذہنی سکون ملتا ہے۔

وہ آنکھیں کہاں ہیں جو ان حقائق پر رو سکیں وہ انسان کہاں ہیں جو انسانیت کی لاج رکھ سکیں۔ میں اُداس نظروں سے ہر طرف دیکھتی ہوں۔ کاش میرے اکرام کی طرح اور بھی بہت سے اکرام ہوتے جو بہت سی "نزہتوں" کو بغیر کسی جہیز کے بیاہ لاتے اور ان کا دامن خوشیوں سے بھر دیتے کہ ہم نے تمہیں صرف "تمہارے" لئے اپنایا ہے۔ ہمیں دولت کی چاہ نہ تھی۔ ایک شریکِ زندگی کی ضرورت تھی۔ تم میں وہ سب کچھ ہے جس کی ہمیں چاہ تھی لیکن کاش ایسے شائد ایسے نیک باقی نہیں رہے۔ جبھی تو "نزہتیں" آنچل میں آنکھوں کے راستے موتی لئے اپنی بے مائگی کے احساس میں پھنکی مار رہی ہیں۔ انھیں بغیر جہیز کے کوئی قبول نہیں کرے گا۔ اس دور میں لڑکے بکتے ہیں ان کے والدین کہاں سے منہ مانگی قیمت لائیں۔

سفید پوشی کا بھرم رکھنے والے شریف خاندان بھی اس ریل پیل کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں اور آج کی اس کاروباری دنیا میں شادی کو کاروبار بنانے والے لوگوں کے ہاتھوں میں بے بسی سے پھنس جاتے ہیں۔ اگر وہ رشوت نہ لیں، غبن نہ کریں، چور بازاری سے رقمِ مطلوبہ حاصل نہ کر پائیں تو ان کی بیٹیوں کو تین تین بار ٹھکرا دیا جاتا ہے اور اس کے بعد چاندی کے تار بیٹی کے سر پر دیکھ کر وہ اس کی حسرت لئے قبر میں جا لیٹتے ہیں۔ نہ جانے کتنی بوڑھی کنواریاں ہماری ترقی کے اس دور کو رو رہی ہیں۔ نہ جانے کتنی بن بیاہیاں اپنے ان دیکھے شوہروں کی چتا پر خاموشی سے سُلگ رہی ہیں۔ وہ شوہر جنھیں دولت کی ملینے میٹھی نیند سُلا دیا ہے وہ اس نیند سے کبھی نہیں جاگتے۔ نہ ان محروم و حیران لڑکیوں کی آنچ کو کوئی دیکھتا ہے۔ جو چُپکے چپکے راکھ کا ڈھیر بن جاتی ہیں یا اس ڈھکی چھپی آگ کو تاپنے کے لئے کئی ہاتھ اُٹھتے ہیں وہ دلوں میں چنگاری بن کر جلتی ہے اور شعلہ بن کر خود جلتی ہے دوسروں کو جلاتی ہے

آپ کے تبصرے آپ کے مشورے باعثِ فخر ہیں سب کے واسطے

● حجاب سے میرا تعلق پہلے بھی رہا ہے، اب بھی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی رہے گا۔ ماشاء اللہ حجاب کافی ترقی کر چکا ہے۔ اس کی زبان سلیس اور عام فہم ہونا بھی س کی مقبولیت کی بہت بڑی وجہ ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ اس طرح حجاب دن دگنی رات گنی ترقی کرتا رہے۔ بے حجابیوں کو باحجاب کرے اور قلب و نظر کے حجاب کو ہٹا کر لوں کو منور اور آنکھوں میں بینائی عطا کرتا رہے۔

حجاب اکتوبر ۸۷ء میں ظفر صاحب کا تبصرہ خوب ہے۔ کہانی کی کہانی ہے اور شرح ، شرح بھی۔ میرے خیال میں اگر اشعار کی شرح اس طرز پر کی جائے تو بہت مفید کام ہوگا۔ نتخاب میں اشعار وہی ہوں جو اپنے اندر اسلامی نظریات سموئے ہوئے ہوں۔ جب یں نے اکتوبر کے حجاب میں یہ تبصرہ پڑھا تو بے حد خوشی ہوئی کہ چلئے حجاب میں ایک مفید کالم کا اضافہ ہوا مگر بعد کے شماروں میں نہ پاکر ایسا لگا جیسے میری کوئی قیمتی شے کھو گئی ۔ و کاش یہ مستقل ہو جائے۔

اس کے علاوہ کوئی طویل اصلاحی کہانی قسط وار آنی چاہئے۔ ان دونوں صورتوں یں حجاب کے قارئین کو پہلے سے کہیں زیادہ منتظر پائیں گے۔ ایک کالم سوال و جواب

• سنجیدہ اختر. بھدراوتی. میری رائے ہے کہ ہر مہینے کا لحاظ رکھ کر اور یہ لکھا جائے تو یہ مفید اور معلوماتی بات ہوگی. دوسری بات یہ ہے کہ ہر ایک موضوع پر ایک مضمون چھانٹ کر تجلی کی رونق بڑھانا چاہیے. تیسری بات یہ ہے کہ سوال و جواب کا کالم مزید رکھئے. کتنی ہی ایسی معلومات ہیں جن کو ہر کوئی نہیں جانتا. کافی پڑھے لکھے حضرات بھی غلطیاں کرجاتے ہیں. امید کہ توجہ دیں گے.

ایک خاص بات کی طرف توجہ دلاؤں وہ خاص بات خود آپ کے مضمون کی ہے آپ نے ایک افسانہ "پری اتری گئی آج خوب شیشے میں" لکھا. بڑے مزے کا افسانہ ہے اس سے ہمیں جھوٹ کا جواز بھی مل گیا. معاف کیجئے گا. ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا رسالہ اپنی نوعیت کا انوکھا رسالہ رہے. ظفر میاں کیوں خاموش ہیں ان سے لکھاتے رہیئے اور کہیئے کہ مجھے خط جلد بھیجیں. میں ان سے سخت ناراض ہوں. والسلام. آپ کے بھائی سلام لکھوا رہے ہیں

محتاج دعا — سنجیدہ اختر بھدراوتی

• مولانا........ مدظلہ العالی. محترم مائل صاحب السلام علیکم. میں آپ کا رسالہ تجلی حرفاً حرفاً پڑھتا ہوں اور آپ کو دعا دیتا ہوں. اللھم زد فزد. لیکن پچھلی بار آپ نے بنات کے خطوط میں ایک ایسا شعر سمویا ہے جس سے سخت حیرت ہے کہ آپ نے کس طرح کاغذ پر لانے کی جرأت کی. یہ بات کہ یہ فحش شعر ہے آپ نے خود کہا تو ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے. ہم آپ اب اس عمر میں ہیں جہاں ادب میں اتنا گہرا مطالعہ نہیں کرتے. عریاں شعر کو اور عریاں کرتا ہے. آپ کے قلم کی احتیاط سے واقف ہوں. شاید مجھے پہلی بار ایک بات کھٹکی. چونکہ آپ سے خلوص ہے اسلئے بات صاف صاف کہہ دی. اللہ تعالیٰ زیادہ سے زیادہ آپ سے دین کی تبلیغ کا کام لے.

سوال } سوال و جواب کے سلسلے میں عرض ہے کہ سوال صاف صاف ایک صفحہ پر لکھا جائے سو
جواب } زیادہ تر مذہبی اسلامی عقیدوں. گھریلو الجھنوں. تہذیبی ملفوظوں. اصلاح اولاد

کے متعلق ہونا چاہیے۔ جس صفحہ پر آپ سوال لکھیں اسی صفحہ پر اپنا پورا پتہ بھی لکھیں۔

Dr. AHMAD SAJJAD

• برادر مکرم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

الحمد للہ بخیر رہکر خواہاں خیریت ہوں۔

گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے حیدرآباد شانتی نکیتن۔ کلکتہ اور پٹنہ وغیرہ کا اس طرح مسلسل سفر ہوتا رہا کہ آپ کے "فرض نصف ملاقات" کی ادائیگی کا بھی موقع نصیب نہ ہوا معذرت خواہ ہوں۔

البتہ حجاب کے تازہ شمارہ (جنوری ۸۸ء) کے رنگا رنگ اور خیال انگیز مندرجات نے مجبور کر دیا کہ اس خوبصورت اور دلچسپ پیش کش پر آپ کو ہدیہ مبارکباد ارسال کروں۔

حجاب جس علمی حلقے کا محبوب بلکہ مرغوب رسالہ بن چکا ہے اس کے مذاق و معیار کا خیال رکھتے ہوئے ہر ماہ اس قدر معنی خیز انتخاب پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

غلامی کے مسئلہ پر آپ کے اداریہ کا ابتدائی حصہ تو پسند آیا مگر آگے چل کر اپنا لگا کہ شعلہ ٹھنڈا پڑ گیا اور صاحب نظر دانشور نے واعظ کا روپ دھار لیا۔ آئندہ شمارہ میں اس کی تلافی ہونی چاہیے۔

عزیزی منظر احمد صاحب کی زبانی آپ کی خیریت اور تحریریں برابر ملتی رہتی ہیں۔ آپ نے گزشتہ شمارہ میں احقر کی کتاب پر جس شفقت و محبت اور عالمانہ انداز سے تبصرہ فرمایا ہے اسکے لئے سراپا سپاس ہوں۔ میری جن تحریری خامیوں کی طرف آپ نے نشاندہی کی ہے وہ بالکل بجا ہیں۔ مگر آپ کا انداز پیش کش ایسا دلنواز ہے کہ ایک تعلق دھوکا ہوتا ہے کہ وہ عیب، ہنر تو نہیں ــــ گزشتہ ماہ جب حیدرآباد کے دفتر جماعت پرانی حویلی میں مقیم تھا تو وہاں کئی رفقائے کرام نے مجھ سے جناب نائل اور حجاب کے بارے میں اس انداز سے گفتگو کی جیسے وہ میرے ہی گھر کے ہوں۔ لوگوں کو آپ کے نازک حالات کا لحاظ ہے [illegible]

الجھنوں کے گرفتار

محترمہ صوفیہ صاحبہ ایشیا ائٹ ہاؤس سٹن روڈ کانپور نے اپنے خط میں تو لکھا کہ چند سوالات بھیج رہی ہوں لیکن اتنے زیادہ سوال کر ڈالے کہ ان کے دو صفحے بھر گئے۔ ان سوالات میں بڑا اضطراب ہے۔ ہم کو اس مضمون نما سوال نامہ سے سوالات چھانٹنے میں ذرا زحمت ہوئی بہرحال یہ دلچسپ سوالات ملاحظہ ہوں اور ہمارے جواب بھی ——— (م)

(۱) سوال :- کیا تقدیر کا لکھا کٹ سکتا ہے؟ اگر نہیں تو علامہ اقبال نے کیسے لکھ دیا کہ تدبیر سے تقدیر بدل سکتی ہے۔

جواب صوفیہ صاحبہ! آپ کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یقین تو ہے کہ تقدیر کا لکھا مٹ نہیں سکتا لیکن ایک شاعر نے کہہ دیا ہے اس لئے آپ کا یقین متزلزل ہو گیا ہے۔ اگر شاعر کا کہنا ہی آپ کے لئے دلیل ہے تو سنئے، سراج لکھنوی فرماتے ہیں :-

مٹ نہیں سکتی کبھی تحریر پیشانی سراج   شک اگر ہو جنگ کر کے دیکھ لو تقدیر سے

یا کسی کا یہ مصرع ——— پیش آتی ہے وہی جو کچھ کہ پیشانی میں ہے

یا ایک ہندی کوی کہتا ہے ——— کرم گتی ٹارے ناہیں ٹرے (تقدیر کا لکھا ٹالے نہیں ٹلتا)

(۲) سوال :- قسمت کے متعلق کچھ لوگ جان لیتے ہیں کہ ایسا ہونے والا ہے اور وہ سچ ہو بھی جاتا ہے

جواب کیسے ہی لوگ ہوں قسمت کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے کہ کیا ہونے والا

ہے۔ یہ تو جواب ہوا کیسے لوگ ہوں گا۔ لیکن اگر آپ کا یہ مطلب ہے کہ لوگ کیسے جان لیتے ہیں
تو جواب یہ ہے کہ کسی طرح بھی نہیں جان سکتے۔ اب رہی یہ بات کہ اور وہ سچ بھی ہو جاتا ہے
تو میری عزیزہ آپ اپنی بہت سی باتوں کو یاد کیجئے۔ آپ کو دس پانچ مثالیں اپنی ذات سے
مل جائیں گی۔ کبھی آپ نے اپنے اندازے اور اٹکل سے کہہ دیا ہو گا اور وہ ہو گیا ہو گا تو کیا یہ
تقدیر کا لکھا جان لینا ہوا۔ بیٹی! دنیا میں بہت سے چالاک ہیں جو نادان لوگوں کو ٹھگنے کے لئے
ایسے ڈھونگ رچاتے ہیں۔ یہ ایسی ذو معنی بات کہتے ہیں کہ سننے والا سمجھتا ہے کہ سچ کہتا ہے۔ آپ
مسلمان ہیں۔ مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ تقدیر کی بات کوئی کسی طرح نہیں جان سکتا۔ ایک واقعہ ہے
ایک بار ایک جوتشی نے ایک بادشاہ سے کہا، سرکار! گیارہ دن کے اندر مر جائیں گے۔ بادشاہ اداس
ہو گیا۔ پاس ہی وزیر بیٹھا تھا۔ اس نے جوتشی جی سے پوچھا۔ آپ کب مریں گے؟ اس نے
جواب دیا۔ میری زندگی ابھی پچاس برس سے زائد ہے۔ یہ سن کر وزیر نے تلوار نکالی اور اس کا سر قلم
کر دیا۔ بادشاہ نے وزیر کو ڈانٹا تو اس نے عرض کیا حضور! یہ شخص اپنی زندگی کے بارے میں
تو جانتا نہیں تھا۔ دوسروں کے بارے میں اسے کیا معلوم۔ بادشاہ خوش ہو گیا اور پھر بہت
دنوں زندہ رہا۔ ان شاء اللہ ہم اپنے اس سال کے اوہام شکن نمبر میں ایسی بہت سی باتوں
پر لکھیں گے۔

(۳) سوال: کیا پردہ کرنا ضروری ہے؟ میرے گھر والے اتنی سختی سے پردہ کرتے ہیں کہ داماد اور
بہنوئی داماد وغیرہ سے بھی پردہ کرتی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ جسم کی وہی چیز چھپانے کی ہے جو
چھپائی جانی چاہیے۔ چہرہ کیوں چھپایا جائے۔ ہاں نوجوان خوبصورت لڑکی ضرور پرہیز کرے
بدصورت کو پردہ کرنے کا کیا حق ہے اور ۴۰، ۵۰ سال کی عورت کو تو پردہ کرنا ہی نہیں چاہیے
وہ اپنے آپ کو خود بچا سکتی ہیں۔

جواب صوفیہ صاحبہ! کتنا اضطراب ہے آپ کے سوال میں۔ وہ تو کہئے میں نے مختصر کر دیا

ِب ملاحظہ ہو۔ پردہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ آپ کے گھر کی عورتیں داماد اور پوتے داماد
پردہ کرتی ہیں اور ایسے ہی دوسرے لوگوں سے تو آپ کے، وغیرہ، میں بھتیجے اور بھانجے
رہی آسکتے ہیں تو عرض ہے کہ آپ کے گھر کی عورتوں کو پردے کے حدود نہیں معلوم
ں پردے کے متعلق آپ اپنی معلومات بڑھائیں اور اپنے گھر والوں کو بتائیں۔

آپ فرماتی ہیں کہ چہرہ کیوں چھپایا جاتا ہے۔ وہی چیز چھپانا چاہئے جو چھپانے کی ہے۔ جواب
یہ ہے کہ چہرہ ہی تو مرد کے لئے آزمائش بنتا ہے۔ چہرہ ہی تو وہ پھاٹک ہے جس سے
بدمعاش کی نگاہ اندر گھستی ہے اور وہ بدمعاشی پر تل جاتا ہے۔

آپ کہتی ہیں کہ بدصورت عورت کو کیا حق ہے کہ پردہ کرے۔ صوفیہ بیٹی! اگر آپ مرد
نہیں تو آپ کو معلوم ہوتا کہ مرد کی نظر میں ہر عورت خوبصورت ہوتی ہے۔ آپ یہ نہیں سمجھ
ں گی اس لئے آپ کے لئے یہ جواب ہے کہ بدصورت عورت کے لئے بدصورت مرد فتنہ بن
جاتا ہے۔

صوفیہ بیٹی! آپ کا یہ خیال غلط اور ناتجربہ کاری پر مبنی ہے کہ ۴۰، ۵۰ برس کی عورت مرد
سے اپنی حفاظت کرسکتی ہے۔ خدا نہ کرے کہ کبھی کسی شریف خاتون کو بدمعاش مرد سے سابقہ
پڑ جائے۔ بہرحال آپ کے لئے دعا ہے کہ خدا آپ کو محفوظ رکھے۔"

سوال ۵۔ مرد کٹھن سے کٹھن کام کرلیتا ہے۔ عورت نہیں کرپاتی تو کہا جاتا ہے کہ مرد کے لئے اللہ کا حکم
ہوتا ہے عورت کے لئے نہیں ہوتا۔

جواب بیٹی! کس جاہل نے آپ سے کہہ دیا اور آپ نے مان لیا۔ اللہ کے حکم سے ہی سب
ہوتا ہے۔ چاہے وہ مرد کرے یا عورت۔ عورت بھی کچھ ایسے کٹھن کام انجام دیتی ہے جو مرد کے
بس کے نہیں۔ بچوں کی پیدائش۔ بچوں کو پالنا۔ بچوں کو قابو میں رکھنا۔ مرد جیسے صنفِ شدید کو
انسان بنانا۔ اس کو اپنی انگلی پر نچانا۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے کام ہیں جو عورت انجام دے

حکم سے کرتی یا کرسکتی ہے۔ یاد رکھئے جس طرح اللہ مرد کے لئے رحمان ہے عورت کے لئے رحیم ہے۔ دونوں اس کے بندے ہیں۔

(۵) سوال: غریب اور معمولی شکل کی لڑکیوں کی شادیاں کیوں نہیں ہوتیں کیا یہ اللہ کے حکم میں ہے

جواب آپ کا مشاہدہ غلط ہے غریب اور معمولی شکل کی لڑکیوں کی شادیاں جلد ہو جاتی ہیں پریشانی ہے خوبصورت، گریجویٹ اور بڑے گھرانے کی لڑکیوں کے لیے۔ یہ خوبصورت خوبصورت شوہر چاہتی ہیں۔ یہ گریجویٹ گریجویٹ شوہر چاہتی ہیں۔ یہ بڑے گھرانے کی بڑے گھرانے کا فرد چاہتی ہیں۔ اور اسی انتظار میں عمر سے گذر جاتی ہیں اور عمر بھر ہاتھ ملتی رہتی ہیں یہ اللہ کا حکم نہیں ہے بلکہ حضرت انسان کی شامت اعمال ہے۔

(۶) سوال: مرد کسی غریب لڑکی کو محبت میں پھنسا کر چلا جاتا ہے تو اللہ مرد سے انتقام کیوں نہیں لیتا۔

جواب یہاں پھر آپ کے مشاہدے نے آپ کو دھوکا دیا۔ محبت کے کھیل زیادہ تر تعلیم یافتہ اعلیٰ گھرانوں میں کھیلے جاتے ہیں۔ غریبوں کو اتنی فرصت کہاں کہ کہیں عشق لڑاتے پھریں۔ آپ کے یہ مشاہدات کالجوں اور مغرب زدہ لوگوں سے متعلق ہیں جو آپ نے غریبوں کے ماتھے چپکا دیا ہے۔

(۷) اللہ میاں کُن کہہ دیتے ہیں اور کام ہو جاتا ہے۔ پھر ہم دعا کرتے ہیں تو اس میں دیر کیوں لگتی ہے یا دُعا قبول نہیں ہوتی۔

جواب بیٹی صوفیہ! مجھے بالکل یقین ہو گیا کہ آپ کا مطالعہ بالکل نہیں ہے۔ آپ تو ہمیں بھی نہیں پڑھتی ہیں۔ ابھی ہم نے خود دُعا کے عنوان سے سیر حاصل مضمون لکھا ہے۔ آپ پڑھئے اور اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کریجئے۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی پکار ضرور سنتا ہے۔ کوئی اُسے پکارے تو۔

(۸) سوال: لوگ مزاروں پر جاتے ہیں وہاں سے ان کی مرادیں فوراً پوری ہو جاتی ہیں لیکن

سنتا۔ میں چاہتی ہوں کہ میں بھی وہاں جاؤں لیکن میری والدہ پوری ملّانی ہیں وہ اس کو حرام کہتی ہیں۔

جواب میری نصیحت یہ ہے کہ آپ اپنی والدہ سے اسلامی تعلیم ضرور سیکھ لیں۔ یہ ملّانی آپ کی سچی بہی خواہ ہے۔ رہی یہ بات کہ مزاروں پر فوراً دعا قبول ہوتی ہے یہ آپ کو کس نے پڑھا دیا جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ آپ کہتی ہیں کہ یہ مزاروں کی برکت ہے اور جو لوگ بنگلہ دوں سے مرادوں کی جھولیاں بھر لاتے ہیں ان کے متعلق کیا خیال ہے؟

جس طرح عزیزہ صوفیہ اُلجھے ہوئے خیالات میں مبتلا ہیں اسی طرح بہت سی لڑکیاں ہوں گی۔ ان سب کو میرا مشورہ ہے کہ وہ اسلامی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بہترین لٹریچر کا مطالعہ کریں۔ میرے خیال میں مولانا مودودی نے جس طرح ایسے ذہن صاف کئے ہیں اس طرح کسی نے یہ کام انجام نہیں دیا۔ اس لئے مولانا مودودی کی لکھی ہوئی کتابیں ضرور پڑھئے اور تفہیم القرآن کو اپنے مطالعہ میں رکھئے۔



(محمد فاروق بہاری)

(ہر چیز میں اللہ ہے)

[illegible]

مائل خیرآبادی

میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ دُلاری سے حال احوال سن کر میں نے پان والے کا پتہ پوچھا۔ پھر سیدھا نکڑ والی پان کی دکان پر پہنچا۔ پان والے سے کہا:

"وہ میری لڑکی تھی جس سے آج صبح اسی جگہ غنڈوں نے چھیڑ چھاڑ کی تھی سن لو۔ میرا نام جودھی ہے۔ ان گنڈوں سے تو بعد میں نبٹوں گا۔ اس وقت تو مجھے اُن میاں صاحب کا پتہ بتا دو جن سے ان گنڈوں نے کہا تھا، تم کون ہو اس کے؟"

اور انھوں نے جواب دیا تھا: میں اس کا باپ ہوں۔" پھر وہ دُلاری کے ساتھ منڈی تک گئے تھے۔

پان والے نے نظر بھر کے مجھے دیکھا پھر بتایا۔ ادھر اس گلی سے سیدھے چلے جاؤ املی کے پیڑ کے نیچے ان کا مکان ہے۔

"اور ان کا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا اس نے کہا۔

"نام تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ سب ان کو میاں جی کہتے ہیں!"

میں گلی میں گھس گیا۔ املی کے پیڑ کے نیچے پہنچا۔ املی کے پیڑ کے نیچے ایک چارپائی پر ایک صاحب بیٹھے تھے۔ اُجلا اُجلا چہرہ اُجلا کرتا۔ اُجلی داڑھی والے۔ دل نے کہا۔ یہی ہیں میاں جی۔ میں نے پاس جا کر سلام کیا۔

"میاں سلام!"

"بھیا سلام! آؤ بیٹھو!" میاں جی نے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"بھائی! کون ہو اور کیسے آئے؟"

میاں جی نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا۔
"میرا نام جودھی ہے۔ میں چاند دیرا ہ
میں رہتا ہوں۔ تیسرے دن گاؤں سے سبزی
لاتا ہوں۔ آڑھت پر دے آتا ہوں۔ میری
لڑکی دُلاری بھی آتی ہے۔ وہی دُلاری
جس کی عزت کی خاطر کل آپ غنڈوں سے
بھڑ گئے تھے۔
"بھائی! میرا فرض تھا کہ میں اُسے
غنڈوں سے بچاتا۔
"آپ پر یہ فرض کیسے؟ اور بھی تو بہت
سے لوگ وہاں تھے کیا ان پر فرض نہ تھا؟
"سب پر فرض تھا۔ لیکن شاید وہ
غنڈوں سے دبتے تھے یا پھر انھیں
معلوم نہ تھا؟"
"کیا معلوم نہیں تھا؟"
"بھائی جودھی! تم نے حضرت محمد صلی اللہ
علیہ وسلم کا نام سنا ہوگا۔ ہم انکو اللہ کا رسول
مانتے ہیں اور ان کی ہر بات کو حق سمجھتے
ہیں۔ اللہ کے رسولؐ نے ہمیں تاکید فرمائی
ہے کہ:
"جب تم کہیں ظلم اور زیادتی ہوتے
دیکھو تو ہاتھ سے روک دو۔ مطلب یہ
ہے کہ اگر اپنے اندر ظلم روکنے کی
طاقت ہو تو طاقت سے روک
دو۔ اگر ہاتھ سے نہ روک سکو تو
زبان سے روک دو۔ زبان سے
روکنے کا مطلب یہ ہے کہ نصیحت
کر کے لوگ ظلم اور زیادتی نہ کریں۔
اور اگر زبان سے بھی روکنے کی
ہمت نہ ہو تو اس ظلم اور زیادتی
کو دل میں بُرا سمجھو۔ جودھی بھائی
اللہ کے رسولؐ نے اس تیسری
بات کو ایمان کا کمزور درجہ بتایا
ہے۔"
میں ایمان، حق، رسول جیسے الفاظ کچھ
سمجھا کچھ نہ سمجھا لیکن یہ بات سمجھ گیا کہ آدمی
اگر طاقت والا ہو تو اُسے غنڈوں سے
لڑ جانا چاہیے۔ میں نے کہا۔
"میاں جی! میرا نام جودھی ہے۔ آپ
میرا ڈیل ڈول دیکھ رہے ہیں۔ ان غنڈوں

میں دو دن کو تو میں خالی ہاتھوں پیس کر
رکھ دوں گا۔ ہاتھ میں لاٹھی ہو تو...."

"سنو سنو بھوسی! تو کیا تم ان سے لٹھ
بازی کرو گے؟"

"میاں جی! کل صبح سب دیکھیں گے
پان والے کی دوکان کے پاس؟"

"مگر میں ایسی تدبیر بتاؤں کہ سانپ
بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے؟"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔ میاں جی
نے کہا۔

"آؤ میرے ساتھ!"

اور یہ کہہ کر میاں جی اُٹھے۔ میں بھی اُٹھا
اور ان کے ساتھ ہو لیا۔ میاں جی چلتے چلتے
پٹھانی ٹولہ پہنچے۔ ایک مکان کے پاس
ٹھہر کر دروازے کی کنڈی بجائی۔ تھوڑی
دیر میں ایک بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی گھر
سے نکلا۔ ہم کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میاں جی
نے سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب دیا۔
پھر جلدی سے چارپائی نکال لایا: "بیٹھیے
میاں جی! کیسے تکلیف فرمائی؟"

"خان بھائی! میں کل سے تکلیف میں
ہوں؟" میاں جی نے کہا۔

"فرمائیے؟"

"کل کچھ نادان لڑکوں نے میرے اس
بھائی کی بیٹی کو چھیڑ دیا تھا۔ مجھے اسی وقت
سے بڑی تکلیف ہے!"

"ہوں!" خان صاحب نے مونچھوں پر ہاتھ
بڑھا کر کہا۔ "تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ ان
سے کہیے کہ اپنی بیٹی کو گھر میں رکھیں ورنہ
میں کسی کو روکنے کا ٹھیکیدار تو ہوں نہیں؟"

"خان بھائی! تم پر یہ ٹھیکیداری تمہارے
خدا کی طرف سے واجب ہے!"

"واہ میاں جی! میں کوئی مجسٹریٹ ہوں؟"

"ٹھیک کہتے ہو لیکن اپنے خدا کے
بندے تو ہو؟"

"اچھا ہوں تو؟"

"تو دیکھو، تمہارے خدا نے جو یہ جسم تم کو
دیا۔ تم کو اتنی طاقت دی۔ تمہارا دباؤ سب
مانتے ہیں تو کیا خدا کی طرف سے آپ سے
آپ تمہاری یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ تم اللہ

حق ادا کرو۔"

"میں اللہ کا کیا حق ادا کروں؟"

"یہ کہ جو لوگ تمہارا دباؤ مانتے ہیں ان کو خدا سے ڈراؤ اور خدا کی زمین پر زیادتی کرنے سے روک دو۔"

میں نے دیکھا کہ خان صاحب کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ میاں جی پھر کہنے لگے۔ خان! یاد رکھو جس خدا نے تم کو یہ جسم، یہ زور اور طاقت اور یہ دبدبہ دیا ہے۔ قیامت کے روز اس کا رتی رتی حساب لے لے گا اب تم جانو اور تمہارا خدا جانے۔ میں اتنا ہی کر سکتا تھا۔ اب میں جاتا ہوں۔ میں تمہارے لئے دعا کرتا رہوں گا۔

میاں جی یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے میں بھی اٹھ کر چل دیا۔ ہم کچھ ہی دور چلے تھے کہ جانے کیوں میں نے مڑ کر دیکھا میں نے دیکھا کہ خان منہ لٹکائے چلا آرہا تھا۔ میں نے میاں جی سے کہا۔ وہ رک گئے۔ خان پاس آیا۔ بولا "معاف کیجئے۔ میاں جی! میں نے آپ کو چائے کے لئے بھی نہ پوچھا۔ آج پہلا دن تھا کہ ایک بھلا آدمی میرے گھر آیا اور میں نے اسے گویا دھتکار دیا۔ میری درخواست ہے کہ آپ میرے گھر واپس چلیں۔

میاں جی پلٹ پڑے۔ خان نے بیٹھک کھولی۔ ہمیں بٹھایا۔ چائے پلائی۔ اس کے بعد بولا۔ "میں آج شام کو آپ کے پاس آؤں گا۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے لیکن اپنے اس بھائی سے ملو۔ دلاری اسی کی بیٹی ہے۔ دلاری جیسے اس کی بیٹی ویسی تمہاری۔"

خان نے ایک نظر مجھے دیکھا۔ پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں اب یہ سوچ رہا تھا کہ میاں جی کی باتوں میں جادو ہے یا یہ اُن کی کرامت۔ ایک نظر میں پتھر پگھل گیا۔ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی۔ میں نے دل میں جھانکا مجھے ایسا لگا جیسے میں نے غنڈوں کو معاف کر دیا ہو۔

جمعیۃ اسلامی جاپان

اگر یہ کہا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ جمعیۃ اسلامی جاپان اسلامی دعوت و تبلیغ کے ایک ایسے مرحلہ میں داخل ہو گئی ہے جس نے اسے بین الاقوامی شہرت بخش دی ہے اور اس کی اس شہرت کا سبب بنے ہیں ڈاکٹر شوقی فاتکی جو جاپان میں قومی سطح کی سیاسی شخصیت کے حامل ہیں انھوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر کے ایک زبردست دھماکہ پیدا کر دیا۔

ڈاکٹر شوقی فاتکی سے ملاقات ہوئی۔ یہ جمعیۃ اسلامی جاپان کے سربراہ ہیں۔ ان کی جماعتی کوششوں سے ۲۳ ہزار جاپانی اسلام قبول کر چکے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کا حوصلہ دیکھئے کہ انھوں نے کم سے کم ۵ لاکھ جاپانیوں کو اسلام کی دولت سے مالا مال کرنے کا تہیہ کیا ہے تاکہ وہ ایک مسلم آبادی اور ایک ایسے نئے شہر کو وجود میں لائیں جو صحیح معنوں میں اسلامی و دینی سوسائٹی کا نمونہ بن سکے اور جہاں سے تمام جاپان میں اسلامی دعوت و تبلیغ کے لئے مواد فراہم کیا جاسکے۔

جاپانی وزیر کا قبول اسلام | جاپان کے سیاسی رہنماؤں میں سے ایک مسٹر جوشیرو کومیا سابق وزیر اطلاعات و نشریات ہیں۔ انھوں نے اپنے دور وزارت میں عوامی و قومی مقبولیت حاصل کر کے ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے اطلاعات و نشریات کے محکمہ کو موصوف نے جس طرح کنٹرول کیا اور اسے جس قدر ترقی یافتہ بنا دیا ہے۔ تمام اہل جاپان اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

آج وہ جاپان پارلیمینٹ کی وزارتی کونسل کے چیرمین ہیں۔ اُن کے سیاسی مشاغل سے جاپان کا کوئی گوشہ چھوٹا ہوا نہیں ہے اس سے پہلے وہ جاپانی پارلیمینٹ کی حکمراں کونسل کے لیڈر بھی رہ چکے ہیں۔ حکمراں لبرل پارٹی کے سکریٹری کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں۔ اس کے علاوہ حکمراں پارٹی کی عوامی امور کی کمیٹی کے سکریٹری اور عوامی تعلقات کے محکمہ کے چیرمین کے ساتھ سکریٹری کی حیثیت سے بھی نمایاں و کامیاب خدمات کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔

جاپان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جب اس سطح کی شخصیت نے اسلام کو اپنایا اور مسلمانانِ جاپان کے لئے بھی اور عالم اسلام کے لئے بھی یہ بڑی خوش آئند خبر ہے۔ جاپان کی اسلامی کانفرنس بھی اس کو نیک فال شمار کرتی ہے۔

مسٹر جوشیرو کومیا نے اپنے پُرانے نام کی جگہ اب محمد کومیا نام رکھ لیا ہے۔ ان کی تمنا ہے کہ وہ اپنی آئندہ زندگی کو اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لئے وقف کر دیں۔ اس سلسلہ میں ان کا ارادہ ہے کہ وہ سب سے پہلے جاپان کے سیاسی و قومی رہنماؤں کو اس کی دعوت پیش کریں۔ اس مقصد کے لئے وہ ہر ممکن کوششیں عمل میں لانا چاہتے ہیں۔

قبول اسلام کے اسباب | محمد کومیا نے اسلام کا مطالعہ کرنے کے بعد محسوس کیا کہ وہ ایک ایسا دین ہے جو ذہن و دماغ کو اپیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلام کے مطالعہ کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اسلام سے متاثر ہو رہے ہیں اور اسلام ان کے قلب و دماغ پر غلبہ پا رہا ہے۔

اس سلسلہ میں جمعیۃ اسلامی جاپان کی کی مساعی قابلِ تعریف رہی ہے۔ اس نے موصوف کو اسلام سے روشناس کرنے کے مواقع فراہم کئے۔

اور پھر وہ مسرت انگیز گھڑی بھی آگئی جب جوشیرو کومیا نے محمد کومیا کہلائے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۴ ویں صدی کے اختتام سے ٹھیک

ایک سال پہلے یعنی یکم محرم ۱۳۹۹ بروز جمعہ جمعیۃ مؤتمر اسلامی جاپان کی مرکزی مسجد سنجکو میں ساڑھے تین سو جاپانی مسلمانوں کے سامنے اور پاکستان، سعودی عرب وبنگلہ دیش کی اسلامی شخصیتوں کی موجودگی میں مسٹر جوشیرو کومیا نے قبول اسلام کا اعلان کیا اور دہ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے ان کے اس اقدام سے اہل اسلام کو بے پناہ خوشی ومسرت حاصل ہوئی اور ان کے اسلامی حوصلوں وولولوں کو بے حد تقویت ملی اور یہ توقع بندھی کہ ان کی اور جمعیۃ کی کوششوں سے آئندہ بھی جاپان میں اسلام سے قومی وملی سطح کے افراد کو روشناس ہونے کی توفیق ملے گی۔ (بشکریہ "المدینہ")

تراشے

بڑوں کا بیٹا | قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ جنگ جلولاء میں جو حضرت عمرؓ فاروق کے عہد خلافت میں لڑی گئی تھی، مسلمانوں کو مکمل فتح حاصل ہوئی اس میں کافروں کے راشن کے لئے جو بکریاں آئی تھیں ان کا نیلام ہوا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو اس جنگ میں شریک تھے ان کی بولی ۴ ہزار تھی اور اسی پر نیلام ختم ہوا۔ جب یہ بکریاں مدینہ پہونچیں اور حضرت عمرؓ کی نظر سے گذریں اور ان کو معلوم ہوا کہ اسے میرے لڑکے عبداللہ نے نیلام میں خرید کیا ہے تو اپنے صاحبزادے کو بلا کر فرمایا کہ اگر کوئی شخص مجھے آگ میں ڈالنے کی کوشش کرے تو کیا تم مجھ کو بچانے کی فکر نہ کرو گے۔ کہا۔ ابا جان! میری جان اور میرا مال آپ پر قربان ہوگا تو اب سنو جلولاء کی بکریاں جو تم نے نیلام میں خریدی ہیں اس کی وجہ سے خدا مجھے دوزخ میں ڈالے گا۔ صاحبزادے نے کہا۔ ابا جان یہ کیسے۔ کہا اس لئے کہ تمہارے ساتھ اس نیلام میں رعایت کی گئی ہے اول تو اس لئے کہ تم نبی ؐ اکرم کے ایک معزز صحابی ہو دوسرے اس لئے کہ تم امیرالمومنین کے صاحبزادہ ہو اس لئے میں اس کو پھر سے نیلام کروں گا۔ صاحبزادے کی بے مثال وسعِ اطاعت دیکھئے کہ بکریاں پھر سے نیلام ہوئیں۔ مدینہ میں نیلام سے بکریوں کے دام چار لاکھ تک پہونچے۔ حضرت عمرؓ نے صرف مثل نفع دے کر باقی تیس لاکھ بیس ہزار

زت سعد بن ابی وقاص کے پاس بھیجا
جنگ جلوار کے کمانڈر تھے کر اس رقم کو
ار کے مجاہدین میں تقسیم کردیں اور جو
ب گزر گئے ہوں ان کے ورثاء تک
نچادیں۔

ت اور احتساب کے ساتھ | لاہور، جماعت

می کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
نے کہا ہے کہ صرف ملک میں اسلامی
انین کے نفاذ سے قوم وہ مقصد حاصل
یں کرسکتی جس کے لئے اسلام نے یہ
انین مقرر کئے ہیں۔ ایک مقامی اردو
نت روزہ کو انٹرویو میں انھوں نے
۔ اسلامی قوانین کا نفاذ اور زندگی کے
م شعبوں میں اسلام کے مطابق تبدیلی
تھ ساتھ ہونی چاہیے کیونکہ دراصل
ہے معاشرہ میں اسلامی قوانین نافذ
ں نہیں کئے جا سکتے جس میں لوگوں کی
زمرہ زندگی میں اسلام کا نام ونشان
ں نہ ہو۔ مولانا مودودی نے ملک میں
می نظام زندگی کے مکمل نفاذ کے لئے

درج ذیل اقدامات تجویز کئے۔

(۱) نظام تعلیم فوراً اور یکسر تبدیل کیا جائے
اور تعلیم وتدریس کے ہر شعبہ کا نصاب اسلام
کی ہدایات کے مطابق مرتب کیا جائے۔

(۲) تعلیمی اداروں کے لیے ایسے
اساتذہ منتخب کئے جائیں جنہیں اسلام کا
مکمل علم ہو۔ جو اسلامی نظریہ حیات پر مکمل
ایمان رکھتے ہوں اور حقیقی اسلامی کردار
کے حامل ہوں۔

(۳) ملک کے کالجوں میں قرآن مجید
حدیث، فقہ اور عربی زبان کی تعلیم دی جائے

(۴) سرکاری ملازمین کے تربیتی اداروں
میں اسلامی اور اخلاقی تعلیم شروع کی جائے
تاکہ ان اداروں سے ایسے دیانت دار،
خدا ترس اور فرض شناس اہلکار نکلیں جو
دینی تعلیم سے بھی آراستہ ہوں۔

(۵) طالبات کے لئے علیحدہ تعلیمی
ادارے اور یونیورسٹیاں قائم کی جائیں۔

(۶) سرکاری ملازمین کا مکمل احتساب ہونا
چاہیے اور بددیانت افراد کو ملازمت

سے برطرف کردیا جانا چاہیئے اور ان کی جگہ اعلیٰ اخلاقی کردار کے حامل افراد کو بھرتی کیا جائے۔

(۷) سی۔ آئی۔ ڈی کو پولیس سے علیحدہ کیا جائے اور اسے سرکاری محکموں اور حکام پر نگاہ رکھنے اور حکومت کو صحیح رپورٹ پیش کرنے کا کام سپرد کیا جائے۔

(۸) اسلام دشمن اور فحش لٹریچر اور جرائم کی خبروں کی اشاعت پر مکمل پابندی ہونی چاہیئے۔

(۹) ذرائع ابلاغ کو عوام کو اسلامی احکام اور عقائد کی تعلیم دینے اور ان میں خداخوفی اور روزِ جزا کے احتساب کا احساس بیدار کرنے کے لیئے استعمال کیا جائے۔

(۱۰) دولت کی منصفانہ تقسیم، عوام کو دولت کے حصول کے لیئے بدعنوانی اور رشوت ستانی سے انسداد اور قابلِ اعتراض ذرائع سے حاصل کی گئی دولت ضبط کرنے کے لیئے ملک کا اقتصادی نظام اسلام کے مطابق بنایا جائے۔

تمثیل

آج زندگی میں پہلی بار اُسے شدت سے اپنے اپاہج ہونے کا احساس ہوا۔

بیساکھیوں کے سہارے کھڑا وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے بڑی بے چارگی کے عالم میں سامنے کی طرف گھور رہا تھا۔ ویران پارک کے سناٹے میں وہ اکیلی خوفزدہ اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی۔

لیکن وہ چاروں شہ زور اُس کے پیچھے تھے۔ آخر جب اُس سے برداشت نہ ہوا تو وہ زور سے چیخا۔

مگر بے سود، ان چاروں میں سے دو نے ایک لمحہ کے لیئے کھڑکی کی طرف دیکھا پھر چاروں نے مل کر اُس بے چاری کو دبوچ لیا۔

پہلے تو وہ بہت چیخی، تڑپی۔ پھر کچھ دیر بعد ساکت ہوگئی۔

وہ چاروں فاتحانہ انداز میں اُس کے بے جان جسم کو چھوڑ کر ایک طرف بڑھنے لگے تو اُس نے دھیرے سے کہا۔

"بے چاری پولیس!!"

وصیت نامہ

میں آجکل میتھ اور کنگ نامی تحصیلوں کے درمیان واقع ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا ہوں۔ ہر پانچ یا دس سال بعد ہمارے علاقے کا معائنہ کیا جاتا ہے لیکن حکام کبھی اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ زمین کا وہ ٹکڑا جس پر ہمارا مکان کھڑا ہے کس تحصیل سے تعلق رکھتا ہے بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں میرے ماں باپ نے جان بوجھ کر یہ خاص جگہ منتخب کی ہے کیونکہ متنازعہ فیہ علاقہ ہونے کی وجہ سے وہ دونوں تحصیلوں کے ٹیکسوں اور دوسرے واجبات سے جان چھڑانا چاہتا تھا یہ بات اس حد تک ٹھیک ہے کہ جب کونسلوں کے انتخاب کا موقع آتا ہے تو وہ دونوں علاقوں میں ووٹ ڈالنے کا حق استعمال کرتا ہے لہٰذا یہ ایک حقیقت ہے کہ میرا باپ قدرتی طور پر ہوشیار واقع ہوا تھا اور جس طریقے سے اس نے زمین کا یہ ٹکڑا حاصل کیا وہ اس کی حیرت انگیز ذہانت اور چالبازی پر دلالت کرتا ہے۔

ہمارے علاقہ میں رئیس تو کوئی بھی نہیں البتہ ایک کھاتا پیتا زمیندار رفائیل ہنری کیب عمر رسیدہ اور سنجیدہ طبیعت کا مالک تھا۔ لیکن اس کے دونوں بیٹے پیٹر اور میٹ سخت جھگڑالو اور زہریلی طبیعت رکھتے تھے۔ دونوں میں اکثر باپ کی زمین کی وراثت کے بارے

میں ٹھن جاتی ۔ بے چارہ باپ سمجھا سمجھا کر تھک گیا۔ کہ وہ زمین دونوں بیٹوں میں برابر بانٹنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ لیکن ٹیڈی نے اس کی ایک نہ سنی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میٹ ایک دن تنگ آکر گھر سے بھاگ نکلا اور چند ہفتوں بعد ایک بندرگاہ سے اس کا خط موصول ہوا کہ میں ہندوستان جانے والے ایک جہاز پر سوار ہو گیا ہوں۔

بوڑھے ہنری کو اس خبر سے اس قدر صدمہ پہنچا کہ وہ بستر علالت پر دراز ہو گیا۔ اور موت ہی نے اسے بیٹے کی جدائی کے غم سے نجات دی۔ جتنا عرصہ وہ بیمار رہا، پیٹر قریباً روزانہ اسے وصیت نامہ لکھوانے پر مجبور کرتا تاکہ بدمعاش اور ننگ خاندان "میٹ کو کچھ نہ ملے، لیکن زمیندار اس بات کے لئے قطعاً تیار نہ تھا کہ ساری جائداد اس کا ایک بیٹا ہتھیا لے اور دوسرا محروم ہو جائے

ہمسائے اس جھگڑے سے بخوبی واقف تھے۔ اکثر رات گئے تک بوڑھا اور پیٹر آپس میں بحث کرتے رہتے۔ لیکن ایک رات ..... یہ اتوار کی رات تھی جب ان کے گھر میں خاموشی تھی — تو ہمسائے سمجھ گئے بوڑھا یا تو چل بسا ہے یا اس کی حالت نازک ہے۔

قریباً آدھی رات کے وقت ہمارے ہمسائے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ سب سے پہلے میں نے اس پر کان دھرے، کیونکہ میں آگ کے پاس سویا ہوا تھا، لیکن مارے خوف کے اٹھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ دستک دینے والے نے کچھ دیر انتظار کیا پھر دروازہ پیٹتے ہوئے میرے باپ کو پکارا:

"کوئن گریگو، ذرا دروازہ تو کھولو!"

آواز سے میں جان گیا باہر پیٹر کیب کھڑا ہے۔ لیکن بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ آخر کار میرا باپ اٹھا اور دروازے کی چٹخنی کھول کر باہر نکل گیا۔ رات کے سناٹے میں اس کی آواز گونجی:

مسٹر پیٹر، کیا بات ہے؟ آپ کے والد

تو خیریت سے ہیں؟"

"والد صاحب وفات پا گئے ہیں" پیٹر نے جواب دیا۔

"اوہ خدا ان پر رحم کرے کب فوت ہوئے وہ؟"

"قریباً ایک گھنٹہ پہلے" پیٹر کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی "وہ تو اطمینان سے چل بسے لیکن مجھے مصیبت پڑ گئی ہے، وصیت نامہ موجود نہیں"

"واقعی یہ تو بہت ہی افسوس ناک بات ہے" میرے باپ نے کہا:

"ہاں کوئی وصیت نامہ ہوتا، تو مجھے اتنی فکر نہ ہوتی۔ میں تمہارے پاس اسی لئے آیا ہوں ..... دیکھو کوئی یہ چیلنج قبول کرو اور میری مدد کا وعدہ کرو۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم میرے والد کے ہم شکل ہو۔ اور ہم شکل بھی ایسے کہ لوگ آئے دن دھوکا کھاتے ہیں"

"پھر؟" میرا باپ نہ جانے کیوں گھبرا سا گیا۔

"ذرا سنو تو سہی، میں چاہتا ہوں تم ہمارے گھر آکر بستر پر لیٹ جاؤ"

"لاش کے ساتھ؟" میرے باپ نے کانپتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل نہیں، تم علیحدہ بستر پر بیماروں کی طرح لیٹ جانا، میں ہمسایہ اور اسکول ماسٹر ملی سکالنن سے کہونگا کہ والد صاحب وصیت نامہ لکھوانا چاہتے ہیں۔ جب وہ لوگ آچکیں تو تم ہی ان کو وصیت نامہ لکھوا دینا۔ اور ساری جائداد میرے نام کر دینا۔ کسی کو یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ دھوکا بازی ہو رہی ہے۔ تیار ہو نا؟"

"ہاں لیکن کمرہ خوب تاریک ہونا چاہیئے"

"ارے اس کی فکر نہ کرو، ایسا ہی ہوگا اور کوئی تمہارے نزدیک نہ پھٹک سکے گا تمہیں صرف وصیت نامے کے کاغذ پر والد صاحب کے نام کے نیچے لکیر کھینچنا پڑے گی"

آور پادری کہاں ہوگا؟"

"پادری سے والد صاحب الیسٹر کے موقع پر ملے تھے اور اسے کہہ آئے تھے کہ میری موت پر تم مت آنا۔ یہ بھی میری خوش قسمتی ہے.... چلو کوئن جلدی سے میرے ساتھ آجاؤ۔ دن نکلنے سے پہلے ہی سب کام ختم ہو جانا چاہیے"

میرے باپ نے اندر آکر اپنا بڑا سا کوٹ پہنا اور پیٹر کے ساتھ ہولیا ان کے جاتے ہی میں اچھل کر بستر سے نکلا اور زمیندار صاحب کے گھر جانے کے ارادے سے ایک پگڈنڈی پر ہولیا تاکہ پہلے ہی سے وہاں پہنچ کر کسی کونے کھدرے میں چھپ کر یہ سارا ڈرامہ دیکھ سکوں۔ لیکن میری بدقسمتی دیکھیے کہ ایک گڑھے میں گر پڑا۔ وہ تو شکر ہے کہ میں جلدی سے نکل آیا، ورنہ ڈوب ہی جاتا۔

زمیندار صاحب کے گھر پہنچا، تو میرے باپ کی کارکردگی شروع ہو چکی تھی۔

خیر میں ایک ٹوٹے ہوئے شیشوں والی کھڑکی سے چپک گیا اور اندر جھانکنے لگا۔ یہ کمرہ خاصا فراخ تھا ایک دیوار کے ساتھ بستر لگا تھا۔ میرا باپ بیمار کی طرح لحاف اوڑھے اس پر لیٹا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک میز پر دواؤں کی شیشیاں، چائے کی خالی پیالیاں اور کچھ چمچ پڑے تھے کچھ فاصلے پر ایک اور میز تھی جس پر کاغذ اور قلم دوات وغیرہ رکھے تھے۔ اس کے سامنے کرسی پر بلی سکالفن بیٹھا تھا۔ بلی سکالفن کے دونوں طرف بہت سے لوگ کھڑے نہایت سنجیدگی سے وصیت نامہ لکھے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ پیٹر غمزدہ چہرہ لئے ایک کونے میں کھڑا تھا اور وقفوں سے وسکی کے گلاس لوگوں کو پیش کر رہا تھا۔ وسکی کی بوتلیں خالی ہوتی چلی گئیں لیکن اس کے ماتھے پر شکن تک نہ آئی۔ آج تو وہ مہمان نواز لگ رہا تھا۔

بے شک مجھے معلوم تھا یہ سب

دھوکا بازی ہو رہا ہے۔ لیکن وہ جانے کیوں مجھے بھی اس نیم تاریک کمرے کا ماحول بے حد پاکیزہ دکھائی دینے [illegible]۔ لگ رہی تھی ہوئی آنکھوں کے ساتھ خاموشی سے کھڑے تھے۔ کبھی کبھار کوئی سسکی لے کر رو بھی دیتا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میں بھول ہی گیا کہ اصل معاملہ کیا ہے اور دہشت سے میرا رُواں رُواں کانپ اٹھا۔

بیمار کے بستر کی طرف سے دھیمی آواز میں کھانسنے اور کراہنے کی آواز آئی تو سب لوگ مؤدب ہو گئے اور پھر اس سحر زدہ خاموشی میں میرے باپ کی آواز سنائی دی۔

بلی سکالنن کو بلاؤ۔ میں وصیت نامہ لکھوانا چاہتا ہوں۔" وہ پوری کوشش کر رہا تھا آواز مرحوم زمیندار سے مشابہ ہو۔

" وہ یہاں موجود ہے ابا۔" پیٹر، بلی سکالنن کا ہاتھ پکڑ کر بستر کے قریب چلا گیا۔

"بلی جو میں کہتا جاؤں لکھتے جاتا، کیونکہ میرا آخری وقت قریب آگیا ہے یادری رافرٹی بے شک یہاں نہ آئے لیکن تم سب لوگ گواہ رہنا کہ میں ایک سچے مدمن کیتھولک کے طور پر دنیا کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

اس پر لوگوں کے جمگھٹے میں سے "ہائے افسوس کی صدائیں بلند ہوئیں نہ معلوم کتنے لوگ مرتے ہوئے زمیندار کی حالت پر افسوس کا اظہار کر رہے تھے

" میں اپنے رشتہ داروں، ہمسایوں اور سب لوگوں سے کسی قسم کا گلہ شکوہ دل میں نہیں رکھتا۔" اس پر لوگوں نے صدائے تحسین و آفرین بلند کی "میں بیٹے پیٹر کو۔۔۔ اور یہ بھی لکھنا کہ وہ میرا بہت ہی نیک بخت اور فرماں بردار بیٹا ہے اپنے دونوں کھتوڑی والے کھیت اور ان سے ملحقہ چراگاہیں اور ڈوران بوگ والا قطعہ دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں اسے اپنا لانی والا کھیت اور لاری کے علاقہ والی زمین بھی دیتا ہوں

..... اوہ میرا گلا بالکل خشک ہو گیا ہے
.... ذرا کچھ پی لوں۔" یہ کہتے ہوئے
میرے باپ نے وسکی سے بھرا ہوا گلاس
اٹھایا اور دو چار گھونٹ لے کر واپس میز
پر رکھ دیا۔ پھر بلند آواز میں بولا "میں اپنے
بیٹے پیٹر کو کنویں کے قریب والے آلوؤں
کے دو کھیت بھی دیتا ہوں وہاں تو شاندار
فصل پیدا ہوتی ہے ....."

" ابا، تم کمزوری تو محسوس نہیں
کر رہے ؟" پیٹر نے میرے باپ
کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا کیونکہ وسکی
پی کر میرا باپ تیز تیز باتیں کر رہا تھا۔
ہاں بیٹے، ذرا وہ گلاس مجھے پکڑانا
کہیں تم نے اس میں پانی تو نہیں ملا دیا؟"
" نہیں ابا آپ کے منہ کا ذائقہ
خراب ہو چکا ہے۔"
" لوگوں کی طرف سے ہمدردی
کے چند الفاظ سنائی دیئے۔
" اب میرا وصیت نامہ ختم ہونے
والا ہے۔ بیٹا پیٹر، میں چاہتا ہوں
کہ تم میری طرح ایمانداری سے ز
بسر کرو اور سکون کی موت م
لئے میرے آخری الفاظ غور
سُن رہے ہو نا، کیا بلی اور دو
سب لوگ بھی سُن رہے ہیں؟"
" ہاں جناب ہم سب سُن
" اچھا تو یہ میرے وصیت
کا آخری حصہ ہے اور .... ذر
مجھے پکڑانا۔" یہ کہتے ہوئے ا
وسکی کا گلاس خالی کر دیا۔" اور
یہ بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ میں اپنے
نامے کی ہر سطر پر عملدرآمد کرو
ہوں۔ میں چوک کے ساتھ وا
کوئن گرنگین کو دیتا ہوں کیونکہ وہ
اپنی محنت اور شرافت کے باو
کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ پیٹر
سے ہمیشہ اچھا سلوک کرنا اور ج
وہ تم سے کچھ رقم مانگے فوراً دید
یقین ہے تم میرے آخری الف
کرو گے۔ بلی سکالن، تم نے یہ

ہے کہ میں چوک والا دوا کیٹر کا قطعہ کوئن گرگین کے نام کر رہا ہوں ..... آہ، اب میرا ضمیر مطمئن ہوگیا ہے اور ..... " نہ معلوم وہ اور کیا کہنا چاہتا تھا۔ لیکن پیٹر نے جب دیکھا کہ "قریب المرگ" انسان اتنی بے ربط زبانی سے کام لے رہا ہے تو فوراً لوگوں کو کمرے سے باہر لے گیا تاکہ اس کا باپ سکون سے اپنی آخری سانس لے سکے

جب وہ سب جا چکے تو پیٹر لپک کر میرے باپ کے پاس واپس آیا جو ایک کونے میں کھڑا اپنے کپڑے پہن رہا تھا۔

"شاباش کوئن، تم نے خوب اداکاری کی، لیکن یہ سمجھ لو کہ وہ چوک والے قطعے کی بات صرف ایک مذاق ہے "

"مذاق! ویسے تو سارا وصیت نامہ ہی ایک مذاق ہے۔ میں کل سرائے میں بیٹھ کر لوگوں کو ساری بات سنا دوں گا۔" "مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اتنے کمینے نکلو گے خبردار میرا راز فاش مت کرنا۔" پیٹر ڈر گیا۔

اور مجھے بھی معلوم نہ تھا کہ تم اتنے لالچی نکلو گے کہ اپنے باپ کے آخری الفاظ کا بھی پاس نہ کر دگے " یہ کہتے ہوئے میرے باپ نے قہقہہ لگایا۔

"بہت بہتر کوئن" پیٹر میرے باپ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

"معاہدہ آخر معاہدہ ہے، لیکن یہ مان جاؤ کہ تم نے چالاکی کی ہے "

اس طرح یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا اور میرا باپ زمیندار کے گھر کے پچھواڑے سے نکل کر اپنے گھر پہنچ گیا اور ہم اس جگہ کے مالک بن گئے جہاں آجکل میری رہائش ہے۔

چند نکتے

- اپنی اصلاح سب سے مشکل کام ہے اور دوسروں پر نکتہ چینی آسان۔
- عالم پانی کے بغیر سیراب ہے اور جاہل پانی کی موجوں میں رہ کر بھی تشنہ رہتا ہے۔
- پرندے اپنے پاؤں کے باعث دام میں پھنستے ہیں اور انسان اپنی زبان کے باعث۔

وقت کے جھٹکے

محمد محی الدین

(خلیفہ مہدی کا دور ہے۔ پردہ کے اُٹھتے ہی ملکہ فرزانہ کے محل کا شاندار پھاٹک نظر آتا ہے۔ پھاٹک پر ایک پہرہ دار کھڑا ہے۔ ایک جانب سے ایک انتہائی مفلس بڑھیا داخل ہوتی ہے۔ اس کا پُر وقار انداز اور اس کی چمکدار آنکھیں بتا رہی ہیں کہ بڑھیا کبھی بہتر پوزیشن کی مالک رہ چکی ہے۔ لیکن قسمت کے جھٹکوں سے وہ غریبی کی پستی میں آ گری۔ پہرہ دار عورت کو پھاٹک کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ کر للکارتا ہے)

اے بڑھیا کہاں جا رہی ہے؟
ہوش میں ہے کہ نہیں!

بڑھیا: ہوش میں ہوں۔ مجھے ملکہ سے ملنا ہے۔

پہرہ دار: (حقارت سے) کیوں؟ کیا کام ہے؟

بڑھیا: یہ میں ملکہ ہی سے کہوں گی۔

پہرہ دار: (ایک کنیز کو بلا کر کہتا ہے) دیکھو! یہ ملکہ سے ملنا چاہتی ہے۔ تم جا کر ملکہ سے اجازت لے آؤ۔

(کنیز چلی جاتی ہے اور چند لمحوں کے بعد واپس آتی ہے)

کنیز: (رعب سے) ملکہ پوچھ رہی ہیں تمہارا نام کیا ہے اور تمہیں کیا کام ہے؟

بڑھیا: (عاجزی سے) میں تم سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے، انہی سے کہوں گی۔ ملکہ سے کہو! جب تک وہ میری بات نہ سن لیں گی، میں یہاں سے نہ ہٹوں گی۔

کنیز: (چلی جاتی ہے۔ چند لمحوں بعد لوٹ آتی

چلو ملکہ نے اجازت دے دی ہے)
(دونوں آگے بڑھتی ہیں اور پردہ گرتا ہے)

(دوسرا منظر)

(پردہ اٹھتا ہے۔ ملکہ فرزانہ کی حسین و جمیل مسحور کن خوابگاہ ہے۔ وہ بڑے رعب و تمکنت سے بیٹھی ہوئی ہے بڑھیا اُسے دیکھ کر جھجکتی، ڈرتی اور گھبراتی ہے)

بڑھیا: (سلام کرتے ہوئے) ملکہ! میں مروان بن محمد کی بیٹی مزنا ہوں، جو بنی اُمیہ کا آخری تاجدار تھا۔

ملکہ: (یک بیک غصہ و نفرت سے) اے مغرور عورت! تجھے میرے سامنے آنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ کیا تو نہیں جانتی کہ تیرے خاندان والوں نے، میرے عزیزوں، رشتہ داروں پر کیسے کیسے ظلم کئے کیا تو اس بات کو بھول گئی کہ جب ہمارے خاندان کی کچھ عورتیں تیرے باپ کے پاس ایک نیک کام میں اُس سے مدد حاصل کرنے گئیں تو تو نے اور تیرے باپ نے مدد کرنے کی بجائے اُن کو ذلیل کیا تھا۔ کیا تیری یہ حرکت انسانیت کے خلاف نہ تھی؟ مانا کہ آپس میں دشمنی تھی لیکن پھر بھی ایک بے بس اور مجبور دشمن کے ساتھ ایسا برتاؤ کسی طرح مناسب نہ تھا۔ (ایک لمحہ کے لئے رُکتی ہے۔ مزنا سر جھکائے خاموش کھڑی ہے)

خیریت اسی میں ہے کہ تو فوراً محل سے نکل جا۔

مُزنا (ایک قہقہہ لگا کر) بہن فرزانہ! بیشک میں یہاں نہ آتی۔ مگر میرے آنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ مجھ سے پھر نصیحت حاصل کرو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ کسی وقت میں تم سے زیادہ مغرور اور تم سے زیادہ مال و دولت کی مالک تھی مگر تم نے دیکھا کہ وقت کے جھٹکوں نے مجھے کیسے پستی میں پھینک دیا۔ وقت کی و-ل نے میری کیا حالت بنادی

چند ہی دنوں کے اندر مفلس اور محتاج ہو گئی ہوں۔

میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا۔ وہ میرے سامنے آیا۔ اب تم جو میرے ساتھ کرنا چاہتی ہو تو کیا تم کو پسند ہے کہ اس کا نتیجہ تمہارے سامنے آئے۔

(مُزنا واپس پلٹتی ہے اس کی باتوں سے فرزانہ کپکپا اٹھتی ہے۔ اس کے گلابی چہرے کی رنگت بدل جاتی ہے۔ اچانک وہ اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور دوڑ کر مُزنا کو پکڑ لیتی ہے اور چاہتی ہے کہ اُسے گلے لگا لے کہ مُزنا اُس سے الگ ہو جاتی ہے)

مُزنا: فرزانہ! تم ملکہ ہو اور میں ایک غریب اور بے بس عورت، میرے کپڑے پھٹے ہوئے اور میلے کچیلے ہیں۔

فرزانہ: نہیں مُزنا! تمہاری باتوں نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ غرور و تکبر کی سزا اتنی سخت ہوتی ہے، اللہ! میں سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ میری بہن اب مجھے معاف کر دو اور اپنے حق کو شکر لو۔ (ملکہ لونڈیوں کو آواز دیتی ہے۔ لونڈیاں بھاگ کر آتی اور ہاتھ باندھ کر ٹھیر جاتی ہیں)

آؤ! ہماری بہن مُزنا کو نہلا دھلا کر اعلیٰ پوشاک پہناؤ اور معزز مہمان کی طرح محل میں رکھو۔

(مُزنا اظہار تشکر کے اشک پونچھتی لونڈیوں کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ ملکہ اپنی خاص کنیز کو بلاتی ہے)

فرزانہ: دیکھو۔۔۔! ہمارا باغ والا محل مُزنا کو دے دو اور اس کا بھاری وظیفہ مقرر کر دو!

(پردہ گرتا ہے)



شحِ نفس

حاصلِ مطالعہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

شحّ کا لفظ عربی زبان میں کنجوسی اور بخل کے لئے بولا جاتا ہے مگر جب اس لفظ کو نفس کی طرف
نسوب کرکے شحِّ نفس کہا جائے تو یہ تنگ نظری، تنگ دلی، کم حوصلگی اور دل کے چھوٹے پن
اہم معنی ہو جاتا ہے۔ جو بخل سے وسیع تر چیز ہے بلکہ خود بخل کی بھی اصل جڑ وہی ہے اس
صفت کی وجہ سے آدمی دوسرے کا حق ماننا اور ادا کرنا تو درکنار اس کی خوبی کا اعتراف تک کرنے
سے جی چراتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا میں سب کچھ اُسی کو مل جائے اور کسی کو کچھ نہ ملے۔ وہ خو
خود دینا تو کجا، کوئی دوسرا بھی اگر کسی کو کچھ دے تو اس کا دل دُکھتا ہے۔ اس کی حرص کبھی
اپنے حق پر قانع نہیں ہوتی بلکہ وہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے یا کم از کم
دل سے یہ چاہتا ہے کہ اس کے گرد و پیش دنیا میں جو اچھی چیز بھی ہے اُسے اپنے لیے سمیٹ
لے اور کسی کے لئے کچھ نہ چھوڑے۔ اسی لئے قرآن میں اس بُرائی سے بچ جانے کو فلاح
کی ضمانت قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (سورۂ حشر آیت۹)

اور جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچالئے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شحِّ نفس کو ان بدترین انسانی اوصاف میں شمار کیا ہے
جو فساد کی جڑ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت میں ہے کہ شحّ سے بچو کیونکہ شحّ ہی
نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا، اسی نے ان کو ایک دوسرے کے خون بہانے اور

دوسروں کی حرمتوں کو اپنے لئے حلال کر لینے پر اکسایا۔ اس نے ان کو ظلم پر آمادہ کیا اور انھوں نے ظلم کیا۔ فجور کا حکم دیا اور انھوں نے فجور کیا۔ قطع رحمی کرنے کے لئے کہا اور انھوں نے قطع رحمی کی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان اور شحِ نفس کسی کے دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ حضرت ابو سعید خدری رضؓ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دو خصلتیں ہیں جو کسی مسلمان کے اندر جمع نہیں ہو سکتیں۔ بخل اور بد خلقی۔ (تفہیم القرآن جلد ۵ تفسیر سورۂ حشر حاشیہ ۱۹۔ ص ۳۹۶)

دو غزلیں ...... (اشفاق زیدی نگینوی)

کون سنتا ہے مظلوم کی داستاں — سر اٹھاتی ہیں جب ظلم کی آندھیاں
چھا گئیں کیوں وہاں آج خاموشیاں — ہو رہی تھیں جہاں غم کی مہرباں
بلبلوں کی اگر جل اٹھیں میتیں — یہ بہاریں رہیں گی نہ یہ گلستاں
دائرے ظلمتوں کے سمٹنے لگے — جب سے دیکھیں کڑکتی ہوئی بجلیاں
ہم نے روشن کئے آنسوؤں کے دئے — حد سے جب بڑھ گئیں غم کی تاریکیاں
حیف حالات نے وہ کھلائے ہیں گل — میرے ہاتھوں میں دامن کی ہیں دھجیاں
گر کے اشفاق آنکھوں سے ضائع ہوئے — اشک پلکوں پہ ٹھہرے ہوئے کہکشاں

ظلمات شب غم کو بڑھاتے ہیں دھندلکے — امید کی کرنوں کو مٹاتے ہیں دھندلکے
روپوش کہاں ہو رہے وہ دن کے اجالے — کچھ اور بھی گہرے ہوئے جاتے ہیں دھندلکے
کیوں غم کے چراغوں کو سرِ شام بجھا کر — مجھ کو مری خلوت میں بلاتے ہیں دھندلکے
بیگانہ بنا کر خرد و فکر و عمل سے — انسان کو دیوانہ بناتے ہیں دھندلکے
کاشانۂ اشفاق کی قندیل بجھا کر — تاریک سے کچھ خواب دکھاتے ہیں دھندلکے

(مولانا محمد حسین صاحب ناظم
[illegible]
[illegible])

شادی بیاہ میں

فرمائشی جہیز، نوید، برات ہمارے سماج کی بدترین لعنتیں

اللہ ربّ العزت کی ذات بہت ہی رحیم و کریم ہے۔ اس نے اپنی رحمت سے جہاں انسانوں کی آسائش زندگی کی تمام چیزیں پیدا فرمائی ہیں وہیں ان کی ہدایت و فلاح کے لئے بھیجو دین انبیاء علیہم السلام اور آخر میں سرور کائنات رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھیجا۔ وہ نہایت ہی سادہ اور آسان بھیجا تاکہ انسانوں کے لئے اس پر عمل کرنا سہل ہو اور زندگی عافیت سے گذرے۔

چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلدِّیْنُ یُسْرٌ (دین آسان ہے)

اسلام سے پہلے اپنے گھڑے ہوئے رسوم و رواج کی وجہ سے پورا انسانی معاشرہ سخت مصیبت اور پریشانی میں مبتلا تھا۔ یہ دینِ محمدی کے پیرو اور اسلام کے علمبردار بننے کے دعوے دار ہیں۔ خود اپنی سماجی زندگی میں ایسی بُری اور ناجائز رسوم و رواج کے پابند ہو گئے ہیں جس نے پورے معاشرے کو تباہ و برباد اور پوری زندگی کو جہنم کدہ بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ تباہی و بربادی شادی بیاہ سے متعلق رسم و رواج نے پھیلائی ہے۔ ہم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی آسان و سادہ شریعت کو چھوڑ کر ان تمام رسم و رواج کو اختیار کر لیا۔ جن کو آپ نے اپنے پیروں تلے کچل ڈالا تھا۔ تلک، فرمائشی جہیز، نوید، برات وغیرہ قبیح رسمیں آخر ہماری ہی تو پیدا کی ہوئی ہیں جو معاشرہ کا ناسور بن کر ہماری ہلاکت کا

رعایتی اعلان

مکتبہ حجاب رامپور کی طرف سے

مولانا مودودیؒ کی لکھی ہوئی کچھ کتابوں کی قیمت زیادہ ہے۔ ہم ایسے صاحبان کے لئے جو ان کو یکمشت نہیں خرید سکتے، ایک رعایتی اعلان شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس اعلان سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

● ارکان جماعت اسلامی۔ حسب ذیل کتابوں کی قیمت کو اس طرح قسطوں میں ادا کر سکتے ہیں۔

(۱) تفہیم القرآن۔ ۶ جلدیں۔ موجودہ ہدیہ 127/- ہے۔ اس کا آئندہ ایڈیشن کاغذ کی گرانی کی وجہ سے اندازاً 150/- ہوگا۔ مکتبہ حجاب سے تفہیم القرآن کا سیٹ چھ قسطوں کے دینے پر حاصل کریں۔

(۲) سیرت سرور عالم۔ ۴ جلدوں میں۔ اس وقت صرف ۲ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ دونوں کی قیمت سو روپیہ ہے۔ یہ دونوں جلدیں پانچ قسطوں۔

(۳) رسائل مسائل۔ ۴ حصے۔ موجودہ قیمت 34/- ہے۔ یہ سیٹ دو قسطوں میں۔

(۴) محسن انسانیت۔ قیمت 22.50۔ دو قسطوں میں۔

(۵) تفہیمات۔ ۴ حصے۔ موجودہ قیمت 28.50۔ دو قسطوں میں۔

نوٹ ۱۔ ارکان جماعت فہرست ارکان سے اپنا نمبر ضرور لکھیں۔

نوٹ ۲۔ جماعت اسلامی کے ارکان اور غیر ارکان صاحبان نقد رقم بھیجیں تو محصول ڈاک مکتبہ حجاب کے ذمہ۔

مکتبہ حجاب کی مطبوعات پر 100/- یا اس سے زائد کی کتب منگانے پر 40% کمیشن۔ سو سے کم ہر ۲۰ کی کتابوں پر 33% اور 25/- سے کم منگانے پر 25%۔ محصول ڈاک بذمہ خریدار۔ مکتبہ حجاب کی مطبوعات۔ دیکھئے اسی شمارے [illegible]

(مینیجر مکتبہ حجاب، رامپور، یو۔پی۔ ۲۴۴۹۰۱)

وہ خطۂ زمین جہاں عورتیں مردوں پر راج کرتی ہیں!

کم از کم دنیا میں ایک خطۂ خاک تو ضرور ایسا ہے جس میں عورتوں کو مردوں پر پوری فوقیت حاصل ہے اور وہ ہے بھارت دنیپال کا کم و بیش ... مربع میل کا سرحدی علاقہ۔ اس علاقے میں رہنے والے قبیلہ کا نام "تھڑو" (تھارو) ہے۔

تھارو قبیلہ کی ابتدائی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔ کہا جاتا ہے مغلوں نے چتوڑ گڑھ (راجپوتانہ) پر حملہ کیا تو چتوڑ کے غیور راجپوتوں نے شہر کے محصور ہونے سے پہلے اپنی عورتوں اور بچوں کو وہاں سے باہر نکال دیا تاکہ وہ مجبوری کی صورت میں مسلم حملہ آوروں کے ہتھے نہ چڑھ سکیں۔ ان کے خیال میں نیپال کی طرف ہمالیہ کی ترائی ان کی عورتوں کے لئے محفوظ ترین مقام تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کے کارواں کے ساتھ اپنے مرد نوکروں ساتھ صفائی کرنے والیوں، مہروں اور دھوبیوں کو بھی بھیج دیا تاکہ وہ ان عورتوں کی دیکھ بھال کر سکیں۔

یہ راجپوت مغلوں کی فوج کثیر کا مقابلہ نہ کر سکے تو اپنی راجپوتانہ روائت کے مطابق کیسری بانا پہنے میدان جنگ میں آخری سانس تک لڑتے ہوئے تقریباً سب کے سب ڈھیر ہو گئے اور جو تھوڑے بہت جانبر ہوئے وہ جسمانی طور پر اتنے ناکارہ ہو چکے تھے کہ اپنی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں تک جو اس وقت ہمالیہ کی ترائی میں مقیم تھیں نہ پہنچ سکے۔ ان راجپوت عورتوں نے بہت مدت تک اپنے جنگ آزما شوہروں کا انتظار کیا لیکن وہ تو ختم ہو چکے تھے۔ آخر وہ ہر

طرف سے مایوس ہوکر اسی خطے میں قیام پذیر ہوگئیں۔ وہیں جھونپڑیوں اور کچے پکے مکانوں میں اپنے گھر بنالئے اور اسی علاقہ کی پیداوار سے اپنی ضروریات زندگی پورا کرنے لگیں۔

ان عورتوں میں سے کئی نوجوان تھیں۔ دو چار سالوں میں ان کنبوں کی لڑکیاں بھی جوان ہوگئیں تو ان عورتوں کے لئے شادی کا مسئلہ بڑی ٹیڑھی کھیر بن گیا۔ آخرکار انھوں نے ساتھ آئے ہوئے نوکروں اور ان کے لڑکوں سے ہی شادیاں کرنی شروع کردیں۔ نفسیاتی طور پر ان مردوں میں جوان راجپوت عورتوں کے لئے خادم ہی تھے احساس کمتری برقرار رہا اور راجپوت عورتیں ان کی بیویاں بن جانے کے باوجود اپنا تحکمانہ رویہ ترک نہ کرسکیں یہ مرد ان کے خاوند تو بن گئے لیکن ان کی اپنی قدیم خادمانہ ذہنیت میں رتی بھر فرق نہ آیا۔ وہ ان عورتوں کے احکام اسی طرح اطاعت و وفاشعاری سے بجالاتے جس طرح وہ پہلے کیا کرتے تھے۔ ایک نسل کی صورت حالات بعد کی نسلوں میں بھی ویسی ہی رہی اور ایک طرح کا دستور بن گیا کہ عورتیں اپنے آپ کو فائق سمجھتی رہیں اور مرد پھسڈی کے پھسڈی رہے

اب وہاں کا رواج یہ ہے کہ عورتیں اپنے گھر کا کام کاج کبھی فرش زمین پر بیٹھ کر نہیں کرتیں۔ ہمیشہ کام کرتے وقت چودھرانیوں کی طرح چارپائی پر بیٹھتی ہیں۔ وہ کسی مرد کا جوٹھا کھانا نہیں کھاتیں چاہے وہ ان کا کتنا ہی قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو۔ تھرو مردوں کو رسوئی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی۔ وہ گھر میں پینے کے پانی والے گھڑے کو چھو تک نہیں سکتے۔ جس گھر میں لڑکے زیادہ ہوں اس کنبے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تھرو عورتیں مردوں سے کہیں زیادہ بہادر، شجاع اور ذہین ہوتی ہیں۔ گھر کا سارا محنت طلب کام عورتیں ہی کرتی ہیں۔ کپڑا بننے سے لیکر جنگل سے ایندھن چننے۔ کھیتی باڑی کرنے

اور گھر سے باہر ان سے اپنی جونپڑیاں بنانے
کے کام تک عورتیں ہی سنبھالتی ہیں اور لطف
یہ ہے کہ وہ ان تمام کاموں کو اپنے لئے
بوجھ محسوس نہیں کرتیں اور مرد سے
شادی کر لینے کے بعد بھی اُسے ان کاموں
میں شریک ہونے کی اجازت نہیں
دیتیں۔ وہ محنت مشقت کا کام اپنا حق
سمجھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جبلی
طور پر بھی مردوں سے فائق ہیں اور مردوں
پر اپنا رعب داب اسی طرح قائم رکھتی
ہیں جس طرح ہمارے یہاں مرد عورتوں
پر رکھتے ہیں۔

ہری بھون یونیورسٹی کلچرل سوسائٹی
نے "نیپال" کے عنوان سے ایک کتابچہ
شائع کیا ہے۔ تھرو قبیلہ کی پیدائش
کی مندرجہ بالا تھیوری اسی کتابچہ سے
لی گئی ہے۔

لیکن تھرو قبیلہ کے لوگ "نیپال"
کی اس تھیوری کو درست نہیں سمجھتے
بلکہ وہ ایک اور روایت سناتے ہیں۔ ان
کا کہنا ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد مہاراجہ رام
چندر جی کی حمایت میں لنکا کی لڑائی میں
شامل ہو گئے تھے۔ وہ لڑائی راکشسوں
اور انسانوں کے درمیان تھی۔ ہمارے لوگوں
میں سے بیشتر ان راکشسوں کی صورتیں
دیکھ کر مارے خوف کے ہی کانپ اُٹھے
بس اُسی روز سے اُن کو "تھرو" یعنی تھر
جانے والے، کانپ اُٹھنے والے کہا جانے
لگا۔ میدان جنگ میں شامل دوسرے قبیلے
ان لوگوں کو "تھرو، تھرو" کہہ کر مذاق اُڑانے
لگے۔ یہ بے چارے مارے ندامت کے
میدانِ کارزار سے بھاگ کر یہاں ترائی میں
آ ٹھہرے۔

تھرو قبیلہ کے لوگ نیپال کے ایک
خطہ تک محدود نہیں بلکہ ان کی آبادی بھارت
کی سرحد کے ساتھ ساتھ ۸۰۰ مربع میل علاقے
میں پھیلی ہوئی ہے۔ اُن کی تعداد کم و بیش
ڈھائی لاکھ ہے۔ اس خطے کو مجموعی طور پر
"تھروہٹ" کہا جاتا ہے۔

ترائی" جیسے علاقے میں جہاں تھرو رہتے

ہیں۔ ملیریا کا بڑا زور ہے۔ اس علاقے میں سانپ اور جونکیں بہت ہوتی ہیں چونکہ اس خطے میں رسل ورسائل کا انتظام بھی معقول نہیں۔ کھانے پینے کی اشیاء بہت کم دستیاب ہوئی ہیں۔ کچھ ان کی بھاشا سمجھنے میں بھی عام سیاحوں کو دشواری ہوتی ہے۔ اس لئے مدت سے ان لوگوں کے ساتھ ہندوستانیوں بلکہ نیپالیوں کے بھی تعلقات کم ہی رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی طرزِ زندگی آج وہی ہے جیسی کہ کبھی مغلوں کے زمانے میں بھی۔

شرو سماج کا یہ رواج واقعی حیرت انگیز ہے کہ ان میں جہیز کا مطلق دستور نہیں۔ حالانکہ بھارت اور نیپال میں باوجود ہزار کوششوں کے جہیز کی لعنت اب بھی برقرار قائم ہے۔ اس لئے کہنا چاہئے کہ یہ لوگ کم از کم اس لعنت سے مبرا ہیں۔ ان میں جہیز کے طور پر صرف ایک روپیہ اور ایک دھوتی لڑکی کو دی جاتی ہے اور بس۔

البتہ ایک بدعت ضرور ہے کہ ان کے یہاں صغر سنی (بچپن) میں ہی شادیاں ہو جاتی ہیں۔ چار چار پانچ پانچ برسوں کے بچے بچیوں کی شادی کر دی جاتی ہے۔ کہیں کہیں یہ ضروری نہیں سمجھا جاتا کہ اسی عمر میں شادی ہو لیکن وہ کم عمر میں منگنی ضرور کر دیتے ہیں۔ سن بلوغت تک بچے بچیاں اپنے ماں باپ کی نگرانی میں رہتے ہیں اور وہیں پروان چڑھتے ہیں۔ کبھی کبھی منگیتر لڑکی اپنے ہونے والے سسرال میں بھی آجاتی ہے لیکن باقاعدہ شادی اسی وقت ہوتی ہے جب وہ قابلِ شادی ہو۔ شادی ہونے پر اُسے کنبے کا ممبر بنا کر سسرال میں لایا جاتا ہے۔ منگیتر لڑکی جب تک بیاہی نہیں جاتی اس کا ہونے والا شوہر اس لڑکی کی ماں کو اس کا خرچہ دیتا رہتا ہے۔

لیکن ان کے ہاں یہ پابندی نہیں کہ بچپن کی منگنی لازماً پکی رہ سکے۔ اگر لڑکی یا لڑکے کے پریواروں میں سے کسی کی بھی کسی وجہ سے شادی ناپسند ہو تو وہ شادی رُک جاتی ہے اس صورت میں لڑکے اور لڑکی کے لیے نیا رشتہ ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا ہے کہ

تقریباً سب کی منگنیاں بچپن ہی میں ہو جاتی ہیں۔ اس لئے بہت کم منگنیاں ٹوٹتی ہیں۔ شادی کے رشتوں کا اہتمام بھی عورتیں ہی کرتی ہیں۔ مرد ان میں کوئی حصہ نہیں لیتے۔

سہرو قبیلہ کا ناچ بڑا زوردار اور پُرلطف سمجھا جاتا ہے۔ ڈھول، ہارمونیم اور کھرتالیں ان کے محبوب ساز ہیں۔ عورتیں اور مرد زیورات کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ سہرو عورتیں زیورات سے لدی لال سُرخ دوپٹے اور لہنگے پہنے جب مستی میں جھوم جھوم کر ناچتی ہیں تو عجیب سماں باندھ دیتی ہیں۔

ان کے یہاں دسہرہ دیوالی کے تہوار کسی گنتی میں نہیں۔ یہ لوگ صرف ہولی کو بڑا تہوار سمجھتے ہیں۔ فطرت کے یہ پرستار موسم بہار کی بشارت دینے والے ہولی کے تہوار کو خوب ذوق و شوق سے مناتے ہیں۔ ہولی یہاں کا ایک مخصوص ناچ ہوتا ہے جس میں عورتیں مرد سب شامل ہوتے ہیں اور جب ان کا "لکڑی کھیل" شروع ہوتا ہے تو ... ل کر گیت گاتے ہیں۔

ان کے یہاں ایک ہی فصل ہوتی چاول۔ ہولی کے علاوہ ایک تہوار اگر وقت ہوتا ہے جب چاول کی فصل پک جاتی ہے۔ بیساکھی کی طرح کا ان کا یہ تہوار بھی اُن کی مسرتوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

سہرو بڑے ہشاش بشاش اور ... ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے ۸۰ فی صد لوگ بہت ہی غریب ہیں۔ صرف ۲۰ فی صد لوگوں کے پاس کاشتکاری کے زمین ہے۔ باقی لوگ چھوٹے چھوٹے مزدوری کے کام کرتے ہیں۔

غریبی اور مفلسی کے باوجود سہرو بہت خود دار اور منفرد ہوتے ہیں۔ سہرو باشندے آپ کو ایک شخص بھی بھیک مانگتا دکھائی دیگا۔ انکے یہاں گداگر کو سخت نفرت سے دیکھا جاتا ہے۔ اسے وہ کمینگی کی انتہا ... ہیں۔ ان لوگوں میں شاذ ایک فیصد بھی پڑھے لکھے نہیں ملتے لیکن اپنی ناخواندگی کے باوجود یہ لین دین کے انتہائی ایماندار، شریف، خوش اور ملنسار ہوتے ہیں۔ (بلکہ یہ سنگھے سٹوڈنٹ

جیون ساتھی ضرورت ہے

گزشتہ دنوں ایک بیالیس سال کے نوجوان کنوارے لڑکے نے اخبار میں اشتہار دیا کہ اب جبکہ میں احمقانہ جذبات کی منزل سے آگے بڑھ گیا ہوں مجھے ایک جیون ساتھی کی ضرورت ہے۔ ضرورت مند بہنیں ناچیز کی طرف رجوع کریں جس سے میرا بھلا تو ہوگا ہی شاید ان کا بھی ہو جائے۔

اس اشتہار کے جواب میں جو چٹھیاں تشریف لائیں۔ اُن میں سے چند ایک کی جھلک ملاحظہ فرمائیے۔

کنیا میں صرف ایک نقص ہے

میری لڑکی چندر کانتا (نام اگر پسند نہ ہو تو آپ اپنی حسب منشاء بدل سکتے ہیں) تین بیکس میں ایم۔ اے کر چکی ہے۔ مناسب ور نہیں ملا۔ اس لئے اس درمیانی وقفے سے فائدہ اٹھاکر وہ مسلسل امتحان دیتی رہی۔ ادھر یہاں بھی لڑکیاں آجکل اگر یونیورسٹی میں داخل ہوکر کوئی ڈگری حاصل کریں تو اس وقت تک انہیں کوئی سماجی مرتبہ نہیں ملتا۔ مجھے دھن دولت کی کوئی کمی نہیں، بلیک مارکیٹ کا دھندا کرتا ہوں اور پرماتما کے فضل سے ایک بار بھی گرفتار نہیں ہوا۔ مگر چندر کانتا میں ایک نقص ہے کہ وہ جہیز پر تھوکتی ہے۔ ہم نے اُسے لاکھ سمجھایا کہ جہیز لئے بغیر تمہیں کوئی ور قبول نہیں کرے گا۔ لیکن زیادہ کتابیں پڑھتے رہنے سے اس کی بدھی خراب ہوگئی۔ لہٰذا اگر آپ بھی جہیز کے مخالف ہوں تو کسی دن ہمارے غریب خانہ پر تشریف لائیے۔ آنے سے پہلے فون پر اطلاع دیجئے گا۔ ہم اپنی کوٹھی سے بل ڈاگ کو ہٹا دیں گے۔ چندر کانتا صرف یہ بل ڈاگ اپنے ساتھ جہیز میں لے جانا چاہتی ہے۔ چندر کانتا کی عمر ---؟ بس یوں سمجھ لیجئے۔

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

ماں باپ جاھل ہے

میں ایک مہذب لڑکی ہوں۔ آپ میرے فوٹو سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ خود فوٹوگرافر نے اعتراف کیا تھا کہ میں نے پہلی بار کسی مہذب لڑکی کا فوٹو کھینچا ہے۔ میرے ماں باپ (میرے منہ میں خاک) جاہل تھے۔ انہوں نے ایک وحشی خاوند کے پلّے باندھ دیا تھا۔ جب میں کنواری تھی تو میری طرف دیکھ کر فحش سیٹیاں بجاتا تھا۔ شادی کے بعد میری سہیلیوں کو فحش سیٹیاں مارنے لگا۔ شراب میں دھت رہتا تھا۔ آمدنی خاصی تھی۔ لیکن آمدنی تو رنڈیوں کے دلالوں کی بھی خاصی ہوتی ہے۔ تنگ آکر ایک دن میں نے اس کی پیٹھ پر لات مار دی اس نے ۰۰ اور کے ۰ کہہ کر سویکار کر لی اس شرط پر کہ میرے جہیز کی ہر چیز اپنے پاس رکھے گا اور مجھے طلاق دے دیگا۔

آپ کے اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شریف اور مہذب انسان ہیں۔ جبھی اتنی عمر تک کنوارے رہے کیونکہ آپ کو کوئی مہذب لڑکی میسر نہیں آسکی۔ آپ صرف دس پیسے کا کارڈ لکھ کر ارسال کر دیجئے میں آپ کے پاؤں پر آکر سر رکھ دوں گی۔ میری زبان ذرا اتھل ہے۔ باقی سب کچھ ٹھیک ہے امید ہے کہ آپ اس بات کا اعتراف کریں گے کہ تھتلے بھی مہذب ہو سکتے ہیں۔

ماموں کی گالیاں

لڑکی کیا ہے؟ سونا ہے سونا۔ اگرچہ اس کی عمر از تیس برس سے چند دن تجاوز کر چکی ہے۔ لیکن چہرے پر جوانوں کا سا جلال ہے۔ دور سے پچیس سال کی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا پختہ ارادہ تھا کہ اپنا باقی جیون بیواؤں اور یتیموں کی خدمت کرتے کرتے گذار دے گی۔ لیکن آپ کے اشتہار کے سبب دل سے اتنی متاثر ہوئی کہ بیواؤں اور یتیموں کو تلانجلی دینے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ سب سے زیادہ آپ کی عمر سے مسرور ہوگئی۔ اگر آپ دونوں کا عقد ہو جائے تو مجھ بدنصیب باپ پر بڑا احسان ہوگا۔

لڑکی بے حد سگھڑ ہے۔ اتنی عمر کے باوجود کنواری لگتی ہے۔ کنواریوں کی طرح شرماتی ہے۔ کنواریوں کی طرح مسکراتی ہے۔ کنواریوں کی طرح رات کو سپنے دیکھتی ہے۔ آپ شائد اس امر کو

شک وشبہ کا اظہار کریں کہ اتنی عمر گذر جانے کے باوجود اس نے کسی سے شادی کیوں نہیں کی۔ اب ہم کیا بتائیں، ہماری لڑکی کا ایک ماموں تھا۔ ہر امیدوار اس سے گالیاں کھا کر چلا جاتا۔ وہ سٹھیا دار تھا۔ ہمیں اس کا غم تھا۔ لہٰذا ہمیں اپنی لڑکی سے زیادہ بوڑھی کی فکر تھی۔ شکر ہے بھگوان کا کہ ایک ایکسیڈنٹ میں وہ مارا گیا۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں گالیاں دینے والا اب کوئی نہیں گیا۔ آپ بے خطر ہو کر ہمارے گھر برات لا سکتے ہیں۔

(نوٹ) میری لڑکی نے صاف کہہ دیا کہ شادی کرے گی تو صرف آپ سے ورنہ بدستور کنواری رہے گی۔

کھرا سودا

آپ کا اشتہار ہماری نظر سے گذرا۔ رشتے ناطے کا ہر اشتہار ہماری نظر سے گذرتا ہے۔ ہم بزنس مین ہیں۔ اس لئے لاگ لپیٹ نہیں رکھتے ہم نے ان چیزوں کی ایک فہرست چھپوالی ہے۔ جنھیں ہم اپنی لڑکی کے جہیز میں دیں گے یہ فہرست ہم ہر امیدوار کو بھیج دیتے ہیں۔ آپ کو بھی بھیج رہے ہیں۔ نہ ہم اس سے زیادہ دے سکتے ہیں نہ کم دیں گے۔ سودا کھرا کرتے ہیں منظور ہو تو ہاں کر دیجئے ورنہ آپ جہاں ہیں۔ وہاں خوش رہیں اور ہم یہاں خوش رہیں گے۔ فہرست اشیاء حسب ذیل ہے۔

ایک سکوٹر۔ دس تولے سونا۔ پندرہ سال پہلے کا ایک ٹیلی ویژن۔ (ریفریجریٹر لینا چاہیں تو ٹیلی ویژن کٹ جائے گا) دو درجن اسٹیل کے برتن جن میں پانچ چمچے بھی شامل ہوں گے۔ سو دو سو سے زیادہ کی بارات کو کھانا نہیں دیں گے۔ لڑکی کو پانچ ہزار روپیہ بھی نقد دیں گے۔ مہنگائی کے آنکڑے دیکھ کر ان میں کمی بیشی کر دی جائے گی۔

لڑکیوں کا کیو

ہمیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کہ آپ کی عمر کتنی ہے۔ کنوارا ہونا ہی کافی ہے۔ میری تین لڑکیاں جوان ہیں۔ بملا، نرملا، شیلا تینوں کی عمر بالترتیب چھبیس، چوبیس، اور بائیس سال ہے۔ تینوں میں سے آپ کسی سے بھی شادی کر سکتے ہیں۔ تینوں میٹرک میں فیل ہیں۔ کیونکہ یہ ہمارے خاندان کی روایت ہے۔ لڑکیوں کی ماں اور باپ بھی اسی روایت کے محافظ ہیں۔ تینوں کے فوٹو بھیج رہا ہوں۔ یوں لگتا ہے۔ ایک لڑکی کے تین فوٹو ہیں ● (ذکر تو نسوی کا پ سے)

افسانہ

ایسا بھی غرورِ حُسن کیا

ممتاز نازلی بمبئی

روزینہ نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ اُس کے لئے رشتوں کی بھرمار ہونے لگی روزینہ کے والد تو بوکھلا ہی گئے۔ روزینہ اُن کی اکلوتی لڑکی تھی۔ روزینہ کی والدہ کا انتقال اس کے بچپن ہی میں ہو چکا تھا۔ ماں کی کمی کو بھی باپ نے ہی پورا کیا تھا۔ انہوں نے اپنی کل کائنات روزینہ کو ہی سمجھ لیا تھا۔ حد سے زیادہ لاڈ پیار کی وجہ سے روزینہ بے حد مغرور ہو گئی تھی اس کی ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔ اس لئے اس کے خیالوں کی اُڑان خود بخود بہت اونچی تھی۔ وہ عام آدمی سے سیدھے منہ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ اُس نے دولت کو ہی اپنا معبود سمجھ لیا تھا۔ قدرت نے اس کے حسن کو بھی بے مثال بنایا تھا۔ گدرا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک، پتلے پتلے گلاب کی پنکھڑی جیسے لب ابھرا ابھرا سا گول چہرہ۔ غرضیکہ حسن کی نزاکت اور کچھ لاڈ پیار نے اُسے بہت زیادہ مغرور بنا دیا تھا۔ بات بات میں اپنی تعریف کرنا اور ہر جگہ اپنی امارت کا مظاہرہ کرنا اس کی عادت بن چکی تھی۔ اس کے رشتے آنے کے بعد اس کے غرور میں اور اضافہ ہو گیا اس کی خواہش تھی کہ اس کی شادی کسی کروڑ پتی سے ہو۔

انہیں دنوں روزینہ کی سہیلی کی شادی کا سلسلہ نکلا۔ روزینہ شادی میں گلابی غرارہ کا سوٹ پہن کر گئی۔ ایک تو وہ خود بھی حسین تھی۔ اس دن کی سج دھج نے اس کے حسن کو اور بھی نکھار دیا تھا۔ شادی میں جاوید بھی آیا ہوا تھا۔ وہ اپنی امی کو بلانے زنانہ خانے میں داخل ہوا تو اچانک اس کی نظر روزینہ پر پڑی

وہ اس سراپا قیامت کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ روزینہ اُسے اپنے خوابوں میں بسی لڑکی کا عکس نظر آئی۔

جاوید نے فوراً ہی اپنی امی کے ذریعہ روزینہ کے گھر رشتہ بھجوا دیا۔ اگرچہ روزینہ کے رشتے متعدد بڑے بڑے گھرانوں سے بھی آئے تھے جہاں نہ صرف روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ بلکہ صورت شکل کے اعتبار سے بھی لڑکے بہت خوبصورت تھے۔ روزینہ کے مغرور مزاج میں یوں بھی دولت کو سب سے زیادہ اہمیت تھی اُسے غریبوں سے ہمیشہ ہی نفرت رہی تھی۔ پھر بھلا جاوید جس کی ماہوار آمدن محض ایک ہزار روپے ماہانہ تھی۔ اس کے معیار پر کیسے پورا اُتر سکتا تھا جاوید دولت میں یقیناً دوسروں سے کم تر تھا لیکن ظاہری خوبیوں اور شکل و صورت میں وہ ان دولت مندوں سے کہیں زیادہ پُرکشش تھا۔ اس کے سینے میں محبت سے بھرا ہوا دل تھا جس میں روزینہ کی چاہت کے دئیے جلتے تھے۔ روزینہ کے والد نے جاوید کی باطنی خوبیوں کو پرکھا اور بیٹی کے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہو کر اس کا رشتہ منظور کر لیا۔ انھیں شاید اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ان کی بیٹی کسی انسان کی باطنی خوبیوں کی جگہ دولت کو سب سے بڑی خوبی سمجھتی ہے۔

روزینہ کے والد کو جاوید کا رشتہ اس لئے بھی پسند آیا کہ اس کی بزرگ امی تھیں اور ایک بہن تھی۔ وہ بھی شادی شدہ۔ وہ سمجھتے تھے کہ روزینہ کو خاندان کا جتنا پیار جاوید کے گھر میں مل سکتا ہے۔ اتنا کسی دولت مند گھرانے میں نہیں مل سکے گا۔ ان تمام باتوں کے پیشِ نظر اُنھوں نے جاوید کا رشتہ منظور کر لیا۔ اور منگنی کی رسم ادا کر دی گئی۔ دونوں ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے لئے نہایت موزوں تھے۔

روزینہ کو یہ رشتہ بالکل پسند نہیں تھا کیونکہ اس نے تو بہت اونچے خواب دیکھے تھے اُسے محبت کرنے والے شوہر سے زیادہ دولت سے بھری تجوری کی ضرورت تھی۔ اس لئے یہ رشتہ اس کے معیار کے مطابق نہیں تھا۔ جب اسے سہیلیاں چھیڑتیں تو وہ ناک بھویں چڑھا کر کہتی "توبہ، یہ بھی کوئی رشتہ طے ہوا ہے

میرا رشتہ کسی ایسی جگہ ہونا چاہئے تھا جہاں بڑا خوبصورت سا بنگلہ ہوتا۔ آرام دہ فرنیچر ہوتا۔ نئے ڈیزائن کی کاریں ہوتیں جاوید ہرگز میرے خوابوں کا شہزادہ نہیں ہے۔ یہ میری بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے کہ اچھے رشتے آنے کے باوجود میرے والد کو ایک ہزار روپے کمانے والا پسند آگیا۔ میں تو کب کا انکار کر دیتی۔ لیکن اپنے والد کے ڈر کی وجہ سے خاموش ہوں۔ وہ سخت مزاج کے آدمی ہیں۔ اور جو سوچ لیتے ہیں کر کے رہتے ہیں!

روزینہ کی سہیلیاں سوچتی رہ جاتیں کہ روزینہ کے خوبصورت جسم میں کتنی بدصورت روح ہے جو انسان کی ساری خوبیوں کو زر سے تولتی ہے۔

رفتہ رفتہ شادی کے دن قریب آرہے تھے دونوں گھروں میں زور شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ روزینہ کو مایوں بٹھا دیا گیا۔ اس کی سہیلیاں اس کے پاس جاتیں لیکن روزینہ کا بجھا بجھا چہرہ دیکھ کر خود بھی افسردہ ہو جاتیں۔

شادی کا دن بھی آگیا۔ جاوید بے حد خوش تھا کہ اُسے اس کی پسندیدہ حور جیسی لڑکی مل رہی تھی۔ شام ہوگئی۔ جاوید دولہا بنایا گیا۔ اور روزینہ دلہن! تمام سہیلیاں اُسے چھیڑ رہی تھیں۔ لیکن روزینہ منہ بسورے خاموش بیٹھی تھی۔ اچانک بارات آگئی۔ بارات آگئی کا شور بلند ہوا۔ اور ساری لڑکیاں بارات دیکھنے کے لئے دوڑ پڑیں۔

نکاح کی رسم سے فارغ ہونے کے بعد بھاری دل اور روتی ہوئی آنکھوں سے روزینہ کے والد نے اپنے جگر کو رخصت کیا اس موقع پر تمام رشتہ داروں کی آنکھیں بھی پُرنم تھیں۔

روزینہ پرائی ہوگئی۔ اس کی زندگی کا نیا سفر شروع ہوگیا لیکن روزینہ اپنی ساس کے ساتھ بہت ہی نامناسب رویہ رکھتی تھی اور جاوید کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھی جبکہ جاوید روزینہ سے والہانہ محبت کرتا تھا۔ ہر طرح سے اس کی دل جوئی کرتا۔ لیکن وہ جاوید سے کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتی جاوید پریشان تھا کہ آخر کیا بات ہے جو روزینہ اس قدر بے رُخی برت رہی ہے۔ جاوید کو

خواہش ہوتی کہ شام کو جب وہ آفس سے گھر لوٹے تو روزینہ اس کا مسکرا کر استقبال کرے لیکن روزینہ کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ وہ اپنے کمرے میں منہ لپیٹے پڑی رہتی یا کسی رسالے سے دل بہلا رہی ہوتی۔ بے چاری جاوید کی امی ضعیف ہونے کے باوجود خود ہی کھانا وغیرہ پکایا کرتیں۔ روزینہ خوب سیر ہو کر کھالیتی۔ نہ ساس سے صلاح لیتی اور نہ جاوید کا انتظار کرتی، ان سب باتوں سے جاوید کے دل کو بہت چوٹ لگتی۔ اسی طرح تین مہینے گزر گئے۔ جاوید نے اس بات کو شدت سے نوٹ کیا کہ روزینہ اکثر و بیشتر اسے غریبی کا طعنہ دیتی تھی۔ جبکہ جاوید نے اس کی ہر خواہش کو پورا کیا ہے۔

ایک دن شام کے وقت جاوید جب تھکا ہارا گھر پہنچا تو کمرے کے اندر سے روزینہ کی باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں جاوید کمرہ کے باہر ہی رُک گیا۔ روزینہ اپنی کسی سہیلی سے کہہ رہی تھی "میں یہاں کیسے خوش رہ سکتی ہوں۔ میری پرواز بہت اونچی تھی۔ ٹھیکروں کے اس مکان میں میرا تو دم گھٹتا ہے شادی کے بعد سے جاوید نے مجھے کوئی زیور بھی بنوا کر نہیں دیئے۔ میں تو لاکھوں میں کھیلنے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ غریب جاوید مجھے کوئی خوشی دے ہی نہیں سکتا"

اس سے آگے جاوید کچھ بھی نہ سن سکا وہ اُلٹے پیروں گھر سے واپس چلا گیا۔ سڑک پر گھومتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے آفس میں کام کرنے والی بھولی بھالی معصوم لڑکی مہتاب کا سراپا آگیا۔ جو اس سے دل ہی دل میں پیار کرتی تھی۔ جاوید نے اس کے پیار کو پذیرائی نہیں بخشی تھی۔ اب وہ بہت پشیمان تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ وہ پہلے ہی روزینہ کے ان خیالات سے آگاہ ہو گیا۔

بے خودی کے عالم میں اس کے قدم مہتاب کے گھر کی طرف اُٹھتے چلے گئے۔ مہتاب کے گھر پہنچ کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ہمت کر کے اس نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا سامنے مہتاب کھڑی تھی

سوگوار سی، حسین، موٹی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ اس وقت ہلکی سی ساڑی میں تھی لیکن اس حالت میں بھی روزینہ سے بھی زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ جاوید کو اپنے دروازہ پر کھڑا دیکھ کر وہ سکتہ میں آ گئی۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ جاوید کبھی اس کے گھر بھی آ سکتا ہے۔ وہ اُسے حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی جو "آئیے اندر آ جائیے"۔ جاوید نے اندر داخل ہو کر پورے ماحول کا جائزہ لیا۔ ایک لمبا سا کمرہ، مختصر سا سامان۔ مہتاب نے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔ تشریف رکھئے اور خود بھی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور بوجھل آواز سے پوچھا۔ کیسے آنا ہوا؟ آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں۔؟

ہاں مہتاب! یہ پریشانیاں تو میرا مقدر بن گئی ہیں۔ جسے میٹھے پانی کا چشمہ سمجھا تھا وہ زہر نکلا۔

کیا مطلب؟ مہتاب نے حیران ہو کر پوچھا۔

مطلب یہ کہ روزینہ کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔ کیونکہ میں اُسے ہر مہینے نئے نئے ڈیزائن کے زیورات بنوا کر نہیں دے سکتا۔ اس کے لئے ہیوونڈا کار نہیں خرید سکتا۔ میں اس قابل نہیں کہ وہ مجھے اپنی چاہت دے سکے۔ کیونکہ میں ایک غریب آدمی ہوں۔"

یہ آپ کیا کہہ رہے جاوید صاحب! روزینہ تو پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ افسوس ہے کہ وہ ایسے اعلیٰ خیالات رکھتی ہے! دُکھ تو اسی بات کا ہے کہ پڑھی لکھی ہو کر بھی وہ اس قدر گھٹیا انداز سے سوچتی ہے۔

مہتاب گردن لٹکائے خاموش بیٹھی تھی جاوید اس کے قریب ہو کر بولا۔ میں تمہارا گنہگار ہوں۔ تم مجھے معاف کر دو، اور مجھے سہارا دو۔ میں اتنے دنوں تک ایک پتھر سے سر ٹکرا رہا تھا۔ روزینہ نے میرا دل زخمی کر دیا ہے۔ تم اپنی محبت کا پھایا رکھ کر مجھے بچا لو۔ تمہاری امی کہاں ہیں؟ میں خود ان سے بات کر لوں گا۔" امی کا ذکر سنتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ رونے لگی۔ جاوید حیران سا اُسے دیکھنے لگا۔ بمشکل اس کے آنسو تھمے۔ اس نے بتایا کہ ایک ہفتہ پہلے اس کی امی اس دنیا،

ٹھوکریں کھانے کے لئے تنہا چھوڑ گئی ہیں۔ جاوید کو بہت افسوس ہوا۔ دس پندرہ دن تک جاوید ہر روز مہتاب سے ملنے جاتا رہا۔ آخرکار اس نے مہتاب کو تیار کر ہی لیا۔

جاوید رات گئے گھر پہنچا تھا۔ اسی لئے صبح دیر سے سو کر اٹھا تو پتہ چلا کہ روزینہ اپنی سہیلیوں سے ملنے گئی ہے۔ جاوید اس دن آفس بھی نہیں گیا۔ روزینہ شام کے وقت گھر آئی۔ اور آتے ہی مسہری پر لیٹ گئی۔ کچھ دیر کے بعد جاوید روزینہ کے پاس آیا اور کہا۔ روزینہ! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ہر لمحہ مجھ سے دور ہی ہوتی چلی جا رہی ہو۔ اب بہتر یہی ہے کہ ہم اپنی راہیں الگ کر لیں۔ میں تمہارے والد صاحب کو بلا لیتا ہوں۔ روزینہ تنک کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اور تلخ لہجہ میں بولی۔ ٹھیک ہے! ہم آج ہی اور اسی وقت ہی الگ ہوں گے۔ والد صاحب کو بلانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ روزینہ اپنے کپڑے اور زیورات لیکر اپنے میکے چلی گئی۔ جاوید نے چند دن بعد مہتاب سے نکاح کر لیا۔

روزینہ کے والد کو جب صورت حال کا علم ہوا تو انہیں بہت صدمہ ہوا اور وہ روزینہ پر بہت بگڑے کہ جاوید جیسے شریف انسان کو ٹھکرا کر اس نے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ یہ صدمہ پہاڑ بن کر ان پر گرا جس کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے۔ یہی غم ان کو گھن کی طرح چاٹ گیا۔ وہ اپنی نالائق بیٹی کی بربادی دیکھنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اچانک والد کی موت سے روزینہ بوکھلا اٹھی۔ کیونکہ اب اس دنیا میں وہ تنہا رہ گئی تھی۔ اب کوئی اسکی کفالت کرنے والا نہیں تھا لاچار ملازمت کی تلاش میں نکلی۔ اور اپنی ایک سہیلی کے ذریعہ ایک فرم میں ملازم ہو گئی۔

اب وہ آزاد تھی، جہاں چاہتی آزادی سے گھومتی۔ تنخواہ کا بیشتر حصہ کپڑوں اور میک اپ پر خرچ کرتی۔ فرم کے مالک سیٹھ اکرام صاحب بہت دولت مند آدمی تھے۔ شہر میں ان کی کئی کپڑے کی ملیں چلتی تھیں۔ تنویر ان کی واحد اولاد تھا۔

اکرام صاحب کو اللہ نے بہت کچھ دیا تھا روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن بیچارے کو دلی سکون بالکل نہیں تھا۔ دنیا میں کوئی ان کا ہمدرد و غم گسار نہیں تھا۔ ایک ہمدرد ان کی بیوی تھیں تو اللہ نے انھیں اپنے پاس بُلا لیا۔ اکرام صاحب تنویر سے سخت نالاں تھے اُسے بوڑھے باپ سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ باپ کے خون پسینے سے کمائی ہوئی دولت کو وہ پانی کی طرح بہاتا تھا۔

ایک دن اچانک اکرام صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اور وہ اپنی فرم میں نہ جا سکے۔ اُنھوں نے تنویر کی بہت منت سماجت کی کہ وہ فرم جانے کے راضی ہو جائے۔ بڑی خوشامد کے بعد وہ فرم جانے کے لئے تیار ہوا۔

اس دن روزینہ سُرخ ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ اسی رنگ کی چپل، اسی رنگ کی لپ اسٹک اور نیل پالش، غرض وہ اوپر سے نیچے تک سُرخ انگارہ بنی ہوئی تھی۔ گیارہ بج گئے تھے۔ لیکن باس کا ابھی تک پتہ نہیں تھا۔ سب ان کے انتظار میں تھے۔ روزینہ سر جھکائے ٹائپ کر رہی تھی۔ اچانک سب کھڑے ہو گئے۔ روزینہ بھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے جو نظریں اوپر اُٹھائیں تو حیرت سے دیکھتی ہی رہ گئی۔ کیونکہ آج اکرام صاحب کی جگہ ایک نوجوان قبول صورت لڑکا آ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ اکرام صاحب کے صاحبزادے مسٹر تنویر ہیں۔ تنویر نے اوپر سے نیچے تک روزینہ کو دیکھا اور مسکراتا ہوا اپنے آفس میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک چپراسی روزینہ کے پاس آیا اور کہا کہ تمہیں باس نے بلایا ہے۔ روزینہ نے جواب دیا کہ اچھا چلو میں آتی ہوں۔ اور وہ اپنے لباس اور میک اپ کو درست کرتی ہوئی اپنی فائل لے کر باس کے دفتر میں داخل ہو گئی۔

تنویر نے ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ روزینہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا بیٹھئے! فائل مکمل ہو گئی کیا؟

جی ہاں! اس نے فائل تنویر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اور واپس جانے کے لئے پلٹی ہی تھی کہ تنویر نے کہا رُکئے۔ روزینہ میز کا

سہارا لیکر بڑی قاتل اداسے کھڑی ہوگئی۔!

آپ بہت خوبصورت ہیں، تنویر نے بے دھڑک کہہ دیا۔ روزینہ اد لئے ناز سے اٹھلائی۔ اور شکریہ کہتی ہوئی آفس کے کمرے سے نکل گئی۔

اکرام صاحب اس بات سے بہت خوش تھے کہ تنویر اب پابندی کے ساتھ دفتر جانے لگا تھا اور فرم کے کاموں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

ایک دن حسبِ معمول روزینہ اپنی فائل لے کر تنویر کے آفس میں گئی تو تنویر نے روزینہ سے پوچھا۔

روزینہ! آپ کی سالگرہ کب ہے؟"

روزینہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "سالگرہ تو ہر سال آتی ہے لیکن جس طرح آتی ہے۔ اسی طرح گزر جاتی ہے۔

"کیا مطلب..... ؟ تنویر نے تعجب سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ میں نے آج تک کبھی اپنی سالگرہ نہیں منائی۔

"اچھا یہ تو بتائیے آپ کی سالگرہ آتی کب ہے؟۔ تنویر نے پوچھا۔

"میری سالگرہ ۸ فروری کو ہوتی ہے۔

"اوہ! تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کی سالگرہ کا دن پرسوں ہے۔

"جی! روزینہ نے اٹھلا کر کہا۔

تنویر نے ہنستے ہوئے کہا لیکن اس بار آپ کو اپنی سالگرہ منانی ہی پڑے گی۔ اور ہم سب کو پارٹی دینا پڑے گی۔ کیوں بلائیں گی نا؟

جی ہاں! اگر آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔

آج روزینہ کی سالگرہ ہے۔ روزینہ نے آج اپنی فرم کے تمام دوستوں اور سہیلیوں کو مدعو کیا ہے۔ آج روزینہ خوب بنی سنوری ہوئی تھی۔ بادامی رنگ کے شرارہ اور جمپر میں وہ بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ سارے مہمان آچکے تھے۔ لیکن اس پروگرام کا محرک تنویر ابھی تک نہیں آیا تھا۔

انتظار کرتے کرتے وہ تھک گئی اور مہمانوں کے اصرار پر وہ کیک کاٹنے ہی والی تھی کہ تنویر آگیا۔ تنویر کے آنے کی خبر ملتے ہی روزینہ کھل اٹھی!

روزینہ نے کیک کاٹا۔ آج روزینہ پورے بیس سال کی ہو گئی تھی۔ تنویر نے ایک بہت ہی خوبصورت ہیرے کا جڑاؤ سیٹ دیا۔ روزینہ نے بہت فخر کے ساتھ تنویر سے تحفہ قبول کیا۔ روزینہ کی سالگرہ کا دن اس کے لئے ایک یادگار کادن بن کر آیا۔ اس دن اس نے تنویر کے ساتھ کئی گھنٹے گزارے۔ وہ دل وجان سے اس پر فریفتہ ہو گئی۔ رفتہ رفتہ ملاقاتیں بڑھیں وعدے اور عہد و پیمان ہوئے۔ اور آخر کار دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔

شادی کے بعد روزینہ بے حد خوش تھی۔ اس کا لاکھوں میں کھیلنے کا خواب آج پورا ہو گیا تھا۔ تنویر بھی اُسے بے حد چاہتا تھا۔ ایک مہینہ تک وہ مختلف مقامات پر گھومتے رہے۔

روزینہ کو زندگی کا ہر عیش میسر ہو گیا تھا میلوں میں پھیلی ہوئی کوٹھی، ملازموں کی فوج کاریں، غرض وہ ہر طرف سے بے فکر تھی لیکن تنویر کبھی کسی ایک کا ہو کر رہا ہی نہیں تھا۔ وہ تو ایک بھونرا تھا۔ جو ڈال ڈال پھول پھول بیٹھتا تھا۔

ایک دن روزینہ نے تنویر سے کہا کہ آج مجھے مارکیٹ جانا ہے۔ کیونکہ میری سہیلی شمع کی سالگرہ ہے۔ اس کے لئے بڑھیا سا تحفہ خریدنا ہے۔

تنویر نے ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے کہا۔ میں آج کل بہت زیادہ مصروف ہوں۔ تم تنہا ہی چلی جاؤ۔

روزینہ کو تنویر کی یہ بات ناگوار تو بہت گزری لیکن مصلحتاً خاموش ہو گئی۔ اور دل پر جبر کر کے اکیلی ہی اپنی کار میں مارکیٹ چلی گئی۔ مارکیٹ پہنچ کر وہ کار سے اُتری ہی تھی کہ اس کی نظر سامنے کھلونوں کی دکان پر کھڑے ایک جوڑے پر پڑی۔

یہ جاوید اور مہتاب تھے۔ مہتاب جاوید کی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ جاوید اُسے پیار بھری نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ مہتاب کی گود میں ایک چاند سا بچہ تھا۔ وہ دونوں بچے کے لئے کھلونے خرید رہے تھے خوشی ان دونوں کے چہروں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

ان دونوں کو دیکھ کر روزینہ [illegible] کو

زبردست دھکا لگا۔ وہ کار سے اُتری بھی نہیں اور وہ واپس اسی وقت گھر چلی گئی۔

رفتہ رفتہ تنویر روزینہ سے بالکل بے تعلق سا نظر آنے لگا۔ اور یہاں تک کہ وہ رات رات بھر غائب رہنے لگا۔ ایک روز روزینہ نے تنویر سے کہا۔ میری خطا کیا ہے؟ آپ مجھ سے ناراض کیوں ہیں؟۔

تنویر نے خشک لہجہ میں کہا تمہیں کس چیز کی کمی ہے۔ روپیہ ہے، زیور ہے، کپڑا ہے، کوٹھی ہے، کار ہے، نوکر ہیں۔ اور کیا چاہئے؟

روزینہ نے بڑی التجا سے کہا: مجھے آپ کا پیار چاہئے۔

اچھا اچھا، اب ہٹو، مجھے جلدی جانا ہے۔ تنویر نے بے رُخی سے کہا۔ روزینہ تنویر کے پیروں پر گر پڑی۔

خدا کے لئے مجھے میرا قصور تو بتا دیجئے

تنویر نے اُسے دیوار کی طرف دھکا دے کر دور کر دیا۔ روزینہ کی پیشانی پر خون چھلک آیا۔ روزینہ کو غصہ آگیا۔ اُس نے چیخ کر کہا میں آپ کی بیوی ہوں، مجھے حق ہے: روزینہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی تنویر نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ اور کہا اگر تمہیں یہاں تکلیف ہے تو جاؤ کوئی اور گھر تلاش کر لو۔ یہ کہہ کر وہ غصہ سے بھناتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کے قیمتی زیورات، ساڑیاں اور خوبصورت فرنیچر سب اسے منہ چڑا رہے ہوں۔ اس کی حالت پر قہقہہ لگا رہے ہوں۔ آج اُسے اندازہ ہوا کہ دولت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس کا غرورِ حُسن دم توڑ رہا ہو ●●

● سلطان مسقط کی تاریخی شادی پر مہمانوں کی تواضع کے لئے ہندوستان سے تین ٹن آئس کریم بارہ سو بھیڑ بکریاں، بے حساب آم اور انگور منگائے گئے۔ بعض حلقوں کو حیرت ہے کہ شاہ عمان نے اپنی شادی پر اتنے کثیر اخراجات کیسے کئے جبکہ ملک طویل خانہ جنگی اور بائیں بازو کی بغاوت کا شکار ہے۔

حیرت کی کوئی بات نہیں ہے بھائی۔ ؎

خالی اگر ہو جیب تو دستار بیچ دے
مشغول نائو نوش ہے شیخ حرم ہنوز

کرشمہ قدرت

محمد اشفاق [illegible]

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن نعمتوں سے نوازا ہے اُن کا شمار بے حساب ہے بقول جگر مرادآبادی

یہ تو نے کہا کیا اے ناداں فیاضیٔ قدرت عام نہیں
تو فکر و نظر تو پیدا کر، کیا چیز ہے جو انعام نہیں

انسانی جسم میں اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت عظیم آنکھ کا شیشہ EYE-LANCE ہے، یہ خراب ہو جائے تو دنیا کے ماہرین چشم میں کوئی بھی ایسا نہیں جو آنکھ کی روشنی واپس لا سکے۔ نہ ہی کوئی بڑے سے بڑا سائنس داں سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود دنیا کوئی آئی لینس بنا سکا جو آنکھ کے قدرتی شیشہ NATURAL EYE-LANCE کا نعم البدل دے سکے اور بینائی دے سکے۔

اسی طرح انسانی دماغ ہے جو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ایسی پیچیدہ مشین ہے جسے آج تک بھی مکمل طور پر تو کیا سمجھا جاتا، جزوی طور پر بھی پوری طرح نہیں سمجھا جا سکا اور جو اب تک ہے

"ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا"

بنا ہوا ہے۔

حال ہی میں خداوند کریم کی انسان کو عطا کئے ہوئے دماغ کی فضیلت و عظمت اہمیت قدر و قیمت کا ایسا واضح و مدلل ثبوت ملا ہے جس سے سائنسداں حیران و سرگرداں ہیں۔ ایک تازہ واقعہ ملاحظہ ہو۔

امریکہ کے مشہور شہر واشنگٹن کے شہرۂ آفاق "نیشنل بیورو آف اسٹینڈرڈ کانفرنس ہال" "NATIONAL BUREAVE OF-STANDERD CONFRENCE HALL"

میں دنیا کے سب سے اعلیٰ ترقی اور شہرت یافتہ کمپیوٹر، یونی واک ۱۱۰۸ (UNIVAC 1108) کے اعلیٰ ترین مادی دماغ اور ایک معمولی ہندوستانی عورت شکنتلا دیوی کے قدرتی غیر معمولی صلاحیت کے دماغ کے درمیان ایک انتہائی دقیق ریاضی سوال کے حل کرنے کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ کو دیکھنے کے لئے امریکہ کے مشہور عالی دماغ فلاسفر و سائنسداں واشنگٹن کے اس کانفرنس ہال میں اس کثرت سے جمع ہو گئے کہ ہال میں بیٹھنے کی تو کیا کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ رہی۔

اس مقابلے کے پیشتر اپنے دورۂ امریکہ کے دوران شکنتلا دیوی نے اپنی خداداد دماغی قابلیت و صلاحیت کا امریکہ کے تمام مشہور شہروں میں مظاہرہ کر کے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ خداداد قابلیت کا بے پناہ ثبوت دیا تھا۔ ان مظاہروں کی بنا پر سائنس دانوں نے اسی کمپیوٹر سے یہ معلوم کیا تھا کہ کیا کوئی انسانی دماغ ایسا ہو سکتا ہے جو ان لوں گھڑیوں کا حساب ایک منٹ میں بالکل صحیح بتا سکے، تو کمپیوٹر نے بتایا تھا کہ پانچ کروڑ اسی لاکھ انسانی دماغوں میں ایک دماغ ایسا ہو سکتا ہے مگر کمپیوٹر کے اس واضح جواب کے باوجود، مادی دماغ کو ہی سب کچھ ماننے والے سائنسداں اس پر یقین کرنے کے لئے قطعی آمادہ نہ ہوئے اور انھوں نے شکنتلا دیوی کی قدرتی دماغی قابلیت و صلاحیت کو چیلنج کیا جسے شکنتلا دیوی نے بخوشی قبول کر لیا، اس طرح یہ عظیم مقابلہ شروع ہوا۔

کمپیوٹر کے مادی دماغ اور شکنتلا دیوی کے قدرتی دماغ کی صلاحیت اور سوال حل کرنے کی رفتاری استعداد اور درست جواب معلوم کرنے کے لئے دونوں سے ایک ہی سوال پوچھا گیا۔ سوال تھا: "دو سو ایک ہندسوں والے عدد کی اکیسویں روٹ کون سی ہے؟"

اس سوال کے ساتھ ہی حاضرین میں سے ہر ایک کی نگاہ بگ کلاک "BIG-CLOCK" کی روشن سوئیوں پر اس طرح جم گئی کہ سوائے کلاک کی ٹک ٹک کے سانس لینے کی آواز بھی نہ آ رہی تھی جیسے حاضرین کے دلوں کی

دھڑکن ہی بند ہو گئی ہے۔

پچاس سیکنڈ گذرے تھے کہ شکنتلا دیوی نے ،بلیک بورڈ (تختۂ سیاہ) پر بالکل صحیح جواب لکھ دیا۔ اس کے دس سیکنڈ بعد یعنی ایک منٹ پورا ہونے پر ہی اس مشہور عالم کمپیوٹر یونی واک ۱۱۰۸ نے وہی جواب دیا جو شکنتلا دیوی کا تھا۔ اس طرح مادی دماغ قدرتی دماغ سے دس سیکنڈ کے فرق سے جواب دینے کے باعث شکست کھا گیا اور سائنسداں اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

غزل

کیا غرض مجھ کو کہ میخانہ نہ ہو ساغر نہ ہو
شیشۂ دل چور کر دے بس وہی پتھر نہ ہو

میری محتاجی فقط تجھ سے ہی وابستہ رہے
اے مرے اللہ! احسانِ بشر مجھ پر نہ ہو

پھر ہو تقلیدِ براہیمیؑ کا منظر سامنے
تو اگر چاہے تو دنیا میں کوئی آذر نہ ہو

قوتِ پرواز، عزم و حوصلہ سب کچھ تو ہے
ایک پر کی بات ہی کیا طائرِ ہو پر نہ ہو

مرہمِ زخمِ جگر بے حد ضروری ہے مگر
بے ضرورت چارہ گر کو حاجتِ نشتر نہ ہو

اپنی مرضی اک فریبِ نفس ہے اے ہم نفس
زندگی کس کام کی کوئی اگر رہبر نہ ہو

دلق بوسیدہ ہی مفلس کا اک ہے تو کفن
منظرِ عبرت ہے یہ جس کو پھٹی چادر نہ ہو

یادِ جاناں میں تڑپنے کا مزا کیا پوچھنا
مضطرب پھر سکوں تو لے دل مضطر نہ ہو

قصرِ جنت شیخ صاحب کو مبارک ہو مگر
اس کے عاصی کے لئے ممکن نہیں اک گھر نہ ہو

(ابو المحبوب انصاری عاصی)

اپنے بچوں کو پولیو سے بچائیے

بشارت حسین

والدین کو چاہیے کہ جیسے ہی بچے پیدا ہوں اپنے بچوں کو چیچک وغیرہ کے ٹیکوں کے ساتھ پولیو کا ٹیکہ بھی ضرور لگوائیں ورنہ بچے کبھی نہ کبھی پولیو کا شکار ہو سکتے ہیں۔

عام طور پر بچے پولیو کا شکار اس وقت ہوتے ہیں جب کہ جسم میں بیماری سے مقابلہ کرنے کے لئے ضروری مدافعت کی قوت موجود نہیں ہوتی۔ یہ ضروری مدافعت کی قوت بچہ اپنی ماں سے بھی حاصل کرتا ہے لیکن چونکہ یہ کمزور ہوتی ہے اس لئے اگر پولیو کا ٹیکہ بچہ کو نہیں لگایا جاتا ہے تو بچے چھوت لگنے پر پولیو کا شکار ہوتے ہیں۔

بڑے لوگ پولیو سے متاثر کیوں نہیں ہوتے ہیں؟ تو آئیے یہ بھی معلوم کر لیجئے۔ اس کی وجہ ماحول سے قلیل مقدار میں پولیو کے وائرس (virus) کی جسم میں آمد ہوتی ہے جس کی وجہ سے جسم اپنے تئیں مرض کے خلاف مدافعت خود پیدا کر لیتا ہے۔

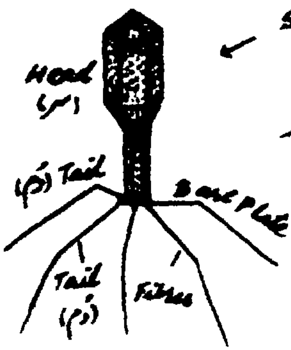
اب دیکھنا یہ ہے کہ وائرس (virus) کیا ہے؟۔

وائرس (virus) نیوکلیائی پروٹین کے بنے ہوتے ہیں اور اپنے میں زندگی کی خصوصیت رکھتے ہیں۔ یہ جسامت میں انتہائی مختصر سے مختصر ہوتے ہیں اور خوردبین (microscope) کے بغیر وائرس (virus) دیکھے نہیں جا سکتے ہیں۔ وائرس (virus) کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان افزائش نسل کا کام انسانی حیوانی یا پودوں

کے خلیوں (Cells) سے الگ ہوکر نہیں کر سکتے ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ وائرس پولیو انفلوئنزا، چیچک، خسرہ جیسی بیماریوں کا باعث ہوتے ہیں۔

زیر نظر تصویر میں بیکٹیریو فیس وائرس (Bactriophase Virus) کی شکل ہے۔

Bactriphase



Structure of (Bactriophase Virus)

بیکٹیریو فیس وائرس کی شکل

خوردبین میں دیکھنے کے بعد

(Virus)

چند اور وائرس کے نام یہ ہیں:

(۱) پولیو وائرس ہومینس---------- (Polio Virus hominis)

(۲) میکسو وائرس------ (Myxo Virus)

(۳) پاکسی وائرس وے ریولی------ (Poxi Virus varidae)

(۴) پاکسی وائرس آفی سینل---- (Pox virus officinale)

دو شعر

دکھا تو ہوتا کہ راستہ ہوتا مجھ کو
دستے والا اگر کوئی تیرا ہوتا
رات سے ڈھلنے کو سورج بھی اجالا کوئی
پامنتا ہی تیرا سے سویرا ہوتا
(داغ)

کیا جہیز وصول شوہر کے بچے حرامی ہوتے ہیں

ڈاکٹر محمد جمالی فیروز آبادی

ماہنامہ "حجاب" بابت ماہ جنوری ۱۹۹۶ء میں محترم ابن حمید صاحب کا سوال نظر سے گذرا جس میں موصوف نے سوال کے روپ میں صاف صاف فیصلہ فرما دیا ہے کہ جہیز یا شادی کے نام پر جو تجارت ہو رہی ہے وہ حرام ہے اور اس قسم کی شادیوں کے نتیجے میں جو بچے جنم لیتے ہیں وہ حرامی ہیں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ بھی اپنے دستور (یعنی) قرآن کے ذریعہ اس طرح کے بچوں کو جائز (یعنی حلال کا) مقام دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ابن حمید صاحب کے سوال سے یہی مترشح ہوتا ہے اسی لئے محترم مائل صاحب نے بھی علمائے کرام سے گذارش کر ڈالی ہے کہ وہ اس سوال پر غور فرمائیں۔ حجاب کے صفحات ان کے افکار عالیہ کے منتظر رہیں گے۔ حالانکہ اتنی اہم بات کے لئے ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ مدیر محترم فاضل مضمون نگار سے گذارش فرماتے کہ وہ اپنی بات کے ثبوت کے لئے کوئی نص پیش فرمائیں اس لئے کہ اس سے مسلم معاشرہ میں پیدا ہونے والے بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا حلالی (صحیح النسب) ہونا ہی خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ جب کہ اتنی اہم بات فاضل مضمون نگار نے بغیر کسی ثبوت کے محض جوش میں تحریر فرما دی ہے۔

جہاں تک اسلام میں کسی نکاح اور شادی کے جائز ہونے اور اس کے نتیجے میں جو بچے پیدا ہوں ان کے حلالی ہونے کا تعلق ہے وہ صرف اس بات پر منحصر ہے کہ زوجین (زن و شوہر) کے درمیان کم از کم دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کے

سامنے ایجاب وقبول ہو۔ اس کے بعد یہ دونوں (عورت و مرد) رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ان کے ملاپ سے جو اولاد وجود میں آئے گی وہ حلال اور جائز ہوگی۔ کوئی جہیز کسی قسم کا مطالبہ اور لین دین کی کوئی شرط ایسے شوہر کے بچوں کو حرامی اور ناجائز نہیں بنا سکتی۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے ایک مالی مہر کے عوض کسی عورت سے نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ وہ اس مہر کو ادا نہیں کرے گا تو وہ دراصل زانی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جس کسی مرد نے کسی عورت سے شادی کی کم مہر پر یا زیادہ مہر پر اور اس کے دل میں نیت یہ ہے کہ اس عورت کا یہ حق (مہر) اس کو نہ دے تو قیامت کے دن وہ زانی کی صف میں خدا کے سامنے حاضر ہوگا۔ (طبرانی)

ان احادیث میں بھی یہ نہیں فرمایا گیا کہ ایسے مرد کی اولاد حرامی ہوگی۔ اس لیے کہ نیت کا جاننے والا صرف اللہ ہے۔ اصول و قوانین ظاہر سے بحث کرتے ہیں باطن سے نہیں۔ باطن کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ہر شخص آخرت میں اپنے اعمال کی جزا و سزا اپنی نیت کے مطابق پائے گا۔ اسی لئے اتنی اہم اور واضح احادیث کی بنا پر بھی کسی عالم اور فقیہ نے آج تک یہ نہیں کہا کہ جو شخص اپنی بیوی کا مہر ادا نہیں کرے گا یا ادا نہ کرنے کی نیت رکھے گا وہ زنا کا مرتکب ہوگا۔ اور اس کی اولاد حرامی ہوگی۔

لہٰذا ابن حمید صاحب کا یہ تحریر کرنا کہ۔ اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ جو اس طرح کی شادیوں سے زن و شوہر کی ملاقات ہوتی ہے پھر بچے جنم لیتے ہیں ان کو کس زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ یورپ میں حرامی بچوں کو دستور کے ذریعہ جائز اور حلال قرار دیا گیا ہے لیکن کیا اللہ اپنے دستور قرآن کے ذریعہ اس طرح کے بچوں کو جائز مقام دینے کے لئے تیار ہے۔ (یعنی نہیں ہے) دانستہ یا نادانستہ اللہ تعالیٰ اور اس کے کلام مبین کی شان میں بہت بڑی جسارت، گستاخی اور بے باکی ہے۔ جس کی ابن حمید صاحب کو اللہ کی جناب میں معافی مانگنی چاہیئے۔ معلوم نہیں اس قسم کی تحریر سے ان کے پیش نظر کیا فائدہ مقصود ہے

مہکتے گوشے

حسن احمد صدیقی

—— کسی نے عرض کیا کہ میں سب سے بڑا عالم بننا چاہتا ہوں —— آپؐ نے فرمایا کہ خدا سے ڈرو جس نے خشیت کی راہ اختیار کی وہ سب سے بڑا عالم بن گیا۔

—— کسی نے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ سب سے بڑا انسان بن جاؤں —— آپؐ نے فرمایا کہ سب لوگوں کو نفع پہنچاؤ۔ جو لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے وہ سب سے بڑا انسان کہلانے کا مستحق ہے

—— کسی نے عرض کیا کہ میری خواہش ہے کہ میں عادل بنوں —— آپؐ نے فرمایا کہ عدل وانصاف کا تقاضا یہ ہے جو اپنے لئے پسند کرو وہی دوسروں کے لئے پسند کرو۔ گویا کہ ایسا کرو گے عادل سمجھے جاؤ گے

—— کسی نے عرض کیا کہ میں خدا کا مقرب بننا چاہتا ہوں —— آپؐ نے فرمایا کہ خدا کو کثرت سے یاد کرو۔

—— کسی نے عرض کیا کہ میں ایمان کی تکمیل چاہتا ہوں —— آپؐ نے فرمایا کہ اپنے اخلاق درست کر لو۔ ایمان مکمل ہو جائیگا۔

—— کسی نے عرض کیا کہ میں میدان حشر میں نور کے ساتھ اٹھنا چاہتا ہوں —— آپؐ نے فرمایا کہ ظلم سے بچو۔ ظلم نہیں کرو گے تو نور الٰہی کے ساتھ اٹھائے جاؤ گے۔

—— کسی نے عرض کیا کہ میرے گناہ کم ہو جائیں ایسی ترکیب بتائیے —— فرمایا کہ بکثرت استغفار کرو۔ گناہ گھٹ جائیں گے۔

—— کسی نے عرض کیا کہ بندگی چاہتا ہوں —— آپؐ نے فرمایا کہ مصائب میں شکوہ

وہاں پر جاؤ. بیرنگ ہو جاؤ گے.

—— کسی نے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے رزق میں زیادتی ہو —— آپ نے فرمایا کہ پاک وصاف رہا کرو رزق میں برکت ہوگی.

—— کسی نے عرض کیا کہ میں خدا اور اس کے رسول کا دوست بننا چاہتا ہوں —— آپ نے فرمایا کہ جو چیزیں خدا اور اس کے رسول کو پسند ہیں انھیں اختیار کر لو اور جو چیزیں انھیں ناپسند ہیں ان سے احتراز بھی کرو اور اظہار بیزاری بھی.

—— کسی نے عرض کیا کہ میں اللہ کے غصہ سے بچنا چاہتا ہوں —— آپ نے فرمایا کہ کسی پر غصہ نہ کرو. تم دوسروں پر رحم کرو اللہ تم پر رحم کرے گا. تم دوسروں کی غلطیاں نظر انداز کرو اللہ تمہاری غلطیاں نظر انداز کرے گا.

غزل

(نظام الدین نظام)

گھنے سائے کی ٹھنڈک راہ کی دیوار ہے بھائی
اگر ٹھہرے تو پھر بڑھنا بہت دشوار ہے بھائی

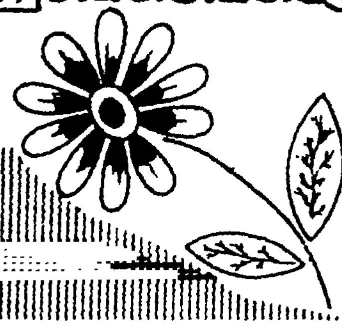
تمنائیں بھی دل میں ہیں، کھلونوں کی محبت بھی
گذرنا بھی وہیں سے ہے جہاں بازار ہے بھائی

ہمارے شہر میں تو حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں
بچا لے جائے جو خود کو وہی ہشیار ہے بھائی

کسی کے واسطے برسوں نہ ہولی ہے نہ دیوالی
کسی کے واسطے ہر دن نیا تہوار ہے بھائی

ہمیشہ ایک ہی چہرہ لئے لوگوں سے ملتا ہے
وہ اپنے فن میں ماہر ہے مگر بیکار ہے بھائی

غزل کہنا نظام اپنے لئے مشکل نہیں لیکن
جسے سب شعر کہتے ہیں بڑا دشوار ہے بھائی



جڑواں بھائی

فی زمانہ سائنس بے پناہ ترقی کر چکا ہے۔ سائنسدانوں نے ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیئے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے لیکن قدرت کی بہت سی عجیب باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں لاکھ جتن کرنے کے باوجود سائنسدان کچھ جانکاری نہیں حاصل کر سکے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہیں؟

خدا کی باتیں خدا ہی جانے

اس سلسلہ میں درج ذیل دو جڑواں بھائیوں کی داستان بڑی دلچسپ اور تعجب انگیز ہے۔ ان دو برطانوی اشخاص کی ذہنی اور جسمانی کیفیت پر سائنسدان حیران ہیں اور آج سے یہ عقدہ وا نہیں ہو سکا۔ قدرت کے اس معجزہ کی کہانی حال ہی میں ایک یورپین انگریزی رسالہ میں شائع ہوئی ہے جو اس طرح ہے۔

۵۹ سالہ انگریز لینڈ لارڈ ایلین ڈوڈ جس نے شہر میں ایک عالی شان ریستوران کھول رکھا ہے وہ ایک روز اپنے ایک گاہک سے باتوں میں مصروف تھا کہ اچانک اس کا گلا بند ہو گیا اور اس کے حلق میں شدید درد ہونے لگا اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی۔ منہ سے آواز نکلنے کے سبب وہ بتا ہی نہ سکتا تھا کہ اُسے کیا تکلیف ہے۔ کیفیت اس پر چند منٹ طاری رہی اور اس کے بعد وہ نہایت دھیمی آواز میں بولا۔

"نہ جانے میرا گلا کیوں بیٹھ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے گویا میرے حلق میں

کسی نے تیز نشتر سے ٹھونک دیا ہے۔"

بہرحال ایلن کی قوت گویائی تو بحال ہو گئی مگر ہفتہ بھر وہ اچھی طرح کھانا نہ کھا سکا نہ پانی پی سکا۔

ڈاکٹروں نے بغور معائنہ کے بعد بتایا کہ ایلن کے گلے میں خرابی ضرور ہے مگر اس کی جو حالت ہوئی ہے اُس کے متعلق ان کی عقل کام نہیں کرتی۔

اس واقعہ کے پورے ایک ہفتہ بعد جب کینیڈا سے ایلن کے دوسرے بھائی ایرک کا خط موصول ہوا تو یہ معمہ حل ہو گیا۔ ایرک نے لکھا کہ پچھلے ہفتہ اس کا خناق کا آپریشن ہوا تھا جو چند منٹ میں مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد پورا ہفتہ اُسے کھانے پینے میں تکلیف رہی۔ ایرک نے اپنے اس خط میں اپنے گلے کے آپریشن کی جو تاریخ اور وقت لکھا تھا عین اُسی روز اور اُسی وقت ایلن ڈوڈ کو تکلیف ہوئی تھی۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ وہ دونوں جڑواں بھائی ہیں۔ ان دونوں کی عمر ۶۰ برس ہے اور وہ بچپن ہی سے ذہنی و جسمانی طور پر یکساں کیفیت کے حامل ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ایلن ڈوڈ خوش ہے تو ایرک بھی مسرور اور اگر ایلن کو کوئی تکلیف ہو جاتی ہے تو ایرک بھی اتنا ہی دکھی ہو جاتا ہے۔ ان دونوں بھائیوں کے جسمانی نظام میں ٹیلی پیتھی کارفرما ہے۔

ایلن نے بتایا کہ "بچپن میں ایک بار میرا جی متلانے لگا تو وہی کیفیت ایرک پر طاری ہو گئی۔"

ایک بار ایرک کسی کام کے سلسلہ میں لندن کے نواحی قصبہ میں گیا تو وہاں اس کا دانت دُکھنے لگا اور کوئی تین گھنٹے سخت قسم کے درد میں مبتلا رہا۔ شام کو گھر لوٹا تو ایلن نے اُسے بتایا کہ آج دن کو مجھے سخت دانت درد لاحق ہو گیا تھا۔ کیا آپ کو بھی یہ تکلیف ہوئی تھی؟"

ایرک نے اس بات کا جواب دیتے ہوئے جب اپنے بھائی سے دانت درد شروع ہونے کا وقت پوچھا معلوم ہوا کہ

دونوں بیک وقت اس عارضہ میں مبتلا ہوئے تھے۔

ایلن اور ایرک کی بوڑھی ماں نے بتایا کہ ایک بار جب یہ دونوں بھائی چھوٹے تھے تو میخ گاڑتے وقت ایلن کے انگوٹھے پر ہتھوڑی کی ضرب آگئی تو جتنی تکلیف اُسے ہوئی اتنی ہی ایرک کو۔

اوائل عمر میں دونوں کی شکل بھی اس قدر ملتی تھی کہ اسکول میں ان میں سے ایک کے بازو پر رنگ دار کپڑا باندھ دیا جاتا تھا بصورت دیگر ٹیچروں کے لئے یہ پہچاننا دشوار ہو جاتا تھا کہ ایلن کون ہے اور ایرک کون۔

ہم شکل ہونے پر ایلن لطف لیتا۔ مگر ایرک کبھی کوشش کرتا کہ سفر کے دوران وہ دونوں مل کر نہ بیٹھیں۔ مبادا لوگ اُن پر اپنی نگاہیں گاڑ لیں۔

ایلن نے بتایا کہ ١٩٣٩ء میں جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو وہ نیوی میں بھرتی ہو گیا اور ایرک بری فوج میں۔ دونوں تقریباً پانچ برس ایک دوسرے سے جدا رہے۔ اس مدت میں ایلن نے اپنے بھائی کو صرف ایک خط لکھا اور وہ بھی اس وقت جب ان کا جنگی بیڑہ ٢٠ گھنٹے کے لئے کیپ ٹاؤن بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا۔ اس نے خط پر تاریخ اور وقت ڈال دیا۔ دو روز بعد اُسے فوجی ڈاک سے ایرک کا خط ملا۔ جسے پڑھ کر ایلن کی حیرانی کی حد نہ رہی کہ ایرک نے بھی اسی تاریخ اور وقت پر اٹلی کے کسی مقام سے اُسے خط ارسال کیا تھا۔

بحری فوجی خدمات کے دوران ایلن اور اُس کے ساتھیوں کی ڈبکنی کشتی کو دشمن نے دو بار تارپیڈو کیا اور دونوں مرتبہ ایلن ڈوبتے ڈوبتے بچا اور اُسے بڑے غوطے آئے۔ عین اُسی وقت ایرک نے بھی یوں محسوس کیا جیسے اُس کا دم گھٹ رہا ہے اس امر کا انکشاف اس وقت ہوا جب جنگ کے خاتمہ پر دونوں بھائی فوج سے چھٹی پانے پر ملے۔

١٩٤٠ء میں ایرک لندن چھوڑ کر

ا۔ہابساادہ نوڈ نوڈ میں آج کل اس کا بہت
کا رہا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے بھائی سے
زروں میل دور ہے لیکن جونہی وہ اپنی
عافیت کے بارے میں ایلن کو بتانا
ہتا ہے تو اس کا تصور کرتا ہے اور اپنے
ں کی بات کہہ ڈالتا ہے۔ اُدھر لندن میں
ن کو جھٹ سے اس امر کا احساس
جاتا ہے کہ اس کا بھائی اُسے یاد کر رہا ہے
ایلن کا کہنا ہے کہ ہم دونوں نے زندگی
ہر کوشش کر کے اپنے اندر صرف یہ فرق
یدا کیا ہے کہ میں مے نوش بھی ہوں
ہن
د سگریٹ نوش بھی جبکہ ایرک ان دونو
شوں کا عادی نہیں۔ یہ عادت کا فرق ہے
فسیات دونوں کی یکساں ہے۔

اسی طرح کیلی فورنیا کی دو جڑواں
ہنوں جن کی عمر صرف سات برس ہے
کے بارے میں بھی سائنسداں بڑے چکر
میں ہیں۔ یہ دونوں ایک ایسی بولی بولتی
ہیں جن کو اس کے ماں باپ سمجھ سکتے ہیں
نہ ان کی اُستانیاں کلاس میں وہ اپنی

ہم جماعتوں کے ساتھ مقامی بھاشا میں با
کریں گی لیکن جب وہ دونوں تنہا گفتگو
ہوں گی تو ان کی بھاشا کو ان کے سوا کوئی
نہیں سمجھ سکتا۔ انھیں جب یہ کہا گیا کہ وہ
اپنی اس عجیب و غریب بھاشا کا انگریزی
میں ترجمہ کر دیں تو انھوں نے بے بسی
کا اظہار کر دیا۔

ایک دو بار اُن سے اپنی پرائیویٹ
بھاشا تحریری طور پر بیان کرنے کو کہا گیا تو
انھوں نے رومن میں لکھ دیا مگر ماہرین
نباتات اُن کی تحریر کا کوئی مطلب نہ نکال
سکے اور انھیں تھک ہار کر یہ کہنا پڑا کہ
خدا کی باتیں خدا ہی جانے

طلاق

مولانا محمد امین اثری
صدر مدرس
مدرسہ لطفیہ علی گڑھ

عورت اور مرد کے باہمی تعلق کو عقد (گرہ) اور نکاح کہتے ہیں اور اس تعلق کے چھوڑ دینے
ر کاٹ دینے کو طلاق کہتے ہیں۔ اسلام میں نکاح کے جو تقاضے ہیں اس پر اگر ٹھیک
یک عمل کیا جائے تو شاید ہی طلاق کی نوبت آئے۔

طلاق کی حیثیت ایک فیصلہ کی ہے اس لئے یہ فیصلہ کن قدم اٹھانے سے پہلے مسئلہ
ے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر عورت میں ایک خرابی ہوگی تو اس
ے مقابلہ میں اس میں خوبی بھی ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ خوبی کا پہلو وزنی ہو۔ نبی کریم صلی اللہ
یہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

لا یفرک مومن مومنۃ ان کرہ منہا خلقا رضی منہا آخر (مسلم)	"کوئی مومن کسی مومنہ سے نفرت نہ کرے اگر اس کی ایک خصلت ناپسندیدہ ہوگی تو دوسری خصلت پسندیدہ بھی ہوگی"

طلاق کے نتیجہ میں جو مسائل پیدا ہو جاتے ہیں ان پر بھی غور کر لینا چاہئے۔

(۱) اولاد کی پرورش کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے اور والدین کی جدائی کا بچوں پر برا اثر پڑتا ہے
(۲) میاں بی بی کے گہرے میل ملاپ کے بعد جدائی سخت پریشانی کا باعث بن جاتی ہے دل بھی زخمی ہو جاتے ہیں۔
(۳) ان کے لئے گذر بسر کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ خاص طور سے ہمارے ملک

میں جہاں معاشی حالات خراب چلے آرہے ہیں۔ ایک عورت کو طلاق کی صورت میں جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہیں۔

(۴) موجودہ حالات میں عورت کے لئے دوسرا نکاح بھی مشکل ہے۔ عام طور سے مطلقہ عورتوں کو تجرد ہی کی زندگی گزارنا پڑتی ہے۔

طلاق کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے ان نتائج کو نظرانداز کر کے طلاق کا اختیار استعمال کرنا کوئی دانشمندی کی بات نہیں ہے لیکن آپس کی ناچاقی کی بنا پر مرد طلاق دینا ضروری سمجھے تو آخری فیصلہ کرنے سے پہلے حکم ہے کہ پہلے گھر والے اس کی اصلاح کی کوشش کریں اگر اصلاح نہ ہو سکے تو پھر ایک دو آدمی لڑکے کی طرف سے اور ایک دو لڑکی کی طرف سے جمع ہوں اور باہم مل کر کوئی ایسی صورت نکالیں کہ باہم صلح ہو جائے اور طلاق کی نوبت نہ آئے اور خدانخواستہ پھر بھی سمجھوتہ نہ ہو سکے اور طلاق ناگزیر معلوم ہو تو طلاق کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

<u>طلاق دینے کا صحیح طریقہ</u> طلاق دینے کا فیصلہ کرنے کی صورت میں مرد کو چاہئے کہ وہ طلاق دینے کا شرعی طریقہ اختیار کرے۔ طلاق کا شرعی اور مسنون طریقہ یہ ہے کہ:

(۱) صرف ایک طلاق دی جائے۔ یعنی شوہر بیوی سے کہے کہ میں نے ایک طلاق دی۔ اس پر طلاق واقع ہو جائے گی۔ بس ایک طلاق دینے پر اکتفا کرے۔

(۲) طلاق دو عادل گواہوں کی موجودگی میں دی جائے۔

(۳) طلاق حالت طہر میں (یعنی ماہواری کے بعد پاکی کی حالت میں) دی جائے جس میں شوہر نے مجامعت نہ کی ہو۔

(۴) طلاق دینے کے بعد عورت کو عدت گزارنا ہوگی۔ عدت تین ماہواری تک ہے لیکن حاملہ کی عدت وضع حمل تک ہے۔ اگر عورت کو ایام نہ آتے ہوں تو اس کی عدت تین

قمری ماہ تک ہے۔ عدت کے اندر مرد رجوع کر سکتا ہے۔ رجوع کے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میں نے رجوع کر لیا۔ رجوع دو عادل گواہوں کی موجودگی میں کر لیا جائے۔

(۵) رجوع نہ کرنے کی صورت میں عدت گذرتے ہی عورت مرد سے جدا ہو جائے گی، لیکن یہ ایک طلاق ہوگی۔ اگر مرد اور عورت دونوں چاہیں تو دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔

قرآن اور حدیث کی رو سے طلاق کا یہ صحیح اور بہترین طریقہ ہے۔ اس صورت میں مرد کو غور و فکر کا کافی موقع مل جاتا ہے اور پچھتانے کی نوبت نہیں آتی۔

طلاق دینے کا غلط طریقہ لیکن لوگ شرعی احکام سے ناواقفیت کی بنا پر یا جذبات سے مغلوب ہو کر بیک وقت تین طلاقیں دے بیٹھتے ہیں اور بعد میں پچھتانے لگتے ہیں۔ طلاق دینے کا یہ طریقہ خلاف سنت ہے اس لئے ایسی طلاق کو بدعت کہتے ہیں۔ تین طلاق کے بعد رجوع کرنے کا موقع ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں بیشمار گھر تباہ ہو جاتے ہیں یا لوگ غیر شرعی طریقہ پر اپنی بی بی کو گھر میں ڈال رکھتے ہیں اور زندگی بھر بدکاری میں مبتلا رہتے ہیں یا حلالہ کا طریقہ اختیار کرتے ہیں جو غیرت کے منافی اور اسلامی تعلیم کے بالکل خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلالہ کرنے والے اور حلالہ کرانے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ایک نشست میں تین طلاقیں دینے والے کو دُرّے ملا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ کیا اللہ کی کتاب سے کھیل اور مذاق کرتا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نزدیک ایک وقت میں تین طلاقیں دے دینا انتہائی جہالت اور نادانی کی بات ہے۔ ایک شخص نے اپنی بی بی کو ایک وقت میں تین طلاقیں دے ڈالیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تو آپ سن کر غصے سے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل کیا جا رہا ہے جب کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔

مطلقہ عورت کا گھر سے نکلنا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مطلقہ عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ
نکالو اور نہ وہ خود نکلیں یعنی نہ مرد غصے میں آ کر عورت کو گھر سے نکال دے جیسا کہ جاہل مردوں
میں دیکھا گیا ہے اور نہ عورت ہی بگڑ کر گھر چھوڑ دے جیسا کہ جاہل عورتوں میں دیکھا گیا ہے عدت
تک گھر اس کا ہے۔ اسی گھر میں دونوں کو رہنا چاہئے۔ اس حکم میں مصلحت یہ ہے کہ اگر طلاق
رجعی کے بعد دونوں میں میاں بی بی بن کر رہنے کی جو گنجائش باقی ہے اس سے فائدہ اٹھایا جائے
جس وجہ سے طلاق ہوئی ہے اس پر مرد بھی غور کر کے نادم ہو سکتا ہے اور رجوع کر سکتا ہے عورت
بھی اپنی غلطی کے بارے میں سوچ سکتی ہے اور شوہر کو منانے کی تدبیریں سوچ کر عمل میں لا سکتی
ہے۔ اپنی غلطی کی معافی مانگ سکتی ہے۔ بناؤ سنگار کر کے مرد کو اپنی طرف مائل کر سکتی ہے
دونوں ایک گھر میں رہیں گے تو تین مہینے تک یا تین حیض آنے تک یا حمل کی صورت میں
بچہ پیدا ہونے تک اس کے بہت سے موقع آ سکتے ہیں کہ وہ پھر میاں بی بی بن جائیں۔ اگر مرد
غصے میں آ کر نکال دے گا تو گنہگار ہوگا اور اگر عورت خود جائے گی تو وہ بھی گنہگار ہوگی اور
کھانا وغیرہ اس کا حق ہے اس سے بھی محروم ہو جائے گی۔

گھر سے نکلنے کا ٹھیک طریقہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ عدت ختم ہونے پر بھلے طریقے سے
عورت کو گھر سے نکالو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہر یا اس کا کوئی حصہ باقی ہے تو اسے دو
اور اگر تم کو اللہ نے کچھ زیادہ دینے کی توفیق دی ہے تو کچھ اور دینے کا ذکر سورہ بقرہ
آیت ۲۵۰ میں ہے اور سورہ احزاب میں بھی۔

عدت کے دنوں میں عورت کہاں رہے؟ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ان کو عدت کے دنوں میں
جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو جیسی بھی تمہارے پاس جگہ ہے۔ اس زمانے میں تم ان کو ستاؤ نہیں کہ
وہ بے چاری پریشان ہو کر بھاگ جائیں۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دنوں میں اس کے کھانے رہنے کی ذمہ داری

ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہ ذمہ داری مرد پر ہے کہ وہ عدت کے دنوں میں اسے کھانا کپڑا دے جو اس کی حیثیت سے ہے۔ اس کے مطابق دے۔ وجہ یہ ہے کہ عدت کے دنوں میں ہو سکتا ہے کہ وہ رجوع کرے۔ رہی تین طلاقیں دینے کی بات تو بھی مرد پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عدت تک اسے اسی گھر میں رکھے اور نان و نفقہ دے۔ اگر کوئی مرد نان و نفقہ سے بچنے کے لئے اُسے پریشان کرے گا تاکہ وہ پریشان ہو کر چلی جائے تو مرد سخت گناہ گار ہوگا۔

<u>رضاعت کا مسئلہ</u> عورت کے سلسلے میں یہ بات صاف صاف اللہ نے فرما دی کہ اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر اس وقت تک خرچ کرتے رہو جب تک بچہ پیدا نہ ہو جائے۔ رہی یہ بات کہ اس بچے والی کو تو طلاق ہو گئی تو اب بچے کے خرچ کا معاملہ سامنے ہے۔ بچے کے دودھ پلانے کا مسئلہ سامنے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے کہ اگر وہ ماں بچے کو دودھ پلائے تو اسے اُجرت دو اور یہ اُجرت آپس میں طے کر لو۔ اللہ کے اس حکم سے علماء نے یہ قانون نکالا ہے۔

(۱) عورت اپنے دودھ کی مالک ہے (۲) بچہ پیدا ہونے کے بعد وہ اب بچے کے باپ کی بیوی نہ رہی تو وہ مجبور نہیں کہ بچے کو دودھ پلائے (۳) بچے کا باپ بھی مجبور نہیں ہے کہ بچے کی ماں ہی سے اسے دودھ پلوائے۔ (۴) اگر باپ اسے دودھ پلوانا چاہے اور وہ بھی راضی ہو تو پلائے اور اُجرت لے۔ (۵) بچے کا خرچ باپ برداشت کرے گا۔ (۶) بچے کو دودھ پلانے کی پہلی حقدار ماں ہے۔ دوسری عورت سے دودھ پلانے کا کام اسی وقت لیا جا سکتا ہے جب کہ ماں راضی نہ ہو۔ (۷) اگر ماں اتنی ہی اُجرت مانگے جتنی اُجرت دوسری عورت مانگتی ہے تو پھر ماں زیادہ حقدار ہے کہ دودھ پلائے۔ (۸) اگر دوسری عورت دودھ پلانے کے لئے نہ مل سکے تو ماں کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ دودھ پلائے اور چند شریف لوگ اُجرت طے کریں گے جو دونوں کے لئے قابل قبول ہو۔ (۹) [illegible] کے ماں باپ ایک دوسرے کو پریشان نہ کریں۔

مردوں کی تلاش

"معزز جوانمردو! تم کہاں ہو؟" ...... اس عنوان سے حال ہی میں ایک روسی اخبار میں ستائیس اٹھائیس سال کی تین تعلیم یافتہ لڑکیوں کی دردناک اپیل شائع ہوئی ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ہم تین چار سال کی مسلسل قسمت آزمائی سے مایوس سی ہوکر اخبار میں اشتہار دینے پر مجبور ہیں کہ ہم شادی کرنا چاہتی ہیں۔ ہمیں موزوں شوہر میسر نہیں ہو سکے۔ ہم ایسے شریف النفس، معقول، صحیح طور پر ترقی پسند نوجوانوں سے شادی کرنا چاہتی ہیں جو ایسے "ماڈرن" نہ ہوں جنھیں مغربی تہذیب کے شوق تقلید میں اپنے گھر پریوار سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

اس اثنا میں کچھ ایسے نوجوانوں کو بھی ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا، جو شادی کے امیدوار تھے۔ ان نوجوانوں کے ہپیوں کے سے لمبے لمبے بال تھے اور وہ ان ہی کی سی بے ہنگم پتلونیں پہنے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھ کر ان لڑکیوں نے کہا۔

"کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم ان سے شادی کرلیں۔ نہیں صاحب! یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ ہم اکیلی ہی رہیں۔ ہم کوئی معقول شوہر چاہتی ہیں جس کا کوئی گھر ہو، خاندان ہو اور وہ ہمیں اپنے پریوار میں رکھ کر ہمیں "محبت مادری" سے آشنا کر سکے۔"

۱۹۷۰ء کی مردم شماری کے مطابق روس میں ۱۰۰ مجرد عورتوں کے مقابلہ میں ۳۰ مجرد مرد تھے وہاں پچیس پچیس سال کی عمر تک لڑکیوں کی شادی نہیں ہو پاتی۔ بیشتر تعداد ان لڑکیوں کی ہے جو شادی کی عمر سے تجاوز کر چکی ہیں۔ انھیں روس میں "بوڑھی کنواریاں" کہا جاتا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے عورتوں اور مردوں کی تعداد میں توازن قائم نہیں رہ سکا۔ اس جنگ میں لاکھوں جوان ہلاک ہو گئے تھے۔ عورتوں کی تعداد تب سے زیادہ چلی آ رہی ہے۔

ایک ۲۶ سالہ لڑکی نے "ہمارا سماج" کے کالم میں اخبار کو لکھا ہے۔

"میں اور میری کئی ہم عمر لڑکیاں محسوس کر رہی ہیں کہ وقت بڑی تیزی سے ہمیں پیچھے چھوڑ کے آگے نکل رہا ہے۔ ایک آدھ سال اور اسی طرح نکل گیا تو ہم نہ ادھر کی رہیں گی نہ ادھر کی۔"

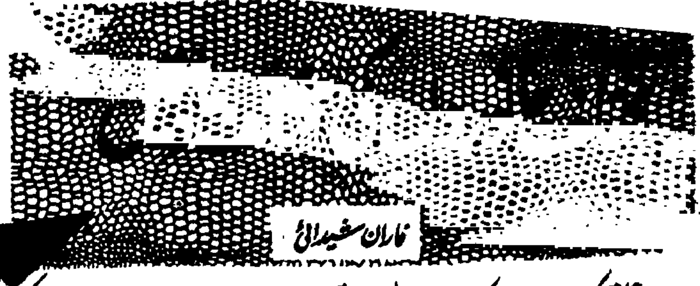
معقول تمنا اوپر جو کچھ نقل ہوا وہ ایک ایسے ملک کی لڑکیوں کی دردناک اپیل ہے جہاں اس ملک کے دور اندیشوں کے بقول پیٹ کا مسئلہ حل کر دیا گیا ہے۔ وہاں کے مردوں اور عورتوں کو روزگار، رہنے کے لئے مکان، بیماری کے لئے شفاخانے، کھیل تماشوں کے لئے فلمیں، تھیٹر اور کلب حاصل ہیں۔ ہر کام اور ہر بات کے لیے وقت مقرر ہے۔ اتنے وقت سے اتنے وقت تک کام۔ فلاں وقت فلم اور تھیٹر کے لئے۔ فلاں وقت کھیل کے لئے۔ کھیل بھی وہ جو وہاں کے دانشور پاس کر دیں۔ روس کی زندگی کو دیکھ کر کچھ دوسرے دانشوروں کا کہنا یہ ہے کہ اس طرز زندگی اور جانوروں کی زندگی میں فرق کیا ہے؟ جانور بھی اسی پابندی اور قید و بند کے ساتھ کام کرتا ہے۔ انسانی زندگی صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ انسانی زندگی میں کچھ اخلاقی، روحانی اور سماجی تقاضے پورے کرنے کی ضرورت ہے۔

ان تقاضوں کو روس میں بڑی بے دردی سے کچل دیا گیا۔ لیکن یہ لاوا پھوٹتا رہتا ہے۔ اوپر لڑکیوں کی جو اپیل شائع ہوئی ہے وہ آتش فشاں

کا لاوا ہے جو باہر بکھر گیا ہے۔ ان لڑکیوں کی تمنا کو ہر معقول آدمی معقول تمنا کہے گا اس کو ہم کہتے ہیں کہ جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے۔

اس اپیل میں ایک بات اور سر پر چڑھ کر بول رہی ہے۔ وہ یہ کہ وہاں کی عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔ روس میں اوسطاً ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتیں آتی ہیں۔ اس کی وجہ وہ ہنگامی صورت حال ہے جو سنہ ۳۹ء کی جنگ میں سامنے آئی۔ جنگ میں بہادر نوجوان کام آ گئے۔ جنگ کے بعد وہاں کے دانشوروں نے عورتوں مردوں کے فرق کو اس طرح حل کیا کہ عورتوں اور مردوں کی قوت کار اور میدان کار کو برابر کر کے عورتوں سے وہ کام لینا شروع کر دیا جو درحقیقت ان کے حصے کا نہ تھا۔ عورتوں کی یہ بات کہ نازک عورتوں کی شادی کیسے ہو۔ اس کے لئے کہا گیا کہ کیا شادی ہی عورتوں کے جذبات کا حل نہیں ہو سکتے لئے اور بھی ذرائع ہو سکتے ہیں۔ وہ ذرائع وہاں کی حکومت نے فراہم کئے۔ تعدد ازدواج ایک طریقہ تھا۔ اسے ظلم کہا گیا اور اس کے خلاف اتنا زبردست پروپیگنڈا کیا گیا کہ عورت بھی اسے ظلم سمجھنے لگی۔ عورت کو سوکن ہرگز برداشت نہیں لیکن یہ برداشت ہے کہ وہ جب چاہے ذرا دیر کے لئے ایک مرد کو شوہر بنا لے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابھی عورت کے جسم کے اندر کی عورت وہی ہے جو ہنوز جانور نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کی اس تمنا کو مہذب طریقے سے شرافت کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔ ورنہ اگر کہیں جسم کے اندر کی عورت جانور بن گئی تو انسانیت کا نام مٹ جائے گا اس کے بعد قیامت کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ ملک کے مشہور و معروف تعمیر پسند شاعر ابوالمجاہد زاہد صاحب نے کیا فرمایا۔

گیا تو حسن نہ دیوار میں نہ در میں تھا
وہ ایک شخص جو مہمان میرے گھر میں تھا



فاران سعیدالٰہی

چیتے کی یہ عادت ہے کہ جب وہ موٹا ہو جاتا ہے اور چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہتا تو کسی غار میں چھپ کر بیٹھ رہتا ہے۔ اور کچھ دنوں تک فاقے کرتا ہے۔ اس طرح جب اس کی فربہی کم ہو جاتی ہے تب وہ باہر نکلتا ہے۔

شترمرغ اپنے انڈوں کو تین حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ ایک حصے کو ریت میں دبا دیتی ہے۔ دوسرے کو دھوپ میں رکھ دیتی ہے اور بقیہ سینے لگتی ہے۔ جب انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں تو دھوپ میں رکھے ہوئے انڈوں سے رقیق مادہ نکلنے لگتا ہے، اسے وہ بچوں کو پلاتی ہے۔ جب بچے کچھ توانا ہو جاتے ہیں تو ریت میں دبے ہوئے انڈوں کو توڑ دیتی ہے ان پر مکھیاں، مچھر اور دوسرے کیڑے مکوڑے آکر بیٹھتے ہیں جو ان بچوں کی خوراک بن جاتے ہیں۔

تیتر۔ کی یہ عادت ہے کہ جب اسے اندیشہ ہو کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے تو وہ دم سے اپنے پیروں کے نشانات مٹاتا جاتا ہے تاکہ تعاقب کرنے والا اس کے پاؤں کے نشان نہ دیکھ سکے۔

لومڑی جب بھوکی ہوتی ہے اور کوشش کے باوجود اسے کچھ کھانے کو نہیں فراہم ہوتا ہے تو وہ چاروں شانے چت لیٹ جاتی ہے اور مرنے کی اداکاری کرتی ہے۔ پرندے اس کے پاس آتے ہیں اور اسے مردہ سمجھ کر چونچ مارتے ہیں تو جھپٹ کر دبوچ لیتی ہے۔

اونٹ کے لیے صاف و شفاف پانی شراب جیسی تاثیر رکھتا ہے اس کی چال میں لغزش پیدا کر دیتا ہے اس لیے اس جانور کو کھاری پانی جس میں نمک موجود ہو بہت مرغوب ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

• غذا کی ابتدا اور انتہا نمک پر کرو. کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نمک میں ستر، بیماریوں کی شفا رکھی ہے۔

• گرم گرم کھانا کھانے سے معدہ ضعیف ہوتا ہے۔

• غذا کے تین حصے کرو. ایک حصہ کھانے کا ایک حصہ پانی کا اور ایک حصہ سانس لینے کے لئے چھوڑ دو. بہت کھانے سے ہیضہ. تخمی. کاہلی سستی پیدا ہوتی ہے. مطالعہ کتب میں دل نہیں لگتا۔ طبیعت میں رحم اور مہربانی ختم ہوجایا کرتی ہے اس لئے حضور صلعم نے ڈکار سے نفرت فرمائی ہے. زیادہ کھانا عبادت کرنے سے باز رکھتا ہے. اولاد کند ذہن پیدا ہوتی ہے۔

• تکیے کے سہارے بیٹھ کر کھانا نہ کھاؤ کیونکہ اس سے بدہضمی پیدا ہوتی ہے.

• سرکہ کھایا کرو کیونکہ یہ ہاضم طعام ہے. پیٹ کے کیڑے مارتا ہے. بھوک لگاتا ہے.

• گوشت کو چھری سے کاٹ کر نہ کھاؤ بلکہ چبا چبا کر کھاؤ۔ بقول حکماء اطباء چالیس مرتبہ چبا کر کھاؤ. (انگلو)

• پھونک کر نہ خود کھاؤ نہ دوسروں کو کھلاؤ۔

• خلال وہ استعمال کرو جس کا مزہ تلخ ہو. خوشبودار لکڑی سے خلال نہ کرو کیونکہ اس سے مرض جذام پیدا ہوتا ہے جن سے خلال کرنے کی ممانعت ہے وہ ذیل ہے

انار کی شاخ۔ بانس۔ چاندی۔ سونا۔ پیتل۔ تانبہ۔ قلم۔ نیزہ۔ امرود۔ سیب۔ ناشپاتی۔ انجیر۔ منقی۔ کشمش۔

• کدو کھاؤ۔ اس کے استعمال سے دماغ بڑھتا ہے۔ دل کا غم دور ہوتا ہے۔ پیٹ کو نرم کرتا ہے۔ سدہ کھولتا ہے۔ گرم مزاج والوں کو بہت اکسیر ہے۔ دق کے مریض کو بھی نفع پہونچاتا ہے۔

• گوشت کے استعمال سے گلا اور حلق صاف ہوتا ہے۔ فرحت قلب حاصل ہوتی ہے۔ ضعف بدن کی شکایت رفع ہوتی ہے۔ اگر گوشت کو دودھ میں پکا کر کھایا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

• انجیر کھایا کرو کیونکہ اس سے طبیعت ملائم رہتی ہے۔ ورم جگر کو دور کرتا ہے۔ بواسیر کا مادہ خارج ہوتا ہے۔ منھ کی گندگی دور ہوتی ہے۔ درد قولنج کو نافع ہے۔ مرگی اور فالج کو بھی نفع پہونچاتا ہے۔ پیشاب بہ آسانی آتا ہے۔ اس کا شربت کھانسی کو مفید ہے۔

• دھوپ کے پانی سے غسل نہ کرو کیونکہ اس سے مرض برص پیدا ہوتا ہے۔

• کھجور کھایا کرو کیونکہ یہ امراض معدہ کو نافع ہے۔ اگر کوئی شخص روزانہ صبح کو سات کھجوریں کھا لیا کرے تو وہ زہریلی چیزوں کے اثر سے بچا رہتا ہے۔ خون صالح پیدا کرتا ہے۔ جسم فربہ کرتا ہے۔ مرطوب طبائع کو زیادہ نافع ہے۔

اوہام شکن نمبر

حجاب کا اوہام شکن نمبر ان شاء اللہ نومبر ۱۹۸۹ء میں شائع ہوگا لیکن اس کے لئے آپ ابھی سے ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ آپ اپنے گرد و پیش پھیلے ہوئے اوہام لکھ کر ہمارے پاس بھیجدیں۔ ہم انھیں ترتیب دے کر شائع کردیں گے یہ کام آپ ابھی کریں۔ ہمارا تجربہ ہے کہ بہت سے اچھے مضامین محض اس لئے خاص نمبر میں شائع نہیں ہوسکے کہ وہ بروقت نہیں مل سکے لہذا آپ تساہل نہ فرمائیں۔ (م)

کارآمد باتیں

حکمت کی ڈائری سے

۱. اگر کپڑے پر کسی چکنی چیز کا داغ پڑ جائے تو پٹرول میں برش تر کر کے صاف کرلیں۔

۲. اگر کپڑے پر گھی، موم یا چربی وغیرہ گر جائے تو فاضل موم وغیرہ کو چاقو سے کھرچ کر کپڑے کے نیچے اوپر بلاٹنگ پیپر رکھ کر گرم استری پھیر دیں۔ دو چار مرتبہ بلاٹنگ پیپر بدل بدل کر یہ عمل دہرائیں، تمام چربی یا موم وغیرہ پگھل کر بلاٹنگ میں جذب ہو جائے گا۔ بعد میں پٹرول سے کپڑے کو صاف کرلیں۔

۳. جست کی بالٹیاں یا دوسرے برتن میلے یا بدنما ہو جاویں تو ایک حصہ عمدہ صابن (کپڑے دھونے کا)، دو حصے مٹی کا تیل پانچ حصے پانی میں صابن حل کر کے ملالیں اس مرکب کو برتن پہ اچھی طرح مل کر کسی کھردرے کپڑے سے رگڑ کر صاف کرلیں بالکل نیا جیسا صاف و چمکدار ہو جائے گا۔

۴. المونیم یا ٹین وغیرہ کی چیزیں داغدار یا میلی ہو گئی ہوں تو ایک حصہ چاک مٹی ۲۰ حصے پسا ہوا نمک ملا کر کسی کپڑے وغیرہ کی گدی پر لگا کر خوب رگڑیں۔ داغ دھبے دور ہو جائیں گے۔

۵. فلیٹ کیپ پر اگر داغ پڑ جائیں تو باریک پسا ہوا شیشہ کسی چمڑے کے ملائم ٹکڑے پر لگا کر رگڑیں۔ ٹوپی صاف ہو جائیگی۔

۶. لکڑی کا کوئلہ باریک پسا ہوا پانی میں گھول کر گلدان میں ڈال کر پھولوں کے گلدستے میں لگا دیں تو پھول تین چار دن تک بالکل تر و تازہ رہیں گے۔ ایک

گدان میں دو یا تین تولہ کوئلہ کافی ہے۔

۷۔ خربوزے کے چھلکے خشک کر کے باریک پیس لیں، تھوڑا سا ہانڈی میں ڈالنے سے سبزی گوشت وغیرہ جلد گلتا ہے اور خستہ ولذیذ ہو جاتا ہے۔ اگر آٹے یا میدہ میں ملا کر گوندھیں تو خمیر جلد اُٹھ جاتا ہے۔

۸۔ آم کی گٹھلیوں کی گری نکال کر خشک کر کے باریک پیس لیں۔ دست بند کرنے کی بہترین دوا ہے۔ تین ماشے پانی سے کھلائیں اگر قدرے کالا نمک اور مرچ سیاہ ملا لیں تو لذیذ چورن بن جاتا ہے۔ اس کی گٹھلیوں کی گری کا تیل خضاب کا کام دیتا ہے۔

۹۔ کپڑے پر روشنائی کے داغ پڑ جائیں تو ایک ماشہ آگزالک ایسڈ تین تولہ پانی میں ملا کر برش یا اسفنج سے تر کر کے صاف کریں۔ اگر ہلکا داغ رہ جائے تو ہائیڈروجن پراوکسائیڈ سے صاف کریں۔

۱۰۔ مارکنگ انک کا نشان پوٹاشیم سائنائیڈ کے ہلکے محلول سے صاف کر کے لائیکر ار امیونیا سے دھوئیں۔ قلعی صاف ہو جائیگا پوٹاشیم سائنائیڈ خطرناک زہر ہے۔ ہوشیاری سے استعمال کریں۔

۱۱۔ سرخ یا زرد پھول کا رنگ تبدیل کرنا ہو تو گندھک کا دھواں دیں، رنگ بدل جائے گا۔

۱۲۔ پان کے داغ اور دوسرے بہت سے دھبے گندھک کا دھواں دینے سے دور ہو جاتے ہیں۔

۱۳۔ چھتریاں میلی ہو جائیں یا کیچڑ وغیرہ کے دھبے پڑ جائیں تو پہلے صابن کے محلول سے صاف کریں۔ پھر پانی میں لائیکر ار امیونیا ملا کر برش سے رگڑیں بالکل صاف ستھری ہو جائے گی۔

۱۴۔ مٹی کے برتن کو واٹر پروف بنانا ہو تو ہارڈ پیرافین (موم بتی کا موم) برتن کو آگ پر گرم کر کے برتن میں ڈال دیں پگھلنے پر چاروں طرف گھمائیں سب طرف لگ جائے اور پیرافین اچھی طرح جذب ہو جائے تو باقی کو واپس لوٹا دیں۔ سرد ہونے پر استعمال کریں۔ بالکل چینی کے برتن جیسا کام دے گا۔

روسی افسانہ

دوہری انا، دو ویرانیاں

کیفے گاہکوں سے بھر چکا تھا۔ باتوں کی گونج اور برتنوں کی کھنک سے ہال میں ایک شور برپا تھا۔ مسز بشپ اکتا کر اپنی جگہ سے اٹھی۔ بل ادا کیا اور باہر نکل آئی۔ آسمان پہ بادل گھرے ہوئے تھے ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہو گئی تھی سڑک کے کنارے کی روشنیاں مدھم پڑ گئی تھیں۔ مسز بشپ ماحول کو خوشگوار محسوس کرتے ہوئے کچھ دور تک پیدل چلتی رہی

گلی کی نکڑ پر پہنچ کر اس نے اپنا پرس دیکھا۔ بل ادا کرنے کے بعد صرف ستاسی سینٹ بچے تھے۔ اس رقم میں کوئی ٹیکسی ڈرائیور اسے اسٹریٹ تک پہنچانے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت مسز بشپ نے اس ذہنی کوفت کا اندازہ کیا جو ضرورت کے وقت روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے لاحق ہو جاتی ہے۔ وہ برج میں کافی پیسے ہار چکی تھی۔ وہ پچھتا رہی تھی کاش میں برج میں نہ کھیلتی رات زیادہ گذر چکی تھی اس لئے بس کے ملنے کا امکان نہ تھا۔ صرف ایک ٹرام باقی رہ گیا تھا۔ لیکن ٹرام اسٹیشن تک پہنچنے کے لئے تقریباً ایک فرلانگ پیدل چلنا پڑتا تھا۔ اب اس نے محسوس کیا کہ موسم غیر معتدل ہے، سر میں درد بھی تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر کھڑی ہوئی ٹریفک کے آنے کا انتظار کر رہی تھی اشارہ بدلتے ہی وہ ٹرام اسٹیشن کی طرف چل پڑی۔

آج اسے اپنے اوپر بڑا ترس آرہا تھا۔ زمانہ دوشیزگی میں وہ اپنے مستقبل کے بارے میں بڑے حسین خواب دیکھا کرتی تھی۔ میرے پاس بے حساب دولت ہوگی جسے میں اپنے مرغوبات پر صرف کر سکوں گی۔ ایک سے ایک پوشاک ہوگی۔ ہیر دل سے مرصع زیور ہوگا۔ اعلیٰ قسم کی کار ہوگی۔

یکایک اسے خیال آیا کہ آجکل تو بہت زیادہ لوگ تنگی حال کے شاکی ہیں۔ اس خیال سے اس کو کسی قدر تسکین ہوئی مگر وہ سوچنے لگی کہ دولت پاکر کھو دینا اور بات ہے اور اس سے بالکل محروم رہنا دوسری بات ہے اس نے فیصلہ کیا کہ اب کبھی ایک ڈالر سے کم لے کر گھر سے نہ نکلوں گی خدا نہ کرے کوئی حادثہ ہی پیش آجائے، لیکن کس قسم کا حادثہ؟ اس کے متعلق وہ اپنے دماغ میں کچھ متعین نہ کر سکی۔ تاہم حادثہ کا خیال آتے ہی اور زیادہ مضطرب ہو گئی۔

مسز بشپ متوسط درجہ کی خاتون تھی۔ شوہر اس کی دلداری میں کوئی کمی نہ کرتا تھا۔ ہر بات کا خیال رکھتا۔ ہر مد کے لئے اسے مناسب رقم دیتا رہتا تھا۔ کئی سال قبل میاں بیوی نے ایک مشترکہ بجٹ بنایا تھا لیکن اخراجات کے معاملے میں دونوں غیر محتاط واقع ہوئے تھے لہٰذا زیادہ دنوں تک اس پر کاربند نہ رہ سکے۔ پھر بھی رابرٹ بشپ کچھ نہ کچھ رقم پس انداز کر لیتا تھا۔ اس لئے بیوی جب کبھی اس سے رقم طلب کرتی تو انکار نہ کرتا ایسے موقع پر شکر گزار ہونے کے بجائے دل میں کہنے لگتی کہ مرد کتنے خود غرض ہوتے ہیں اپنی شریک زندگی کی ضرورتوں کا لحاظ کئے بغیر چپکے چپکے اپنے لئے روپیہ جمع کرتے رہتے ہیں۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ شوہر سے اپنا جیب خرچ مقرر کرائے گی۔

اس خیال سے اسے قدرے سکون ملا۔ اور وہ تیز تیز چلنے لگی۔ ٹرام اسٹاپ

ر زیادہ دیر منتظر نہ رہنا پڑا۔ تھوڑی دیر
یں ٹرام آگئی اور اسے لیکر آگے روانہ
ہو گئی۔

اسٹریٹ ۱۵۸ کے اسٹاپ پر بہت
سے مسافر ٹرام میں آگھسے ایک شخص بالکل
روازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس
سے باہر کا منظر مسز بشپ کی نظروں سے
وجھل ہو گیا تھا وہ ٹرام کی گھٹن سے گھبرا کر
ب باہر دیکھنا چاہتی تو اس آدمی پر نگاہ
پڑ جاتی یہ اونچے قد اور دبلے بدن کا انسان
ڈھیلا ڈھالا بے ہنگم سا پرانا اور لمبا اوور کوٹ
پہنے ہوئے تھا۔ اوپر کا بٹن شاید دوبارہ
لگایا گیا تھا۔ کیونکہ جس دھاگے سے اسے ٹانکا
لیا تھا وہ کوٹ کے ہم رنگ نہیں تھا۔
کوٹ کی خستہ حالت دیکھ کر مسز بشپ
نے آدمی کی طرف نگاہیں گاڑ دیں۔ اس کے
ہاتھ لمبے اور دبلے ہوئے تھے انگوٹھے
اور اس کے قریب کی انگلی کے اندر کی
طرف سے ڈھکے تھے اور دبے
ہوئے تھے۔ یہ شاید بہت زیادہ

گھسنے کی وجہ سے تھا۔ وہ اس نتیجہ پر
پہنچی کہ وہ ایک شریف النفس انسان ہے
اور اہل و عیال کا بڑا بار اٹھائے ہوئے
ہے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے مصارف
پورے کرنے کے لئے اسے غیر معمولی
محنت کرنی پڑتی ہے۔ اپنی دیکھ بھال
پر وہ کچھ صرف نہیں کرتا، جو کچھ کماتا ہے
انہیں پر خرچ کر دیتا ہے وہ کچھ یوں محسوس
کر رہی تھی کہ اس شخص کے دماغی انتشار کی
سب سے بڑی وجہ اس کی بیوی ہے
جو اسے ذہنی سکون دینے کے بجائے
اس کی مشکلات میں اضافہ کرتی رہتی ہے
مسز بشپ کو اس شخص سے ایک گونہ
ہمدردی ہو گئی اس نے سوچا کہ میں ایک
ہلکی سی مسکراہٹ سے اس شخص کو تھوڑی
سی مسرت دے سکتی ہوں۔ چنانچہ ٹرام
سے اترتے وقت اس نے اس آدمی
کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ اس شخص نے اپنا
منہ دوسری طرف پھیر لیا۔
مسز بشپ گھر پہنچی تو اس کے دماغ

میں اسی قابلِ رحم انسان کی پریشانی چکر لگا رہی تھی۔ چند لمحے وہ اپنے کمرے میں خاموش بیٹھی رہی پھر اٹھ کر شوہر کے کمرے کی طرف چلی پہلے اس نے دروازے کی طرف جھانک کر دیکھا۔ رابرٹ ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ غالباً اخبار پڑھتے پڑھتے نیند آگئی تھی۔ اخبار اس کے چہرے پر پڑا ہوا تھا۔ خاتون نے اس کی طرف غصے سے بھرے ہوئے جذبات کے ساتھ دیکھا یہ شخص میرا ذرا بھی خیال نہیں کرتا پیسوں کے کم ہونے کی وجہ سے مجھے کیسی تکلیف اٹھانا پڑی اتنے پیسے بھی میرے پاس نہ تھے کہ ٹیکسی کرایہ کر کے گھر تک آجاتی۔ کتنا شریف تھا وہ آدمی جو اپنے اہل و عیال کے آرام و آسائش کی خاطر اپنا کچھ خیال نہیں کرتا۔ کتنا پرانا تھا۔ اس کا کوٹ ایک بٹن تو ٹھکانے سے ٹکا ہوا بھی نہیں تھا۔ غصے میں اس نے شوہر پر سر سے پاؤں تک نگاہ ڈالی۔

کئی سال پہلے جب ان کی شادی ہوئی تھی۔ رابرٹ کبھی کبھی کھانے کی میز پر ڈنر سوٹ میں آیا کرتا تھا۔ قیمتی مشروبات اڑائے جاتے تھے اور وقت ہنسی خوشی میں گزرتا تھا۔ خاتون سوچ رہی تھی کہ جو شفقت رابرٹ کو ابتدا میں میرے ساتھ تھا اس میں کمی آگئی ہے وہ میری طرف سے بے پروا ہوگیا ہے۔ میں اس کی یہ بے اعتنائی برداشت نہیں کر سکتی اسے بیلا ہارڈی کا خیال آگیا جو شرابی ہونے کے باوجود اپنی بیوی کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ وہ جھنجھلا گئی۔ اس کا جی چاہا کہ رابرٹ کے چہرے پر پڑا ہوا اخبار اٹھا کر پرزے پرزے کر ڈالے۔ غصہ اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ کچھ دیر وہ دروازے میں کھڑی اپنے مشتعل جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی پھر کمرے میں داخل ہوئی اور بے پروائی سے چلتی ہوئی ایک کھڑکی کے پاس آئی اور زور سے اس کے پٹ کھول دیے اس آواز سے رابرٹ

نک پڑا۔

"آہا، مولی! تم آگئیں" (وہ بیوی کو مولی کہتا تھا)

"ہاں ابھی ٹرام سے اتری ہوں" مولی نے چڑچڑے پن سے جواب دیا

وہ رابرٹ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر غصّے اور شکایت کے لہجے میں بولی۔

"دیکھو رابرٹ یہ کتنی بری بات ہے مجھے کیفے سے نکل کر بارش میں بھیگنا پڑا۔ میرے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ ٹیکسی کر کے گھر تک پہنچ جاتی اُفوہ! ہوا کتنی سرد تھی۔ ستاسی سینٹ تھے، صرف ستاسی سینٹ۔

"ارے یہ تو برا ہوا" رابرٹ نے ...ں کے ساتھ کہا "اچھا کچھ رقم مجھ سے لو"

یہ کہہ کر رابرٹ نے قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ ڈالر کا نوٹ نکال بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

مولی نے سر ہلا کر کہا "نہیں رابرٹ یہ بات نہیں ہے۔ میں اس وقت کچھ نہیں مانگتی مگر یہ کہتی ہوں کہ تم مجھے ہر مہینے جیب خرچ کے نام سے علیحدہ رقم دے دیا کرو"

"کیا میں تمھیں ماہانہ خرچ نہیں دیتا ہوں" رابرٹ نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

"یہ ٹھیک ہے، میں کب اس سے انکار کرتی ہوں۔ لیکن تم گھر کے خرچ کے لئے دیتے ہو۔ اسے میں اپنی ذاتی رقم نہیں سمجھتی۔ میں تو بندھی ٹکی رقم جیب خرچ کے لئے چاہتی ہوں"

"لیکن مولی! اگر میں جیب خرچ دے بھی دیا کروں، تو تم اسے دس دن میں ختم کر لو گی"

"واہ! تم مجھے بالکل نادان بچی سمجھ رہے ہو۔ کیا میں اپنا برا بھلا بھی نہیں سمجھ سکتی۔ رابرٹ تم میرے ساتھ بڑی زیادتی کر رہے ہو۔ میں جیب خرچ

ضرور لوں گی۔ تمھیں میری بات ماننا پڑے گی"

رابرٹ اس دوران محض شغل کے طور پر نوٹ کو الٹتا پلٹتا رہا۔ جب بیوی خاموش ہو گئی تو بولا۔

"اچھا تمھیں کتنے دام ماہانہ ملنے چاہئیں؟"

"پچاس ڈالر کم از کم" مولی کا لہجہ تحکمانہ اور قدرے ترش تھا "میں اس میں گذارا کر لوں گی۔"

"پچاس ڈالر" رابرٹ نے تعجب سے کہا۔ وہ بے دلی سے کھانستا اور کچھ دیر سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر بولا "بہتر ہے لیکن اس مہینے مجھے کئی مطالبات ادا کرنا ہیں۔ اگر تم اگلے مہینے کی پہلی تاریخ تک انتظار کر سکو، تو میں پیش کر دوں گا۔"

"یہ مانا" مولی نے اپنی فتح کا احساس چھپاتے ہوئے کہا "لیکن دیکھو رابرٹ تنخواہ کا حساب کرتے وقت کہیں بھول نہ جانا"

یہ کہتی ہوئی وہ اپنا کوٹ اتارنے کے لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ رابرٹ خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر اخبار دیکھنے لگا۔

مولی تھوڑی دیر بعد پھر شوہر کے کمرے میں آگئی وہ پہلے کی طرح آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ اسے غنودگی آگئی تھی۔ اخبار ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا تھا۔ کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ مولی اسے بند کرنے کے لئے بڑھی۔ راستے میں میز پر رابرٹ کا لمبا اونی کوٹ پڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر مولی کو ٹرام کا عیال دار پریشان حال آدمی یاد آگیا۔ وہ کھڑکی کی طرف جانے کے بجائے کوٹ کو دیکھنے لگی۔ کوٹ پرانا ہو چکا تھا۔ اس کی ساری رونق جاتی رہی تھی۔ مولی نے کوٹ کے بٹن دیکھے وہ سب میلے ہو چکے تھے۔ ایک بھی بٹن کسی کاریگر کے ہاتھ کا لگا ہوا نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جب کوئی بٹن الگ ہو گیا

پہننے والے کو جس رنگ کا دھاگا مل
گیا اس نے ٹانک لیا۔ ہر بٹن کا دھاگا
دوسرے رنگ کا تھا۔

اب مولی کی دلچسپی اور بڑھی وہ شوہر
کے سیدھے ہاتھ کی انگلیاں دیکھنے لگی
انگوٹھا اور اس کے قریب کی انگلی کے
سرے ٹرام والے آدمی کی انگلیوں
سے زیادہ گھسے اور اندر دبے
ہوئے تھے۔ پھر اس کی نظر پیروں
پر پڑی۔ مولی نے یہ پہلی مرتبہ غور کیا
کہ رابرٹ جو چپل پہنے ہوئے تھا۔
وہ اتنے چھوٹے ہیں کہ ایڑیاں چپل سے
باہر نکلی ہوئی رہتیں۔ وہ سکتے میں رہ
گئی اس نے دوبارہ شوہر کے چہرے
پر نظر ڈالی، چہرے سے اضمحلال
برس رہا تھا۔

مولی اپنی جگہ پر کھڑی ہو کر خدا معلوم
کیا سوچنے لگی۔

پھر بڑھ کر اس نے اپنے شوہر
کی اداس پیشانی چوم لی۔ (تیج سے)

"گوبھی پلاؤ"

چاول (سیلا) ۵۰۰ گرام

چاولوں کو صاف کر کے دھولیں اور
دو گھنٹے کے لئے بھگو دیں۔ گوبھی کے
درمیانہ سائز کے ٹکڑے کر کے دھولیں
پتے اور ڈنٹھل کاٹ کر پھینک دیں۔
ٹماٹروں کو دھو کر باریک ٹکڑوں میں کاٹ
لیں۔ ہری مرچوں کو سل پر پیس لیں
پیاز چھیل کر لچھے کاٹ لیں۔

ایک دیگچی میں گھی ڈال کر آنچ پر
رکھ دیں۔ گھی گرم ہو جائے تو اس
میں گوبھی کے ٹکڑے ڈال دیں۔ دو
چار منٹ تل کر گھی سے نکال لیں۔ پھر اسی
گھی میں پیاز کے لچھے ڈال دیں۔ پیاز
بادامی ہو جائے تو اس میں ٹماٹر ہری مرچ
گرم مسالہ، ادرک، لہسن اور نمک ڈال
دیں۔ ٹماٹروں کا پانی بھن جائے تو
چاول ڈال کر دو چار منٹ بھون لیں
پھر چاول کے گلنے کے انداز کا پانی
ڈال کر



موسم گرما میں کیری یعنی کچے آم بکثرت بازار میں آجاتے ہیں کیونکہ یہ آندھی سے گرتے رہیں. میں ان کے استعمال کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں. مجھے یقین ہے آپ پسند کریں گی.

<u>آم کا تیل والا اچار</u> (۱) ہلدی پسی ۵۰ گرام. (۲) دھنیا کٹا ۵۰ گرام (۳) سونف ۲۵۰ گرام. (۴) رائی ۲۰۰ گرام (۵) کچے آم ۴ کلو (۶) میتھی ۵۰ گرام (۷) نمک پسا ایک کلو (۸) سرسوں کا تیل ۳ کلو.

کچے آموں کو اچھی طرح دھو کر پھانکیں کاٹ لیں. اب مسالوں کو پیس کر مرتبان میں بھر لیں. تیل کو گرم کر کے اس میں ڈال دیں. مرتبان میں تیل اس قدر ہو کہ پھانکیں ڈوب جائیں. اب اس اچار کو دھوپ میں رکھ دیں. ۲۰-۲۱ دن میں اچار تیار ہو جائے گا. اب اس کو استعمال کریں.

<u>آم کا میٹھا اچار</u> (۱) نمک ایک کلو (۲) گڑ ۲ کلو (۳) آم کچے ۲ کلو (۴) مرچ ۵۰ گرام (۵) دھنیا ۲۵ گرام.

آم کا چھلکا اتار کر گٹھلی نکالیں پھر نمک ملا کر ان آموں کو دھوپ میں رکھ دیں، دھوپ میں رکھنے سے جو پانی چھوٹ جائے اسے پھینک دیں. پھر آموں میں گڑ اور مسالے ملا کر برتن کو دھوپ میں رکھ دیں، گڑ پگھلنے پر آموں کو اچھی طرح ہلا دیں، آم کا میٹھا اچار تیار ہے.

:- لیموں کا میٹھا اچار :-

لیموں کی چار چار پھانکیں جڑی ہوئی کاٹیں اور نمک ملا کر مرتبان میں بھر دیں پھر گڑ کی چاشنی بنا کر اس میں ڈال دیں. اب سب مسالے کوٹ کر چھان کر اس میں ڈال دیں. اب سے دو مہینے بعد اچار تیار ہو جائیگا.

مالک، پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر محمد اسحٰق نائل خیر آبادی مطبوعہ ... کے پرنٹرز دہلی. مقام اشاعت محلہ بارہ دری گھوسی

خواتین اور طالبات کا پاکیزہ ماہنامہ

حجاب

رامپور

۱۲۱/۲۱۶

حجاب
رامپور

اس دائرے میں سُرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ نے حجاب کے لیے جو زرِ تعاون عنایت فرمایا تھا اس کی مدت اس پرچے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ جلد از جلد زرِ تعاون ارسال فرمائیں گے۔ ہم آپ کے زرِ تعاون کے منتظر ہیں۔ والسلام۔ منیجر حجاب رامپور یو۔پی۔ 244901

جون ۱۹۷۹ء رجب ۱۳۹۹ھ

جلد ۹ شمارہ ۱۰۸

ایک شمارہ -/3 سالانہ چندہ -/26 وی پی سے V.P -/30

کتبہ۔ الیاس حسین

در پردۂ حجاب

اداریہ

ایمانیات

مقالات ومضامین

افسانے اور کہانیاں

منظومات

صحت و تندرستی

ہمارا گھر

تراشے

مولانا مودودی

تاریخ و سیر

رسُولوں کو

عینُ الیقین کی تربیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فارسی میں ایک مثل ہے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ یعنی سنی ہوئی بات دیکھی ہوئی بات کا درجہ نہیں رکھتی۔ سنی ہوئی بات کے بارے میں شبہ بھی کیا جا سکتا ہے لیکن جو بات آنکھ سے دیکھ لی جاتی ہے اس پر پورا پورا یقین ہوتا ہے۔ یہی عین الیقین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو عین الیقین کا درجہ عطا فرمایا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لیجیے۔ حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالےٰ نے طور پر اپنا جلوہ دکھایا۔ آپ سے باتیں کیں۔ کچھ معجزے عطا فرمائے۔ حضرت ابراہیمؑ کی درخواست پر اللہ تعالیٰ نے انھیں موت کے بعد زندگی کا نمونہ ایک چڑیا کے ذریعہ دکھایا۔ قرآن میں اس طرح کی نشانیوں کا ذکر موجود ہے۔ اسی عین الیقین کی غرض سے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمانوں کی سیر کرائی۔ قرآن مجید کی سورہ بنی اسرائیل کے شروع میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ ایک رات اپنے بندے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کو کعبے سے بیت المقدس تک لے گیا۔ تاکہ آپ کو اپنی نشانیاں دکھائے" حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا کیا دکھایا۔ تفصیل بہت دلچسپ ہے۔ اور اس سے بہت ہی عبرتناک باتیں سامنے آتی ہیں اس لیے ہم معراج شریف کے واقعے کو احادیث کی مدد سے ترتیب دے کر پیش کرتے ہیں۔ ہم صرف وہ باتیں چُن رہے ہیں جن سے پورا واقعہ سامنے آ جائے۔ ساری باتوں کو سمیٹنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

رجب کی ستائیس تاریخ تھی۔ رات کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کعبے کے پاس

سو رہے تھے۔ اچانک حضرت جبریل علیہ السلام آپ کے پاس تشریف لائے۔ حضرت جبریلؑ اللہ کے فرشتوں میں سب سے بڑے اور بزرگ فرشتہ ہیں۔ انھوں نے آپؐ کو جگایا۔ آپؐ کے سامنے براق پیش کیا۔ بُراق کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ وہ خچر سے کسی قدر چھوٹا تھا۔ (دراصل براق ایک نوری سواری تھی جس پر آپؐ نے سفر فرمایا تھا۔)

آپ بُراق پر سوار ہوئے۔ حضرت جبریلؑ ساتھ چلے۔ بیت لحم پہنچے۔ حضرت جبریلؑ نے بتایا کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کی جگہ ہے۔ بیت لحم سے چل کر مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) پہنچے۔ وہاں پہنچ کر آپ بُراق سے اترے۔ مسجد کے اندر تشریف لے گئے۔ مسجد میں اللہ کے سارے نبی موجود تھے۔ سب نماز کے لیے تیار کھڑے تھے۔ صفیں درست ہو چکی تھیں۔ انتظار یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کس نبی کو نماز پڑھانے کا حکم دیتا ہے۔ حضرت جبریلؑ نے آپؐ کا ہاتھ پکڑ کر امامت کے لیے آگے بڑھا دیا۔ آپؐ نے نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد حضرت جبریلؑ ایک نورانی سیڑھی کے ذریعہ آسمان پر لے گئے۔ سیڑھی کو عربی زبان میں معراج کہتے ہیں اس لیے آسمانوں کا یہ سفر "معراج" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے آسمان پر پہنچے۔ وہاں فرشتوں نے پوچھا "کون ہے؟" حضرت جبریلؑ نے بتایا کہ اللہ کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپؐ کا نام سنا تو پہلے آسمان کے فرشتوں نے مبارکباد پیش کی۔

ایک ایک کرکے آپ ساتویں آسمان پر پہنچے۔ ساتویں آسمان کے آگے ایک مقام ہے "سدرۃ المنتہیٰ" سدرۃ المنتہیٰ پر حضرت جبریلؑ رک گئے۔ آپ سے عرض کیا کہ اب آگے آپؐ اکیلے سفر کریں گے۔ حضورؐ اکیلے آگے بڑھے۔ آسمانوں کی انتہائی بلندی پر پہنچے۔ اللہ کے سامنے حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ اللہ نے آپؐ سے باتیں کیں۔ اللہ نے آپؐ کو کچھ باتیں عطا

وہاں میں پانچ وقت کی نماز کا تحفہ عظیم عطا فرمایا۔ اس کے بعد آپ واپس ہوئے۔ سدرۃ المنتہیٰ پر حضرت جبرئیلؑ، آپ کا راستہ دیکھ رہے تھے انھوں نے مبارکباد پیش کی۔ پھر ساتھ لے چلے جنت، دوزخ، جنت کی نعمتیں اور دوزخ کے عذاب دکھاتے اور آسمانوں کی سیر کراتے ہوئے نیچے اُترے۔ آپ کو براق پر بٹھایا اور کعبے میں اسی جگہ پہنچا دیا جہاں آپ سو رہے تھے

صبح کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو معراج کا حال سنایا۔ جو کچھ دیکھا تھا بیان فرمایا۔ اللہ کے نیک بندوں کو جنت کی خوشخبری سنائی۔ نافرمانوں کو دوزخ کے عذاب کا ذکر کر کے ڈرایا رات کی رات یہ سب ہو جانا اور واپس آنا ایک ایسا انوکھا نرالا اور عجیب و غریب واقعہ تھا کہ جس نے سنا وہ حیران رہ گیا۔ مکے کے کافر تو حضورؐ کا مذاق اڑانے کا بہانہ ہی ڈھونڈا کرتے تھے انھوں نے آپ کی خوب ہنسی اڑائی۔ ناممکن ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ واقعہ کچھ ایسا تھا کہ کچھ مسلمانوں کے ایمان بھی خطرے میں پڑ گئے۔ ابوجہل آپ کی ہنسی اڑانے میں پیش پیش رہتا تھا۔ اس نے کہا ٹھیرو میں ابھی آتا ہوں۔ وہ نہایت ذہین آدمی تھا اس نے سوچا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سب سے بڑے عاشق ابوبکر (رضی اللہ عنہ) ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اس واقعے کو ناممکن قرار دیں تو بہت سے مسلمان حضورؐ کو جھٹلا دیں گے۔ وہ سیدھا ابوبکرؓ کے گھر پہنچا۔ ان سے ملا اور کہا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ راتوں رات آسمان کی سیر کر آیا تو اسے آپ کیا کہیں گے۔ ابوبکرؓ نے جواب دیا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ جب یہ کہلوا لیا تو ابوجہل بولا۔ تمہارے صاحب (حضرت محمدؐ) تو یہی کہتے ہیں۔ یہ سن کر ابوبکرؓ نے کہا۔ اچھا، اگر حضورؐ یہ کہتے ہیں تو بالکل ٹھیک ہے۔ حضورؐ کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں میں تو کتنے دن دیکھا کرتا ہوں کہ جبرئیلؑ آپ کے پاس آتے ہیں، اچھا چلو مجھے حضورؐ کے پاس لے چلو۔

ابوجہل حضرت ابوبکرؓ کو حرم شریف میں لے گیا۔ یہاں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ حضورؐ معراج کا

حال بیان فرمارہے تھے۔ کافر ہنسی اڑا رہے تھے۔ مسلمان حیران کھڑے تھے۔ ابوبکرؓ نے جاتے ہی حضورؐ سے پوچھا: "یارسول! آپ بیت المقدس گئے؟"

آپؐ نے جواب دیا "ہاں" ابوبکرؓ نے پوچھا "بتائیے، اس کے کتنے در اور دروازے ہیں؟"

حضورؐ نے بیت المقدس کے در نہیں گنے تھے۔ آپؐ سوچ میں پڑ گئے۔ اس وقت حضرت جبریلؑ نے بیت المقدس آپؐ کے سامنے کر دیا۔ آپؐ نے گن کر بتا دیا۔ ابوبکرؓ نے کہا "آپ نے سچ کہا۔ اس کے بعد اور باتیں بھی پوچھتے رہے۔ حضورؐ جواب دیتے رہے۔ آپؐ کے ہر جواب پر ابوبکرؓ کہتے رہے "آپ سچ کہتے ہیں" — ابوبکرؓ نے کچھ اور ثبوت مانگے۔ آپ نے بتایا کہ ایک قافلہ آرہا ہے۔ لوگوں کا ایک اونٹ گم ہوگیا تھا۔ میں نے ان کو اس کا پتہ بتادیا۔ ایک شخص کی چھاگل سے پانی پیا۔

قافلے والے آئے۔ ان سے پوچھا۔ ان سب نے کہا "ہاں، ایسا تو ہوا تھا"

اس طرح سارے ثبوت تو ملے لیکن کافر یہی کہتے رہے کہ ثبوت تو ہیں مگر یہ ناممکن بات ہے کیسے ہو سکتی ہے؟ اب مسلمانوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اللہ بڑی قدرت والا ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

اس موقع پر جس خوبصورتی سے حضرت ابوبکرؓ نے کافروں کا منہ بند کیا اور اپنے ایمان کا کھلا ثبوت دیا تو زبان رسالت سے انھیں "صدیق" کا خطاب ملا۔

اسی معراج کی یاد میں مسلمان ہر سال رجبی شریف مناتے ہیں۔ جھوم جھوم کر معراج کے واقعات بیان کرتے اور سنتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کتنے ہیں۔ جن کے دل حضرت ابوبکرؓ کی طرح کھلتے ہیں افسوس تو یہ ہے ایسے عظیم واقعے سے مسلمان کوئی عملی نصیحت قبول نہیں کرتے۔ رجبی شریف دھوم دھام سے مناتے ہیں اور رجبی شریف ان کی بے عملی کو روتی ہوئی گذر جاتی ہے۔

اس وقت جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی۔ کہتے ہیں توحید کی آواز بلند ہوئے

بارہ سال بیت چکے تھے۔ آپ کے دشمن اسلامی تحریک کو دبانے کے سارے جتن کر چکے تھے۔ ان کی روک تھام کے باوجود اسلام کی آواز عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی تھی۔ عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جس کے دو چار آدمی اس تحریک سے متاثر نہ ہو چکے ہوں۔ خود مکے میں حضورؐ کے لیے دفاع کا جتھا بن چکا تھا جس کے کارکن اس تحریک کے لیے ہر خطرے سے ٹکرانے کو تیار تھے۔ مدینے میں اوس اور خزرج کے طاقتور قبیلوں کی بڑی تعداد اسلام کی حامی اور مددگار بن چکی تھی۔ اب وہ وقت آگیا تھا کہ اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکے سے مدینے لے جائے اور وہاں اسلامی ریاست قائم کر دے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے نبیؐ اور مسلمانوں سے جو کام لینا تھا اس کو مکمل کرنے کے لیے ہجرت سے ایک سال پہلے سورہ بنی اسرائیل نازل فرمائی۔ اس مبارک سورہ کی چند باتیں ہم نیچے پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ فرمایا:۔

"اور یہ لوگ (مکے والے) اس بات پر تلے ہیں کہ (اے نبیؐ!) تمہارے قدم اس سرزمین سے اکھاڑ دیں اور تم کو یہاں سے نکال دیں۔ اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں زیادہ دنوں ٹھیر نہ سکیں گے۔ (آیت ۷۶)

یہ آیت ایک طرح کی پیشین گوئی بھی ہے اور کافروں کے لیے تنبیہ بھی اور ایسا اصول بھی جو ہر نبی کے زمانے میں برتا گیا۔ یعنی اللہ کا نبی جب کسی بستی سے ہجرت کر جاتا ہے تو وہ بستی تباہ کر دی جاتی ہے۔ قرآن میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور تاریخ نے بھی ان حادثوں کو محفوظ رکھا ہے۔ اسی اصول کو اللہ تعالیٰ آیت ۷۷ میں یوں بیان فرمایا کہ:۔

"یہ ہمارا مستقل طریقہ کار ہے جو ان سارے رسولوں کے بارے میں ہم نے برتا، جن کو تم سے پہلے بھیجا تھا اور ہمارے طریقہ کار میں تم کوئی تغیر نہ پاؤ گے۔"

حضورؐ کی ہجرت کے بعد زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ پہلے مکے کے بڑے بڑے سردار جنگ بدر میں بری طرح قتل ہوئے۔ پھر تحریک اسلامی آگ کی طرح سارے عرب میں پھیل

سورۂ بنی اسرائیل کی پیشین گوئی حرف بحرف ثابت ہوئی۔ آیت ۸۰ میں ہے کہ

"اور اے نبی! دعا کرو کہ اے میرے رب! تو مجھے جہاں بھی لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال، اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔"

اس دعا سے ثابت ہوتا ہے کہ اب جلد ہی حضورؐ کو ہجرت کا حکم دیا جانے گا اور جلد ہی مسلمانوں کے ہاتھوں میں اقتدار آنے والا ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ اس کے بعد ہی حضورؐ کو ہجرت کا حکم ہوا۔ آپ مدینے تشریف لے گئے اور وہاں اسلامی ریاست قائم کر دی۔

"اور اعلان کردو کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔ (سورۂ بنی اسرائیل ۸۱)"

یہ اعلان اس وقت کیا گیا تھا جب مسلمان مکے کے اندر مظلوم تھے۔ ایسے لوگ جو کافروں کے ظلم سے پریشان ہو کر بستی سے مسلمان حبش کی طرف ہجرت کر چکے تھے۔ خود حضورؐ کی جان کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا۔ ایسی حالت میں کافروں نے اعلان سنا تو اسے ٹھٹھوں میں اڑا دیا مگر زیادہ عرصہ نہیں گزرے تھے کہ حضورؐ مسلمانوں کے ساتھ ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن حضورؐ کعبے کے بتوں کو اکھاڑ اکھاڑ کر پھینک رہے تھے اور ساتھ ساتھ یہ آیت اور تلاوت فرماتے جاتے تھے یعنی جاء الحق و زھق الباطل۔ ان الباطل کان زھوقا۔ حق آگیا باطل مٹ گیا اور باطل کو مٹنا ہی چاہیے۔"

نبی شریعت کے ماننے والوں کو چاہیے کہ معراج کے سلسلے میں سورۂ بنی اسرائیل کا مطالعہ خود کریں۔ علماء کرام بتاتے ہیں کہ معراج دراصل اس اقتدار اور عروج کی تمہید ہے جو مسلمانوں کو حاصل ہوا تھا۔ آج بھی دنیا میں مسلمانوں کی وہی حالت ہے جو مکے میں صحابہ کرام کی تھی تو کیا ہم پر لازم نہیں آتا کہ اسلامی غلبے کے لیے جان لڑا دیں یہاں تک کہ اسلام زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری ہو جائے۔ ہم بھی دعا کرتے ہیں اور اس کے لیے مسلمانوں کو معراج کی یاد دلاتے ہیں۔ اللہ ہمیں توفیق عطا فرما

یکم مارچ کو سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں ایک عظیم الشان تقریب منعقد کی گئی جس میں شاہ خالد بن عبدالعزیز نے اسلام کے لیے عظیم خدمات انجام دینے پر جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو پہلا بین الاقوامی شاہ فیصل شہید اعزاز دیا۔ یہ اعزاز طلائی تمغہ، سند توصیف اور دو لاکھ سعودی ریال پر مشتمل ہے۔ جماعت اسلامی کے ناظم دارالعروبہ مولانا خلیل حامدی نے مولانا مودودی کی جانب سے یہ اعزاز وصول کیا۔ اس موقع پر انھوں نے مولانا مودودی کی لکھی ہوئی تقریر پڑھی جس میں مولانا مودودی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر مسلمان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ انسانیت کی خدمت کے مشن کو پورا کرے۔ انھوں نے کہا کہ اسلامی تعلیمات انسانیت کی خدمت کا بہترین ذریعہ ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی خرابی صحت کی بنا پر اس تقریب میں شرکت نہ کر سکے۔ ان کی نمائندگی مولانا خلیل حامدی اور مولانا مودودی کے فرزند سید حسین فاروق مودودی نے کی۔ اس موقع پر شاہ خالد نے ان سے مولانا مودودی کی صحت کے بارے میں دریافت کیا اور مولانا کی مکمل صحت یابی اور درازی عمر کی دعا کی۔ اس تقریب میں دوسروں کے علاوہ ولی عہد شہزادہ فہد بن عبدالعزیز، نائب وزیر اعظم شہزادہ عبداللہ، متعدد شہزادوں اور شاہی کابینہ کے وزراء نے شرکت کی۔ مولانا مودودی کے سب سے بڑے صاحبزادے جناب عمر فاروق بھی تقریب میں موجود تھے جو کئی سال سے ریاض میں مقیم ہیں۔ شاہ فیصل فاؤنڈیشن کے چیئرمین شہزادہ خالد الفیصل نے اس موقع پر اپنی تقریر میں اسلام پر مولانا مودودی کے تحقیقی کام اور اسلامی تحریک کے لئے ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ انھوں نے تبلیغ اسلام کے لیے مولانا مودودی کے لٹریچر کی تعریف کی۔ انھوں نے مولانا مودودی کو موجودہ صدی کا عظیم اسلامی مفکر قرار دیا۔

برصغیر کے مسلمانوں ــــــ اور اہل علم کو مبارکباد

عالم اسلام میں مولانا مودودی کی اسلامی خدمات کا اعتراف

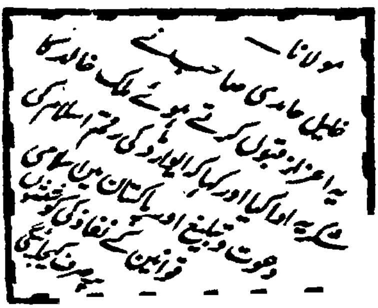
برصغیر ہند و پاک کے مسلمان اور اہل علم لائق مبارکباد ہیں کہ شاہ فیصل ایوارڈ کا پہلا مستحق اسی سرزمین کے ایک عالم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو قرار دیا گیا۔

یورپ میں جس طرح اہل علم کی تحقیقی کاوشوں پر نوبل پرائز دینے کا طریقہ ہے۔ اسی طرح شاہ فیصل شہید کے انتقال کے بعد ان کے نام سے ایوارڈ دینا طے کیا گیا۔ ایوارڈ اسلام کے لیے خدمات اسلامی اسلامی تحقیقات اور عربی لٹریچر پر دیے جائیں گے۔ ایوارڈ کا فیصلہ کرنے والی کمیٹی میں دنیا کے ممتاز عالم اور دانشور شامل ہیں۔ یہ کمیٹی تیونس کے مفتی اعظم شیخ محمد ہیل الخوجہ اسلامی سکریٹریٹ کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبدالکریم گایا اور رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل شیخ محمد علی الحرکان پر مشتمل ہے۔

ایوارڈ دینے کا یہ سلسلہ اسی سال شروع کیا گیا ہے اور اس کے لیے پہلا نام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ہے اور دوسرا نام ترکی کے عالم ڈاکٹر فواد کا ہے۔ تیسرے نام کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ جو تصنیفات پیش کی گئی ہیں وہ معیار کے مطابق نہیں اس لیے اس سال اسے ملتوی کر دیا گیا۔ شاہ فیصل ایوارڈ طلائی تمغہ، سند توصیف اور دو لاکھ سعودی ریال پر مشتمل ہے۔ مولانا مودودی

حالات کی وجہ سے یہ بین الاقوامی اعزاز لینے خود ریاض نہ جا سکے اور ان کی جانب سے مولانا خلیل حامدی صاحب نے یہ اعزاز قبول کرتے ہوئے ملک خالد کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ایوارڈ کی رقم اسلام کی دعوت و تبلیغ اور پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی کوششوں پر صرف کی جائے گی۔

مولانا کو فیصل ایوارڈ دیے جانے پر دنیا کے تمام اسلامی حلقوں میں مسرت کا اظہار کیا جا رہا ہے اور اسکا اعتراف کیا جا رہا ہے کہ انکی تصانیف نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اسلامی نظام حیات کے قیام کے لیے ان کی عملی جدوجہد لائق تحسین ہے۔ مولانا مودودی کی تصانیف کا عربی اور دنیا کی دوسری کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کی تصانیف ہر جگہ خصوصاً عالم اسلام کے مذہبی اور جدید تعلیم یافتہ حلقوں میں یکساں مقبول ہیں۔ یہ تصانیف الحاد تشکیک اور لادینیت کی مزاحمت کے لیے موثر ہتھیار ثابت ہوئی ہیں۔ عالم اسلام کے دینی اور علمی حلقوں میں مولانا مودودی کی خدمات کا ہمیشہ ہی کھلے دل سے اعتراف کیا جاتا رہا ہے۔ اس لیے فیصل انعام کے اعلان ہونے کے بعد انھیں عالم اسلام کے ہر حصہ سے مبارکباد کے تار موصول ہو رہے ہیں۔ انڈونیشیا کے سابق وزیر اعظم جناب محمد ناصر صاحب نے اپنے تار میں کہا۔



"فیصل انعام ملنے پر انڈونیشی مسلمانوں اور میری طرف سے مخلصانہ مبارکباد قبول فرمائیے"

ایک تہنیتی تار ندوۃ الشباب ورلڈ مسلم یوتھ اسمبلی کی جانب سے موصول ہوا۔ اس کے صدر حسن ابن عبداللہ الشیخ وزیر تعلیم سعودی عرب ہیں۔ اس تار میں کہا گیا تھا۔ عزت مآب مولانا مودودی! آپ کو

پہلے فیصل انعام کے لیے منتخب کرکے آپ کی عظیم خدمات اسلام کا اعتراف کیا گیا ہے اس سے ان تمام لوگوں کو بے حد مسرت ہوئی ہے جو اس مقصد کی راہ میں کام کر رہے ہیں۔ میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ اور دعا ہے کہ دنیا بھر میں ابھرنے والی اسلامی تحریک آپ کی رہنمائی سے فیضیاب ہوتی رہے۔

انٹرنیشنل اسلامک فاؤنڈیشن آف اسٹوڈنٹس کے سکریٹری جنرل جناب مصطفےٰ محمود نے مولانا مودودی کو یہ اعزاز ملنے پر اور پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ پر مبارکباد دی ہے۔ سعودی عرب کے شیخ ریاض الخطیب نے مولانا کے نام اپنے خط میں لکھا ہے کہ بلاشبہ آپ اس اعزاز کے حقدار ہیں۔ ورلڈ اسمبلی آف یوتھ کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبدالحمید ابو سلیمان نے اپنے تار میں مبارکباد دیتے ہوئے دعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے تاکہ آپ دنیا بھر میں تحریک اسلامی کی قیادت کرسکیں۔

فیصل انعام ملنے پر مبارکباد کے جو پیغامات موصول ہوئے ہیں ان سے قطع نظر بھی عالم اسلام کے دینی اور علمی حلقوں میں مولانا مودودی کو خراج تحسین ادا کیا جاتا رہا ہے۔ ذیل میں کچھ اقتباسات دیے جا رہے ہیں جن سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

امام حرم :۔

گزشتہ ماہ امام حرم الشیخ محمد عبداللہ بن سبیل مولانا سے ملاقات کرنے ان کی قیامگاہ پر گئے اور ایک گھنٹہ ان کے ساتھ رہے انھوں نے مولانا کی قیام گاہ پر نماز مغرب کی امامت کی۔ انھوں نے مولانا مودودی سے ملاقات کی اپنی خوش نصیبی قرار دیتے ہوئے انھیں پاکستان میں نظام اسلام کے نفاذ پر مبارکباد دی۔ انھوں نے کہا کہ تین سال قبل جب میں پاکستان آیا تھا تو میری انتہائی خواہش تھی کہ میں آپ کی زیارت کروں لیکن نہایت افسوسناک طریقے سے مجھے آپ

سے ملاقات سے روک دیا گیا تھا۔ آپ ہمارے
لیے کتنی خوشی کا دن ہے ہم آپ سے ملاقات
کر رہے ہیں۔ آپ نے اسلام کے لیے بڑی جدوجہد
کی ہے اور تکالیف برداشت کی ہیں۔ انھوں
نے کہا کہ ۳۲ سال سے ہم منتظر تھے کہ پاکستان
میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے عملی
اقدامات کیے جائیں۔ اب ہم اس منزل کی
جانب رواں ہو رہے ہیں۔ امام حرم نے
کہا کہ جس جدوجہد میں آپ سالہا سال سے
لگے ہوئے تھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے
اس کے نتائج ظاہر ہونے لگے ہیں۔ اللہ
تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کی
جدوجہد میں اور زیادہ برکت دے اور
جس مشن کے لیے آپ کام کر رہے ہیں
وہ آپ کی زندگی میں پورا ہو جائے۔
امام حرم نے مولانا مودودی کو ان کے دوست
اور مکہ مکرمہ کے ممتاز عالم دین الشیخ محمود
رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل الشیخ
محمد علی الحرکان کا سلام اور پیغام پہنچایا اور
ان کے لئے دعائے صحت کی۔

سعودی عرب کے قاضی القضاۃ

سعودی عرب کی عدالت عالیہ شرعیہ
(کونسل) کے قاضی القضاۃ ایچ جسٹس الشیخ
عبداللہ بن حمید نے گذشتہ ہفتے ریاض کی ایک
ضیافت میں گفتگو کرتے ہوئے مولانا مودودی
کی دینی خدمات کو زبردست خراج تحسین
پیش کیا اور ان کی صحت اور درازی عمر کے
لیے دعا کی۔

سید محمد قطب

گذشتہ ماہ اخوان المسلمین کے سرکردہ
سید قطب شہید کے بھائی اور ملک عبدالعزیز
یونیورسٹی مکہ کے پروفیسر جناب محمد قطب نے
لاہور میں اپنے قیام کے دوران مولانا سید
ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات کی۔ محمد قطب
نے مولانا مودودی کی صحت کے بارے
میں دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ دنیائے
اسلام کو مولانا مودودی کی اشد ضرورت
ہے اور ہر جگہ لوگ ان کی صحت کے لیے
دعا کر رہے ہیں۔ مولانا مودودی سے اپنی
سابقہ ملاقاتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں

نے کہا کہ ان سے پہلی ملاقات سنہ ۶۰ء میں قاہرہ
میں ہوئی تھی۔ اس وقت مصر میں حالات
کافی پریشان کن تھے۔ ناصر کی قید سے رہائی
کے بعد ایک مرتبہ لندن میں بھی مجھے آپ
سے ملاقات کا اتفاق ہوا تھا اور یہ میری
خوش قسمتی ہے کہ ایک مرتبہ پھر آپ سے
ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ انھوں
نے کہا کہ آپ نے اسلام کے صحیح نظریات
کو غیر اسلامی ملاوٹوں سے پاک کر کے
اس طرح پیش کیا ہے کہ دنیا میں ہر جگہ
مسلمان ان سے استفادہ کر رہے ہیں
اور دنیائے اسلام کے تمام ممالک میں
نوجوان نسل اس سے بہت زیادہ متاثر
ہے آپ کی یہ عظیم خدمات اسلامی تاریخ کا
گراں قدر سرمایہ ہے۔ جب مولانا مودودی
نے انھیں بتایا کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کی سیرت پاک لکھ رہے ہیں اور
مکی دور تقریباً مکمل ہو چکا ہے تو انھوں
نے اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا کہ
سید قطب شہید بھی سیرت پاک کے
بارے میں لکھنے کی شدید خواہش رکھتے تھے
لیکن قدرت نے انھیں مہلت نہ دی اور
اب وہ کام آپ کے ہاتھوں پورا ہو رہا
ہے جس سے آئندہ نسلیں استفادہ کریں گی۔

سید بہاء الامیری

عالم اسلام کے ممتاز رہنما اور مراکش
کے کلیتہ حدیث کے سربراہ الشیخ بہاء الامیری
نے جو ایک سو سے زائد کتب کے مصنف
ہیں۔ گزشتہ ماہ لاہور میں مولانا مودودی
سے ملاقات کی انھوں نے مولانا مودودی
کو اپنی تصانیف پیش کیں۔ کراچی میں ایک
اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے
کہا کہ مجھے پاکستان آنے کی کئی لحاظ سے
خوشی ہے۔ ایک وجہ تو اس وقت پاکستان
میں موجودگی کی سعادت ہے جب یہاں
اسلامی شریعت کے نفاذ کا اعلان کیا گیا ہے
اور دوسری وجہ مولانا مودودی کی زیارت
تھی۔ وہ میری محبوب ہستی ہیں۔ اور ان کے
سے ملاقات کا شوق مجھے پاکستان لے آیا
انھوں نے کہا کہ میرے اور عرب نوجوانوں

کے اذہان کی تعمیر میں سید مودودی کے نور معرفت اور تعلیم کا بڑا حصہ ہے۔ وہ دورِ جدید میں علمی اور دینی جہاد میں معروف ہیں۔ ان کے منور چہرے کی زیارت کرنا میرے لیے بڑی سعادت ہے۔ سید بہاء الامیری نے یہ تقریر اردو میں کی۔ وہ پاکستان میں شام کے سفیر بھی رہ چکے ہیں۔

ڈاکٹر دوالیبی

گزشتہ ماہ سعودی عرب کے شاہ خالد کے مشیر ڈاکٹر دوالیبی نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ان کی رہائش گاہ واقع اچھرہ میں ملاقات کی۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک مولانا مودودی کے پاس رہے۔ ڈاکٹر دوالیبی نے مولانا کو مبارکباد دی کہ ان کی جدوجہد کے نتائج ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں اور پاکستان میں اسلامی قوانین کا نفاذ شروع ہو گیا ہے انھوں نے مولانا مودودی کو شاہ فیصل ایوارڈ ملنے پر بھی مبارکباد دی اور کہا کہ آپ بجا طور پر اس کے مستحق تھے۔ ڈاکٹر دوالیبی نے مولانا مودودی سے عشر اور زکوٰۃ کے نظام پر تبادلہ خیال کیا۔

ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی مرحوم

ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی مرحوم شام میں اخوان المسلمین کے مراقب عام تھے۔ وہ نہایت جلیل القدر اور دقیق النظر عالم تھے کئی علمی اور تحریکی کتابوں کے مصنف تھے ۱۹۶۴ء میں ان کا انتقال ہو گیا ۱۹۶۴ء میں جب جماعت اسلامی پاکستان پر پابندی عائد کی گئی تو اس کی خبر سن کر انھوں نے "حضارۃ الاسلام" میں ایک زبردست اداریہ لکھا جس کا عنوان تھا۔ اے پاکستان کے حکمرانو! جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر تمہارے الزامات غلط ہیں۔ مولانا مودودی نے ایک مشہور حدیث "السلطان ظل اللہ" کی جو تشریح کی ہے۔ شیخ السباعی اس سے اتنے متاثر تھے کہ ان کا کہنا تھا کہ اگر مولانا محترم یہ مجھے عنایت فرما دیں اور اس کے عوض مجھ سے میری تصنیف "السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی" لے لیں تو میری بڑی خوش قسمتی ہوگی۔

علامہ محمد البشیر الابراہیمی

علامہ محمد البشیر الابراہیمی الجزائر کے نامور عالم دین اور نڈر مجاہد تھے۔ ۱۹۵۳ء میں جب مولانا مودودی کو سزائے موت سنائی گئی تو عالم اسلام میں اس پر شدید احتجاج ہوا۔ اس موقع پر علامہ ابراہیمی نے پاکستان کے اسوقت کے گورنر جنرل کو جو احتجاجی تار بھیجا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ مولانا مودودی کو سزائے موت دے کر تم ایک شخص کو ختم نہیں کرو گے بلکہ اسلام کی تلواروں میں سے ایک تلوار کو توڑ دو گے۔ اسلام کی ایک گرجدار آواز کو دبا دو گے۔ اسلام کے ایک روشن باب کا خاتمہ کر دو گے اس سے اعدائے اسلام کے سوا کسی کو خوشی نہ ہوگی۔

کینیا کے قاضی القضاۃ

کینیا کے قاضی القضاۃ شیخ صالح فارسی نے مولانا مودودی کی شان میں ایک طویل عربی قصیدہ نظم فرمایا ہے اس میں انھوں نے مولانا مودودی کی اسلامی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

استاذ عصام العطار

استاذ عصام العطار شام کے اخوانی رہنما ہیں وہ ۱۹۶۴ء سے جرمنی میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی زیر ادارت ایک عربی جریدہ "الرائد" شائع ہو رہا ہے۔ انھوں نے مولانا مودودی کو ایک نظم میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

یمن کی وزارت تعلیم کے ایک ذمہ دار حسن بن یحییٰ الذاری نے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے بارے میں کئی نظمیں لکھی ہیں۔

مولانا مودودی سے

ایک استفسار اور اس کا جواب

استفسار مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی ایک کتاب میں "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" پر تنقید کی ہے اور آپ کی دینی فکر اور فہم قرآن کو غلط بتایا ہے۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک آپ کے خلاف باتیں کہتے ہیں۔ آپ کی شخصیت، تحریک اسلامی کے بارے میں کوئی سوال کرے تو گول مال جواب دے کر ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی زبان سے کبھی آپ کے بارے میں اور تحریک اسلامی کے حق میں ایک کلمہ تحسین نہ نکل سکا۔ ایک مورخ اسلام کی حیثیت سے ہی اگر انھوں نے آپ کی اور تحریک اسلامی کی خدمات کا ذکر کیا ہوتا تو کتنا بہتر ہوتا۔ مولانا علی میاں ندوی کی یہ روش، میری سمجھ سے باہر ہے۔ کیا آپ اس پہ اظہار خیال فرمائیں گے۔

حسین احمد بن ابوالاخلاص مولانا عبدالصمد نوری

جواب محترمی و مکرمی۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ علی میاں ندوی صاحب اس سے پہلے بھی مختلف مواقع پر میرے خلاف باتیں بھی کرتے رہے ہیں اور لکھ بھی چکے ہیں حالانکہ میں نے ان کے خلاف نہ کبھی کچھ کہا نہ لکھا۔ ظاہر بات ہے کہ کلام وحی تو ان کی کتابیں بھی نہیں ہیں۔ ان کے خلاف بھی بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں لیکن میرے دل میں کبھی اس کا خیال بھی نہیں آیا۔ اپنی ایک عربی کتاب میں انھوں نے میرے خلاف اظہار خیال فرمایا تھا۔ اسی زمانے میں اتفاق سے مجھے عرب جانے کا موقع ملا۔ وہاں بہت

سے نوجوان میرے پاس آئے اور تقاضا کیا کہ علی میاں کے اعتراضات کا جواب دوں۔ مگر میں نے ان سے کہا کہ یہ اس وقت نئی نسل کے لوگوں کو دین کی طرف جو توجہ ہو رہی ہے وہ گنتی کے چند آدمیوں کی تحریروں کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ لوگ ایک دوسرے کی تردید کرنا شروع کر دیں تو یہ نسل آخر کس پر اعتماد کرے گی اور کس کی بات پر توجہ کرے گی۔ اس لئے میں تو بہرحال ان کے خلاف کچھ نہیں لکھوں گا۔ اگر میرے بجائے انہی کا اعتماد لوگوں میں قائم رہے تو یہ زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ میں اور وہ لڑ کر دونوں ہی کا اعتماد ختم کر دیں۔

آپ کی دعاؤں کا بہت شکریہ۔ میری صحت روز بروز کمزور ہو رہی ہے۔ دعا یہ ہے کہ جب تک زندہ رہوں اللہ تعالیٰ دین کی خدمت کے قابل رکھے۔

میری صحت اس قابل نہیں رہی کہ اس طرح کے سوالات کا جواب دے سکوں جو آپ نے تحریر کئے ہیں۔ کئی کئی روز تک تو میں خطوط پڑھ بھی نہیں سکتا۔ بہ مشکل ضروری باتوں کے جواب لکھوایا کرتا ہوں۔ خاکسار — ابوالاعلیٰ مودودی

غزل

وہ جو آجاتے شبِ غم کا سویرا ہوتا
دل کی دنیا میں نہ یہ گھور اندھیرا ہوتا

رات سے لڑنے کو سورج بھی اُبھرا کوئی
یا تمنا ہی تمنا ہے سویرا ہوتا

بازوؤں میں حرکت کچھ نہ کچھ آ ہی جاتی
کسی طوفاں نے کبھی تجھ کو بھی گھیرا ہوتا

رنج تو ہوتا مگر، اتنا نہ ہوتا مجھ کو
لوٹنے والا اگر کوئی لٹیرا ہوتا

اس سے پہلے بھی لازم ہے کسی کا ہو جا
یہ جو ارمان ہے مائل کوئی میرا ہوتا

(مائل خیر آبادی)

دعا

(پاکستانی صحافی و شاعر محمود شام کی نظم سے متاثر ہو کر) (شائستہ شمیم)

اس سے پہلے کہ فن و فکر کی عظمت نہ بچوں!
دل کے جذبات، جواں خوابوں کی حرمت نہ بچوں!
عصمتِ لوح و قلم، قلب کی جرأت نہ بچوں!
ایک فنکار کے سینے کی حرارت نہ بچوں!
خالقِ ارض و سما، لوح و قلم کے مالک!
یہ دعا ہے کہ اُٹھا لینا زمیں سے مجھ کو!
اس سے پہلے کہ میں آذر کی تجارت سیکھوں!
جہل فرعون کا، باطل کی اطاعت سیکھوں!
اس سے پہلے کہ فرنگی کی سیاست سیکھوں!
زار و چنگیز و ہلاکو کی شقاوت سیکھوں!
خالقِ ارض و سما، لوح و قلم کے مالک!
یہ دعا ہے کہ اُٹھا لینا زمیں سے مجھ کو!

اس سے پہلے کہ سیہ شب کو سحر کہنے لگوں!
جہل کو علم، خطاؤں کو ہنر کہنے لگوں!
اس سے پہلے کہ میں پتھر کو گہر کہنے لگوں!
کور بیں جو ہیں انھیں اہلِ نظر کہنے لگوں!

خالقِ ارض و سما، لوح و قلم کے مالک!
یہ دعا ہے کہ اٹھا لینا زمیں سے مجھ کو!

اس سے پہلے کہ درندوں کو میں انساں سمجھوں!
زہر کو قند کہوں، کفر کو ایماں سمجھوں!
اس سے پہلے کہ میں زنداں کو شبستاں سمجھوں!
پھول میں آگ کو صحرا کو گلستاں سمجھوں!

خالقِ ارض و سما، لوح و قلم کے مالک!
یہ دعا ہے کہ اٹھا لینا زمیں سے مجھ کو!

اس سے پہلے کہ جھکے میرے قلم کی تلوار!
میرے ادراک پہ چھا جائے تعصب کا غبار!
اس سے پہلے کہ ملے خاک میں میرا پندار!
میری ذلت کو سمجھے مصر کا کوئی بازار!

خالقِ ارض و سما، لوح و قلم کے مالک!
یہ دعا ہے کہ اٹھا لینا زمیں سے مجھ کو!

دلہن

مائل خیرآبادی

"بیٹی!"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ میری ساس میری ہی طرف دیکھ رہی تھیں۔ میری نند فاطمہ ان کے پاس بیٹھی تھی۔

"جی امی! ابھی آئی۔"

مجھے ایسا لگا کہ وہ مجھ سے کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہیں۔ کسی اندیشے کی جھلک ان کی نگاہوں میں تھی۔ اچانک سوچ کی رَو میرے ذہن میں دوڑ گئی۔ ابھی تو تیسرا ہی چالا ہے۔ میں نے کسی سے منہ کھول بات بھی نہیں کی۔ ہی وہ "اُن، جی، اچھا" ہفتہ بھر میں یہی چند الفاظ تھے جو میری زبان سے سنے گئے تھے۔ میں نے فاطمہ کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ وہ بھی سنجیدہ تھی۔

"جی، امی جان! فرمایئے!"

"کیا کر رہی تھیں، بیٹی!"

"پتلون کی سیون ذرا اُدھڑ گئی تھی....."

"اچھا تو اسے ٹھیک کر رہی تھیں!"

"جی امی جان!"

"بیٹی! اللہ تیرا سہاگ قائم رکھے!"

"آمین! امی جان فرمایئے۔ بات کیا ہے مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی؟" میں بھانپ گئی کہ کوئی خطرناک بات ہے۔

"نہیں بیٹی، تم کو آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے۔ تیسرا ہی تو چالا ہے۔ تم سے غلطی کیا ہوگی۔"

"پھر؟ آپ کچھ پریشان لگتی ہیں؟"

"بیٹی! میں بھی تو تیری ماں ہوں!"

"امی! یوں کہیے کہ آپ ہی میری ماں ہیں۔"

"جیو بیٹی! جگ جگ جیو۔ ایک بات پوچھوں؟"

"جی امی، ضرور پوچھیے۔"

"فاطمہ! تو بھی سن۔" اور فاطمہ بھی چوکنا ہو گئی۔

"اگر پتھر پتھر پہ گرے تو کیا ہو گا بیٹی؟"

"ایک تڑاکا جس سے دل دہل جائیں۔"

"ہاں۔ اور؟"

"چنگاری بھی پیدا ہو سکتی ہے۔"

"اور؟"

"اور جو پتھر کمزور ہو گا وہ چور چور ہو جائیگا۔"

"اور اگر پتھر کسی نرم اور گیلی زمین۔ شہر بھری یا ریتیلی زمین میں گرے تو؟"

"تو امی جان! پتھر اس میں دھنس جائے گا۔"

"ہاں بیٹی! شاباش۔ اری فاطمہ سن رہی ہے۔ ماشاء اللہ تیری بھابی بڑی سمجھدار ہے۔"

"مگر امی! اسے۔۔۔ میں نے کہا۔ میں سمجھی نہیں۔ آپ نے تو کوئی پہیلی کہی ہے شائد؟"

"پہیلی نہیں ہے۔ ایک مثال ہے۔ مجھے تیرے بھولے پن پر ترس آتا ہے۔ کان لگا کر سننا۔ فاطمہ گواہ ہے۔ انور ظالم ہے آئے دن فاطمہ کو پیٹتا رہتا ہے۔ ذرا سی بات پر گھر میں توڑ پھوڑ کرنے لگتا ہے۔ میری بھی نہیں سنتا۔ توبہ۔ مجھ پر بھی آنکھیں نکالتا ہے۔ آس پڑوس گھر باہر کے سبھی لوگ جانتے ہیں سب سمجھا کر ہار چکے۔ نہیں سمجھتا۔ نہیں سنتا۔ جب اس کی شادی کی بات ہوئی تو فاطمہ کے ابا کہتے تھے کہ کس غریب بچی کا خون کروں اس نالائق سے نکاح کرا کے۔۔۔ مگر بیٹی! قسمت میں جو ہوتا ہے۔ ہو کر رہتا ہے۔ اللہ کے بھید اللہ ہی جانے۔ ایسے غصہ ور اور پتھر دل کو بیٹی تو تم بیٹی! بس اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ تم اس پتھر کے لئے نرم اور گیلی زمین بن جاؤ جس میں یہ پتھر گرے تو دھنس کر رہ جائے اور زمین کا گیلا پن پتھر کی گرمی کو بجھا دے۔"

میں نے سنا تھا کہ میری ساس پڑھی لکھی نہیں ہیں مگر اس طرح جو انھوں نے سمجھایا تو میرے دل پر بڑا اثر ہوا، پھر نئی بات یہ دیکھی کہ اپنے بیٹے کی ایک برائی مجھ سے کہہ رہی تھیں کون ماں ہے جو اپنے بیٹے کی برائی کرے۔ تمام مائیں تو بیٹوں کی برائیوں کو چھپائے پھرتی ہیں۔

میرے دل میں اپنی ساس کی محبت بھی بڑھی اور عظمت بھی۔ محبت اور عظمت کے ملے جلے جذبات کے مارے میں نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔ ممتا کا ہاتھ آپ سے آپ میرے سر پر آ گیا۔

ٹھیک اسی وقت ایک گرج سنائی دی۔

• تو دل ٹھنڈا کر لیا اپنا۔ میری برائی میری بیوی سے!!"

• اوئی اللہ!" فاطمہ چیخ کر ماں کے پیچھے چھپ گئی اور ماں کا یہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا اور کھڑی ہو گئی۔

• ٹھہرئیے! آپ نے پوری بات نہیں سنی۔ امی آپ کی تعریف کر رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے کہہ دیا۔

• یہ میری تعریف ہو رہی تھی غصہ ور پتھر دل۔ وہ پھر چیخے۔ امی مجھے کہہ رہی تھیں"

• بے شک، امی نے آپ کو غصہ ور کہا"

• پھر!"

• بات تو سنئے۔ میں کہتی ہوں آپ نے پوری بات نہیں سنی۔ دیکھئے امی نے امی کے سامنے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا) غصہ اُسے آتا ہے جو غیرت دار ہوتا ہے۔ غیرت مند آدمی غلط بات کو برداشت نہیں کرتا۔ اس برداشت نہ کرنے کو غصہ کہتے ہیں۔"

• خوب ہے یہ تاویل۔ تاویل بھی نہیں۔ رفو کی ہے اچھا اور پتھر دل جو کہا۔" مگر اب وہ پہلی سی گرج نہیں تھی۔

• امی جان کا مطلب یہ تھا کہ غلط بات اس کے دل میں ٹھونسنا چاہو تو وہ پتھر ہے پتھر کسی کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔"

• واہ بھئی واہ! اچھا اور تم ہو نرم و نازک اور کمزور۔"

• وہ تو اللہ نے خود فرمایا ہے میں کیا تمام عورتیں نرم دل، کمزور جان ہوتی ہیں۔ میرے ابا نے ایک دن قرآن کا ترجمہ سنایا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عورت کمزور جان ہے اور مرد قوام۔ مرد کو عورت کی حفاظت کرنا چاہئے۔ دیکھئے اس حق بات پر آپ کو غصہ نہیں آئے گا بلکہ یہ حق بات آپ کے دل کو لگے گی۔"

اور پھر جیسے آتش فشاں پھٹتے پھٹتے رہ جائے۔ انھیں سکون آگیا لیکن یہ کہہ کر مڑے "خوب احمق بنایا مجھے" لبوں پر دربردہ مسکراہٹ سی کھل گئی۔

"کہیں جائیے گا نہیں۔ امی جان کہتی ہیں۔ انور بھو کا ہے"!

چپکے جاکر کمرے میں بیٹھ گئے۔ امی نے فاطمہ کو اشارہ کیا وہ اسٹو اٹھا لائی۔ فاطمہ چائے بنا رہی تھی اور امی بار بار میری بلائیں لے رہی تھیں۔ میرا منہ چوم رہی تھیں اور چپکے چپکے کہتی جا رہی تھیں "بیٹی! آج پہلا دن ہے کہ انور کے اندر کا دیو بند کا بند رہا۔

پسندیدہ اشعار

کچھ پسندیدہ اشعار اُستاذ محترم رشید کوثر فاروقی صاحب کے زمزمہ (غزلوں کا مجموعہ) سے انتخاب کر کے روانہ کر رہا ہوں۔ اس درخواست کے ساتھ کہ حجاب کے کسی شمارے میں جگہ دیں۔

دیکھا نہیں کسی کو حقارت سے آج تک
مجھ سے مری نگاہ کی قیمت نہ پوچھیے

زاہد سے بچائے رکھے خدا، لیتا ہے خدا کا نام مگر
بندوں کے لئے اس پردے میں اکثر یہ خدا بن جاتا ہے

حقیقتوں کے چراغاں لہو سے ہوتے ہیں
ندیم! کھیل نہیں ہے جہانوں کا اساس

رہروو! آؤ چنیں خار اور اس طرح چنیں
کہ جو کل آئیں انھیں ایک بھی کانٹا نہ ملے

حسن کیسا حوصلہ کیا بے خدا تہذیب کا
پاؤں بھی طاؤس کے، طاؤس کی پر بھی

سکوتِ شب میں جب قرآن کی ترتیل سنتا ہوں
تو جیسے روح پھولوں میں بسی معلوم ہوتی ہے

مجھ کو ہر شئے حسیں نظر آئی!
حسن، حسنِ خیال ہی تو نہیں!

پردہ نشین! تیری غیرت پہ حرف آیا
محسوس کر رہا ہوں آواز میں تبسم!

(مرسلہ: ابو حنظلہ۔ پونا)



دُعا مانگنا

دُعا کے معنی ہیں پکارنا۔ دعا مانگنا کے معنی ہیں، مدد کرنے کے لئے کسی کو پکارنا یا کسی کو پکارنا یا مدد
لئے اس طرح پکارنا کہ بھائی! ذرا میری یہ گٹھری اٹھوا کر میرے سر پر رکھوا دیجئے یا کسی پنچے
وست سے کہنا کہ میاں ذرا پانی دینا۔ یا شوہر سے کہنا کہ لکڑی لا دیجئے یا سہیلی سے کہنا کہ ذرا
بٹن تو لا دو وغیرہ تو یہ دُعا مانگنا نہیں ہے۔

دُعا کا ٹھیک ٹھیک مطلب یہ ہے کہ اللہ کو مدد کے لئے پکارنا۔ یہ پکارنا اس وقت ہوتا
ہے جب آدمی کسی مصیبت میں پھنس جاتا ہے اور اس سے کچھ بنائے نہیں بنتا تو وہ اللہ کی
ف دھیان دیتا ہے اور اس وقت اس کی مدد چاہتا ہے۔ یہ پکارنا اس وقت بھی ہوتا ہے
ب انسان کی کچھ تمنائیں اور خواہشیں ہوتی ہیں اور وہ تمنائیں اور خواہشیں کسی طرح پوری
یں ہوتیں تو وہ اللہ کی طرف دھیان دیتا ہے۔ یہ تمنائیں اس طرح کی ہوتی ہیں۔ مثلاً اسکے
د نہیں ہوتی۔ چاہتا ہے کہ وہ صاحب اولاد ہو جائے۔ کوئی بیماری ہو جاتی ہے چاہتا ہے
اللہ اس کی بیماری دور کر دے۔ بے روزگاری میں اللہ کو پکارتا ہے کہ وہ روزگار سے لگا دے
قصان سے بچا دے۔ قحط پڑ جاتا ہے۔ سیلاب آ جاتا ہے۔ زلزلہ آ جاتا ہے۔ اس طرح جان اور
ل کو نقصان پہنچانے والی آفتوں سے بچنے کے لئے چاہتا ہے کہ اُسے بچا لے۔ کوئی بڑا دشمن
منے ہوتا ہے اُس سے بچنے کے لئے خدا ہی سے لَو لگاتا ہے۔
ایسے بُرے وقتوں میں وہ اللہ کو بلند آواز سے کبھی پکارتا ہے۔ چپکے چپکے بھی پکارتا

ہے۔ رات کو اکیلے میں بھی پکارتا ہے۔ اجتماعی طور سے بھی پکارتا ہے۔ یعنی بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے مل جل کر بھی دعا کرتا ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسے وقتوں میں خدا ہی سے کیوں دعا کرتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ آدمی کا دل اس بات کو مانتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی باگ ڈور اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ پانی اللہ کے حکم ہی سے برستا ہے۔ حاجتیں اللہ ہی پوری کرنے والا ہے بیٹا بیٹی دینے والا اللہ ہی ہے۔ مصیبتوں اور بیماریوں کو ٹالنا اللہ ہی کے بس میں ہے وغیرہ۔

ایسے وقتوں میں جب انسان اپنی پوری طاقت جھونک دیتا ہے اپنے ساتھیوں کی مدد لے کر بھی کام نہیں بنتا اور ہمت ہار بیٹھتا ہے تو اسی مالک کو پکارنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو سارے جہان کا مالک ہے اور جو ساری دنیا کا کام اپنی مرضی سے چلا رہا ہے۔ اس مالک کو بے دیکھے پکارتا ہے۔ ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حال میں پکارتا ہے۔ میں نے کچھ ایسے واقعات پڑھے ہیں کہ بڑے بڑے مشرک اور دہریئے بُرے وقت میں صرف اللہ کو پکارنے پر مجبور ہو گئے۔

سب لوگ جانتے ہیں کہ جب ہٹلر روس کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا اور روس اسے روکنے میں بے بس ہو رہا تھا تو روس جیسے دہریے ملک کے سربراہوں نے مسجدوں اور گرجاؤں کے مولویوں اور پادریوں سے درخواست کی تھی کہ وہ اللہ سے کامیابی کے لئے دعا کریں۔ اس کے علاوہ دو ایک اور دلچسپ واقعے سنئے:

جب حضورؐ نے مکہ فتح کیا تو ابوجہل کے مشہور اور بہادر فرزند عکرمہ مکے سے بھاگ گئے۔ جدہ کے بندرگاہ پر پہنچے۔ ایک جہاز پر سوار ہوئے۔ سوچا تھا کہ حبش کو بھاگ جائیں گے اور وہیں رہیں گے۔ جا رہے تھے کہ سمندر میں طوفان آگیا۔ جہاز طوفان میں پھنس گیا۔ جہاز پر تمام مسافر مشرک ہی تھے۔ دیوی۔ دیوتاؤں۔ سورج اور چاند اور

بندوں کے استھانوں کے پجاری ہی تھے۔ سب پہلے تو ہبل، لات، عزیٰ، منات اسوج دیوتا، چاند دیوتا اور بزرگوں کا نام لے لے کر اس مصیبت سے بچنے کے لئے گڑگڑا رہے تھے ان سارے دیوتاؤں اور بندوں کو پکار کر تھک گئے تو سب نے کہا کہ اب سوائے خدائے واحد کو پکارنے کے کوئی صورت نہیں۔ جب اس طرح سب نے کہا تو عکرمہ نے دل میں کہا سارے بتوں کو چھوڑ کر خدائے واحد ہی کو ماننا اور اس سے لو لگانا ہوتا تو محمد سے ہمارا جھگڑا ہی کیوں ہوتا۔ یہی بات تو محمد بھی کہتے ہیں۔

عکرمہ نے دل میں طے کر لیا کہ اگر خدائے واحد اس طوفان سے بچالے گا تو محمد کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا اور مسلمان ہو جاؤں گا۔ جہاز طوفان سے بچ گیا۔ عکرمہ واپس ہوئے اور آکر مسلمان ہو گئے۔

اس سے زیادہ نصیحت والا دلچسپ واقعہ وہ ہے جب ابرہہ (ایک عیسائی بادشاہ) ہاتھیوں کا لشکر لے کر کعبہ ڈھانے چلا۔ مکے کے سرداروں کے سردار عبدالمطلب کو خبر ہوئی۔ وہ سارے سرداروں کو لے کر حرم کعبہ میں گئے۔ کعبے سے لپٹ کر اس وقت جو دعا کی۔ اس کے الفاظ آج بھی تاریخوں میں لکھے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عبدالمطلب نے صرف اللہ کو پکارا تھا۔ نہ تو سب سے بڑے بت ہبل کو پکارا اور نہ ان ۳۶۰ بتوں کو جو کعبے میں دھرے تھے۔ آخری الفاظ یہ ہیں:

"اے اللہ! یہ تیرا گھر ہے۔ ابرہہ سے بچانے کی ہم میں طاقت نہیں۔ اب تو جانے"

لطیفہ:- یہ عجیب بات ہے کہ ایسے آڑے وقتوں میں آدمی صرف اللہ کو پکارتا ہے لیکن جب بلا ٹل جاتی ہے تو پھر نذر و نیاز اور چڑھاوے اللہ کو چھوڑ کر آستانوں اور بندوں کے چرنوں اور قدموں میں پیش کئے جاتے ہیں یعنی لوگ پھر شرک میں پھنس جاتے ہیں۔ قرآن نے

ایسے مشرکوں کی رگ خوب پکڑی ہے۔ جگہ جگہ ان کی اس چھچھوری ذہنیت کو واضح کیا ہے۔ صرف ایک ملاحظہ ہو:۔

وَإِذَا غَشِيَهُم مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ

اور جب سمندر میں ان لوگوں پر ایک موج پہاڑوں کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ ہی کو پکارتے ہیں۔ اپنے دین کو بالکل اسی کے لیئے خالص کر کے۔ پھر جب وہ (اللہ) بچا کر انھیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کچھ تو مقتصد ہو جاتے ہیں اور ہماری نشانیوں کا انکار نہیں کرتا مگر ہر غدار اور ناشکرا شخص۔

مقتصد کے معنی علماء نے کئی لکھے ہیں — یہ کہ کوئی توحید پر قائم رہتا ہے۔ کوئی نرم پڑ جاتا ہے لیکن جو بڑے ہی ناشکرے ہوتے ہیں۔ وہ پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بتوں اور زیارتوں کے قدموں میں ناک رگڑنے لگتے ہیں۔

دعا کے بارے میں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مالک اور مختار اور حاجت روا اللہ ہی ہے۔ اب کوئی مشرک لاکھ کہے اور سمجھے سمجھائے کہ فلاں دیوی دیوتا۔ فلاں پیر صاحب فلاں زیارت کے بزرگ کے اختیارات میں بھی کچھ ہے لیکن اس نامناسب کوشش سے اللہ کے علاوہ کوئی اور حاجت روا نہیں ہو سکتا۔ مالک اللہ ہی رہے گا۔ اختیارات سب اسی کے ہاتھ میں رہیں گے۔ اس بات کے خلاف اگر لوگ اپنی جگہ کچھ نبیوں، ولیوں، فرشتوں دیوی دیوتاؤں، جنوں، چاند سورج اور ستاروں وغیرہ کو اختیارات میں شریک سمجھ کر بیٹھیں تو اس سے حقیقت میں ذرہ برابر فرق نہیں پڑتا۔ مالک و مختار اللہ اور بے اختیار

بے اختیار و بے بس بندے، بندے ہی ہیں گے۔

ابھی ایک بات سمجھا رہ گئی۔ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں سے مدد مانگنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص درخواست لے کر کسی بادشاہ کے دربار میں جائے لیکن بادشاہ کو چھوڑ کر وہاں جو درباری بادشاہ کے حضور میں سر جھکائے اس کے حکم کے منتظر بیٹھے ہوں۔ انہی میں سے کسی ایک کے آگے اپنی درخواست پیش کر دے اور پھر ہاتھ جوڑ جوڑ کر اسی کے آگے گڑگڑاتا رہے کہ میرے لئے تو حضور ہی سب کچھ ہیں۔ آپ چاہیں گے تو میرا کام بن جائے گا؛ میری مراد آپ ہی برلائیں گے۔

یہ حرکت اول تو بڑی بے وقوفی اور گستاخی کی ہے۔ سوچئے، بادشاہ سامنے موجود ہے۔ اس کی موجودگی میں اُسے چھوڑ کر کسی دوسرے کے سامنے گڑگڑایا جا رہا ہے اور بادشاہ دیکھ رہا ہے۔ افسوس کی بات ایک اور ہے کہ وہ درباری کہتا ہے کہ بھئی میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔ میں تمہاری ہی طرح رعایا ہوں۔ بادشاہ سلامت سامنے تشریف فرما ہیں۔ سرکار میں درخواست پیش کرو مگر احمق اس کی خوشامد میں لگا ہوا ہے کہ میرے لئے تو آپ ہی بادشاہ ہیں۔ میرے سرکار آپ ہیں میرا کام آپ ہی بنائیں گے تو بنے گا۔

یہ باتیں سمجھنے اور سمجھانے کے بعد اب میں قرآن کی ایسی بہت سی آیتوں میں سے صرف ایک آیت پیش کرتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا ہی اصل عبادت ہے۔ سورۂ مومن کی آیت ۶۰ ملاحظہ ہو۔ فرمایا:۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝

تمہارا رب کہتا ہے۔ مجھے پکارو۔ میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں گا۔ جو لوگ گھمنڈ میں

آگر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں. ضرور وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہونگے۔

ترجمہ پڑھ لیجئے. سوچ لیجئے. اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھ سے ہی دعا کرو. یہ لوگ
میں اگر میری عبادت نہیں کرتے وہ جہنمی ہیں. اس جگہ عبادت کے صاف معنی دعا
ہیں. تمام علماء کرام نے دعا کو عبادت کہا ہے. اگر کوئی عبادت دعا کی روح سے خالی
یا رکھئے عبادت کرنے والے کے ایمان میں ضرور خامی ہے. قرآن کی ساری دعائیں
جائیے. ساری کی ساری شرک سے خالی ملیں گی. سورہ فاتحہ جسے ہم آپ ہر نماز میں
پڑھتے ہیں ایک جامع دعا ہے. مطلب واضح ہے. تعریف کے لائق اللہ ہی ہے. احسان
کا ہے. سارے جہانوں کا وہی رب ہے. وہ بڑا مہربان اور رحم والا ہے روز محشر کا
ہے. اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں یعنی تجھی کو پکارتے رہتے ہیں. اے اللہ!
سے مدد مانگتے ہیں یعنی دعا کرتے ہیں. ہم کو سیدھی راہ کی ہدایت فرما. اس سیدھی راہ کی
پر تیرے وہ خاص بندے چلے جن پر تو نے انعام فرمایا. جن پر تو کبھی غصے نہیں ہوا
بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔

قرآن میں جو دعائیں ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو سکھائی ہیں ان سب میں
کا مالک اللہ ہی کو بتایا گیا ہے. لہٰذا ہر وقت اسی کو پکارنا چاہیے. دعا واقعی عبادت ہے
شخص دعا نہیں کرتا، دراصل وہ گھمنڈ میں مبتلا ہوتا ہے. حضورؐ نے بھی دعا کو عباد
ہی فرمایا ہے۔

• حضرت نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا "دعا عین عبادت ہے"
پھر سورۂ مومن کی آئت + حضورؐ نے تلاوت فرمائی۔

• حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا "دعا مغز عبادت ہے"

• حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ من لم یسأل اللہ یغضب علیہ جو اللہ سے نہیں مانگتا، اللہ اس پر غضبناک ہو جاتا ہے۔

دعا کرنے کے فائدے:۔ (۱) دعا کرنے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی ذہنی تربیت بہت اچھی ہو جاتی ہے۔ وہ توحید اور شرک کو خوب سمجھ جاتا ہے۔ شرک سے بچ جاتا ہے۔ اللہ کی رحمت کا حقدار ہو جاتا ہے اور یہ کہ دعا کرنا اپنے بندہ ہونے کی دلیل ہے اور اللہ کو اپنا رب ماننے کا ثبوت۔ ظاہر بات ہے کہ جو اللہ ہی کا ہو کر رہتا ہے اس سے بڑھ کر خوش قسمت انسان اور کوئی کیسے ہو سکتا ہے۔

(۲) دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ بندہ اپنے ذہن کے مطابق دعا کرتا ہے، وہ یہ نہیں جانتا کہ جس کام کے لئے دعا کر رہا ہے واقعی اس کے فائدے کی ہے یا نہیں۔ ہاں اللہ جانتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے فائدے کی چیز دے دیتا ہے اور نقصان کی چیز سے بچا لیتا ہے اور اپنے فضل و کرم سے کوئی آنے والی بلا ٹال دیتا ہے اور مزے کی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ جو دعا پوری نہیں کرتا تو اُسے آخرت میں اجر دینے کے لئے محفوظ کر لیتا ہے۔ مطلب یہ کہ دعا کرنے میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔

(۳) دعا کرنے والا بڑا مہذب اور بات کرنے کے آداب سے واقف ہو جاتا۔ اس کی سمجھ میں یہ آ جاتا ہے کہ اپنی بات کو کسی کے سامنے کس طرح پیش کرنا چاہئے۔

(۴) دعا مانگنے سے ایمان اور یقین میں مضبوطی آتی ہے۔

(۵) دعا مانگنے سے اللہ کی توفیق بندے کے شامل حال ہو جاتی ہے پھر اللہ کا بندہ بڑے اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے وہ بے سہارا نہیں ہوتا ہے اور اکیلا پن اس سے دور ہو جاتا ہے اس کے اندر بزرگی اور بڑپن آ جاتا ہے۔

(۶) اسے خدا پر بھروسہ ہو جاتا ہے۔ دعا کی بدولت اس کی ہر طرح جیت ہے۔ دعا کو

ہوگئی تو اس دنیا میں کامیاب اور اگر اللہ نے اس کی دعا آخرت میں اجر دینے کے لئے محفوظ فرمالی تو آخرت بھی کامیاب۔ اور کیا چاہیے۔

ایک مہذب تلقین۔ حضرت ابو ہریرہ رض فرماتے ہیں کہ حضور نے ارشاد فرمایا۔ جب تم میں سے کوئی شخص دعا مانگے تو یوں نہ کہے کہ اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے۔ اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم کر۔ اگر تو چاہے تو مجھے رزق دے بلکہ اُسے پورے یقین کے ساتھ کہنا چاہیے کہ اے اللہ میری فلاں ضرورت پوری فرمادے۔

حضرت ابو ہریرہ رض ہی حضور کی بات نقل فرماتے ہیں کہ اللہ سے دعا مانگو اس یقین کے ساتھ کہ وہ قبول فرمائے گا۔

سب سے بڑا استاد

ظفر سبجونی

ملک دینار نے جب محسوس کیا کہ اس نے فلسفے کی تعلیم مکمل کر لی ہے تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب اسے سفر کرنا چاہیے اور علم حاصل کرنا چاہیے۔ اس کا مقصد اس پوشیدہ استاد کو تلاش کرنا تھا، جس کے بارے میں اُسے معلوم تھا کہ وہ اُس کے اندر ہی موجود ہے چنانچہ اس نے چند کھجوروں کی پوٹلی بنائی اور چل پڑا۔ اس کے لیے یہی زادِ راہ کافی تھا۔ کافی دور جانے کے بعد اُسے ایک درویش ملا جو اسی سمت میں جا رہا تھا۔ ملک دینار تھوڑی دیر تک تو نہایت خاموشی سے درویش کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ بالآخر درویش نے کہا: "تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"

"میں دینار ہوں اور تلاش میں نکلا ہوں۔"

"میں ملک الفاتح ہوں۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔" درویش نے کہا۔

"کیا تم مجھے اس استاد کا پتہ بتا سکتے ہو یا کم از کم اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہو جس کی مجھے تلاش ہے؟"

"کیا میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں؟ کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟" درویش نے چڑ کر کہا۔ "میں کیا کسی کی مدد کروں گا۔ میں نے تو یہ سن رکھا تھا کہ وہ استاد جس کی تمہیں تلاش ہے، انسان کی ذات میں ہوتا ہے۔ انسان اسے کس طرح تلاش کرتا ہے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اپنے تجربات سے کس حد تک فائدہ اٹھاتا ہے بس میں اتنا ہی کچھ بتا سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر درویش چپ ہو گیا۔

چلتے چلتے وہ ایک درخت کے پاس پہنچے جو ہوا سے ہل رہا تھا اور ہلتے وقت اس کے تنے میں سے ایسی آواز نکلتی تھی جیسے وہ تکلیف سے کراہ رہا ہو۔ درویش نے رُک کر درخت کی آواز سنی اور بولا: "درخت کہہ رہا ہے کہ اسے کوئی چیز چبھ رہی ہے۔ لمحہ بھر کے لیے ٹھہر جاؤ اور مجھے اس پریشانی سے نجات دلا دو!"

"مجھے جلدی ہے!" ملک دینار نے درویش سے کہا۔ "اور پھر بھلا درخت بھی کبھی باتیں کرتے ہیں؟" اور یہ کہہ کر وہ چل پڑا تو درویش بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ جب وہ چند میل آگے نکل گئے تو درویش نے کہا "مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شہد کی خوشبو آ رہی ہو۔ غالباً وہ شہد کی مکھیوں کا چھتا تھا جو درخت کو پریشان کر رہا تھا۔"

"اچھا!" ملک دینار نے کہا: "اگر یہ بات ہے تو آؤ! چلتے ہیں اور کچھ شہد اکٹھا کر لیتے ہیں۔ یہ شہد ہم کھا بھی سکیں گے اور کچھ راستے میں بیچ بھی دیں گے۔"

"اگر تم چاہتے ہو تو چلتے ہیں۔" درویش نے کہا۔

جب وہ دوبارہ درخت تک پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اُن کے پیچھے آنے والے چند اور مسافر درخت کے تنے میں سے شہد نکال رہے ہیں، کھا رہے ہیں اور کہتے جا رہے ہیں "واہ کتنا لذیذ شہد ہے۔ یہ تو بازار میں ہاتھوں ہاتھ بکے گا۔ کس قدر خوش قسمت ہیں ہم لوگ اور مقدار کتنی ہے۔ پورا شہر کھا سکتا ہے۔ پھر بھی بچ رہے گا۔ بھائیو! یہ سمجھ لو کہ اب ہمارا مستقبل محفوظ ہے۔"

دینار اور فاتح خالی ہاتھ لوٹ گئے چلتے چلتے اُن کی راہ میں ایک چٹان آئی۔ اس چٹان کی ڈھلوان سے گنگناہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ درویش نے اپنا کان زمین سے لگایا اور پھر سر اٹھا کر بولا: "یہ آواز چیونٹیوں کی فوج معلوم ہوتی ہے جو مدد کے لیے پکار رہی ہیں۔ اپنی زبان میں یہ کہہ رہی ہیں کہ ہماری راہ میں عجیب و غریب پتھر آ گئے ہیں جنھیں ہٹانا ہمارے بس کی بات نہیں

خدا کے لیے کوئی ہماری مدد کرے۔ دینار تمہارا کیا خیال ہے؟ ہم ان کی مدد کریں یا تم آگے بڑھ جانا چاہتے ہو؟"

"میرے بھائی ہم چیونٹیاں یا چٹانیں تلاش کرنے نہیں نکلے کم از کم میں تو نہیں نکلا!"

"اچھا جیسی تمہاری مرضی، ویسے ایک بات بتا دوں، ہو سکتا ہے کہ یہ چیونٹیاں اس اُستاد کا پتہ دیں جس کی ہمیں تلاش ہے۔"

لیکن دینار درویش کی بات کہاں سنتا وہ تو آگے بڑھتا چلا گیا تھا۔ بہر حال رات ہوئی تو انھوں نے راستے میں واقع ایک سرائے میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ بستر پر لیٹتے ہوئے دینار کو خیال آیا کہ وہ چٹان کے قریب اپنا چاقو بھول آیا ہے۔ چنانچہ اگلے دن علی الصبح وہ درویش کو لے کر دوبارہ چٹان تک پہنچا وہاں کیا دیکھتا ہے کہ چند افراد مٹی میں لت پت اشرفیوں کے ایک ڈھیر کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے ہیں۔ ان کے پوچھنے پر ان لوگوں نے بتایا کہ یہ اشرفیاں انھوں نے زمین سے کھود کر نکالی ہیں۔ اُن کے بیان کے مطابق وہ جا رہے تھے کہ ایک بزرگ نے اور انھوں نے بتایا کہ اگر اس جگہ کو کھودو تو تمہیں ڈھیروں اشرفیاں ملیں گی جو دوسروں کے لیے چٹانیں ہیں۔"

دینار نے اپنی قسمت کو جی بھر کے کوسنے کے بعد کہا: "اگر ہم ٹھہر جاتے اور اس جگہ کو کھود لیتے تو راتوں رات دولت مند بن سکتے تھے۔"

اس کی یہ بات سن کر ان لوگوں میں سے ایک نے کہا: "عجیب بات یہ ہے کہ ہمیں جو بزرگ ملے تھے ان کی شکل آپ کے ساتھ والے بزرگ سے بہت ملتی ہے۔"

"خیر—میں تو سمجھتا ہوں کہ سارے بزرگوں کی شکلیں ایک دوسرے سے بہت ملتی ہیں۔" اور اس کے بعد وہ درویش کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

ملک دینار اور فاتح سفر کرتے ہوئے ایک دریا کے کنارے پر پہنچے اور دریا پار کرنے کے لیے کشتی کا انتظار کرتے کرتے وہیں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ

ایک مچھلی بار بار اُچھلتی ہے اور پانی میں غائب ہو جاتی ہے۔ یہ مچھلی" درویش نے کہا۔ "ہم سے کہہ رہی ہے کہ میں نے ایک پتھر نگل لیا ہے مجھے اگر تم پکڑ کر فلاں بوٹی کھلا دو تو تمہاری مہربانی ہوگی۔ مسافرو مجھ پر رحم کر دو۔"

عین اُسی وقت ایک کشتی قریب آگئی اور ملک دینار نے حسبِ معمول آگے بڑھنے کے شوق میں پہلے درویش کو کشتی میں ڈھکیلا اور پھر خود بھی چھلانگ لگا کر بیٹھ گیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچنے کے بعد انھوں نے ایک سرائے میں قیام کیا اور صبح وہ ناشتے سے فارغ ہو کر چائے پی رہے تھے کہ کشتی والا آگیا اور درویش کا ہاتھ چومنے لگا اور بولا "بزرگوار، پچھلی رات آپ کا کشتی میں ہونا میرے لیے برکت کا باعث ثابت ہوا۔ مجھے بہت دولت ملی ہے۔"

"تم کو جو چیز ملی ہے، اس کے تم ہی حقدار ہو میرے بیٹے!"

فاتح نے کہا۔

پھر کشتی والے نے بتایا کہ کس طرح وہ دونوں کو چھوڑ کر واپس جا رہا تھا کہ دوسرے کنارے پر ساحلی ریت میں اس نے ایک مچھلی تڑپتی دیکھی۔ وہ اُچھل اُچھل کر ان جھاڑیوں تک پہنچنا چاہتی تھی، جو قریب ہی اُگی ہوئی تھیں۔ مچھیرے نے چند پتیاں توڑ کر مچھلی کے منہ میں ڈال دیں۔ پتیوں کا منہ میں پہنچنا تھا کہ مچھلی کو قے سی ہوئی تھی اور اُس نے اپنے حلق میں سے جو کچھ پھنس گیا تھا۔ نکال دیا اور اس نے مچھلی کو اُٹھا کر دریا میں ڈال دی اس سے فارغ ہو کر میں لوٹا تو دیکھا کہ وہ چیز جو مچھلی کے پیٹ سے نکلی ہے، ایک بہت بڑا ہیرا ہے۔

"تم دینار ہو!" دینار مارے غصے کے چیخ اٹھا۔ "تم تینوں خزانوں کے بارے میں جانتے تھے لیکن تم نے مجھے وقت پر کبھی نہیں بتایا کہ مجھے یہ کام کرنا ہی ہے۔ تم دوست تو نہیں ہو۔ تم جب نہیں ملے تھے تو میں اپنی بدقسمتی کا رونا رویا کرتا تھا۔ اب تم ملے ہو تو مجھے پوشیدہ خزانوں کا علم تمہاری وجہ سے ہو جاتا ہے، لیکن بہت تاخیر سے!"

ملک دینار غصے میں چیختا چلاتا رہا جب اس نے اپنی بات ختم کی اور غصہ ٹھنڈا ہوا تو اسے احساس ہوا کہ اس نے جو کچھ کھویا، اس میں اس کی اپنی غلطی بھی تھی۔ وہ شرمندہ ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا تو درویش نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ میرے بھائی۔ اگر تم سوچو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ تجربہ سب سے بڑا استاد ہوتا ہے۔

دینار اتنا شرمندہ تھا کہ اس نے سر بھی نہیں اٹھایا۔ درویش آہستگی سے اٹھا اور راستے سے گزرنے والے ایک گروہ کے ساتھ ہو لیا۔ جس میں شامل لوگ سفر کی مشکلات کے بارے میں بحث کرتے جا رہے تھے۔

غزل

شہزاد احمد

فصلِ گل خاک ہوئی جب تو صدا دی تو نے
اے گلِ تازہ! بہت دیر لگا دی تو نے

تیری خوشبو سے مرے دل میں کھلے درد کے پھول
سو گئی تھی جو ہوا، پھر سے جگا دی تو نے

میری آنکھوں میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہ تھا
اس خرابے میں یہ کیا شمع جلا دی تو نے

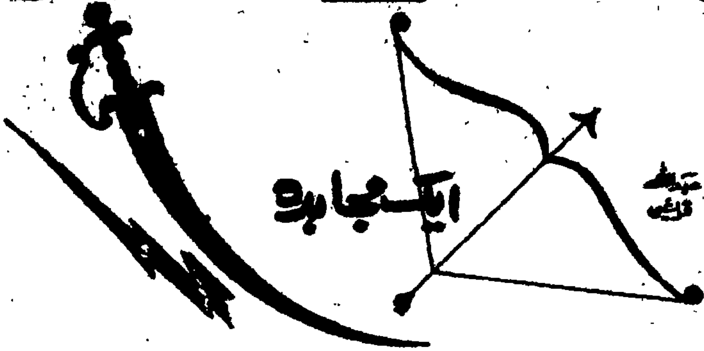
زندگی بھر مجھے جلنے کے لیے چھوڑ دیا
سبز شاخوں میں یہ کیا آگ لگا دی تو نے

میں ترے ہاتھ نہ چوموں تو یہ ناشکری ہے
دولتِ دردِ تمنا سے بھلا دی تو نے

کبھی کہہ دوں تو زمانہ مرا دشمن ہو جائے
دل کو وہ بات بھی چپ رہ کے سنا دی تو نے

وہ ترے پاس سے چپ چاپ گزر کیسے گیا
دلِ بے تاب! قیامت نہ اٹھا دی تو نے

کاش واپس بھی گویائی نہ ملتی شہزاد
بول کر آج بہت بات بڑھا دی تو نے



ایک مجاہد

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں جن لوگوں نے دمشق فتح کیا، ان کے شاندار کارناموں سے تاریخ کے صفحات جگمگا رہے ہیں۔ ۱۴ھ ۶۳۵ء میں حضرت خالد بن ولیدؓ کی سرکردگی میں دمشق فتح ہوا۔ دمشق اس زمانے میں مشہور شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی آبادی بہت کثیر تھی اور لوگ خوشحال تھے۔ قلعہ سنگ بستہ اور نہایت مستحکم تھا۔ شہر مضبوط فصیل سے محفوظ تھا اور اونچے اونچے برجوں پر منجنیق نصب تھے۔ دوہری فصیل کے اطراف میں گہری خندق پانی سے لبالب تھی۔ شہر پناہ کے مختلف دروازے تھے۔ جن میں باب جابیہ، باب الصغیر، باب توما، باب الفرادیس، باب کیسان، باب الشرقی اور باب مرقش بہت مشہور تھے۔

شہر کے گرد اگرد محافظ فوج پھیلی ہوئی تھی قلعہ والے بیرونی حملوں سے محفوظ تھے۔ مگر وہ جب چاہتے غازیوں کو نقصان پہنچا سکتے تھے کئی روز کے متواتر حملوں اور خونریز جنگوں کے بعد مطلع صاف ہوا۔ رومی قلعہ بند ہو گئے اور غازی قلعہ کے نیچے آ جمع ہوئے۔ اب حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے محاصرے کی ترتیب یوں فرمائی کہ حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کو باب جابیہ پر، یزید بن ابو سفیانؓ کو باب الصغیر پر، کاتب رسول اللہ، حضرت شرحبیلؓ بن حسنہ کو باب توما، و [illegible]

پر اور قیس بن ہبیرہ المرادی کو باب کیسان پر
متعین فرمایا اور خود باب الشرقی سنبھال لیا۔
باب مرقش ان دنوں بند پڑا ہوا تھا۔ اس پر
جنگ نہ ہونے کے باعث عربوں نے اس
کا نام باب السلامتہ رکھ دیا۔

اہل دمشق اس محاصرے سے بہت پریشان
تھے۔ لیکن ان کا حاکم توما، جو ہرقل بادشاہ روم
کا داماد تھا، اپنی جواں مردی سے ان کی ڈھارس
بندھا رہا تھا۔ قلعہ والوں کی جانب سے مزید
استحکامات اور مدافعانہ کارروائی شروع ہو گئی
جنگ کا زیادہ زور باب توما پر تھا، جہاں
توما خود ایک چیدہ لشکر کے ساتھ برسرپیکار
تھا۔ شہر کا برگزیدہ راہب انجیل مقدس
اور صلیب اعظم لیے دعائے فتح کر رہا تھا
اور اپنے آدمیوں کو مسلمانوں کے لشکر پر
تیروں، پتھروں اور ڈھیلوں سے حملہ
کرنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ اس کے
جوش دلانے پر رومیوں نے اتنا سخت
حملہ کیا کہ بہت سے مسلمان زخمی اور شہید
ہو گئے۔ ان زخمیوں میں ایک بہادر ابان
بن سعید بن العاص بھی تھے جن کو زہر آلود
تیر لگا تھا۔ تیر تو انہوں نے نکال کر پھینک
دیا اور زخم پر اپنا عمامہ کس کر باندھ لیا۔ ساتھی
جب ان کو تھام کر لے گئے تو زخم کھول کر
مرہم پٹی کرنا چاہی۔ ابان نے منع کیا کہ اس
کے کھولتے ہی جان نکل جائے گی۔ لیکن
لوگوں نے علاج کی ضرورت سے اسے
کھول ہی دیا۔ ابانؓ نے آسمان کی طرف
دیکھا اور انگشت شہادت اٹھا کر کلمۂ شہادت
پڑھا۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی ان کی روح
قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور آپ کو
شہادت نصیب ہوئی۔

اس نوجوان شہید کی شادی چند ہی
روز پہلے جنگ اجنادین کے موقع پر ہوئی
تھی۔ تیر و شمشیر کے سائے میں بیاہی ہوئی نئی
نویلی دلہن کو اس حادثہ کی اطلاع ہوئی تو
وہ راضی برضا اٹھی پر آموجود ہوئی۔ اس
کی پریشان خاطری کا اندازہ لگانا کچھ مشکل
نہیں، جس کے ہاتھوں سے ابھی مہندی
کی خوشبو بھی نہیں گئی تھی، جس کے ارمان

ہنوز تازہ تھے اور جس کا سہاگ لٹ گیا تھا۔ وہ کوئی بے انس یا بے حس نہیں تھی۔ وہ مئے محبت کا چھلکتا ہوا پیمانہ تھا، جو چکنا چور ہوا جا رہا تھا۔ اس کے دل میں محبت اور محبت میں درد تھا۔ اس میں نسائی حیا تھی۔ اور حیا کے پردے میں وہ اس شور قیامت کو چھپائے ہوئے تھی جو اس سانحہ سے اس کے دل کی دنیا میں بپا تھا۔

اس نے اپنے چہیتے شوہر کی نعش پر اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

"تم اس انعام و اکرام کے ساتھ آسودہ رہو جو تم کو عطا ہوا، تم حور عین اور سایہ پروند عالمین کی طرف سدھارے۔ اسی پروردگار نے ہم تم کو یکجا کیا تھا اور اب جدا کر دیا۔ قسم ہے اس ذات پاک کی کہ میں اس وقت تک جہاد کروں گی جب تک تم سے نہ آملوں گی۔ مجھے امید ہے کہ میری یہ آرزو ضرور پوری ہوگی۔"

نماز جنازہ کے بعد لاش دفن کر دی گئی۔ ابان کی بیوہ نے جو عتبہ کی بیٹی تھی، دین گیا، نہ چھاتی کوٹی، نہ بال نوچے نہ قبر پر گئی بلکہ صبر کی سل سینے پر رکھ کر نہایت تیزی سے ہتھیاروں کی طرف لوٹی۔ تلوار کو بوسہ دیا۔ ڈھاٹا باندھا۔ ڈھال اٹھائی اور کمان اور ترکش سنبھال کر اپنے خاوند کا قصاص لینے لشکر میں جا شامل ہوئی۔ اسے تیر اندازی میں قدرت حاصل تھی۔ وہ ایسا تاک کر تیر چلاتی تھی کہ اس کا نشانہ کبھی خطا نہ جاتا تھا۔

اس نے لوگوں سے صرف اتنا پوچھا کہ اس کے شوہر کس دروازے پر شہید ہوئے تھے یہ معلوم ہونے پر کہ باب توما پر شہید ہوئے ہیں اور خود توما نے مارا ہے، وہ اسی دروازے پر پہنچی اور شرجیل بن حسنہ کے تیر انداز دستے میں شامل ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ فصیل کے اوپر ایک شخص صلیب اعظم لیے توما کے آگے کھڑا ہے اور بار بار صلیب کے واسطے سے اپنی قوم کے لیے دعائے فتح کر رہا ہے۔ ابان کی بیوہ نے سب سے پہلے اسی کو تیر کا نشانہ بنایا۔ رومیوں سے یہ تذلیل دیکھی نہ گئی۔ خود توما پورے جوش سے شہر کا دروازہ کھول کر آگے

بڑھ آیا۔ اس کے ساتھی اس کے پیچھے آئے اس ٹڈی دل نے نہایت شدت سے حملہ کیا۔ مسلمان دیوار کے بہت قریب تھے اس لیے اوپر سے تیر و سنگ کی بارش ہو رہی تھی اور نیچے سے وہ نیزہ و تلوار کی زد میں تھے۔ شرجیل بن حسنہ نے موقع کی نزاکت کا اندازہ لگا کر اپنی فوج کو کسی قدر پیچھے ہٹ کر لڑنے کی ہدایت کی۔ لشکر کسی قدر پیچھے ہٹا اور قلعہ سے آنے والے تیروں اور پتھروں کی زد سے کسی قدر محفوظ ہو گیا۔

رومیوں نے لاکھ کوششیں کیں مگر ایک بھی کارگر نہ ہوئی۔ توما نے غلبہ کیا اور بڑھ کر دو دو ہاتھ دکھائے۔ مسلمانوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ شرجیل مقابلے کے لیے چست ہو گئے۔ توما نے اپنے ساتھیوں کو پکارا اور حملے کی ترغیب دی۔ اسلامی جرنیل کے گرد دشمنوں کا جمگھٹ جمع ہو گیا۔ اور مقابلہ بہت کٹھن صورت اختیار کر گیا۔ جس کسی نے ادھر کا رُخ کیا ابان کی بیوہ نے اس کو تیروں پر دھر لیا۔ توما کسی طرح پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیتا تھا

ابان کی بیوہ نے اس منظر کو دیکھا اور یہ معلوم کر کے کہ یہی ہرقل بادشاہ روم کا داماد توما ہے۔ جس نے اس کے شوہر کو شہید کیا ہے۔ بسم اللہ کہہ کر ایک تیر ایسا تاک کر چلہ سے چھوڑا کہ وہ ٹھیک توما کی آنکھ میں لگا اور وہ بے تاب ہو گیا۔ یہ وقت بڑا نازک تھا۔ توما شرجیل پر غالب آنا چاہتا تھا کہ اس مجاہدہ نے اس دشمن خدا کو مرغ بسمل کی طرح تڑپا دیا اور وہ اُلٹے پاؤں بھاگا۔ ابان کی بیوہ نے ایک اور تیر اس پر چھوڑا مگر اس کے ساتھیوں نے ڈھالوں کی چھاؤں میں اسے چھپا لیا۔ توما کے زخمی ہونے سے رومیوں کے حوصلے کسی قدر پست ہو گئے اور وہ پیچھے ہٹنے لگے۔ ام ابان تیر چلاتی اور اس قسم کے جوشیلے شعر پڑھتی جاتی تھی۔

"ام ابان تو اپنا انتقام لے اور ان پر پے در پے حملے کئے جا۔ رومی تیرے تیروں سے چیخ اُٹھے ہیں۔"

رومی لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ مقابلے

میں وہ شہر کا سب سے پہلے توما بھاگا۔ مسلمانوں نے تعاقب کیا اور تین سو آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ رومی قلعہ کے اندر گھس گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ توما کی آنکھ میں تیر جوں کا توں تھا اور وہ بڑے کرب اور بے چینی کا اظہار کر رہا تھا۔ شہر کے معززین اس کے گرد جمع ہو گئے اور تیر نکالنے کی تدابیر پر غور کرنے لگے مگر کسی تدبیر سے کامیابی نہ ہوئی۔ آخر تیر کی لکڑی کو کاٹا گیا اور اس کی آہنی نوک بدستور آنکھ میں چھوڑ دی گئی۔ اب آنکھ پر پٹی باندھ کر لوگوں نے چاہا کہ توما اپنے محل میں جا کر آرام کرے اور جنگ کے ارادے سے باز رہے۔ مگر وہ وہیں بیٹھ گیا۔ جب اسے ذرا سکون ہوا تو اس نے لوگوں کو ان کی کم ہمتی پر غیرت دلائی۔ ان میں نیا جوش پیدا کیا اور کامیابی کا یقین دلایا۔

دروازہ پھر کھلا۔ پھر ایک قیامت خیز جنگ برپا ہوئی اور دیر تک جاری رہی عصر کے قریب فریقین نے جنگ بندی کی اور اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ گئے۔ اہل دمشق کا نقصان جانی کافی ہو چکا تھا۔ وہ توما کے گرد جمع ہوئے اور صلاح دی گر وہ اس نے شب خون مارنے کی تجویز ان کے سامنے رکھی جسے سب نے پسند کیا۔

آنے والی رات کے وسط میں توما کی آواز پر آہن پوش نوجوانوں نے شہر کے ہر دروازے سے نکل کر مسلمانوں پر چھاپہ مسلمانوں کا لشکر اگرچہ بے خبر تھا لیکن ان کے امراء اور پاسبان چوکس تھے۔ وہ فو کیل کانٹے سے لیس ہو کر مدافعت پر کمربستہ ہو گئے۔ ہر سمت گھمسان کا رن پڑا اور کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ اب کے بھی حملے کا سب سے زیادہ زور باب توما پر تھا کیونکہ توما خود کمان کر رہا تھا۔ وہ بڑی بے جگری سے لڑ رہا تھا اور اپنی آنکھ پھوڑنے والے کو للکار رہا تھا۔ حضرت شرحبیل نے اس کی للکار کا جواب دے کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا ام ابان اس تمام جنگ میں حضرت شرحبیل کے ساتھ تھی۔ وہ اس قدر کامیاب تیر انداز کر رہی تھی کہ اس کا ہر تیر دشمنوں کے لئے

تیر قضا کا حکم رکھتا تھا اس نے سب سے اندازاً رومی ہلاک کئے۔ کسی کو اس کے نزدیک آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اب اس کے ہاتھ میں آخری تیر رہ گیا تھا اور وہ بہترین شکار کی تاک میں تھی۔ ایک رومی اس کے قریب آپہنچا اور وہ تیر ام ابان نے اس کے سینے میں پیوست کر دیا۔ رومی غصہ کھا کر حملہ آور ہوا اور اس کی مدد کو کئی سو سوار آ پہنچے جنہوں نے چاروں طرف سے ام ابان کو گھیر لیا۔

ام ابان کا تیر خوردہ مرگیا اور وہ خود ایک سوار کے ہاتھوں گرفتار ہو گئی۔ لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر صدیق رض اور ابان بن عثمان رض عین موقع پر وہاں آپہنچے اور انہوں نے اس سوار کو قتل کر کے اور دوسروں کو بھگا کر ام ابان کو رہائی دلائی۔ حضرت شرجیل کی تلوار ٹوٹ چکی تھی اور قریب تھا غالب آنے ہی والا تھا کہ ان دونوں نے بروقت پہنچ کر انہیں بھی بچا لیا اور رومیوں کو شہر کی جانب بھگا دیا۔

غزل ۔۔۔۔

یہ غزل کسی بھائی یا بہن نے برغرض اشاعت بھیجی ہے لیکن نہ اپنا نام لکھا نہ شاعر کا۔ اگر اب بھی ہمیں معلوم ہو جائے تو ہم آئندہ اشاعت میں نام شائع کر دیں گے۔

وہ جو اک عمر سے مصروف عبادات میں تھے
آنکھ کھولی تو ابھی عرصۂ ظلمات میں تھے

صرف آفات نہ تھیں ذات الٰہی کا ثبوت
پھول بھی دشت میں تھے حسن بھی جنات میں تھے

نہ یہ تقدیر کا لکھا تھا نہ منشائے خدا
حادثے سارے میری شامت اعمال میں تھے

میں نے کی حد نظر پار تو یہ راز کھلا
آسماں تھے تو فقط میرے خیالات میں تھے

میرے دل پہ تو گریں آبلے بن کر بوندیں
کون سی یاد کے صحرا تھے جو برسات میں تھے

اس سبب سے بھی تو میں قابل نفرت ٹھہرا
جتنے جوہر تھے محبت کے مری ذات میں تھے

غزلیں

نظام الدین نظام

(۱)

بارشیں سوکھے درختوں کو ہرا کرتی رہیں
چیونٹیاں لیکن تنوں کو کھوکھلا کرتی،
دل کے زخموں کو کبھی ناخن نے چھیڑا ہی نہیں
چارہ گری کوششیں اچھا بُرا کرتی۔
تازہ دم آندھی نے صورت ہی بدل دی شہر کی
ناتواں، بوڑھی فصیلیں بس گلہ کرتی۔
گھٹ کے رہ جانا کبھی آنسو رُلانا خون کے
خواہشوں کا اک یہی تو کام تھا کرتی۔
ڈوبتے ہی چاند کے روشن ہوئیں تنہائیاں
تو نہیں جو، تیری یادیں حق ادا کرتی۔
ذات کی تعریف کو الفاظ تو ملتے نہیں
کیا زبانیں تھیں کہ جو حمدِ خدا کرتی رہیں

(۲)

چیونٹیاں کرتی ہیں جیسے میٹھے پھل کو کھوکھلا
کچھ یہی برتاؤ ہے انسان سے انسا
ٹھہر کر کچھ دیر، تازہ دم مسافر چل دئے
بوڑھا برگد دیکھ کر اپنی جڑوں کو رو۔
سر پہ سورج دوپہر کا ریت ہے پیروں تلے
اور آگے بڑھ رہا ہے کیا عجب ہے آ
شاعری اچھی ہے لیکن اس قدر اچھی نہیں
شاعری کو زندگی سمجھا اگر مر جائے
عالموں نے زہر کے پیالے پئے اس شہر میں
جاہلِ مطلق کو عالم بھی نہیں سمجھا گیا
ہاں وہی اردو کا شاعر جس کو کہتے ہیں نظامؔ
خون جب تھوکے سمجھئے وہ ادب میں جی گیا

(غیر مطبوعہ)

94, B. A. Virani marg BOMBAY – 8

اس بار الوند یوسفی صاحب نے ہم سے یہ صفحات چھین لیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک آپ بیتی ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ ایک آپ بیتی ہے ہزاروں سلماؤں کی۔ ذرا پڑھیے اور بتائیے کہ میری رائے کہاں تک ٹھیک ہے۔ (م)

پیاری صفیہ! خوش رہو۔

دعوت نامہ ملا تھا۔ خط بھی موصول ہوا شکریہ۔ شادی کی تقریب میں شرکت نہ کرسکی۔ کیا کروں بہت مصروف ہوں۔ دعا کرتی ہوں خدا کرے تیرا شوہر تجھے دائمی سکون و پیار دے سکے۔ ہاں صفو! دائمی! کیونکہ عارضی اور وقتی سکون تو مجھے بھی ملا تھا ایک دن میں بھی دلہن بنی تھی لیکن آج کسی لڑکی کو دلہن بنتے دیکھ کر میرا دل کانپ جاتا ہے۔ تو سوچے گی، کیوں؟ سن لے شاید مستقبل سنوارنے میں کچھ تیری مدد کرسکے۔

آج سے تقریباً بارہ سال پہلے جب میں کالج کی ایک طالبہ تھی اس وقت کالج کا ایک لڑکا مجھے دل و جان سے چاہتا تھا۔ مجھے خطوط لکھتا تھا۔ میں پڑھ کر پھاڑ دیتی تھی۔ غصے سے لال پیلی ہو جاتی تھی لیکن صفو! جوانی کے ایام تھے۔ بالآخر بہک گئی آہستہ آہستہ وہ میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا اور میں بھی اس سے پیار کرنے لگی ہم دونوں ایک دوسرے سے چھپ کر ملنے لگے اور ملتے رہے یہاں تک کہ کالج کا دور ختم ہو گیا

گھر پر آگئی وہی گھر تھا صفو جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ جہاں میرے خاندان کے اور گھر کے افراد تھے لیکن میرے دل میں کوئی اور گھر بنا چکا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ ہر لمحہ اسی کا دھیان رہتا تھا اس کی یاد میں کھوئی کھوئی رہتی تھی دل سینے سے نکل کر کسی سے ملنے کو بے تاب تھا۔ یہاں تک کہ اس نے پیغام بھیجا۔ گھر والے رضامند نہ تھے کیونکہ بچپن ہی میں چچا زاد بھائی سے میری منگنی ہو چکی تھی

میری رضامندی پہ شادی ہو گئی

شادی کے بعد زندگی کے مزے لوٹتی رہی "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے مصداق بمبئی کی وہ کونسی مشہور جگہ ہوگی جہاں بیٹھ کر ہم نے مستقبل کے خواب نہ دیکھے ہوں وہ کونسی تھیٹر ہوگی جس میں میں نے شوہر کے ساتھ فلم نہ دیکھی ہو۔ کیا کہوں صفوا بڑے عیش کے دن کٹ رہے تھے۔ ہر آنے والا دن عید اور ہر آنے والی رات شب برات ہوتی تھی۔ دنیا کی رنگینی و دلفریبی میں کھوئی ہوئی تھی۔ بڑا مزا آرہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ میرا باغ ہستی کبھی خزاں رسیدہ نہ ہوگا۔

شادی ہوئے تین سال ہو چکے تھے میرے چمنستان محبت میں کوئی غنچہ نہ کھلا تھا یعنی میں کوئی اولاد نہ جنم دے سکی تھی۔ کیا کروں اپنے اختیار کی بات نہیں تھی بس یہی قصور تھا کہ مجھ سے بے انتہا محبت رکھنے والا شوہر کھنچا کھنچا سا رہنے لگا۔ وہ خلد زا ماحول میرے لئے جہنم کدہ بن گیا۔ سچ ہے نہ

تنہائی سے بڑھ کر نہیں دنیا میں عذاب

پھر بھی قید تنہائی کی صعوبت بھی

کرتی رہی۔ صبر کرتی رہی اور پھر چلہ ہی کا ہر روز شام کو کام سے آکر مجھے کوستا تھا۔ بھلا کہتا تھا میں ہونٹ سی لیتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد اس کی حالت میں تبدیلی نظر آئی تو میں خوش ہو گئی تھی لیکن آہ! آج بھی سوچ خون کے آنسو روتی ہوں وہ کہنے لگا۔ کل دونوں خواجہ درگاہ جائیں گے۔ یقین مانو میری روح لرز گئی تھی بچہ کی داستان سن چکی تھی جو کئی مجاوروں کے بستروں کی زینت بن چکی تھی لیکن ایک چڑیا بھی جنم نہ دے سکی اور اب تک نہ دے سکی۔

مجبوراً شوہر کے ساتھ درگاہ گئی! مگر کب تک! شوہر کام پہ چلا جاتا تھا میں تنہا جاتی تھی دو جمعرات گئی تیسری جمعرات جا سکی تھی پھر تو شوہر نے وہ پٹائی کی کہ خدا کی پناہ! بالآخر پھر جانے لگی لیکن تیسری بلا اپنی عزت و آبرو سب کچھ لٹا کر انہیں قدموں سے واپس آگئی شوہر کو خوش رکھنے کے لیے قربانی قبول کر لی گئی۔

پھر بھلا شک یقین میں تبدیل ہو گیا کہ ان مزاروں پر شیطانوں کی حکومت ہوتی ہے یہ مزارات شیاطین کے اڈے ہیں۔ صفو! شاید تو نے سنا ہوگا دنیا بھر کے بدنام ڈاکو۔ بدمعاش۔ لٹیرے۔ اسمگلر۔ مزاروں ہی میں پناہ حاصل کرتے ہیں اپنے گناہوں کو چھپانے کے لئے سجادہ نشین اور مجاور بن بیٹھتے ہیں۔

ایمرجینسی کے زمانے میں بمبئی کے کتنے داداسجادہ نشین ہو گئے۔ کئی بار درگاہوں کے تہہ خانوں میں قاتل پکڑے گئے اور وہی دادا جو آج سجادہ نشین بنے بیٹھے ہیں معاشرے میں معزز و محترم بھی سمجھے جاتے ہیں حالانکہ ان کے حلقہ ارادت میں وہی لوگ ہوتے جو شراب۔ بھنگ۔ چرس۔ افیون کے دلدادہ ہوتے ہیں۔

سوچتی ہوں قوم کے علماء اور دانشور حضرات کیا اس سے واقف نہیں آخر اس کے خلاف کیوں بغاوت نہیں کرتے۔ کب تک یہ شیطانی گروہ انسانی لبادہ پہن کر سادہ لوح عوام کو گمراہ کرتا رہے گا۔ ناموس اسلام کو رسوا کرنے والے بھیڑیئے کب تک بکریوں کی کھال میں چھپے عصمت دری کرتے رہیں گے۔

صفو! بات طویل ہو گئی ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا پھر بھی ماں نہ بن سکی۔ گھر کے سب ہی افراد مجھے کوستے رہے منحوس سمجھتے رہے آخر کار وہ وقت بھی آ پہنچا جب میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی اور میرا مستقبل تاریک ہو گیا کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی کیا کروں۔ کدھر جاؤں! کہاں جاؤں! والدین تو اس دنیا سے جا چکے تھے۔ نہ میرا کوئی بھائی تھا نہ بہن! نفس کہتا تھا سلمٰی! خودکشی کر لے تیرا کوئی سہارا نہیں تو تنہا ہے۔

شیطان کہتا تھا سلمٰی! مایوس کیوں ہے اب بھی تیرے باغ حسن میں بہار باقی ہے تو وہ پھول ہے جس پر آج بھی بھونرے منڈلانے کے لئے بے تاب ہیں، چل اور بازار حسن میں اپنی دکان سجا لے بڑے عیش کے دن کٹیں گے ممکن تھا کہ شیطان مجھے بہکا لیتا کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا! صفو! میرا ادھر ہی جا رہا تھا

جن سے کم سنی ہی میں منسوب کر دی گئی تھی۔ میں نے جس کے ارمانوں کا خون کیا تھا اسے معلوم وہ مجھے لینے آیا تھا جب اس پر میری نظر پڑی میں شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر رو لگی اور اس کے ساتھ آ گئی دو سال ہو گئے اس کے بچوں میں پل مل گئی ہوں۔ ایک ماہ پیشتر ایک بھی آیا تھا لیکن اب اور غم اٹھانے کی ہمت نہیں۔

صفو! میرے خیال میں عورت کی جو سب سے بڑی کمزوری ہے اسے لوگ محبت سمجھ ہیں وہ جس سے محبت کرتی ہے اس پر اپنا سب کچھ نثار کر دیتی ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتی کیا ہو کیا بن جائے گی۔ لیکن مرد ہمیشہ ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اس لئے کہ مرد فطرتاً خانہ بدوش ہے اور عورت وطن پرست۔

صفو! کسی کو ناراض نہ کرنا نہ جانے کل کیا ہو گا۔ ورنہ میری طرح پچھتائے گی اور ہونٹ مسکرانے کو ترس جائیں گے۔

منی کہانی

خون

سرمایہ دار: بدتمیز! شرم نہیں آتی۔ میرے دروازے پر بیٹھ کر شراب پیتا ہے۔
شرابی: "شراب ہی تو پیتا ہوں۔ کسی کا خون تو نہیں پیتا۔"

ڈرپوک

وہ دونوں پارک میں ٹہل رہے تھے۔ اچانک اُدھر سے ایک کار گذری جس کو دیکھ کر لڑکی کا چہرہ فق پڑ گیا۔ کیا ہوا لڑکے نے پوچھا۔ کار میں کون تھا؟
"میرا منگیتر" لڑکی نے جواب دیا۔

سعید احمد امرتسری محلہ روڈ لاہور

مہارانی

محمود قوری

جب فاتح سندھ محمد بن قاسم قلعے کے اندر داخل ہوا تو اس نے کیا دیکھا

یہ اس عہد کا قصہ ہے جب عرب میں حضرت امیر معاویہؓ کا زمانہ تھا۔ مسلمان فتوحات پر فتوحات حاصل کر رہے تھے اور ان کی بہادری کے قصے چار دانگِ عالم میں مشہور تھے۔

ہندوستانی علاقہ سندھ میں صبح کا وقت تھا۔ آفتاب لمحہ بہ لمحہ بلند ہو کر اپنی زریں کرنیں محل کے بلند در و دیوار اور سنہری کنگروں پر نثار کر رہا تھا۔ غلام اور داسیاں خلافِ معمول بڑے سہمے ہوئے انداز میں مصروفِ کار تھے کیونکہ آج سندھ کا راجہ چچ معمول کے برعکس صبح کی سیر کی بجائے اپنی خواب گاہ میں ہی ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تردد کا عکس اور غیر معمولی سکوت فکرِ عمیق کا پتہ دیتے تھے۔ آج اس نے نہ اپنی چہیتی رانی سوبھن دیوی پہ تحسین آمیز نظر ڈالی تھی نہ راجکمار داہر اور راج کمار دھرسنگھ کے پرنام کا جواب دیا تھا بلکہ پشت پر ہاتھ باندھے ٹہلتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل ہی اس نے اپنے خاص غلام منوراج کو مندر کے بڑے پنڈت کو طلب کیا۔ اب جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔ اسے گزشتہ شب کا سپنا یاد آ رہا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ وہ ارور (الور) کے بڑے مندر میں ایک مورتی نصب کر رہا ہے جس کا جسم سونے کا اور آنکھیں ہیرے کی تھیں اور اس کے ماتھے کے بیچوں بیچ ایک چمکتی ہوئی بندیا لگی ہوئی تھی۔ وہ حسن کا ایک مکمل شاہکار تھی کہ راجہ چچ نے کبھی ایسا روپ نہ دیکھا تھا۔ راجہ بیدار ہوا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔ یہ کیسا سپنا تھا یہ کیسی

ہو رہی تھی۔ وہ ان سوالوں پر غور کرتا رہا اور صبح ہو گئی اور اب اس خواب کی تعبیر دریافت کرنے کے لئے وہ سدر رہو متردد تھا اور رانی سوبھن دیوی اور ننھے راجکمار داہر اور دھرم سنگھ اسے سوچوں میں گم حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں منوراج حاضر خدمت ہوا اور دست بستہ عرض کیا۔

"مہاراج! پنڈت جی آئے ہیں!"

راجہ اس آواز پر چونک پڑا اس نے گردن موڑ کر منوراج کو دیکھا اور پنڈت جی کو باریابی کی اجازت دے دی۔ تھوڑی دیر بعد پنڈت جی راجہ چچ کا خواب سُن کر مراقبہ کے انداز میں سوچ رہے تھے اور راجہ امید و بیم کی حالت میں پنڈت جی کو تک رہا تھا۔ کافی دیر بعد پنڈت جی نے سر اٹھایا اور بولے۔

"مہاراج! آپ بہت جلد ایک راج کماری کے پتا بننے والے ہیں!"

یہ سُن کر راجہ کے چہرے سے تفکرات کے بادل چھوٹ گئے اور رانی سوبھن دیوی کا اطمینان ہو کر آیا۔ اسے علم تھا کہ راجہ چچ کی ایک جاٹ رانی امید سے تھی اور وہ چاہتی تھی کہ اس کے راج کماروں کے بعد اب کسی اور رانی کے بطن سے راج کمار جنم نہ لے ورنہ راج پاٹ میں حصہ دار بنے گا اور یہ تعبیر اس کی تمناؤں کے عین مطابق تھی۔ آخر اسی دن سورج غروب ہونے کی ساعت راجکماری بائی نے جنم لیا جس کا جسم سونے کی طرح چمکتا ہوا اور آنکھیں ہیروں کی طرح روشن تھیں۔ راجہ چچ نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ واقعی یہی اس کے خواب کی تعبیر تھی۔ چچ خاندان میں اتنی سندر اور موہنی صورت والی کوئی راجکماری نہ تھی۔

راجہ نے نہایت عقیدت و محبت سے اسے چوم لیا۔ اس دن ارور میں جشن منایا گیا اور پرجا کو خوشیاں منانے کی عام اجازت دی گئی۔ پنڈتوں اور نجومیوں کی موجودگی میں بڑے مندر میں سونے کی ایسی ہی مورتی نصب کی گئی جیسی راجہ نے سپنے میں دیکھی تھی اور

جو بالکل راجکماری بائی کی ہم شکل تھی، ساتویں دن راجہ چچ نے سندھ بھر کے نجومیوں اور ستارہ شناسوں کو طلب کیا اور سب کو راجکماری کی جنم پتری تیار کرنے کا حکم دیا۔ مختلف نجومیوں نے جنم پتری تیار کی جس میں ایک بات مشترک تھی۔

"راجکماری بائی سے شادی کرنے والا مطلق العنان راجہ بنے گا۔"

یہ راجہ چچ کی زندگی کے آخری دن تھے۔ کچھ ہی عرصہ بعد وہ دنیا سے رخصت ہو گیا تو اس کا بھائی چندر سنگھ کا راجہ بنا جو بدھ مذہب کا پیرو اور پنڈتوں میں وقت گزارنے والا انسان تھا چونکہ وہ پرجا کو مجبور کرتا کہ اس کا دھرم اختیار کریں لہٰذا لوگ نا اتفاقیوں کا شکار ہو کر اس سے برگشتہ ہونے لگے مگر جب چھ ماہ بعد وہ بھی اس جہان ناپائیدار سے کوچ کر گیا تو سندھ میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ یہ دیکھتے ہوئے نوجوان راج کمار داہر نے اور راجہ چندر کے بیٹے راج نے برہمن آباد میں راج پاٹ پر قبضہ کر لیا مگر ایک برس بعد ہی راج تو داہر کے دوسرے بھائی دھرم سنگھ نے برہمن آباد کی سلطنت سنبھال لی۔ ادھر یہ تبدیلی ہوتی رہی ادھر راجکماری بائی عمر کی منزلیں طے کرتی رہی۔ اور سندھ کی خوبصورت بائی کے ہم شکل ہونے کا چرچا پورے سندھ میں ہونے لگا۔ جو بھی مورتی کو دیکھتا بائی کو دیکھنے کی تمنا کرتا اور جو اسے دیکھ لیتا پاگل ہو جاتا کتنے ہی علاقوں کے راجے مہاراجے اور نوجوان راج کمار اس کے لئے دست طلب بڑھا رہے تھے مگر راجہ داہر اور راجہ دھرم سب کو مایوس کر رہے تھے۔ اب سننے میں آیا تھا کہ بھاٹیہ (بودھیہ) کے راجہ نے رانی راجکماری کے لئے پیغام بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس وقت دونوں راجوں کی ماں سوبھن دیوی اپنی سوتیلی بیٹی بائی کو بڑی تشویش کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مہارانی کے مرنے کے بعد راج کماری بائی کو سوبھن دیوی نے ہی اپنے محل میں پالا کیا تھا۔ اپنے محبوب شوہر کی نشانی راجہ

یہ اکلوتی بیٹی اسے بھی بہت عزیز تھی۔ اس نے پنڈت بھگوان داس جیسے ماہر استاد اور سندھ کے مشہور کلاکار سے باقاعدہ سنگیت کی تعلیم دلوائی تھی جن کا خیال تھا کہ سندھ کی اس حسین راجکماری کے گلے میں سرسوتی بستی ہے جب ہی تو اس کی مدھر آواز سننے والے مدہوش ہو جاتے ہیں۔ رانی سوہن دیوی سنگیت کی دیوانی اور مدھر گیتوں کی عاشق ہمیشہ بائی کے گیت شوق سے سنتی اور اس پر فخر کرتی تھی مگر اب کچھ عرصے سے اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں سوچیں گھل جاتیں۔

ان دنوں سندھ کی حکومت دو حصوں میں تقسیم تھی۔ شمالی حصے پر نوجوان راجہ داہر اور جنوبی علاقے پر راجہ دھر سنگھ حکمراں تھے اور ان کے نقطہ نظر سے اہم چیز راج پاٹ تھی۔ بظاہر دونوں بھائی ایک دوسرے کے دوست، ایک دوسرے کی حکومت کو تسلیم کر چکے تھے مگر حقیقت میں دونوں ہی ایک دوسرے کو ہٹا کر سندھ کی رجواہٹ چاہتے تھے لیکن اس تنازعہ میں داہر کا پلڑا کچھ زیادہ بھاری نظر آتا تھا۔ اس کا دانا وزیر موہن داس برہمن اس کا خاص دوسرا وزیر سی ساکر اس کا وفادار اور سندھ کا سب سے بڑا نجومی سانچ اس کا دوست تھا۔ سانچ ہر لمحہ و ہر ساعت کے لئے آنے والے حالات سے آگاہ کرتا اور موہن داس برہمن ان مسائل کو سلجھانے کی تدبیر بتاتا تھا۔ اس وزیر کا ذہن وہ کچھ سوچتا جو سندھ بھر میں کوئی اور نہ سوچ سکتا تھا۔ ان دو کے سوا سی ساکر بھی راجہ داہر کا مشیر تھا اور پرتاپ سنگھ، جے رام، اور دوسرے راجہ داہر کے خوشامدی مشیر تھے جو دربار میں صرف اپنی اہمیت جتانے کے لئے راجہ کی ہاں میں ہاں ملاتے۔

ان دنوں برہمن آباد کا راجہ دھر سنگھ پورے ایک برس بعد اپنی راجدھانی سے نکلا اور مشرقی اطراف کا دورہ کر کے وہاں کے انتظامات مکمل کرتا ہوا راجہ داہر کی دعوت پر الور آیا جہاں قلعہ کی از سرِ نو تعمیر مکمل ہو چکی تھی اور اردگرد کے گاؤں آباد ہو رہے تھے۔ الور سے

فارغ ہونے کے بعد داہر اور دھر سنگھ دونوں اپنی ماں سوہبن دیوی کی محبت میں چند دن گزارنے کے لئے محل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

شام کا وقت تھا رانی سوہبن دیوی کچھ سوچ رہی تھی جبین کی شکنیں فکر عمیق کی غمازی کر رہی تھیں اور دونوں بھائی ماں کو دیکھ رہے تھے۔ کافی دیر بعد رانی سوہبن دیوی نے دامن سکوت چاک کیا اور دھیمو سے جس بات کے لئے فکر مند تھی وہ اگل دی۔

"راج کماری بائی کو کب تک بٹھائے رکھنے کا ارادہ ہے۔ کیا تمہیں خبر نہیں اگلے پورن ماشی کو وہ پورے گیارہ برس کی ہو جائیگی"

"ہاں، دونوں راجے جیسے جونک پڑے۔ راجہ چچ کے بعد اب راج کماری کو بیاہ دینا ان ہی کی ذمہ داری ہے۔

دھر سنگھ بولا۔

"اس کے لائق بہت سے رشتے ہیں، راجکمار نرائن داس سوئمبر کے اعلان کا منتظر ہے اور راجہ بھاٹیہ کے بارے میں اطلاع ملی ہے کہ وہ پنڈت سری پرشاد کو مہارانی کے حضور بھیجنے والے ہیں" اس بات پر رانی سوہبن دیوی فخر سے مسکرائی اور بولی۔

"ہم راجہ رشل کی درخواست نہ ٹھکرا سکیں گے۔ وہ راجکماری بائی کے لئے سب سے زیادہ مناسب ہے وہ برہمن ہے، خوبصورت اور دلیر بھی اور راجہ بھی"

تینوں ماں بیٹے راجکماری بائی کی نسبت کے لئے باتیں کرتے رہے ان کے خیال میں حسین ترین راجکماری کے لئے بھاٹیہ کا جوان راجہ ہی موزوں ترین تھا۔ تھوڑی دیر بعد رانی سوہبن دیوی بولی۔

"داہر! تم کل ہی سارنج کو طلب کر کے گھڑی معلوم کرو تا کہ ہم راجکماری کی نسبت کے لئے صحیح فیصلہ کر سکیں" راجہ داہر نے اس حکم پر سر جھکا دیا اور محفل برخاست ہو گئی۔

نوجوان راجہ داہر کے دربار میں غیر معمولی خاموشی تھی وہ خود تخت مرصع پر جلوہ افروز ہونے کا بت معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے دائیں جانب سونے کی جواہرات سے مرصع کرسی پر راجہ دھر سنگھ بیٹھا جوان تھا اور سانس

کرسیوں پر بڑے بڑے سردار اور مصاحب بیٹھے ہوئے تھے جن میں وزیر موہن داس برہمن، وزیر سی ساکر، فوج کا اعلیٰ افسر رامو دوسرا بڑا افسر سبنو بھیر اور چند دوسرے عہدیدار متکبرانہ انداز سے بیٹھے ہوئے تھے۔ راجہ داہر کی صحبت نصیب ہونا معمولی بات تو نہ تھی۔ اس وقت راجہ داہر کے سامنے سندھ کا سب سے بڑا نجومی سلائچ کھڑا تھا اور ان سب کی نظریں اس پر مرکوز تھیں جس نے کئی یوم کی کاوشوں کے بعد راجکماری بائی کا زائچہ تیار کیا تھا تاکہ شادی کے لئے شبھ گھڑی کا تعین ہو سکے۔ وہ راجہ داہر کے حکم پر حاضر خدمت ہوا تھا۔ داہر بولا:

"سلائچ! راجکماری کا زائچہ کیا کہتا ہے؟"

"مہاراج!" سلائچ نے ادب سے کہا "راجکماری کا ستارہ بڑے عروج پر ہے۔ ان کی شادی آپ جس گھڑی بھی کریں گے وہ شبھ ثابت ہوگی۔"

داہر اور دھر سنگھ کے چہروں پر طمانیت کا رنگ بکھر گیا اب وہ مزید سننے کے لئے سلائچ کی جانب دیکھ رہے تھے جو زائچہ میں مصروف تھا وہ پھر بولا۔

"مہاراج! زائچہ کہتا ہے کہ راجکماری کا ستارہ اپنے پتی کے لئے مبارک ہوگا۔ جس کا سنجوگ جس سے بھی ہوگا وہ سندھ کا مطلق العنان راجہ بنے گا۔"

یہ سلائچ کے الفاظ نہ تھے بم تھے۔ دربار پر سکوت چھا گیا جیسے وہاں کوئی متنفس باقی نہ رہا ہو۔ راجہ داہر اور راجہ دھر سنگھ چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ سندھ ان دونوں کے قبضہ میں تھا جسے بانٹ کر دونوں حکومت کر رہے تھے۔ ایسے میں کسی اور کا مطلق العنان راجہ بننا ان کے راج کا خاتمہ تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ راجکماری کا کسی سے بھی سنجوگ ان دونوں کے لئے نحس تھا، ان کی بدبختی کی علامت تھا۔ لہٰذا دونوں بھائی بُری طرح بے چین تھے۔ آخر دھر سنگھ نے قدرے سنبھل کر کہا۔

"آگے بیان کرو۔"

سلائچ نے دوبارہ زائچہ پڑھا، دونوں

رابے سنتے رہے۔ آخر میں اس نے کہا۔

”مہاراج! راج کماری کی جنم پتری میں یہی بات سب سے نمایاں ہے کہ وہ سندھ کی مہارانی بن کر عمر بھر حکومت کریں گی۔ ان کا ستارہ اپنے پتی کو عروج پر پہنچا دے گا کیوں کہ بھگوان نے ان کے ماتھے پر مہارانی کا لفظ درج کیا ہے۔“

یہ سن کر راجہ داہر سوچوں میں گم بیٹھا رہ گیا۔ سلائج نے آگے کیا کہا دھر سنگھ نے کیا پوچھا، درباریوں کا ردعمل کیا تھا اسے کچھ ہوش نہ تھا بس خیال تھا تو صرف اتنا کہ بھگوان نے راج کماری بائی کے ماتھے پر مہارانی کا لفظ درج کیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ تصور گہرا ہوتا رہا۔ دربار برخاست ہو گیا، لوگ مختلف خیالات کے تحت ایک دوسرے کو راج کماری کے بارے میں یہ بتاتے ہوئے چھٹ گئے۔ کوئی راج کماری بائی کے بے مثل حسن کے مدنظر اسے اسی مقام کے قابل سمجھ رہا تھا کسی کے دل میں اس کے حصول کی تمنا چٹکیاں لے رہی تھی مگر اپنی حیثیت کے بارے میں سوچ کر کمتری محسوس کر رہا تھا اور کوئی سلائج کی ستارہ شناسی کی تعریف کر رہا تھا اور کچھ ایسے بھی تھے جو راج کماری بائی کی شادی کو سندھ میں انقلاب گردانتے تھے راجہ داہر اور راجہ کا کے لئے نحس سمجھ رہے تھے۔ مگر ان عجیب لوگوں کے خیالات ذہنوں تک ہی محدود تھے۔ انھیں الفاظ کا جامہ پہنا دینا کسی طور بھی مناسب تھا لہٰذا سب مہر بہ لب تھے۔ غرض یہ کہ اس دن جگہ جگہ جوانوں کی ٹولیاں اسی موضوع پر محو گفتگو تھیں۔ مگر راجہ داہر اور دھر سنگھ کے خیالات سب سے جدا تھے وہ کیا سوچ رہے تھے اس کا اندازہ انھیں آپس میں بھی نہ تھا نہ وہ ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ چند دنوں بعد دھر سنگھ کو برہمن آباد لوٹ جانا تھا۔ لہٰذا وہ لوٹ گیا اور اس عجیب و غریب مصیبت کا سامنا کرنے اور نرالے مسئلے کو سلجھانے کے لئے داہر تنہا رہ گیا۔

(پھر کیا ہوا یہ اگلے ماہ کے حجاب میں پڑھئے)

زمانے کی گواہی

ایک ہندو کا حسن اخلاق | بھوپال کے ایک محلہ میں ایک ممتاز سرکاری افسر رہا کرتے تھے یہ اب سے ۷۰-۸۰ سال پہلے کی بات ہے۔ جہاں وہ رہتے تھے وہ پورا محلہ ہندو معماروں اور ہندو اہیروں سے آباد تھا ایک بار اس شہر میں طاعون پھیلا اور پورا محلہ خالی ہو گیا۔ صرف دو گھرانے باقی رہ گئے۔ ایک انہی مسلمان افسر کا اور دوسرا ایک ہندو معمار کا۔ اس ہندو خاندان کے بھی سب لوگ بھاگ گئے۔ صرف ۱۴-۱۵ سال کا ایک لڑکا رہ گیا اور چونکہ ان معماروں میں کم عمری میں شادی کا رواج تھا اس لئے اس کی ۱۲-۱۳ سال کی بیوی تھی۔

ایک دن اس ہندو لڑکے کو طاعون کا بخار چڑھ آیا۔ گھر میں کم سن بیوی وہ کیا دیکھتی بھالتی۔ دوپہر کا وقت تھا وہ گھبرائی ہوئی مسلمان پڑوسی کے گھر آئی جہاں مسلمان افسر کی اہلیہ اور کنبے والے رہتے تھے۔ یہ نیک بی بی پورے محلہ میں اماں کہلاتی تھیں۔

طاعون متعدی بیماری ہوتی ہے اس لئے گھر میں وہ اس کی پابندی بھی رکھتی تھیں کہ پانی آبال کر پئیں اور گندگی نہ رہنے پائے۔

اس ہندو بچی نے جب اپنے شوہر کی کیفیت بیان کی تو وہ بے چین ہو گئیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جو دوائیں گھر میں موجود تھیں وہ تھیلی میں ڈالیں۔ برقع پہنا اور ہندو پڑوسی کے گھر جا پہنچیں۔ گھر میں ہدایات دے گئیں کہ جب بچوں کے والد آئیں تو پڑوسی کی بیماری کی اطلاع کر دیں۔ یہ بڑی بی جب پڑوسی کے گھر پہنچیں تو اس کی حالت انتہائی خراب تھی۔ ان کو علاج معالجہ کی جو تدبیر

بے چاری کرتی رہیں۔ مریض کے کپڑے صاف کئے۔ پیشاب پاخانہ کی صفائی کی۔ سر اور ہاتھ پاؤں دبائے۔ والی کو تسکین ہوئی تو گھر سے کھانا منگوا کر اسے کھلایا اور دعائیں کرتی رہیں۔ ان کے شوہر شام کو ۸ بجے کے بعد جب گھر پہنچے تو ساری کیفیت سنی چنانچہ وہ بھی اس پڑوسی کے گھر جا پہنچے اور فوراً حکیم صاحب کو بلا کر لائے۔ وہ رات ان دونوں میاں بیوی نے اس لڑکے کے سرہانے گزاری۔ دوسرے دن شوہر نے چھٹی لے لی۔ اس طرح کئی راتیں اور دن اس مریض کی تیمارداری میں گزارنے کے بعد خدا نے فضل فرمایا اور وہ بچہ بچ گیا

بعد میں یہ بیمار بچہ اپنے شہر کا بہت اچھا کاریگر بنا اور اپنی بڑی برادری کا چودھری بنایا گیا۔ اس کے تقریباً ۲۰-۲۵ سال کے بعد جب ان خاتون کا انتقال ہوا تو وہ ان کی موت پر اس طرح بلک بلک کر رو رہا تھا کہ جیسے اس کی حقیقی ماں مر گئی ہو۔ ماں کی قبر کھودی گئی تو اس نے درخواست کی کہ قبر کا صندوق وہ اپنے ہاتھ سے بنائے گا اور جب اس کا معاوضہ دیا گیا تو واپس کر کے اس رقم کو ورثا کے قدموں پر ڈال دیا کہ اسے اپنی ماں کی آخری خدمت کے طور پر قبول کیا جائے۔

زمانہ بدلتا گیا ۱۹۴۷ء آ گیا جس کے بعد ہر مسلمان کمزور اور ہر غیر مسلم اپنے آپ کو حاکم سمجھنے لگا اسی زمانہ میں ایک غیر مسلم سکھ نے ہندو محلے کے اس اکیلے مسلمان گھرانے کو نکالنے کی یہ تدبیر سوچی کہ غیر مسلموں کے گھروں پر پتھر پھینک کر شور مچا دیا کہ یہ مسلمان گھر کی طرف سے آئے ہیں۔ رات کا وقت تھا پولیس ایسے موقعوں پر کہاں آتی ہے اور آتی بھی تو اسی مسلمان گھرانے کے لوگوں کو پکڑ لے جاتی۔ گھر کے باہر بہت سے آدمیوں کا ہجوم ہو گیا تھا جنہیں بھڑکانے والے بھڑکاتے جا رہے تھے۔

عین اسی وقت پہلے ہی بیمار چودھری اپنے کنبہ کو لے کر بیچ میں آ کر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ اس گھر کے کسی آدمی کو آنچ آئی تو آدمی اگر کسی

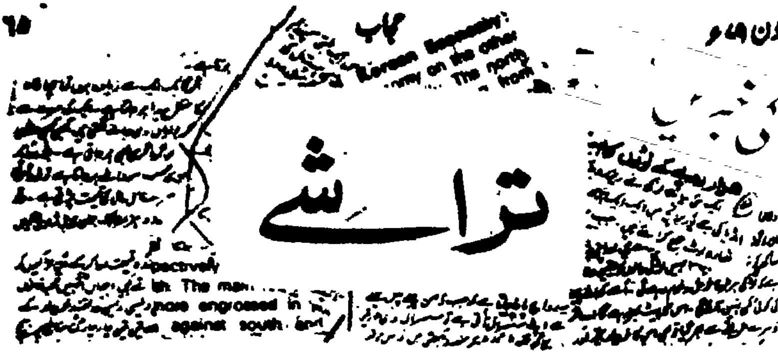
کو بھی نقصان پہنچایا گیا تو اس کی خاطر پہلا مرنے والا میں ہوں گا۔ پھر اس نے کہا کہ اس خاندان نے جس طرح محلے کو سہارا دیا ہے اس احسان کو بھولا نہیں جاسکتا اور آج کے آنے والے شرنارتھیوں کی وجہ سے ہم اس قدیم شرافت کو فراموش نہیں کر سکتے

خدمت خلق ایک ضرورت | یہ ایک مختصر سا واقعہ ہے لیکن سبق لینے کے لیے بہت کافی ہے۔ انسان کی شرافت اور اس کے محبت و خلوص کے عملی مظاہرے ضائع ہو جانے والی چیز نہیں۔ آخرت میں اس مسلم خاندان کے دونوں میاں بیوی کو اپنی بے لوث خدمت کا جو اجر ملے گا وہ تو ملے گا ہی لیکن اس دنیا میں بھی ان کے خاندان نے آدھی صدی کے بعد اس کا نمونہ دیکھ لیا۔

یہ تو ہے خدمت خلق کا ایک پہلو اور یہ ہوئی گنے چنے خاندانوں کی بات۔ لیکن فرض کیجیے ۶۔۷ کروڑ مسلمانوں کے جو ایک کروڑ خاندانوں پر مشتمل ہوں گے اگر بے لوث خدمت کا یہی جذبہ اپنالیں یہ سمجھ کر اپنائیں کہ ان کے خدا نے خلق کی خدمت کرنے اور ان کے عظیم رسول علیہ وسلم نے زمین والوں پر رحم کرنے کی کہی ہے تو کتنی روحیں ان کے حسن اخلاق سے متاثر ہونگی۔ کتنے لوگ اسلام سے قریب آئیں گے اور کتنوں کے لئے اسلام وجہ کشش بنے گا۔

یہ جو ہم پڑھتے ہیں کہ فلاں بزرگ کی تقریر کے بعد اتنے غیر مسلم افراد اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے۔ ان کی تہہ میں بھی دراصل مسلم سماج اور افراد کا حسن اخلاق کارفرما ہوتا ہے جس کے اثرات آہستہ آہستہ ہوتے ہیں اور پھر کسی بزرگ کی تقریر کی تاثیر ان دبی ہوئی لہروں میں برقی رو پیدا کر دیتی ہے اور وہ اپنی زندگی کا اہم فیصلہ کر ڈالتے ہیں۔

ہمارے عوام الناس اسلام کی خوبیاں بیان نہیں کر سکتے۔ لیکن ان کا عمل ضرور اس کی گواہی دے سکتا ہے



• خدشہ

بمبئی میں ایک طبی سمپوزیم میں بولتے ہوئے مقامی ہسپتال کی ایک مشہور لیڈی ڈاکٹر نے مشورہ دیا ہے کہ نوجوان مریضاؤں کو ادھیڑ عمر کے ڈاکٹر دیکھا کریں تو بہتر ہے نوجوان مریضاؤں کا جب نوجوان ڈاکٹر علاج کرنا شروع کرتے ہیں تو مریضاؤں کی پہلی بیماری کے ساتھ ایک نئی بیماری کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ مذکورہ لیڈی ڈاکٹر کے اس مشورے کی اور بھی ڈاکٹروں نے تائید کی اور اس خدشہ کو قریب قریب صحیح بتایا ہے۔

• رشتہ اپنی جگہ ہو جائے

شوہر نے بیوی سے کہا۔ اب کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ کر ہمیں اپنی بیٹی کی شادی کر دینی چاہیے۔"

بیوی نے اپنے بھائی بہنوں کے لڑکوں کی تعریف کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ ان میں سے کسی سے رشتہ ہو جائے تو بہت ہی اچھا رہے گا۔"

اس پر شوہر نے جھنجھلا کر کہا۔ "تم اپنے ہی خاندان والوں کے نام گنائے جا رہی ہو اور میں چاہتا ہوں کہ یہ رشتہ کہیں اچھی جگہ ہو جائے۔"

• گھور تپسیا کا پھل

جموں کی خبر ہے کہ ایک ۶۰ سالہ برہم چاری جی مہاراج کشٹرہ کے نزدیک ایک کٹیا میں بیس سال سے رہ رہے تھے۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ وہ گھور تپسیا کر رہے تھے کشٹرہ کی ایک نہایت خوبصورت لڑکی،

ان کی کٹیا میں روزانہ دودھ پہنچانے جایا کرتی تھی۔ ایک دن کٹیا کا دروازہ بند پایا گیا۔ دو تین روز یہ دروازہ بند رہا تو آس پاس کے لوگوں میں چنتا پیدا ہوئی لیکن چند دن بعد معلوم ہوا کہ چنتا کی کوئی بات نہیں۔ برہمچاری جی مہاراج نے عدالت میں جا کر اس شردھالو کنیا سے شادی کر لی ہے۔ اب وہی اپنی ۸ سالہ تپسیا ختم کر کے گرہست آشرم میں پرویش کریں گے۔ یہ لڑکی اتنی خوبصورت تھی کہ اسے کٹیا کی ملکہ کہا جاتا تھا۔

● ہزار روپے کے نوٹوں کا استعمال

ایک نئی بیاہتا لڑکی نے ریزرو بنک آف انڈیا کی جے پور برانچ میں ایک ایک ہزار روپے کے اٹھارہ نوٹ جمع کرائے ہیں۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اس کے پاس ہزار ہزار کے اتنے نوٹ کہاں سے آئے تو اس لڑکی نے بتایا۔ یہ نوٹ مجھے میرے سسرال کی ان رشتہ دار عورتوں نے دیے ہیں جو میرا منہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ یہ نوٹ میری "منہ دکھائی" کے ہیں۔ بھارت کی اکثر سٹیٹوں میں اب بھی یہ رواج پایا جاتا ہے کہ جب دلہن پہلے پہل میکے سے اپنے سسرال آتی ہے تو سسرال والی عورتیں ان کا گھونگھٹ الٹ کر منہ دیکھتی ہیں تو اس موقعہ پر "منہ دکھائی" کے طور پر اسے کچھ روپے بھی دیتی ہیں۔

● جہالت کی انتہا

پتہ نہیں، جہالت ہمارے دیش سے کب ختم ہو گی۔ ٹونے ٹوٹکے میں اعتقاد رکھنے والا ایک جوڑا کس طرح اپنے سات ماہ کے بچے کا خود قاتل بنا۔ اس کا ذکر واقعی دل خراش ہے۔

تریویندرم کے نزدیک موضع آریہ نگر میں ہر مارچ کو ایک میلہ لگا تھا۔ جس میں کچھ سادھو ہاتھی پر سوار ہو کر آئے تھے ماتین اور اس کی بیوی کو کسی سیانے نے ٹوٹکا بتا رکھا تھا کہ اگر بچے کو کسی ہاتھی کے پیٹ کے نیچے سے گزار کر اسے ہاتھی سے سونگھا لیا جائے تو بچہ بڑا ہو کر بہت مالدار

بتاتا ہے۔ مائین نے اس سیانے کے نسخے کے مطابق پہلے تو بچے کو ہاتھی کے پیٹ کے نیچے سے گزارا اور پھر ہاتھی کے منہ تک لگایا تاکہ وہ اس کو سونگھ سکے۔ ہاتھی کے منہ میں ایک ناریل تھا۔ اور وہ کڑکڑا کر کھا رہا تھا۔ جونہی مائین نے اپنے بچے کو اس کے منہ تک پہنچایا، ہاتھی نے شاید اسے دوسرا ناریل سمجھا اور فوراً اس کا سر چبا ڈالا۔ مائین کے ہاتھ میں اس بچے کا صرف دھڑ رہ گیا پولیس نے مہاوت کو گرفتار کر لیا۔ اور بعد میں اسے ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

● معجزہ

پچھلے ہفتے دو پولیس افسر موت کے منہ سے بال بال بچ گئے۔ ان کا بچاؤ کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ ہوا یہ کہ کمدھی میں مقیم ایک ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر مسٹر ناگ رتنم جب صبح کی سیر سے واپس گھر آئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کی کوٹھی کے صحن میں ان کی ایک مرغی گھاس پر بے حس بیٹھی تھی۔ مسٹر رتنم نے اسے ہلایا جلایا تو انھیں معلوم ہوا کہ وہ کسی دم کی مہمان ہے۔ انھوں نے فوراً اپنے نوکر کو اسے ذبح کر کے ناشتہ تیار کرنے کے لیے کہا۔ جب ڈش تیار ہو گئی تو مسٹر رتنم نے اپنے پڑوسی ریزرو پولیس انسپکٹر مسٹر چندر شیکھرم کو ناشتے کی دعوت دی۔ نوکر کھانا لانے کے لیے کچن میں داخل ہوا تو وہ ایک بار چلا اٹھا۔ انھوں نے دیکھا کہ جس کیتلی میں مرغی کا گوشت پکا کر رکھا گیا تھا اس کے ارد گرد ایک ناگ کنڈلی لیے بیٹھا ہے۔ دونوں انسپکٹروں کی موجودگی میں وہ ناگ وہاں سے رینگ کر ساتھ والے یارڈ میں غائب ہو گیا۔ انھوں نے کیتلی سے ڈھکنا اٹھا کر بغور دیکھا تو گوشت کا رنگ غیر معمولی طور پر نیلا پڑ گیا تھا۔ تجربے کے طور پر اس میں سے گوشت کا ایک ٹکڑا نکال کر ایک کتے کے سامنے پھینکا گیا۔ کتا اس ٹکڑے کو نوچتے ہی تڑپ کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اب دونوں انسپکٹر اس نتیجے تک پہنچے کہ ناگ روزانہ مرغیوں کے انڈے کھانے کے لیے آتا ہو گا۔ آج اس مرغی نے مزاحمت کی

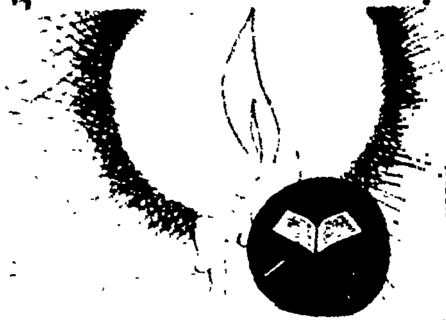
تھا اس نے مرغی کو ڈسا ہوگا۔ اس لیے اُس مرغی
کا گوشت زہر آلود ہوگیا ہے۔ لیکن اب تک
یہ معمہ حل نہیں کر سکے کہ وہی ناگ اُس کی تیلی
کے اردگرد احاطہ کیے کیوں بیٹھا تھا؟ کیا وہ
اُن کی جان بچانا چاہتا تھا؟

● رنگ و نسل کے مسئلے کا صحیح حل

امریکہ کے افریقی النسل کے باشندوں
کا مشہور لیڈر میلکم اکس، جو ایک زمانے
میں گوری نسل کے خلاف کالی نسل کے
شدید ترین تعصب کا علمبردار تھا۔ اسلام
قبول کر کے جب حج کے لیے گیا اور اس
نے دیکھا کہ مشرق، مغرب، شمال، جنوب،
ہر طرف سے ہر نسل کے لوگ، ہر رنگ کے
لوگ، ہر وطن کے لوگ، ہر زبان بولنے والے
لوگ چلے آرہے ہیں۔ سب نے ایک جیسا
احرام کا لباس پہن رکھا ہے۔ سب ایک ہی
زبان میں لبیک لبیک کے نعرے لگا رہے
ہیں۔ ایک ساتھ طواف کر رہے ہیں اور
ایک ہی جماعت میں ایک امام کے پیچھے
نماز پڑھ رہے ہیں۔ تو وہ پکار اٹھا کہ رنگ
و نسل کے مسئلے کا صحیح حل یہی ہے، نہ کہ وہ
جو ہم اب تک کرتے رہے ہیں۔ اس مرحوم
کو تو ظالموں نے قتل کر دیا مگر اس کی خود نوشتہ
سوانح عمری شائع شدہ موجود ہے۔ اس
میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ حج سے کیسا گہرا
اثر اس نے قبول کیا تھا۔

● جہیز کی لالچی سسرال کا انجام

بٹھنڈہ۔ استغاثہ کے مطابق پرسرام نگر
میں ایک نوبیاہتا لڑکی کرشنا کو شادی کے
بعد اس کی ساس، خاوند اور سسر وغیرہ تنگ
کیا کرتے تھے کہ وہ کم جہیز لائی ہے۔ اُن لوگوں
کی بدسلوکی میں کوئی کمی نہ ہوئی تو لڑکی کے
والدین نے احتجاج کیا مگر کچھ لوگوں نے بیچ
میں پڑ کر معاملہ سلجھا دیا لیکن جہیز کے لالچی اپنی
روش پر قائم رہے اور انھوں نے لڑکی کو اذیتیں
پہنچانا اور بھوکے رکھنا شروع کر دیا بلکہ دھمکی دے کر
اس سے طلاق نامہ پر دستخط کروا لیے۔ مجبور ہو کر لڑکی
کے والدین نے پولیس سے رجوع کیا۔ پولیس نے
ملزمان کو گرفتار کر لیا جنھوں نے بعد میں
ضمانتیں کروا لیں۔



حاصل مطالعہ

شمع ہدایت

یہ ظالم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں، یہ نہ سمجھو کہ اللہ اس سے غافل ہے۔ وہ تو انھیں اس دن تک کے
ڈھیل دے رہا ہے جب آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ وہ سر اٹھائے بھاگے چلے جا رہے
ہے گے، نظریں اوپر جمی ہوئی ہوں گی اور دل اُڑے جاتے ہوں گے۔

اے نبیؐ، تم انھیں اس دن سے ڈراؤ جب عذاب انھیں آ لے گا۔ اس وقت یہ ظالم کہیں
، کہ اے ہمارے رب ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے، اب ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں
ہ اور رسولوں کی پیروی کریں گے (مگر ان سے کہدیا جائے گا) کیا تم لوگ پہلے قسمیں کھا کھا کر
ں کہتے تھے کہ ہم پر کبھی زوال آنے والا نہیں ہے حالانکہ تم ان قوموں کی بستیوں میں رہ کر تے
ہ جنھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا اور تم خوب جانتے تھے کہ اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا
نہیں ان کی مثالیں دے دے کر سمجھاتے بھی رہے تھے۔ انھوں نے اپنی ساری چالیں چل دیکھیں
ن کی ہر چال کا توڑ اللہ کے پاس تھا، اگرچہ ان کی چالیں ایسی بے پناہ تھیں کہ پہاڑ بھی
ے ٹل جائیں۔

پس اے نبیؐ تم ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ اللہ نے اپنے رسولوں سے جو وعدے کیے ہیں کبھی
ے کے خلاف کرے گا۔ اللہ زبردست ہے اور انتقام لینے والا۔ انھیں اس دن سے ڈراؤ
ب کہ زمین اور آسمان بدل ڈالے جائیں گے اور سب کے سب اللہ واحد قہار کے سامنے
کل بے نقاب آ حاضر ہوں گے اس روز تم مجرموں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں ان
ہ ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہیں، تارکول کے لباس ان کے جسموں پر ہیں اور آگ کے شعلے ان

توضیح القرآن

ایک نہائت سستے ہدیے کا بہتر ترجمہ والا قرآن

خصوصیات ملاحظہ فرمائیں :-

(۱) جملہ ظاہری خوبیوں سے آراستہ۔ مجلد خوبصورت ٹائٹل۔ اوراق کے حاشیے رنگین۔

(۲) ترجمہ نہائت آسان اور عام فہم (۳) آیتوں کے ترجمے کے ساتھ ساتھ ترجمے کی عبارت میں بھی آیتوں کے نمبر لگے ہوئے ہیں۔ یہ بات اب تک کسی ترجمے میں نہیں ہے

(۴) سورتوں کے نمبروں میں ترتیبی اور نزولی دونوں طرح کی ترتیب واضح کی گئی ہے۔

(۵) سب سے زیادہ اہم خوبی یہ ہے کہ پورے صفحہ کے ترجمے کا خلاصہ چند جملوں میں کر کے ایسا واضح کیا ہے کہ نظر اس پر ٹھہر جاتی ہے۔

ہماری معلومات کی حد تک اتنے کم ہدیہ کا ایسی خوبیوں کے ساتھ کوئی ترجمہ اب تک نہیں شائع ہوا

- توضیح القرآن مجلد رف پیپر ہدیہ ۱۵/- علاوہ محصول ڈاک۔
- پانچ سے کم منگانے پر محصول ڈاک مکتبہ حجاب برداشت کرے گا۔
- توضیح القرآن مجلد گلیز کاغذ پر ہدیہ 30/- علاوہ محصول ڈاک۔

نوٹ :- پانچ یا زائد منگانے پر کمیشن 33٪۔ پانچ سے کم منگانے پر محصول ڈاک مکتبہ حجاب ادا کرے گا۔

منیجر مکتبہ حجاب رامپور، یو۔ پی ۲۴۴۹۰۱

نظر آتے ہیں

[redacted]

محمد عبدالسمیع حافظ دھامپوری
احمد علی روڈ۔ دھام پور

دیکھئے حشر کے آثار نظر آتے ہیں
ہر طرف فتنے ہی بیدار نظر آتے ہیں
حسن آوارہ کی رنگین فضاؤں سے سجے
ہر طرف کوچہ و بازار، نظر آتے ہیں
عقل حیراں ہے الہٰی کہ حقیقی بھائی
کیوں بہم بر سرِ پیکار نظر آتے ہیں
محفل رنگ میں زردار ہیں مست مئے عیش
محوِ غم مفلس و نادار نظر آتے ہیں
اسپتال آج ہر اک گھر ہے خدا خیر کرے
اب مسیحا بھی تو بیمار نظر آتے ہیں
حیف صد حیف کہ تھا سادگی جن کا شیوہ
اب وہ فیشن کے پرستار نظر آتے ہیں
اہل دنیا کو اگر دیکھئے تن ہیں چنگے
من اگر دیکھیے بیمار نظر آتے ہیں
دیکھ تو جھوٹے ہیں بالکل نئے فیشن کے رنگ
صرف ظاہر میں چمکدار نظر آتے ہیں
ہائے کیا دور ہے انسان ہی انسانوں کی
آبروریزی پہ تیار نظر آتے ہیں
آج ابلیس نے اس طرح سجائی ہے زمیں
دشت بھی گلشن و گلزار نظر آتے ہیں
اب فقط کرتے ہیں ہم بحث کلام و منطق
عمل و عزم سے بیزار نظر آتے ہیں
اہل حکمت، عقلا، اہل خرد، اہل نظر
موت کے سامنے لاچار نظر آتے ہیں
سہل و آسان ہیں سب عزم جواں کے آگے
زیست میں کام جو دشوار نظر آتے ہیں

حافظا! نرم دلوں پر نظر لطف و کرم
تیر و نشتر ترے اشعار نظر آتے ہیں

خواتین میں تبلیغ دین کے طریقے

یہ مضمون محترم ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب امیر حلقہ بہار کی فرمائش پر لکھا گیا اور انہی کی اجازت سے شائع کر رہا ہوں۔

خواتین میں تبلیغ دین کی ضرورت اور اہمیت

وہ شخص بہت زیادہ محسوس کرتا ہے جو دین اور دین کے تقاضوں سے تھوڑا بہت واقف ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم کی آیت "قوا انفسکم واہلیکم نارا" بار بار اُسے چونکاتی رہتی ہے کہ اپنے کو اور اپنی اہلیہ کو جہنم کی آگ سے بچائے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تاکید کہ مرد اپنے گھر کا راعی ہے (رکھوالا ہے) اس کو چاہیے کہ اپنے گھر کو شیطانی ہتھکنڈوں سے بچائے۔

اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے عائد کردہ اس فرض کی ادائیگی کی ضرورت اس وقت اور زیادہ ہے جب اس فرض کی ادائیگی سے کوتاہی برتنے پر اس کے نتیجے اس کے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ:۔

• اگر مرد اپنی اہلیہ کو دین کا پابند بنانے کی کوشش نہ کرے گا تو دین پر پوری طرح قائم رہنا خود اس کے لئے مشکل ہو جائے گا۔ غمی اور شادی کی تقریبات کے موقع پر بڑے بڑے متقی اور مولوی اسی لئے فیل ہو جاتے ہیں کیونکہ انھوں نے پہلے سے بیوی کو دین سے واقف نہیں کیا۔ "تکرار ٹکر دیدم دم نہ کشیدم" کے مصداق وہ ان ساری خرافات کو برداشت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو ایسے موقعوں پر محض بیوی کی ضد پر ہوتی ہیں اور اس وقت خود یا نصیحت اور دیگر ان را نصیحت کی پھبتی اس پر چسپاں ہو جاتی ہے۔

• خود اس کے بچے جو ماں کی گود میں پلتے ہیں۔ وہ باپ سے زیادہ ماں سے متاثر ہوتے ہیں۔ ماں کی دیکھا دیکھی غیر اسلامی ماحول کا اثر لیتے ہیں اور غلط راہ پر پڑ جاتے ہیں۔

• وہ اگر گھر کے باہر لوگوں سے دین پر عمل کرنے کی تلقین کرتا ہے تو اس کی یہ تلقین بے اثر ثابت ہوتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ سارے جہاں کا درد جگر میں لئے پھرتا ہے لیکن اُسے گھر کی خبر نہیں۔

• قوا انفسکم و اہلیکم نارا، کا فرض اور اس فرض کی ادائیگی سے کوتاہی کے نتیجے سامنے آتے ہی وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنے گھر کو دین کا پابند بنانے کے لئے کچھ کرے۔

خواتین میں تبلیغ کا طریقہ

شوہر خود دین کا نمونہ بنے: جو شخص چاہتا ہے کہ خواتین دین کی پابند ہو جائیں اُسے چاہیے کہ سب سے پہلے وہ خود دین کے سانچے میں ڈھل جائے۔ گھر والوں کے سامنے دین کا نمونہ بن جائے۔ جس بات کو وہ حق سمجھتا ہے اُسے مضبوطی سے پکڑ لے اور کسی حال میں بھی حق کو نہ چھوڑے ورنہ گھر کی اصلاح کرنے میں ناکام رہے گا۔ فرض سے کوتاہی اور فرض کی ادائیگی کی کچھ مثالیں ہم بیان کرتے ہیں۔ گھروں میں یہ عام طور پر دیکھی اور سنی جا سکتی ہیں۔

• گھر میں مرد ایک مزدوری کام میں مشغول ہے۔ اسی وقت ایک شخص دروازے پر آکر پکارتا ہے۔ اب گھر کا مرد بیوی سے کہتا ہے کہ کہدو "گھر میں نہیں ہیں"۔ ظاہر ہے کہ جب بیوی یہ کھلا ہوا جھوٹ دیکھے گی تو کیا ہ نمازی اور پرہیزگار شوہر ہو، اس کی کیا حیثیت اس کی نظر میں رہ جائے گی۔

• گھر کا ایک بچہ باہر سے کوئی چیز لے آیا پوچھا گیا کہ کہاں سے لایا۔ اس نے بتایا کہ باہر پڑی ہوئی ملی۔ اب اگر مرد اُسے کچھ نہیں کہتا تو گھر کی عورت یہ سمجھتی ہے کہ اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔

• غصہ آنا فطری بات ہے لیکن اگر شوہر غصے میں گھر کی چیزیں توڑتا ہے اور بیوی پر غصہ اُتارتا ہے تو عورت ایسے شوہر کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔ ظاہر ہے کہ پھر وہ شوہر چاہے کیسی اچھی بات بتائے وہ اس

کان سے سنتی ہے اور اُس کان سے اُڑا دیتی ہے۔ ایسے موقع پر گھر کے مرد کو کاظمین الغیظ پر عمل کرنا چاہیے۔

عجیب بات ہے کہ ایک شخص دین کے تقاضوں کو سمجھ کر باہر تبلیغ کرنے جاتا ہے تو وہاں گالیاں بھی سننے کو ملتی ہیں وہاں تو بڑی سی بڑی بات برداشت کر لیتا ہے لیکن گھر میں آکر بیوی کے لیے معافی کا جذبہ نہیں رکھتا۔ دال میں نمک زیادہ ہونے پر ہانڈی بیوی کے سر پہ دھمک دیتا ہے تو اسے یہی کہا جائے گا کہ وہ باہر جا کر چند منٹ کے لئے تقویٰ کا ایکٹر بن جاتا ہے اور بس۔

• مرد تلقین کرتا ہے کہ حرام مال سے بچنا چاہیے، لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ بہت سی حرام باتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جھوٹ بولنا حرام ہے۔ غیبت حرام ہے چغل خوری حرام ہے۔ رشوت لینا اور دینا حرام ہے۔ بہت سی رسمیں حرام ہیں۔ وہی مرد کسی نہ کسی طرح ایسی حرام باتوں کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ اس کا اثر گھر پہ یہ پڑتا ہے کہ ان حرام باتوں سے بچنے کی فکر کم ہو جاتی ہے اور ایسی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو اچھے اچھے دیندار مرد کے گھر میں ہوتی رہتی ہیں اور کسی کو احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔ چیز اُٹھانے پر بچے ہی سے ایسی جگہ رکھوا دے جہاں سے اس نے اٹھائی تھی اور اس وقت بتلائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گری پڑی چیز اُٹھانے سے روکا ہے تو اس کا اثر بھرپور ہوتا ہے۔ اسی طرح چاہے ایک روپیہ حرام کا ہاتھ آتا ہو، اس پر لات مار دے تو غیر ممکن ہے کہ بیوی اثر نہ لے۔ اثر ہی نہ لے بلکہ اس کے دل میں شوہر کی عظمت بڑھ جاتی ہے اور وہ غیر شعوری طور پر اس کے عمل کو قبول کر لیتی ہے۔

• نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ سے شادی کی اس وقت ام المومنین کے سامنے حضورؐ ایک امانت دار انسان تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر اس ہستی سے شادی کر لی

جائے اور اپنی تجارت سپرد کر دی جائے تو تجارت خوب چلے گی لیکن پھر جب قریب سے حضورؐ کو دیکھا تو انسانیت کا مکمل نمونہ پایا۔ اس بات نے ان کو اس قدر متاثر کیا کہ جب حضورؐ نے اللہ کے حکم سے اپنے نبی ہونے کا اعلان کیا تو حضرت خدیجہؓ نے کسی جھجک کے بغیر اقرار کر لیا۔ اور پھر اپنا مال دین کو آگے بڑھانے میں لگا دیا۔

• ایک اور مثال حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ملاحظہ ہو۔ جب آپ خلیفہ بنائے گئے تو آپ نے تمام طمطراق اور شان و شوکت کی ساری چیزیں ہٹا دیں۔ اہلیہ محترمہ حضرت فاطمہ کے پاس باپ کا دیا ہوا ایک موتی تھا۔ (وہ باپ جو خلیفہ تھا اور اس نے بیت المال سے وہ موتی بیٹی کو دیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا کہ یا تو یہ موتی بیت المال میں داخل کر دو یا مجھ سے الگ ہو جاؤ۔ بیوی شوہر کے کردار سے واقف تھی اپنے شوہر کا ساتھ پسند کیا اور موتی بیت المال کو بھجوا دیا۔

• ایسی ہی کچھ مثبت مثالیں میں نے اپنے رفقاء میں دیکھیں۔ ایک رفیق کی اہلیہ پر نیند کا غلبہ زیادہ تھا۔ ایک بار گھر میں دودھ آیا۔ بے چاری سے غفلت ہو گئی۔ سو گئی اور دودھ بلی پی گئی۔ جاگی تو گھبرائی۔ میاں گھر میں آئے۔ بیوی کو گھبرایا ہوا دیکھا۔ وجہ پوچھی۔ ڈرتے ڈرتے بیوی نے بتایا کہ بلی دودھ پی گئی۔ اس پر ہمارے رفیق نے کہا کہ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دودھ میں کچھ خرابی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس خراب دودھ سے ہمیں بچا لیا۔

اب آپ غور فرمائیے اس جواب کا اثر بیوی پر کیا ہوا ہو گا۔ ہمارے رفیق کا کہنا ہے کہ اس سے دو فائدے ہوئے اول یہ کہ بیوی کو اس پر بھروسہ ہو گیا۔ اور وہ میری بہترین اطاعت گذار بن گئی۔

• ہمارے ایک رفیق کی شادی ایک ایسے خاندان میں ہوئی جہاں رسم و رواج کو دین سمجھ کر برتا جاتا تھا۔ یہ رفیق ترک وطن کر کے آئے تھے۔ شادی کے بعد بیوی نے ایک رسم کا ذکر کیا اور اس کی اہمیت یہ بتائی کہ اگر یہ رسم نہ کی گئی تو میرے خاندان والے میرے گھر نہیں

آئیں گے۔

بڑا نازک معاملہ تھا۔ ہمارے رفیق نے بڑی خوبصورتی سے بیوی کو ہمنوا بنایا۔ کہا کہ دیکھو میں یہاں کا رہنے والا نہیں۔ ہمارا تمہارا خاندان بھی الگ الگ۔ سوچو پھر وہ کیا اصل ہے جس کی بنا پر ہماری تمہاری باہم شادی ہو گئی۔ بیوی جواب نہ دے سکی تو خود بتایا کہ وہ اسلام ہے جس کی بنا پر ہم تم دو اجنبی نکاح کے بندھن میں بندھ گئے۔ پھر کیوں نہ ہم اسلام کو کسوٹی مان لیں اور جو باتیں ہمیں اسلام سے ملے وہ اپنا لیں اور جو بات اسلام میں نہ ہو اُسے ترک کر دیں۔

یہ بات بیوی کے ذہن میں بیٹھ گئی۔ پھر اس رسم کی تحقیق ہوئی۔ فتویٰ پوچھا گیا۔ فتویٰ آیا کہ یہ رسم اسلام کے خلاف ہے چنانچہ رسم نہیں ہوئی۔ شوہر کے حسن تدبیر سے نہ صرف یہ کہ بیوی کے گھرانے کے لوگ آنے لگے بلکہ بہت سے گھرانوں سے وہ رسم ختم کر دی گئی۔

ایسی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں میرا یقین یہ ہے کہ اگر شوہر خوبصورتی اور نرم کلامی کے ساتھ بیوی کو دین کی طرف راغب کرے تو امید رکھنا چاہئے کہ اللہ توفیق بخشے گا۔

گھر میں اللہ کا ذکر کرنا دوسرا بہترین طریقہ یہ ہے کہ شوہر یہ کوشش کرے کہ گھر والوں کو خصوصی طور سے بیوی کو دین کی باتیں بتاتا رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ ازواج مطہرؓ صحابہ کرام رضؓ اور بندگان دین کے حالات بتاتا رہے۔ یہ حالات وعظ کے طور پر نہیں بلکہ گھر میں جب کوئی واقعہ پیش آ جائے یا کوئی بات دیکھے سنے تو اس وقت توجہ دلائے کہ اس موقع پر اللہ کا یہ حکم ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر یہ اور یہ کرتے تھے اور بندگان دین کے یہاں یہ بات یوں ملتی ہے۔

خاص طور پر عفو و درگزر کا طریقہ اختیار کرے۔ بیوی کو ہمنوا بنانے کا سب سے اچھا طریقہ وہی ہے جو حضورؐ نے بتایا کہ دن میں ستر بار بیوی کو معاف کرو۔

اس جگہ ہمارے ایک رفیق کا پر لطف

قصہ سنئے۔ ایک بار بیوی سے کھٹ پٹ ہوگئی اور ایک نے دوسرے سے بولنا چھوڑ دیا۔ یہ جھگڑا عصر کے وقت شروع ہوا تھا۔ تیسرے دن عصر سے ایک گھنٹہ پہلے ایک بزرگ خاتون دونوں کو سمجھانے کی غرض سے تشریف فرما تھیں۔ اس وقت میاں صاحب باہر سے تشریف لائے تو دروازے ہی سے پکارا "ارے بھئی سنتی ہو۔ دیکھو تو میں کیا لایا ہوں؟"

وہ بزرگ خاتون اور بیوی دونوں حیران کایا کیسے پلٹی۔ بزرگ خاتون نے حیران ہو کر پوچھا تو ہمارے رفیق نے بتایا۔ آج جھگڑے کا تیسرا دن ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی مومن کسی مومن سے زیادہ روٹھا نہ رہے۔ ہماری ان بن کو عصر کے وقت تین دن پورے ہونگے۔ میں نے گھنٹہ بھر پہلے ہی حضورؐ کے ارشاد پر عمل کیا۔

ہمارے اسی رفیق نے مجھے بتایا کہ اس پر وہ بزرگ خاتون اتنا متاثر ہوئیں کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور بیوی کا یہ عالم جیسے اسے کونین کی دولت مل گئی۔

اس قصے میں ایک تفریح کی بات اور ہوئی بیوی نے کہا۔ آخر کار آپ مجھ سے ہار ہی گئے نہ میاں نے جواب دیا نہیں، میں جیتا میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر تم سے پہلے عمل کیا اور اس طرح ہار کر تم کو جیت لیا۔ بیوی نے تسلیم کیا کہ واقعی آپ ہی جیتے۔

یہ دلچسپ واقعہ میں نے اس لئے نہیں سنایا کہ آپ محظوظ ہی ہوں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ موقع اور محل سے خوبصورتی کے ساتھ دین کی ایک نہ ایک بات پہنچاتے رہنا چاہیے زبان سے یا کتاب سے۔

میرے ایک رفیق کی عادت ہے کہ صبح گھر میں جب ناشتہ کی تیاری ہوتی ہے تو بیوی بچوں میں گھس کر خود بیٹھتے ہیں اور وہاں قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی بلند آواز سے کہہ اٹھتے ہیں، واہ! کیا بات فرمائی۔ بیوی پوچھنے لگتی ہے۔ "کیا بات ہے؟" اس وقت وہ قرآن کا ترجمہ سناتے ہیں۔ ان کی بیوی نے ایک بار مجھ سے کہا کہ میں آپ کے بھائی کو روٹی پکا کر کھلاتی ہوں اور وہ قرآن

کی باتیں پکا پکا کر میرے کانوں کے ذریعہ میرے دل میں پہنچاتے ہیں۔

گھریلو اجتماع

گھریلو اجتماع کے سلسلے میں اس جگہ میں اگر یہ بات عرض کر دوں تو اسے جماعتی عصبیت نہیں کہنا چاہیئے۔ جماعت اسلامی کے تربیتی پروگرام میں حالانکہ پہلے ہی دن سے گھر کی اصلاح پر زور دیا گیا ہے لیکن اب جو پالیسی ہمیں ملی ہے۔ اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسی فیصدی قوت ہمیں گھر کی تربیت کرنے میں لگانا چاہیئے۔ تاکیدی سرکلر ہے کہ ہر رکن جماعت ہفتہ میں ایک بار باقاعدہ گھر میں اجتماع کرے اس میں اس کے گھر والے شریک ہوں۔

سوچئے، گھر میں ایک خاص دن، ایک خاص وقت، ایک خاص اہتمام کے ساتھ بیٹھنا بچوں اور بڑوں کے لئے کس درجہ مفید ہو سکتا ہے۔ آپ انھیں علم مجلس کی بات بتائیں گے۔ اجتماع میں ادب سے بیٹھنا چاہیئے۔ صحابہ کرام رض حضور ص کی خدمت میں اس طرح ادب اور خاموشی سے بیٹھتے تھے جیسے ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوں یعنی بے جا حرکت بھی نہیں کرتے تھے۔

آپ اپنے بال بچوں کو بتائیں گے کہ صحابہؓ ہمہ تن گوش ہو کر حضورؐ کی باتیں سنتے تھے۔ حضور ص نے فرمایا ہے کہ مجلس میں پھلانگ کر آگے نہ جاؤ بلکہ جہاں جگہ مل جائے وہاں ادب سے بیٹھ جاؤ۔

ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اجتماع میں کچھ لوگوں کو کھڑے ہوئے دیکھا آپؐ نے فرمایا۔ بیٹھ جاؤ۔

اس وقت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ گھر سے آ رہے تھے وہ اجتماع سے دس بارہ قدم دور تھے۔ حضورؐ کا ارشاد سنا کہ بیٹھ جاؤ تو وہیں بیٹھ گئے۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رض کا یہ اسوہ آپ جا ہے جیسے بگڑے ہوئے اور بدتمیز لڑکے کے سامنے پیش کریں گے وہ متاثر ہوگا۔ ذرا عمل کر کے دیکھئے تو!

گھریلو اجتماع میں درس قرآن، درس حدیث صحابہ کرامؓ اور بزرگوں کے حالات۔ نبیوں کے قصے، مسئلے مسائل، شرک، بدعت اور دوسرے گناہ کی باتیں۔ جنت کی ترغیب، دوزخ کی ہولناکی، یہ سب عالمانہ انداز میں نہ ہو۔ بلکہ نہایت سادہ زبان میں ہو جیسے بچے اور بڑے سب ہضم کر سکیں۔ دھیرے دھیرے گھر کے اجتماع کی باگ ڈور بیوی کے ہاتھ میں دیتے رہنا چاہیے تاکہ چار چھ ماہ میں وہ خود اجتماع کی کارروائی انجام دینے کے لائق ہو جائے۔

گھر کی عورت اگر یہاں تک پہنچ جائے تو سمجھ لیجیے کہ آئندہ سو برس تک کے لئے یہ اثر کام کرے گا۔ ایک عورت کا سنبھلنا ایک گھر کا سنبھلنا ہے۔ ایسے گھر کی تربیت یافتہ لڑکیاں جہاں بیاہ کر جائیں گی وہاں تک اثر پھیلے گا اور یہ صدقہ جاریہ گھر کے قیم کے کھاتے میں درج ہو گا۔

گھر کا اجتماع کرنا بہت ہی پتّے ماری کا کام ہے۔ بڑے استقلال کی ضرورت ہے۔ اگر استقلال کے ساتھ ہوتا رہے تو یقیناً کامیابی ہو گی۔

گھر کے اجتماع کے اثرات آس پاس

اگر ایک آدمی اس طرح خاموشی اور استقلال کے ساتھ اپنے گھر کی اصلاح میں لگ جائے تو اسے صرف گھر کی اصلاح ہی نہ سمجھئے۔ اس طرح دراصل آپ ایک بہت بڑے الاؤ کو سلگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گھر کا اجتماع پاس پڑوس سے چھپا نہیں رہ سکتا۔ رشتہ داروں سے چھپا نہیں رہ سکتا۔ ملنے جلنے والوں اور ملنے جلنے والیوں سے چھپا نہیں رہ سکتا۔ پہلی پڑوسنیں دھوبنیں، بھنگیں وغیرہ یہ سب جان جائیں گی۔ ایک ایک کر کے یہ اجتماع بہت سی عورتوں کو متوجہ کرلے گا۔ آپ بیوی کو بتایئے کہ ان میں سے سمجھ دار خاتون کو چن چن کر کبھی کبھی اس سے کارروائی کرائے۔

مثل مشہور ہے کہ دیئے سے دیا جلتا ہے ایک گھر کا اجتماع بہت سے گھروں کو متاثر کرتا ہے۔ دیئے سے دیا جلا یا جائے تو ہر گھر میں روشنی

پھیل سکتی ہے۔ اس طرح کہیں مرد عورتوں کی اصلاح کا سبب بنے گا اور کہیں عورتیں اپنے گھر والوں کی راہ پر لگا لے جائیں گی۔

ہلکا پھلکا دینی لٹریچر

دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والے مردوں ہی کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ عورتوں کے لئے ہلکا پھلکا دینی لٹریچر فراہم کریں۔

ہلکے پھلکے دینی لٹریچر کے پھیلاؤ کا طریقہ اگر اندھا دھند نہیں بلکہ منظم طریقے سے انجام دیا جائے تو اس کے اثرات بہت گہرے پڑتے ہیں۔ منظم طریقے کے معنی یہ ہیں کہ مرد عورتوں کے لئے ایک لائبریری کا انتظام کریں۔ اس لائبریری سے کتابیں پڑھی لکھی عورتوں تک پہنچائی جائیں۔ ان عورتوں کے گھر کے مردوں سے ربط پیدا کیا جائے۔ مردوں کو متوجہ کیا جائے کہ وہ اس کام میں اپنی عورتوں کی مدد کریں۔ اس کے بعد جن عورتوں کو اللہ توفیق دے وہ کسی شادی غمی کی تقریب میں ملاقات کے وقت یا اور جن موقعوں پر ملیں مشورے ہوں کہ جن گھروں کے مرد ایسی باتوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں انھیں کس طرح تعاون پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔

نوٹ:۔ عورتوں کے لئے ایسے رسالے بھی فراہم کرنا مردوں ہی کی ذمہ داری ہے جن کے مضامین اندازِ بیان کے اعتبار سے زنانے کے ذوق کے مطابق ہوں لیکن ان میں دین اس طرح سمویا ہو جیسے کیپسول کے اندر دوا رکھی ہوتی ہے۔

غیر فطری طریقے

آئے دن عورتوں کے اجتماعات محلے بستی میں کرنا۔ سواریوں میں لدلدا کر عورتوں کا اجتماعات میں پہنچنا۔ مردوں کا ان کے ساتھ ہونا۔ اجتماع کے بعد مردوں کا ان کو لینے جانا۔ عورتوں کی عدم موجودگی میں بچوں کی دیکھ بھال کا مسئلہ یا پھر بچوں کو بھی اجتماعات میں لے جانا اور ان بچوں کا چیخنا چلانا۔ سواری کے اخراجات کا اثر مردوں کی

جیب پر پڑتا۔ یہ اور اس طرح کی باتیں ایسی ہیں کہ ہر سال میں ایک دو بار تو کسی نہ کسی طرح گوارا کرسکتا ہے۔ زیادہ نہیں۔ وہ جائزہ لیتا ہے کہ ایسے اجتماعات سے عورتیں کیا سیکھ کر آئیں۔ وعظ و تلقین کتنا ان کے پلے پڑا۔ مکے گئیں، مدینہ گئیں، کربلا گئیں۔ جیسی گئی تھیں ویسی ہی ہر پھر کے آگئیں تو بیکار ہے۔ میں اپنے تجربوں کی روشنی میں عرض کرتا ہوں کہ یہ غیر فطری اور سطحی طریقے مفید نہیں بلکہ پریشانی کا باعث ہیں۔ فطری طریقہ وہی مفید بھی ہے جو میں نے اوپر بیان کیا۔ گھر میں لگی ہوئی آگ نہ بجھانا اور سارا ہر پانی لیے ہوئے ڈھونڈنا کہ کہاں آگ لگی ہے بالکل غیر فطری ہے ☆

انمول تحفہ

(افسانہ)

ابا نو شاہین۔ سری پیٹھ میدک اے پی

چنبیلی کے سفید سفید پھولوں کے گلدستہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں سوچنے لگی۔ قدرت نے ہمیں کیسی کیسی خوشبوئیں عطا فرمائی ہیں۔ کتنے خوبصورت لگ رہے ہیں یہ پھول۔

خدایا! تو کتنا مہربان ہے۔ اگر زمین پر یہ خوشبودار پھول نہ اُگاتا تو دنیا میں گندگیوں کا مداوا کس طرح ہوتا۔ میٹھا سرور ملتا ہے ان پھولوں کے سونگھنے سے۔

قرآن حکیم میں بالکل سچ فرمایا۔ "میری کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"۔ بیشک یہ تیری قدرت ہے کہ اتنے چھوٹے سے بیج کو تناور درخت میں بدلتا ہے۔ ان کی ڈالیوں و پتوں میں رنگ برنگے لطیف خوشبو والے پھول کھلانے پر تو ہی قادر ہے۔

یہ گلدستہ فوزیہ نے یہ کہتے ہوئے دیا تھا کہ چونکہ تمہارا نام یاسمین ہے اور عربی میں یاسمین کے معنی ہیں چنبیلی۔ اس لیے میری نظر میں شائد تمہارے لئے اس سے بہتر میں اور کوئی تحفہ نہیں۔

—— اور —— میں سوچنے لگی کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندوں کے لیے بھی یہ کی انمول نعمت سے کم نہیں۔

مہاسے

ڈاکٹر ناظمہ بشیر

نوجوانی کے آغاز میں مہاسے اکثر پریشانی کا سبب بنتے ہیں اور ہم بڑے بوڑھوں سے یہ بھی سنتے آئے ہیں کہ مہاسوں اور جوانی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یعنی جوانی کی منزل میں قدم رکھتے ہی مہاسوں سے سابقہ پڑنا لازمی ہی ہے۔

لیکن اس کہاوت کی کوئی طبی بنیاد نہیں کیونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اگر بچپن ہی سے خوراک پر خاص توجہ رکھی جائے تو مہاسے نکلتے ہی نہیں۔ خوراک کے ساتھ ساتھ اگر ہم اپنی جلد یعنی کھال کی صفائی کا بھی خیال رکھیں تو مہاسوں سے نجات مل جاتی ہے۔ مہاسے اکثر ۱۲ سے ۲۵ سال کی عمر میں ہی نکلتے ہیں اور عام طور پر ان کا حملہ چہرے پر ہی ہوتا ہے لیکن کبھی یہ پھیل کر پیٹھ اور سینے پر بھی نکل آتے ہیں۔

بازاروں میں بڑے بڑے اشتہاری دعووں کے ذریعے نئی نئی کریم اور دوسری دوائیں بکتی ہی رہتی ہیں اور اکثر ناسمجھ نوجوان دواؤں کو بے سوچے سمجھے صرف اشتہاروں سے متاثر ہوکر استعمال بھی کرنا شروع کر دیتے ہیں اور مہاسوں سے نجات پانے کے چکر میں سیکڑوں روپے خرچ کر ڈالتے ہیں۔ لیکن وہ اس چھوٹی سی بات کا خیال نہیں کرتے کہ اگر اپنی جلد کو صاف رکھنے کے ساتھ ساتھ اگر چکنائی والے کھانوں کا استعمال بند کر دیں تو بڑی آسانی سے خود بخود ان کا علاج ہو سکتا ہے۔

میں نے اپنے بہت سے مریضوں سے مہاسے، ان کے کھانے پینے کی عادتیں بدلوا اور ان کا نظام ہاضمہ درست کر کے ٹھیک

گئے ہیں۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ اس عمر میں لڑکے لڑکیاں چاٹ، سالوں اور دوسری چکنائی والی چٹپٹی چیزوں کی طرف زیادہ راغب ہونے لگتے ہیں اور ساتھ ہی چہرے پر کریم پاؤڈر لگانا شروع کر دیتے ہیں جس کے بعد مہاسوں کا نکلنا ناگزیر سا ہو جاتا ہے کھانے کا اس بیماری سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اگر ہمارے کھانے میں مناسب مقدار میں حیاتین اور پروٹین موجود نہ ہو تو ایسا کھانا متوازن کھانا نہیں رہتا جس سے مہاسوں کے علاوہ دوسری بیماریاں بھی اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ اس سے جلد پر خشکی آسکتی ہے اور بالوں پر بھی برا اثر پڑ سکتا ہے اور وہ اپنی چمک کھو سکتے ہیں۔ اگر کھانے میں ہری سبزیاں، پھل، دودھ اور دہی مناسب مقدار میں استعمال ہوتا رہے اور ساتھ ہی جلد اور بالوں کی صفائی بھی باقاعدگی سے ہوتی رہے تو مہاسے کبھی کسی کو پریشان نہیں کر سکتے۔

یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر مہاسوں کی بروقت روک تھام نہ کی جائے تو یہ سنگین شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ مہاسوں کو نوچنا یا کھرچنا نہیں چاہیے ایسا کرنے سے جو لیسدار مادہ نکلتا ہے۔ وہ نئے مہاسوں کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کی جگہ ہلکے گرم پانی سے چہرے کو دھونا اور صاف کپڑے سے پونچھنا چاہیے لیکن سب سے بڑی حکمت یہی ہے کہ متوازن کھانے کی طرف خاص توجہ دی جائے۔

(پریس ایشیا انٹرنیشنل)

چٹنی کی ترکیب :۔

املی کا گودا	پاؤ پیالی
لال مرچ	۲ عدد
ہری مرچ	۴ عدد
پودینے کی پتیاں	ایک چمچہ
چینی	۲ چائے کے چمچے
نمک	حسبِ ذائقہ

املی کو ایک پیالی پانی میں دو گھنٹے کے لیے بھگو دیں، پھر ہاتھ سے مل کر چھلنی سے چھان لیں۔ پھوک پھینک دیں۔ باقی کی تمام چیزوں کو مل کر باریک پیس کر املی کے گودے میں ملا لیں چٹنی تیار ہے۔ پھلوں کے ساتھ کھائیں۔ ختم

جنگل کی شہزادی کا سوئمبر

(رونق دکنی سیمابی)



شیر کو جنگل کا بادشاہ کہا جاتا ہے اور یہ غلط نہیں کہا جاتا جبکہ رنگ روپ اور طاقت و جرأت میں جنگل کے تمام جانوروں میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ اس کے رہن سہن اور اپنی خوراک کے لئے تازہ شکار کے طور طریق سے بھی وقار بلند ظرفی اور تمکنت واضح ہوتی ہے۔ مادہ جب گرم ہوتی ہے تو فوری تسکین کے لئے نر کا طریقۂ انتخاب بھی ایک انوکھی شان رکھتا ہے جب اس پر اس قسم کے دورے پڑتے ہیں تو وہ ایک ناقابلِ بیان دلدوز اور کھوکھلی آواز نکالتی ہے جس کی گونج سے جنگل کا گوشہ گوشہ دہل اٹھتا ہے۔ مجھے جنگل میں آزادی سے چلتے پھرتے جانوروں کی تصویریں کھینچنے کا شوق ہے۔

اور اسی جذبہ کے تحت ایک بار جب کہ میں جون کے گرم دنوں میں آسام کے جنگلوں میں گھوم رہا تھا تو سامنے کی ایک گھنی جھاڑی میں حرکت سی ہوئی اور میں ٹھٹک کر کھڑا رہ گیا۔ اس جھاڑی سے ایک دو لمحے بعد شیرنی کی دلدوز پکار سنائی دی۔ جو اپنی فطری خواہش کی سیرابی کے لئے نر کو متوجہ کر رہی تھی۔ پاس ہی اتفاق سے ایک گنجان درخت تھا اور اس پر میں بعجلت تمام چڑھ گیا۔ شیرنی فوراً بعد ہی جھاڑی سے باہر نکل آئی جو بہت بے چین معلوم ہوتی تھی۔ وہ میرے سامنے ہی کھلے میدان میں ایک طرف بیٹھ گئی۔ چند ہی لمحے بعد ایک جواں سال طاقتور، خوبرو شیر بصد شان استغنا وہاں آنکلا

اور اس کے تھوڑے ہی دیر بعد ایک اور شیر جو اسی کا ہم عمر معلوم دیتا تھا دوسری سمت سے نمودار ہوا اور جھاڑی میں تقدرے رُکا رہا۔ شیرنی نے دوسرے شیر کو بھی دیکھ لیا تھا مگر پہلے شیر نے اُسے نہیں دیکھا تھا۔

میں اس وقت درخت کی اونچائی پر ایک محفوظ جگہ اپنا کیمرہ تیار کئے جنگل کے اس نایاب ہنگامہ خیز ڈرامہ کی تصویریں لینے کے لئے مستعدی سے بیٹھ گیا۔ یقیناً اس ہنگامہ خیز واقعے میں غم و غصہ، ناکامی اور اُمید کے جذبات، حسد، دشمنی اور شجاعت کے مناظر قابلِ دید ہونے کے ساتھ لرزہ خیز بھی ہوتے ہیں۔ شیرنی میرے پیڑ کے سامنے کھلی جگہ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلا شیر جو جوانی سے بھرپور جس کی جلد پر چمکتی ہوئی سیاہ لکیریں بڑی ہی خوشنما معلوم دیتی تھیں، شیرنی کی طرف کھڑے کھڑے کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ اُدھر شیرنی غالباً اندرونی جذبات سے اب مشتعل ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے کان پیچھے کی طرف موڑے۔ پیٹھ کے بل یک بیک لیٹ گئی اور اپنی دم کو شدید جھٹکے دینے لگی۔ اُدھر شیر نے ایک عجیب قسم کی دبی دبی گہری گہری آواز نکالی اور پھر شیرنی کی طرف بڑھنے لگا۔ مگر شیرنی اب اُٹھ چکی تھی اور اب اُس جھاڑی کے پاس بیٹھ گئی تھی جہاں وہ دوسرا شیر ہنوز چھپا ہوا تھا۔ پہلا شیر جوش و خروش کے ساتھ ابھی چند ہی قدم مادہ کی طرف بڑھا ہوگا کہ اس کی نگاہوں میں ایک بجلی سی کوند گئی اور دوسرے ہی لمحے چھپا ہوا شیر غراتا ہوا چھلانگ لگا کر پہلے شیر پر کود پڑا۔ بیچارہ اس اچانک حملے کے لئے تیار ہی کہاں تھا۔ اس کے باوجود وہ تیزی سے ایک طرف ہو گیا مگر فوراً غصے سے مغلوب ہو کر غراتا ہوا حملہ آور سے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔

دونوں ہی شیر جیلے اور طاقت میں برابر معلوم ہوتے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو گھور کر دیکھا۔ جوشِ غضب اُن کی سُلگتی ہوئی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا اور دونوں کی دم تیزی سے ہوا میں لہرانے لگی۔ پھر دونوں یکے بعد دیگرے زور سے دہاڑے اور دوسرے لمحے میں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ جنگل ان کی چیخ و پکار سے گونج اُٹھا۔ یہ لڑائی اپنی عزت و وقار اور قسمت

کے اظہار کے لئے لڑی جا رہی تھی چاہے اس میں جان ہی کیوں نہ چلی جائے ۔۔۔ اُس غارت گرِ ایمان شیرنی کے لئے، جو اُن کے سامنے تھوڑے ہی فاصلے پر اطمینان سے بیٹھی ہوئی گاہے گاہے اپنی چکیلی جلد کو زبان سے صاف کرتی ہوئی بڑی ہی بے اعتنائی سے اس زور آزمائی کو دیکھ رہی تھی۔ اُدھر جنگل کے چرند پرند اس جنگ و جدال کے شور و غل سے لرزہ براندام ہو رہے تھے۔ یہ یقینی تھا کہ جو شیر اس لڑائی میں دشمن کو شکستِ فاش دے گا وہی اس شیرنی کو حاصل کر سکے گا۔

ادھر یہ لڑائی شباب پر تھی کہ ایک اور شیر اُسی قد و قامت کا اور جواں سال کہیں سے نمودار ہوا۔ شاید وہ بھی شیرنی کی پکار پر حاضر ہو گیا تھا۔ مگر جیسے ہی اس کی نظر ان دونوں شیروں کی باہمی نبرد آزمائی پر پڑی۔ وہ بسرعتِ تمام اُسی جھاڑی میں چھپ گیا جس میں پہلے شیرنی بیٹھی تھی۔ شیرنی نے اُس نووارد شیر کو دیکھ لیا۔ مگر یہ ان دونوں شیروں کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ اس تیسرے شیر نے یہی مناسب سمجھا ہو گا کہ موقع کا انتظار کیا جائے۔ اور اُدھر شیرنی کا سر بعد ناز و افتخار کچھ اور اونچا ہو گیا۔ کیونکہ اُس کی ایک نظرِ عنایت کے لئے ایک نہیں بلکہ تین جانباز حاضر ہو گئے تھے۔ اور تینوں اُس پر جان قربان کرنے کے لئے تیار تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور خراماں خراماں چل کر میرے درخت کے نیچے اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کی نگاہوں میں اب بیک وقت تینوں شیر تھے۔

لڑائی خوب زوروں پر جاری تھی اور دونوں جان کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ کچھ اس لئے بھی کہ یہ زور آزمائی شیرنی کی نگاہوں کے سامنے ہو رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے لگائے ہوئے شدید زخموں سے چور، اور لہولہان ہو رہے تھے۔ کئی جگہ سے بال اور کھال کے ٹکڑے اُدھڑ چکے تھے۔ اور خون بہہ رہا تھا۔ دونوں اپنی پچھلی ٹانگوں پر استادہ اپنے پنجوں سے ایک دوسرے کو چیر پھاڑ کر رکھ دینے کے لئے مستعد نظر آ رہے تھے۔ پھر یک بیک دونوں آپس میں لڑتے لڑتے زمین پر آ رہے

اور ایک دوسرے کی آغوش میں پیوست ہو گئے۔ اب لڑائی اور خوں ریز ہو گئی۔ ایک دوسرے کو اپنے تیز ناخنوں اور دانتوں سے شدید زخم لگا رہا تھا۔ درمیان میں کبھی کبھی شیرنی ایک عجیب قسم کی آواز بھی نکال رہی تھی۔ شاید وہ داد شجاعت دے رہی تھی۔ اس آواز کے بعد ہی لڑائی اور شدید ہو جاتی۔ زمین تو دونوں کے خون سے رنگین ہو ہی چکی تھی۔ اب گوشت کے ٹکڑے بھی ادھر اُدھر بکھرے جا رہے تھے۔ ایسے میں ایک شیر نے دوسرے کی گردن کو اپنے دانتوں سے پکڑا اور ایک جھٹکے کے ساتھ وہاں کا چمڑا ادھیڑ دیا۔ زخم بہت گہرا تھا، اس جگہ کا خون آلود لال لال گوشت نمایاں ہو گیا۔ اب دوسرے شیر کے پاؤں اُکھڑ گئے اور اس نے اپنی دُم کو اپنے دونوں پاؤں کے بیچ میں دبا لیا۔ اور بھاگ کھڑا ہوا وہ لنگڑاتے ہوئے بھاگ رہا تھا اس کے پیچھے فاتح شیر اپنی کامیابی پر زور سے دہاڑا۔ دس بارہ قدم اس کے تعاقب میں دوڑا اور پھر واپس آ گیا پہلے اس نے زمین پر لوٹ پوٹ کر اپنے خون آلود جسم کو صاف کرنے کی کوشش کی اور پھر لنگڑاتے ہوئے نڈھال، مگر سینہ تانے ہوئے شیرنی کی جانب اپنی کامیابی کا صلہ حاصل کرنے کے لئے آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔

شیرنی نے جب فاتح شیر کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُس مقام پر پہنچ گئی جہاں تیسرا شیر چھپا موقع کا منتظر تھا۔ ایک تازہ دم اور دوسرا زخموں سے چور لہولہان اب اُسے فیصلہ کرنا تھا کہ کسے قبول کیا جائے غالباً یہ فیصلہ اس کے لئے دشوار تھا اس لئے وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔ فاتح شیر خطرے سے ناواقف اپنی کامرانی پر شاداں اور مطمئن شیرنی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ تیسرا شیر یکایک اس پر کود پڑا۔ زخمی شیر اس غیر متوقع حملے کے لئے تیار نہ تھا اُس نے ابھی سے پہلے دانت نکال دیئے مگر آخر شیر تھا اس قدر جلد شکست کیسے مان سکتا تھا اس نے فوراً اپنی کھوئی ہوئی طاقت اکٹھا کی اور اس غاصب شیر سے لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ دو چار پنجے مارے بھی مگر مقابلہ نہ کر سکا۔ اور اس نے اپنی سلامتی کے لئے وہاں سے بھاگ جانا ہی بہتر سمجھا۔ غاصب شیر نے اس کا پیچھا کیا

اور بڑی ہی بے دردی سے بھاگتے ہوئے شیر کے ایک دو زخم بھی لگائے۔ پھر کامراں واپس آگیا۔ بیچارے شیر نے اپنی اس پسپائی پر مایوسی سے شیرنی کی طرف دیکھا اور روپوش ہوگیا۔

جب تیسرا شیر تازہ دم شیرنی کے پاس پہنچا تو اس نے خود کو ہری گھاس پر گرادیا اور پیٹھ کے بل لوٹنے لگی۔ جب شیر اس کی گردن کو چاٹنے لگا تو اپنی شوخی اور عشوہ و ناز کا مظاہرہ کرنے کے لئے بعد ناز شیر کے ہلکے طمانچے مارنے لگی پھر یک بارگی اُٹھ کھڑی ہوئی اور تیز چھلانگیں مارتی ہوئی جنگل کے اندر بھاگنے لگی۔ شیر بھی اس کے ساتھ بھاگنے لگا حتیٰ کہ دونوں میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ آخر جنگل کی ملکہ نے اپنا شریک حیات منتخب کر لیا اور مجھے چند نایاب تصویریں حاصل کرنے کا موقع عطا کیا۔ ●●

غزل

کوئی جگنو بھی نہیں کوئی ستارا بھی نہیں
روشنی کا کہیں ہلکا سا اشارا بھی نہیں

جس سے کھا جائے دلِ سادہ محبت کا فریب
اُن کی نظروں میں کوئی ایسا اشارا بھی نہیں

مجھ پہ الزام ہے کیوں حسن کی رسوائی کا
میں نے تو ان کو نگاہوں سے پکارا بھی نہیں

دوستو! اور گرانبارِ وفا تو نہ کرو
میں نے یہ قرض ابھی سر سے اُتارا بھی نہیں

سیلِ غم کشتیِ دل کو نہ بہالے جائے
کوئی ملاح نہیں کوئی کنارا بھی نہیں

تجھ کو کیا میری پریشانیِ خاطر سے کہ تو
کشتۂ غم بھی نہیں درد کا مارا بھی نہیں

کیوں ترا دل ہے تب و تابِ زمانہ سے تہی
سینۂ سنگ میں کیا کوئی شرارا بھی نہیں

بدگماں کیوں ہیں نہ جانے تری یادیں مجھ سے
تجھ سے غافل تو کوئی لمحہ گزارا بھی نہیں

کس طرح اُس سے ہو اُمیدِ وفا بزمِ فانی
جو ہمارا بھی نہیں اور تمہارا بھی نہیں

(بیدار فانی جالندھری)

بھاجی

انجم حیات

میں پانچ سال بعد دوبئی سے لوٹا تو پتہ چلا کہ آجکل بھاجی سخت بیمار ہیں۔ اپنی آمد کے دوسرے روز میں اپنے ساتھ دوبئی سے لایا ہوا فرج اور رنگین ٹیلی ویژن اور ٹیپ ریکارڈ ہوائی اڈے کے کسٹم حکام سے چھڑا کر لایا، تو اماں جی نے یاد دلایا۔

نذیر بیٹے شام کو بھاجی کی خیریت تو معلوم کر آنا۔“

میں نے ارادہ کیا۔ شام کو بھاجی کی عیادت کے لیے موچی دروازہ ضرور جاؤں گا۔ لیکن دن ڈھلتے ہی میری ہونے والی ساس میری ہونے والی سالی کے ہمراہ آ گئیں۔ اُنھوں نے مجھے دیکھتے ہی میرے ماتھے پر بوسہ دیا اور اپنی بیٹی کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پلاسٹک کے تھیلے میں سے پانچ پانچ کے کئی نوٹوں کا ہار میرے گلے میں ڈال دیا۔ مجھے کس قدر مسرت ہوئی، بیان نہیں کر سکتا۔ اماں جی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ میں اپنی ساس سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے مجھ سے دوبئی کے موسم سے لے کر میری تنخواہ تک معلومات حاصل کیں۔

رات لو دس بجے کے قریب جب یہ ماں بیٹی واپس جانے لگیں تو اماں جی نے دروازے پر آ کر پوچھا ”نومبر چاند کی بیس تاریخ ٹھیک ہے نا!“

”تم چاہو تو ابھی بارات لے کے آ سکتی ہو۔“ یہ فقرہ میری رگ و پے میں بجلی کی رَو کی طرح سرایت کر گیا۔ ان لمحوں میں اپنی ذات کے سوا کائنات کی ہر شکل بھولا تھا۔ اور بھاجی تو اس کائنات میں شامل تھے۔

بھاجی موچی دروازے میں ہمارے ہمسائے تھے۔ اپنے گھر کی بیٹھک میں وہ فرنیچر بنانے کا کام کرتے تھے۔ اُن دنوں میں پانچویں میں پڑھتا تھا۔ صبح اسکول جاتے ہوئے اکثر اُن کی دکان پر رُک جاتا۔ کرسیوں اور میزوں کو پالش کرتے اپنے ہم عمر لڑکوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتا۔ گلی کے چار پانچ چھوٹے بڑے لڑکے بھاجی کی دکان پر کام کرتے تھے۔ مجھے گلے میں بستہ ڈالے دیکھ کر بھاجی کہتے: "نذیرے اسکول نہیں جاؤ گے کیا؟"

اور جب میں کارپوریشن کے پرائمری اسکول پہنچتا تو واقعی دیر ہو چکی ہوتی۔ ماسٹر صاحب مجھے چھڑی سے ٹھوکا دے کر کہتے: "ابے کیا گھر میں صابن نہیں! قمیص کتنی میلی چکٹ ہو رہی ہے!"

اُس وقت نہیں لیکن اب تصور کر سکتا ہوں کہ اُن دنوں ہمارا پورا گھر میلا چکٹ تھا۔ ابا کو ذرا زیادہ کام مل جاتا تو گھر میں کپڑے دھونے کا صابن آجاتا جس سے ہم سب بہن بھائی منہ ہاتھ بھی دھوتے

ابا جی صبح سبز چائے کے ساتھ کلچہ کھا کر کمرے میں پڑا ہوا اپنا تیشہ اور ٹاٹ کے تھیلے میں بند دوسرے اوزار اُٹھاتے اور "یا اللہ تیرا ہی آسرا" کہہ کر گھر سے نکل جاتے۔ کبھی کبھی ساتھ کی گلی سے "ابا کی منجی پیڑھی ٹھکوا لو" کی آواز آتی۔ تو میں سوچا کرتا۔ جب پڑھ لکھ کر افسر بن جاؤں گا۔ تو ابا کے کندھے سے تیشہ اور ٹاٹ کا تھیلا اُتار کر شہر سے باہر گندے نالے میں پھینک آؤں گا۔

مگر ایک روز جب شہر کی ایک سڑک پر ایک تیز رفتار کار ابا کے جسم سے ٹکرائی تو میرا یہ خواب ابا کے سر کی طرح پاش پاش ہو گیا۔ محلے والے ابا کو سپردِ خاک کر کے لوٹے تو بھاجی نے اماں جی کے سر پر چادر اوڑھاتے ہوئے کہا! "میں تیرا بھائی ہوں بہن، تجھے تتی ہوا نہیں لگنے دوں گا۔"

دو چار روز کے بعد بھاجی گھر آئے اور مجھے اپنے ساتھ دکان پر لے گئے۔ چند دنوں بعد مجھے معلوم ہوا بھاجی کی دکان پر کام کرنے والے میرے سبھی ساتھی

یتیم تھے۔

بھاجی ان کو ہر ہفتے ایک معقول رقم وظیفے کے طور پر دیا کرتے۔ میں لکڑی کے کام کی الف بے بھی نہیں جانتا تھا۔ مگر پہلے ہی ہفتے بھاجی نے ایک بند لفافہ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا! "نذیرے اپنی ماں کو دے دینا۔"

اس لفافے میں ہمارے پورے گھر کی گاڑی کھینچنے کے لیے ایندھن ہوتا تھا جو ہر ہفتے بھاجی مجھے تھما دیتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ جان گیا کہ بھاجی اپنے فن میں بڑے ہی طاق ہیں۔ بڑی بڑی کوٹھیوں کے مالک اپنی اقامت گاہوں میں لکڑی کے آرائشی کام کے لیے موچی دروازہ کی پیچ در پیچ گلیوں میں بھاجی کا پتہ پوچھا کرتے... بادشاہوں کے زمانے کے لکڑی کے جس کام کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ کاریگر اپنے زمانے کے بھاجی ہوں گے۔

بھاجی کا وجود شجر سایہ دار تھا جس کی گھنیری چھاؤں نے چار پانچ گھرانوں کو زمانے کی چلچلاتی دھوپ سے بچا رکھا تھا۔

ایک روز جب میں ایک میز پر وارنش کر رہا تھا میرے ایک ساتھی نے جسے دکان پر بھاجی سمیت سبھی چھوٹا کہا کرتے تھے، مجھے بتایا! "نذیرے ماسٹر کو بھاجی باہر بھجوا رہے ہیں۔"

"... باہر... کہاں چھوٹے؟"

"دوبئی..." اور واقعی چند دنوں بعد ہمارا سب سے سینئر ساتھی، ماسٹر پاکستان سے باہر چلا گیا۔ بھاجی اُسے ہوائی اڈے پر الوداع کہہ کر لوٹے، تو بہت مسرور اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔

مجھے بھاجی کی دکان پر کام کرتے تقریباً دس برس ہو گئے۔ دکان پر میز کرسیاں بنانے کے علاوہ میں بھاجی کے ساتھ شہر سے باہر نئی کوٹھیوں میں لکڑی کے کام کے لیے بھی جانے لگا تھا۔ ایک بار بھاجی ایک بنگلے میں لکڑی کے بیل بوٹے بنا رہے تھے کہ میں نے محسوس کیا ان کے

ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش پیدا ہو چکی ہے ....اور لرزش بڑی بڑی پختہ عمارتوں کو کھنڈر بنا دیتی ہے... میں نے سوچا اگر یہ عظیم عمارت گر گئی تو ہمیں کہیں جائے پناہ نہ مل سکے گی. شاید اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ مجھے بخار نے آلیا. اور میں دو روز تک بھاجی کی دکان پہ نہ جا سکا. بخار ابھی مکمل طور پر نہیں اترا تھا کہ بھاجی گھر پہ آ گئے میں سمجھا مجھے دکان پر لے جانے کے لیے آئے ہیں. لیکن وہ پائنتی بیٹھ کر میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولے! "بہن جی. نذیرے کو ابھی گھر سے باہر نہ نکلنے دینا. اس کا بخار نہیں لوٹنا" بھاجی اتنا کہہ پائے تھے کہ انھیں شدید کھانسی آنے لگی. ان کا سانس پھول گیا. گھبراہٹ میں ماں جی کے ہاتھ سے سبز چائے کی پیالی لوٹ کر گر گئی. میں جلدی سے اٹھ کر کھاٹ پر بیٹھ گیا اس دوران بھاجی کی طبیعت سنبھل گئی تھی. انھوں نے ہمیں کوئی بات کرنے کا موقع نہ دیا اور بولے. "کیوں بہن جی! نذیرے کو باہر بھجوا دیں؟" ماں جی کچھ سوچنے لگیں تو بولے:

"جی چھوٹا نہ کر بہن، سب کام سنور جائیں گے!"

ایک مہینے کے اندر اندر ماسٹر نے دوبئی سے میرے لیے ویزا بھیج دیا. اس مقصد کے لیے بھاجی یقیناً پہلے سے کوشش کر رہے ہوں گے.

دوبئی پہنچ کر مجھے ایسا لگا جیسے میری زندگی کی گاڑی ایک دم تنگ اور تاریک گلیوں سے نکل کر وسیع و عریض ہموار سڑک پر مڑ گئی ہو. تاہم ایک اداسی سی مجھ پہ طاری ہو گئی تھی. مگر جب پہلی تنخواہ ملی تو یہ اداسی یکا یک ختم ہو گئی. ضروری اخراجات کے لیے پیسے رکھ کر میں نے باقی رقم اماں جی کو گھر بھیج دی. چھ ماہ تک بھاجی کے ساتھ باقاعدگی سے خط وکتابت ہوئی، پھر رفتہ رفتہ میری مصروفیتیں بڑھتی گئیں اور مہینوں میں ایک آدھ خط لکھتا.

چار سال میں میں نے اماں جی کو اتنی رقم بھجوا دی تھی کہ اس سے انھوں نے میرے

ایک دیرینہ خواب کی تعبیر..... نئی کالونی میں ایک خوبصورت کوٹھی خرید کر لی۔ کوٹھی میں مزید آرائش کے لیے میں نے بھابی کے ہاں جانے کا سوچا بھی، لیکن پتہ نہیں کیوں نہ جاسکا۔ اماں جی نے بھی پہلے پہل بھابی سے ملاقات پر زور دیا۔ پھر شاید میرے بیاہ کی تیاریوں میں وہ میری ہی طرح بھابی کو بھول گئیں۔

چاند کی چودھویں شب کو میں نے حجلۂ عروسی میں نغمہ کا گھونگھٹ اُٹھایا۔ تو اپنی قسمت پر نغمہ سے زیادہ پیار آیا۔ گھر جیسے نغمہ کے آنے کے بعد گھر کا حسن سنوارنے کے لیے کسی اور شے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ مری میں ہنی مون منانے کے بعد گھر آکر میں نے سوچا نغمہ کو لے کر بھابی کے گھر جاؤں گا۔ لیکن رات کو سوتے وقت موچی دروازے کی پیچیدہ اور تیرہ و تار گلیوں کی بو میرے نتھنوں میں در آئی میں ڈر سا گیا کہ نغمہ ان گلیوں میں جا کر کیا محسوس کرے گی۔ بہتر یہی ہے اکیلا ہی بھابی کی عیادت کر آؤں.

اگلی صبح میں جلدی جلدی اُٹھا اور تیار ہو کر رکشا میں موچی دروازے چل دیا۔ موچی دروازے کے باہر میں رکشا والے کو کرایہ ادا کر رہا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا میں نے گھوم کر دیکھا۔ چھوٹا کھڑا تھا۔ نام کے برعکس جوان اور تنومند چھوٹا..... بالکل چپ چاپ میرے چہرے پر آنکھیں گاڑتا ہوا ایک دم میرے گلے لگ گیا۔ میں رسماً خوشی سے بھرپور لہجے میں اُس کی خیریت دریافت کرنے ہی والا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی اُسے کندھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کر کے میں نے پوچھا۔

"چھوٹے کیا ہو گیا ہے تجھے؟"

"میں یتیم ہو گیا ہوں نذیرے!"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"مگر تمہارے ابا تو کب کے انتقال کر چکے!"

"پرسوں بھابی اللہ کو پیارے ہو گئے نذیرے" اور چھوٹے کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

اے مرے محبوب مجھ سے کس لئے ناراض ہو؟
راز یہ بتلا دو مجھ کو تم مرے ہمراز ہو

اس لئے ناراض ہو تم، آج آوارہ ہوں میں
ہو کے اک خاتونِ خانہ انجمن آرا ہوں میں
دید کی مردوں کو دعوت دے وہ نظارہ ہوں میں
جو کلب میں انکو مضطر کر دے وہ پارا ہوں میں
ہے زمانہ جس کا شیدائی وہ حسن آرا ہوں میں
بے حیا رخسانہ کی مانند عیارہ ہوں میں

اے مرے محبوب تم کو غالباً ہے اس کا غم
کیا اسی غم میں تمہاری ہو رہی ہے چشم نم
میں نکلتی ہوں بڑے فیشن سے گھر سے بے نقاب
تاکہ بازاروں میں دیکھیں سب مرا حسن و شباب
ہو گئی بے شرم، بے غیرت میں کتنی بے حجاب
انتہا یہ ہے کہ اب کلبوں میں پیتی ہوں شراب
اور کھاتی ہوں بڑی خوش ہو کے چٹنی سے کباب
بعد اس کے ہاتھ میں لیتی ہوں طاؤس و رباب

اے مرے محبوب شاید اس لیے تم صبح و شام
مجھ سے پہلے کی طرح کرتے نہیں اب ہم کلام

صرف اتنی بات پر تم ہو گئے مجھ سے خفا
کیا ہوئی اسکے سوا کچھ اور بھی مجھ سے خطا
تل گئے ترک تعلق پر یہ تم کو کیا ہوا
کیا تمہارے دل میں اب باقی نہیں خوف خدا

میرے ہمدم میرے ہمراہی میرے اے ہمنوا
کچھ تمہیں معلوم ہے مردوں کی اب حالت ہے کیا

غالباً اے جانِ من تم اس لیے مغموم ہو
اس حقیقت کے مگر تم علم سے محروم ہو

تم نے کچھ سوچا کہ عورت اب وہ عورت کیوں نہیں؟
انکے دل میں آج مردوں کی وہ وقعت کیوں نہیں؟
انکی نظروں میں تمہاری آج عزت کیوں نہیں؟
کیا سبب ہے آج انکو پاس غیرت کیوں نہیں؟
پہلے جیسی پاک دامن، پاک طینت کیوں نہیں؟
کیا ہوا اس کو تمہاری اب ضرورت کیوں نہیں؟

تم نے کچھ سوچا کہ آخر کیوں ہوا یہ انقلاب
اے مرے محبوب اب کیوں خاموش ہو دو اسکا جواب

تم کو آتا ہے نظر میرا ہی دامن داغ داغ
ہو رہے ہو اس غلط فہمی میں جو تم باغ باغ
ہو اگر تم مردِ دانا تو لگاؤ یہ کچھ سراغ
کس نے لگوایا میرے پاکیزہ دامن پر سیہ داغ
ہائے کس نے کر دیا گل میری عظمت کا چراغ
کس نے میرا کر دیا تبدیل یہ دل اور دماغ

عفت و عصمت ہوئی برباد جو میری حضور
یہ نہیں معلوم تم کو اس میں کس کا ہے قصور

لے گئے تھے تم بھری محفل میں مجھکو بے نقاب
تم نے کھیلا پہلے پہل تم نے پی پہلے شراب
تم نے ہاتھوں میں لیا پھر یہ لو طاؤس و رباب
تم نے پہلے وضع بدلی اور فیشن و خضاب
یہ کلب، تھیٹر، سینما کس نے بنوائے جناب
صرف کی ہے کس نے آخر ان پہ دولت بے حساب

تم ہمارے داغ دامن پر تو رکھتے ہو نظر
کیوں مگر تم کو نہیں کچھ اپنے دامن کی خبر

آہ! جن مردوں پہ ہم کو ناز تھا وہ ہیں کہاں
فخر کرتے تھے سدا جن پر زمین و آسماں

چھوڑنا آوارگی ہم کو خدا گزرے نہ شاق
ہم حیاتِ عزیز دینی کو رکھیں بالائے طاق
اس نئی تہذیب کے فرزند کو ہم کر دیں عاق
اس رواجِ بے حجابی کی دلہن کو دیں طلاق
ختم جب کر دیں گے ہم اور تم سب آپس کا نفاق
سب ہمارے اس نظریے سے کریں گے اتفاق

یہ مگر اس وقت ہو سکتا ہے ممکن بیش و کم
حق کے آگے جب کریں دل سے سرِ تسلیم خم

پھر یقیناً ختم یہ ناراضگی ہو جائے گی
مرد و زن میں باہمی دلبستگی ہو جائیگی
پوری آدمؑ اور حواؑ کی خوشی ہو جائیگی
دور سب رہبانیت کی گندگی ہو جائیگی
مسلکِ انسانیت کی پختگی ہو جائیگی
اے ملک ہم سے ادا پھر بندگی ہو جائیگی

زندگی یہ زندگی پھر زندگی ہو جائے گی
زندگی کہنے کے قابل زندگی ہو جائے گی

جو کبھی انسانیت کے تھے امیر کارواں
میری ہم جنسیں کیا کرتی تھیں قربان جان و جاں

بد چلن، بدکار، بزدل، اب وہ بد کردار ہیں
کیا کہوں؟ و دیوث ہیں، مکار ہیں، عیار ہیں

[illegible]

[illegible]

پیاز

پیاز پیاز یوں تو مصالحے کا ایک اہم جزو ہے۔ لیکن اس کے فوائد کے پیش نظر اس کے استعمال سے بہت سی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ پیاز کا استعمال بطور سبزی بھی کیا جاتا ہے لیکن بطور دوا کے اس کا استعمال بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں معدنی و حیاتی اجزا، پروٹین، گندھک، کیلشیم، پوٹاشیم، سوڈیم اور فولاد کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ دق کے جراثیم کو مارتا ہے۔ وبائی امراض کے اثرات کو ختم کرتا ہے۔ ہیضہ کے مریض کے لئے اس کا رس بہت مفید ہے۔ قبض کو دور کرتا ہے۔ مثانے کی پتھری کو خارج کرتا ہے اور ریاح کو تحلیل کرتا ہے۔ اگر آنکھیں دکھنے آجائیں تو اس کا عرق اور شہد ہم وزن ملا کر لگانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ پیاز کو پیس کر سونگھنا اور تلوؤں پر لیپ کرنا بلغمی درد سر کو دور کرتا ہے۔ بھوک بڑھاتا ہے۔ پیاز کا عرق گرم گرم کان میں ڈالنے سے بہرہ پن دور ہو جاتا ہے۔ پیاز کو بھوبل میں بھون کر کھانے سے بلغمی کھانسی جاتی رہتی ہے۔ (دولت کی بارش سے)

سبزی کباب آلو ۲۵۰ گرام، مٹر ۲۵۰ گرام، گوبھی ۲۵۰ گرام، لہسن ۴ جوئے، ادرک ایک انچ کا ٹکڑا، ہری مرچ کا کچومر آدھی پیالی، ہرے دھنیے کا کچومر آدھی پیالی، لیموں ایک عدد، نمک حسب ذائقہ، گھی حسب ضرورت، انڈا ایک عدد، کرم (سوکھی ڈبل روٹی کا چورا)

آلو کو چھیل لیں۔ مٹر کی پھلیوں سے دانے نکال لیں۔ گوبھی کو کاٹ لیں (ڈنٹھل پھینک دیں) اب تینوں چیزوں کو الگ الگ ابال لیں، پھر تینوں چیزوں کو ملا کر آٹے کی طرح گوندھ لیں۔ پھر ادرک، لہسن ہرے دھنیے اور ہری مرچ کو سل پر پیس لیں اور سبزیوں میں ملا دیں۔ نمک اور لیموں کا رس بھی ملا دیں۔ ایک کڑھائی میں گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ اب

ایک پاؤ اپنچ موٹی گول۔ سیخ یا لکڑی لیں۔ اس پر سلی اور گندھی ہوئی سبزی چاروں طرف لگادیں۔ سبزی کباب کی موٹائی آدھا انچ اور لمبائی تین انچ ہونا چاہیے۔ پھر انڈے میں ہاتھ ڈبوکر اس پر مل دیں۔ دوسرے ہاتھ سے اسے ہر طرف لگادیں۔ پھر احتیاط سے لکڑی سے اتار کر گرم گھی میں ڈال دیں۔ اس طرح تمام کباب تل لیں اور کسی بھی چٹنی کے ساتھ گرم گرم کھائیں۔

(مرسلہ شکور صدیقی شاہین۔ مغل پورہ۔ حیدرآباد)

اینٹستھنیز رہبانیت کا باوا آدم

اینٹستھنیز سقراط کا شاگرد اور مقلد تھا۔ اسے سقراط نے نصیحت کی ــــ ”ایسا معلوم ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ عیش اور فضول خرچی سے خوشی حاصل ہوتی ہے، دیکھو! کسی چیز کی خواہش نہ کرنا دیوتاؤں کی صفت ہے اور کم سے کم طلب کرنا دیوتاؤں کی قربت ہے۔“

اینٹستھنیز بہت متاثر ہوا۔ وہ کہتا تھا کہ میں اپنے تصرف میں کچھ نہیں رکھتا تاکہ مجھ پر تصرف نہ ہو۔ اینٹستھنیز کا ایک شاگرد ہوا۔ اس کا نام ڈایوجینز تھا۔ یہ حضرت عیسیٰ سے ۴۱۲ برس پہلے ہوا ہے۔ اس نے کم سے کم ضرورت پر زور دیا۔ فقیرانہ زندگی کو ترجیح دی۔ حیوانوں کی طرح رہنا پسند کیا۔ زمین پر سوتا۔ جو کچھ جہاں مل جاتا کھا پی لیتا۔ فطری تقاضے سب کے سامنے پورے کر لیتا۔ صرف اپنے آپ کو شہری آدمی سمجھتا۔ دن میں شمع جلا کر ادھر ادھر پھرتا اور کہتا کہ میں شہری آدمی کی تلاش میں ہوں۔

ایک بار سکندر سے اس کی ملاقات ہوئی۔ سکندر نے اپنا تعارف کرایا کہ میں بادشاہ سکندر اعظم ہوں۔ مجھ سے کچھ مانگو۔ ڈایوجینز نے کہا ”مہربانی فرما کے دھوپ چھوڑ دو۔“

اسی ڈایوجینز کے فلسفے سے متاثر ہو کر لوگوں نے رہبانیت کو رواج دیا۔

رہبانیت کا شجرہ یوں ہے:۔

رہبانیت بنت ڈایوجینز ولد اینٹستھنیز ولد سقراط یونانی

محمد زکی ایم۔ اے علیگ

مذہب بیزاری کے بعد

۳۹۹ تا ۱۴۶ قبل مسیح

مذہب کی تباہی سے پہلے یونانیوں کی جو اخلاقی حالت تھی وہ بھی قائم نہ رہ سکی۔ قدیم مذہبی ڈھانچے کے گر جانے سے حالت اور خراب ہو گئی۔ عوام تو بیرا نے مذہب سے چمٹے رہے لیکن دانشور طبقے میں مذہب سے بیزاری بڑھتی گئی۔ اسی کے ساتھ اخلاقی گرفت بھی ڈھیلی ہوتی گئی۔ ذمہ داری کا احساس بالکل ختم ہو گیا۔ ہر طرف ہر شعبے میں افراتفری پھیل گئی۔ بیٹا باپ سے بیزار ہو گیا، مرد شادی سے، شہری سیاسی ذمہ داری سے، اور عورت ماں بننے سے۔

جنسی بے راہ روی اور سیاسی بد عنوانیوں میں دن پر دن اضافہ ہوتا گیا۔ غیر شادی شدہ لوگ زیادہ تر وقت میسواؤں کے ساتھ گذارتے۔ بوڑھے جوے اور اوباشی میں وقت کاٹتے۔ بیوی سے زیادہ لونڈیوں کی مانگ بڑھ گئی۔ شادی کی جگہ آزاد جنسی تعلقات نے لے لی۔ لوگ بچہ پیدا کرنے سے گھبرانے لگے۔ محدود کنبوں کا رواج عام ہو گیا۔ مانع حمل تدابیر اور اسقاط سے مقصد کی تکمیل ہوئی۔ شرح پیدائش کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ صرف ایک فی صد کنبوں میں ایک ہی بچہ پرورش پاتا تھا اور بہت سے خاندانوں میں ایک بھی نہیں۔

شہر ویران ہونے لگے۔ عیش پرست یونانی اولاد سے حد درجہ بیزار ہو گئے۔ جو ایک دو بچے بچ جاتے ان میں سے ایک جنگ میں مارا جاتا اور دوسرا کسی مرض یا بلا کی نذر ہو جاتا۔ اس طرح اس مسئلے نے نازک صورت اختیار کر لی۔ پھر کوئی تدبیر کام نہ آئی اور یونانی تہذیب کا خاتمہ ہو کر ہی رہا۔ (مغربی تہذیب کا آغاز و انجام صفحہ ۱۱۳)

انار

مشہور پھل ہے۔ مزہ تین طرح کا ہوتا ہے۔ (١) شیریں (میٹھا) (٢) کھٹ میٹھا (٣) ترش (کھٹا)۔ انار شیریں کے دانوں کا پانی میٹھا ہوتا ہے اور ٹھنڈا اثر ہوتا ہے۔ تازہ میوہ (پھل) کے طور پر اس کا استعمال ہے۔ اس میں غذائیت کم ہوتی ہے مگر جتنی ہوتی ہے اس سے نہایت عمدہ، لطیف خون پیدا ہوتا ہے اور زود ہضم (بہت جلدی ہضم ہونے والا) ہے جن کا مزاج گرم ہے ان کے جگر، دل کو بہت طاقت دیتا انسان کے سینہ و حلق کی خشونت خشکی اور کھانسی ہو تو کھانسی کو بھی دور کرتا ہے۔ اس لیے گرم مزاج والوں کو خاص فائدہ ہوتا ہے۔ یرقان (پیلیا) اور خفقان (دل کی گھبراہٹ اور وحشت) میں فائدہ کرتا ہے انار کے دانوں سے نچوڑا ہوا پانی یا رس بہت ہی ہلکی پھلکی خوراک ہے اور بہت [illegible] ہضم ہو کر جزو بدن ہو جاتی اور طاقت [illegible] ہے۔ میٹھے انار کا رس ہلکی آنچ پر پکا کر گاڑ[ھا] ہو جانے پر ٹھنڈا کر لیں دو تولہ (٢٢ گرام) کو ئیں تو نظر کی کمزوری بہت جلد دور ہ[و] اور نظر تیز ہو جاتی ہے۔

انار کا شربت (زیادہ گرمی) دور کر[نے] اور دل و جگر کو طاقت دینے کے لیے است[عمال] کیا جاتا ہے۔ اور میٹھے انار کا رس بطور دوا ٥٢ گرام تک ایک دفعہ (ایک بار ٢ تولہ ٥ تولہ تک۔

(٢) کھٹا انار : سرد و خشک ہے۔ [illegible] جو صفرا (پت) کی زیادتی سے آ[تا] ہے [illegible] ان کو روکنے، دل و جگر اور معدہ کی حرا[رت] دور کرنے انسان کو طاقت دینے کے

بہترین ہے۔ معدہ کو طاقت دینے والے چورن ہاضمہ اور دوسری ہاضم دواؤں میں اسی انار کو ملایا جاتا ہے۔ اس کا پانی جلد ہضم ہونے والا اور کھائی ہوئی غذا کو ہضم کرنے والا بھی ہے۔ پیاس کی زیادتی اور متلی دور کرنے کے لئے مناسب ہے۔ کھٹے انار کا پانی آنکھ میں لگانے سے آرام ملتا ہے اس کے دانے چوسنے سے سل کی بیماری کو سکون ہوتا ہے۔ اس کا شربت دست بند کرنے دل کی جگر کی بڑھی ہوئی گرمی دور کرنے اور معدہ کی کمزوری و گرمی دور کرنے کے لئے غذا اور دوا کے طور پر فائدہ دیتا ہے۔ آبِ انار ترش (بطور دوا) ایک وقت میں ایک بار ۲۰ تا ۵۰ گرام

روح کی نورانی غذا

- جب خدا کسی کی مدد کرتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ (قرآن مجید)
- خدا کا خوف ہی خیر کی طرف انسان کی رہبری کرتا ہے۔ (حضرت فضیلؒ)
- احکامِ خداوندی پر عمل کرنے سے حکمت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم)
- ہمسایہ کا حق اسی سے ادا ہوتا ہے جس پر خدا کی رحمت ہو۔ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم)
- اپنے بھائی کا دل خوش رکھ کر اس سے بہتر کوئی عبادت نہیں۔ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم)
- جو صاحب دل ہے اس کے لئے خدا کی نصیحت کافی ہے۔ (قرآن مجید)
- اللہ پاک ہے اور پاکیزگی کو پسند کرتا ہے۔ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم)
- خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔ (حضرت عثمان غنیؓ)
- اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو۔ (قرآن مجید)
- خدا کا خوف ہی خیر کی طرف انسان کی رہبری کرتا ہے۔ (حضرت فضیلؒ)
- جو غصے کو برداشت کر لے وہ سب سے بڑا پہلوان ہے۔ (حضرت علیؓ)

(مرسلہ: شکور صدیقی شاہین۔ حیدر آباد)



مغربی ممالک میں عورتوں کو کتنی آزادی حاصل ہے اور وہ کس حد تک آزا
ہیں۔اس کی ایک مثال حال ہی میں جرمنی کے علاوہ باویریا میں سامنے آئی ہے۔
ٹاپ لیس عورتوں کے درمیان مکے بازی کے مقابلے ہوئے۔عورتیں بالکل مح
بن گئیں۔ یہ مقابلہ ہرمراٹ مان نامی ایک شخص نے کرایا۔جس کی ریشمی کپڑے کی
دوکان ہے۔ اس نے ایسے مقابلے پہلی بار تھائی لینڈ میں دیکھے۔جہاں و
کاروبار کے سلسلے میں جاتا رہتا ہے۔ اس کے دل میں بھی ایسے مقابلے کر
کا خیال پیدا ہوا۔ باویریا واپس آنے کے بعد اس نے اخباروں میں اشتہ
جن لڑکیوں کو کھیل کود سے دلچسپی ہو وہ اس سے خط وکتابت کریں۔اس
اشتہار کے جواب میں ۶۰ لڑکیوں نے درخواستیں بھیجیں۔ ہرمراٹ مان
سب کو انٹرویو پر بلایا۔ان میں سے اس نے ۱۲ خوبصورت لڑکیوں کے مقابلے
لیے چن لیا۔مقابلہ کا نام انٹرنیشنل جرمن گرل باکسنگ چیمپئن شپ رکھا گیا۔اس
مقابلوں کے لیے ایک بڑا ہال کرایہ پر لیا۔ہال کے درمیان مقابلوں کے لئ
تیار کیا گیا۔اسٹیج کے ارد گرد چمڑے کی رسیاں باندھی گئیں۔ہال میں اسٹیج کے
طرف کرسیاں لگائی گئیں۔ان مقابلوں کے ٹکٹ پانچ پانچ سو روپے میں فروخ

لوگوں نے اپنے ٹکٹ بلیک میں بیچ دیے۔ جب مقابلہ شروع ہوا۔ ہال کی تمام بتیاں بند کردی گئیں۔ صرف اسٹیج پر روشنی کا انتظام تھا۔ کھیل شروع ہونا سے پہلے آٹھ لڑکیاں یکے بعد دیگرے اسٹیج پر آئیں۔ انھوں نے صرف جانگیے پہن رکھے تھے باقی تمام بدن عریاں تھا۔ اس کے بعد مقابلے شروع ہوئے۔ دو دو لڑکیاں محمد علی کی طرح ایک دوسرے پر مکے برسانے لگیں۔ سیمی فائینل مقابلوں تک تین لڑکیاں پہنچ گئیں۔ ایک لڑکی سیمی فائنل مقابلہ ہار گئی۔ فائنل مقابلہ دو انتہائی خوبصورت لڑکیوں کے درمیان ہوا۔ دونوں کے درمیان بڑا زوردار مقابلہ ہوا۔ ایک لڑکی نے دوسری کے جبڑے پر مکہ مارا جس سے دوسری لڑکی کا دماغ چکرا گیا وہ لڑکھڑائی اور اسٹیج پر گر گئی۔ ریفری نے دس تک گنتی پڑھی لیکن لڑکی میں اتنی سکت نہ تھی کہ کھڑی ہو جائے۔ مکہ مارنے والی لڑکی کو اول قرار دیا گیا۔ اسے سونے کا تمغہ دیا گیا جب کہ مقابلہ ہارنے والی لڑکی کے حصہ میں صرف ایک پھول آیا۔ پھول ہاتھ میں پکڑ کر وہ اسٹیج پر زار زار رونے لگی۔

میرے پسندیدہ اشعار

(محمد رضی الدین اقبال)

- کہنے کو گلِ تر کی طرح نرم ہے عورت — آجائے کوئی وقت تو پتھر کی طرح ہے
- مہربان گردشِ حالات بھی ہو جائے گی — عقل کو تابع، فرمانِ خداوند تو کر
- اتنی ہی تاب ناک ہے منزل — راہ میں جس قدر سیاہی ہے
- پی جاؤ صداقت کا تلخاب — اس زہر میں امرت مضمر ہے
- مجبوروں کی منتظر آنکھیں رہیں شام و سحر — اس زمانے میں ہمیں سے کبھی یہ بھلائی ہوئی

جسے ماں کا پیار نہیں ملتا

آرتھر شوپنہاور (۱۷۸۸ء، ۱۸۶۰ء) جگادری فلسفیوں کی لق ودق نسلوں میں وہ وا
تھا جو بلا کا قنوطی تھا۔ اور برگساں اور نطشے جیسے دانائے راز کا فکری باپ ہے اس کے
نے خودکشی کی تھی۔ اپنے شوہر کی موت کے بعد اس کی ماں شہرۂ آفاق شاعر گوئٹے
دلنواز داشتہ بن گئی تھی۔ شاید اسی لیے وہ تمام عمر عورتوں پر تبرا پڑھتا تھا۔ وہ
ہی میں اپنی عیش پسند اور تند خو ماں سے الگ ہو گیا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس
داری پاگل تھی۔ وہ ہمیشہ کنوارا رہا اور دو کمروں کے ایک بورڈنگ ہاؤس میں پور
تیس سال تک تن تنہا ڈٹا رہا۔ اس کی تنہائیوں کا ساتھی "آتما" نامی ایک خوبصورت
بالوں والا کتا تھا جسے شہر کے سکول باز "تھا شوپنہاور" کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ بڑی ضخ
سے لمبے پائپ پیتا تھا اور چوری کے خوف سے ان پائپوں کو ہمیشہ مقفل رکھا کرتا تھا
زنی کے خوف سے اس نے کبھی کسی باربر سے اپنا شیو نہیں بنوایا۔ وہ بلاناغہ دو گھنٹے
چہل قدمی کرتا اور کھانا کھانے کے بعد بڑی محویت سے نے نوازی کرتا تھا۔ بزدلی کے
مارے وہ ہمیشہ ایک بھرا ہوا پستول اپنے سرہانے والی دراز میں رکھ کر سوتا تھا۔ جب
وہ جامعہ برلن میں پروفیسر مقرر ہوا تو اپنی بیماری کی حد کو پہنچی ہوئی خود پسندی کے تحت
اس نے اپنے اور عظیم فلسفی ہیگل کے پڑھنے کے ایک ہی اوقات مقرر کروائے لیکن جب
وہ ہیگل کا لیکچر سننے والوں کو اپنی طرف راغب نہ کر سکا۔ تو زچ ہو کر پڑھانے سے ہمیشہ

ہمیشہ کے لیے توبہ کرلی۔ وہ اپنے تنخواہ دار مخبروں کو ہر طرف بھیجا کرتا تاکہ وہ اس کی شہرت کی ذرا ذرا سی خبریں تک اس کو فراہم کریں۔ اس کو جادو ٹونے میں بھی بڑا اعتقاد اور عیب جوئی کا بڑا شوق تھا۔ ایک بار اپنے غصیلے پن میں اس ایک بوڑھی دہقان کو جو اس کے گھر کے دروازے کے سامنے اپنی کسی سہیلی سے بات کر رہی تھی۔ اسٹرھیوں سے نیچے پھینک دیا تھا جس سے وہ بے چاری لنگڑی ہو گئی تھی۔ شوپنہاور کو سزا کے طور پر اس عورت کو جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ اس لنگڑی کی موت کے بعد شوپنہاور نے اپنی ڈائری میں بڑی خوشی سے لکھا "بڑھیا مر گئی بلا کٹی"!

وہ ہمیشہ ایک مخصوص ہوٹل میں کھانا کھاتا تھا۔ وہ کھانا شروع کرنے سے پہلے میز پر سونے کا ایک سکہ رکھ دیا کرتا تھا اور کھانے کے بعد جھٹ اس کو اپنے پرس میں واپس ڈال دیتا تھا۔ اس کا یہ عجیب وظیفہ ایک بیرے پر خاصا گراں گزرا۔ ایک روز وہ شوپنہاور سے اس حرکت کا سبب پوچھ ہی بیٹھا۔ فلسفی نے جواب دیا۔

"میں نے عہد کیا ہے کہ میں یہ سکہ اس دن کسی غریب خانے کو ہدیہ کروں گا جس دن اس ہوٹل میں آنے والے انگریز افسر گھوڑوں عورتوں اور کتوں کے علاوہ کسی اور موضوع پر بکواس کرنے کی زحمت گوارا کریں گے"

طبی ٹوٹکے

• برف کے زیادہ استعمال سے معدہ کمزور ہو جاتا ہے۔ بھوک میں کمی ہوتی ہے۔ قوت ہاضمہ میں فتور پیدا ہوتا ہے۔ برف دانتوں کو کمزور کرتی ہے۔ نزلہ و زکام کی تحریک کرتی ہے

• پانی میں لیموں کے چند قطرے ملا کر پی لینے سے معدہ صاف رہتا ہے۔ موسمی بخار میں لیموں بیحد مفید ہے۔ لیموں کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے اور صحت ٹھیک رہتی ہے

افسانہ

ایک سوال

احمد تنویر

الطاف حسین دن بھر کے تھکے ماندے جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے تو اپنی بیوی کی آنکھوں میں جانا پہچانا سوال دیکھ کر کانپ سے گئے۔ ہر لمحہ، ہر پل، ہر روز ایک ہی سوال۔ کیا شبانہ کے لئے کوئی رشتہ ملا؟ اور ان کی آنکھوں کے سامنے بیس سال قبل کا وہ منظر گھوم گیا جب دن بھر دفتروں کی خاک چھان کر گھر میں داخل ہوئے تو شبانہ کی امی کی آنکھوں میں بس ایک سوال رہتا۔ کیا آج بھی کوئی نوکری نہیں ملی؟

شبانہ کی امی ان کا کوٹ اُتارنے لگیں۔ شبانہ چائے کی پیالی الطاف حسین کے ہاتھ میں دے کر دوبارہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ شبانہ کی عمر پچیس سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس کے کنوارے چہرے پر جگہ جگہ لکیریں ابھرنے لگی تھیں۔ خوبصورت سڈول جسم، ستواں ناک، تیکھا نقشہ اور صوم و صلوٰۃ کی پابند۔۔۔ لے دے کر سانولا رنگ ہی اس کا سارا نقص بن گیا تھا۔ سترہ، اٹھارہ سال کی عمر سے ہی شادی کی بات سنتے سنتے اس کے کان پک گئے تھے۔ اب گھر میں جب بھی اس کی شادی کا تذکرہ ہوتا اس کا چہرہ زرد ہو جاتا۔ ایک دن تو حد ہو گئی۔ جب اس کی چھوٹی بہن ریحانہ نے شبانہ کو خاموش خلاء میں گھورتے ہوئے دیکھا تو ہنستی ہوئی اس کے قریب گئی اور پیار سے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگی: "کیوں باجی! دولہا بھائی کی یاد آرہی ہے کیا؟" تو جیسے قیامت ہی آگئی۔ شبانہ نے غصہ میں اس کی وہ پٹائی کی کہ ریحانہ ہفتوں بستر پر پڑی رہی۔

الطاف حسین نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے

۔ل اور ہچکیاں بھرنے لگے۔ شبانہ کی امی ان کے ریب ہی بیٹھ گئی اور ان کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگیں۔

الطاف حسین آنکھیں بند کئے پڑے رہے۔

"سو گئے کیا۔؟" شبانہ کی امی نے دھیرے سے کہا۔

"اب تو قبر ہی میں چین سے سو سکوں گا، شبانہ کی ماں" الطاف حسین نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا شبانہ کی امی نے جھٹ اپنا ہاتھ اُن کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

"کیوں بھری شام ایسی منحوس باتیں زبان سے نکالتے ہیں کیا کمی ہے ہمیں؟ اچھا کھاتے ہیں، اچھا پہنتے ہیں۔ رہ گئی شبانہ کی شادی کی بات تو ابھی اس کی عمر ہی کیا ہوئی ہے؟ اس کی عمر کی تو سیکڑوں لڑکیاں ابھی بیٹھی ہوئی ہیں" کہتے کہتے ان کا گلا رندھ گیا اور پلکوں سے آنسوؤں کے چند قطرے ٹوٹ کر الطاف حسین کی پیشانی پر گر پڑے۔

چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی۔

"شبانہ کی ماں! میرے ذہن میں ذہلانے کیسی آندھیاں اٹھا کرتی ہیں۔ کیسی موجیں میرے سینے میں اُبلنے کے لئے بے قرار رہتی ہیں۔ میری راتوں کی نیند اور دل کا قرار چھن گیا ہے" وہ ایک ٹک ٹوٹی ہوئی شہتیر کو دیکھ رہے تھے "کل جب میں بڑے بابو کے گھر گیا تو وہ کافی خوش تھے۔ مجھے پاس ہی بٹھا کر کہنے لگے کہ میں نے اپنی لڑکی کی شادی طے کر دی ہے۔ لڑکا ڈاکٹر ہے۔ اُس نے صرف ایک کار کی فرمائش کی ہے۔ سچ کہتا ہوں شبانہ کی ماں کچھ دیر کے لئے تو جیسے میں پتھر بن گیا تھا۔ دل میں آیا کہ بڑے بابو کی جان لے لوں یا اپنی جان دے دوں" اُن کی آنکھوں میں سُرخی اُتر آئی تھی "برسوں بعد حکیم برکت اللہ نے ایک نسبت دی بھی تو اس شرط پر کہ لڑکے کو سات ہزار روپے تلک دینا ہوگا۔ اب تم ہی بتاؤ اتنی بڑی رقم میں کہاں سے لاؤں جتنا کماتا ہوں۔ سارا کا سارا خرچ ہو جاتا ہے۔ کسی کسی طرح سے دو تین ہزار روپئے جمع کر پایا ہوں تو اس زمانے میں اس کی کیا حقیقت ہے اور پھر شادی، بیاہ کوئی گڑا گڑیا کا کھیل تو نہیں ہے"

"...... تو پھر آپ کے بڑے بابو کے پاس اتنی رقم کہاں سے آ گئی؟" شبانہ کی امی نے پوچھنے کو

ناک پر سرکاتے ہوئے کہا۔
" رشوت سے ۔۔۔ !" الطاف حسین چڑھ کر بولے
" آپ بھی رشوت کیوں نہیں لیتے ؟ سارا زمانہ جب یہی کرتا ہے تو!"
" شباد کی ماں ۔ !" الطاف حسین چیخ پڑے۔
" خدا کے لئے دوبارہ ایسی بات زبان پر نہ لانا"
الطاف حسین بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلنے لگے شبانہ کی امی ان کے نزدیک سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں پھر دھیرے دھیرے رات گہری ہوتی گئی اور سب ہی لوگ خوابوں کی دنیا میں جا پہنچے۔
اسی طرح دن گزرتے رہے۔
ایک دن الطاف حسین کافی خوش خوش گھر میں داخل ہوئے اور کہنے لگے " شباد کی شادی ایک پروفیسر سے ٹھیک کر آیا ہوں" شباد کی امی کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے۔ لیکن پھر انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے الطاف حسین کی جانب دیکھا تو الطاف حسین نے انھیں پاس بلایا اور دھیرے سے کہا۔
" لڑکے کو صرف آٹھ ہزار نقد دینا ہے" پھر انھوں نے ایک بھرپور قہقہہ فضا میں بکھیر دیا۔۔۔
ریحانہ تالیاں بجاتی ہوئی شبانہ کے گلے میں جھول گئی۔ ایک عرصہ بعد شبانہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جاگی تھی۔ اس کی بھی کبھی آنکھوں میں سہانے سپنے لہرائے تھے۔ اور پھر اس کی آنکھیں خود ہی شرم سے جھک گئیں۔ سارا گھر خوش تھا۔ بابل کے گیتوں اور ڈھولک کی آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ شادی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہوگئی تھی۔ جیسے جیسے شادی کی تاریخ نزدیک آرہی تھی شبانہ کی آنکھوں میں ایک عجیب سا سرور چھانے لگا تھا۔ ایک عجیب سی لذت کے احساس سے اس کا انگ انگ تھرک اٹھتا۔ نئے گھر، نئی زندگی شروع کرنے کا حسین تصور!"
الطاف حسین شبابو کو منہ توڑ جواب دینا چاہتے تھے۔ " بڑے بابو کو ڈاکٹر داماد ملا تو انہیں کار دینی پڑی اور مجھے آٹھ ہزار ہی میں پروفیسر داماد مل گیا۔ کتنا سستا!"
۔۔۔ لیکن ایک دن تو غضب ہی ہوگیا۔ شادی کے ٹھیک ایک روز قبل الطاف حسین کے آفس جانے کے دو گھنٹے بعد ہی ان کے آفس کا چپراسی ہانپتا کانپتا گھر میں داخل ہوا۔
" صاحب رشوت لیتے ہوئے پکڑے گئے"

(باقی صفحہ ۲۳۲)

افسانہ

نسیم کوثر

ہاتھ میں بوسیدہ سی ٹوپی جسے اس نے کاسہ گدائی بنا رکھا تھا اور نظریں ہر آنے جانے والے پر، اسلام پور کی جامع مسجد کے باہری دروازے پر وہ صبح سویرے ہی آکر بیٹھ جاتا، اور عشاء کی نماز تک بیٹھا رہتا۔ بجھی بجھی آنکھوں اور بوسیدہ کپڑوں کے باوجود چہرے پر ایک عجیب قسم کا نور تھا پھر بھی اتنا ضرور تھا کہ اسے بھیک مانگنے کا ڈھنگ بالکل معلوم نہیں تھا۔ نہ کوئی گیت گاتا نہ صدائیں لگاتا بس خاموش، ہاتھ میں کاسہ گدائی لئے گم سم بیٹھا رہتا جیسے خاموشی اس کا گیت ہو اور خاموشی ہی اس کی صدا۔ پھر بھی نماز کے بعد لوگ اس کے پاس جاتے اور ٹوپی میں پیسہ ڈال کر کھسک جاتے۔ اس طرح اسے ایک اچھی خاصی رقم مل جاتی تھی کیونکہ عبادت کرنے کے بعد گناہوں کے بوجھ سے دبے ہوئے انسان کو وہاں کوئی دوسرا فقیر نہیں ملتا تھا اور پھر خیرات کرنے سے گناہوں کا بوجھ ہلکا ہو نہ ہو دل کا بوجھ ضرور ہلکا ہو جاتا ہے۔

دوسرے فقیر وہاں آنے سے گھبراتے تھے ایسی بات نہیں کہ وہ جامع مسجد تک آنا نہ چاہتے ہوں۔ خواہش تھی ضرور لیکن وہ کسی کو پھٹکنے ہی نہ دیتا تھا۔ جہاں کوئی نیا فقیر اس کی سرحد میں داخل ہونے کی کوشش کرتا وہ اسے ایسی ڈانٹ پلاتا کہ وہ پھر بھولے سے اُدھر آنے کی جرأت بھی نہ کرتا اور اسی دبدبہ کی وجہ سے وہ فقیروں کا بڑے میاں تھا اور اس کی عزت بھی تھی۔

بڑے میاں کی صرف ایک ہی لڑکی تھی۔ بڑے میاں کو اس کی شادی کی بڑی فکر تھی صعوذ دعا کرتے کہ "یا خدا میری بیٹی کو کوئی اچھا سا شوہر دلا دے۔" پھر وہ اُٹھ کر آہستہ آہستہ بجھے بجھے قدموں سے مسجد کی جانب روانہ ہو جاتے۔

لڑکی بڑی اور باشعور ہو چکی تھی۔ اس نے بابا کو فکرمند دیکھا تو ایک دن اس کا سبب پوچھ بیٹھی۔ بابا نے اُسے بتا دیا کہ بیٹی میں تیری شادی جلد سے جلد کر دینا چاہتا ہوں۔

"بابا میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔"

وہ تقریباً رو پڑی۔ "ارے پگلی! لڑکی کا سب سے بڑا کھونٹا اس کا شوہر ہوتا ہے جس سے وہ زندگی بھر بندھی رہتی ہے۔ تجھے تو خوش ہونا چاہئیے میں رات دن اسی فکر میں ہوں کہ کوئی اچھا سا بھکاری، جو ہوشیار اور خوش گلو ہو اور جو بھیک مانگنے کا آرٹ جانتا ہو اس سے تیری شادی کر دوں تاکہ تو سکون سے رہ سکے۔"

"لیکن بابا ابھی تو ڈاکٹر احمد حسین اور ڈپٹی رفیق احمد کی لڑکیاں کنواری بیٹھی ہیں۔ شمیم بوا کہہ رہی تھیں کہ وہ مجھ سے چھ سال بڑی ہیں اور بی اے، ایم اے بھی کر چکی ہیں پھر بھی ان کی شادی نہیں ہو رہی ہے خوبصورت بنگلہ ہے، کار ہے اور خود نگہت باجی اور سلمیٰ باجی ہزاروں میں ایک ہیں۔"

"بیٹی تو بھی بڑی بھولی ہے۔ بڑے لوگوں کی بڑی بات، ہم نالی کے کیڑوں سے ان کا کیا مقابلہ ہم تو وہ پھول ہیں جو خزاں میں کھلتے ہیں اور بہار میں مرجھا جاتے ہیں۔"

لڑکیوں کی ایک خاص عمر ہوتی ہے۔ جس میں ان کی شادی کر دینی چاہئیے۔ یہ امیر لوگ لڑکے کی تلاش میں ہی لڑکی کی آدھی عمر گنوا دیتے ہیں اور پھر آجکل لڑکے ملتے ہی کہاں ہیں اچھا لڑکا تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ آج کل تو لڑکے بکتے ہیں۔ بھیڑ بکریوں کی طرح ان پر بولی ہوتی ہے جس کا پلہ بھاری ہوتا وہ بازی لے جاتا ہے لوگ ڈاکٹر، انجینیر اور پروفیسر لڑکے تو خرید لیتے ہیں لیکن یہ خریدے ہوئے لڑکے مٹی کے کھلونے سے زیادہ کمزور اور نازک ثابت ہوتے ہیں جو زمانے کی سرد و گرم ہواؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتے ہیں اور پھر لڑکی کی زندگی جہنم سے بدتر ہو جاتی ہے وہ اپنی لڑکیوں کے لئے لڑکے تو خرید لیتے ہیں ٹھیک اسی طرح ایک ضدی بچے کی ہٹ پر اس کے والدین قیمتی کھلونے خرید دیتے ہیں لیکن خوشی تو بازاروں میں نہیں بکتی۔؟"

اور ایک دن اسی فکر میں غوطہ زن وہ چوپال لوٹ رہا تھا کہ چوراہے پر اسے ایک بھکاری نوجوان ملا جو اپنی مسحورکن آواز سے گلی والے کی ایسی صدا بلند کرتا کہ لوگ جھوم جھوم جاتے۔ مسافروں کے قدم رُک جاتے۔ چاروں طرف سے لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

بڑے میاں نے سوچا کیا غضب کا چھوکرا ہے۔ بڑے میاں کو یہ بھکاری چھوکرا بے حد پسند آیا۔ شام کو جب لوگ بکھرنے لگے اور وہ جانے کے لئے سامان اکٹھا کرنے لگا تو بڑے میاں کھانے کے بہانے سے اُسے اپنی جھونپڑی میں لے آئے کھانے کے بعد بڑے میاں نے اپنی لڑکی کی شادی کا تذکرہ کیا اور اپنی پریشانی بھی بیان کی۔ بڑے میاں نے ہزار سبز باغ دکھلائے۔ اپنی بیٹی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے لیکن وہ نوجوان بھکاری صاف مُکر گیا۔ پھر بھی بڑے میاں نے ہمت نہ ہاری اور ہار بھی کیسے مانتے وہ بھکاریوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے اور اس پیشہ میں انھیں پچاس کا تجربہ تھا۔ ایک بار پھر انھوں نے بھرپور کوشش کی اور یہ سُن کر ان کو اپنی سماعت پر دھوکہ ہوا جب نوجوان بھکاری نے بڑے میاں سے پوچھا۔ "اچھا جہیز میں کیا دوگے؟"

بڑے میاں تو ہر قیمت پر سودا کرنے کو تیار تھے نوجوان کی بات سُن کر بولے: "بیٹا یہ جھونپڑا اور سب سامان تمہارا، میرا کیا مجھے تو صرف دو روٹی چاہئیں۔ باقی سب تم دونوں میاں بیوی کا ہوگا۔"

"اس بوسیدہ سی جھونپڑی میں کیا رکھا ہے؟" نوجوان بھکاری کی بات سُن کر بڑے میاں کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا۔ وہ غصہ کو پی کر بولے اور کیا چاہئے تمہیں۔۔؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر کان سے اُدھ جلے سگریٹ کا ٹکڑا جلا کر ایک لمبا کش لیکر بولا "ابھی میرا کچھ حساب کتاب جمع نہیں ہے۔ پاس میں کچھ موٹی رقم ہوتی تو کسی ضرورت مند بھکاری کو پکڑی دیکر اچھا سا ٹھکانہ خرید لیتا۔"

"تم ہوشیار ہو ماشاء اللہ جوان ہو اور پھر تمہاری آواز میں اللہ تعالے نے ایسا نور دیا ہے کہ اچھی خاصی بھیڑ اکٹھا ہو جاتی ہے اور آمدنی بھی۔ کچھ دن اور صبر کر دپھر کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈ لینا۔"

بڑے میاں نے مشورہ دیا۔

"ارے بابا یہ سب تو اور بات ہے اور پھر تم خود ہی سمجھدار اور تجربہ کار ہو۔ آج کل بھیک مانگنے کی ٹکنک بدل گئی ہے۔ میں تو بے حد پریشان ہوں۔ ہاں اگر تم اپنی مسجد والی جگہ مجھے دے دو۔"

اور بڑے میاں کو اس بھکاری نوجوان کو دیکھ کر ناامیدی کے صحرا میں جو اُمید کی ایک ہلکی سی کرن دکھائی دی تھی۔ وہ تاریکی میں ڈوبتی ہوئی نظر آنے لگی۔ اُنھوں نے اپنی بُجھی بُجھی آنکھوں سے ایک بار نوجوان کو دیکھا اور اس کی شرط کے سامنے سر جھکا دیا۔ وہ خوش تھا کہ اس کی بیٹی کو ایک مستقل ٹھکانہ مل گیا۔ ●●

بقیہ ایک سوال کا

انھیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔" یہ خبر سنتے ہی سارے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ شبانہ کی امی ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئیں۔ شبانہ کی آنکھوں میں تو جیسے آنسو خشک ہو گئے تھے اس کے رخسار کی سرخی ایک بار پھر غائب ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں سارے جہاں کا کرب سمٹ آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ساکت لب پر ایک ہی سوال تھا۔ "بتاؤ! میں کب تک کنواری رہوں گی؟" ●●●

مظہر امام

مرا ساتھ نہ چھوڑ

تو شب و روز کا حاصل ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
اور جو کچھ بھی ہے، باطل ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
تو نے سوچا ہے مجھے تو نے سنوارا ہے مجھے
تو مرا ذہن، مرا دل ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
تو نہ ہوگا تو کہاں جا کے جلوں گا شب بھر
تجھ سے ہی گرمیٔ محفل ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
ہے تعاقب میں مرے چیختی موجوں کا ہجوم
تو کہ ٹھہرا ہوا ساحل ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
تری اُلفت کو سپر اپنی بنائی میں نے
شہر کا شہر ہی قاتل ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
کیوں کروں رنج کہ ابھی آئیں گے کتنے موڑ
وقت، کہتے ہیں کہ، عادل ہے میرا ساتھ نہ چھوڑ
سب کی رفتار کو دیکھا جو مرے ساتھ چلے
تو ہی ہمراہی کے قابل ہے، میرا ساتھ نہ چھوڑ
اب کسی راہ پہ جلتے نہیں چاہت کے چراغ
تو مری آخری منزل ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ

(بشکریہ شاعر بمبئی)

بانس کے پھول

از :- مردولا سنہا
ترجمہ :- پریمی گوجرانوالی

منجو دھڑ دھڑاتی ہوئی لوکل ٹرین کے ڈبے میں گھس گئی۔ پرس کو کونے والی سیٹ پر پھینک کر وہ پلو سے پسینہ پونچھنے لگی۔ تبھی اس کی نظر سامنے بیٹھے آدمی پر پڑی جو اس کی طرف پیٹھ کئے لیٹا تھا اور کھجور کا پنکھا جھل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی جو بڑی چنچل لگ رہی تھی۔ پنکھا دیکھ کر منجو کو بارہ سال پہلے کی یاد آگئی جو اسے پنکھا جھلتے دیکھ کر کہتا تھا۔ "تم تو پوری دادی نانی لگتی ہو" وہی کنج جس سے منجو نے پریم وواہ کیا تھا۔ اگرچہ پتا نے لاکھ مخالفت کی مگر منجو نے اپنی ضد کے آگے کبھی کسی کو اہمیت نہیں دی تھی۔ کسی کی ہمت تھی جو اس کے پاؤں میں بیڑیاں

تھا۔ شادی کے پانچ سال کسی طرح رو دھو کر پورے کئے تھے اور ایک دن وہ تمام بندھنوں کو توڑ کر منالی آگئی پنچن کو بھی ساتھ لائی تھی۔

طلاق ہوا تو پنچن کنج کے حصہ میں آئی۔ منجو کے لئے پنچن سے الگ ہونا اتنا ہی تکلیف دہ تھا جتنا انگوٹھے سے ناخن الگ ہونا۔ مگر کیا منجو پتی کے دروازے پر بچی کی بھیک مانگتی؟ تب سے منجو بمبئی کی ایک فرم میں اونچے عہدے پر کام کر رہی تھی۔

ٹرین رکی۔ خیالات کی کڑیاں ٹوٹیں منجو ٹرین سے اتر کر آگے بڑھی ہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے پکارا "منجو"

اپنا نام سن کر وہ چونک پڑی مگر پکارنے والا کچھ دور تھا اس لئے پہچان نہ سکی۔

ارے یہ تو وہی پنکھے والا ہے۔ تو ..... یہ .... تو ... کنج ہی ہے۔ اسے

چولہے پوری نگل جائے گی۔
گنج بولا :- منجو تم ابھی تک گانٹھ باندھے ہو؟ ابھی تک اسی غصہ کو سینے سے چپکائے ہو! کیا تمھیں میری۔ میری اپنی کنچن کی یاد نہیں ستاتی؟ میری نہ سہی کنچن کی خاطر۔
شٹ اپ! پتہ نہیں لوگ پرائی عورتوں کو کیا کیا بول جاتے ہیں! آپ کو شرم نہیں آتی؟ اور گردن جھٹک کر دھند ناتی ہوئی اسٹیشن سے باہر آگئی اور کچھ دور جاکر اس نے محسوس کیا کہ اس کا سارا جسم پسینہ سے تربتر تھا کیا وہ سچ مچ گنج کو نہیں پہچانی؟ یا پھر نہ پہچاننے کا بہانہ کر رہی تھی؟ او نہہ ہو گا!
مگر یہ خیالات تھے کہ پیچھا ہی نہ چھوڑتے تھے۔ میں کیوں جھکوں؟ آج ہی میری ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ آج چاہتا ہے کہ میں اس کے قدم چوموں؟ منجو ایسی جھکنے والی نہیں۔
آفس آگیا تھا۔ آفس میں بھی وہ ملال دن بدحواس سی رہی۔ رات کو بھی وہ من سے لڑتی رہی۔ جتنا بھلانے کی کوشش کرتی، من اتنا ہی اور الجھتا جاتا۔ کبھی کبھی بیٹی کنچن سے ملنے کو دل اتنا بے تاب اٹھتا کہ کلیجہ پھٹنے سا لگتا۔
اف یہ کیسی ہلچل؟ اتنے سالوں گھمنڈ پل بھر میں چور ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ روز ٹرین سے آتی جاتی نہ تو کبھی گنج ملا اور نہ کبھی کنچن۔
بیچاری منجو آشاؤں کا ساگر لئے جا اور سونا من لئے لوٹ آتی۔
ایک دن وہ بس کے انتظار میں کھڑی تھی کہ سڑک کے پار نیلی کار کے اندر کنچن کا چہرہ دکھائی دیا۔ شاید اسے گنج ڈرائیو کر رہا تھا۔ منجو کو ایسا محسوس کہ برسوں کی مراد آج پوری ہوئی۔
بدحواس ہو کر چوراہا پار کرنے لگی۔
جتنی دیر میں اس نے چوراہا پار کیا اتنی دیر میں خیالات کا سمندر اٹھ کھڑا ہوا۔
وہ کہے گی "گنج، کنچن، اب میں

لوگوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اتنے برسوں کی مردہ زندگی میں نے کیسے گزاری ہے تمہیں کیسے بتاؤں؟"

کار کے پاس پہنچ کر اس شیشے سے جھانکا۔ وہ چونک پڑی۔ کینچن ایک عورت کے گلے میں باہیں ڈال کر کہہ رہی تھی۔ ممی۔ ماں۔ گنج بولا۔ کینچن۔ مجھے لگتا ہے مد سو تمہاری اپنی ممی ہے سوتیلی نہیں ہے۔

کینچن نے منہ بنا کر کہا۔ "سوتیلی کیوں؟ سوتیلی تو وہ ہوتی ہے جو چھوڑ جاتی ہے۔"

اس کے آگے کچھ اور نہ سن پائی اسے لگا کہ کانوں میں کوئی گرم شیشہ انڈیل رہا ہے۔ اس کا دل چاہا وہ کہے ..... میں آگئی ہوں بیٹی، میں کہیں نہیں گئی تھی۔ شاید تم لوگ ہی کھو گئے تھے کہیں۔ میں تو ہمیشہ تمہارے پاس تھی.....

مگر وہ کچھ نہ کہہ پائی۔ اسے لگا جن پھولوں کی خوشبو پا کر وہ یہاں تک دوڑی آئی تھی وہ بانس کے پھول تھے جنہیں وہ کبھی

حکمت کی ڈائری

شہد کے ذریعہ علاج

بد ہضمی:۔ چائے کے پیالہ میں تازہ ابلا ہوا پانی ڈالیں اس میں ایک بڑا چمچہ شہد اچھی طرح سے ملالیں۔ جس قدر گرم پی سکتے ہوں چائے کی طرح آہستہ آہستہ پی لیں۔ صبح دوپہر اور شام دن میں تین مرتبہ کھانا کھانے سے پہلے پی لیا کریں۔ ہاضمے کی تمام تکالیف کے لئے مفید ہے۔

تکان:۔ دماغی اور جسمانی تکان کو رفع کرنے کے لئے شہد ایک بہترین ٹانک ہے۔

جب آپ کو دماغی یا جسمانی تکان محسوس ہو تو دو بڑے چمچے شہد ایک گلاس گرم پانی میں ڈال کر خوب ملا کر پی لیا کریں۔ تکان دور ہو جائے گی۔

نزلہ و زکام:۔ شہد کے دو چمچے آدھے لیموں کے پانی میں ملا کر دن میں تین چار بار پینے سے یا گرم پانی کے گلاس میں ایک بڑا چمچہ شہد اور ایک چمچہ ادرک کا پانی ملا کر پینے سے نزلہ و زکام دور ہو جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

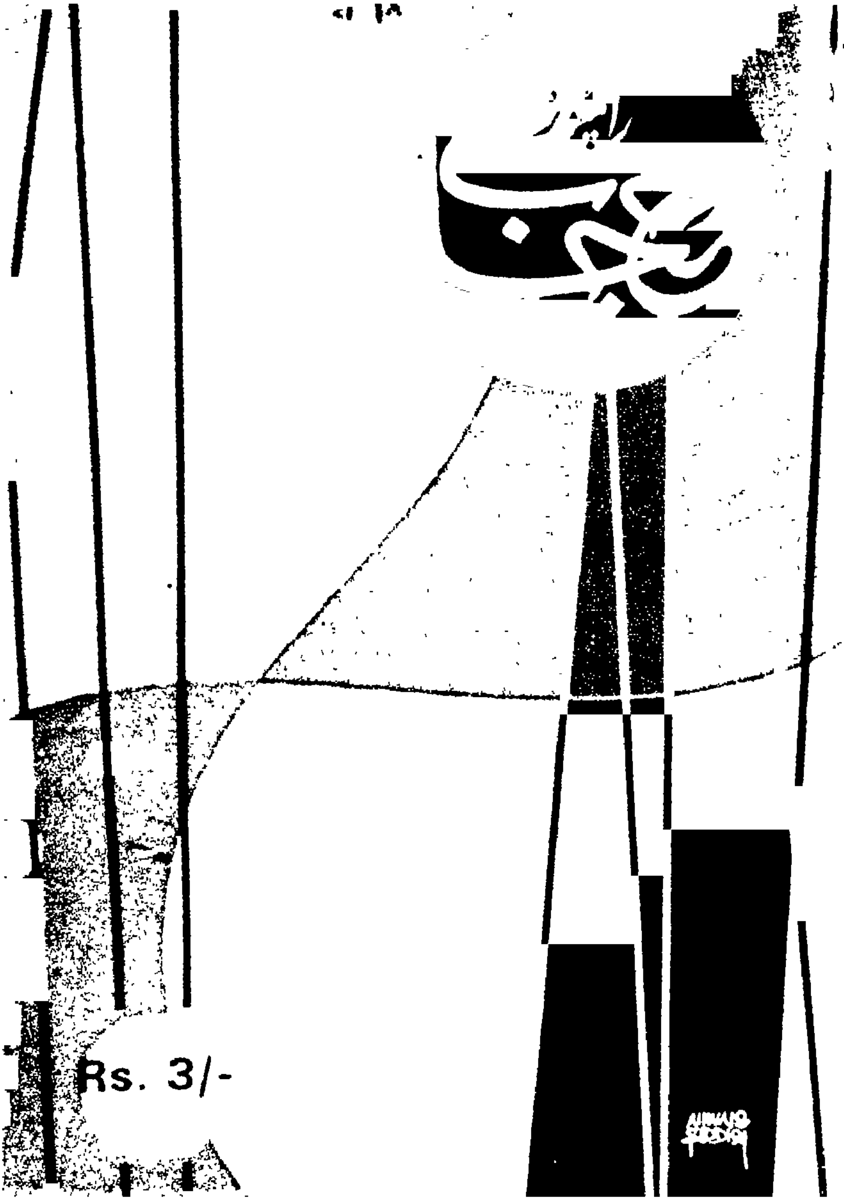
اللہ کی مصلحت

۱۹۵۹ء کا ذکر ہے۔ میرے والد بزرگوار کو پاکستان جانا تھا۔ میں اور میرے چچازاد بھائی عبدالحق صاحب والد بزرگوار کو ریلوے اسٹیشن چھوڑنے گئے۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ گاڑی جا چکی ہے جس کا صد درجہ افسوس ہوا۔ اب دوسری گاڑی کے لیے تقریباً سات گھنٹے انتظار کرنا تھا چونکہ ریلوے اسٹیشن سے ہمارا گاؤں تقریباً آٹھ میل دوری پر ہے اور شام کے چار بج چکے تھے اس لئے والد بزرگوار نے ہم لوگوں کو واپس کر دیا۔

صبح کو ریڈیو کے ذریعہ معلوم ہوا: "پاکستان جانے والی ایک ٹرین امرت سر میں اُلٹ گئی جس میں بہت سے افراد ہلاک وزخمی ہو گئے۔ اس خبر سے ہم لوگوں کو بے حد تشویش ہوئی اب تو گھر کے سبھی افراد کے دلوں میں ایک انجانا خوف طاری ہو گیا اور ہم لوگ اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعائیں کرنے لگے۔ تقریباً دو، تین روز کے بعد والد بزرگوار کا خط موصول ہوا۔ خدا کا شکر ادا کیا جو بڑا مہربان ہے۔ انھوں نے لکھا کہ تم لوگ خبر سنکر پریشان ہو گئے ہو گے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اس ٹرین میں نہیں تھا۔ اگر آتے وقت گاڑی نہ چھوٹی ہوتی تو اسی ٹرین میں ہوتا جس کا ایکسیڈنٹ امرتسر میں ہوا۔ خدا معلوم پھر کیا ہوتا حالانکہ اس روز گاڑی چھوٹنے کا صد درجہ افسوس تھا، لیکن مشیت ایزدی کچھ اور تھی جو ہماری فہم وادراک سے بالاتر ہے۔ بیشک ہر آرام و تکلیف مالک حقیقی کی طرف سے ہے اور اس میں انسانوں کے لیے بھلائی وخیر پوشیدہ ہے۔ اللھم حفظنا من کل بلاء الدنیا وعذاب الاخرۃ۔

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد اسحٰق مائل خیرآبادی مطبوعہ ... پرنٹرز دہلی مقام اشاعت محلہ بارہ دری ...

MONTHLY **HIJAB** RAMPUR U.P


Rs. 3/-

12.7.79

پاکیزہ ڈائجسٹ

خواتین اور طالبات

حجاب

اس دائرے میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ نے حجاب کے لیے جو زرِ تعاون عنایت فرمایا تھا اس کی مدت اس پرچے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے اور یہی سرخ نشان آپ کو یاد دلاتا ہے کہ آئندہ کے لئے جلد سے جلد زرِ تعاون مرحمت فرمائیں........ والسلام

منیجر حجاب رامپور۔ یو۔پی۔ ۲۴۴۹۰۱

جلد ۹

شمارہ ۱۰۹

شعبان ۱۳۹۹ھ ★ جولائی ۱۹۷۹ء

ایک شمارہ ۔/3

سالانہ چندہ ۔/26

V.P سے ۔/30

مقالات ومضامین

صحت وتندرستی

مراسلات

حجاب کی نظر میں

کاتب: الیاس حسین

در پردۂ حجاب

ایمانیات

افسانے اور کہانیاں

سیر و سیاحت

منظومات

جیسی کرنی ویسی بھرنی

سورۂ زمر رکوع ۸ کا ترجمہ

جہنّمی

اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تھا جہنّم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے کارندے ان سے کہیں گے "کیا تمہارے پاس تمہارے اپنے لوگوں میں سے ایسے رسول نہیں آئے تھے جنھوں نے تم کو تمہارے رب کی آیتیں سنائی ہوں اور تم کو اس بات سے ڈرایا ہو کہ ایک وقت تم کو یہ دن بھی دیکھنا ہوگا۔ (وہ جہنمی جواب دیں گے "ہاں، آئے تھے" مگر عذاب کا فیصلہ کافروں پر چپک گیا۔ کہا جائے گا۔ داخل ہو جاؤ جہنّم کے دروازوں میں، یہاں اب تمہیں ہمیشہ رہنا ہے۔ بڑا ہی برا ٹھکانہ ہے یہ گھمنڈیوں کے لئے۔

جنّتی

اور وہ لوگ جو اپنے رب کی نافرمانی کرنے سے بچتے تھے انھیں (ایک مہذب) جماعت کی طرح جنّت کی طرف لے جایا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے تو پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے تو اس کے منتظمین ان سے کہیں گے" سلام ہو تم پر، بہت اچھے رہے۔ تشریف لے جائیے اس (جنّت) میں ہمیشہ کے لئے" اور وہ (جنّتی) کہیں گے شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو (جنّت میں) زمین کا وارث بنا دیا۔ اب ہم جنّت میں جہاں چاہیں اپنا مقام بنا سکتے ہیں! پس بہترین اجر ہے عمل کرنیوالوں کے لئے۔

کرنوں کا سفر

اداریہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شبرات، شبرات کے بارے میں ہم ہر سال لکھتے ہیں کہ شبرات میں آتشبازی چھوڑنا آگ سے کھیلنا ہے۔ یہ فضول خرچی ہے اور اس سلسلے میں فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔ ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین۔ آتشبازی چھوڑنا ایک قومی نقصان، ایک فضول خرچی اور ایک عظیم گناہ ہے۔ قومی نقصان مال کا بھی اور جان کا بھی۔ اخبار پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ہر سال شبرات میں بہت سے بچے جل جاتے ہیں اور اکثر مر بھی جاتے ہیں۔

یہ سب کچھ ہے لیکن مسلمانوں میں زیادہ تر لوگ اس فضول خرچی اور اس عظیم گناہ میں حصہ لیتے ہیں۔ چونکہ عام طور پر مسلمانوں میں دینی تعلیم نہیں ہے اس لیے وہ اسے ایک کارنمایاں اور ثواب کا کام سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں شبرات دیوالی کی رات کے مثل ہے۔ برادران وطن کا عقیدہ ہے۔ دیوالی کی رات لکشمی جی گھر گھر تشریف لاتی ہیں اور حصہ رسد دولت تقسیم کر جاتی ہیں یہی خیال مسلمانوں کو شبرات کے سلسلے میں ہو گیا ہے۔ انھیں بھی بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے آسمان پر آکر پکارتا ہے کہ کون مجھ سے مانگتا ہے میں اُسے دوں گا۔ چنانچہ مسلمان اسی خوشی میں چراغاں کرتے ہیں اور آتشبازی چھوڑ کر خدا کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی نے فضول خرچ کرنے والوں کو شیطان کا بھائی فرمایا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ شبرات کے سلسلے میں عام مسلمانوں میں جو خیال پایا جاتا ہے اس میں

عوام تو ذمہ دار ہیں ہی. لیکن ہمارے علماء بھی ذمہ دار ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ آتشبازی شرعاً گناہ عظیم ہے لیکن وہ کم ہی اپنی تقریروں میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ شبرات سے ہفتوں پہلے سے جمعہ کے دن خطبوں میں اور مجلسوں کے وعظوں میں اس گناہ عظیم کے بارے میں قرآن و حدیث کے حوالوں سے مسلمانوں کا ذہن بنانا شروع کر دیا کریں۔

شبرات میں مسلمانوں کے اندر خدا جانے کس نے یہ روائت پھیلا دی ہے کہ اُحد کی لڑائی میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو دانت شہید ہوئے تھے تو اس خبر کو سن کر مشہور عاشق رسول حضرت اویس قرنی رح نے اپنے سارے دانت توڑ ڈالے تھے اور جب حضورؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے ان کے لیے حلوہ بھیجا تھا چنانچہ یہ ایک یادگاری سنّت ہے۔

یہ روائت بالکل غلط ہے۔ حضرت اویس قرنی رح کا اتنا بلند مقام ہے کہ وہ جب حضرت عمر رض سے ملنے کے لیے مدینے تشریف لائے تو حضرت عمر رض نے ان سے درخواست کی کہ آپ ہمیں نصیحت کریں۔ بھلا ایسے بلند تابعی سے یہ شرعی غلطی کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے دانت توڑ ڈلے۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ایک تابعی کتنا ہی عالی مرتبہ ہو لیکن وہ صحابی رسولؐ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ نہ علم میں نہ تقویٰ میں۔ تو اس وقت جب حضورؐ کے دانت شہید ہوئے تھے کسی صحابی نے اپنے دانت نہیں توڑے۔ سیدہ بی بی فاطمہ رض سے زیادہ حضورؐ سے کس کو محبت ہو سکتی تھی۔ بی بی صاحبہ نے بھی یہ غیر شرعی فعل انجام نہیں دیا۔

یہاں بھی ہم علمائے کرام ہی کی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے وعظوں اور خطبوں میں اس غلط روائت کی تردید کریں۔ اور عوام کا ذہن اس سلسلے میں صاف کریں۔ اللہ تعالیٰ بڑا اجر عطا فرمائیگا

ہاں ایک روائت میں یہ آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کی چودھویں رات میں مدینے

ن جنت البقیع میں تشریف لے گئے تھے اور آپ نے قبرستان کے مُردوں کے لیے
مغفرت کی تھی۔ تو زیادہ سے زیادہ یہ سنت کہا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے اتنا اہتمام کرنا کہ
فول ساری رات قبرستانوں میں گھوم گھوم کر یہ سنت ادا کرتے ہیں اور پھر پچھلے پہر جب
ں تو بہتوں کی فجر کی نماز فوت ہو جاتی ہے جو فرض ہے۔ مسلمان اتنی سی بات نہیں
ر یہ سنت کسی کو کرنا ہی ہے تو تنہا کرنا چاہیے۔ علماء نے یہی مشورہ دیا ہے۔

عبان کی چودہویں رات کے سلسلے میں جو روائتیں مشہور ہیں وہ ہم نیچے درج کرتے ہیں،
ں جاننا چاہیے کہ ان روائتوں پر ہمارے اماموں نے بڑی سخت جرح فرمائی ہے۔ بہرحال
ں ملاحظہ ہوں۔ یہ حدیثیں بہت لمبی ہیں اس لیے ہم ان کا مفہوم پیش کرتے ہیں۔
ضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا۔ آج نصف شعبان کی رات ہے اس میں
ٰ اتنے لوگوں کو جہنم سے نجات دے گا جتنے قبیلہ کلب کی بکریوں کے بال ہیں۔ یعنی بے شمار
لیکن مشرک، کینہ پرور، قطع رحمی کرنے والا۔ پاجامہ یا تہبند ٹخنے سے نیچے لٹکانے والا۔ اپنے
انا فرمان۔ شراب خور، ظلم سے محصول لینے والا۔ جادوگر۔ غیب کی چیزیں بتانے والا۔ فال والے
۔ عملیات ٹونے ٹوٹکے کرنے والے، عریف یعنی جوتشی جو ہاتھ کی لکیروں سے حال بتاتے
سپاہی اور چوسر والے اور طنبورہ والے بخشش سے محروم رہیں گے۔
ضرت عائشہ رض سے روائت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ نصف شعبان کی
ہے۔ اللہ تعالیٰ اس رات کو خاص طور سے علماء کی طرف توجہ فرماتا ہے۔ اور استغفار کرنے
۔ رحم فرماتا ہے لیکن آپس میں کینہ رکھنے والوں کے حال پر چھوڑ دیتا ہے"
ضرت علی رض فرماتے ہیں کہ جب نصف شعبان کی رات آئے تو رات کو جاگو۔ نماز پڑھو
ں اور روزہ رکھو کیونکہ اللہ تعالیٰ اس رات کو سورج ڈوبنے کے بعد سے ہی نیچے آسمان

پر بھی فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کہ ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ ہم اس کی مغفرت کردیں۔ ہے کوئی رزق مانگنے والا کہ ہم اس کو رزق دیں۔ ہے کوئی گرفتار بلا کہ ہم اُسے مصیبت سے چھڑادیں اللہ تعالیٰ صبح تک یہ فرماتا رہتا ہے۔

● عطار ابن بسیار فرماتے ہیں کہ اس رات ملک الموت کو سال بھر تک مرنے والوں کی فہرست مل جاتی ہے۔ اس کا مطلب علماء نے یہ بیان فرمایا ہے کہ ایک آدمی کا نام تو اس فہرست میں درج ہے اور وہ ہے کہ مکان کی تعمیر میں لگا ہے یعنی سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔

ان روائتوں کو پھر پڑھ لیجئے۔ اللہ کے دربار سے جو لینا ہو۔ ان کے تحت لے لیجئے اور جن بُرائیوں سے بچنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ ان سے دور رہنے کا عہد کیجئے۔ اس طرح تو اس رات کا حق ادا ہو سکتا ہے ورنہ یاد رہے کہ الٹے آئتیں گلے پڑیں گی۔

مُشکل ہے

پروفیسر طفیل احمد مدنی

اے دوست حصولِ آزادی بے سعی فراواں مشکل ہے
ہم بیٹھے رہیں اور کھل جائے خود ہی درِ زنداں مشکل ہے

امید لگائے بیٹھے ہیں جس صبح کی اب بھی اہلِ نظر
پھر سینۂ شب سے ظاہر ہو وہ صبح درخشاں مشکل ہے

ایمان و یقینِ محکم کے فانوس لگا لو تم ورنہ
اس تیز ہوا میں ٹک جائے یہ شمع فروزاں مشکل ہے

مغرب کی طرف سے اٹھا ہے جو کفر و ضلالت کا طوفاں
سُن لو کہ فقط فریادوں سے رُک جائے وہ طوفاں مشکل ہے

ہم جادۂ حق سے ہٹ جائیں یہ بات تو مانا ہے ممکن
باطل کو مگر ہم حق کہدیں اے گردشِ دوراں مشکل ہے

دل اپنے جلالیں تو شاید یہ دشتِ جنوں طے ہو جائے
ماحول کی ظلمت میں ورنہ طے ہو یہ بیاباں مشکل ہے

ہر سمت فضائے جور و ستم ہر سمت فضائے عشوہ گری
کس سمت نہ دیکھوں میں آخر اے دیدۂ حیراں مشکل ہے

وہ دورِ جنوں تھا دورِ جنوں یہ دورِ خرد ہے دورِ خرد
اس دور میں لیکن مل جائے غالب سا سخنداں مشکل ہے

وہ شخص طفیل اپنا سب کچھ قرباں ہے جس کی عظمت پر
لے آئے کہیں سے اُس جیسا اب محفلِ خوباں مشکل ہے

منا منا بات تو سنا!

شبنم بانو علی، جامعۃ الصالحات

ے میرے گھر کی مسرت کو بڑھانے والے
زندگی پھولوں کی خوشبو سے بسانے والے

زندگی کا یہ نیا دور مبارک ہو تجھے
تیرے ہونٹوں کی ہنسی اور بھی کھلتی جائے
تجھ سے روشن ہوں زمانے میں روایات حسن
جو تجھے چاہیے وہ شے تجھے ملتی جائے

یرے آنگن میں کھلیں علم و حکایات کے باغ
یرے جینے سے منور ہو شب تیرہ و تار
یرے ایوان تمنا میں ستاروں کا ہجوم
رے افکار سے پر کیف صحت مند بہار

آ تجھے پیار کے آداب سکھا دوں پل میں
تیرے ہونٹوں کی گلابی کو ذرا چوم تو لوں
وہ نشہ جو کہ تو لایا ہے یہاں اپنے ساتھ
تیرے اس نشہ کو پی کر میں ذرا جھوم تو لوں

تو کہ آیا ہے نئے دور میں مانند چراغ
تجھ کو تاریک مکانوں میں بھی جلنا ہوگا
تیرے حصے میں جو کچھ آئے بحسن خوبی
اپنے ماحول کی ہر شے کو بدلنا ہوگا

تیری دنیا ہے جفا کیش سراپا عیار
تیرا اللہ تجھے علم کی طاقت دیدے
پاؤں کانٹوں سے بچاتا ہوا تو راہ چلے
تیرا اللہ تجھے ایسی ہی حکمت دیدے

تو کھلے پھول کی مانند رہے مثل چراغ
تیرے اعمال میں پوشیدہ ہو راز جبریل
تجھ سے پیدا ہوں زمانے میں بھلے چال چلن
اور قرآن مقدس ہو سدا تیرا کفیل

اپنے ماں باپ کی عزت کا نگہبان رہے
ہاں تو انسان بنے واقعی انسان بنے
سختیاں لاکھ ہوں خاطر میں نہ لائے کوئی
تو بہر حال مسلمان، مسلمان، مسلمان بنے

زندگی سایہ مژگان کی طرح چھائی رہے
موت کی آہنی زنجیر بھی ہلکی پڑ جائے
جس طرف دیکھ لے تو آنکھ اٹھا کر بھیا!
خوف سے جسم میں باطل کے بھی لرزش بڑھ جائے

تجھ سے امید ہے امید ہی بن کر رہنا
بن کے اللہ سے، شیطان سے تن کر رہنا

مہارانی

(دوسری قسط)

منورہ نوری



ایک دلگداز تاریخی داستان

محمد بن قاسم جب سندھ میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا!

اب تک کہانی کا خلاصہ

[redacted]

مہاراجہ سندھ کے دو بیٹے تھے داہر اور دھرسنگھ. مہارانی کا نام سوبھی دیوی تھا. اس سے ایک بیٹی بھی پیدا ہوئی. اس کا نام تھا راج کماری بائی. درباری نجومی پنڈت سلائچ نے راج کماری کا زائچہ تیار کیا اور لکھا کہ "راج کماری کا سنجوگ جس سے بھی ہوگا وہ سندھ کا مطلق العنان راجہ ہوگا" زائچے کی یہ پیشین گوئی سنکر مہاراجہ اور مہارانی اور داہر اور دھرسنگھ گھبرا گئے اس کا مطلب یہ ہے کہ راجکماری کا سنجوگ (بیاہ) جس سے ہوگا وہ سندھ کا راجہ ہوگا اور داہر اور دھرسنگھ محروم رہیں گے. دھیرے دھیرے راج کماری جوان ہوگئی تھی. مہاراجہ مرچکا تھا اس کی جگہ داہر راجہ بنا. سلائچ کی پیشین گوئی سے وہ سب سے زیادہ پریشان تھا. راجکماری کے لیے جب کوئی پیغام آتا انکار کردیتا. لیکن بہرحال راجکماری کا بیاہ تو کرنا ہی تھا مگر کیسے؟ صفحہ اُلٹیے اور اس کا حل ملاحظہ فرمائیے.

دن گزرتے گئے نئے نئے واقعات جنم لیتے گئے

راجہ رسل نے بڑے تزک واحتشام سے پنڈت سری پرشاد کو ہیرے جواہرات اور قیمتی تحائف کے ساتھ رانی سوبھن دیوی کے حضور بھیجا۔ یہ راج کماری کے لئے دستِ سوال دراز کرنے کی طرف پہلا قدم تھا مگر رانی سوبھن دیوی جو کل تک اس پر فخر کرتی تھی اب یہ سب دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی۔ سلایئج کی بات نے اسے رانی بائی کی پیدائش پر نجومیوں کی پیش گوئی یاد دلا دی تھی اور اسے یہ کسی طرح بھی گوارا نہ تھا کہ راج کماری بائی سندھ کی مہارانی بن کر حکومت کرے اور داہر اور دھر سنگھ اس کی نحوست کا شکار ہوں۔ اس رات دونوں ماں بیٹے دیر تک مشورہ کرتے رہے۔ راجہ داہر بولا۔

"پنڈت سری پرشاد کو ناکام لوٹانا ناحق سے خواہ مخواہ کی مصیبت مول لینا ہے۔"

" لیکن راج کماری بائی کو اس سے بیاہ دینا اس سے بھی بڑا خطرہ ہے۔" رانی سوبھن دیوی نے کہا۔

"سلایئج کی پیش گوئی آج تک غلط ثابت نہیں ہوئی۔" راجہ داہر نے کہا۔ اور وہ کہتا ہے کہ راج کماری کا سنجوگ جس سے بھی ہوگا وہ سندھ کا مطلق العنان راجہ بنے گا۔"

"اس وقت سب سے بڑا مسئلہ راجہ بھاٹیہ کے سوال کو لوٹانا ہے۔ تجربہ کار رانی سوبھن دیوی نے کہا۔ راجہ داہر اس بار کچھ نہ بولا بلکہ وحشت زدہ نگاہوں سے ماں کو تکتا رہا پھر وہ بولی۔

"اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ پنڈت سری پرشاد کو مع التحائف و عزت کے ساتھ لوٹا دو اور کہہ دو کہ راجکماری کے سویمبر پر دعوت دیں گے؟"

"تحائف لوٹانے کا مطلب آپ کو معلوم ہے؟" راجہ داہر نے اسے دیکھا۔

"تو پھر تحائف رکھ کر اسے لوٹا دو تاکہ جھگڑا نہ ہو۔" سوبھن دیوی نے جواب دیا۔

" تحائف روکنے کے معنی یہ ہیں کہ اب

سوئمبر کی رسم کی ضرورت نہیں بلکہ ہم نے اسے منتخب کر لیا ہے۔"

راجہ داہر نے بحث کے انداز میں کہا۔

دیر تک سوبھن دیوی آسے اور وہ سوبھن دیوی کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے آخر طے پایا کہ پنڈت سری پرشاد کو معہ تحائف کے باعزت طور پر لوٹا دیا جائے اور کہا جائے کہ کئی راجوں مہاراجوں کے تحائف آئے ہیں مگر ہم سب کو لوٹا رہے ہیں تاکہ سوئمبر کی رسم پر سب کو دعوت دے سکیں۔

وقتی طور پر بلا سر سے ٹل گئی مگر راجہ داہر کا سکون واپس نہ آسکا وہ سخت متردد اور الجھن میں گرفتار ہو چکا تھا۔ راجکماری بائی بہت بڑا مسئلہ بن چکی تھی اس کی شادی کرنا اور نہ کرنا دونوں ہی باتیں خطرناک تھیں۔ وہ خوبصورت ہی نہیں حسین ترین تھی جس کی جوان ہونے سے قبل ہی شہرت پھیل گئی تھی۔ ایسے میں اسے بٹھائے رکھنا بھی اور بیاہ دینا سندھ کی حکومت کا چھن جانا تھا۔ خیالات کی یلغار ہوتی تو وہ سوچوں میں کھو جاتا۔ تب چشم تصور اسے عجیب عجیب منظر دکھاتی وہ دیکھتا کہ سندھ کے تخت پر کوئی اور متمکن ہے راج کماری اس کے پہلو میں مہارانی بنی بیٹھی ہے اور وہ خود ....؟ اس کے آگے وہ آنکھیں بند کر لیتا۔ خود کو ایک بھٹکے ہوئے انسان یا بھکاری کے روپ میں دیکھنے کی اس میں تاب نہ تھی ایسے میں اس کا دل چاہتا کہ راجکماری کا گلا گھونٹ دے، اسے سمندر کی بھینٹ چڑھا دے یا زندہ ہی کہیں غائب کر دے۔ وہ کبھی سوچتا اُسے نذر آتش کر دے تاکہ اس کی پیشانی سے مہارانی کا لفظ بھی جل جائے مگر یہ سب سوچنا سہل تھا۔ اُس پر عمل کرنا مشکل ترین۔ ان دنوں راجہ داہر کی راتوں کی نیند اور دن کا چین ختم ہو چکا تھا۔ تنہائی میں سلاح کی آواز پھنکار ناگ کی طرح گونجتی۔

" مہاراج! راج کماری کا سنجوگ جس سے بھی ہو گا وہ سندھ کا مطلق العنان راجہ بنے گا۔"

راجہ داہر پاگل ہو اٹھا اپنے کان بند کر لیتا مگر آواز پیچھا نہ چھوڑتی اور اس کے

دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگی۔ وہ سوچتا کہ راجکماری کے ماتھے پر مہارانی کا الفاظ اس کی تقدیر پر نحوست کی مہر بن کر لگنے والا ہے اور اس آنے والی بدقسمتی کو ٹال دینا اس کے اختیار میں نہیں۔ وہ سوچتا رہا اور دن گزرتے رہے۔

راجہ داہر اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا۔ چہرے پر پریشانی عیاں تھی۔ اس وقت اس کی خدمت میں پرتاپ سنگھ، جے رام اور اودے سنگھ بیٹھے ہوئے تھے مگر ان کی خوشامدانہ باتیں راجہ داہر کو اس غم سے بے نیاز نہ کر سکیں۔ لہٰذا بڑی دیر گفتگو کے بعد وہ یہ سوچ کر مہاراجہ کچھ علیل ہیں خاموش ہو گئے تھے اور اس وقت تصورات کی یلغار راجہ داہر کو کہیں سے کہیں لے گئی تھی۔ اور وہ سوچوں میں اس درجہ مستغرق تھا کہ اب اسے گردوپیش کی کچھ بھی خبر نہ تھی۔ یہاں تک کہ اب اسے اپنے دانا وزیر، مشیر کار موہن داس کی بھی کمرے میں آمد کی خبر نہ ہوئی تھی۔ موہن داس دروازے میں کھڑا چند منٹ اسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ چند دن سے وہ راجہ کو افسردہ اُلجھنوں کا شکار اور کھویا کھویا دیکھ رہا تھا۔ موہن داس بتائے بغیر ہی اس کی پریشانی سمجھتا تھا۔ اب بھی راجہ نے کچھ نہ کہا تھا مگر اس کی فکر موہن داس سے پوشیدہ نہ تھی۔ لہٰذا اس وقت وہ ان پریشانیوں کے سدباب کے لئے حاضر خدمت ہوا تھا۔ اس کے ذہن نے وہ تدبیر سوچی تھی جو سندھ کا کوئی دانا نہ سوچ سکتا تھا۔ اس وقت دست بستہ کھڑا اسے مخاطب کرنے کی سوچ رہا تھا کہ یکایک راجہ نے گہرا سانس لیا۔ غیر ارادی طور پر نظریں اٹھیں تو وہ اپنے سامنے موہن داس کو دیکھ کر چونک پڑا پھر اپنے خیالات اور حالات کی پردہ پوشی کے لئے مسکرایا اور بولا۔ "آؤ موہن داس کیسے آئے؟"

> یہ اسلام کا احسان ہے!
> اسلام نے دنیا سے بڑے بڑے
> اوہام دور کئے!
> یہ ایک حقیقت ہے!

"مہاراج! غلام عیادت کے لئے حاضر ہوا ہے"
موہن داس نے آگے بڑھتے ہوئے بڑی چالاکی سے کہا۔
"عیادت ؟" راجہ نے چونک کر دیکھا۔
"ہمیں کیا ہوا تھا؟"
"مہاراج، پچھلے کئی دنوں سے آپ کی طبیعت ناساز نظر آتی ہے، موہن داس نے کہا۔
"ہاں! مہاراج کئی دن سے فکرمند ہیں۔"
پرتاپ سنگھ نے موقع نہ جانے دیا۔
"میں خود بھی یہی محسوس کر رہا ہوں"
جے رام نے اپنی باری پوری کی۔
راجہ داہر نے ان سب کو دیکھا مگر وہ اپنی اچھوتی پریشانی اور تردد کا اظہار نہ کرنا چاہتا تھا لہٰذا بولا۔
"نہیں نہیں۔ یہ تم سب کا وہم ہے ہم نہ علیل ہیں نہ پریشان۔"
"مہاراج!" دانا وزیر نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "غلام کی آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔ یہ گنہگار نظریں اسی دن سے حضور کو متردد دیکھ رہی ہیں جس دن سے سلاح نے راجکماری کی جنم پتری پڑھی تھی۔"
یہ سنکر راجہ داہر نے حیرت، عقیدت اور ستائش کے انداز میں موہن داس کو دیکھا۔ اس کی ذہانت اور دور بینی کی داد دے رہا تھا یہ وہ دانا اور وفادار انسان تھا جسے کبھی دکھ بتانے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ چند لمحے سکوت کی نذر ہو گئے۔ پھر وہ قائل ہونے کے انداز میں بولا۔
"ہاں، اس تصور نے ہمارا سکون لوٹ لیا ہے کہ راجکماری کا ستارہ ہمارے لئے بھاری اور سنجوگ ہمارے اقتدار کے لئے نحس ہے۔ اتنے دنوں سے ہم اسی مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر ہمیں بہرصورت تباہی نظر آتی ہے۔"
موہن داس دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ راجہ داہر کو علم نہ تھا اس کے خیال میں تو یہ الجھن حل ہونے والی نہ تھی۔ پرتاپ سنگھ، اودے سنگھ اور جے رام اس وقت بھی مہر بہ لب تھے یا بولنے کا موقع

موقع دیکھ رہے تھے کہ کب آئے اور راجہ کی ہاں میں ہاں ملائیں مگر موہن داس کی بات نے ان ہی کو نہیں راجہ کو بھی چونکا دیا۔ وہ بولا۔

"مہاراج! راج کماری کے ماتھے پر بھگوان نے مہارانی درج کیا ہے جسے کوئی انسانی قوت نہیں مٹا سکتی مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ حضور کے لئے نحس ہیں۔"

راجہ داہر نے اس کی بات بغور سنی اور لاچاری سے بولا۔

"ہم تمہاری بات سمجھنے سے قاصر ہیں موہن داس۔" "راج کماری مہارانی بھی بنے گی اس کا پتی سندھ پر راج بھی کرے گا لیکن وہ پھر بھی ہمارے لئے نحس نہیں تم کیا کہہ رہے وضاحت کرو۔"

یہ سوال سن کر موہن داس نے ماحول پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور عرض کیا۔

"مہاراج! میں اپنی بات کی وضاحت کروں گا۔"

راجہ داہر نے تعجب سے دیکھا مگر اسے موہن داس کی ذہانت پر کوئی شک نہ تھا اس نے ہمیشہ ہی بڑے بڑے مسئلوں کو چٹکیوں میں حل کیا تھا لہٰذا اب بھی کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ راجہ نے یہ درخواست منظور کی اور محفل برخاست ہو گئی... اور... دوسرے دن اسی کمرے میں صرف دو آدمیوں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ راجہ داہر اور موہن داس۔

موہن داس نے عرض کیا۔

"مہاراج! غلام نے ہر انداز سے، ہر رُخ سے اس معاملے پر غور کیا ہے اور مسلسل فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ راج کماری مہاراج کے لئے شبھ ثابت ہو سکتی ہے۔"

راجہ داہر نے حیرت سے دیکھا، وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے موہن داس ہمیں بتاؤ۔؟"

"مہاراج۔" موہن داس نے آہستہ آہستہ کہا۔ "ان کی مہارانی بننے کی پیش گوئی تو پوری ہو کر رہے گی۔ اب صورت... صرف ... یہ ہے.... کہ آپ انھیں اپنی مہارانی .... بنالیں۔"

"موہن داس!" راجہ داہر اس زور سے چنگھاڑا کہ در و دیوار ہل گئے اور موہن داس خود بھی کانپ گیا۔ راجہ کے چہرے سے شدید غصے اور حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور تنفس تیز ہو گیا تھا...

"مہاراج!" موہن داس گھگھیا گیا۔ اس نے اس سے قبل کبھی راجہ کو اتنے شدید غصے میں نہ دیکھا تھا۔ راجہ نے اس کے خوف کو نظر انداز کر کے کہا۔

"جانتے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"مہاراج۔ اس کے باوجود بھی غلام اپنی بات دُہرانے کے لئے تیار ہے۔"

راجہ کا چہرہ کچھ اور سُرخ ہو گیا گو کہ موہن داس نے اپنی بات نہ دُہرائی تھی مگر اس کا فقرہ دُہرا دینے کے مترادف تھا اور راجہ داہر راج کماری کو اپنی عزت سمجھتا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے موہن داس کو یوں تک رہا تھا جیسے اس نے اس کی عزت پر حملہ کر دیا ہو۔ اس نے اشتعال آمیز انداز میں کہا۔

"تم نے یہ جرأت کیسے کی؟ اس کی سزا جانتے ہو؟ ہم تمہارا سر تن سے جدا کر سکتے ہیں۔"

اس بار موہن داس آگے بڑھا، راجہ کے چرن چھوئے اور گڑگڑایا۔

"مہاراج۔ غلام آپ کے اختیارات سے واقف ہے مگر اس نے ہمیشہ آپ کی بہتری سوچی ہے اور اب بھی یہ مشورہ اس لئے دیا ہے کہ اسی طرح آپ کا راج پاٹ قائم رہ سکتا ہے۔ ورنہ بھگوان کے لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ راج کماری کا سنجوگ جس سے بھی ہو گا سندھ کی راجدھانی اسی کی جھولی میں گر جائے گی۔"

راجہ داہر کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھتا چلا گیا۔ نہ جانے سالار کی پیش گوئی یاد آ گئی تھی یا موہن داس کی دلیل نے قائل کر دیا تھا۔

اب راجہ داہر کے چہرے پر غیرت اور غصے کی جگہ استعجاب کا رنگ تھا۔ شائد اس بار وہ موہن داس کے انداز فکر پر غور کر رہا تھا اس کے مدِنظر سندھ کی حکومت تھی جس پر کلی طور پر قبضہ چاہتا تھا۔ ابھی تو وہ راجہ دسنگھ کو ہی اپنی راہ سے نہ ہٹا سکا تھا کہ اب راج کماری

بائی خطرہ بن گئی تھی۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ دھیرے سے بولا۔

"موہن داس ہمیں تمہاری خدمات کا اعتراف ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم ہمارے خیر خواہ ہو لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں کیا اگر ہم ایسا کریں گے تو بدنامی ہوگی پرجا کہے گی کہ راجہ نے دھرم کی پرواہ نہ کی۔"

"مہاراج!" موہن داس سوچے سمجھے انداز میں بولا: "آپ راج کماری سے وہ تعلق نہ رکھیں گے جو مہاراج اور مہارانی کا ہوتا ہے بس آپ انھیں اپنی ذات سے وابستہ کرلیں تاکہ ان کا سنجوگ کسی اور سے ممکن نہ ہو۔"

اب راجہ داہر کے چہرے پر اطمینان عود کر آیا جیسے شدید باد و باراں کے بعد مطلع صاف ہو جائے۔ آج بہت دن بعد راجہ داہر مطمئن نظر آرہا تھا نہ رخ پر پژمردگی تھی نہ مایوسی بلکہ اس وقت اس کی آنکھوں میں سابقہ چمک اور چہرے پر صحت مندی کا رنگ دوڑ رہا تھا۔ آج ایک اچھوتا اور نیا تصور اس کے دانا ذہن نے پیش کیا تھا جس سے بہ آسانی رجو بھی قائم رہ سکتی تھی۔ راجہ سوچتا رہا اا میں کوئی قباحت نہ تھی۔ موہن داس صورت حال سمجھ رہا تھا۔

"مہاراج! لوگ تو راج پاٹ کے سگے رشتوں کو ختم کر دیتے ہیں۔ باپ اا کے خون سے ہاتھ رنگتے ہیں۔ اگر را کو موقع مل جائے تو کیا وہ اور رکے پر قبضہ کرنے کے لئے آپ کو نقصان پہنچائیں گے۔ آپ تو صرف اپنے تخ حفاظت کے لئے راج کماری کو مہارا بخشیں گے اور تو کچھ نہیں۔"

اب کی بار راجہ داہر نے مسکرا کر دیکھا اور آمادگی کے انداز میں بولا۔

"موہن داس دنیا کیا کہے گی کہ را اپنی بہن سے شادی کر لی۔ کسی کو کیا خب نے کس مقصد کے لئے ایسا کیا ہے ا مہارانی سے کوئی ایسا تعلق نہیں۔"

باقی آئندہ

میرا سفر جے پور

مائل خیرآبادی

مولانا منظور الحق صاحب امیر حلقہ جماعت اسلامی راجستھان کو جماعت اسلامی سے متعلق لوگ جانتے ہی ہیں۔ آپ کو وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو حجاب پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ مولانا کا ایک ترمیتی گرامی نامہ فروری ۸۶ء کے حجاب میں شائع ہو چکا ہے۔ اسے تمام حجابی بہنوں اور بھائیوں نے پڑھا ہے اس طرح مولانا حجابی حلقے میں بھی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ مجھے یہ شرف بھی حاصل ہے کہ مولانا ایکبار میرے یہاں رامپور محض ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے

مولانا راقم الحروف سے ہمیشہ شفقت اور محبت سے پیش آتے رہے جب میں نے حجاب جاری کیا تھا تو آپ نے ہر وہ کوشش اور مدد فرمائی جس کی حجاب کو ضرورت تھی۔ راجستھان میں حجاب کی جو ایجنسیاں قائم ہیں

اور جو سالانہ خریدار ہیں وہ مولانا کی کوششوں کی بدولت ہیں مولانا خود حجاب کے پہلے خریدار ہیں اور آج بھی ہیں۔ بلکہ راقم الحروف نے کئی بار اعزازی طور پر حجاب جاری کرنے کی درخواست کی لیکن مولانا نے رد کر دی۔ حتیٰ کہ حجاب کی خریداری اس وقت بھی جاری رہی جب آپ ایمرجنسی کے زمانے میں اور اس سے پہلے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔ مولانا حجاب کو اتنا پسند فرماتے ہیں کہ جیل میں بھی خاص طور پر منگا کر ملاحظہ فرماتے رہے۔ واضح رہے کہ مولانا صرف ایمرجنسی ہی میں نہیں اس سے پہلے بھی کئی سال جیل میں رہے ہیں

ایمرجنسی کے زمانے کی قید و بند میں مولانا کی صحت بری طرح متاثر ہوئی۔ جیل سے آنے کے بعد آپ صاحب فراش ہو گئے۔ یہ خبریں مجھے ملتی رہتی تھیں۔ مولانا کے دوست جناب مولانا محمد عزیز صاحب صائب المظاہری امیر

جماعت اسلامی رامپور سے مولانا کے متعلق باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ مولانا عزیز صاحب اپنے دوست کے حالات زندگی ایسے والہانہ انداز میں بیان فرماتے کہ جی چاہتا چند دن خدمت اقدس میں گزاروں۔ جذبات سے مجبور ہو کر میں نے حاضری کی درخواست کی تو مولوی عبدالمجید صاحب آفس سکریٹری جماعت اسلامی راجستھان نے مولانا کے ایماء سے ایسا بے مثل جواب لکھا کہ مجھے اکبر بادشاہ کے وزیر خاص ابوالفضل کی یاد آگئی۔ شاہ ایران کہا کرتا تھا کہ اکبر کو تو جیسا کہ وہ ہے جانتا ہی ہوں لیکن ابوالفضل کا قلم ملرے ڈالتا ہے بالکل یہی تاثر مولوی عبدالمجید صاحب کے متعلق میرا ہے۔ مولوی صاحب نے لکھا کہ اس وقت مولانا زیادہ بیمار ہیں۔ اللہ نے چاہا تو جلد اچھے ہو جائیں گے۔ اسوقت آپ آئیے تاکہ مولانا آپ کے ساتھ رہیں اور قرب وجوار کے آثار الصنادید دکھائیں۔

یہ خط وکتابت ہوتی رہی۔ مولوی عبدالمجید صاحب شوق ملاقات کی آگ بھڑکاتے رہے مولانا کے تاثرات کی ترجمانی ایسی بے مثل کرتے کہ میں دنگ رہ جاتا۔ میں دل ہی دل میں کہتا کہ یہ شخص کتنا اچھا انشا پرداز ہے اس نے ادبی میدان میں قدم کیوں نہیں رکھا۔ کئی مہینے ترٹپنے کے بعد مارچ کے شروع میں مسرت نامہ ملا کہ مولانا روبصحت ہیں اور آخری ہفتے میں ملاقات کے متمنی ہیں۔

میں نے مولانا عزیز صاحب (امیر مقامی) سے اجازت لی اور دہلی ہوتا ہوا جے پور جا پہنچا میں نے لکھا تھا کہ ۲۴ مارچ کو آؤں گا لیکن ۲۲ مارچ ہی کو پہنچ گیا۔ غیر متوقع حاضری پر رفقائے جے پور کو بے حد خوشی ہوئی میں نے مولوی عبدالمجید صاحب کو کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن پہچان لیا کہ یہی وہ صاحب ہیں جن کے قلم کی دھاک میرے دل پر بیٹھی ہے۔ ملاقات ہوئی اور خوب ہوئی۔ باتیں شروع ہوئیں اور خوب خوب ہوئیں۔ جے پور کے رفقاء کو میرے آنے کی اطلاع ہوتی گئی۔ ایک ایک کرکے آتے گئے یہاں تک کہ دوپہر کے کھانے میں دفتر کا پورا کمرہ کھانے والوں سے بھر گیا۔ اسی وقت پروگرام بننے لگے۔ فلاں وقت فلاں فلاں

تاریخی مقامات دیکھنا ہیں۔ ٹونک اور سوائی مادھو پور بھی دیکھنا ہے۔ فلاں فلاں وقت اجتماعات ہونے ہیں، خواتین سے بھی ملاقات کرنی ہے۔ نوجوانوں کے اجتماع میں بھی چلنا ہے اور کل سینچر کی رات میں ادبی نشست کرنا ہے۔ ادبی نشست کے اہتمام کے لیے جناب شمیم صاحب جے پوری کو بلایا گیا۔ شمیم صاحب سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ باتوں میں کچھ ایسی اپنائیت تھی کہ موصوف نے اپنے گھر کے حالات بھی بتا ڈالے۔ معلوم ہوا کہ مسز شمیم ایم۔ اے ہیں۔ کالج میں پڑھاتی ہیں نیز بہترین گھر والی ہیں۔ بہترین گھر والی کا مطلب میں نے پوچھا تو شمیم صاحب نے جو کچھ بتایا اس سے متاثر ہو کر میں نے عرض کیا "ملاقات کرائیے"۔ شمیم صاحب نے بشرح صدر منظور کر لیا اور صبح کے وقت مدعو بھی کر لیا (مسز شمیم سے میری جو ملاقات ہوئی وہ اسی شمارہ میں شائع ہوئی ہے)

اچانک میں نے مولوی عبدالمجید صاحب سے کہا "بھائی! میں چاہتا ہوں کہ مفتی اعظم حکیم احمد حسن صاحب کے یہاں آنے سے پہلے میں ان کی خدمت میں پہنچ جاؤں تو زیادہ اچھا ہے۔ چنانچہ میری خواہش پر جلدی کی گئی اور الحمدللہ کہ مفتی صاحب کے مطب میں مجھے اس وقت لے جایا گیا جبکہ آں موصوف مجھ سے ملنے کے لیے چلنے کو تیار بیٹھے تھے۔ چند مریض تھے ان کو جلدی جلدی نمٹا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ بغلگیر ہوئے اور دیر تک سینے سے لگائے رہے۔ پھر باتیں ہوئیں تو آواز سے پہچان لیا کہ سفر میں خشک زکام ہو گیا ہے۔ دوا دی۔ اس کے بعد خاطر مدارات میں جو چیزیں میرے سامنے آئیں انھیں دیکھ کر میں گھبرایا۔ عرض کی، یہ سب کھانے سے تو اور زیادہ ...." میں جملہ پورا نہیں کر سکا تھا کہ فرمایا "حکیم دوا دیتے وقت ان سب کی رعایت رکھتا ہے۔"

خاطر مدارات کے ساتھ تواضع میں جو گفتگو فرما رہے تھے اس سے مجھے مغرور ہو جانا چاہیے تھا لیکن من آنم کہ من دانم۔ مفتی صاحب ایک بار غریب خانہ پر تشریف لائے تھے۔

اس دن کی ساری باتیں دہراتے رہے اور میں
ندامت محسوس کرتا رہا۔ دل میں کہتا رہا کہ مفتی
صاحب کتنے عظیم آدمی ہیں کہ ایک بے علم
و بے مایہ شخص کے متعلق یوں فرما رہے ہیں
دیر تک مطب میں بٹھائے رکھا۔ اس کے
بعد وعدہ لیا کہ گھر پر ضرور آئیں۔ وہاں ایک
بھتیجی (ثریا ایم۔ اے) ملاقات کے لئے
بے چین ہے۔ (ثریا مفتی صاحب کی نواسی ہے)
رفیق دیرینہ مولوی محمد اسمعیل صاحب

اس دن جماعتی دورے پر گئے تھے۔ شام
ہوتے ہوتے وہ بھی آ گئے۔ گھر گئے۔ سنا کہ
محمد اسمعیل صاحب کا بھائی محمد اسحٰق (امال
خیر آبادی) آیا ہے تو اسی وقت دوڑے
دوڑے جماعت کے دفتر میں آئے۔ ملے
اور خوب ملے۔ دونوں طرف تھی آگ برابر
لگی ہوئی کئی برس سے ملاقات نہیں ہوئی
باتیں شروع ہوئیں تو ختم نہ ہونے کا نام نہ لیتی
تھیں۔ مجھے اپنا شعر یاد آ گیا:ـ

اللہ رے بیان محبت کی دلکشی
سو بار بھی بیان ہو لیکن مزا دہی

رات کے وقت تقریباً تمام رفقاء ے
ہو چکی تھی۔ مفتی صاحب بھی تشریف لائے
اسی رات دفتر میں ٹھہرے ہوئے جما
کے ایک ہمدرد سے ملاقات ہوئی۔ یہ صا
ہیں جناب سردار احمد صاحب سوائی ماد
کے مشہور و معروف سابق چیرمین۔ جماعت
دعوتی سرگرمیوں سے متعلق تبادلہ خیال ہوا۔
نے محسوس کر لیا کہ یہ بزرگ بے شک جماعت
کے مخلص کارکن ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ ایسے
اب تک رکن جماعت کیوں نہیں ہو سکا۔
نہ ہو سکا تو زبان سے نکل گیا۔ سردار احمد صاحب
نے پورے شرح صدر کے ساتھ جواب د
کہ اگر میں رکن ہو گیا ہوتا تو جس مضبوطی سے
ساتھ میں معترضین کے سامنے مدافعت کر
ہوں، نہیں کر سکتا۔ اب حال یہ ہے کہ غیر جا
رہ کر گفتگو کرتا ہوں تو لوگ اس میں وزن
محسوس کرتے ہیں۔

سردار صاحب جب گفتگو فرماتے ہیں
تو اپنی گفتگو کو مضبوط دلائل سے سجاتے بھی
خوب ہیں۔ میں نے موصوف کی اس حکمت

کی غلط کھاتر دید تو نہیں کی لیکن نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا کہ ۔ جنگ بدر میں جہاں بہت سے اہل مکہ کو لشکر اسلام نے قید کرلیا تھا۔ وہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضورؐ کے داماد حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ اور دیگر آل ہاشم بھی گرفتار ہوئے تھے حضرت عباسؓ سے ان کی اپنی ذات اور آلِ ہاشم کے لیے فدیہ طلب کیا گیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ یارسول اللہ! آپ جانتے ہیں کہ میں ہمیشہ آپ کا طرفدار، اسلام کا حامی و مددگار رہا ہوں اسلام کی حقانیت کو تسلیم کرچکا ہوں۔ آپ کی حمایت میں جہاں تک ہوسکتا ہے۔ مکے والوں کے سامنے آپؐ کی اور آپؐ کی نبوت کی وکالت کرتا ہوں۔ لہٰذا مجھ سے فدیہ نہیں لینا چاہئے

چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اس وقت تک اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا تھا اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چچا کا مدلل عذر قبول نہیں فرمایا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اپنا اور اپنی طرف سے آلِ ہاشم کے قیدیوں کا فدیہ دینا پڑا۔ یہی قانون دامادِ رسول ﷺ حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ پر لاگو ہوا اور انہیں بھی فدیہ دینا تسلیم کرنا پڑا۔"

سردار احمد صاحب نے میری یہ بات بڑی توجہ سے سنی۔ الحمد للہ، پتہ چلا کہ وہ ایک اصولی شخص ہیں۔ ایک شریفانہ غیرت چہرے پر نمودار ہوئی۔ میں نے گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔ دوسرے دن کئی بار سردار صاحب سے باتیں ہوئیں اور میں نے اس شریف بزرگ کی اسی طرح کئی باتوں سے اختلاف کیا اور اس بڑے دل والے بزرگ نے دلچسپی کے ساتھ میرے اختلاف کو انگیز کیا۔ اچانک میرا ہاتھ شیروانی کی جیب پر گیا۔ اتفاق سے قلم جیب میں نہ تھا۔ سردار صاحب نے اپنا بہترین قلم عنایت فرمایا۔ میں نے ان کا پتہ نوٹ کیا اور جب قلم واپس کرنے لگا تو فرمایا کہ "مائل صاحب! یہ میری نشانی اپنے پاس رکھ لیجئے۔"

دوسرے دن مسٹر شمیم صاحب کے دولت کدہ پر چند رفقاد کے ساتھ گیا۔ وہاں مسٹر شمیم ایم۔ اے سے تقریباً ۱½ گھنٹہ باتیں ہوئیں۔ وہاں سے واپسی کے بعد دوپہر کا کھانا رفقاء کے ساتھ

لعایا۔ ظہر کی نماز پڑھ کر مولانا مظہر الحق صاحب
ور بھائی محمد اسمٰعیل صاحب کے ساتھ جے پور
۔قلعہ اور راجاؤں کی رانیوں کے محل دیکھنے گیا
مولانا نے راستے میں کچھ پھل لے لیے۔ ہم دونوں
نے اصرار کے ساتھ ایک نچلی برجی میں مولانا
کو بٹھا دیا اور پھر دونوں بھائی بلندیاں طے کرنے
لگے۔ ملکی اور غیر ملکی بہت سے لوگ اسی غرض
سے اوپر نیچے آجا رہے ہے۔ میں نے بلندی پر
پہنچ کر آس پاس دور دور تک نظر دوڑائی
تو جے پور کے راجاؤں کی اس ذہانت پر عش
عش کر گیا کہ قلعہ کچھ اس طرح بنایا ہے جس کا
فتح کرنا اُس زمانے میں ناممکن نہیں تو انتہائی
مشکل ضرور تھا۔ پھر میرے ذہن میں وہ بہادر
گھوم گئے جنھوں نے اس قلعہ کو بھی فتح کر کے
ہی چھوڑا۔

بھائی اسمٰعیل میرے لیے بہترین رہنما
(گائڈ) اور مورخ ثابت ہوئے۔ ایک ایک جگہ
دکھاتے اور اس کی تاریخی حیثیت بتاتے رہے ایک
جگہ تین صاحب (شاید وہ تھک گئے تھے اور
بیٹھے سستا رہے تھے) ہمیں دیکھ کر متوجہ ہوئے
ان میں سے ایک صاحب نے پوچھا "
دیکھا؟" میری زبان سے نکلا "زمیں کا
آسماں کیسے کیسے "

وہ ہمیں دیکھتے رہے اور ہم آگے بڑھ
ایک جگہ ایک ہاتھی پر سوار کچھ لڑکے ا
لڑکیاں محلات کی بلندیوں پر جا رہے
انھوں نے ہمیں دیکھا۔ ایک لڑکی نے "اس
علیکم" کہہ کر سلام کیا۔ میں نے بھائی اسمٰعیل
سے کہا "یہ سب مسلمان ہیں۔ میں نے قصداً
سے کہا۔ ان سب نے سُن لیا۔ ان کے چہرے
شگفتہ ہوگئے اور جب تک وہ نظروں سے او
نہ ہوگئے ہمیں، دیکھتے رہے اور ہاتھ بلند کر
اپنی خوشی کا اظہار کرتے رہے۔ بھائی اسمٰعیل
صاحب نے بتایا کہ یہ غیر ملکی ہیں۔

مجھے حیرت یہ تھی کہ ڈیڑھ گھنٹہ ان بلند
پر چڑھا اُترا لیکن تھکاوٹ کا نام تک نہیں بتا
اس کی وجہ یہ تھی کہ بھائی اسمٰعیل صاحب جے پور
کی تاریخ بڑی دلچسپی سے بتا رہے تھے اور میں بڑے
شوق سے سن رہا تھا۔ نیچے مشرق کی طرف کچھ
کوارٹرس تھے۔ اسمٰعیل صاحب نے بتایا کہ وہ جو

بھر ہے، دو دن میں جے پور کے راجہ نے
بنوائی تھی۔

پہاڑ اور پہاڑ پر محلات دیکھنے کے بعد ہم واپس ہوئے۔ مولانا منتظر تھے۔ پھلوں سے تواضع فرمائی۔ اس کے بعد ایک ہوٹل میں لے جاکر بہت عمدہ چائے پلوائی اور بہت عمدہ جے پوری اصلی گھی کی مٹھائی کھلائی۔ اس کے بعد واپس ہوئے اور عصر کی نماز شہر ہی میں آکر پڑھی۔ یہاں مفتی احمد حسن صاحب کے اخلاق کریمانہ کا ایک اور دل پر اثر پڑا۔ بزرگ مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ ہمیں نہ پاکر قلعہ کو گئے۔ وہاں نہ پایا تو واپس آگئے میں نے دل میں کہا۔ کاش! مفتی صاحب اس ڈیڑھ گھنٹہ ہمارے ساتھ ہوتے۔

مغرب سے پہلے مولوی عبدالمجید صاحب کے ساتھ ایک باغ دیکھنے گئے۔ لیکن وہاں تک پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی۔ سوئے اتفاق کہ بجلی بھی یونہی سی تھی۔ لطف نہیں آیا۔ مولوی صاحب زبانی تعریف کرتے رہے اور میں ہاں ہاں کرتا رہا۔ عشاء سے پہلے پہلے واپس ہوئے۔

دو دن یوں تفریح میں گذر گئے۔ تیسرا دن دعوتی پروگرام میں گذرا۔ مولانا مظہر الحق صاحب بھی خوب ہی ہیں۔ خواتین کے اجتماع میں مجھ سے تقریر کروا ڈالی۔ میں نے عذر کیا تھا کہ یہ کیا ضروری ہے کہ جو شخص کچھ شُد بُد لکھتا ہو وہ تقریر بھی کرنا جانتا ہو۔ مولانا نہیں مانے اور مجھے اپنا برسوں پرانا شعر یاد آگیا:

اکثر ایسا بھی محبت میں ہوا کرتا ہے
کہ سمجھ بوجھ کے کھا جاتا ہے دھوکا کوئی

خواتین کے اجتماعات میں دعوتی کام کرنے والی بہنوں نے کچھ سوالات کئے۔ ان بہنوں کی نمائندہ خاتون مسز شمیم ایم۔ اے تھیں۔ ان کے سوالوں کے جوابات میں نے اور مولانا نے دیے۔

بعد مغرب نوجوانوں کے ایک اجتماع میں شرکت کی۔ میرے ساتھ رفیق محترم مولوی اشفاق صاحب بھی تھے۔ میں نے انھیں آگے کر دیا۔ مولوی اشفاق صاحب نے نوجوانوں کو بہت اچھے دعوتی مشورے دئے۔

بعد عشاء شمیم صاحب اور کچھ اور صاحبان
کے سامنے اسلامی ادب پر گفتگو ہوئی۔ عرض
کیا گیا کہ ہمیں اور آپ کو جو یہ انتہائی لطیف شے
ملی ہے یعنی ادبی صلاحیت۔ تو کیا ہم نے اسے
اپنے والدین سے ورثہ میں پائی ہے یا کہیں
پڑی مل گئی ہے یا کہیں خریدی ہے یا کسی
بادشاہ یا نواب سے بطور انعام ہاتھ آئی ہے؟
سامعین کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے
ان کے سامنے یہ بالکل نیا سوال رکھا گیا ہے
جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ یہ صلاحیت
اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس
کے بعد ہمارا یہی سوال ہونا چاہئے تھا کہ پھر
ہمیں اسی اللہ کا احسان ماننا اور شکریہ ادا
کرنا چاہئے اور اس احسان اور شکریے کی
بہترین شکل یہ ہے کہ ہم اس صلاحیت کو
اسی کی مرضی کے مطابق استعمال کریں۔

ایسی نشستوں میں میرے سامنے وہ
بھونڈا اعتراض کئی بار آیا کہ اسلامی ادب
میں شاعری تو مسجد کے لوٹوں کے ادب کے
سوا کچھ نہیں۔ یہاں یہ اعتراض نہیں ہوا
لیکن میں نے بتایا کہ ہاں تہنے والی و
ہے جو اپنے اندر دین و اخلاق کو سمو
ہوئی یا ان نظریات سے قریب ہوگی
کہ اسلام سے متصادم نہ ہوگی۔ میر
کہ میر کے ضخیم دیوان میں سے صرف ۲
چنے گئے ان میں بھی بیشتر اسلامی نقط
سے متاثر ہو کر تیز کئے گئے ہیں اور یہ
ہو بہو قرآن کا ترجمہ ہیں۔ مثلاً

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

میں نے مثال میں میرؔ، مومنؔ، ذ
اور دوسرے اساتذہ کے بیسیوں اشعا
مجھے دوران بحث خیال آیا کہ موجودہ د
تعمیر پسند شعراء کا کلام بھی پیش کرنا چاہیے
حفیظ میرٹھی، عروج زیدی اور ابوالمجاہد
اکھاڑے میں اتارا۔ میں نے کہا کہ رطب و
تو ہر شاعر کے یہاں ہوتا ہے، کیا میر کے
نہیں؟ میں نے میر کے دو ایک واہیا
سنائے۔ پھر زاہد صاحب کا ایک شعر ا
بن گیا۔ شعر یہ تھا۔

گیا تو حسن در و دیوار میں نہ رہا
وہ ایک شخص جو مہمان میرے گھر میں تھا

اس شعر پر سبھی جھوم اٹھے۔ پھر میں نے عرض کیا کہ غور فرمائیے حسن کی جگہ نور، کیف اور لطف وغیرہ الفاظ رکھے جا سکتے ہیں لیکن چونکہ حسن ان سب کا جامع ہے۔ شاعر نے سوچ سمجھ کر یہی لفظ رکھا۔ دوسرے مصرع پر مہمان کی جگہ موجود رکھا جا سکتا تھا لیکن چونکہ مولانا ابوالمجاہد زاہد عربی ادب کے طالب علم رہ چکے ہیں اور عالم دین ہیں انھوں نے لفظ "مہمان" رکھا۔ مہمان چند دن کے لیے آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ "وہ ایک شخص" سے مراد روح ہے جو انسان کے جسمانی مکان میں مہمان ہے۔ اس کے جانے سے اس گھر کی رونق ختم ہو جاتی ہے اور اگر "وہ ایک شخص" ضمیر ہے یا انسانیت ہے تو بھی شعر بہت ہی تعمیری ہے۔ پھر دیکھیے کہا کس ڈھب سے ہے۔ شعر شروع ہوتا ہے لفظ "گیا" سے۔ اسے متعلق کیا ہے دوسرے مصرع سے اور پھر جو بلاغت پیدا کی ہے اسی نے اس شعر کو ظاہری اور محسوساتی دونوں طرح اول نمبر کا شعر بنا دیا ہے۔ شعر میں ایک نہایت عمدہ بات کہی گئی ہے اور نہایت عمدہ طریقے سے کہی گئی ہے۔

الحمد للہ! کہ جماعت اسلامی کے ادبی موقف کی لوگوں نے تائید فرمائی۔ مولانا ایک ضرورت سے چلے گئے تھے۔ دوسرے دن بھائی اسمٰعیل صاحب جو تین دن سے سایہ کی طرح ساتھ رہے تھے بس اسٹینڈ تک پہنچانے گئے۔ مولانا نے میرے لیے اور اپنے دوست مولانا عزیز صاحب کے لیے تحفہ ساتھ کر دیا تھا۔ میں سب کی دعائیں لے کر روانہ ہوا اور بخیریت رامپور آ گیا۔ میں جب اس سفر کا جائزہ لیتا ہوں خوشی محسوس کرتا ہوں اور رفقائے پونہ کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ یہ سب مجھ سے علم و فضل میں بڑے ہیں لیکن چھوٹوں کو نوازنے والے ہیں۔ اللہ نے اسی لیے ان کو بڑا بنا دیا۔ مجھے اس سفر سے [illegible]ق ملا۔ جزاہم اللہ۔

براہ کرم: خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر ضرور لکھیے ——— منیجر حجاب، رامپور۔

ظہیرہ شمیم جے پوری سے ایک ملاقات

اسی شمارے میں میرے سفر جے پور کے سلسلے میں آپ نے پڑھا ہے کہ جے پور کے مشہور شاعر جناب شمیم صاحب ایم۔اے نے بروقت ملاقات اپنی اہلیہ محترمہ کا ذکر کیا۔ محترمہ ڈبل۔ ایم۔ اے ہیں۔ گرلس کالج میں ٹیچر ہیں۔ گیارہ ستون پالی ہیں۔ اس کے باوجود بہترین گھر والی ہیں۔ اپنے بچوں کی بہترین نگراں۔ نہایت دیندار اور اسلامی نظریات کی پرجوش حامی۔

اس تعارف نے مجھے متوجہ کیا۔ میرے دل میں ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ شمیم صاحب سے عرض کیا۔ موصوف نے شرح صدر میری درخواست منظور فرمالی۔ اتوار کا دن ۸ بجے صبح کا وقت طے ہوا۔ میں جے پور کے چند رفقا کے ساتھ کاشانۂ شمیم کی طرف چلا۔ ملاقات کا مرکزی مقصد یہ تھا کہ آں محترمہ سے یہ پوچھوں گا کہ آپ نے وہ کیا برتے جن کی بدولت شمیم صاحب نے باوجود خود کفیل ہونے کے آپ پر گھر چھوڑ دیا اور اتنے مطمئن ہیں کہ گویا گھر کے تو وہ نہیں۔ آپ ہیں۔

میں نے اپنی عمر میں اس طرح کی صرف ایک خاتون سے علی گڈھ میں محترمی مولانا اثری صاحب کے ساتھ ملاقات کی تھی۔ دائرہ عمل اسلامیہ کالج ہے۔ مسز شمیم صاحبہ کے دائرہ عمل میں پھیلاؤ نظر آیا۔ مجھے انٹرویو لینا نہیں آتا۔ میں نے سیدھی سی ملاقات محترمہ سے کی۔ انھوں نے جو کچھ فرمایا۔ من وعن لکھدیا۔ اب یہ کام حجابی بہنوں کا ہے کہ وہ الفاظ کے اس ڈھیر میں سے موتی چن لیں اور اپنے گلے کا ہار بنائیں۔ میں نے اسی لیے یہ محنت کی۔ یہی مقصد میں نے مسز شمیم صاحب سے تمہیداً عرض کردیا تھا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ میری یہ محنت سوارتھ ہو۔

عورت اپنے گھر اور اپنے بچوں کی نگراں ہے
اس سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا

آٹھ بجنے میں دو منٹ باقی تھے کہ میں چند
قا کے ساتھ شمیم صاحب کے مکان پر پہنچ
یا۔ شمیم صاحب منتظر تھے سلام اور مصافحے کے
د وہ اپنی نشستگاہ میں لے گئے۔ وہاں
مجھے ایک صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ میرے برابر
ھائی اسمٰعیل صاحب، مولوی عبدالمجید صاحب۔
ر کرسیوں پر دوسرے رفقا اور مسٹر شمیم یعنی
رکے قوام صاحب ایک اسٹول پر تشریف
رما ہو گئے جب کہ میں نے دیکھا کہ میرے
اہنی طرف ایک پردے کے برابر خالی
سی موجود تھی۔ میں نے کہا بھی کہ شمیم صاحب
پ یہاں میرے پاس آجائیں۔ بولے "ذرا
پہلے کچھ ــــ" وہ ابھی جملہ پورا نہ کر سکے تھے
کہ چائے آگئی۔ ہم چائے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ دائیں طرف
سے السلام علیکم کی آواز آئی۔ وعلیکم السلام کہہ کر میں نے شمیم
صاحب کی طرف دیکھا۔ انھوں نے کرسی
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "بسم اللہ
ملاقات کیجئے۔ میں سمجھ گیا کہ مسز شمیم تشریف
لے آئیں۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ سامنے پردہ تھا۔
میں نے کسی تمہید کے بغیر عرض کیا۔

"شمیم صاحب نے مجھے آپ کے متعلق جو کچھ بتایا اس سے میں نے یہ سمجھا ہے کہ آپ نے اپنے گھر کو ایک مثالی گھر بنا لیا ہے۔ میں خواتین کے ایک ماہنامہ حجاب کا ایڈیٹر ہوں کیا آپ پسند فرمائیں گی کہ اپنے تجربات مجھ سے بیان فرمائیں اور میں انھیں ترتیب دیکر حجاب میں چھاپ دوں تاکہ حجابی بہنوں کو اس سے فائدہ پہنچے؟"

ایک شرمائی شرمائی سی آواز آئی: "میرے تجربات ہی کیا۔ معلوم نہیں شمیم صاحب نے کیا آپ سے کہدیا۔ میں نے جو کچھ کیا اُسے فخریہ بیان کرنا ہرگز پسند نہیں کرتی۔ میں نے شمیم صاحب کو خوش کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا اپنا فرض انجام دیا ہے۔ اگر یہی فرض آپ حجابی بہنوں کو محسوس کرانا چاہتے ہیں تو بسروچشم حاضر ہوں۔"

یہ مرلوط جملے یہ جملوں کا سلسلہ کھاؤ۔ اس بے تکلفی کے ساتھ۔ میں سنگدو تک رہ گیا۔ ہار اٹھا!

کیا راجستھان کے ریگ زار میں پڑھے لکھوں کی اردو اتنی بلیغ ہو جاتی ہے۔ میں نے قلم نکالا اور لیٹر پیڈ سنبھال لیا۔

"تو کیا، آپ لکھیں گے؟"

"جی ہاں! پہلے آپ اپنا تعارف کرائیں؟"

"والدین نے میرا نام ظہیرہ ناہید رکھا تھا شادی کے بعد ظہیرہ شمیم ہو گئی۔ تاریخ پیدائش ۱۹/ دسمبر ۱۹۳۲ء ہے۔ میرے والد ڈاکٹر عبدالرحمن خاں صاحب اچھے تعلیم یافتہ بزرگ تھے میری والدہ درجہ ۴ تک پڑھی تھیں۔ لیکن نہایت سگھڑ خاتون تھیں۔ دیندار، سمجھدار، پردے کی پابند۔ میں نے انھیں کبھی غصے میں نہیں دیکھا انھیں سلائی نہیں آتی تھی۔ والد صاحب کا انتقال میرے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ اسوقت میں چھٹی جماعت میں زیر تعلیم تھی۔ میں تیسری اولاد ہوں۔ ہم پانچ بہنیں اور دو بھائی ہیں۔

ظہیرہ شمیم صاحبہ بے تکلف نہایت شستہ اردو بول رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں میرا قلم ان کی زبان کی روانی سے پیچھے رہ جاتا تو میں مکرر ارشاد کی زحمت دیتا۔ محترمہ میری خاطر رک جاتیں اور جو بات لکھنے سے رہ جاتی دوبارہ میں شکریہ ادا کرتا اور وہ پھر حالات بیان کرنے لگتیں۔

"والد صاحب کے انتقال سے ایک پہلے ہمارے گھر چوری ہو گئی تھی۔ امی نے جہیز بیچ کر کفن دفن کرایا۔ ابا جان کے انتقال کے بعد ہمیں اکثر فاقے کرنے پڑتے تھے۔ ہم چنے کھا کر گزر بسر کی۔ جوار کھا کر دن کاٹے۔ درجہ ۹ میں تھی۔ اس وقت میرے پاس کوئی کتاب نہیں تھی۔ سہیلیوں سے لے لے کر یاد کرتی تھی۔ فیس ادا کرنے کو پیسے نہ تھے۔ ماں نے کڑھائی اور پرانی کرسیاں بیچ دیں۔ یاد ہے کہ میرے گھر میں ڈبیہ جلتی تھی۔ میں اس روشنی میں ہوم ورک کرتی تھی۔

ظہیرہ شمیم صاحبہ اپنے نازک دور کے بیان کر رہی تھیں۔ آخر ان سے ضبط نہ ہو رو پڑیں۔ ان کی سسکیوں کی آواز ہم سب پردے کے باہر سنی۔ ہم بھی آبدیدہ ہو گئے قلم رکھ دیا اور اس تصور میں کھو گیا کہ اکثر کا کیسا ایسے ہی نازک دور سے گزرا ہے

حالت میں میری آنکھوں سے دو بڑے قطرے میز
لیٹر پیڈ پر گرے اور پھیل گئے اور اسی وقت پردے
کے اندر سے آواز آئی:

"ہاں صاحب! اس طرح میں نے ٹینتھ کلاس سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا!" آواز اب بھی بھرائی ہوئی تھی۔

"ذرا ٹھہریے!" میں نے قلم اٹھاتے ہوئے عرض کیا: "یہ جو دینی رجحان آپ کے اندر پایا جاتا ہے یہ کب کی پیداوار ہے۔ کیا یہ تحصیل علم کے بعد آپ کے مطالعہ کی بدولت ہے یا اس میں آپ کے والدین کا بھی کچھ حصہ رہا ہے؟"

"والدین!" مسز شمیم نے یہ لفظ دہرایا۔

"میں نے عرض کیا نا! والد بزرگوار ڈاکٹر تھے ان کا پیشہ مصروفیت چاہتا تھا۔ آپ نے میرے متعلق شمیم صاحب سے جو کچھ سنا، وہ سب اللہ کے فضل سے میری والدہ کی محنت کا ثمرہ ہے!"

"سبحان اللہ!" میری زبان سے نکلا۔ یہ سبحان اللہ میں نے اس لیے کہا کہ محترمہ نے "والدہ کی محنت" سے پہلے "اللہ کا فضل" شامل کر لیا تھا۔ اس سے ان کی دینی معلومات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ فرمایا کہ:

والدہ محترمہ ہماری دس سال کی عمر سے نماز کی تاکید کرنے لگتی تھیں۔ ہم تمام بھائی بہنیں بچپن سے نماز کی پابند ہیں۔ ہماری والدہ ہمارا حوصلہ بڑھاتیں۔ ہمیں صبر کی تلقین کرتیں۔ لا تقنطوا من رحمت اللہ کا مطلب سمجھا کر مستقبل کے لیے امید دلاتیں۔ ہماری تعلیم کا سب سے زیادہ خیال رکھتیں۔ ہمارا ٹائم ٹیبل ان کے سامنے رہتا۔ وہ ہمیں ابھارتی رہتیں کہ ہمارا نمبر اول آئے۔

ماں نے اس طرح حوصلہ بڑھایا جلیا گل سکنڈری اسکول سے میں نے انٹر پاس کر لیا پھر وہیں ملازمت کر لی۔ ہمارے گھر کی حالت بہت ہی نازک ہو رہی تھی۔ والدہ کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی تھیں۔ میں آگے تعلیم جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ بہن بھائی بھی پڑھ رہے تھے ساٹھ روپیہ ماہانہ کی ملازمت غنیمت تھی اور بسر ہوگئی۔ مجھے سارے مضامین پڑھانے پڑتے تھے۔ دینی تعلیم اگر کسی کتاب میں اسلام اور رسول کی قسم کے الفاظ آتے تو میں بڑی تفصیل سے ان کے معنی سمجھاتی۔ میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی

کردیتی تھی۔

"ظہیرے ظہیرہ صاحبہ!" میری زبان سے برجستہ نکلا۔ مجھے ستائیس برس پرانا اپنا واقعہ یاد آگیا۔ جب میں بھی ٹیچر تھا۔ ۱۹۴۸ء کے بعد اسکولوں میں ہندی لازمی زبان قرار پا چکی تھی۔ درسی کتابوں میں مسلمانوں کے عقائد کے خلاف ایسی باتیں آنا شروع ہو گئی تھیں جن پر مسلمان احتجاج کرنے لگے تھے۔ ۱۹۵۲ء کا واقعہ ہے کہ میں ہندی کی ایک نظم پڑھا رہا تھا۔ ہندی کویتا کا ایک بول (مصرع) تھا: ؎

ہے محمدؐ، بدھ، عیسیٰ ایش کے اوتار تم

میں اونچے کلاسز کے طلباء کو اوتار اور رسول کا فرق بتا رہا تھا۔ میں نے بتایا کہ اوتار کے عقیدے کے تحت یہ ہے کہ ایشور آوشکتانوسار آکار روپ میں (اچھا ہٹایئے ہندی۔ اردو میں سنئے) خدا بذات خود حسب ضرورت کسی انسان یا شیر یا کسی اور جاندار کی شکل میں زمین پر اپنے بھگتوں کی مدد کرنے یا اصلاح حال کے لیے آجاتا ہے۔ اس کے برعکس رسول کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے اپنے خاص بندوں کو چن لیتا ہے۔ ان کے پاس ا... ایک فرشتے حضرت جبریلؑ کے ذریعہ اپنے احکا... بھیجتا ہے۔ وہ خاص بندہ احکام اللہ کے بند... کو سناتا ہے۔ خود ان احکام پر عمل کرکے نمو... دیتا ہے اور اپنی پیروی کرنے کا حکم دیتا ہے۔ بندہ رسول، نبی یا اللہ کا پیغمبر کہلاتا ہے۔ ہند... میں اسے ایش دوت کہہ سکتے ہیں۔ اسلامی... کی رو سے اوتار کا عقیدہ شرک ہے۔ اسلا... عقیدے کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ و... اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ا... نبی تھے۔ اوتار نہیں تھے۔ جس شخص نے یہ نظم... ہے وہ اسلامی عقیدہ نہیں جانتا اس نے حضـ... محمدؐ، حضرت عیسیٰؑ اور مہاراجہ بدھ کو ایک ہـ... خانے میں رکھ دیا۔

پرنسپل پنڈت پرمیشور دیں برآمدے... کھڑے سن رہے تھے۔ گھنٹہ ختم ہونے پر ... بلایا اور فرمایا کہ کتاب میں جو کچھ ہو، وہی پڑھ... دیجیے۔ باہر سے کوئی چیز نہ لایا کیجیے۔

میں نے عرض کیا: میں ایسا ہی کرتا ہوں ضروری باتیں نہیں کرتا۔ ... نے اوتا...

ول کی وضاحت پر اعتراض کیا تو میں نے عرض
اسبق میں یہی تو تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ یہی موضوع بحث بن گیا
ر پھر میں نے استعفا دے دیا تھا۔ میں نے
ہیرہ صاحبہ سے پوچھا۔ پرنسپل نے آپ پر اعتراض
ہیں کیا؟

"نہیں!" انھوں نے جواب دیا۔

"حیرت ہے" میری زبان سے نکلا۔ اس
پر مسز شمیم صاحبہ نے فرمایا کہ آپ کے یوپی میں
ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو تعصب پایا جاتا
ہے وہ راجستھان میں نہیں ہے۔ اس کی
تصدیق ہمارے رفقا نے بھی کی اور چند منٹ
میں انٹرویو سے ہٹ کر ایسی باتیں ہونے لگیں
جنھیں عدم تعصب کی مثالیں کہنا چاہئے۔ اس
کے بعد میں پھر ظہیرہ شمیم صاحبہ کی طرف
متوجہ ہوا۔

"ہاں پھر؟"

پرنسپل صاحبہ میری محنت اور میرے
طریقہ تعلیم سے بہت خوش تھیں۔ انھوں نے
مجھے لائبریری کا انتظام بھی سونپ دیا۔ اس
سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ میں نے ہر طرح کی کتابوں
کا خوب مطالعہ کیا۔ بی۔اے کے پرائیویٹ امتحان
کی تیاری کے لئے حسب ضرورت کتابیں میری
دسترس میں آگئیں۔ اسی طرح ہسٹری میں ایم اے
کیا اردو میں ایم اے اس وقت کیا جب شمیم صاحب
سے میری شادی ہوگئی۔ شمیم صاحب نے
ایم۔اے میں کامیاب کرنے کے لیے اپنا پورا
تعاون دیا۔

"اچھا، اب یہ بھی فرمائیں کہ شمیم صاحب
سے شادی کس طرح ہوئی؟" میں نے پوچھا
بولیں۔ "جس طرح مسلمانوں میں شادیاں ہوتی
ہیں۔" اس جواب پر میں چونکا۔ سوچا کیا میرا سوال
غلط ہوا۔ میں نے ندامت محسوس کی۔ شمیم صاحب
اور رفقا پر نظر ڈالی۔ وہ سب سنجیدہ تھے۔ محترمہ
نے رُکے بغیر کہنا شروع کیا کہ ۵ رمئی ۱۹۵۸ء کو
منگنی ہوئی تھی۔ ابھی میری بہنوں اور بھائیوں
میں سے کوئی اس قابل نہ تھا کہ گھر کا بار سنبھال
سکتا۔ میں نے سوچا۔ اگر میں نے شادی کر لی تو
میری والدہ اور بہنوں کے لیے معاشی مسئلہ
پریشان کن ہو جائے گا۔ میں نے اجازت لیکر

بہنوں کو پڑھایا۔ میں نے اپنے بڑے بھائی کی بھی شادی کرائی۔ اس وقت ان کی عمر ۲۰ سال کی تھی۔ اس کے بعد جب میں خود ستائیس سال کی ہو گئی تو شادی کی۔"

"اچھا سسرال والوں کا تعلق......"

ظہیرہ صاحبہ نے میرا جملہ پورا نہ ہونے دیا۔ بول پڑیں "جی ہاں! میں سمجھتی تھی کہ آپ یہ ضرور پوچھیں گے۔ الحمد للہ (محترمہ نے آواز بلند کر کے کہا)، مجھے سسرال بہت اچھی ملی۔ میرے سسر حافظ قرآن تھے۔ دیندار تھے۔ مسئلے مسائل سے واقف تھے۔ شمیم صاحب کے عقائد و نظریات بھی بہت اچھے پائے۔ یہ سب بڑے فراخ دل تھے۔ میں آپ سے عرض کروں میں نے اپنی تنخواہ سے اپنی بہنوں کی شادی کی۔ اپنی والدہ کی خدمت کی۔ مجھ سے کسی نے یہ تک نہ پوچھا "تم تنخواہ کیا کرتی ہو!" اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ میں شمیم صاحب کے سامنے اعتراف کرتی ہوں کہ خود شمیم صاحب اور ان کے بزرگوں نے بہت کوآپریٹ کیا شمیم صاحب، سسر صاحب اور ساس صاحبہ الگ الگ مجھے خرچہ دیتے تھے۔ کسی دباؤ یا کے ڈر سے نہیں۔ خوشی خوشی۔"

"تو ماشاء اللہ آپ ان سب کے لیے دعا گو رہی ہوں گی؟"

"بے شک۔ اب بھی ہوں۔"

"اس وقت آپ کی کوئی اور تمنا بھی تھی؟"

"ہاں"۔۔۔ ہاں کی آواز کچھ اس طرح آئی جیسے کوئی خاتون شرم اور خوشی کے ملے جلے جذبات میں آ کر اس طرح ہاں کرتی ہے "مائی صاحب! میرا عقیدہ اللہ پر بہت زیادہ ہے۔ میری دعا ہمیشہ قبول ہوئی۔ شادی کے بعد میری ایک تمنا دعا میں تبدیل ہو گئی وہ یہ کہ میری جو اولاد ہو وہ اسلام کے کام آئے میرے تین لڑکے ہیں۔ ان کے نام میں نے خود رکھے ہیں۔ ایک کا نام مجاہد ہے۔ دوسرا طارق ہے۔ تیسرا غازی۔ میں انھیں مجاہد اور غازی بنانے کے لیے صرف دعا ہی نہیں کرتی۔ کوشش بھی کرتی ہوں۔

ہماری گفتگو کالج سے یکدم گھریلو زندگی پر آ گئی۔ تو میں نے محترمہ سے دریافت کیا کہ

گھر، اولاد، کالج اور خانہ داری وغیرہ کی ساری کھکھیڑ کو آپ نے کس طرح منظم کیا ہے اور بچوں کی تربیت کرنے میں آپ کا کیا طریقہ رہا ہے۔

"ہاں، یہی بات تو آپ حجابی بہنوں کو بتائیں گے۔ سنئے، میں نے اپنے اوقات منظم کر لیے ہیں۔ صبح سویرے سو کر اٹھتی ہوں۔ اول وقت نماز پڑھ کر بچوں کو اٹھاتی ہوں۔ شمیم صاحب مسجد چلے جاتے ہیں۔ میں اپنی نگرانی میں نماز پڑھاتی ہوں۔ قرآن کی تلاوت خود کرتی ہوں بچوں کو بھی تاکید کرتی ہوں۔ میرے تمام بچوں میں دس برس کی عمر ہوتے ہوتے نماز روزے سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ میں طریقۂ تعلیم میں محض پیار کا رویہ رکھنے کے خلاف ہوں میرے خیال میں پیار کے ساتھ تادیب کا خوف بھی ہونا چاہیے۔ میں ہوم ورک ۹ بجے تک خود تیار کراتی ہوں۔ اسکولوں میں اردو نہیں ہے۔ میں خود بچوں کو اردو پڑھاتی ہوں چونکہ ہمارا سارا لٹریچر اردو میں ہے۔ ہندی میں منتقل نہیں ہوا ہے اس لیے اگر ہم اردو نہ پڑھائیں گے تو ہمارے بچوں کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ میرے طریقۂ تعلیم میں کہانیاں اور مثالوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی مدد سے تعلیم کو بہت دلچسپ بنا دیتی ہوں۔ نبیوں کے قصے۔ صحابہ کے حالات۔ اسلامی جانبازوں کی سوانح حیات۔ جنت و دوزخ کا حال۔ نیک اعمال۔ آخرت کے لیے ایمان و عمل کا تحفہ لیجانا قبر کے سوال جواب۔ یہ سب میں منظم اور غیر منظم دونوں طرح بتاتی رہتی ہوں۔ یعنی ہر وقت۔ میں وقت بیکار نہیں کھوتی۔ انہی اوقات میں گھریلو کام بھی کرتی رہتی ہوں۔ محلے کے بچے صبح ۵ بجے سے ۹ بجے تک میرے گھر کے اندر مجھ سے دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ شمیم صاحب تو اپنے کام سے چلے جاتے ہیں۔ بچوں کا ایک لشکر میرے اشارے پر حرکت کرتا ہے۔ میرے بچے کام میں میری مدد کرتے ہیں۔ میری لائبریری میں دینی کتابوں کا بہت زیادہ ذخیرہ ہے محلے کی عورتوں کو متوجہ کرتی رہتی ہوں کہ وہ بچوں کو دینی تعلیم ضرور دلائیں۔ میں کالج میں بھی مسلمان لڑکیوں سے نماز پڑھواتی ہوں۔ آپ یہ سنکر خوش ہوں گے کہ ہمارے کالج میں

لڑکیوں کو نماز پڑھتے دیکھ کر سب ہی خوش ہوتی ہیں۔

بات کالج کی طرف پھر مڑی تو میں نے پردے کے متعلق پوچھا کہ آپ کی زندگی میں کہیں حارج تو نہیں ہوا؟ اس کا جواب شرح صدر کے ساتھ دیا۔

"پردے کے متعلق یہ خیال غلط ہے کہ پردے سے صحت خراب ہو جاتی ہے اور یہ خیال بھی غلط ہے کہ عورت اضافہ علم سے محروم رہتی ہے۔ میں اپنے کالج میں دیکھتی ہوں کہ پردہ دار مسلم لڑکیوں کی صحت بے پردہ لڑکیوں سے اچھی ہے اور آج کل اضافۂ علم کے سوال میں پردے کو رکاوٹ بتانا ناواقفیت کی دلیل ہے۔ کتابوں کی لائبریریاں اخبار ریڈیو، ٹیلی ویژن، آمد و رفت کے ذرائع ان سب نے تو مردوں اور عورتوں کو برابر کا موقع دے دیا ہے۔ میرے کالج میں نئی آنے والی استانیاں جب مجھ پر اعتراض کرتی ہیں تو میں مدلل جواب دیتی ہوں۔ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے گھروں کا فرق بتاتی ہوں۔ مائل صاحب! میرے کالج میں بہت سی غیر مسلم استانیوں اور لڑکیوں نے مسلمان عورتوں کا لباس اختیار کر لیا ہے۔ وہ قمیص اور شلوار پہنتی ہیں۔

میں نے داڑھی کے متعلق اظہارِ خیال کرنے کے لئے عرض کیا تو ہنس کر بولیں، شمیم صاحب سامنے بیٹھے ہیں ان سے پوچھئے کہ انھوں نے داڑھی کیوں نہیں رکھی۔ میں داڑھی کے متعلق ان سے مدلل گفتگو کر چکی ہوں۔

یہ سنکر ہم سب کی نظریں شمیم صاحب کے فارغ البال چہرے پر پڑیں۔ وہ بے چارے عجیب مخمصے میں پھنس گئے۔ ایک دھیما سا قہقہہ بیٹھک میں بلند ہوا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ میں اس ہنسی میں داڑھی کے متعلق مزید پوچھنا بھول گیا وقت بھی زیادہ ہو چکا تھا۔ میں نے عرض کیا۔ اگر آپ حجابی بہنوں کو اپنا کوئی خاص پیغام پہنچانا چاہتی ہوں تو فرما دیں۔ اس کے جواب میں فرمایا:

میرا پیغام اپنی بہنوں کے لیے اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہمارے جو بچے اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں وہ ادھوری تعلیم ہے۔ اگر ہم انھیں دینی تعلیم نہ دیں گے تو وہ صحیح معنوں میں

انسان نہ بن سکیں گے اور یہ کام ہے ہم عورتوں کا۔ میں بھائی بہنوں سے یہ بھی توضیح کردوں گی کہ وہ اپنے بچوں کو شریعت سے بھی آگاہ کریں اور خود کو اچھے مسلمان کا نمونہ بنائیں۔ بچوں کی چھوٹی عمر میں انھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے نبیوں کے قصے سنائیں۔ کلمہ وغیرہ اور آیتیں یاد کرائیں۔ یہ کام وہ رات کو لیٹتے وقت بآسانی کرسکتی ہیں۔

اور سائل صاحب! آپ میری بہنوں سے کہہ دیں کہ موجودہ تعلیم کی چمک دمک سے مرعوب نہ ہوں۔ یہ کھوکھلی ہے۔ اگر کسی کو سماج کی صحیح خدمت انجام دینا ہے تو وہ بچوں کو دینی تعلیم سے ضرور آراستہ کرے ورنہ جو اپنے بچے کو محض اسکولی تعلیم دے کر اس کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی۔

میں نے محترمہ مسز شمیم کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے اپنی تصنیفات میں سے کچھ کتابیں بطور تحفہ محترمہ کی خدمت میں پیش کیں۔ انھوں نے بڑی مسرت کے ساتھ قبول فرمایا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ مولانا منظور الحق صاحب کے یہاں تین بجے خواتین کا اجتماع ہے اس میں تشریف لائیے گا۔ ہماری یہ درخواست بھی منظور کرلی گئی۔ پھر ہم نے شمیم صاحب کو ان کی ازدواجی زندگی کی کامیابی پر مبارکباد دی اور یہ دعا دیتے ہوئے رخصت ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور تمام مسلمانوں کے گھروں کو ایسا ہی بنادے۔ آمین!

یورپین نسلیں خلط ملط ہونے لگیں

لے پالک بچوں کی سمسیا گمبھیر ہو گئی!

(ماخوذ)

اپنی ولدیت معلوم کرنا اور یہ جاننا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں، ہر بچے کا بنیادی حق ہے لیکن انگلینڈ اور ویلز میں لوگوں کا ایک طبقہ قانونی طور پر اس حق سے محروم ہے اور وہ لوگ نہیں جان سکتے کہ ان کے حقیقی ماں باپ کون ہیں۔ دراصل یہ طبقہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے۔ جنھیں بچپن میں کسی نے گود لے لیا۔ یا اپنا متبنّیٰ بنالیا۔

انگلینڈ اور ویلز میں بچوں کو گود لینے کا رواج ۱۹۲۶ء سے چلا آرہا ہے اور کچھ لے پالک تبھی سے اپنا حسب نسب جاننے کے آرزومند ہیں اور جب بھی انھوں نے اپنے اصلی ماں باپ کا نام پتہ معلوم کرنے پر اصرار کیا، انھیں ان کے سرپرستوں نے حیلے بہانے بنا کر ٹال دیا۔

لیکن گذشتہ دو ایک برس سے متعلقہ قانون نرم کر دیا گیا ہے اور اب ۱۸ برس سے زائد عمر کے لے پالکوں کو سرکار نے یہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ اگر چاہیں تو اپنا برتھ سرٹیفکٹ دیکھ سکتے ہیں۔ اس سرٹیفکٹ سے انھیں اپنے حقیقی ماں باپ کا نام اور پتہ بہ آسانی معلوم ہو سکتا ہے۔

اس مقصد کے لئے حکومت نے سوشل سروس ڈیپارٹمنٹ میں ایک مشاورتی بیورو کھول دیا ہے۔ اپنا حسب نسب جاننے والے بالغ افراد کو ایک فارم پُر کر کے دینا

پڑتا ہے جس پر چند روز بعد انھیں مطلوبہ برتھ سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے۔ ساتھ ہی انھیں ایک ایسی فہرست دے دی جاتی ہے جس پر بہت سے نام اور پتے درج ہوتے ہیں۔ اسی فہرست سے لے پالکوں کو اپنے حقیقی والدین کا اتہ پتہ معلوم ہو جاتا ہے۔

سالہا سال کے بعد اس قسم کا ملاپ بڑا رقت انگیز ہوتا ہے اور والدین اور بچوں کے دل و دماغ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

بہت سے نوجوان جنھیں اپنے اصلی گھر کی تلاش ہوتی ہے، اپنے خاندان، قومیت اور جائے پیدائش کے بارے میں حقائق سے آگاہ ہو کر مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن کئی ایک ایسے ہوتے ہیں جو حسب نسب جان کر مطمئن نہیں ہوتے، بلکہ دو قدم اور آگے جانا چاہتے ہیں یعنی وہ ذاتی طور سے اپنے حقیقی ماں باپ سے ملنے کے آرزومند ہوتے ہیں۔

لیکن اس تلاش و جستجو میں کئی بار متعلقہ افراد کو مایوسی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ کئی بار ایک ہی علاقہ میں ایک ہی نام کے دو یا تین افراد نکل آتے ہیں اور کئی بار خود والدین اس حق میں نہیں ہوتے کہ ان کے بچے پر یہ راز افشا ہو جائے کہ وہ کن وجوہ کے زیر اثر انہوں نے اپنا بچہ کسی کو دے دیا وغیرہ وغیرہ۔

برتھ سرٹیفکیٹ حاصل کرنے سے پہلے متلاشیوں کو متعلقہ بورڈ کے صلاح کار سے ملنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن وہ انھیں مزید تفصیلات معلوم کرنے اور معاملہ کی تہہ تک پہنچنے سے روکنے کا مجاز نہیں ہوتا۔

بہت سے لے پالک جو بڑے ہو کر تعلیم حاصل کر کے برسر روزگار ہو جاتے ہیں۔ اس جھنجھٹ میں نہیں پڑتے کہ یہ پتہ لگائیں کہ ان کے پرورش کنندگان واقعی ان کے حقیقی والدین ہیں یا نہیں۔ مثال کے طور پر سکاٹ لینڈ میں جہاں برتھ سرٹیفکیٹ حاصل کرنا بہت سہل ہے، صرف ۳ فی صد لے پالک ہی ایسے پائے گئے جنہوں نے اس سہولت سے فائدہ اٹھایا، اسی طرح انگلینڈ اور ویلز میں

جہاں ۱۹۲۶ء سے لے کر اب تک کوئی پونے سات لاکھ بچے گود لئے گئے، یا متبنّیٰ بنائے جاچکے ہیں۔ پچھلے سال کے دوران صرف ایک فی صد افراد اپنا حسب نسب جاننے کے لئے متعلقہ دفتر میں پہنچے۔

بہت سے لے پالک تو اپنے منہ بولے والدین کے انتقال کے بعد ہی اپنے حقیقی ماں باپ کا پتہ لگانے نکلتے ہیں۔

حال ہی میں ایک ۲۶ سالہ نوجوان لڑکی نے جو ایک ماڈل گرل کے طور پر کسی کمپنی میں ملازم ہے اپنی "ماں" کی وفات کے بعد اپنے حقیقی آبا و اجداد کی بابت جاننے کے لئے برتھ سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لئے درخواست دی۔ اس سرٹیفکیٹ سے اسے معلوم ہوا کہ وہ لندن کے ایک نواحی قصبہ میں پیدا ہوئی۔ وہ ابھی ایک ماہ ہی کی تھی کہ ان کے پڑوس میں رہنے والی ایک عورت نے جس کے کوئی بچہ نہ تھا اُسے گود لے لیا۔ اتنا پتہ لگ جانے پر اس لڑکی کے من میں اپنے والدین سے ملنے کی خواہش تیز ہوگئی۔ چنانچہ وہ اس قصبہ میں جا پہنچی جہاں سب سے پہلے اس کی اپنے حقیقی چچا سے اور اذاں دادا سے ملاقات ہوگئی۔ جنھوں نے اُسے بتایا کہ اس کی حقیقی ماں کینیڈا میں رہتی ہے۔ اس پر اس لڑکی نے اپنی ماں کے ساتھ خط و کتابت شروع... کر دی اور چند ماہ بعد وہ خود کینیڈا جا پہنچی۔ وہاں اپنے والدین اور دیگر بھائی بہنوں سے مل کر اُسے بہت خوشی ہوئی اُس کے ماں باپ کو جب پتہ چلا تو جس عورت نے ان کی بیٹی کو گود لیا تھا، وفات پاگئی ہے تو اُنھوں نے اپنی بیٹی کو واپس لندن نہیں بھیجا اور اس طرح یہ لے پالک لڑکی اپنے پریوار میں رہنے لگی۔

کئی بار تو کھوج لگانے والے بہت جلد منزلِ مقصود تک جا پہنچتے ہیں۔ ایک بار ایک عورت اپنے برتھ سرٹیفکیٹ پر درج پتہ کے مطابق ایک مکان پر جا پہنچی اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کی ماں اندر نہ تھی، مگر عورت جس نے اندر سے جواب دیا، بولی: "وہ تو کہیں گئی ہے۔" پھر اُس نے دروازہ کھولا تو اجنبی عورت کو دیکھ کر کہنے لگی: "اوہ! انتہائی

شکل تو ہو بہو ماں کی شکل جیسی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اُسے اندر بٹھایا اور اس طرح ماں بیٹی کا ملاپ ہو گیا۔

تاہم متعلقہ دفتر کے صلاح کار ایسے لوگوں کو براہِ راست ملنے کی بجائے پہلے خط و کتابت کرنے کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ مایوس نہ ہو۔

کئی بار معاملہ بالکل اُلٹ ہو جاتا ہے یعنی حقیقی والدین ملنا تک گوارا نہیں کرتے مثلاً ایک عورت کا کمسن بچہ جسے اس نے پیدا ہوتے ہی کسی کو سونپ دیا تھا۔ جب تلاش کرتا ہوا اپنے اصلی گھر پہنچا تو اس نے اسے دھتکار دیا اور بولی! "خبردار! جو آئندہ اِدھر کا رُخ کیا ورنہ اچھا نہ ہوگا" لیکن اس قسم کے واقعات شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔

اکثر والدین اپنے بچے کو جسے کسی نے گود لے لیا ہو دیکھنے کے خواہش مند رہتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا اُن کا بچہ ٹھیک طور سے پرورش پا رہا ہے یا نہیں۔ اس مقصد کے لئے انھیں ایڈاپشن سوسائٹی سے رابطہ قائم کرنا پڑتا ہے لیکن قواعد و ضوابط کی رُو سے یہ سوسائٹی بہت لوگوں کو اس امر کی اجازت دیتی ہے کہ وہ پالک بچوں سے میل ملاپ رکھیں۔

ایک بار ایک عورت نے اس سو سے رجوع کیا اور بتایا کہ وہ گذشتہ تیـ برس سے ہر سال اپنی بیٹی کے لئے اس سالگرہ کا کارڈ خریدتی ہے لیکن وہ یہ کا بھیجے کس پتہ پر ؟ یہ اُسے معلوم نہیں۔ سوسائٹی نے بعض امکانی پیچیدگیاں پیـ ہونے کے اندیشے کے پیش نظر اس عور سے معذرت کا اظہار کیا۔

امریکہ میں بھی بہت سے لے پالک بچ دل برداشتہ ہو چکے ہیں کیونکہ وہاں بـ وہ اپنے حسب نسب کا ریکارڈ دیکھنے یا بر سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے حق سے محروم ؛ اس ملک میں لے پالکوں کی تعداد ۲۰ لاکھ ـــ بھی زیادہ ہے ان میں سے بہت سے اپنے حقیـ والدین کا پتہ لگانے کی جستجو میں سرگرداں ؛ کچھ تو براہِ راست تلاش میں مصروف رـ ہیں اور کئی ایک اپنے موجودہ ماں باپ

ساطت سے اپنے حقیقی ماں باپ کا نام معلوم
سنے کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں اگرچہ
ن کے منہ بولے والدین یہ بات پسند نہیں کرتے
ے لے پالکوں کی طرف سے اُنھیں پورا یقین
لایا جاتا ہے کہ وہ زندگی بھر اُنھیں کے ہوکر
ہیں گے بھلے ہی ان کو اپنے اصلی آباد اجداد
پتہ چل جائے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی لے پالک
اش کرتے کرتے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ
جائے تو ماں کی نسبت اس کا حقیقی والد زیادہ
سرد مہری سے پیش آتا ہے مبادا اُسے اپنی
جائیداد سے حصہ دینا پڑ جائے۔

کئی لاولد لوگ ہسپتالوں یا لاوارث بچوں
کے آشرموں سے بچہ گود لے لیتے ہیں اور اس
طرح انھیں خود پتہ نہیں ہوتا کہ بچہ کس نسل سے
ہے کسی غریب کا بیٹا ہے یا امیر کا۔ چنانچہ وہ پروان
چڑھتا ہے تو اس کی عادات و خصائل سے تھوڑا
بہت پتہ چلتا ہے کہ وہ کس طبقہ سے تعلق رکھتا
ہے کیونکہ بہت سی باتیں تو ورثہ میں ملتی ہیں
کئی بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جو نسل در نسل چلی
جاتی ہیں۔ کئی بچے بڑے ہوکر فنونِ لطیفہ کی
طرف مائل ہوتے ہیں۔ یہ بھی خاندانی اثر ہوتا ہے
لے پالک منی جس کی عمر اس وقت ۲۶
برس ہے اور جو ایک کمرشل آرٹسٹ ہے
ہر وقت اس بات کی کھوج میں رہتی ہے کہ
آیا آرٹ کا فن اُسے ورثہ میں ملا ہے اس نے
ایڈاپشن ایجنسی کے ایک سوشل ورکر سے
رابطہ قائم کیا جس نے اُسے کئی ایڈریس
دیئے جن میں سے ایک ایڈریس سے اسے اپنے
حقیقی دادا کے گھر کا پتہ چل گیا۔ پھر وہیں سے
اسے اپنی ماں جو کیلیفورنیا میں مقیم تھی کا بھی
ایڈریس مل گیا۔ منی اس پتہ پر کیلیفورنیا جا پہنچی۔

منی نے بتایا کہ جونہی میں نے کیلیفورنیا
پہنچ کر بتائے گئے ایڈریس پر اس مکان
کے دروازہ پر دستک دی تو ایک عورت
باہر نکلی، میں نے اُسے بتایا کہ میں نیویارک سے
آرہی ہوں اور آپ سے بات چیت کرنا چاہتی
ہوں۔ میں ۱۹۴۶ء میں پیدا ہوئی تھی۔ میں
بچی ہی تھی کہ رچرڈ نامی ایک شخص نے مجھے
گود لے لیا۔ اس نے میری پرورش کی تعلیم دلائی۔

رچرڈ ایک کارخانے میں کیبنگ تھا طالب علمی کے زمانے میں مجھے آرٹ سے رغبت ہوگئی چنانچہ معمولی سی تربیت پاکر میں ایک اعلیٰ کمرشل آرٹسٹ بن گئی۔ میرے ٹیچر مجھے کہتے کہ آرٹ تمہیں ورثہ میں ملا ہے۔ لیکن رچرڈ کے خاندان میں کبھی فنونِ لطیفہ سے بے گانے تھے۔ چنانچہ میرے دل میں اپنا حسب نسب جاننے کی خواہش پیدا ہوئی، اور کافی کھوج کے بعد مجھے اپنی حقیقی ولدیت کا پتہ چلا اور یہاں اپنا میکہ گھر سمجھ کر آئی ہوں۔"

یہ سنتے ہی اس بڑھیا نے جو اسی کی حقیقی ماں ہی تھی اُسے گلے لگا لیا اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے فرطِ مسرت سے چلا اٹھی۔ میری بچی! میری بچی!! اے خدا تیرا لاکھ شکر ہے کہ تو نے میری بچی کو مجھ سے ملا دیا یہ کہہ کر اُس نے اپنے خاوند کو جو ایک بہت اچھا نقشہ نویس تھا! خوشخبری سُنائی تو وہ بھی فوراً گھر آ گیا۔ اور ۲۶ برس کے بعد اپنی بچی سے مل کر بہت خوش ہوا۔ تب مجھ پہ ظاہر ہو گیا کہ واقعی آرٹ اُسے ورثہ میں ملا ہے اور کاش اس کے ٹیچر بالکل ٹھیک کہتے تھے۔

لے پالکوں کے لئے ایک اور دشواری یہ ہے کہ شادی بیاہ کے معاملے میں کئی بار ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک ہی خون میں رشتہ ہو جاتا ہے اور تحقیق و تفتیش و حسب نسب جاننے کے بعد میاں بیوی بھائی بہن ثابت ہو جاتے ہیں اس سلسلے میں ایک واقعہ بڑا دل چسپ ہے۔

یہودی لڑکی سارہ میر ۱۹ برس کی تھی جبکہ ایک آئرش نوجوان سے اس کی شادی ہو گئی اور اس کے ایک لڑکا پیدا ہوا جسے کسی نے گود لے لیا اور اس کا نام جیری رکھا، وہ جب جوان ہو گیا تو اس کی ایک لڑکی سے محبت ہو گئی جس کا نام جینی تھا، بالآخر دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ دریں اثنا جینی نے اس کا حسب نسب پوچھا۔ جیری نے لاعلمی ظاہر کی۔ بات جینی کی ماں تک پہنچی، چنانچہ ماں بیٹی دونوں نے کھوج کی تو پتہ چلا جیری سارہ کا ہی بیٹا تھا اور یہ جینی اس کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ جیری کو جب اس ساری کہانی کا پتہ چلا تو وہ بہت نادم ہوا اور اس طرح بہن بھائی بدنام ہونے سے بچ گئے۔ ●

خوب!

جب میرا دماغ درست ہوا تو کہتے ہیں خراب ہو گیا

شہر کے "دادا" کی عبرتناک کہانی ماڈل ٹاؤن خستہ آبادی کی زبانی — !

میں پریشان تھا۔ میرے ذہن میں انتشار تھا۔ کچھ اچھا نہ لگتا تھا۔ بے ارادہ اس مجلس میں چلا گیا۔ ایک مولانا صاحب وعظ فرما رہے تھے مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ ان کی تقریر کا موضوع کیا تھا جس وقت میں پہنچا، اس وقت مثال کے طور پر ایک واقعے پر روشنی ڈال رہے تھے میں نے سنا:۔

"جنگ بڑے زوروں پر تھی۔ گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ لشکرِ اسلام بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا تھا لیکن عیسائیوں کے بہادر سپاہی آہنی دیوار بن کر سامنے کھڑے تھے۔ ان کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف سے عورتیں انہیں جوش دلا رہی تھیں۔ دوسری طرف ان کے بچے بھی جھوم جھوم کر قومی ترانہ گا رہے تھے۔ وہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے۔ اگر مسلمانوں نے میدان جیت لیا تو ہم سب لونڈی غلام بنا لئے جائیں گے۔

عیسائی بہادر عورتوں اور بچوں کی یہ چیخ سنتے تو ان پر بے خودی چھا جاتی۔ وہ سب مرنے مارنے پر تل گئے تھے۔ عالم یہ تھا کہ ایک شور برپا تھا۔ تلواروں کی جھنکاریں، نیزوں کی کڑک نعرۂ تکبیر اور نعرۂ تثلیث بلند ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی سر، پیر، ہاتھ کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔ زخمیوں سے میدان پٹا جا رہا تھا لیکن فتح و شکست کے آثار دور دور تک نظر نہ آتے تھے۔ اچانک ایک آواز بلند ہوئی:۔

"مسلمانو! میں نے عیسائی سپہ سالار کو مار گرایا یہ دیکھو اس کا گھوڑا۔ میں اس پر کھڑا ہوں ساتھ ہی ایک طرف سے تیر آیا اور اس بہادر مسلمان کے حلقوم میں پیوست ہو گیا۔ وہ گھوڑے سے گرا

لیکن دوسرے مجاہد نے گھوڑے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ گھمسان کا رن پڑا کہ خدا کی پناہ۔ عیسائیوں کا سپہ سالار مارا جا چکا تھا۔ بے افسر فوج کتنی دیر لڑتی۔ آخر بھاگ کھڑی ہوئی۔ بلنے کی آہنی دیوار ٹوٹی۔ مسلمانوں نے کشتے کے پشتے لگا دیے۔ اسی حالت میں کچھ عیسائی بچے ان کی تلواروں کی زد میں آ گئے۔

"نعرۂ تکبیر"۔۔۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک شخص نے پکارا اور اس کے جواب میں "اللہ اکبر" کا شور بلند ہوا۔ اسی شور میں مولانا صاحب کی آواز دب گئی۔ وہ خاموش ہو گئے شور کم ہوا تو فرمایا:

مسلمانو! تم نے پورا واقعہ نہیں سنا۔ اگر تم پوری بات سن لیتے تو درود پڑھتے۔ میرے اس واقعے کے بیان کرنے کا نقطۂ عروج (کلائمکس) یہ ہے کہ جب اس جنگ کی رپورٹ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچی تو۔۔۔۔

مولانا صاحب "تو" کہہ کر رک کے پھر ایک سوال کر دیا، مسلمانو! کیا خیال ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر اسلام کو فتح کی مبارک باد دی ہوگی۔ مجاہدین کی پیٹھ ٹھونکی ہوگی شاباشی دی ہوگی؟

"نہیں!" مولانا جذبات میں بھر گئے انہوں نے فرمایا۔ نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خدا سے فرمایا "پروردگار! میں نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا تھا۔ اے اللہ! میں اس جرم سے بری ہوں۔" آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور آپ بار بار یہی الفاظ دہرا رہے تھے۔

مسلمانو! مجاہدین نے حضور کی یہ کیفیت دیکھی تو اپنے کو لعنت ملامت کرنے لگے۔ کاش! ہم اس جنگ میں شریک نہ ہوتے۔

حضرت ابو بکرؓ نہایت سنجیدہ بزرگ اور رازدار رسولؐ تھے۔ یہ منظر ان سے بھی نہ دیکھا گیا۔ وہ آگے بڑھے۔ عرض کیا۔ یا رسول اللہ! مسلمان مجاہدین کو دیکھیے!"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر اسلام کی طرف دیکھا۔ چشم مبارک سرخ تھی۔ فرمایا۔ "مشرکین کے بچے تم سے اچھے ہیں!"

مولانا کی زبان سے یہ سنا تو میرا دل یکدم دھڑکا۔ میرے منھ سے "ہائے" نکلی اور میں بے ہوش ہو گیا۔ پھر جب میں ہوش میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اپنے گھر چارپائی پر لیٹا ہوں اور ڈاکٹر کہہ رہا تھا "کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ اچانک دل پر اثر ہوا ہے۔"

ڈاکٹر یہ کہہ کر چلا گیا۔ میرے گھر والوں نے مجھ سے پوچھا "کیا ہوا تھا؟" میں نے "کچھ نہیں" کہہ کر ٹال دیا۔ اٹھا اور ٹہلتا ہوا باہر نکل گیا۔ ہندو مسلم بلوے میں گجودھر میرے ساتھ رہتا تھا۔ ہم دونوں اس موقع پر قتل بھی کرتے، آگ بھی لگاتے اور لوٹ مار بھی۔ اس کے بعد آدھا آدھا بانٹ لیتے میرے دل پر ایک بوجھ تھا جو میرے دل کو دبائے دے رہا تھا۔ میں سیدھا گجودھر کے گھر پہنچا۔ وہ ملا۔ میں نے کہا "یار! طبیعت بوجھل ہو رہی ہے۔"

"تو چلو!" اس نے کہا اور ساتھ ہو لیا بھٹی پر پہنچا خود بھی چڑھایا مجھے بھی پلائی۔ میرا تجربہ یہ تھا کہ شراب پینے غم دور ہو جاتے ہیں۔ خوف دھرا جاتا ہے۔ لیکن وہ خیال جو مجلس کہتے وقت آیا تھا۔ اب مجھے او دماغ کو توڑے دے رہا تھا۔ می تھا۔ اچانک خیال آیا۔ اپنے کام پر مزار شریف جا کر منت مانتا تھا۔ میں منت مانی تھی کہ جو مال ہاتھ مزار پر چڑھاؤں گا۔ شائد میں نے ہو۔ میں نے گھر جا کر ایک بڑا سا زیو پونے بیچا اور مزار پر چڑھا آیا۔

میرا دل، میرا دماغ اب بھی تھا اب میرا جی چاہتا تھا کہ کہیں ریل کے نیچے اپنے کو کٹوا دوں۔ یہ پھر بھٹی پر گیا۔ خوب چڑھائی اور پٹڑی کی طرف۔ مگر خدا جانے کیسے آپ سے آپ کو توالی چلا گیا۔ بڑے کہا رپورٹ لکھوانی ہے اور پانچ اس کے آگے رکھ دیا۔ اس نے قلم

کیا ہوا؟"

اس کے جواب میں میں نے کہا کہ پچھلے ہفتے جو بلوہ ہوا تھا۔ میں نے اس میں ہندوؤں کا ایک بچہ قتل کر دیا تھا۔

بڑے منشی نے قلم رکھ دیا۔ مجھے دیکھا۔ میں پیٹے ہوئے تھا۔ اس نے کہا، "ٹھہرو!" وہ انچارج تھانہ منور یار خاں کے پاس گیا انھیں ساتھ لایا اور کہا، "سنئے یہ کیا رپورٹ لکھاتا ہے۔" منور یار خاں نے مجھے ایک موٹی سی گالی دے کر کہا "ابے دادا کے بچے کیا ہے؟"

"حضور! رپورٹ لکھانے آیا ہوں۔ پچھلے ہفتے جو بلوہ ہوا تھا۔ میں نے اس میں ہندوؤں کا ایک بچہ قتل کر دیا تھا۔"

"سالے! تیرا دماغ خراب ہوا ہے کیا؟" منور یار خاں نے پھر مجھے گالی دی۔ میری زبان سے آپ سے آپ نکل گیا "خوب! خوب! جب میرا دماغ درست ہوا ہے تو کہتے ہیں خراب ہو گیا!" مجھے تاؤ آ گیا۔ میں نے کہا۔ "دیکھئے حضور بہت کھلایا ہے آپ کو۔ آپ رپورٹ لکھتے ہیں یا جاؤں مجسٹریٹ کے پاس۔"

میرے تیور دیکھ کر منور یار خاں ڈھیلا پڑ گیا بڑے منشی سے کہا کہ اس کا بیان لکھ لو۔ اس کی دماغی جانچ کے لئے ڈاکٹری معائنہ کے الفاظ بھی شامل کر دینا۔ ڈاکٹری معائنہ کے بعد اسے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اس رپورٹ سے ہوتا کیا ہے۔ مستند بیان مجسٹریٹ کے سامنے دیا ہوا ہو گا۔

منور یار خاں بڑا گھاگ تھا۔ اس نے بات ٹھیک کہی تھی۔ رپورٹ لکھ لی گئی۔ پھر دو سپاہیوں کی حراست میں مجھے ڈاکٹری معائنہ کے لیے بھیج دیا گیا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے بہت سے سوال کئے میں نے بڑے ادب اور تہذیب کے ساتھ جوابات دیے لیکن جب یہ پوچھا گیا کہ بچے کو کس حالت میں قتل کیا تو میں اپنے بس سے باہر ہو گیا۔ یہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے کہا، "اس وقت بچہ ماں کا دودھ پی رہا تھا۔ میں نے چاقو نکالا۔ سوچا۔ بندے سمیت کان کاٹ لوں۔ لیکن .... لیکن .... ڈاکٹر صاحب ... ڈاکٹر صاحب .....!" میں پاگلوں کی طرح زمین پر پیر پٹخنے لگا۔ ادھر اُدھر بھاگنے لگا۔ کھا ڈنڈے ڈولا

نے مجھے پکڑ لیا تو میں نے دیوار پر سر دے ملا اور بے ہوش ہوگیا۔

پھر جب میں مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا تو پتہ چلا کہ ڈاکٹر نے مجھے پاگل لکھ دیا تھا اس کے الفاظ یہ تھے: "اس کا (یعنی میرا) دماغی توازن نارمل نہیں ہے۔"

مجسٹریٹ کے سامنے میرا بیان ہوا۔ پھر مجھے جیل کے اسپتال بھجوا دیا گیا۔ وہاں سے مجھے آگرہ پہنچایا جانا تھا۔ مقامی اسپتال میں مجھے عبدالحکیم سیفی ایڈیٹر اخبار "سیف و قلم" اور جگت نرائن کیفی سمپادک "سماج سدھار" ملے۔ نہ معلوم کیوں آئے تھے۔ ان دونوں نے بلووں کو روکنے کے لیے بڑے اچھے آرٹیکل لکھے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد پر اخبارات کے صفحے کے صفحے رنگ ڈالے تھے لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ اس وقت تو اخبار "عقرب" اور "بچھو" ہندی گھر گھر پڑھا جا رہا تھا۔ سیفی صاحب اور کیفی جی کی کوششوں سے سیرت کمیٹی کی طرف سے وہ جلسہ ہوا تھا جس کی ایک مجلس میں میں بھی شریک ہوا تھا۔

سیفی صاحب نے مجھ سے پوچھا "وفا کیسے ہو؟" میں نے جواب دیا: "ایڈیٹر صاحب جب میرا دماغ درست ہوا تو انچارج تھانہ منہ یار خاں اور ریاست نور خاں مجسٹریٹ مجھے پاگل قرار دیتے ہیں۔ پھر میں نے مولانا وعظ من و عن سنا دیا اور کہا "عبدالحکیم صاحب آپ بتائیے۔ میں کیا کروں۔ جب سے میں نے سنا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "مشرکوں کے بچے تم سے (یعنی صحابہؓ سے) اچھے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ "عقرب" کے ایڈیٹر صاحب تو کافروں اور مشرکوں کو سراپا نجس بتاتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ انھیں اللہ کے گھر کے قریب نہ آنے دو۔

سیفی صاحب اور کیفی صاحب دونوں میرے پاس بیٹھ گئے۔ جگت نرائن کیفی نے مجھ سے پوچھا "وفا خاں! یہ بتاؤ کہ تمہارے رسول کی بات سچی ہو سکتی ہے یا "عقرب" کے ایڈیٹر کی؟

بات تو نبی صلی اللہ ہی کی ٹھیک ہو سکتی

"تو وفا خاں!" کیتی جی نے کہا۔ "تو چھوڑو وفا خاں "معترب" کی باتوں کو۔ تم مسلمان ہو تم کو تو اپنے نبی کی بات دانت سے پکڑ لینا چاہیئے"
میں نے عبدالحکیم سیتی کی طرف دیکھا انھوں نے کہا۔ "بھائی کیتی ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔"
"تو پھر ایک مشورہ چاہتا ہوں ـــ" اسی وقت ڈاکٹر گشت کرتا ہوا آگیا۔ سیتی صاحب نے اسے بٹھالیا۔ میں کہہ رہا تھا کہ اب یہ بتاؤ کہ جب میں نے ایک معصوم بچہ قتل کر دیا اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنی تو پھر اب میری بخشش کیسے ہوگی؟
"ہوسکتی ہے" کیتی جی یکدم بول اُٹھے۔
"کیسے؟" میں نے پوچھا۔ اب سیتی صاحب نے کہا کہ وفا خاں! توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ تم توبہ کرکے سچے مسلمان بن جاؤ۔ اللہ بڑا غفور اور رحیم ہے۔
میں نے سر جھکا لیا۔ مجھ پر جیسے غنودگی سی چھا گئی سیتی صاحب اور کیتی جی ڈاکٹر سے باتیں کرتے رہے۔ تیسرے دن سیتی صاحب پھر اسپتال آئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ پرسوں سے اس وقت تک انھوں نے مجسٹریٹ اور کوتوال سے مل کر کیا تدبیر کی۔ وہ آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے مجھے اپنے دفتر میں رکھ لیا۔ میں دفتر میں کام بھی کرتا تھا اور صبح کے وقت اخبار کا ہاکر بھی تھا۔ کیتی جی کو معلوم ہوا تو انھوں نے "سماج سدھارہ" کا بھی ہاکر بنالیا اور ایک فہرست دے دی کہ فلاں فلاں کے یہاں اخبار دے دیا کرنا۔
اب مجھ پر ایک حادثہ اور گزرا۔ کیتی جی نے جو فہرست دی تھی اس میں پنڈت بے دیال کا بھی نام تھا۔ وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں کہیں باہر تعینات تھے۔ لیکن گھر پر اخبار ضرور جاتا تھا۔ میں اخبار دینے پنڈت جی کے گھر پہنچا تو مجھ پر اپنے پاپ کا تصوّر چھا گیا اسی گھر میں ہی گھس کر میں نے بچے کو قتل کیا تھا اور کچھ مال لوٹ کر لے گیا تھا۔ میں دیر تک دم بخود کھڑا رہا کسی نے مجھ سے کہا "کھڑے کیوں ہو۔ اخبار دے کر راستہ ناپو!" میں چونکا۔ میں نے کہا۔
"اخبار لے لو" اندر سے آواز آئی "بھیا پیسے

لیتے جاؤ۔" ایک بوڑھی ماں دروازے پر آئیں۔
میں نے ان سے پوچھا: "مائی! اس گھر میں اور
کون رہتا ہے؟" بولیں "بیٹا! میں ہوں اور
میری بہو۔ بس۔"

میں نے کہا "اماں! میرے پاس رسید
نہیں ہے۔ میں آج نیا نیا نوکر ہوا ہوں۔ پیسے
پھر لے جاؤں گا۔" وہ اخبار لے کر چلی گئیں۔
میں آٹھ بجے تک روتا رہا اور اخبار بانٹتا تھا۔
پھر جب دفتر پہنچا تو سیفی صاحب بھانپ گئے
"کیا ہے وفا خاں؟"

"برا حال ہے ایڈیٹر صاحب۔" میں نے
بتایا کہ پنڈت جیہ پال جی کے گھر گیا تھا۔ وہاں
جاکر میرا کلیجہ کٹ گیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ
مائی جی کے چرنوں میں سر رکھ دوں اور
کہوں کہ مجھے ذبح کر دیں۔ اسی طرح میرے
دل کو تسلی ہو سکتی ہے۔"

"نہ، نہ، ہرگز نہیں!" عبدالحکیم سیفی صاحب
نے تاکید کے ساتھ منع کر دیا۔ "ہرگز انھیں
نہ بتانا کہ ان کے بیٹے کے قاتل تم ہو۔ جب
اللہ نے تمہارا گناہ چھپا دیا تو تمہیں کیا ضرورت
ہے کہ کہتے پھرو۔"

"لیکن میں پنڈت جی کے گھر کی طرف
تو خودکشی کرنے کو جی چاہے گا۔"

"دیکھو وفا خان! خودکشی اسلام میں
ہے۔ خودکشی کرنے والا ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں
گا۔ تم مسلمان ہو۔ یہ کبھی نہ بھولو۔"

"تو پھر مجھے بتائیے۔ میں کیا کروں؟"

"بتاؤں گا۔"

میں روز اخبار صبح کو بانٹنے کو جاتا رہا
دن مائی جی نے کہا "بیٹا! بہو رانی بیمار ہے۔
نسخہ میرے پاس ہے۔ دوا لا دو۔"

میں جب ڈاکٹر ہریش کے مطلب گیا
اخبار بھی دیا اور نسخہ بھی پیش کر دیا اور پیسے
ڈاکٹر صاحب نے ایک نظر مجھ پر ڈالی۔
کو دیکھا۔ پھر اولا دو۔ میں نے دوا لی۔ اور
جی کو دے آیا۔ مائی جی مجھے ایک روپیہ
لگیں۔ میں نے کہا "اماں! میں یہ نہیں لوں
انھوں نے اصرار کیا لیکن میں بھاگ آیا۔

اس دن کے بعد جب اخبار دینے جا
خود پوچھتا "اماں! کوئی سیوا؟" مائی جی بڑ

بہت مدد تیں لیکن جب میں نے ہر دن اپنے کو سیوا کے لیے پیش کیا تو پھر دھیرے دھیرے وہ مجھ سے کام لینے لگیں۔ کبھی کبھی وہ مجھے کچھ کھانے پینے کو بھی دیدیتیں۔ اب میں نے محسوس کیا جیسے میں خوش ہوں۔ میرے دل پر جو پتھر رکھا تھا وہ سرکنے لگا۔

عبدالحکیم صاحب اور جگت نرائن یہ سب دیکھ رہے تھے۔ دونوں بہت خوش تھے ایک دن دونوں نے نہ جانے کیا آپس میں کھسر پھسر کی۔ پھر مجھے دس روپیہ دیے اور کہا کہ سیب لے کر پنڈت جی کے گھر چلو۔ کہہ دینا کہ ہم دونوں آرہے ہیں۔

میں نے بڑے بڑے میٹھے سیب تین کلو لیے۔ مالی جی کے پاس پہنچا۔ ان سے پیغام کہا۔ انھوں نے بیٹھک کھول دی: "بیٹا ذرا اسے صاف کر دو۔ کرسیاں میز بیٹھک سے لگا دو اور او بھورانی! چولہے پر پانی رکھ دینا۔" اور سنو تو گاڑی کا ٹائم بھی ہے!"

میں نے جلدی جلدی بیٹھک صاف کی میز کرسی قرینے سے لگا دی۔ دونوں ایڈیٹر آئے تو میں نے دیکھا کہ ایک تیسرے صاحب بھی ساتھ تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ سب اسٹیشن ہو کر آئے تھے۔ تیسرے صاحب جو ساتھ تھے وہ تھے پنڈت جید پال جی۔

مجھے یہ معلوم ہوا تو میں زمین میں گڑ گیا۔ دنیا بھر کے خیالات میرے ذہن میں آنے لگے لیکن میری یہ تدبیر بہت اچھی رہی کہ میں دوڑ دوڑ کر کام کرتا رہا۔ اندر بھی باہر بھی۔ میں کبھی اندر سے پلیٹیں لاتا کبھی چائے وغیرہ۔ اس دن میں نے پہلے پہل بھورانی کو دیکھا تھا۔ کلی جیسا معصوم اور بھولا چہرہ مگر پھیکا پھیکا سا۔ ایک لمبی سانس کے ساتھ آہ سی میرے دل سے نکلی جسے میں دبا گیا۔ اسی کی گود تو میں نے سونی کی تھی۔

پنڈت جی سے دونوں ایڈیٹروں نے میرا تعارف کرایا اور سفارش کی مجھے گھر کی دیکھ بھال کے لیے نوکر رکھیں۔ پنڈت جی بھی مدت سے ایک دیانتدار نوکر تلاش کر رہے تھے۔ وفا خاں میرا نام سنا تو مسکرائے: "اسم بامسمیٰ" ان کی زبان سے نکلا اور پھر میں ان کے گھر کا سیوک ہو گیا یہ بہت اچھا ہوا۔ اس گھر میں سیوا کر کے

میرا دل بہت خوش ہوتا تھا۔ مجھے جو تنخواہ ملتی
وہ میں مائی جی کے پاس امانت کے طور پر رکھ دیتا
میں نے اپنے کو چوبیس گھنٹے کا نوکر سمجھ لیا تھا۔
میں کام کر کے تھکنے کا نام بھی نہ لیتا تھا۔ دونوں
شریف عورتیں مجھ سے بہت خوش تھیں کبھی
کبھی مالکن کہتیں اماں کہتا تھا مجھے آشرباد بھی
دیتی تھیں اور سہورانی تو مجھے بھیا کہہ کر پکارنے
لگی تھیں اور پھر اس دن تو میں رو ہی پڑا جب
رکشا بندھن کے تہوار کے موقع پر انھوں
نے میری کلائی میں راکھی باندھی تھی اور
پنڈت جی مجھ سے مذاق کرنے لگے تھے۔
میرے جیجا جی ہو گئے تھے نا!

میرے دل کا بوجھ اتر گیا۔ ایک دن
مجھے گجو دھر ملا۔ اس نے کہا۔ سنا ہے کہ پنڈت
جی کے گھر نوکر ہو گئے ہو۔ میرا نام تو نہیں لیا
کبھی۔ دادا یاد رکھنا۔ نام لیا تو اچھا نہ ہوگا۔

وہ دھمکی دے کر چلا گیا۔ میرے دل میں
کھوٹ نہ تھی۔ میں بے فکر تھا۔ ایک دن دو
بجے رات کو کچھ کھٹکا ہوا۔ میں چونکا تو دیکھا کہ
ایک شخص ڈھاٹا باندھے، چاقو تانے میری

چارپائی کے پاس کھڑا ہے اور دوسرا سہورانی
کمرے میں ہے۔ میں اچھل کر چارپائی کے دوسری
طرف لڑھک گیا: مار ڈالوں گا سالے! میرا
سے نکلا۔ میرے لڑھکتے ہی اس شخص نے
چلا دیا۔ چاقو گدے میں گھس گیا۔ کمرے سے ما
اور سہورانی کی چیخ بلند ہوئی۔ میں نے لپک کر
والی کلائی پکڑ لی۔ وہ شخص چاقو چھوڑ کر اور جھٹکا
دے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں ہوشیار تھا۔ جا
ہو گئی تھی۔ دو ڈاکو سہورانی کے کمرے سے نکلے
اور نکلتے ہی مجھ پر چاقو سے وار کر دیا۔

مثل مشہور ہے۔ "لاکھ باندھ کر رکھو ہرا
چھلانگ نہیں بھولتی۔" میں نے پینترا بدلا۔
کا چاقو خالی گیا۔ دوسرے کا چاقو میری ران
لگا۔ لیکن اسی کے پیٹ میں میں نے چاقو
دیا تھا۔ وہ ہائے کہہ کر گر گیا۔ اس کا ساتھی بھاگ
کھڑا ہوا۔ محلے ٹولے کے لوگ اکٹھا ہو گئے۔
جس ڈاکو کو میں نے ڈھیر کر دیا تھا۔ اُسے دیکھ
بھالا گیا تھا۔ وہ گجو دھر تھا۔ پھر پولیس آئی۔
ہوئے۔ تھانہ عدالت کا بھی چکر مجھ سے لگوایا گیا
وہ دن ہے اور آج کا دن۔ مائی جی سور

ہو گئیں۔ بھورانی کی گود اللہ نے کئی بچوں سے بھری
میں اب ان بچوں کا سیوک ہوں۔ یہ بچے مجھے
ماما جی (ماموں) کہتے ہیں میں گھر کا سیوک ہیں
لوگ کہتے ہیں کہ وفا خاں اس گھر کا مالک ہے
میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بہت خوش ہوں۔
جب گھر میں کوئی خوشی کی یا تیج تیوہار یا رشتہ
ناتے کی بات ہوتی ہے تو بھورانی کہتی ہیں۔
"میں کیا جانوں۔ بھیا جانے" اور میں ہنس کر انتظام
میں لگ جاتا ہوں۔ میں اب نماز روزے کا
پابند ہو گیا تھا۔ روزوں میں بھورانی میرے
لیے افطاری اور سحری کا انتظام اپنے ہاتھ
میں لے لیتیں اور جب میں زیادہ کام کرتا تو ڈانٹتیں
اور کبھی کبھی چپت بھی لگا دیتی تھیں "ارے بھیا
روزہ لگ جائے گا، کام چھوڑ۔ ذرا بیٹھ لگ لے"
اور پھر میرے شانے پکڑ کر گدے پر گرا دیتیں
اور پھر کہتیں "سو نہیں تو اب ڈنڈا لونگی۔" ہائے
کیسا پیار تھا۔ اس ڈانٹ میں۔

آپ سمجھ سکتے ہیں، میں بہت خوش
ہوں۔ اسی سال رمضان میں میں نے پیارے
رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ وہ
تشریف لائے۔ فرمایا۔ "وفا خاں! ادھر
آؤ" میں آپ کی طرف چلا گیا مگر میں ہکا بکا
تھا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ پیارے نبیؐ
مجھے بلائیں گے۔ میں حضورؐ کے پاس چلا گیا۔
آپؐ نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا، فرمایا، "تیرا گناہ
اللہ نے معاف کر دیا۔ اور دیکھ اُدھر" حضورؐ نے
جس طرف اشارہ فرمایا تھا میں نے اس طرف
دیکھا۔ "جنت!" میری زبان سے نکلا۔ جنت
میں ایک بچے کو کھیلتے دیکھا۔ یہ وہی بچہ تھا
جسے میں نے قتل کیا تھا۔ میں اُسے لینے بڑھا
تو کسی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ دیا "ابھی نہیں"
میں جاگ اٹھا۔ دیکھا بھورانی میرے سینے پر
ہاتھ رکھے کہہ رہی تھیں "ابھی نہیں" یعنی ابھی
سوتے رہو۔ عصر کے وقت میں خود جگا دونگی۔
میں نے کہا "دیدی! ایک بات پوچھوں"

"پوچھ!"

"آپ کا کوئی اور بچہ بھی تھا؟"

"ہاں میرے بھیا۔ سات مہینے کا تھا۔ ہندو
مسلم بلوے میں ایک پاپی نے اسے مار ڈالا تھا"
"دیدی! اسے ابھی میں نے خواب میں دیکھا

"کیسا تھا وہ ؟"

"بڑا پیارا. شہزادہ لگ رہا تھا وہ"

"کہاں تھا ؟"

"جنت میں "

"ہٹ پگلے !"

"سچ مچ دیدی !"

"تونے کیسے پہچانا ؟"

"آپ کی صورت سے بالکل مل رہا تھا"

"تو پکڑ لاتا اُسے "

"دیدی ! میں بڑھا کہ اُٹھاؤں کسی نے مجھے روک دیا اور کہا کہ ابھی نہیں. جاگا تو دیکھا آپ میرے سینے پر ہاتھ رکھے ہیں اور کہہ رہی ہیں "ابھی نہیں"

بھوجائی ہنسنے لگیں. مجھے ایسا لگا کہ جیسے سچ مچ اللہ تعالیٰ نے میرا گناہ معاف کر دیا میں آج بھی اس خواب کو سچ سمجھ رہا ہوں.

اور پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد آ رہی ہے کہ مشرکین کے بچے تم سے اچھے ہیں. کتنی سچی بات کہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے !

اگر آپ کے پاس دو گائیں ہیں !

سوشلزم :- تو ایک گائے اپنے اس پڑوسی کو دے دیں جس کے پاس کوئی گائے نہیں.

کیمونزم :- تو آپ انھیں سرکار کو دیدیں. ان سے ہوئے دودھ کا تھوڑا حصہ آپ کو بھی مل جائے گا.

فاشزم :- تو انھیں اپنے پاس رکھیں لیکن ان کا سارا دودھ سرکار کو دیدیں آپ کو قیمت ادا کر کے سرکار تھوڑا سا دیدے گی.

نازی ازم :- تو سرکار آپ کو گولی مار دے گی آپ کی دونوں گائیں خود لے جائے گی اور اپنے پاس رکھے گی.

امپیریلیزم :- تو ایک فروخت کر کے اس سے حاصل شدہ قیمت سے ایک سانڈ خریدیں اور روپیہ کمائیں.

سیکولرازم :- تو آپ ان کا دودھ حاصل کریں اور اس میں پانی ملا کر فروخت کریں. سرکار آپ کو کچھ نہ کہے گی.

یہ ہیں محترمہ شائستہ شمیم

(بقلم خود)

محترمہ شائستہ شمیم حجابی خواتین کے لئے جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کی نظمیں اور غزلیں اکثر ماہنامہ حجاب کے صفحات لو زینت بخشتی ہیں۔ کچھ حضرات نے شک ظاہر کیا کہ شائستہ شمیم فرضی نام ہے۔ اس شک کو دور کرنے کے لیے ہم نے ایک بار محترمہ شائستہ شمیم کا پورا پتہ بھی شائع کیا تھا پھر انھیں لکھا کر براہ کرم تعارف نامہ ارسال فرمادیں تاکہ ایسے لوگوں شک دور ہو جائے۔ موصوفہ نے ہماری درخواست پر توجہ فرمائی مگر بہت دیر کی آپ نے آتے آتے۔ لیکن دیر آید درست آید۔ یہ تعارف بصد شکریہ شائع کیا جا رہا ہے۔ (م)

عم محترم — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خط ملا۔ ہر لفظ سے آپ کی شفقتیں ہیں کہ پھوٹی پڑتی ہیں۔ آپ نے تعارف کا حکم کیا دیا کہ میری جان بن آئی۔ علمی کم مائیگی کا احساس ہے کہ قلم اٹھانے نہیں دیتا۔ تعمیل حکم سے سرتابی کروں، یہ خود میں جرأت ہیں پاتی۔ سمجھ میں نہیں آتا لکھوں تو کیا لکھوں میری زندگی کے حالات ہی کیا۔ ہاتھ کی لکیروں کی طرح ٹیڑھے میڑھے۔ بہرحال ؎

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہی ہوں میں

ابا کا آبائی وطن اعظم گڑھ کا ایک گاؤں محی الدین پور ہے۔ اس کی خاک سے کئی صاحب کمال ہستیاں اٹھیں۔ ان میں صوفی بھی تھے اور شاعر بھی۔ مجاہد بھی تھے اور شب زندہ دار بھی۔ زمینداری کا خاتمہ ہوا۔ سبزہ زار، ریگ زاروں میں بدل گئے۔ زندگی کے چہروں پر غم و آلام کی اداسیاں پھیل گئیں۔ بزرگوں نے گھر کے در و دیوار پر حسرت کی نظر ڈالی۔ گاؤں کو الوداع کہا۔ چند نفوس پرشش گاؤں

کاک کارواں اس شہر میں آ پہنچا۔ غم و آلام کو زادِ سفر کے طور پر ساتھ لیا۔ اس "شہرِ وفا" میں کوئی نہ تھا۔ لوگ ناآشنا تھے۔ در و دیوار اجنبی۔ ابا اُس وقت زیرِ تعلیم تھے۔ حالات ناسازگار دیکھ تعلیمی سلسلہ منقطع کر دیا۔ اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارے۔ قسمت نے ساتھ دیا۔ ملازمت مل گئی۔ کا اضطراب کم ہوا۔ اس کے ماتھے کی سلوٹیں برابر ہونے لگیں۔

غالباً [illegible] کی بات ہے ابا کا عقد ہوا۔ نانا جان اسلامیہ کالج گورکھپور میں اُستاد تھے۔ خدا مغفرت کرے بڑے رکھ رکھاؤ کے انسان تھے۔ پُرانے زمانے کے انگریزی داں تھے اور مغربی تہذیب دلدادہ۔ مشرق سے بیزار نہ تھے لیکن مغرب سے مرعوب ضرور تھے۔ اس ماحول میں میں نے آنکھیں کھولیں کچھ بڑی ہوئی تو کالج کے پرائمری اسکول میں داخل ہو گئی۔ اس طرح تعلیم کی ابتدا ہوئی۔

کچھ دنوں بعد نانا کا گھر چھوٹ گیا۔ ابا کے پاس آ گئی۔ جماعت اسلامی سے ابا کا دیرینہ تعلق تعلیمی دور ہی میں ان کی ذہنی طہارت ، کا عمل مکمل ہو چکا تھا۔ مولانا مودودی کے لٹریچر سے ایسے سرشار تھے کہ اس کا نشہ کوئی ترشی نہ اتار سکی۔ یہاں آئی تو ماحول بڑا مختلف پایا۔ انسانی قلب کی مختصر سا مکان تھا۔ آسائش کی کوئی چیز نہ تھی، تکلیف کا ہر سامان تھا۔ لیکن کسی چہرے پہ نہ درد کا احساس، نہ کسی لب پہ کوئی شکوہ۔ خدا کا ذکر تھا، اسلام کا چرچا تھا۔ کان آیاتِ قرآنی سے آ ہوتے تھے۔ آنکھیں لوگوں کو سربسجود دیکھتی تھیں۔ میں یہاں آئی تو کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ گئی اب داخلہ امام باڑہ مسلم گرلس اسکول میں ہو گیا۔ ابا میرے لیے سیرت اور کہانیوں کی ہلکی پھلکی کتابیں لانے لگے۔ میں انھیں شوق سے پڑھتی۔ خوش ہوتی۔ ان کتابوں کے کردار کی خوشبو میرے دل و دماغ میں رچتی بستی چلی گئی۔ اس دوران امی بھی نئے ماحول کے سانچے میں ڈھل چکی تھیں۔ ان کا اجتماعات میں آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ اکثر میں بھی اُن کے ساتھ ہو لیتی۔ آ میرے شعور میں پختگی نہ تھی۔ باتیں کیا سمجھتی۔ لیکن ہمہ تن گوش و سراپا شوق بن کر سنتی رہتی۔ اس طرح کئی سال گزر گئے۔ میرے شعور میں کچھ پختگی آ گئی۔ ابتدائی تعلیمی مراحل طے کر کے اونچی

ں میں پہنچ گئی۔ اب اسلامی افکار و نظریات پر ٹھوس کتابوں کے مطالعہ کا شوق ہوا۔ مولانا مودودی
بارگاہ میں پہنچی یا پہنچا دی گئی ؂

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے میرے دہن کیلئے

مولانا محترم کی تمام اہم تصانیف میری نظر سے گزریں۔ ان کے اندازِ بیان کی شگفتگی اور طرزِ استدلال
مجھ پر جیسے سحر کردیا۔ جہدی افادی کی طرح میں ان کتابوں کو "تازیانۂ حرم" سمجھ کر ان کے جلوؤں میں گم
ہوئی۔ "آبِ حیات" سمجھ کر انھیں پیتی گئی۔ میرے اندر ایک نئی صالح فکری توانائی ابھری۔ میرے
دفن کو ایک حیات بخش روشنی ملی۔ اسی دوران اسلامی تحریک کا مطالعہ شروع کیا تو مجدد الف
ثانیؒ، سید اسمٰعیل شہیدؒ، سید احمدؒ کے علاوہ اخوان کی پوری تاریخ دیکھی۔ حسن البنا سے سید قطب
شہیدؒ تک ہر مجاہد کی داستان پڑھی۔ اسی وقت ملک میں ایمرجنسی کا نفاذ ہوا۔ جماعت کے افراد
قید و بند کی اذیتوں سے دوچار ہوئے۔ ان واقعات نے میرے جذبات میں شعلوں کی تپش
بھر دی۔ میری نظمیں "زیرِ لب"، "انتظار کرو" اور "نقشِ فریادی" انھیں جذبات کی آئینہ دار ہیں۔
انٹرمیجیٹ کیا تو امام باڑہ گرلس کالج چھوٹ گیا۔ عارضی طور پر مقامی اسکول میں ٹیچر ہوگئی
تھی ہی بی۔ اے کی تیاریاں بھی جاری رہیں۔ تعلیمی ضرورتوں کے پیش نظر مختلف اصنافِ ادب
کا مطالعہ کرنا پڑا۔ تنقیدی ادب بھی دیکھا اور شعری تخلیقات بھی۔ میرؔ و غالبؔ اور ذوقؔ و مومنؔ
کو فکری بصیرتیں دیکھتی ہوئی، "مردِ حق آگاہ" کے در پہ پہنچی۔ اقبالؔ کا "سوز دروں" مجھے اپنا
سوزِ دروں محسوس ہوا۔ اقبالؔ کو خوب پڑھا لیکن ان کے "افکار کی گزرگاہوں کی خاک کو
نہ پاسکی۔ میرا درس و تدریس کا سلسلہ دو تین سالوں تک جاری رہا۔ اس دوران میں نے بی۔ اے
کیا۔ پھر میری شادی ہوئی تو اسکول سے الگ ہوگئی۔ اب ایم۔ اے کی طالبہ ہوں اور دعاؤں
کی طلب گار۔

میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ غزل کی مٹھاس مجھے ہمیشہ پسند رہی۔

مگر ساتھ ہی "تنگستانِ غزل" کی شاکی بھی رہی۔ پھر بھی ڈاکٹر بجنوری کی طرح نہ اسے "نیم وحشی صنفِ سخن" سمجھا نہ رشید احمد صدیقی کی طرح اسے اردو شاعری کی "آبرو" قرار دیا۔ کبھی حیا تخلص کرتی تھی اب اس کی بھی گنہگار نہیں۔ چولہے چکی سے فرصت کہاں کہ شعر و شاعری کے لیے وقت نکال سکوں حسرت تو ہوں نہیں کہ "مشقِ سخن" بھی جاری رہے اور "چکی" کی مشقت بھی۔ کبھی طبیعت موزوں رہی تو کچھ کہہ دیا کبھی مہینوں "شہرِ خموشاں" کا سناٹا رہا۔

میرے ذہن کی تعمیر میں میرے والدین کا بڑا ہاتھ رہا۔ میرے مطالعہ کے لیے انھوں نے ہمیشہ بہتر کتابوں کا انتخاب کیا۔ ان کے مطالعہ سے میرے اندر راست فکری پیدا ہوئی۔ میرے چچا کا یہ احسان کم نہیں کہ میرے مطالعہ کی بیشتر کتابوں کی خریداری کا بار ان کے سر رہا۔

آخر میں ایک بات اور عرض کردوں گی۔ میری نظم "دعا" کا ایک مصرعہ یوں ہے ؏

اس سے پہلے کہ میں زنداں کو شبستاں سمجھوں

یہاں "زنداں" کا لفظ قدرے ہلکا ہے اس کی جگہ "مقتل" کر دیں۔ بات کچھ طویل سی ہو گئی سمع خراشی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اور غالب کے اس شعر کے ساتھ اجازت کی طلب گار ؏

بک گئی ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی !!

میرے دادا محترم عبدالستار صاحب اور والد محمد شمیم صاحب سلام عرض کرتے ہیں۔ چچی کو آداب بھائی بہنوں کو تسلیمات۔ طالب دعا۔ شائستہ شمیم۔

انمول ہیرا

کلیم جاوید

اس کہانی پر کلیم جاوید لکھا ہے۔ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی بچے نے کہیں سے نقل کر کے بھیجا ہے۔ اس لیے اسی بچے سے کہنا ہے کہ وہ بتائے کہ کلیم جاوید وہ خود ہے یا یہ اس کہانی کے مصنف کا نام ہے اور یہ کہ اگر یہ کہانی کہیں سے نقل کی گئی ہے تو حوالہ دے (م)

آج جب وسیم کالج گیا تو اس کا دل رو رہا تھا۔ وہ کلاس میں نہ معلوم کیسے بیٹھا رہا۔ پروفیسر جگدیش لکچر دے رہے تھے اور وسیم کی بے بس آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ پروفیسر جگدیش نے کچھ پریکٹیکل کمپلیٹ کرکے لانے کے لیے دیے تھے اور یہ کام تو آج وہ سبھی لڑکے کر لائے تھے جو روزانہ پروفیسر صاحب کی ڈانٹ سنتے تھے۔

آج وسیم نے پروفیسر صاحب کا دیا ہوا کام نہیں کیا تھا۔ کیا معلوم اسے یاد نہیں رہا ہوگا۔۔۔ یا اور کوئی دوسری الجھن کی وجہ سے وہ دیا ہوا کام نہیں کر سکا۔

وسیم ایک بہت غریب باپ کا لڑکا تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھا اکثر کرتا پیجامہ پہنتا تھا۔ اور ہوائی چپل۔۔۔ کالج میں دوسرے لڑکے نئے نئے فیشن کے کپڑے ہر روز بدل کر آتے تھے اور وسیم کی اس دردناک حالت پر اس کی ہنسی اڑاتے تھے۔ اس پر پان کھا کر تھوکتے تھے۔۔۔ لیکن وسیم بے چارا کچھ بھی نہیں بولتا تھا اور اپنی اس حالت کو دیکھ کر وہ خود ہی اپنی آنکھوں سے مجبوری۔ بے بسی و مفلسی کے آنسو بہا لیتا تھا۔

وسیم کلاس میں بھی سب سے پیچھے بیٹھتا تھا لیکن وہ پڑھائی میں سب سے آگے تھا۔ ہر سال پوری کلاس میں فرسٹ آتا تھا۔ وسیم سے لکچرر بھی بہت خوش تھے۔

کالج میں وسیم کی اتنی کمزور حالت دیکھ کر پروفیسروں کو بھی وسیم پر بہت ترس آتا تھا۔

ایک مرتبہ کلاس میں پروفیسر صاحب نے پوچھا۔۔۔ بتا ؤ راکیش انسان کے جسم سے خون کیسے نکالا جا سکتا ہے۔ راکیش چپ کھڑا رہا وہ پروفیسر صاحب کے سوال کا جواب نہیں دے

سکا۔ اس طریقہ سے پروفیسر صاحب نے ایک ایک کرکے ہر لڑکے سے سوال کیا مگر کوئی بھی جواب نہیں دے سکا۔ آخر میں پروفیسر صاحب نے سب سے پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے سے پوچھا۔ بتاؤ وسیم۔۔۔ وسیم پہلے تو کچھ شرمایا اور کہنے لگا۔

"سر انسان کے جسم سے خون ایک طریقہ سے نکالا جا سکتا ہے۔ جسم پر ایسی کوئی باریک چیز چبھوئی جائے جو کھال کو چبھوتی ہوئی خون کی نس کو چھو دے۔"

پروفیسر نے گردن نیچی کرتے ہوئے کہا گڈ وسیم بیٹھ جاؤ۔

پروفیسر صاحب نے کھڑے ہوئے لڑکوں پر بہت غصہ کیا انھیں ڈانٹنے لگے۔ دل ہی دل میں لڑکے وسیم سے جل رہے تھے۔ وسیم بھی دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہو رہا تھا۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے سب لڑکوں کو ڈانٹ سننا پڑ رہی تھی۔ پیریڈ ختم ہونے کے بعد سب لڑکوں نے وسیم کو مارنے کا پلان بنایا جب کالج سے چھٹی ہوئی تو سب لڑکے کالج کے گیٹ پر جمع ہو گئے جب وسیم نکلا تو اس پر ایک لڑکے نے پان کھا کر تھوکا وسیم بے چارا کچھ نہ بولا چپ چاپ چلا گیا۔۔۔۔ جب لڑکوں نے یہ دیکھا تو دو تین لڑکے آگے بڑھے اور اسے دھکا دیا وہ بے چارا گر پڑا بس اس غریب کا گرنا تھا کہ سب لڑکوں نے اس کی خوب پٹائی کی۔ وسیم کے سر سے خون بہنے لگا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سب لڑکے آس پاس کھڑے ہو کر وسیم کو مار رہے تھے اور پوچھ رہے تھے۔ بتا خون کیسے نکالا جاتا ہے۔

وسیم بے چارا مار کھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا میں بے قصور ہوں راجیش بابو۔۔۔ میں بے قصور ہوں لیکن راکیش، راجیش، رشید، دیپک ان سب لڑکوں نے اسے اتنا مارا کہ وہ بیچارہ بے ہوش ہو گیا۔ جب لڑکوں نے یہ دیکھا تو سب لڑکے وہاں سے چلے گئے۔ وسیم ابھی بے ہوش ہی پڑا تھا۔

جب پروفیسر جگدیش آفس کا سارا کام ختم کرکے گھر کو چلے تو انھوں نے سامنے زخمی

وسیم کو خون میں لت پت پڑا ہوا دیکھا وہ فوراً اپنی گاڑی روک کر نیچے اُترے اور وسیم کو گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گئے۔

پروفیسر جگدیش حیران تھے وہ سوچ رہے تھے آخر اسے کس نے مارا ہے پروفیسر جگدیش نے وسیم کے گھر پر خبر کی اور وہ اپنے گھر چلے آئے۔

دوسرے دن روزانہ کی طرح کالج کا سب لڑکے بیٹھے ہوئے تھے پروفیسر جگدیش آئے۔ انھوں نے حاضری کی سب لڑکے حاضر تھے صرف وسیم غیر حاضر تھا اس دن پروفیسر صاحب کا دل بھی پڑھانے میں نہیں لگا وہ شام کو کالج چھوٹنے کے بعد ہی اسپتال پہنچے انھوں نے دیکھا کہ وسیم بے ہوش ایک پلنگ پر پڑا ہوا ہے اس کے سر اور پیروں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر پروفیسر جگدیش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ وسیم کے پاس بیٹھ گئے۔

پروفیسر جگدیش وسیم سے کچھ پوچھنے ہی والے تھے کہ پاس میں کھڑے ڈاکٹر کی آواز نے انھیں، چونکا دیا۔ بس آپ مت بولئے، وہ بے ہوش ہے۔

وسیم کے سرہانے وسیم کا بوڑھا باپ بیٹھا ہوا تھا اس کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل رہے تھے۔ پروفیسر جگدیش نے وسیم کے باپ کو دلاسا دیا اور کچھ روپے پیسے اور اس کے چہرے پر آنسو بہاتے ہوئے وہ واپس اپنے گھر چلے آئے گھر پر تو آج کھانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

جب پروفیسر جگدیش اپنے کمرے میں سونے کے لئے گئے تو انھیں پھر وہی وسیم کی صورت آنکھوں میں آ گئی۔ وہ سوچنے لگے کتنا سیدھا ہے وسیم اپنے سیدھے راستے سے نیچی نظریں کئے ہوئے کالج آنا اور چلے جانا کسی سے بغیر کام نہ بولنا۔ وہ بے چین ہوتے رہے۔ کروٹیں بدلتے رہے۔ انھیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ آخر وہ پریشان ہو گئے اور رات کے ۲ بجے اٹھ کر وسیم سے ملنے اسپتال پہنچے تو پروفیسر جگدیش نے دیکھا کہ وسیم کے آس پاس ڈاکٹر کھڑے ہیں اور اسے آکسیجن دی جا رہی ہے۔

پروفیسر جگدیش ڈاکٹر سے کہنے لگے ڈاکٹر
صاحب آپ کسی بات کی پروا نہ کیجئے۔ آپ اس
کی جان بچا لیجئے، اگر اس کی جان بچانے میں مجھے
جس طرح کی قربانی دینا پڑے میں وہ قربانی
دینے کو تیار ہوں ڈاکٹر صاحب... ڈاکٹر نے
کہا ہم تو پوری کوشش کر رہے ہیں یعنی ہم نے
اس کو ایک انجکشن لگایا ہے اگر اس سے ان کو
۲۰ منٹ میں ہوش آیا تو ٹھیک ہے ورنہ...
اتنا کہہ کر ڈاکٹر رک گیا... پروفیسر جگدیش نے
ڈاکٹر سے کہا آپ رک کیوں گئے بولیے نا ڈاکٹر
صاحب... ورنہ.. کیا ہوگا۔

ڈاکٹر دھیمی آواز میں یہ کہہ کر چلا گیا۔ ورنہ
آپ کو کالج کے رجسٹر سے ان کا نام کاٹنا پڑیگا۔
پروفیسر جگدیش ۲۰ منٹ کا انتظار بڑی
بے چینی سے کر رہے تھے۔ آخر ان کی بھی
انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں... وسیم نے آنکھیں
کھول دیں۔ وسیم نے پروفیسر جگدیش کی طرف
دیکھا اور کہا

سر آپ راکیش، راجیش، خورشید، دیپک
اور کلاس کے سب لڑکوں کو معاف کر دینا
انھیں کچھ مت کہنا سر... آپ مجھ
کرو سر، پروفیسر جگدیش نے بھرائ
لہجے میں کہا... ہاں بیٹے میں وہ
میں انھیں کچھ بھی نہیں کہوں گا...
پھر کہنے لگا سر اب میں ٹھیک نہیں
گا... سر اب میں کبھی کالج نہیں آ
سر میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ لڑکے ابھی
... نا سمجھ ہیں... انھیں کچھ مت ک
انھیں معاف کر دینا سر... پروفیسر
نے وسیم کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے

نہیں بیٹے تم بالکل ٹھیک ہو جا
وسیم آنسو بھری آنکھوں سے اشارا کر

نہیں سر میں بالکل سچ کہہ رہا ہو
میں... کبھی... ٹھیک... ٹھیک
کہہ کر وسیم کی گردن لٹک گئی... اور
... ہمیشہ... ہمیشہ... کے لیے..
کی نیند سو گیا۔

دوسرے دن جب کالج لگا تو
کالج میں وسیم کی موت کی خبر پھیل گئی۔
لڑکوں نے وسیم کو خراج عقیدت پیش

آخر میں پروفیسر جگدیش نے وسیم کے بارے میں کہا۔

وسیم ایک ہونہار لڑکا تھا وہ بہت غریب تھا اس نے آج تک کالج میں کسی بھی ٹیچر کی طرف نظر اٹھا کر بات نہیں کی۔ پروفیسر جگدیش ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے وہ روندھی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے کہ آج وسیم کی موت کے ذمہ دار ہمارے ہی کالج کے کچھ لڑکے ہیں جنہوں نے کچھ دنوں پہلے اُسے پیٹا تھا جس کی وجہ سے وہ مر گیا مرتے وقت اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ آپ اُن لڑکوں کو معاف کر دینا۔

آج وسیم تو اس دنیا میں نہیں ہے لیکن پھر بھی اس کی صورت میری آنکھوں میں ہے۔ آج ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کالج کا کونا کونا ہر چیز اس کی موت سے اُداس ہے اور اُسے خراج عقیدت پیش کر رہی ہے۔

ابھی پروفیسر جگدیش پوری بات کہہ بھی نہ سکے تھے کہ ان مجرم لڑکوں کا ایک گروہ روتا ہوا پروفیسر جگدیش کے قدموں میں سر جھکا کر، و گڑگڑا کر کہنے لگا سر ہمیں معاف کر دو۔ وسیم کی موت کے ذمہ دار ہم ہیں سر

پروفیسر جگدیش نے کہا۔ معاف تو تمہیں مرتے وقت وسیم ہی کر گیا تھا۔۔ لیکن تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آج تم نے اپنے ہاتھوں سے ایک ہیرا کھو دیا ہے۔ جو ہیرا اب تمہیں کبھی نہ مل سکے گا۔ اتنا کہہ کر پروفیسر جگدیش آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے چلے گئے۔

لیکن آج وسیم کو اس دنیا سے منہ پھیر کر گئے ہوئے پچیس دن ہو گئے ہیں جب کبھی پروفیسر جگدیش حاضری لیتے ہیں تو ان کے منہ سے وسیم کا نام نکل ہی جاتا ہے اور وہ اداس ہو جاتے ہیں لڑکوں سے سوال پوچھتے ہیں تو پوری کلاس کھڑی ہو جاتی ہے۔ تو پھر وہ کہہ دیتے ہیں تم بتاؤ وسیم۔۔۔

آج بھی وہ ٹیبل سونی پڑی رہتی ہے جس پر وسیم بیٹھا کرتا تھا۔

میرا پسندیدہ مشغلہ

کوثر پروین متعلم درجہ ہشتم زینت محل اسکول۔ دہلی ملہ 6

محترمی سلام مسنون۔ ہمارے اسکول میں مندرجہ بالا عنوان پر طالبات سے رائے مانگی گئی کہ آپ کا پسندیدہ مشغلہ کیا ہے۔ اس پر میرا جواب یہ تھا۔

میرے خیال میں ہمارا پسندیدہ مشغلہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم دوسروں کے کام آئیں۔ اور اپنا ضرور دوسروں کی بھلائی کے کاموں میں گذاریں۔ صحیح معنوں میں اچھا انسان تو وہی ہے جو انسانوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہو۔ اسی لیے ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اچھے کی یہ پہچان بتائی — جو کچھ اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرتا ہے۔

مردوں کے لیے تو خدمت کے کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مگر ہم خواتین بھی اگر چاہیں گھر اپنے پڑوس اور اپنے عزیزوں رشتہ داروں کے ساتھ اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ بہت سے کے کام کرسکتی ہیں۔

ہم اگر چاہیں تو اپنی کلاس کی غریب اور ضرورت مند سہیلیوں کو ان کے اسکول کی ضرور چیزیں وقتاً فوقتاً دے سکتی ہیں۔ کاپیاں، کتابیں، قلم، جومیٹری بکس وغیرہ تحفتاً ایسے انداز اور سلیقے دیے جاسکتے ہیں۔ جس سے آپس میں محبت بھی بڑھے اور لینے والی کو کسی طرح کا احساس کمتری ہم ان بچوں اور سہیلیوں کو جو تعلیم میں کمزور ہیں۔ ان کی مدد کرسکتے ہیں۔ ان کا ہوم ورک ان کو کرائیں تاکہ وہ اپنی تعلیم کو خوبی کے ساتھ جاری رکھ سکیں۔

ہم خواتین اگر چاہیں تو پاس پڑوس میں ہونے والے لڑائی جھگڑے کافی کم ہو سکتے ہیں

ہیں نا اتفاقی چل رہی ہے تو ہم کوشش کر کے صلح صفائی کرا سکتے ہیں۔ ہم اگر چاہیں تو قریب اور غریب پڑوسیوں کی روزمرہ کی ضرورت کی چیزوں کے ذریعے مدد کر سکتے ہیں۔ کسی بے پڑھی عورت کا خط لکھ دینا اور اس کے پاس آیا ہوا خط پڑھ دینا........ مجھے یہ بہت پسند ہے اور ساتھ ہی مجھے یہ بھی پسند ہے کہ کسی کا خط میں نے پڑھ کر سنایا ہو، یا کسی نے مجھ سے خط لکھوایا ہو تو میں اس کے مضمون کو کسی پر ظاہر نہ کروں۔ تاکہ کسی کے گھر کے بھید ہوں وہ راز ہی رہیں۔

ویسے مجھے یہ بھی پسند ہے کہ پاس پڑوس کا کوئی بچہ اگر گندا رہتا ہو تو میں اس کا منہ دھلا دوں اس کے کنگھا کر دوں۔ اس کے ناخن تراش دوں۔ بھلائی کے ان چھوٹے چھوٹے کاموں کو کرنے سے بھی کتنا قلبی روحانی سکون ملتا ہے۔

محلے کی خواتین کو اگر لباس کی تراش خراش کے معاملے میں شوہر کی خواہش ہو یا کپڑے کا میٹر اور سینٹی میٹر کے حساب سے تخمینہ پھیلانا ہو تو میں اس کام میں بھی ان کا ہاتھ بٹانا پسند کرتی ہوں۔ سوئٹر کا ڈیزائن اگر مجھ سے نہ آتا ہو تو محلے کی جس لڑکی سے آتا ہوگا۔ میں اس سے معلوم کر کے بتا دوں گی۔ اسی طرح مجھے یہ بھی پسند ہے کہ اگر گھر میں، یا پڑوس میں یا سہیلیوں میں سے کسی کی طبیعت خراب ہو تو اس کی مزاج پرسی کروں۔ پاس بیٹھ کر اس کا سر دبا دوں۔ وقت ہو رہا ہو تو اپنے ہاتھ سے دوا دوں۔

ویسے خون دیکھ کر مجھے بہت گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اور اگر محلے کے کسی بچے کے چوٹ لگ جائے۔ خواہ گرنے سے یا لوہے کی کوئی چیز لگ جانے سے۔ اور اس کے خون بہنے لگے تو میرے دل میں درد ہونے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آناً فاناً یہ خون رک جائے۔ اس لیے میرا مشورہ ایسے وقت یہ ہوتا ہے کہ اسے فوراً ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔

دوسری بات یہ ہے کہ تھوڑا بہت فرسٹ ایڈ کا سامان مرہم پٹی وغیرہ ہر گھر میں ہونا چاہیے اور ابتدائی مرہم پٹی گھروں میں ہی کر دینی چاہیے کیونکہ بعض اوقات ڈاکٹر کے ہاں پہنچنے تک بہت سا خون بہہ جاتا ہے۔ خدا کرے آگے جا کر میرا دل اتنا مضبوط ہو جائے کہ میں ہنگامی موقع پر مرہم پٹی بھی

خود ہی کر دیا کرو۔ اس طرح سے مجھے نہ صرف بیمار کی تیمارداری کا ثواب ہی ملے گا بلکہ اس کی مد
کا ثواب بھی ملے گا۔

ابھی تو میں تعلیم میں مگن ہوں اور باورچی خانے سے زیادہ واسطہ نہیں رہتا ہے۔ اللہ تعا
سلامت رکھے امی جان نے سارا کام اکیلے ہی سنبھال رکھا ہے لیکن آگے جا کر میں ایسے کھانے
پکانے ضرور سیکھوں گی جو کم قیمت اور بلا تکلف ہوں۔ جنھیں تھوڑی لاگت سے اور کم وقت میں تیار
ہو۔ ایسے کھانے خواہ کتابوں کے ذریعے سیکھے جائیں، یا تجربہ کار خواتین سے مجھے سیکھنے پڑ
میں سیکھوں گی ضرور۔ اور پھر میں اوروں کو بھی سکھاؤں گی۔

کسی بچے کو محبت کے ساتھ کلمہ یاد کرا دینا۔ یا نماز سکھا دینا یا غسل کا طریقہ بتا دینا یا کوا
ایسا کام بتا دینا جو ہمارے روزمرہ کام آتا ہو۔ یہ بھی خیر کے کام ہیں۔ اسی طرح کوئی اچھی با
اچھی کتاب سے پڑھ کر ہم کسی کو سنا دیں۔ یا پڑھی لکھی خواتین کو اچھی کتابیں پڑھنے کے
دیں تو یہ بھی بہت اہم کام ہے۔ کیونکہ اس ذریعے سے بہت سے غلط خیالات کی اصلاح
ہے۔ اور صحیح باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ اور ہمارے لیے یہ خوش نصیبی کی بات ہوگی۔ کہ اللہ نے ہمارے
سے اس تک سچائی پہنچا دی۔

غرض خدمت کا دائرہ بہت بڑا ہے۔ میں ان سب کاموں کو اچھا سمجھتی ہوں۔ کچھ کوا
کچھ چھوٹ بھی جاتے ہیں۔ مگر خواہش یہی ہے کہ میں بھی اور میری سہیلیاں بھی سب اچھے اور
کے اور خدمت کے کاموں میں دلچسپی لیں اور اپنی ذات سے دوسروں کو بھی فیض پہنچائیں۔ ا
ہماری دنیا بھی اچھی بنے گی اور آخرت کی بھلائی بھی حاصل ہوگی۔ انشاء اللہ۔ فقط کوثر پروین۔

• ہم اگر چاہیں تو غریب اور شریف پڑوسیوں کی روزمرہ کی ضرورت کی چیزوں کے ذریعہ مدد کر سکتے
•• اگر ہم چاہیں تو روزمرہ کی ضرورت کی چیزوں کے ذریعہ غریب اور شریف پڑوسیوں کی مدد کر سکتے ہ

شخصیت کی تربیت

(۱) حضرت عمرؓ کا دستور تھا کہ جب لوگوں
کو کسی چیز سے روکتے تو اپنے گھر والوں کو جمع
کر کے فرماتے کہ میں نے فلاں فلاں چیز سے
منع کیا ہے اور لوگ تمہاری طرف ایسے ہی
دیکھ رہے ہیں جیسے پرندہ گوشت کی طرف
دیکھتا ہے اگر تم بچو گے تو وہ بھی بچیں
گے اور تم مبتلا ہو گے تو وہ بھی مبتلا ہوں گے
اگر تم میں سے کسی نے منع کی ہوئی باتوں کا
ارتکاب کیا تو اپنے تعلق کی وجہ سے خدا کی قسم
میں اس کو دگنی سزا دوں گا۔ اسے اختیار ہے
جو چاہے آگے بڑھے اور جو چاہے پیچھے ہٹے۔

(۲) کوفہ والوں کی جانب سے حضرت عمرؓ
اکثر پریشان رہتے تھے۔ اگر ان پر کوئی نرم
حاکم بنایا جاتا تو اس کو کوئی اہمیت نہ دیتے
اور سخت آدمی کو متعین کیا جاتا تو اس کی
شکایت کرتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ تنگ آکر کہا

"کاش مجھے کوئی قوی امانت دار آدمی
ملتا تو میں اس کو کوفے والوں پر حاکم بناتا"

ایک شخص نے عرض کیا۔

"خدا کی قسم میں آپ کو ایسا ہی آدمی بتاتا
ہوں جو قوی امین مسلمان اور بڑی خوبیوں
کا مالک ہے"

پوچھا وہ کون ہے؟

جواب دیا عبداللہؓ (آپ کے صاحبزادے
ہیں) یہ سنکر فرمایا:

"اللہ تجھے محروم کردے"

(۳) یرموک کی لڑائی میں حضرت خالدؓ بن
اسلامی فوج کے سپہ سالار تھے اور حضرت ابو
بن جراح ان کے ماتحت افسر تھے۔ خلیفہ ہو
کے بعد حضرت عمرؓ نے خالدؓ کو معزول کر

ابوعبیدہ بن جراح کو سپہ سالار مقرر کیا اور خالدؓ کو
ان کے ماتحت کر دیا۔ یہ فرمان میں اس وقت
پہونچا جب کہ لڑائی آخری مرحلے میں پہونچ کر
فتح ہونے والی تھی۔ حضرت ابوعبیدہؓ فرمان خلافت
کے مطابق خود سپہ سالاری کا جھنڈا اپنے ہاتھ
میں لے کر فتح کا کریڈٹ خود حاصل کر سکتے
تھے لیکن انھوں نے اس فرمان کو چھپایا اور
خالدؓ کی ماتحتی میں بدستور اپنے کو باقی رکھا یہاں
تک کہ فتح کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے ایسا
کیوں کیا اور موقع پا کر فتح کا کریڈٹ خود کیوں
نہ حاصل کر لیا تو جذبات و خواہشات کی قربانی
دینے والے نے جواب دیا۔

"میں دنیا کی بڑائی نہیں چاہتا اور
نہ دنیا کے لیے عمل کرتا ہوں"

ادھر یرموک کی فتح کے بعد جب یہ خبر
پھیلی کہ اس جنگ عظیم کے فاتح کو سپہ سالاری
سے معزول کر دیا گیا تو لوگوں کے اندر سخت
بے چینی پیدا ہوئی اور بعض نے خالدؓ کو ابھارا
کہ آپ خلیفہ کا حکم نہ مانیں۔ آپ کے ساتھ
کافی لوگ ہیں۔ مگر خالدؓ نے اس مشورہ کو
ماننے سے انکار کر دیا اور برضا و رغبت ابو
بن جراحؓ کی ماتحتی میں ایک معمولی فوجی
اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف لڑتے رہے۔
اس وقت انھوں نے جو جملہ کہا وہ تاریخ
ان الفاظ میں محفوظ رکھا۔

"میں عمرؓ کی راہ میں جنگ نہیں
کرتا بلکہ عمرؓ کے رب کی راہ میں
جنگ کرتا ہوں"

(۴) حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی میں کبھی بڑائی
کے جذبات نہ ابھرنے دیے۔ بلکہ ان سے بڑا
خدمتِ خلق اور رفاہِ عام کے کام لیتے رہے
یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک رات گشت کر رہے
تھے کسی گھر سے دردِ زہ میں مبتلا عورت
کے کراہنے کی آواز سنی۔ فوراً واپس آ کر اپنی
بیوی "ام کلثوم" کو خدمت کے لیے لے گئے
جو نسوانی امور کی نگہداشت کرتی رہیں۔ یہاں
تک کہ فراغت ہو گئی۔

(۵) مشہور صحابی حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ
کی ذرا سی غفلت پر انھوں نے کوڑا مارا

انھوں نے کہا۔

امیر المومنین! میری اس ادنیٰ سی غلطی کو آپ نے اتنا محسوس کیا اور خود کی بڑی غلطی پر آپ نے معاف کر دیا۔ فرمایا۔ عبدالرحمٰن! تم رسول اللہ کے عظیم صحابی ہو۔ ڈر ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ معمولی سی بھول دوسروں کے لیے نمونہ بن جائے۔

حضرت عمرؓ اس طرح اپنی اپنے گھر والوں کی اور مسلمانوں کی تربیت فرماتے تھے چنانچہ آپ کے زمانے میں بڑی بڑی شخصیتیں ابھریں۔ (انتخاب ۔)

غزل

...... (ابوایوب انصاری عاصی)

نقوش پا جو چھوڑ کے پھر نہ ان کو لوٹ کر دیکھو
بڑھو آگے بڑھو آگے یہی تا حد نظر دیکھو

صدا ہر رہگزر پر دے رہا ہے راہبر دیکھو
سفر سے پیشتر تم اک نظر زاد سفر دیکھو

فنا سی بات ہے بہر خدا تم مان کر دیکھو
کبھی پردہ اٹھا کر تم مرا ذوق نظر دیکھو

مذاق اچھا نہیں ان دل جلوں سے اس قدر دیکھو
جلا کر خاک کر ڈالا جنہوں نے اپنا گھر دیکھو

فدا سمجھو یہ دیوانے نہیں ہیں بے خبر دیکھو
اٹھاؤ سنگ جب تو پیشتر تم اپنا سر دیکھو

بھٹکتے پھر رہے ہیں جو پریشاں حال خستہ دل
یہی گم کردہ منزل کبھی تھے راہبر دیکھو

گر تم کو ہی نہیں ہے حاصل نظارۂ رنگیں!
جو فرصت ہو کبھی آ کر مرا زخم جگر دیکھو

ملاقاتوں سے مانا آپ کو فرصت نہیں لیکن!
لڑکپن کے کبھی ساتھی کا کبھی حال جگر دیکھو

ضرورت پر بہت ممکن ہے جاں بھی نذر کر دی ہو
قدم اس راہ میں رکھنا نہیں آسان تر دیکھو

نظر آتا ہے پھر کیا سنگ در سجدہ کر پیشانی
کبھی تم بحر عرفاں میں بھی عاصی ڈوب کر دیکھو

لوہار کی بیٹی

صدیق عالم

"ارے آفت کے پرزو! ذرا ٹھہر دو تو!
مجھے دم تو لینے دو!" میرے کانوں میں ایک عورت کی آواز آئی اور میں نے سر موڑ کر دیکھا۔

کچھ فاصلے پر مجھے دو "آفت کے پرزے" لڑھکتے دکھائی دیے۔ ایک بچہ اور ایک بچی۔ بچے کی عمر سات سال کی ہوگی اور بچی کی عمر کا صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا۔ شاید دونوں ہم عمر تھے دونوں ایک ہی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ یہاں تک کہ ان کی تراش بھی ایک تھی۔ بچے کے سر پہ ایک سرخ اونی ٹوپی تھی اور لڑکی کے بال پیلے فیتوں سے گوندھے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے تھوڑے فاصلے پر ایک فربہ تن اور جوان عورت نمودار ہوئی۔ وہ ہانپتے کانپتے بڑی مشکل سے چل پا رہی تھی۔ اس کے سر پہ ایک سیاہ رومال بندھا ہوا تھا اور اس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔

"ارے شیطان! ذرا سستا تو لینے دو"
یہ کہہ کر وہ دھم سے زمین پر بیٹھ گئی اور لمبی سانسیں بھرنے لگیں۔

"ہاں ہم تو چلے چٹانوں میں کھیلنے تم رہو۔" بچے نے اس کی بات کا جواب دیا اور ہاتھ پکڑ کر بولا: "چل عشرت، میں تیرے لیے مونگے تلاش کروں گا اور تو میرے لیے گھروندے بنائے گی۔ کیوں؟" اور دونوں سمندر کی طرف بھاگ گئے۔

"تم نے روکا نہیں انھیں؟" میں نے اس موٹی عورت سے کہا۔ "اگر وہ موجوں میں کھو گئے تو؟"

"خدا نہ کرے!" اس نے پلٹ کر جواب

مگر ڈرنے کی کوئی بات نہیں وہ دونوں میرے بہت پیارے بچے ہیں۔ بے خطر، شرارتی۔ اگرچہ ان میں سے صرف ایک کو ہی میں نے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے۔"

"اچھا!" میں اس کی طرف کھسک گیا۔ "مگر دونوں کے چہرے ایک دوسرے سے کس قدر ملتے ہیں؟"

"ہاں!" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "آخر دونوں ہیں نا۔ سگے بھائی بہن۔"

میری سمجھ میں اس کی الٹی سی بات نہیں آئی۔ جب اس نے صرف ایک ہی کو اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے۔ تو دونوں کیسے بھائی بہن ہو سکتے ہیں۔ میں نے اس کی ممتا کی روشنی سے تمتاتی ہوئی خود غرض آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی: "تم ذرا تفصیل سے ان کے بارے میں بتاؤ۔ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔"

اس نے فوراً جواب دینے کی بجائے اپنی بھدی ٹانگوں پر نظر ڈالی، جو ساڑی سے باہر نکل آئی تھیں، اور بدستور گری ہوئی تھیں۔ ایک بار پھر کنارِ سمندر کی طرف تاکا پھر بندرگاہ کی اکا دکا روشنیوں کو دیکھتی رہی: "آہ یہ دکھی زندگی! گزشتہ کل سے ہمارا کتنا اٹوٹ رشتہ ہے! تم سنو گے ہم لوگوں کی داستان؟ مزہ تو نہیں۔ پھر بھی سنو۔"

"تم نے ابھی جس بچی کو دیکھا ہے، اسے ہی میں نے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے، اس کا نام عشرت ہے اور بچے کا نام ہے الطاف... خیر اس لڑکے کا ذکر بعد میں آئے گا۔ پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ میں کون ہوں۔"

"میں ایک لوہار کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ اب بھی زندہ ہے مگر سر سے پاؤں تک اس کا جسم مفلوج ہو چکا ہے۔ اسرائیل کا نام تم نے سنا ہوگا تو میں اسی کی بیٹی ہوں۔ آج سے بارہ سال پہلے اس نے گودی کے ایک مزدور سے میری شادی کر دی۔ اس کا نام احمد تھا۔"

"تو وہ مر چکا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔" ایک منٹ کے لیے اس کا سر خاموشی سے سینے پر لٹکا رہا۔ میں اپنے سوال پر شرمندہ ہو گیا۔

اس نے کہنا شروع کیا: "ہماری ازدواجی
زندگی بڑی خوشگوار تھی۔ احمد مجھ پر جان چھڑکتا اور
میں بھی حتی الامکان اسے خوش رکھنے
کی کوشش کرتی۔ شادی سے پہلے وہ شراب
پیتا تھا مگر بعد میں میرے کہنے پر اس نے
شراب پینا چھوڑ دیا۔ میں یقین سے نہیں کہہ
سکتی کہ اس نے شراب پینا بالکل ترک کر دیا
ہوگا۔ وہ ضرور پیتا ہوگا۔ مگر وہ گھر میں کبھی نہیں
پیتا، نہ پی کر آتا۔ وہ دن بھر کا تھکا ماندہ جب
گھر لوٹتا تو یہ پوچھنا کبھی نہ بھولتا: کہو ماہ لقا!
دن اچھا گزرا؟" میں مسکرا کر اس کا استقبال
کرتی۔ ہماری زندگی بہت عمدہ گزر رہی تھی
ادھر میں دیکھتی وہ کچھ زیادہ پیسے لانے لگا
تھا۔ وہ مجھ سے کہتا: عائشہ! خبردار جلد بچہ مت
پیدا کرنا۔ بڑی بھیانک بات ہے یہ!"
"چار سال گزر گئے۔ ہماری ازدواجی زندگی
میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ مگر مجھے ایسا
محسوس ہونے لگا کہ جیسے اس کی دلچسپی یکایک
مجھ سے ختم ہو چلی ہو۔ پہلے پہل تو میں نے
اسے اپنا وہم سمجھا مگر دھیرے دھیرے سب
باتیں ظاہر ہونے لگیں۔ اب اس کا
دکھ دینے والا ہوتا اور عجیب بات
میں بھی اس کا سرد مہری سے استقبال کرتی
لگی تھی۔ وہ شراب پی کر گھر آنے لگا۔
پیسے گھر لانے لگا اور اس نے گھر پر
شراب پینا شروع کر دیا۔ شراب پی کر وہ
خوفناک ہو جایا کرتا اور مجھے پیٹنے لگتا
اس کا نشہ ٹوٹتا وہ معافی مانگ لیتا
اسے معاف کر دیا کرتی۔ ہم عورتوں میں
ایک کمزوری ہوتی ہے کہ ہم شوہروں کو
جلد معاف کر دیا کرتی ہیں۔ اگرچہ یہی
بعد میں ہمارے گلے کا پھندا ثابت ہوا
ایک رات جب وہ گھر لوٹا تو اس
ایک جوان عورت تھی: تم اسے د...
اس نے مجھ سے کہا: تم اپنے باپ کے
"کیوں جاؤں؟" میں نے غصے سے
ہوتے کہا: اس چڑیل کو میں کبھی اس
برداشت نہیں کر سکتی۔"
"کیا؟" وہ گلا پھاڑ کر چلایا۔ اس نے
گردن سے پکڑ کر دھکیلا ... دھتکار دیا

کمینوں سے میرے جینے کو جانتے لگا۔ بھاگ جا کتیا! اپنے باپ کے گھر بھاگ جا۔ اب تیرے لیے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں۔" اس نے مجھے دھکا دے کر گھر سے باہر نکال دیا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ بہت دیر تک میں دروازے پر کھڑی روتی رہی اور جب اس نے دروازہ نہ کھولا تو اپنے باپ کے گھر چلی آئی۔ یہ سوچ کر میں نے خاموشی اختیار کر لی کہ شاید وہ معافی مانگنے آئے۔ مگر وہ نہیں آیا اور مجھے اس کے بارے میں طرح طرح کی خبریں ملنے لگیں۔ میرا باپ یہ سب خبریں لا لا کر مجھے دیتا۔ وہ بڑھتی عمر کے ساتھ بہرا ہو چکا تھا۔ صبح سے شام تک وہ دکان میں دھونکنی کے سامنے بیٹھا کام کرتا رہتا اور رات کو بے سدھ سو جاتا۔

میں نے کئی بار اپنے شوہر کے گھر جانے کی کوشش کی مگر ہمت نہ ہوئی۔ آخر کار ایک شام ہمت کر کے نکل ہی پڑی۔ اس کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ میں اس کا انتظار کرنے لگی۔ آدھی رات کو وہ آیا۔ اس کے ساتھ وہی عورت

مجھ سے وہ سب دیکھا نہ گیا اور میں وہاں سے بھاگ آئی۔

بعد میں مجھے خبر ملی کہ اس نے اس عورت کو مستقل طور پر گھر میں ڈال لیا تھا۔

تم سوچتے ہو گے کہ آخر کار میں نے اپنے مرد کا سامنا کیوں نہ کیا؟ اپنے حق کا استعمال کیوں نہ کیا؟ مگر تم نہیں جانتے ہم عورتوں کے دل میں کتنا شدید خوف بھرا ہوتا ہے۔ مردوں کی مار کا خوف نہیں بلکہ دوبارہ اسی دہلیز سے نکالے جانے کا خوف جس سے وہ ایک بار نکالی جا چکی ہو۔ جب بھی میں نے اس قسم کا کوئی ارادہ کیا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دوبارہ گردن سے پکڑ کر گھر سے باہر کر دے گا۔ وہ عورت مجھ پر دانت نکال کر ہنسے گی اور میں ایک بار پھر روتی ہوئی بھاگ جاؤں گی۔ پھر وہاں جانے سے حاصل؟

قدرت کی ستم ظریفی دیکھو۔ ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ میرا شوہر عرشے پر کام کرتے ہوئے ایک بھاری بھرکم زنجیر کی زد میں آکر

میرے دل کو پتھر بنا دیا تھا۔ میں اپنے اصلی گھر
گئی اور اس عورت کو نکال باہر کیا۔ وہ روتی
چلاتی رہی مگر میں نے اس کی ایک نہ سنی۔ وہ
چلی گئی۔ کہاں؟ یہ مجھے معلوم نہیں۔ وقت
گزرتا گیا۔ اسی سال خزاں کے موسم میں میری
بچی عشرت پیدا ہوئی۔ خلاف توقع ایک نئی
مسرت پاکر میری زندگی نہال ہو گئی۔ سب
کچھ کھو کر بھی میں نے سب کچھ پالیا اور میں
نے اپنا سارا پیار اس پر نچھاور کر دیا۔"

"جب عشرت چار ماہ کی ہوئی تو یکایک
وہی چڑیل ایک اُبھرا ہوا پیٹ لے کر نمودار
ہوئی۔ میں اس وقت اپنے گھر کے آنگن
میں بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی۔ اس نے آتے
ہی میرے گھٹنے پکڑ لیے اور رو رو کر کہنے لگی
کہ اس کے پیٹ میں میرے شوہر کا بچہ ہے
اور میں اسے صرف مہینہ بھر کے لیے اپنے
گھر میں جگہ دے دوں۔ مگر میں نے دھکیل کر
اسے گھر سے باہر کر دیا اور سختی کے ساتھ
دروازہ اندر سے بند کر لیا۔"

"وہ رات سرد اور کہرے میں ڈوبی ہوئی
تھی۔ اس نے میرے گھر کے پچھواڑے
سائبان کے نیچے ایک بچے کو جن
یا۔ مجھے میں رات بھر اس کا چیخنا کراہنا
مگر میرا دل نہ پگھلا۔

مگر صبح جیسے ہی میری نظر اس
ہوئی ٹھنڈی لاش پر اور اس کی گود
ہوئے نوزائیدہ بچے پر پڑی جو اس
کی طرح بے حس سینے سے چپکا ہوا تھا
میرا دل پگھل گیا۔ میری آتما نے مجھے ز
کیا۔ میں نے اس کی تجہیز و تکفین کی ا
کو اپنا لیا اور اس کا نام انور رکھا۔ تو بچ

اس نے اپنی آنکھیں موند لیں
اب وہ کبھی نہ کھولے گی۔ بچے لوٹ
انھیں لیکر چلدی۔ مڑ کر میری طرف دیکھ
"آپ سمجھے، یہ دونوں میرے بچے ہیں
پاس امانت ہیں۔ میں امانت کی پوری
کروں گی۔ کیا سمجھے آپ؟"

"ہاں، میں سمجھا" اور یہ سوچتا ہوا لوٹ
مائیں اسی طرح بچے کو امانت سمجھنے لگیں
میں بڑا امن رہے * اخبار سے مقصد لکھنو

طاہرہ فہد فلاحی

ہے کوئی ماں!

عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کا ظلم و ستم جب حد سے گزر جاتا ہے تو محمد بن عبدالرحمن بن اشعث اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بہت سے تابعی علماء اور صلحاء ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ کوفے کے ممتاز محدث اور فقیہہ تابعی ابراہیم بن یزید نخعی بھی اسی گروہ میں جا شامل ہوتے ہیں۔ حجاج دوسرے علماء و فضلاء کی طرح ان کے خون کا بھی پیاسا ہو جاتا ہے۔

غلطی سے کوفے کے ایک دوسرے بزرگ ابراہیم بن یزید تیمی پولیس کو نماز پڑھتے ہوئے مل جاتے ہیں۔ یہ بزرگ دنیا سے بے نیازی اور زہد و ورع میں اپنی مثال آپ ہیں۔ پولیس انھیں گرفتار کر کے حجاج کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ وہ تحقیقات کی زحمت کئے بغیر انھیں زنجیروں میں جکڑ کر دیماس کے قید خانے میں ڈال دینے کا حکم دیتا ہے۔ مگر یہ مرد درویش ایک صاحب فضل و کمال کی جان بچانے کے لیے اپنی اصل حقیقت پر پردہ ڈالے رہتا ہے۔

ابراہیم تیمی کی والدہ مضطرب و بے قرار ان سے ملنے کے لیے پہونچتی ہیں۔ دیکھتی ہیں کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے ہیں۔ بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر ماں رونے لگتی ہے۔

• بیٹے، تم نے بتایا کیوں نہیں، جس ابراہیم کی انھیں تلاش ہے وہ میں نہیں ہوں!

" اماں، نخعی علم و عمل کا چراغ ہیں جس سے ہزاروں دیے اور روشن ہوں گے اس چراغ کو ظلم و جور کی آندھی سے بجھنا نہیں چاہیے۔ ابراہیم کی زندگی ملت کا سرمایہ ہے اس سرمائے کو لٹیروں کے ہاتھ سے محفوظ رہنا چاہیے۔ میری زندگی کی قربانی سے اگر یہ چراغ علم و عمل محفوظ رہتا ہے تو میرے لیے یہ باعث سعادت ہے۔"

• ہاں ابراہیم نخعی ملت کا متاع گراں بہا ہیں۔ ان پر آنچ نہیں آنا چاہیے۔ اللہ تمہارے ایثار کو قبول فرمائے۔

تربیت کی ایک مثال

مولانا عبدالرؤف رحمانی

جلسہ چمپوا (صوبہ اڑیسہ) منعقدہ ۲۷ر فروری [illegible] میں بعد نماز فجر مولانا محمد حسین،
خطیب مسجد کولوٹولہ کلکتہ نے اپنے وعظ میں بیان کیا کہ مجھ سے بروایت حافظ عبداللہ
رحیم آبادی نو مسلم نے سنائی کہ مدن پورہ بنارس تاج کمپنی کے مالک حاجی عبدالرحمٰن،
اعظم مدن پورہ کے دسیوں منیب وکار پیداوار یعنی ساڑیوں کا لین دین کر رہے تھے
مال دیکھ رہا ہے کوئی اس کی قیمت پیمنٹ کرنے کا پرچہ دے رہا ہے کوئی لوگ ر
حساب کر رہا ہے۔ کوئی مال کو اسٹاک میں جمع کر رہا ہے کوئی فون پر بیوپاریوں سے بات
مولانا عبدالمتین صاحب جو ایک عالم دین اور سنجیدہ مزاج صاحبزادے ہیں سب کو حسب
ہدایات دیتے جا رہے تھے۔ اسی کاروباری مشغولیت کے وقت میں ایک باہر کے مسا
مولانا عبدالمتین صاحب مرحوم سے اپنی کسی حاجت کا اظہار فرمانے لگے مولانا موصوف نے
ہمہ ہمی کے وقت اسے بے جا مداخلت کی بات سمجھ کر اتنا بولے کہ آپ لوگ کچھ وقت کا
لحاظ نہیں کرتے ایسے معاملات کے لیے فرصت کا انتظار کرنا چاہیے۔ آواز کچھ تیز ہو گئی
عبدالرحمٰن صاحب مرحوم مغفور اندر کمرہ میں کسی طرف تشریف فرما تھے تیز آواز کو سن کر بولے
کیا بات ہے۔ کارکن حضرات اور مولانا صاحب سب خاموش ہو رہے۔ دوبارہ پوچھا
بات ہے پھر سب خاموش رہ گئے اتنے میں حاجی صاحب نے مولانا عبدالمتین صاحب
کر کے یہاں آؤ کیا بات ہے کہنے لگے والد صاحب کوئی بات نہیں ہے۔ صرف اتنی

دونوں صاحب ابھی گئے تھے کہ ان کاروباری مشغولیت میں سوال کر بیٹھے۔ میں نے کہا
ابھی وقت نہیں ہے پھر کسی وقت آؤ۔ حاجی صاحب نے بڑی اچھی تربیت کے انداز میں سمجھایا اگر خدا تم کو اسی طرح بناتا اور تم اپنی حاجت لے کر اس کے پاس جاتے اور وہ تمہیں اسی طرح ترش روئی و سخت مزاجی سے جواب دیتا تو تمہیں کس قدر ناگوار گزرتا اور تم کو کتنا رنج ہوتا پھر خدا یاد رکھو خدا دیتا بھی ہے اور ناشکری کرنے پر واپس بھی لے لیتا ہے ہو سکتا ہے کہ تم کو بھی اسی طرح بنا دے میں ایک غریب شخص تھا خدا نے مجھے اپنے فضل سے یہ دولت دی۔ اس میں اللہ کا حق زکوٰۃ متعلق ہے ہمیں حکم ہے کہ زکوٰۃ اس کے مستحق بندوں میں تقسیم کر دیں۔ ہمارا فرض تھا کہ اللہ کے بندوں کو تلاش کریں اور ہر اہل حاجت و مستحقین میں تقسیم کر دیں۔ اب اگر یہ خدا کے بندے ہمارے پاس خود سے آتے ہیں۔ تو ہم پر احسان کرتے ہیں۔ اچھا جاؤ کسی ملازم کو بھیج پتہ لگاؤ وہ کہاں گئے۔ تلاش و دریافت سے معلوم ہوا کہ وہ اسٹیشن جا چکے ہیں ملازم اسٹیشن گیا۔ ان مسافر صاحب کو واپس لایا حاجی صاحب نے معذرت چاہی اور ان کی حاجت پوری فرما دی۔ ایسے نیک والدین جو اپنے بچوں اور صاحبزادوں کی اس طرح سے تربیت فرمائیں آج دنیا سے ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ (ندائے ملت سے)

اسلامی ممالک کی عورتیں بے پردگی

دوسری بڑی جنگ کے بعد مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں واقع اسلامی ممالک پر مغرب کی گہری چھاپ لگ گئی تھی اور جدید فیشن کی رو میں بہہ کر بیشتر عورتوں نے پردہ ترک کر کے شاپ لیس اپنا لیا تھا۔ صنفِ نازک کی تنِ عریانی دیکھ کر مرد بھی ریجھ گئے اور روک ٹوک کرنے کی بجائے حوصلہ افزائی کرنے لگے تھے لیکن تیس چالیس سال بعد اب ہوا کا رخ بدل گیا ہے اور مسلم خواتین پھر سے پردہ کی جانب مائل ہونے لگی ہیں۔ مصر اور ایران سے لے کر انڈونیشیا تک عورت تن ڈھانپ کر باہر نکلتی ہے۔ آپ قاہرہ کے بازار میں نکل جائیے کوئی عورت بے پردہ نظر نہیں آئے گی۔ سوائے چہرہ کے جسم کا کوئی حصہ ننگا دکھائی نہیں دیتا۔ نے تو روائتی برقع پہننا شروع سارے مصر میں مسلم طالبات محکمۂ مطالبہ کر رہی ہیں کہ یونیورسٹی اور کا مخلوط تعلیم کا سسٹم ختم کیا جائے او کیمپس میں واقع ریستورانوں میں بیٹھنے کا الگ انتظام کیا جائے۔ا کالجوں اور یونیورسٹیوں یونینوں ہوتے ہیں۔ تو مغرب کے دلدادہ ا امیدوار بری طرح پٹتے ہیں کیونکہ طالبات صرف قدامت پسند طلباء لیڈر منتخب کرتی ہیں۔

اس معاملہ میں ایران تو مصر قدم آگے نظر آتا ہے۔ شاہ کی معز

وہاں کی جنتا کے دلوں میں مذہب اور پرانی قدروں کے لیے احترام پیدا ہو گیا ہے اور ہر فرد و بشر اسلامی جذبے سے سرشار نظر آتا ہے یکم اپریل کو ہوئے ریفرینڈم میں عوام نے متفقہ طور سے ملک کو اسلامی جمہوریہ میں تبدیل کرنے کے حق میں ووٹ دیا ہے۔ دینی رہنما آیت اللہ خمینی نے یکم اپریل کو ایران میں اسلامی جمہوریہ کے قیام کا دن قرار دیا ہے۔ اور اس ریفرینڈم کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ اس کے حق میں جتنی ریلیاں ہوئیں اور جتنے جلوس نکلے اُن میں کوئی عورت بے پردہ نظر نہیں آئی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ قوم مغربیت کو ترک کر کے ایک بار پھر اسلامی قدروں کو اپنانے اور فیشن کو ترک کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔

یہ نئی اسلامی لہر صرف مصر اور ایران تک ہی محدود نہیں بلکہ دور یورپ میں ملائشیا اور انڈونیشیا بھی اس سے متاثر نظر آتے ہیں جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے وہاں تو نظامِ مصطفےٰ نافذ ہو چکا ہے۔ فوجی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی پہلے تو اس ملک کو اسلامی ری پبلک اور پھر وہاں خاص اسلامی قوانین لاگو کر دیے ہیں۔ اور مرد اور عورتیں دونوں اس بات کے حق میں ہیں کہ گزشتہ نصف صدی کے عرصہ میں اسلامی ممالک پر مغربیت کی جو چھاپ لگی ہے اسے مٹایا جائے اور پرانی قدروں کو بحال کر کے مذہب کو زندگی کا جزو بنایا جائے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی یہ لہر کہیں عورتوں کی زندگی کے ہر میدان میں ترقی کو ساکن تو نہیں کر دے گی؟ اور یہ نیا رجحان صنفِ نازک کو گھر کی چار دیواری میں محبوس کرنے کا موجب تو نہیں بنے گا؟ یا مذہبی جوش میں آکر اربابِ بست و کشاد عورت کی آزادی تو نہیں چھین لیں گے؟

ان تمام سوالات کا جواب پانے کے لیے اگر صورتِ حالات کا بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ رضا و رغبت سے ہو رہا ہے ٹھونسا

نہیں جارہا ہے۔

شرعی قوانین کے نفاذ یعنی اقدار کی بحالی اور بے پردگی و عریانی سے گریز کرنے کی مہم چلانے والے صرف بوڑھے نہیں بلکہ نوجوان مرد و خواتین ہیں۔ اس مہم کا مبتدا اسلامی ممالک کی یونیورسٹیاں اور کالج ہیں۔ مہم کے لیڈروں میں وہ اساتذہ بھی شامل ہیں جنھوں نے یورپ اور امریکہ میں تعلیم پائی ہے اور جو بڑے روشن ضمیر ہیں۔

مثال کے طور پر اکرام حریری نامی ایک ۲۴ سالہ نوجوان ایرانی طالبہ نے ایک غیر ملکی نامہ نگار کو انٹرویو کے دوران بتایا کہ ہمارے ہاں اسلامی حکومت اور پردہ و برقع کی تجدید کا مطالبہ کرنے والوں میں وہ لوگ پیش پیش ہیں جنھوں نے برطانیہ اور امریکہ میں تعلیم پائی ہے اور تدریس جن کا ذریعہ معاش ہے۔ ہم بھی اتنی ہی آزاد خیال ہیں جتنی کہ مغربی عورت

لباس کی تبدیلی اور پردہ داری ہماری ترقی کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔ مشرقی لباس ہماری آزادی کو سلب نہیں کر سکتا۔ جسمانی اعضا کو عریاں کر کے کوئی عورت زیادہ ترقی نہیں کر سکتی۔ ترقی اور آزادی کا سے ہے ٹاپ لیس لباس سے نہیں!

اس خاتون نے بتایا کہ حال کی ایک جماعت کیلیفورنیا میں کیمسٹری تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد لوٹی ہے لباس زیب تن کرتی ہے اور پردہ کی اس کا عقیدہ ہے کہ شرعی قوانین آزاد

مغربی ممالک میں سکس، سپورٹس سکرین کی قباحتیں بیان کرتے ہوئے مس حریری نے بتایا کہ وہاں رشتہ ازدواج، کھیل میدان اور فلمی دنیا تینوں جگہ عورت کی ہے۔ اس کی زندگی بے کیف اور پریشان وہ بظاہر آزاد نظر آتی ہے۔ مگر درحقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں عورت خودکشی کی وارداتیں بھی پورب کی نسبت ہوتی ہیں لیکن اس کے برعکس اسلامی مما ایسی بات نہیں ہے۔ اسلام رواداری ہے اس میں پردہ کی تلقین عورت کے نا کی ضامن ہے۔

ایک اور عرب خاتون ۲۵ سالہ

نے جو واشنگٹن میں سعودی عرب ٹیلیویژن کی نامہ نگار ہے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ "سعودی عرب ترقی کر رہا ہے وہاں دورِ جدید کے مطابق تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ لیکن اسلامی تعلیمات کی باقاعدہ پیروی کی جاتی ہے۔ کیونکہ مغربیت پسندی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان ہالی وڈ کا سا طرزِ عمل اختیار کرے!

اینلا امریکی میں سعودی عرب کے ایک سابق سفیر کی بیٹی ہے اور آزاد خیال ہونے کے باوجود عریانی سے احتراز کرتی ہے۔ اور لباس کے معاملہ میں اعتدال پسند ہے۔ وہ پردہ کی بھرپور حمایت کرتی ہے۔

حالات و واقعات کا بھرپور جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی ممالک میں پڑھا لکھا اور آزاد خیال طبقہ بھی اپنے مذہب کا صدقِ دل سے معتقد ہے۔ وہ دورِ جدید کے "کوکا کولا" کلچر کا قائل نہیں۔ بلکہ وہ مغرب کی تہذیب کو اپنی قدیم روایات کے لیے مضر رساں سمجھتا ہے اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے تمدن کو فروغ دینے کے لیے کوشاں ہے۔ لہٰذا دنیا بھر کے مسلمانوں کی اپنے مذہب کے تئیں بڑھتی ہوئی عقیدت شرعی قوانین کے نفاذ کی وکالت اور عورتوں میں پردہ کی تجدید کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ موجودہ سائنسی زمانے کی افادیت سے منہ موڑ رہے ہیں۔ وہ پھر سے قرونِ وسطیٰ کا سا ماحول پیدا کر کے عورت ذات کو غلام بنانے کے درپے نہیں۔ کیونکہ اسلام تو ابتدا ہی سے مساوات اور رواداری کا علمبردار رہا ہے۔ خصوصاً عورتوں کو تو اس نے بے پناہ تحفظ دیا ہے۔ اسلام کے آغاز سے پہلے عرب ممالک میں دختر کشی کی مکروہ رسم زوروں پر تھی۔ حضرت محمدؐ نے اسلام کی بنیاد ڈالنے کے بعد سب سے پہلے یہ بُری رسم بند کروائی۔ اور عورت کو اس کا مقام دلوایا۔ آدمی کی کمائی میں اُسے برابر کا حصہ دار قرار دیا۔ یہ ایک انقلابی قدم تھا جو قبل ازیں نہ تو یہودیوں نے اُٹھایا اور نہ ہی عیسائی ریفارمروں نے ایسا کرنے کی جرأت کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں ستی کی رسم سے عورت کی ہستی ختم ہو رہی تھی اور [illegible] میں

عورتوں کے پیروں میں بیڑیاں پڑی رہتی تھیں۔ لیکن بے بس عورت ذات کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ یہ پیغمبر اسلام ہی تھے۔ جس نے اپنے پیروکاروں کو عورت کی عظمت سے روشناس کرایا۔ حضرت محمدؐ نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہر شخص کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ماں کے قدموں میں جنت ہے۔ اس طرح لوگوں میں ماں کی خدمت کا جذبہ پیدا ہوا۔

آج اگر اسلامی ممالک میں عورتوں نے قدیم روایات اور اسلامی قدروں کو بحال کرنے کا علم بلند کیا ہے تو اس کے پسِ پشت پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی عظیم تعلیمات کے اثرات کارفرما ہیں۔

آیت اللہ خمینی کا پیغام ہندوستانی مسلمانوں کے نام

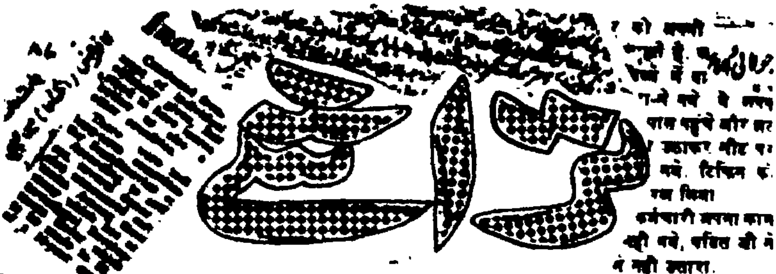
علامہ خمینی نے امیر جماعت اسلامی ہند مولانا محمد یوسف صاحب کو مندرجہ ذیل تحریر دی ہے،

باسمہ تعالیٰ

از خداوند تعالیٰ وحدت کلمہ مسلمین را خواستہ ام۔ اختلافات ظاہری شیعہ و برادران اہل سنت جنایت کاران بین الملل ایجاد کردہ اند۔ باید برادران ما بدانند کہ ما ہمہ مسلمانان پیرو قرآن کریم، تسلیم و نباید باہم اختلافات داشتہ باشیم۔ انشاءاللہ موفق باشید۔ روح اللہ خمینی

ترجمہ:۔ میں اللہ تعالیٰ سے مسلمانوں کے اتحاد کلمہ کا خواستگار رہوں۔ شیعہ اور برادرانِ اہلِ سنت کے ظاہری اختلافات کو گروہ مجرمین نے پیدا کیا ہے۔ ہمارے سب بھائیوں کو جان لینا چاہیے کہ ہم سب مسلمان ہیں اور قرآن کریم کے پیرو ہیں۔ ہمیں باہمی اختلافات نہ رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں (باہمی اتحاد کی) توفیق عطا فرمائے۔

روح اللہ خمینی



(۱) دھجیاں ۔ تینا (۲) منزل کی لگن ۔ سعیدہ مطلب (۳) جسے اللہ رکھے ۔ رمینہ بیگم ۔ ایڈیٹر ڈی

دھجیاں | ایک دفعہ لاہور سے ریل پر سوار ہوئی تو میرے سامنے والی برتھ پر دو عورتیں اور بیٹھی تھیں۔ ایک کے چہرے پر بڑی شرافت تھی دوسری اس کے بالکل برعکس دونوں ٹپ ٹاپ تھیں۔ عمر دراز تھیں۔ ان کے علاوہ دو چار عورتیں اور بھی میرے اردگرد تھیں۔ اب ایک عام دستور سا ہو گیا ہے کہ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد عورتیں برقع اتار کر رکھ دیا کرتی ہیں لیکن میں پہنے رہتی ہوں لہٰذا اس وقت بھی برقع پہنے تھی ان سامنے والی دونوں بہنوں میں سے ایک کو جو زیادہ اپٹوڈیٹ تھیں شاید میرا برقع ناگوار گزر رہا تھا لہٰذا پہلے تو انھوں نے اشارے کنایہ میں کچھ ریمارکس پاس کئے لیکن پھر بھی جب انھوں نے دیکھا کہ یہ تو بڑی ڈھیٹ ہے تو دامتو، غریب کو غصہ آگیا اور آپس میں پردہ کی بحث چھیڑ کر گئی برقعہ والیوں کو برا بھلا کہنے لگی۔ درا صل" یہ برقع اوڑھنے والیاں ہی بدمعاش ہوتی ہیں" اس جملہ پر دوسری بہن نے ہلکے سے ڈانٹا کہ یوں میں بھی تو برقع اوڑھتی ہوں!"

میں ادھر یہ سوچ کر چپ تھی کہ جواب جاہلاں باشد خاموشی۔ لیکن اس جملہ پر غصہ آگیا تھا۔ بہرحال جب وہ کچھ دل ہلکا کر چکیں تو وہ دوسری خاتون سے جو کسی ریلوے ملازم کی بیوی تھی سفر کے آرام اور تکلیف پر باتیں کرنے لگیں۔ خیر سے وہ صاحبہ خود بھی ریلوے ملازم کی بیوی تھیں بولیں ہم تو ہمیشہ فرسٹ سیکنڈ میں سفر کرتے ہیں اس دفعہ بیٹھ گئے انٹر میں ورنہ ہمیں کیا کوئی جیب سے پیسے تھوڑے خرچ ہوتے ہیں اور بلا ٹکٹ کی کس کی مجال ہے۔ گارڈ صاحب

کو سب جانتے ہیں۔

اب تو مجھ سے بھی چپ نہیں رہا گیا اور میں نے کہا کیوں جناب یہ بغیر ٹکٹ گاڑی میں سفر کرنا تو ایسا ہوا جیسے اپنی جیب سے آپ پیسے چرا لیے؟ بس پھر کیا تھا بپھر ہی تو گئیں کہنے لگیں سب ایسے ہی کرتے ہیں۔ کرتے کچھ ہیں۔ کہتے کچھ ہیں۔ میں خود حکومت کی دھجیاں اڑاتی ہوں۔ آپ مجھے سمجھتی کیا ہیں۔ میں مضمون نگار ہوں۔ میرے ڈرامہ ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتے ہیں۔ میرے افسانے اور مضمون فلاں فلاں رسالوں میں چھپتے ہیں۔ میرے اس مختصر سے سوال نے ان پر اس قدر سراسیگی کھسیاہٹ اور بوکھلاہٹ طاری کر دی تھی کہ تمام ڈبہ کی عورتیں ان کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ کہ اتنے میں اللہ نے ان کی مشکل آسان کی اور ان کا اسٹیشن آ گیا اور وہ بڑی تیزی سے حکومت کی دھجیاں اڑاتی ہوئی اتر گئیں اور میں یہ سوچتی رہ گئی کہ یہ حکومت کی دھجیاں اڑاتی ہیں یا اپنی۔ (مینا)

منزل کی لگن | لاہور جاتے ہوئے اتفاق سے کو نیٹ پسنجر میں سفر کرنا پڑا۔ یہ گاڑی ہر چھوٹے مقام پر رکتی ہے اس لیے اس میں دیہاتیوں کی کثرت تھی۔ رات کا ایک بجا ہوگا۔ میری نظر دو عورتوں پر پڑی۔ جو اپنی گٹھریاں سروں پر رکھے اپنی منزل مقصود پہ اترنے کی منتظر نظر آ رہی تھیں۔ ڈبہ کا دروازہ کھلا تھا اور وہ دونوں عورتیں اپنی سیٹ چھوڑ کر زمین پر بیٹھ گئی تھیں۔ مگر ٹرین رکنے میں ہی نہ آتی تھی اس کی رفتار بدستور تیز تھی۔ میں سوچنے لگی یہ غریب اور جاہل عورتیں نہ تو پڑھ سکتی ہیں۔ نہ اُن کے ساتھ کوئی مرد ہے۔ اس پر قیامت یہ کہ رات کا سفر ہے اگر غلط اسٹیشن پر اتر جائیں تو کیا ہوا۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ گاڑی کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔ پلیٹ فارم آ گیا مگر وہ عورتیں نہ اتریں۔ میں حیران پھر انھیں دیکھنے لگی اور اتنی دیر دیکھتی رہی گاڑی کئی جگہ رکی مگر وہ جب اتریں تو گھڑی تین بجا رہی تھی۔ میں نے سوچا منزل کی لگن بھی کیا شے ہے؟ عورتیں کب سے اپنا سامان سروں پہ رکھے بیٹھی تھیں۔

زی رات آنکھوں میں گزر دی۔ با آخران کی
ل آ ہی گئی۔ کیا ایک مسلمان عورت خواہ وہ
بں یا معمولی پڑھی لکھی ہی کیوں نہ ہو اسی
ن کے ساتھ اپنی آخری منزل حاصل نہیں
سکتی؛ جہاں جاکر اسے ایک ایسا اطمینان او
بی نصیب ہوگا جس کی مثال دنیا میں ملنی مشکل
، اور یہاں کی تکلیف تھکن، کوفت، پریشانی
ب کچھ دور ہو جائے گی بالکل اسی طرح جیسے
بے سفر کے بعد اپنے گھر پہنچ کر دور ہو تی ہے۔

(سعیدہ قطب)

بسے اللہ رکھے | ۲۲ر جون ۱۹۸۰ء کو شام کی
ن سے بھائی صاحب شانتا ہارڈیوٹی کے
لیے روانہ ہوئے ۸ بجے شب نوڑہ اسٹیشن
ے جب گاڑی روانہ ہوئی تو مسافروں کی
ثرت تھی لوگ دروازوں میں لٹکے ہوئے
تھے۔ ایسی حالت میں زبردستی داخل ہونے
کوشش میں مسافروں کے گرنے کا احتمال تھا
لہذا وہ خالی دروازہ کے انتظار میں گاڑی کے
استہ پلیٹ فارم پر بڑھتے رہے۔
ابر آلود فضا لیمپ کی مدھم روشنی پلیٹ فارم
پر جا دل کی ۴۰ یا ۵۰ بوریاں پڑی تھیں۔ لیکن نظر
نہ آتی تھیں۔ ان سے ٹھوکر کھا سنبھل نہ سکے اور
پلیٹ فارم کے نیچے گر گئے۔ گاڑی کی رفتار تیز ہو چکی
تھی اس لیے روکتے روکتے بھی پلیٹ فارم کے
باہر نکل گئی اور کئی ڈبے بھائی صاحب کے اوپر
سے گزر گئے۔ یہ روح فرسا منظر دیکھ کر تمام اسٹاف
و مسافر تڑپ گئے چیخ اٹھے۔ لوگوں نے ٹیلیفون
میں ایشرڈی فون کر دیا کہ " رسول صاحب " کٹ
گئے۔ لیکن گاڑی گزرنے کے بعد جب بھائی
صاحب اپنا صافا اٹھا کر خود بھی گاڑی کے پیچھے
دوڑے تو سب حیرت زدہ رہ گئے۔ دیہاتی مسافر
بھوت بھوت کہہ کر بھاگنے لگے۔

کچھ لوگ خوف سے سہمے کھڑے تھے
جب ان کو یقین دلایا گیا تو لپٹ کر رونے
لگے اور " رسول صاحب " آپ۔ خدا کا شکر
ہے کہ موت کے منہ سے نکل آئے اور جسم پر خراش
تک نہ آئی۔

ایسا سنگین خطرہ اور زندگی قسمت والے
کے کرم اس کی رحمت اس کی حاکمیت کا اعلان
ہے۔ ایسے مناظر کا فروں کو کلمہ پڑھنے اور

اشتراکیوں کو اللہ کے وجود پر ایمان لانے کے لیے کافی ہیں۔

خدا کی شان دیکھئے جس وقت گرے ہیں بڑا اڈہ پر گذر رہا تھا اس کا فٹ بورڈ جیسے ہی گذرا ویسے ہی گرے اور دوسرا فٹ بورڈ آنے سے قبل سنبھل چکے تھے۔ ہاتھ پیر سمیٹ کر پلیٹ فارم کی دیوار سے چپک گئے۔ کلمہ پڑھتے رہے اور سمجھ لیا کہ موت یقینی ہے لیکن بالکل مطمئن اور بے فکر، ایک ہاتھ اور پیر لائن پر چلا گیا۔ اس کو فوراً سمیٹ لیا۔ سینے پر سے گاڑی گذرتی رہی۔ جب سب گاڑی گذر گئی اور آسمان نظر آنے لگا تو کچھ دیر یقین نہیں آیا کہ میں زندہ ہوں۔ پھر فوراً ہی احساس ہوا اور اٹھ کر گاڑی کے پیچھے دوڑے۔

ہم سب لاعلم، بے خبر سو رہے تھے جب بھائی صاحب آئے تو بتایا دل اللہ تعالیٰ کے شکر و احسان سے لبریز ہو گیا مالک کے کرم و بخشش کا رواں رواں شکر گذار ہے اس کی شان کریمی اور قدرت کا کرشمہ ہے ورنہ ٹرین کے نیچے آنے کے بعد ہوش و حواس باقی رہنا ممکن نہیں۔ جس کو وہ رکھے اس کے بڑے سے بڑا خطرہ بھی کوئی اہمیت رکھتا سب نے نفل پڑھے۔ صدقہ کیا۔ خ بھائی صاحب کی حیات نو پر مالک کا ج بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ (حسینہ بیگم ال

میرے نئے دیوتا

انیس جنگ

ماسکو کے ریڈ سکوئر میں سینٹ بیلز چرچ میں عقیدت مندوں کی نہیں سیاحوں کی بھیڑ بھاڑ ہے. لیکن میں چرچ کی مورتیوں کے درشن کیا چاہتا ہوں جو دوسری چمکدار تصاویر کی آڑ میں آچکی ہیں. سوچ رہا ہوں روس کے چرچوں اور مسجدوں کا کیا حشر ہوا ہے کیا انسان ان کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے؟ مجھے اپنے وطن کا خیال آرہا ہے. کتنے چرچ مندر مسجدیں اور قدم قدم پر آشرم ہیں وہاں. جن میں عقیدتمندوں کا ہجوم لگا رہتا ہے جن سے فرد اور سماج کو مانسک شانتی ملتی ہے. جن سے لحظہ بہ لحظہ تسکین کا درس ملتا رہتا ہے.

میرے روسی دوست نے مجھے بتایا تھا: ہمارے یہاں مسجدیں بھی ہیں اور

چرچ بھی: میں یہی کچھ دیکھنے آیا ہوں واقعی یہ چرچ باہر سے عظیم الشان دکھائی دیتے ہیں لیکن اندر سے ـــ اندر سے بالکل سنسان ہیں. کریملن کے چرچوں کے تو گنبد بھی سنہری ہیں. ان کی ہر وقت مرمت ہوتی رہتی ہے. اونچی اونچی پاڑیں لگا کر مزدور ان عظیم الشان بلڈنگوں کی چمک دمک برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اب ان بلڈنگوں کا بنے گا کیا؟

.... انھیں عجائب خانوں میں تبدیل کر دیا جائے گا. یہ اس تاریخ کی یادگار بن جائیں گے جس سے روس نہ تو پیار کرتا ہے نہ انکار.

ہاں روس میں چرچ موجود ہیں. بعض دفتروں میں تبدیل ہو چکے ہیں. کچھ میں تو

ہاؤس اسٹور ڈھل گئے ہیں۔ کچھ میں یوتھ کلب اور باقی مقفل و ویران — چیخوف جانے والی سڑک کی طرح سنسان — یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔

لوگ باگ اس ادیب کا مسکن دیکھنے



کے لیے جاتے رہتے تھے۔ سڑک کے دور دور تک ملیں ہیں۔ بے شمار ملیں اور فیکٹریاں ہیں جن سے اُٹھنے والا دھواں مشینی دور میں بے کیف زندگی کی داستان کہتا رہتا ہے۔ یہاں کا سُرخ و سپید چرچ غالباً چیخوف کی زندگی میں بھی موجود تھا۔ چرچ کی علامت بتا رہی ہے کہ وہ کتنی پرانی ہے۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ اونچی اونچی جنگلی گھاس اُگ رہی ہے۔ گیٹ کے دروازے پر بھاری بھرکم تالا لگ رہا۔ پادری کوئی ہے نہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے بتایا۔

چرچ کے اندر ہوا تک خاموش ہے۔ کسی جگہ سے چلنے پھرنے کی آواز نہیں آرہی۔ پادری سیاہ لباس میں ملبوس سایوں کی طرح اِدھر اُدھر جارہے ہیں۔ پُرانی پرانی مورتیاں دمک رہی ہیں۔ ان کی چمک دمک بے موقع سی لگ رہی ہے۔ کیونکہ اُن سے کوئی تقدس نمایاں نہیں

ایک بڈھی عورت نے میرے کیمرے
طرف اشارہ کرکے مجھ سے کہا — "یہاں
تو دیجیے" ۔ میں محسوس کررہا ہوں کہ میں
ممنوعہ جگہ پر آگیا ہوں۔ چرچ کے صحن
زرد زرد سی دھوپ ہے۔ نوجوان پادری
کتاب پر جھکا بنچ پر بیٹھا ہے۔ کیا وہ
سے کوئی بات نہیں کرے گا؟
"نہیں" اُس نے سر ہلاتے ہوئے مجھے
بھایا۔ غالباً چرچ کی طرف سے اُسے تاکید
ہے کہ وہ کسی غیر ملکی سے بات تک نہ کرے
ں سوچ رہا ہوں کہ روسی حکومت اصلیت
کو اس قدر چھپانا چاہتی ہے؟ یا یہ کوئی تنہا
پسندی کا احساس ہے جو اسے دوسروں سے
الگ تھلگ رہنے پر مجبور کررہا ہے؟
مجھے بتایا گیا کہ حکومت کسی کو چرچ
میں جانے سے روکتی نہیں لیکن کسی طرح
چرچ کو سپورٹ بھی نہیں کرتی۔ خدا کے گھروں
کو خدا کی نگہداشت میں چھوڑ دیا گیا
ہے۔
کیا وہ حکومت کی بے اعتنائی سے زندہ
زندہ رہ سکیں گے۔ خاص طور پر اُس سماج میں
جس کی ہر حرکت حکومت سے وابستہ ہے؟
قازقستان کی راجدھانی الماآتا میں مجھے
کچھ نوجوانوں فلمسازوں سے ملاقات کا
موقع ملا۔ میں نے اُن سے پوچھا: "کیا تم خدا میں
یقین نہیں رکھتے؟"
"ہم شیطان میں یقین رکھتے ہیں"
انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"خدا کو کیوں نہیں مانتے؟"
اس کا جواب ۲۴ سالہ قازق اَلنس بولو
نامی نوجوان نے دیا وہ کافی معنی خیز تھا۔ اس
نے اپنی چھوٹی چھوٹی منگولین آنکھوں میں
سنجیدگی بھرتے ہوئے کہا —
"میرا دادا گھوڑے پالا کرتا تھا۔ وہ بھیڑوں
کی کھال کے ایک خیمے میں رہتا تھا۔ گھوڑوں
کا گوشت کھاتا اور گھوڑیوں کا دودھ پیا کرتا
تھا۔ بھیڑوں کو مونڈ کر اُن کی اُون بیچتا اور
بس اس کے سوا اس نے دنیا میں کچھ دیکھا نہیں
کچھ جانا نہیں۔ پھر انقلاب کا دور آیا۔ میرا باپ
اسکول جانے لگا اور ایک ایسی زبان سیکھنے

لکا جس کے حروف بھی میرے دادا کے زمانے میں شاید ہی کبھی نہیں تھے۔ میرا باپ قازق زبان بولتا گیا۔ اور میں ——— میں نہ صرف قازق جانتا ہوں بلکہ روسی زبان بھی جانتا ہوں۔ میں مقامی اسکول اور بعدازاں ماسکو کے فلم اسکول میں داخل ہو گیا۔ اب میں فلمیں بناتا ہوں اور اس ماحول میں رہتا ہوں جس سے میرے باپ دادا بالکل ناآشنا تھے یہ بولوٹ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ——— !

میرا دادا خدا کو مانتا تھا اس کے پاس ماننے کو کوئی اور چیز تھی ہی نہیں۔ اس کی زندگی غیر محفوظ تھی۔ اسے اپنے گھوڑے پالک دلش سے پرے کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس نے خدا کو مان کر کچھ نہ پایا۔ (بشکریہ تیج ویکلی)

غزل

دیکھ تیری غفلت کا ہنسا اس موتی کو کھانے نہ پائے
وقت بہت انمول ہے پیارے اسکو گھر لیجانے نہ پائے

ظلم و ستم سے گھبرا کر تم ضبط کا دامن چھوڑ نہ دینا
آنکھ میں آنسو اور لبوں پر حرفِ شکایت آنے نہ پائے

واکھ برا ہے لیکن ناصح آخر وہ بھی ایک انسان ہے
لطف محبت سے سمجھاتا ایسے کر وہ شرمانے نہ پائے

چھاؤں میں جنکی بیٹھ کے دم لیتے تھے مجاہد اب وہ شجر
بادِ سموم بے عملی سے سوکھ گئے ہریانے نہ پائے

راہ وفا کے چلنے والے نقشِ کف پا چھوڑ گئے ہیں
آنکھ کو اپنا رہبر سمجھو تا کہ کوئی بھٹکانے نہ پائے

سیفؔ غزل تو لکھتے ہو ہر مصرع غلو سے پاک رہے
صدق و صفا کے موتی ٹانکو رنگ تغزل آنے نہ پائے

(سیفؔ خیرآبادی)

لدھیو ہنس



نیوٹران ذرہ بم

سائنس کے کرشموں نے دنیا کو بہت سے حقائق سے آشنا کیا، عقل انسانی کو ایک نئی سمتِ فکر دی اور اپنی تحقیقات کے ذریعہ قدیم غلط نظریات (misconceptions) اور اوہام کے پردوں کو چاک کرکے ان کی حقیقت طشت ازبام کردی۔

وہیں ان تعمیری کاموں میں تخریبی عوامل بھی شامل کردیے جن کے زیرِ اثر انسانیت علاوہ آج تعمیری تنزلی، اخلاقی گراوٹ، ذہنی کشمکش اور روحانی ہیجان جیسے شدید اور مہلک تر امراض سے دوچار ہے۔ آج انسان اور اس کے ذریعہ پیدا کی گئی قوتیں تخریبی کاموں پر صرف ہو رہی ہیں۔ عقل انسانی نے اپنا اسلحے ایجاد کرلئے ہیں جن کی مدد سے لمحوں میں ملک کا ملک اور دنیا کا ایک بڑا حصہ تباہ و برباد کیا جاسکتا ہے۔ ایسے اسلحوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ اسلحوں کے اس بازار میں نیوٹران بم بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

نیوٹران بم عصر حاضر کی بہت ہی خطرناک ایجاد ہے۔ جسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے چند سائنسدانوں نے اپنی صلاحیت کے غلط استعمال کے بعد تیار کیا ہے۔ ایسے سائنسدان جنہیں دنیا لائق و فائق انسان اور عظیم مفکر جیسے خطابات سے نوازتی رہی ہے ایسے عظیم انسانوں نے انسانیت ہی کی تباہی کے لیے اپنے قیمتی وقت کو ایسے اسلحہ بنانے میں صرف کیا جو انسانیت ہی کے لیے نہیں بلکہ کرۂ ارض کی ساری مخلوقات کے لیے یکساں طور پر مضر ہیں

نیوٹران بم تیسری عالمی جنگ کے خطرے کو مزید تقویت پہنچاتا ہے۔ وہ ایک ایسی خطرناک اور ہیبتناک جنگ کی دعوت دیتا ہے جو کرۂ ارض

کی مکمل تباہی کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس کی ہیبت ناکی کا اندازہ اس بات سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ دوسری عالمی جنگ میں استعمال ہونے والے پانچ ٹن کے چالیس فضائی بم جتنا دھماکہ کر سکتے ہیں اتنا ہی دھماکہ ایک کلوٹن کا واحد نیوٹرون بم کر سکتا ہے اور جس کے استعمال سے بارہ مربع کلومیٹر کے وسیع رقبہ کو زندگی کی تمام تر رعنائیوں سے محروم کیا جا سکتا ہے نیوٹرون بم کے اسی (۸۰) فیصد اثرات اشعاع سے منسلک ہیں جس کا اثر تقریباً چار کلومیٹر تک ہوگا جس کی وجہ سے فضا کی آلودگی بڑھتی جائے گی حتیٰ کہ آلودگیاں تیس کلومیٹر کے وسیع رقبہ کا احاطہ کر لیں گی اور کرۂ ارض کے اس حصہ کو بہت جلد زندگی سے پاک کر دے گی۔ اس طرح کہ انہیں زندہ تو رکھے گی لیکن ان میں تولید و تناسل کی صلاحیت باقی نہیں رہ جائے گی کیونکہ یہ اشعاع تقریباً بارہ سو موروثی بیماریاں اپنے ساتھ لائیں گی جس کے زیر اثر ہر شخص کسی نہ کسی بیماری میں ملوث ہو جائے گا۔ اور اس کی زد میں آنے والے لوگوں کی آئندہ بھی نسلیں جسمانی نقائص کا شکار ہوں گی۔ یاد رہے کہ نیوٹرون بم کے اشعاع ریڈیائی عناصر (radio active elements) کے اشعاع سے زیادہ تابکاری پیدا کرتے ہیں۔ ریڈیائی عناصر کے چند اشعاع اگر مشہور سائنسداں میڈم کیوری (Madam Curie) کو زندگی سے محروم کر سکتے ہیں تو کیا نیوٹرون بم کے اشعاع انسانیت کو موت کے زبردست پنجوں سے بچا سکتی ہے؟

ایک کلوٹن کے نیوٹرون بم سے تقریباً چھ سو پچاس (650) ریڈ کی تابکاری پیدا ہوگی جس سے جسم انسانی کا بچ جانا ممکن نہ ہوگا۔ اس کی تابکاری اشیائے زندگی میں سرایت کر جائے گی۔ یہاں تک کہ خوراک انسانی بھی اس کی زد سے دور رہ پائے گا۔ جس کے باعث انسان کا متاثر ہونا لازمی ہوگا۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اگر ایک نہر وار ہیڈ کے نیوٹرون بم کا استعمال کیا جائے تو پڑوس کے ممالک پر بھی اس کے خاصے اثرات مرتب ہوں گے اور زبردست تابکاری کے باعث ان ممالک کی زندگی بھی خطرات سے دوچار

ہو سکتی ہے اور عجب نہیں کہ جس خطۂ ارض کی حفاظت کے لیے اس کا استعمال کیا جائے وہیں کے لیے اس کے اثرات پیغامِ اجل بن جائیں۔

پہلی جنگِ عظیم نے ایک کروڑ انسانوں کو زندگی سے محروم کر دیا۔ لیکن اگر دوسری جنگِ عظیم کے پیمانے پر تیسری نیوکلیائی جنگ ہو اور ایٹم بم کی جگہ پر نیوٹرون بم استعمال کیے جائیں تو تقریباً ایک سو چھہتر ۱ کروڑ انسان جلائے وارادات پر ہی ختم ہو سکتے ہیں۔ اس طرح کرۂ ارض کی تمیس ۳۰٪ فیصد آبادی کو لمحوں میں ختم کیا جا سکتا ہے۔ اب رہی تابکاری کے ذریعہ ہونے والی اموات تو اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔

چونکہ ہر شخص یہاں زائد سے زائد رہنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اب وہی لوگ جو کل تک اسلحہ سازی کو "ہنرِ انسانی" اور "کرشمۂ عقل" جیسے خطابات سے نوازتے رہے آج اسلحہ سازی کے خلاف آوازیں بلند کر رہے ہیں تجربے نے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچا دی ہے کہ جنگ انسانیت کے لیے کتنی مضر اور کتنی مہنگی ہے۔

ابھی حال ہی میں ماسکو کی ایک کانفرنس میں سائنسدانوں نے اسلحہ سازی کے خطرناک دور پر توجہ دلائی کہ دنیا بھر میں صرف اسلحہ سازی پر دو سو پچاس ارب 250 ارب ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں۔ تعلیم کے مقابلے میں یہ اخراجات 1.05 ایک اعشاریہ پانچ فیصد حفظانِ صحت کے مقابلے میں دو اعشاریہ پانچ فیصد 2.05 اور ترقی پذیر ممالک کو قرض دینے کے مقابلے میں تیس فیصد ۳۰٪ زیادہ ہیں۔

نیوٹرون اسلحہ کے ان مہلک اور بھیانک نتائج کو محسوس کرتے ہوئے پولش یونائیٹڈ ورکرز پارٹی کے سکریٹری اول مسٹر ایڈورڈ گیرک نے کہا ہے کہ:۔

"ہم نیوٹرون بم تیار کرنے کے منصوبوں پر دنیا کے عوام کی شدید تشویش میں برابر کے شریک ہیں۔ جو عام تباہی پھیلانے والا ایک جدید طرز کا ہتھیار ہے اس کی پیداوار ہمارے براعظم میں نیوکلیائی جنگ کے خطرے میں بھاری اضافہ کر دے گا۔"

۱۹۴۶ء میں امریکہ نے بحرالکاہل کے ایک جزیرے پہ ایٹم بم کا پہلا تجربہ کیا تھا اور پھر یکے بعد دیگرے بائیس تجربے کئے گئے۔ ان دھماکوں کی تابکاری کے اثرات سے اب تک نجات حاصل نہیں کی جا سکی ہے۔ باوجودیکہ سائنسدانوں نے ہزاروں ٹن مٹی کو کھرچ کر سمندر میں پھینک دیا اور جزیرے کے تمام جنگلات جلا ڈالے لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود تابکاری کے اثرات ہنوز اس جزیرہ میں پائے جاتے ہیں اور اس کے پانی کے سرچشموں میں اب بھی ایسے زہر پائے جاتے ہیں جو مہلک ہونے کے ساتھ انسانی بقا کے لیے نہایت خطرناک ہیں۔ تابکاری کے ذرات اب بھی اتنی مقدار میں موجود ہیں کہ اس جزیرہ پر تقریباً پچاس سال تک انسان آباد نہیں ہو سکتے۔

یہ تو تھی ایٹم بم کی دین جس کی ہلاکت خیزی نیوٹرون بم سے کہیں کم ہے اور جس کے اثرات تقریباً جائے وقوع تک ہی محدود ہوتے ہیں۔ لیکن نیوٹرون ایک ایسا خطرناک اسلحہ ہے جس کے اسی نوے فیصد اثرات نسل پر مبنی ہوتے ہیں اور جو اپنے اندر تقریباً بارہ سو موروثی امراض رکھتا ہے۔

اب قارئین خود ہی غور کریں کہ نیوٹرون بم کی ہلاکت خیزی کتنی زیادہ ہوگی اور کیا اس کے استعمال کے بعد کرۂ ارض کی مخلوقات محفوظ رہ سکے گی؟

کاش! اسی ذہن اور سرمائے کو انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال کیا ہوتا تو دنیا کی کثیر آبادی اس سے فیضیاب ہو سکتی۔

ماضی کے یہ تجربات اور مشاہدات بتاتے ہیں کہ انسان نے چاند پہ اور فضا میں چلنے کے خوب خوب طریقے سیکھ لیے لیکن اسے زمین پر چلنا نہ آیا۔

براہ کرم

مضمون ارسال فرماتے وقت اسے کئی بار غور سے پڑھ لینا چاہیے اور غلطیوں کو درست کر دینا چاہیے۔ اس مضمون کی زبان کی غلطیاں میری کوششوں کے باوجود بھی باقی رہ گئیں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ (م ا)



لیموں

لیموں کا رس از مسز زبیدہ عبدالستار (۲) ناشپاتی کھائیے از اکبری شاہانہ (۳) کپڑوں کے داغ دھبے چھڑانا

ں کا رس استعمال کیجئے | لیموں کا رس
ب گلاب میں ملا کر روزانہ چہرہ اور ہاتھوں پر
نے سے چہرہ کی رنگت کو نکھارتا ہے ، اور
بصورت بناتا ہے۔

جسم کے کسی حصے کا چمڑا سخت کھردرا
ر موٹا ہو گیا ہو تو اس پر رات کو سوتے وقت
زہ لیموں کاٹ کر ملنے سے اس کے مسامات
کھول کر نرم کر کے اصلی حالت پر لے آتا
ہے۔ رات کو لگا دیں اور صبح کو دھو ڈالیں۔

چہرے کی جھریوں، کیلوں اور سیاہ
داغوں پر تازہ لیموں کا رس رات کو لگا دیں۔
ر صبح دھو دیں عجیب اثر دکھاتا ہے۔

روزانہ دانتوں پر تازہ لیموں کا رس
ملنے سے دانت صاف اور مضبوط رہتے ہیں

سر دھونے کے بعد لیموں کے رس کو نیم گرم پانی
یا تازہ پانی میں ملا کر بالوں کو دھونے سے بال
چمکیلے، خوبصورت اور نرم ہو جاتے ہیں۔ جڑیں
مضبوط ہو جاتی ہیں۔

ہاتھوں پر اگر سیاہی کی داغ پڑ جائیں تو لیموں
کے رس کو لگانے سے دور ہو جاتے ہیں۔

مچھلی اور پیاز کی بو اگر کپڑے سے نہ جاتی ہو
تو لیموں کے رس سے دھونے سے صاف
ہو جاتی ہے۔ (مسز زبیدہ عبدالستار، ریتاگری)

ناشپاتی کھائیے | اس پھل سے ہم سب واقف
ہیں۔ آج کل اس پھل کا موسم ہے۔ یہ ایک طاقت
بخش پھل مانا گیا ہے۔ اس کا مزاج سرد و تر ہے
بعض اطباء نے اسے سیب کا بدل قرار دیا ہے
اس لئے مریضوں کو دیا جاتا ہے۔ جدید تحقیق

نے بھی اس نظریہ کی تائید کی ہے کہ ناشپاتی قبض کشا ہے۔ یہ سیب وغیرہ سے جلد ہضم ہوتا ہے۔

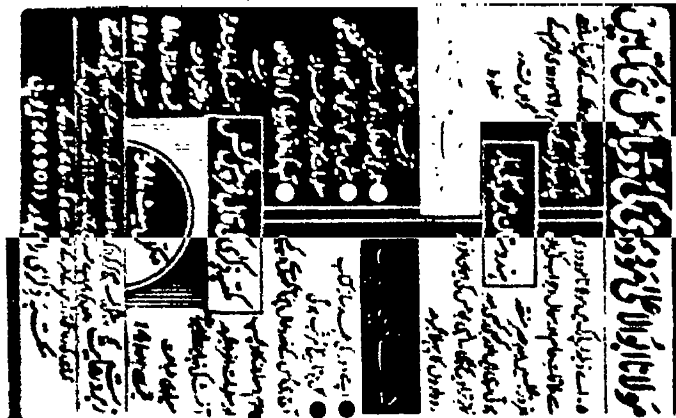
یہ پھل اکثر کمزور بچوں اور عورتوں کو دیا جاتا ہے۔ یہ دل و دماغ، معدے اور جگر کو قوت اور تازگی بخشتا ہے۔ دماغ کو تقویت ملتی ہے اور دل و دماغ کو تراوٹ پہنچاتی ہے پیاس کو بجھاتی ہے۔ ساتھ ہی ناشپاتی کے استعمال سے خون کی ضرورت سے زیادہ تیزی گھٹتی ہے اور صفرا کے جوش کو کم کرتی ہے۔ یہ پھل اکثر عمر رسیدہ لوگوں کے لئے بہت زیادہ کارآمد اور مفید سمجھا جاتا ہے۔ یہ پھل ذائقہ دار کے علاوہ ارزاں بھی ہے۔ اگر آپ اپنا قبض دور کرنا چاہتے ہیں تو ایک دو ناشپاتی کھا لیجئے۔ آپ کی شکایت فوراً دور ہو جائے گی۔ سخت ناشپاتی قابض ہے گویا کوئی بھی انسان قدرت کے اس بیش بہا عطیہ سے محروم نہ رہے۔ اگر آپ کے گھر میں کسی کو بھی دست کی شکایت ہو تو وہ سخت ناشپاتی کھائیں۔ چھلکے سمیت کھانے سے جلد ہضم ہو جاتی ہے۔ چھلکا اتار کر کھانے سے دیر میں ہضم ہوتی ہے۔ یہ خون کو گاڑھا کرتی ہے۔ جن لوگوں کے بدن کے کسی حصے سے خون خارج ہوتا ہو ان کے لیے ناشپاتی بہترین غذا ہے۔ اس کے کھاتے ہی پانی نہیں پینا چاہیے۔ ناشپاتی میں پروٹین، چکنائی، نشاستہ، شکر کے اجزاء کے علاوہ چونا، فولاد، فاسفورس بھی موجود ہیں۔ وٹامن اے، بی، سی بھی ہیں جو رنگ و روپ اور جلد کی نشوونما کے لیے بہت ضروری اور مفید ہے۔ اپنی بہنوں سے گزارش ہے کہ وہ ضرور کھائیں۔ (اکبری شاہانہ۔ تھانہ)

کپڑوں کے داغ دھبے چھڑانا!

(۱) کاجل:۔ داغ والے حصے کو مٹی کے تیل میں بھگو دو۔ تھوڑی دیر بعد صابن اور گرم پانی سے دھولو۔

(۲) خون:۔ ٹھنڈے پانی میں تھوڑا نمک گھول کر دھبہ پر لگا کر کچھ دیر رکھ دو اور ٹھنڈے پانی سے دھو لو۔

(۳) کتھے یا پان:۔ داغ کے اوپر دہی لگا کر رکھ دو۔ تھوڑی دیر بعد صابن اور گرم پانی سے دھولو۔ صاف ہو جائے گا۔





کنور اشفاق احمد چودھری

انار نہ بہت زیادہ ٹھنڈا اور تر ہے نہ بہت سرد اور خشک ہے۔ جن کے مزاج میں پت زیادہ ہوں ان کو خاص فائدہ دینے والا ہے۔ پت کی زیادتی سے ہونے والا بخار، یرقان، خفقان، گرمی معدہ و جگر کے لیے نفع دینے والا۔ پیاس قے، متلی دور کرنے میں برتنا ٹھیک ہے۔ اس کے پانی سے بھی شربت اور رُب بنایا جاتا ہے۔ شربت یا آب انار دوا کے طور پر ۲ تولہ سے ۴ تولہ یعنی ۲۰ گرام سے ۴۰ گرام تک۔

بڑھی ہوئی گرمی چاہے معدہ کی ہو چاہے دل اور جگر کی دور کرنے کے لیے تینوں قسم کے انار اچھے ہیں۔ تینوں طرح کے انار فائدہ ہی دیتے ہیں۔ نقصان کچھ نہیں سوائے اس کے کہ جن کا مزاج سرد اور بلغم والا ہے۔ ان کے لیے انار، آب انار، شربت انار، شربت یا رُب مفید نہیں اس لیے بالکل استعمال نہیں کرنا چاہیے (انٹرنیشنل فوڈ اینڈ ریسرچ آرگنائزیشن آف امریکہ کی رپورٹ)

میٹھا انار اس میں پروٹین ½ ۱ فیصد چکنائی ½ فیصد نشاستہ، شکر، اسٹارچ ½ ۱۴ فیصد، نمک، معدنیات ½ فیصد۔ پانی ۸۰ فیصد ہے۔

انار دانہ انار کے بیج ہیں۔ جو چٹنی بنانے اور کئی سبزیوں میں ذائقہ کے لیے برتے جاتے ہیں۔ برتنے والوں کو شاید ہی پتہ ہو لیکن انار دانہ کئی سبز ترکاریوں کا مصلح (خرابی اور نقصان دور کرنے والا) بھی ہے۔ انار دانہ معدہ کو طاقت دیتا اور بھوک لگاتا ہے اسی لئے ہاضمہ کے چورن میں بھی شامل کیا جاتا ہے۔ قبض کرتا ہے اس لیے دستوں میں فائدہ دیتا ہے۔

پوست انار انار سپل۔ انار کے چھلکے کو کہا جاتا ہے

سرد و خشک ہے۔ دوا ہے غذا نہیں حلق کا ورم دور کرنے کے لیے اس کے پانی سے غرارے کرنا فائدہ دیتا ہے۔ اس کو کوٹ چھان کر سفوف (پاؤڈر جیسا باریک) بنا کر پانے دست بند کرنے زحیر (ایک بیماری) کے لیے اور سیلان الرحم اور خونی بواسیر روکنے کے لیے جوشاندہ دیا کر چھان کر استعمال کرایا جاتا ہے بچوں کی کالی کھانسی میں اجوائن اور کالا نمک سفوف پوست انار میں ملا کر دینا نفع دیتا ہے۔ اس کا خاص نفع بواسیر کے مریض کے لیے ہے۔ سرد مزاج کو نقصان دیتا ہے۔

بیخ انار درخت انار کی جڑ ہے۔ یہ بھی دوا ہے اور اس کے فائدے وہی ہیں جو پوست انار کے ہیں لیکن فائدہ دینے میں جڑ زیادہ طاقتور (قوی تر) ہے۔ اس کا سفوف تھوڑی مقدار میں پیٹ کے کیڑوں کو مار کر نکالنے والا اور قابض ہے۔ زیادہ مقدار میں دست لانے والا پوست و بیخ انار کی مقدار خوراک ۳ سے ۵ ماشہ ۲ گرام سے ۴ گرام تک۔

انار کی اصلاح ایک ماشہ سفوف ہیڑ یا

شک سے بچ جاتی ہے)

اس طرح تمام انار ہی کا کا درخت اور انار کی جڑ بھی اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے کیونکہ ہر شے میں اپنی تاثیر بخشنے والی ذات پاک صرف ان ہی کی ہے ہر انسان کو اس پر غور کرکے حق سبحانہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کا شکر ادا کرنا چاہیے

کیا نہیں مل سکتا؟

روپے سے ڈاکٹر مل سکتا ہے صحت نہیں
〃 〃 آرام 〃 〃 سکون نہیں
〃 〃 نوکر 〃 〃 خادم نہیں
〃 〃 لڑکا 〃 〃 بیٹا نہیں
〃 〃 ساتھی 〃 〃 دوست نہیں
〃 〃 روٹی 〃 〃 مقدر نہیں
〃 〃 پستول 〃 〃 ہمت نہیں
〃 〃 پاؤڈر 〃 〃 خوبصورتی نہیں
〃 〃 عورت 〃 〃 بیوی نہیں
〃 〃 شہرت 〃 〃 عزت نہیں

(رنجبیر سنگھ دہلی)

انصاف!

طارق سجاد رانچی

س مضمون میں ہم لوگ جس اہم خوبی کو پڑھنے جا رہے ہیں۔ وہ ہے انصاف۔ جیسا کہ ہم لوگ جانتے ہیں کہ ہر نیکی یا خوبی لوگوں کو مختلف طریقوں سے سچی زندگی گزارنے کا راستہ بتاتی ہے۔ اعتدال اور استقلال انسان کی اندرونی زندگی کو قابو میں رکھنے میں مدد کرتے ہیں۔ اسی طرح عقل وہ خوبی ہے جسے ہم لوگوں کے سبھی فعل کی حفاظت کرنی چاہیے انصاف کا تعلق خود اعتمادی سے اتنا زیادہ نہیں ہے جتنا ہم لوگوں کے پڑوسیوں کے فرائض کی ادائیگی سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں لوگ کہہ سکتے ہیں کہ اعتدال اور استقلال ہمارے اندرونی معاملات کو بناتے ہیں۔ جب کہ انصاف بیرونی معاملات کی دیکھ ریکھ کرتا ہے۔

<u>انصاف کی اہمیت</u>: جب ہم لوگ پیدا ہو ہم میں سے ہر ایک نے خدا سے کچھ ح حاصل کئے۔ یہ حقوق اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی بسر ک ان تمام حقوق اور دعوؤں میں ہر شخص جینے کا حق سب سے زیادہ اہم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی بڑا کرم کیا ہے۔ اس ہم لوگوں کو ایسی خصلت دی ہے۔ جس کے ہم سبھی ایک دوسرے کے ساتھ مل جل رہتے ہیں۔ سادھوؤں کی طرح الگ تھلگ نہیں۔ لوگ شادی کرتے ہیں۔ خاندانوں تشکیل کرتے ہیں۔ شہر بناتے ہیں اور ملک بساتے ہیں۔ اکثر یہ ساتھ رہنا کئی طرح کی برائیاں پیدا کرتا ہے جیسے لڑائی، جھگڑے، جنگ وجدل چوری چماری وغیرہ۔ اس لئے بالکل فطری

طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ انسان امن و چین سے ایک دوسرے کے ساتھ کیسے رہ سکتا ہے؟ کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ بالکل ناممکن ہے دوسرے یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کو امن سے رہنے پر مجبور کر دیا جائے لیکن سچی بات یہ ہے کہ انسان اسی وقت امن کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ جب وہ ہر شخص کا واجب الادا حق پورا کرتا ہے۔

بس یہیں پر اب ہم انصاف کی صحیح تعریف کر سکتے ہیں۔ انصاف وہ خوبی ہے جس کے ذریعہ ہم لوگ مسلسل ہر شخص کا حق اس کو دیتے رہیں۔ لہٰذا انصاف ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے ہم لوگ اپنے ملک میں امن اور خوشحالی لا سکتے ہیں۔ اس لیے اس موضوع پر ہمیں غور و فکر کرنا چاہیے اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ اگر ہم لوگ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں تو خلق خدا کے حقوق کا لازماً احترام کریں۔ ہم لوگوں کو ہمیشہ سچا ہونا چاہیے، ہم لوگ اس خوبی پر جتنا زیادہ عمل کریں گے۔ اتنا ہی زیادہ ہم لوگ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ خوش و خرم رہیں گے اور اتنا ہی زیادہ مختلف قوموں کے درمیان امن و سلامتی رہے گی اور خدا کی خوشنودی حاصل ہوگی۔

مختلف قسم کے انصاف: انصاف اتنی اہم خوبی ہے کہ وہ ہم لوگوں کے بہت سارے باہمی تعلقات کو ڈھک لیتی ہے۔ سہولت کے لیے اس کو چار حصوں میں تقسیم کر کے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) متبادل انصاف: یہ ایک اہم اصطلاح ہے لیکن اس کا مطلب بالکل سیدھا سادہ ہے۔ متبادل انصاف کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو دوسروں کے حقوق کا لازماً احترام کرنا چاہیے۔ خدا نے ہم لوگوں کو جینے کا حق دیا ہے۔ جسمانی اور روحانی طاقت دی ہے۔ رہنے سہنے کے لیے ضروری سامان اور خاندان کو بڑھانے کا موقع دیا ہے اگر کوئی شخص کسی کے ان حقوق کو نقصان پہنچاتا ہے تو وہ ایک بہت بڑی غلطی کرتا ہے۔ اس لیے جتنا جلد ہو سکے اس کو اپنی غلطی کی تلافی کر لینی چاہیے یہ اصلاح حال کہلاتا ہے۔ اصلاح حال کی یہ ضرورت ایک اہم ترین صفت ہے جو کہ صرف متبادل انصاف میں پایا جاتا ہے۔

مثلاً اجمل مشتاق کا کچھ روپیہ چرا لیتا ہے
اس کا مطلب یہ ہوا کہ اجمل نے مشتاق کا حق
تلف کیا لہٰذا اس کو روپیہ لوٹانا واپس
کر دینا چاہیے۔

یہاں دوسری طرح کا انصاف وہ ہے
جس کے بارے میں ہم لوگ کبھی کبھی باتیں کیا
کرتے ہیں۔ یہ قانونی انصاف ہے۔ قانونی
سماجی بھلائی کو قائم رکھنے کا سب سے بڑا
ذریعہ ہے۔

ملکی قوانین اسی انصاف پر مبنی ہوتے
ہیں یہ قوانین ہر ایک کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں
کرنا ہے بتاتے ہیں تاکہ لوگ امن و چین سے
زندگی بسر کر سکیں۔

مثلاً سواریوں کے تمام قوانین مقامی،
صوبائی یا مرکزی اقتدار کے ذریعہ بنائے جاتے
ہیں تاکہ لوگ سڑک کو ہوشیاری اور حفاظت
کے ساتھ استعمال کر سکیں۔ ہر شخص قانونی
انصاف کی پابندی پر مجبور ہے۔ اس لیے
جب امجد جو ایک نہایت بے پرواہ ڈرائیور
ہے۔ ٹریفک پولیس کے احکامات نہیں
مانتا ہے، تو وہ قانونی انصاف کی خلاف ورزی
کرتا ہے۔

یہاں دو قسم کے انصاف اور ہیں جن کا
اب تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ یہ ہیں:-

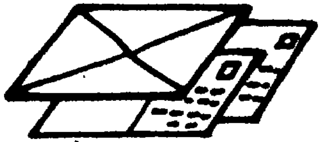
(۳) مساویانہ انصاف اور

(۴) سماجی انصاف

ہمارا دستور: ۲۶ر جنوری کو ہم لوگ ہر سال
یوم جمہوریہ مناتے ہیں۔ یہ ۱۹۵۰ء کا وہ دن تھا
جس دن ہمارا دستور عمل میں آیا۔ اگر آپ نے کبھی
دستور کو پڑھا ہوگا (نہیں تو اب ضرور پڑھ لیں)
تو یاد ہوگا کہ اس کا سب سے اولین جملہ اس
طرح ہے:-

"ہم ہندوستانی پوری ایمانداری کے
ساتھ اس ملک کو خود مختار جمہوری
ریاست بنانا چاہتے ہیں اور تمام
شہریوں کے لیے سماجی، معاشی
اور سیاسی برابری کے انصاف اور
ان کے تحفظ کا عہد کرتے ہیں۔"

• خدا کرے ہم سب انصاف کے تحت زندگی
بسر کریں۔ (انگریزی سے ماخوذ)



یہ نامے میرے نام

(۱) طارق سجاد رانچی (۲) محمد نجیب اللہ انصاری (۳) ڈاکٹر احمد سجاد رانچی (۴) مولانا مختار احمد بہاری

رانچی۔ ۱۴ مارچ ۸۹ء

محترمی چچا میاں! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ہمارے یہاں آپ کا بے حد دلچسپ اور معلومات افزا رسالہ حجاب پوری پابندی سے ہر مہینے آتا ہے جسے گھر بھر پڑھتا ہے۔

ادھر کئی مہینوں سے مجھے آپ سے یہ شکایت ہو گئی ہے کہ آپ نے اس پرچہ میں بچوں کے صفحات دینا بند کر دیے ہیں۔ خیر میں بہر حال "انصاف" کے موضوع پر ایک مضمون حجاب کے لیے بھیج رہا ہوں۔ اس مضمون کو میں نے ایک انگریزی کتاب میں پڑھا تھا جو مجھے بہت پسند آیا اور اسی لیے اس مضمون سے فائدہ اٹھا کر یہ مضمون آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ اس بے انصافی کے دور میں انصاف کی جتنی اور جیسی ضرورت ہے اس کو جتانے یا بتانے کی ضرورت نہیں۔

اس مضمون کی کمزوریوں کو درست کر کے اگر آپ کو پسند آئے اور حجاب کے قارئین کے لیے مفید سمجھیں تو اسے شائع فرما کر ہمیں شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ آپ کے جواب کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ والسلام

آپ کی دعاؤں کا خواہاں۔ طارق سجاد۔

جلپیر۔ ۲۴ مارچ ۸۹ء

محترمی مائل صاحب۔ السلام علیکم

اللہ نے آپ کو افسانے لکھنے میں خاص ملکہ بخشا ہے۔ میری رائے ہے کہ بچوں کی تربیت کے نقطۂ نظر سے مقتدر صحابہؓ اور مشہور شخصیتوں

کے حالات پر مشتمل ایک خصوصی سیریز شائع کیجئے تاکہ نونہالوں کی اسلامی خطوط پر تربیت میں ہم اسلام پسندوں کو خصوصی مدد مل سکے۔

آپ چند ماہ پیشتر حجاب کے آخری صفحہ میں کہانیوں کی شکل میں کافی مواد پیش کرتے رہے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ مذکورہ بالا بزرگوں کے واقعات، اصلاحی انداز اور تاریخی حقائق کے ساتھ کتابی شکل میں اگر شائع ہو گئے تو نئی نسل کی ایک خدمت بھی ہوگی، نیز تحریک کی ضرورت بھی کافی حد تک پوری ہو جائیگی دیگر مرتبین اور مصنفین کی کتابوں سے دراصل تحریک نہیں حاصل ہوگی۔ فقط والسلام

خیراندیش۔ محمد نجیب اللہ انصاری

رانچی۔ ۱۳ مارچ ۸۹ء

برادر مکرم و محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آپ کے عنایت نامہ کا کافی تاخیر سے جواب دے رہا ہوں۔ معذرت خواہ ہوں۔ غلامی کے مسئلہ پر دوسری قسط میں آپ نے تشنگی دور کر دی۔ گذشتہ ہفتہ حلقہ بہار کے تربیتی اجتماع میں آپ کا دلچسپ اور مدلل "عورتوں میں کام کے سلسلے میں" پڑھ کر تمام ارکان نے پسند کیا۔ "ہندوستان کی تحریکوں" پر مجھ سے بھی ایک مضمون کی فرمائش کی گئی تھی۔ مضمون تو تیار ہو اس موضوع پر ایک مستقل تصنیف کا خیمہ بن گیا۔ چنانچہ ان دنوں اسی میں لگا ہوں۔ ویسے وہ مقالہ دعوت اور زندگی رہا ہوں۔ اگر آپ کی نظر سے گذرا تو آپ رائے کا منتظر رہوں گا۔

آپ نے اس ناچیز کی کتاب سے حسن کا اظہار کیا ہے۔ اس کے لیے سراپا سپاس۔ مگر گذشتہ ماہ تک اسے محض محبت کا نتیجہ رہا تھا۔ مگر پاکستان کے جناب الطاف بریلوی صاحب (مدیر العلم) اور مشفق خواجہ صاحب (پاکستان) کے امتیاز علی خاں عرشی صاحب نے جب خلاف توقع بے حد ہمت افزا کلمات سے نوازا تو "آپ کی محبت" کے ساتھ "علمیت" کا بھی قائل ہونا پڑا۔ آپ کو یہ معلوم کر کے یقیناً خوشی ہوگی کہ "باغ و بہار" اور "افسانہ

عجائب" کی درمیانی نثری کڑی عشرت بریلوی کی "داستان سحر البیان" کی اشاعت کی ذمہ داری انجمن ترقی اردو پاکستان لے رہی ہے. میں نے مسودہ بھیجدیا ہے. خدا کرے جلد یہ دوسری تحقیقی کاوش بھی منظر عام پر آجائے.

تنقیدی مضامین کا مجموعہ "تنقید و تحریک" کی کتابت پٹنہ میں ہو رہی ہے. شائع شدہ کتاب کا ٹائیٹل (ڈیزائن) کہیں حفاظت سے رکھدیا ہے جو فی الوقت مل نہیں رہا ہے. ڈھونڈ رہا ہوں. انشاء اللہ ملتے ہی ارسال خدمت کروں گا.

پٹنہ سے واپسی پر مولوی شفیع صاحب ڈیہری آن سون ایک سیمینار میں شرکت کے لیے مجھے لے گئے تھے. کافی اچھا سیمینار تھا انھوں نے سلام عرض کیا ہے.

بچے الحمد للہ بخیر ہیں. پڑھنے لکھنے کا ان کا مذاق نکھرتا جا رہا ہے. میاں طارق اپنی ایک کاوش آپ کی خدمت میں بھیج بھی رہے ہیں. پتہ نہیں وہ حجاب کے لائق بھی ہے یا نہیں. رفعت اور ہم سب کی طرف سے محترمہ بھابی جان اور آپ کی خدمت میں سلام علیک عرض ہے. بچوں کو دعائیں. والسلام خیر اندیش مجاہد

بعد وہی. دارپ شریف

برادر مکرم و رفیق محترم و مخلصم مدیر حجاب حفظ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

عافیت دارین کا طالب ہوں. بجواب آں جناب کارڈ موصول ہوا. جواب الجواب میں بعض وجوہ سے تاخیر ہوئی. میں چھپنے اور چھپنے کی خواہش سے خالی الذہن ہو کے بے ساختگی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنے کچھ شدید احساسات کا اظہار اپنے مرسلہ لفافہ والے خط میں کر بیٹھا تھا.

بہرحال میرے مکتوب میں مرقوم میرے احساسات اگر کچھ افادیت رکھتے ہوں. تو آپ جس طرح چاہیں زیب حجاب کر سکتے ہیں.

فروری کے شمارہ میں مسئلہ شفاعت پر جو مضمون اشاعت پذیر ہوا ہے بہت خوب ہے اللہ تعالیٰ اسے خلق کی ہدایت کا ذریعہ بنا دیں. مارچ کے شمارہ میں ملاقات پر جو مضمون ہے وہ بھی حق گوئی و حق [illegible]

[illegible]

گلدستۂ نعت: نعتیہ کلام کا مجموعہ۔ مصنف جمیل احمد نذیری۔ شائع کردہ: ہلال بک ڈپو اعظم گڑھ یوپی۔ صفحات ۲۲۔ کتابت و طباعت اور کاغذ ٹائٹیل اوسط۔ قیمت ایک روپیہ۔

حجاب میں اب تک ان صفحات میں کتابوں اور رسالوں کا صرف تعارف کرایا جاتا رہا ہے۔ میں ہمیشہ یہ سوچتا رہا ہوں کہ جس شخص نے کوئی ادبی اور علمی خدمت انجام دی ہو اس کی کچھ نہ کچھ حوصلا افزائی ضرور ہونی چاہیئے چنانچہ یہ حوصلہ افزائی محض تعارف تک رکھی۔ تنقیدی نظر سے کسی کتاب کو پرکھنے کی نوبت نہیں آنے دی۔ حلقہ حجاب محض تعارف سے کبھی مطمئن نہیں ہوا اب اصرار ہے کہ تنقید و تبصرہ کا حق ادا کیا جائے۔

میں نے جواب دیا کہ تنقید بڑا نازک کام ہے۔ اور آج کل جب کہ ایک شخص کہتا ہے کہ مجھے یوں اچھا لگتا ہے اور دوسرا اکتاہٹ کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کو بھی کمی ہے میرا خیال ہے کہ وہ محض لکھ دینے سے شعر نہیں بنتا بلکہ شعر میں مضمون آفرینی زبان کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ نیز یہ بھی کہ کل سے آج اردو زبان میں کیا ترقی دکھائی گئی۔ آیا آج کل سے آج مشکل کر دیا گیا یا آسان۔ کل کے مقابلے میں آج اردو زبان کو کھو دیا گیا یا پامال راستے کو اور پامال کر دیا گیا۔ سلاست اور روانی، اشارہ اور کنایہ کی گہرائی جو شعر کی جان ہے اس کا حق کہاں تک ادا کیا گیا؟

اس سلسلے میں نعت گوئی کا معاملہ بہت ہی نازک صورت اختیار کر گیا ہے۔ ایک طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے ایمان کا تعلق ہے محبت کے جذبات ہیں۔ تقاضئہ رسالت ہے یہ اور ایسی بہت سی باتوں میں ہمارے لیے کیا

ہے۔ اگر کوئی شخص ثواب کے لیے ہی نعت کا اہتمام
کرتا ہے تو اسے تنقید و تبصرے کے لیے کہیں نہیں
بھیجنا چاہیے، لیکن اگر کوئی اسکے ساتھ اس کا بھی
خواہاں ہے کہ اسے کچھ مشورے ملیں تاکہ ادبی حیثیت
سے وہ آگے بڑھ سکے تو پھر اسے تنقید و تبصرے
کی سختی گوارا کر لینا چاہیے۔

زیر تبصرہ مجموعہ نعت کے دو مقصد مصنف
نے بیان کئے ہیں اول یہ کہ اس نے نعت گوئی
ذخیرۂ آخرت اور عبادت کے طور پر اپنایا ہے
دوسرا مقصد یہ ہے کہ عوام اور طلبۂ مدارس کے
لیے غلو اور غلط عقائد سے پاک نعتیں فراہم
کردی جائیں۔ جزاک اللہ! نہایت اچھا خیال ہے
میں نے کتاب "گلدستہ نعت" کی ورق
گردانی کی تو سب سے پہلے صفحہ ۳۹ کے عنوان
"نذر عقیدت" پر نظر ٹکی اور یہ پوری غزل پڑھ
ڈالی۔ بے حد افسوس ہوا۔ فنی اعتبار سے نہایت
ناقص، غلو اور غلط عقائد سے بھی پاک نہیں
زبان و بیان کی غلطیاں بھی۔ سوچتا ہوں کہ مشورہ
دوں تو کہیں ایسا نہ ہو نعت گو کا دل ٹوٹ
جائے اور ایسا دل ہو کر قریب جو کچھ ثواب
حاصل کر رہا ہے وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے لیکن آج
تک اسلامی ادب پر جو یہ اعتراض ہوتا رہا ہے
کہ سطحی لوگوں کا ادب پیش کیا گیا اس کا
لحاظ اب سے پہلے کے جو چند تبصرے لکھے گئے ہیں
وہ بنے ہوئے ہیں اور ان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ
سب مشترک ہیں۔ لہٰذا اب ہم ایسی نعتوں کی حوصلہ
افزائی نہیں کر سکتے جو زبان اور فن کے اعتبار سے
ناقص ہوں۔

ہمیں فخر ہے کہ دور نبوی میں ہم حضرت حسان
بن ثابت رض، حضرت عبداللہ بن رواحہ رض اور حضرت
علی رض و غیرہم کا نعتیہ کلام ملتا ہے۔ فارسی میں جامی
اور سعدی اور اردو میں حالی وغیرہ سے بھی بہت
پایا ہے۔ ساتھ ہی افسوس ہے کہ ہم ان بالکل محروم
سے استفادہ نہ کر سکے۔ عقیدت کے پھولوں کا
ڈھیر تو لگا دیا لیکن ان حضرات کے مقابلے کا
ایک شعر بھی نہ کہہ سکے جبکہ ہمیں ان کے اشعار
سے استفادہ کر کے آگے بڑھ جانا چاہیے تھا
جامی کا مشہور مصرعہ ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

عزیز احمد جمیل نقوی سلطانی نے اس کا ترجمہ یوں

اسلامی شعور بیدار کرنے والی بے مثل کتابیں

تصانیف: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام اور جاہلیت	۰/۰۵
اسلامی تزکیۂ نفس	۰/۹۰
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۳/۰۰
اسلام کا نظامِ حیات	۱/۰۰
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	۰/۷۵
اسلام کا نظریۂ سیاسی	۰/۷۵
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	۰/۷۵
اسلامی قانون	۱/۵۰
اسلام اور جدید معاشی نظریات	۲/۵۰
اسلامی معیشت کے اصول و مقاصد	۰/۵۰
انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	۱/۰۰
اسلام اور ضبطِ ولادت	۵/۰۰
اسلامی نظامِ معیشت	۰/۷۵
اسلام کا معاشی نظام	۰/۷۰
اسلامی سیاست (سیاسی کشمکش سوم)	۶/۰
اسلام کا سرچشمۂ قوت	۲/۰

اسلام کا پیغام	۰/۴۰
اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی	۱۰/۰۰
اسلام کی ابتداء	۰/۲۵
اسلام کس چیز کا علمبردار ہے	۱/۵۰
اسلام اور رہبانیت	۰/۷۰
اسلامی ادب	۰/۵۰
اسلامی فلسفۂ معیشت کے بنیادی اصول	۰/۵۰
امام ابوحنیفہؒ اور ان کا کارنامہ	۱/۵۰
ایک نہایت اہم استفتاء	۰/۲۵
اہم ہدایتیں	۱/۲۵
بناؤ بگاڑ	۰/۷۵
تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں	۰/۷۵
تحریکِ اسلامی کامیابی کے شرائط	۱/
تجدید و احیاءِ دین	۵/۰۰
تعلیمات	۳/۲۵

تحریکِ اسلامی دوسری تحریکوں کے مقابلہ میں	/۵۰
تحریکِ اسلامی میں کارکنوں کے باہمی تعلقات	/۵۰
تفہیم القرآن اوّل	۰/۰۰
〃 〃 دوم	۲/۰۰
〃 〃 سوم	۵/۰۰
〃 〃 چہارم	۱/۰۰
〃 〃 پنجم	۹/۰۰
〃 〃 ششم	۲۰/۰۰
تفہیم القرآن سورۂ احزاب	۴/۰۰
〃 〃 چالیسواں	۱/۰۰
〃 〃 الناس تا الم نشرح	۳/۰۰
〃 〃 پارۂ عم	۵/۰۰
تفہیمات اوّل (اضافہ شدہ)	۱۲/۰۰
〃 دوم	۹/۰۰
〃 سوم	۶/۵۰

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

یہ اہم اور نادر کتابیں

مردوں عورتوں بچوں اور بوڑھوں سب کے لیے نہایت مفید

[illegible] 6

Rs. 5/- [illegible]

[illegible]

1.60 [illegible]

0.75 [illegible]

- [illegible] 0.90
- [illegible] 0.70
- [illegible] 6.00
- [illegible] 3.00

0.70

0.70

2.00

1.00

نوٹ: [illegible]

تفہیم القرآن کے پیچھے اُلٹ سے بڑی کم قیمت پر

V.P محصول [illegible] 7

- [illegible]
- [illegible]
- [illegible] 13/-

5/-

[illegible] VP [illegible] 20 [illegible]

[illegible]

۱۰

تجلی

خلفشار نمبر

قابل خیرآبادی

رمضان [illegible] — اگست ۱۹۶۹ء

جلد ۹ — شمارہ ۱۱۰

ایک شمارہ -/3

سالانہ چندہ -/26 — V.P سے -/30

اس دائرے میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ نے جواب کے لئے جوزر تعاون عنایت فرمایا تھا اس کی مدت اس پرچہ کیساتھ ختم ہوگئی آئندہ کے لئے جلد سے جلد زر تعاون مرحمت فرمائیں۔ منیجر

معذرت

خلفشار ضمیر کے لئے ہمارے پاس بہت اچھے اچھے سیر حاصل مضامین اکٹھا ہو گئے۔ ان میں سے ہم بہت مخصوص مضامین شائع کر رہے ہیں۔ ان مضامین کی خاطر ہمیں کچھ خاص مضامین جن کا سلسلہ جاری تھا روک دینا پڑے مثلاً "جہالانی" کی صرف دو قسطیں ہی چھپ سکی تھیں۔ تیسری قسط خلفشار ضمیر کی وجہ سے روک دی گئی۔ اب آپ اگلے شمارے میں عبرتناک کہانی جہالانی کی تیسری قسط ملاحظہ کیجئے گا۔ (ایڈیٹر)

[illegible]!

میں ۲۸ اپریل ۱۹۷۹ء کو دہلی گیا تو وہاں محترم مولانا سعدالدین صاحب امیر جماعت اسلامی جموں کشمیر سے ملاقات ہوئی۔ کشمیر میں تحریک اسلامی کے کارکنوں پر جو ظلم وستم ڈھایا گیا اسکی تفصیل اخباروں میں تو پڑھ چکا تھا مگر مولانا سے زبانی حالات سنے تو معلوم ہوا کہ اخبارات میں بہت کم آیا ہے۔ نیز اُن میں اُن خاص نشانوں پر انگلی نہیں رکھی گئی جہاں سے کشمیر کی جماعت اسلامی کے کارکنوں کے خلاف ایک منصوبہ کے تحت کشمیری عوام کو ورغلا کر یہ فعل سرزد کرایا گیا۔

مولانا سے یہ سب سنا تو دل نے کہا کہ حجاب میں ایک دستاویز کی حیثیت سے ایسے مضامین محفوظ کر دیئے جائیں جن سے ان نشانوں کی نشاندہی ہو جائے نیز جو ادارے ان کے اشاروں پر اسلام کے خلاف غلط پروپیگنڈہ کر رہے ہیں ان سے بھی عوام باخبر ہو جائیں چنانچہ ایسے مضامین جمع کر کے ترتیب دیئے گئے

یہ بات حلقہ حجاب کو معلوم ہے کہ حجاب کی ترتیب وکتابت وطباعت کا انتظام دو ماہ پیشتر کیا جاتا ہے تب جا کر دوسرے مہینے کے آخر میں شمارہ شائع ہو پاتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا اور اب کئی مہینے بعد حجاب یہ دستاویز پیش کرتا ہے۔ ماہانہ پرچوں میں ایسا ہی ہوتا ہے یہیں سے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ تحریک اسلامی سے اتفاق رکھنے والوں کی طرف سے روزنامے۔ سہ روزہ اور کم سے کم ہفت روزہ اخبار ضرور نکلنا چاہیے ورنہ ماہانہ رسالوں میں ایسے مضامین کئی ماہ کے بعد آئیں گے تو کہا جائے گا کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ خود۔ واقعی ایسے اخبارات نہ ہونے سے تحریک اسلامی کے مخالفین کے پروپیگنڈہ کی مدافعت نہ ہوسکی نتیجہ سامنے آیا۔ اب بھی اس ضرورت کو محسوس کیا جانا چاہیے۔ تعمیر حیات، دعوت اور ندائے ملت جیسے ہفت روزہ نکل رہے ہیں ان بیچاروں سے جہاں تک ہو سکا پہلے سے مدافعت تو نہ کرسکے ہاں تباہ وبرباد ہونیوالوں پر حتی الامکان آنسو بہائے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔ ہم نے ان پرچوں سے زیادہ تر استفادہ کیا۔ اور اب یہ سب ان تمام پرچوں کے شکریہ کیساتھ شائع کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھیں

مالک و ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد اسحٰق، ماڈل ٹاؤن آزادی مطبوعہ ... کے پرنٹرز دہلی۔ مقام اشاعت محلہ ... محمد کمال امروہہ یوپی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قرآن کا مُطالعہ

اداریہ

• قرآن مجید کھولئے۔ پڑھنا شروع کیجئے۔ سب سے پہلے تین قسم کے انسانوں کا تعارف آپ کے سامنے آئے گا۔ (۱) متقین۔ وہ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں۔ صدقہ، خیرات اور انفاق کرتے ہیں۔ قرآن مجید پر اور اس سے پہلے والی الہامی کتابوں پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت کے دن پر انھیں پورا یقین ہوتا ہے۔ (۲) کافر، وہ جو انہی اوپر لکھی ہوئی باتوں سے انکار کرتے ہیں۔ (۳) منافق، منافقوں کا کردار دوسرے رکوع سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی وہ جو کسی وجہ سے کہتے تو ہیں کہ ہم مسلمان ہیں لیکن وہ دل سے مسلمان نہیں۔

اللہ تعالےٰ نے پہلی قسم کے کردار والے متقیوں کو جنتی فرمایا " هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ " دوسری اور تیسری قسم کے انسانوں کو جہنمی قرار دیا۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ •

انہی تین قسم کے انسانوں کے کردار کی وضاحت بڑی تفصیل سے جگہ جگہ قرآن کریم میں پائی جاتی ہے۔ ان میں دوسرے نمبر کا گروہ (کافر) اسلام کا کھلا ہوا دشمن اور تیسرے نمبر کا یعنی گروہ منافقین چھپا ہوا۔ دونوں اسلام کے دشمن ہیں۔ تیسرے گروہ کا منافق گروہ ہمیشہ در پردہ کافروں سے مل کر اسلام کو نقصان پہنچاتا رہا۔ آج بھی نقصان پہنچا رہا ہے کل بھی پہنچائے گا۔ یہ جب دیکھتا ہے کہ اسلام اُبھر رہا ہے تو اس کے سینے پر سانپ لوٹنے

لگتا ہے۔ ایسے لوگوں کے غیظ و غضب کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ فرمایا کہ:۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ (سورۃ آل عمران آیت ۱۱۹ و ۱۲۰)

مسلمانو! تمہارے خلاف ان کے غیظ و غضب کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں۔ ان سے کہدو کہ اپنے غصّے میں آپ جل مرو۔ اللہ دلوں کے چھپے ہوئے بھید جانتا ہے۔ مسلمانو! تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برُا معلوم ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کوئی چال تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس پر حاوی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں منافقوں کا کردار مسلمانوں کے لیے جیسا تکلیف دہ رہا وہ کسی سے چھپا نہیں ہے۔ یہ مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ جوڑ توڑ میں لگے رہے۔ ذرا ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا دیتے۔ مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی کوشش کرتے۔ کافروں سے در پردہ ساز باز کر کے انھیں مسلمانوں پر حملہ کرنے کی ترغیب دیتے۔ عین گھمسان کی لڑائی

میں جبکہ مسلمانوں کو فتح حاصل ہونے کو ہوتی یہ یکدم بھاگ کھڑے ہوتے مسلمان گھبرا جاتے۔ احد کی لڑائی میں انہی کی چالوں نے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ انہی چالبازوں نے ٹھیک اس وقت جبکہ لڑائی زوروں پر تھی اور مسلمانوں کا پلہ بھاری تھا مشہور کردیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہوگئے۔ انہی ذات شریفوں نے ازواج مطہراتؓ پر تہمتیں لگا کر اللہ کے رسول کو دلی صدمے پہنچائے۔ وہ تو کہیئے کہ اللہ نے اسلام کی حفاظت کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا ورنہ ان ظالموں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

مضمون کی ابتداء میں جو تین قسم کے لوگوں کا تعارف قرآن سے اخذ کرکے پیش کیا گیا ہے۔ یہ تینوں کردار قیامت تک رہیں گے۔ اللہ کے بندے اللہ کے حکموں کے مطابق نعرۂ اسلام بلند کرتے رہیں گے کافر اور منافق آپس میں ساز باز کرکے مسلمانوں کے خلاف منظم پروپیگنڈا کریں گے۔ مسلمانوں پر جھوٹی تہمتیں لگائیں گے۔ انھیں باہم لڑانے کی کوشش کریں گے۔ اسلام کو کہیں پھلتا پھولتا دیکھیں گے تو ان کا دل کڑھے گا تحریک اسلامی میں حصہ لینے والوں پر مصیبت آئے گی تو یہ خوش ہوں گے۔ بے چارے مسلمانوں کو طرح طرح سے بدنام کرکے عوام کو ان پر چڑھا لائیں گے اور پھر ان کو تباہ و برباد کرنے کی ہر امکانی کوشش کریں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے ساتھ انھوں نے یہی کیا۔ آج بھی جہاں موقع پاتے ہیں، کرتے ہیں۔ ان کا ایک عجیب و غریب کردار یہ بھی رہا ہے کہ جیتے سے نہ جیتیں تو سینہ پہ چڑھ دوڑیں۔ ابھی زیادہ دنوں کی بات نہیں کل کی بات ہے کہ دو ملکوں میں تحریک اسلامی کو ذرا سی کامیابی حاصل ہوئی تو ان کے کلیجے پکنے لگے۔ بہ قول قرآن اپنی انگلیاں چبانے لگے۔ غصے میں جلنے بھننے لگے۔ کل تک جسے خود بُرا کہتے تھے، وہ فرار ہوا یا قتل ہوا تو فراری کو کرتار کا خطاب دیا اور شراب پینے والے ظالم شخص کو شہید اعظم کا خطاب دے کر شہید کربلا حضرت حسین رضؓ کے برابر کا مرتبہ

دے دیا مگر جب جید سے نہ جیتے تو سید پر چڑھ دوڑے۔ اور پھر جہاں جہاں ان کو موقع ملا۔ گھر کے گھر جلوا دیے۔ عصمتیں لٹوا دیں۔ غریبوں اور سیدھے سادھے بے قصور مسلمانوں کو جی بھر کے ستایا اور خوب شاد ہوئے۔ ان کے نزدیک ان کا شہیدِ اعظم ہی صرف انسان تھا۔ باقی ہزاروں مسلمان جو قتل کر دیے گئے۔ جلا دیے گئے یہ انسان نہیں تھے۔

قرآن کہتا ہے کہ مسلمان آزمائشوں سے گزرتے تو ہیں لیکن اگر وہ صبر کریں اور اللہ کا تقویٰ اپنائے رہیں تو انجام کار وہی کامیاب ہوں گے۔ اور منافقوں اور کافروں کی کوئی چال کارگر نہ ہوگی۔ کیونکہ اللہ ایک طرف آزمائشوں میں گھرے ہوئے اپنے بندوں کو نگاہ میں رکھتا ہے۔ تو دوسری طرف کافروں اور منافقوں کو بھی گھیرے میں لیے رہتا ہے۔ یہ اس کے عذاب سے بچ کر بھاگ نہیں سکتے۔ ان میں سے ایک صاحبِ اقتدار جس کا کردار مدینے کے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی سے ملتا ہے۔ آج خوش ہو رہا ہے کہ اس نے اپنے یہاں تحریک اسلامی کے علمبرداروں کو برباد کر دیا۔ آئندہ کے لئے وہ اپنے اقتدار کے نہ چھننے پر مطمئن ہے لیکن میرا قیاس یہ کہتا ہے کہ اس نے اپنے اوپر عذاب الٰہی بلانے میں بہت جلدی کی۔ اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ وہ بہت جلد اپنے کرتوتوں کی سزا اس دنیا میں بھی پا لے گا۔ ان شاء اللہ!

اب انقلاب آجانا چاہیے: حضرت مصعب بن عمیرؓ مکے کے نہایت حسین و جمیل اور سفید پوش جوان تھے۔ مسلمان ہوئے تو اپنے گھر کے اندر بھی دکھ جھیلے اور باہر بھی۔ ہجرت کر کے حبش چلے گئے۔ پھر جب واپس ہوئے ایک کمبل جس میں پیوند لگے ہوئے تھے اور مصعبؓ بہت ہی دبلے ہو چکے تھے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس حال میں دیکھا تو آنکھوں میں آنسو آگئے فرمایا: خدا کی قسم مکہ میں ان سے زیادہ حسین و جمیل اور خوش پوشاک دوسرا نہ تھا۔ اب تو انقلاب آ ہی جانا چاہیے۔

ہوشیار! اے مرد مومن ہوشیار

امریکی سی آئی اے کے ایک ذمہ دار افسر کی "انتہائی خفیہ" رپورٹ پڑھیے اور اپنے عمل سے جو تاریخ آپ لکھ رہے ہیں اس کے صفحات میں اپنا مقام تلاش کیجیے۔ بظاہر یہ خط مصر کے قضیے سے متعلق ہے مگر معمولی تدبر سے انسان سمجھ لیتا ہے کہ سی۔آئی۔اے کا کام کیا ہے اور حلقۂ اثر کہاں تک ہے اور ان کو خطرہ کس قوت سے کہاں کہاں ہے۔ خصوصاً حالیہ واقعات مثلاً ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی پھانسی کے بعد مغربی پریس اور اس کے زیر اثر بیشتر اردو اخبارات اور بعض شخصیتیں جس طرح تحریک اسلامی کے خلاف حرکت میں آئیں اور خود ہندوستان میں جماعت اسلامی ہند کو بدنام کرنے اور عوام کو گمراہ کرنے کے لیے جھوٹے پروپیگنڈے کا جو طوفان اٹھایا گیا اور جماعت کے دفاتر کو لوٹنے، جلانے، اس کی املاک کو تباہ و برباد کرنے اور اس کے افراد کو قتل کرنے کا جو بھیانک ڈرامہ کھیلا گیا یا ایران کے اسلامی انقلاب کی غلط تصویر کشی کے لیے مغربی پریس اور امریکی و روسی طاقتیں جس طرح متحدہ طور پر سرگرم عمل ہیں۔ جمشید پور کے حالیہ فساد کے سلسلہ میں جماعت اسلامی ہند کے غیر فرقہ وارانہ اور آر۔ایس۔ایس اور عام ہندوؤں میں جماعت کی دعوتی کوششوں کو جس طرح غلط معنی پہنانے کی کوشش کی جا رہی ہے

اور جس میں ہمارے اچھے اچھے اردو اخبارات بھی ملوث ہو رہے ہیں۔ وہ سب اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ سی آئی اے کا ہاتھ کہاں کہاں کام کر رہا ہے اور کس کس طرح اس تحریک کو بیخ بُن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے عالمی منصوبہ بندی اور سازشی طریقۂ کار کے سا[تھ] کوششیں جاری ہیں۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ سی آئی اے کا آلۂ کار بننے والی طاقتیں تحریک اسلامی کو ہی سی آئی اے کا ایجنٹ بتاکر اپنی پوزیشن صاف کرنے اور تحریک کو بدنام کر[نے] کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ یہ کوشش ایسی ہی ہے جیسے چور اپنے بچاؤ کے لیے دو[سروں] کی طرف اشارہ کر کے خود ہی چور چور چلانے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کی سی آئی اے ہو یا روس کی کے جی بی یا اور کوئی صیہونی طاقت یہ سب اسلام کی دشمنی میں متحدہ طور پر سرگرم عمل ہیں اور ہماری ملت ہی کے افراد کو آلۂ کار بنائے ہیں۔ (ادارہ)

انتہائی خفیہ منجانب: رچرڈ بی مچل

بنام: سربراہ خفیہ سروس سی آئی اے۔

آپ کے پاس ہمارے نمائندوں اور کارندوں کی بھیجی ہوئی جو معلومات جمع ہو چکی ہیں اور مصری اور اسرائیلی انٹلی جنس کی جو رپورٹیں ہمیں ملی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ مصر اور اسرائیل میں جو معاہدہ ہونے والا ہے اس کے راستے میں مزاحم ہونے والی حقیقی قوت اسلامی تنظیموں میں سرفہرست "الاخوان المسلمون" کی جماعت ہے جو مختلف شکلوں میں عرب ملکوں میں کام کر رہی ہے اور امریکہ میں بھی۔

اسرائیلی محکمۂ جاسوسی نے سفا[رش کی] ہے کہ معاہدہ پر دستخط کرنے سے پہ[لے] جماعت پر کاری ضرب لگائی جائے تا[کہ] پر دستخط ہونے کی بھی ضمانت مل جا[ئے اور] دستخطوں کے بعد اس پر عمل درآمد ہو۔ [اس سے پہلے] بھی اس سفارش پر (سابق) مصری کی حکومت نے جزوی طور پر عمل کر[تے ہوئے] "جمعیۃ الہجرۃ والتکفیر" پر ضرب لگا[ئی]

ان چیزوں کے ساتھ ہی ہماری رائے یہ بھی ہے کہ صدر ناصر کے زمانے میں "اخوان" ختم کرنے کے لیے جو ذرائع ہم نے اختیار کیے وہ نہ صرف اخوان کو ختم کرنے میں ناکام ہوئے بلکہ الٹا ان کی وجہ سے عام مسلمانوں کے دلوں میں ان کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے اور خاص طور پر وہ نوجوانوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔

ان سب باتوں کے پیش نظر ہم اخوان سے نمٹنے کے لیے متبادل حل کے طور پر مندرجہ ذیل ذرائع اختیار کرنے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔

۱۔ مکمل خاتمے کے بجائے جزوی خاتمے پر اکتفا کیا جائے صرف ان راہنما شخصیتوں کا خاتمہ کیا جائے جو دوسرے ذرائع سے جن کا ذکر ہم آگے کرنے والے ہیں، قابو میں نہ آئیں۔ ہم اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ ان شخصیتوں کا خاتمہ ایسے طریقوں سے کیا جائے جو بالکل طبعی اور فطری معلوم ہو۔ ان میں سے بعض شخصیتیں سعودی عرب میں موجود ہیں ان سے جلد چھٹکارا حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اس سے دو مقاصد حاصل ہوں گے۔ ایک تو جزوی خاتمے کے منصوبے پر عمل درآمد ہوگا اور دوسرے اخوان اور سعودی حکومت کے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ جس سے ہمیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مدد ملے گی۔

۲۔ جن شخصیتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ کیا جائے ان کے سلسلے میں ہم مندرجہ ذیل اقدامات کی سفارش کرتے ہیں۔

(۱) جن لوگوں کو بڑے بڑے مناصب دے کر ورغلایا جا سکتا ہے۔ بڑے بڑے اسلامی منصب دیے جائیں تاکہ ان کی قوتیں یہی منصوبے نچوڑ لیں۔ اس کے ساتھ ہی ان پر اور ان کے اہل و عیال پر مادی سہولتوں کی بارش کر دی جائے تاکہ وہ ان میں پوری طرح منہمک ہو جائیں اور عوام سے ان کا رابطہ کاٹ کر ان کی بنیاد ختم کر دی جائے۔

(ب) ان سب سے جن کے کاروباری رجحانات ہوں، ان پر کام کر کے انھیں ان کاروباری منصوبوں میں حصہ دار بنانے کی کوشش

کی جائے جن کے بارے میں طے ہے کہ معاہدہ کے بعد مصر اور اسرائیل کے اشتراک سے ان کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔

(ج) پٹرول پیدا کرنے والے عرب ملکوں میں ان کے لیے کام کے مواقع پیدا کیے جائیں اس طرح وہ اسلامی سرگرمیوں سے دور ہو جائیں گے۔

(د) یورپ اور امریکہ میں جو عناصر فعال ہیں ان کے بارے میں ہماری تجاویز حسب ذیل ہیں:۔

(ا) ان کی قوتوں اور کوششوں کو غیر مسلموں پر صرف کروایا جائے۔ پھر اپنے اداروں کے ذریعہ ان کاوشوں کو لاحاصل بنادیا جائے۔

(ii) ان کوششوں کو اسلامی کتابیں چھاپنے اور شائع کرنے میں کھپا دیا جائے اور ساتھ ہی ان کے نتائج کو ناکام کر دیا جائے۔

(iii) ان کی قیادتوں میں آپس میں شکوک وشبہات پیدا کیے جائیں۔

ان میں اختلافات کے بیج بو کر ان کو نما[یاں کیا جائے]
تاکہ نتیجہ خیز سرگرمیوں کے بجائے ان [...]
میں اپنی قوتیں جھونک دیں۔

(۳) نوجوانوں کے بارے میں [...]
کرتے ہیں کہ:۔

(ا) ان کی قوتوں کو مذہبی رسو[م]
عبادات میں کھپایا جائے۔ اس سلسلے [...]
مذہبی قیادتیں مفید ثابت ہو سکتی ہیں [...]
عبادات پر زور دیتی ہیں اور سیا[...]
تعارض نہیں کرتیں۔

(ب) مذہبی اور فروعی اختلافا[ت]
کو وسیع کیا جائے اور نوجوانوں [...]
میں ان کو نمایاں کیا جائے۔

(ج) سنت پر حملوں کی حوصلہ [افزائی کی]
جائے اور سنت اور دوسرے ا[...]
کے بارے میں شکوک وشبہا[ت پیدا]
کیے جائیں۔

(د) مختلف اسلامی جماعتوں [میں پھوٹ]
ڈالی جائے اور ان جماعتوں کے
مابین تنازعات کھڑے کیے جا[ئیں]

، نوجوانوں کی توجہ اسلامی تعلیمات کی
۔ بڑھ رہی ہے۔ یہ ایک رَو ہے جس
قابلہ ضروری ہے۔ خاص طور پر لڑکیاں
یاں اسلامی لباس کا التزام کر رہی ہیں۔
: مقابلہ ذرائع نشر و اشاعت اور جوابی
، سرگرمیوں کے ذریعہ ضروری ہے۔
(د) مختلف مراحل میں تعلیمی سرگرمیوں
ذریعے اسلامی جماعتوں کی کاوشوں
بے اثر بنایا جائے اور ان کا دائرہ محدود
نے کی کوشش کی جائے۔

اس نازک موقع پر اسلامی جماعتوں
مسئلہ کے حل کے لیے یہ ہماری تجاویز
، اگر آپ ان سے اتفاق کریں تو ان
فوری تنفیذ کے لیے متعلقہ حلقوں کو
راز جلد ہدایات بھیج دی جائیں اور
ن اس سلسلے میں جو کردار ہیں ادا کرنا
ہے۔ ہم اس پر عمل کرنے کیلئے بالکل تیار ہیں۔

دستخط

(رچرڈ پی۔ مچل)

(بشکریہ "الدعوۃ" مصر)

آج آپ نے

- ★ قرآن کے کچھ حصے کا مطالعہ کیا؟
- ★ قرآن کی کوئی سورت یا آیت زبانی یاد کی؟
- ★ قرآن کے کسی حصہ کو ترجمہ یا تفسیر سے سمجھنے کی کوشش کی؟
- ★ قرآن یا حدیث کی کسی آیت یا حکم پر عمل شروع کیا
- ★ تمام نمازیں پابندی وقت سے باجماعت ادا کیں
- ★ کوئی عمل خالص اللہ کے لئے کیا؟
- ★ اپنے گھر والوں کو دین اسلام کے بارے میں ہدایت کی۔؟
- ★ اپنی روزانہ آمدنی میں سے سائل ومحروم اور یتیموں کا حصہ رکھا۔

اگر نہیں

تو آج آپ نے اپنی عمر عزیز کا ایک اور قیمتی دن یونہی کھو دیا۔ کوشش کیجئے کہ آئندہ کل آج سے بہتر گذرے۔ اگر آپ نے روزانہ پندرہ منٹ بھی قرآن و حدیث کے پڑھنے، یاد کرنے اور اس پر عمل کرنے میں گذارے تو یہ دنیا و آخرت میں آپ کی فلاح ونجات کا سبب بن جائینگے خدائے تعالیٰ آپکے ارادوں میں استقامت عطا فرمائے آمین

علامہ اقبالؒ کی روح سے معذرت کے ساتھ

[illegible]

اخبار "دعوت" دہلی کے "خبر و نظر" کے کالم سے

ابلیس اپنی مجلس عاما سے مخاطب ہے۔

• میرے عزیز ساتھیو! تم نے ہر اور پنج پنج میں میرا ساتھ دیا ہے کون سا الٰہی فرمان ہے جس کو تم نے ایک چیلنج کی حیثیت سے قبول نہ کیا ہو اور جس کے مقابلے کے لئے تم نے ایک ایک جز تک پر میری ہدایت کے مطابق عمل نہ کیا ہو۔ اس کائنات کی سب سے بڑی قوت کے سامنے اکڑ کھڑا ہونا کوئی آسان کام نہیں لیکن تنہا تم ہو جنھوں نے یہ مشکل خدمت سرانجام دینے میں میری مدد کی ہے۔ میں احسان فراموش نہیں کہ تمہاری ان خدمات کو بھول جاؤں اور اگر میں انھیں بھولنے کی کوشش کروں تو میرے لیے اس سے کہیں بہتر ہوگا کہ میں خودکشی کر لوں۔ ہزارہا سال کے سرد و گرم چشیدہ اور آزمودہ کار، کارکنوں کو کوئی بے عقل ہی فراموش کر سکتا ہے اور تم جانتے ہی ہو کہ مجھے کوئی بے عقل نہیں قرار دے سکتا۔

آج میں تم سے جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس پر یقیناً برا نہیں مانو گے بلکہ اسی اسپرٹ میں تم اسے سمجھنے کی کوشش کرو گے جس جذبے سے میں اس کا اظہار کر رہا ہوں۔

اس دنیا کو جو تمہارے چاروں طرف بکھری ہوئی ہے۔ میں نے اسے زبان، قوم، نسل، رنگ اور چھوٹے بڑے گروہوں میں تقسیم کیا اور تم سب نے انسانی وحدت کو نت نئے عنوانات سے بانٹنے اور آپس میں ٹکرا دینے کی کوشش کی۔ صدیوں سے یہ نسخہ اس دنیا میں رائج ہے لیکن ادھر کچھ دن سے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تم شاید اپنی سرگرمیوں پر مطمئن ہو چکے ہو اور

تم میں پھر سے مجبور و تعطل پیدا ہو چکا ہے۔ ایک زندہ اور فعال گروہ کے لئے یہ تعطل موت کی نشانی ہے۔ میرے ساتھیو! میرے ان اشاروں سے تم کو میری پریشانی کا کچھ اندازہ تو ہو گیا ہو گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اپنے تاثرات پیش کرو۔

● مجلس عاملہ کا ایک تجربہ کار ممبر۔ حضور والا! آپ کی شکایت اپنی جگہ بجا ہے۔ ہم نے قدم قدم پر آپ سے ہی رہنمائی حاصل کی ہے اور ہمیں پوری امید ہے کہ جن خطرات کا آپ نے اظہار فرمایا ہے ان سے کامیابی کے ساتھ نمٹنے میں بھی آپ کی رہبری ہی ہمارے کام آئے گی۔ لیکن بے جا نہ ہوگا کہ آپ ان خطرات کو ذرا اور وضاحت کے ساتھ ہمارے ذہن نشین کرا دیں۔ ہم نے انسانیت کو مغربی اور مشرقی قوموں میں تقسیم کیا۔ ہم نے مغرب کے بحری قزاقوں کو لوٹ مار کا طریقہ سکھایا اور اس لوٹی ہوئی دولت سے اپنی اپنی سلطنتوں کو وسیع کرنے کا سبق دیا۔ ہم نے انھیں سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں تحقیقات کے دائرے عطا کئے اور مشرق کو مجبور کر دیا کہ وہ انھیں امام تسلیم کر لیں ہم نے مشرق کے باشندوں کو اتنا سمجھا دیا کہ وہ سائنسی تحقیقات انجام دینے والوں کو اپنا ذہنی اور فکری امام بھی مان لیں۔ ہم نے سرمایہ داری، اشتراکیت اور صیہونیت کو جنم دیا اور انھیں ہمہ وقت یہ کام سونپے رکھا کہ وہ مذہب و اخلاق اور خدا پرستی اور خوفِ آخرت کے ہر گوشے کو زندگی کے ہر دائرے سے نکال پھینکیں۔ ہم نے اس صحافت کو جنم دیا جس نے انسانوں کو انسانوں سے بیزار کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی وہ ہم ہی ہیں جنھوں نے سیاست کو ایک فن قرار دیا اور اس طبقے کو اخلاق و اصول سے عاری کر کے دنیا کے لئے ایک مصیبت پیدا کر دی۔ آپ نے جن اندیشوں کا اظہار کیا ہے اس سے مراد اگر مغرب سے اٹھنے والا اشتراکی سیلاب ہے تو اس میں اب محدود قومیتوں کے سوا اور کیا رکھا رہ گیا ہے کوئی دن بھی آسکتا ہے جب ان قوموں کے اندر انسانوں کا باہمی ٹکراؤ ہوگا اور جدلی ارتقا کے نام پر وہ اپنے داخل اور خارج دونوں زاویوں سے سرنگوں ہو جانے والے ہیں۔

اگر اس سے مراد سرمایہ دارانہ نظام ہے تو وہ سرے سے کوئی نظام ہے ہی نہیں اور اس میں بھی رعشہ پیدا ہونے لگا ہے اگر صیہونیت کو آپ نے کوئی خطرہ سمجھا ہے تو وہ آنجناب ہی کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے ہاں اس سے آپ کا اشارہ اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت کی طرف ہو سکتا ہے لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ اس ایک کتاب ایک رسول اور ایک عقیدہ رکھنے والوں کو ہم نے کتنی ہوشیاری سے ایک دوسرے سے جنگ آزما بنا دیا ہے کیا علماء علماء سے دست و گریباں نہیں ہیں. کیا دین کے فروغ کے لئے جو تعلیم گاہیں بنائی جاتی ہیں اور ان سے جو طالب علم نکلتے ہیں وہ مسالک اور ان کے جزئیات پر اپنا وقت صرف نہیں کر رہے ہیں. کیا دین کے نام پر اٹھنے والی تنظیمیں اپنے اپنے خول میں بیٹھ کر اپنی ہم عصری تنظیموں پر گولہ باری نہیں کر رہی ہیں. کیا اسلام کے سہارے کھڑی ہونے والی جماعتیں اور ان کے لیڈر اپنی جماعت اور ان کے لیڈر اپنی جماعت اور اپنی ذات سے اونچا اٹھ سکے ہیں. کیا ان کی صحافت اور ان کے بیشتر صحافیوں کے قلم انتشار ملت اور انہدام دین کے فرائض ادا نہیں کر رہے ہیں۔

.● ابلیس: (مداخلت کرتے ہوئے) ساتھیو! میں تمہارے کارناموں کا درجہ کم نہیں کرنا چاہتا لیکن کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اس دین کو ماننے والی امت میں ایسے رجحانات پیدا ہو رہے ہیں جو اسے حزب اللہ میں بدل دے اس کے نوجوان اب مرعوب نہیں ہیں وہ اسلام کو ایک فرقے کا مذہب بنائے رکھنے کے بجائے دنیا کا مذہب اور دنیا والوں کے لئے نظام حیات بنانے کے درپے ہیں. انھوں نے اپنی نئی نسلوں کو دوسروں کا ایندھن بننے سے بچانا شروع کر دیا ہے ان میں وہ دولت مند پیدا ہو رہے ہیں جو دین کے غلبے کے لئے اپنی دولت صرف کر رہے ہیں ان میں وہ لکھنے والے ابھر رہے ہیں جنھوں نے مرعوبیت دور کی ہے ان کا نوجوان خون دفاعی خانوں میں بیٹھنے کی بجائے اقدام کی باتیں سوچنے لگا ہے۔ انھوں

نے مغرب پر یورش شروع کر دی ہے ان میں کارکنوں کا نظم پیدا ہونے لگا ہے جو ہر محاذ پر لوہا لینے کے لئے تیار ہیں کیا یہ سب خطرات کم ہیں۔

• دوسرا شیطان :۔ حضور والا خطا معاف، ہم لوگ آپ کے نشان کردہ خطرے سے بھی ناواقف نہیں ہیں وہ ہم ہی ہیں جنھوں نے ان پیش آمدہ خطرات کا منصوبہ بند مقابلہ کیا ہے۔ ہم نے کچھ دوسرے گروہوں کو آمادہ کیا ہے کہ وہ خدا بیزار اور خدا کے منکر ہونے کے باوجود اس ملت کے غم خوار بنیں اور سیاسی اختلافات کی آڑ لے کر انھیں ایک دوسرے سے لڑوا دیں۔ ہم نے ہم عصری کے فتنے کا سہارا لیا اور ملت کے ہم عصر رہنماؤں میں یہ احساس اُبھار کر ان کوششوں کے ابھرنے سے تمہارے نام اور تمہاری شخصیات فنا ہو جائیں گی۔ اس لئے یہی وقت ہے کہ کسی نئی قوت کو نہ اُبھرنے دو۔ پہلے ہم نے مسجدیں الگ الگ کرا دی تھیں۔ اب ہم نے ان کے ہاتھوں مسجدیں منہدم کرائیں، کلام پاک پامال کرائے اور ملت کے حق گو انسانوں کو تباہ کرایا۔ کیا یہ باتیں حضور کے اطمینان کے لیے کافی نہیں۔

• ابلیس : ہاں میں ان علامتوں سے مطمئن نہیں۔ تم یہ نہیں دیکھ رہے ہو کہ خطا کاروں میں ندامت کا احساس بیدار ہونے لگا ہے اور ان میں اپنے مظالم پر پشیمانی پیدا ہو رہی ہے۔ ایک خطا کار مومن سے زیادہ میرے نزدیک وہ مومن خطرناک ہے جس میں غلطیوں پر ندامت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ ایک طرف ندامت اور توبہ اور دوسری جانب عفو و درگزر نے جس ملت کو بار بار جوڑا ہے اور جس کی تعلیم و تربیت اس گروہ انسانی کے ضمیر میں داخل ہے وہ جذبہ اس کے دلوں میں سوئے ہوئے مسلمان کو جھنجھوڑتا ہے اور یہ پھر سے کندھے سے کندھا ملا کر دین کی اقامت کے لیے کھڑا ہونے لگتا ہے، اس لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ تم یہ احساس پیدا نہ ہونے دو۔

● ایک اور شیطان! حضور ہماری اس پر گہری نگاہ ہے اور ہم نے الحادی تحریکوں کے کارکنوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی ہے کہ یہ وقت خاموش بیٹھنے کا نہیں۔ تاہم یہ تار و پود کسی وقت بھی بکھر سکتا ہے

● ابلیس: یہ بات صحیح ہے لیکن ہمارا کام اپنی راہ پر چلتے رہنا ہے اس کے لئے سر دست میرا مشورہ یہی ہے کہ ہر رنگ زمین جال پھیلاتے چلے جاؤ۔ ہمعصری کے فتنہ اور سستی صحافت کی بیباکی کا سہارا لو اور اس کے نتائج سے آئندہ نشست میں مطلع کرو دنیا کے دولتمند ترقی یافتہ ممالک اس سلسلے میں تمہارے کام آئیں گے بس شرط یہ ہے کہ تمہاری پیش قدمی میں جمود نہ پیدا ہونے پائے۔

اسلامی حدود کے اعلان کے بعد

اسلامی حدود کے اعلان کے بعد پاکستان میں جرائم میں اچانک جس طرح کمی آئی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ اگر اس اقدام کے نتیجے میں وہاں امن و امان قائم ہوا ہے، مخلوق خدا کی جان و مال اور آبرو محفوظ ہوئے ہیں۔ تو کیا حدیث کی رو سے نیکی میں تعاون کرنے والے کی مانند موجب اجر نہیں؟

پاکستانی حکومت کے اپنے شائع کردہ اعداد و شمار کے مطابق بارہ ربیع الاول (۱۰ فروری ۱۹۷۹ء) کے اعلان کے بعد سے ایک ماہ کا سال سابق کے اسی ماہ سے تقابلی مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں۔

	سال سابق ۱۹۷۸ء ۱۰ فروری تا ۱۰ مارچ	اعلان ربیع الاول کے بعد ۱۰ فروری تا ۱۰ مارچ ۱۹۷۹ء
اندراج مقدمات	۶۸۵۰	۲۴۳۴
قتل	۹۷	۵۸
قاتلانہ حملے	۲۳۹	۱۷۹
چوری ڈاکہ زنی کے واقعات	۴۳۵	۳۲۷
مویشیوں کی چوری	۴۰۷	۲۲۹
اغوا	۲۰۹	

مصر کا سادات

اسلام دشمن تحریکوں کیساتھ

فسادات - فسادات - فسادات

چونکہ اسلامی لہر سے اس وقت خاص طور سے ایران کے "المیہ" کے بعد امریکی سخت پریشان ہیں اور یہودیوں کو بھی تشویش ہے۔ اس لیے ان قوموں کی خواہش ہے کہ اس معاہدہ سے فائدہ اٹھاکر اسلامی قوت پر ضرب کاری لگائی جائے۔ سادات اس دباؤ کو مان چکے ہیں اس کے لیے انھوں نے اپنے خصوصی مشیر حسن تہامی کو سادات صاحب نے یہ ذمہ داری سونپی کہ ایک جامع رپورٹ تیار کی جائے جس کے مطابق اس قوت کا مقابلہ کیا جا سکے حسن تہامی نے جو رپورٹ تیار کی اس کو صدر کو پیش کرنے سے پہلے اسرائیل کے وزیر اعظم کے مشیر اور امریکی سفارت خانے کے اسلامی امور کے ماہر کو دکھائی اور ان سے بعض تجویزیں ملیں اس کو بھی اپنی تجاویز میں شامل کیا۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اس رپورٹ کا خاص حصّہ مصری عیسائی رہنما کے مشورے سے طے ہوا۔

رپورٹ

مکمل تحقیقات اور امکانی وسائل کے بروئے کار لانے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ویسے تو مصر میں اور بھی بہت سی دینی کام کرنے والی جماعتیں ہیں جیسے "انصار السنۃ" "عباد الرحمن" "تبلیغی جماعت" "نوجوانان محمد" "الجمعیۃ الشرعیہ" "جماعت تحریر" اور اس کے علاوہ اسلامی جماعتیں جو کالجوں یونیورسٹیوں مدرسوں اور تعلیم گاہوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور فعال ہیں اور اسی طرح وہ مسجدوں کے امام جو بہت مقبول ہیں اور ان کا دینی مقام

ہے مگر اصل مقابلہ جس جماعت سے کرنا ہے اور جس کے خطرے کو دبانا ہے وہ ہے الاخوان المسلمین، کیونکہ یہ واحد جماعت ہے جس کی سرگرمیاں چند دینی مسائل تک نہیں ہیں اور جو ایک مستقل مدرسۂ فکر بن گئی ہے اور جس کی آواز ہر جگہ پرکشش ہے اور جس کا ایک محدود دائرہ نہیں ہے اور وہ اپنے طریقۂ کار کے مطابق صرف بعض لوگوں کو سامنے لاتی ہے تاکہ کسی مصیبت کو جھیل لیں۔ اور اصل قوت کو بہت ہی خاموش اور خفیہ انداز میں بھرپور صلاحیت اور خفیہ انداز میں کرتی ہے۔ تاکہ اس کے پیغام کو دور دور تک پہنچایا جا سکے اور چپہ چپہ میں اس کے ماننے والے تیار ہو سکیں بلکہ کمیٹی کا تو یہ بھی خیال ہے کہ یہ بات بالکل بعید از قیاس نہیں کہ اس جماعت کے نظریات اور طریقۂ کار نے ایرانی انقلاب کو راہ سجھائی ہو۔ اس لیے کہ ایسے حقائق سامنے آتے ہیں جن کے مطابق اس وقت کے اخوان کے رہنما حسن ہضیبی نے ۱۹۵۶ء میں حکومت مصر کو الٹنے کا جو پلان بنایا تھا۔

یہ سب سامنے رکھتے ہوئے کمیٹی کو جو فرائض تفویض کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ جماعت اخوان کے افراد اور ان کے حامیوں کی مسلسل نگہداشت اور ان کی تمام سرگرمیوں کا جائزہ اور جدوجہد۔

۲۔ نظریات بدلنے کے لیے ان کی ذہنی تطہیر

۳۔ ان کے نظریات دوسروں تک نہ پہنچنے دینے کے لیے ہر ممکن اقدامات اور احتیاطی طریقے۔

۴۔ سیاست کو دین سے جوڑنے کے نظریے کو ختم کرنے کے لیے خصوصی اور مستقل مہم

۵۔ اس نسل کو حجاب تک لپیٹ دینا جو اپنے نظریات کو سینے سے لگاتے ہوں۔ بتدریج اور حکمت عملی کے ساتھ مادی معنوی اور فکری طور پر بے کار اور غیر موثر بنا دیا جائے۔

۶۔ اسلامی تاریخ کے نصاب پر نظرثانی اور اس کو بدلنے کی کوشش اس پہلو کو سامنے رکھ کر ....

نئے نصاب میں دین کو معاشرتی اور اخلاقی
صورتحال سے جوڑ دیا جائے اور سیاست سے
کاٹا جائے۔ اسی طرح خلافت عثمانیہ سے جو
خرابیاں اور تباہیاں پھیلیں ان کو ابھارا
جائے اور یہ ذہن نشین کرایا جاسکے کہ
مغرب نے جو زبردست اور حیران کن پیش
رفت کی ہے وہ اس وقت ہو سکی جب
اس نے کلیسا کو شکست دے دی اور اس
کو سیاست سے دور کر دیا۔

۷۔ طالب علموں کے دین پسند والدین
پر نظر رکھی جائے اور ان کے نظریات کا بہت
باریکی سے جائزہ لیا جائے۔ اسی طرح ان کو
ہر ممکن طرح سے بدنام کرایا جائے۔

۸۔ دین کی انتہا پسندی کے مسئلے کو
ابھارا جائے (تاکہ لوگ اس سے نفرت کرنے
لگیں) اور ان کو وسائل نشر و اشاعت سے
خوب اچھالا جائے اور ایسے انتہا پسندوں
کو گرفتار کیا جائے اور پھر ان کو بہلا پھسلا کر
ان کے اعترافات جمع کیے جائیں جن
سے ان کے جنونی کٹر مذہبی ہونے کو
روشن کر دیا جائے اور اس طرح عوام کی ہمدردی
کے بجائے ان سے نفرت کی جاسکے۔ پھر اس
کے بعد اس دینی انتہا پسندی کو باہر کی کٹر
حکومت کی ایجنسی سے جوڑا جائے جس سے
معلوم ہو کہ وہ عراق اور لیبیا جیسے کٹر اور
مصر مخالف ملکوں کے اشارے پر یہ کام
کر رہے ہیں۔

۹۔ ان کی کالجوں میں نوجوان قیادت
کو بالواسطہ بھڑکایا جائے۔ اور ایسی صورت
حال پیدا کی جائے کہ وہ آسانی سے اسلحہ
حاصل کر سکیں اور پھر اس طرح ان کے اندر
سے بعض بہت ناپسند عناصر کا ان کے ذریعہ
صفایا کیا جاسکے۔ جیسا کہ حسین ذہبی کے سلسلے
میں کیا گیا اور پھر ان کو گرفتار کر کے سخت
سزائیں دی جائیں جس سے دوسرے بھی
احتیاط کریں اور اس سلسلہ میں جماعت تکفیر
کو اچھالا جائے۔

حسین ذہبی وزیر اوقاف تھے حکومت
نے ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہ سازش
کی کہ خود مروا دیا جرم میں ان نوجوانوں کو

پکڑا جو مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اس طرح ان کو بھی پھانسی دے دی اور اس طرح دینی عناد کے خلاف سخت فضا تیار کی ان دہشت پسندوں کو حکومت جماعت تکفیر کے نام دیا کیوں کہ وہ حکومت کو کافر کہتے ہیں۔

١٠۔ ہماری جماعتوں سے اور طلبہ کی اسلامی تنظیموں سے مقابلے کے لیے خصوصی طور پر عورتوں کو بھی سامنے لایا جائے۔ تعلیم گاہوں میں بھی اور دفتروں میں بھی اس لیے کہ یہ بات شبہ سے بالاتر ہے کہ طلبہ پر طالبات سے ربط ضبط کا ایک جذباتی اثر پڑتا ہے۔ اور دوسرے صنف نازک دوسروں کے مقابلے میں (بے لگام آزادی کے بعد، دینی پابندیوں اور لباس و آرائش میں روک ٹوک اور ان کی من مانی کرنے پر اعتراض) سے زیادہ گھبراتی ہیں اور یہ طریقہ ایران میں بھی کامیاب رہا جب آزاد خیال عورتوں نے ایران میں مذہبی پابندیوں پر مظاہرے کئے اور ایرانی انقلاب کی مخالفت میں نعرے لگائے۔

١١۔ داڑھی رکھنے والوں اور (کسی بھی)

طرح کے دینی تحریک تاریخ رکھنے والوں کو برطرف کر دیا جائے اور ان کو تعلیم گاہوں سے بھی نکالا جائے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے رشتے داروں کو بھی درجہ دوم کی بھی فوجی پولیس کی سیاسی اداروں کی اور نشر و اشاعت کے مراکز کی ملازمت سے دور رکھا جائے اور جو اس وقت موجود ہیں ان کو ہٹایا جائے۔ یا کسی غیر اہم جگہ منتقل کر دیا جائے۔ اگر ان کی وفاداری مشکوک ثابت ہو جائے۔

١٢۔ جو کوششیں ایک مستقل پالیسی کے تحت ان کے باہمی اعتماد کو ختم کرنے اور ان کو منتشر کرنے کے لئے کی جا رہی ہیں۔ انکو بڑھایا جائے اور مختلف طریقے اختیار کئے جائیں خاص طور سے ان کے کسی ساتھی کے خلاف ان میں سے کسی کے نام رپورٹ تیار کی جائے پھر اس کو متہم کے خلاف استعمال کیا جائے اس کوشش کے ساتھ کہ وہ آپس میں مل نہ سکیں۔

١٣۔ جتنے بھی گروہ دینی کو تحریک کے طور پر چلا رہے ہیں [illegible]

برتاؤ کیا جائے۔ مبادا وہ سب ہمارے خلاف جمع نہ ہو جائیں۔ جیسا کہ بالعموم اس سے قبل ایسا ہوتا رہا ہے۔

۱۴۔ علمی اور عملی میدانوں میں رجعت پسند نظریات کے حامل لوگوں کو ہر کام کے اور سامنے آنے کے مواقع بند کئے جائیں۔

۱۵۔ تدریس کے شعبے میں مدارس اور جامعات میں دینی ذہن کے لوگ بالکل نہ لئے جائیں اس طرح ذرائع ابلاغ سے بھی ان کو صاف رکھا جائے۔

۱۶۔ اس سے قبل یہ پالیسی تھی کہ کئی اشتراکی عناصر کے خلاف دینی عنصر کو استعمال کیا جاتا تھا کہ وہی کمیونزم کا توڑ کر سکتے ہیں۔ اب یہ روش بدلی جائے۔ اس کے برعکس اب کمیونسٹوں کو انتہا پسند دینداروں کے خلاف استعمال کیا جائے۔

۱۷۔ اس شہرت کی تردید کی جائے کہ اخوان نے معرکہ فلسطین میں کامیاب کردار ادا کیا تھا اور ایسے پمفلٹ تیار کئے جائیں جن کے ذریعہ ان کا تعلق انگریزوں سے ثابت کیا جائے۔

۱۸۔ اخوان اور بیرونی ملکوں خصوصاً سعودی عرب اور خلیج کی ریاستوں کے درمیان تعلقات بگاڑے جائیں اور اس سلسلے میں امریکن ادارے سے مدد لی جائے تاکہ ان پر ہر قسم کے دروازے بند کئے جا سکیں۔ اور کوئی ان کے ساتھ نرم برتاؤ نہ کرے۔

۱۹۔ کمیونزم کے معاشرتی نظریے کو اسلامی اجتماعی نظریے سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ حقیقت ذہن نشین کی جائے کہ جس طرح وہ نااہل ثابت ہوئے اسی طرح اسلامی سوشل نظریہ بھی ناکام نظریہ ہے۔

۲۰۔ مستقل طور سے اور تیز رفتاری کے ساتھ اس پالیسی پر زور دیا جائے کہ ازہر کو ایک کلاسیکل یونیورسٹی میں بدلا جا سکے تاکہ اس سے دین کے میدان میں کام کرنے والے فارغین کا سیلاب روکا جا سکے اور اس سے فارغ امام اور اساتذہ کی ذہنی اور عملی روش بدلی جا سکے اور قدیم اسلامی نظریات کے مطابق ان کی فکری ساخت کو نہ ڈھالا

جائے بلکہ دین میں جو اصلاح اور وقت کے مطابق تبدیلی کے علمبردار اٹھے تھے. جیسے طٰہٰ حسین اس جیسے تجدد پسند طبقے سے ان کو جوڑ دیا جائے.

۲۱. ایک طرف تو قوم کی نمائندہ پارلیمنٹ سے کھلے عام یہ اعلان کیا جائے کہ ہم اسلام کے حدود اور باہمی معاملات میں نیا قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے مسودہ کمیٹی تشکیل کی جائے۔ دوسری طرف کمیٹی کو خبردار کیا جائے کہ وہ ایسے مسودے کو ٹال مٹول کر کے غیر مؤثر بنا دے اور اس کو آگے دھکیلے یا اس کے نفاذ میں ایک طویل عرصہ کا انتظام کرائے.

● معاصر اسلامی طاقتوں سے مقابلہ

۱. اسلامی مفکرین وزعماء.

۲. اسلامی اخبارات ورسائل.

۳. نوجوان اسلامی قیادت.

یہ تین محاذ ہیں اور ان سے نمٹنے کا طریقہ کار حسب ذیل ہے.

● معاصر اسلامی مفکرین وزعماء

ان میں سرفہرست اخوان کے رہنما مرشد عام کا نام آتا ہے جن کے ساتھ جو پالیسی اختیار کی جائے وہ اس طرح کی ہے جسے کہتے ہیں اس کو اپنے ساتھ لگائے رکھو اور طویل مذاکرات کیے جاؤ اور مصالحت کے بے شمار طریقے پیش کرو یہاں تک کہ وہ تھک کر چور ہو جائیں. پھر ان کو چھوڑ دو اور اس وقت وہ تنہا ہوگا۔ اس طرح کہ کبھی ان سے دلائل سے بات کی جائے کبھی اپیلیں کی جائیں کبھی قوم کے مفاد کا حوالہ دیا جائے. اور اس طرح اس رہنما کے ملنے والوں کو ٹھنڈا رکھا جائے اور اس دوران تمام نامعلوم نئے عناصر کا ہم کو پتہ چل جائے۔ اس کے بعد ان میں پھوٹ ڈلوائی جائے اور ان کے رہنما سے الگ کیا جائے جس کی ویسے بھی ۷۵ سال کی عمر ہے اور صحت بھی بہت خراب رہتی ہے جو ۲۰ سال مصر کی جیلوں میں گذارنے سے بگڑ چکی ہے. اس طرح اس کی قوت مختصر ہے اور اس کو ضائع کرنا اور اس کے وقت کو لمبی لمبی ملاقاتوں اور مستقل [illegible]

ٹینگ کرکے بڑا آسان ہوگا اور اس طرح وہ کوئی تحریک چلانے سے عاجز ہوگا۔

بہر حال یہ ضروری ہے کہ اس کو گرفتار نہ کیا جائے کہیں لوگوں کے ذہن میں پچھلی گرفتاریوں کا منظر نہ لوٹ آئے اور وہ اس کو اس سلسلے کی پہلی کڑی سمجھیں۔

۲۔ یونیورسٹیوں کے دیندار اساتذہ اور تحریکی انجمنوں کے مدارس۔ کالجوں (ایسے سرکردہ لوگ ہیں) سے نمٹنے کے لیے تجویز یہ ہے کہ امتحان جلد سے جلد ختم کیے جائیں اور اس طرح قانونی طور پر یونیورسٹی میں اسلام پسندوں کے اجتماعات روکے جاسکیں اور وہ مظاہرے اور ہڑتالوں پر اکسانے کے لیے لوگوں کو جمع کرسکیں سپر گرل کی چھٹی پوری طرح سے جمع کرلی جائیں۔ ان کی مصروفیات کے بارے میں معلومات پوری طرح سے جمع کرکے ان سے استفادہ کیا جائے۔

• **اسلامی اخبارات ورسائل**

ان میں اہم اہم جو رسالے ہیں "الدعوۃ" اور "الاعتصام" [illegible]

پریس سے شائع ہورہے ہیں۔ بہر حال ان میں چھپنے والے مواد پر نظر رہنا چاہیے کہ وہ ان پریس کا لائسنس ختم کرنا چاہیے۔ یا اس میں دشواریاں پیدا کی جائیں تاکہ ان پر نظر رکھنی ممکن ہی رہے۔

• **نوجوان اسلامی قیادت**

یہ تیسرا محاذ ہے ان کے لیے تو جدید زندگی کے ہیجان خیز اور توبہ شکن سامان عیش و عشرت لیسے ذریعے ہیں جن سے ان کو بہکایا جاسکتا ہے اور ان کو ان کے رشتے داروں کو جلسوں اور رنگ و رامش کی محفلوں میں بلایا جائے اور ان سے اونچے عہدے یا تجارتی ٹھیکے یا شرکت کی بنیاد پر منصوبوں میں موقع فراہم کرنے کے وعدے کیے جائیں جو ہامی بھرے اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اور حکومت کے حامیوں میں شمار ہو جو نہ مانے تو نوکری میں رکاوٹ ڈالی جائے۔ ترقی نہ دی جائے ٹیکس کے معاملے کو اس کے پیچھے لگا دیا جائے اور اس کی جو [illegible] مشکلات

سیاہ کی جائیں۔

کچھ ضروری تجاویز

ایک خفیہ کمیٹی بنائی جائے اور اس کے ذمہ یہ کام ہو کہ وہ کچھ سازشیں تیار کرے جس سے وقت ضرورت فائدہ اٹھایا جائے کبھی انقلاب کی کوشش کے نام سے کبھی ارادہ قتل کی تہمت لگا کر کبھی تخریب کاری اور توڑ پھوڑ کی بات کہہ کر کبھی کسی دوسرے ملک سے مل جانے کی خبر دے کر ان کو اس میں پھانسا جائے اور اس سب کے باوجود ایک بات ہر وقت ذہن میں رہے کہ تشدد اور گرفتاری کے راستے نہ اختیار کئے جائیں جتنا بھی ممکن ہو کیوں کہ اس طرح حکومت مقامی رائے عامہ کے سامنے آزادی اور جمہوریت اور ہر شخص کو حاصل آزادی کا اعلان کرتی رہے اور اس پر آزادی ختم کرنے کی تہمت نہ لگ سکے اور اسی طرح مغرب کو بھی ہمنوا بنا لیا جائے کہ انسانی حقوق پامال نہ کئے گئے۔

بہر حال رپورٹ ختم ہو جاتی ہے۔

دستخطوں پر اس کے ساتھ دو منسلک کاغذ ہیں ایک میں بیگن کے مشیر کی بعض ترمیمیں اور تجویزیں ہیں۔ دوسرے میں امریکن ماہر کی رائے۔ وہ دونوں اس طرح سے ہیں۔

• اسرائیلی وزیر اعظم کے مشیر کی تجاویز

بیگن کے مشیر کی تجاویز کا زور اس کامیاب تجربے پر ہے جو شاہ ایران کا تھا کہ اپنے اہم معاملات میں اس نے عیسائیوں اور یہودیوں کو استعمال کیا اور نازک ذمہ داریوں کے لیے صرف ان پر اعتبار کیا اور ان لوگوں نے بھی اس کے اور حکومت کے تمام راز راز رکھے۔ آخری لمحے تک انھوں نے فاش نہ کئے ا جو ظاہر ہے ایرانی عوام اور اسلام کے خلاف تھے، اس طرح سے یہودیوں کا کردار جنگ عظیم میں اتحادیوں کے ساتھ یہی رہا ہے جنھوں نے فتح تک اتحادیوں کے راز محفوظ رکھے جب کہ ان سے ہٹلر کے بھی تعلقات تھے۔ اس بنا پر اس کی تجویز درج ذیل ہے۔

۱۔ (مصر کے حالات کے مطابق) پہلے

نازک ذمہ داریوں کے لیے قبطی عیسائیوں کو بڑھایا جائے۔ اس طرح نہ تو معلومات باہر جا سکیں گی اور نہ دینی بنیادوں پر ہمدردی کا خطرہ ہوگا۔ ہاں یہ مزید ہو کہ اس کا معاون ایک مسلمان مقرر کیا جائے اور قرارداد کی تنفید کا کام اس سے لیا جائے۔

۴۔ نوجوان قبطیوں کو فوجی تربیت دی جائے تاکہ وہ ہنگاموں کا مقابلہ کر سکیں۔ اور ان کو اسلحہ دیا جائے۔ تاکہ اگر کبھی اچانک دینی انتہاپسندی سے ہرے کا رنگ اختیار کرے تو قبطی ملیشیا باقاعدہ فوج کی مدد کر سکے کیوں کہ فوج پر الزام لگ سکتا ہے اور وہ اس سے متاثر ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے ہی دینی بھائیوں کے خلاف لڑ رہی ہے۔

۴۔ قبطی پادری کو چھاپے خانے مہیا کیے جائیں اور ربط قائم کرنے کے لیے ترقی یافتہ آلات دینے چاہئیں۔ جس سے وہ براہ راست قومی سلامتی کے ادارے اور اس کمیٹی کے سربراہ سے سلسلہ قائم رکھ سکے۔

۴۔ اس پادری کے حکم کے تابع ایک ہیلی کاپٹر بھی رکھا جائے۔

۵۔ روٹری کلب، لائنز کلب کے ممبروں سے پوری مدد لی جائے۔ اور ان کو مزید سہولتیں اور رعائتیں دی جائیں کیوں کہ انھوں نے بھی اپنا مقصد یہ بنا لیا ہے کہ دین خدا کے لیے مگر وطن سب کے لیے ہے۔

۶۔ احتیاطی تدبیر کی تجاویز سے اسے اختلاف ہے وہ چاہتا ہے کہ بم کا استعمال سے گریز کیا جائے ممکنہ حد تک تاکہ اس عہد کو ڈکٹیٹر شپ کا عہد نہ قرار دیا جائے۔

● <u>امریکن سفارت خانے کے اسلامی امور کے ماہر کا تبصرہ</u>

۱۔ اس نے بیگن کے مشیر کی تجاویز کو پسند کیا، سوائے آخری بات کے۔ کیوں کہ اس کا کہنا ہے کہ وہ اس بات کو پسند کرے گا کہ تمام قوتیں ایک دوسرے کے متوازی چلیں اور خود اس کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ انتہاپسندی کو اس کے برگ و بار لانے سے قبل ہی کچل دیا جائے۔

• • • •

مسلمانوں کی جذباتیت پر مولانا ابوالحسن علی میاں کا جچا تلا تبصرہ

میں اسی وقت کالپی (ضلع جالون) کے سفر سے واپس آرہا ہوں، جاتے ہوئے میری کار کے سامنے پٹرول لے جانے والی ایک گاڑی آگئی، گنجان آبادی والے شہر میں جہاں ٹریفک زیادہ ہوتی ہے کوئی بڑی گاڑی چھوٹی گاڑی کے سامنے آجائے تو دیر تک اس کا ساتھ رہتا ہے، پٹرول والی گاڑی کے پشت پر جلی حروف سے لکھا ہوا تھا: "Highly Inflammable" (بہت تیزی سے آگ پکڑ لینے والی اور بھڑک جانے والی چیز)

حالیہ واقعات کی روشنی میں اور بھٹو صاحب کی پھانسی کے سلسلہ میں ہندوستان کے بعض حصوں میں مسلمانوں نے جس جذباتیت، اشتعال پذیری اور بے قابو ہوجانے کا مظاہرہ کیا، اس سے میرا ذہن پٹرول کی اس گاڑی سے مسلمانوں کے قومی مزاج کی طرف منتقل ہوگیا، میں نے کہا کیا مسلمان پٹرول کی اسی گاڑی کی طرح ہیں؟ یہ پٹرول کی تعریف، بارود، جلد بھڑک جانے والی چیز، "پنبہ و آتش" (روئی اور آگ) کی تعریف تو ہوسکتی ہے، مسلمانوں کی تعریف نہیں ہوسکتی، اور یہ ان کی کوئی خوبی اور تعریف نہیں ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر اپنا توازن کھودیں، جامہ سے باہر ہوجائیں اور ہر طرح کے شرعی، اخلاقی، عقلی و انسانی حدود کو پھلانگ جائیں۔ (بشکریہ تعمیر حیات)

ہزار شکر کہ دیکھے ہیں پھر بہار کے دن

صدر مملکت جنرل ضیاء الحق نے عید میلاد النبی کے روز چند اہم اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ کا جو اعلان کیا ہے وہ ان بے شمار نعتوں اور مدحیہ تقریروں سے زیادہ قیمتی ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کی اور کہی گئی ہیں اس لیے کہ حضورؐ کی محبت کا اصل تقاضا تو آپ کے لائے ہوئے دین کو قائم کرنا اور آپ کے دیئے ہوئے احکام کو نافذ کرنا ہے جس کی نہایت مبارک اور قابل تحسین ابتداء صدر پاکستان کے اس اعلان سے ہوئی ہے، یہ پاکستان کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ اپنے جس مقصد وجود سے وہ ۳۲ سال محروم رہا، اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ اس کی راہ پر گامزن ہو رہا ہے، تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اللہ کریم کے شکر گزار ہوں اور اس نعمت کی ناقدری کر کے اس کی رحمت کے بجائے لعنت کے مستحق نہ بنیں اور اجرائے احکام اسلامی کا اعلان ہو جانے کے بعد صدر مملکت اور ان کی حکومت، انتظامیہ اور عدلیہ کے حکام اور عام مسلمان سب بڑی آزمائش میں پڑ گئے ہیں۔ انسانی قوانین کی خلاف ورزی کرنا اور چیز ہے اور خدا اور رسولؐ کے قانون کو توڑنا بالکل ہی دوسری چیز ہے۔ اس سے تو آدمی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اور وہ خدا کے غضب کا مستحق بن جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر شخص اپنے دائرہ عمل میں اس عظیم ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کرے اور سب سے زیادہ حکومت کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے افسروں، ملازمین اور عوام کو تمام ممکن وسائل سے کام لے کر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنانے کی کوشش کرے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

عہدِ حاضر کے مفکر

شائستہ شمیم

محترم محترم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی۔ محترم سید ابو الاعلیٰ مودودی کو ان کی دینی خدمات کے صلہ میں عالمِ اسلام کے سب سے بڑے ایوارڈ یعنی "شاہ فیصل ایوارڈ" سے نوازا گیا۔ اخبارات میں یہ خبر پڑھکر بڑی مسرت ہوئی کہ ان کی خدمات کا اعتراف معقول انداز میں کیا گیا۔

ظاہر ہے اس عظیم شخصیت پر میرا کچھ لکھنا عجیب سا لگتا ہے۔ بہت سے اہلِ قلم ان پر لکھیں گے۔ اس سلسلے میں ایک نظم ہوگئی ہے۔ یہ میری حقیر سی کوشش ہے۔ پسند آجائے تو شائع کر دیں۔ وقت کی چیز ہے میں اپنی نظمیں اور غزلیں اس یقین کے ساتھ بھیجتی ہوں کہ جہاں خامیاں ہوں گی آپ درست کر دیں گے۔ طالب دعا شائستہ شمیم

…ے مدبر تیری پاکیزہ طبیعت کو سلام — اے مفسر تیری قرآں سے عقیدت کو سلام
…بہرِ قوم ترے شوقِ شہادت کو سلام — دینِ فطرت کے مبلغ تیری فطرت کو سلام

عہدِ حاضر کے مفکر تیری عظمت کو سلام

…ہر دو نخوت کی جبینوں کو جھکانے والے — حق کی آواز سرِ دار لگانے والے
…سب کو شہادت کا سنانے والے — راہِ حق سے نہ کبھی پاؤں ہٹانے والے

حق تعالیٰ کے سپاہی تری جرأت کو سلام

تو نے کردار کو پھولوں کی لطافت بخشی
فکر و احساس کو ایماں کی حرارت بخشی
ذہنِ بیمار کو مومن کی فراست بخشی
ملت و قوم کو بے لوث قیادت بخشی

مصلحِ قوم تری فہم و فراست کو سلام

تو مسلماں کا دل، تو ہی مسلماں کا دماغ
تو مسلماں کا گلشن تو مسلماں کا باغ
فکر و دانش کا زمانے میں جلایا وہ چراغ
پا لیا گم کردۂ منزل نے بھی منزل کا سراغ

فخرِ مشرق ترے افکار کی ندرت کو سلام

نئی تہذیب کے آداب زبوں چھوڑ دیئے
سرخ سیلاب کے بڑھتے ہوئے رخ موڑ دیئے
زعمِ باطل کے پرستاروں کے سب توڑ دیئے
اور اسلام کے فرزندوں کے دل جوڑ دیئے —

پیرِ دانا تیری دانائی و حکمت کو سلام

تو نے ملت کو کیا خوابِ گراں سے بیدار
تیز کی اس کی رگوں میں نئے خون کی رفتار
دینِ فطرت کا بڑھا تیری فراست سے وقار
ہم جاں قوم بنی سیسہ پلائی دیوار

حق کے معمار تری سعی و شفقت کو سلام

تجھ پہ اپنوں کی طرف سے بھی ہوئے قہر و عتاب
آگ میں پھر بھی کھلائے نئی فکروں کے گلاب
تجھ میں پوشیدہ نئی نسل کی امیدوں کے خواب
ہاں، نہیں تیری بصیرت کا کہیں کوئی جواب

اے مفکر تیری اس فکر و بصیرت کو سلام

اے مفکر یہ ترے زورِ قلم کا اعجاز
معترف ہو ہی گئے اہلِ عجم اہلِ حجاز
ہے تری ذات پہ آج عالمِ اسلام کو ناز
میرا اللہ کرے اور تیری عمر دراز

پاک کے مردِ مسلماں تری عظمت کو سلام

صدر ضیاء الحق کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے بھیجا ہے

مصری جریدے الازہر کے مدیرِ اعلیٰ کا صدر کو خراجِ عقیدت

قاہرہ ۱۲ (اپ پ) مصر کے موقر جریدے الازہر کے چیف ایڈیٹر عبدالودود شالبی نے صدر ضیاء الحق کو حق کا فرستادہ اور مردِ مومن قرار دیا ہے۔ جریدے میں صدر ضیاء الحق کے نام ان کا ایک خط شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے صدر ضیاء الحق کو پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ کرنے پر زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور کہا ہے وہ نہ صرف پاکستانیوں کو بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو بے حد عزیز ہیں۔ انہوں نے صدر ضیاء الحق کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ کو مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے آگے لانے میں خدا تعالیٰ کی حکمت پوشیدہ ہے۔ خدا تعالیٰ آپ سے جو کام لینا چاہتا ہے آپ اسے جرأت اور ثابت قدمی سے انجام دیں۔ آپ کے نام کے معنی حق اور روشنی کے ہیں۔ جب روشنی آئی تو تاریکی کافور ہو جاتی ہے اور حق یقیناً باطل کو شکست دے گا۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ سے طاغوتی قوتوں کو ختم کرنے کا کام لینا چاہتا ہے۔ شرعی نظام کے نفاذ سے آپ نے پاکستان کو ایک ولولۂ تازہ عطا کیا ہے اور اس کے زخمی جسم کو ایک نئی زندگی بخشی ہے۔ آپ نے پاکستان کو وہ کچھ دیا جو اس سے پہلے کوئی شخص نہ دے سکا۔ آپ کے مقدس مشن کو آگے بڑھانے کے لئے دنیا کا ہر مسلمان آپ کے ساتھ ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں اسلامی ایشیائی کانفرنس اور علامہ اقبال کی صد سالہ برسی کے موقع پر لاہور اور ان کی سادگی اور جذبے سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان صرف اور صرف اسلام کی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور جب سے یہ معرضِ وجود میں آیا ہے مصری عوام اسے دل و جان سے چاہتے ہیں اور اس کے عقائد و اقدار پر گہری نظر رکھتے ہیں لیکن افسوس کہ ماضی کے حکمرانوں نے پاکستان میں اسلامی معاشرے کے قیام اور اسلامی نظام نافذ کرنے کے بارے میں کچھ نہ کیا وہ اسلام کی بجائے مغرب پر انحصار کرتے رہے اور ملک کو اسلام سے دور لے جاتے رہے۔ انہوں نے اخلاقی انحطاط اور ذہنی افلاس پیدا کر دیا کہ ... نے بھی کوئی توجہ نہ دی۔

اخبار المدینہ سعودی عربیہ کی حق گوئی

(عربی سے ترجمہ: علاؤ الدین رانجوری)

مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی گئی تو پاکستان میں حق و صداقت کا بول بالا اور عدل و انصاف کا پرچم لہرانے لگا، جسے بھٹو تار تار کر دینا چاہتے تھے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی ساری زندگی عیاشی، نفس پروری اور اپنے مخالفوں سے نمٹنے میں گزر گئی۔

اگر آدمی ذرا بھی فہم و بصیرت سے کام لے تو ان لوگوں کی حقیقت جو مسٹر بھٹو کے سلسلے میں الیفت و ہمدردی اور رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں واشگاف ہو جائے گی کہ ان کا اظہار ہمدردی نہ تو کسی گہرے غم و تاسف کا نتیجہ ہے۔ نہ کسی محبت و غم خواری کا صحیح آئینہ دار۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ ایک شخص قاتل ہے لیکن اس کے حق میں رنج و الم کا اظہار اور ماتم نالہ و شیون صرف اس لئے بپا کیا جائے کہ وہ ملک کا وزیر اعظم تھا اور دوسرا مجرم شخص اس لئے ناقابل اعتنا تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ایک معمولی انسان ہے۔

ادھر حکومت مصر کے ایک سرکاری ترجمان کے بیان سے مزید دل پر چوٹ لگتی ہے کہ "بھٹو کی پھانسی اخلاق اور اسلامی اصول و آئین کے خلاف ہے۔"

ممکن ہے صحافیوں کو اتنا مواد (MATTER) نہ مل پاتا ہو جو ان کے روزناموں کے لیے کافی ہو تو اس کی تلافی کے لیے وہ بھٹو کے لئے تعریفی کالم، اپنے تاسف و بے قراری کا
[redacted]

کا اظہار اور جنرل ضیاء الحق کو اپنے سب و شتم کا نشانہ بناتے رہے ہیں لیکن تعجب اس پر ہے کہ ایک سرکاری ترجمان جس پر حکومت کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایسے بیانات کیونکر دے سکتا ہے؟

> اس میں کوئی شک نہیں کہ بھٹو ایک خونریز، سفاک اور ظالم و جابر انسان تھے جنہوں نے قتل و خون کا بازار گرم رکھا، وہ لاقانونیت کے علمبردار تھے جو قانون اور اصول و آئین کی خلاف ورزی میں پیش پیش رہے۔ جنہوں نے ملک کی اقتصادی حالت کو تباہ و برباد کر دی۔ جنہوں نے حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں جنہوں نے ملک و قوم کی امانت کو اپنے ذاتی اغراض کا نشانہ بنایا۔ ان سب کے باوجود انھیں قانونی ضمانتیں حاصل رہیں اور وہ یہ باور کراتے رہے کہ وہ عدالت کے تمام فیصلوں پہ بیشک راضی بہ رضا ہیں۔

ایک طرف بی بی سی لندن کی طرف سے بے سر و پا خبریں نشر کی جاتی ہیں اور رائی کو پہاڑ" بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح مسٹر کیلاہن (صدر برطانیہ) بھٹو کے معاملہ میں اظہار افسوس و ہمدردی کرتے ہیں اور اسے عالمی رائے عامہ کی خلاف ورزی قرار دینا چاہتے ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جنھیں ہم ناقابل تسلیم و ناقابل اعتنا سمجھتے ہیں کیونکہ بھٹو کے ساتھ ہمدردی و محبت کے اظہار سے کہیں زیادہ مسٹر کیلاہن کی خواہش یہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق کے وہ اقدامات اور وہ آواز جو ایک خوش آئند مستقبل کا پیش خیمہ ہے دب کر رہ جائے۔

کیا یہ بات غور و فکر کی نہیں ہے کہ اگر مسٹر بھٹو کا یہی مسئلہ برطانیہ میں پیش آتا تو کیا انھیں قتل و غارت گری، فساد و بدامنی پھیلانے کی اجازت دے دی جاتی اور انھیں مدتوں اس کی چھوٹ ہوتی کہ وہ حکومت کی پالیسی کو ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرتے۔ ملک و ملت کی

جتن کم زور کرتے رہیں۔

لیکن یہ سب کچھ پاکستان میں ہوتا رہا تو مسٹر کیلا ہن، بی بی سی ریڈیو اور صحافت اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی رہی کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستانی عوام کا خون زیادہ ارزاں ہو گیا ہے؟ اور وہ قتل و خون، ذلت و پستی کی جس اہانت آمیز زندگی میں آپڑے تھے وہ ان کے لیے باعث ننگ و عار نہیں۔

تعجب ہے کہ مسٹر کیلا ہن اپنے مخالفوں کے لئے کوئی کلمۂ خیر نہیں کہہ سکتے، انھیں خوف ہے کہ اگر انھوں نے ایسا کر بھی دیا تو ان کی آزادی و کرسی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ کیا یہ انصاف ہے کہ اپنوں کے لیے الگ معیار و پیمانہ مقرر کیا جائے اور غیروں کی جانچ کے لیے دوسرا؟

اس خوش آئند اقدام پر ہم جنرل ضیاء الحق کی خدمت میں مبارکباد اور حق و انصاف کی بقا کی خاطر انھوں نے جو کچھ کیا اس پر انھیں خوشیوں کی سوغات پیش کرتے ہیں۔ اور ان کے لئے دعاگو ہیں کہ اس نئے دور کی تمہید اور منزلِ مقصود کی طرف پیش قدمی میں خدا انھیں مزید استقامت و ثبات قدمی عطا فرمائے اور جو مسائل و مشکلات درپیش ہیں اور جن چیلنجوں کا مقابلہ کرنا ہے خدا انھیں اس کی قوت و توفیق بخشے۔ (آمین) (بشکریہ تعمیر حیات لکھنؤ)

بقیہ فتنہ سعدی کے پیچھے

نظر آگئی تو اسے احترام سے اٹھا کر یہ کہہ کر اوپر رکھ دیا کہ مستقبل کی امامت کا حق اسی کتاب کے ذریعہ ادا ہوگا۔

ہم چاہتے ہیں کہ ملت کے دردمند اصحاب ہر جگہ اس شرانگیزی کے بارے میں غور کریں اور یہ دیکھیں کہ دین و ملت کے یہ "دردمند" کون ہیں۔ اس کے بعد ان کے سامنے خود وہ تصویر آجائے گی۔ جو اس وقت اس طبقے کے پیش نظر ہے۔ (دعوت)

پاکستان کے معزول وزیر اعظم

تختِ حکومت سے تختۂ دار تک

شمس الہدیٰ بھاگلپوری

۴؍ اپریل کو پاکستان کے معزول وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو راولپنڈی جیل میں مقامی وقت کے مطابق رات ۲ بجے پھانسی دے دی گئی اور ان کے جسد خاکی کو ان کے خاندانی قبرستان لاڑکانہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ مسٹر بھٹو ایک طوفان کی طرح سیاسی افق پر ابھرے۔ انھوں نے ہندوستان سے ایک ہزار سال تک جنگ کرنے کا عہد کیا تھا۔ ان کو بنگلہ دیش کے قیام کے بعد پاکستان کا اقتدار اعلیٰ حاصل رہا جو بلاشبہ ایک کامیاب اور باصلاحیت سیاسی لیڈر تھے۔ وہ پاکستان کے سیاسی افق پر اس وقت ابھرے جب پاکستان کے فوجی حکمراں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے انھیں اپنی فوجی حکومت میں وزیر بنایا۔

۱۹۶۵ء کی ہندوستان، پاکستان کی جنگ میں پاکستان کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل میں انھوں نے اپنے ملک کی پُر زور وکالت کی۔ کافی عرصہ ایوب خاں کے ساتھ رہنے کے باوجود مسٹر بھٹو کا ان سے اختلاف ہو گیا اور ۱۹۶۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے انھوں نے ایک نئی سیاسی جماعت بنائی اور جنرل یحییٰ خاں کے زمانہ میں الکشن کے ذریعہ انھیں مغربی پاکستان میں اکثریت حاصل ہوئی اور پھر ۱۹۷۷ء کے الکشن کے بعد ملک میں شدید ہنگامے ہوئے۔ ان پر الیکشن میں کھل کر بدعنوانی کا الزام لگایا گیا اور بالآخر جنرل ضیاء الحق نے ملک کا اقتدار سنبھال لیا۔

اگرچہ مسٹر بھٹو کے بعض ایسے کارنامے ہیں کہ جن کو واقعی ان کے کارنامے کہا جاسکتا
مثلاً سب سے بڑا کارنامہ تو ان کا یہ ہے کہ پاکستان میں قادیانیوں کو انھوں نے رجسٹر
غیر مسلم قرار دیا اور جتنے بھی قادیانی حکومت کے بڑے بڑے عہدے پر فائز تھے ا
نے ہر ایک کو ایک طرف سے معزول کردیا لیکن دوسری طرف ان کے ایسے
کہ جن کو سامنے رکھ کر کوئی بھی صحیح الدماغ اور ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرنے والا شخص
کی حمایت نہیں کرسکتا۔ بھٹو کے زمانے میں پاکستانی معاشرے اور تہذیب کی جو بُری حال
تھی اور اب تک جس کے اثرات ختم نہیں ہوئے ہیں بالکل واضح ہیں۔

یہ بھٹو حکومت کی دین ہے کہ معاشرے میں معصیت کی کثرت ہے، جرائم
کا زور ہے، خود غرضی، خوشامد، فحش کاری جیسی خرابیاں ملک میں کافی بڑھ گئی ہ
آخرت میں جواب دہی کا احساس کمزور ہوگیا ہے۔

مسٹر بھٹو کو جس قتل کے سلسلہ میں پھانسی دی گئی ہے وہ قتل ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء
اور اس قتل کی پہلی رپورٹ ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کو مقتول کے بیٹے اور پاکستان نیشنل اسمبلی
مسٹر بھٹو کے زبردست حامی احمد رضا قصوری نے اچھرا تھانہ میں درج کرائی تھی۔
مسٹر بھٹو پر قتل کا الزام لگایا گیا تھا اس پر بھٹو حکومت نے ۱۹۷۴ء میں ہائی کورٹ
مسٹر شفیق الرحمان کے سربراہی میں ایک جانچ کمیٹی بنائی بعد میں یہ معاملہ خفیہ پولیس
کردیا گیا۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو مسٹر بھٹو گرفتار کرلیے گئے اور فوجی حکومت قائم ہوگئی۔
بعد یہ مقدمہ ہائی کورٹ میں چلا۔ ہائی کورٹ نے مسٹر بھٹو اور چار اشخاص جن کا
واسطہ تھا۔ پھانسی کی سزا تجویز کی۔ ملزمان کو اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں
کی اجازت دے دی گئی۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۸ء کو مسٹر بھٹو کے وکیل مسٹر یحییٰ بختیار نے
سزائے موت کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی۔

۱ر مئی ۱۹۷۸ء کو اپیل کی پہلی سماعت مقرر کی گئی مگر یحییٰ بختیار کی اس درخواست پر کہ وہ اس تاریخ تک کیس تیار نہیں کر سکیں گے۔ آئندہ تاریخ سماعت ۲۰ر مئی مقرر کردی گئی۔

۲۰ر مئی ۱۹۷۸ء کو سپریم کورٹ کے کل ججوں پر مشتمل فل بنچ نے اپیل کی سماعت شروع کی۔ ۳۱ر اگست ۱۹۷۸ء کو بنچ کے ایک رکن مسٹر قیصر خاں بیمار ہوگئے جس کے بعد بنچ ۸ ججوں پر مشتمل ہوگیا۔ اور ۲۱ر نومبر ۱۹۷۸ء کو ایک فاضل جج مسٹر جسٹس وحید الدین شدید علیل ہوگئے اور بنچ میں صرف سات جج باقی رہ گئے۔

۶ر فروری ۱۹۷۹ء کو عدالت عظمیٰ نے ۱۱ بجے دن فیصلہ کا اعلان کیا اور اپیل کثرت رائے سے مسترد کردی اس کے بعد نظر ثانی کی درخواست ہوئی جو ۲۴ر مارچ کو مسترد کردی گئی۔

"سپریم کورٹ کے سات ججوں پر مشتمل بنچ میں سے چار نے پھانسی کے حق میں فیصلہ دیا اور تین ججوں نے پھانسی کے خلاف فیصلہ دیا۔"

اس سے ایک بات اور واضح اور صاف ہوتی ہے کہ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ججوں سے زبردستی پھانسی کے حق میں فیصلہ کرایا گیا لیکن ایک بات لوگ نظر انداز کردیتے ہیں کہ اگر ان سے زبردستی پھانسی کے حق میں فیصلہ کرایا تو یہ فیصلہ بااتفاق تین ججوں سے کرایا جاتا اس میں کوئی اختلاف نہیں کرتا۔

مسٹر بھٹو کو پھانسی دیے جانے پر پوری دنیا میں صدمہ اور رنج و افسوس کا اظہار کیا جا رہا ہے اور اس امر کا اندیشہ بھی کیا جا رہا ہے کہ اس سے اندرون پاکستان سنگین صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

لیکن حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ لوگ ایک مجرم کے لیے اتنا واویلا مچا رہے جس کو سزا دے کر یہ ثابت کردیا ہے کہ اسلام عدل و انصاف کا کتنا بڑا اعلیٰ تصور

پیش کرتا ہے اور پریکٹیکل (Practical) طور پر ہمیں بتاتا ہے کہ بادشاہ و غلام میں کوئی امتیاز نہیں ہے ایک جرم کی جو سزا غلام کے لیے ہے اگر وہی جرم بادشاہ بھی کرے گا تو اس کو بھی وہی سزا ملے گی۔

لوگ جنرل ضیاء الحق کی خواہ مخواہ جذبات میں بہہ کر اختلاف کر رہے ہیں حالانکہ قرآن مجید کا ارشاد ہے:۔

"ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب لعلکم تتقون ۰"

(اور تمہارے لئے قصاص ہی میں زندگی ہے اے عقل والو، شاید تمہیں (اس کی بدولت) تقویٰ کی نعمت حاصل ہو) ـــ اور

"فجعلناها عبرۃ ونکالاً لما بین یدیها وما خلفها وموعظۃ للمتقین"

ہم پاکستان کے موجودہ حکمرانوں کو اس عظیم تاریخی کارنامہ پر مبارکباد دیتے ہیں کہ ساری دنیا کے دباؤ کے باوجود حق پر ڈٹے رہے اور انھوں نے حق و باطل میں پورا امتیاز کیا۔" (تعمیرِ حیات لکھنؤ)

قطعات

(۱)
خدا کو چھوڑ کر دنیا پہ مائل ہوتے جاتے ہیں
اسی باعث مصائب ہم پہ نازل ہوتے جاتے ہیں
ضیاؔ حیرت ہے روزانہ مسائل زندگانی کے
ہم آساں کرتے جاتے ہیں یہ مشکل ہوتے جاتے ہیں

(۲)
مقصدِ زیست کو اپنے اگر انساں سمجھے
قدر ہستی کی کرے، رب کا یہ احساں سمجھے
جن کی نظر دل میں نہیں دین کی کچھ بھی وقعت
ایک دھوکہ ہے انھیں کوئی مسلماں سمجھے

(ضیاؔ - سیف پوری)

مسٹر بھٹو کی پھانسی کی سزا

(کراچی کے روزنامہ جنگ کا اداریہ)

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کی خبر کے اعلان کے مطابق پاکستان کے مشہور اردو روزنامہ جنگ نے اپنی اشاعت ۵ اپریل میں "فاعتبروا یا اولی الابصار" کے عنوان سے جو اداریہ لکھا ہے وہ بلا کسی اظہار رائے کے جواب میں درج کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

(اے آنکھوں والوں عبرت حاصل کرو)

سابق وزیراعظم بھٹو کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ تاریخ پاکستان میں رونما ہونے والا یہ ایک انتہائی عبرت انگیز واقعہ ہے۔ حکومت پاکستان کا یہ سابق سربراہ کچھ عرصہ پہلے تخت اقتدار پر متمکن تھا۔ اور آج تختہ دار پر پہنچ گیا۔ حکمرانوں کے عروج وزوال کے بڑے بڑے عبرت دلانے والے واقعات تاریخ میں موجود ہیں لیکن حالیہ دور میں شیخ مجیب الرحمن، ایران کے رضا شاہ پہلوی اور بھٹو کو قدرت نے جس طرح عبرت کا مرقع بنایا اس کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ شیخ مجیب کا کام تو چشم زدن میں تمام ہوگیا۔ شاہ ایران جن پر قتل وغارت گری کے سنگین الزام ہیں بظاہر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن برے انجام کے سیاہ سائے ان کا تعاقب کر رہے ہیں اور انھیں کہیں جائے پناہ نہیں

مل رہی ہے۔ بھٹو کا معاملہ ان دونوں سے مختلف رہا۔ وہ سیاسی وجوہ کی بنا پر اقتدار سے ہٹائے بھی گئے اور ایک اخلاقی جرم میں کٹہرے میں بھی کھڑے کر دیے گئے۔ ترکی کے وزیر اعظم عدنان مندریز کو بھی سزائے موت دی گئی تھی لیکن ان پر ایک فوجی عدالت نے مقدمہ چلایا تھا۔ سابق وزیر اعظم بھٹو پر بھی فوجی عدالت میں مقدمہ چلا کر سرسری سماعت کے بعد انھیں کوئی بڑی سزا دی جا سکتی تھی لیکن جنرل محمد ضیاء الحق نے بھٹو کے معاملے میں معزولی اقتدار سے لے کر آخر تک کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جو آئین قانون اور عدل و انصاف کے منافی ہو۔

بھٹو پر اختیارات کے ناجائز استعمال اور متعدد بے قاعدگیوں کے سنگین الزامات کی بنا پر بھی کئی مقدمات قائم کیے گئے تھے لیکن سب سے پہلے قتل کے اس قضیے کو لیا گیا جو خود بھٹو کے دور حکومت میں شروع ہوا یعنی نواب محمد احمد خاں کے قتل کا قضیہ تھا۔ مقتول کے وارث نے اپنی پہلی رپورٹ میں بھٹو کو اس قتل کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ ضروری تحقیقات کے بعد قانون اور ضابطے کے مطابق یہ قضیہ ہائیکورٹ (عدالت عالیہ) کے سامنے لایا گیا جس نے دو ماہ دو دن تک شہادتوں کی جانچ پڑتال اور سماعت کے بعد بھٹو کو سزائے موت کا مستحق قرار دیا۔ سپریم کورٹ (عدالت عظمیٰ) نے مسلسل سات ماہ تک اس سزا کے خلاف اپیل کی سماعت کی اور اپنے اکثریتی فیصلے کے ذریعے عدالت عالیہ کی سزا کو برقرار رکھا۔ اس کے بعد سپریم کورٹ نے غیر معمولی وقت اور مواقع دے کے نظر ثانی کی درخواست کی سماعت کی اور متفقہ طور پر درخواست کو مسترد کر دیا۔

اس نہایت مختصر تفصیل سے جو بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی سے کام نہیں لیا گیا اور کسی بے مداخلت کو راہ نہیں دی گئی۔ بھٹو کو اپنے قانونی دفاع کے لیے وہ تمام سہولتیں فراہم کی گئیں جو ضابطے کے مطابق قتل کے کسی بھی

ملزم کو مہیا کی جاتی ہیں۔ بلکہ متعدد سہولتیں عام روایات سے ہٹ کر دی گئی تھیں۔ بھٹو اور ان کے وکلاء نے عدالت پر اپنے مکمل اعتماد کا بھی اظہار کیا۔ ملک کے تمام ماہرین قانون اور بعض بین الاقوامی شہرت کے بیرونی قانون دانوں نے بھی یہ اعتراف کیا کہ قتل کے اس مقدمے کی سماعت عدل و انصاف کی اعلیٰ سطح پر اور بہترین و مسلمہ قانونی و عدالتی روایات کے مطابق عمل میں آئی۔ صدر ضیاء الحق نے بھی ایک سے زائد بار یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ عدل و انصاف کے تمام تقاضوں کو پورا ہونے دیں گے اور عدالت عظمیٰ جو بھی فیصلہ دے گی اسے نافذ کر کے اس کی بالادستی اور احترام کو پوری طرح برقرار رکھیں گے انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پاکستان میں عدلیہ کی بالادستی کا یہ ایک بہت بڑا مظہر ہے۔ اس سے پوری عالمی برادری کو یہ گہرا تاثر ملا ہے کہ پاکستان میں عدلیہ ایک ایسا بالادست ادارہ ہے کہ پاکستان کی کوئی طاقت عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے سے نہیں روک سکتی اور اس کے احترام کو مجروح نہیں کر سکتی۔

اس مقدمے میں اور اس کے فیصلے کا سب سے اہم پہلو عبرت انگیزی سے تعلق رکھتا ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کے لیے عبرت کا بڑا سامان ہے جو حکمرانی کے منصب پر فائز ہوں اور جن کے ہاتھوں میں زبردست اختیارات ہوں۔ اللہ تعالیٰ اگر کسی کو تخت حکومت پر بٹھا سکتا ہے تو اسے اقتدار سے محروم بھی کر سکتا ہے اور آخرت سے پہلے اس دنیا میں حساب کے شکنجے میں کس سکتا ہے۔ تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ اقتدار خدا کی ایک مقدس امانت ہے۔ جو حکمراں اسے مالک حقیقی کی مرضی کے مطابق استعمال کرتے ہیں اور اس اقتدار کے لوگوں کی جان مال اور آبرو کی حفاظت کے لیے کام میں لاتے ہیں۔ اقتدار سے الگ ہونے کے بعد بھی ان کا نام عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

آخر میں ہم یہ بات اچھی طرح واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اب اس ملک میں کوئی فرعون چنگیز اور ہٹلر بننے کا خیال دل میں نہ لائے۔ پاکستان کے عوام کا سیاسی اور اسلامی شعور پوری طرح بیدار ہو چکا ہے۔ یہاں جو بھی جمہوری اور اسلامی اصولوں سے انحراف کی راہ اختیار کر کے قوم کی گردن پر مسلط ہونے کی کوشش کرے گا اور ظلم و ستم کا بازار گرم کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کا ہمارے عوام اور ہماری بہادر افواج بھی احتساب کریں گی اور ہماری عدلیہ بھی اس کے جرائم کی اسے قرار واقعی سزا دے گی۔ یہ مقدمہ ملک کی آزمائش تھا جس میں ہماری عدلیہ بھی پوری اتری اور صدر ضیاء الحق بھی۔ ان دونوں نے بڑے سے بڑے دباؤ کی پروا نہ کی اور عدل و انصاف کے پرچم کو بلند رکھا اور واضح کر دیا کہ اس ملک میں کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اپنے کیے کی سزا پا کر رہے گا۔

(بشکریہ نوائے وقت)

(محمود شاہد)...... یہ باتیں بھی صحت کے لئے ضروری ہیں

۱۔ ناریل کے تیل میں لیمو کا عرق ملا کر ہونٹوں پر لگانے سے ہونٹوں کی سیاہی جاتی رہتی ہے۔

۲۔ اگر سر میں گنج ہو جائے تو مکھن تازہ لے کر اس میں پسا ہوا سرمہ ملا کر لگائیں۔ تو فائدہ ہوگا۔

۳۔ رات کو سوتے وقت اگر پلکوں پر زیتون کا تیل لگا لیا جائے تو پلکیں گھنی اور چمکدار ہو جاتی ہیں۔

۴۔ گرمیوں میں برف کے لئے استعمال ہونے والے تھرماس کو اگر سردیوں میں روٹیاں گرم رکھنے کے لئے استعمال کیا جائے تو روٹیاں کافی دیر تک گرم رہتی ہیں۔

۵۔ اگر ریشمی کپڑے پر چائے گر جائے تو فوراً پہلے کپڑے کو دودھ سے دھو لیں اور پھر پانی سے داغ دور ہو جائے گا۔

(علاؤالدین ندوی)

بھٹو کی پھانسی
اور ہندوستانی مسلمان

اس دنیا میں کتنے لوگ ہیں جو اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات، قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ، سلاطین عالم کی فتح و شکست سے عبرت و نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ کتنے ہیں جو سماعت رکھتے ہوئے بھی نہیں سن سکتے، بصارت کے باوجود صحیح طور پر نہیں دیکھ سکتے۔

أم آذان لا يسمعون بها أم لهم أعين لا يبصرون بها.

یہ ایک بہت عبرت و موعظت کا واقعہ ہے جو گذشتہ مہینہ کی ابتدائی تاریخوں میں ظہور پذیر ہوا، پاکستان کے معزول وزیر اعظم مسٹر بھٹو کو (جن کو ہندوستان کے بہت سے مسلم حلقے ہیرو HERO تصور کرتے ہیں) ایک قتل کے جرم میں تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ مسٹر بھٹو ایک ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ قدرت نے انھیں ذہانت عزم، حوصلہ اور جوش و جذبہ کی نعمت سے مالا مال کیا تھا، وہ موجودہ سیاست (جو محود فریبی حقائق پسندی سے انکار اور ذہانت و سیاسی جوڑ توڑ کا نام بن گئی ہے) کے مزاج داں اور اس کے صف اول کے رہنماؤں میں تھے۔ ان کی ذہانت و صلاحیت پر اعتماد کر کے شروع میں پاکستانی عوام نے ان سے بہت کچھ امیدیں اور توقعات وابستہ کر لی تھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی ذہانت، معاملہ فہمی اور نکتہ دانی کی ضرورت سے زیادہ احساس کی بناء پر راہ اعتدال سے بہت دور جا چکے تھے۔ انھوں نے اقتدار کے نشے میں جمہوریت کو ایک خطرناک آمریت Dictatorship میں تبدیل کر دیا تھا۔ انھوں نے ساری طاقتوں کا محور اپنی ذات کو بنا لیا

تھا اور عوام کو یہ تصور دینا چاہا کہ ملک و قوم کے سب سے بڑے محسن اور اس پر حکومت کرنے کے واحد حقدار ہیں، قوم و ملت کی فلاح ان ہی کی ذات سے وابستہ ہے، وہی سیاست کے نوک پلک سے واقف ہیں اور سارے کے سارے لوگ ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

اسی احساس برتری کے ساتھ وہ حکومت و سیاست میں بام عروج پر پہونچ گئے لیکن جتنی سرعت کے ساتھ وہ بام عروج تک پہنچے تھے۔ اسی سرعت سے وہ پھر پستی میں آگرے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ٹھوکر کھا کر بھی ان میں سنبھلنے اور گر کر اٹھنے کا احساس نہ جاگا۔ جیل کے پرصعوبت لمحات میں جب وہ اپنے ماضی کا جائزہ لیتے ہوں گے تو دل کی گہرائیوں میں ضرور اپنی غلطیوں کا احساس ہوتا ہوگا لیکن افسوس عبرت پذیری کے بجائے وہ اس خیال میں رہے کہ بیرونی (اسلام دشمن) طاقتوں کے دباؤ سے وہ رہا ہو کر پھر اپنی کھوئی ہوئی پوزیشن حاصل کرلیں گے اور بعض عرب ممالک کے ذمہ داروں اور امراء کی اپیلوں سے ایک مرتبہ پھر ان کے افسوسناک ماضی پر پردہ پڑ جائے گا۔

قتل کے جس قضیہ کے سبب بھٹو صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے وہ تو دراصل ان کی آمرانہ زندگی کے انجام کا ایک ذریعہ بنا ورنہ یہی خون ان کے سر نہیں تھا بلکہ ان کے دور حکومت میں ایسے ہی بڑی تعداد میں معصوم انسانوں کا خون ہوا جو صرف ان کی غفلت و لاپرواہی کا نتیجہ تھا۔ یا سیاسی انتقام کے جوش میں وہ خود اپنے دشمنوں سے نمٹنا چاہتے تھے، ان میں بچے، بوڑھے، طالب علم، مرد و زن اور سیاسی قائدین سبھی شامل تھے۔ خواجہ رفیق سرِ راہ مار دیے گئے۔ مولوی شمس الدین قتل کر دیے گئے۔ حیات شیرپاؤ مارے گئے۔ عبدالصمد اچکزئی اشوک کمار اور محمد قتل کر دیے گئے۔ اسداللہ مینگل کے بارے میں پتہ نہ چلا کہ اس بیچارے کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ ایسی درجنوں وارداتوں کے باوجود کسی ذمہ دار کو کسی قانونی عدالت سے کوئی سزا نہیں ہوئی۔" (تجارت ۱۵ اپریل ۱۹۷۹ء)

ان سب واقعات کے بعد بھی وزیر اعظم کی آنکھیں حالات کے رُخ کو نہ دیکھ سکیں اور وقت کے دھارے کو نہ پہچان سکیں۔ معزول ہو جانے کے بعد جب ان کی زندگی کے آخری لمحات جیل کی تاریک کوٹھری میں گزر رہے تھے۔ ان کی طرف سے پشیمانی کا اظہار عوام کے سامنے نہیں ہوا۔ اس لئے بھی کہ خود ان کے علاوہ جماعت (پیپلز پارٹی) اور ان کے حامیوں کو آخر وقت تک یقین نہ آ رہا تھا کہ جب کہ ہر چہار طرف سے رہائی کے لئے سیاسی دباؤ ڈالا جا رہا ہے بھٹو اتنی جلد تختہ دار تک کیوں کر پہونچ جائیں گے؟ اس کے لئے انھوں نے سازشیں بھی کیں حتیٰ کہ ایک عرب ملک نے ایک جج کو ۳ لاکھ کی خطیر رقم دے کر خریدنا چاہا لیکن یہ سازش بھی کامیاب نہ ہو سکی اور راز فاش ہو گیا۔ اور یقین نہ آنے کے باوجود بھٹو ہمیشہ کے لیے اپنے چاہنے والوں سے روپوش ہو گئے۔ قدرت کی طرف سے یہ قطعی اور حتمی فیصلہ تھا جسے دنیا کی کوئی طاقت بدل نہ سکی، لا تبدیل لسنۃ اللہ، جس ملک میں انہیں پھانسی دی گئی اس ملک کے لوگ ان کے بارے میں ہم سے بہتر جانتے ہیں کسی نے (سوائے ان کی جماعت کے تھوڑے سے افراد اور اسلام دشمن عناصر کے) کوئی شور و غوغا نہیں کیا، گریہ وزاری نہیں مچائی، کسی نے جلوس نہیں نکالے کوئی غم زدہ نہیں ہے۔ اسی طرح بنگلہ دیش میں مجیب الرحمٰن کو مع اہل و عیال کے ہلاک کر دیا گیا اور وہاں بھی امن و سکون کی فضا قائم رہی، بھٹو جیسے آمریت پسند اپنے عوام دشمن ماضی اور قتل کے جرم کے ارتکاب کے سبب پھانسی پا گئے تو ان کے ملک میں بھی سکون ہے۔ ان باتوں سے حقائق کا ثبوت ملتا ہے جو محض پروپیگنڈے کے زور سے چھپائے نہیں جا سکتے۔

اس واقعہ کے بعد سے باہر کے ممالک خصوصاً ہندوستان میں جو اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ انتہائی قابل افسوس، لائق ملامت، کم علمی پر دال اور حقیقت پر مبنی ہیں، بھٹو صاحب کو جن حالات سے گزرنا پڑا وہ ان عوامل و اسباب

کا تقدیر لت نتیجہ تھے جو ان کے دورِ اقتدار میں ہوتا رہا لیکن ہندوستانی مسلمان نہ صرف یہ کہ عوام بلکہ خواص (علماء) کا ایک طبقہ بھی اس نافہمی میں مبتلا ہو گیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جنرل ضیاء الحق سے شدید نفرت کے جذبات نے ان کے ذہنوں کو ماؤف کر دیا ہو۔ جیسے جماعتی عصبیت اور شدید مخالفانہ روش سے معاملہ کی اصل اہمیت اور بھٹو صاحب کے قتل کی واقعیت کی تہہ تک نہ پہونچ سکے ہیں۔ چنانچہ وہ انتہا پسندی، افراط و تفریط کا شکار ہو گئے اور عام انسانی معیارِ شرافت کو بھی برقرار نہ رکھ سکے، اس کی وجہ (خوش قسمتی یا بدقسمتی سے)، اس خیال کا پیدا ہو جانا بھی ہے کہ اسلامی قانون کے نفاذ اور بھٹو کو تختۂ دار پر لٹکانے میں تمام تر ہاتھ جماعت اسلامی یا پاکستان کے علماء کا ہے، پھر (غلط فہمی سے) جنرل ضیاء الحق کو جماعت اسلامی کا امین و پاسبان تصور کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ نہ یہ صحیح ہے کہ اسلامی اصول و آئین کے نفاذ میں تمام تر سہرا جماعت اسلامی کے سر ہے، نہ یہ درست ہے کہ جنرل ضیاء الحق کسی مخصوص جماعت کی سربراہی و رہنمائی چاہتے ہیں۔ اس موقع پر جماعت اسلامی کو جس طرح کشمیر اور دوسرے مقامات پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ غیر اسلامی، غیر اخلاقی حرکتیں ہیں بلکہ پست ذہنیت کی علامت اور (عام مسلمانوں کے لئے) ایک بدنما داغ ہیں، اخباروں اور بعض مصدقہ اطلاعات کے مطابق کشمیر میں انھیں نقصان پہونچانے کے لئے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ رکھا گیا، ان کے مدرسوں، مکتبوں، کالجوں، دفتروں، کتب خانوں اور ذمہ داروں کے گھروں پر حملے کئے گئے۔ ان کی تمام سرگرمیاں ختم کر دی گئیں، متعدد لوگوں کو مارا پیٹا گیا، اور بعض لوگوں کو گولی کا نشانہ بنا کر موت کے آغوش میں ڈھکیل دیا گیا، پھر اسی پر بس نہیں کیا بلکہ کچھ اللہ کے دشمنوں نے دینی کتابوں حتیٰ کہ کتب تفاسیر تک کو خاکستر کر کے رکھ دیا۔ (تفصیل کے لئے ۱۲؍ اپریل دعوت سہ روزہ ملاحظہ فرمائیں)

دوسری طرف موجودہ مسلم صحافت (باستثنائے بعض) کی باگ ڈور جن اہلِ قلم

ہاتھوں ہے وہ یا تو لادینیت کے داعی، کیمونزم (سیکولرزم) کے حامی ہیں اور اگر مذہب کے لئے ان کے پاس کوئی جگہ ہے تو وہ اسے (مغربیت سے مرعوبیت کی بنا پر) انسان کی نجی زندگی کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں۔

موجودہ صحافت کی یہ روش صرف مذہب ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ انسانی اصول وضوابط اور اخلاق اقدار وروایات کی پابندی سے بھی آزاد ہے، ریڈیو وصحافت کا یہ طرز عمل نئی پود کے حق میں افیون کی وہ گولیاں ہیں جو معاشرہ وسماج کی جڑیں کھوکھلی کئے دے رہی ہیں، کھوٹے سکے دکھا کر ان کو کوئی بھی خرید سکتا ہے۔ ان کے یہاں سب سے بڑی ہوشیاری اور ضابطہ کی بات یہ ہے کہ چڑھتے سورج کی پوجا کی جائے۔ سیاسی اکھاڑے میں جس کی جیت ہو جائے وہی خدا تسلیم کر لیا جاتا ہے، اس مذہب بیزاری بلکہ مذہب سے بغاوت کے دور میں اگر کوئی حکومت مذہب کے لئے کوئی جگہ دے کر اسے مکمل رنگ وآہنگ میں دیکھنا چاہتی ہے تو اس پر دنیا کی نگاہیں کھٹکتی ہیں اور اپنی راہ کا روڑا خیال کرلی ہیں دنیا کی عظیم طاقتیں اگر بھٹو کی حمایت کرتی ہیں تو کیا اس لئے کہ ان کو ان کی جان پیاری تھی۔ ایسے وہ محب وطن سمجھتے تھے یا وہ انصاف کے طلبگار تھے۔ اگر یہی بات تھی تو اور دوسرے چار مجرمین کے لئے دنیا کا کوئی ہمدرد رحم کی اپیل کیوں نہیں کرتا، بین الاقوامی طریقہ پر یہ سب اسلام دشمنی کا اظہار ہے۔ اس وقت اور بھی تعجب وافسوس ہوتا ہے جب اس طرح کی واقعات اسلام دشمن عناصر ہی کی طرف سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی طرف سے بھی نمایاں ہوتی ہیں کیا یہ انصاف کی بات ہے کہ بلٹز، نئی دنیا، عوام، سیاست اور اسی طرح کے اخباروں "بی بی سی ریڈیو" کی خبروں کو معیار بنا کر ۱ مدا، اسلام کی پشت پناہی کی جائے؟ ان کی آوازسے آواز دی جائیں۔ اپنے ہی جیسے مسلمانوں کو سب وشتم، طعن وتشنیع کا نشانہ بنائیں، ہلڑ بازی کریں۔ اگر دنیا

کی طاقتوں اور ہندوستانی مسلمانوں کو مظلوم و ستم زدہ انسانوں سے ایسی ہی ہمدردی ہے تو آج ایران میں برسرِ بازار انسان کے خون سے ہولی کھیلی جارہی ہے کیوں نہیں رکوانے کی کوشش کرتے. یوگنڈا میں قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع ہوچکا ہے اس سے کسی کے دل میں ذرا بھی حرکت پیدا کیوں نہیں ہوتی۔ اسرائیل کے خلاف انھوں نے کیا کیا؟ خود ہندوستان (جمشید پور) میں سیکڑوں جانوں کے برباد ہونے کی اطلاعات مل رہی ہیں ان سے ان ہمدردوں کی نیندیں کیوں نہیں حرام ہو جاتیں. دل کے مضراب میں کوئی حرکت پیدا کیوں نہیں ہوتی' کہاں گئے وہ رہنمایانِ قوم جو کسی فساد زدہ علاقوں کا دورہ اس وقت کرتے ہیں. جب تخریب پسند عناصر جی بھر کر معصوم انسانوں کے خون سے اپنی پیاس بجھا چکے ہوتے ہیں عورتیں بیوہ، بچے یتیم ہوچکے ہوتے ہیں، عزتیں لٹ چکی ہوتی ہیں۔ سہاگ اجڑ چکا ہوتا ہے تو لوگ شان سے دورہ کے لئے نکلتے ہیں اور اخباروں میں رسمی بیانات شائع کرواتے ہیں کیا اس وقت ان دردمندوں کے دلوں میں سوز و درد' تڑپ و بے قراری' ہمدردی و غمخواری کا جوہر چھن گیا ہے۔

یہ کون سے اسلام کی تعلیم ہے کہ ظلم و بربریت سے مجبور و مقہور انسانوں کی گلو خلاصی کے لئے تو کوئی اقدام نہ کیا جائے لیکن اپنی ہی ملت، اپنے ہی دین و مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ بہیمیت و انسانیت سوز حرکتیں روا رکھی جائیں؟ یہ کس اسلام کا قانون ہے کہ مجرم کا جرم ثابت ہو جائے پھر بھی اس کے جرم پر صرف اس لئے پردہ ڈال دیا جائے کہ دنیا کی بڑی طاقتیں (جو خود مجرموں اور ظالموں کی رہنما ہیں) اس کی پشت پناہی کر رہی ہیں اور جنرل ضیاء الحق صرف اس لئے چنگیز، ہٹلر، یزید کا لقب پائیں کہ انھوں نے اسلامی قانون کی مخالفت نہیں کی اور اعدائے اسلام کی بات نہیں مانی، انصاف کا دامن تھامے رہے انھوں نے وزیر اعظم اور معمولی رعایا کے ا[illegible]از کو مٹا دیا

ظلم کا ساتھ نہیں دیا اور حق پر ثابت قدم رہے۔ کیا حق و باطل کا معیار اور جھوٹ اور سچ کے پیمانے بھی بدل گئے ہیں۔ کیا ہم یہ مان لیں کہ اس تغیر پذیر زمانے اور حالات کے بہاؤ کے ساتھ اسلام کے ماننے والے بھی بہنے کے لئے آمادہ ہو گئے ہیں۔ کیا اس قوم کی زوال کی علامت نہیں ہے جس نے کبھی آفاق عالم پر اپنی عظمت و شوکت کا پرچم لہرایا تھا کیا ان کی ریشہ دوانیاں غیر مسلموں کے سامنے اسی اسلام کی صحیح تصویر پیش کر رہی ہیں جہاں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی، ایک کو دوسرے کے لئے آئینہ کہا گیا ہے۔ کیا ان علماء کے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ وہ معاملہ کے تمام پہلوؤں پر شریعت کی روشنی میں غور کر کے رائے قائم کریں۔ ان کے بارے میں توانما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء کہا گیا ہے، کیا یہ مومنانہ فراست ہے کہ حق و باطل، تاریکی و روشنی اور دوستوں اور دشمنوں میں امتیاز نہ کیا جائے۔

کیا یہ مسلمان جو اخلاقی "نقطۂ نظر کی بنیادوں پر آسمان سر پہ اٹھا لیتے ہیں۔ اقوامِ عالم کی قیادت کریں گے۔ بھٹکی ہوئی دنیا کو ہدایت و رہنمائی کی روشنی دکھائیں گے جن کا حال یہ ہے کہ روشنی موجود ہوتے ہوئے بھی اندھے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

صنفِ نازک کا خیال: خیبر سے واپسی کے وقت ایک جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ پھسل گئی۔ حضورؐ اور آپؐ کی اہلیہ ام المومنین حضرت صفیہؓ بھی گر پڑیں۔ حضرت ابوطلحہؓ آپ کو سنبھالنے کے لئے آپ کی طرف دوڑے تو آپؐ نے فرمایا علیک بالمراۃ۔ پہلے عورت کی خبر لو چنانچہ حضرت ابوطلحہؓ اپنے چہرے پر کپڑا ڈال کر انکی طرف چلے جب انکے پاس پہونچ گئے وہی اپنا کپڑا ان پر ڈالدیا اور کجاوہ ٹھیک کر کے ان کو سوار کرا دیا۔ (مسند احمد جلد سوئم ص۱۸۱)

فتنہ پردازی کے پیچھے

لوگوں کو شاید یاد ہو کہ کمیونسٹ پارٹی اپنے اجلاس میں یہ طے کر چکی ہے کہ وہ ہندی ریاستوں اور شمالی ہند پر اپنی توجہات کا بیشتر حصّہ صرف کرے۔ اس سے پہلے ان لوگوں کی سرگرمیوں کا بڑا محور مشرقی ہند اور جنوبی ہند کی ریاستیں اور علاقے تھے لیکن ایمرجنسی کے بعد ان کا یہ فیصلہ ہوا ہے کہ اس دائرے کو شمالی ہند میں پھیلایا جائے۔ سرگرم پارٹیوں کی حیثیت سے فطری بات ہے کہ انھیں ان علاقوں میں اپنے لئے خام مواد کی تلاش ہے۔ غالباً یہی حکمت عملی ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو اس مقصد کے لئے تاکا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ افراتفری اور انتشار میں مبتلا اس گروہ سے بہتر سپاہی انھیں کہیں اور نہیں مل سکتے۔

اسی حکمت عملی کا دوسرا تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ مسلمانوں میں رہے سہے اتحاد کو بھی پارہ پارہ کریں اور ان جماعتوں اور اداروں اور افراد کو نشانہ بنائیں جو مسلم نوجوانوں میں اسلامی شعور بیدار کر کے انھیں ایک با اصول گروہ بنانے کے لئے کوشاں ہیں۔ جماعت اسلامی کو ہدف بنانا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ آج کالجوں اور یونیورسٹیوں کے سیکڑوں ہزاروں طلباء میں جماعت اسلامی نے دینی شعور بیدار کرنے کی جو کوشش کی ہے اس کی وجہ سے ہماری یہ نوجوان نسل نہ صرف ان شکاریوں کے چنگل سے بچ نکلی ہے بلکہ ان کی کوششوں سے کمیونسٹ عناصر میں بھی خلا پیدا ہونے کا امکان پیدا ہونے لگا۔ حال ہی میں بھٹو صاحب کی پھانسی کے معاملے کو ان لوگوں نے جس طرح اٹھایا اس کو پڑھ کر ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ اسلام کے اتنے بڑے بہی خواہ اس صدی میں شاید کہیں پیدا ہی نہیں ہوئے۔ ممکن ہے کہ اس کے پیچھے کوئی بین الاقوامی محرک بھی ہو لیکن ہندوستان میں یہ جھنڈا اٹھانے کا مقصد یہ بھی تھا کہ جماعت اسلامی جیسی منظم اور باشعور جماعت کو مسلمان عوام سے کاٹا جائے شمال سے جنوب تک کی صحافت پر نظر ڈالی جائے اس مسئلے کو ہوا دینے والے یہی عناصر نظر آئیں گے۔ باقی وہ لوگ تھے جو سادہ لوحی، غلط فہمی اور خلوص کے ساتھ ان کے اس جال میں پھنس گئے۔

ہم نے یوپی کے ایک شہر کی ایک خبر شائع کی تھی کہ وہاں جماعت اسلامی کے دفتر پر حملہ کرنے والوں میں سے جن لوگوں کو پولیس نے اپنے انتظامی تقاضے کے طور پر گرفتار کیا ان کی مفت پیروی کے لئے کمیونسٹ پارٹی نے پیش کش کی ہے۔ اب ایسی ہی خبر سرینگر سے آئی ہے اور کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان ہی میں شائع ہوئی ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے پانچ وکیلوں پر مشتمل ایک قانونی ڈیفنس کمیٹی بھی بنائی گئی ہے جو گرفتار شدگان کی معاوضہ کے بغیر قانونی پیروی کرے گی۔

ہندوستان میں ہزاروں حادثات پیش آچکے ہیں لیکن بے گناہ پکڑے جانے والوں کی پیروی کا خیال کبھی بھی اس پارٹی کو نہ آسکا۔ مگر مسلمانوں کے انتشار کو آگے بڑھانے کے معاملہ میں ان کا یہ اقدام جس بات کی غمازی کر رہا ہے اس کو ہر سوجھ بوجھ رکھنے والے کو سمجھنا چاہیے۔

وادی کشمیر کے سلسلے میں ہم نے سنا کہ اسلامی کارکنوں کے علاوہ وہاں اسلامی کتابوں پر بھی خاص طور سے غصہ اتارا گیا اور جو لوگ پیش پیش تھے۔ انھوں نے مذہبی کتابوں حتیٰ کہ کلام پاک تک کو جلایا اور روندا لیکن اگر کسی جگہ انھیں کارل مارکس کی کوئی کتاب

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

اے وادیٔ کشمیر

(شائستہ نعیم)

محترم چچا جان ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

مزاج گرامی! آپ کا ۹ر مارچ کا خط اپریل کے آخری عشرہ میں ملا تھا۔ میں علیل تھی۔ جواب نہ دے سکی۔ معذرت خواہ ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ مجھے اس بات کا حق حاصل ہے کہ اپنے ذہن میں اُبھرنے والے شکوک کے بارے میں آپ سے رجوع کروں۔ "نمونۂ عظیم" نمبر کے بارے میں میرے اُٹھائے ہوئے سوالات اسی سلسلے کی کڑی تھے۔ آپ کے جواب کے بعد اب مجھے کچھ عرض نہیں کرنا ہے۔

ایک نعتیہ غزل اور ایک نظم "اے وادیٔ کشمیر" ارسال خدمت ہے۔ "دعوت" میں کشمیر کے سانحۂ عظیم کے اسباب اور نقصانات کی تفصیلات پڑھ کر آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ میں نے آنسوؤں کے ساتھ یہ نظم کہی ہے اور آنسوؤں کے ساتھ ہی لکھ رہی ہوں۔

"حجاب" کا اداریہ میرے لئے آبِ کوثر کی طرح ہے۔ اس میں آپ کے اداریہ کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا تو بھی یہ میرے لئے قابل قدر ہوتا۔ ادھر دو ماہ سے حجاب میں جو اداریہ آرہا ہے وہ بے حد کار آمد ہے۔ غزلیں اور نظم شائع کرنے کے لئے مشکور ہوں۔

محتاج دعا۔ شائستہ نسیم گورکھپور

خوش رنگ فضاؤں میں تری ایسا دُھواں ہے
ہر سمت لپکتی ہوئی شعلوں کی زباں ہے
دہشت سی ہے چھائی ہوئی، دحشت کاسماں ہے
بستی پہ تری شہرِ خموشاں کا گماں ہے
کچھ بول، زباں کھول کہ یہ ماجرا کیا ہے
میں کیا کروں تحریر؟
اے وادیٔ کشمیر!

یہ کس نے سیاہی ترے چہرے پہ، لگادی
اک خون کی ندّی تری دھرتی پہ بہادی
مٹی میں حیا اپنی ہی ماؤں کی رِلادی
روشن تھی جو تہذیب کی قندیل بجھادی
تہذیب و تمدّن کا یہاں خون بہا ہے
ہر شخص ہے دلگیر!
اے وادیٔ کشمیر!

یہ کس نے زمیں پہ تیری طوفان مچایا
کیں بستیاں تاراج، مساجد کو گرایا
قرآں کے اوراق کو شعلوں میں جلایا
اک جابر و سفّاک کا یوں سوگ منایا

یہ کون تری خاک سے فرعون اُٹھا ہے
بدنیت و بے پیر!
اے وادیٔ کشمیر!

یوں خون میں ڈوبا ہوا یہ کس کا کفن ہے
زخموں سے تڑپتا ہوا یہ کس کا بدن ہے
بیوہ بنی بیٹھی ہوئی یہ کون دُلہن ہے
اُجڑی ہوئی یہ مانگ لئے کس کی بہن ہے
دھرتی کا تری کیسا یہ دستورِ وفا ہے
یہ کیسی ہے تعزیر؟
اے وادیٔ کشمیر!

جلتے ہوئے یہ آگ کے شعلوں میں مکانات
یہ جنّت ارضی پہ سلگتے ہوئے باغات
مکتب رہے محفوظ نہ سجدوں کے مقامات
دہرائی گئیں عہدِ جہالت کی روایات
وادی تری جیسے کہ کوئی ہیر و شما ہے
عبرت کی ہے تصویر
اے وادیٔ کشمیر!

یہ کون ہیں چہروں پہ لئے غم کی خراشیں
کاندھوں پہ اُٹھائے ہوئے اپنوں ہی کی لاشیں
آنکھوں میں چھپائے ہوئے اشکوں کی برآتیں

ہونٹوں میں دبائے ہوئے مجبور زبانیں
مظلوموں کی فریاد سے یاں عرش ہلا ہے
یہ آہ کی تاثیر!
اے وادیٔ کشمیر!

یہ وادیٔ گل پوش ترے خوں سے دُھلی ہے
اسلام کے جانبازوں کی لاشوں سے پٹی ہے
تقدیس یہاں مریم و سیتا کی لُٹی ہے
دھرتی پہ تری کیسی یہ بیدادگری ہے
گھر تیرا، ترے گھر کے چراغوں سے جلا ہے
اے شومیٔ تقدیر!
اے وادیٔ کشمیر!

سرگرمِ عمل کل بھی تھے، ہم کل بھی رہیں گے
مردانِ جری ہیں کبھی پیچھے نہ ہٹیں گے
ہم وقت کے ہر وار کو ہنس ہنس کے سہیں گے
جو بات کہ حق ہے وہ سرِ دار کہیں گے
تلواروں کے سائے ہی میں اسلام پلا ہے
تخریب میں تعمیر
اے وادیٔ کشمیر!

سانحہ کشمیر اور اس کے اسباب

میرے محترم و مکرم بھائی ایڈیٹر صاحب تعمیر حیات! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

"سانحہ کشمیر اور اس کے اسباب" کے عنوان سے ۴ صفحات پر مشتمل ایک روداد غم ارسال خدمت ہے۔ براہ کرم اسے اپنے موقر جریدے کی قریبی اشاعت میں جگہ دیجئے اور اس کا عربی ترجمہ کرکے اسے عرب دنیا کے اخبارات تک بھی پہنچایئے تاکہ عرب دنیا کے اسلام پسند حلقے بھی کشمیر کی طرف متوجہ ہوں۔ ڈر ہے کہ اگر دنیائے اسلام نے فوری طور پر کشمیر کی طرف اپنی توجہ نہ دی اور اس کی خاطر کوئی منصوبہ نہ بنایا تو آئندہ چند برس میں کشمیر سے اسلام رخصت ہو جائے گا اور اسلام پسندوں کی تذلیل اور لوٹ مار کا موجودہ سلسلہ جاری رہا تو کسی کو اسلام کا نام لینے کی جرأت نہ ہوگی۔ بھٹو کے نام پر کشمیر میں لادین عناصر نے اسلام اور قرآن پاک کی توہین کرنے اور شعائر اسلام کے خلاف نفرت پھیلانے کا منصوبہ بند سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ امید ہے کہ آپ حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی اور دیگر جید علماء ہند اور اسلامک سکریٹریٹ کو اور دوسری عالمی اسلامی تنظیموں کو بھی کشمیر میں اسلام کے خلاف سازشوں سے آگاہ کریں گے اور اس سلسلہ میں تدابیر پر غور ہوگا۔

تازہ فتنہ میں اُجڑے ہوئے کشمیری مسلمانوں کی بحالی کے لئے بھی آپ کی فراخدلانہ مدد کی ضرورت ہے۔ (خیراندیش — ایک کشمیری مسلمان)

★

۴ اپریل کو راولپنڈی میں مسٹر بھٹو سولی
لٹکائے گئے۔ اس خبر کے آنے کے ساتھ ہی
دی کشمیر کی زندگی رک گئی اور گلی گلی میں مظاہرے
شروع ہو گئے جنھوں نے فوراً ہی تشدد
و بربریت اور درندگی کی شکل اختیار کر لی
س طرح ۴ اپریل کی صبح سے ۶ اپریل کی
م تک وادی کشمیر خاص کر اس کے
ں لوٹ مار اور آتش زنی میں ڈوب
ئے اور اب سارا کشمیر غمناک اور اداس ہے۔
کشمیر کی وادی میں پاکستان کے سربراہان
لت اور وزراء اعظم مقبول رہے ہیں۔ لیکن
سب میں مسٹر بھٹو کشمیر کے عوام میں مقبول ترین
ڈر بن گئے لیکن یہ حیرت ہے کہ گذشتہ
۳۲ برس میں صرف دو پاکستانی لیڈروں
کشمیریوں نے کم ہی پسند کیا ہے۔ ان میں
ے ایک تھے قائداعظم محمد علی جناحؒ اور
سرے موجودہ صدر جنرل محمد ضیاء الحق
سے نفرت کرنا اور کرانا کشمیر کے عوام
اس کا ایمان بنایا گیا اور اب جو ضیاء الحق

صاحب کو پسند بھی کرتا ہے وہ اپنی بے عزتی
اور مار پیٹ کے خوف سے ایسا اظہار نہیں
کر سکتا۔ ایک شیر خوار بچے سے لے کر ایک
صد سالہ بڑھیا تک، ایک گنوار سے لے کر
ایک مولوی اور واعظ سب پر مسٹر بھٹو کی قصیدہ
خوانی اور صدر ضیاء الحق کی عیب چینی فرض
قرار پائی ہے۔ مسٹر بھٹو کی تعریف اور صدر
ضیاء الحق کی تحقیر کے بغیر کوئی کشمیری مسلمان
مسلمان نہیں اور کوئی عالم اور دانشور دانشور
مانا نہیں جائے گا۔ اس تعصب اور جہالت
کے اسباب بھی ہیں مسٹر بھٹو ایک ایسی شعلہ نوا
شخصیت کا نام تھا جس نے کردار اور عمل کے
غازی کا نہیں بلکہ گفتار کے غازی بننے کی
طرف اپنی توجہ لگائی۔ وہ ۲۰ برس میں
پہلے پاکستانی حکمران تھے جنھوں نے نشر
و اشاعت اور ابلاغ عامہ کے تمام ذرائع
کو اپنی شخصیت اور مقبولیت کے لیے مسلسل
استعمال کیا۔ وہ ریا اور مکر سے اپنی زندگی
اور سیاست چلاتے تھے۔ وہ ریڈیو اور ٹیلی
ویژن پر تقریر کرنے آتے تو کئی کئی گھنٹے

اپنی شعلہ فشانی اور ہرزہ سرائی سے سامعین اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے پوری دنیا کو متاثر کرتے تھے۔ تقریباً ہر بات ریڈیو پاکستان مسٹر بھٹو کی تقریروں کے ٹیپ بجاتا اور کوئی نہیں تو کم از کم کشمیری مسلمان گھرانوں میں یہ تقریریں بڑی مقبول ہو رہی تھیں۔ سیاسی اداکاری اور ڈراموں میں مسٹر بھٹو کا جواب نہ تھا۔ وہ اپنے معمولی ایکٹ کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے اور اپنے بھدے اور غلط کاموں کو بھی نیکی کا جامہ پہنا دیتے تھے۔ کشمیر اور آزاد کشمیر میں تحریک آزادی کشمیر کو ختم کروانے کے لئے انہوں نے کیا چالیں چلیں وہ تو سوچ سمجھ رکھنے والوں کو معلوم ہیں۔ لیکن جمہوریت کا نعرہ دے کر انہوں نے کشمیریوں کو یہ تاثر دیا کہ صرف مسٹر بھٹو کشمیر کو آزاد کرا سکتے ہیں۔

سابق وزیر اعظم اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے سارے پاکستان میں غیر مقبول ہو گئے۔ لیکن کشمیری ظاہر پرست ہو کر صرف مسٹر بھٹو کی تعریفیں کرتے رہے۔

آخر جب کشمیریوں کو پتہ چلا کہ جنرل ضیاء نے مسٹر بھٹو کو اقتدار سے الگ کر دیا ہے تو جنرل ضیاء الحق کے خلاف ہو گئے۔ جب مسٹر بھٹو کے خلاف لاہور ہائی کورٹ نے نواب محمد احمد خاں کے قتل کے مقدمہ کی سماعت شروع کر دی تو جنرل ضیاء الحق کے خلاف نفرت اور زیادہ تیز ہو گئی۔ اس نفرت کو ہوا دینے اور بھڑکانے میں بی بی سی اور ہندوستان کے اردو پریس نے اہم کردار ادا کیا۔ پاکستانی حکومت کی تذلیل کرانے اور مسٹر بھٹو کی محبت play up کرانے میں کشمیر کے عوام میں دہلی کے دو اخبارات "عوام" اور "نئی دنیا" نے سب سے زیادہ گھناؤنا کردار ادا کیا۔ اس چیز سے ان دونوں نے اپنی سستی صحافت اور غیر ذمہ دارانہ تحریروں کے ذریعہ کشمیر کے عوام کو گمراہ کیا۔ دوسری طرف سے سیاسی جماعتوں کے لیڈروں اور مسجدوں کے اماموں اور واعظوں نے بھی پاکستان حکومت، پاکستان قومی اتحاد کے لیڈروں اور پاکستان کے علماء کے

ـدوں اور آستانوں میں ایک بھیانک نفرت
یز مہم شروع کی جو آج بھی شدت کے ساتھ
ری ہے۔ وادی کے چھوٹے بڑے شیعہ
ولویوں، بعض سنی مولویوں اور اہل حدیث
حلقوں نے اس نفرت انگیز مہم کے چلانے
ں ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش
ں اور مساجد پر پاکستان کے بعض علماء اور
ن کی تصنیفات پر کفر کے فتوے جاری
کیے جانے لگے۔ کشمیر کے کمزور کمیونسٹوں کے
و صلے بھی بلند ہونے لگے اور انھوں نے
بھی عوام میں اسلام پر نکتہ چینی شروع کر دی
ہور ہائی کورٹ نے مسٹر بھٹو کو قتل کا مجرم
رار دیا تو یہ لوگ پاکستان کے خلاف وادی
ی سڑکوں پر نکل آئے اور بعض دیہات
یں تشدد کے واقعات پیش آئے اور چلہ
داڑھی کی سنت پر حملے کیے گئے اور اسلامی
رسگاہوں کے بورڈ اتارے گئے۔ جب سپریم
ورٹ نے اس سزا کی توثیق کی تو پھر سے
وادی بھر میں پاکستان اور سربراہ مملکت
کے خلاف احتجاج ہوا۔ جب نگرانی کی

اپیل مسترد ہوئی تو کشمیر کے عوام اور زیادہ مشتعل
ہو گئے اور جب مسٹر بھٹو کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا تو ساری
وادی میں ۳ روز تک وسیع پیمانے پر لوٹ
مار اور آتش زنی کی وارداتیں ہوئیں مکانات
اور دوکانیں راکھ کا ڈھیر بنائے گئے۔ لاکھوں
روپے کا مال و اسباب گھروں اور دکانوں
سے لوٹ لیا گیا، ایک نامعلوم تعداد قتل کی
گئی۔ عورتوں کی آبروریزی کی گئی۔ مویشیوں
پر ڈنڈے برسائے گئے۔ مرغ مرغیوں تک
کو چھین لیا گیا۔ ضلع اسلام آباد میں کئی گاؤں
کھنڈرات بنائے گئے اور ضلع بارہمولہ میں
بانڈی پورہ کی تحصیل میں سب سے زیادہ
تباہی مچائی گئی۔ ساری وادی میں ہزاروں
کنال پر پھیلے ہوئے باغات میں پائے
جانے والے سیب اور دوسرے میووں
کے درخت کاٹ کر گرائے گئے۔ لوگوں کی
داڑھیاں شیو کی گئیں۔ جماعت اسلامی کشمیر
کے تمام دفاتر اور درسگاہیں تہس نہس
کر دیے گئے اور قرآن پاک اور دوسری
دینی کتابوں کو پاؤں سے روندا گیا اور جلایا

گیا۔ نہ صرف صدر ضیاء الحق بلکہ علماء کی تذلیل کرنے کے لیے ان کے پتلے جلائے گئے یا ان علماء کے پتلوں کے ساتھ فحش عبارت لکھ کر ان کو دیواروں اور بجلی کے کھمبوں پر آویزاں کیا گیا ہے۔ ساری وادی میں اسلام پسند لوگوں کی نشان دہی کر دی گئی اور ان کی بے رحمی کے ساتھ تذلیل کی گئی اور ذاتی عناد کی بنیاد پر بہت سارے لوگوں کو نشانہ بنایا گیا۔ یہ سب کچھ ایک منظم منصوبے کے تحت کیا گیا، جس میں کمیونسٹوں، لیڈروں اور دوسرے اسلام دشمن عناصر نے بھرپور حصہ لیا۔ مسجدوں کے پیش امام، واعظ اور امام اور عام مسلمان اس سازش میں بری طرح استعمال ہو گئے۔ عام مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھائی گئی تھی کہ پاکستان میں جنرل ضیاء الحق نے اسلام کو ختم کر دیا ہے۔ اس دوران کشمیر میں کمیونسٹ لابی سرگرم رہی اور ہندوستان کا محکمہ جاسوسی بھی سرگرم تھا اور انھوں نے اس ہنگامے کا رخ پاکستان اور اسلام کی دشمنی کی طرف موڑ دیا۔ دیہات میں مختلف سیاسی جماعتوں کے کارکنوں نے بھی اپنی دوکان چمکانے کے لئے ان مظاہروں کے دوران اہم رول ادا کیا اور اپنی اشتعال انگیز تقریروں کے ذریعے مظاہرین کی آگ پر تیل چھڑکا۔ اس غارت گری اور آتش زنی کے دوران مظاہرہ کرنے والوں، چلانے والوں نے ساری وادی کا ٹریفک نظام معطل کر دیا تھا اور کشمیر کی ایڈمنسٹریشن بالکل بے حس و حرکت تماشا دیکھ رہی تھی۔ کاش ایڈمنسٹریشن نے ان ہنگاموں کو رد کرنے کے لئے ضروری کارروائی کی ہوتی تو آج یقیناً صورت حال مختلف ہوتی۔

۴۔ ۵ اور ۶ اپریل کی غارت گری کشمیر کا سیاہ ترین باب ہے۔ افسوس ہے کہ یہ بربریت شیخ صاحب کے زمانہ اقتدار میں ہوئی، جن کا ڈسپلن مسلمہ تھا۔ ان واقعات نے شیخ صاحب کی پوزیشن کو سخت متاثر کر دیا اور لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ شیخ صاحب کی حکومت غنڈوں کی سرکوبی نہیں کر سکی،

اوراب لوگوں میں عدم تحفظ کا احساس ہے۔ ابھی تک اس غارت گری میں حصہ لینے والوں تقریروں میں اس کی شہ دلانے والوں اور پردے کے پیچھے تار ہلانے والوں کو گرفتار نہیں یا ہے۔ آئندہ انتخابات میں یہ صورت حال موجودہ حکمراں جماعت کے خلاف استعمال ہو سکتی اس لئے ضروری ہے کہ شیخ صاحب اس کا سنجیدہ نوٹس لیں اور پارٹی امتیازات سے بالاتر ہو ورنہ اس قیاس کو تقویت ملے گی کہ شیخ صاحب کی نیشنل کانفرنس بھی اسی لوٹ مار کی اہاں تھی۔

میں نے کشمیر کے تازہ عذر پر یہ ایک سرسری رپورٹ لکھی ہے۔ میں نے کسی مبالغے سے بھی کام نہیں لیا ہے۔ تفصیلات و واقعات زیادہ ہولناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے ہیں اور میرے پاس وہ بیان و زبان نہیں ہے جو اس قصۂ غم کو قلم بند کرے۔

دل کا کانٹا زبان سے نکلا

یوسف دلیر

مغربی ذرایع ابلاغ اور اشتراکی ممالک کے شور وغل سے بالکل عیاں ہے کہ وہ ا
اسلام دشمن مقاصد اور نظریات کی روشنی میں بھٹو صاحب کو اپنے لئے کوئی خطرہ نہیں سمجھتے
جبکہ آج بین الاقوامی سطح پر اسلامی نظام کے متوقع انقلاب پر مغربی اور اشتراکی د
پریشان ہے۔ اور سازشوں میں مصروف ہے۔ آج دنیا بھر میں ایران اور پاکستان ۔
خلاف بڑے پیمانے پر پروپیگنڈہ ہو رہا ہے۔ ایران میں کمیونسٹوں اور کردوں کی ہ
کو بڑے پیمانے پر پیش کیا جاتا ہے جبکہ پاکستان میں انتشار پیدا کرنے کے لئے بار بار
خاندان کا ذکر خیر کیا جاتا ہے۔ تصویر کچھ ایسی بنائی گئی ہے کہ جیسے ایران اور پاکستان میر
باتوں کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔ مغرب کے سفید سامراج اور مشرق کے سُرخ سامرا
یہ اسلام دشمن سرگرمیاں اسوقت سے بہت تیزی کے ساتھ شروع ہو گئی ہیں۔ جب سے پا
کی موجودہ حکومت کا رخ ماسکو، واشنگٹن اور پیکنگ کی بجائے مکہ اور مدینہ کی جانب
میں آیا ہے اور دوسری طرف ایران میں جب سے دینی گروہوں کے ہاتھوں ایک ملک
اسلامی تحریک کا آغاز ہو گیا۔ ایسی ہی وجوہات ہیں کہ اب امریکہ نے ایٹمی توانائی کا بہانہ
کر پاکستان کی تمام اقتصادی امداد بند کر دی ہے کہ یہ ملک معاشی مشکلات کا شکار ہو
نئے طرز نظام سے متنفر ہو جائے۔ حالات سے صاف ظاہر ہے کہ آج اسلام اور غیرا
کے درمیان اس قدر واضح ٹکر ہے کہ تاریخ میں بھی اس انداز کی نہ تھی۔ اسلام دشمن

براہ راست اسلام کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کیونکہ دنیا میں کروڑوں مسلمان اور سینکڑوں مسلم مملکتیں ہیں لہذا وہ مسلمانوں کے مختلف اندرونی مسائل اور معاملات کو بار بار اُچھال کر انتشار پھیلانے کے درپہ ہیں۔

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ عام مسلمان حالات کی باریکیوں کو سمجھنے سے قاصر نظر آرہا ہے وہ ظاہری شور وغل اور پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے ایسا لگتا ہے کہ اللہ اور اسلام کے حقائق کے بارے میں جو ضعیف ایمان اس کے دل میں چھپا ہوا تھا وہ موجودہ شور وغل اور مخالف دین پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر زبان پر آگیا ہے۔ وقت نے اب رسمی اسلام اور حقیقی اسلام کو پوری طرح چھانٹ کر رکھ دیا ہے۔ جو لوگ محدود مذہبیت کے حامل تھے جذبات کی حد تک مسلمان تھے۔ شرک وبدعت اور فروعی معاملات میں اُلجھنا جن کا شیوۂ اسلام تھا وہ سب ایک قوم بن کر ان لوگوں کے مقابل آگئے ہیں جو چاہتے ہیں کہ مسلمان پھر ایک بار ملت اسلامیہ بن کر اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی طرف بڑھیں۔ آج منافقوں اور ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کو سر کی آنکھوں سے پہچانا جا سکتا ہے۔ یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی یاد دلاتی ہے جب کہ اسلام اور کفر کی پہچان بالکل آسان تھی۔

بین الاقوامی سطح پر اسلامی نظام کے بڑھتے ہوئے انقلاب کے خلاف ردّعمل واضح طور پر کشمیر میں سامنے آگیا ہے جہاں طاغوت، کفر اور محدود مذہبیت کے حامیوں نے ایک قوم بن کر اسلام، قرآن، سنتِ رسولؐ اور مساجد کے خلاف کھلی بغاوت کی یہ لڑائی کسی ایک اسلامی جماعت کے خلاف نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو کم از کم اسلامی لٹریچر قرآن کریم، مسجدوں اور سنتِ رسولؐ کی حفاظت کی جاتی لیکن ان سب کو شرمناک توہین کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ لڑائی اسلام کا نام لینے والے افراد کے خلاف نہیں تھی بلکہ سراسر اسلام کے خلاف تھی۔ اسلامی لٹریچر قرآن کریم اور اس کی تفاسیر مساجد اور دینی درسگاہیں بہرحال کسی ایک جماعت کا ورثہ نہیں ہو سکتے، بلکہ بلا امتیاز مسلک، جماعت، رنگ ونسل اور وطن کے ہر مسلمان کا ان پر حق ہے اگر چند مسلمان آگے بڑھ کر

ان کو ملیا میٹ کردیں تو یہ سراسر اللہ اور اس کے رسول کے خلاف بغاوت کے مترادف
داڑھی رکھنا بہرحال سنتِ رسولؐ میں سے ہے اس کی توہین کرنا داڑھی والے شخص کی نہ
خود شعارِ رسولؐ کی توہین ہے۔ ہمارے نبیؐ نے فرمایا وہ شخص ایمان نہیں رکھتا جس کا
اس کی تکلیفوں سے محفوظ نہ رہے اور اس کی اذیت کے درپے رہے۔ تعجب ہے کہ ا
ہمسایوں اور ہم وطنوں کو اقتصادی اور اخلاقی طور پر ختم کر کے اور مصائب کا نشانہ
والے بے باک ہو کر خود کو مسلمان کہتے ہیں۔ توبہ و استغفار کی بات تو دور اپنے کرتو
پر شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔ کاش یہ ملت اپنے دوستوں اور دشمنوں کے درمیان امتیاز
کی صلاحیت پیدا کر لیتی ہے (ترجمان الحق)

کشمیر کے حالیہ فسادات کا

سیاسی پس منظر

(از غلام حسن متو مجاہد منزل)

پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کی خبر نے جہاں دنیا بھر کے ایوانوں میں ظاہری طور پر لرزہ طاری کر دیا وہاں کشمیر میں اس خبر کی سرگوشیاں جب گلی کوچوں، سڑکوں اور شاہراہوں پر سُنی جانے لگیں تو کشمیری عوام کے دل و دماغ میں ایک عجیب اور مختلف قسم کے ردِ عمل نے جنم لیا جس نے طوفانی صورت اختیار کر کے تشدد کے ایسے ہولناک ماحول کو بپا کیا جس میں نہ صرف آدھ درجن سے زیادہ قیمتی جانیں ضائع ہوئیں بلکہ اس تشدد نے کئی عمارتوں کو آگ کے شعلوں کی گود میں بھسم کر کے صفحہ ہستی سے مٹا دیا اور آخر کار اس پُر تشدد احتجاج نے ایسی ہولناک صورت اختیار کی کہ گاؤں کے گاؤں آگ کی شعلوں کے نذر ہو گئے۔ اور بھائی اپنے بھائی کے لئے قہر الٰہی بن کر ٹوٹ پڑا۔ ان پُر تشدد کارروائیوں سے نہ صرف انسان انسانیت اور اخلاقی سطح سے گر گیا بلکہ اپنے جاہلانہ اور سفاکانہ طرزِ عمل سے اس نے اپنے پست ذہنی اور جذباتی ہونے کا ایک ایسا ثبوت پیش کر دیا جس کی نفی، تردید، یا تلافی ایک لمبی مدت تک کرنی ناممکن ہے۔

حالات کا غائر مطالعہ کیا جائے تو اس ساری دوڑ دھوپ کے پیچھے تین طرح کے سیاسی محرکات کار فرما تھے۔ ایک گروہ کا سیاسی مقصد تو یہ تھا کہ وہ اس تشدد کے سہارے

کشمیر کی موجودہ حکومت کو بیرون ریاست بدنام کرنے کے لئے ایک اوچھے ہتھیار کے طو
استعمال کرے اس غرض سے پوری وادی میں منافرت سستی جذباتیت اور غیر عقلی پن
دریا میں غوطہ زن ہوئی۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے پوری قوم پاگل پن کا شکار ہو گئی
اس مقصد کے تحت ۲ / اپریل سوموار کو   کے نام پر یہاں تشدد کی ابتدا ہوئی تھ
اور پریس انفارمیشن بیورو کی عمارت کو آگ لگا کر خاک کر دیا گیا ۔ مدعا یہ تھا کہ بڑے پیما
ہنگامے ہوں جن کی کوئی اخلاقی جوازیت نہ تھی۔ کیونکہ جو لوگ اس احتجاج میں پیش
تھے انہوں نے خود موجودہ حکمرانوں کو آلہ وانگن کرنے کا اختیار دیا ہے مگر کچھ حکمران
کی بر وقت مداخلت اور حکمتِ عملی سے یہ احتجاج دب گیا اور پھر غیر متوقع بھٹو صاحب
دوسرے ہی دن انجام کو پہنچنا اس کی راہ میں ایک رکاوٹ بن گیا۔ اس مقصد کے حص
کے لئے اگرچہ یہ مناسب وقت نہ تھا مگر پھر بھی بعض املاک کو جلا کر سیاسی کرتاہ بینی کی بدتر
مثال پیش کی گئی۔ ان شکست خوردہ سیاست دانوں کو یہ اُمید تھی کہ حکمران جماعت کی طرف
اس احتجاج کی بھرپور مزاحمت ہو گی اور اس کا سہارا لے کر وہ لوگوں کو استعمال کر کے مرکز
ایوانوں میں لرزہ طاری کر دیں گے۔ مگر حکمران جماعت نے اس احتجاج کی مزاحمت کے ب
حوصلہ افزائی کر کے اس ساری سیاسی دوڑ دھوپ کا نقشہ ہی بدل دیا۔ زبان سے پہلو
پاکستان کی مملکت اور اسلامی نظامِ حیات کے خلاف ایسے نعرے لگائے گئے جن کی
کشمیری سے توقع ہی نہ رکھی جا سکتی تھی۔ اور یہ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ سیاسی اسٹیج
شکست خوردہ اور نام نہاد سیاست دانوں کو جب اپنی لگائی ہوئی آگ کا اثر کچھ مخالف
آنے لگا۔ تو وہ موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے پیچھے لپکے اور ایک سیاسی گروہ موجودہ فض
اپنے موافق پا کر قیادت کے اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اور مشتعل ہجوم کے برافروختہ اور اس
وجہ سے پیدا شدہ منافرت کو دیرپا ثابت کرنے کے لئے سیاسی فریب کاری

آزمودہ ہتھکنڈے آزمانے لگا۔ اور بھٹو کے لئے احتجاج جو محض انصاف اور انسانی ہمدردی کے نام پر کیا گیا تھا۔ پورے پاکستان کے خلاف منافرت، تعصب اور غلط فہمی پھیلانے کا ایک سستا ذریعہ بنا دیا گیا اور اس گروہ کے سیاسی مدبرین کی زبان بھٹو صاحب کی تسبیح خوانی سے شروع ہو کر کشمیر ہند کے پرانے راگ پر ختم ہوئی۔ موقع کی نزاکت اور دلوں میں بھڑکی ہوئی وقتی منافرت کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بات کی کوشش کی گئی کہ لوگوں کے دل و دماغ بھٹو صاحب کی ہلاکت کے زیرِ اثر پاکستان کے سات کروڑ انسانوں سے بھرپور نفرت کے لئے استعمال کئے جائیں اور اس کا سیاسی فائدہ آسان طریقے سے ان لوگوں کو ملے جو اس احتجاج کے ردِ عمل سے دوہرے سیاسی فائدوں کی تاک میں تھے۔ اور اس طرح انسانیت انصاف اور انسانی ہمدردی کے نام ابھری ہوئی کشمیری قوم کی آواز ایک غیر متوقع روپ دکھا کر منافرت اور تعصب سے آلودہ ہو گئی اور اس نئی صورت حال سے یہ پوری طرح عیاں ہو گیا کہ یہ احتجاج کسی انسانی ہمدردی یا ملی جذبے کے تحت نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے سہارے درحقیقت موقع پرست سیاسی طالع آزمائی اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی فکر میں تھے اور اس وجہ سے تشدد نے ایسی صورت اختیار کی۔ تیسرا گروہ پہلے دو کی جملہ قوت کا متحدہ روپ تھا اور اس میں اگرچہ ایک طرف سیاسی محرکات کارفرما تھے مگر دوسری طرف مذہبی نظریات کو بھی اس میں خاصا دخل تھا اور اس کی سفاکی اور بربریت کا نشانہ یہاں کی جماعت اسلامی بنی۔ جماعت اسلامی کو تشدد کا نشانہ بنانے کے وقت یہ سب شکست خوردہ سیاستدان اور پیشہ ور ملا اپنے سیاسی اور مذہبی اختلافات بھول گئے اور لوگوں کو یہ تاثر دیا گیا کہ جماعتِ اسلامی پاکستان نے ہی بھٹو کو پھانسی پر لٹکایا۔ اس وجہ سے ان کی ہم جماعت کشمیر جماعت اسلامی کو ملیامیٹ کرنا جہاد ہے۔ اس ساری منافرت اور درندگی کا پس منظر جاننے کے لئے اگر ہم اس قرارداد کا مسودہ سامنے

رکھیں، جو شکست خوردہ، موقعہ پرست اور نام نہاد مدبرین سیاست نے عیدگاہ کے اجتماع میں پاس کرانے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ سیاسی محرکات بھی سامنے آئیں گے جو یہاں کے شکم پرست ملاؤں اور نام نہاد سیاستدانوں کے زیر نظر تھے اور جس کی وجہ سے یہاں ہر سو ایسی تباہی ہوئی۔ قرارداد میں تحریر ہے "آج ہر آنکھ پُرنم ہے"۔ آج ہر شئے ماتم کناں ہے کیونکہ تیسری دنیا کے عوام کے اس عظیم المرتبت انقلابی قائد، بے مثال سیاستدان، ذہین مدبر اور باصلاحیت رہنما کو امریکی سامراج اور پاکستان المعروف "کوڑستان" کے فوجی ٹولہ اور نام نہاد اسلامی جماعتوں کے ملاؤں نے بڑی بے رحمی اور بربریت سے قتل کیا۔

اوپر کے الفاظ میں صاف طور پر اس ذہنیت کی بو آتی ہے جس کے ایماء پر یہاں تشدد کا محور گھومتا رہا۔ آگے کچھ بے باک اور غیر اخلاقی انداز میں اپنے من کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے تحریر کیا گیا ہے۔

ان سامراجی طاقتوں کے پاس فرسودہ سیاست مردودی ملاؤں اور اس قتل سے تعلق رکھنے والے نام نہاد مفتیوں اور مٹھی بھر درندہ صفت فوجی جرنلوں کے سوا کچھ نہیں۔ ان کے پاس اگر ہے تو وہ ہے سازش، قتل وغارت اور اسلام دشمنی، سیاسی بازی گری کے کند ہتھیار، ان کے فریب، دھوکہ اور یزیدیت ہے۔

اس تھرڈ کلاس زبان کا مطلب یہ ہے کہ بھٹو نوازی کے سہارے پوری پاکستانی قوم، وہاں کی سیاست اور فوج کو اسلام دشمن بازی گر جتا کر درحقیقت حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی مذموم کوشش کی گئی تھی کیونکہ جہاں تک حقائق کا تعلق ہے ہمیں ہی کیا پوری دنیا کو اس کی صحیح جانکاری نہیں۔ پھر بے وجہ جذباتیت کے بہاؤ میں بہہ کر انسانوں کو مشتعل کرنا کیسی غیر ذمہ دارانہ اور احمقانہ بات تھی۔ جمعہ کے روز جو تعزیتی اجتماعات ہوئے ان میں یا تو لوگوں کے دل و دماغ پاکستانی قوم سے متنفر کرنے کے حربے آزمائے گئے۔

ہبی گروہ بندی کی بنیاد پر سیاست کی آڑ میں یہاں کے نام نہاد مولویوں نے منافرت
بانے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری وادی میں جماعت اسلامی تشدد کا شکار
ئی۔ متذکرہ بالا قرارداد میں جماعت اسلامی پاکستان والوں کو سامراج پرست ملاؤں
ستان کے مردودی ملاؤں کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اسٹیج پر کھل کر قوم کے علماء
نے جماعت اسلامی کے کارکنوں کو پہچان لینے کے گر بتائے اور ان ساری
ں کو مدنظر رکھ کر یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس احتجاج کے نام پر مختلف قسم کے
ے اپنا سیاسی اُلو سیدھا کرنے کی تاک میں جائز و ناجائز انصاف اور ظلم و جبر کے
ات یہاں تک کہ سیاسی اختلافات کو بھی بالائے طاق رکھ کر صرف یہ چاہتے تھے کہ
حتجاج ان کی جھولی میں مطلوبہ سیاسی فوائد ڈال دے۔ قطع نظر اس کے کہ کس کو کیا
یا اس جہالت، درندگی اور سفاکی کا کس کو کیا پھل ملنے والا ہے۔ یہ بات اس تشدد نے
ت کر دی کہ یہ قوم نہ کسی قسم کی سیاسی سوجھ بوجھ رکھتی ہے نہ ان میں ملی غیرت کا جذبہ
ج زن ہے نہ ان کے دل شائستگی اور نرم روی کی دولت سے آشنا ہیں۔ بلکہ اپنی پست
نا اور جذباتی تحریک پر یہ قوم سفاکی اور جہالت میں آخری حدود تک کو پھاندنے کے
ئے تیار ہے۔ نہ جانے مورخ تاریخ کشمیر کے اس باب کو کن الفاظ سے رقم کرے گا مگر
صاف ہے کہ انشاء اللہ اس سارے واقعے سے کشمیر میں تحریک اسلامی کو
ت حاصل ہو گی اور یہ تحریک ضرور اپنے نیک مقاصد حاصل کرنے کے لئے اپنے
ر ایمانی جذبہ کسی صورت میں ڈگمگانے نہ دے گی۔ بلکہ وقت کی آندھیوں سے بے نیاز
کر وہ اس تحریک کو صرف اس لئے جاری رکھیں گے کہ یہ ایک فرض ہے اور فرض کی
ائیگی ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ ★★★★★★★★★★★★★★★★★★

(ترجمان الحق)

مُدعی سُست گواہ چست

اسحٰق جلیس

۱۔ امت مسلمہ کو قرآن مجید میں امت وسط (امت معتدل) کہا گیا ہے۔

وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس۔

(اور اس طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو)

جس ملت کو شہداء علی الناس کے مقام سے سرفراز ہونا ہے اس کو زندگی کے کسی مرحلہ میں راہ اعتدال سے منحرف نہیں ہونا چاہیے۔ یہ امت اگر اعتدال سے دامن کش ہو جائے تو اس میں تمام بنی نوع انسان کا خسارہ ہے۔

۲۔ اس ملت کا دوسرا امتیازی وصف یہ ہے کہ اسے دنیوی زندگی میں واضح ہدایات اور رہنمائی کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اس امت کی قیامت تک رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ اس ملت کی تاریخ شاہد ہے کہ جب اس رہنمائی سے وہ بے نیاز ہوئی اس نے نقصان اٹھایا اور جب کتاب و سنت کو رہنما بنایا کامیاب اور سربلند ہوئی۔

۳۔ اس ملت کو کتاب الٰہی میں ان گنت مقامات پر عقل، تدبر اور بصیرت کو کام میں لانے اور غور و فکر کو اپنانے کی دعوت دی گئی ہے۔ اندھی تقلید و اطاعت سے اور جوش و جذبات کے دھارے میں بہنے سے روکنے کے لئے مسلمانوں کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے یہ تک فرمایا گیا کہ، والذین اذا ذکروا بایات ربھم لم یخروا علیھا صما وعمیانا۔ (اور

وہ (رحمان کے بندے)، کہ جب ان کو پروردگار کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں تو ان پر اندھے اور بہرے ہوکر نہیں گرتے (بلکہ غور و فکر سے کام لیتے ہیں)

کسی غیر محتاط شخص کی بات اور پروپیگنڈہ پر یقین کرنے سے ان الفاظ میں روکا گیا،

یاایہا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنبإ فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نٰدمین (ایمان والو! اگر کوئی غلط کار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کرلیا کرو (مبادا) کہ کسی قوم کو نادانی سے نقصان پہنچا دو۔ پھر تم کو اپنے کیئے پر نادم ہونا پڑے)

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک سے صحابہ کرام رض کو جو محبت و عشق تھا۔ اس کی نظیر پوری تاریخ انسانی میں نہیں ملتی، لیکن جماعت صحابہ کو حضور ؐ نے جس طرح تربیت فرمائی تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوگا کہ ایک مرتبہ حضور ؐ نے فرمایا کہ "اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو"

صحابہ کرام رض جو حضور ؐ کے جاں نثار تھے اور آپ ؐ کی ہر بات واجب الاطاعت سمجھتے تھے، اس موقع پر اپنی ذہنی تربیت کے اظہار سے ذرا نہ جھجکے اور انھوں نے دریافت کیا کہ "یارسول اللہ ؐ! مظلوم کی مدد تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ظالم کی مدد کیوں کر کی جائے؟" اس پر آپ ؐ نے تشریح فرمائی کہ "ظالم کی مدد یوں کہ اسے ظلم سے روکو"

۵۔ مسائل کو جانچنے اور شخصیتوں کو پرکھنے کے لئے ہمیں وہ پیمانے بھی دیے گئے ہیں جن کے ذریعہ ہم صحیح اور غلط، اچھے اور برے، مفید اور مضر، دوست اور دشمن کی تمیز کرسکتے ہیں جو بات اسلام کے مصالح اور ملت کے مفاد سے متصادم ہوگی ہم اس سے دست کش ہوں گے۔ ہر شخصیت کو ہم قرآن و سنت کے مقرر کردہ معیار احترام و عزت پر پرکھیں گے۔ العزۃ للہ ولرسولہ وللمومنین اور ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

ہم کسی مسئلہ کو اور کسی شخصیت کو اپنے ذہنی پیمانوں اور ناقص معیار پر نہیں جانچیں گے۔

۶۔ جس ملت کو ایسی واضح رہنمائی نصیب ہو، جس کے پاس خیر و شر کی تمیز کے اعلیٰ پیمانے ہوں، جسے زندگی کے ہر موڑ پر خدا کی کتاب اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ مبارک سے قیمتی ضابطے اور اصول عمل مہیا ہوں اور اس ملت کا عمل اس کے بالکل برعکس ہو، اس پر جتنا بھی ماتم و افسوس کیا جائے کم ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا ۔۔۔ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ہماری اس بے راہ روی اور قرآن و سنّت کی تعلیمات سے بے نیازی کا بڑا بھونڈا مظاہرہ حال ہی میں پاکستان کے سابق وزیر اعظم بھٹو صاحب کی سزائے موت پر نظر آیا۔ عجیب و غریب بات ہے کہ جس ملک میں یہ واقعہ پیش آیا وہاں کے نوے فی صد لوگوں نے اس خبر کو سُن کر اطمینان کا سانس لیا، بعض منچلوں نے مٹھائیاں تقسیم کیں، نمازِ شکرانہ ادا کی، پاکستان سے ہندوستان میں آئے ہوئے چند لوگوں سے ہمیں ملنے کا اتفاق ہوا تو انھوں نے بھی اپنی نمازِ شکرانہ کا ذکر کیا، جب کہ یہاں جنرل ضیاء الحق کی حکومت نہیں تھی۔ پاکستان میں بھٹو صاحب واقعی مقبول ہوتے تو عوام پولیس اور فوج کو خاطر میں نہ لاتے، پاکستان میں تو کچھ نہ ہوا البتہ ہندوستانی مسلمانوں نے اس مسئلہ میں اپنی انتہا پسندی، جوش و جذبے، غم و غصّے اور بے دانشی کا جس طرح ثبوت دیا ہے وہ بہت تشویشناک اور قابلِ مذمت ہے۔

۷۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن کو مسموم کرنے اور انھیں گمراہ کرنے میں یہاں کے پریس نے افسوس کہ اس ملک کے اُردو پریس بہت

نمایاں ہے، جس بے ضمیری، جھوٹ اور بہتان و افترا کا بازار گرم کیا وہ ہماری صحافت کے چہرے کا بدنما داغ ہے۔

ہماری صحافت کی ناواقفیت، غیر ذمہ داری اور بددیانتی سے عالم اسلام کے واقف حلقوں اور حقیقی صورت حال سے قریبی واقفیت رکھنے والوں میں ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنی دیوالیہ پن کی جو تصویر ابھری ہے اور ہماری جو رسوائی ہوئی اس کی تلافی ممکن نہیں۔ رائٹر، یو این آئی، پی۔ ٹی۔ آئی اور بی بی سی کی خبروں کو وحی الٰہی سمجھنے والوں، اسلام دشمن عناصر سے حقیر مالی منفعت حاصل کرنے والوں اور اپنے پرچے کی اشاعت بڑھانے کے لئے من گھڑت جھوٹی سرخیاں جمانے والے صحافیوں نے ناواقف عوام کو گمراہ کیا، باہمی منافرت پھیلائی، دین داروں اور دیانت داروں پر سب و شتم، طنز و تعریض کو رواج دیا۔ بھائیوں کو بھائیوں سے لڑایا۔ ہزاروں گھر ویران کر دیے، مسجدوں اور مقدس کتابوں کو نذر آتش کرا دیا اور دین سے وابستہ لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا، اس دروغ گو اور شر انگیز صحافت کے علم برداروں کو یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ انھیں ایک نہ ایک دن خدا اور خلق کے سامنے حساب دینا ہوگا۔

ہر مکتب خیال کے رہنماؤں، ملت کے بہی خواہوں، دانشوروں اور قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ کیا ملت کی قسمت کی باگ ڈور "نئی دنیا" "عوام" "نشیمن"، "بلٹز" جیسے حقائق کو مسخ کرنے والے اخبارات کے سپرد کر کے تعمیری ذہن کی تشکیل اور ملی جدوجہد کے مثبت نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے؟

۸۔ تحریکوں اور شخصیتوں کے مدح و ذم اور تعریف و تنقید کے سلسلے میں ہم نے ذاتی ذوق، وجدان اور سنی سنائی باتوں پر انحصار و اعتماد نہیں کیا۔ اسلام کے وسیع تر مفاد، امت کے

سواد اعظم کی فلاح و بہبود اور قرآن وسنت کا مقرر کردہ پیمانہ ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہا ہے۔ ا
یں مصر کے صدر مرحوم جمال عبدالناصر کا طوطی بولتا تھا، ان کی تعریف و توصیف اور مدح
میں ہر طبقہ بازی لے جانا چاہتا تھا۔ انھیں عربوں کا نجات دہندہ اور عربوں کے اتحاد کا'
سمجھا جاتا تھا، اس دور میں ہم نے جمال عبدالناصر پر بے لاگ تنقید کی اور عربی قومیت کے
کے نعروں سے ہولناک عواقب کی نشان دہی کی، ان کے خطرناک عزائم اور حقیقی تصویر
نقاب کیا، عالم اسلام کو ان کی گمراہی کا شکار ہونے اور ان کے سحر سے آزاد کرنے کی مقد
کوشش کی، آنے والے دور نے یہ ثابت کیا کہ ہمارے اندیشے غلط نہیں تھے، عالم عرب
عالم اسلام کو اس شخص سے عظیم نقصان پہنچا، ایک رسواکن شکست ہوئی، بیت المقدس مسلم
کے ہاتھ سے جاتا رہا اور آج تک عالم عربی اس کے بوئے ہوئے کانٹوں سے لہولہان ہے۔
عبدالناصر پہ ہماری تنقید، ان کی نا عاقبت اندیشانہ اور اسلام مخالف سرگرمیوں پر ہماری گرفت
بہت بڑے حلقے کو گراں گذرتی تھی لیکن ہم اپنی دینی ذمہ داری سمجھتے ہوئے یہ فریضہ انجا
دیتے رہے۔ ہمیں اسلام عزیز ہے، اخلاقی قدریں عزیز ہیں، انسانیت کی فلاح و بہبود ع
ہے۔ ہم شخصیتوں کو اسی عینک سے دیکھتے رہے۔

بھٹو صاحب سے ہمیں کوئی ذاتی پرخاش نہیں، ہمیں ان کی خوبیوں اور خامیوں سے
صرف اس وجہ سے دلچسپی ہے کہ وہ ایک عظیم مسلم ملک کے سربراہ تھے، ان کی اسلام مخالف
یا اسلام موافق سرگرمیوں کا اثر عالم اسلام پر پڑ سکتا تھا، اسی نقطۂ نظر سے آج ہم انکی شخصیت
کا جائزہ پیش کر رہے ہیں۔ یہ جائزہ سنی سنائی باتوں یا مغربی خبررساں ایجنسیوں کی رطب
و یابس خبروں پر مبنی نہیں بلکہ براہ راست مطالعہ، سال گذشتہ پاکستان کے سفر اور وہاں
کے قریبی مشاہدے نیز عالم اسلام کے غیر جانب دار اہل قلم کی نگارشات سے استفادہ پر
مبنی ہے۔

۹. ذوالفقار علی بھٹو، سیاست کے میدان اور اجتماعی زندگی میں پاکستان کے سابق صدر اسکندر مرزا کی دریافت ہیں۔ وہی اسکندر مرزا جس نے پاکستان کو بازیچۂ اطفال بنا رکھا تھا، جو پاکستانی عوام پر سازشوں کے ذریعہ ایک عذاب بن کر مسلط رہا۔ جس نے اپنے دور میں کبھی کوئی مستحکم حکومت قائم ہونے نہیں دی، جس کے دور میں صبح شام وزارتیں بدلتی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ فوج کو مداخلت کرنی پڑی۔ اور پاکستان میں سب سے پہلا مارشل لا نافذ ہوا۔ مرحوم ایوب خاں نے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھالا، نئی کابینہ بنی، اسکندر مرزا نے بھٹو صاحب کو وزارت کے لیے پیش کیا۔ اس دور میں بھی جب بحیثیت صدر اسکندر مرزا نے سازشوں کا چکر چلایا تو مرحوم ایوب خاں نے انھیں معزول کر کے جلاوطن کر دیا اور لندن میں اس حال میں وہ مرے کہ کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ بھٹو صاحب ایوب خان کو ڈیڈی کہہ کر اپنی پوزیشن مضبوط کرتے گئے۔ اس دور میں انھوں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کس طرح پاکستان کو تباہ کرنے اور مشرقی پاکستان میں بے اعتمادی پیدا کرنے کی سازش کی۔ معاہدۂ تاشقند میں کیا کردار ادا کیا، ایوب خاں کی مستحکم حکومت کو انھوں نے کن سازشوں سے متزلزل کیا۔ اس کی تفصیلات کا یہاں موقع نہیں، اس شمارے کے دیگر مضامین میں ان باتوں پر روشنی پڑےگی یہاں ہم صرف ان کے دورِ اقتدار کے کارناموں کے جائزے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۰۔ **ذہانت** : بھٹو صاحب کے قصیدہ خواں ان کی ذہانت کا بڑا ذکر کرتے ہیں بیشک وہ ایک ذہین انسان تھے۔ لیکن تنہا ذہانت کوئی ایسی صفت نہیں کہ اس کے صحیح یا غلط استعمال سے صرفِ نظر کرلی جائے۔ ذہانت دودھاری تلوار ہے اگر یہ تعمیر پہ صرف ہو تو مفید اور تخریب کے رُخ پر چلے تو اس سے بڑھ کر مہلک کوئی اور چیز نہیں۔ بھٹو صاحب کی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو ان کی ذہانت ہمیشہ تخریب کی طرف مائل نظر آئے گی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد جب انھوں نے یہ دیکھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی پارٹی

اکثریت میں آگئی ہے تو انھوں نے ایسے حالات پیدا کردیے کہ پُرامن انتقال اختیارات کا مرحلہ نہ ہوسکا۔ اور ملک دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ مشرقی پاکستان میں مارشل لا کا نفاذ، ہندستان سے جنگ اور اس میں رسوا کن شکست کی سازش میں بھٹو صاحب نے کلیدی کردار ادا کیا، عین اس وقت جب مشرقی پاکستان کا سقوط ہونے والا تھا۔ بھٹو صاحب بحیثیت وزیر خارجہ سلامتی کونسل میں بحث کے لیے گئے ہوئے تھے انھوں نے جان بوجھ کر تین چار دن بیماری کے بہانے میٹنگ میں شرکت نہیں کی اور پانچویں روز جب پہونچے تو پولینڈ کی جنگ بندی کی قرارداد کو پھاڑ کر واپس چلے آئے۔ یہاں ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اوریہ قائدِ عوام اس کا منتظر تھا کہ مشرقی پاکستان کی پوری جان نکل جائے تاکہ وہ مغربی پاکستان پر بلاشرکت غیرے اقتدار پر قابض ہو جائے۔ ان کی سازش کامیاب ہوئی لیکن اس کا خمیازہ لاکھوں مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔

بھٹو صاحب کی پھانسی کی سزا سن کر غم و غصہ سے بے قابو ہونے والے بہاری بھائیوں کو شاید یہ خیال نہیں رہا کہ سابق مشرقی پاکستان اور حالیہ بنگلہ دیش میں بہاری مسلمانوں پر جو کوہِ غم ٹوٹا تھا جس میں دو لاکھ بہاری مسلمان بے دردی سے شہید کیے گئے تھے اس خونی ڈرامے کے اصل اداکار بھٹو صاحب تھے۔ پھر مظلوم بہاری مسلمان کیمپوں میں پناہ دینے کے لیے آخر وقت تک جو انکار کرتا رہا وہی آج شہیدِ اعظم اور قائدِ عوام بنا ہوا ہے اور اس کی محبت میں اپنے ہی ہم وطن دیندار بھائیوں پر زندگی دشوار کی جا رہی ہے۔ ع

"نا طقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے"

۱۱۔ مسلم سربراہ کانفرنس: حقائق سے نابلد اور ضمیر فروش اخبارات کے اس بدپروپیگنڈہ

سے عوام وخواص کی اکثریت متاثر ہے کہ بھٹو صاحب نے مسلم ممالک کے اتحاد کی زبردست کوشش کی اور اپنے دور میں مسلم ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس لاہور میں منعقد کرائی۔ سربراہ کانفرنس کی اصل حقیقت یہ تھی کہ مرحوم شاہ فیصلؒ شہید کو پاکستان سے بڑا تعلق تھا اور وہ اسے عالمِ اسلام کا قلعہ سمجھتے تھے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد انھیں ذاتی طور پر بے حد صدمہ پہنچا تھا۔ انھیں یہ خیال ہوا کہ پاکستان کے عوام کی مایوسی دور کرنے نیز پوری دنیا پر یہ تاثر قائم کرنے کے لئے کہ پاکستان تنہا نہیں مسلم ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس اگر پاکستان میں کی جائے تو یہ مقصد حاصل ہوگا۔ اپنی تجویز کے ساتھ شاہ فیصلؒ نے سربراہ کانفرنس کا پورا خرچ برداشت کیا جو کروڑوں سے متجاوز تھا۔

اس کانفرنس سے جس کے اصل محرک اور میزبان شاہ فیصل تھے بھٹو صاحب اور ان کے ساتھیوں نے دو فائدے حاصل کئے۔ اول یہ کہ لاکھوں روپیہ کانفرنس کے مصارف کے نام سے وصول کر کے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کیا۔ بھٹو صاحب کے ایک ساتھی مصطفٰے کھر نے ڈیڑھ کروڑ روپیہ ممتاز بھٹو نے ایک کروڑ روپیہ اس کانفرنس میں غبن کیا، خود بھٹو صاحب جنھوں نے متحدہ عرب امارات کے شیخ زید کے ان روپیوں کا جو ایک اسپتال . . . . کی تعمیر کے لئے دیا گیا تھا « نصرت ٹرسٹ » قائم کیا۔ اس موقع پر کیا کمی کی ہوگی۔

دوسرا فائدہ اس کانفرنس سے بھٹو صاحب نے یہ اٹھایا کہ مشرقی پاکستان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ یعنی بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا۔ اگر بنگلہ دیش کو اس وقت تسلیم نہیں کیا جاتا تو شیخ مجیب کے قتل کے بعد کم از کم فیڈریشن کی شکل تو بنتی

لیکن بھٹو صاحب ہر قیمت پر اور معصوم انسانوں کی لاشوں پر اقتدار کے بلاشرکت غیرے مالک بننا چاہتے تھے۔ یہ تھی حقیقت بھٹو صاحب کے عالم اسلام کو متحد کرنے کی اور پھر جب ان کا اقتدار مستحکم ہو گیا تو انھوں نے عالم اسلام کا نام تک لینا چھوڑ دیا تھا، صرف "تیسری دنیا" کی اصطلاح استعمال کرتے رہے۔

۱۲۔ **جنگی قیدیوں کی رہائی:** بھٹو صاحب کا یہ کارنامہ زبان زدِ عوام ہے کہ انھوں نے ایک لاکھ جنگی قیدیوں کو چھڑایا، اسے صحافت کی ناواقفیت پر محمول کیا جائے یا بددیانتی پر کہ جنگی قیدیوں کے سلسلے میں جینوا قرارداد کی رو سے یہ مسلمہ اصول ہے کہ جنگ ختم ہوتے ہی ان کا تبادلہ ہونا چاہیے۔ اسی اصول کے تحت عرب اسرائیل جنگ کے قیدی ۲۲ دن میں رہا ہوئے دوسری جنگ عظیم ختم ہوتے ہی قیدیوں کا تبادلہ شروع ہوا۔ حال ہی میں چین اور ویتنام کی جنگ کے بعد قیدیوں کا تبادلہ شروع ہو رہا ہے اور پاکستان کے جنگی قیدی ۲۲ دن کے بجائے تین سال میں بعد از خرابی بسیار رہا ہوئے، اس طویل قید نے ان کے اعصاب کو متاثر کیا، کئی اسیروں کا دماغی توازن جاتا رہا۔ اکثریت کام کے لائق نہ رہی اور اس کو ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔ ہندوستان میں پاکستانی جنگی قیدیوں کی طویل حراست بھٹو صاحب کے ایما پر تھی، وہ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ جنگی قیدی آکر ان سربستہ رازوں کا انکشاف کریں جس سے ان کا آسن ڈانوان ڈول ہو جائے۔ یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ بھٹو صاحب نے قیدی رہا نہیں کئے بلکہ ان کی رہائی میں تاخیر کی کوشش کرتے رہے۔ یہ بات خلافِ حقیقت ہے کہ وہ جنگی قیدی جنھیں بہرحال رہا ہونا تھا۔ حکومت ہند کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے رہا نہیں ہو رہے تھے۔ حکومت ہند کی ایک لاکھ جوانوں کی تین سال تک پذیرائی میں کون سی منفعت تھی؟ اگر بھٹو صاحب قیدیوں کی فوری رہائی میں مخلص تھے تو ان کے پاس ایک ترپ کا پتہ تھا، وہ تھے شیخ مجیب الرحمٰن، اگر بھٹو شیخ مجیب

کی رہائی کے ساتھ مشروط کر دیتے تو پہلے ہی ہفتہ ان غریبوں کی رہائی ہو جاتی۔

۱۳۔ **اقتصادی حالت** : بھٹو صاحب کا یہ کارنامہ بھی گنایا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے دورِ اقتدار میں پاکستان کو اقتصادی لحاظ سے بہت مستحکم کیا۔ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو اقتصادیات کی ابجد تک سے ناواقف ہو۔ بھٹو صاحب کے دورِ اقتدار میں پاکستان اقتصادی بدحالی کی انتہا کو پہونچ چکا تھا۔ اس کا سبب غلط منصوبہ بندی اور صنعتوں کو قومیا کر اس سے اپنے خویش واقارب اور پیپلز پارٹی کے لوگوں کے لئے لوٹ کھسوٹ کی راہ ہموار کرنا تھا ریزرو بینک میں سونا موجود نہیں تھا اور کثرت سے کاغذی نوٹ چھپتے رہے جس کے نتیجہ میں افراطِ زر عام ہو گیا تھا۔ لائل پور (موجودہ فیصل آباد) پاکستان کا مانچسٹر کہلاتا تھا۔ یہاں کے کپڑے کی صنعت کا مارکیٹ پورا مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید تھا۔ اس صنعت کو قومیا کر اصل مالکوں اور تجربہ کار لوگوں کو الگ کر کے پیپلز پارٹی کے ناتجربہ لوگوں کو ڈائرکٹر بنا کر اس صنعت کو تباہ کر دیا گیا۔ پاکستان کو زرِ مبادلہ دینے والی یہ صنعت خسارہ میں چلنے لگی اور کئی ملیں بند ہو گئیں۔ اب موجودہ حکومت نے ان بند ملوں کو جاری کیا۔ آٹا مل، چینی مل، کپڑا مل سب نیشنلائز کئے گئے۔ مقصد صنعتی ترقی نہیں تھا۔ بلکہ اپنی پارٹی کے کارکنوں کو روزگار مہیا کرنا اور لکھ پتی بنانا تھا، غیر ملکی زرِ مبادلہ کا ایک دوسرا ذریعہ وہ پاکستانی ملازمین تھے جو عرب ملکوں میں کام کرتے ہیں۔ یہاں بھی بھٹو صاحب نے اہلیت اور صلاحیت کے بجائے اپنے علاقہ اور پارٹی کے لوگوں کو ترجیح کی پالیسی اختیار کی، ناکارہ لوگ بھیجے جاتے، ملک کی بدنامی ہوتی اور متعلقہ حکومتیں انھیں واپس کر دیتیں۔

راقم سطور نے ۱۹۸۰ء میں سعودی عربیہ، کویت، متحدہ عرب امارات کے سفر کے دوران عربوں سے پاکستانیوں کی عام شکایت سنی کہ یہ اہلیت اور محنت دونوں سے عاری ہے۔

۱۴۔ **قادیانی مسئلہ** : بھٹو صاحب کے دورِ حکومت میں قادیانیوں کو غیر مسلم

اقلیت قرار دینے کے پروپیگنڈہ سے دیندار طبقہ بھی متاثر ہے اور اسے ان کے "حسنات" میں نمایاں درجہ دیا جا رہا ہے۔ ہماری صحافت کی ایک پڑوسی ملک کے حالات سے اس درجہ بے خبری سے عوام پر اس کا اعتماد کب تک قائم رہ سکتا ہے؟

قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تاریخ یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سے اس فرقہ نے جس تیز رفتاری سے حکومت میں اثر و نفوذ قائم کیا تھا کلیدی محکموں پر قبضہ کر کے اپنی تبلیغی سرگرمیاں شروع کی تھیں۔ اندرون ملک "ربوہ" نامی ایک متوازن حکومت قائم کی تھی اس سے ملت کے سواد اعظم میں بڑی بے چینی پائی جاتی تھی۔ اندر ہی اندر یہ سلگتا ہوا آتش فشاں ۱۹۵۳ء میں پھٹ پڑا۔ قادیانیوں کے خلاف ملک گیر پیمانے پر ایجی ٹیشن شروع ہوا، جسے مارشل لا کے زور پر دبا دیا گیا۔ اس میں مولانا مودودی اور مولانا عبدالستار نیازی کو فوجی عدالت نے پھانسی کی سزا سنائی۔ قادیانی مسئلہ وقتی طور پر دب تو گیا لیکن قادیانیوں سے معاشرے میں عام نفرت کی فضا بنی رہی۔ بھٹو صاحب کے دور میں اس مسئلہ نے پھر آگ کی طرح پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا

> ہندوستان کے مسلمان تقسیم ہند کے الزام کی سزا آج تک بھگت رہے ہیں۔ جمشید پور کا حالیہ فساد اسی ابتلاء اور آزمائش کی ایک کڑی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت نے تقسیم ہند کی تائید بھی کی تو صرف اس جذبہ سے کہ وہاں اسلامی شریعت کا نفاذ ہوگا اور دنیا کے نقشہ پر ایک مثالی اسلامی فلاحی ریاست قائم ہوگی۔ یہ خواب تیس سال بعد جس مخلص کے ہاتھوں شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے، اسی جنرل ضیاء الحق کو گالیاں دی جا رہی ہیں۔ ع
>
> برایں عقل و دانش بباید گریست

اس موقع پر بھی کمی اشتعال انگیزی قادیانیوں نے کی، پنجاب یونیورسٹی کے طلبہ کا ایک گروپ پک نک کے لئے کہیں سفر کر رہا تھا، جب قادیانیوں کے مرکز ربوہ کے اسٹیشن پر ان کی ٹرین پہونچی تو ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا، چند شہید ہوئے، کئی مجروح ہوئے، اس واقعہ نے خیبر سے کراچی تک عوام کو غم و غصہ سے بھر دیا ملک کی تمام سیاسی، سماجی اور دینی جماعتوں نے مولانا یوسف صاحب بنوری رح کی صدارت میں مجلس تحفظ ختم نبوت قائم کی اور پورے ملک میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی زوردار مہم شروع کردی، اس تحریک کے پیچھے یہ بات چونکہ بھٹو حکومت اور پیپلز پارٹی بھی آچکی تھی۔ لہٰذا مجبور ہو کر بھٹو صاحب نے اس مسئلہ پر اسمبلی میں بحث کی منظوری دی، ممبران کی اکثریت نے جب قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تجویز منظور کی تو بھٹو صاحب کو اسے تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا۔ انھوں نے اس تجویز کے اصل نکات یعنی قادیانی کی کلیدی عہدوں سے معزولی، ان کی تعداد کی بنیاد پر ملازمتیں، انھیں اسلام کے نام پر تبلیغ سے ممانعت اور ربوہ شہر کو غیر قادیانیوں کے لیے بھی کھولنے کے مطالبات پر آخر تک عمل نہ ہونے دیا۔ بلکہ در پردہ وہ قادیانیوں کی بھرپور ہمت افزائی کرتے رہے اور انھیں موثر رکھنے کے لیے ہر ممکن سہولت مہیا کرتے رہے۔

جو قوم مخالف نقطۂ نظر کو سننے اور اس پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کی عادی نہ ہو وہ قومی زندگی میں ہمیشہ گھاٹے کا سودا کرتی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کو اس کے تلخ تجربات بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن افسوس کہ وہ ان سے سبق نہیں سیکھتے۔

۱۵۔ جمہوریت اور اسلامی دستور: بھٹو صاحب کو جمہوریت کے احیاء کا علمبردار اور اسلامی دستور کے خالق کی حیثیت سے بہت سراہا جا رہا ہے، یہ ایسا مغالطہ اور بے بنیاد

دعویٰ ہے کہ جس کی تردید ان کے سات سالہ دورِ اقتدار کا ایک ایک لمحہ کرتا ہے۔

بھٹو صاحب جن انتخابات کے نتیجہ میں عوام کی اکثریت کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے وہ انتخابات ۱۹۷۰ء میں ہوئے تھے جب پاکستان کے دو ٹکڑے نہیں ہوئے تھے۔ قومی اسمبلی کی تین سو نشستوں میں سے ان کی پارٹی کو کل ۸۵ نشستیں مغربی پاکستان ملی تھیں مشرقی پاکستان میں انھوں نے کوئی نمائندہ کھڑا نہیں کیا تھا۔

مغربی پاکستان میں واحد اکثریتی پارٹی کی حیثیت اگرچہ پیپلز پارٹی کو حاصل ہوا اسے صرف ۳۲ فی صد ووٹ ملے۔ گویا بھٹو صاحب کی مخالفت میں ۶ رائے دہندگان نے ووٹ دیے چونکہ یہ مخالف ووٹ پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ لہٰذا اس بھٹو صاحب کو پہنچا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد پاکستان اب ایک مستقل ملک تھا۔ لہٰذا اسے میں انتخابات کرانا عین جمہوری تقاضا تھا۔ لیکن بھٹو صاحب جیسے جمہوریت نواز اس نہیں ہوئے اور سیاسی تاریخ میں پہلے غیر فوجی مارشل لا اور ایڈمنسٹریٹر اور کی حیثیت سے وہ اقتدار پر قابض ہو گئے۔ ایوب خاں کے زمانہ کا دستور کالعدم قرا جا چکا تھا اب جب نئے دستور کو بنانے کا سوال پیدا ہوا تو انھیں بڑی پیچیدگی کا سامنا پڑا۔ انھوں نے اپنے انتخابی منشور میں "اسلام ہمارا مذہب اور سوشلزم ہماری منزل کیا تھا۔ روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگایا تھا۔ دستور سازی میں سوشلزم ملک کے کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا، پاکستان کا قیام اسلام کے نام پر عمل میں آیا تھا اور کے لئے مسلمانوں نے بے شمار قربانیاں دی تھیں۔ بھٹو صاحب دستور کو بدلنے

> سچی بات کو جھوٹ کے پردوں میں نہ چھپاؤ اور اگر تمہیں سچائی کا علم ہو تو اس کو جان بوجھ کر اپنے تک نہ روکے رکھو۔ (قرآن حکیم)

مملکت کا نام جمہوریۂ اسلامیہ قرار دینے پر مجبور تو ہوئے لیکن ساڑھے پانچ سال کی طویل مدت میں انھوں نے اسلام کی طرف اور معاشرے اور ملک کو لے جانے میں ایک انچ بھی پیش رفت نہیں کی۔ جسٹس حمود الرحمٰن کی صدارت میں اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی اور اس کی سفارشات کو سرد خانہ میں ڈال دیا، اور پورے منصوبے سے ملک اور معاشرے کا تعلق اسلام سے کمزور کرنے کے پروگرام پر عمل پیرا رہے۔ ریڈیو، ٹی۔وی، صحافت اور کمیونسٹ اہل قلم کے ذریعہ انھوں نے اسلامی اور اخلاقی قدروں کو پامال کیا۔ فسق و فحاشی کو سرکاری سرپرستی میں عام کیا۔ کراچی میں ایشیا کا سب سے بڑا جوا خانہ اور قحبہ خانہ زیر تعمیر تھا، بھٹو صاحب نے اعلان کیا تھا کہ بیروت کے اجڑنے کے بعد ہم کراچی کو بیروت بنانا چاہتے ہیں تاکہ بیرونی سیاح ہمارے زرمبادلہ میں اضافہ کریں۔ اسلامی دستور اور نظام شریعت کی راہ پر یہ معکوس گامزنی اور خود سربراہ مملکت کا یہ عالم کہ عام جلسے میں اس کا اعلان کہ "بہت تھک جاتا ہوں تو تھوڑی سی پی لیتا ہوں"! دینا سے ان کی واقفیت کا یہ عالم تھا کہ مخالف پارٹیوں کے رہناؤں نے جلسۂ عام میں انھیں بار بار یہ چیلنج کیا کہ جمہوریۂ اسلامیہ کے یہ سربراہ صرف نماز کا سبق سنا دیں تو ہم مخالفت سے دستبردار ہو جائیں گے۔

اسلام اور اسلامی قدروں سے بھٹو صاحب کے بغض و عناد کا سلسلہ پھانسی کے پھندے تک جاری رہا، ان کے ایک ساتھی عبدالحفیظ پیرزادہ نے ان سے ملاقات کرنے کے بعد یہ بیان دیا کہ وہ جیل میں نماز پڑھ رہے ہیں تو بھٹو صاحب کو بہت ناگوار گذرا، انھوں نے جیل سپرنٹنڈنٹ محمد یار خاں کو بلا کر یہ ہدایت کی کہ "اس کی تردید کی جائے کہ میں جیل میں نماز پڑھ رہا ہوں، لوگ اس سے یہ اثر لیں گے کہ میرے اعصاب متاثر ہو گئے ہیں، جب مجھے پھانسی کے چند گھنٹے پہلے انھوں نے شیو کا سامان مانگا تو ان سے کہا گیا کہ تھوڑی دیر

بعد آپ کو پھانسی دی جائے گی اب شیو بنا کر کیا کیجئے گا؟" تو انھوں نے برہمی سے جواب دیا کہ "میں مولوی کی موت مرنا نہیں چاہتا مجھے داڑھی کا شیو کرنے دیا جائے۔"

اس اخباری پروپیگنڈہ اور بی۔ بی۔ سی کی اڑائی ہوئی گپ کی کوئی حقیقت نہیں کہ بھٹو نے آخری وقت یہ جملہ کہا تھا کہ "خدا میری مدد فرما میں بے گناہ ہوں" جیل میں موجود لوگوں نے اس کی تردید کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے اظہار بندگی اور اس کی عبادت سے جس شخص کی انا کو ٹھیس پہونچتی ہو اور جو داڑھی کو سنت رسولﷺ کی بجائے مولوی کا شعار کہہ کر نفرت کرتا ہو وہ اسلامی دستور کے نفاذ میں کہاں تک مخلص ہو سکتا ہے؟ رہا جمہوریت کے قیام کا مسئلہ تو بھٹو صاحب کے سات سالہ دور حکومت میں پورا ملک جیل خانہ بن چکا تھا۔ مستقل دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ سے حزب مخالف کو کوئی جلسہ نہیں کرنے دیا جاتا تھا۔ اپنے سیاسی مخالفین اور ان کے اعزہ کا اغوا اور قتل شب و روز کا تماشہ تھا، غنڈوں کو کھلی چھوٹ تھی اور شرفاء کا ناطقہ بند تھا۔

ملت کی دولت اور بیرونی امداد کا بڑا حصہ اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے اور اپنے خود ساختہ اور درآمد کردہ نظریات کے پرچار پر صرف کیا جاتا تھا۔ ریڈیو اور ٹی وی صرف ایک شخصیت اور اس کی پارٹی کے غلام بن کر رہ گئے تھے، مخالف اخبارات پر مستقل پابندی تھی اور حزب اختلاف کو ایسا کچل دیا گیا تھا کہ کوئی سر نہ اٹھا سکے

ان تمام انتظامات کے بعد مارچ ۱۹۷۷ء میں انتخابات کا جب اعلان ہوا تو مخالف جماعتیں باہمی اختلافات کو بھلا کر متحد ہو گئیں، بھٹو صاحب کو اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا سی۔ آئی۔ ڈی رپورٹ نے بھی بھٹو صاحب کے گمان کی تائید کر دی تھی۔ کچلے ہوئے اور پسے ہوئے لوگوں نے پاکستان قومی اتحاد کو ہاتھوں ہاتھ لیا اس کی مقبولیت سے بوکھلا کر الیکشن میں انتظامیہ کی ملی بھگت

ے وہ دھاندلیاں کی گئیں کہ پورا پاکستان چیخ اٹھا اور خیبر سے کراچی تک مخالفت کا ایسا طوفان اٹھا جسے بھٹو صاحب فوج اور مارشل لاء کے ذریعہ بھی دبانے میں ناکام رہے، اس طوفان مخالفت کے باوجود بھٹو صاحب کی "جمہوریت نوازی" نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ حزب اختلاف سے مصالحت اور عوام کے جذبات کی رعایت کی مخلصانہ کوشش کریں۔ عوامی نمائندگی اور جمہوریت کے دعویدار کو تو ایسے حالات میں جب پورے ملک میں ان کے خلاف عوام سر سے کفن باندھ کر میدان میں آگئے تھے حکومت سے دستبردار ہو جانا چاہیے تھا، اس کے برعکس انھوں نے پیپلز پارٹی کو ناجائز اسلحہ فراہم کئے غنڈوں کو منظم کیا۔ تاکہ پورے ملک میں خانہ جنگی برپا ہو جائے۔ اس کا بھی ثبوت ملا ہے کہ انھوں نے اپنی کرسی بچانے کے لئے بعض پڑوسی ملکوں کو سرحد پر اپنی فوجیں بھیجنے کی درخواست کی تھی۔ یہ وہ حالات تھے جن میں فوج نے ۵ رجولائی ۱۹۷۷ء کو مداخلت کرکے بھٹو صاحب کو اقتدار سے بے دخل کر دیا۔

بھٹو صاحب کی پھانسی کو بہانہ بنا کر خود مسلمانوں کے ذریعہ اسلام اور دینی ذہن کے خلاف جو مہم چلائی گئی اس کی مثال برصغیر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ بعض اخبارات نے ایسی فضا بنائی کہ نمازی اور دیندار مسلمان تک اپنی ناواقفیت اور بے شعوری کی وجہ سے اس سیلاب میں بہہ گئے۔ اس موضوع پر قلم اٹھا کر ہم ایک ناخوش گوار فریضہ انجام دے رہے ہیں لیکن اس مجبوری کو ہم دینی اور اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔

کسی ایک جماعت یا ایک طبقہ کے سر سہرا نہیں

پاکستان میں نظام مصطفےٰ کے قیام اور بھٹو کی آمریت کے خلاف جو مہم چلی تھی اس میں اس ملک کے تمام طبقے اور مکاتب خیال کے عام و خواص شامل تھے۔ کالج، یونیورسٹیوں کے طلبہ اور اساتذہ، ادیب اور دانشور، خواتین، دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث مکتب فکر

خیال کے علماء اور عوام، جماعت اسلامی، تحریک استقلال، جمہوری پارٹی، یہ ایسی اہم تھی ؟
مولانا مفتی محمود جیسے دیو بندی اور مولانا شاہ احمد نورانی جیسے بریلوی سے لے کر حنیف
جیسے ترقی پسند تک شامل تھے، ایسی صورت میں اپنے غم و غصہ کا نشانہ صرف جماعت
یا مولویوں کو بنانا کہاں تک قرین عقل و انصاف ہے ؟

بھٹو صاحب کے مقدمہ کے سلسلہ میں جنرل ضیاء سے لے کر پاکستان کے تمام
قطعاً ملوث نہیں ہیں۔ یہ ... خالص عدلیہ کا معاملہ تھا۔ کھلی عدالت میں ان کے مقدمہ
سماعت ہوئی جو انہی ... کے دورِ اقتدار میں احمد رضا قصوری نے
ہائی کورٹ میں ... دائر کیا تھا، اس مقدمہ میں
دراز تک چلتا رہا۔ ... قانون کے تمام تقا
پورے کئے گئے۔ دنیا کے ماہر ... قانون دا
اکثریت نے اس سماعت کو سراہا، یہ تو ... ایک غیر س
فوجداری مقدمہ تھا، اگر بھٹو صاحب رہا بھی ہو جاتے ... تو ان پر مزید اس
بھی بھیانک اٹھارہ الزامات تھے۔ پاکستان کا عدلیہ جو اپنی غیر جانبداری میں معروف
اس کے فیصلہ کے خلاف ہنگامہ آرائی کرنے والوں کو پاکستان کے ایک ماہر قانون اے
بروہی نے حقیقت پر مبنی جواب دیا ہے کہ "افغانستان میں صرف ایک شب
صدر داؤد اور ان کے ۴۵ افراد خاندان اور دس ہزار انسانوں کو موت کے گھاٹ
اتار دیا گیا۔ ایران میں سرسری سماعت کی عدالتوں میں روزانہ موت کی سزائیں
دی جا رہی ہیں، ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ ہم نے قانون کے تمام تقاضے پورے
کئے اور عرصۂ دراز تک مجرموں کو صفائی کا موقع دیا۔"

۱۷۔ ایک مغالطہ :۔ ہندوستانی اخبارات نے عوام میں یہ غلط فہمی بھی پھیلا رکھی

کہ بھٹو صاحب کے مقدمہ کا فیصلہ شرعی قوانین کے تحت نہیں ہوا۔ بعض فتاویٰ شائع کیے جا رہے ہیں کہ وعدہ معاف گواہ کی شریعت اسلامی میں کوئی حیثیت نہیں، مدیران جرائد اور مفتیانِ کرام سے عرض ہے کہ پاکستان میں وہاں کے حکمران طبقہ نے جس میں بھٹو صاحب بھی شامل ہیں شریعت اسلامی کا عملاً نفاذ کب کیا تھا؟ عدالتیں سول اور فوجداری قوانین میں انہی تعزیرات کی پابند تھیں جو انگریزوں کا ورثہ اور وہاں کی عدالتوں میں رائج رہیں۔ مروجہ قوانین سے ہٹ کر کسی ملک کی عدلیہ دوسرے قانون پر کس طرح عمل کر سکتی تھی؟ اب اسلامی شریعت کے نفاذ کا اعلان ہوا ہے۔ ہنوز دیوانی اور فوجداری قوانین کو اسلامی شریعت کے سانچے میں ڈھلنا ہے، اس کام کا باقاعدہ آغاز جولائی ۱۹۷۹ء سے ہوگا۔ ایسی بدیہی حقیقت سے جان بوجھ کر صرف نظر کرنے والے عوام کو گمراہ کر رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے اس مسئلہ میں ایک سازش کے تحت کجی کی راہ بنائی جا رہی ہے اور ہٹلر کی اس پالیسی کو اختیار کیا جا رہا ہے کہ جھوٹ اس کثرت سے بولو کہ سننے والے کو سچ کا یقین ہونے لگے۔

۱۰۔ **حرفِ آخر:** ۔ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ، ایران میں اسلامی انقلاب اور عالم اسلام پر اس کے دوررس نتائج سے بوکھلا کر روس، امریکہ، اسرائیل اور تمام اسلام مخالف طاقتیں دنیا کے مختلف ممالک میں اسلام مخالف لابی تیار کر رہی ہیں۔ ان کی سازشوں کا شکار مسلمان بھی ہو رہے ہیں۔ عالم اسلام کے مخلص ترین بزرگ اس بات کی ہدایت کرتے ہیں کہ جو لوگ خلوص سے اسلام کو غالب کرنے میں کوشاں ہیں ان میں سرفہرست جنرل ضیاء الحق صاحب کا نام لیا جاتا ہے، ان کی کامیابی اور حفاظت کے لئے دعاؤں کا اہتمام کیا جائے، لیکن بدتوفیقی دیکھیے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ ان پر سب و شتم، بہتان اور جھوٹے الزامات کی بوچھاڑ کر رہا ہے۔

کوئی شخصیت چاہے وہ کتنی ہی معروف و مشہور ہو خدا تعالیٰ کی مقدس کتاب سے بڑھ کر محترم نہیں ہو سکتی، بھٹو صاحب کی محبت و عقیدت کے اندھے مظاہروں میں قرآن مجید کی بے حرمتی

مسجدوں اور دینی کتابوں کو نذر آتش کرنے کے واقعات خود مسلمانوں کے ہاتھوں اس کثرت سے ہوئے ہیں کہ اس کا وبال خدانخواستہ پوری ملت پر نہ پڑے۔ بے گناہوں کا قتل مال و املاک کی بربادی، دین کی بے حرمتی اور خواتین کی آبروریزی ایک ایسے مسئلہ میں جس کا دور دور تک ہماری قومی زندگی سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں تھا۔ ہماری بے دانشی، بے شعوری اور غلط جذباتیت کے وہ الم ناک مظاہر ہیں جن کی اصلاح کی تدبیر ہر اس شخص پر فرض ہے جس کے دل میں ذرہ بھر ایمان کی رمق اور انسانیت کا درد ہے۔

خدا کرے کہ ہماری یہ آواز صدا بصحرا نہ ثابت ہو اور ہر طبقہ اور ہر مکتب خیال کے خواص اور عوام اس پر سنجیدگی سے غور کر کے کوئی لائحہ عمل اور ضابطۂ اخلاق بنائیں۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

عورتوں کو مارنے پر بددعا

ایک بار ولید بن عقبہ کی عورت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کرنے آئیں کہ مجھے ولید بہت مارتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ولید سے جا کر بتا دینا کہ حضورؐ نے مجھ کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر آئی اور کہنے لگی کہ ولید نے اب تو مجھے اور مارا ہے۔ یہ سنکر حضورؐ نے کپڑے کا ایک ٹکڑا کاٹ کر بطور نشانی عطا فرمایا۔ عورت نے لے جا کر دکھلایا تو اس نے عورت کو اور بھی مارا۔ پھر وہ شکایت لے کر حاضر ہوئیں۔ آپؐ نے ولید پر بددعا فرمائی۔ (منتخب کنز العمال جلد پنجم صفحہ ۲۰۲)

کس نے لگائی؟ کشمیر میں آگ

محمود احمد کشمیری
مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

صاحب مضمون نے جو ایس۔ آئی۔ ایم کے ممبر ہیں اپنے وطن کا دورہ کیا اور اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں۔ خود موصوف کے مکان کو بھی فسادیوں نے لوٹا اور آگ لگادی۔ موصوف اس وقت مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔ انہی کی رپورٹ سے صرف وہ اقتباس یہاں دیا جارہا ہے جس کا عنوان "محرکات" ہے۔ (ایڈیٹر)

محرکات پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد وادی کشمیر میں جو تشدد آمیز مظاہرے ہوئے اور جن کا ہدف وہاں کی ایک مشہور و معروف تنظیم جماعت اسلامی جموں و کشمیر بنی اور جس کے نتیجے میں کروڑوں روپیہ کا نقصان ہوا۔ اس کے متعلق جہاں تک میں نے حقیقت سمجھنے کی کوشش کی ہے اس کے مطابق اسلامی طبقہ مندرجہ ذیل تین وجوہات کی بناء پر تشدد کا شکار رہا۔

(۱) جماعت اسلامی جموں و کشمیر گذشتہ ربع صدی سے ریاست کی حدود کے اندر اپنے محدود وسائل کو بروئے کار لاکر اقامت دین کے عظیم نصب العین کو عام کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ اور اس جدوجہد کے نمایاں اثرات کشمیر کے پڑھے لکھے اور نوجوان طبقہ پر مرتب ہوئے ہیں جن سے کوئی بھی غیر متعصب مورخ انکار نہیں کرسکتا۔ نوجوان نسل کا جماعت کے مقصد اور طریق کار کو قبول کرنا اور اس کے مطابق اپنی عملی زندگی کی تعمیر کرنا ہی وہ واحد

نے جو یہاں کے ادیبی اور سوشلسٹ اور سیکولرسٹ طبقے کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے یہ طبقہ ہمیشہ جماعت کا دشمن رہا ہے۔ اور جماعت اسلامی کی بڑھتی ہوئی قوت کو توڑنے کے درپے رہا ہے کیونکہ جماعت اسلامی ہی وہ جماعت ہے جس نے ان اسلام دشمن عناصر کا مقابلہ کیا ہے اور اس طویل عرصے کی کش مکش میں انھیں بڑی حد تک ناکام بنایا ہے اور اسلام کے علَم کو نہ صرف بلند رکھنے کی کوشش کی بلکہ نوجوانوں اور عوام و خواص کو اسلام کا شیدائی بنانے کی بھرپور جدوجہد کی ہے۔ جب بھٹو صاحب کی سزائے موت سپریم کورٹ نے بھی بحال رکھی، اور جنرل ضیاء الحق کی جانب سے معافی کی کوئی امید بھی نظر نہ آئی تو انھوں نے پروپیگنڈے اور نشر و اشاعت کا بھرپور استعمال کرکے جماعت اسلامی پاکستان کو بھٹو کی سزا کا سبب بتلایا اور یہی نہیں جماعت اسلامی پاکستان کی آڑ لے کر جماعت اسلامی جموں وکشمیر کے خلاف کشمیری عوام کو تشدد اور تخریب کاری پر اُبھارنا شروع کیا اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ چنانچہ بڑے بڑے جلوسوں اور مظاہروں کی رہنمائی انھیں دشمنان اسلام نے ہمدردان اسلام بن کر کی۔ اور عوام کو بھرپور استعمال کیا۔ عوام تو عوام علم دین سے واقف کار حلقے بھی ان کی سازش کو سمجھ نہ سکے۔ اور فریب کا شکار ہو گئے۔

(۲) دوسرا طبقہ جو ان واقعات میں جماعت کی مخالفت میں آگے آگے تھا وہ قبر پرستوں اور آستانوں کے مجاوروں کا طبقہ تھا اس گروہ نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اس موقع کو اپنے لئے بہترین موقع پایا کیونکہ جماعت اسلامی نے ان کے خلاف بھی محاذ آرائی کی تھی چنانچہ جماعت کو یہ لوگ سب سے بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ تحریک اسلامی کے اثرات سے ان کے حلوے مانڈے خطرے میں پڑنے لگے تھے اور وہ عرصہ سے جماعت پر خار کھائے بیٹھے تھے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان شکم پرست ملاؤں کے ساتھ وہ گروہ بھی شامل ہوا، جنھیں حق کو براہ راست قرآن و سنت سے استفادہ کرنے کا فخر حاصل ہے۔ — سہ ماہی اشارہ

ہے تبلیغ الاسلام اور جمعیت اہل حدیث کی طرف سے۔ جماعت اسلامی سے مسلکی اختلافات، نیز تحریکی اختلافات میں وہ اتنے متشدد ہو گئے کہ انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور جماعت کی اندھی دشمنی میں دوسروں کے ساتھ خم ٹھونک کر آگے آ گئے۔ یہاں تک کہ جمعیت اہل حدیث کی مسجدوں میں جماعت کے افراد کا داخلہ بند کر دیا۔ جمعیت اہل حدیث کے ایک پیش امام نے مولانا مودودی کو علی الاعلان کافر کہنا شروع کر دیا۔

(۳) تیسری سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ چند سالوں سے جماعت اسلامی ریاست کشمیر کی عملی سیاست میں بھی حصہ لے رہی ہے۔ کشمیر کی موجودہ حکمراں پارٹی جماعت اسلامی کو سب سے بڑا حریف سمجھتی ہے۔ ۱۹۷۲ء کے عام انتخابات میں جماعت اسلامی دوسری سب سے بڑی جماعت کی حیثیت سے وادی میں اپنی بے لوث خدمت کی بنا پر اُبھر کر سامنے آئی جس سے اس کے سیاسی حریفوں میں بغض وحسد پیدا ہو گیا۔ اس لئے اس موقع پر اُن سیاسی حاسدوں نے بھی عوامی رجحان کو جماعت کے خلاف موڑنے میں بھرپور حصہ لیا۔ تاکہ بزعم خویش جماعت اسلامی کو تباہ کر دیا جائے۔ ریاست کے مقامی پریس کے علاوہ دہلی کے اردو کے چند اخبارات جس میں نئی دنیا "اور" عوام" پیش پیش تھے۔ وادی کشمیر میں نفرت اور تشدد کی آگ پھیلاتے رہے۔ جھوٹ اور بے بنیاد خبروں سے پوری فضا کو پراگندہ کر دیا اور عوام نے اس پر یقین کر لیا۔

اس سروے کے دوران چند لرزہ خیز مشاہدات سامنے آئے جن کو تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جب پوری وادی میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی تو پوری ایڈمنسٹریشن تماشائی بنی ہوئی تھی اور یہ سب نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کے اشارے پر ہوا جس میں شیخ عبداللہ پیش پیش ہیں۔ کیونکہ ان کی مخالف مضبوط سیاسی جماعت، جماعت اسلامی ہی تھی۔ نیشنل کانفرنس جماعت کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اس کی طاقت سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس نے اپنے حریف کے کچلے جانے کے اس موقع کو غنیمت جانا چنانچہ اتنے بڑے فساد میں ریاستی حکومت نے فساد یوں

اور بلوائیوں کو کھلی چھٹی دے دی بلکہ جماعت کے افراد کو برباد کرنے میں شرپسندوں کا ہاتھ بھی بٹایا اور پوری پوری مدد کی ان کی مدد سے شرپسندوں نے جماعتِ اسلامی کے افراد ان کی جائداد، باغات، مکانات وغیرہ کی مکمل فہرست بنائی۔ پھر تین چار دن تک شرپسندوں کو کھلی چھٹی ملی رہی۔ باوجود یہ کہ جماعت کے بیشتر افراد نے ان سازشوں سے ریاستی حکومت کو خبردار کیا بلکہ خود جاکر تھانہ میں رپورٹ درج کرائی۔ حملے کی سازشیں بتائیں لیکن اس طوفان کے دوران ان کا رویہ ایسا رہا کہ ایسا معلوم ہونے لگا کہ ریاست میں پولیس یا انتظامیہ ہے ہی نہیں۔ انتظامیہ والے اور خاص طور سے نیشنل کانفرنس کے بڑے لیڈران مواقع پر بغلیں بجاتے رہے!

خرد کا نام جنوں رکھ دیا میں نے

شمس الہدیٰ بھاگلپوری

پاکستان کے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کے الزام میں عدالت سے سزا کا فیصلہ صادر ہونے کے بعد پھانسی دے دی گئی تو دنیا میں کہرام مچا کر وزیراعظم اور صدر جیسے مناصب جلیلہ پر فائز رہنے والوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا جاتا اور بیرونی ذرائع ابلاغ نے ایسا طومار باندھا کہ پاکستان میں عدالت کی سزا پر عمل درآمد کر کے گویا کوئی بڑا گھناؤنا جرم کیا گیا ہے، پاکستان گویا وحشیوں کا ملک ہے۔ حالانکہ یہ وہی ممالک ہیں کہ جہاں ملکہ کی بیٹی کا ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی میں چالان ہو جائے اور عدالت سے چند پونڈ کے جرمانے کی معمولی سی سزا ہو جائے تو اس ملک کے اخبار اس خبر کو یوں اچھالتے ہیں گویا انھوں نے پوری انسانیت اور اس کی تہذیبی ارتقار کی تاریخ کو حسن بخش دیا۔ اس واقعہ کو اس طرح نمایاں کیا جاتا ہے کہ گویا تاریخ عالم میں قیام انصاف کی ایسی شاندار کوئی نظیر مل ہی نہیں سکتی لیکن مشرق میں اگر عدل کی یہ مثال قائم ہو رہی ہو کہ سربراہ حکومت جو سب کی جانوں کا آئینی، قانونی اور اخلاقی محافظ ہوتا ہے خود کسی کی جان کے اتلاف کا محرک ثابت ہو جائے اور سپلا امتیاز ادنیٰ و اعلیٰ عدالت کے فیصلے کے مطابق اس کو پھانسی دی جا رہی ہو۔ یہ ممالک انسانیت کشی کے الزامات کا طومار باندھ کر پاکستان جیسے ممالک پر درندوں کا باڑہ ہونے کا گمان کرتے ہیں چنانچہ ۴ اپریل کے واقعہ پر مغربی دنیا کا ردعمل کچھ ایسا ہی ہے۔

بھٹو دور میں درجنوں سیاسی قتل ہوئے مگر ایسی درجنوں وارداتوں کے کسی ذمہ دار کو کسی قانونی عدالت سے سزا نہ ہوئی۔ یہی نہیں کہ بھٹو صاحب نے ان تمام معاملات میں اپنی ذمہ داری پوری کرنے سے پہلو تہی کی بلکہ ان کے سلسلہ میں اپنی ناکامی کی ذمہ داری کا اعتراف قوم سے کر کے بھی معذرت طلب نہ ہوئے۔ ان کے دور میں انفرادی قتل کے علاوہ جلسوں میں قتل عام ہوا، سڑکوں پر بے گناہ انسان پرندوں کی طرح شکار کئے گئے ان سب مظالم کی ذمہ داری کبھی بھٹو صاحب نے قبول نہ کی نہ عوام سے کبھی اظہار ندامت کیا پیرزادہ سے یہ خبر ملی کہ وہ نواب احمد خاں کے قتل کے سلسلہ میں کسی بندے سے تو کجا اللہ سے بھی رحم نہ مانگیں گے کیونکہ وہ بے گناہ ہیں۔ کاش انھیں اللہ سے رجوع کرنے اور اپنے اہل وطن کے سامنے فراخ دلی سے اپنے ظلم اور غلطیوں کے اعتراف کی توفیق ہوتی۔ یہ ان کے نیکی کی علامت اور بڑائی کی دلیل ہوتی۔ مگر افسوس آخر دم تک وہ یہ علامت اور دلیل پیش کرنے سے قاصر رہے۔

بھٹو صاحب کو یہ توفیق نہ ہوئی مگر عباس ہویدا نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اقبال جرم کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اہل وطن سے اپنے مظالم کی معافی مانگی خصوصاً ان نوجوانوں سے کہ جن کو ان کے دور میں گرفتار کیا گیا اور اذیتیں پہنچائی گئیں۔ انھوں نے اللہ تعالےٰ سے بھی اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ بھٹو صاحب سے بھی ایسی ہی غلطیاں ہوئی تھیں مگر انھیں تو اپنے عوام سے معافی مانگنے یا خدا سے رحم طلب کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ یہ فرق دونوں مرنے والوں میں ظاہر ہوا۔ عباس ہویدا یقیناً بھٹو سے بڑے انسان ثابت ہوئے۔

بھٹو پر اختیارات کے ناجائز استعمال اور متعدد بے قاعدگیوں کے سنگین الزامات کی بناء پر بھی کئی مقدمات قائم کئے گئے تھے لیکن سب سے پہلے قتل کے اس مقدمہ کو لیا گیا تھا جو خود بھٹو کے دور حکومت میں شروع ہوا اور اس کیس میں عدل و انصاف کے تقاضے پورا

کرنے میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیا گیا اور نہ بے جا مداخلت کو راہ نہیں دی گئی۔ بھٹو کو اپنے قانونی دفاع کے لیے وہ تمام سہولتیں فراہم کی گئیں جو ضابطے کے تحت کسی قتل کے ملزم کو مہیا کی جاتی ہیں۔ بلکہ متعدد سہولتیں عام روایات سے ہٹ کر دی گئیں۔ بھٹو اور ان کے وکلاء نے عدالت پر مکمل اعتماد کا بھی اظہار کیا۔ پاکستان کے تمام ماہرین قانون اور بعض بین الاقوامی شہرت کے بیرونی ماہرین قانون نے بھی یہ اعتراف کیا کہ قتل کے اس مقدمہ کی سماعت عدل والنصاف کے اعلیٰ سطح پر اور بہترین و مسلمہ قانونی و عدالتی روایات کے مطابق عمل میں آئی۔ صدر ضیاء الحق نے بھی بار بار یہ یاد دہانی کرائی کہ وہ عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا ہونے دیں گے۔ اور عدالت عظمٰی جو بھی فیصلہ دے گی اس کو نافذ کر کے اس کی بالادستی اور احترام کو پوری طرح برقرار ہونے دیں گے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پاکستان میں عدلیہ کی بالادستی کا یہ ایک بڑا اظہار ہے اس سے پوری عالمی برادری کو یہ گہرا تاثر ملا ہے کہ پاکستان میں عدلیہ ایک ایسا بالادست ادارہ ہے جس کو کوئی طاقت عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرنے سے روک نہیں سکتی۔ اور اس کے احترام کو مجروح نہیں کر سکتی۔

بھٹو کی موت سے بھٹو کے لواحقین اور چاہنے والوں کو صدمہ ہونا ایک فطری بات ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ صدمہ بی بی سی کو ہوا ہے کیونکہ گزشتہ دو ماہ سے بھٹو کے حق میں اس کی تحریک ناکام ہو چکی ہے۔ اس نے جو توقعات وابستہ کی تھیں۔ ناکام ہو گئیں۔ بی بی سی کو شکایت ہے کہ پھانسی رات کے دو بجے کیوں دی گئی؟ پھانسی کی تاریخ، وقت اور جگہ کا اعلان پہلے سے کیوں نہیں کیا گیا؟ نظر بند بیوی اور بیٹی کو میت کے ساتھ جانے کی اجازت کیوں نہیں دی گئی؟

لندن میں مقیم بچوں کو والد سے آخری ملاقات کیوں نہیں کرائی گئی؟ کارکنوں کو بڑی تعداد میں گرفتار اور انھیں کوڑوں کی سزائیں کیوں دی گئیں؟

سند جو ہاتھ لگا شکایت مرحوم بھٹو کے لواحقین یا خیر خواہوں کو تو ہو سکتی ہے لیکن جس کی تاریخ ظلم و ستم سے بھری ہوئی ہو۔ ایسے انگریز کے ٹھیکیدار "بی بی سی" کو زیب نہیں دیتی۔ بی بی سی آج جس جمہوریت اور عدل و انصاف کی ڈفلی بجانے میں مصروف ہے اس جمہوریت و عدل کے بانی برطانیہ نے ایسے گھناؤنے مظالم ڈھائے ہیں کہ آج بھی تاریخ کے سیاہ صفحات اس کی گواہی دیں گے۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ بھٹو کے ختم ہو جانے کے بعد اب ان کے بارے میں مخالفانہ باتیں نہ کی جائیں کیونکہ مرنے والوں کو برا کہنا اچھا نہیں لیکن اگر دوسری طرف سے بھٹو کو مہاتما بنا کر پیش کیا جائے اور اس کی تصویر کی پرستش ہو تصویریں پوجی جائیں تو جواباً بھی حقائق پیش کیے جائیں گے اور اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہوگی جو نادانی میں یا دانستہ اب بھی بھٹو کی تعریف کر کے ان مخالفوں کو بھٹو کی بداعمالیاں یاد دلانے پر مجبور کرتے ہیں۔

کیا یہ واقعی بھٹو دوستی ہے۔ ہم پھر عرض کرتے ہیں کہ بھٹو ختم ہو گئے۔ اب انہیں مثبت یا منفی طور پر موضوع گفتگو نہ بنایا جانا چاہیے۔ اب عوام کے مسائل پر اور پاکستان میں ایک نئے نظام "اسلامی" کی استواری پر گفتگو ہونا چاہیے۔ ماضی کو حال میں گھسیٹ کر لانا اچھا نہیں ہے (بشکریہ تعمیر حیات)

بقیہ ۔ ایرانی [illegible]

مرد بھی۔ ان کے لباس اور چہروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زیادہ متوسط طبقے کے مذہب پسند لوگ ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہ کے خلاف تحریک اسلامی دینی جذبے سے ابھری تھی۔

ڈاکٹر کریم سنجابی سنی مسلمان ہے شاہ کے خلاف تحریک فرقہ وارانہ نہیں بلکہ صحیح معنوں میں اسلامی تھی۔ کیونکہ شریک ہونے والوں کے سامنے فرقہ وارانہ مفاد نہیں بلکہ اجتماعی، ملکی اور دینی مفاد تھا۔ (دعوت)

(ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی)

مبالغہ آمیز مہم

بھٹو کی گرفتاری سے لے کر پھانسی تک ہندوستان میں جس طرح اخبارات نے مبالغہ آمیز مہم چلائی اور جھوٹی خبروں کے ڈھیر لگائے اس نے ۱۹۷۱ء کی یاد تازہ کر دی جب بنگلہ دیش کی جنگ سے پہلے اور اس کے بعد مبالغہ آمیز مہم چلائی گئی جو پریس انسانی ہمدردی خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی کے لیے اس قدر حساس ہے، وہی خود اپنے ملک میں تشدد اور لوٹ پھونک اور بے آبروئی کے واقعات کا ایسا بلیک آؤٹ کرتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے جس تناسب سے پاکستان کے سابق وزیر اعظم کو اخبارات کے صفحات میں جگہ دی گئی اور جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ کاش کہ اس کا عشر عشیر اس مسلمان اقلیت کو بھی ملتا جو دو ہزار فسادات سے نڈھال ہے کاش ویسی اہمیت مسلم یونیورسٹی اور اردو زبان کو بھی ملتی جو حقوق سے محرومی کی اپنی مثال آپ پیش کرتی ہے۔

پاکستان میں جو کچھ ہوا اس کی سزا جس طرح جماعت اسلامی کے لوگوں کو ہندوستان میں دی گئی۔ کاش اس کی کوئی مثال کمیونسٹوں، امریکن نوازوں اور غیر ملکی طاقتوں کے ایجنٹوں کے سلسلے میں پیش کی جاتی لیکن اخباری دنیا پر جن لوگوں کا قبضہ ہے وہ کوئی حق پرستوں اور مفاد پرستوں کی ایسی ٹیم ہے جو صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح ثابت کرنے کی کارگزاری پر نہ صرف زندہ بلکہ پھل پھول رہی ہے۔

بطور دلیل نہیں لیکن حقائق کی دنیا میں دیکھا جائے کہ جب اندرا کانگریس ۲/۳ اکثریت

کے ساتھ بر سر اقتدار بھٹو اور جب انھوں نے "شریفوں" کا معاہدہ کیا تھا مسلم یونیورسٹی کسی فرد کا مسئلہ نہیں تھی۔ پوری ملت اور آئندہ آنے والی نسلوں کا مسئلہ تھی۔ سپریم کورٹ کے ایک فیصلے پر اپنے جائز حق سے محرومی ہو گئی۔ ۱۳ سال کی مسلسل جدوجہد اور ملک گیر احتجاج اندرائی دور حکومت اور موجودہ حکمراں طبقہ کے جذبۂ انسانیت کو ابھارنے میں ناکام رہے لیکن ایک فرد واحد پر جس کے جرائم کی کوئی انتہا نہیں جو ہزاروں خاندانوں کے اجڑنے اور بے شمار انسانوں کے قتل و برباد ہونے کا ذمہ دار ہے جس کی تلون مزاجی سے کسی کی عزت و آبرو محفوظ نہیں رہی تھی۔ جس کی عیاشی اور شراب نوشی تنہا اس کی ذات تک محدود نہیں رہی تھی پوری ایک اسلامی مملکت کے کردار کو ختم کر دینے اور بالکل تحلیل کر دینے کا ذریعہ بن گئی تھی اور یہ سرحد پار کی باتیں تھیں کسی خلائی علاقے کی باتیں نہیں تھیں جو اخبار نویس واشنگٹن اور ماسکو میں چیونٹی کے رینگنے کی آواز سن لیتے ہیں وہ اپنے پڑوسی ملکوں سے اس درجہ بے خبر رہے کہ انھیں پاکستان لوٹتا نظر آیا۔ قتل و خون کے دریا بہتے نظر آئے۔ اسٹرائیک و احتجاج کا طوفان نظر آیا۔ آخری درجہ کی ناانصافی نظر آئی اور یہ سب اس شخص کے سلسلے میں جو ابھی تک مبغوض ترین آدمی تھا۔ اس کا مطلب بھٹو سے ہمدردی سمجھا جائے یا پاکستان یا پاکستانی عوام سے معیاری جھوٹ اور مکر سمجھا جاتا ہے جو اتنے بڑے پیمانے پر بولا جائے کہ اس کا یقین آ جائے۔ میں نے گزشتہ دو مہینے میں نہ عرب ملکوں میں اور نہ خود پاکستان میں کہیں وہ غم و غصہ اور حالات دیکھے جس کا اظہار خصوصیت سے اردو اخبارات نے کیا ہے وہاں تو پولیس بھی نہیں دکھائی دی جو دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ پر عام طور پر ہندوستان میں نظر آتی ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مہم دراصل نہ بھٹو کی ہمدردی میں تھی نہ جنرل ضیاء الحق کی مخالفت میں بلکہ اسلامی نظام کے "احیاء" کے خلاف ہے جس میں ان لوگوں کا دم

کشت ننگ ناچ ہے جو نفس پرستی میں گلے گلے ڈوبے ہوئے ہیں۔ ابھی اسلامی نظام کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا گیا اور ابھی سزاؤں کا وہ سلسلہ بھی نہیں شروع ہوا لیکن ادھر طوفان کا طوفان کھڑا کر دیا گیا۔ اور بھٹو کے واقعہ کو لے کر اس طبقہ کو بدنام کرنے کی ایسی مہم چلائی گئی کہ اچھے اچھے اس طوفان میں تنکوں کی طرح اڑ گئے۔

پاکستان صحیح بنا یا غلط یہ تاریخی بحث ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ایک ملک ہے اور اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے لیکن شروع سے وہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں رہا جنھوں نے اسلامی قدروں کو پامال کیا اور ایک ایسی نسل تیار کر دی جس کا دوبارہ اپنی صالح روایات پر واپس لانا مشکل کام ہے۔ قانون کے نفاذ سے اچانک وہ ساری تبدیلیاں ظہور میں نہیں آسکتیں جو اسلامی حکومت کا منشا ہے۔

فوجی ہونا سفاکی اور درندگی کی دلیل نہیں ہے درندگی تو لوٹ اور کھسوٹ سے بھی ہو سکتی ہے جمہوریت کے عوام اداروں میں بھی ہو سکتی ہے اور سوشلزم کا نعرہ لگانے والوں میں بھی۔ دراصل کسی کا کردار خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ کس درجہ شریف اور خیر خواہ ہے

ایران میں یوگنڈا میں، بیت المقدس فلسطین میں اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کم سے کم اتنی توجہ کا مستحق تو ضرور ہے تو اس پر ہلکا سا احتجاج ہوتا۔ کسی سفارت خانہ پر مظاہرہ ہوتا کسی اسمبلی میں ریزولیوشن پاس کا نوٹس دیا جاتا۔

ہندوستانی اخباروں کی ایک ٹیم پاکستان کا دورہ کرتی اور خود جا کر حالات کا جائزہ لیتی اور اپنی آنکھوں سے دیکھتی کہ حقائق کیا ہیں پاکستان کے حق میں ایک اچھے صالح معاشرے کی ضرورت ہے یا جوا خانوں، شراب خانوں اور عیاشی کے اڈوں کی تہذیب کی۔ خود ہندوستان کو اچھے شریف پڑوسی ملک کی ضرورت ہے۔ یا اوباش بے ضمیر بے کردار لوگوں کی۔

مرارجی ڈیسائی کا رویہ زیادہ حقیقت پسندی کا تھا اور انھوں نے کامیاب سیاست داں کا رول ادا کیا۔ اگر وہ یہ حقیقت پسندی دوسرے مسائل حل کرنے میں بھی پیش نظر رکھیں تو وہ ہندوستان کو استحکام اور ترقی دینے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

امن و امان کی فضا اور صالح کردار کے بغیر نہ ہند کا کوئی مستقبل ہے نہ پاکستان کا۔ لیکن جو حالات خود ہمارے ملک میں چل رہے ہیں اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر لوگوں کی عزت و آبرو کو آگ و خون میں جھونک کر جس قدر جلد اقتدار حاصل ہو سکے اسے حاصل کر لینا چاہیے۔ یہ ایسی ذہنیت ہے کہ جسے پنپنے دیا گیا یا مہنگائی اور چند محدود مزدوروں کی خاطر اس کی مدافعت کی گئی تو ایسا تاریخی المیہ پیش آئے گا جس کی نظیر اس برصغیر میں ملنی مشکل ہوگی۔

وحشی بستی کے خونخوارو!

[illegible] اسلام آباد

★ آؤ راکھ کے ڈھیروں پر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ لو کہ بستیاں جل کر اب خاکستر ہو چکی
یں۔ انسانی زندگیاں مر چکی ہیں۔ آؤ انسانی تقدس و عظمت کی پامالی کے وحشتناک منظر تو
یکھو کہ انسانیت پر بربریت غالب آچکی ہے۔ آؤ انسانی لاشوں کو دیکھو جنہیں شیطان
اغوت کے کارندوں نے ذاتی مفادات کی بھینٹ چڑھایا۔ آؤ ماؤں اور بہنوں کے
ت و آبرو کی نیلامی تو دیکھو۔ آؤ دیکھو انسانیت کس طرح مجروح کی گئی۔ آؤ انسانیت
ے جنازے پر دو چند آنسو تو بہا لو۔ آؤ دیکھو کہ انسان خود کس طرح اپنے بھائیوں کے
شیانوں کو خاکستر کر رہا ہے۔ آؤ عظیم کتاب کے بکھرے ہوئے اوراق کی پائمالی بے
تی اور خستہ حالی پر خوب آنسو بہا لو۔ آؤ اپنے اسلاف کی کتابوں کو ان گندی گلیوں
گندے چوراہوں پر بکھرتے اور خاکستر ہوتے دیکھو۔ آؤ خاک و خون میں تڑپتے ہوئے
انوں کو دیکھو۔ آؤ دیکھو کہ حساس، ذی شعور اور عظیم اشخاص کے قلم کئے ہوئے ہاتھوں
کی ہوئی زبانوں اور زخمی کئے ہوئے وجودوں کو دیکھو۔ آؤ دیکھو کہ انسان کس طرح
لا ہے۔ آؤ وحشی بستی کے وحشی مکینوں کو دیکھو۔ آؤ جنگل کے قانون کی عمل آوری دیکھو
یکھو کہ یہاں خونخوار لوگ کتنے خونچکاں مناظر تخلیق کر رہے ہیں۔ آؤ کمزوروں
غوں اور بے کسوں کے حسرت بھرے چہروں کو دیکھو۔ آؤ آہوں، کراہوں اور

سسکیوں کی مدح فرسا صدائیں تو سنو۔ آؤ انسان کے تقدس کو مٹتے اور دفن ہوتے ہوئے دیکھو
کون ہے جو اس وحشی بستی کے خونخوار لوگوں کے اندوہناک شب و روز کا مطالعہ کرے
کون ہے جو یہاں بلند مقاصد، اعلیٰ و ارفع خیالات اور عظیم انسانی تقدس کے لئے کام کرے تو
کچلنے اور چکنا چور ہونے کے لئے تیار ہو جائے، ورنہ اس ویرانے میں خاموش رہے یہاں
وحشی لوگ دانت نکالے ہوئے ہیں۔ کون جو اس قوم کے عظمت و تقدس کے تعمیر کا خواہاں ہو
پہلے اپنے آشیانے کو مسمار ہوتا دیکھ لے ورنہ چپ رہے۔ کون ہے جو عزت و آبرو کی باتیں
کرے۔ پہلے اپنے وجود کو کفن پہنا لے ورنہ اس خونخوار بستی میں خاموش رہے کیوں کہ یہاں اچھے
حرکات، اعمال اور خیالات کا بدلہ یہی ہے جو یہاں علم و عمل فکر و دانش و عقل و حکمت کے
میناروں کو روشن کرنے کا خواہاں ہو۔ تو لاٹھیوں کی جوتوں گالیوں کی ضربوں، بندوقوں
کی گولیوں سے اپنا رشتہ استوار کرلے، جو بہاروں اور باغوں کا باغبان بننے کا خواہاں
ہو، بہاروں کی آرزو نہ کرلے کہ اس کے راستے میں کانٹے بوئے جائیں گے کیونکہ وحشی بستی
میں اچھے کاموں کا صلہ یہی ہے کہ وہ اپنے محسن کو مجروح کرتے ہیں۔ ان کے آشیانوں
کو جلاتے ہیں یہی واقعی یہی ہوتا ہے۔ میں نے خود دیکھا، خود محسوس کیا۔ اور واقعی ان حالات
سے دوچار ہوا۔ میں یہ دیکھ کر مجروح ہوا، میں تڑپتا رہا۔ میں وحشی بستی میں خونخوار لوگوں کے
ہاتھوں ظلم سہتا رہا۔ افسوس میں نے اس ویرانے میں کیوں پھول اگانے کی غلطی کی تھی۔
افسوس میں نے بنجر بستی میں اخلاق کا درس کیوں دیا تھا کاش میں جانتا کہ مجھے پتھروں سے
زخمی کیا جائے گا۔ کاش معلوم ہوتا کہ بداخلاقیوں کے طوفان میں اخلاقیات کی تمام دیواریں
بہہ جائیں گی۔ کاش میں جان گیا ہوتا کہ یہ ویرانہ بنجر اور پرخار صحرا پھولوں کے نشو و نما کے لئے
موزوں نہیں۔ یہ کانٹوں کی کاشت کے لئے زرخیز ہے۔ کاش میں اس بستی میں پیدا نہ ہوتا۔
جہاں میرے خیالات کی دنیا اجڑی ہوئی ہے۔ کاش میں مر چکا ہوتا۔ کاش میرے ضمیر کا

چراغ گل ہو چکا ہوتا۔ میں رونا چاہتا ہوں۔ آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ جانا چاہتا ہوں لیکن میری نگاہیں دہشتناک منظر دیکھتے دیکھتے خشک ہو چکی ہیں۔

یہاں اخلاق کا درس مت دو۔ یہاں انصاف و انسانیت کی باتیں مت کرو۔ یہاں شرمناک سوز حرکات پر ماتم مت کرو۔ یہاں آہوں اور کراہوں اور سسکیوں کا تمسخر اڑاؤ۔ یہاں عفت و عصمت کو لٹتے ہوئے مت شرماؤ۔ یہاں کے بے کسوں اور کمزوروں کی پامالی پر دکھ کا اظہار مت کرو۔ ورنہ زبانیں کھینچ لی جائیں گی۔ یہاں آنکھیں پھوڑ دی جائیں گی۔ آؤ انسانیت پر ماتم کریں اشرف المخلوقات کا چہرہ مسخ کر لیں۔ اخوت و ہمدردی کو دفن کر لیں دلوں کے چراغوں کو گل کر دیں۔ ضمیر و وجدان کو لہو لہان کر دیں۔ جسموں کو تار تار کر دیں اخلاق، شرم و حیا کی قدروں کو پھاڑ دیں۔ کرگسوں کے رہ کر خوش الحان طائروں کے خلاف جنگ کریں، چمگادڑوں، الوؤں اور چیلوں کے لئے ابابیل و عندلیب اور کبوتروں کے جسموں کو گھسیٹ لیں۔ اگر تمہیں عزت درکار ہے اگر سماج میں رتبہ چاہتے ہو تو آؤ بھنگ کے کھیت لگائیں۔ ثمردار اشجار کاٹ لو۔ مے خانوں اور شراب خانوں کی تعمیر کرو۔ اور علم و دانش کے درسگاہوں کو آگ لگاؤ۔ سود خواروں اور خونخواروں شاطر و قاتل انسانوں کے محل تعمیر کریں۔ شائستہ لوگوں، محنت کشوں اور ایمانداروں، انسانوں کے آشیانوں کو جلا کر خاکستر کر دیں۔ آؤ قوم کو نیلام کریں کہ سماج و معاشرے میں یہی عزت کا معیار ہے۔ جنگلی بستیوں میں چراغوں کو روشن کرنا دشمنی کے لئے خطرہ ہوتا ہے۔ یہاں تاریکی اور اندھیرا ہونا ہی چاہئے یہاں جنگل کے قانون ہی نافذ رہے۔ چمگادڑ اور اُلو روشنی سے ڈرتے ہیں۔ انھیں طائر حسین کی رنگین نوائی سے نفرت ہے، ویرانوں، کھنڈروں سے انھیں محبت ہے۔ تہذیب و تمدن، علم و عمل کی روشنی سے وحشیوں کو کیا سروکار، یہ بستی وحشیوں کی ہے۔ باغوں اور بہاروں سے انھیں کیا غرض۔

بس اب انسانیت کو اور زیادہ مجروح نہ کرو۔ بس اب قافلے کو اور نہ لوٹو بس باغوں کو ویران مت کرو۔ بس علم و دانش کدوں کو مسمار نہ کرو۔ بس چراغوں کو اب نہ بجھاؤ بس یہ انتہا ہے۔ قومیں کی تاریخ یہاں ختم ہو رہی ہے۔ عذاب الٰہی ان حالات کے بعد آتا ہے۔ اگر روش نہ بدلو گے تو بس اے قوم ایک عذاب عظیم کا انتظار کرو جس کے آنے پر چیخنا اور چلانا کام نہ آئے گا!" (بشکریہ ترجمان الحق)

احیاءِ اسلام کی

اہل مغرب

عالمگیر تحریک سے خوفزدہ ہیں

{پروفیسر عثمان غنی}

اہلِ مغرب ان دنوں دوہری پریشانی میں مبتلا ہیں۔ ایک پریشانی اس بات کی کہ ان کی مادی تہذیب سائنس اور ٹیکنالوجی کی ساری ترقی مادی آسائشوں کی فراوانی اور تعیشات کی بہتات کے باوجود انسان کو سکون اور اطمینان نہیں دے سکی۔ بلکہ اب تو یہ ان کے اعصاب اور ذہنوں کو مفلوج کئے دے رہی ہے۔

ان کو دوسری پریشانی اسلامی دعوت اور اسلامی تحریکوں کی حیرت انگیز ترقی سے ہے پاکستان ایران، ترکی اور افغانستان کے حالات نے ان پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ اب مسلمان ان کے بچھائے ہوئے جال کو تار تار کر کے چھوڑیں گے۔ عرب ملکوں میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد کا پورے اعتماد کے ساتھ نہ صرف اسلامی عقائد اسلامی شعائر اور اسلامی عبادات کی طرف رجوع بلکہ اسلام کو ایک تہذیبی اور سیاسی قوت کے طور پر غالب کرنے کے لئے بے پناہ ولولے اور جذبے اہل مغرب کو مایوس کر رہے ہیں۔

اسلام ـــ مستقبل کی طاقت

اسلامی تحریکوں کی پیش قدمی سے ان کو پریشانی اس لئے ہو رہی ہے کہ وہ اسلام کو

اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں اور ان کی تمام پالیسیوں میں کونے کا پتھر اسلام کی راہ روکنا ہے اس بات کا ثبوت ہمیں تمام مغربی طاقتوں کے طرز عمل سے آسانی سے مل جاتا ہے اور طرز عمل ہی کیا۔ ان کی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ اب یہ بات کھل کر سامنے آ رہی ہے ہم زیادہ تفصیلات میں یہاں نہیں جائیں گے۔ بس مثال کے طور پر صرف دو مستشرقین کے اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

ایک جرمن مستشرق نے "اسلام مستقبل کی طاقت" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اس میں وہ کہتا ہے :۔

"مسلمانوں کے عقیدے کی جڑیں ان کی کتاب میں بڑی گہری ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اس کے ساتھ اگر ان کے پاس دولت مادی رسائل اور تکنیکی طاقت آ گئی، تو یہ دنیا کے لئے لعنت بن جائیں گے ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس وقت کے آنے سے پہلے اس طاقت پر کاری ضرب لگائیں"

● ایک دوسرا مستشرق "براون" لکھتا ہے:۔

"ہمارے لئے اصل خطرہ اسلامی نظام ہے۔ اسلام میں پھیلنے اور دوسروں کو قائل کرنے اور مسخر کرنے کی جو صلاحیت موجود ہے اور اس کے اصولوں میں جو داخلی توانائی پائی جاتی ہے، وہ ہمارے لئے خطرناک ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ہماری راہ میں واحد رکاوٹ اور ہمارا اصل حریف اسلام ہے"

اسلام کے بارے میں اس رائے پر مغرب کے ملحد، عیسی، یہودی اور اشتراکی سب متفق ہیں۔ ادھر سے جو گولہ باری اسلام پر مسلسل ہوتی ہے۔ اس کا جائزہ لیجئے تو کسی گولے پر آپ کو صلیب کا نشان نظر آئے گا۔ کسی پر ستارہ داؤدی کا اور کسی پر ہتھوڑے اور درانتی کا۔

اسلامی نظام کا رُعب

اہلِ مغرب کی اس ذہنیت اور ان کے اس تجربے کو ہم جانے رکھیں، تو پاکستان اور ایران کے بارے میں ان کے تبصرے سمجھنے میں ہمیں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ پاکستان میں اسلامی حدود کے نفاذ پر مغربی ذرائعِ ابلاغ کی تلملاہٹ ان کی ذہنیت سے پوری پوری مطابقت رکھتی ہے۔

ان سب باتوں کو جاننے کے باوجود جمہوریت پر ایمان رکھنے کے ان دعویداروں نے عدلیہ کے احترام کے ان مبلغوں اور قانون کی بالادستی کے ان علمبرداروں نے صحافت کے تمام مسلمہ اصولوں کی مٹی پلید کرتے ہوئے مسلسل جس بھونڈے اور مضحکہ خیز انداز میں پوری بے حیائی اور ڈھٹائی کے ساتھ اپنے ذرائع ابلاغ سے خبریں پوری دنیا کے سامنے نشر کی ہیں اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اسلامی قوانین کے نفاذ، اسلامی معاشرے کے قیام اسلامی اخلاق کی ترویج اور اسلامی بنیادوں پر قائم ہونے والے سیاسی اور اقتصادی نظام کو اپنے نظریات، اپنے نظامِ حیات اور اپنی تہذیب کے لئے سب سے بڑا چیلنج اور سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہیں انھیں معلوم ہے اگر دنیا کے ایک دو ملکوں میں بھی اسلامی نظام اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ عوامی تائید کے ذریعے قائم ہو گیا تو اس کے براہِ راست اثرات ان کے اپنے ملکوں کے بے چین مگر سکون کے متلاشی عوام پر پڑیں گے اور اسلام کی برکتوں کے عملی ظہور کے بعد اشتراکیت کو کریملن میں اور سرمایہ داری کو لندن اور واشنگٹن میں جائے پناہ مشکل سے ملے گی۔

بھٹو مغرب کا پٹھو

اس ذہنیت اور ان جذبات کے ساتھ جب وہ صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں اسلام کا راستہ روکنا نہایت ضروری ہے اور اس مقصد کے لئے انہیں بھٹو سے زیادہ موزوں آدمی کوئی نظر نہیں آتا تھا ان کے خیال میں بجا طور پر بھٹو کو یہ انفرادیت حاصل تھی کہ اپنی شعبدہ بازیوں سے ان پڑھ عوام کی حیوانی خواہشات و شہوات اور ان کے سفلی جذبات و احساسات سے کھیلے، انہیں اعلیٰ ملی مقاصد سے دور ہٹائے ان کی نظریں مادی چیزوں پر اس حد تک مرکوز کر دیں کہ وہ ان سے زیادہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچ ہی نہ سکیں۔ وہ مادی سہولتوں کی تحصیل کے لئے ہر قسم کی اخلاقی اقدار اور دینی وملی روایات کو پاؤں تلے روند دیں۔ حلال و حرام کی تمیز ان کے ضمیروں اور ذہنوں میں باقی نہ رہے۔ برائی ان کی نظروں میں نیکی، اور نیکی ان کی نظروں میں برائی بن جائے۔ اور ان کا معیارِ خیر و شر محض ان کی خواہشات بن جائیں۔

بی۔بی۔سی لندن

ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر انھوں نے بھٹو کے بارے میں ساری خبریں نشر کیں۔ اور بی بی سی لندن نے تو اس سلسلے میں دنیا کے تمام صحافتی اصولوں کی مٹی بُری طرح پلید کی۔ خبروں اور تبصروں میں علمی و معروضی انداز کے علمبردار ان لوگوں نے سپریم کورٹ کے فیصلے کی خبر جس انداز میں نشر کی اس نے ان کے مکروہ عزائم کو بالکل بے نقاب کر کے رکھ دیا۔ انھوں نے سپریم کورٹ کے بارے میں فاضل ججوں کے بارے میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ایک عام کوتاہ بین، او۔ ... ، جذباتی آدمی جس طرح صوبائی عصبیتوں کا شکار ہوتا ہے

اسی طرح ان جج صاحبان نے قانون کے سارے تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اور انصاف کی روایات کو پس پشت ڈالتے ہوئے اپنی صوبائی عصبیتوں سے مغلوب ہو کر ایک شخص کو پھانسی پر لٹکانے کا فیصلہ اس لئے صادر کر دیا ہے کہ وہ ان کے صوبے سے تعلق نہیں رکھتا اور اس سلسلے میں انھیں انسانی جان کو اپنے صوبائی جذبات کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے کوئی لحاظ یا حجاب محسوس نہیں ہوا۔

بی بی سی لندن نے جو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے، اگر ایک ذہن اسے قبول کرلے تو پھر اس ملک کے بارے میں اس کے سوا وہ کیا رائے قائم کرے گا جس ملک کی سب سے بڑی عدالت کے جج اس سطح کے لوگ ہیں۔ اس ملک میں جنگل کا قانون نافذ ہے اور اس میں رہنے والے انسان نہیں بلکہ جنگلی جانور ہیں۔

یہ ہے اہل مغرب کے دانشوروں کی سوچ اور یہ ہے ان کا طرز عمل اسلامی ملکوں اور مسلمانوں کے بارے میں اور اس میں عبرت ہے ان لوگوں کے لئے جو اہل مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز کو وحی سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔

پاکستان کے بارے میں اس رویے کے بعد ایک ہلکی سی جھلک اس رویے کی جو اہل مغرب نے اس وقت ایران کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے۔

ایرانی عورتوں میں

فرانس کے مشہور وجودی فلسفی جان پال سارترے کے نام سے اکثر قارئین واقف ہیں سارتر کی ماں یہودی تھی اور یہودیوں کے دستور کے مطابق یہودی وہ ہے جس کی ماں یہودی ہو۔ اس امتیاز سے سارتر یہودی پس منظر سے تعلق رکھتا ہے اور خود وہ شعوری طور پر ملحد ہے ایک لمبے عرصہ سے اس کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی تعلقات سیمون دو بوخوا سے ہیں

یہ بھی ایک ملحد عورت ہے اور سارتر ہی کی طرح وجودی فلسفے کی قائل ہے اس کی عمر اس وقت اکہتر سال ہے۔

ایران میں پچھلے دنوں اسلامی نقطۂ نظر سے دو احکام جاری کئے گئے۔ ایک یہ کہ ایرانی خواتین جب گھروں سے باہر نکلیں تو وہ ایک بڑی چادر اوڑھ کر نکلیں تاکہ وہ باپردہ ہوں، باوقار اور باحیا محسوس ہوں اور اسلامی احکام و روایات کی بالادستی قائم ہو۔ دوسرا حکم مخلوط تعلیم کو بند کرنے کا تھا۔

ان دونوں احکام کو ایران کی نوے فی صد سے زیادہ خواتین کی حمایت حاصل تھی مغرب اور اشتراکیت سے متاثر عورتوں کی ایک نہایت قلیل تعداد کو ان سے اختلاف تھا۔ انہوں نے کچھ ان احکام کے خلاف مظاہرہ کیا اور کچھ ان کو مظاہرے کی ترغیب دینے اور تحریک کرنے والوں کے سیاسی مقاصد تھے۔ اس مظاہرے کی مخالفت میں ان خواتین کی طرف سے مظاہرہ ہوا جو پردے کے حق میں ہیں۔ ان کی تعداد لاکھوں سے بھی متجاوز تھی۔

بس پھر کیا تھا۔ مغرب کی اس ملحد فلسفی عورت نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود اسلامی شعائر کی مخالفت کے لئے اعلانِ جہاد کر دیا۔ نوے فی صد سے زیادہ عورتوں کے جذبات کو اس نے بالکل نظر انداز کر دیا اسے یہ بات بھی یاد نہ رہی کہ یہ ایک دوسرے ملک کا اپنا داخلی معاملہ ہے۔ اس نے ایک پریس کانفرنس بلائی اور اس میں اعلان کر دیا کہ اس نے ایرانی عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ایک عالمی کمیٹی تشکیل دی ہے۔ اس کمیٹی میں پندرہ اور مختلف ملکوں کی ایک سو عورتیں شامل ہیں۔ ان میں سے بعض فلمی اداکارہ ہیں بعض کا تعلق صحافت سے ہے۔ بعض کا پیشہ عصمت فروشی ہے۔

مینڈک کی مدار دل پہنچی

بوفوار نے پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ ایرانی عورت نے ہمارے جذبات کو ابھارا ہے اس کی تائید و حمایت کے لئے

ہم نے یہ کمیٹی تشکیل کی ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ایرانی عورت کا ہم ساتھ دیں گی۔ میں خود تو اپنی صحت اور عمر کی وجہ سے ایران نہیں جا سکوں گی۔ لیکن ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمارا ایک وفد ایران جائے گا اور وہ مہدی بازرگان سے ملاقات کرے گا۔

مغرب کی ان عورتوں نے وہاں کے پریس کے ساتھ مل کر ایک مصنوعی شور و شغب برپا کر رکھا ہے کہ وہ ایرانی عورت کے حقوق کے لیے لڑ رہی ہیں۔ گویا ان کے نزدیک وہ ایران میں دو چار فیصد تو عورتیں ہیں جو بے پردہ ہونا چاہتی ہیں لیکن وہ نوے فیصد عورتیں نہیں ہیں جو پردے کے حق میں ہیں۔

لے آئینہ دیکھ

اصل بات یہ نہیں کہ انہیں ایران کی ان عورتوں سے کوئی دلچسپی ہے۔ ان کی اصل دلچسپی تو اسلام دشمنی سے ہے۔ اگر انہیں عورتوں کے حقوق سے کوئی غرض ہوتی تو سب سے پہلے وہ اپنی مغربی عورتوں کے حقوق کے لیے لڑائی لڑتیں۔

کیا انہیں یہ نظر نہیں آتا کہ مغرب کی لڑکی جب جوان ہوتی ہے تو اس کے والدین اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ وہ اپنی روٹی کمانے کے لئے مجبور ہوتی ہے وہ اس کے لئے انتہائی مشقت طلب کام بھی کرتی ہے اور انتہائی غیر اخلاقی حرکتیں بھی۔

اس عورت نے مشقت کے ساتھ اخلاقی یا غیر اخلاقی ذرائع سے روزی تو کمائی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد اسے اس سے زیادہ سخت مرحلہ پیش آتا ہے وہ مرحلہ ایسے مرد کی تلاش جو اس کا شریکِ زندگی بن سکے جو اس کے بچوں کا باپ بن سکے۔ بچوں کی پرورش اور تربیت کی ذمہ داریوں میں اس کا معاون ہو جو اس کو احساسِ تحفظ فراہم کر سکے جو اس کے دکھ درد کا ساتھی۔

اس معاشرے میں اول تو خاوند کا ملنا مشکل اور اگر مل جائے تو اس کے ساتھ مستقل

بشتۂ زوجیت کا قائم رہنا تقریباً ناممکن ہے۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد طلاق تقریباً یقینی
وتی ہے۔ جتنی مدت یہ رشتۂ زوجیت رہتا ہے۔ اس عرصہ میں بھی دوسری عورتوں کے
ساتھ اس مرد کے تعلقات قائم رہتے ہیں۔ یہ صورتِ حال نچلے طبقوں سے لے کر اعلیٰ
بقوں تک ہر سطح پر پائی جاتی ہے۔

اب اس مغربی عورت کی حیثیت اس سے بڑھ گئی ہے۔ خاوند تو کیا اب تو بعض حالا
سالے وقتی طور پر ایسا دوست تلاش کرنے میں دقت پیش آتی ہے جس سے وہ اپنے
سی جذبات کی تسکین کر سکے۔ مغرب کی یہ عورت اتنی بے آبرو، بے وقار اور بے وزن
بنی ہے کہ اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے بسا اوقات اُسے بھاری قیمت ادا کرنی
تی ہے۔

یہ کوئی وہم یا خیال کی بات نہیں، بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تلخی مغربی عورت محسوس
رہی ہے اور وہ اپنے معاشرے سے اس کا انتقام بھی لے رہی ہے، اس کا صرف ایک نمونہ
ھ کر آپ صحیح صورتِ حال کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

بون سے مغربی جرمنی کی خبر رساں ایجنسی نے یہ خبر نقل کی ہے کہ مغربی جرمنی کے محکمہ جاسوسی
لئے لوگوں نے انکشاف کیا کہ اس محکمے کی ایک سکریٹری مشرقی جرمنی کے لئے کام کر رہی
۔ وہ مشرقی جرمنی کے محکمۂ جاسوسی سے تعلق رکھنے والے ایک دوست کو اپنے ملک کی
ہائی اہم اور خفیہ معلومات مہیا کرتی ہے۔ یہ سکریٹری نیٹو میں کام کرتی تھی۔ وہ اسلحہ اور
نا حکمت عملی کے بارے میں نیٹو کے رازوں پر مشتمل دستاویزات اپنے مشرقی جرمنی کے
وس دوست کو مہیا کرتی تھی۔ اس عورت کو گرفتار کر لیا گیا۔ تفتیش کے دوران اس
سوال کیا گیا کہ وہ اپنے ملک کے خلاف یہ کام کیوں کرتی ہے جو کہ غداری کے مترادف
ہے اس کے جواب میں اس نے بالکل صاف کہا کہ وہ اس دوست کے عشق میں مبتلا ہو کر

اس کے ساتھ جنسی خواہش کی تسکین کے بدلے میں اسے ہر چیز دینے پر رضامند ہو گئی تھی۔

گویا مغربی عورت اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اپنی جنسی خواہش کی وقتی تسکین کے لئے وہ اپنی قوم کے ساتھ غداری کرنے پر بھی تیار ہو جاتی ہے۔ حالانکہ مذہب اور دین کے جذبات ختم کرنے کے ساتھ وہاں قوم کو خدا بنا کر اس کی پرستش اور اس کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کے جذبات پیدا کئے گئے تھے۔

یہ ہے اس وقت مغربی عورت کی بے بسی اور محرومی اور یہ ہے اس کا مقام اور احترام کیا بہتر نہیں کہ جان پال سارتر کی معشوقہ سیمون دو بوخوار اور حقوق نسواں کے لئے اس کی قائم کردہ عالمی کمیٹی اداکارہ اور طوائف عورتیں ایرانی خواتین کے حقوق کے لئے جنگ لڑنے سے پہلے مغرب کی اس ستم رسیدہ، بے بس اور مظلوم عورت کی عزت و آبرو اور وقار کی بحالی کے لئے جدوجہد کریں۔ لیکن حقیقت میں یہ مسئلہ عورت کے حقوق اور مقام کے جدوجہد کا نہیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں کی اقدار اور روایات کے ساتھ ان کے بغض، کینہ اور دشمنی کا ہے۔ (ماخوذ از زندگی لاہور)

قانون قانون ہے:۔ پاکستان سے واپسی کے بعد مسٹر خوشونت سنگھ نے انگریزی ہفتہ وار نئی دہلی میں پاکستان کے حالات پر تبصرہ کیا ہے۔ مسٹر بھٹو کی سزائے موت سے پہلے وہ پاکستان پہنچے تھے اور اتفاق سے پھانسی کے دن پاکستان ہی میں تھے وہ لکھتے ہیں کہ لاہور کے ہوائی اڈے پر جس تجربے سے میں دوچار ہوا وہ زبان حال سے اس ماحول کی غمازی کر رہا تھا جو پاکستان پر چھایا ہوا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جس کے ایک ہفتہ کے دوران مسٹر بھٹو کو پھانسی دے دی گئی، بھٹو نے جو بھی کارنامے انجام دئے ہوں جو بحث کے موضوع بنے ہوئے ہوں ان کو پھانسی دیئے جانے کے جو بھی نتائج برآمد ہوں ان کو پھانسی دینا ایک ضروری امر تھا، کیونکہ کوئی بھی شخص قانون سے بالاتر نہیں اور قانون کی نظر میں وہ قتل کے مجرم تھے۔

کیا ہماری آنکھیں کھول دینے کے لئے ایک ایسے صحافی کا تجربہ کافی نہیں ہے جو مسز گاندھی اور بھٹو کی شخصیت اور زندگی

میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

ابو الغزالی

شاعر نے شائد ایسے ہی موقع پر کہا ہو جو اس وقت جماعت اسلامی ہند پر آیا ہوا ہے، اور ہندوستان میں جماعت اسلامی نشانہ بنی ہوئی ہے۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

کچھ دنوں پہلے آر۔ ایس۔ ایس کا تماشہ کھڑا کیا گیا اور وہ لوگ جن کا کردار کبھی بھی غیر مشتبہ نہیں رہا، چیخ چیخ کر یہ کہتے رہے کہ جماعت اسلامی آر۔ ایس۔ ایس سے کوئی سمجھوتہ کر چکی ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ اس سمجھوتے کے پیچھے دنیاوی اغراض و مفاد ہے اور اب مرحوم بھٹو صاحب کی پھانسی کا مسئلہ ہی شور و غوغا سے اٹھایا گیا ہے اور جماعت اسلامی ہند کو مجرموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا گیا ہے۔ گویا حکومت پاکستان نے نہیں جماعت اسلامی ہند نے انھیں پھانسی دی ہو اسی کو کہتے ہیں۔ ؏ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

سابق وزیر اعظم پاکستان مسٹر بھٹو کی پھانسی کا حادثہ اور اس پر ہندوستانی مسلمانوں کا ردِ عمل ان کی تاریخ کا عجوبہ ہے۔ ایک ایسی ملت جو پچھلے ۳۲ برسوں سے اپنے ملک میں شدید حالات پیچیدہ مسائل جان و مال کے خطرات، معاشی ابتری، معاشرتی پسماندگی، تعلیمی پستی اور سیاسی نابرابری کا شکار ہو۔ اُسے اپنے بُرے بھلے کا کوئی ہوش نہیں۔ اپنے پڑوسی ملک کے خالص اندرونی واقعہ پر اپنے جس شدید ردِ عمل کا اظہار کیا ہے وہ اس کی بے شعوری، بے بصیرتی اور اپنے دنیا کے حالات و واقعات سے بے خبری کا آئینہ دار ہے آج کی دنیا خواہ کتنی ہی بین الاقوامی

ہو۔ ہم اپنے ملک کے احوال و واقعات سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ اپنے پڑوسی ملک سے خواہ کتنے ہی تاریخی اور جذباتی رشتے رہے ہوں یا موجود ہوں اس کا اس طرح غیر دانشمندانہ جذباتی اظہار، کسی اصولی ملت کو زیب نہیں دیتا۔ ہم نے بھٹو مرحوم کے حادثہ پر جس غم و غصہ، جلسے جلوس، نعروں اور اپنے ملک کی جمہوری فضا سے فائدہ اٹھاکر توڑ پھوڑ، آتش زنی کے ذریعہ سے اپنے ذہنی و قلبی تعلق کا جس طرح مظاہرہ کیا ہے وہ برادران وطن کے نزدیک اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ اس ملت کو اپنے ملک کے احوال و مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں اور خود اپنی فکر بھی نہیں جس کا اظہار ملک کے ہندی و انگریزی اخبارات نے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے اور ہمیں آئینہ دکھلایا ہے کہ دیکھو یہ ہے تمہاری تصویر اور ہماری عظیم اکثریت کو اس کا ہوش نہیں۔ بات یہ ہے کہ "در زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم" کے ہم مصداق ہیں۔ اور ہماری ملت کی عظیم اکثریت تیسرے درجہ کی کاروباری اور مفاد پرست اردو صحافت کا شکار ہے وہ یہ نہیں جانتی کہ نیشنل پریس اس مسئلہ کو کس نظر سے دیکھتا ہے ہمارے ملک کے سنجیدہ صحافت و سیاست نے اس واقعہ کو کس زاویہ سے دیکھا ہے ؟ حکومت کا رویہ کیا ہے ؟

حقیقت یہ ہے کہ اس المناک واقعہ کے پیچھے ہماری ملت کی بے خبری اور سادہ لوحی سے زیادہ اردو صحافت کی بے ضمیری اور بے دانشی کو دخل ہے۔ اگر آپ گذشتہ چند مہینوں کے کچھ اردو اخبارات اٹھاکر دیکھیں اور پٹنہ، کلکتہ، دہلی کے اردو روزناموں کو پڑھیں تو ایسا محسوس ہوگا کہ یہ اخبارات دہلی، بمبئی، پٹنہ یا کلکتہ سے نہیں شائع ہو رہے ہیں بلکہ لاہور اور کراچی کے اخبارات ہیں خبروں سے لے کر تبصرے اور اداریے تک پاکستان کے احوال و مسائل سے بھرے پڑے ہیں اور ساتھ ہی جھوٹ، بہتان اور الزام تراشی کے اعلیٰ نمونہ ہیں جس میں ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی سے کھلواڑ کی عبرتناک تصویر نظر آئے گی۔ ان بے ضمیر صحافیوں نے اپنی خودغرضانہ اور تاجرانہ سیاست و صحافت کے لئے مسلمانان ہند کی زندگیوں کا بیچ سودا کرلیا ہو

کیونسٹ سرخوں اور اندرا کانگریس کے ایجنٹوں نے مسلم سماج میں گھس کر ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کو اپنی سیاست کے لئے جس طرح استعمال کیا اور کر رہے ہیں، وہ اس ملت کے لئے افسوسناک بھی ہے اور عبرتناک بھی! ان سیاسی شعبدہ بازوں کے لئے ہماری یہ ملت خام مال کہ اسے جہاں چاہیں استعمال کریں اور یہ بھیڑ بکریوں کا ایسا ریوڑ ہے کہ جسے جو چاہے ہنکا کر لے جائے اور جس قربان گاہ پر چاہے جاکر بھینٹ چڑھا دے۔ مسلم سماج کی فطری کمزوری، جذباتی بیماری اور غیر دینی مزاج سے فائدہ اٹھا کر ان سرخوں اور اندرا جی کے ایجنٹوں نے جھوٹ، الزام اور بہتان تراشی کا ایسا طوفان اُٹھایا کہ ہماری یہ ملت اس طوفان میں بہہ گئی اور اپنے ہاتھوں اپنا ہاتھ کاٹنے لگی۔ کروڑوں کے سرمایہ کو جو خود اس ملت کا اپنا سرمایہ تھا برباد کیا، اپنے دفاتر، اپنی لائبریریاں جلائیں۔ حد تو یہ ہے کہ اپنی عظیم کتاب، کتاب ہدایت قرآن مجید کو پھاڑا اور آگ لگایا۔ کتنا عبرت انگیز یہ واقعہ ہے کہ جب کشمیر کے ایک گاؤں میں مسلمان کے ایک گھر پر مسلمانوں کے ایک مشتعل ہجوم نے حملہ کیا تو اہل خانہ کو تو مارا پیٹا ہی، گھر کے اسلامی اساسہ کو آگ لگا دی یہاں تک کہ اللہ کی کتاب قرآن مجید کے اوراق پھاڑ کر زمین پر بکھیر دئے۔ جب جذبات سے مغلوب یہ گروہ چلا گیا تو اس گھر کا ایک ہندو پڑوسی جو یہ تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اپنے گھر سے ایک دھلی ہوئی چادر لایا اسے زمین پر بچھایا بکھرے ہوئے قرآن مجید کے اوراقِ پریشان کو چُنا اور چادر میں رکھا اور سب کو لپیٹ کر ایک درخت پر ادب و احترام سے رکھدیا اور ایک دوسرے مسلمان کے پاس جاکر کہا کہ یہ تمہارا قرآن ہے جو میں نے درخت پر اُٹھا کر رکھدیا ہے اسے اٹھا لو۔ کیسی عبرت ہے اس واقعہ میں! یہ سارے حادثے ہماری بے خبری اور دین سے دوری کی علامت ہیں، اور ان میں اس اُمت مسلمہ کے لئے غور و فکر اور عبرت و نصیحت کا سامان ہے اور ملک کے وہ تمام علمائے دین جو دین و ملت کا درد رکھتے ہیں اور۔ اپنے دائرے میں دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں ان سے اپیل ہے

دانشوروں اور صاحب بصیرت افراد و اشخاص کے لئے یہ ایک تازیانہ ہے مگر اب بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلیں اور وہ دن دور نہیں کہ مساجد میں خطبے پڑھے جاتے رہیں گے۔ مدارس میں۔ قال اللہ اور قال الرسول کی آوازیں گونجتی رہیں گی، ہمارے اہلِ دین، دین کی راہ میں دوڑتے اور دین پر محنت کرتے رہیں گے اور کسی وقت اچانک اس پوری ملتِ مسلمہ کو دین دشمن اور ملت فروش عناصر اُچک لے جائیں گے اور ان کو اپنے سیاسی مقاصد، ذاتی مفاد کی قربان گاہ پر لے جاکر بھینٹ چڑھادیں گے اور ہم بعد میں افسوس کرتے اور ہاتھ ملتے رہ جائیں گے اگر اب بھی ہمارے دینی علماء اور اہل دین دانشوروں اور صاحب بصیرت افراد و اشخاص کی آنکھیں کھل جائیں تو ہم سمجھیں گے کہ اس شر سے بڑا یہ "خیر" وجود میں آیا ہے اور انشاء اللہ یہ تازیانہ ہماری سادہ لوح اور معصوم ملت کے لئے بہت کچھ کھو کر بھی "اپنی حقیقت" کو پالینے اور چیزوں کو پہچان لینے کا ایک تلخ اور ناگوار سانحہ ثابت ہوگا ایک ایسا سانحہ جو آیا اور گذر گیا جو ہمارے لئے اور ہماری آئندہ نسلوں کے لئے، سامانِ عبرت بن گیا۔

اب اصل مسئلہ کی اس حقیقت کی طرف آئیے کہ پاکستان کے سابق وزیراعظم مسٹر بھٹو کی پھانسی سے ہندوستان کی جماعتِ اسلامی سے کیا تعلق تھا یہ پھانسی جائز تھی یا ناجائز، یہ قتل سیاسی تھا یا قانونی؟ ان باتوں کو پاکستان کے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے فیصلوں کو پڑھ کر قانون داں اور باشعور حضرات سمجھیں۔ اتنی بات تو ملک کا ہر عامی و ہر عالم جانتا اور مانتا ہے کہ دوسرے ملک کے واقعہ سے یہاں کی جماعت کا نہ کوئی ربط ہے اور نہ تعلق! وہ پاکستان کا خالص اندرونی مسئلہ اور قانونی مقدمہ تھا جس کی ذمہ داری تمام تر وہاں کی حکومت عدالت اور عوام کے سر آتی ہے۔ برِعظیم ہند وپاک کی سیاست کا ہر ایک طالب علم اس سادہ سی حقیقت کو جانتا ہے کہ جب ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا تو اس جغرافیائی تقسیم کے ساتھ ملت اسلامیہ کی فکری عملی سیاسی، جماعتی تقسیم عمل میں آئی۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ جس نے پاکستان

حاصل کیا وہ بھی دو حصوں میں بٹ گئی۔ انڈین مسلم لیگ ہندوستان میں نام کی اور اس کی پالیسی اور پروگرام تک بدل گئے۔ جمعیۃ علماء ہند، مسلمانوں کی دوسری بڑی جماعت تھی۔ پاکستان میں جمعیۃ علمائے اسلام ہو گئی۔ سنی جمعیت علماء جو بریلوی فکر کے علماء اور خانقاہوں کے صوفیہ کی جماعت تھی۔ پاکستان میں جمعیت علماء پاکستان کہلانے لگی۔ خان عبدالغفار خاں کے صاحبزادے خان عبدالولی خاں نے، جن کے اثرات پاکستان کے دو صوبے سرحد اور بلوچستان میں سب سے زیادہ تھے۔ نیشنل عوامی پارٹی بنائی۔ کشمیر کی مسلم کانفرنس جو نیشنل کانفرنس کی مدِمقابل تھی، مقبوضہ کشمیر پاکستان کی واحد مسلم کانفرنس رہ گئی۔ ٹھیک اسی طرح ہندوستان کی جماعتِ اسلامی، جماعتِ اسلامی پاکستان اور جماعتِ اسلامی ہند کے نام سے علیحدہ علیحدہ اپنے ملکوں میں اپنی اپنی پالیسی اور پروگرام کے تحت کام کرنے لگی۔ ہندوستان و پاکستان کی ان تمام جماعتوں کے نام کی یکسانیت کے باوجود ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رہا، سب اپنے اپنے ملک میں اپنے حالات و مسائل کو سامنے رکھ کر اپنی پالیسی اور پروگرام مرتب کر اور کام کرتے رہے۔

پھر آپ اس حقیقت کی طرف آئیے کہ بھٹو مرحوم کی سیاست کی ابتدا جنرل ایوب خاں کے دور سے ہوئی ان کے دورِ حکومت میں وہ وزیرِ خارجہ رہے۔ کشمیر کے مسئلے پر ہندوستان کے ساتھ جنگ ہوئی، آخر معاہدۂ "تاشقند" وجود میں آیا اور بھٹو صاحب نے جنرل ایوب خاں کے خلاف جمہوریت کی تحریک چلائی جس میں پاکستان کی سبھی سیاسی پارٹیاں شریک تھیں۔ اس تحریک کے نتیجہ میں ایوب خاں اقتدار جنرل یحییٰ خاں کے سپرد کر کے خود میدان سے ہٹ گئے۔ یحییٰ خاں کے دورِ حکومت میں انتخاب عمل میں آیا۔ بھٹو صاحب کی طالع آزمائی مغربی پاکستان کے اُفقِ سیاست پر اُبھری اور مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کو کامیابی حاصل ہوئی۔ پارلیمانی جمہوریت کے اصول پر شیخ مجیب الرحمٰن کو ملک کا وزیرِ اعظم ہونا تھا۔

جس کی بھٹو صاحب نے شدید مخالفت کی اور ایک ملک میں دو وزیراعظم کی تھیوری پیش کی، ا
قومی اسمبلی کا اجلاس جو ڈھاکہ میں ہونا طے پایا تھا اس کی مخالفت میں بھٹو صاحب نے فرمایا کہ
پاکستان سے جو بھی ڈھاکہ جائے گا اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ دو وزیراعظم کا نظریہ ا
اس فرمان نے پاکستان کی قسمت ہی بدل کر رکھ دی پھر سیاست کی پُر پیچ وادیوں اور جنر
ٹکاخان کے فوجی آپریشن کے نتیجہ میں آگ وخون کے دریا سے گزر کر بنگلہ دیش وجود میں آ
لاکھوں انسان اس حادثہ کے شکار ہوئے، ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔ بچے کھچے مغربی پاک
کے اقتدار سے بھٹو صاحب تنہا مالک بن بیٹھے پھر ۱۷ء سے ۷۷ء تک بھٹو صاحب
دورِ اقتدار کی حقیقت ان پاکستانیوں سے پوچھئے جو آج بھی اپنے اعزہ واقربا سے
اس ملک کے مختلف شہروں اور گھروں میں آتے رہتے ہیں۔ گھر والوں کی گواہی زیادہ معتبر
انھوں نے اپنے دورِ اقتدار میں اگر کچھ اچھے کام کئے۔ جیسے ملک کو ایک جمہوری اسلامی دست
بخشا۔ اپنی شکست خوردہ قوم میں حوصلہ پیدا کیا۔ شملہ معاہدہ کر کے اپنے قیدی اور زمین وا
لئے۔ لیکن انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں جو دوسرے کارنامے انجام دیے اس کی فہرست
طولانی ہے۔ سیاسی قتل کی داستانیں ان سے منسوب ہیں۔ بلوچستان اور سرحد کی منتخبہ حکو
کو ختم کرنا، مہاجر اور سندھی باشندوں میں تلخی پیدا کرنا، فیڈرل اور سیکوریٹی فورس
ذریعہ اپنے سیاسی حریفوں کی زندگی اجیرن کر دینا ایسے واقعات ہیں جو ان سے منسوب
جاتے ہیں۔ ان کے دورِ حکومت کی تلخی اس حد تک پہنچی کہ ۷۷ء میں پاکستان کے عوام پاکست
قومی اتحاد کے جھنڈے تلے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ملک کی تمام سیاسی جماعتیں متحد ہو
اس میں ملک کی سب سے بڑی تنظیم مسلم لیگ بھی تھی جس کے سربراہ پیر و پگارڈ جیسے رہنما تھے
جمعیۃ علماء اسلام بھی، سنی جمعیۃ علماء اور خانقاہوں کے بزرگ رہنما مولانا شاہ احمد نورا
بھی تھے پاکستان کے مشہور سیاستداں چودھری محمد علی کی پارٹی پاکستان جمہوری پارٹ

اور اس کے نمائندے نواب زادہ نصر اللہ خان بھی تھے نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ خان عبدالولی خان، کشمیر کی مسلم کانفرنس اور جماعتِ اسلامی پاکستان بھی تھی۔ اس طرح نو جماعتوں کے اتحاد نے بھٹو صاحب کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور اس قومی اتحاد کے سربراہ حضرت مولانا مفتی محمود ہیں جو جمعیۃ علماءِ اسلام کے نمائندہ اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ اور مرید ہیں۔ قومی اتحاد نے انہیں کی رہنمائی اور سربراہی میں جنرل ضیاء الحق کی حکومت سے تعاون کیا اس پس منظر میں جو کچھ بھی ہوا وہ پاکستان کا اندرونی مسئلہ تھا اس سے ہندوستان کی کسی جماعت کا کوئی تعلق نہ تھا۔

کسی مسلمان بھائی کے حق میں دعائے مغفرت کرنا ہر مسلمان کے لئے پسندیدہ ہے خود پاکستان میں بھی بھٹو مرحوم کے پھانسی دینے کے حق میں رہنے والے بھی ان کے لئے دعائے مغفرت کرنے میں برابر شریک ہوں گے اور یہ دعائے مغفرت اگر ہندوستانی مسلمان اپنے طور پر کریں تو کوئی برائی نہیں ہے بلکہ ایک دینی عمل ہے لیکن اس حقیقت سے ہٹ کر یہ سوچئے کہ پاکستان کے اس واقعہ کو ہندوستان میں اشتعال کا سبب بنانا اور تمام جماعتوں سے ہٹ کر ہندوستان کی جماعتِ اسلامی کو ہدفِ ملامت بنانا اور اس کے افراد کے خلاف جھوٹے اشتعال انگیز بہتان تراشی کرنا اور کشمیر سے راس کماری تک اور دہلی سے بنگال تک یکساں جھوٹا پروپیگنڈہ کرنا کہ جماعتِ اسلامی والوں نے بھٹو مرحوم کی پھانسی کی خوشی میں شیرینی تقسیم کی ہے ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا جس کی سازش صیہونی طاقتوں، کمیونسٹوں اور کانگریس کے ایجنٹوں نے مل کر تیار کی تھی اس لئے کہ ہندوستان میں دین کے احیاء اور ملتِ مسلمہ کی بقا کی جو منظم کوشش جماعتِ اسلامی ہند انجام دے رہی ہے یہ طاقتیں ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتی ہیں ہماری ملت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اور بیجا اشتعال دلا کر ان کے ہاتھوں وہ کام انجام دیا جو کھلا دشمن بھی نہیں کر سکتا تھا اپنوں اور غیروں کے سامنے اس پوری ملت کا سر ندامت سے جھکا ہوا ہے

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر بھٹو صاحب کی پھانسی ایک ظلم تھا تو اس ظلم کا ارتکاب جنرل ضیاء الحق کی حکومت عدلیہ اور پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں سے ہوا تھا۔ اس کا انتقام آخر جماعت اسلامی ہند سے کیوں؟ ہندوستان کی اور دوسری جماعتیں بریلوی، دیوبندی علماء، خانقاہوں کے سجادگان اور دوسری سیاسی جماعتیں کیوں نہیں، وہاں بھٹو صاحب کے معاملہ میں تو سب متفق تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سامنے کی باتیں تھیں مگر ہمارے سادہ لوح مسلم عوام کی آنکھوں پر اردو اخبارات اور مسلم سماج کے اندر گھسے ہوئے گرگوں نے جھوٹ اور بہتان تراشی کی سیاہ پٹی باندھ دی تھی۔ ان کا مقصد ہندوستان میں مسلمانوں کے درمیان جماعتِ اسلامی ہند کو مغضوب و مطعون کرنا تھا تاکہ اس ملک میں ہوا کے تند و تیز ہونے کے باوجود جو جماعت دین کا چراغ جلائے بیٹھی ہے اسے بجھا دیا جائے اور اس اُمتِ مسلمہ کے اندر دینی شعور پیدا کرنے اور انھیں اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی جو کوشش گذشتہ تیس برسوں سے یہ جماعت انجام دے رہی ہے وہ ختم ہو جائے، پاکستان تباہ ہو، وہ اسلام کی تجربہ گاہ نہ بن سکے۔ ان کی دلچسپی اسی سے ہے اپنے ان ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لئے ملت کی جذباتی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر جماعتِ اسلامی ہند کو ہدف ملامت بنانا دراصل جماعت کی دین پسندی اور ملت دوستی کا انتقام لینا تھا۔

یہ بات بڑے اچنبھے اور غور و فکر کی ہے کہ وہ جماعت جس نے گذشتہ تیس برسوں سے سخت جاں حالات میں مسلمانوں کے درمیان، دین اور خدمتِ خلق کے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے ہوں۔ یہ نیم فاقہ کش، درویشوں کی جماعت جس نے بے انتہا ایثار اور اخلاص کے ساتھ دینی خدمات اور لوگوں میں بھلائی کے کام انجام دئے ہیں۔

ملک کی تقریباً تمام ہی علاقائی زبانوں، تلگو، ٹامل، ملیالم، گجراتی، بنگلہ، ہندی اور انگریزی زبانوں میں قرآن مجید کے قابلِ اعتماد تراجم، احادیث کے مجموعے اور اسلامی موضوعات پر

دشت کر مقابلہ کیا اور جسم و جان کی ساری توانائیاں
اسی مقصدِ عظیم میں کھپا دیں اور بس یہی آرزو رہی
کہ اللہ تعالیٰ میری سعی اور میری تگ و دو کو قبول
فرمائے اور میری لغزشوں اور کوتاہیوں سے
صرفِ نظر کرے۔ حق کے راستے پر چلنے کے
سارے ہی عواقب و نتائج اُن کے سامنے
تھے۔ چنانچہ اُن کی تحریروں اور اُن کی تقریروں
میں واضح اشارے اور نقشے ملتے ہیں۔ ایک
موقع پر اُن کے الفاظ یہ تھے:

"حق کے متعلق یہ بات اچھی طرح سمجھ
لیجئے کہ وہ بجائے خود حق ہے۔ وہ ایسی مستقل
قدر کا نام ہے جو سراسر صحیح اور صادق ہے
تمام دنیا اس سے منحرف ہو جائے تب بھی وہ
حق ہی ہے۔ مصائب حق پر نہیں اہلِ حق پر
ہیں لیکن جو لوگ سوچ سمجھ کر کامل قلبی
اطمینان کے ساتھ یہ فیصلہ کر چکے ہوں کہ انہیں
حق ہی پر قائم رہنا ہے اور اسی کا بول
بالا کرنے کے لئے اپنا سارا سرمایۂ حیات لگانا
ہے وہ مصائب میں مبتلا ضرور ہوتے
ہیں ناکام کبھی نہیں ہو سکتے۔"

مولانا کو اپنے مقصد کی سچائی اللہ تعالیٰ کی
تائید و حمایت اور حق و صداقت پر قائم رہنے
والوں کی کامیابی پر اس قدر پختہ یقین تھا
کہ بدترین حالات میں بھی وہ گھبراتے نہ تھے
کیا کیا وقت نہیں گزرا اُن پر۔ حکومت
شدید مخالف عوام سخت برہم اور حق پرستوں
کی مٹھی بھر جماعت۔ راہ چلتے تو لوگ کاٹنے
کو دوڑتے۔ یہ عہد طویل تر تھا مگر [illegible] یہی
فرماتے رہے کہ ہم حق پر ہیں اور ایک دن
قوم اپنی غلطی محسوس کرے گی۔ حق کے لئے
یہ استقامت دامنِ رسولؐ کے وابستگان
ہی میں پیدا ہو سکتی ہے۔

*

سیرتِ رسولؐ میں رزقِ حلال، حمیت
اور عزتِ نفس کو غیر معمولی مقام حاصل ہے
مولانا نے اپنی زندگی میں ان تینوں باتوں
کا خاص طور پر خیال فرمایا۔ وہ تاریخ کے حوالے
سے اس حقیقت تک پہنچ گئے تھے کہ دعوتِ حق
وہی شخص لے کر اُٹھ سکتا ہے اور اسے آبرومندی
سے آگے بڑھا سکتا ہے جس کے پاس جائز ذرائع

ایران کے کچھ درونِ پردہ واقعات

سندھ کے امیر جماعتِ اسلامی مولانا جان محمد عباسی جو مسٹر بھٹو کے خلاف ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں کھڑے ہوئے تھے اور جنہیں مرحوم کی فیڈرل پولیس نے اغوا کر کے کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔ حال ہی میں ایران کے دورے پر گئے تھے۔ ان کے مشاہدے کے کچھ حصے ان کے ہمراہی ڈاکٹر مراد علی شاہ نے بیان کئے۔

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ انقلاب کے بعد حکومت کے دفاتر خالی ہو چکے ہیں۔ اکثر و بیشتر سرکاری کارندے احتساب کے خوف سے فرار ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر ابراہیم یزدی جو وزیر خارجہ ایران بن چکے ہیں جس عمارت میں کام کرتے تھے وہ گیارہ منزلہ تھی۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہ اس گیارہ منزلہ عمارت کی صرف تین منزلوں میں کچھ دفاتر کام کر رہے تھے بقیہ آٹھ منزلیں بالکل خالی پڑی تھیں۔

ایران میں مولانا عباسی کے دورہ تک ملکی نظم و امن ابھی تک بحال نہیں ہو سکا تھا پولیس کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ پولیس کا سارا کام انقلابی رضا کار ہی انجام دیتے تھے۔

شاہِ ایران کی فوج عوام پر اتنی سنگدلی کے ساتھ گولیاں کیوں برساتی تھی۔؟ ڈاکٹر مراد علی شاہ نے بتایا کہ شاہ نے فوج میں زیادہ تر بہائی اور یہودی بھرتی کر رکھے تھے بہائی ایران میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو پاکستان میں قادیانی رکھتے ہیں ڈاکٹر ابراہیم [illegible]

بھی بہائی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ موت کے گھاٹ اُتارے جانے کے باوجود اس کی لاش کو دفنانے کے لئے کوئی جگہ نہیں ملی۔ مسلمان کسی بہائی کو اپنے قبرستان میں دفن ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ امیر عباس کی لاش ابھی تک مُردہ خانے میں پڑی تھی۔

زاہدان میں اکثریتی باشندے سُنی ہیں مولانا عباسی جب دورۂ ایران میں زاہدان پہنچے تو گورنر ایران نے ان کے اعزاز میں زاہدان کے علماء کو بُلایا۔ ڈاکٹر مراد علی شاہ کہتے ہیں کہ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ زاہدان کے بیشتر علماء میں زیادہ تر مولانا عباسی صاحب کے والد محترم کے شاگرد تھے۔ یہ سب لوگ عباسی صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، اور دوسرے لوگوں کے لئے بھی یہ واقعہ موجبِ حیرت بنا۔ علاقہ زاہدان کے لوگ شوقِ تعلیم میں زیادہ تر اپنے قریبی علاقہ بلوچستان اور سندھ ہی سے رجوع کرتے ہیں۔ چونکہ بلوچستان میں کوئی ایسا اعلیٰ دینی مدرسہ نہیں اس لئے وہ سندھ آجاتے ہیں۔ ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد ٹی وی سے عورت بالکل ہی غائب ہوگئی ہے۔ گھنٹوں پروگرام چلتا ہے لیکن شاذ ہی کوئی عورت دیکھنے میں آئی ہے۔

انقلابی عدالتوں کی پوری کارروائی ٹی وی پر دکھائی جاتی ہے۔ عوام جرنلوں اور افسروں کو سزائے موت دیئے جانے پر پوری طرح سے مطمئن ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انھیں سزا نہ دی جاتی تو عوام انھیں خود پکڑ کر سولی پر کھینچ دیتے۔ ان میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں جس کا ہاتھ بے گناہوں کے خون سے رنگا ہوا نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ شاہ ایران کے خلاف تحریک میں کم از کم پچاس ہزار افراد موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ ایران کا شاید ہی کوئی گھر ہو جس کا کوئی نہ کوئی فرد شاہ کے مظالم سے متاثر یا اس تحریک میں کام نہ آیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ ایران کے خلاف تحریک صحیح معنوں میں ہمہ گیر اور قومی تحریک تھی۔ بہشت زہرہ جس میں یہ شہداء دفن ہیں ہر وقت سوگواروں سے بھرا رہتا ہے ان سوگواروں میں عورتیں بھی ہوتی ہیں اور

اسلامی شعور بیدار کرنے والی بے مثل کتابیں

از ـ مائل خیرآبادی

ہمارے بزرگ اول	۱/۶۵	ہمارے بزرگ دوم	۱/۶۵	نماز کیسے پڑھیں (ہندی)	۱/۰۰
اندیشوں کے گرفتار	۲/۳۰	بہت خوب	۰/۶۰	دودھ کا پوت	۰/۵۰
امانت کا بوجھ ۲/۰ ہم ایسے نہیں	۲/۰	جنت اسلام	۱/۸۰	دانا حکیم ۱/۰ ہیرے کا جگر	۵/۰
ایک شعر ایک کہانی	۰/۵۰	بڑوں کی مائیں	۰/۵۰	دانا حکیم کی دانا بیٹی	۰/۴۰
اچھی اچھی مزیدار باتیں	۰/۵۰	بشریٰ کے خطوط	۱/۰	دو انسان ایک کردار	۲/۰
اسلامی تہذیب اور آداب	۱/۰	تربیتی کہانیاں اول	۰/۵۰	تالونسے قتل کے بعد	۰/۴۰
امرود بادشاہ	۰/۶۰	〃 〃 دوم	۰/۵۰	زبان کا زخم	۰/۵۰
ابن بطوطہ کا بیٹا	۲/۵۰	〃 〃 سوم	۰/۵۰	سچے افسانے	۲/۰
اچھی نظمیں اول	۰/۵۰	〃 〃 چہارم	۰/۵۰	شہزادہ توحید	۱/۰
〃 〃 دوم	۰/۴۰	ترکستان سے ترکی تک	۱/۰	طویلے کی بلا	۲/۵۰
اب تک یاد ہے	۲/۰	چینی گڑیاں ۰/۶۰ پھولوں کی پتی	۱/۰	فیصلے ۰/۶۰ ہمارا ابن بطوطہ	۱/۰
اچھے افسانے	۲/۰	پیارے نبی ایسے تھے	۰/۶۰	۹۹ قتل کے بعد	۰/۶۰
ایک انسان دو کردار	۰/۵۰	جنتی بچہ ۰/۲۵ جانباز ساتھی	۱/۰	قرآن میں عورت کی حیثیت	۵/۰
احساس ابھرتا ہے		حضرت عمر ثانی	۱/۳۰	گڈو کی گڑیا ۰/۴۰ [illegible]	۱/۰
بڑوں کا بچپن	۰/۶۵	خواتین کے دلوں کی باتیں	۲/۵۰	گڑیا کا وعظ	۰/۴۰
بیوقوف کی تلاش	۰/۶۰	خانہ آبادی	۰/۸۰	نقلی شہزادہ	۰/۳۰
بدنصیب	۱/۳۰	خدیجۃ الکبریٰ	۰/۵۰	مہمان ترکچہ ۰/۴۰ مرحلے	۲/۰
بنت حوا ۱/۰ تعلیمند	۱/۰			[illegible] فرشتے ۰/۵۰ [illegible]	۱/۰

مرکزی مکتبہ اسلامی

اوہام شکن نمبر

اوہام شکن نمبر جس کے متعلق ایک سال پہلے ہی ارادہ کر لیا تھا۔ الحمد للہ اب کتابت کے آخری مراحل میں ہے۔ اس کی ترتیب کے لئے مضامین پر غور کیا جانے لگا اور اس کی تیاری کے لئے مطالعہ کیا گیا تو حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ معلوم ہوا کہ اوہام کے سلسلے میں ہر شخص مبتلے دارد۔ پچھلے سال رسم ورواج نمبر کے سلسلے میں ہم نے بتایا تھا کہ رسم ورواج کی تعداد اتنی ہے جتنے دنیا میں گھر ہیں۔ اوہام کے بارے میں معلوم ہوا کہ دنیا میں جتنے انسان بستے ہیں اتنے اوہام ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی مجموعے میں ان سارے اوہام کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ تو سوچا گیا کہ شروع میں ایک جامع مضمون اوہام کے عنوان سے آنا چاہیے۔ الحمد للہ قرآن وحدیث کی روشنی میں یہ کام بھی ہو گیا اب صرف کتابت اور طباعت کا مرحلہ سامنے ہے۔ ان شاء اللہ یہ مرحلہ بھی گذر جائے گا۔ اور **اوہام شکن نمبر** نومبر ۱۹۷۹ء میں آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ کاغذ کی گرانی کے باوجود اللہ نے چاہا تو قیمت -/6 ہی ہوگی۔ ستمبر کے شمارے میں اوہام شکن نمبر کے مضامین اور لکھنے والوں کا تعارف ملاحظہ فرمائیے گا اس سے آپ کو اس کے مضامین کی افادیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

"منیجر"

برہان

ستمبر ۱۹۷۶ء | شوال ۱۳۹۶ھ

جلد [illegible] | شمارہ [illegible]

قیمت 3/- | سالانہ 26/- | V.P سے 30/-

ایڈیٹر [illegible]

اس دائرہ میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ نے برہان کے لئے چندہ تعاون عنایت فرمایا تھا اس کی مدت اس پرچہ کے ساتھ ختم ہوگئی آئندہ کے لئے براہ کرم جلد چندہ تعاون مرحمت فرمائیں

مکتبہ برہان

در پردہ حجاب

اداریہ

ایمانیات

مقالات ومضامین

افسانے اور کہانیاں

مکتوبات

حجاب کی نظر میں

منظومات

ہمارا گھر

ترانے

متفرقات

دلیلِ حق

گلوں میں رنگت کہاں سے آئی یہ نغمۂ شکبار کیا ہے
کلی کے لب پر ہے کیوں تبسم یہ مسکراتی بہار کیا ہے
کہاں سے چشمے اُبل رہے ہیں یہ منتظر کوہسار کیا ہے
ہوائیں کیا گنگنا رہی ہیں یہ نغمۂ آبشار کیا ہے
یہ برگ کیا ہے یہ بار کیا ہے یہ پھول کیا ہے یہ خار کیا ہے
شجر پہ کس نے یہ پھل سجائے جھکی ہوئی شاخسار کیا ہے
یہ صبح کیا ہے یہ شام کیا ہے یہ لیل کیا ہے نہار کیا ہے
بدلتا ہے کون موسموں کو یہ گردشِ روزگار کیا ہے
یہ آسمان اور اسکے اوپر یہ کہکشاں کی قطار کیا ہے
یہ ماہِ تاباں کہاں سے آیا یہ مہرِ زریں نگار کیا ہے
یہ چاندنی کا حسین منظر یہ نور کی رہگزار کیا ہے
یہ گنبدِ نیلی فام کیا ہے بلندیوں کا وقار کیا ہے
یہ مست بادِ سحر کے جھونکے یہ پپیہے کا خمار کیا ہے
کبھی جو فرصت ملے تو سوچو بھلا یہ معمار کیا ہے

(باقی احمد پوری۔ کویت)

• شائستہ تبسم

دعاؤں کا اپنی اثر دیکھ لیتی! مدینے کے شام و سحر دیکھ لیتی
ضیا بار جس کے ذرّوں میں خورشید سی ہیں ایسی زمیں اک نظر دیکھ لیتی
ہو دیدار سے جس کے ایمان تازہ خدا کا مقدس وہ گھر دیکھ لیتی
جہاں ایک سجدہ ہزاروں پہ بھاری میں کعبہ کے وہ بام و در دیکھ لیتی

نہ ہوتی ہوس اور کچھ دیکھنے کی!
میں شائستہ طیبہ اگر دیکھ لیتی!

غزلیں

(راشن انصاری پرتاپگڑھ)

ابھی ہیں اور بھی کتنے صنم کسے معلوم ابھی اٹھائیں گے کتنے ستم کسے معلوم
یہ مت کہو کہ ہیں منزل کے پاس ہم ورنہ اُٹھے اُٹھے نہ اُٹھے پھر قدم کسے معلوم
مری خودی تری خاطر ہے صنم خانہ میں رہے رہے نہ رہے پھر بھرم کسے معلوم
تری تلاش میں ہم سالکان گیتی کے کہاں کہاں بنے نقش قدم کسے معلوم
ابھی تو لڑتے ہیں ہم پاسبانِ ظلمت سے سحر کے بعد کہاں ہوں گے ہم کسے معلوم
وہ دن کہ جس کا ہمیں انتظار ہے اس دن کہاں کہاں سے اٹھیں گے قلم کسے معلوم

کبھی قریب سے راشن نہ دیکھنا ورنہ
نہ جانے کیا وہ دکھا دے قسم کسے معلوم

—•••—

اوہام شکن نمبر

ان شاء اللہ نومبر ۱۹۷۹ء میں ٹھیک وقت پر شائع ہو جائے گا۔ اس میں کیسے کیسے مضامین ہوں گے؟ ان کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں۔

● قلم کاغذ پر سیاہی ہی بکھیرتا ہے لیکن اس کی سیاہی عجیب و غریب ہے۔ اسی سیاہی سے دنیا میں اندھیرا پھیلتا ہے اور اسی سیاہی سے اُجالا بھی۔ اوہام شکن نمبر کے ساڑھے سو صفحات سے زائد صفحات میں قلم کی سیاہی کا اندھیرا اُجالا آپ دیکھیں گے۔

قلم کی سیاہی کے اس اندھیرے اُجالے کا جب ہم نے گہرا مطالعہ کیا تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اوہام کے متعلق "ہر شخص خیلے دارد" یعنی دنیا میں جتنے افراد ہیں اتنے ہی اوہام ہیں۔ ظاہر ہے ان سارے اوہام کو کوئی گھیر نہیں سکتا۔ پھر اوہام شکن نمبر کا حق کیسے ادا کیا جائے؟ یہ ایک سوال بنا آیا۔ دل و دماغ نے طے کیا کہ اوہام کے بارے میں ایک نہایت جامع مضمون شروع میں آنا چاہئے جو اوہام کی شناخت کے لئے روشنی کا منارہ ہو اور اس روشنی میں اوہام کی ساری دنیا کو دکھا سکے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ایسا جامع مضمون مرتب ہو گیا۔ یہ مضمون قرآن و حدیث سے استفادہ کر کے لکھا گیا۔ آج آپ اس مضمون کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں اور اس کے ساتھ دوسرے مضامین سے بھی تعارف حاصل کر لیں۔ آپ کو علم ہو جائے گا کہ اوہام شکن نمبر میں کیا ہوگا۔

اوہام شکن نمبر میں

(۱) اوہام۔ قرآن و حدیث نے اوہام کے بارے میں کیا بتایا ہے۔ اوہام کس بنیادی عقیدے کے بگاڑ کا نتیجہ ہیں۔ قرآن نے اس کے لئے ایک لفظ "جبت" استعمال کیا ہے۔ اس مضمون میں جو

کے معنی اس کی تشریح بڑی تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے اس کے ضمنی عنوانات یہ ہیں۔

- چاند کا گھٹنا بڑھنا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ایک قدرتی جنتری ہے اسے کسی وہم کو متعلق نہیں کیا گیا۔
- دنوں، تاریخوں اور ساعتوں سے متعلق وہموں کے قصے۔
- جانوروں کے بارے میں وہمی باتیں۔
- بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام، ازلام وغیرہ کا حرام ہونا۔ مشرکانہ فال گیری • توہم پرستانہ فال گیری
- اوہام کی جڑ • قرآن کے احکامات • اللہ کا مد مقابل • شیطان کا چیلنج بحضور رب العالمین۔
- شیطان کے چیلے • آخری بات • آگاہی • پنچوں کا فیصلہ برحق مگر پرنالہ یہیں گرے گا۔

(۲) **بھولوں کا وجود** ۔ مولانا ابو المجاہد صاحب کے ساتھ کاشی پور کا سفر۔ شملہ میں نہایت سبق آموز اور دلچسپ بحث۔ مولانا کا چچا تلا طرز استدلال اور پھر نائل خیرآبادی کا پیش کیا ہوا بنیادی اصول۔

(۳) **پریاں اور بدروحیں** ۔ مغربی افسانہ نگاری کی فنکاری کا عظیم لیکن ناقابل قبول افسانہ

(۴) **جنتر منتر** دلہہ وہ بھال بھالی، چشم دید واقعہ۔ تجربے نے کیا بتایا۔ اس میں وہی بات کارفرما ہے کہ پنچوں کا فیصلہ سر آنکھوں پر مگر پرنالہ ــــ؟

(۵) **تعویذ اور گنڈا شرک ہے** ۔ ایک سیر حاصل مقالہ۔ علامہ ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی ایم بی۔ بی۔ ایس فاضل علوم دینیہ دفاق المدارس نے ایک پمفلٹ ہمارے پاس تبصرے کے لئے بھیجا ہمیں اتنا پسند آیا کہ اسے اوہام شکن نمبر کی زینت بنالیا۔ نہائت سیر حاصل مقالہ ہے۔ سولہ صفحات میں پھیلا ہے۔

(۶) **منحوس کون؟** حمیرا بانو۔ پاگل کوٹ نے بچپن میں نانی اماں سے ایک کہانی سنی۔ وہی کہانی اوہام شکن نمبر کی ترتیب میں آگئی۔ حمیرا بانو نے اپنے قلم سے کہانی کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔

(۷) **پیر پرستی** ان۔ سلطانہ صاحبہ نے دل ہلا دینے والا واقعہ لکھا ہے۔ ایک ماں نے پیر پرستی کی اندھی عقیدت میں اپنے اکلوتے ننھے بچے کو کس طرح ذبح کیا اور اس کا گوشت پکا کر پیر کو

نذر کیا۔ یہ واقعہ پڑھکر پیروں سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور پیر پرستوں کی ذہنیتوں پر رحم آتا ہے۔

(٨) **انسانی بلیدان** ۔ یہ بھی اندھی عقیدت کا ایک واقعہ۔ واقعہ ہی نہیں بلکہ مقدمہ ہے۔ واقعہ ایم۔ پی ڈسٹ بستر میں پیش آیا۔ پڑھنے سے دل تھر تھراتا ہے۔

(٩) **میری شادی شدہ زندگی کا قیامت خیز تجربہ** ۔ اسد اللہ غالب دوامی قیامت خیز نفسیاتی مضمون ہے۔ ایک ڈاکٹر نے وہم کا علاج وہم سے کیا۔

(١٠) **عورت کے لئے** ۔ (جوزی فرینک) قبائلی زندگی کا عجیب مشاہدہ۔ ایک حسین عورت کے لئے دو دو ہی نوجوانوں کا آپس میں جنگ کرکے ختم ہو جانا۔ پڑھنے سے سانس رکتی ہے اور رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

(١١) **جادو کے اثرات سے بچ نکلنے والے مردے** ۔ زومبیائی لوگوں کو غلام بنائے رکھنے کے لئے امریکن شوگر کمپنی کے مالکوں کے فریب کی کہانی۔ ولیم سی بروک کی زبانی۔

(١٢) **جنگلی بابا** اوہام پرستی کا بھیانک روپ۔ مجسٹریٹ چودھری کبیر خاں کی عدالت کا ایک مقدمہ اور اس کی تفصیل۔ جنگلی بابا کے کرتوت۔ ایک معصوم بچی کی آبرو ریزی۔

(١٣) **جہالت کی حد** نعیم سیف ادیب دہلی کا ایک ذاتی مشاہدہ۔ اوہام کی ایک نہایت خوبصورت نثری تصویر۔

(١٤) **اوہام پرستی عہد جہالت کی نشانی** ۔ م۔ ح۔ باسط۔ افسانہ اور کہانی نہیں، مقالہ ہے۔ اوہام کے نقصان نہایت دلچسپ پیرائے میں سمجھائے ہیں۔

(١٥) **انت کال** بھاگو لال بھاگوا کا انتہائی دلچسپ مضمون۔ بھاگو بھائی! قیامت آنے والی ہے۔

(١٦) **چٹکلے** دراصل تراشے ہیں جو مختلف مقامات کے مختلف ذہنوں کا عکس ہیں۔

(١٧) **نحوست اور پیغمبر اسلام کی نظر میں** ۔ سرفراز احمد اعظمی نے قرآن و حدیث سے اخذ کرکے بڑی [illegible] سے یہ مقالہ تیار کیا تھا۔ ہمیں یہ مقالہ شائع کرنے پر بے حد خوشی ہے۔

محمود علی ادیب کا لکھا ہوا ہے۔

(۱۹) **خود کشی** یہ مضمون پرتاپ دہلی سے لیا گیا ہے۔ راکھی کے تہوار کے موقعہ پر دیوی پر ایک انسانی جان کی قربانی۔ بڑا افسوسناک واقعہ ہے۔

(۲۰) **کہا جاتا ہے** یورپ میں، امریکہ میں، بھارت میں، چین میں ساری دنیا کے ملکوں میں بھوت پریت کے بارے میں کیا کہا جاتا ہے؟ یہ بات اس مضمون میں بتائی گئی ہیں۔

(۲۱) **اب تک یاد ہے** رضی الدین اقبال۔ حجاب کے پڑھنے مضمون نگار نے اپنا مشاہدہ پیش کیا ہے۔ نہایت بھیانک اور لرزہ خیز ہے۔

(۲۲) **غلو** محرم کی عزاداری سے ملتی جلتی ایک مثال ایک عیسائی ڈاکٹر نے عیسائی مذہب میں دیکھی اور اس مضمون میں پیش کی۔ مضمون ایک اخبار سے لیا گیا ہے۔

(۲۳) **افریقی قبائل میں جادوگروں کے کرتوت** — انگلینڈ کی شہزادیہ مسز ہیری کا پینڈ کی چشم دید کہانی۔

(۲۴) **اوہام پرستی عہد جہالت کی نشانی** ۔ حجاب کے خاص قلمی معاون حیدر بیابانی صاحب فرماتے ہیں کہ وہم کی دوا لقمان کے پاس بھی نہ تھی۔ دراصل قصہ وہی ہے کہ پنچوں کا فیصلہ سر آنکھوں پر مگر پرنالہ؟

(۲۵) **تین قسم کے معبود** عقائد کو درست کرنے والا ایک اقتباس جو ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن سے لیا گیا ہے۔

(۲۶) **اوہام کے کرشمے** ۔ سید آفتاب پاشاہ کا مقالہ۔ بہت اچھا بہت عمدہ۔

(۲۷) **ہم نے بھی زیارت کی ہے** ۔ سید سجاد علی عاقل بھونگری نے نیلوتوں پر کیا دیکھا۔ دھن اس کا بیان۔ دلچسپ بھی۔ نصیحت آموز بھی۔

(۲۸) **[illegible]** ۔ صدیق دکنی سیمابی نے ایک ہم کے سلسلے میں بتایا ہے کہ شکار ہونے کے

مضامین میں کس مکاری اور فنکاری سے اوہام پرستی سکھائی جاتی ہے۔

(۱۹) یقینی تیرا ماس کے خواص۔ سید عبدالمجید بیدار صاحب نے ثابت کیا ہے کہ پتھروں کے خواص میں بہت سے وہمی خواص بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔

(۲۰) سچا دوست۔ پرانی دنیا میں بھوت آتے تھے، اب کیوں نہیں آتے۔ اس پر سیر حاصل بحث۔

(۲۱) اصلاح۔ وہم کا علاج وہم ہے۔ نہایت دلچسپ واقعہ۔ افسانوں سے زیادہ حیرت انگیز۔

(۲۲) آسیب زدہ محل۔ ایک محیر العقول وہم نہیں محض افسانہ۔ مغربی ادیبوں کا رقم کے لئے ایسے افسانے تخلیق کرنا جو بیٹھا ہی نہیں آئے۔

(۲۳) بوڑھی روح کی جوانی پر۔ یہ بھی مغربی حریص ادیبوں کی فنکاری کا بناوٹی افسانہ ہے۔ ہارون حیدر صاحب نے اس کے چہرے سے نقاب اٹھائی ہے۔

(۲۴) کالے جادو کا آنا اثر۔ یہ بھی ایک فریب ہے۔

(۲۵) ایک پیشہ سراسر در ولیش۔ یہ بھی فرضی قصہ ہے جو محض توہم پروری کے لئے لکھا گیا۔

(۲۶) ہوائی جہاز میں سانپ۔ یہ بھی واقعہ نہیں۔ افسانہ ہے۔ افسانہ پسند لوگوں کے لئے لکھا گیا نہیں بلکہ لکھوایا گیا ہے۔

(۲۷) کہانی مرگئی۔ مرسلہ فاطمہ انصاری۔ جسے انھوں نے پاکستانی رسالہ "انوار" سے نقل کر کے بھیجا تھا۔

(۲۸) دیوتا کا انتقام۔ وہم پرستی کی انتہا۔ عفت سلطانہ انصاری نے انگریزی میں ایک واقعہ جسے ہم افسانہ کہتے ہیں، پڑھا اور اردو میں منتقل کیا۔

نوٹ:۔ اوہام شکن نمبر کے مضامین کا تعارف بہت طویل ہوتا جا رہا ہے اس لئے اب ہم باقی اگلے مہینے میں اس کی ایک جھلک دکھائیں گے اور مضامین نگاروں کا تعارف بھی جبھی کرائیں گے۔ نظموں، چٹکلوں، اقتباسات کی جھلک بھی آج نہ آسکی۔ اگلے پرچے میں وہ بھی دیکھئے۔ (مدیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

معاشرے کی تشکیل میں خواتین کی ذمہ داریاں

معاشرہ ۔ ذرا دیر کے لئے اپنے چہرے کی آنکھوں کو بند کر لیجئے اور دل و دماغ کی آنکھوں کو کھول کر مرد اور عورت کی زندگی کی چلتی پھرتی تصویر دیکھئے۔ جب تک مرد اور عورت شادی بیاہ کے بندھن میں نہیں پھنستے یعنی کنوارے ہوتے ہیں تو انھیں اپنی، صرف اپنی فکر ہوتی ہے۔ وہ اپنا پیٹ بھرنے، اپنا تن ڈھانکنے اور اپنے زندہ رہنے کے بارے میں سوچا کرتے ہیں۔ اپنی اپنی ہی ضرورت کی چیزوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مرد کو یہ پروا نہیں کہ اسی طرح کا ایک انسان، جسے عورت کہا جاتا ہے۔ کس حال میں ہے۔ عورت کو بھی یہ خیال نہیں آتا کہ اسی طرح کا ایک انسان جسے مرد کہا جاتا ہے کس طرح رہتا بستا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی ایک حکمت پر غور کیجئے تو اس کی مشیت سمجھ میں آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے اندر ایک دوسرے کے لئے کشش رکھی ہے۔ یہ کشش کہ دونوں باہم مل کر رہیں۔ ان کی یہ خواہش فطری ہے۔ دونوں اپنی اپنی یہ خواہش ہر قیمت پر پوری کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں کی خواہشوں کو پورا کرنے کا بہترین طریقہ وہ معاہدہ ہے جسے نکاح اور بیاہ کہا جاتا ہے۔

شادی کے بعد دونوں ایک دوسرے کے لئے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ اب مرد صرف پیٹ بھرنے، اپنا تن ڈھانکنے، اپنے رہنے بسنے اور اپنی ہی ضرورتوں کے لئے فکر نہیں بلکہ وہ اپنی بیوی کو بھی ان ضرورتوں میں شریک کر لیتا ہے۔ دوسری طرف بیوی کی صرف

یہی نہیں کہ ان چیزوں کو بنا سنوار کر اپنے لئے دھرو ہر کے طور پر پسند کر لے۔ نہیں، اب وہ اپنے شوہر کے آرام و آسائش کا خیال رکھنے لگتی ہے۔

اس طرح جب دونوں فکر کرنے لگتے ہیں تو انھیں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ دونوں کا کہیں ایک ٹھکانہ ہو۔ اس سوچ کے نتیجے میں "گھر" بنتا ہے۔ یہ گھر پہلے اینٹوں، پتھروں اور گھاس پھونس کا ہوتا ہے جس کے اندر وہ سردی گرمی اور برسات سے بچتے ہیں اور اپنی چیزوں کو بھی محفوظ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد اولاد ہوتی ہے۔ اب ان دونوں کو اولاد کی فکر ہونے لگتی ہے۔ وہ اسے پروان چڑھاتے ہیں۔ اولاد بڑی ہوتی ہے ان کی بھی شادی ہوتی ہے۔ پیچیدہ رشتے ناتے کے لوگ پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ اب ایک گھر کا رہن سہن اور اس کے طور طریقے دوسرے لوگوں کے گھروں میں پہنچنے لگے۔ کوشش کی جانے لگی کہ جہاں تک ہو سکے ان سارے گھرانوں کا رہن سہن ایک ہی طرح کا ہو۔ سب ایک ہی ذہن سے سوچیں۔ ان کی بولی بانی ایک ہو۔ ان کا طور طریقہ ایک ہو۔ زندگی بسر کرنے کا ایک ہی راستہ ہو۔ لباس بھی ملتا جلتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ سب ایک تہذیب میں ڈھل جائیں۔

یہاں تک پہنچتے پہنچتے اس اینٹ پتھر کے گھر کا مطلب بدل جاتا ہے۔ اب گھر کا مطلب ہوتا ہے۔ زندگی بسر کرنے کا اصول، ڈھنگ، طور طریقہ۔ اب جب کہا جاتا ہے کہ فلاں کا گھر بگڑ گیا تو اسکے معنی یہ نہیں ہوتے کہ چھت اور دیواریں ڈھے گئیں بلکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس شخص کے گھر کے لوگوں کا رنگ ڈھنگ خراب ہو گیا۔ ہم آپ سب اسی معنی میں لفظ "گھر" کا استعمال بول چال میں کرتے بھی ہیں۔ خیریت خیر صلا پوچھتے ہیں "کہو بھئی۔ گھر کا کیا حال ہے؟"

جواب دینے والا کہتا ہے۔ الحمد للہ۔ اللہ کا فضل ہے۔ گھر کا مطلب ہو گیا۔ گھرانہ یعنی وہی گھر کے لوگ۔

یہ ہوئی "ایک گھر" کی بات۔ جب بہت سے گھر یعنی گھرانے والے ایک ہی رنگ ڈھنگ

اور زندگی بسر کرنے کا ایک ہی طریقہ اپنا لیتے ہیں تو اب اسی کو "معاشرہ" کہنے لگتے ہیں۔ "سماج" کہنے لگتے ہیں۔ اسی کو اردو کے اچھے اور ادبی الفاظ میں معاشرے کی تشکیل کہتے ہیں۔

معاشرے کی تشکیل میں عورت کا حصہ : معاشرے کی تشکیل کسی اصول پر ہو چاہے وہ اسلامی طرز پر ہو یا غیر اسلامی طریقوں پر۔ اس میں عورت کا حصہ مرد سے زیادہ ہوتا ہے۔ آپ خود دیکھئے، مرد تو کمانے کی دُھن میں گھر سے باہر رہتا ہے۔ معاشرے کی نئی پود یعنی اولاد عورت کی گود میں پروان چڑھتی ہے۔ بچہ اپنی ماں کی زبان سیکھتا ہے۔ بچہ اپنی ماں کا رنگ ڈھنگ دیکھتا ہے۔ بچہ کی ماں کی تہذیب غیر شعوری طور پر اپنے اندر جذب کرتا ہے بچہ جو کچھ ماں کو کرتے دیکھتا ہے اسی کی نقل کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب ماں نماز پڑھتی ہے تو دو برس کا بچہ اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے کبھی کبھی بڑے دلچسپ واقعات سامنے آتے ہیں۔ بچہ ماں سے پہلے اس کے آگے سجدے میں ہوتا ہے اور ماں ایک مسرت آمیز تعجب کے ساتھ یہ سوچتی ہے کہ کوئی اسے آگے سے ہٹا دے تاکہ سجدہ کرنے کے لئے میدان صاف ہو جائے۔

اسلامی معاشرے اور غیر اسلامی معاشرے کے آداب، تہذیب، رسم و رواج وغیرہ سب میں عورت کا کردار مرد کے کردار سے زیادہ جھلکتا ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ ہر معاشرے کی تشکیل میں عورت کی ذمہ داریاں مرد سے زیادہ ہوتی ہیں اور ہمارا یہ کہنا بالکل ٹھیک ہے اور چاہے تو کسی بھی مرحلے پر عورت سے ٹکرا کر تجربہ کر لے۔ شادی بیاہ اور غمی کی تقریبوں میں ہم نے بڑے بڑے مولویوں کے گھروں میں دیکھا ہے کہ عورت جو چاہتی ہے وہی ہوتا ہے اور قال اللہ اور قال الرسول کہنے والا مولوی اس کے آگے سپر ڈال دیتا ہے۔ چاہے وہ گھر میں جھگڑا اٹھ کھڑا ہونے کے خوف سے خاموش رہے یا کسی اور وجہ سے، بہرحال وہ ہار جاتا ہے پھر شادی اور غمی کی تقریبوں میں اسلام کی شرع نہیں، عورت کی شرع چلتی ہے۔ ... اور

مولانا صاحب ہیں کہ ٹکر ٹکر دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بن کر رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا نہایت ضروری ہے کہ معاشرے کی تشکیل میں عورت کو اس کی ذمہ داریوں سے نبٹنے کے لئے تیار اور ٹرینڈ کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے عورت کو سنوارنے کے لئے مرد پر ذمہ داری ڈالی ہے۔ قرآن کہتا ہے: قوا انفسکم واھلیکم نارا " اپنے کو اور اپنے اہل خانہ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اس طرح مرد پر فرض ہو گیا کہ وہ اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لئے سب سے پہلے گھر والی کو تربیت دے۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی کہ عورت گھر کی نگران ہے۔ اس سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اب گھر بنانے اور گھر سے جہاں تک اس کی پہنچ ہے۔ سب کی ذمہ داری عورت پر ہے۔ سچ کہا جس نے کہا کہ ایک مرد کی اصلاح صرف ایک شخص کی اصلاح ہے لیکن ایک عورت کی اصلاح ایک معاشرے کی اصلاح ہے۔ ایک مرد کی اصلاح کا اثر اس کی زندگی تک یعنی چالیس پچاس سال رہتا ہے لیکن ایک عورت کی اصلاح کا اثر اس کی اولاد کی نسبت سے کم از کم سو برس تک رہتا ہے یعنی تیسری پشت تک۔

مثالیں ۔ اوپر جو کچھ عرض کیا گیا۔ اس کے بیسیوں ثبوت تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان میں کچھ ملاحظہ ہوں:۔

● حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے عہد خلافت میں رات کو گشت لگایا کرتے تھے۔ یہ جاننے کے لئے کہ اللہ کے جن بندوں کی نگرانی ان کے ذمے کی گئی ہے وہ واقعی کس حال میں ہیں۔ چنانچہ آپ ایک بار اپنے غلام کے ساتھ رات کو نکلے۔ ایک گھر سے کچھ آواز آ رہی تھی۔ ٹھہر کر سننے لگے۔ اندر ایک عورت اپنی لڑکی سے کہہ رہی تھی: بیٹی! دودھ میں پانی ملا دے!! بیٹی نے جواب دیا۔ "امی! امیر المومنین نے اعلان کرا دیا ہے کہ کوئی دودھ میں پانی نہ ملائے" عورت پھر اس سے کہتی ہے کہ "اس وقت امیر المومنین یہاں کہاں؟ جو وہ دیکھیں گے" تو لڑکی جواب دیتی ہے: "امی! اللہ تو حاضر و ناظر ہے۔ اللہ سے یہ فعل کیسے چھپ سکے گا؟"

یہ پوری گفتگو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سن لی۔ غلام سے کہا کہ اس گھر کو پہچان لے۔ پھر وہاں سے لوٹ پڑے۔ دوسرے دن اس عورت اور لڑکی کو بلا بھیجا۔ وہ دونوں آگئیں۔ آپ نے ان سے رات والی گفتگو نقل کی۔ دونوں نے اقرار کیا۔ اب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے لڑکوں کو بلایا اور فرمایا۔ اگر مجھے شادی کی ضرورت ہوتی تو میں اس خدا ترس لڑکی سے شادی کر لیتا۔ تم میں سے جس کو ضرورت ہو۔ میں اس کے ساتھ اس کی شادی کر دوں۔ حضرت عاصم نے اپنی ضرورت پیش کی۔ ان کی شادی اس لڑکی سے کر دی گئی۔

انہی حضرت عاصم کے نواسے اسلامی حکومت کے مشہور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ہوئے۔ عجیب بات ہے۔ بنو امیہ جیسی سنگلاخ زمین میں فاروقی دانہ ڈالا گیا تو عمر بن عبدالعزیز جیسا ثمر بار درخت پیدا ہوا۔ یہی عمر بن عبدالعزیز بنو امیہ میں کسی کو خلافت کے لائق نہیں سمجھتے ہیں۔ تو ایک دن ان کی زبان سے نکل جاتا ہے کہ مدینہ چلا جاؤں گا اور خلافت فلاں ابن فلاں کو سونپ دوں گا۔ یہی باتیں کی جاتی ہیں۔ تو ایک بوڑھی تجربہ کار عورت کہتی ہے کہ میں نے اسی وقت کہا تھا عمر کے خاندان کی لڑکی گھر میں نہ لاؤ۔ تم نے میرا کہا نہ مانا۔ نتیجہ آج سامنے آیا۔ (اس بوڑھی عورت کا اشارہ عبدالعزیز بن مروان کی شادی کی طرف ہے۔ ان سے حضرت عاصم کی لڑکی سے شادی ہوئی تھی۔ اسی لڑکی کے بطن سے حضرت عمر بن عبدالعزیز پیدا ہوئے) اب آپ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ دیکھ لیجئے۔ کتنے دنوں تک ایک عورت کے اثرات رہتے ہیں۔ پر دادا سے نواسے تک۔

دوسری مثال حضرت ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:۔ حضرت ربیعہ مشہور تابعی بزرگ ہیں۔ ان کی پیدائش سے چند دن پہلے ان کے والد ایک جہاد پر گئے۔ جاتے وقت تیس ہزار دینار بیوی کو دے گئے۔ پھر کچھ ایسی مہمیں پیش آتی رہیں کہ ستائیس برس تک نہ آسکے۔ یہاں حضرت ربیعہ پیدا ہوئے۔ ماں نے ان کی پرورش کی۔ اچھے اچھے بزرگوں سے قرآن و حدیث کی تعلیم دلائی۔ اس وقت کچھ صحابہ حیات تھے۔ ان کی خدمت میں بھیجا۔ سارے دینار بیٹے کی تعلیم و تربیت پر خرچ کر دیے۔

جب بیٹا [illegible]

حضرت ربیعہ نوجوانی ہی میں اسلامی تعلیم کے ماہر بن کر چکے۔ اپنے اساتذہ کے حکم سے مسجد نبوی میں درس دینے لگے۔ درس میں بڑے بڑے علماء شریک ہوتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بھی ان کا درس سننے جاتے تھے۔ اس طرح ستائیس برس گزر گئے۔ حضرت ربیعہ کے والد تشریف لے آئے۔ حسن اتفاق کہ ادھر سے والد گھر میں داخل ہونے والے تھے کہ مسجد جانے کے لئے حضرت ربیعہ رح گھر سے نکلے۔ ایک اجنبی کو گھر میں داخل ہونے سے روکا۔ والد صاحب خفا ہو گئے کہ تو کون ہے جو میرے گھر میں رہتا ہے۔ دونوں میں جھگڑا ہونے لگا۔ لوگ اکٹھا ہو گئے۔ حضرت انس رض نے سنا تو دوڑتے ہوئے آئے۔ حال پوچھا۔ حال معلوم ہوا۔ حضرت انس رض نے پہچانا۔ حضرت ربیعہ رح کی والدہ صاحبہ نے بھی پہچانا۔ جھگڑا ختم ہوا۔ ربیعہ رح مسجد چلے گئے۔ یہ بزرگ گھر میں پہنچ کر پہلی بار بیوی سے پینتیس ہزار دیناروں کے بارے میں پوچھا تو بیوی نے کہا، نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ جاؤ نماز پڑھ آؤ۔ پھر حساب دیکھ لینا۔ مسجد نبوی میں جا کر دیکھا تو بیٹا بڑے بڑوں کے درمیان درس دے رہا تھا۔ گھر آئے تو بیوی نے پوچھا ”مسجد میں کیا دیکھا؟“ بتایا کہ بیٹے کو عالی مرتبے پر پایا۔ اب وہ بولیں ”کہئے، یہ بیٹا قیمتی ہے یا پینتیس ہزار دینار؟“ بولے ”یہ بیٹا“۔ بیوی نے بتایا کہ میں نے پینتیس ہزار دینار بیٹے کو ایسا بنانے میں خرچ کر دئے۔ میاں بہت خوش ہوئے۔ کہا کہ تم بہترین بیوی اور بہترین ماں ہو۔ میری عدم موجودگی میں اپنی ذمہ داری خوب ادا کی۔

● تیسری مثال **جب حسن حسین باہم لڑ پڑے** حضرت علی رض کے فرزند ارجمند، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے، حضرت فاطمہ رض کے لخت جگر حضرت حسن رض اور حضرت حسین رض ابھی بچے ہی تھے۔ ایک دن کھیل کھیل میں باہم لڑ پڑے۔ اس کے بعد والدہ محترمہ کے پاس ایک دوسرے کی شکایت کرنے گئے۔ بی بی صاحبہ نے دونوں کی شکایتیں سنیں تو کہا۔ میں یہ کچھ نہیں سننا چاہتی کہ حسن نے حسین کو پیٹا یا حسین نے حسن کو۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ لڑائی اللہ کو پسند نہیں۔ تم دونوں نے آپس میں لڑ کر اللہ کو ناراض کر لیا۔ جس سے اللہ ناراض، اس سے میں بھی ناراض۔ جاؤ۔ بھاگو۔

دودھ پو میری فکر دلے۔

بی بی صاحبہ نے جس محبت اور محنت سے دونوں بچوں کو پالا تھا اس کا اثر یہ تھا کہ حسنین ماں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ اب جو ماں نے اس طرح رُخ پھیر لیا تو دونوں رو پڑے۔ پھر ایک نے دوسرے کو دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے۔ اس کے بعد عرض کیا: امی! اللہ سے ہماری غلطی معاف کرا دیجئے۔ اب ہم کبھی نہ لڑیں گے۔ فرمایا، اچھا تو یہ کرو! ننھے ننھے ہاتھ دعا کے لئے اُٹھ گئے۔ حضرت فاطمہؓ استغفار والی آئتیں پڑھتی جاتیں۔ دونوں بھائی دُہراتے جاتے۔ رضی اللہ عنہم۔ انہی دونوں بھائیوں کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں نوجوانوں کے سردار ہوں گے۔

آپ کہیں گے کہ یہ بہت پہلے کے نمونے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کی اولاد کو ایسا ہونا ہی چاہیئے تو لیجئے، میں آج کے کچھ نمونے پیش کرتا ہوں۔ آج ماؤں نے اپنی ذمہ داریاں نبھائیں تو دیکھئے، یہ نمونے ہمارے سامنے آئے۔ یہ دیکھئے، یہ ہیں حضرت سید احمد شہیدؒ یہ دیکھئے یہ ہیں علامہ اقبالؒ۔ یہ دیکھئے یہ ہیں سر سیدؒ۔ اور یہ فلاں بزرگ اور یہ فلاں بزرگ۔ چونکہ یہ فلاں فلاں حضرات بقید حیات ہیں میں ان کا نام نہیں لینا چاہتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ بے راضی ہوں گے۔ اب ذرا مختصراً حال سنئے۔

• واقعہ ہے کہ ایک بار رائے بریلی میں فساد ہو گیا۔ سید احمد شہیدؒ ابھی بچے ہی تھے۔ یہی کوئی چودہ پندرہ برس کے۔ تلوار لے کر فسادیوں سے لڑنے چلے۔ ملازمہ نے روکا۔ سید صاحب کی والدہ محترمہ اس وقت نماز پڑھ رہی تھیں۔ سلام پھیر کر ملازمہ سے کہا۔

• احمد سے محبت تم کو مجھ سے زیادہ نہیں لیکن میں چاہتی ہوں کہ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرے، ماں کے بعد بیٹے سے کہا، جلدی جاؤ، کہیں دوسروں سے پیچھے نہ رہ جائے۔

یہی بچہ بڑا ہوکر حضرت سید احمد شہیدؒ ہوا۔ سید صاحب اور ان کے ساتھیوں

کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ سید صاحب اور ان کے سپاہی صحابہ کرام رض کی زندگی کا نمونہ تھے۔ دن کے غازی اور رات کے نمازی۔

• واقعہ ہے کہ ایک بار سر سید احمد خان نے اپنے ملازم کو پیٹ دیا۔ ماں کو خبر ہوئی تو حکم دیا کہ نوکر سے معافی مانگے یا گھر سے نکل جائے۔ سرسید گھر سے بھاگ کر خالہ کے گھر گئے۔ اب ماں کی محبت یاد آئی تو رونے لگے۔ خالہ نے حال پوچھا ساتھ لیا۔ ماں کے پاس لے گئیں سفارش کی، لیکن وہاں شرط یہی تھی کہ نوکر سے معافی مانگے۔ سرسید کو معافی مانگنی پڑی۔

سرسید رح کہتے ہیں کہ میری ماں نے اس طرح میری تربیت کی کہ آج بھی جبکہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرا ہاتھ کمزور پر نہیں اٹھتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے ماں منع کر رہی ہیں۔

• واقعہ ہے کہ علامہ اقبال رح کے والد صاحب کی کمائی مشکوک تھی۔ اقبال رح پیدا ہوئے تو ماں نے انھیں اپنے پاس سے ایک بکری خریدی۔ اس کا دودھ انھیں پلایا۔ حلال کی روزی کا اثر یہ پڑا کہ علامہ اقبال رح کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد محبت پیدا ہو گئی۔ علامہ صاحب لکھتے ہیں کہ ایک بار میری ماں اور نوکرانی ایک ہی مرض میں مبتلا ہو گئیں۔ دوا بہت قیمتی تھی۔ نوکرانی نہیں منگا سکتی تھی تو میری ماں نے اپنی دوا اسے کھلائی اور خود بے علاج رہیں لیکن یہ حیرت انگیز بات سامنے آئی کہ جس رفتار سے نوکرانی اچھی ہو رہی تھی اسی رفتار سے والدہ صاحبہ صحت یاب ہو رہی تھیں۔

خواتین سے گذارش: اب میں ایک خاص بات خواتین سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اگر وہ اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں تو اولاد کو اس طرح پروان چڑھائیں جس طرح ہماری قابل تقلید بزرگ ماؤں نے اولاد کے سلسلے میں اپنا فرض ادا کیا۔

اولاد کے علاوہ ایک اور ذمہ داری آپ پر ہے اس سے عہدہ برآ ہوئے بغیر آپ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ اس ذمہ داری کے تحت وہ باتوں سے بچنا ہوگا۔

(۱) اول یہ کہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے دل میں معاشرے کی تشکیل کا جذبہ اسلامی اصولوں کے تحت ہو لیکن آپ کے گھر کا مرد اپنے کاروبار کی وجہ سے یا دین سے دور ہونے کی وجہ سے ساتھ نہ دیتا ہو تو آپ کا اولین فرض یہ ہے کہ اپنی بہترین صلاحیتوں اور حکمتوں سے کام لے کر اُسے اپنا ہمنوا بنائیں۔ اپنی شیریں زبانی سے اُسے متوجہ کریں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ عورتوں نے اپنے گھر کے مرد کو اسلام کی طرف راغب کیا ہے۔ موقع موقع سے تعلیمات اسلام کی یاد دہانی کرا کے یہ باتیں کہ زندگی بس یہی زندگی نہیں ہے۔ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ اور ہمارا اصل سرمایہ وہ ہے جو آخرت میں کام آئے۔ عزیز بہنو! جب آپ شادی بیاہ وغیرہ کی تقریبات میں اپنی بات منوا لیتی ہیں۔ تو دین کے معاملے میں خاموش کیوں ہیں؟ آپ تنہا زندگی کی گاڑی نہیں کھینچ سکتیں جب گاڑی کے دونوں پہیے برابر چلیں گے تب ہی راستہ طے ہوگا۔

(۲) دوم یہ کہ اگر آپ کا شوہر دین کی دعوت کے لئے اپنے کو وقف کئے ہوئے ہے تو پھر آپ وہ نمونہ پیش کریں جو حضرت ابراہیمؑ کی ازواج مطہرات حضرت سارہؓ، حضرت ہاجرہؓ نے پیش کیا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات نے پیش فرمایا۔ صحابیات نے جو نمونہ دیا اور دیگر خواتین سلف سے ہم نے پایا مثلاً

• آپ کو معلوم ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کو اللہ نے نبی بنایا اور آنحضرت نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تو آپ کا سارا شہر حتیٰ کہ باپ تک دشمن ہو گیا لیکن زوجہ محترمہ حضرت سارہؓ نے آپ کا ساتھ دیا۔ اور یہ ساتھ اس طرح دیا کہ جب گھر سے نکلے تو صرف ڈھائی آدمی تھے۔ خود حضرت ابراہیمؑ زوجہ محترمہ حضرت سارہؓ اور ان کے بھتیجے حضرت لوطؑ جو اس وقت بارہ تیرہ برس کے نوجوان تھے اس نوجوان کو حضرت سارہؓ نے ہی شوہر کی حمایت کے لئے اُبھارا تھا۔ پھر آج سے پانچ ہزار برس پہلے کی دنیا میں جس طرح سفر کی صعوبتیں برداشت کیں، آج تصور کرکے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ حضرت سارہؓ نے وہ سب دکھ برداشت کئے۔ اللہ کی طرف سے اس دنیا میں یہ صلہ ملا کہ

ان کی اولاد میں اس قدر نبی پیدا ہوئے کہ اتنے نبی کسی کی عورت کی اولاد میں نہیں ہوئے۔ ام الانبیاءؑ کا لقب حاصل کیا۔ آخرت میں ان کے جو رتبے ہوں گے وہ اللہ ہی کے علم میں ہیں۔

● آپ کو معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب نبی ہوئے اور آپ نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تو مکے کے تمام سردار آپ کے دشمن ہو گئے۔ آپ کو طرح طرح سے ستانے لگے۔ آپ پر بری طرح طنز کرنے لگے۔ آپ کا دل دکھانے لگے۔ آپ دکھے دل کے ساتھ باہر سے گھر تشریف لاتے اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ سے حال بیان فرماتے تو ام المومنین آپ کے دکھ کو دور کرنے والی اور آپ کے غم کو ہلکا کرنے والی باتیں کرتیں اور سرداران مکہ پر اس طرح تبصرہ فرماتیں کہ آپ کو بڑی تسلی ہوتی۔ (حضورؐ کی عزیز ترین اور مشہور عالمہ فاضلہ بیوی ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتیں ہیں کہ مجھے اس خدمت پر آج بھی رشک آتا ہے)

آپ خود فرمائیں۔ ایک وہ مرد جو دین کی تبلیغ کے لئے باہر نکلتا ہے۔ باہر اسے تلخ تجربے ہوتے ہیں۔ لوگ اس پر ایسی باتیں مڑھتے ہیں جن کا وہ مرتکب نہیں ہوتا۔ باہر یہ سب اپنے دل پر لاد کر جب گھر آتا ہے اس وقت گھر والی وہ نمونہ پیش کرے جو حضرت خدیجہؓ نے پیش فرمایا تو سوچئے اس مرد مومن کا دل کتنا بڑھ جائے گا۔ لیکن اگر اس کے برعکس بے چارہ داعی اسلام تھکا ہارا طعن و طنز کا مارا گھر آئے اور یہاں گھر والی اس کے پیچھے پڑ جائے اور فتے لے ڈالے کہ وہ نہیں گھر میں نمک نہیں، یہ ضرورت ہے، وہ سامان لانا ہے اور آپ ہیں کہ باہر سٹرگشتی کر رہے ہیں تو ایسی باتوں کا غریب کے دل پر کیا اثر ہوگا۔ جب تک عورت اس ذمہ داری کو بھی سامنے نہیں رکھے گی اس وقت تک اس کا دیندار شوہر دین کی راہ میں آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ پھر خدانخواستہ کوئی اور ردعمل ہوا اور اس کی پوچھ گچھ قیامت میں آپ سے ہونے لگی تو جواب سوچ رکھئے۔

● آپ کو معلوم ہے کہ صحابہ کرامؓ جہاد پر جذبۂ شہادت سے سرشار ہو کر جاتے تھے۔ جہاد میں ایک مدت لگ جاتی تھی لیکن تاریخ کی کتابوں میں کہیں آپ نے پڑھا کہ ان کے گھر کا نظام

بگڑتا ہو۔ کیوں؟ وجہ یہ تھی کہ ان حضرات کی نیک بیویاں اپنی اپنی ذمہ داریاں پوری طرح انجام دیتی تھیں۔ وہ اولاد کی تربیت کرتیں۔ ضروریات زندگی کے لئے جائز ذرائع اختیار کرتیں اور کوئی ایسا موقع نہ دیتیں کہ شکوہ ہو سکے۔ اگر یہی بیویاں کندھا ڈال دیتیں تو صحابہ کرام رض اس جانبازی سے میدان جنگ میں حصہ نہ لے سکتے ـــ ایک تاریخ نگار نے بڑے ادبی انداز میں اسی بات کو یوں لکھا ہے۔

"صحابیات کی خدمات اس چشمے جیسی تھیں۔ جو زمین کے اندر کسی درخت کی جڑ کو سیراب کرتا ہے۔ اس چشمے کو کوئی نہیں دیکھتا لیکن درخت کی شادابی کی تعریف سب ہی کرتے ہیں حالانکہ اصل کام چشمے نے انجام دیا۔

ایک اور ادیب نے یوں سراہا۔

"صحابیات کی مثال دودھ میں گھی کی سی ہے۔ دودھ کے اندر گھی کسی کو نظر نہیں آتا جب کہ دودھ سے گھی بنانے کے بعد اس کی قوت گھٹ جاتی ہے۔"

کتنا دلچسپ اور نصیحت آموز یہ واقعہ ہے سنئے۔

• زمانہ خلافت میں حضرت سعید رض کو حضرت عمر فاروق رض نے حمص کا گورنر بنایا۔ حضرت سعید رض نے بہت عمدہ انتظام کیا۔ وقائع نویسوں کی رپورٹوں سے حضرت عمر رض کو ان کی صلاحیتوں کا علم ہوا خود معائنہ کرنے تشریف لے گئے۔ حضرت سعید رض کو سادہ زندگی کے ساتھ رہتے اور خدمت خلق کرتے دیکھا۔ (اس سلسلے کے بہت سے واقعات ہیں ان کو میں چھوڑتا ہوں) تو خوش ہو کر چار ہزار دینار دیئے۔ دینار دیکھ کر حضرت سعید رض بہت پریشان ہو گئے۔ پریشانی دیکھ کر بیوی دوڑیں۔ اللہ خیر کیا بات ہے؟ کیا قیامت آگئی۔ فرمایا۔ اس سے [redacted] پوچھا کیا؟ امیر المومنین بخیریت ہیں؟ بولے۔ ہاں، وہ تو بخیریت ہیں لیکن میرے لئے گھر میں سانپ اور بچھو بھیجے ہیں۔ یہ کہہ کر دینار کی تھیلی کی طرف اشارہ کیا۔ بیوی واقعی بیوی ہی تھی۔ دیناروں پر نظر ڈالی اور پھر کہا۔ تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ کل محتاجوں میں ہم یہ سارے ہی تقسیم کردیں گے۔

حضرت سعید رضہ نے فرمایا: واللہ بہت عمدہ بیوی ہو لیکن یہ خدمت بھی خوب انجام دینا! اور پھر نماز کی نیت کی اور شکرانے کی نماز ادا کرنے کھڑے ہو گئے۔

اس طرح کے بہت سے حالات ہیں کہ ان نیک بیویوں نے اپنے مردوں کو بڑی بڑی تقویت پہنچائی۔ بس عقلمند خواتین کے لئے کئی واقعے بطور نمونہ پیش کئے نصیحت اختیار کرنے والوں کے لئے یہی بہت ہیں۔ آپ بھی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی کوشش کریں پھر دیکھیں کہ آپ کے دیندار شوہر کی قوت تبلیغ کس درجہ بڑھ جاتی ہے۔

اس طرح کا تعاون کرنے والی خواتین کے لئے حضورؐ نے جہاد کے برابر ثواب بتایا ہے۔ بڑا دلچسپ واقعہ ہے۔ مضمون طویل ہوتا ہے تو ہونے دیجئے۔ یاد آ گیا تو سن لیجئے۔

● آپ نے پڑھا ہو گا کہ ایک بار مدینے میں خواتین کے اجتماع میں یہ بحث چھڑی کہ مرد جمعہ کی نماز کا ثواب حاصل کرتے ہیں۔ جنازے کی نماز کا ثواب لوٹتے ہیں۔ میت دفنانے کا ثواب پاتے ہیں۔ جہاد کا ثواب ان کے لئے مخصوص ہے وغیرہ وغیرہ لیکن ہم عورتیں گھروں میں بیٹھی رہتی ہیں۔ چولہا چکی اور بچے پالنا ہمارا کام ہے اور بس۔

سوچا جانے لگا کہ حضورؐ سے درخواست کرنا چاہئے کہ ہمارے لئے بھی ثواب کی ویسی ہی صورت نکالیں جیسی مردوں کے لئے ہے۔ ان نیک خواتین نے حضرت اسماء بنت یزید کو نمائندہ بنا کر حضورؐ کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت اسماء رضہ نے اس طرح خواتین کی عرضداشت پیش کی۔

• یا رسول اللہ! ہم خواتین اللہ کو ایک مانتی ہیں اور آپ رسول برحق ہیں۔ لیکن عبادات اور ثواب میں ہمارے مرد ہم سے آگے بڑھ گئے۔ یا رسول اللہ! ہم اپنے مردوں کا بوجھ ڈھوتی ہیں (ذرا یہ بلاغت ملاحظہ فرمائیں) ان کی اولاد کو لئے پھرتی ہیں۔ انھیں پالتی ہیں۔ ہمارا گھر ہمارا میدان کار ہے۔ ہمارے مرد جہاد کرتے ہیں۔ جو افضل العبادات ہے۔ ہم اس سے محروم۔ ہمارے مردوں کے لئے جمعہ اور جنازے کا ثواب ہے۔ ہمارا دامن اس ثواب سے خالی۔ یا رسول اللہ! جس اللہ نے آپ کو رسول بنا کر

ر بھیجا ہے۔ اس کی بندیاں کہتی ہیں کہ جس طرح مرد اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لائے اسی طرح ہم نے اسلام قبول کیا لیکن ہمارے مرد ہم سے آگے بڑھ گئے۔ یا رسول اللہ! مدینہ کی عورتوں نے مجھے اپنا نمائندہ بنا کر آپؐ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ میں گواہی دیتی ہوں کہ آپؐ نے کبھی کسی کو محروم نہیں کیا۔"

یہ فصیح و بلیغ تقریر حضورؐ سنتے رہے۔ جب حضرت اسماءؓ خاموش ہوئیں تو حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کیا تم نے اس سے بہتر تقریر سنی ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: نہیں یا رسول اللہ۔ حضورؐ نے پھر پوچھا: کیا تم نے ایسی بہتر نمائندگی کرتے ہوئے کسی کو دیکھا؟ صحابہؓ نے عرض کیا: نہیں یا رسول اللہ!

اب حضورؐ نے جوش کے ساتھ حضرت اسماءؓ بنت یزیدؓ سے فرمایا: "اسماء! جاؤ، مدینے کی خواتین سے کہہ دو کہ جب تمہارے مرد اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوتے ہیں، اس وقت تم ان کے گھروں کی نگرانی کرتی ہو، ان کے بچوں کو پالتی ہو اور ان سے دور گھروں میں بیٹھ کر ان کو مطمئن رکھتی ہو تو تمہیں بھی ان کے برابر ثواب ملتا ہے۔"

کہتے ہیں کہ حضرت اسماءؓ خوش خوش واپس ہوئیں۔ راستے میں کہتی جاتی تھیں۔ کتنا کریم ہے میرا رب اور کتنے عظیم ہیں ہمارے پیارے رسولؐ۔ اور پھر جب اس نمائندہ خاتون نے یہ مژدہ جانفزا عورتوں کو سنایا تو تاریخ کہتی ہے کہ وہ دن مدینے کی عورتوں کے لیے ان کی زندگی کا عظیم دن تھا۔ انہیں اس خبر سے بڑھ کر کبھی کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ یہ ہے اسلامی معاشرے کی تشکیل میں خواتین کی ذمہ داری کا صلہ۔

آخری بات اب ایک مرحلہ آپ کے سامنے آ سکتا ہے کہ آپ کا حامی اسلام شوہر آپ کی حیات میں خدانخواستہ اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت میں ایک کردار تو یہ ہے کہ بیوہ واویلا کرتی ہے۔ سوگ طاری کر لیتی ہے لیکن وفادار بیویوں کے سامنے میں ازواج مطہرات کا اسوہ رکھنا چاہتا ہوں۔ حضورؐ کے انتقال کے وقت کئی ازواج مطہرات موجود تھیں۔ آپؐ کے بعد انہوں نے کیا کردار پیش کیا۔

ان سب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے اپنے کو وقف کردیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سیکھا تھا اس کے پھیلانے میں لگ گئیں۔ وہ حضورؐ کے بعد گھر گھر بانٹنے میں جٹ گئیں۔ انھوں نے دولت کی ہوس نہیں کی۔ مرتے دم تک دین پھیلانے میں لگی رہیں۔ ان میں حضرت عائشہ رضؓ سب سے آگے بڑھ گئیں۔ ہمارے علماء کرام کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ حضرت عائشہؓ کو توفیق نہ بخشتا تو ہمیں آدھا دین ملتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے فرمایا کرتے تھے کہ دین اس گوری عورت سے سیکھو۔ حضرت عائشہ رضؓ اور دیگر ازواج مطہراتؓ نے امت کی ماں ہونے کا حق ادا کردیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے شوہر کو زندہ و سلامت رکھے۔ لیکن اگر آپ کو اس دوسرے مرحلے سے گزرنا پڑے تو آپ اپنی ماؤں کی طرف دیکھیں اور آپ بھی اپنے داعی اسلام شوہر کے مشن کو آگے بڑھانے میں تن من دھن لگا دیں۔ اللہ آپ کی مدد فرمائے۔

عید مبارک

آپ عید کس طرح منائیں؟

(از مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم)

● عید آرہی ہے۔ آپ کے بچے (خدا آپ کا سایہ ان کے سروں پر مدت تک قائم رکھے) خوش ہو رہے ہیں کہ نئے نئے کپڑے پہننے کو ملیں گے۔ طرح طرح کی مٹھائیاں اور اچھے اچھے کھانے کھانے میں آئیں گے اور عید گاہ میں نئے نئے کھلونے خرید کریں گے۔ آپ کو اپنے بچوں کی خوشیاں مبارک۔ لیکن یہ بھی کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ان مٹھائیوں اور کھانوں کی لذت کتنے لمحوں تک اور کپڑوں اور کھلونوں کی خوشی کتنی دیر تک قائم رہ سکتی ہے؟ کپڑے میلے ہوں گے۔ کھلونے ٹوٹیں گے۔ اور مٹھائیاں حلق کے نیچے اتر جائیں گی۔ اپنے بچوں کو ہنستا کھیلتا دیکھ کر تھوڑی دیر آپ بھی خوش ہو لیں گے لیکن جس طرح تھوڑی ہی دیر کے بعد ان کی اداسی یقینی ہے۔ اسی طرح آپ کی بھی خوشی ٹھہرنے والی نہیں۔ آپ وہ دائمی خوشی کیوں نہ خرید فرمالیں جسے نہ کبھی زوال ہو اور نہ جس سے آپ کبھی محروم ہو سکیں؟

● آپ کے پڑوس میں، آپ کے محلہ میں آپ کی بستی میں۔ آپ ہی کی بستی میں آپ ہی کے بچوں کی طرح دل رکھنے والے اور دلوں میں ارمان و شوق رکھنے والے، کچھ اور بچے بھی ہیں جن کے ناز بردار ماں باپ آج اس عالم میں موجود نہیں۔ عید ان کے گھر میں بھی آتی ہے پر ان کے گھر سے اداسی نہیں اور کوئی ان کی اداسی پر ترس کھانے والا نہیں۔ ان کے دل

غمگین ہیں اور کوئی ان کی غمگینی کو دور کرنے کی تڑپ اپنے دل میں رکھنے والا نہیں۔ ان کے دل غمگین ہیں۔ آپ ان کی سرپرستی کیجئے۔ وہ بے آسرا ہیں آپ ان کا آسرا بنئے آپ کی عید جب ہی مقبول ہو سکتی ہے۔ جب آپ ان کی عید کو اپنی عید بنائیں اور اپنے دل میں یہ خیال تک نہ لائیں کہ آپ اُن پر کوئی احسان و نوازش کر رہے ہیں بلکہ اپنی خوش بختی پر سجدۂ شکر کریں کہ آپ کو اپنی عاقبت سدھارنے کا ایک موقع دیا گیا! آج آپ نے اگر ایک یتیم کی بھی عید کرا دی تو کل، جب تمام ہنستے ہوئے چہرے رو رہے ہوں گے آپ کے چہرے پر انشاء اللہ اس وقت بھی تبسم رقص کر رہا ہوگا۔

● عید کا چاند دیکھا جا چکا ہے۔ امیر گھرانوں کی ڈیوڑھیاں مبارکباد کے شور سے گونج رہی ہیں۔ آپ اپنے دل میں کل کے مصارف دودھ شکر۔ سوئیاں۔ میوہ۔ عطر پان۔ بچوں کی خاطر داری۔ دوستوں کے تحفہ تحائف۔ ملازمین و متوسلین کے انعام اکرام وغیرہ کا حساب لگا رہے ہیں لیکن یہ بھی کبھی آپ کے خیال میں آتا ہے کہ ان دعوتوں اور ضیافتوں کی خوشیوں کی عمر کتنی ہے؟ ان میں سے کسی مسرت کو بھی پائیداری نصیب ہے؟ آپ اس مسرت کا سودا کیوں نہ کر لیں جو آپ سے کبھی نہ چھن سکے اور جو بڑے سے بڑے اور نازک وقت پر بھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑے؟

● آپ کے پڑوس میں، آپ کے محلہ میں، آپ کی بستی میں کچھ غریب و بیکس ضعیف و مفلس، محتاج و بے زر بھی اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں وہ بھی آپ ہی کی شریعت کا کلمہ پڑھنے والے ہیں آپ ہی کے رسول کی اُمت ہیں آپ ہی کے پروردگار کے بندے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آپ کے ہاں بہت کچھ ہے۔ اور ان بے چاروں کے ہاں کچھ بھی نہیں۔ آپ کل مٹھیاں بھر بھر کر پیسے لٹائیں گے۔ وہ غریب اناج کے دانے دانے کو ترس رہے ہیں۔ آپ کے ہاں کے نوکر چاکر ہی نہیں بلکہ کتے

اور بھی تنگ کی عید منائیں گے۔ ان بیچاروں کو اس کی فکر ہے کہ کل کا فاقہ کیسے برداشت کیا جائے گا۔ آپ اگر عید کی حقیقی مسرت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے کھانے سے پہلے محتاجوں اور مسکینوں کو کھلائیے اور دوستوں کی پرتکلف دعوتوں اور ضیافتوں سے قبل ان فاقہ کشوں کا جبری روزہ کھلوائیے۔

آپ کی اصلی عید یہی ہے کہ یتیموں اور مسکینوں کے ہاں عید کرائیے کہ آپ کے سید وسرور کا یہی طریقہ تھا۔ یتیموں اور بیوائوں کی غمخواری، مسکینوں کی دستگیری، دردمندوں کی حاجت روائی ان مختصر فقروں میں ساری سیرت مبارک کا عطر کھنچ آتا ہے۔ ▲

مہارانی

منورہ نوری

قسط ۲

محمد بن قاسم جب سندھ میں داخل ہوا تو اس نے کیا دیکھا؟

ابتک کہانی کا خلاصہ

مہاراجہ سندھ کے دو بیٹے تھے۔ داہر اور دھر سنگھ۔ مہارانی کا نام سہاگ دیوی تھا۔ اس سے ایک بیٹی بھی ہوئی اس کا نام تھا راج کماری بائی۔ داہر نجوم میں ماہر پنڈت سالج نے راج کماری کا زائچہ تیار کیا اور لکھا کہ راج کماری کا سنجوگ جس سے بھی ہوگا وہ سندھ کا مستحق سلطان راجہ ہوگا۔ زائچے کی یہ پیشین گوئی سن کر مہاراجہ اور مہارانی، داہر اور دھر سنگھ گھبرا گئے اس کا مطلب یہ ہے کہ راجکماری کا سنجوگ (بیاہ) جس سے ہوگا وہ سندھ کا راجہ ہوگا۔ اور داہر اور دھر سنگھ محروم رہ جائیں گے ——— دھیرے دھیرے راجکماری جوان ہو رہی تھی۔ مہاراجہ مر چکا تھا۔ اس کی جگہ داہر راجہ بن گیا سالج کی پیشین گوئی سے وہ سب سے زیادہ پریشان تھا راجکماری کے لئے جب کہیں سے پیغام آتا تو وہ انکار کر دیتا لیکن بہرحال راجکماری کا بیاہ تو کرنا تھا مگر کیسے اور کہاں یہ سوال حل کرنا تھا۔ سالج نے رائے دی کہ آپ بہن سے شادی کر لیں لیکن صرف شادی کی حد تک رہے وہ آپ کی بہن ہی رہے۔ اس حل پر مہاراجہ داہر کو کس حد تک سمجھا پھر سالج نے اسے کس طرح مطمئن کیا؟ یہ اس قسط میں ملاحظہ فرمائیں۔

• سوامی نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ آپ مہاراج کو بتا دیں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا رہی جگ ہنسائی کی بات تو لوگ دو چار ہی دن میں سب بھول جاتے ہیں۔

• مگر بات بھولنے والی نہ ہوگی۔" راجہ داہر نے خدشہ کا اظہار کیا۔

"نہیں مہاراج!" موہن داس نے وثوق سے کہا۔ "اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز اور عجیب و غریب واقعات کو لوگ ذہن سے جھٹک دیتے ہیں۔ حضور آپ اگر چند ماہ کی اجازت مرحمت فرمائیں تو غلام ثبوت پیش کر سکتا ہے۔"

"ہم تمہیں چھ ماہ کی مہلت دیتے ہیں اگر تم اپنے اس دعوے میں کامیاب ہوئے کہ لوگ حیرت انگیز واقعات کو جلد فراموش کر دیتے ہیں تو ہم تمہیں منہ مانگا انعام بھی دیں گے اور تمہاری ... [illegible]

شمس و قمر کی گردش جاری تھی، وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔ راجہ داہر اروڑ کے تخت پر راج کرتا رہا۔ دھر سنگھ برہمن آباد گیا تو مصروفیت کے سبب واپس نہ آسکا۔ راجکماری بائی گیارہواں برس پورا کر کے بارہویں میں لگ گئی۔ اس کی سکھیاں اسے حیرت سے دیکھتیں اور بڑے مندروں میں جب اس کی سواری جاتی تو اس کے دیکھنے والوں دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جاتے۔ جب وہ اپنی مدھر آواز سے گیت گاتی تو فضا جیسے ساکن ہو جاتی۔

رانی سوبھن دیوی کی آنکھوں میں راجکماری کو دیکھ کر نہ اب تفکرات کے سائے پھیلتے، نہ پیشانی پر سوچوں کی شکنیں اُبھرتیں بلکہ وہ بڑی خشمگیں نگاہوں سے اُسے دیکھتی جیسے وہ اس کی سوتیلی بیٹی اور بھائی راجہ چچ کی لاڈلی اور چچ خاندان کی سب سے حسین راجکماری نہیں بلکہ ایک مسلسل خطرہ ہے۔ ان ہی دنوں راجہ داہر کے خاص مصاحبوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں کہ موہن داس نے ایک بکری پالی ہے

جس کے لئے ایک علیحدہ گھر تعمیر کیا ہے جہاں اس بکری کی دیکھ بھال وہ خود کرتا تھا اور ادھر بھٹکنے کی اجازت کسی کو نہیں دیتا۔ چند ایک نے اس گھر میں جھانکنے کی کوشش کی تھی وہ صرف اتنا ہی جان سکے تھے کہ اس بکری کے بال سیاہ اور دراز ہیں اور موہن داس اس دربار کے بعد کا تمام وقت اس کی سیوا میں صرف کرتا ہے اور اسے سب کی نظروں سے چھپانا چاہتا ہے اور یہ حقیقت تھی کہ موہن داس نے سب کی نظروں سے چھپا کر پالی ہوئی اس بکری کے سر میں مالی کے کچھ دانے ڈالے اور اب سب کچھ بھول کر انھیں سینچ رہا تھا۔ ہر صبح سر میں پانی بھر دیتا۔ دھیرے دھیرے نلائی کرتا اور بکری کو بند کمرے میں سب سے چھپا دیتا۔ یوں وقت گزرتا رہا دن ہفتوں اور مہینوں کی صورت میں گزرتے رہے۔ اس دوران نہ موہن داس نے اس بکری کا ذکر کیا نہ راجہ داہر سے ناچ کماری بالی کے بارے میں گفتگو کی۔ اس طرح چھ ماہ گزر گئے۔ موہن داس کی محنت رنگ لائی۔ بکری کے سر میں سبزی اُگ آئی اور جب بالشت بالشت بھر سر پہ لہلہانے لگی تو ایک دن موہن داس راجہ داہر کی خدمت میں حاضر ہوا اور پھر بولا:

"مہاراج! اب وقت آگیا ہے کہ میں اپنے دعوے کا ثبوت پیش کروں، اجازت دیجیے۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" راجہ داہر نے اشتیاق سے اسے دیکھا۔

"میں شہر میں چار دن اپنی بکری کی نمائش کروں گا اور آپ ہر روز روانہ ہونے سے قبل اسے ملاحظہ فرمائیں گے۔" موہن داس نے کہا۔

"ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں۔" راجہ داہر نے جواب دیا۔

اس کے بعد شہر کی گلیوں اور بازاروں میں اعلان کرا دیا گیا کہ شہر کے مختلف حصوں میں اس عجیب و غریب بکری کی نمائش کی جائے گی جو چار دن جاری رہے گی۔ لوگ بے چینی سے مقررہ دن کا انتظار کرنے لگے۔ راجہ داہر

خود بھی منتظر تھا لیکن موہن داس نے بکری کو اس سے بھی راز میں رکھا تھا۔ آخر بڑے انتظار کے بعد وہ دن آ گیا

راجہ داہر تخت مرصع پر جلوہ افروز تھا۔ دائیں بائیں آبنوسی کرسیوں پر اس کے مصاحب و اعلیٰ عہدیدار جمع تھے۔ عقب میں خوبصورت نوعمر خواصیں کھڑی تھیں۔ اچانک موہن داس کی آمد کا شور بلند ہوا۔ سب لوگ اشتیاق سے اور راجہ داہر بے قراری سے دیکھنے لگا جیسے موہن داس کی پالتو بکری نہیں کوئی عجوبہ روزگار شے دربار میں آنے والی ہے۔ آخر موہن داس دربار میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی دو غلاموں کے درمیان سیاہ دراز بالوں والی بڑی سی بکری تھی جس کے سر پہ بیچوں بیچ ایک بالشت اونچی سبزی لہلہا رہی تھی۔ دیکھنے والوں کے منہ سے حیرت و مسرت بھری چیخیں نکل گئیں۔ ایک لمحہ کے لئے درباری راجہ کا احترام اور راجہ اپنی حیثیت بھول گیا ہر فرد کی کوشش یہی تھی کہ قریب جا کر

اس ہریالی کو چھوئے۔ حسین نوعمر خواصیں اپنا فرض فراموش کر کے انگشت بدنداں تھیں اور راجہ داہر اپنی عزت و منزلت اور مقام یکسر بھلا کر آنکھیں پھاڑے اسے تک رہے۔ زندہ بکری کے سر پر ہریالی کا پودا اُگ آنا معمولی بات تو نہ تھی۔ اس نے استعجاب کے عالم میں کہا: موہن داس اسے قریب لاؤ۔

موہن داس نے حکم کی تعمیل کی۔ راجہ داہر دیر تک انگلیاں پھیر کر یہ یقین کرتا رہا کہ بکری کے سر پہ یہ ہریالی قدرتی ہے یا مصنوعی۔ اس دن اور اس کے بعد بازاروں، درمیانی پارکوں اور کشادہ سڑکوں پر اس عجوبۂ روزگار بکری کو لے جایا گیا۔ موہن داس ایک اونچے کھلی سواری میں دو غلاموں کے ساتھ بکری لئے پھرتا۔ وہ جس طرف بڑھتا اس کے پہنچنے سے قبل ہی اس کی آمد کی خبر پہنچ جاتی لوگ سواری کے ساتھ ساتھ دوڑتے۔ حیرانی کے اظہار کے لئے نعرے لگاتے۔ خوشی کی آوازیں بلند کرتے۔ مقررہ جگہ پر پہنچ کر موہن داس سواری روکتا۔ بکری کو نیچے اتارتا۔ ایسے میں بکری

بے خبر اپنی حیثیت سے بے پرواہ کھڑی منہ چلاتی رہتی۔ پجاریوں میں سے کسی کو علم نہ تھا کہ موہن داس نے یہ سب کیوں کیا ہے وہ تو اسے بس اس کا کمال سمجھ رہے تھے۔ میلے کے سب جوان اسے اپنے ہاتھ سے چارہ کھلانے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتے مگر یہ چند ایک ہی کو نصیب ہوتا۔ بڑے قریب ہو کر اس کے بدن پر انگلیاں پھیر کر یقین کرنا چاہتے کہ مبادا مصنوعی کھال سر پہ رکھ کر انہیں بہکایا تو نہیں جا رہا ہے۔ مگر اس کا موقع بھی چند ایک کو ہی ملتا۔ وہ قریب آتے حقیقت کو پرکھتے۔ استعجاب سے ایک دوسرے کو دیکھتے اور بھگوان کی طاقت کی تعریف کرتے ہوئے واپس لوٹ جاتے۔ اس وقت جو جوان اور بوڑھے قریب نہ آ سکتے وہ ایک دوسرے کو دھکے دینے میں مصروف ہوتے کہ موہن داس گاڑی میں سوار ہو کر دوسرے مقام کی طرف بڑھ جاتا۔ غرض یہ کہ اس دن گلی کوچوں میں ایک دھما چوکڑی ہو جاتی۔ لوگ ایک دوسرے سے ٹکراتے گر رہے تھے اور کتنے ہی اس دھکم پیل میں زخمی ہوئے۔ کئی مقامات پر ایک دوسرے سے جھگڑے جنہیں بکری کو قریب سے دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا وہ اپنا غصہ دوسروں پر اتار رہے تھے۔ موہن داس نے ان سب کو بہ نظر غائر دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ ایسے ماحول میں جہاں بہت سے لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آ رہے تھے وہاں [illegible] رہے تھے۔

• بھائی جھگڑتے کیوں ہو۔ اس بکری کی نمائش تو چار دن چلے گی۔

نمائش کا دوسرا دن بھی ایسا ہی تھا۔

راجہ داہر حسب معمول تخت پر اور مصاحبین دائیں بائیں براجمان تھے۔ آج کچھ لوگ بے قراری اور اشتیاق سے بکری کے منتظر تھے لیکن جو کل اسے قریب سے دیکھ چکے تھے ان کی بے تابی کا عالم وہ نہ تھا جو دوسروں کا۔ موہن داس اسی انداز سے دربار میں داخل ہوا لیکن آج نہ تعجب کی چیخیں بلند ہوئیں نہ کسی نے اپنی حیرت ظاہر کی۔ ہاں درباریوں نے مسرور ہو کر اسے دیکھا

راجہ واہر نے ایک تحسین آمیز نظر ڈالی اور موہن داس کو شہر کا گشت لگانے کی اجازت دے دی۔ شہر کا رنگ آج روز گزشتہ کی مانند نہ تھا۔ آج لوگ نہ سواری کے آگے دوڑ کر خبر پھیلا رہے تھے۔ نہ دھکم پیل تھی نہ جھگڑا بلکہ آج مجمع کل کے مقابلے میں نصف تھا جو لوگ بکری کا دیدار کر چکے تھے۔ آج انھوں نے بس سرسری نظر ڈالی اور اپنے مشاغل میں مشغول ہو گئے۔ ہاں جو لوگ گزشتہ دن اس اعزاز سے محروم رہ گئے تھے آج وہ رش کم ہونے کے سبب بہ آسانی قریب آئے۔ بکری کو ہاتھ سے کچھ نہ کچھ کھلاتے سر پہ ہاتھ پھیرتے اور لوٹ جاتے اور جو جتنی دیر چاہتا کھڑا رہتا۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوا کہ کسی نے بکری کو حیرانی سے دیکھ کر دوسروں کو دکھانا چاہا تو انھیں روکھا سا جواب ملا:

"ہاں بھائی! عجیب چیز ہے کل ہی ہی دیکھ لی تھی۔"

موہن داس نے اطمینان سے سانس لیا اور شام کو لوٹ آیا۔

تیسرے دن وہی تخت تھا وہی مصاحب و امراء کہ موہن داس دربار میں آیا تو راجہ داہر نے کوئی دلچسپی لیے بغیر اسے دیکھا اور کہا۔

"موہن داس! ہم تمھیں شہر میں گشت لگانے کی اجازت دیتے ہیں۔"

موہن داس نے باقی درباریوں کو دیکھا مگر وہ بھی سب بکری کو دیکھ رہے تھے ایسے جیسے اب وہ عجوبہ نہ رہی ہو۔ موہن داس کے لبوں پر تبسم آیا اور وہ شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مگر آج ہر جگہ کا رنگ دیگر تھا، نہ چہروں پر مسرت تھی نہ حیرت نہ جوش تھا نہ ولولہ۔ لوگ سواری کی آواز سن کر سر اٹھاتے، دیکھتے اور پھر کام میں مصروف ہو جاتے۔ آج نہ دکانوں سے کود کود کر لوگ سڑکوں پر جمع ہوئے، نہ بند گھروں کے دریچے کھلے، نہ چھتوں پر عورتوں کا ہجوم نظر آیا، نہ بچوں کی انگلیاں پکڑے مردوں نے قریب آنے کی کوشش کی۔ البتہ چند بچوں نے بکری کو چارہ کھلانے کی آرزو کی اور بس موہن داس بکری کو لیے مختلف جگہوں پہ

پھر بلدیا لوگ سرسری انداز میں دیکھتے اور کام میں یوں مصروف ہو جاتے جیسے یہ بکری اب عجوبہ نہ رہی ہو۔ کچھ لوگوں نے تو یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ

"اب یہ بکری اتنی نرالی بھی نہیں کہ روز اس کا دیدار کیا جائے۔"

"بھائی بڑے آدمیوں کی باتیں ہیں جو بھی دکھائیں دیکھو۔ سنا ہے یہ کرتب ایک دن اور ہوگا۔"

موہن داس نے دیکھا یہ وہی لوگ تھے جو نمائش کے پہلے دن حیرت کے اظہار کے لئے نعرے لگا رہے تھے اس کے چہرے پر یوں اطمینان چھا گیا جیسے اسی بات کی توقع ہو۔ وہ شہر سے لوٹ گیا۔

نمائش کا چوتھا اور آخری دن عجیب تھا۔ موہن داس دربار میں پہنچا مگر آج راجہ کے مصاحبین، امراء، درباریوں نے بکری کو دیکھ کر منہ پھیر لئے اور راجہ نے ناقابل برداشت انداز میں اسے دیکھ کر بے ساختہ کہا۔

"موہن داس! بند کرو یہ فضول تماشہ، روزانہ اسے دیکھ دیکھ کر ہم تنگ آ گئے ہیں۔"

یہ بات اس نے غیر ارادی طور پر کہی تھی مگر موہن داس نے سکون سے سنی اور روانہ ہو گیا۔ اس دن شہر بھر میں کسی نے بھی بکری پر نظر نہ ڈالی۔ موہن داس اور اس کے غلام متوجہ کرنا چاہتے بھی تو لوگ اب اسے رک کر دیکھنا گوارا نہ کرتے۔ اگر کوئی شخص شوق سے دیکھتا یا دوسروں کو دکھانا چاہتا بھی تو دوسرے اسے یوں دیکھتے جیسے اس کی ذہنی صحت پر شک ہو۔ کچھ منہ بنا کر کہہ رہے تھے

"بھائی یہ بات پرانی ہو چکی۔ کوئی نئی بات کرو۔"

موہن داس گلی گلی کوچہ کوچہ بکری لئے پھرتا رہا۔ مگر چار دن قبل کا عجوبہ آج اپنے اندر کوئی کشش نہ رکھتا تھا۔ کچھ نوجوان جو آج سے صرف چار یوم قبل اس بکری کو خود چل کر دکھانے میں فخر محسوس کر رہے تھے، آج گلیوں میں نعرے لگا رہے تھے

"فضول نمائش ختم کرو۔"

اوراس شب راجہ داہر کی خاص نشستگاہ
یں موہن داس اس کی خدمت میں حاضر تھا
ار دن کی مکمل رپورٹ راجہ کے گوش گزار کر دے
چکے تھے اور وہ سوچوں کے اس انقلاب پر
متعجب تھا۔ خود اسے اپنی پہلے دن کی حیرانی
اور اشتیاق بھی یاد تھا اور چوتھے دن کی وہ
بے زاری بھی، موہن داس اپنے دعوے میں
میاب ثابت ہوا تھا۔ راجہ داہر کے چہرے
ر اعتراف شکست کے آثار تھے اور وہ دھیمے
دھیمے کہہ رہا تھا۔

"موہن داس! ہمیں اعتراف ہے
ہم ہار گئے۔ واقعی لوگ زیادہ سے زیادہ
کسی چیز کو صرف دو دن اہمیت دیتے ہیں
پھر نہیں۔"

موہن داس نے دست بستہ عرض کیا۔
"مہاراج! یہ دنیا ہے یہاں ہر چیز کو تغیر
ہے۔ لوگ ہر ساعت، ہر لمحہ نئی چیز طلب کرتے
ہیں۔ نئی بات سننا چاہتے ہیں اور پرانی کو بھول
جاتے ہیں۔ آپ کی اور راجکماری کی شادی کا
قصہ بھی صرف دو دن شہرت پائے گا پھر

دن اس خبر سے سننے والے الجھن محسوس کریں
گے اور چوتھے دن بے زاری۔"
راجہ داہر قائل ہو چکا تھا۔ لہٰذا کچھ نہ بولا
البتہ اس نے سلایخ کو طلب کیا اور پوچھا
"سلایخ! اگر ہم راجکماری کو اپنی مہارانی
بنائیں تو راج پر کیا اثرات ہوں گے۔ ہمیں
وضاحت سے بتاؤ۔"
سلایخ نے ایک شب کی مہلت مانگی
اور اگلی صبح حاضر ہو کر عرض کیا۔
"مہاراج! میرا علم کہتا ہے کہ اگر آپ راجکماری
کو اپنی مہارانی بنائیں لیکن شادی کسی دوسری
عورت سے کریں تو آپ کی سلطنت میں امن
ہوگا اور پرجا خوش حال رہے گی لیکن اگر آپ
نے راجکماری کو چھو لیا تو وہ دن سندھ کے
انقلاب اور آپ کے زوال کا پہلا دن ہوگا۔"
راجہ داہر نے ہمیشہ کی طرح کوئی لغزش سی اور
فیصلہ کن انداز میں بولا۔
"ہم اسے صرف مہارانی بنائیں گے تاکہ
اس کا ستارہ کسی اور سے منسلک نہ ہو اور اس
کی شادی کی نحوست ٹل جائے۔"

یہ محل کا وہی عقبی باغ تھا جہاں راجکماری روز چہل قدمی کرتی تھی، وہی سبزہ زار کا درمیانی فوارہ۔ شام آج بھی حسین تھی۔ ٹھنڈی چھینٹوں کا اچھال آج بھی فرحت بخش تھا۔ مگر آج راج کماری کو ہر طرف سوگ ہی سوگ محسوس ہو رہا تھا۔ قطار در قطار کھڑے لاتعداد درخت سوگوار غلاموں کی طرح دست بستہ اور غمگین محسوس ہو رہے تھے۔ راجکماری بائی اپنی مخصوص جگہ فوارے کے سامنے سنگ مرمر کی چوکی پر بیٹھی ہوئی تھی مگر اس اس کے لبوں سے ہنسی نہیں پھوٹ رہی تھی عارض شرم سے گلگوں نہیں ہو رہے تھے اور آج اس کے گرد سکھیاں جمع نہ تھیں بلکہ اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں دہشت کا اظہار کر رہی تھیں۔ خلافِ معمول اس کے سامنے دوسری چوکی پر رانی سوبھن دیوی براجمان تھی۔ مگر نہ ماؤں جیسا وقار تھا نہ شفقت نہ آنکھوں میں چاہت تھی نہ چہرے پر محبت۔ بلکہ آج وہ ایک فیصلہ کر دینے والی مطلق العنان ہستی نظر آ رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کر دیا تھا بڑا ہی انوکھا بڑا ہی عجیب۔

"راج کماری! تم نے سلاچ کی پیش گوئی سن لی ہے۔ لہٰذا ہم نے پرجا کی خوشحالی اور راج پاٹ کے تحفظ کے لئے تمہیں راجہ داہر سے منسوب کر دینے کا فیصلہ کیا ہے!"

راج کماری کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر رانی سوبھن دیوی کو دیکھا جس کے ایک جملے نے اس کی ارمانوں کی دنیا کو بھسم کر دیا تھا۔ اس کی محبت کی دنیا تہہ و بالا ہو گئی تھی اس کے من کا وہ مندر جس میں راجہ رنل کو بسائے پوج رہی تھی ایک دم مسمار ہو گئی۔ وہ چیخی چلائی روئی اور گڑگڑائی سوبھن دیوی نے اسے سمجھایا۔

"راج کماری! سلاچ کہتا ہے کہ تیری پیشانی پر مہارانی درج ہے۔ تیرا سنجوگ کسی اور سے دونوں راجوں کے لئے نحس ہے۔ تیری شادی کی نحوست جب ہی ٹل سکتی ہے کہ راجہ داہر تجھے اپنی مہارانی بنا لیں اور شادی کسی اور محبت سے کریں۔"

راج کماری یہ فیصلہ بلکہ ظالمانہ حکم سُن کر
پڑی۔

یہ رات بڑی سیاہ لگ رہی تھی۔ اروڑ
کے گلی کوچوں اور بازاروں میں راجہ داہر اور
جکماری بائی کی اچانک اور حیرت انگیز شادی
چرچہ تھا۔ لوگ دو دو چار کی ٹولیوں میں
ٹ کر اس شادی پر تنقید کر رہے تھے۔ کچھ
ٔ اردگرد دیکھ کر کہ راجہ کے مخبر نہ سُن لیں
ں امر پر افسوس کا اظہار کر رہے تھے کہ
بھی ایسا نہ ہوا تھا لیکن کچھ لوگ ایسے بھی
تھے جو راجہ کے اس فعل کو جائز قرار دینے
کوشش کر رہے تھے۔ یہ موہن داس
یسا ذہن رکھنے والے لوگ تھے جن کا
یال تھا کہ سندھ کی بقاء کے لئے یہ فعل
ٔ امناسب ہے۔ غرض کہ ہر طرف یہی چرچہ
تھا۔ اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی
اج کماری اپنے نصیبوں پر اشک بار تھی۔ آج
س کی شادی ہوئی تھی اسے مہارانی کا خطاب
تھا مگر اس پر نہ دلہنوں والا حجاب تھا۔ نہ
لہنوں والا لباس، بلکہ وہ پیکر غم بنی بیٹی

زندگی کے اس انوکھے انقلاب پر غور کر رہی تھی
آج شام تک جو چیز اس کے وہم و گمان میں
بھی نہ تھی وہ ایک دم عمل میں آگئی تھی محل کا
وہی مخصوص حصّہ تھا وہی اس کی خواب گاہ
وہی قدِ آدم شیشوں والی سنگھار میزیں، اور
وہی وہ خود، مگر پھر بھی سب کچھ بدل گیا تھا
اس کی بڑی بڑی ہوشربا آنکھیں پُرنم تھیں
رُخساروں کا بالائی حصّہ متورم اور سُرخ ہوکر
مسلسل گریہ کا شکوہ کر رہا تھا۔ روشن کشادہ
جبیں پر بدحواسی کی لکیریں منتشر افکار کا پتہ
دیتی تھیں۔ سندھ کا راج پاٹ بھگوان نے
اس کی قسمت میں لکھ دیا تھا۔ مہارانی کا لفظ
اس کے ماتھے پہ درج تھا۔ وہ مہارانی تھی مگر
اس کا کوئی راجہ نہ تھا۔ ہائے رام یہ کیا بپلا تھا؟
وہ سوچ سوچ کر روتی رہی اور رات ڈھلتی رہی
صبح ہوئی داسیاں مہارانی کے پاؤں
چھونے اور وزیروں امیروں کی بیویاں اُسے
پرنام کرنے حاضر ہوئیں تو وہ کچھ نہ کر سکی۔

(باقی آئندہ)

یہ نامے میرے نام

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حجاب کا مئی کا شمارہ نظر سے گذرا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی بے حد مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ اس قدر لگن کے ساتھ اس کام کو سرانجام دے رہے ہیں۔ مئی کے شمارہ میں ایک چیز کھٹکی جو صرف بربنائے تعلق آپ کو لکھ رہا ہوں۔ ایک عنوان نظر سے گذرا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اور اس کے نیچے کئی ایسی چیزیں نظر آئیں جن کا حدیث ہونا بہر حال مشکوک ہے اور بعض جو واقعۃً مفہوم ہیں حدیث کا ان میں بھی اس بات کا التزام نہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کیا ہیں۔ حدیث کے مفہوم بیان کرنے کا بھی ایک اصول ہے اس لیے بہتر تو یہ ہے کہ صرف معتبر حدیثیں اور ان کے حوالوں کے ساتھ دی جائیں۔ دراصل حدیثوں کا معاملہ بے حد نازک ہے اور خاص طور پر جب کہ ان کو براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہو۔ یہ حدیث تو شاید عام پڑھے لکھے لوگوں سے بھی پوشیدہ نہیں ہوگی کہ

مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّداً فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّار، یعنی جو شخص قصداً میری طرف جھوٹ منسوب کرے تو وہ اپنی جگہ آگ میں بنالے"

امید ہے کہ آپ میری اس تحریر کو محسوس نہیں فرمائیں گے، یہ صرف اسلئے لکھ گیا کہ حجاب سے میرا ایسا ناتا تعلق ہے اور میری خواہش ہے اس کا معیار بلند ہو۔ والسلام۔ آفاق احمد اعظم گڈھ

محترمہ محمودہ ہادی لندن

محترم بھائی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ آپ سب مع بھابی صاحبہ اور بچوں کے بفضل تعالیٰ خیریت سے ہوں گے۔ ہم لوگ بھی یہاں پر ماشاء اللہ سے خیریت سے ہیں۔ ویسے تو آپ سے پہلے مجھے معافی مانگنی ہے کہ بہت ہی طویل عرصہ کے بعد آپ سے مخاطب ہو رہی ہوں۔ دراصل بات یہ تھی کہ ۱۹۷۵ء میں جب کہ ہم پاکستان گئے تھے وہیں پر میری شادی ہو گئی اور پھر بعد میں اپنے شوہر محترم کے ساتھ لندن گئی جہاں پر ۱۸ سال گزارنے کے بعد اب پھر ہندستان آنے کا ماشاء اللہ سے موقع ملا ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ ابا جان کی طبیعت ناساز تھی اور امی بھی میرے پاس آئی ہوئی تھیں تو امی نے کہا کہ میرے ساتھ چلی چلو اچھا موقع ہے۔ پھر آگے اللہ رب العزت کی مرضی بھی تھی اس لیے ہم لوگ یہاں پر ۱۰ اپریل کو شام میں پہنچے یہاں پہنچنے کے بعد چونکہ موسم کی تبدیلی کی بنا پر میری طبیعت خراب ہو گئی تھی اور ہسپتال میں ایک ہفتے رہ کر پھر گھر آئی۔ کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مگر طبیعت میں کمزوری اور سستی کی بنا پر آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکی اور اب جب کہ اللہ کے فضل سے طبیعت ٹھیک محسوس ہو رہی ہے تو سوچا کہ آپ کو خط لکھ ہی دوں۔ کیونکہ میں شاید اگلے ہفتے اپنے وطن جانے کا سوچ رہی ہوں۔ اگر اللہ چاہے پھر اس کے بعد دو تین اور جگہوں پر انشاء اللہ جانے کا پروگرام بھی ہے۔ تو پھر شاید موقع ملے یا نہ ملے۔ ابا نے بتایا تھا کہ میری غیر حاضری میں آپ نے کچھ کتابیں بھجوائی تھیں جس کا بہت بہت شکریہ۔

کہنے اور لکھنے کو تو بھائی صاحب بہت سی باتیں ہیں مگر اس وقت تو میں آپ کو صرف نقشہ ہی کھینچ کر دکھا سکی ہوں کہ یہاں کی طرز زندگی اور انگلستان کے رہن سہن

میں کتنا فرق ہے۔ یہاں ہر انسان کی زندگی آرام دہ ہے لیکن وہاں پر تو انسان صرف ایک کل پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔ دن رات کی مشینی زندگی جیسے سورج کے گرد زمین کی گردش بس یہی حال انسان کا ہے کہ ایک چکر ہے جو کہ لگاتار بغیر کسی اسٹاپ کے چلتا رہتا ہے۔ اگر ایسی حالت میں بھی ہمیں اتنی مہلت مل جائے کہ رب العزت کے دربار میں سر جھکالیں تو سمجھ لیجیے کہ بہت بڑا معرکہ سر کرلیا۔ صبح صبح اٹھتے ہی میاں کو اور منی کو رخصت کرکے پھر گھر کا سارا کام خود ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ دھوبی، بھنگی اور اوپر کے کام بھی خود ہی کو کرنے پڑتے ہیں اور پھر شدت کی سردی کچھ نہ پوچھیے۔ آخرکار دوپہر کے ایک بج جاتا ہے۔ پھر باورچی خانہ میں جانا پڑتا ہے اس کے بعد دوسرے کام سے نپٹ کر ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ منی کے گھر آنے کا وقت ہوگیا اسے فارغ کیا کہ اتنے میں میاں بھی گھر تشریف لاتے ہیں۔ پھر کھانے کھلانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے پھر سب چیزوں سے فارغ ہوتے ہوتے ہی آٹھ بج جاتے ہیں اور پھر نو بجے کے قریب تو سب سو جاتے ہیں لیکن جب سے یہاں آئی ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا برسوں کا آرام ملا ہے تو سوچتی ہوں کہ جتنا موقع مل سکے دینی باتوں سے مستفیض ہوسکوں۔ ورنہ ایسا سنہری موقع پھر نہیں ملے گا۔ ارے میں نے تو اپنی روداد سنا کر آپ کو خوب بور کیا آپ کی مصروفیات کی تو خبر بھی نہیں لی۔ امید ہے کہ اب آپ کی آنکھیں ٹھیک ہوں گی اور ماشاء اللہ صحت بھی۔ اب تو ماشاء اللہ بچے بھی کافی بڑے ہوگئے ہوں گے۔ ہاں میری گڑیا بھی تو اب ماشاء اللہ ساڑھے پانچ سال کی ہوگئی ہوگی اور خوب بولتی ہوگی۔ بھائی صاحب آپ خط کا جواب ضرور دیں انتظار رہے گا اپنا پتہ بھی لکھ رہی ہوں۔ اگرچہ آپ کے پاس نہ ہو کیونکہ آپ کا پتہ اصل حجاب سے لیا ہے۔ اپنے پرانے خطوں کو تو ابھی دیکھا تک نہیں ورنہ انھیں سے پتہ چل جاتا۔

بھابی صاحبہ سے میرا سلام کہیے گا اور بچوں کو دعا و پیار۔ آپ کی اور بھابی صاحبہ کی خدمت میں بندگی۔ ابا کی طبیعت بھی پچھلے دنوں ناساز تھی مگر اب ماشاء اللہ ٹھیک ہے۔ امی ابا آپ کی خدمت میں سلام عرض کر رہے ہیں۔ اجازت چاہتی ہوں۔ خدا حافظ۔ فقط آپکی بہن

● برادرم نرائن داس دھیمہ پانی پت

مشفقم برادرم مائل صاحب! تسلیم و آداب

پوسٹ کارڈ ملا۔ واقعی اس دفعہ آپ نے پہل کی ہے بشکریہ قبول ہو۔ بندہ آپ کو خط مارچ کا پرچہ پڑھ کر لکھنا چاہتا تھا مگر بوجہ تساہل اور خرابی صحت آج کل کرتے کرتے اپریل کا پرچہ بھی آگیا یہاں ہر طرح خیریت ہے آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔

میرے لڑکے عزیز جگجیت سنگھ نے J.S. FASHION HOUSE TAILORS & DRAPERS. کے نام سے کاروبار ۱۰۔۱۔۸۹ کو شروع کر دیا تھا۔ کاروبار خوب چل گیا ہے۔ آٹھ کے قریب ٹیلر (درزی) کام کر رہے ہیں۔ بی۔ اے کرنے کے بعد عزیز جناب ماسٹر خلیل احمد صاحب میرٹھی سے سال بھر دہلی میں ٹرینگ لی ہے۔ ملازمت کی نسبت اس کام کو ترجیح دی ہے۔ شاید میں نے پیشتر بھی اطلاع آپ کو دے دی ہوگی۔ دعا فرمائیں کہ عزیز خوب ترقی کرے۔

مارچ کے عجاب میں ویلین واسنو کے فارمولے پڑھ کر بہت افسوس ہوا ہے کیونکہ عجاب جیسے مشہور اور مفید پرچے میں ایسے غلط فارمولے نہ چھپنے چاہئیں۔ بنانے والے کا نقصان ہو۔ یہ تو نقل در نقل والا معاملہ ہے۔ آپ نے (ڈرگ سنگ کان پور) کا حوالہ دیا ہے مگر ان لوگوں کے نسخے غلط ہیں۔ یا صحیح۔ کوئی علم نہیں ہے۔ انھوں نے دیگر جگہ سے نقل کئے ہوں گے۔ ویلین یا ویزلین تو ایک معمولی چیز ہے میں

مٹی کے تیل کے خاندان سے ہے۔ مٹی کا تیل۔ موم بتی کا موم۔ ڈیزل آئل۔ موبل آئل وغیرہ سب زمین سے برآمد ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر لوگ ویزلین کے ذریعہ مرہمیں بناتے ہیں۔

اسٹیرک ایسڈ (STEARIC ACID) یہ چیز موم سے بھی سخت بھیڑ کی چربی سے تیار ہوتی ہے۔ یہ پگھل کر جم کر سخت ہو جائے گی۔

بہرحال ایک کٹنگ ارسال ہے اس میں منوکریم۔ کولڈ کریم۔ ویزلین کے نسخے پڑھیے آپ کو معلوم ہے کہ بندہ ۴۸ سال سے صابون سازی اور پرفیومرس کی عملی ٹریننگ دیتا آرہا ہے۔ میری کتابیں۔ سالنامے آپ کے پاس ہوں گے۔ کوئی صنعتی مضمون دینا ہو تو سالناموں سے دے دیا کریں۔ موجود نہ ہوں تو لکھیں چند خاص نمبر دوبارہ بھیج دوں گا یہ لٹریچر آپ کا لٹریچر ہے۔ عزیزان کو پیار۔ (خیر اندیش۔ دھمیجہ)

● نور جہاں انجم پوسد

عالی مقام چچا جان۔ سلام مسنون:

ان دنوں پوسد آئی ہوئی ہوں۔ ٹیلرنگ کے امتحان سے فارغ ہوئی ہوں۔ انشاء اللہ کامیابی کی پوری امید ہے۔ اسکے بعد جماعت اسلامی کی طرف سے نادار بچوں کے لئے اکوٹ میں دستکاری کا مرکز قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ تاکہ غریب مسلم بچیاں اور خواتین پردے کے حدود میں رہکر خود کفیل بن سکیں۔ اسی مرکز میں ایک شعبہ ٹیلرنگ کا بھی کھولنا ہے جسکے لئے عدم صحت کے باوجود کوشاں ہوں۔ ساتھ ہی اجتماعات و درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ گو کبھی علالت کے باعث اس میں کبھی کمی بیشی ہو جاتی ہے مگر حالت سنبھلتے ہی بھرپور سرگرمی کے ساتھ اس طرف متوجہ ہو جایا کرتی ہوں۔ گھریلو زندگی بھی اللہ کے فضل و کرم اور آپ بزرگوں کی دعا سے خوشگوار ہے دراصل ہمارا نکاح دین داری اور تحریکی مقاصد کی کامیابی کے لئے عمل میں آیا ہے اسلئے ہم دونوں میاں بیوی کی تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے مقصد کے حصول میں ایک دوسرے کا رفیق و ہمدم بنائے رکھے اور دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران کرے۔ والسلام۔ انجم

الجھنوں کے گرفتار

(۱) فاطمہ (۲) ایم۔ڈی داؤد (۳) علی اکبر (۴) ذاکر حسین

ہچا میاں۔ السلام علیکم۔ اگر میں آپ کی لکھی ہوئی کتابوں کے ذریعہ آپ سے رشتہ قائم کروں تو آپ میرے لئے چچا میاں ہی نہیں بلکہ اس سے بڑے بزرگ ثابت ہوں گے۔ میرے والد صاحب کی عمر کم و بیش پینتالیس سال کی ہے۔ انھوں نے اپنے بچپن میں آپ کی لکھی ہوئی نظمیں اور کہانیاں خوب پڑھیں۔ پھر جب میں اس قابل ہوئی تو مجھے بھی آپ کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھوائیں۔ تو دیکھئے! آپ پہلے میرے والد کے چچا میاں تھے۔ اب میرے لئے بزرگوار دادا جان ہوئے۔

دادا جان! اسی رشتے سے میں اپنی ایک پریشانی آپ سے بیان کرتی ہوں۔ اوپر کی تمہید سے آپ نے یہ تو سمجھ لیا ہوگا کہ میں ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی جہاں ایسا لٹریچر پڑھا پڑھایا جاتا ہے۔ جیسا آپ لکھتے ہیں۔ ہم سب اس سے متاثر بھی ہیں اور جہاں تک ہم سے ہوتا ہے دین کی باتوں پر عمل بھی کرتے ہیں۔

اب دیکھئے، میری قسمت کی خوبی۔ جب میں بڑی ہوئی یعنی شادی کے لائق تو میرے لئے ایک لائق، دیندار، نیک اور شریف بر ڈھونڈا جانے لگا۔ خوش قسمتی سے ایسا شوہر مل بھی گیا یہ صاحب ایس۔ڈی۔او ہیں۔ سات سو روپیہ تنخواہ ہے۔ واقعی بڑے متقی ہیں بڑے پارسا ہیں۔ ان میں ساری ہی باتیں اچھی ہیں۔ ان ساری اچھی باتوں میں سے سب سے اچھی یہ بات ہے کہ آجکل کے زمانے میں نہایت سعادت مند بیٹے ہیں۔ والدین کے نہایت مطیع و فرماں بردار والدین انھیں جو حکم دیں سر تسلیم خم۔ قرآن شریف کی وہ تعلیم ان کی گھٹی میں پڑی ہے کہ والدین

سے سامنے اُف تک نہ کرو۔ ان کو خوش کرکے جنت حاصل کرلو۔ میرے شوہر   اس آیت کی تفسیر ہیں کتنی بڑی خوبیوں کے مالک ہیں میرے شوہر۔ میں قرآن کو کلام الٰہی مانتی ہوں۔ میرے شوہر ماں باپ کے سعادت مند بیٹے کے ناتے ان شاء اللہ جنت پائیں گے۔ مگر افسوس صد افسوس ان کی سعادت مندی نے میری زندگی کو جہنم بنادیا۔ ان سے میری شادی ہوئی تو میرے گھر والے بہت خوش تھے۔ میں بھی بہت خوش تھی۔ لیکن جب میں نے ان کے گھر یعنی اپنی سسرال میں قدم رکھا تو پتہ چلا کہ گھر میں یہی ایک سعید ہیں۔ میرے خسر صاحب بھی خیر کچھ ہیں، لیکن ساس اور نندیں اُف اللہ۔ ویسی ہی ہیں جیسی کہ ہوا کرتی ہیں۔ ابھی میرے چالے ختم نہیں ہوئے تھے کہ مجھ پر "مہربانیاں" شروع ہوگئیں۔ بچپن سے میری عادت ہے کہ فجر کی نماز کے بعد تلاوت کرتی تھی۔ یہاں بھی تلاوت کرنے لگی تو نندوں کی طرف سے "ثواب" ملنا شروع ہوگیا۔ انھوں نے ناشتہ تیار کرنا چھوڑنا چھوڑ کیا دیا اب وہ صبح اٹھتی ہی نہیں۔ جاگ رہی ہیں۔ مگر پلنگ نہیں چھوڑتیں۔ ایک دن محبت کرنے والے بھائی اور میری ساس کے سعید بیٹے نے ہنس کر نجمہ سے کہا "اری اُٹھ! مجھے جلدی جانا ہے" بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ نجمہ اٹھی تو مگر یہ کہتی ہوئی۔ "ملانی بی سے کہتے کیوں نہیں" اور اسی آواز میں سروری نے آواز ملائی۔ اور ایک طرف سے ساس نے مجھ پر بات ماری: "پڑھ لکھ تو لیا لیکن یہ تمیز نہیں کہ کس وقت کون سا کام کرنا ہے۔ نہ جانے کیسے ماں باپ کا سایہ پڑا ہے"

یہ سنکر دل پر چوٹ پڑی۔ قرآن میرے آگے کھلا تھا ہی۔ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں نے اپنی ساس کے سعادتمند بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ چپ۔ ٹکر ٹکر دیدیم دم نہ کشیدیم کا نمونہ بنے کھڑے تھے۔

میں قرآن پڑھنا بھول۔ اُسے ویسے ہی رکھا۔ لپک کر باورچی خانے میں گئی۔ ماچس تلاش کرنے لگی۔ نہ ملی تو جاکر ساس صاحبہ سے عرض کی۔ امی جان! ماچس نہیں ملتی!

"تو کیا میری چھاتی پہ رکھی ہے!" یا اللہ، میری زبان سے نہیں ملا، ... نکلا۔ اُدھر میاں

صاحب نے والدہ محترمہ سے یہ عرض کیا: امی! آج ناشتہ کرنے کو جی نہیں چاہتا، ان کا یہ کہنا تھا کہ محترمہ بگڑ گئیں، پھر کر و لیں۔ تو کیا بہو کا جائے گا۔ اری بگڑ چل۔ تیری قسمت ہی میں لکھا ہے۔ بڑا انتظار تھا بھابی کا۔ دیکھ لیا بھابی کو۔ چل، جا چولہا جھونک۔

اس کے بعد آئے دن مجھ میں کیڑے نکلنے لگے۔ پہلے سعید بیٹے کے سامنے، اری یہ دگّی نہ ڈھنگ کی۔ اپنی اُمنگ کی۔ پھر براہ راست مجھ پر بلا وجہ جملے شروع ہو گئے۔ نہ کام کی نہ کاج کی دشمن اناج کی۔ اور پھر تو ایسی تیری ماں ایسا تیرا باپ۔

ایک دن میں نے بڑے ادب سے عرض کیا، امی جان! میری ماں کو تو کچھ نہ کہئے! اس کا جواب ملا۔ تو کیا کرے گی تو۔ میاں سے کہکر کولھو میں پلوائے گی؟

اور پھر جب ایس۔ ڈی او صاحب کام سے واپس گھر لوٹے۔ ڈیوڑھی میں قدم رکھا کہ تقید شروع ہو گئے۔ میں نے جب میاں صاحب سے دبے لفظوں میں فریاد کی تو فرمایا صبر کرو۔ وہ میری ماں ہیں۔ انھیں ناراض کر کے میں اپنی عاقبت برباد نہ کروں گا۔ دیکھئے کس درجہ قرآن کی آیتوں کے مطابق فرمایا۔

دادا جان کو تین برس ہو گئے۔ وہ اپنی عاقبت تو شاندار بنا رہے ہیں۔ اب حالت یہ ہے کہ میں گھر میں اچھوت بن کر رہ گئی ہوں۔ ماں کے سعادت مند بیٹے سے پٹتی بھی رہتی ہوں۔ ان کی محبت کرنے والی بہنوں نے طعن و تشنیع سے مرا کلیجہ چھلنی کر رکھا ہے۔ دو برس تک میرے اولاد نہیں ہوئی تو نندوں نے مجھے گھوڑا کہنا شروع کر دیا۔ پھر جب تیسرے سال پہلوٹھی کا بچہ ہوا تو بالکل باپ کی شکل لیکن میری نندوں نے اُسے حرامی قرار دیا۔ مجھے ساری تکلیفیں منظور لیکن میری عزت نہیں، انھوں نے اپنے بھائی کی لاج کی پروا نہ کی۔ بچے کو حرامی کہتی ہیں۔ تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میرے والدین کو سارے حالات معلوم ہیں۔ انھوں نے ایک بار، نیک صالح، دیندار اور شریف داماد ہے۔ کہا تو جواب ملا کہ ماں کے سامنے میں اُف نہیں کر سکتا۔ فاطمہ سے کہئے کہ جس طرح

ہو انھیں راضی کریں۔ اب میرے ماں باپ بھی دکھی ہیں۔ اور میں تو اللہ سے دعائیں کرتی ہوں کہ کسی کی آئی مجھے آجائے۔

دادا جان! آپ تو بڑے تجربہ کار ہیں۔ بتائیے کیا کروں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ لوگ ان کی سعادت مندی کی تعریف کرتے ہیں اور میں ہوں کہ ان کی سعادتمندی کی بھینٹ چڑھی جا رہی ہوں۔ اسلام میں سارا شرف کیا ماں کے لئے ہی ہے۔ بیوی کے بارے میں کچھ بھی نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ خودکشی کر لوں۔ آپ مجھے جواب میرے میکے کے پتے پر دیں۔ جواب میں چھاپیں تو نام بدل دیں۔ والسلام۔ آپ کی بھتیجی یا پوتی جو بھی سمجھئے۔ فاطمہ۔

جواب:۔ عزیز بیٹی فاطمہ! اللہ تم پر اپنی سلامتی نازل فرمائے۔ ساس اور نندوں کی زد میں ایک تم ہی فاطمہ نہیں ہو، بے شمار فاطمائیں ہیں جو تمہاری جیسی آزمائش میں مبتلا ہیں اور ستم ظریفی یہ کہ کسی کو رحم نہیں آتا۔ تم نے لکھا ہے کہ میاں دیندار ہیں اور ان تمام خوبیوں کے ساتھ ماں کے نہایت فرماں بردار اور سعید بیٹے ہیں۔ ضرور ہوں گے۔ ایسے سعید صاحبان جب دینی لٹریچر پڑھتے ہیں تو واقعی دیندار بن جاتے ہیں۔ میں بہت سے سعید صاحبان کو دیکھتا رہتا ہوں۔ یہ سب سعادتمندی کے اس بلند مقام پر ہیں کہ بے شک جنت کے استحقاق کا دعویٰ کر سکتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں۔ یہ سب دھوکے میں ہیں۔ انھوں نے اسلامی لٹریچر پڑھ کر گھر والوں کے درمیان جو حفظ مراتب قائم کیا اس میں سارا شرف ماں کے پلڑے میں ڈال دیا۔ رہی بیوی تو اُسے نان نفقہ ملنا چاہیئے اس کے بعد خود میاں صاحب جنہیں بیوی سب کو راضی رکھے۔ ساس کتنا ہی ظلم کرے، ساس کی لڑکیاں پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جائیں میاں یہ نہیں دیکھتے، وہ تو بس دیکھنا چاہتے ہیں۔ بیوی یہ سب سہے اور صبر کرے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اسلام میں ماں ہی کے حقوق ہیں جو ادا نہ کئے گئے تو بیٹا نافرمان ہو جائے گا۔ بیوی کے حقوق ہی نہیں، اس کے لئے فرائض ہی فرائض ہیں۔ ومگر

ماں کی سب سے بڑی سعادت پھر سب کے بعد دو دعائیں کمالے اور پڑی رہے۔ کاش ایسے سعادت مندوں کو معلوم ہوتا اور وہ یہ بھی پڑھتے کہ قرآن و حدیث کے ارشادات بیوی کے بارے میں کیا ہیں؟ بیشک ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ بیوی بھی جہنم کو پاؤں تلے دبائے بیٹھی ہے۔ خدا نہ کرے کہ وہ پاؤں کا دباؤ کم کر دے یا پاؤں ہی ہٹا لے تو پھر ماں کی بخشی ہوئی جنت دھری کی دھری رہ جائے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی نعمتوں میں عورت کو گنایا ہے۔ مرد کو اس کی قدر کرنا چاہیے اس کا بھی اجر ملے گا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو بہترین آدمی بتایا ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے بہترین ہو۔ ایسے بہترین آدمی کے لئے بھی اجر ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ مدینے کی کچھ خواتین نے ازواج مطہراتؓ کے ذریعہ حضورؐ تک یہ بات پہنچائی کہ ہمارے شوہر ہمیں پیٹتے ہیں تو حضورؐ نے بڑے دکھ کے ساتھ فرمایا کہ یہ برے لوگ ہیں۔ حضورؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ آدمی کو گناہگار کرنے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ضائع کر دے جن کو وہ (اپنی کمائی) کھلاتا ہے۔

کمال ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو یہ فرماتے ہیں کہ تم اپنی بیوی کے منہ میں جو لقمہ دیتے ہو وہ بھی صدقہ ہے۔ یعنی اس کا بھی ثواب ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ حضورؐ تین چیزوں کی تعریف فرمایا کرتے تھے، عطر، عورت اور نماز۔ نماز کو حضورؐ نے آنکھوں کی ٹھنڈک فرمایا۔ حجۃ الوداع میں خاص طور پر مسلمانوں سے کہا کہ اس کمزور جان کا خیال رکھنا۔

کتنے بد نصیب ہیں وہ سعادت مند بیٹے جنھوں نے دینی لٹریچر میں صرف ماں کے حقوق پڑھے اور بیوی کے حقوق ان کی نگاہوں سے نہ گزرے یا انھوں نے پڑھا تو جہالت کی لوک بہہ مار دیا۔ ایک دن آئے گا جب ماں کے حقوق کی ادائیگی کا ثواب سامنے آئے گا اور بیوی کے ساتھ جو سلوک یہ سعید صاحبان کر رہے ہیں اس کا بھی بدلہ ملے گا۔ یہ سعید صاحبان بیوی کو ننگ و عار سمجھ کر

اپنے گھر کو یہیں جہنم بنا لیتے ہیں۔ اے میری فاطماؤ! سنو۔ ان شاءاللہ ایک "دوسری جنت" بھی ان کے استقبال کے لئے تیار ہے۔

عزیز بیٹی فاطمہ! تم سے مجھے یہ کہنا ہے کہ ابھی تم کو ایک سال یا دو سال مزید اس جہنم کی آگ میں جھلسنا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو ایک بچہ اور عنایت فرمائے اور خدا کرے کہ تمہاری نندوں کی جلد شادی ہو جائے اور انھیں بھی ایسا ہی سعید شوہر ملے تو بڑی بی کا مزاج بھی درست ہو جائے گا اور میاں صاحب کی سعادتمندی بھی اپنا رنگ لائے گی۔

تم کہو گی کہ یہ تو وہ بات ہوئی کہ تا تریاق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔ بے شک یہی بات ہے لیکن اس کے سوا علاج نہیں۔ یہ دن تم کو بھگتنا ہیں۔ رو کر انھیں گذارو یا ہنس کر۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ جیسے حالی مرحوم نے بیوہ کی فریاد نظم کہی ہے اسی طرح کی ایک نظم میں اس "بیوہ" کے لئے کہوں جس کا شوہر زندہ ہو اور وہ اپنی ماں کا بڑا سعادتمند بیٹا ہے۔

ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ تمہارے شوہر بہت ہی سعید ہیں۔ تمہاری ساس بہت ہی جاہل اور ظالم ہیں۔ لیکن ہیں آدمی۔ میں نے سنا ہے کہ سانپ کو دودھ دیا جاتا ہے تو وہ رام ہو جاتا ہے پھر بھلا تمہاری خدمت کا اثر ان پر کیوں نہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی سوچیں۔ ان کی بھی تو دو لڑکیاں ہیں۔

فاطمہ! جب تم دو تین بچوں کی ماں ہو جاؤ گی تو پھر تمہارے ساتھ یہ بدسلوکی کرنا کسی کے لئے آسان نہ ہوگا۔ یہ تمہارے بچے بھی تو ماشاءاللہ تین چار سال کے ہو جائیں گے اور وہ بھی کھلی آنکھوں دیکھنے لگیں گے۔

آخر میں میری نصیحت یہ ہے کہ دیکھو! ایسی نوبت نہ آئے کہ خدانخواستہ طلاق ہو جائے۔ آجکل لڑکیوں کا مسئلہ بڑا کٹھن ہو گیا ہے۔ ہر شہر اور بستی میں جوان کی حد کتنی بیاں بیٹھی ہیں اور عمر میں زیادہ ہو چکی ہیں اس نزاکت کو سامنے رکھنا۔ ورنہ اس کے نتائج اس سے برے ہوں گے۔ جو تم بھگت رہی ہو۔ اور دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ جب کبھی تم ساس بنو تو اپنی ساس کو بھول جاؤ۔ بس اب تو، تمہارے لئے

اور تمہاری جیسی ساری خاطاؤں کے لئے دعا کرتا ہوں۔ والسلام۔ میں ہوں وہ جسے تم سب نے چچا بنا کر چھوڑ دیا۔ دادا جان لکھو۔ یعنی مائی خیر آبادی۔

● ایم۔ ڈی۔ داؤد معرفت ایم۔ ڈی بشیر اینڈ کو دسبے وادرہ۔ ۵۲۰۰۰۶

محترم مینجر صاحب السلام علیکم

سوال ۱۔ آج کے دور میں جو مسلمان رسم و رواج میں مبتلا ہیں اور شادی جیسے خوشی کے موقع پر دعوتوں میں پیسے ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں اور ڈالدیتے ہیں۔ اگر پیسے نہ ہوں تو دعوت چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

سوال ۲۔ تصویر (Photo) کھنچوانے کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟

جواب ۱۔ شادی بیاہ کے موقع پر دعوتوں میں پیسے ڈالنا ضروری نہیں ہے۔ یہ رسم ورواج کے تحت ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو شخص غریب ہوتا ہے تو وہ شرم کے مارے شادی میں نہیں جاتا کہ سب پیسے ڈالیں گے اور وہ نہ ڈالیگا۔ اس رسم کو جلد سے جلد مٹنا چاہیئے۔

جواب ۲۔ اسلام میں زندہ کی تصویر بنانے کی ممانعت آئی ہے۔ بڑی سخت وعید ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں مصوّر سے کہے گا کہ ان تصویروں میں جان ڈال۔ وہ نہ ڈال سکے گا۔ تو حکم ہوگا کہ اسے جہنم میں لے جاؤ۔

ایک شخص حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت میں آیا۔ وہ مصوّر تھا۔ اس نے ابن عباسؓ سے حال کہا تو آپ نے اُسے اللہ کے عذاب سے ڈرایا۔ وہ بیچارہ بہت پریشان ہوا تو آپؓ نے فرمایا کہ تو بے جان کی تصویریں بنا کر کمائی کر۔ چنانچہ اس مصوّر نے ایسا ہی کیا اور اس میں کمال پیدا کیا۔

نوٹ: اضطراری حالت میں فوٹو کھنچوایا جاسکتا ہے۔ جیسے پاسپورٹ بنواتے وقت ضرورت پڑتی ہے یعنی جب تصویر کھنچوائے بغیر کام نہ چلے۔ (م)

عصمت حکیم آبادی

موتی تول

ہیرالال شری واستو اپنے باپ دادا کی پرانی وضع کے رئیسوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ شاہی میں باپ دادا کسی اچھے عہدے پر رہے ہوں گے۔ اسی زمانہ کا لکھوری اینٹ کا مکان لکھنؤ کے محلے مولوی گنج میں ابھی تک موجود ہے۔ مکان کا ایک حصہ ساٹھ ستر روپے ماہوار پر اٹھا ہوا ہے۔ باقی حصے میں خود رہتے ہیں۔ باہر کے کمرے میں پرچون کی دوکان کر لی ہے پہلے اچھی چلتی تھی لیکن جب سے سامنے کے مکان کی ایک دوکان سندھی نے لے کر پرچون ہی کا کام شروع کر دیا ہے تب سے ہیرا لال کی بکری بہت ہی کم ہو گئی ہے۔ تجارت کا جو فن نئے سندھی کو آتا ہے ہیرالال اس سے بالکل ہی ناواقف ہے۔ وہ منافع بھی چاہتے ہیں اور عزت بھی۔ محلے سے تھوڑی بہت عزت تو مل جاتی ہے لیکن اب منافع بالکل نہیں ملتا۔ پرانی پونجی پر دو بیٹیوں کو بیس ہزار خرچ کر کے بیاہ کر سکے ہیں۔ اور اب تیسری منورما کی باری ہے بس یہی تین لڑکیاں ہیں۔ منورما کے بعد انھیں دنیا کے جھمیلوں سے نجات مل جائے گی۔ پھر نہ دوکان کے چکر میں پڑیں گے اور نہ گرتی ہوئی لکھوری کی دیواروں کو بنانے کی فکر باقی رہے گی۔ آج کل منورما کی ماں سے کچھ اسی طرح کی باتیں ہوتی ہیں۔ مکان تینوں لڑکیوں کے نام لکھ کر بنارس چلے جائیں گے۔ باقی زندگی وہیں رہ کر گیان دھیان اور مذہبی کتابوں کا علم حاصل کر کے گذار دیں گے دنیا کے جنجال میں پڑ کر ابھی تک نہ تو پوجا پاٹ ہی کر سکے ہیں اور نہ دھرم کا گیان ہی حاصل کر پائے ہیں۔ نجات کے لیے جتنی پونجی کی ضرورت ہے اس میں سے ابھی کچھ بھی ان کو حاصل نہیں

ہو گئی ہے۔

مگر منورما کا رشتہ ابھی تک ٹھیک نہیں ہو سکا ہے۔ اچھے لڑکوں کا بھاؤ بہت بڑھ گیا ہے۔ کچھ تو اچھے لڑکوں کی کمی ہو گئی ہے اور کچھ روپے کی قیمت گھٹ گئی ہے۔ جب وہ اپنی دونوں لڑکیوں کے بیاہ پر دس بیس ہزار دینے کی بات کہتے ہیں تو لڑکے والے ناک بھوں چڑھا کر جواب دیتے ہیں۔ اس وقت کے مقابلے پر اب دس ہزار کی حیثیت ہی کیا رہ گئی ہے۔ ایک ٹرک سیمنٹ کا پرمٹ بیچنے پر دس ہزار آسانی سے مل جاتے ہیں۔

ہیرالال جواب دیتے۔ "مگر میں یہ کام کہاں کرتا ہوں؟"

جواب ملتا: "آپ نہ کریں ہم تو کرتے ہیں۔ پندرہ بیس ہزار میں تو لڑکے نے بی اے کیا ہے۔ بیس ہزار سے کم میں تو بیاہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

ہیرالال نے کئی جگہ بات چلائی۔ پچھلائی پر دو سو روپیہ بھی خرچ کیا۔ مگر ابھی تک پندرہ ہزار سے کم کی مانگ کہیں سے نہیں آئی۔ ایک دن باتوں باتوں میں انھیں ایک دوست کے لڑکے کی خبر ملی۔ اُن کے دوست لالہ گیا پرشاد کی کپڑے کی دوکان تھی۔ سے چوبیس کلو میٹر دور قصبہ ملیح آباد میں۔ ان کا خاندان بھی پرانے زمانے کا چھوٹا زمیندار تھا۔ مزاج میں پرانی آن بان اور وضع تھی۔ ہیرالال کو بڑی امید تھی کہ یہ رشتہ ضرور ہو جائے گا۔

بہت دن کے بعد ایک دن بیوی کے ساتھ پہنچ گئے۔ لالہ گیا پرشاد نے اپنے دوست کو گلے سے لگایا۔ دونوں دوست اتنے دنوں کے بعد آبدیدہ ہو گئے اور پھر لالہ گیا پرشاد ہیرالال کو لے کر گھر کے اندر چلے گئے۔ اپنی بیوی، شادی شدہ لڑکی اور اسی سال ایل ایل بی کرنے والے لڑکے سے ہیرالال جی کا تعارف کرایا اور پھر ایسی خاطر مدارات کی جیسے سچ مچ بہت دن کا کھویا ہوا سگا بھائی گھر آ گیا ہو۔

پُرانی دوستی اور محبت کے قصوں کا گھر والوں پر بڑا اثر پڑا اور ہیرالال جی نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ ان کی عزیزی کو دیکھ کر

بھگوان نے ایسا اچھا رشتہ اپنی طرف سے کرایا ہے لڑکا بہت ہی تندرست اور خوبصورت تھا کسی طرف سے کوئی عیب نہیں تھا تعلیم تو کچی ہی لیکن اتنی ہی دیر میں ہیرالال جی نے سمجھ لیا کہ بہت ہی سعادت مند اور طبیعت کا شریف لڑکا ہے۔ رمیش نے اپنے پتاجی کے ایسے اچھے دوست کی خاطر مدارات میں بہت دلچسپی لی تھی۔

دنیا داری کی تمام باتوں کے بعد ہیرالال نے منورما کا ذکر کیا۔ اپنی دو لڑکیوں کی شادی پر دس دس ہزار دینے کا ذکر کیا۔ منورما کے دسواں پاس ہونے کا ذکر کیا۔ سندرتا اور گھر گرہستی میں ہوشیاری کا ذکر کیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ اب ان کی حیثیت دس ہزار دینے کی بھی نہیں رہ گئی ہے۔ رشتے تلاش کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ ہر طرف سے ناامید ہو کر اب اپنے دوست کے خبر سن کر آئے ہیں۔

انھوں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا: گیا پرشاد بھائی اب شریف لوگ کہیں نہیں ملتے۔ سب تجارت پیشہ کئے ہیں۔ تم سے رشتہ کر کے میری آتما کو سکون مل جائے گا کم سے کم میری ایک لڑکی بکنے سے بچ گئی اور میرے شریف دوست کے گھر کی لکشمی بن گئی۔

اگیا پرشاد نے ہمدردی کے ساتھ اپنے دوست کی بات سنی پھر کہا — اب تم آئے ہو تو دو چار روز ٹھہرو۔ بھگوان کی جو مرضی ہوگی وہی ہوگا۔ لڑکے کے بیاہ کی بات تو ابھی سوچی نہیں تھی۔ اب تم نے کہا ہے تو گھر کے لوگ بیٹھ کر کوئی فیصلہ کریں گے۔

مگر ہیرالال گھر میں کسی کے نہ ہونے کا عذر کر کے لکھنؤ واپس چلے آئے۔ اگیا پرشاد نے دو چار روز بعد اپنی رائے بتانے کا وعدہ کیا۔ پھر اگیا پرشاد جی کے یہاں جو بات چیت ہوئی اس میں فیصلہ کیا گیا کہ اُن کے لڑکے کی قیمت تو بیس پچیس ہزار روپے سے کم نہیں لیکن پرانی دوستی کا خیال کر کے اگر لڑکی پسند آ گئی تو بارہ ہزار میں رشتہ کر لیں گے۔ اس سے کم نہیں۔ جب یہ خط لکھا جانے لگا تو رمیش نے اپنی ماں سے اتنا ہی کہا۔ ماتا جی

اگر لڑکی پسند آجائے تو جو کچھ چاہا ہی دے دیجیں
لے لیجیے روپیہ تو میں خود ہی پیدا کر لوں گا۔"

باپ نے بھی اتنا ہی جواب دیا "تم
ابھی بچے ہو دنیا کو نہیں جانتے۔"

خط دیکھ کر ہیرالال کا دل ٹوٹ گیا اور پھر انھوں نے کسی سے اس خط کا ذکر نہیں کیا۔ منورما کی ماں سے بھی نہیں۔ پھر ایک دن بھوانی نے ایک اور رشتہ بتایا۔ لڑکا کوئلے کنٹرول کی دوکان کرتا تھا شاید کوئلے کا کوئی ٹکڑا آنکھ میں پڑ گیا تھا جس سے ایک آنکھ جاتی رہی تھی لیکن شیشے کی آنکھ لگا کر لڑکے کا یہ عیب چھپا دیا گیا تھا بس داہنی آنکھ میں تھوڑا سا نقص تھا جو چھپ نہیں سکا تھا۔ بھوانی نے سات ہزار پر رشتہ پکا کر لیا تھا۔ اس سے کم ریٹ پر لڑکے کا ملنا ممکن نہیں تھا۔ ہیرالال نے حساب لگایا ان کی پرچون کی دوکان سندھی خریدنا چاہتا ہے۔ وہ پانچ ہزار روپے دے سکتا ہے مہاجن سے بات کی تھی۔ وہ مکان گروی رکھنے پر راضی تھا۔ بیس ہزار کے مکان پر چار ہزار سے زیادہ دینے کو تیار نہ تھا اس طرح نو ہزار میں وہ کسی نہ کسی طرح لڑکی کو رخصت کر سکتے تھے اور کلیجے پر پتھر رکھ کر انھوں نے کالے کلوٹے لڑکے سے رشتہ منظور کر لیا۔

بیاہ میں بہت کم لوگوں کو بلایا۔ اپنے دوست گیا پرشاد کو بہت تاکید کے ساتھ لکھا اگر وہ نہ آئے تو بڑا ہی دکھ ہوگا۔ مگر گیا پرشاد اپنے دوست سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ کر سکے انھوں نے بیاہ کے دن منیش کو پانچ سو روپیہ شگن دے کر بھیج دیا۔

کل بیاہ کی تاریخ ہے۔ پانچ ہزار روپیہ سندھی سے لے کر دوکان اس کے حوالے کر دی ہے لیکن آج شام تک مہاجن نے روپیہ نہیں دیا ہے۔ ٹال مٹول کر رہا ہے۔ ہیرالال دن میں کئی چکر لگا چکے ہیں اب مہاجن نے رات کو بلایا ہے۔

کوئی دس بجے رات کو مہاجن نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ کاغذات سرکاری میں مکان کا حصے دار ہیرالال کا ایک بھائی بھی ہے جو بیس سال سے گمشدہ ہے

معلوم نہیں کب آجائے اور مکان کا دعویدار بن جائے۔

دوسرے دن براتی آگئے۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بیاہ منڈپ میں داماد اور سمدھی کے سامنے ہیرالال بیٹھ گئے۔ پنڈت نے لین دین کی بات کی۔ ہیرالال نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک ایک پیسہ جوڑ کر پانچ ہزار روپے سمدھی کے سامنے رکھے۔

روپیہ گن کر سمدھی نے کہا: "یہ تو پانچ ہزار ہیں۔"
ہیرالال نے کانپتے ہوئے کہا: "بھیا اتنے رکھ لو۔ دو ہزار گھر بیچ کر دوں گا۔" سمدھی نے اپنے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے کہا "چل بیاہ ہو چکا۔ پانچ ہزار لیکر خاندان کی ناک تھوڑی کٹوا دیں گے۔" ہیرالال نے ایک مرتبہ پھر کسی طرح کہا "بھیا دو ہزار کے لئے مجھے بے عزت مت کرو۔" مگر سمدھی لڑکے کو لیکر منڈپ سے باہر جا چکے تھے۔

ٹھیک اسی وقت رمیش سمدھی کی جگہ پر بیٹھ گیا بولا: "پنڈت جی پہلے یہ بیاہ میرے ہی ساتھ ہو رہا تھا۔ میرا نام رمیش ہے۔ لالہ گیا پرشاد پنچ آبادی کا لڑکا ہوں۔ آپ منتر پڑھو اور میرے ساتھ بیاہ کر دو۔"

پنڈت نے ہیرالال کی طرف دیکھا لیکن ہیرالال کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں وہ دور افق میں کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ اب کیا ہو رہا ہے اس کی جیسے انھیں خبر ہی نہ ہو۔ پانچ ہزار کے نوٹ جس طرح بکھرے پڑے تھے اس طرح پڑے رہ گئے۔

بڑے داماد نے ان کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ "چاچا جی کیا رمیش کے ساتھ بیاہ کر دیا جائے؟" ہیرالال نے اتنا ہی کہا تھا: "بھیا پانچ ہزار لے لو دو ہزار گھر بیچ کر دے دوں گا۔"

منورما نے گھونگھٹ ہٹا کر اپنے پتا کا چہرہ دیکھا۔ چند بوند آنسو ٹپک کر گود میں گر پڑے پھر اس نے پنڈت جی سے آہستہ سے کہا۔ "پنڈت جی بیاہ کر دو۔"

اب دوسرا سال چل رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ منورما لالہ گیا پرشاد کے گھر کی لکشمی بن گئی ہے مگر ہیرالال کسی کسی وقت چیخ اٹھتے ہیں: "بھیا پانچ ہزار رکھ لو۔ دو ہزار گھر بیچ کر دوں گا۔"

اس کے سوا انھیں کچھ یاد نہیں ہے شاید منورما کے بیاہ کے بعد انھیں دنیا کے جنجال سے نجات مل گئی ہے۔ (بشکریہ پاسبان چنڈی گڑھ)

اسلام

ایک مغربی مفکر کی نظر میں

مسٹر دنسٹن فاکس نیوزی لینڈ کے ایک لائق قانون داں ہیں۔ اُنھوں نے ذیل کے مقالہ میں اسلام کے محاسن پر بڑی خوبی کے ساتھ تبصرہ کیا ہے اس مقالہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مغرب کے غیر متعصب حلقوں میں اسلام کے بارے میں کیسے بلند و بالا خیالات موجود ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مقالہ بڑے غور اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا کیونکہ اس میں بہت سی ایسی باتیں بتائی گئی ہیں جو سب سے اہم ہیں۔ (مرسلہ م. س. کانپور)

موجودہ دور میں جب انسان ہر شے اور ہر عمل کو مادی اور اقتصادی زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے اور پوری دنیا میں مذہب کی گرفت مضبوط ہوتی چلی جا رہی ہے تو بظاہر یہ حقیقت بے حد تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ دنیا کا ہر ایک ایسا مذہب جو الہامی مذاہب میں سب سے کم عمر ہے آہستہ آہستہ سب کی توجہ کا مرکز بنتا چلا جا رہا ہے۔

یہ سطور میں اسلام کے بارے میں قلمبند کر رہا ہوں۔ آج اسلام مغربی دنیا میں ایک قابل توجہ مذہب بن چکا ہے اور وہ لوگ بھی جو خود اپنے آبائی مذہبوں کی تعلیمات میں روحانی سکون اور دنیاوی عملیت نہ پاکر خود مذہب سے بیزار ہو چکے تھے، اسلام کے گرویدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن ایسا کیوں ہے؟ ہمیں اُس کے اسباب کو معلوم کرکے یا تو اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ اسلام درحقیقت سچا مذہب ہے اور جو نظر

سچائی صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہمیں بلا تامل اس سچائی کو قبول کر لینا چاہیے یا پھر اگر ہم اس نتیجہ پر پہنچیں کہ دنیاوی اعتبار سے کچھ ایسے طریقے اس مذہب کے لیے اختیار کیے گئے ہیں جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں تو ہمیں اپنے مذہب کو مقبول بنانے کے لیے بھی انہی طریقوں کو اپنا لینا چاہیے۔

میں نے اسی زاویۂ نظر سے اسلام کے بنیادی عقائد اور دنیاوی زندگی کے نظام کا مطالعہ کیا ہے اور اس مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلام کے بنیادی عقائد بہت ہی طاقتور اور اس کا بنایا ہوا نظامِ زندگی بہت ہی مکمل اور انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ اسی لیے آج جب کہ پوری دنیا میں مذہب سے بے تعلقی کا جذبہ بڑھتا جا رہا ہے، اسلام آگے بڑھ رہا ہے، اور انسان اس مذہب کی طرف متوجہ ہوتا جا رہا ہے۔

میں نے کہا ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد طاقتور اور جاندار ہیں۔ میں ان الفاظ کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ عقائد آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاتے ہیں اور انھیں مان لینے کے بعد انسان کی پوری زندگی، اور زندگی کے ہر شعبہ میں انقلابی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر اسلام کا سب سے بڑا اور بنیادی عقیدہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانا ہے۔ لیکن اس کا یہی عقیدہ انسان کی پوری زندگی اور بنی نوعِ انسان کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کو بدل دیتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی وحدانیت پر یقین رکھنے والا انسان خود بخود یہ بات بھی سمجھنے لگتا ہے کہ اس دنیا اور تمام انسانوں کو پیدا کرنے والی وہی ذات واحد ہے، اس لیے سب انسان، انسانیت کے دائرہ میں ایک دوسرے کے برابر ہیں اور اس دنیا کی نعمتوں میں سب کا حق اور حصہ بھی مساوی ہے اس طرح صرف یہی ایک عقیدہ اتنا مضبوط ہے کہ کوئی شخص بھی اس کو ہلا نہیں سکتا اور کسی کو بھی اس کے دور رس لیکن بالکل

واضح اور مفید نتائج کی تردید کی جرأت نہیں ہو سکتی۔

پھر خدا تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لے آنے کے بعد انسان کو تمام تر توہمات سے نجات مل جاتی ہے، ہر شے پر خدائے تعالیٰ کی قدرت کا احساس انسان کو بے جا اندیشوں سے بے نیاز کرتا اور اس کی ہمت کو بڑھاتا ہے اور اسے اُس کی دنیاوی ترقیوں میں مدد دیتا ہے۔

اسلام موت کے بعد ایک دوسری زندگی کی یقین دہانی بھی کرتا ہے اور اُس زندگی کی نوعیت کو موت سے پہلے کی زندگی کے عمل پر مبنی قرار دیتا ہے۔ اسلام کا یہ عقیدہ زندگی کا نقشہ بدل دیتا ہے اور اس عقیدہ کا ماننے والا ہر شخص اپنی زندگی میں ایسے اعمال کے ارتکاب سے گریز کرنے لگتا ہے جو اس کی موت کے بعد ابدی زندگی کو مصیبت ناک بنا سکتے ہیں اور اسی مرحلہ پر انسان اُس نظام زندگی کو قبول کرتا ہے جو اسلام نے مرتب کیا ہے۔

ہم مغرب کے باشندے خصوصیت کے ساتھ سرگرم اور معروف زندگی کو پسند کرتے ہیں لیکن مغرب والوں کے موجودہ مذہب عیسائیت میں زندگی کو سرگرم بنانے کی بجائے اُسے معطل اور مسیحی خانقاہوں تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے انسان کو زیادہ سے زیادہ سرگرم رہنے کی ترغیب دی ہے اور ان سرگرمیوں کا ایک مکمل لائحہ عمل بھی عطا کیا ہے۔ اسلام کا یہ پہلو مغرب کے باشندوں کی توجہ کو خصوصیت کے ساتھ اپنی طرف کھینچتا ہے اور جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کے نظام حیات کے مطابق سرگرمی اور معروفیت میں گزرنے والا ہر لمحہ ان کے اجر و ثواب کو بڑھاتا اور اُن کی نجات کی ضمانت بنتا ہے، تو وہ قدرتی طور پر اس مذہب کو قبول کرنے کی جانب مائل ہو جاتے ہیں۔

اسلامی عبادات بھی بہت ہی آسان اور نفسیاتی زاویے سے انسان کی تعمیر کی

صلاحیتوں کو بڑھاتی اور اس کے علم میں اضافہ کرتی ہیں۔ میں اپنی جگہ ایسا سمجھتا ہوں کہ نماز انسان کی زندگی میں نظم اور باقاعدگی پیدا کرتی ہے۔ اور موجودہ دور میں زندگی کی یہی باقاعدگی کامیابی کی سب سے مضبوط ضمانت ہے، روزہ انسان کے ضبط نفس اور دوسروں کی عزت اور معاشی دشواری کے احساس کی بیداری کا موجب بن جاتا اور اس طرح انسان کو سماج کے کمزور اور معذور افراد کے ساتھ ہمدردی کی ترغیب دیتا ہے۔

حج، اسلام کی ایک ایسی عبادت ہے جس کی بنیاد اس مذہب کے بین الاقوامی نظریات پر رکھی گئی ہے۔ اس عبادت کی بدولت جہاں اسلامی مساوات کا مظاہرہ ہوتا ہے وہاں دنیا کے ہر گوشہ کے مسلمانوں کے درمیان برادرانہ روابط کی تجدید میں بھی یہ عبادت زبردست کردار ادا کرتی ہے اور مسلمان اُن تجربات، مشاہدات اور فوائد سے بھی اپنا دامن بھرتے ہیں، جو سفر اور سیاحت کی بدولت حاصل ہوتے ہیں۔ اور جو موجودہ دور میں بنی نوع انسان کی ترقی میں بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

اسلام انسان کو خوددار بناتا ہے۔ خدا کی وحدانیت کا عقیدہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام کے ماننے والے اپنے پروردگار کے علاوہ کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتے اور کسی کے روبرو ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ اسلام میں گداگری ایک معیوب فعل ہے اور اسی لیے اس نے ضرورتمندوں کی حاجت روائی کے لیے بیت المال سے امداد کی وظائف جاری کرنے کا طریقہ اختیار کرکے انسان کی خودداری کو برقرار رکھا ہے۔

بیت المال یا مسلمانوں کا قومی سرمایہ چونکہ براہ راست اسلامی ریاست کے زیر تسلط جمع اور خرچ کیا جاتا ہے اور اسلامی ریاست حاجت مندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی ذمہ دار ہے اس لیے وہ اس سرمایہ سے جن ضرورت مندوں کی مدد کرتی ہے وہ دوسرے لوگوں کے ممنون منت نہیں

ہوتے اور اُن کی خودداری برقرار رہتی ہے۔

میرا یقین ہے کہ یہ محاسن اسلام کے مزاج کے اہم عناصر ہیں اور انھیں کسی مقصد کے حصول کے لیے پالیسی کے طور پر اس مذہب میں داخل نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ عین فطری ہیں، اسی لیے یہ مذہب خصوصیت کے ساتھ مغربی دنیا کے باشندوں کے توجہ اور کشش کا موجب بنتا جا رہا ہے۔

• نظام الدین نظامؔ

تھے نہ اشک جہاں، مسکرائے ہیں یہ لوگ
نہ جانے کون سی دنیا سے آئے ہیں یہ لوگ
زباں، وہاں سے جسے بول چال کہتے ہیں
خیال، گہرے سمندر سے لائے ہیں یہ لوگ
جنہیں نصیب تھیں قد کی بلندیاں، وہ گئے
غروب ہوتے ہوئے دن کے سائے ہیں یہ لوگ
مرے قریب سے کچھ اس طرح گزرتے ہیں
جنازہ کاندھے پہ جیسے اُٹھائے ہیں یہ لوگ
نظامؔ چاند کو چھونے کی دُھن میں نکلا تھا
اسی کی لاش سمندر سے لائے ہیں یہ لوگ

• نظام الدین نظامؔ

کیسے کہوں کہ ہوگی ملاقات اب کہاں
میں خود بھی بے خبر ہوں کہ گزرے گی شب کہاں
سورج کوئی نیا نہیں ہے چاند بھی وہی
ہم بھی وہی ہیں، پہلے سے وہ روز و شب کہاں
تاریکیوں نے شہر میں پھیلا دیا ہے جال
کیا جانے آج رات لگے کی نقب کہاں
پڑھنا، کہ تم سے دور گزری ہے کس طرح
لکھنا، کہ ہم سے ہوگی ملاقات اب کہاں
وہ لوگ جن کے جسموں پہ چہرے بھی تھے نظامؔ
کیا جانے جا کے چھپ گئے وہ لوگ سب کہاں

غزلیں

تری شان ہے ایک اعلیٰ و برتر
یہ حق ہے کہ تو میرا معبودِ حق ہے
کئے آسمان و زمیں تو نے پیدا
ترے حکم کی کی ہے تعمیل سب نے
ہے شکر اس کی اُمت میں پیدا کیا ہے

نہیں کوئی تجھ سے زمانے میں بڑھ کر
یہ حق ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں کم تر
ہیں روشن ترے نور سے ماہ و اختر
ہو دریا و صحرا کہ ہو کوہ و پتھر
جسے کہتے ہیں شافعِ روزِ محشر

دعا ہے یہی ایک ہم کی تجھ سے
کہ ایماں پہ ہو خاتمہ ربِّ اکبر

(صابر علی رہنمو، فرخ آبادی)

فسانہ

کرچیاں

محمد رضی علیا

وہ بچپن ہی سے بہت غصہ ور مشہور تھی سب سے الگ تھلگ، منفرد، اپنے دکھ سکھ میں مگن رہنے والی۔ اس کی کوئی سہیلی نہ تھی اس کے چھ بھائی تھے اور وہ ان سب میں بڑی تھی۔ اسی لیے گھر میں بھی اس کا کوئی دوست نہ بن سکا۔ چھوٹے بھائی اس کا رعب سہنے ڈانٹ پھٹکار سننے اور طمانچے کھانے کے لیے مناسب تھے۔ بھلا یہ اس کے دوست کیوں کر بن سکتے۔ اماں اپنے مسائل و معروفیات میں بڑی بُری طرح منہمک رہتیں۔ ابا جان اپنے کاروبار میں مگن رہتے تھے۔ پڑوس میں سب کے سب جاہل۔ بھلا وہ ان سے کیوں دوستی کرے۔ اسکول اور کالج کی سہیلیاں انتہائی بکواس ہوتی تھیں۔ سوائے بکواس کے اور کیا ہوسکتا تھا ان سے۔ وہ ان سے بھی الگ تھلگ رہتی۔

وہ سارے کالج میں بددماغ، منفرد اور مغرور مشہور ہوگئی تھی۔ البتہ اُستاد صاحبان اُسے پسند کرتے تھے۔ چونکہ وہ محنتی اور سنجیدہ تھی اور ایسی طالبات کا کالج میں فقدان تھا۔ لڑکے اُسے دیکھ کر بدکتے تھے۔ ساتھی لڑکیاں اس کے سامنے ہونٹ بھی نہ ہلا سکتیں کچھ ایسا ہی اس کا رعب تھا۔

گھر کے کسی کام میں دلچسپی نہ لیتی۔ گھر میں کون آتا ہے، کون جاتا ہے، اُسے کیا خبر اور کیا پروا۔ سارا بوجھ اماں کے کندھوں پر تھا اور اماں اس کا غصہ اس کے چھوٹے بھائیوں پر اتارتیں۔ انھیں کئی کئی مرتبہ برتن دھونے پڑتے اور گھر کی صفائی کرنی پڑتی۔ اماں ان کو ڈائریکٹ اُسے بتاتیں کہ اب وہ اس

کی ان حرکتوں سے نالاں ہو چکی ہے۔ آخر کب تک
کوئی برداشت کرے۔

لیکن وہ کوئی توجہ نہ دیتی۔ اپنے کمرے
میں گھس کر پردہ گرا دیتی اور ضخیم ناولوں میں
کھو جاتی۔ کوئی کچھ کہے، کوئی سُنے نہ سُنے اُس
کی بلا سے۔ اماں دیر تک بڑبڑاتی رہتیں۔

وہ اتوار کا دن تھا اور گھر میں غیر معمولی
چہل پہل۔ اس نے ناشتہ کے بعد اپنے
آپ کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ آج اماں بھی
خاموش تھیں۔ کیونکہ ہر مرتبہ تو وہ اُسے ہفتہ کی
رات اور اتوار کی صبح میں دس دس مرتبہ
یاد دلاتیں کہ گھر دھونا ہے، "تو ان موٹی
موٹی کتابوں کو چولہے میں جھونک۔ کیا
حالت بنا رکھی ہے۔ اللہ کی مار! ابھی سے
دیدوں پر یہ موٹے موٹے چشمے چڑھا رکھے
ہیں۔۔۔ خیر! تو ہاں یاد ہے نا؟"

"ہاں! ہاں اماں یاد ہے۔" وہ پیر پٹختی
ہوئی اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ کتنا کہا
اماں کو ایک نوکرانی رکھ لو، مگر اُن پرے
کنجوسی! "نوکرانیاں چور ہوتی ہیں!" اس
نے دل ہی دل میں اماں کی نقل اُتاری اور
دھم سے پلنگ پر گر کر "سیفول" کا ناول اُٹھا لیا۔

......

دوپہر ہوتے خالہ جان تشریف
لائیں۔ اُن کے ساتھ اُن کی ماں، بیٹی اور
بڑے صاحبزادے تھے۔ اُس نے اُکتائی
ہوئی نظروں سے انھیں دیکھا اور دھیرا
دھیرا پیشانی تک ہاتھ اٹھا دیا۔ کیوں آتے
ہیں یہ کم بخت۔ ٹھنڈے ٹھنڈے گھر رہ
بیٹھیں یہاں آ کر تکلیف دیں۔

لیکن آج خالہ جان نے اُسے دیکھ کر منہ نہ
بنایا۔ رقیہ نے نظر انداز نہ کیا۔ اُن کی آنکھوں
میں عجیب چمک تھی۔ وہ زیادہ دیر تک وہاں
نہ ٹھہری اور اپنے چھوٹے بھائی نوید کو بلاتی
ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی۔

ڈرتا ڈرتا نوید داخل ہوا۔ وہ غصہ کو
ضبط کرکے بولی۔

"یہ پورا کا پورا ریوڑ کیوں آیا ہے رے؟"

"م۔۔۔ مجھے کیا معلوم آپی۔" بیچارہ
بُری طرح سہم گیا۔

"ہاں! ہاں! تجھے تو کچھ نہیں معلوم ہاں کے پاس تو گھسا رہتا ہے۔ اُن کی پیالی طشتری دھو کر دیتا ہے غلاموں کی طرح..." اپی نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ مارا۔

"اپی! دیکھیے، بس!... غلام نہ کہیے" یک بیک نوید کو غصہ آگیا۔

"اچھا نہیں کہتی! بول وہ کیوں آئے ہیں؟" اپی نے بڑے پیار سے پوچھا اور وہ اس غصہ میں چیخا۔

"آپ کو بتا...!" اپی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور دانت پیس کر بولی۔

"بھاگ یہاں سے۔" وہ جان چھڑا کر بھاگا۔ اس نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ گہری سوچ میں کھو گئی۔

"اُف یہ جاہل! انھیں اس کے سوا کوئی اور کام سوجھتا ہے!" وہ بہت دیر تک غصہ میں ہونٹ چباتی رہی۔ مٹھیاں بھینچتی رہی۔

کچھ ہی دیر بعد خوش خوش اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔

"اماں یہ کیا ہو رہا ہے؟" اُس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"چُپ — چُپ —" اماں ہونٹوں پر انگلی رکھتی ہوئی بولی۔

"چل جلدی سے تیار ہو جا۔ وہ لوگ کیا کہیں گے؟"

"نہیں اماں! میں نہیں آؤں گی۔ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ اتنے ہی میں اُدھر سے ابا اس کے کمرے میں داخل ہوئے اور اماں اسے غصے سے گھورتی باہر نکل گئی۔

"کیا ہوا بھئی ہماری بیٹی کیوں ناراض ہے؟" وہ حیران رہ گئی۔ ابا میاں نے ایسی محبت سے تو آج تک نہ کہا تھا۔ وہ پگھل گئی۔

"ابا میاں! مجھے یہ سب پسند نہیں۔" وہ ٹھنکی۔

"ارے میری بیٹی! ہمیں بھی یہ پسند نہیں مگر کیا کریں۔ مجبوری ہے۔ یہی تو قانونِ فطرت ہے۔ پھر تو عزیزوں میں تھوڑی جلدی ہے۔

تیری خالہ بھی کچھ بُری نہیں۔ تو دور نہیں جائے گی چل جلدی سے آجا۔ ہم سب منتظر ہیں۔

ابامیاں چلے گئے۔ نہ جانے اُن کے الفاظ میں کیا جادو تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلنے لگی۔

....

ایک مہینے بعد بشارت دولھا بنے گھر آئے اور نہایت سادگی سے اُسے اپنے گھر لے گئے۔ وہ بالکل خاموش رہی تھی۔ کچھ احتجاج نہ اعتراض۔ اس موقع پر اُس کے من کا کوئی تار نہ جھنجنایا۔ وہ تو اپنے باپ کی خواہش پر عمل کر رہی تھی۔ جو پچیس برس تک اس کے وجود سے بے خبر رہے اور پھر ایک دن اچانک اُسے شفقت کے سمندر سے سیراب کر دیا۔ کتنے میٹھے بول تھے وہ۔

شادی کے وقت وہ نہ بہت زیادہ خوش ہوئی اور نہ ایک ایک کے گلے لگ کر روئی دھوئی۔ اُسے ان تمام باتوں سے سخت نفرت تھی۔ البتہ اماں نے اُسے سینہ سے لگا کر بہت اثر لیا۔

بشارت بالکل سیدھے سادے قسم کے انسان تھے۔ بہت سلجھے ہوئے دور اندیش اور متین قسم کے آدمی۔ انھیں اس کی غصہ ور عادت کا علم تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ ہنستے رہتے اور اس فکر میں رہتے کہ اُسے کبھی غصہ نہ آئے۔ مگر اماں بھلا یہ سب نخرے کہاں برداشت کریں۔ بہو کی خالہ اور الگ تھلگ بن اُنھیں ایک آنکھ نہ بھا پہلے پہل تو انھوں نے خوب سمجھایا۔ پر چھوٹے موٹے جھگڑے ہونے لگے۔ وہ کہا چُپ رہتی۔ اس نے کھری کھری سُنائی بشارت کو اچانک بڑا ہنگامہ خیز غصہ آیا۔ انھوں نے اس کے گال پر بھر پور طمانچہ رسید کر دیا۔

وہ سکتے میں آگئی۔ نہ روئی اور نہ فر کی۔ چُپ چاپ کمرے میں آئی۔ ایک سو کیس میں کپڑے بھر کر سب کو حیران و پریشان چھوڑ باہر نکل گئی۔ آٹو رکشا کے ذریعے آدھ گھنٹے بعد وہ اپنے گھر میں تھی۔

اماں اس کو یوں دیکھ کر بوکھلا گئیں۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے میں گھسی۔ اس کا کمرہ چھوٹا تھا۔ اماں اور ابا میاں کے سمجھاتے سمجھاتے کچھ دن بنا تو بشارت کو بلوایا اور اسے سمجھانے لگے بے چارہ پہلے ہی اُداس تھا۔ اماں نے بیٹی کو بلوایا تو اس نے پہلے تو آنے سے انکار کر دیا پھر منہ پھلائے آئی۔ اماں اُٹھ کر چلی گئیں دونوں اجنبی اجنبی سے بیٹھے رہے۔ آخر بشارت نے سکوت توڑا۔

"فرخ! آخر بات بھی تو کچھ ہو۔ یوں روٹھا نہیں کرتے ہو۔"

"مجھے ایسے جملوں سے سخت نفرت ہے۔ براہ کرم مجھے طلاق دے دیں۔" ایک گولی زناٹے سے چلی اور بشارت کے دل و دماغ میں پیوست ہو گئی۔ وہ غصے سے اُٹھ کھڑا ہوا اور بغیر کچھ کہے باہر نکل گیا۔

پھر اُسے طلاق ہو گئی۔ اماں اور ابا میاں پر دکھوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مگر اُسے رتی برابر فکر نہیں ہوئی۔ اس نے ایک کالج میں نوکری کر لی۔ وہ ... کالج کی خشک ... رہتی۔

دس برس ہوا کے ایک تازہ خوشگوار جھونکے کی طرح گزر گئے۔ کچھ احساس ہی تو نہ ہوا۔ یہ دن کیسے جلدی جلدی مہینے اور سالوں میں بدل جاتے ہیں اور حسرتوں کے داغ چھوڑ جاتے ہیں۔

اس عرصے میں اماں اور ابا میاں یکے بعد دیگرے ...... زمین کے پیوند ہو گئے۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بڑے ہو گئے کچھ پڑھ لکھ کر نوکر ہو گئے۔ کچھ پڑھ رہے تھے۔ مگر سب کا دل گھر سے اچاٹ تھا۔ گھر میں تھا ہی کون، خشک بے رس اور ضدی آپی، جس کی دنیا کالج اور کتابوں ہی میں کھو گئی تھی۔ جس کی زندگی کی کتاب کے اوراق بوسیدہ ہو رہے تھے۔ مگر جس کا غرور اب بھی انتہا پر تھا۔ وہ نہ جانے کیا تھی۔ کوئی نہ جانتا تھا۔

پھر تینوں بڑے بھائیوں نے اس سے پوچھے بغیر شادی کر لی اور اپنے سسرال میں بس گئے۔ دو چھوٹے بھائی امریکہ چلے گئے سب سے چھوٹا البتہ ابھی پڑھ رہا تھا۔ مگر

بھائیوں کی تاکید تھی کہ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی انھیں مطلع کرے وہ اُسے بھی امریکہ بلائیں گے۔ وہ اکیلی تھی۔

ہمیشہ ہی سے تو اکیلی تھی۔

پھر ایک دن راستے میں اُسے بشارت مل گئے۔ اُن کے ساتھ اُن کی بیوی اور بچے بھی تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے وہ دیکھتی ہی رہی مگر بشارت آگے نکل گئے۔ اُن کی والدہ اُسے جانتی تھیں اُسے دیکھ کر وہ مسکرائیں۔ وہ گڑبڑا گئی۔ کتنا طنز تھا اُن نظروں میں۔ اس کی نظریں۔ پھر بشارت کی پشت سے ٹکرائیں۔ کیا جاندار انسان ہے یہ۔ کبھی یہ اسی کا تو تھا۔

"اُف ـــ یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ ایسی گندی، بُری باتیں، مجھ ایسی پڑھی لکھی پر زیب بھی دیتی ہیں؟"

وہ گھر کی جانب تیز تیز بڑھنے لگیں۔ مگر اب اس کی ٹانگیں جواب دے رہی تھیں اب کتنی تھک گئی ہے وہ۔ اس نے قریب سے گذرتی سواری کو روکا اور بیٹھ گئی۔

گھر میں حسبِ معمول وحشت تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آئی۔ کمرے میں کتابوں کا ایک ذخیرہ تھا۔ لیکن آج وہ انھیں ناپسندیدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے زندگی کے چالیس برس اس کمرے میں ایک خواب کی طرح گذر گئے۔ کچھ پتہ نہ چلا۔

اتنے ہی میں اُسے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ وہ کمرے سے باہر نکلی آواز گودام سے آرہی تھی۔ وہ بڑھی۔ گودام میں نوید بیٹھا ایک دھول سے اَٹی پیالی کو تھامے سسک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر چُپ ہوگیا۔ اُسے معلوم تھا کہ آپی روتے چہروں سے نفرت کرتی ہیں۔ اُن پر سخت برہم ہوتی ہیں مگر آج آپی اُسے گھورے جارہی تھیں اور سوچے جا رہی تھیں۔

"کیوں رو رہے ہو نوید؟" وہ حیران رہ گیا۔ یہ لہجہ آج کتنا ٹوٹا ہوا ہے۔ ہر وقت تو اس میں کڑک رہتی تھی۔ اُسے سہارا ملا۔ اس کے آنسو اُبلنے لگے۔

"آپی! اس پیالی کو جانتی ہو۔ اس میں

روزانہ اماں چائے بناتی تھیں اور میں اسے دھوتا تھا اور تم مجھے غلام کہتی تھیں۔ اس وقت مجھے کتنا ناگوار گزرتا تھا مگر اب — اب آپی — کوئی میری اماں، میری مالکن کو بلائے یہ غلام ساری زندگی اُن کی غلامی کرے گا۔ آپی۔ اماں کے بغیر میں " وہ بلک بلک کر رونے لگا۔

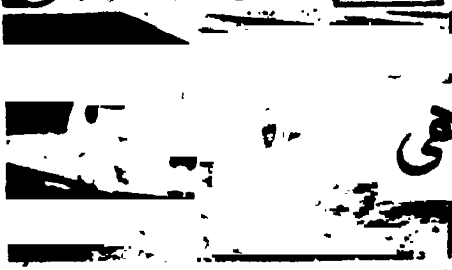
وہ اُسے دیکھتی رہی۔ "کبھی کبھی یہ آنسو کتنے بھلے لگتے ہیں۔ انسان کو ہلکا پھلکا کر دیتے ہیں۔ مگر میرے آنسو کیوں خشک ہو گئے ہیں۔ میں کب تک ایسی ہی خشک رہوں گی۔ میری زندگی کی خزاں کبھی بہار میں نہ بدلے گی؟" وہ بے اختیار سوچے جا رہی تھی۔ پھر — اچانک وہ اٹھی اور نوید کو گلے سے لگا لیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"نوید پیارے! میں ہوں تیری آپا۔ میں ہوں تیری ماں۔ میں ہوں تیری لونڈی!"

نوید حیران تھا کہ یہ میری بہن وہی ہیں۔ یا اللہ نے کسی اور کو ان کے بدلے بھیج دیا ہے۔

ہوشیار رہ	اختیار کر	مت چل
۱۔ دشمن کے وار سے	۱۔ عیب پوشی	۱۔ اکڑ کر
۲۔ نادان کے پیار سے	۲۔ چشم پوشی	۲۔ برے لوگوں کی روش پر
۳۔ مطلب کے یار سے	۳۔ سفید پوشی	۳۔ مطلبی یاروں کے مشورہ پر۔
۴۔ خالی اور بیکار سے	۴۔ عبادت	۴۔ ٹیڑھے راستے پر۔
۵۔ اُدھار کے بیوپار سے	۵۔ سخاوت	۵۔ نفس کی ہر خواہش اور جی چاہنے پر۔
۶۔ بیچ بچاؤ میں خود ملوث ہونے سے	۶۔ بُردباری	۶۔ بے سوچے سمجھے کسی کے کہنے پر۔
۷۔ سفر اور بازار میں پاکٹ مار سے	۷۔ خاموشی	۷۔ دنیا سے بغیر توشۂ آخرت لئے۔

مرسلہ: خالصہ خاتون۔ رامپور۔ یوپی



زمانے کی گواھی

(۱)

آندھیاں طوفان باد و باراں، قحط، خشک سالی مہلک وبائیں اور زلزلے قدرتی آفات ہیں اور کرۂ ارض کا کوئی ملک ان آفات ناگہانی سے محفوظ نہیں۔ سمندری زلزلوں سے تو حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ پرانے جزیرے غرقاب اور نئے جزیرے نمودار ہو جاتے ہیں۔ وسیع و عریض و گہری جھیلوں کا پانی خشک ہو جاتا ہے اور خشک کنویں پانی سے بھر جاتے ہیں۔ پچھلے موسم سرما میں کیلیفورنیا کی جھیل رولنز جو ۱۵۰ فٹ گہری ہے اور جس کے ذریعہ گرد و نواح کے بہت سے قصبوں کو پینے کا پانی مہیا ہوتا ہے۔ یکایک سوکھ گئی اور لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس میں صرف ۱۰ فٹ گہرا پانی رہ گیا اس جھیل میں چلنے والی ہاؤس بوٹ لنگر رہ گئی اور کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ سو فٹ گہرا پانی کہاں غائب ہو گیا۔

نومبر ۱۹۸۲ء میں سکاٹ لینڈ اور دوبارہ انگلستان میں برفانی اور سمندری طوفان نے کافی تباہی مچائی اور اخبارات نے لکھا کہ ایسا طوفان گزشتہ نصف صدی میں کبھی نہیں آیا تھا۔ لیکن برطانوی ماہر موسمیات کا کہنا تھا کہ دنیا کے دیگر حصوں کے آفات ناگہانی کے مقابلہ میں یہ طوفان کہیں کم ضرر رساں تھا۔ ماہرین نے صدیوں پرانے ریکارڈ کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ برطانیہ واحد ملک ہے جہاں طوفان بہت کم آتے ہیں اور دیگر قدرتی آفات کے باعث شرح اموات دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلہ میں کم ہے۔

ماہرین نے اس سلسلے میں مشرقی یورپ ہندوستان اور دیگر ایشیائی ممالک میں پچھلے تین پچیس برس کے دوران قدرتی

آفات سے ہونے والی اموات کے جو اعداد و شمار پیش کیے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے ہر خطے کے لوگ کسی نہ کسی رنگ میں خدائی قہر کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر نومبر ۱۹۷۰ء میں آندھرا پردیش میں جو اچانک سمندری طوفان آیا تھا۔ اس میں ۹ ہزار افراد ہلاک ہو گئے تھے اور درجنوں دیہات کا نام و نشان تک مٹ گیا۔

سنہ میں جاپان میں سمندری طوفان ۴۰ ہزار مکانات کو بہا لے گیا تھا اور ان گنت افراد لقمہ اجل بن گئے تھے۔

اس آفت کی ہولناکی سے لوگ ابھی سنبھل نہ پائے تھے کہ جنوبی مینا میں زلزلہ آ گیا اور ۳ ہزار انسانی جانیں تلف ہو گئیں یکے بعد دیگرے کئی جھٹکے آئے اور کئی ماہ میں ۵۰ ہزار مکانات منہدم ہو گئے

لیکن آج سے چار ساڑھے چار سو برس پہلے ۱۵۵۶ء میں چین میں اس قدر شدید بھونچال آیا تھا کہ اس میں ... ۸۳۰ افراد ہلاک ہو گئے تھے اور ایک کروڑ بے گھر۔ اس کے بعد صدیوں تک ایسا بھیانک زلزلہ کبھی نہیں آیا اور اگر آیا تو پھر اسی ملک میں تنگ شان کے مقام پر۔ اس کی شدت بھی صدیوں پرانے بھونچال کی سی تھی یعنی اس میں ۲۳۷، ۶۵۵ افراد ہلاک اور ۷ لاکھ ۹۰ ہزار زخمی ہو گئے مزید برآں لاکھوں لوگ بے خانماں برباد ہو کر رہ گئے تنگ شان پر یہ خدائی قہر جولائی ۱۹۷۶ء میں نازل ہوا تھا اور آج بیس بائیس برس گزر جانے کے باوجود لوگ اس کی ہلاکت خیزیوں کا تصور کر کے لرز جاتے ہیں۔

۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ یوگوسلاویہ کے شہر سکوپجی کے ہوائی اڈہ سے جیٹ طیارہ کی اڑان کے بعد لوگ مسافروں کو الوداع کہہ کر لوٹنے ہی والے تھے کہ زمین کانپنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مکان گرنے شروع ہو گئے۔ آدھ منٹ کے شدید جھٹکوں نے سارا شہر تباہ کر دیا اور زائد از دو ہزار افراد موت کے منہ میں جا پہنچے۔

اس طرح مارچ ۱۹۷۷ء میں رومانیہ کی راجدھانی بخارسٹ میں بھونچال سے چار سو افراد ہلاک اور زائد از ۲ ہزار زخمی ہو گئے

عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ اس زلزلے میں چھ رفت چند سیکنڈ رہا۔ مکانات یوں گرے جیسے ٹھوکر لگنے سے مٹی کے گھروندے گرتے ہیں۔

۱۹۳۹ء کا سال ترکی کے لیے بڑا منحوس ثابت ہوا تھا۔ اس سال وہاں تین بار زلزلے آئے اور زائد از پانچ ہزار افراد مر گئے۔

خشک سالی اور اس کے نتیجہ میں قحط سے بھی کچھ کم تباہی نہیں ہوئی۔ ۱۹۸۴ء میں ایتھوپیا اور جنوبی مغربی افریقہ میں لگاتار بارش نہ ہونے کے باعث اس قدر قحط پڑا کہ ہزاروں لوگ بھوکوں مر گئے۔

روئے زمین پر آئے دن اس قسم کے قدرتی مصائب کو دیکھ کر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ان قدرتی آفات میں قدرت کی کیا مصلحت ہے۔ بسے بسائے شہر کے شہر دم زدن میں نیست و نابود ہو جاتے ہیں ان گنت جانیں طوفان کی ایک جھپٹ میں تلف ہو جاتی ہیں۔ بے شمار سبز و شاداب خطے پل بھر میں اجڑ کر بیابان بن جاتے ہیں۔ آخر اس میں قدرت کیا بہتری دیکھتی ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا کوئی منطقی جواب ہو ہی نہیں سکتا۔ قدرت کے اس جبر و قہر سے طرح طرح کے فلسفوں نے جنم لیا کئی فلاسفروں نے اسے جبار و قہار قدرت کا مظہر بتایا ہے جس کے اظہار سے یہ قدرت کاملہ اپنی ہستی کا ثبوت دیتی رہتی ہے۔ اس خیال نے انسان کو قدرت کے متعلق کئی پختہ عقائد دیے۔ اس سلسلے میں اردو کے ایک شاعر کی رباعی پڑھیے۔

اوجھل ہے مگر روئے نشانات بھی ہے
چپ چاپ اشاروں سے مگر بات بھی ہے
کہتا ہے کبھی زور کا جھٹکا دے کر
انسان! خبردار مری ذات بھی ہے

اپنی ہستی کو ASSERT کرنے کا قدرت کا یہ طریقہ انسان کو پسند ہو یا نہ ہو قدرت کی یہ ASSERTION بارہ مہینے چوبیس گھنٹے جاری رہتی ہے۔

• علامہ اقبال نے دنیا کی ہر فاتح قوم کی ابتدا و انتہا کو صرف ایک یادگاری شعر میں سمو دیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔

آ بجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

یعنی فاتح اقوام کی ابتدار بہادرانہ شمشیر زنی سے ہوتی ہے اور فتح و کامرانی کے بعد ان کی اولاد عیش و عشرت اور رنگ رلیوں میں ڈوب کر ختم ہو جاتی ہے۔ مغل عہد کا آخری دور بھی عجیب عجیب رنگیلے شہزادوں کا دور تھا۔ آپ کو یہ سن کر شاید حیرانی ہوگی کہ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں ایک شہزادہ پتنگ بازوں کا بادشاہ " کہلاتا تھا۔ اس شہزادے کا اصلی نام تو شاید اب کسی کو بھی یاد نہیں انھیں سب " میر صاحب " کہتے تھے۔ وہ بہادر شاہ ظفر کے بھتیجے تھے۔ یہ میر صاحب ۹۰ سال کی عمر تک جئے۔ پتنگ بازی اور پتنگ بازوں کی سرپرستی میں اپنی مثال آپ ہی تھے۔ کہتے ہیں۔ انگریزوں نے ان کے نام جتنی بھی جائیداد بحال رکھی تھی۔ انھوں نے وہ سب کی سب بیچ بیچ کر پتنگ بازی میں اڑا دی تھی۔ لکھنؤ، آگرہ اور دہلی کے فنکار پتنگ بازوں کو وظیفے دے دے کر بلاتے اور پتنگ بازی کے مقابلے کرواتے۔ آخری عمر میں "میر صاحب" کو میر پتنگ کہا جانے لگا۔ وہ اپنے اس عوامی لقب پر پھولے نہیں سماتے تھے۔

جامع مسجد ایریا کے ایک ۹۰ سالہ بڑھے حاجی ظہیر الدین نے بتایا: "میں نے اپنے بچپن میں شہزادہ پتنگ کو دیکھا تھا۔ بڑھاپے سے کمر دوہری ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی آسمان میں اُلجھے ہوئے دو پتنگوں کے ماجھوں کی کشاکش دیکھ کر فوراً بتا دیا کرتے تھے کہ کونسی پتنگ کٹے گی اور کون سی جیتے گی۔

ایمان کی خاطر

وقار عظیم ندوی (شعبہ عامہ)

موجودہ صدی کی چھٹی دہائیاں بہت کم
یخ میں فیصلہ کن سالوں کی حیثیت رکھتی ہیں
ہ زمانہ ہے کہ جب تبت پر چین کے دانت
ے ہوئے تھے۔ چین اس کو خاص طور پر
ں لیے اہمیت دے رہا تھا کہ تبت دنیا کی
ت ہے لہذا فوجی نقطۂ نظر سے اس کی کافی
یت ہے۔ دور اندیش نگاہیں صاف طور
دیکھ رہی تھیں کہ ملک عنقریب سرخ آندھیوں
زد میں آنے والا ہے۔ حالات تیزی سے
ار رہے تھے، حتیٰ کہ ۱۹۵۹ء تک تبت پر
ن کا مکمل تسلط ہو چکا تھا۔

کمیونزم کا جہاں بھی تسلط ہوا، سب
ے بڑا اور واحد خطرہ اس کے سامنے اسلام
ابت کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام
لوں ہی کو سب سے زیادہ مصیبتیں جھیلنی

پڑی ہیں۔

تبت پر چین کا قبضہ خود اس بات کا
اعلان تھا کہ اب اس ملک میں دین و ایمان
کے ساتھ جینا ناممکن و محال ہے، جسے خدا و
رسول پیارے ہوں اس ملک کو خیرباد کہے
یہ خیالات وہاں کے مسلمانوں کو سخت پریشان
کر رہے تھے۔ بالآخر انھوں نے کافی غور و
فکر کے بعد ملک کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے
کا فیصلہ کر لیا، وطن کسے پیارا نہیں ہوتا لیکن
ایمان عزیز تر ہے۔

انھوں نے اپنے گھر و بار کی کنجیاں چینیوں
کے ہاتھوں میں رکھ دیں اور ان سے کہا کہ یہ
سب تمہارا ہے، ہمیں خالی ہاتھ ہی یہاں سے
نکل جانے دو۔ چینی اب یہ سمجھ چکے تھے کہ جذبات
کے اس سمندر کو قابو میں رکھنا ناممکن ہے لہذا

انھیں ملک چھوڑنے کی اجازت دینی ہی پڑی۔

تحریک ہجرت شباب پر تھی، قرآن کریم کی یہ آیت۔ ربنا اخرجنا من هذه القرية الظالم اهلها۔ (اے مالک! ظالموں والی اس بستی سے ہمیں نکال لے) ہر شخص کے دل کا حال بن رہی تھی۔ اللہ و رسول پر ایمان رکھنے والے قلوب بے چین و مضطرب تھے لیکن چین کا رویہ ابھی تک ساری کوششوں کا ایک جابرانہ و مختصر جواب تھا: نہیں!

حالات کی اس مختصر تصویر کے بعد اب ہم ایک تبتی خاتون کا واقعہ ذکر کرتے ہیں، جو خود انہی کا بیان کردہ ہے، یہ سن رسیدہ خاتون اب طائف میں مقیم ہیں۔

ان محترم خاتون نے بتایا کہ تبت میں ان دنوں چین کے قبضہ کے بعد سب لوگ یہ سمجھ چکے تھے کہ اب اس ملک میں مسلمان بن کر نہیں رہا جا سکے گا جس کے نتیجہ میں تمام مسلمان ملک چھوڑنے کا متفقہ فیصلہ کر چکے تھے۔ بچہ بچہ کی فکر یہی تھی کہ کب ملک چھوڑنے کی اجازت ملتی ہے لیکن چینیوں کے رویّہ سے اس بات کی امید نہیں تھی کہ وہ ہجرت کی اجازت دیں گے۔ یا کبھی میں خود سے دریافت کرتی کہ کیا میں تبت کی خاطر اسلام چھوڑ سکوں گی؟ یہ سوچتے ہی مجھے ایسا لگتا گویا مجھے کوئی آگ کے بھڑکتے ہوئے الاؤ میں دھکیل دینا چاہتا ہو اور میرے وجود میں ایک کپکپاہٹ رینگ جاتی، آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے مجھے جان کی بازی لگانی پڑے لیکن میں اسلام کو خیرباد نہیں کہہ سکتی.. تبت میں مستقبل کے متعلق جتنی فکر بڑھ جاتی تھی اتنی میرے ارادہ میں پختگی آتی جاتی تھی۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے اعصاب میں اس وقت اتنی قوت کہاں سے آ گئی تھی۔

ایک دن کی بات ہے جب کہ میں اپنی فکروں میں ڈوبی ہوئی تھی، میرا ذہن گویا اس کوشش میں تھا کہ کوئی راہ ڈھونڈ نکالے مسلمانوں کا ہجرت یا اصرار اور چینیوں کی یکسر نفی ایک لاینحل مسئلہ تھی کہ اچانک میرے ذہن میں ایک بات آئی جس کے تصور سے اب میں کانپ اٹھتی ہوں لیکن اس وقت مجھے اس

بات سے یک گونہ خوشی ہوئی تھی۔ اللہ نے دو تین بچے دے رکھے تھے، میں نے سوچا کہ جلد ہی کسی دن اپنے بچوں سے پوچھوں گی کہ وہ کیا کھانا چاہتے ہیں اور ان کی دوسری خواہشات کیا ہیں، پھر ان کی خواہشات پوری کر کے انہیں لے کر پاس کے دریا پر جاؤں گی اور سب کو اس کی موجوں کے سپرد کر دوں گی اور خود بھی ان سے جا ملوں گی۔ میں یہ سوچنے پر اس لیے مجبور ہوئی کہ میں دیکھ رہی تھی کہ یہ بچے اسلام پر قائم نہیں رہ سکیں گے، کافر بن کر رہنے سے موت کہیں اچھی ہے۔ لہٰذا کیوں نہ ہمارا خاتمہ اسلام پر ہی ہو۔

اس خاتون کا یہ واقعہ سوچ کر ایسا لگتا ہے گویا اعصاب میں ایک دم بجلی دوڑ گئی ہو، ایک ماں جو سراپا شفقت و محبت ہے، جس کے پیار کی گہرائیوں کو آج تک پایا نہیں گیا جو اپنے بچوں کی خاطر اپنے وجود کو بھی ہر دم وارنے کے لیے تیار رہتی ہے وہی ماں اپنے لخت ہائے جگر کے متعلق اتنا سخت فیصلہ کرے۔

یہ یقیناً ایک سوال ہے جس پر کسی کو حیرت بھی ہو سکتی ہے لیکن جسے ایمان کی اہمیت معلوم ہو، جس کا دل اس کی لذت سے کبھی آشنا ہوا ہو، وہ اس واقعہ پر قطعاً متعجب نہیں ہوگا۔ ایمان کی قوت ازل سے ایسے کرشمے دکھاتی رہی ہے۔ ایمان کی بے پناہ قوت کے سامنے بڑی بڑی مصیبتیں آسان اور بڑے بڑے مسائل حل۔ ان خاتون کے اس قصے پر ہمیں اس لیے بھی حیرت نہیں کہ اس عالم مادی کا یہ اصول ہے کہ جب کسی چیز کو دو قوتیں مختلف سمتوں میں کھینچتی ہیں تو وہ شے، زیادہ طاقتور قوت کی جانب خود کھنچ جاتی ہے، بالکل اسی طرح ان خاتون نے اپنے دل میں ایک کش مکش محسوس کی۔ ایک طرف دنیوی رشتہ و تعلق تھا اور دوسری طرف ایمان کی قوت اور ایمان کی فتح ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کی نصرت کا بھی عجیب طریقہ ہے جب ایمان والے ایمان کی خاطر آخری قربانی پیش کرتے ہیں، یا اس کے لئے تیار

ہوا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی نصرت بھی آجاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے مخلص دبے ہوئے بندے فتحیاب وغالب ہوتے ہیں۔ غزوۂ خندق خدا کے اسی نظام نصرت کی ایک تفسیر ہے۔

ان خاتون کا کہنا ہے کہ "اللہ کی عجیب شان ہے کہ میں نے یہ ارادہ کیا ہی تھا کہ دو چار دن میں یہ معلوم ہوا کہ تبت چھوڑنے کی اجازت مل گئی۔ ہم لوگوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کی دعائیں سن لی تھیں۔

اجازت ملتے ہی ہم لوگ اپنی ساری جائدادیں تبت میں چھوڑ کر صرف اللہ و رسول کا نام سینے سے لگائے ہندوستان کی سرحدوں کی طرف چل دیے!"

اس آدمی کی محبت

یہ ہاتھ چومے گئے، پھر بھی بے گلاب رہے — جو رُت بھی آئی، خزاں کے سفیر ایسی تھی
شہادتیں مرے حق میں تمام جاتی تھیں — مگر خموش سے منصف، نظیر ایسی تھی
کتر کے جال بھی، صیاد کی رضا کے بغیر — تمام عمر نہ اُڑتی، اسیر ایسی تھی
وہ میرے پاؤں کو چھونے جھکا تھا جس لمحے — جو مانگتا اُسے دیتی، امیر ایسی تھی
پھر اُس کے بعد نہ دیکھے وصال کے موسم — جدائیوں کی گھڑی چشم گیر ایسی تھی
بس اک نگاہ مجھے دیکھتا، چلا جاتا — اُس آدمی کی محبت فقیر ایسی تھی

نہ سر کو پھوڑ کے تو مر سکا تو کیا شکوہ
جنوں شعار کہاں میں بھی ہیر ایسی تھی

پروین شاکر

جہاد

دنیا میں جو قوم بھی اپنے کو دنیا کی امامت و قیادت کے لئے پیش کرتی ہے وہ جب تک اپنے خون کے سمندر میں خود غوطہ نہیں لگاتی، اس منزل کو نہیں پہونچتی۔ اجتماعی ترقیات کا ذریعہ صرف ایک ہی ہے اور وہ جہاد ہے یعنی ہر پہلو کا جہاد، نفس کا جہاد، علم کا جہاد، مال کا جہاد، عقل کا جہاد جسم کا جہاد، اور اس راہ میں جان و مال و اولاد و عزیزا اور ہر محبوب سے محبوب اور عزیز سے عزیز متاع کی قربانی، یہ تو مطلق جہاد کی راہ ہے لیکن جہاد فی سبیل اللہ یعنی خدا کی راہ میں جہاد کی منزلیں تو اس سے بھی زیادہ کٹھن ہیں، جہاد اپنے لئے نہیں، بلکہ خدا کے لئے، خدا کے دین کے لئے اور خدا کے حکم کے لئے قومیں نہیں، بندے اپنے آپ کو قربان کرتے ہیں کہ اللہ کی بات کا بول بالا ہو، لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا و یکون الدین کلہ للہ یعنی دین اور اطاعت صرف خدا کی ہو جائے، آج ضرورت ہے کہ ہم پھر اپنی آواز بلند کریں اور حق کی منادی دنیا کو بتائیں کہ اس کا امن او رچین قومی و نسلی امتیازات اور تفرقوں میں نہیں بلکہ پیغام حق کے قبول کرنے میں ہے، پیغامی برادری قائم ہو جس میں پیغام کے ہر قبول کرنے والوں کو برابری کا درجہ ملے اور اس پیغام کے مقدار قبول اور اس کے لئے جد وجہد کی ذمہ داری کے قبول کو حقوق کی کمی و بیشی کا معیار بنایا جائے۔ لیکن یہ پوری طرح یقین کر لینا چاہئے کہ دنیا میں کسی پیغام یا کسی تحریک و دعوت کی کامیابی اس پیغام اور دعوت کی صرف عمدگی سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے علمبرداروں کی جد وجہد، سعی و محنت، سرگرمی عمل اور ایثار و قربانی سے ہو سکتی ہے۔ دنیا ایک بحر رواں ہے۔ اس بحر رواں میں وہی زندہ رہے گا جو خود بھی رواں ہے۔"

(مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ)

جنگجو

اسلام کا موضوع آتا ہے تو مغربی مصنفین کا قلم از خود بہک جاتا ہے۔ اسلامی تحریکوں کی کامیابی سے انکے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے زیر دستوں کی منڈی میں بغاوت پیدا ہو گئی ہے۔ صدر کلنٹن نے اسلامی تحریکات کے خصوصی مطالعے کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح مغرب کے جرائد میں بھی عالم اسلام کی بیداری موضوع بحث بنی ہوئی ہے لندن کے مشہور علمی جریدے اکانومسٹ میں "جنگجو اسلام" کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون حال ہی میں شائع ہوا ہے اس میں بعض تبصرے بڑے ہی معلومات افزا ہیں لیکن دیکھنے کی چیز مغربی مصنفین کی تجسس و تلاش ہے۔ قارئین مجلہ کے فائدے کے لئے اس مضمون کا ترجمہ دیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ اسے دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

مسلم اکثریتی ممالک میں یہ دعویٰ بڑے شد و مد کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ سیاست سمیت زندگی کے ہر شعبے کا مرکز اسلام ہے لیکن یہ دعویٰ نیا نہیں ہے۔ اسلام کی ہمہ گیریت کے متعلق دعویٰ اور اس سے پیدا ہونے والا سیاسی دباؤ اسلامی ریاست میں موجود رہا ہے۔ پچھلے چند برسوں میں جو نیا واقعہ رونما ہوا ہے وہ یہ ہے کہ بہت سی اسلامی ریاستوں میں اس اسلامی دباؤ نے بیک وقت سیندھ لگائی ہے جیسا کہ ایران کی حالیہ بغاوت سے ظاہر ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ بیسویں صدی کے آخری ربع میں اسلام نے اتنی قوت اور طاقت حاصل کر لی ہے کہ وہ مرکز زندگی ہونے کا دعویٰ کر سکے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ دعویٰ اسلام ہی کیوں کرتا ہے، وہ کیاں بڑے مذاہب مسیحیت اور بدھ مت کیوں نہیں کرتے؟

اس کی متعدد وجوہ سامنے آتی ہیں۔

سب سے پہلے جو وجہ بظاہر معلوم ہوتی
ہے اگرچہ اس کا تذکرہ بہت کم ہے۔ وہ یہ ہے
اسلام نسبتاً جوان مذہب ہے۔ اسلام کی عمر
بھی چودہ سو برس ہے جب کہ مسیحیت دو ہزار
ں بوڑھی اور بدھ مت اڑھائی ہزار سال
عمر کو پہنچ چکا ہے۔ مذاہب کی شکل وصورت
ایک اپنا قانون ہے۔ پھر بھی ان پر ادھیڑ
ر کہن سالی کی نقاہت کے اثرات طاری
ئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چودھویں صدی
یسوی میں کلیسا یورپ میں ایک عظیم طاقت
۔ اسی طرح بدھ مت بھی آٹھویں صدی
یسوی میں جب وہ چودہ سو سال کا تھا۔
رچہ اس پر کہولت کے آثار نمایاں تھے
بھی وہ وسطی ایشیا، افغانستان اور ہندوستان
سب سے بڑا مذہب تھا۔

اسلام اپنی ادھیڑ عمر میں ابھی تک توانا
ن اور مسلسل فروغ پذیر ہے۔ بالخصوص
ریقہ میں اس کی مقبولیت بہت بڑھ
رہی ہے اور وڈنمارک میں اسلام قبول
کرنے والوں کی اوسط تعداد دو افراد فی ہفتہ ہے

حج جو انسانیت کے مختلف طبقات کا عجیب
وغریب اجتماع ہے۔ اب پہلے سے زیادہ
پُر ہجوم ہوگیا ہے۔ اس میں شریک ہونے
والوں کی تعداد ایک لاکھ فی سال کے حساب
سے بڑھ رہی ہے۔ یہ سالانہ اجتماع جدید
اسلام کی حرکت پذیری اور وحدت کا اظہار
اور اس میں اضافے کا موجب ہے۔

اس کی زندگی کی دوسری وجہ یہ ہے
کہ اسلام نے ایک مذہب اور ایک معاشرے
کی حیثیت سے کبھی بھی اپنے آپ کو منجمد وجامد
نہیں ہونے دیا ہے۔ اسلام کو آج سے نہیں
ابتدا ہی سے مغربی مسیحیت کی جانب سے سیاسی
روحانی اور ثقافتی چیلنج رہے ہیں اور ثقافتی
اور سیاسی چیلنج پچھلی چند صدیوں سے تو انتہائی
سخت ہوگئے ہیں۔ اسلام کی تاریخ بڑی مختلف
اور بدھ مت سے مشابہہ ہوتی۔ اگر اس کا مرکز
انڈونیشیا ہوتا۔ لیکن اسلام ایک ایسی سرزمین
سے ابھرا ہے جو تین براعظموں کا سنگم ہے۔
اس کی ایک جانب تو [illegible]

اس وجہ سے اسلام کو اپنے دفاع میں اور بھی چوکس رہنا پڑتا ہے۔

مسیحیت کی مشنری مساعی جو اسلام کے لئے روحانی چیلنج کا درجہ رکھتی تھیں۔ بتدریج بے اثر ہو رہی ہیں۔ عیسائی مشنریوں نے اپنے طویل تجربے سے محسوس کر لیا ہے کہ اسلام وہ واحد مذہب ہے جس کے ماننے والوں کو توڑا نہیں جا سکتا۔ پچھلی پوری صدی میں غالباً صرف دو تین مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کیا جا سکا ہے۔ جب عیسائی مشنری اور یورپ کے استعمار پسند اسلام کو رجعت پسند اور جامد مذہب ہونے کا طعنہ دیا کرتے تھے تو وہ درحقیقت مذہب اور اس کے معاشرے کی ظاہری تنظیم اور صورت پر تنقید کرتے تھے جو بلاشبہ پسماندہ تھی لیکن ظاہری سطح کے نیچے اسلام کا ایمان اسی طرح زندہ اور روزمرہ کی زندگی میں حرکت پذیر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائی مشنریوں کو اپنا مذہب چھوڑنے والے مسلمان نہ مل سکے۔

عیسائیوں کی تنقید نے مسلمانوں کو جھنجھوڑ دیا اور تجدید اسلام کے خواہشمند اپنے مذہب کا پھر سے جائزہ لینے لگے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مسلمان معاشرے اور اس کے اداروں پر تعمیری تنقید اور اس کے اصلاح احوال کی راہیں تجویز ہونے لگیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اسلام پر مسیحی تنقید انیسویں صدی عیسوی کے آخری حصے میں شروع ہوئی جب خود مسیحی اپنے مذہب سے برگشتہ ہونے لگے تھے۔

● صلاح الدین ایوبی جاگ اٹھا

یورپ کا اسلام کے لئے سیاسی چیلنج اول اول کامیاب ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ وہ چیلنج جو صلیبی جنگوں سے شروع ہو کر بالآخر جنگ عظیم اول کے بعد برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور روس کے عالم اسلام پر مکمل غلبے پر منتج ہوا لیکن صلیبی جنگوں کی روح اس شکل ہی سے مرتی ہے اس کا ایک مظاہرہ اس وقت دیکھنے میں آیا جب فرانس کا جنرل گوراڈ ۱۹۲۰ء میں دمشق میں فاتحانہ داخل ہوا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ دمشق کی جامع امویہ کے پہلو میں واقع مقبرے پر گیا اور اس کا دروازہ کھٹکھٹا کر بولا
"صلاح الدین! سنو! ہم واپس آ گئے ہیں"

لیکن جب یورپ کا عالم اسلام سے سیاسی تسلط ختم ہوا تو اس کے ساتھ ہی وہ چیلنج بھی ختم ہوگیا جو یورپ کی جانب سے عالم اسلام کو تھا۔ سوائے وسطی ایشیا کے جو روس کے قبضے میں ہے باقی سارے عالم اسلام سے یورپ کا غلبہ رخصت ہوگیا۔ لیکن مسلم عربوں کے لئے مغرب کا یہ چیلنج سیاسی اور عسکری صورت میں اسرائیل کی شکل میں اب بھی موجود ہے۔ اسلام کی توانائی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام کے علماء نے (بعض ممالک میں انھیں ملّا کہتے ہیں) مغربی استعمار کے خلاف جدوجہد میں براہ راست حصہ لیا۔ اس صدی کے ابتدائی عشروں میں قریب ہر ملک کی قومی تحریک میں علماء پیش پیش تھے۔ بعض ملکوں میں یہ علماء ہی تھے جنھوں نے قومی تحریک چلائی۔ مراکش، شام، عراق، تیونس، لیبیا مصر، انڈونیشیا وغیرہ کی تحریکیں آپ دیکھیں تو آپ کو یہ حقیقت صاف جھلکتی دکھائی دیگی۔

ایران کی جدوجہد میں ایک عجیب تضاد بھی دکھائی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ جو علماء شاہ سے دستور چھیننے کے ذمہ دار تھے، انھوں نے موجودہ شاہ ایران کے باپ رضا خان کو ۱۹۲۴ء میں مجبور کیا کہ وہ ترکی کے اتاترک کی پیروی میں ایک غیر اسلامی جمہوریہ بنانے کی بجائے بادشاہت قائم کرے۔

لیکن اسلامی ملکوں کے لئے اس وقت سب سے بڑا یہ چیلنج ثقافتی نوعیت کا ہے۔ اس وقت دنیا کا بالعموم کلچر مادی اور باثروت زندگی کی تمنا ہے جس میں نشہ آور گولیاں، دھمال پر اکسانے والی موسیقی اور فحاشی و عریانی اہم مقام رکھتی ہیں۔ یہی وہ تیزابی مادے ہیں جو جدید زندگی کو کھائے جارہے ہیں۔ اسلام اس پہلو سے مغرب کے سخت خلاف ہے۔ اور وہ ان اقدار کو زوال اور ضلالت کی راہیں سمجھتا ہے۔ مغربی تہذیب کے خلاف مخالفانہ جذبات شدید تر ہوجاتے ہیں جب کسی مقام کی مغرب نواز سیاسی قیادت غیر نمائندہ اور جابر اور مغرب کی کاروباری کمپنیوں کے مقامی اقتصادی معاونین بدعنوان اور بددیانت بھی بھی ہوں۔ ان لوگوں کے مقابلے میں

اسلام ایک یقینی اور اصلاحی جذبہ کی صورت میں اُبھرتا ہے۔

• اسلام صرف مذہب نہیں ضابطہ حیات بھی ہے

اسلام کی واپسی کا ایک مظہر مشرق وسطیٰ کی عورتوں میں پردے کا رواج ہے۔ نوجوان عورتیں اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک چادر میں ڈھانپ رہی ہیں لیکن یہ بات ان عورتوں کے لئے بڑی ہی مایوس کن ہے جنھوں نے اسکرٹ پہننے کے لئے پردے کے خلاف جدوجہد کی تھی۔ مصر، شام اور اردن میں جنگ جون ۶۷ء کی شکست نے نوجوان نسل کو اسلام کی جانب پھیر دیا تھا، حالانکہ عربوں کی شکست کی یہ ذلت خود ان کی غلط پالیسیوں کے نتیجہ میں ملی تھی۔ عورتوں نے لمبی لمبی چادروں سے اپنے جسم ڈھانپ لئے۔ یہ چادریں بالعموم سفید ہوتی ہیں کیونکہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام سفید لباس کو زیادہ پسند کرتا ہے لیکن ایران میں عورتیں بالعموم سیاہ چادریں پسند کرتی ہیں۔

اصل چیز یہ ہے کہ آج کا مسلمان قرآن کے احکام کی تعمیل بڑی سنجیدگی سے کرنا چاہتا ہے۔ قرآن کے احکام کی تعمیل ہی کے سلسلے میں یہ عقیدہ بھی ہے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے۔ وہ معروف معنوں میں صرف ایک مذہب ہی نہیں بلکہ ایک ضابطہ حیات بھی ہے۔ اسلام ایک مسلمان کی زندگی کے ہر شعبے پر حکمرانی چاہتا ہے۔ اس کی نجی زندگی ہی نہیں اس کی سیاسی اور اقتصادی زندگی پر بھی اس کا کنٹرول ہے۔ اسلام میں خدا اور قیصر کی تقسیم نہیں۔ اسلامی ریاست کا مطلب ایک ایسی مسلم مملکت ہے جس میں صرف ایک کی حکمرانی ہو۔ اس مملکت میں قرآن کے سوا کوئی اور سیاست نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ مسلمان لادین بھی ہو سکتا ہے تو وہ گویا دو اضداد کو جمع کر رہا ہے۔

کمال اتاترک سلطنی مصلح تھا۔ اس نے مسلم ترکی کو لادین ریاست بنانے کی کوشش کی لیکن اس کی ناکامی اب خون کے حروف میں واضح ہے۔ ترکوں نے اتاترک کی تمام غیر اسلامی اصلاحات کو ٹھکرا دیا اور زیر سطح

تصوف اور روحانی طریقوں سے مذہبی اخوت وقائم کرلیا۔ جب ایک مرتبہ مذہب دشمنی کا دباؤ کم ہوا تو ترکی میں اسلام پھر سے اُبھر آیا۔

ابن خلدون ماہر عمرانیات مسلمانوں میں شاید ہی پیدا ہوا ہو، ہر قابل ذکر مسلمان مفکر ابن خلدون سے متفق ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی نظام اسلامی شریعت پر مبنی ہونا چاہئے لیکن اسلامی ریاست کی دوسری بنیادیں بھی ہیں وہ قرآن کے مقدس احکام اور سنت رسولؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے وہ حدیث کی شکل میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفائے راشدین کا اسوہ ہے۔ اس طرح اختیارات کے ایک نہیں کئی سرچشمے ہیں۔

جنگ عظیم دوئم کے بعد جب اکثر مسلم ممالک نے آزادی حاصل کرلی تو بہت سے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں نے ان آزاد ریاستوں میں اسلامی ریاست کے تخیل کو پیش کرنے اور فروغ دینے کی کوشش کی۔ بعض ممالک میں ان کو عمل میں ڈھالنے کی سعی بھی کی گئی۔ لیکن اسلامی ریاست کا یہ تخیل نیا نہیں پرانا ہے۔ عہد سابق کے مسلم مفکرین اسے ہر دور میں پیش کرتے رہے ہیں۔

بہت سے مسلم ممالک مثلاً مراکش، لیبیا مصر، ترکی، ایران، پاکستان، ملائشیا، انڈونیشیا میں اسلامی ریاست قائم کرنے کی سعی بار بار کی گئی۔ سوڈان، اردن اور شام میں اخوان [المسلمون] اس کے لئے بہت کوشاں رہی، ان ممالک کی طویل فہرست ظاہر کرتی ہے کہ آج کل خبروں میں جو جنگجو اسلام کا ذکر آتا ہے تو یہ تصور نیا نہیں ہے۔ اس فہرست میں وہ چھ ممالک بھی ہیں۔ جن کی مسلم آبادی دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ ان کی تاریخ پر سرسری نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں نفاذ اسلام کے حق میں اور اس کے خلاف مسلسل ایک جدوجہد جاری رہی ہے۔ ان کے علاوہ بعض ایسے ممالک بھی ہیں۔ مثلاً سعودی عرب، شمالی یمن، اور بعض عرب امارات جن میں نظام ریاست مکمل طور پر قرآن پر مبنی ہے۔ عالم اسلام کے جغرافیے پر نگاہ ڈالنے سے معلوم

ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کو جو چیلنج درپیش ہیں ان کے جوابات یکساں نوعیت کے نہیں ہیں۔ بلکہ ہر علاقہ میں اس چیلنج کا مقابلہ اپنے انداز سے کیا جا رہا ہے۔

● جوہرِ اسلام کیا نہیں ہے؟

جوہرِ اسلام کو معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے سمجھ لیا جائے کہ جوہرِ اسلام دو چیزیں نہیں ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مسلم قومیت نہیں ہے دوسرے یہ کہ ایک پہلو سے پان اسلام ازم (اتحاد عالم اسلامی) بھی نہیں ہے۔ اسلامی سیاست کے بارے میں منظم ترین افکار یا تو اخوان المسلمون نے پیش کئے ہیں یا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعت اسلامی نے یا پھر انڈونیشیا کے ڈاکٹر محمد ناصر کی مسجومی پارٹی نے۔ تینوں یکساں طور پر قومی اور پان اسلام ازم کے تصورات اور پروگرام کو رد کرتے ہیں۔ مولانا مودودی نے تو مسلمانانِ ہند کی تحریک پاکستان میں بھی حصہ نہ لیا تھا اور اخوان المسلمون نے ناصر کی عرب قومیت کے تصور کی سختی سے مخالفت کی تھی۔

ان لوگوں کی قومیت کے خلاف جدوجہد عجیب سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ بعض مذہبی گروہوں نے استعمار کے خلاف جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا تھا لیکن یہ مفکر جواب میں کہتے ہیں کہ یہ قومی تحریکیں حقیقت میں استعمار اور مسیحی مغرب کے خلاف جہاد تھا یہ جواب حقیقت میں منفی قومیت کا ہے اصل چیز یہ ہے کہ ان کے نزدیک آزادی کے بعد کسی قومی ریاست کو مثبت طور پر اپنی تمام وفاداریوں کا مرکز بنا لینا خدا کے مقابلے میں ایک بت کی پرستش سے کم نہیں ہے۔

ان مفکرین نے بجا طور پر بھانپ لیا تھا کہ قوم پرستی مسلمان کی وفاداری پر قبضہ جمانا چاہتی ہے۔ حالانکہ وفاداری صرف اسلام کا حق ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جوہرِ اسلام کا اگر کوئی مقابلہ کر سکتی ہے تو وہ قوم پرستی ہے اس جذبے نے کمیونزم کی زبردست لہر کا بھی اسی طرح سے مقابلہ کیا تھا۔ اسلام کے مجتہدین نے قوم پرستی کی بجا طور پر

نا لغت کی ہے کیونکہ یہ ایک نوع کی سیاسی بدعت ہے جو کسی قوم کی وفاداری کو پہچان دیتی ہے۔ جبکہ صرف اسلام کا ہونا چاہیے' اس میں قوم پرستی بھی شریک بن جاتی ہے۔

اس سے یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ پھر مسلمانوں کو پان اسلام ازم (اتحاد عالم اسلامی) کو قبول کر لینا چاہیے۔ کیونکہ پان اسلام ازم تمام مسلم ریاستوں کے اتحاد کا نام ہے۔ لیکن اسلام کے یہ منکرین کہتے ہیں کہ مسلم ریاستوں کا یہ اتحاد در حقیقت قومی ریاستوں میں اتحاد کی کوشش قومی سطح پر ہو گی۔ اسلامی سطح پر نہیں ہو گی۔

سیاسی پان اسلام ازم قومی تصور سے بالاتر تصور نہیں ہے بلکہ ایک نوع کا بین الاقوامی تصور ہے۔ پان اسلام ازم کے تصور میں یہی سقم ہے جس کی وجہ سے پان اسلام ازم کی علمبردار تنظیمیں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکی ہیں اور ان کا پہلا سا غلغلہ باقی نہیں رہا ہے۔ سعودی عرب بھی مسلم ریاستوں کے درمیان یکجہتی کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا ایک مظہر مسلم نیوز ایجنسی کی تجویز ہے لیکن یہ کوشش بھی نتیجہ خیز ثمر آور نہیں ہو رہی ہے۔ چونکہ اتحاد و یکجہتی کی یہ کوشش دنیوی (سیکولر) سطح پر ہوتی ہے۔ اس لئے ایسا سیاسی پان اسلام ازم کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہر ملک کے اپنے اپنے قومی مفادات ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اشتراک و اتحاد کا خواب پورا نہیں ہو پاتا۔ جبکہ بنگلہ دیش بھی مسلم ملک تھا جو مسلم پاکستان سے الگ ہوا۔ اسی طرح مسلم یمن میں مسلم عرب مسلم عرب کے خلاف نبرد آزما ہے۔ مغربی صحرا میں بھی یہی نقشہ موجود ہے۔ مسلمان مسلمان کے خلاف لڑ رہا ہے۔ اس پہلو سے اتحاد اسلامی کے بارے میں یہ کہنا ہے۔ ایک کے خلاف عالم اسلام کی نفرت آمیز بغاوت ہے۔ ایک بے حقیقت بات معلوم ہوتی ہے۔

● <u>اسلام کو ناکارہ بنانے والے سیاستدان</u>

اسلام کی سلطنت مختلف ممالک پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس لئے مختلف مسلم لیڈر و

کی جانب سے جو اسلام کو مختلف پیرایوں میں پیش کرنا کچھ عجب نہیں ہے۔ بہرحال یہ تین نوع سے پیش کیا جارہا ہے۔

ایک وہ پیشہ ور سیاستداں ہیں جو اسلام کی زندہ قوت کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں مسٹر جناح تھا جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کی آرزوؤں اور خوف کو پاکستان کی تخلیق کے لیے بڑی ذہانت سے استعمال کیا۔ اس سے ملتی جلتی لیکن اس سے کہیں کم تر کوشش مسٹر بھٹو کی تھی جو اعلیٰ درجہ کا مغربی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود جب سیاست میں گھر گیا تو اس نے اسلامی سوشلزم کا بے معنی لیکن پرکشش نعرہ لگایا۔

ترکی میں اسی قسم کی پارٹی ڈیموکریٹک پارٹی تھی جو انتخابات میں یہ نعرہ لگا کر کامیاب ہوئی تھی کہ برسر اقتدار آکر وہ کمال اتاترک کی حج پر عائد کردہ پابندی ختم کردے گی۔ اب ملی سلامت پارٹی بھی ان نعروں کو لیکر کھڑی ہوگئی ہے۔ مراکش کا شاہ حسن بھی اپنی شخصیت کے گرد مذہبی ہالہ بنانا چاہتا ہے جیسا کہ مصر کے سابق حکمراں شاہ فاروق نے اپنی حکومت کے آخری ایام میں یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ اس کا شجرہ نسب پیغمبر اسلام سے جا ملتا ہے۔ اسی قسم کے سیاستداں ہیں جنھوں نے اسلامی سیاست کو بدنام کیا ہے انھوں نے دین کے نام پر بعض اوقات بڑی بھونڈی اور وحشیانہ حرکتیں کی ہیں۔

● وہ بزرگان دین جنھوں نے سیاست کی۔

اسلامی جنگجوئی کی دوسری قسم میں اہل مذہب شامل ہیں۔ اس فہرست میں بڑے بڑے عالم، مشائخ اور آیت اللہ کے نام ملتے ہیں۔ جنھوں نے عملی سیاست میں سرگرم حصہ لیا۔ ایک لیڈر کی حیثیت سے وہ ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن بعض ممالک میں انھوں نے سیاسی تنظیمیں بھی قائم کرلی ہیں۔ انڈونیشیا میں نہضت العلماء ہے۔ پاکستان میں جمعیت العلماء اسلام اور جمعیت العلماء پاکستان ہیں اور ایران میں آیت اللہ کی ڈھیلی ڈھالی تنظیم ہے۔ سعودی عرب جیسے ممالک میں جو اپنے بارے میں

می ریاست ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں لیڈروں
ے مشائخ ہوتے ہیں۔

ان دونوں اقسام میں ایک خصوصیت
ل ہے۔ وہ اسلامی ریاست کی متعین تعریف
ہیں کر سکتے لیکن ان کا نصب العین بہرصورت
می سیاست کا قیام ہے۔ اسلام کی نشاۃ
یہ کا جو تصور وہ پیش کرتے ہیں وہ ساتویں
ی کے اسلامی اداروں کے احیا سے حاصل
م ہوتا ہے۔ اس لئے ریاست کا جو اسلامی
ل ان کے عزائم سے جھلکتا ہے۔ وہ زیادہ تر ظاہری
جات پر مبنی ہے۔ مثلاً چور کے ہاتھ کاٹنا، زنا
ے جرم میں سنگساری، امتناع شراب اور قصاص
دینا جیسا کہ پاکستان میں بھٹو کے دور میں
مدیوں کو دبایا گیا تھا۔ یہ دونوں انواع عالم
سلام کے سیاسی اتحاد کی بھی قائل ہیں لیکن یہ
نوں ایک تیسری قسم کے جنگجویان اسلام کے
شترکہ طور پر مخالف ہیں۔

• تیسری قسم

یہ تیسری قسم کے لوگ پیشہ ور سیاستدان
ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اسلامی تصورات
کو سیاسی زندگی میں سمونے کے لئے سیاست
میں داخل ہوئے ہیں۔ ان میں عالم عرب کے
اخوان المسلمین اور پاکستان کی جماعت اسلامی
نمایاں ہیں اپنے ڈھانچہ اور تنظیم کے اعتبار سے
اخوان اور جماعت میں گہری مماثلت پائی جاتی
ہے اور وہ ایک دوسرے سے رابطہ بھی قائم
کئے ہوئے ہیں۔ وہ بے حد منظم اور نظریئے
سے سرشار ہیں۔ ان کے ارکان کا زیادہ تر
تعلق نچلے درجے کے شہری طبقے سے ہے
اگرچہ ان کے بعض لیڈر اونچے درجے کے
سکالر اور ماہر بھی ہیں۔ دونوں جماعتیں خلاف
قانون بھی رہی ہیں۔ کیونکہ دونوں تشدد کا
جواب تشدد سے دینے کی قائل ہیں۔ اس
لئے ادوار ابتلاء کے باوجود وہ اپنے وجود
کو قائم رکھنے میں کامیاب رہی ہیں۔ آج وہ
اپنے ممالک کی حکومتوں کے مقابلے میں واضح
اور خطرناک حد تک متبادل قیادت بن چکی
ہیں۔ جماعت اسلامی بالخصوص بڑی بااثر
ہے اور جنرل ضیاء الحق بھی ان کے نظریات
کو بڑی ہمدردی سے سنتا ہے۔ ان کا احترام

ان کی دیانت وامانت کی وجہ سے کیا جاتا ہے اور ان سے خوف ان کی یکسوئی کی وجہ سے کھایا جاتا ہے۔ پھر وہ برسہا برس سے سماجی خدمت بھی کر رہے ہیں جس کی بنا پر وہ داد تحسین بھی وصول کر رہے ہیں۔

وہ اس پہلو سے ماڈرن ہیں کہ وہ نشر واشاعت کی اہمیت کو خوب سمجھتے ہیں ان کے لٹریچر کی بدولت ہمیں ان کے خیالات نظریات اور اسکیموں کی تمام تفصیلات حاصل ہو سکتی ہیں۔ وہ صرف اسلامی ریاست نہیں بلکہ اسلامی نظام بھی چاہتے ہیں جسے وہ نظام اسلامی یا نظام مصطفےٰ کے عنوان سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسلامی نظام کا تصور زیادہ پھیلا ہے۔ اس سے صرف اس سوسائٹی کا نقشہ ملتا ہے جس میں شریعت کے صرف قوانین ہی نافذ ہوں۔ بلکہ ایک ایسی سوسائٹی کا خاکہ ملتا ہے جو اسلامی اصولوں سے سرشار اصلاح یافتہ اور عصر حاضر کے شانہ بشانہ چلنے والی ہے

اسلامی جمہوریوں کے اس تیسرے گروہ کا موقف ہے کہ ریاست کی بنیاد اگرچہ قرآن اور حدیث رہیں گے لیکن جدید زندگی کے لئے ان کے علاوہ قانون سازی بھی کرنی ہوگی۔ قانون سازی کا یہ دائرہ وہ ہے جو قرآن وحدیث سے متصادم نہیں ہے زندگی کے کون کون سے دائرے کتاب وسنت سے متصادم نہیں ہیں۔ اس کا فیصلہ "صالح افراد" کی ایک چھوٹی سی کمیٹی کرے گی جس کے ارکان ضروری نہیں کہ تمام تر علماء یا مشائخ ہوں۔ اسلامی ریاست جمہوری ہوگی اور اس کا سربراہ منتخب ہوگا۔

فوجی حکومت یا بزور قائم شدہ حکومت اسلام کے منافی ہے اس پہلو سے دیکھا جائے تو اسلامی تصورات اور مسلمانوں کے عمل میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اس وقت صرف دو مسلم ممالک ترکی اور ملائشیا ایسے ہیں جن میں منتخب حکومت قائم ہے۔ خود سعودی عرب میں شاہی خاندان حکمران ہے جو اسلامی اصولوں بلکہ وہابی نقطہ نظر سے بھی جائز نہیں ہے۔ یہ اسلامی جمہوریے یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلم

ممالک میں ایک جماعتی حکومت ہونی چاہیے ان کی دلیل یہ ہے کہ صالحین کے سوا کسی اور کی حکومت کیسے ہو سکتی ہے؟ کیا اس ریاست میں دو صالح جماعتیں بھی ہو سکتی ہیں اس کے بارے میں ابھی غور نہیں کیا گیا ہے۔ مسلمان ممالک نہ تو مغرب کی مادیت کو پسند کرتے ہیں۔ نہ کمیونزم کی دہریت کو ان کی مثالی خارجہ پالیسی ناوابستگی کی ہے۔ یہی پالیسی ہے جس کی طرف ایران کے آئت اللہ خمینی نے اشارہ کیا ہے۔

اقتصادی دائرے میں اسلام کے مصلحین ہر قسم کے سود کو قطعی رد کرتے ہیں۔ اس طرح وہ بنکوں کے جدید نظام کی نفی کرتے ہیں جس سے ہم متعارف ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم اپنا مالیاتی نظام زکوٰۃ سے چلائیں گے۔ جو ذاتی آمدنی پر لی جاتی ہے۔ پاکستان کی جماعت اسلامی اس ٹیکس کی تشخیص اڑھائی فیصد تجویز کرتی ہے۔ اسلامی نظام میں ذاتی ملکیت کی اجازت ہوگی۔ لیکن یہ محدود ہوگی۔ زمین کی حد ملکیت بھی مقرر کر دی جائے گی جو بہت کم ہوگی۔ اور ملک کے تمام اہم شعبے قومی ملکیت میں لے لئے جائیں گے۔ اخوان اور جماعت دونوں ٹریڈ یونین کی اہمیت کی قائل ہیں اور دونوں نے ان پر اپنا اثر قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

سماجی دائرے میں عورت کو باوقار مقام دیا جائے گا لیکن اسے مرد کے تابع ہو کر رہنا ہوگا۔ مصر کے اخوان کو عورتوں کے باہر نکل کر کام کرنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن پاکستان کی جماعت اسلامی کو ہے۔ جماعت اسلامی ضبط ولادت کے بھی خلاف جب کہ اخوان اس کے خلاف نہیں ہے۔ دونوں جماعتیں قرآن کے احکام طلاق، تعدد ازدواج اور بدکرداروں کی سزا کے بارے میں بڑی مضطرب ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ طلاق کو مشکل تر بنا دیا جائے اور قرآن نے تعدد ازدواج کے لئے جو شرائط رکھی ہیں ان کی موجودگی میں تعدد ازدواج ممکن ہی نہیں۔ ایسی صورت میں اگر کوئی دوسری شادی کرے گا تو اسے

یہ بہت مہنگی پڑے گی۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ اسلامی نظام میں چور کے ہاتھ کاٹنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی کیونکہ کسی کو چوری کی ضرورت ہی نہ ہوگی، پھر قرآن کی شرائط کے مطابق جب تک چار عینی شاہد نہ ہوں گے کسی کو زنا کی سزا بھی نہیں مل سکے گی۔

ان مصلحین کو اصل وقت غیر مسلم اقلیتوں یا مسلمان فرقوں کے سلسلے میں پیش آتی ہے ان کا موقف ہے کہ قانون کی نگاہ میں سب یکساں ہیں لیکن خود قرآن بعض اقلیتوں کو دوسروں کی نسبت زیادہ برابری دیتا ہے۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ وہ دوسرے درجے کے شہری بن کر رہ جاتے ہیں۔

تمام مسلم ممالک کے لئے دو چیزوں میں سے ایک مقدر ہو چکی ہے یا تو وہ نفاذ اسلام کا انکار کر دیں اور ایک لادین ریاست بنے رہیں۔ یا پھر اسلامی ریاست بننے یا اسلامی نظام نافذ کرنے کی کوشش میں مسلسل لگے رہیں۔ شاید دو صدیوں بعد جب عالم اسلام اسلامی جوش کے دورے سے گذر جائے گا تب مسلمانوں کو ایک زندہ اور مکمل دین کے چیلنج سے چھٹکارا حاصل ہوگا۔ (اکانومسٹ لندن)

پانچ چیزوں کے چھوڑنے پر پانچ چیزوں کا انعام

[illegible]

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

(۱) فضول نگاہی چھوڑ دو تو خشوع و خضوع کی توفیق ملے گی۔

(۲) فضول گفتگو چھوڑ دو تو تم کو حکمت و دانائی کی توفیق ملے گی۔

(۳) فضول غذا چھوڑ دو تو تم کو عبادت کی توفیق ملے گی۔

(۴) لوگوں کی عیب جوئی چھوڑ دو تو تم کو اپنے عیوب پر اطلاع کی توفیق ملے گی۔

(۵) اللہ تعالیٰ کی ذات میں بحث و مباحثہ کو چھوڑ دو۔ تم کو شک اور نفاق سے نجات کی توفیق ملے گی۔



تہران۔ ۱۵ رمئی۔ ایران کے غیر سرکاری سربراہ مملکت آیت اللہ خمینی نے ساری دنیا کے غریبوں سے اپیل کی کہ وہ اٹھ کھڑے ہوں اور ایران کی مثال کی پیروی کریں۔ انھوں نے کہا کہ قطعی فتح اس وقت حاصل ہوگی جب ساری دنیا میں اسلام کی حکمرانی ہوگی۔ مقدس شہر قم میں پاکستانی نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے آقائے خمینی نے عالمی اسلامی انقلاب کی تائید میں انتہائی بیباک تقریر کی۔ آقائے خمینی نے کہا کہ اسلام عوام کو روشنی کی سمت لے جانے کے لیے آیا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ ساری دنیا کے غریب متحد ہوں گے اور ایران ساری دنیا کے تمام غریب ممالک کے لیے ایک مثال قائم کرے گا کہ ہم نے خالی ہاتھوں سے بڑی طاقتوں کو شکست دی ہے اور فتح حاصل کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے امید ہے کہ ہم ساری دنیا کے غریب عوام ایران کے اسی راز کو معلوم کریں گے اور ساری دنیا کے تمام مسلمان اور تمام غریب عوام اٹھ کھڑے ہوں گے۔ (ماخوذ۔ روزنامہ قومی جنگ راولپنڈی)

(۱۷ رمئی ۱۹۷۹ء)

● لندن کے اخبار "ڈیلی ایکسپریس" نے انکشاف کیا ہے کہ ایران کے معزول شاہ کی اہلیہ ملکہ دیبا نے اُن سے علیحدگی اختیار کرلی ہے۔ رپورٹ کے مطابق ملکہ فرح دیبا اور سابق شاہ کے درمیان پندرہ روز قبل ایک زوردار جھڑپ ہوگئی تھی جس کے بعد وہ شاہ کی رہائش گاہ سے سخت پہرے کے باوجود باہر نکل گئیں۔ اگر یہ اطلاع درست ہے تو کہنا پڑے گا

بیاہ تختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا انساں سے رہتا ہے

اس اطلاع پر ہمیں پرانی باتیں یاد آرہی ہیں۔ ملکہ ثریا کو طلاق دینے کے بعد فرح دیبا نے جو یورپ کی کسی یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھیں، یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ ایران کے تخت وتاج کا وارث پیدا کریں گی۔ بعد میں ان کا یہ دعویٰ صحیح ثابت ہوا۔ ولی عہد پیدا ہوا اور آج جوانی کی منزل کے قریب پہنچ رہا ہے یہ دوسری بات ہے کہ اب نہ تاج رہا ہے نہ تخت۔ تخت طاؤس تہران میں پڑا ہے اور شاہ جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

شاہ ایران کی ملکہ بننے کے بعد فرح دیبا کے حسن وجمال کے بہت چرچے ہوئے تھے وہ پاکستان آئیں تو ان کا بے مثال سواگت ہوا۔ پاکستانی اخبارات کی روایت کے مطابق سواگت کرنے والوں میں مردوں کے مقابلہ میں عورتیں زیادہ تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ان کے ہیر ڈریزائن کو دیکھ کر اس کی نقل کرنا چاہتی تھیں۔ روایت کے مطابق وہ انھیں دیکھنے کے بعد اپنے آئینوں کے سامنے جا کھڑی ہوئیں لیکن نقل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ مردوں نے ان کا یہ جنون دیکھا تو ان کے دماغوں میں یہ شعر ابھر آیا۔

تو اور آرائش خم کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

لیکن اب حالات نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ ایران اور پاکستان دونوں کی شکل وصورت ہی بدل گئی ہے۔ ایران میں مولانا خمینی نے عورتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ زلفوں کو کپڑے سے ڈھانپ کر دفتروں اور بازاروں میں آیا کریں اور پاکستان میں جنرل ضیاء الحق حسن کی شوخیوں پر پابندیاں لگا رہے ہیں۔

● لاہور کا ایک جواں سال شہری کرامت علی جو پھانسی کی کوٹھڑی میں موت کا انتظار کر رہا ہے قید کی موت کے دوران نہ صرف خود پابند صلوٰۃ وصوم بن چکا ہے بلکہ اپنی تبلیغ کے ذریعہ غیر مسلم قیدی کو حلقہ بگوش اسلام کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ کرامت صرف بھولا

ریلوے روڈ گول منڈی کا رہنے والا ہے اور ۲ء میں میلہ چراغاں پر اس کے ہاتھوں ایک شخص قتل ہو گیا تھا۔ اس وقت کرامت کی عمر تقریباً انیس سال تھی۔ اسے عدالت سے سزائے موت سنائی گئی اور اپیلوں کے مراحل ختم ہونے پر سزا کی توثیق ہو گئی۔ مگر اس عرصہ میں کرامت نے جیل کی روایتی عادت سیکھنے کی بجائے دینی تعلیم کی طرف رجوع کیا۔ اس نے ناظرہ قرآن حکیم پڑھا اور بیس مرتبہ قرآن ختم کیا۔ پابند صوم وصلوٰۃ ہونے کے علاوہ باقاعدہ تہجد گزاری کرتا ہے۔

جیل میں کرامت کی ملاقات ایک اور قیدی برکت مسیح سے ہوئی۔ برکت کو اپنی بیوی کے قتل کے جرم میں سزائے موت ہو گئی تھی۔ اس کی بھی تمام اپیلیں مسترد ہونے کے بعد سزا کی توثیق ہو گئی تھی۔ برکت مسیح کرامت سے اسلام کی تعلیمات اور آخرت تک زندگی کے بارے میں کلام خداوندی سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسلام قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ چنانچہ برکت نے جیل حکام اور چند قیدیوں کی موجودگی میں مدینہ مسجد کے امام کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اور اسلامی نام محمد عبداللہ رکھا گیا۔ اس دوران اس کی سزائے موت پر عمل کرنے کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ نومسلم محمد عبداللہ نے وصیت کی کہ مرنے کے بعد اسے اسلامی طریقہ سے دفن کیا جائے اور اس کی دو نابالغ بچیوں کو اسلامی طریقے پر پرورش کیا جائے۔ (دعوت دہلی)

کوریا میں پورا گاؤں مشرف اسلام ہو گیا

کویت۔ کوریا کے رسالے "کوریا اسلام ہیرالڈ" نے انکشاف کیا ہے کہ کوریا کے ایک مکمل گاؤں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس گاؤں کی آبادی ۱۴۱۶ افراد پر مشتمل ہے۔ یہ گاؤں ایک ثانوی اسکول کے استاد کی کوششوں سے حلقۂ اسلام میں آیا ہے۔

(دعوت دہلی)

اللہ کی نعمتیں

مسز انجم آفاق۔ بی۔ اے۔ ۱۸۔ مالی پورہ
اچھاور ضلع سیہور (بھوپال) مدھیہ پردیش

محترمی چچا مائل صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،
بھوپال کے ایک ہندی روزنامے "نو بھارت" میں شائع شدہ ایک مضمون کا اردو میں ترجمہ کر کے بھیج رہی ہوں۔ عنوان ہے "باسی روٹی کے تازہ لوازمات۔" مضمون نگار کا نام نہیں مل سکا۔ میرے خیال سے متوسط طبقہ کے گھرانے کے لئے اس مہنگائی کے زمانے میں یہ مشورے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ بہرحال اگر حلقۂ احباب کے لئے مفید سمجھیں تو اسے شائع کر دیجئے گا۔ جہاں ضرورت سمجھیں ترمیم یا اضافہ کر سکتے ہیں۔
امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند و تندرست رکھے۔ تحریک اسلامی کو آپ سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ والسلام طالب دعا مسز انجم آفاق بی اے

روٹیاں چاہے کتنا ہی خیال رکھ کر پکائی جائیں پھر بھی گھروں میں اکثر بچ ہی جاتی ہیں۔ اب اگر گھر کے افراد ٹھنڈی روٹیاں کھانا پسند نہیں کرتے ہیں تو اور بھی مشکل۔ پھر اس مہنگائی کے زمانے میں بہت سی روٹیاں نوکرانی یا بھکاری کو دینا بھی آسان نہیں ہے۔ اس پریشانی سے بچنے کے لئے آسان طریقہ یہی ہے کہ ان کو مختلف طریقوں سے پکا لیا جائے جن کو گھر کے

سبھی افراد شوق کے ساتھ کھا سکیں، اور آپ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے۔
نیچے ان روٹیوں کے مزیدار استعمال کے کچھ آزمودہ طریقے درج کر رہی ہوں۔ خود بھی شوق سے کھائیے اور اللہ توفیق دے تو دوسروں کو بھی کھلائیے۔

(۱) ٹھنڈی روٹی کے پوہے

روٹیوں کو چور کر بالکل باریک کر لیجیے۔ پیاز و ہری مرچ باریک کاٹ لیجیے۔ تھوڑے سے تیل میں پیاز بگھار دیجیے۔ اب نمک، ہلدی، دھنیا تھوڑی سی تلی اور شکر وغیرہ سب مسالے ضرورت کے مطابق ڈال دیجیے۔ اب پوری روٹی بھی کڑھائی میں ڈال کر برابر سب مسالوں کے ساتھ ملا لیجیے۔ تھوڑی ہی دیر میں اُتار لیجیے۔ یہ نمکین روٹی پوہے کی طرح ان شاء اللہ مزے دار لگے گی اور سبھی لوگ اسے ذوق و شوق سے کھائیں گے۔

(۲) ٹھنڈی روٹی کے لڈو

نمکین کے علاوہ میٹھی ڈش (Dish) بھی تیار کی جا سکتی ہے۔ روٹی کا باریک چورا کر لیجیے۔ پھر تھوڑا سا گھی گرم کر کے اس میں ڈال دیجیے۔ اب ذوق کے مطابق گڑ یا شکر اس میں ملا کر اس کے لڈو بنا لیجیے۔ ان سب لڈوؤں کو بچے اور بڑے سبھی شوق سے کھائیں گے۔

(۳) تلی ہوئی روٹیاں

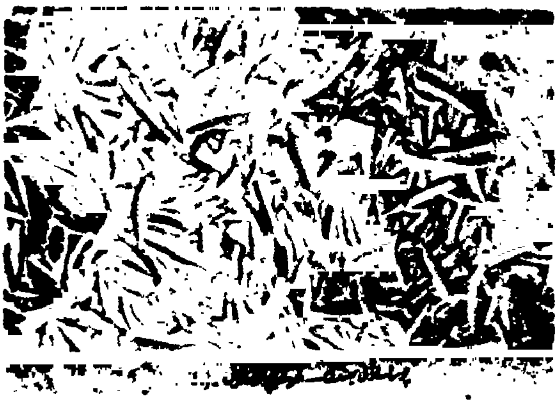
روٹیوں کے چار ٹکڑے کر لیجیے۔ اگر ان کی دونوں سطحیں بھی الگ ہو جائیں تو کر لیجیے پھر ان ٹکڑوں کو بادامی رنگ ہونے تک تل لیجیے۔ اب ان پر ہلکا سا نمک مرچ چھڑک کر یا پھیکا ہی رہنے دیں۔ یہ تلے ہوئے ٹکڑے چائے کے ساتھ بھی مزیدار لگیں گے۔

(۴) ٹھنڈی روٹیوں کے بھجیے:۔ روٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیجیے۔ زیادہ چھوٹے بھی نہ ہوں پھر بیسن کا پتلا محلول بنا کر اس میں نمک، مرچ، دھنیا، پیاز وغیرہ سب مسالے ڈال لیجیے۔ محلول پتلا ہی رہنا چاہیے اب روٹیوں کے ٹکڑے بیسن کے گھول میں ڈبو کر تل لیجیے۔ یہ بھجیے مزیدار لگیں گے۔

موسمی ترکاریاں

اگست کے مہینے میں کس طرح رہنا چاہیے

اگست کے مہینے میں ہوا غیر معمولی مرطوب ہو جاتی ہے۔ بارش کے پانی میں بہت سی غلاظتیں مل جاتی ہیں۔ نباتات کے خشک پتے اور شاخیں وغیرہ بھیگ کر گلنے سڑنے لگتی ہیں اور اُس کے بعد جب اُن پر تیز دھوپ پڑتی ہے تو ان سے گندے کثیف بخارات اُٹھ کر مرطوب ہوا میں مل کر اس کے فساد کو بڑھا دیتے ہیں۔ اس لیے جولائی کا مہینہ شروع ہوتے ہی بستی اور مکان کی صفائی کا اہتمام کیا جائے اور اس



مہینے میں بھی اس کو جاری رکھا جائے۔ اس مہینے کی مرطوب آب و ہوا سے بد ہضمی، ہیضہ، دست اور پیچش کی شکایتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ملیریا بخار ہونے میں ہاضمے کی خرابی کو بھی دخل ہوتا ہے اس لئے اپنے ہاضمے کو درست رکھنے کی کوشش کریں۔ کچھ نہ کچھ ورزش کر لیا کریں۔ عام ورزشوں کے علاوہ جھولا جھولنا اس ماہ کی خاص ورزش ہے۔ جھولنے سے پھیپھڑوں کی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔ اگر پینگیں بڑھائی جائیں تو اس سے پھیپھڑوں کی ورزش کے علاوہ پنڈلیوں، رانوں

کلائیوں اور بازوؤں کے عضلات کی بھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے جس سے ٹانگیں اور ہاتھ مضبوط ہو جاتے ہیں۔



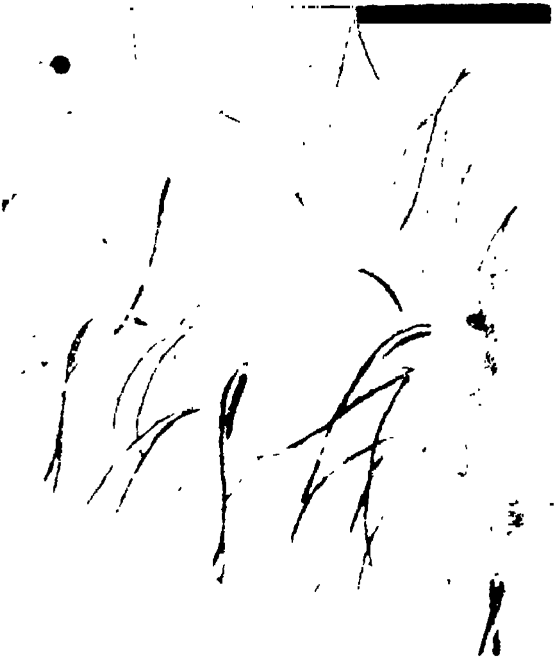
بہار [illegible]

اس مہینے میں پکوان پکانے کا عام رواج ہے۔ پوڑے، گلگلے، پوریاں، کچوریاں، سہال اندرسے وغیرہ خوب کھائے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کے کھانے میں اعتدال اور احتیاط سے کام لیجیے، ورنہ بدہضمی ہو جائے گی۔

کھانے کے علاوہ پینے کی چیزوں میں بھی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ اب لسی شربت اور ٹھنڈائی کا زمانہ نہیں۔ صبح کے ناشتے میں بسکٹ اور چائے مناسب ہے۔ اگر آپ کا معدہ اچھا ہے تو پراٹھا، پوری کچوری، نمک پارے، اندرسے بھی ناشتے میں کھا سکتے ہیں۔ لیکن انھیں صرف بطور ناشتہ کھائیے، پیٹ بھر کر نہیں۔ بعض لوگ گرما گرم بھنے ہوئے چنوں کا ناشتہ کرتے ہیں۔ اُن کے موسم کے مطابق ہونے میں شک نہیں۔ محنت، مزدوری کرنے والے غریبوں کے لیے اچھی چیز ہے۔

دوپہر کے کھانے میں سادہ روٹی سبز ترکاریوں کی بھجیا اور بھنی ہوئی مونگ کی دال یا چنے کی دال کے ساتھ کھائیں۔ گوشت خور لوگ بھنا ہوا گوشت یا کم شوربے کا گوشت استعمال کریں۔ لوبی سیتا پھل اور بھنڈی جیسی دیر ہضم ترکاریاں کم استعمال کریں۔ شام کے کھانے میں بھی ایسی ہی

چیزیں استعمال کریں۔ گوشت، قورمہ، کباب، کوفتے استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن دوپہر کا کھانا ہو یا شام کا اس کے ساتھ لیموں مزید استعمال کیا جائے۔ املی، انار دانے یا سرکے کی چٹنی کھائی جائے۔ تمام سبزیاں ترکاریاں اور پھل وغیرہ صاف اور تازہ ہوں۔ گلی سڑی یا کیڑے لگی کوئی چیز نہ ہو۔



رات کو ایسی جگہ سوئیے جہاں بارش ہونے کی صورت میں آپ بھیگنے سے محفوظ رہیں اور آپ کی نیند بھی خراب نہ ہو۔ اس طرح اگر رات کو بارش نہ بھی ہوئی تو شبنم سے حفاظت رہے گی۔ اگست کے مہینے میں مچھروں کی پیدائش افراط سے ہونے لگتی ہے۔ اُن کی نیش زنی سے محفوظ رہنے کے لئے پلنگ پر مچھر دانی لگائیے۔ اگر اس کا انتظام نہ ہو سکے۔ تو باریک ململ کی چادر سے جسم کو ڈھک لیا جائے۔ اس مہینے میں صبح و شام، بلکہ ممکن ہو تو دوپہر کو بھی نہائیے۔ نہانے کے لئے صاف ستھرا پانی استعمال کیجئے۔ تالابوں، دریاؤں اور نہروں کا پانی اس مہینے میں بہت گندا ہو جاتا ہے۔ وہاں نہانے سے پرہیز کیجئے۔ بارش میں نہا سکتے ہیں، لیکن زیادہ دیر تک نہانا

ہرگز مناسب نہیں۔

اس مہینے میں سفید اور باریک لباس پہننا چاہیے۔ کُرتے یا قمیص کے نیچے باریک بنیان یا ہلکی نیم آستین ضرور ہونا چاہیے۔ اس بنیان یا نیم آستین کو روزانہ بدلتے رہیے، یا اُسے دھو کر دھوپ میں خشک کر کے پہن لیا کیجیے۔

اگست کے کچھ پھلوں اور ترکاریوں کی خصوصیات جان کر آپ کو انھیں ٹھیک طرح استعمال کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

اگست میں انگور بہت آتے ہیں۔ انگور سب سے بہتر وہ ہیں جو بیل پر پکیں اور پکنے کے بعد بھی کئی روز تک بیل پر لٹکے رہیں۔ ایسے انگور بہت میٹھے ہوتے ہیں۔ انگور تمام میووں اور پھلوں میں افضل ہے۔ عمدہ پکے ہوئے انگور مزاج کے اعتبار سے گرم و تر ہوتے ہیں۔

چکوترے کا مزاج سرد و تر ہے۔ یہ جسم کو غذائیت دیتا ہے۔ گرم صفراوی مزاج کے لوگوں کے لیے خصوصیت سے مفید ہے۔ چکوترا جسم میں صفرا کا غلبہ ہو تو اس کو تسکین دیتا ہے، معدے اور جگر کی گرمی کو کم کرتا ہے بھوک کو تیز کرتا ہے۔ پیاس بجھاتا ہے اور فرحت بخشتا ہے۔ نزلہ زکام اور کھانسی کے مریضوں کے لیے مفید ہے۔

کرنا، جسے کنا اور کھٹا بھی کہتے ہیں لیموں کی قسم کا پھل ہے اور سنترے کے برابر ہے۔ اس کا مزاج سرد و خشک ہے۔ اس کا رس نچوڑ کر شکر ملا کر پینے سے جسم کو غذائیت حاصل ہوتی ہے۔ صفرا کا غلبہ ہو تو دور ہو جاتا ہے۔ پیاس کو تسکین اور طبیعت کو فرحت ہوتی ہے۔ گرم صفراوی امراض میں مفید ہے۔ اس کے استعمال سے شراب کا خمار بھی اُتر جاتا ہے۔

کمرکھ کا مزاج سرد و خشک ہے۔ اس میں غذائیت کم ہوتی ہے۔ یہ صفراوی تیزی کو دور کرتی ہے، پیاس بجھاتی ہے۔ گرم مزاج اشخاص کے معدے کو قوت بخشتی ہے اور بھوک کو تیز کرتی ہے۔ قے اور متلی کی شکایت ہو تو اس کو دور کرتی ہے۔

سیندھا گرم و تر ہے۔ پکی ہوئی سیندھا

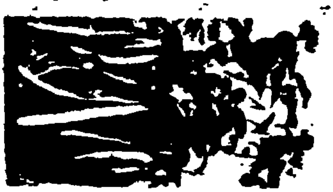
کھانے سے جسم کو غذائیت حاصل ہوتی ہے
یہ پیشاب آور ہے۔ قبض کشا ہے، خون کو
صاف کرتی ہے۔ اس میں کسی قدر بادی پیدا
ہوتا ہے۔ اس کی اصلاح کے لیے نمک اور
سیاہ مرچ کے ساتھ کھائیں تو بہتر ہے۔

پھوٹ کا مزاج سرد تر ہے اس میں
غذائیت ہوتی ہے۔ ثقیل اور دیر ہضم ہے
پیشاب خوب آور ہے۔ اس کے زیادہ کھانے
سے بعض آدمیوں کو دردِ شکم ہو جاتا ہے۔

سیتا پھل، اس کا مزاج سرد تر ہے۔
یہ جسم کو فربہ کرتا ہے۔ ملین ہے، گرم صفراوی
مزاج کے موافق ہے لیکن یہ کچھ نفاخ بادی
پیدا کرتا ہے۔

لوبیے کی پھلیاں، لوبیے کی نرم و نازک
پھلیاں گوشت کے ساتھ پکا کر کھائی جاتی ہیں
اور لذیذ ہوتی ہیں۔ یہ جسم کو غذائیت دیتی
ہیں لیکن ثقیل اور دیر ہضم ہوتی ہیں اور نفخ
پیدا کرتی ہیں، اس لیے بادی چیزوں میں
شمار کی جاتی ہے۔ پکانے کے لیے اس کی
ملائم پھلیاں حاصل کی جائیں اور ان کو





اچھی طرح گلا لیا جائے۔ ان میں گرم مسالہ اور
ادرک ضرور شامل کی جائے۔

اپنے مزاج کے پیشِ نظر ترکاریوں
اور پھلوں کے انتخاب میں سوچ سمجھ سے کام
لینا چاہیے، تاکہ یہ مہینہ آپ کے لیے بیماریوں
کا نہیں، صحت کا پیامی ثابت ہو۔ (بانو دہلی سے)

خط و کتابت کرتے وقت خریداری
نمبر یا ایجنسی نمبر کا ضرور حوالہ دیجیے۔
(منیجر)

بُوا کی باتیں

"اوئی، بہو بیگم! ہری مرچیں تو دیسی کی ویسی رکھی ہیں۔ تلوگی کب؟"

"بوا! تم نے سامان تو لا کر میرے سر تھوپ دیا لیکن بتایا نہیں کیا کروں؟"

"اچھا، تو بی بی صاحبہ کو ہری مرچیں بھی تلنی نہیں آتیں"

"تو میں کوئی باورچن تھوڑی ہوں"

"باورچن نہ سہی۔ اپنے ہاتھ کی پکائی ہوئی چیز ہی کچھ اور ہوتی ہے"

بوا نے بات بالکل ٹھیک کہی تھی۔ پھر جب ہری مرچ تلنے کی ترکیب بتائی تو مجھے ایسا لگا جیسے تل اوٹ پہاڑ ہو۔ بوا نے بتایا۔

"ہری مرچوں کو پہلے تو دھو ڈالو۔ پھر کسی کپڑے سے پانی خشک کر لو۔ اسکے بعد مرچوں کی ڈنڈیاں کاٹ کر پھینک دو اور مرچوں کو چیر دو۔"

دو منٹ کا کام تھا۔ میں نے یہ سب کر لیا۔ اتنی دیر میں بوا نے کڑھائی چولہے پر رکھ ڈالی۔ اسکے بعد بولیں۔

"اب دھنیا، سونف، زیرہ کو گھی کے بغیر کڑھائی میں ہلکا سا بھون کر پیس لو بی بی"

یہ بھی دو منٹ کا کام تھا۔ میں نے کر ڈالا۔ تو بوا نے بتایا کہ اب کڑھائی میں گھی اور مرچیں ڈال کر آنچ دکھاؤ۔ مرچیں بادامی ہو جائیں تو پسا ہوا مسالہ اور پسا ہوا نمک ڈال دو۔ دو منٹ بھون کر آنچ سے اتار لو اور لیموں اوپر سے نچوڑ دو۔ چٹپٹی مسالہ دار مرچیں تیار۔

میں ہنس دی: "ہر کام دو منٹ کا" میری زبان سے نکلا اور بوا نے جواب دیا۔ "اور کیا اتنی سی شے میں گھنٹے چاہئیں"

کم قیمت بالا نشین

محمد رضی الرحمن اقبال

• چنا خون کو صاف کرتا ہے، بدن کو فربہ کرتا ہے اور طاقت بخشتا ہے مگر اس کا زیادہ استعمال معدہ کے لئے مضر ہے۔

• دماغی کمزوری کو دور کرنے کا سب سے اچھا نسخہ سیب ہے۔ اس کے استعمال سے طبیعت چُست اور پھرتیلی ہو جاتی ہے۔

• گرما کے موسم میں ہر روز چھاچھ کا استعمال بہت مفید ہے اس سے جسم کی گرمی دور ہوتی ہے اور بدن کو طاقت حاصل ہوتی ہے۔

• پالک انتہائی طاقتور بھاجی ہے اس سے خون بڑھتا ہے اور آنکھوں کی بینائی میں اضافہ ہوتا ہے۔

• اگر آپ کو بدہضمی ہو گئی ہے تو نہار منہ پکا ہوا کیلا کھائیں۔ آرام ہو گا۔

• اگر آپ کے پیٹ میں گیس بھر جاتی ہے۔ یا معدہ درست نہیں، طبیعت سست ہے تو سونف کا استعمال کریں۔ تھوڑی سی سونف بھون کر رکھ لیں اور ہر روز صبح یا شام تھوڑی سی چبالیں۔ حیرت انگیز فائدہ ہو گا۔

• دماغی کام کرنے والوں کے لئے ہر روز صبح اور شام کھلی جگہ یا گھاس پر چہل قدمی کرنا ضروری ہے اور اگر ہر روز ایک کیلا بھی استعمال کرلیں تو بہت تقویت بخشتا ہے۔

• اپنے تکیوں کو کھٹملوں کی نیناہ گاہ نہ بنایئے۔ تکیہ میں روئی بھرتے وقت اس میں تھوڑا سا کافور ملا دیجئے۔ کھٹمل پاس بھی نہ آئیں گے اور گرمیوں میں تکیہ ٹھنڈا بھی رہے گا۔

• صحت منر رہنے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ ہر روز کھانا وقت پر کھائیں اور بھوک سے دو ایک نوالے کم کھائیں۔

امریکی عورتوں میں کینسر کی کثرت

امریکہ میں سرطان (کینسر) کے ماہرین کے اندازے کے مطابق امریکہ کی ۱۲۴۵۰۰۰ خواتین چھاتی کے کینسر میں مبتلا ہیں لیکن انھیں خود اس کا علم نہیں۔ اس سال تقریباً ۹۰۰۰۰ میں کینسر تشخیص ہوگا اور ان میں سے ۳۰۰۰۰ اس موذی مرض میں ہلاک ہو جائیں گی۔

• چھاتیوں کا سرطان عموماً ۴۰ سال کی عمر کے بعد واقع ہوتا ہے یعنی زیادہ عمر والی خواتین کے لیے سرطان کا خطرہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔

• اگر ایک چھاتی میں سرطان ہو چکا ہو تو اس کا مزید خطرہ باقی رہتا ہے۔ اسی طرح ورم پستان جیسی بیماری کے بعد بھی اس کا خطرہ بڑھ سکتا ہے۔

• کینسر میں حمل اور بچوں کی پیدائش کو بھی دخل ہے۔ تین سے کم بچوں والی خواتین کے لیے خطرہ زیادہ ہے۔ اس صورت بھی خطرہ زیادہ ہوتا ہے جب حمل ۲۵ برس کی عمر کے بعد واقع ہوں اور اس سے بھی زیادہ خطرہ اس وقت ہوتا ہے جب پہلا حمل ۳۰ برس کی عمر کے بعد واقع ہو۔

• اگر لڑکیاں بے تحاشا کھا کھا کر موٹی ہو جائیں اور سن بلوغ سے پہلے ان کا وزن بڑھ جائے تو انھیں ایام جلد شروع ہوں گے اور یہ بھی ایک خطرے کا عامل ہے۔ اسی طرح غذا میں خاص طور پر چکناہٹ کا استعمال بھی چھاتی کے کینسر کا ایک عامل ہو سکتا ہے۔

امریکی عورتیں چربی اور چکناہٹ بہ کثرت استعمال کرتی ہیں ان میں یہ مرض ایشیائی عورتوں سے نسبتاً زیادہ ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو ایشیائی عورتیں امریکہ میں زیادہ دیر قیام کرتی ہیں ان کی غذا میں چکناہٹ کے اضافے کی وجہ سے اس کا خطرہ بڑھ جاتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ خواتین کو اپنی اور اپنی لڑکیوں کی غذا میں چکناہٹ کے استعمال کے معاملہ میں پرہیز کرنا چاہیئے۔ (ہمدرد صحت)

غزل

ایک شخص ہے جو تم سے شکوہ کئے ہے ۔۔۔ ہے درد سے بے چین کہ ہونٹ سئے ہے
انساں ہے کہ بار غم کو جیسے اٹھائے ۔۔۔ ذرہ ہے کہ سورج کو ہتھیلی پہ لئے ہے
ہاتھ اس کا بڑے غور سے دیکھے ہے نجومی ۔۔۔ جو شخص ترے ہاتھ میں ہاتھ اپنا دئے ہے
خود ساز خداؤں سے ایک اللہ کا بندہ ۔۔۔ جھگڑے ہے کہ بس ایک خدا کے لئے ہے
دولت کا یہ پانی بہت اچھا مگر اس سے ۔۔۔ اتنی ہی بڑھے پیاس کوئی جتنا پئے ہے
منہ پھیر کے سب بیٹھے کلیسوں سے ہیں پیچھے ۔۔۔ غصّے کا بھی انداز ہے، مائل بھی کئے ہے

خوش کرلے کسی طور سے تجھ کو ترا مائل
بس ایک اسی آس پہ مر مر کے جئے ہے

مائل خیرآبادی —— ۱۰ اپریل ۱۹۶۹ء

غزل

عروج زیدی

فکرِ بیش و کم نہیں اُن کی رضا کے سامنے
یہ مجھے تسلیم ہے ارض و سما کے سامنے

یہ کمالِ جذبِ دل میری نظر سے دُور تھا
آپ خود آجائیں گے پردہ اُٹھا کے سامنے

وہ تو کہیے میرا دل آماجگاہِ شوق ہے
ورنہ کون آتا ہے تیرِ بے خطا کے سامنے

کربلا کے حادثہ کا جائزہ لینے کے بعد
اِک سوال آتا ہے اربابِ وفا کے سامنے

آندھیاں اُن کو بجھا دیں آندھیوں کی کیا مجال
میں نے جو شمعیں جلائی ہیں ہوا کے سامنے

گردِ مایوسی نہ ہو آئینۂ اُمید پر
لاکھ رہے نارسائی ہو دعا کے سامنے

ٹوٹ جائے گا طلسمِ رہزنی و رہبری
میں اگر آئینہ رکھ دوں رہنما کے سامنے

جو قناعت کا سوالی جو غرض نا آشنا
سر جھکا دیتی ہے دنیا اس گدا کے سامنے

اے ضمیرِ زندہ! میرے ہر قدم پر احتساب
نامۂ اعمال جائے گا خدا کے سامنے

سوچنا پڑتا ہے کیوں بے بس ہوں کیوں مجبور ہوں
میں سرِ آغازِ فکرِ انتہا کے سامنے

کیا بتاؤں میری غرقابی پر کس کا ہاتھ تھا
ناخدا کو پیش ہونا ہے خدا کے سامنے

فکرِ ما، ادراکِ ما، درکارِ ما، آزارِ ما
میری ہر مشکل ہے جب مشکل کشا کے سامنے

شدتِ احساسِ توبہ کا وہ عالم ہے عروجؔ!
جام میرے سامنے ہے میں خدا کے سامنے

حجاب کی نظر میں!



● **سفینۂ غزل**: مصنف عروج زیدی۔ ناشر سید عرفان علی زیدی۔ ڈیمائی سائز صفحات ۱۴۰ مجلد خوبصورت گرد پوش اور مصنف کی تصویر کے ساتھ۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت پندرہ روپیہ

ملنے کا پتہ: عرفان زیدی محلہ سیف الدین خاں رامپور۔ یوپی۔

● عروج زیدی صاحب ملک کے پختہ مشق شعرا میں سے ہیں۔ آپ کی شاعری کی عمر کم و بیش پچاس سال ہے۔ عروج صاحب کے کئی مجموعۂ کلام شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب سے پہلے ان کے قطعات کا مجموعہ "شمع فروزاں" شائع ہوا اور اردو اکاڈمی سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔ اس سال سفینۂ غزل پر بھی ایک ہزار روپیہ ایوارڈ ملا ہے۔ اس مجموعے میں موصوف کی [illegible] سے [illegible] تک کی غزلیں ہیں۔ کتاب پر گوپال متل ایڈیٹر تحریک نئی دہلی، رشید حسن خاں شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی اور پروفیسر ڈاکٹر احمد سجاد صاحب رانچی یونیورسٹی اور عنوان چشتی نے بڑے اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ حسن اتفاق یہ کہ ان میں سے اول الذکرین صاحبوں کو بھی ان کی کتابوں پر ایوارڈ ملے ہیں۔

ہمیں پوری کتاب "سفینۂ غزل" پر اسلامی نظریات کی چھاپ نظر آئی۔ خوشی ہوئی کہ یہ نظریات واعظانہ انداز میں نہیں بلکہ شاعرانہ صلاحیت کے ساتھ سموئے گئے ہیں۔

پہلی غزل "اعتراف" کے عنوان سے ہے جو دراصل حمد ہے۔ اس کے بعد دو نعتیں پھر صفحہ ۱۴۰ تک غزلیں ہی غزلیں ہیں۔ ان غزلوں میں دین و اخلاق، صلح و سلامتی اور عشق و محبت کے

ذہانت کی آنچ پوری طرح محسوس ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سنگریزوں کی رگوں سے بھی میں ناواقف ہوں
تیرے ہاتھوں میں ہے آئینہ کا جوہر اے دوست!

میرے قابو میں تو قرطاس کا پرزہ بھی نہیں
تیرے ہاتھوں میں ہے کونین کا دفتر اے دوست!

گرتی دیوار سے بچ بچ کے گزرنے والو
اسکے سائے میں پلے ہو یہ تمہیں یاد نہیں!

زندگی غم سے عبارت ہے تمہیں کیا معلوم
اور غم کس کی امانت ہے تمہیں کیا معلوم!

بس اس "خطا" پہ کہ ربطِ خصوصی ہے مجھ سے
میرے قریب کی دنیا بھی خفا ہے مجھ سے!

بے خبر سوتے تھے آغوشِ وفاداری میں
آج بھی تم نے جگایا ہے تو ہم جاگے ہیں!

ان کو دیکھا تو قدم یوں رک گئے
جیسے دامن ہو کہیں الجھا ہوا!

میری نظروں میں صرف مرا آشیاں نہیں
گزر رہا ہوں برق کی رفتار دیکھ کر!

خود بخود جب موسمِ گل میں یہ لو دینے لگے
تنکے تنکے کو چراغِ آشیاں کہنا پڑا!

جو آتی ہے تو یادِ عشرتِ رفتہ مزید آئے
گھر پہ چھائیوں کا ہم کبھی پیچھا نہیں کرتے

خیر ہے آپ کہاں، جادۂ پرخار کہاں
میرے غم خانے کو یہ راہ گزر جاتی ہے!

پھول ہیں محرومِ اندازِ جنوں !
ان کا دامن چاک ہے تو کیا ہوا!

پھر اس نرمی سے بولا جا رہا ہے
جیسے پھولوں میں تولا جا رہا ہے

کمند ڈال رہا ہوں میں چاند تاروں پہ
مآل کچھ ہو مگر خواب تو سنہرا ہے

کمند ڈال رہا ہے جو چاند تاروں پر
خدا ہی جانے کہ تقدیر آدمی کیا ہے

آدمی انسان تھا در انسان جانتا
زہد سے تو یہ بزعمِ خود فرشتہ بن گیا

درِ جنت پہ میں پہنچا تو یہ غیبی پیام آیا
جہاں پہلی پہل کھائی تھی ٹھوکر وہ مقام آیا

اب کوئی دم کا ہے مہمان اندھیرے کا غرور
یہ ابھرتے ہوئے سورج کا پیام آیا ہے

ہم سمجھتے رہیں، ہمیں وقت نے سمجھایا ہے
دیر سے دھوپ ہی ہوتی ہے [illegible]

یہ ذمت کرم بھی مرے دوست کیوں کریں — میں تے خود اپنی راہ میں کانٹے بچھائے ہیں
مسکرا کر چوم لیتا ہوں کبھی دار و رسن — اور کبھی اک پھول لگنے سے تڑپ جاتا ہوں میں
سب نگاہِ التفاتِ دوست کے محرم نہیں — یہ جدھر ہو جائیگی عالم اُدھر ہو جائے گا

جبیں جھکے ماسوا کے در پہ پناہ تیری خدائے برتر!
خرد کو یہ مصلحت مبارک، جنوں کا یہ فیصلا نہیں ہے!

عروج وسعتِ فطرتِ بشر خدا کی پناہ — غمِ حیات پکارے تو آدمی ہی لے

زیر تبصرہ مجموعۂ کلام میں ایسے ہی اشعار ملیں گے۔ عروج صاحب جو کچھ کہتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں اور اسے شعری جامہ بھی خوب پہناتے ہیں۔ میں نے ان کی غزلوں میں ایک ایسی خوبی پائی ہے جو بہت کم شعراء کے حصے میں آئی ہے۔ ان کی غزلوں میں تقریباً ایک ہی حیا کے اور کم و بیش ایک ہی وزن کے اشعار ہوتے ہیں۔

عروج زیدی صاحب کا فن اور ذہن اشعار کی صورت میں ہمارے سامنے آگیا گوپال متل صاحب "حرفے چند" کے عنوان سے عروج صاحب کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں۔

"عروج صاحب کا دائرہ فکر وسیع ہے حسن اور عشق کے معاملات کے ساتھ ساتھ کچھ اور معاملات زندگی ہیں جن سے وہ گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور یہ دلچسپی عاشقانہ نہیں، حکیمانہ ہے۔ ان سبھی معاملات کا کامیاب شاعرانہ اظہار ان کی غزلوں میں ہوا ہے۔" (سفینۂ غزل ص۳ و ص۴)

رشید حسن خاں صاحب نے اس طرح خراج تحسین پیش کیا ہے۔

"عروج صاحب کے یہاں زبان کی صحت اور بیان کے حسن کا اہتمام واضح طور پر نظر آتا ہے اور مقررہ ضابطوں اور متعین آداب کی انھوں نے پوری طرح پابندی کی ہے اور ساری پابندیوں کے ساتھ اچھے شعر کہتے ہیں۔ یہ ثبوت

ہے اس کا کہ وہ زبان کے مزاج شناس ہیں اور بیان پر ان کو قدرت ہے۔" (سفینۂ غزل ص۱۱)

ڈاکٹر احمد سجاد صاحب اس طرح رقمطراز ہیں۔

"گزشتہ پینتالیس برسوں سے عروج زیدی کی غزلیں ہند و پاک کے بیشتر معیاری رسالوں میں شائع ہو رہی ہیں اور سید احتشام حسین، نیاز فتحپوری، اختر انصاری، فراق گورکھپوری، گوپال متل اور ماہر القادری وغیرہ جیسی شخصیتوں سے داد پا چکی ہیں مگر اس کے باوجود ان کے کلام کا بالاستیعاب تنقیدی مطالعہ ہنوز باقی ہے۔"

(سفینۂ غزل ص۱۶)

اردو ادب کے ان اساطین (گوپال متل، رشید حسن خاں، ڈاکٹر احمد سجاد، ڈاکٹر عنوان چشتی) نے عروج صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ سو فیصد نہیں تو ۹۹ فیصد ضرور صحیح ہے۔ غائر نظر سے دیکھنے کے بعد چند لفظوں پر انگلی رکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً ص۱۵۸ پر برہم نَظَری کو برہم نَظْری (فعلن) کہہ گئے۔ ایک جگہ "میرے ہاتھوں میں تو کشتی کی بھی پتوار نہیں" مصرع میں بھی پتوار کے بعد ہونا چاہیے۔ ایک جگہ نورانی دنیا کا سماں یوں کھینچا ہے: ؎ شورِ تھا معراج کی شب الصلوٰۃ علیہ السلام

نورانی دنیا میں "شور"؟ اس کے بدلے نرم لفظ ہونا چاہیے جیسے صدا۔ ایک جگہ عربی کے لفظوں سے اردو کی ایک ترکیب ڈھالی گئی ہے۔

"افضلِ کُل مرسلیں ہو، یا محمد مصطفےٰ"

افضلِ کل مرسلیں کی ترکیب اردو میں ایک عجوبہ سا معلوم ہوتی ہے۔ ایسا ہی عجوبہ اس مصرع میں دیکھئے "تیرے ہاتھوں میں ہے بحر کا لنگر اے دوست" بحر کا لنگر ....

ہمیں تو یہ معلوم تھا کہ جہاز کا لنگر ہوتا ہے۔ بحر کا لنگر بھی ہوتا ہے۔ یہ ہمارے علم میں نیا اضافہ ہے۔

کہیں کہیں ہم مخرج حروف ادغام ہو گیا ہے جیسے "تیرے ہاتھوں میں ہے بحر کا لنگر اے دوست" میں سے ہر اور "دیکھ یا دھوپ ہی ہوتی ہے نہ سایہ یارو" میں بھی ہوا اور [illegible]

حروف کا ادغام عیب مانا جاتا ہے۔ اس طرح کے ادغام سے کوئی شاعر نہیں بچا ہے۔ میرے سب سے اچھے شعر میں ملاحظہ فرمائیں۔ سب پہ جس بار نے گرانی کی ؏ سب پہ کو ادا کیجئے تو سپّے نکلے گا۔ یہ تو ہو ہی ہو اور یہ یاسے بھی بڑا عیب ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ان نقطوں اور ترکیبوں کی تاویل کرلی جائے لیکن — لیکن کے بعد جو کچھ عرض کررہا ہوں اس کا تعلق فکر ونظر کی لغزش سے ہے۔ اس لغزش سے دوسرے لوگ متاثر ہوسکتے ہیں۔ اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ واضح کردوں۔ پہلی غزل "اعتراف" کا مصرع ہے۔

خیر و شر کے لیے تخلیق ہوئی ہے میری (سفینۂ غزل ص۱ شعر۳)

واضح رہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے شر کے لئے نہیں پیدا فرمایا۔ یہ اندیشۂ تخلیق آدمؑ کے وقت فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور ظاہر کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ — میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ قرآن نے انسان کی وجہ تخلیق یہ بتائی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

یعنی محض عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ عبادت خیر ہی خیر ہے۔ اگر شاعر کا خیال فالہمہا فجورہا وتقواہا کی طرف گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نیک و بد کی تمیز انسان پر الہام فرمادی گئی ہے۔ معروف ومنکر اس پر واضح ہے۔ اس کے بعد ص۱۸ پر نعت شریف ہے۔ اس کا دوسرا شعر یہ ہے۔

إِنَّهُ قومی کی دعا فرما کے ثابت کردیا افضلِ کل مرسلیں ہو یا محمدؐ مصطفےٰ

۱۔ افضل کل مرسلیں کا مطلب یہ ہے کہ تمام نبیوں میں سب سے افضل۔ ہم بھی مانتے ہیں لیکن اس کی دلیل إِنَّهُ قومی کی دعا نہیں ہے بلکہ آپ کا خاتم المرسلین ہونا تاقیامت تمام انسانوں کے لئے رسول ہونا ہے۔ دوسرے انبیاءؑ "لکل قوم ہاد" کے تحت اپنی اپنی قوم کے لئے نبی تھے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تاقیامت — دنیا کی ساری قوموں کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ہوں — اس کا دوسرا شعر ہے۔

عَلّمَ مالم تکن تعلم ہے جس کی شان میں
وہ تمہیں ہو، ہاں تمہیں ہو، یا محمد مصطفٰے

عَلّمَ مالم تکن تعلم قرآن کی کوئی آیت نہیں ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اُتری ہو۔ قرآن میں "عَلّمَ الانسان مالم یعلم" انسان کو وہ کچھ سکھایا گیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے سلسلے میں نہیں نازل ہوئی۔ بلکہ انسان کے لئے اللہ کے احسانوں میں ایک احسان کے طور پر ہے۔ اس کے بعد ملاحظہ ہو:

وہ کلیم اللہ تھے جو طور تک محدود تھے
تم سرِ عرش بریں ہو یا محمد مصطفٰے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں اس طرح ہے کہ میرا اور نبیوں کا تقابل اس طرح نہ کرو کہ کسی نبی کے بارے میں ذم کا پہلو آجائے۔ اس شعر میں یہ پہلو آگیا ہے۔ پھر فرمایا تم سرِ عرش بریں ہو آگے اور کھل کر کہا گیا ہے:

شور تھا معراج کی شب الصلوٰۃ والسلام
عرش کے مسند نشیں ہو یا محمد مصطفٰے

عرش کے مسند نشیں ہو" آخر یہ بات کہاں سے ثابت ہے۔ عرش نشین تو اللہ تعالیٰ ہے۔ اگلا شعر ملاحظہ ہو:

سورۂ والشمس کی تفسیر ہے روئے جمیل
پیکرِ نور آفریں ہو، یا محمد مصطفٰے

حضورؐ پیکرِ نور تھے یہ تسلیم لیکن آپؐ پیکرِ نور آفریں تھے۔ یہ تسلیم نہیں۔ نعت کہتے وقت بہت چوکنا رہنا چاہیے۔ سچ کہا جس نے کہا: — باخدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار

جی ہاں "با محمد ہوشیار" حضورؐ کی حدیثوں سے ثابت ہے کہ دوسری قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ انھوں نے اپنے انبیاء کو شریکِ خدا بنا لیا تھا۔ کاش صاحب کی یہ غزل انتخاب کلام کے وقت نکال دی جاتی تو کم سے کم فکری لغزشوں سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی تعلیم کی روشنی میں زندگی کو خوشگوار و با مقصد بنانے کیلئے نئی نسل کو اسلامی طریق سکھانے کیلئے

مسلم خواتین اور طالبات کے لئے نادر موقع

اسلامی تعلیم خانہ داری و سلائی مراسلاتی کورس

جو صرف خواتین کے لئے قائم ہے۔ اگر آپ معمولی اردو لکھ پڑھ سکتی ہیں تو ایک گھنٹہ روزیہ کے مطالعہ سے اس کورس کے ذریعہ ارکان اسلام۔ تہذیب و عمل۔ سلیقہ و خانہ داری خط و کتابت و سلائی کڑھائی میں بذریعہ ڈاک امتحان دے کر سند حاصل کر کے مسلم معاشرے میں ایک مقام حاصل کر سکتی ہیں۔

مکمل معلوماتی کتاب "اسلامی تعلیم خانہ داری کورس" مفت حاصل کریں۔

پتہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

ادارۂ اختری۔ محلہ ابوالبرکات۔ دیوبند۔ یو۔ پی

پن کوڈ ۲۴۷۵۵۴

اسلامی شعور بیدار کرنے والی ایمان افروز کتابیں

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام اور جاہلیت ۰/۷۵
اسلامی تزکیہ نفس ۰/۹۰
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر ۳/۰
اسلام کا نظام حیات ۱/۰
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر ۰/۷۵
اسلام کا نظریۂ سیاسی ۰/۷۵
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے ۰/۸۵
اسلامی قانون ۱/۵۰
اسلام اور جدید معاشی نظریات ۲/۵۰
اسلامی معیشت کے اصول و مقاصد ۰/۶۰
انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
اسلام اور ضبط ولادت ۵/۰
اسلامی نظام معیشت ۰/۷۵
اسلام کا معاشی نظام ۰/۷۰
اسلامی سیاست
(سیاسی کشمکش، سوم) ۶/۰
اسلام کا سرچشمۂ قوت ۲/۰
اسلام کا پیغام ۰/۴۰

اسلامی تہذیب اور اسکے اصول و مبادی ۶/۰
اسلام کی ابتداء ۰/۲۵
اسلام کس چیز کا علمبردار ہے ۱/۵۰
اسلام اور رہبانیت ۰/۷۰
اسلامی ادب ۰/۵۰
اسلامی فلسفہ معیشت کے بنیادی اصول
امام ابوحنیفہؒ اور انکا کارنامہ ۱/۵۰
ایک نہایت اہم استفتاء ۰/۲۵
اہم ہدایتیں ۱/۲۵
اقبالیات ۱/۵۰
اسلام کی دعوت (جلال الدین عمری) ۴/۰
اونچ نیچ چھوت چھات ۰/۴۰
اسلام ایک نظریہ (صدرالدین اصلاحی)
اساس دین کی تعمیر ۵/۰۰
اسلام اور اجتماعیت ۲/۵۰
اسلام ایک عظیم جدوجہد (عبدالحمید...) ۴/۰
انسان اپنے آپ کو پہچان ۵/۰۰
اسلام کا تعارف ۵/۰۰

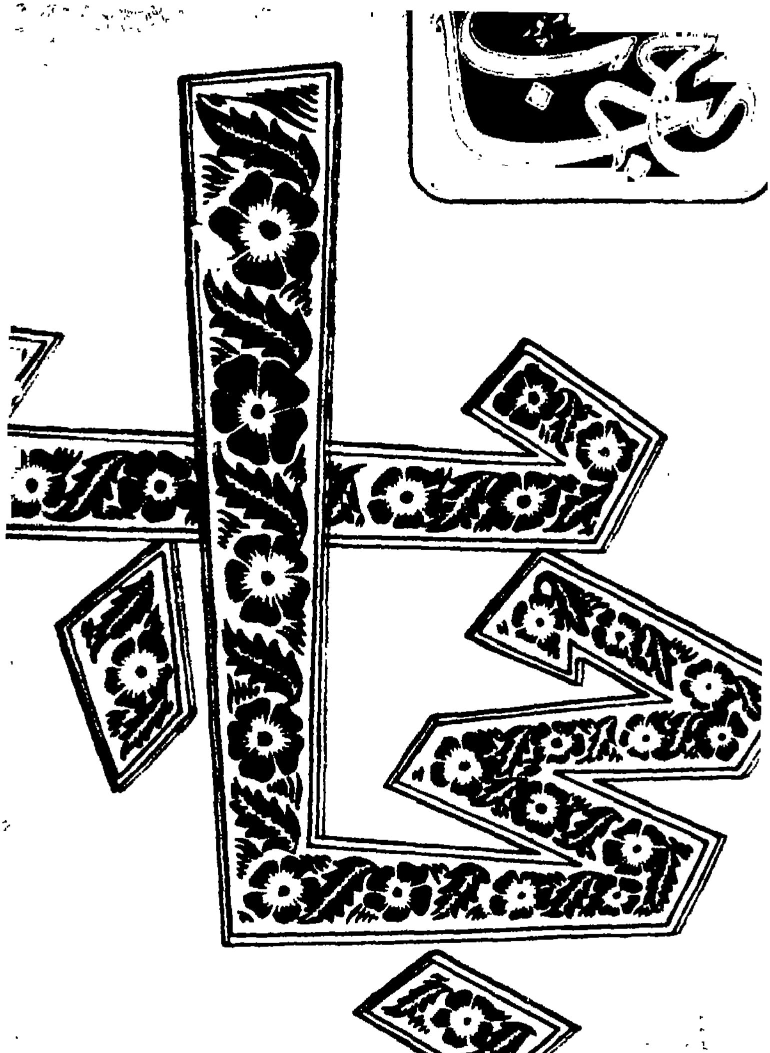
اسلام کا عدل اجتماعی (سید قطب) ۱۶/۰
اسلام اور جدید ذہن کے شبہات ۱۲/۰
اسلام ایک ضرورت (محمد قطب) ۲/۰
اسلام کا روشن مستقبل ۲/۵۰
اسلام آپ سے کیا چاہتا ہے (سید حامد علی) ۳/۰
اسلامی زندگی کے نشان راہ ۳/۰
اسلامی توحید (محمد یوسف اصلاحی) ۱/۰
اسلام ہی کیوں؟ (انیس الدین احمد)
امن کس طرح قائم ہوسکتا ہے۔
سید حامد حسین حبیب اللہ
انسانی اخوت (ملک حبیب اللہ)
اقبال کی ترجمانی ان کے صاحبزادے
کی زبانی (جاوید اقبال) ۰/۷۰
انسانوں کی خدمت (ملک حبیب اللہ) ۰/۷۰
آپ کی الجھن (عمر افضل) ۲/۵۰
انسان اور اسکے مسائل (جلال الدین عمری)
اسلامی نصب العین (عروج قادری)
اقامت دین فرض ہے ۱/۰
اولیاء اللہ ۱/۰

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

مالک، پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر محمد اسحٰق ... مطبوعہ ... پریس دہلی، مقام اشاعت بارہ دری ...

Regd. ...

MONTHLY HIJAB RAMPUR U.P.



پاکیزہ ڈائجسٹ

خواتین اور طالبات

حجاب

ایڈیٹر مائل خیرآبادی

شمارہ ۱۲   جلد ۹

اکتوبر ۱۹۷۹ء   ذی قعدہ ۱۳۹۹ھ

ایک شمارہ ۳/

سالانہ چندہ 26/   V.P سے منگانے پر 30/

اس دائرے میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ نے حجاب کے لئے جو
زرِ تعاون عنایت فرمایا تھا اس کی مدت اس پرچے کے ساتھ ختم ہو گئی۔ تجدید کرنے کے لئے جلد سے
جلد زرِ تعاون مرحمت فرمائیں۔ والسلام —— منیجر حجاب رامپور یوپی

تلخیاں

(شائستہ ثمیم)

(۱)

مری خطاؤں کے پرچے، مرے گناہوں کی بات — کبھی تو ذکر بھی ہوتا مری وفاؤں کا
ستم شعار وستم تم نے کیا، نہیں تو رہے — یہ میرا ظرف نہ شکوہ کیا جفاؤں کا

(۲)

میں نے جس باغ کو سینچا تھا لہو سے اپنے — آہ اس باغ کے پھولوں ہی سے جل اٹھی ہوں
میں نے جو آگ جلائی تھی اُجالے کے لئے — خود اسی آگ کی گرمی سے پگھل اٹھی ہوں

(۳)

مشورہ سر تو کٹانے کا بجا ہے لیکن — حق مگر کوئی گلستاں پہ مرا ہے کہ نہیں
تم بصد شوق بھرو پھولوں سے دامن اپنا — کچھ وفاؤں کا مگر میری صلہ ہے کہ نہیں

(۴)

ہر اک طرح سے ثبوت وفا دیا لیکن — تمہیں یقین نہ آیا مری وفاؤں کا
اب اختیار تمہیں دو سزائے جرم وفا — صلہ ملے تو سہی کچھ مری خطاؤں کا

(۵)

یہ مانتی ہوں کہ اب میں چمن پرست نہیں — چمن کے پھولوں میں لیکن کہاں ہے بوئے وفا
میں اپنا سر بھی کٹا دوں اگر چمن کے لئے — مرا یقین ہے تم کو رہے گا پھر بھی گلا

(۶)

دورِ جمہور کی آزاد فضاؤں کی قسم — لب ہلائے کوئی انساں، یہ جسارت بھی نہیں
سر اٹھانا تو بڑی بات ہے میرے یارو — ایک انگلی تو اٹھانے کی اجازت بھی نہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(اداریہ)

دو ٹوک بات

یہ بات ماہنامہ حجاب کے اجراء کے وقت جولائی [illegible] کے پہلے ہی شمارہ میں عرض کر دی گئی تھی کہ "حجاب" خواتین اور طالبات کی ذہنی اصلاح اور عملی تربیت کی غرض سے نکالا جا رہا ہے ذہنی اصلاح قرآن و سنت کی روشنی میں اسلامی عقیدوں کے مطابق ہوگی اور عملی تربیت میں سب سے پہلے گھر کی اصلاح پر پورا زور صرف کیا جائیگا الحمد للہ کہ ہم نے اس پالیسی کو ایک حرف نہیں بدلا. ایک طرف قرآن و سنت سے عقائد اخذ کر کے صاف صاف اور نکھار کر پیش کئے اور ان میں کسی قسم کی مداہنت نہیں برتی. دوسری طرف گھر کی اصلاح کے لئے بات یہاں سے شروع کی کہ تربیت کا منشا، صرف یہی نہیں ہے کہ روزہ نماز اور کلمہ ہی پڑھ لیا جائے بلکہ اسلامی عقیدوں

کی روشنی میں گھر سے لے کر باہر تک زندگی کے تمام گوشوں میں خواتین کی عملی تربیت ہونا چاہئے اور ایک مسلمان کا گھر صحیح معنوں میں اسلامی تربیت کا نمونہ۔

اس سلسلے میں ہم نے خواتین کی تربیت کے لئے جو سلسلہ شروع کیا اس میں سب سے پہلے یہ بتایا کہ گھر ایک چھوٹی سی ریاست ہے اس ریاست کا سربراہ (قوام) گھر کا مرد ہے۔ مرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اہلیہ کو دوزخ کی آگ سے بچانے کی فکر کرے۔ یہ بات ہم نے قرآن کی آیۃ • قوا انفسکم واہلیکم نارا سے اخذ کی۔ ہمارا یہ موقف بالکل صحیح ہے۔ اس کے بعد ہم نے خواتین کو بتایا کہ اب تم گھر کی راعی ہو۔ گھر کی دیکھ بھال۔ اپنے نفس کی حفاظت۔ بچوں کی تربیت کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ تم اپنے بچوں کی تربیت اس طرح کرو کہ وہ اللہ کے بہترین سپاہی بن کر گھر سے نکلیں اور تحریک اسلامی کے فروغ اور اقامت دین کے فریضہ کو ادا کرنے کے لئے اپنے کو وقف کر دیں۔ یہ تربیتی پروگرام ہم نے قرآن و سنت کی روشنی میں دیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم خواتین کو یہی بتا رہے ہیں سمجھا رہے ہیں۔ حجاب کے مقالات و مضامین افسانے اور کہانیاں۔ نظمیں اور غزلیں۔ گھریلو تخلیقات سب اس کے گواہ ہیں۔

ہماری ایک تنقید

خواتین کی اصلاح و تربیت کے لئے مسلمانوں کا شعور بیدار ہو چکا ہے۔ اور وہ اپنی اپنی جگہ نیز اجتماعی طور پر کوشش میں لگے ہیں۔ ہمارے ملک میں کچھ جماعتیں ہیں جو باقاعدہ ایک نصاب کے ذریعہ خواتین کی اصلاح کر رہی ہیں۔ ان جماعتوں میں تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی پیش پیش ہیں اور اپنے اپنے طریقے سے دین کی اس خدمت کو انجام دے رہی ہیں۔ ہم ان دونوں جماعتوں کی تبلیغی سرگرمیوں کو خلوص و محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ جب تربیتی غرض سے ہم نے اپنے مضامین میں گھر کی ریاست پر توجہ دلائی اور خواتین کے اجتماعات کے سلسلے میں کچھ اصلاحات پیش کیں اور ہم نے کہا کہ خواتین کے اجتماعات اتنے زیادہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آئے دن عورتوں کا سواری پر لد لد کر جانا۔ گھر کی ریاست کے سربراہ (قوام) کے لئے باعث تشویش ہو جائے گا۔

گھر کی حفاظت کے اعتبار سے بھی اور گھر کے بجٹ کے اعتبار سے بھی تو اس سلسلے میں ہمارا یہ فقرہ خاص طور پر لوگوں کو کھٹکا کہ

• جو شخص اپنے گھر کی اصلاح کی کوشش نہیں کرتا اور دعوت و تبلیغ کی دھن میں گھر کے باہر میدان تلاش کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جس کے گھر میں آگ لگی ہو وہ اسے تو نہ بجھائے لیکن بالٹی میں پانی لئے ہوئے باہر تلاش کرتا پھرے کہ کہاں آگ لگی ہے۔ جہاں یہ پانی صرف کیا جائے ؟

یہ بات ہم نے اس وقت کہی تھی جب آج سے تین سال پہلے جماعت اسلامی نے اپنے کارکنوں کو یہ پروگرام دیا تھا کہ سب سے زیادہ گھر کی اصلاح پر زور دیا جائے۔ ہم نے اوپر جو اقتباس دیا اس کے مخاطب جماعت اسلامی کے کارکن تھے۔ ہوا فقرہ یہ ہے کہ ہم نے جماعت اسلامی کے کارکنوں پر تنقید کی تھی کہ وہ گھر کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ گھر کے باہر ذرا دیر تقویٰ کی ایکٹنگ کرتے پھرتے ہیں لیکن ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ ہم نے جو تنقید جماعت اسلامی کے کارکنوں پر کی تھی اُسے تبلیغی جماعت والوں نے اپنے اوپر چوٹ سمجھ کر بہت زیادہ محسوس کیا چنانچہ ان کے ہمنوا کانپور کے ایک ماہنامہ نے ہمارے خلاف سخت اداریہ لکھا۔ یہ اداریہ ہمارے خلاف تو محض بہانہ تھا لیکن اس پردے میں جماعت اسلامی ہند پر کم اور مولانا مودودی پر زیادہ لعن طعن کی بوچھاڑ کردی۔ ہمارے کچھ رشتہ دار اور گھرانے کے لوگ تبلیغی جماعت کے کارکن ہیں۔ وہ ہمارے پاس شکوہ لے کر آئے تو ہم حیران ہوگئے کہ نشانہ کون تھا اور تیر کہاں جاکر لگا۔ ہم نے ان سے کہا کہ بات تو ہم نے جماعت اسلامی کے کارکنوں کے لئے کہی تھی لیکن اگر آپ لوگ ایسے ہی ہیں کہ گھر کی اصلاح پر توجہ نہیں دیتے اور باہر تبلیغی دھن میں مارے مارے پھرتے ہیں تو آپ کو بھی ہماری تحریر سے نصیحت حاصل کرنا چاہئے نہ کہ شکوہ۔

• حجاب کے کچھ ایجنٹ گھر ایک چھوٹی سی ریاست ہے اور اس میں حکومتوں کے لئے

کارکن بنا رہے ہیں۔ یہ بات ہمارے ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔ آج جہاں جہاں انقلابی جماعتیں اپنے اپنے یہاں کی ریاستوں کی اصلاح کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ وہ سب یہی کہہ رہی ہیں کہ چاہے وہ اسلامی جماعتیں ہوں یا غیر اسلامی۔ چنانچہ جب دنیا میں دو جگہ ابھی دنوں میں اسلامی انقلاب آیا تو حجاب نے بھرپور ان کی حمایت کی۔ حجاب میں ایسے مضامین کی بھرمار ہوئی تو وہ لوگ جو خواتین کو صرف روزہ نماز سکھانے چاہتے تھے۔ اور صرف یہ چاہتے تھے کہ ان کی خواتین بس گھر کی حد تک اچھی گھروالی بنی رہیں اسلامی ریاست کا نام نہ لیں۔ گھبرا گئے۔ ان کے خیالات ہمارے حجاب کے چند ایجنٹوں کے ذریعہ ہم تک پہنچے سالانہ خریدار صاحبان نے بھی لکھا کہ حجاب کو صرف گھریلو حد تک رہنا چاہیے۔ حجاب کی ایک ایجنسی کا ایک تفصیلی خط ملا۔ اسمیں ایجنٹ نے کچھ دلائل کے سہارے بحث بھی چھیڑی۔ ہم نے سب کو صاف جواب دے دیا کہ حجاب کی اشاعت متاثر ہوتی ہے تو ہو، ہم خواتین کے لئے بھی تحریک اسلامی اور اقامت دین کے فریضے کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے دنوں جماعت اسلامی ہند و کشمیر پر آزمائش آئی تو حجاب کے سیکڑوں خریدار کم ہو گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس سے ہمارے دل پہ نہ ملال آیا اور نہ ہم اس موقف سے ہٹے جو اختیار کر رکھا تھا۔ ہم اپنے موقف پر مطمئن ہیں۔ رہی حجاب کی اشاعت اور مالی منفعت تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے ہمارا معاملہ طے ہو چکا ہے۔ ہمیں اتنا ہی ملے گا جو اللہ نے ہمارے لئے طے فرما دیا ہے۔ فکر اس کی نہیں ہے۔ ہاں فکر اس کی ضرور ہے کہ جو معاملہ طے نہیں ہے اس کے بارے میں کیا کریں یعنی یہ کہ آخرت میں ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔

حوصلہ افزا رُخ اب ہمارے پاس جو خطوط آ رہے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اوپر جو بات ہم نے لکھی وہ دراصل عوام کا ردعمل تھا۔ ان کے برعکس اسلام کا صحیح شعور رکھنے والے حضرات نے ہماری حوصلہ افزائی کی۔ ان میں سے کچھ کے خطوط ہم اسی شمارہ میں شائع کر رہے ہیں اور صرف دو حضرات کا ذکر اظہار تشکر کے طور پر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان میں سے ایک بنگ مولانا ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب

ہیں جو جماعت اسلامی ہند کی طرف سے امیر حلقہ بہار ہیں اور دوسرے مولانا محمد حمزہ حسنی صاحب ایڈیٹر رضوان لکھنؤ سابق الذکر نے ہمیں ایک عنوان دیا۔ "خواتین میں تبلیغ دین کے طریقے" فرمایا کہ اس عنوان سے ایک سیر حاصل مضمون کی ضرورت ہے۔ میں نے اس ارشاد کی تعمیل کی مضمون بھیجا۔ وہ ایک بڑے مجمع میں سنایا گیا۔ اس مضمون میں بھی میں نے یہی موقف اختیار کیا تھا کہ نوے فیصدی دعوت و تبلیغ کی قوت گھر کی اصلاح میں اس غرض سے لگائی جائے کہ ہمیں داخلی طور پر تحریک اسلامی کے لئے کارکن مل سکیں۔ مولانا ضیاء الہدیٰ صاحب کی طرف سے ہمارے نام نہایت حوصلہ افزا خط موصول ہوا۔ اس کے بعد جو لوگ اس اجتماع میں شریک تھے۔ انھوں نے بھی ہمارے حوصلوں کو بڑھایا۔ اس اجتماع میں شریک ہونے والوں میں سے ڈاکٹر احمد سجاد صاحب نے اپنے ایک خط میں خاص طور پر ہمارے موقف کی حمایت کی۔ الحمدللہ۔

مولانا حسنی صاحب نے ہمیں عنوان دیا "اسلامی معاشرے کی تشکیل میں خواتین کی ذمہ داریاں"۔ چونکہ میں جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے اس فروعی اختلاف سے واقف ہوں اس لئے اس مضمون میں وہ رعایت ملحوظ رکھی لیکن ظاہر ہے کہ جو نظریہ میری رگ رگ میں سرایت کر گیا ہے اس کا اظہار بہر طور ہوا۔ خواہ وہ دبے سروں میں ہی۔ خواتین کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں جو بات عرض کی گئی ہے حسنی صاحب نے اس کی تائید کی اور مضمون کی پسندیدگی سے مطلع فرمایا۔

ایک توارد

اور اب جب کہ ایران اور پاکستان میں اسلامی انقلاب آیا اور اسلام دشمن تحریکیں وہاں اور جہاں جہاں تحریک اسلامی سرگرم عمل ہے۔ ہر جگہ تحریک اسلامی اور اسلامی انقلاب کو ناکام کرنے کی کوشش میں خفیہ اور علانیہ مکر (داؤں پیچ) سے کام لے رہی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم خواتین کو کھل کر حکومت اور اسلامی ریاست کے اسلامی نظریوں سے واقف کرائیں نیز دنیا بھر میں سرگرم عمل تحریکات اسلامی کے بارے میں بتائیں کہ کہاں کیا کیا اور کس کس طرح اللہ کے سپاہی سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے

ہیں اور وہاں کی خواتین کس طرح اپنے سپوتوں کی مدد کررہی ہیں۔ اور انھوں نے کیا قربانیاں پیش کی ہیں۔

ادھر مدیر حجاب کے دل میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ کچھ بزرگوں نے یہی بات لکھ بھیجی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کہ اس طرح کا ایک خطا اسی اشاعت میں ملاحظہ فرمائیں۔ توقع کی بہترین مثال آپ کے سامنے آئے گی۔ چنانچہ اب ہم حجاب کے کچھ صفحات اس کے لئے وقف کررہے ہیں اور حلقہ حجاب سے درخواست کرتے ہیں کہ تحریک اسلامی کی سرگرمیوں سے متعلق انگریزی، عربی یا کسی معروف زبان میں جو تخلیقات ان کے سامنے آئیں ان کی کٹنگ (تراشے) روانہ فرماکر ممنون فرمائیں۔

اس سلسلے میں ہم آنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جہاں جہاں تحریک اسلامی کا کام ہورہا ہے وہاں کا نوجوان (بغیر اس استثنیٰ کے کہ اس کا رکن مرد ہے یا عورت) اب اس موقف میں نہیں رہا کہ وہ مدافعت ہی کرے بلکہ چاہے وہ انڈونیشیا کی نوجوان لڑکی ہو یا لڑکا، کشمیر اور افغانستان کا جیالا ہو یا ایران و پاکستان میں انقلاب برپا کرنے والا۔ یہ سب اقدامی مرحلے میں آچکے ہیں۔ اسلام دشمن تحریکیں ان کو بھاری سے بھاری جانی و مالی نقصان تو پہنچا سکتی ہیں لیکن غیر ممکن ہے کہ انھیں دبا سکیں۔ ایسی حالت میں سوچنا یہ ہے کہ ہم کیا کریں۔ حجابی بھائیو اور بہنو! کم سے کم ہمیں ان کے لئے دعا تو کرنا ہی چاہیے اور اگر دل میں اسلام کو غالب کرنے کا جذبہ ہے تو دنیا بھر میں تحریک اسلامی کی جو لہر آگئی ہے اس سے کچھ سبق لیں۔ اللہ آپ کی مدد فرمائے۔ آمین۔

دودھ بخشنا

● چھوٹے نابالغ بچے مرتے ہیں تو اسکی ماں سے کہا جاتا ہے کہ دودھ بخش دے۔ دودھ بخشنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بچے نے ماں کا جو حق ادا نہیں کیا ہے اس کے لئے معافی کا اعلان کرے۔ اس سلسلے میں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ بچے معصوم ہیں۔ آخرت میں ان سے ان کے کاموں کا حساب نہیں لیا جائے گا۔ اور اللہ ان سے حساب لئے بغیر ہی ان کو جنت عطا فرمائے گا۔ لہٰذا یہ دودھ بخشوانا محض ایک رسم کے سوا کچھ نہیں۔ (ذکی صدیقی)

کس محبت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں

(۱) س۔ ر۔ ق (۲) رئیس نعمانی (۳) سید اسحاق حسینی (۴) مولانا نجم الدین احمد بابا!

چنچل گوڑہ حیدرآباد

14 . 7. 79

مکرمی و محترمی جناب مائل صاحب السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

ماہنامہ حجاب اب جس معیار پر پہنچ گیا ہے اس کے اعتبار سے ایک مشورہ میرے ذہن میں آرہا ہے جسے آپ کے سامنے پیش کرنے کے لئے زحمت دے رہا ہوں۔

خدا کے فضل و کرم سے اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالمی پیمانے پر تحریک اسلامی اپنی مدافعانہ حیثیت سے آگے بڑھ کر اقدامی منزل میں داخل ہوتی جارہی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بڑی طاقتوں (سیاسی) کے نزدیک یہ اب ناقابلِ لحاظ نہیں رہی اور انھوں نے اس کا NOTICE لینی سمجھے جانے لینا شروع کر دیا ہے۔

اگرچہ اخبار دعوت کے سہ روزہ ایڈیشن میں عالم اسلام کے نام سے کچھ ایسی باتیں آتی رہتی ہیں جو عالمی تحریک اسلامی سے متعلق ہوتی ہیں لیکن مجھے اس میں تشنگی محسوس ہوتی ہے (میرا جی چاہتا ہے کہ کسی اسلامی ماہنامہ میں ہر ماہ ایک متعین و مختص عنوان کے تحت پچھلے مہینہ بھر کے ایسے عالمی واقعات کا ایک جامع یعنی خلاصہ شائع ہوا کرے جس سے اسلامی تحریک کی عالمی رفتار کا ایک عکس قاری کے سامنے آتا جائے یہ نہ صرف اسلام پسندوں کی معلومات میں اضافہ کا موجب ہوگا بلکہ ان کے لئے ایک مہمیز کا بھی کام دے گا اور اگر اسے پرکشش انداز میں پیش کیا جائے تو یہ دعوتی کام بھی ہو سکتا ہے۔

اس کے لئے مختلف ملکی و بیرونی ملک کے اسلامی اخبارات و رسائل اردو، انگریزی اور عربی

کا مطالعہ کرتے رہنا ہوگا۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کے پاس اس کا انتظام ہے یا نہیں لیکن اتنا ضرور یقین رکھتا ہوں کہ اگر آپ اس کام کو دو تین مددگاروں کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لے سکیں تو بہترین طریقہ پر اسے انجام دے سکتے ہیں۔ ابتداء ملکی اردو اخبارات و رسائل سے بھی کی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے مناسب عنوان پر میں نے بہت غور کیا لیکن میرا ذہن "کاروانِ اسلام" سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اس سے بہتر کوئی عنوان تجویز فرما سکیں۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔ والسلام۔ خاکسار۔ س۔ع۔ق۔ حیدرآباد۔

گلستان ۱۹۱ اصطبل چار باغ لکھنو۔

مکرمی مائل صاحب سلام مسنون

(۱) تازہ حجاب میں اتفاق سے نظر آپ کے تبصرے پر پڑ گئی جو آپ نے نذیری صاحب کی کتاب پر کیا ہے۔۔ آپ کا تبصرہ نہایت معقول و مناسب ہے۔ دراصل نعت کا مسئلہ اس قدر نازک ہے کہ بڑے بڑوں کا دامن خیال افراط و تفریط سے آلودہ ہونے سے نہیں بچ سکا ہے۔ مثال کے طور پر آپ جامی جیسے (بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر والے) شاعر کا نعتیہ کلام بھی اگر کبھی بالاستیعاب مطالعہ فرما سکیں۔ تو یقیناً آپ ان کی تقلید کا مشورہ کسی نعت گو کو نہیں دیں گے، اور یہ سب کرشمہ ہے "عقیدت" میں غلو کا، جس کی بلاہ راست ضرب عقیدے پر پڑتی ہے اسی لئے میرا خیال یہ ہے کہ غزل گو شعراء کے ساتھ کسی وجہ سے کوئی رعایت کردی جائے تو اتنا مضر نہیں ہے جتنا نعت نگاروں کے ساتھ مروت برتنا۔

(۲) مذکورہ بالا تبصرے کے آخر میں آپ نے میرے نام کے ساتھ خدا جانے کیوں "رامپوری" چھپوا دیا ہے۔ ریاض عقیدت کا مرتب "رئیس رامپوری" نہیں۔ "رئیس نعمانی" ہے جس کا کبھی رامپور سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

(خیر اندیش۔ رئیس)

سید اسحٰق حسینی
۳۰ گوئن روڈ لکھنؤ

مکرمی مائل صاحب امت برکاتہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ جولائی ۲۰۰۶ء کا حجاب اپنی تمام خوبیوں، حسن و جمال اور خوبصورتی و رعنائی کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ "دادا" کی کہانی آپ کی زبانی پڑھ کر جھوم جھوم اٹھا۔ اس کے علاوہ اور مضامین بھی قابل ذکر ہیں۔

جمیل احمد نذیری کی کتاب گلدستہ نعت پر آپ کا حقیقت پسندانہ بیباک اور بے لاگ تبصرہ و تنقید پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ مجھے امید ہے کہ جمیل صاحب اس کی سختی اور تلخی کے باوجود اسے بخوشی قبول فرمائیں گے۔

میں اپنی کتاب "حضرت علیؓ" آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ اس سے قبل بھی میں نے روانہ کی تھی غالباً آپ تک پہونچی نہیں یا پہونچی تو لیکن کہیں ضائع ہوگئی۔ بہرحال مکمل تبصرہ کا خواہشمند ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور زیادہ سے زیادہ دین و ملت اور ادب و علم کی آپ خدمت کرسکیں۔ والسلام۔ ناچیز۔ سید اسحاق حسینی

ہلال بکڈپو مبارک پور

محترم جناب مائل صاحب! سلام مسنون۔

آپ کا عنایت نامہ ابھی ابھی ملا۔ کل ہی "حجاب" کے شمارے بھی ملے۔ "تازہ شمارہ" میں مولانا جمیل احمد نذیری کے مجموعہ نعت پر آپ کا تبصرہ خوب ہے۔ میں نے نذیری صاحب کو منع کیا تھا کہ اسے شائع نہ کریں۔ آپ نے تبصرہ میں انکے ساتھ اور ہلال بکڈپو کے ساتھ جو اپنائیت کا اظہار کیا ہے اسکے لیے مشکور گزار ہوں اور انشاء اللہ آئندہ میری کوشش یہی رہیگی کہ کوئی غیر معیاری کتاب نہ شائع ہو۔ اس سلسلے میں آپ کے مشورے میرے لئے بہت کارآمد ہونگے۔

والسلام ــ نجم الدین

اداریہ

یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ اس وقت تحریک اسلامی پورے شباب پر ہے اور تحریک اسلامی کے سپاہی مدافعانہ راہ گزار کر اقدامی مرحلہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب تک باطل تحریکیں دو موروں سے حملہ کر رہی تھیں۔ ان کا ایک مورچہ ادبی تھا۔ اسلام دشمن ادیبوں نے اپنے قلم کی نوک سے اسلامی صحیفوں کو داغدار کر دیا تھا۔ دوسرا مورچہ تھا اسلام دشمن سیاسی لیڈروں کا۔ اس مورچے سے وہ اپنے لشکروں کو لیس کر کے چڑھا لاتے تھے۔ یہ دونوں مورچے آج بھی اپنا کام کر رہے ہیں۔

ان دونوں مورچوں کے دھاووں سے مسلمانوں کے چھکے چھوٹ چکے تھے۔ حالات اتنے نازک ہو چکے تھے کہ بخیال خویش مسلم۔ چودھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے اسلام ہی ختم ہو جائیگا۔ مسلمان "لا تقنطوا من رحمۃ اللہ" کا سبق بھول چکے تھے۔ وہ یہ بھول چکے تھے کہ اللہ کے نزدیک دین دراصل اسلام ہی ہے اور اس نے اسلام کی حفاظت کی ذمہ داری خود لی ہے نہ کہ اسلام کا قیام مسلمانوں کی کوششوں کا مرہون منت ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ایسے اسلام پسند ادیب پیدا فرمائے۔ جنہوں نے اپنے قلم کی تلوار سے اسلام پر کئے گئے اعتراضات کے پرخچے اڑا دیئے۔ اتنا ہی نہیں پھر انھوں نے جارحانہ تخلیقات سے اسلام دشمن ادیبوں کو لوہا منوا دیا۔ اب حالت پہلے سے برعکس ہے۔ اب اسلامی ادیب اقدامی مرحلے میں ہیں اور غیر اسلامی ادیب اپنے لکھے قلم پر ۔۔۔ رہے ہیں کہ وہ روشنائی کیوں نہیں پھینکتا۔

اللہ تعالیٰ نے تم کے دشمن پیدا کرنے کے ساتھ تلوار اور عزم و حوصلہ کے دھنی اور مجاہد بھی تراشے۔ ان کو آزمائش کے ہر دور سے گزارا اور اب ان میں سے دو ایک کو تجرباتی منزل میں لا اُتارا۔ اللہ تعالیٰ کو حالات بدلنے میں دیر ہی کیا لگتی ہے۔ دنیا کے ہر فرعون کی پیشانی کے بال اس کی چٹکی میں ہیں۔ وہ لوگوں کے درمیان زندگی کے حالات کو تبدیل کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس نے اچانک دو جگہ اسلام کو غالب فرما دیا۔

اور ایک جگہ اب اور تب کی دیر ہو رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جب تک یہ اداریہ شائع ہو اس وقت اس جگہ بھی اسلام کا غلبہ ہو جائے۔ لیکن شیطان بھی نہایت چالاک اور ذہین ہے۔ اب اس نے اپنے اہم دشمن چیلوں کو سمجھایا ہے کہ نااُلقو! دائیں سے، بائیں سے، آگے سے، پیچھے سے مگر چھپ کر مسلمانوں کے داخلی نظام کو درہم برہم کردو۔ ورنہ تم کو دنیا میں کہیں سر چھپانے کے لئے جگہ نہ ملے گی۔ شیطان کے چیلوں نے سرتسلیم خم کر دیا۔ مسلمانوں کے داخلی نظام کو درہم برہم کرنے کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں لگ گئے۔ داخلی نظام میں عورت کو مرکزی کردار ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات شیطان سے چھپی نہیں چنانچہ اس کے چیلوں نے خواتین اسلام کے ذہنوں میں زہر اتارنا شروع کر دیا۔ یہ باطل طاقتوں کا تیسرا محاذ تھا۔ قریب تھا کہ مسلمانوں کے گھرانے اس سے متاثر ہو جاتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو فوراً آگاہ کر دیا۔ اور ——

اب جب کہ جاکرتہ سے ٹرکی تک پوری پٹی میں تحریک اسلامی پورے شباب پر ہے اور مغربی دنیا میں گھس کر اقدام کر رہی ہے تو ضرورت ہے ہمارے یہاں بھی مسلم عورتوں کو تحریک اسلامی سے اچھی طرح واقف کرایا جائے اور اس سے پہلے کہ باطل اپنا پُرفریب لٹریچر اور نظریہ، ان پر لادیں مسے اور غلط آزادی کے بہلانے سے ورغلا دے ان کو اسلامی نظام میں اپنی جگہ، اپنی ذمہ داری اور اپنی صلاحیت مناسب اور موزوں عمل تجویز کر لینا چاہیئے۔ مجھ سے اچانک ایک بزرگ نے فرمایا کہ اوہام شکن نمبر بعد میں نکالنا اس وقت ایسی کتاب جلد سے جلد منظر عام پر لاؤ جس سے ہماری مائیں اور بہنیں اسلامی

نظام میں اپنی جگہ اور اپنا رول متعین کرسکیں۔ یہ مشورہ ایسے شخص کا تھا جس کا مشورہ میں حکم سمجھتا ہوں میں خلفشار نمبر شائع کرکے ستمبر کا شمارہ پریس بھیج چکا تھا کہ مجھے یہ حکم ملا۔ وقت کم اور کام بڑا۔ میں اپنی عمر میں اتنا کبھی نہیں گھبرایا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر تائید غیبی میرے ساتھ نہ ہوتی تو میں ہرگز دو مہینوں میں برسوں کا کام انجام نہ دے سکتا۔ میں جب کوئی تخلیق منظر عام پر لانا چاہتا ہوں تو پہلے اس کا گہرا مطالعہ کرتا ہوں۔ اس کے بعد نوٹس ترتیب دیتا ہوں۔ پھر لکھتا ہوں۔ وقت کی کمی محسوس کرکے سوچنا شروع کیا تو اس کے سوا کوئی چارہ کار سمجھ میں نہیں آیا کہ اللہ سے دعا کروں۔ میرا کئی بار کا تجربہ ہے کہ جب میں نے گڑگڑا کر اور ہر طرح کے وسائل سے کٹ کر اللہ سے دعا کی تو میری دُعا قبول ہوئی۔ پھر یہ کہ رمضان المبارک میں روزہ کے افطار کے وقت کی دُعا جسے اللہ ضرور قبول کرتا ہے۔ میں نے روزہ کھولتے وقت کئی روز برابر دُعا کی اور پھر مجھے معلوم ہوا کہ واقعی دُعا ہی مومن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میں نے کئی سال پہلے اس طرح کا کوئی سلسلہ "حجاب" میں شروع کیا تھا۔ میں نے اس کی ورق گردانی شروع کی کئی نہایت قیمتی مضمون ہاتھ آئے۔ اللہ کا کرم دیکھئے کہ یہ سب بنیادی مضمون تھے۔ ایسا محسوس ہوا کہ میں شاید یہی کچھ سوچ کر قسط وار لکھ رہا تھا اس کے بعد کسی وجہ سے نامکمل چھوڑ دیا۔ تو خشت اول چوں نہد معمار است۔ جب مجھے بنیاد ہی بھری بھرائی مل گئی تو اب دیواریں اٹھانا اور کمرے اور کھڑکی بنانا اور پلاسٹر کرنا کیا مشکل تھا۔ میں نے اس مال غنیمت (ہاتھ آئے ہوئے مضامین) پر نظر ثانی کی کہیں ترمیم اور کہیں تنسیخ کی۔ بہت کچھ کاٹا اور بہت کچھ بڑھایا ٹھیک ٹھاک کرکے یہ مضامین کاتب کو دے اور پھر اللہ دے اور بندہ لے مضامین بالترتیب قلم کی نوک سے کاغذ پر آنے لگے۔

الحمد للہ ـــــــ!

یہ کام بروقت ہوگیا۔ اس کے لئے میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس کے تحریک کرنے والے کے لئے دعا کرتا ہوں اور اب (اگلا صفحہ ملاحظہ ہو)

یہ اعلان

کرتا ہوں کہ دسمبر ۱۹۸۲ء میں شائع ہونے والا "اسلام شعار نمبر" مؤخر ہو گیا یعنی پھر کبھی نکلے گا اور اس کے بجائے دسمبر میں شائع ہونے والی خاص اشاعت کا عنوان یہ ہوگا۔

اسلامی نظام میں خواتین کا مقام اور انکے کرنے کا کام

یہ کتابچہ ضخیم ہوگا اور اس کی قیمت کیا ہوگی یہ ابھی کچھ نہیں معلوم۔ اندازہ ہے کہ پانچ روپیہ ہوگا اس سے کم و بیش۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بھائی اور بہنیں سب اس اچانک تبدیلی کا خیر مقدم کریں گے

اس خاص اشاعت میں

اس خاص اشاعت میں سب سے پہلے یہ بتایا جائیگا کہ ایک مرد اور ایک عورت میں ذہنی اور جسمانی طور پر کیا فرق ہے۔ اس پر سائنٹیفک دلائل پیش کئے جائیں گے

اس کے بعد بتایا جائیگا کہ مرد اور عورت کے متعلق مغرب نے جو غلط تصور دیا تھا اور عورت کو جس طرح ابھارا گیا اس سے کیا خلفشار پیدا ہوا۔ اس خلفشار پر مغرب کے دانشوروں کے اقوال پیش کئے جائیں گے پھر بتایا جائیگا کہ مغرب میں مساوات مرد و زن کا نعرہ اب تک کام ہوا ہے اور اس کے نتائج پر خود پریشان ہیں کہ اب کیا کریں۔ آخر میں اسلام کا راستہ، اسلامی ریاست میں مرد اور عورت کا مرتبہ حکومت کے حقوق و فرائض پر عورتوں کے حقوق اسلامی حکومت میں۔ اسلام مساوات مرد و زن کا کہاں تک قائل ہے اور کہاں فرق کرتا ہے اسلامی نظام میں مرد و عورت کے فریضوں کا تعین۔ عورت اگر ریاست کی سربراہ ہو تو کیا مشکلات پیش آتی ہیں اور علماء نے اس پر کیا کہا ہے۔ ان کے فیصلے کے عنوان سے آخر میں تفصیل جاری رکھا جائے گا۔ شان الامانت ختم حضرات مسلمان عورتوں کے لئے یہ کتاب نہایت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ

صبح کے آثار نظر آتے ہیں

جائزہ رقم کے قلم سے

وسط دہلی مسٹر خشونت سنگھ سابق ایڈیٹر السٹریٹیڈ ویکلی پچھلے دنوں بیرون ہند کا دورہ کر کے آئے ہیں۔ انھوں نے عالمی انسائیکلوپیڈیا مذاہب WORLD RELIGION کے حوالے سے ایک خاص بیان نقل کیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۵ء تک یعنی پانچ سال میں پانچ لاکھ آدمیوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ یہ تعداد یورپ اور امریکہ کے نئے مسلمانوں کی ہے لیکن اگر افریقہ میں مسلمان ہونے والوں کی تعداد اس میں شامل کر لی جائے تو ہر سال مسلمان ہونے والوں کا اوسط دس لاکھ سے زیادہ ہی ہوگا جب کہ تبلیغ اسلام کا خاص موثر ادارہ کوئی نہیں ہے ان کے مقابلے میں عیسائی مشنریاں بھرپور تبلیغی ذرائع سے لیس ہو کر کام کر رہی ہیں لیکن بہت کم لوگ عیسائی ہو رہے ہیں۔ مسٹر خشونت سنگھ نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلام زندگی کے قریب مسائل کا حل دیتا ہے۔

اور جاپان میں جاپان میں اس سال غیر معمولی طور پر لوگ مسلمان ہوئے۔ جاپان میں مسلمانوں کی تنظیم موتمر اسلامی میں ۲۶ ہزار سے زیادہ نومسلم شامل ہیں اور یہ سب بڑے جوش کے ساتھ اسلام پھیلا رہے ہیں۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ جاپان میں بڑے بڑے دانشور اسلام کی طرف متوجہ ہیں۔ چنانچہ موتمر اسلامی کے چیرمین استاد شوقی کی کوششوں سے دنیا میں سے کچھ کو ہاتھ لگی ہے اس بات کو جاپانی پریس نے بطور خاص خوب اچھالا اور موتمر اسلامی کی بہت تشہیر کی۔ لیکن یہی بات موتمر اسلامی کے پیغام کے لئے مفید ثابت ہوئی۔

ملیشیا پچھلے دنوں سعودی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس دورہ کرتے ہوئے ملیشیا۔ وہاں

انھوں نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ سعودی عرب ایشیا میں اسلامی قوانین نافذ کرنے میں بھرپور تعاون کرے گا۔ اسلامی قوانین کے نفاذ سے ہی اور کراہتی ہوئی دنیا کی انسانیت کے لئے امن کا ضامن ہے

چیف جسٹس نے سعودی عرب کی مثال دی کہ وہاں اسلامی قانون نافذ ہے اس لئے وہاں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لئے ہر جگہ اسلامی قانون اپنانے کی ضرورت ہے۔

سعودی کا عطیہ

سعودی عرب نے تائیوان کی شنگ شانگ یونیورسٹی کو ایک لاکھ ڈالر کا عطیہ بطور قرض کے لئے دیا ہے تاکہ اسلامیات پر ریسرچ کے لئے ایک شعبہ قائم کیا جائے۔ سعودی عرب نے اسلامی تبلیغ کے لئے شیخ محمد علی خوقیر کی خدمات بھی پیش کی ہیں۔

مخالفت جماعت اسلامی ہند

ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی جماعت اسلامی ہند کی مخالفت میں اس لئے شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے کہ جماعت اسلامی ہند نے اپنے لٹریچر کے ذریعہ کمیونزم پر مدلل تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کو ایک نظام حیات کے طور پر پیش کرکے ایسا لٹریچر فراہم کیا ہے جس کی وجہ سے کمیونسٹ پارٹی کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق ہو چکی ہے اب اس کے پاس جماعت اسلامی ہند کے خلاف جھوٹ اور افترا پردازی کے سوا کوئی حربہ نہیں رہا۔ یہ جھوٹ کمیونسٹ پارٹی ہی کا گھڑا ہوا ہے کہ جماعت اسلامی ہند اور آر۔ایس۔ایس میں ساز باز ہو چکا ہے۔ ماضی میں مسلم نوجوانوں کو جماعت اسلامی سے کاٹنے میں وہ ناکام ہو چکی ہے۔ وہ دیکھ چکی ہے کہ یہ حربہ چلا نہیں لہٰذا اب وہ نئے ہتھیاروں کی تلاش میں ہے۔

تحریک اسلامی کی قوت

حال ہی میں ایک نیم سرکاری امریکی جریدے نے اپنا اسلامی انقلاب کا جائزہ شائع کر دیا۔ اس نے اقرار کیا ہے کہ اسلامی تحریکیں دنیا میں قائم ہیں ان کا سب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ دنیا میں عمرؓ جیسی خلافت قائم ہو تاکہ ان کا عدل اللہ سے ماضی چھا جائے چنانچہ بتلایا گیا ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ایک ارب کروڑ ہے ان کی معیشت ناقص ہے لیکن

[illegible]

میں اتاترک نے مذہب کو کچل دیا تھا مگر وہاں پھر اسلام زندہ ہو رہا ہے۔ افغانستان میں مسلمانوں نے محض اس لئے بغاوت کر رکھی ہے کہ وہاں کی موجودہ حکومت اسلام کے بجائے کمیونزم کی طرف مائل ہے۔ پاکستان میں شریعت اسلامیہ کا اعلان ہو چکا ہے۔ ایران میں خمینی اسلامی انقلاب لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی طرح مصر اور ملیشیا میں شام اور انڈونیشیا میں۔ غرضیکہ دنیا بھر میں اسلامی تحریکیں ابھر رہی ہیں۔ ان کے پاس بہت عمدہ لٹریچر ہے۔ ملیشیا میں اسلام پسندی کا جائزہ لیتے ہوئے مقالہ نگار نے قلم کی دلچسپ جولانی کے ساتھ ایک واقعہ لکھا ہے کہ جب وزیراعظم کی بیٹی یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لوٹی تو جیسے ہی کوالالمپور پہنچی اس نے فوراً برقع اوڑھ لیا۔

مقالہ نگار لکھتا ہے کہ سعودی عربیہ اور لیبیا میں شریعت پوری طرح نافذ ہو چکی ہے، اور سوڈان اور نائیجیریا میں مسلمانوں کا شدید اصرار ہے کہ یہاں بھی شریعت کا نفاذ ہونا چاہیئے۔ بیروت کی امریکی یونیورسٹی کے اسلامی تاریخ کے پروفیسر شہاب نشابی کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ اسلام آج بھی دنیا میں زندہ قوت ہے۔

مالمو میں مسجد

سویڈن کی پریس کونسل کی اطلاع کے مطابق یورپ میں سب سے بڑی مسجد کا خاکہ تیار کر لیا گیا ہے۔ یہ مسجد مالمو میں تعمیر ہوگی۔ اس میں کلچرل سنٹر، ایک درسگاہ، لائبریری، نمائش گاہ اور ایک ڈائننگ ہال بھی مسجد سے ملا ہوا ہوگا۔ مسجد کی تعمیر میں پچاس ملین ڈالر کی لاگت آئے گی۔ سویڈن میں سولہ ہزار مسلمان بستے ہیں۔

ہرات میں

افغانستان میں تحریک اسلامی کے مجاہدین نے سرکاری فوج کے ۸۰ فوجی ہلاک کر دیئے اور کئی روسی خیروں کو قید کر لیا۔ مجاہدین کی سامان کے باوجود روس [illegible] کی مسلح فوجوں سے کامیاب گھمسان کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہرات اور کابل جانے والی سڑک کا بڑا حصہ مجاہدین کے قبضے میں آ گیا۔ اب کابل ٹھیک ان کے سامنے ہے۔ ان شاء اللہ جب تک ان سطروں کی سیاہی خشک ہوگی، افغانستان میں تحریک اسلامی کے جھنڈے گڑ چکے ہوں گے۔

گھور اندھیروں پر ایک اجالے کی یلغار

اب یہ سمجھنے میں مخالف اور موافق تمام لوگوں کو ذرا بھی شک نہیں رہا کہ عالمی پیمانے پر تحریک اسلامی اپنی مدافعانہ حیثیت سے بڑھ کر اقدامی منزل میں داخل ہو گئی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم حجابی بہنوں کو تحریک اسلامی کی ان سرگرمیوں اور کامیابیوں سے واقف کرائیں جو عالمی پیمانے پر آگے بڑھ رہی ہیں اور بتائیں کہ اسلامی انقلاب برپا کرنے میں انسانی صنف کی کمزور مجاہدات نے کس طرح اپنا رول ادا کیا۔ سب سے پہلے آج ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایران کا مغرب نواز شاہ پہلوی کا تخت پچاس ہزار شہید ملت کے خون میں کس طرح بہہ گیا اور اب وہ اپنے ملک کے لئے بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ موت کا فرشتہ اس کے پیچھے لگا ہے۔ ایران کے بعد ہم افغانستان کی تحریک اسلامی کی سرگرمیوں کا جائزہ لیں گے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم سب سے پہلے افغانستان سے ملت حجاب کو روشناس کرائیں گے لیکن وہاں مکمل انقلاب آج کل میں ٹل رہا ہے۔ انشاء اللہ جب ہم ایران کے بعد افغانستان دوسری قسط میں پیش کریں گے تو وہاں اجالے اندھیروں پر غالب ہو چکیں گے۔ (م)

• اس وقت دنیا میں واقعات اتنی تیزی سے رونما ہو رہے ہیں کہ انہیں دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور خوشی بھی۔ ان واقعات میں ایک بے حد حیرت انگیز واقعہ ایران کا اسلامی

انقلاب ہے۔ اس پر بہت کچھ گذر چکا اور جب یہ سطور شائع ہوں گی اس وقت تک مزید بہت کچھ گذر چکا ہوگا۔ تاریخ عالم میں ایسی کوئی نظیر موجود نہیں ہے کہ کسی منظم اسلحہ اور جمی جمائی حکومت کو، جس کی تہرانی کا یہ حال ہو کہ اس کے خلاف کچھ بولنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہو اور انسانیت سوز سزاؤں کو دعوت دینے کے مترادف ہو۔ عوام کے نہتے ہاتھوں نے فنا کے گھاٹ اتار دیا ہو ۔۔۔ ایک آتش فشاں پہاڑ تھا جو اچانک لاوا اگلنے لگا۔ اور اس کی راہ میں جو بھی آیا جل کر بھسم ہوگیا۔ ظالموں کو تباہ و برباد کر دینے والا ایک ایسا زلزلہ تھا جسے وقت کا ترقی یافتہ نازک ترین آلہ کہ زلزلہ پیما بھی نہ بھانپ سکا۔ ملک کے ایجنٹ تو شاگرد تھے سی۔ آئی۔ اے اور کے۔ جی۔ بی کے استادوں کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ اندر ہی اندر کتنا ہوش رُبا لاوا پک رہا ہے۔

وہ کون سی قوت تھی جس نے اٹھارہ اٹھارہ بیس بیس سال کے نوجوانوں میں سربازی و جاں بازی کی وہ بجلی بھر دی کہ انھوں نے گولیوں کے سامنے اپنے سینے کھول دئے اور جنھوں نے گولیوں کے جواب میں فوجیوں پر گلاب کے پھول پھینکے، وہ کون سی طاقت تھی جس نے نوجوان لڑکیوں کو گھروں کی رنگین چہار دیواری سے نکال کر انھیں پرشور میدان جہاد میں لا اتارا اور جنھوں نے گولیاں کھا کر بھی پیٹھ نہ پھیری۔

بلاشبہ یہ قوت ایمان اور اسلام کی قوت تھی جس نے الحاد اور بے دینی کو منہ کے بل گرا دیا۔ ایثار، قربانی اور اقامت دین کی راہ میں فداکاری کا جو نقشہ ہمیں ایران کے نوجوان اور لڑکیوں نے کیا ہے وہ ہمارے لئے تو سبق آموز ہے ہی، آئندہ اسلامی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ شاہ ایران نے صیہونیوں اور قادیانیوں کو مسلمانوں کے سر پر لا بٹھایا تھا اور اس کی کوشش یہ تھی کہ اپنے خاندان کو ایران کا مقتدر رکھنے کے لئے اسلام کو آنا گزند کرے کہ پھر سے کوئی اسلامی نظام ...

[illegible] ... کا ارادہ رکھتے ہیں۔

لینے سے جان چھاسئے، لیکن اسے خبر دتھی کہ دین اسلام کسی انسان کا بنایا ہوا دین نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا دین ہے اور اس کی پشت پر اس کائنات کے حقیقی مقتدر اعلیٰ کا ہاتھ ہے اسی نے ایران میں یہ کرشمہ دکھلایا کہ جبر، ظلم اور فساد کو مٹانے والے ہاتھ بموں، رائفلوں، برچھیوں اور تلواروں کی بجائے گلدستے لیکر نکلے اور ان گلدستوں نے بموں اور گولیوں پر فتح پائی۔ علامہ اقبال رح کے اس مصرع کے معنی آج سمجھ میں آئے کہ

ایمان ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اس طرح کہ شاہ ایران کے خلاف تحریک اسلامی کے سرفروش نوجوان لڑکوں لڑکیوں ... عورتوں اور مردوں نے جلوس نکالا تو اس وقت عورتوں اور لڑکیوں کے نازک ہاتھوں ... میں پھولوں کے ہار تھے۔ نامہ نگاروں کا چشم دید بیان ہے کہ جب اس جلوس پر بندوقوں ... کی باڑھ چلی تو گولیاں اور بم برسانے والوں پر عورتوں اور لڑکیوں نے پھولوں ... کی بارش کی۔ گولیاں ان کے سینوں پر اور بم ان کے سروں پر پڑ رہے تھے اور ... ہر مرنے والا اور مرنے والی کی زبان سے نکلتا کہ خدا کی قسم کہ میں کامیاب ہوا۔

شاہ ایران نے اپنے عہد حکومت میں ۶۰ ہزار مسلمانوں کو شہید کیا۔ آخر کار اس ... کا تخت حکومت ان شہیدوں کے خون میں بہہ گیا۔ اس حیرت انگیز انقلاب نے دنیا بھر میں ایک طرف حق پرست داعیان اسلام میں خوشی کی لہر دوڑا دی ہے۔ ان میں نئی ہمت اور نیا ولولہ پیدا کیا ہے۔ وہیں دوسری طرف باطل اور داعیان کفر و الحاد کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی ہے۔ ان کی حکومتیں ایک تازہ جوش کے ساتھ اس انقلاب کے وجوہ و اسباب کی تفتیش اور اسے ناکام بنانے کی سازش کے لئے مستعد ہو گئی ہیں۔ مغربی پریس کھلا گیا ہے۔ اسلامی نظام پر کیچڑ اچھال رہا ہے اور اس نے اسلام کے خلاف اپنے زہریلے پروپیگنڈے کو تیز کر دیا ہے اور تیسری طرف ہزاروں، لاکھوں انسانوں کے ذہنوں میں یہ سوال ابھر آیا ہے کہ آخر اسلام اور اسلامی نظام ہے کیا ایران کے مسلمانوں میں یہ قوت کہاں سے آگئی ...

زمین فساد سے بھر جاتی ہے اگر اللہ ایک کو دوسرے کے ذریعہ دفع نہیں کرتا

نے ایک بے نظیر کارنامہ انجام دے ڈالا۔

دنیا میں جو اسلامی تحریکیں اور تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ ان میں سے متعدد دینی تنظیموں کے نمائندوں کا ایک وفد، امیر جماعت اسلامی پاکستان کی قیادت میں ایران گیا تھا تاکہ جناب آیت اللہ روح اللہ خمینی [redacted] کو مبارکباد دے۔ اپنی خوشی کا اظہار اور اپنی مدد کی پیش کش کرے۔ ایران کے [redacted] ذمہ داروں نے اس وفد کا جس طرح سے استقبال کیا اور ان کے ساتھ یگانگت [redacted] کی جو روش اختیار کی وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کی رضا کے لئے کام کرنے [redacted] والوں کے جسم چاہے ایک دوسرے سے دور ہوں ان کے دل، ایک [redacted] دوسرے سے قریب ہوتے ہیں۔ اس وفد کی مختصر روداد جو ایشیا لاہور میں شائع [redacted] ہوئی ہے۔ ہم یہاں اس کے چند اقتباسات دے رہے ہیں۔

تاریخی قبرستان۔ وفد نے تہران پہنچتے ہی سب [redacted] سے پہلے بہشت زہرہ کا رخ کیا۔ یہ وہ تاریخی قبرستان ہے جہاں شہدائے انقلاب [redacted] اسلامی مدفون ہیں۔ اور اسے صرف قبرستان ہی کی نہیں، تحریک کی جدوجہد کے مرکز ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ یہ قبرستان تہران سے ۱۵ کلو میٹر دور ہے۔ یہاں کا منظر انتہائی رقت آمیز تھا۔ تا حد نظر قبریں پھیلی ہوئی تھیں اور ان قبروں کے اوپر شہداء کی تصاویر لگی ہوئی ہیں۔ ان تصاویر سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان میں اکثریت نوجوانوں کی تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ ایران کی حالیہ تحریک میں ۲۰،۲۲ ہزار نوجوان شہید ہوئے۔ جبکہ صرف ایک دن میں چار ہزار افراد کو شہید کیا گیا۔ شاہ ایران کے پورے دور میں ۵۰ ہزار افراد شہید ہوئے۔

علامہ خمینی سے ملاقات میں ان کو اسلامی تحریک کی اس عظیم الشان کامیابی پر مبارکباد دی گئی اور اس

ک دورے میں دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں کی طرف سے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا گیا۔ وفد کے ظہار خیال کے جواب میں علامہ خمینی نے کہا

آپ کی تشریف آوری میرے لئے بہت ہی مسرت اور خوشی کا موجب ہے۔ میں آپ کا اور جن وں کی آپ نمائندگی کرتے ہیں ان کا اپنی طرف سے اور اہل وطن کی طرف سے دلی شکر گزار ہوں مجھے پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ پر بے حد مسرت ہوئی ہے اور میری یہ دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانانِ پاکستان کو پوری یکسوئی اور سرعت کے ساتھ اسلام عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے، علامہ خمینی نے وفد کے ارکان سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے جذبات محبت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ ہم تمام مسلمان ملکوں پر مشتمل ایک عالمی اسلامی حکومت قائم کرنے کا ارادہ رکھتے اور پوری دنیا کے سامنے اسلام کا صحیح تصور پیش کرنا چاہتے ہیں۔ امام صاحب فرمایا کیا امر قابل افسوس ہے کہ خود ہمارے علماء اور مفکرین کا اسلام کے بارے ذہن واضح نہیں ہے جو اسے صرف مسجدوں، چٹائیوں اور چند ل کا دین سمجھتے ہیں۔ تحریک کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ محض لی خصوصی مدد اور ایمان کی طاقت تھی کہ ہمارے خالی ہاتھوں نے ظالم و جابر نوں کے ٹینک توڑ دیئے۔ اس ضمن میں امام صاحب نے بڑے پتے کی بات کہی کہ ظلم یادہ دیر تک برداشت کیا جائے تو پھر اس سے نجات پانے کے لئے زیادہ قربانیاں دی جاتی ہیں۔

ہے، اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
ی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے
(علامہ اقبالؒ)

ہو رہا ہے آج پھر دار و رسن کا اہتمام
دیکھنا ہے کہ ہم میں ہے کوئی منصور بھی
(ابو المجاہد زاہد)

سماج سدھار کیلئے

اسلامی قانون کی ترتیب کار

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام میں ترتیب کار یہ ہے کہ پہلے ذہنوں کی اصلاح کا کام تعلیم اور تلقین کے ذریعے سے کیا جائے تاکہ لوگوں کے خیالات تبدیل ہوں، پھر لوگوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر کام کیا جائے یہاں تک کہ محلے محلے بستی بستی اور کوچے کوچے میں ایسے لوگ تیار ہو جائیں جو بدکرداریوں کو عوام کی مدد سے دبائیں اور اپنے اپنے علاقوں کے باشندوں میں دینداری اور دیانت داری پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح ملک کے اندر ایک ایسی رائے عامہ پیدا ہو جائے گی جو برائیوں کو سر نہ اٹھانے دے گی

کوئی شخص عام رائے کی موجودگی میں بگڑنا چاہے گا تو اس کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی اور جو شخص صحیح طرز زندگی اختیار کرے گا اس کو پورا معاشرہ مدد دینے والا ہوگا اس کے ساتھ اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ معاشرہ ایسا ہو جس کے لوگ ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار ہوں۔ ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آنے والے ہوں ہر شخص انصاف کا حامی اور بے انصافی کا مخالف ہو ہر شخص اپنے اوپر پیٹ بھرنا حرام سمجھے اگر اس کو معلوم ہو کہ اس کا ہمسایہ بھوکا سو رہا ہے۔ پھر اسلام ایک ایسا معاشی نظام بھی قایم کرتا ہے جس میں ہو

حرام ہو، زکوٰۃ فرض ہو، حرام خوری کے دروازے بند کردیئے جائیں۔ رزق حلال کمانے کے لئے تمام مواقع لوگوں کے لئے کھول دیئے جائیں اور کوئی آدمی اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔ ان تدابیر کے بعد ڈنڈے کا نظام آتا ہے۔ ایمان، اخلاق، تعلیم، انصاف اصلاح معیشت اور ایک پاکیزہ رائے عامہ کے دباؤ سے بھی جو آدمی درست نہ ہو تو وہ ڈنڈے ہی کا مستحق ہے اور ڈنڈا پھر اس پر ایسی بے رحمی کے ساتھ علی الاعلان چلایا جائے کہ ان تمام لوگوں کے دماغ کا آپریشن ہوجائے جو حرام کے رجحانات رکھتے ہوں۔

لوگ بڑا غضب کرتے ہیں کہ اسلام کے پروگرام کی ساری تفصیل چھوڑ کر صرف اس کی سخت سزاؤں پر گفتگو شروع کردیتے ہیں۔ اسلام پہلے عام لوگوں میں ایمان پیدا کرتا ہے پھر عوام کے اخلاق کو پاکیزہ بناتا ہے پھر تمام تدابیر سے ایک ایسی مضبوط رائے عامہ تیار کرتا ہے جس میں بھلائیاں پھلیں پھولیں اور برائیاں پنپ نہ سکیں پھر معاشرتی اور معاشی اور سیاسی نظام ایسا قائم کرتا ہے جس میں بدی کرنا مشکل اور نیکی کرنا آسان ہوجائے۔ وہ ان تمام دروازوں کو بند کردیتا ہے جن سے خواہش اور جرائم نشوونما پاتے ہیں اس کے بعد ڈنڈا وہ آخری چیز ہے جس سے ایک پاک معاشرے میں سر اٹھانے والی ناپاکی کا قلع قمع کیا جاتا ہے اب اس سے بڑا ظالم اور کون ہوسکتا ہے کہ ایسے برحق نظام کو بدنام کرنے کے لئے آخری چیز کو پہلی چیز قرار دیتا ہے اور بیچ کی سب چیزوں کو ایسان کی طرح نگل جاتا ہے۔

جو شخص کسی طرح برائیوں سے باز نہ آئے۔ اُسے سماج سے دور کردو تاکہ دوسرے لوگ متاثر نہ ہوں۔
جی ہاں! اس کی جگہ جیل خانہ ہے

مشہور موسیقار مہدی حسن کو پچھتر کوڑوں کی سزا

مشہور پاکستانی غزل سرا مہدی حسن کی سحر انگیز آواز لاکھوں ہندوستانیوں کو والہ و شیدا بنا چکی ہے پچھلے سال ہندوستان آیا تو اس کی بزم غزل میں ہجوم شائقین کی بے پناہ تعداد دیکھنے میں آئی تھی ں میں مہدی حسن کا پہلا پروگرام ایک فائیو سٹار ہوٹل میں منعقد ہوا تھا۔ لوگوں کا اشتیاق اس تھا کہ جن میں پیسہ خرچ کرنے کی مقدرت تھی وہ اُسے سننے کے لئے بمبئی اور دوسرے دور از شہروں سے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی پہنچے تھے۔ ہوٹل میں داخلے کی فیس کم از کم ۵۰ روپیہ تھی [illegible] تے وزیر خارجہ اٹل بہاری باجپائی تک اس کی غزل نوائی کے دل دادہ تھے۔ وہ اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود اُسے سننے کے لئے وقت نکالتے رہے۔

پاکستان میں مہدی حسن کو شراب کے نشے میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اُسے اسلامی عدالت میں پیش کیا گیا جہاں ے ۷۵ کوڑوں کی سزا ملی۔ آج کل پاکستان میں نظام مصطفےٰ بڑی شدت سے لاگو ہے۔ شرابیوں، چوروں، اکاروں کو اسلامی قانون کے تحت سخت ترین سزائیں دی جا رہی ہیں۔ مہدی حسن کے ساتھ پاکستان کے ممتاز شاعر حبیب جالب اور ایک دوسرے موسیقار محمد علی کو بھی پچھتر پچھتر کوڑوں کی سزا ملی۔ برصغیر مشہور و معروف شاعر فیض احمد فیض اس عتاب سے بچ گیا اور چھپ کر پاکستان سے فرار ہو گیا ہے۔ اور جب تک پاکستان میں اسلام کی حکمرانی ہے وہ شاید دوبارہ پاکستان نہ آ سکے گا۔

مہدی حسن لاہور کے ایک ہسپتال میں اپنے ذہنی و جسمانی صدمہ میں مبتلا ہے۔ ([illegible])



اب تک کہانی کا خلاصہ:

سندھ کے مہاراجہ کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام داہر اور دوسرے کا دھر سنگھ۔ ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام راج کماری بائی۔ جوتشیوں نے راج کماری بائی کی جنم پتری بناتے وقت بتایا کہ بائی کی شادی جس کے ساتھ ہوگی وہی سندھ کا راجہ ہوگا۔ یہ بات سن کر سب گھبرائے خاص طور پر راج کمار داہر بہت پریشان تھا کیونکہ راجہ کے بعد داہر ہی کو راجہ بنایا گیا تھا۔ اس کے ایک درباری سازشی نے ترکیب بتائی کہ آپ خود برائے نام شادی کر لیں لیکن رکھیں اسے بہن ہی کی طرح۔ داہر پہلے تو راضی نہ ہوا اسے بدنامی کا ڈر تھا لیکن پھر اپنا راج سنگھاسن بچانے کے لئے بائی سے بیاہ کر لیا۔ حکومت ہر بلکہ حکومت کسی سے چاہے وہ راجہ کی بیٹی ہو یا بھکاری کی مظلوم مظلوم۔ اس بیاہ کا نتیجہ کیا ہوا۔ یہ اب آگے پڑھئے۔

(چوتھی قسط)

دوسرے دن قیمتی زیورات اور
نفیس ملبوسات سے اُسے سجایا گیا تاکہ آج
پہلی بار مہارانی کی حیثیت سے راجہ کے پہلو
میں بیٹھ کر وہ پرجا کو اپنا دیدار کرائے اور ان
کا پرنام قبول کرے۔ وہ جدھر جدھر سے
گزرتی سب جھک جھک کر چرن چھوتے
وہ مدہوشی اور دُکھ کے عالم میں یہ رسم ادا
کرتی رہی۔ اسے خبر نہ تھی کہ وہ کتنی دیر تخت
پر راجہ کے پہلو میں بیٹھی رہی اور کون کون
اسے پرنام کرتا رہا مگر بہت دیر بعد جب
وہ اپنے محل میں لوٹی تو اس کا انگ انگ
تھک رہا تھا مفلوج تھا اور سینے میں
دم گھٹا جا رہا تھا۔ پھر وہ چپکے چپکے بے آواز
روتی رہی، تڑپتی رہی سسکتی رہی۔ کاش
اس کے ماتھے پر مہارانی نہیں بھکارن
درج ہوتا تو اس کا بھائی اسے آج یوں خلوص
سمجھ کر شادی کے بندھن میں قید نہ کرتا۔ اسی
دن راجہ داہر نے اُسے سخت تاکید کی۔
"بائی! تم مہارانی ہو تمہیں سوگ زیبا

ہمیں ویتاڑہ

تب اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے
دل پر قابو نہ پا سکی۔ کتنی مجبور تھی وہ بھائی نے
رجواہٹ کے تحفظ کے لئے عمر بھر اسکے
ارمانوں کا خون کرنا تھا۔ چند دن بعد راجہ داہر
کو راجہ دھر سنگھ کا پیغام ملا جس میں انتہائی غصے
اور آزردگی کے اظہار کے ساتھ اس فعل پر
کی گئی تھی۔ رانی بائی نے یہ سب کچھ سنا اور
سے دیکھتی رہ گئی۔ اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ یہ
پیغام ملتے ہی راجہ داہر نے حسب دستور موہن
داس کو طلب کیا اور کہا۔
"موہن داس! دھر سنگھ کو اس شادی
کی خبر مل گئی ہے وہ ہم سے ملنا چاہتا ہے۔"
"مہاراج!" موہن داس نے مشورہ
"آپ راجہ دھر سنگھ سے ملنے سے انکار کر
آپ نے دھرم کے خلاف تو کوئی کام نہیں
کیا۔ بس راج کماری کو مہارانی کا خطاب
ویسے بھی راجہ دھر سنگھ پر آپ کا رعب
بات مانتا ہی کی تھی راجہ داہر نے
کو لوٹا دیا اور کہا۔

"دھر سنگھ سے کہو اب سے ہم اس سے ملنا نہیں چاہتے۔"

مگر دھر سنگھ کے لئے یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی۔ اسے راجہ داہر کا یہ فعل کسی طور بھی گوارا نہ تھا لہٰذا چند دن بعد اروڑ کے گلی کوچوں میں یہ خبر سنی گئی کہ برہمن آباد کا راجہ دھر سنگھ اپنے بھائی راجہ داہر کے ساتھ جنگ لڑنے کے لئے مع لشکر آنے والا ہے۔ یہ سن کر راجہ داہر بھی بگڑ گیا۔ اس نے موہن داس اور سی ساکر سے مشورہ کیا اور اس کی آمد سے قبل ہی اپنی فوج کے ساتھ اروڑ سے باہر نکل کر انتظار کرنے لگا۔

شام کا وقت تھا میدان میں راجہ داہر کی فوج کا پڑاؤ تھا اور وہ خود اس وقت قرب و جوار کے علاقے کا چکر کاٹ رہا تھا اس کے ساتھ سلارج اور چند دوسرے مصاحب تھے۔ چونکہ ابھی تک دھر سنگھ کی آمد کی کوئی توقع نہ تھی لہٰذا وہ جتنی دیر بھی سیر کرتا کوئی حرج نہ تھا۔ ابھی راجہ داہر درختوں کے ایک جھنڈ کے سامنے سے گزر کر جس کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک خوبصورت ہرن اس کا راستہ کاٹ گیا۔ اس نے سلارج کو دیکھا اور سوال کیا

"سلارج! کیسا شگون ہے؟"

"مہاراج!" سلارج نے جواب دیا "آپ کسی بہت بڑے خطرے کو ٹالنے میں کامیاب ہوں گے۔ پھر آپ ہی کا راج ہوگا۔"

"تم نے کیسے اندازہ کیا؟" راجہ داہر نے بڑے اشتیاق سے سوال کیا۔

"مہاراج! اس ہرن کے پچھلے پیروں کی بناوٹ عام ہرنوں سے مختلف ہے ایسا ہرن جس انسان کا راستہ کاٹ دے وہ سب پر غالب آجاتا ہے۔" سلارج نے ادب سے کہا

یہ سن کر راجہ داہر بہت خوش ہوا اور بولا

"ہم اس ہرن کا پیچھا کریں گے اور دیکھیں گے اس کے پیروں کی بناوٹ کیسی ہے؟"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ راجہ ہرن کا تعاقب کرتا رہا اور سلارج اپنے باپ دادا کے اور اپنے تجربات ایسے ہرن کے بارے میں بتاتا رہا مگر جب شام ہونے لگی

واپس ہی راجہ داہر کو دھر سنگھ کا خیال آیا۔ وہ
تیزی سے چل کر اپنے پڑاؤ میں واپس آیا۔ جہاں
قلعہ سے آئے ہوئے مخبر نے خبر دی کہ دھر سنگھ
پہنچ چکا ہے اور اس کے ساتھ بہت کم فوج
ہے۔ راجہ داہر نے پوچھا۔

"کیا وہ قلعہ میں داخل ہو گیا؟"

"نہیں" مخبر نے جواب دیا۔ "موریہ داس
نے اس کی آمد کی خبر سنتے ہی قلعہ کا دروازہ
بند کرنے کا حکم دیا تھا اور مجھے اس کے چور
دروازے سے آپ تک بھیجا ہے۔"

"بڑی دانائی کی بات کی ورنہ وہ قلعہ
پر قبضہ کر لیتا ہے۔" راجہ داہر نے کہا۔ "مگر اب
دھر سنگھ کہاں ہے؟"

"مغربی شہر پناہ کے پاس جھیل کنارے
میں ایک مہمان کی طرح ٹھہرے ہوئے
ہیں۔" مخبر نے کہا۔

یہ سن کر راجہ داہر نے واپسی کا حکم صادر
فرمایا اور خفیہ طور پر قلعہ میں پہنچنے کے بعد
دھر سنگھ کو دعوت کا پیغام بھیجا اس نے
جواب دیا۔

"میں قلعہ میں آنا نہیں چاہتا
آپ ملنے آؤ تو دوسری بات ہے۔"

اس صورت حال پر راجہ داہر
صورت حال عجیب تھی۔ اگر وہ چند
کے ساتھ اس کے پاس جاتا تو خطرہ
تھا دھر سنگھ کے تیور خطرناک تھے۔
وہ مع لشکر کے جاتا تو بھائی کو مذاکرہ
نے جنگ کی باعث کی تھی۔ وہ بہت
فوج لایا تھا۔ لہٰذا راجہ داہر سخت متردد
کہ کیا کرے؟ آخر موریہ داس کے مشورے
اس رات راجہ داہر کے کہنے کے مطابق ٹھہرا
باقی سو سپاہیوں کی اپنی خاص سواری پر سوار
ہو کر قلعہ سے باہر نکلا اور ایک اس مہمان خانہ
میں جا پہنچا جو قلعہ سے باہر تعمیر کیا گیا تھا۔
جہاں دھر سنگھ قیام پذیر تھا۔ دھر سنگھ نے
جوں ہی ان کو دیکھا غصے سے دیوانہ ہو گیا
اور شاہی آداب بھول کر بولا۔

"ناحق! آپ نے خلیفہ کو مسلمانوں کی اجازت
کیوں دی۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ ان دونوں
کا رشتہ کیا ہے؟"

"اگر تم اطمینان سے سنو تو بتاؤں مہارانی
سوہمن دیوی نے کہا: بات یہ ہے کہ اس کی
شادی کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ فقط ستارے
کی نحوست اتارنے کے لئے بائی مہارانی
بن کر محل میں رہتی ہے اور داہر کسی اور
عورت سے شادی کرے گا۔"

"کیا بائی کے مہارانی بننے سے ستارے
کی نحوست ٹل جائے گی؟" دھرسنگھ نے
بے یقینی کے انداز میں اسے دیکھا۔

"ہاں" رانی سوہمن دیوی بولی "جب
بائی کا کسی اور سے سنجوگ نہ ہوگا تو کوئی
اور سندھ کا راجہ کیسے بنے گا؟" بائی مہارانی
بن گئی اگر ایسا نہ ہوتا تو تم جانتے ہو کیا ہوتا؟"

"کیا ہوتا؟" دھرسنگھ نے پوچھا۔

"ہم راجہ رنگل سے بائی کو بیاہ دینا
چاہتے تھے۔ بائی کے ستارے کے اثر
سے وہ سندھ کا مطلق العنان راجہ ہوتا
اور تم دونوں بھائی یا تو موت کے گھاٹ
اتار دیئے جاتے یا اس کے مصاحب بنتے۔"

یہ سن کر [illegible] عقیدت سے [illegible] کو
دیکھا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ اس نے
اس فعل پر داہر کو معاف کر دیا۔ مگر تھوڑی دیر
بعد اس کا انداز فکر بدل چکا تھا۔ وہ سوچ رہا
تھا کیوں نہ داہر کو موت کے گھاٹ اتار دیا
جائے اور وہ خود راج پاٹ پر قبضہ کر لے۔
بائی تو اب مہارانی بن ہی چکی۔ ستارے کی
نحوست بھی ٹل چکی وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر
بولا۔ "ماتا جی! آپ کی زبانی صحیح صورت حال
سن کر میں نے داہر کو معاف کر دیا مگر اب اس
کا اور میرا ملاپ قلعہ سے باہر ہونا چاہیے تاکہ
سب دیکھ لیں۔"

بات معقول تھی سب نے اتفاق کیا
رانی سوہمن دیوی بولی۔

"یہ ملاپ تو کل ہی ہوگا مگر اب تم قلعہ
کے اندر چلو ورنہ پرجا کہے گی کہ یہ خاندان
کے راجے لڑ رہے ہیں۔"

یہ سنکر راجہ دھرسنگھ ہنس دیا اور
اس شب دونوں بھائی بڑی گرم جوشی سے
ملے مگر دراصل دونوں کے من میں کھوٹ تھا۔
دھرسنگھ [illegible] شادی کے بار[illegible]

میں سن لیا ہوگا؟" راجہ داہر نے پوچھا۔
"ہاں! مجھے اب تم سے کوئی گلہ نہیں۔" دھرسنگھ بولا۔
"مگر چونکہ ہم دونوں نے اپنے اپنے اشتعال کا اظہار پرجا کے سامنے کیا ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اب وہ سب ہمارا ملاپ بھی دیکھ لیں لہٰذا تم قلعہ سے باہر چلو تاکہ وہ سب ہمارا اتحاد دیکھ سکیں۔"
یہ سن کر راجہ داہر کو خطرے کا احساس ہوا مگر وہ اپنے جذبات کی پردہ پوشی کے لئے اطمینان سے بولا۔
"کل صبح ہم دونوں اور بائی قلعہ سے باہر نکل کر پرجا کو یقین دلا دیں گے کہ ہم آپس میں ناراض نہیں ہیں۔"
ادھر دونوں بھائی محو گفتگو تھے ادھر لاشعوری طور پر بائی خطرہ محسوس کر کے تنک بارتھی دل خواہ مخواہ ہی بیٹھا جا رہا تھا۔ مایوسیوں کے بھنور میں چکر کاٹ رہی تھی۔ دھرسنگھ کی ناراضگی کی خبر سے اسے ڈھارس بندھی تھی مگر اب وہ دونو بھائیوں کے لئے سونے کی چڑیا تھی جسے کوئی بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔
گو کہ دونوں کا ارادہ غلط تھا۔ صرف سندھ کی حکومت حاصل کرنے کے لئے وہ بائی کو قابو کر لینا چاہتے تھے۔ دھرسنگھ فیصلہ کر چکا تھا کہ کل قلعہ سے نکل کر راجہ داہر کو خاک و خون میں نہلا دے گا۔ راجہ داہر بھی موہن داس سے مشورہ کر کے کوئی فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ بائی کو اصل حالات کی خبر تو تھی مگر دھرسنگھ اور داہر کے ملاپ کی خبر نے اسے مایوس کر دیا تھا۔ ایک بھائی کے ہاتھوں ظلم کا شکار ہو کر وہ سوچ رہی تھی دوسرا بھائی اس کی حمایت کرے گا مگر اب دل کے گوشے گوشے سے صدائیں آرہی تھیں۔
"بائی! یہی سونے کا قفس تیرا مقدر ہے جسے دنیا شاندار محل کہتی ہے۔ تجھے بیاہی بن کر یہیں سسک سسک کر مرنا ہے۔"
اس شب دونوں بھائی دیر تک شراب پیتے رہے پھر راجہ داہر کے حکم سے خاص جام تیار ہوئے۔ دھرسنگھ اپنا جام پی کر گہری نیند

سو گیا اور داہر نے موہن داس کو طلب کیا۔
صبح ہوئی دونوں بھائی نفرت اور دشمنی دلوں میں چھپائے ایک دوسرے سے ملے راجہ داہر نے مہارانی کی سواری تیار کرنے کا حکم دیا۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک جلوس کے درمیان سب سے آگے دھر سنگھ کا ہاتھی ہے اس کے عقب میں راجہ داہر کا اور سب سے پیچھے رانی بائی کی سواری شہر میں گشت لگا کر قلعہ سے باہر نکلنے والی ہے۔ ان کے پیچھے پرجا خوشی سے نعرے لگا رہی تھی۔ دیکھنے والے چشمِ عبرت سے انھیں دیکھ رہے تھے اور دونوں بھائی انھیں اتحاد کا یقین دلانے اپنے ملاپ کی خوشی منانے قلعہ سے باہر جا رہے تھے مگر جونہی راجہ دھر سنگھ کا ہاتھی قلعہ سے باہر نکلا اور راجہ داہر کا ہاتھی قلعہ کے پھاٹک تک پہنچا تو دیکھنے والوں کے سانس رک گئے ہوں کہ راجہ داہر کھڑا ہوا اور قلعہ کے پھاٹک میں لٹک گیا۔ اس کا ہاتھی اس کے نیچے سے نکل کر پھاٹک سے نکل گیا۔ موہن داس کے حکم پہ کھڑے ہوئے پہرہ داروں نے قلعہ کا دروازہ بند کر دیا اور راجہ داہر رانی بائی کی سواری میں کود گیا۔ یہ دیکھ کر رانی بائی نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ اس ہنگامے پر دھر سنگھ نے پلٹ کر دیکھا اور بند دروازے کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

کئی دن سندھ کے اعلیٰ ترین ویدگت نرائن کے زیرِ علاج رہنے کے بعد رانی بائی کو ہوش آیا تو دو خبروں نے اس کا سواگت کیا دھر سنگھ برہمن آباد جانے کے تین دن بعد بخار اور جسم پر پھوڑوں کے مرض میں گرفتار ہو کر مر گیا اور راجہ داہر نے شادی کر لی (ایک روایت کے مطابق دھر سنگھ کی بیوہ سے) یہ کوئی نہ جان سکا کہ راجہ دھر سنگھ کی اچانک اور بے وقت موت کا سبب کیا تھا قیاس یہ ہے کہ اس آخری خاص جام نے بعد میں اثر کیا رانی بائی کو راجہ داہر کی شادی سے تو کوئی غرض نہ تھی لیکن دھر سنگھ کی عجیب موت نے اسے بے حال کر دیا۔ وہ بال نوچ نوچ کر روتی۔ اب فرار کی ہر راہ مسدود ہو چکی تھی۔ ..

دیواروں سے سر ٹکرائی اور نڈھال ہو جاتی۔

یوں صبح شام کا چکر چلتا اور وقت گزرتا رہا ایک شب راجہ داہر نے رانی بائی کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔ بائی حکم ماننے کے لئے مجبور تھی۔ لہٰذا گئی اس نے محسوس کیا کہ راجہ داہر بڑا مسرور ہے۔ قندیلوں کی کثرت سے کمرہ روشن تھا۔ خوبصورت خوامیں حکم کی منتظر تھیں اور راجہ داہر کے پہلو میں بڑے تکبرانہ انداز سے رانی لاڈلی براجمان تھی۔ اس کے قیمتی زیورات اور لباس دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ لبوں پر ایک دلآویز تبسم لئے وہ راجہ کو دیکھ رہی تھی۔ بہت دیر تک راجہ داہر رانی لاڈلی کو گدگداتا رہا اور وہ بڑے فخر سے کھلکھلاتی ناز دکھاتی رہی۔ آخر بہت دیر بعد راجہ نے اُسے چھوڑا اور رانی بائی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"مہارانی! ہم نے سُنا ہے کہ اب تک دھرسنگھ کا سوگ منا رہی ہو۔ تم سندھ کی مہارانی ہو، خوش رہو، آئندہ ہم نہ سنیں کہ تم اُداس ہو، جاؤ۔"

"مہارانی! مہارانی" بائی کا سر چکرانے لگا۔ وہ راجہ داہر کا حکم سُن نہ سکی اُسے محسوس ہوا جیسے اُسے کسی نے گالی دی ہو۔ رانی بائی کمرے سے نکل آئی۔ مگر اس وقت نفرت کی آگ، ناکامی کی آگ اور جذبات کی آگ اُسے جلائے دے رہی تھی۔ یہ آگ بڑی انوکھی تھی۔ جو آج پہلی بار بھڑکی تھی۔ وہ سُلگ رہی تھی۔ تپ رہی تھی۔ اور رات جیسے ختم گئی تھی۔ آسمان پر لاتعداد ننھے ننھے چراغ روشن تھے۔ تیرہویں شب کا چاند اپنی نورانی کرنوں سے دنیا کو منور کر رہا تھا اور فضا میں بے پایاں سکوت طاری تھا۔ ایسے میں رانی بائی اپنی خوابگاہ کے بجائے محل کے عقبی باغ میں ٹہل رہی تھی۔ اس کے ذہن میں عجیب عجیب سی خواہشات سر اٹھا رہی تھیں جنھیں وہ محسوس کر سکتی تھی سمجھ سکتی تھی اور جن کی تکمیل کسی طور بھی اس کے بس میں نہ تھی۔ یوں تو رانی بائی نہ تن درست تھی نہ بیمار۔ بس نیم دیوانگی کی حالت میں آئی کہو،

گھنٹے ننگے پاؤں ٹھنڈی گھاس پر ٹہل کر گزار
دیتی۔ نہ سکھیوں سے ملتی تھی۔ نہ داسیوں کو
حکم دیتی تھی۔ بلکہ چپ چاپ سوچوں میں
گم رہتی تھی لیکن آج تو اس کی حالت میں
ایک عجیب انقلاب آگیا تھا۔

شب نصف سے زیادہ گزر چکی تھی
کائنات پر ہو کا عالم طاری تھا۔ کبھی کبھی ہوا
درختوں کے پتوں کو چھیڑتی ہوئی گزرتی
تو سرسراہٹ کی آواز ماحول کو مزید پراسرار
بنا دیتی ورنہ ہر طرف خاموشی تھی۔ ایسے میں
بس رانی بائی کی سسکیاں گونج رہی تھیں
وقت گزرتا رہا۔ رات بیتتی گئی اور رانی بائی
کی سوگواری سسکیاں معدوم ہوتی گئیں
جسم جو دیر تک جھٹکے کھانے سے تھک
گیا تھا اب نڈھال ہوا جا رہا تھا لہٰذا اس
نے خود کو آہستہ سے گھاس پر ڈال دیا۔ شبنم
کے قطروں میں ڈوبی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی
گھاس اس کے جلتے جسم اور سلگتے جذبات
کو فرحت دے رہی تھی۔ ایک داسی ساوتری
قریب آئی اور رانی بائی کے عریاں شانوں
کو خاص انداز میں سہلا کر بولی۔

"مہا رانی۔ نہیں۔ راجکماری۔"

مگر رانی بائی نے اس کے ٹوٹے الفاظ
اور گھبراہٹ کو محسوس نہ کیا کیونکہ اس وقت
ساوتری کے ہاتھوں کا لمس اسے بڑا اچھا
لگ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ اس کے جسم
پر وہ یوں ہی ہاتھ پھیرتی رہے۔ ایسے میں
وہ تھوڑی دیر کے لئے بھول گئی کہ کیوں روئی
تھی۔ ساوتری دھیرے دھیرے رانی کے
شانوں پر ہاتھ پھیرتی رہی تھی۔ ایک لذت
آمیز نشہ ایک تھکی تھکی سی سوچ رانی بائی کے
اعصاب پر چھانے لگی۔

پھر وقت گردش کرتا رہا۔ دن ہفتوں
اور مہینوں میں گزرتے رہے اور رانی بائی
محل کے اسی حصے میں قید ہو گئی۔ اب نہ
اسے دھرم سنگھ کی یاد ستاتی نہ راجہ داہر کا خیال
نہ راجہ چل کا تصور بے قرار کرتا۔ نہ اپنی سکھیوں
کے درمیان بیٹھ کر محظوظ ہوتی۔ نہ مندر میں
اس کی سواری جاتی اور نہ مندر کی حسین ترین
مورتی کے ہم شکل ہونے پر فخر کرتی بلکہ تنہائی

ور آرزوؤں کی یلغار اُسے بُری طرح تھکا تی تو
کبھی وہ کسی ساز پر کوئی اُداس گیت گانے
لگتی۔ کبھی وہ کسی سادتری کو وہی عجیب و غریب
حکم دیتی۔ پھر وہ نڈھال ہو جاتی۔ آنسو بہتے
رہتے اور چہرے پر وحشت برس جاتی۔

اس دوران راجہ داہر ایک برس کے
لئے برہمن آباد گیا تاکہ وہاں کے انتظامات
بہتر کر سکے۔ یہاں سے وہ سیستان گیا اور
ارور لوٹ آیا۔ اس تمام عرصہ میں رانی لاڈلی
اس کے پہلو سے جدا نہ ہوئی اور رانی بائی
یک پالتو جانور کی طرح ہر جگہ اس کے ساتھ
پھرائی گئی جہاں اس کی نگرانی کا بہترین انتظام
ہوتا۔ چند برسوں کے ہیر پھیر میں رانی بائی
ب بالکل جوان ہو چکی تھی۔ تیرہ برس کی
وہ الھڑ لڑکی جسے راجہ داہر نے مہارانی بنایا
تھا اب مکمل حسن کا شاہکار تھی۔ راجہ داہر اُسے
دیکھتا تو جلدی سے آنکھیں چرا لیتا۔ جب
سی خاص موقع پر رانی بائی تاج مرصع سر پہ
رکھے راجہ کے پہلو میں بیٹھ کر رعایا کا پرنام
قبول کرتی تو راجہ کے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی

چہرے پر نئے نئے رنگ آتے۔ وہ اپنے ذہن
میں بار بار دُہراتی کہ رانی بائی اس کی بہن ہے
جس کے لیے سلاجی نے کہا تھا کہ جس دن آپ
نے اُسے چھولیا وہ دن سندھ میں انقلاب کا
اور آپ کے زوال کا پہلا دن ہوگا۔

وقت گزرتا رہا پھر ملکی نظام کے تحت
راجہ داہر نے فیصلہ کیا کہ وہ موسم بہار میں برہمن
آباد میں، موسم بہار میں الور میں اور موسم گرما
سیستان میں گزارے گا تاکہ آب و ہوا بھی تبدیل
ہو سکے اور ملک کا نظم و نسق بھی بہتر ہو سکے
ایسے میں دونوں رانیاں اس کے ساتھ ہوتیں
اور رانی بائی کو دیکھ کر اسے اپنے پر قابو رکھنا
مشکل ہو جاتا۔

الور میں خبر مشہور ہوئی کہ راجہ رنمل نے
راجہ داہر کی خدمت میں ایک پنڈت کو قاصد
بنا کر بھیجا ہے اور کہا ہے کہ تم نے دھرم کی
پروانہ کرتے ہوئے اپنی بہن سے بیاہ رچایا
ہے۔ یا اُسے آزاد کر دو یا پھر خمیازہ بھگتنے
کے لئے تیار ہو جاؤ۔ راجہ داہر نے حسب دستور
موہن داس اور سلاجی کو بلایا اور بڑے طویل

مشورے کے بعد راجہ رنل کو تلخ سا جواب دے
دیا۔ اپنے خانگی معاملات میں کسی اور کی مداخلت
اسے گوارا نہ تھی اس کے فوری بعد راجہ رنل نے
بغاوت کردی اور ایک روایت کے مطابق
اسی ہزار فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس خبر
سے ایک طرف جہاں رانی بائی کو ایک بار
پھر امید کی کرن نظر آئی۔ وہاں دوسری
طرف راجہ داہر بری طرح گھبرایا اس نے
پھر مصاحبین اور داناؤں کی بیٹھک بٹھائی
اور مشورہ کیا۔ سلائج نے حسب دستور
پھر ایک شب کی مہلت مانگی۔ راجہ نے
موہن داس کی طرف دیکھا۔ اس نے
عرض کیا؛

• مہاراج! راجہ رنل کی طرف صلح
کا ہاتھ بڑھائیں۔ اس سے ناراضگی کا
سبب معلوم کریں کیونکہ اچھا ہے کہ پرجا
کا خون نہ ہو۔"

راجہ داہر کو یہ بات پسند آئی۔ اس
نے اسی وقت راجہ رنل کو پیغام بھیجا اس
نے جواب دیا۔

• یہ صلح دو شرطوں پر ہو سکتی ہے اول
یہ کہ بائی کو اس کی وہی حیثیت دو جو اس
کی ہے دوسری یہ کہ اس کی شادی مجھ
سے کر دو ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

یہ دونوں باتیں راجہ کے لیے ناقابل
قبول تھیں۔ بائی کو رنل کے حوالے کرنا
سندھ کی حکومت اسے سونپ دینے کے
مترادف تھا جس کے لیے وہ کسی صورت
بھی تیار نہ تھا۔ لہٰذا اس نے انکار کر دیا۔"
رنل بھڑک گیا اور بودھیا کے علاقے سے
ارور کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ جس علاقے
سے گزرتا اس پر قبضہ کر لیتا۔ اسی دوران
سلائج حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا۔

• مہاراج! ستاروں کی چالیں کہتی ہیں
کہ سندھ پر آپ ہی کی حکومت قائم رہے
گی اور اس مقابلے میں رنل ہار جائیگا۔"

راجہ داہر یہ سن کر بڑا حیران ہوا کیونکہ
بظاہر اس کی کوئی توقع نہ تھی۔ راجہ رنل اسی
ہزار بہادروں کے ساتھ درمیانی علاقوں کو
زیر کرتا الور کی جانب بڑھا چلا آرہا تھا لیکن

چونکہ ساوتری کی کوئی پیش گوئی آج تک غلط ثابت نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا راجہ داہر نے جنگ کی تیاری کا حکم دے دیا۔

یہ ۵۰ھ تھا۔ عرب میں حضرت امیر معاویہؓ کا زمانہ تھا اور مسلمان فتوحات پر فتوحات حاصل کر رہے تھے۔ ان کی بہادری کے قصے چار دانگ عالم میں مشہور تھے۔ لہٰذا موہن داس نے عرض کیا

"مہاراج! کچھ عرب اسلامی حکومت سے آکر کافی عرصہ ہوا ہمارے ملک میں آباد ہو گئے تھے۔ اب وہ آپ کی پرجا ہیں یہ عرب لوگ بہترین سیاست داں اور بہادر ترین جنگجو ہوتے ہیں۔ آپ ان کو بلا کر مشورہ کیجئے۔"

راجہ داہر نے فوراً حکم جاری کیا کہ پرجا میں جو عرب ہیں حاضر کئے جائیں اس حکم پر عربوں کی جماعت کا سب سے ذہین اور عالم شخص محمد علافی حاضر خدمت ہوا۔ راجہ داہر نے اسے تمام صورت حال سمجھائی اور کہا۔

"علافی تم عرب لوگ بہترین جنگجو ہوتے ہو، بتاؤ اب ہم کیا کریں؟"

"مہاراج!" محمد علافی نے کہا: "رسل کے پہنچنے سے قبل آپ شہر کے گرد خندق کھودنے کا حکم دیں تاکہ شہر محفوظ رہے اور میری کمان میں میری ہی فوج کو آگے بڑھنے کی اجازت دے دیں۔ ہم آگے بڑھ کر اسے روک لیں گے۔"

"تمہاری اپنی فوج کتنی ہے؟" راجہ داہر نے پوچھا۔

"اور اسے تیاری میں کتنا عرصہ لگے گا؟"

"مہاراج! میری فوج پانچ سو افراد پر مشتمل ہے اور اسے تیاری کی ضرورت نہیں ہم لوگ ہر وقت تیار رہتے ہیں۔" علافی بولا۔

"کیا پانچ سو کے دستے کے ساتھ تم مقابلہ کر لو گے؟" راجہ نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ فوری طور پر خندق کھودنے اور مجھے روانہ ہونے کی اجازت دے دیں میری فوج کی تعداد نہ دیکھیں۔" علافی نے کہا۔

راجہ نے فوری طور پر شہر کے گرد

خندق کھودنے کا حکم دیا اور محمد علافی کو آگے بڑھنے کی اجازت دے دی۔ اس سے قبل ہندوستان کے لوگ اس طریقہ جنگ اور خندق کے تصور سے واقف نہ تھے لہٰذا حیرت کر رہے تھے مگر اس جنگ کے انجام نے انھیں مزید حیرت زدہ کر دیا۔ جس دن محمد علافی اپنے پانچ سو کے دستے کے ساتھ راجہ رتن کی اسی ہزار فوج کو شکست دے کر ہزاروں آدمی قیدی بنا کر اور پچاس ہاتھی قابو کر کے واپس لوٹا تو راجہ داہر کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اس نے علافی کو بڑے انعام و اکرام سے نوازا اور شاندار جشن منانے کا حکم دیا۔

دھر سنگھ اور رتن کے مر جانے کے بعد اب سندھ بھر میں کوئی اس کا حریف نہ تھا۔ یہ رات رانی بائی نے تڑپ تڑپ کر رو رو کر گزاری مگر راجہ داہر کا ہر غم ختم ہو چکا تھا۔ اب رانی بائی اس کی تھی۔ رانی لاڈلی بنا کی تھی اور سندھ کی حکومت اس کی تھی۔ پھر سال بیت گئے۔

یہ واقعہ اس دور کا ہے جب سندھ میں وہ مشہور واقعہ پیش آیا جس کے سبب عرب جنگجو سندھ فتح کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ولید بن عبدالملک کا زمانۂ خلافت تھا اور مسلمان ہمیشہ کی طرح تجارت کے شوقین، نہ صرف اسلامی ممالک میں ہی بلکہ دور دراز کے ملکوں میں بھی ان کی تجارت کا بازار گرم تھا۔ بحر احمر میں جدہ مدینہ اور عدن۔ خلیج فارس میں بصرہ اور جزیرہ ہرمز، بحر عرب میں کالی کٹ۔ لنکا۔ مالدیپ اور مصر، غرض یہ کہ اسکندریہ سے لے کر چین تک مسلمانوں کے جہازوں کی آمد و رفت عام تھی ہندوستان سے چین تک کے درمیان سب سے زیادہ اہمیت لنکا کو حاصل تھی۔ عرب اسے سیلان کہتے تھے اور یہاں مدتوں سے تاجروں کی ایک جماعت آباد تھی۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی فتوحات کی شہرت عام تھی دنیا کا ہر حاکم ان سے دوستی کا تمنائی تھا۔ اور جن جن ممالک میں مسلمان تجارت کرتے تھے وہاں کے حاکم ان ہی تاجروں کے ہاتھو ان کے خلیفہ کو تحائف بھیجا کرتے تھے (باقی)

اُلجھنوں کے گرفتار

تمام بھائی بہنوں اور بہنوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی الجھنوں کے تحت تفصیل کر الجھنیں لکھیں وہ بھی نہایت مختصر بعض بہنیں بڑا مضمون سا لکھتی ہیں اس میں ہم کو چھانٹنا پڑتا ہے اس طرح ہم خود ایک اُلجھن میں پھنس جاتے ہیں۔ (م)

چچا میاں! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خط کے القاب وآداب سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ لکھنے والی کوئی آپ کی بھتیجی ہی ہے۔ جی ہاں! میں آپ کی بھتیجی ہوں۔ میں نے بچپن میں بھی آپ کو خوب پڑھا ہے اور اب جب کہ میری عمر چالیس سے زیادہ ہے اور میرے بچے جوان ہیں، آپ کو پڑھ رہی ہوں۔

چچا میاں! آپ یہ پڑھ کر بہت خوش ہوں گے کہ مجھے زندگی کا ساتھی بہت اچھا ملا۔ میں تو نہیں کہہ سکتی کہ مالدار ہوں۔ لیکن میرے شوہر کی آمدنی اتنی ہے کہ مجھے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد بھی اچھی دی۔ کافی ذہین اور فرماں بردار۔ تین لڑکے تین لڑکیاں۔ گڑیا کے علاوہ سب پڑھنے جاتے ہیں۔ پڑھ کر آتے ہیں تو کتابوں کہانیوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ میں چھوٹے بچوں کے ہوم ورک میں رہنمائی کر دیتی ہوں۔ پھر وہ چل پڑتے ہیں۔ گھر میں نہ لڑائی، نہ جھگڑا۔ نہ شور وغل اور نہ شکوہ شکایت۔ دیکھا آپ نے کتنا اچھا میرا گھر ہے۔

آپ مسکرانے لگے ہوں گے۔ جی ہاں! یہ آخری فقرہ آپ ہی کی نظم کا ایک مصرع ہے۔ سچ سچ بہت ہی اچھا میرا گھر ہے لیکن پڑوس سے بہت پریشان ہوں۔ یہ سب مزدور پیشہ ٹھیلے والے اور رکشا والے ہیں۔ نہایت بدتمیز اور بے ہودہ۔ کرائے کے مکانوں میں رہتے ہیں کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جب ان گھروں سے لڑائی جھگڑا اور گالی گلوچ کا شور بلند نہ ہو مردوں کے پاس اس کا علاج یہ ہے کہ وہ روز اپنی بیویوں اور بچیوں کو بری طرح پیٹتے ہیں۔ عورتوں کے پاس صرف یہ علاج ہے کہ وہ تھک جائیں تو چپ ہوں میرے چھوٹے بچے انکی گالیاں سن سنکر گالی بکنے لگتے ہیں۔ ان سب کے روز کے ہنگاموں سے نہ میں رات کو ٹھیک سے سو سکتی ہوں اور نہ دن کو جھپکی لے سکتی ہوں۔

ایک بار میں نے ایک پڑوسن سے کہا کہ یہ کیا ہر روز بدتمیزی ہوتی رہتی ہے تو وہ مجھ سے لڑنے کو تیار ہو گئی۔ دوسری عورتیں اس کی مدد کو آگئیں۔ میں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ ہار مان کر چپکی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کبھی کبھی یہ عورتیں میرے گھر آجاتی ہیں تو میں منہ نہیں لگاتی۔ ایک دن ایک عورت اپنی لڑکی کو لے کر آئی کہ بی بی! دو لفظ اسے پڑھا دو تو میں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ اپنا سا منہ لے کر چلی گئی۔ کون ایسوں کو منہ لگائے۔ مکان اپنا ہے۔ چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ سوچا۔ آپ کو لکھ بھیجوں۔ تو عریضہ ہذا ارسال خدمت ہے۔ کچھ بتائیے۔

(آپ کی پرانی بھتیجی شاہدہ اختر اور اب بیگم جمال)

جواب:۔ آپ کے خط میں یہ پڑھکر خوشی ہوئی کہ آپ سکھ سے ہیں۔ سکھ پاکر شکر کرنا مسلمان کا شعار رہا ہے۔ شکر کے معنی یہی نہیں کہ آپ روزہ نماز کرلیں۔ کلام پاک کی تلاوت کرلیں۔ دل میں خوش ہولیں کہ اللہ نے بہت کچھ علم اور مال دیا ہے بلکہ: ؎

شکر کے معنی یہ ہیں اوروں کو اس سے نفع ہو
مت سمجھنا اپنی پوشاک و غذا کے واسطے

آپ نے مجھے بہت پڑھا اور اب بھی پڑھ رہی ہیں لیکن میں نے قرآن اور حدیث سے اخذ کر کے جو کچھ لکھا اور مثال میں بزرگوں کے اقوال اور نمونے پیش کئے وہ یا تو آپ نے پڑھے ہی نہیں یا ان کو بھول گئیں یا ان کو محض کہانی قصہ سمجھ کر لطف لے لیا۔

محترمہ! اگر آپ نے میری لکھی ہوئی کتابیں پڑھی ہیں اور وہ آپ کے پاس اب ہوں تو ان کو اٹھا کر پھر پڑھیئے۔ آپ کے مطالعہ میں آئے گا کہ اسلام نے پڑوسی کا بہت زیادہ حق رکھا ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پڑوسی کے حقوق کے بارے میں احکام لانے لگے۔ تو حضورؐ کو احساس پیدا ہوا کہ دھیرے دھیرے پڑوسی پڑوسی کا وارث ہو جائے گا۔ حضورؐ نے پڑوسی کے حقوق کے بارے میں بڑی لمبی فہرست دی ہے۔

- پڑوسی اگر تمہاری دیوار میں اپنی طرف کھونٹیاں اور کیلیں گاڑلے تو اسے منع نہ کرو۔
- پڑوسی اگر غریب ہو تو اگر تم اپنے گھر ہانڈی بگھارو تو اس کی خوشبو اس کے گھر میں نہ پہنچے یا پھر اُسے بھی کچھ بھیجو چاہے وہ بکری کے کھُر کے برابر ہو۔
- اگر تم بھی غریب ہو اور گوشت تھوڑا ہی پکاؤ تو اس میں پانی زیادہ کر دو اور کچھ اُسے بھی بھیجدو۔
- خدا کی قسم وہ مومن نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔
- جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ اور اللہ کا رسولؐ اس سے محبت کریں اُسے چاہئے کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔
- قیامت میں جن دو آدمیوں کا مقدمہ سب سے پہلے پیش ہوگا وہ دو پڑوسی ہوں گے۔
- خدا کی قسم تیرا آس پڑوس چالیس گھروں تک ہے اور ان میں سب سے زیادہ حقدار وہ ہے جس کا گھر، جس کا دروازہ تیرے دروازے سے قریب ہو۔
- خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں، (آپ حضورؐ کا یہ زور بیان دیکھ رہی ہیں۔ صحابہؓ نے یہ سنا تو گھبرا گئے۔ پوچھا یا رسول اللہ! وہ کون ہے فرمایا

جس کا پڑوسی اس کی حرکتوں سے محفوظ نہ ہو۔

بس اتنے ہی ارشادات کا مطالعہ فرمایئے۔ اگر آپ حضورؐ کے ان ارشادات پر عمل کرتیں تو آج آپ کے ... میں وہ اضافہ ہوتا کہ لوگ رشک بھی کرتے، دعا بھی دیتے اور آپ کی نقل بھی کرتے اور اس سکھ کا رشتہ آخرت کے سکھ سے بھی جڑ جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو علم اور مال دیا افسوس کہ آپ نے اس کا حق ادا نہیں کیا۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ کے پڑوس میں یہ جو گنوار قسم کے لوگ رہتے ہیں کبھی آپ نے ان پر ترس کھایا۔ آپ نے اپنے علم میں سے ان کو کچھ دیا۔ ان کو بتایا کہ اللہ نے اور اللہ کے رسول نے انسان کو واقعی انسان بننے کے لیے کیا ہدایتیں دی ہیں؟ آپ نے اپنے مال میں سے ان کو کچھ دیا؟ ان کے پاس کبھی تحفہ بھیجا؟۔ عید بقرعید کو سوئیاں یا گوشت بھیجا۔ کبھی اپنی ہانڈی میں ایک گلاس پانی زیادہ کر دیا اور کسی پڑوسی کو بھیجا۔

آپ نے اپنے خط میں یہ تو نہیں لکھا کہ ان مزدور پیشہ لوگوں میں مسلمان ہی مسلمان ہیں یا ہندو مسلم دونوں۔ میرے خیال میں دونوں ہو سکتے ہیں لیکن ہیں دونوں دین و اخلاق سے کورے۔ تو ظاہر ہے کہ ان کی آخرت تو برباد ہو رہی ہے لیکن میں آپ سے عرض کروں۔ آپ بھی گھاٹے کی طرف جا رہی ہیں۔ یہاں آپ انہی گنواروں کی بداخلاقی کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ آخرت میں اللہ تعالےٰ آپ سے ضرور پوچھے گا کہ اے بندی! تیرے پڑوس میں دین و اخلاق سے ناآشنا کچھ لوگ رہتے تھے۔ تو نے ان کو ان کے اصل مالک اور مولا کے احکام پہنچائے؟ ان کو دوزخ سے بچانے کی فکر کی؟ پھر کہئے۔ اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہوگا؟ پھر آپ کو اندیشہ کیوں نہیں ہے؟

میں بتاتا ہوں کیوں نہیں ہے۔ آپ کو زعم ہے کہ آپ نے اللہ کا دین پہچان لیا ہے۔ آپ نے اسلامی لٹریچر پڑھا ہے۔ بس مسلمان ایک آپ ہی ہیں۔ باقی یہ رہے تو یہ اللہ کے بندے بندیاں نہیں۔ تبھی تو ایک عورت جب اپنی بچی کو لے کر آپ کی خدمت میں آئی، آپ نے ٹکا سا جواب دے دیا اسے منہ نہ لگایا۔

کیسا اچھا موقع ہاتھ آیا تھا۔ پڑوس کی بچی کو لگا لیتیں اور پڑوسن کے سامنے بچی کو بسم اللہ پڑھا دیتیں پھر دیکھتیں کیا ہوتا۔ دراصل یہ ایک حل تھا اس پڑوسن کے عذاب اور جی ہاں آخرت کی پتر پرسش سے بھی بچنے کا۔ زیادہ نہیں ہفتہ عشرہ ہی میں آپ کے حامی اور مددگار انہی میں پیدا ہو جاتے۔ آج تو آپ اس ماحول میں نکو بنتی ہیں۔ یاد رکھئے آپ اپنی جگہ کیسی ہی رابعہ بصری ہوں لیکن اگر لوگوں کو اپنا ہمنوا نہیں بنائیں گی۔ دین کی طرف راغب نہیں کریں گی۔ تو اکیلی رہ جائیں گی جی ہاں نکو بنکر۔

آپ مجھ سے پوچھتی ہیں کیا کروں۔ کیا میری لکھی ہوئی کہانیوں میں آپ نے حضرت ابو حنیفہؒ کا یہ واقعہ نہیں پڑھا کہ:-

"امام اعظمؒ کے پڑوس میں داداقسم کا ایک آدمی رہتا تھا۔ اس سے محلے کی سبھی لوگ پریشان تھے۔ وہ امام صاحب کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ایک بار پولیس اُسے پکڑ لے گئی۔ امام صاحب کوتوال کے پاس گئے اور کہا کہ سپاہی میرے پڑوسی کو پکڑ لائے ہیں۔ میں اس کی ضمانت کو آیا ہوں۔

شہر کے دادا کی ضمانت اور امام صاحب۔ کوتوالی والے دنگ رہ گئے۔ دادا کو بلایا گیا تو اس کی آنکھیں بھی پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سب کے سامنے امام صاحب کے قدموں پر گر پڑا توبہ کی۔ پھر آپ کا شاگرد ہوا۔ اس کے بعد وہیں سے آپ کے مدرسے چلا گیا۔

آپ مجھ سے پوچھتی ہیں۔ کیا کروں۔ کیا آپ نے میری لکھی ہوئی کتابوں میں ایک بزرگ کا یہ قصہ نہیں پڑھا۔ میں اس وقت رواں دواں جواب دے رہا ہوں۔ شاید وہ بزرگ ہمارے بزرگ امام صاحب ہی ہیں یا شاید جنید بغدادیؒ یا پھر حسن بصریؒ۔ قصہ یوں ہے۔

"ان کے پڑوس میں ایک قوال رہتا تھا۔ رات بھر قوالوں کی منڈلی جمائے گایا کرتا ڈھولک بجتی رہتی۔ ان بزرگ کی عبادت میں خلل پڑتا۔

ایک دن بزرگ صاحب کے دس بجے اس کی منڈلی میں پہنچ گئے۔ سب ڈر کر بھاگنے لگے تو فرمایا کہ میرے پاس آؤ۔ میں تمہارے لئے خوشخبری لایا ہوں۔ خوش خبری؟ جی ہاں خوشخبری! سب ٹھہر گئے۔ آپ سے پوچھا وہ خوشخبری کیا؟ فرمایا۔ تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے کتنی اچھی آواز دی ہے۔ تم کو لحن داؤدی عطا فرمایا ہے۔ اگر اللہ کا کلام اسی لحن میں اتارو تو شریف لوگ تمہارے منہ چومیں اور اللہ تعالیٰ بھی تم سے خوش ہو جائے۔

بیگم جمال صاحبہ! معلوم ہے کیا اثر ہوا۔ قوالوں نے آپ کے سامنے مزامیر توڑ ڈالے۔ اسی وقت بزرگ کے حلقے میں شامل ہوئے اور پھر ان میں سے ہر ایک بہترین قاری بنا۔

آپ مجھ سے پوچھتی ہیں۔ کیا کروں۔ کیا آپ نے میری لکھی ہوئی کہانیوں میں حضرت جنید بغدادیؒ کا وہ واقعہ نہیں پڑھا جو اس طرح میں نے کہیں نقل کیا ہے؟

"ایک دن شہر میں دھوم مچی ایک رنڈی آئی ہے۔ اس وقت کی سب سے عمدہ گانے والی اور نہایت حسین و جمیل۔ شہر کے صاحب ذوق اس پر ایک ایک رات کے لئے ہزاروں کی بولی لنے لگے۔ جنید بغدادیؒ نے کہلا بھیجا۔ ہر بولی پر سو دینار زیادہ میرے رہے۔ چنانچہ پہلی رات آپ کے لئے طے ہوگئی۔ آپ ایک جوڑا کپڑے اور دیناروں کی تھیلی کے ساتھ اس کے بالا خانہ پر پہنچے تھیلی اسے دی۔ اس سے کہا کہ نہا ڈال۔ وہ نہائی۔ آپ نے اپنے پاس کا نیا جوڑا اسے پہنایا۔ پھر کہا کہ میرے ساتھ آ کر کھڑی ہو جا۔ وہ نماز کے لئے آپ کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ آپ رات بھر اسے نماز پڑھاتے رہے صبح کے وقت دعا کی کہ اے اللہ! میں نے تیری بندی کو تیرے حضور کھڑا کر دیا۔ اب دل کا بدلنا تیرے قبضہ میں ہے۔ یہ کہہ کر وہاں سے چلے تو رنڈی پیچھے ہو لی۔ آپ نے پوچھا۔ کہاں چلیں؟ وہ بولی۔ آپ خانقاہ کو۔"

کہتے ہیں کہ راستے میں وہ جنید بغدادیؒ پر دینار نچھاور کر رہی تھی۔ اور یہ شعر پڑھ رہی تھی
اِلٰی قسم اعضہت ... [illegible]

کیسا اچھا موقع ہاتھ آیا تھا۔ پڑوس کی بچی کو لگا لیتیں اور پڑوسن کے سامنے بچی کو بسم اللہ پڑھا پھر دیکھتیں کیا ہوتا۔ دراصل یہ ایک حل تھا آس پڑوس کے عذاب اور جی ہاں آخرت کی بدترین سے بچنے کا۔ زیادہ نہیں ہفتہ عشرہ ہی میں آپ کے حامی اور مددگار انہی میں پیدا ہو جاتے۔ آج تو اس ماحول میں نکو بنی ہیں۔ یاد رکھئے آپ اپنی جگہ کیسی ہی رابعہ بصری ہوں لیکن اگر لوگوں کو اپنا نہیں بنائیں گی۔ دین کی طرف راغب نہیں کریں گی۔ تو اکیلی رہ جائیں گی جی ہاں نکو بنکر۔

آپ مجھ سے پوچھتی ہیں کیا کروں۔ کیا میری لکھی ہوئی کہانیوں میں آپ نے حضرت ابوحنیفہؒ کا یہ واقعہ نہیں پڑھا کہ:۔

"امام اعظمؒ کے پڑوس میں داداقسم کا ایک آدمی رہتا تھا۔ اس سے محلے کی سبھی لوگ پریشان تھے۔ وہ امام صاحب کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ایک بار پولیس اُسے پکڑ لے گئی۔ امام صاحب کوتوال کے پاس گئے اور کہا کہ سپاہی میرے پڑوسی کو پکڑ لائے ہیں۔ میں اس کی ضمانت کو آیا ہوں۔

شہر کے دادا کی ضمانت اور امام صاحب۔ کوتوالی والے دنگ رہ گئے۔ دادا کو بلایا گیا تو اس کی آنکھیں بھی پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سب کے سامنے امام صاحب کے قدموں پر گر پڑا توبہ کی۔ پھر آپ کا شاگرد ہوا۔ اس کے بعد وہیں سے آپ کے مدرسے چلا گیا۔

آپ مجھ سے پوچھتی ہیں۔ کیا کروں۔ کیا آپ نے میری لکھی ہوئی کتابوں میں ایک بزرگ کا یہ قصہ نہیں پڑھا۔ میں اس وقت رواں دواں جواب دے رہا ہوں۔ شاید وہ بزرگ پہلے بزرگ امام صاحب ہی ہیں یا شاید جنید بغدادیؒ یا پھر حسن بصریؒ۔ قصہ یوں ہے۔

"ان کے پڑوس میں ایک قوال رہتا تھا۔ رات بھر قوالوں کی منڈلی جمائے گایا کرتا ڈھولک بجتی رہتی۔ ان بزرگ کی عبادت میں خلل پڑتا۔

ایک دن بزرگ رات کے دمعبے اس کی منڈلی میں پہنچ گئے۔ سب ڈر کر بھاگنے لگے تو فرمایا کہ میرے پاس آؤ۔ میں تمہارے لئے خوشخبری لایا ہوں۔ خوش خبری؟ جی ہاں خوشخبری! سب ٹھہر گئے۔ آپ سے پوچھا "خوشخبری کیا؟" فرمایا۔ تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے کتنی اچھی آواز دی ہے۔ تم کو لحن داؤدی عطا فرمایا ہے۔ اگر اللہ کا کلام اسی لحن میں اُتارلو تو شریف لوگ تمہارے منہ چومیں اور۔ اللہ تعالیٰ بھی تم سے خوش ہو جائے۔

بیگم جمال صاحبہ! معلوم ہے کیا اثر ہوا۔ قوالوں نے آپ کے سامنے مزامیر توڑ ڈالے۔ اسی وقت بزرگ کے حلقے میں شامل ہوئے اور پھر ان میں سے ہر ایک بہترین قاری بنا۔

آپ مجھ سے پوچھتی ہیں۔ کیا کروں۔ کیا آپ نے میری لکھی ہوئی کہانیوں میں حضرت جنید بغدادیؒ کا وہ واقعہ نہیں پڑھا جو اس طرح میں نے کہیں نقل کیا ہے؟

" ایک دن شہر میں دھوم مچی ایک رنڈی آئی ہے۔ اس وقت کی سب سے عمدہ گانے والی اور نہایت حسین و جمیل۔ شہر کے صاحب ذوق اس پر ایک ایک رات کے لئے ہزاروں کی بولی بولنے لگے۔ جنید بغدادیؒ نے کہلا بھیجا۔ ہر بولی پر سو دینار زیادہ میرے رہے۔ چنانچہ پہلی رات آپ کے لئے طے ہوگئی۔ آپ ایک جوڑا کپڑے اور دیناروں کی تھیلی کے ساتھ اس کے بالا خانہ پر پہنچے۔ تھیلی اسے دی۔ اس سے کہا کہ نہا ڈال۔ وہ نہائی۔ آپ نے اپنے پاس کا نیا جوڑا اُسے پہنایا۔ پھر کہا کہ میرے ساتھ نماز کو کھڑی ہو جا۔ وہ نماز کے لئے آپ کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔ آپ رات بھر اُسے نماز پڑھاتے رہے صبح کے وقت دعا کی کہ اے اللہ! میں نے تیری بندی کو تیرے حضور کھڑا کر دیا۔ اب دل کا بدلنا تیرے ہاتھ میں ہے۔ یہ کہہ کر وہاں سے چلے تو رنڈی پیچھے ہولی۔ آپ نے پوچھا "کہاں چلیں؟" "وہاں آپ کی خانقاہ کو"

کہتے ہیں کہ راستے میں وہ جنید بغدادیؒ پر دینار نچھاور کر رہی تھی۔ اور یہ شعر پڑھ رہی تھی "خدا کی قسم! حضرت رحمۃ اللہ نے موتنا چھوڑا ہم سہنا ملے وہ یہ آپ کیا نہیں آنا۔ ۱۰ گا۔ اگر کسی گئے۔ ز

میری طرف دیکھنے کی جرأت کی تو سعید بی کو بپھرا ہوا پائے گا۔ وہ ٹیٹوا پکڑ لے گی۔ لوگو! گواہ رہو کہ میں نے معصیت کی راہ ترک کردی! خانقاہ پہنچی تو وہاں اس سے شادی کرنے کے لئے امرائے وقت موجود مگر اس نے ایک طالب علم سے شادی کرنا پسند کیا۔

بیگم جمال صاحبہ! آپ میری لکھی ہوئی کتابوں میں سے اس طرح کے قصے پڑھئے اور آپ بھی اسی شاہ کلید سے اپنے پڑوسیوں کے لئے جنت کے دروازوں کے قفل کھولنا شروع کر دیجئے پھر آپ ہی آپ ہونگی۔ یہی گنوار عورتیں۔ آپ کا کلمہ پڑھیں گی۔ آپ کو دعوت و تبلیغ کے لئے کہیں جانا نہیں ہے۔ نہ پیسہ خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ اس عورت سے ملئے جیسے ﷺ کا سا جواب دے دیا تھا اس کی لڑکی کو گھر لائیے اور پڑھانا شروع کر دیجئے۔ پھر دیکھئے۔ اسے جس دن آپ نے نماز سکھادی اور اس بچی نے گھر جا کر نماز پڑھی تو اس بچی کی ماں۔ اس کا باپ، اس کے بہن بھائی سب آپ کے غلام ہو جائیں گے اور پھر ــــ اور پھر کیا بتاؤں۔ اللہ کی برکتوں کا اندازہ کرنا ہو تو کر کے دیکھئے۔ آپ کا گھر پھولوں کا مدرسہ بن جائے گا۔ یہی گنوار پڑوسی جن سے آپ نالاں ہیں آپ پر جان چھڑکیں گے۔ میں اپنے تجربوں کی روشنی میں عرض کرتا ہوں کہ اس سے بڑھکر دین کی تبلیغ کوئی نہیں۔ ہزاروں اجتماعوں، ہزاروں تقریروں، ہزاروں کانفرنسوں سے بڑھکر ہے یہ ذریعہ تبلیغ۔

عزیزہ سلمہا! آپ کے لئے بہترین حل یہی ہے اگر آپ اس پر عمل کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ والسلام۔

اچانک تبدیلی

زمیندار شائع ہونے والے اوہام شکن نمبر کے بدلے اب اسلامی نظام میں عورت کا مقام اور اس کا کام کے عنوان سے نمبر نکلے گا۔ ایجنٹ اور خریدار صاحبان نوٹ فرمائیں۔ (مینجر)

احیائے اسلام کی تحریک میں نوجوان پیش پیش ہیں پاکستان کیونس تا امت مسلمہ نشاۃ ثانیہ کے دور سے گزر رہی ہ

ایران کی تحریک سے روس خوفزدہ ہے مسلم ریاستوں کے متاثر ہونے کا خطرہ ہے ہنگ کانگ کے ۔لاکھ مسلمان بھی عبادت کر رہے

حج سب سے روشن اور ہمہ گیر عبادت ہے

کراچی ۱۵ اپریل (جسارت رپورٹ) امریکہ کے موقر ہفت روزہ جریدے ٹائم نے اپنی تا
تین اشاعت میں دنیا بھر میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کی تحریکوں کا جائزہ شائع کیا ہے اور کہا ہے
اسلام میں از سر نو دلچسپی سب سے زیادہ نوجوانوں میں نظر آتی ہے۔ ایک تفصیلی مقالے میں جر
نے لکھا ہے کہ مسلمان اپنی روحانی اصلیت کو از سر نو دریافت کر رہے ہیں اسلامی طرز حیات
سیاسی قوت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ وہ جدیدیت کی تلخی سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ اپنی قدیم روایات
فخر کرتے ہوئے امت مسلمہ اسلام کا احیاء کر رہی ہے۔ ایران، مصر، کویت، پاکستان اور کئی دیگر مما
کے حوالے سے جریدے نے لکھا ہے کہ ان سب کا مقصد اسلام کو ایک بھرپور قوت کے طور پر پیش
کرنا ہے۔ اسلام صرف ایک مذہب نہیں ہے جس میں جمعہ کے جمعہ نماز ادا کرنا ہی ایک فریضہ ہو،
یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو ساری زندگی پر محیط ہے۔ جریدے کے مطابق پاکستان میں
پر مبنی اسلامی قانون انصاف یعنی شریعت کا نفاذ کیا گیا ہے۔ کویت شریعت نافذ کر رہا ہے اور یہ
اسمبلی بھی مسلمانوں کے مطالبہ کے پیش نظر شریعت کے نفاذ پر بحث کر رہی ہے جس کے بعد شراب
نائٹ کلب اور جوئے خانے بند ہو جائیں گے۔ الجزائر کے نوجوانوں میں اسلام سے محبت زیادہ
آتی ہے۔ تیونس میں مسلمان برائیوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے سینما کے فحش پوسٹروں پر سیاہ

پہیرو ہتے ہیں اور مصر کی قاہرہ یونیورسٹی میں سیکڑوں طالبات نے نقاب پہننا شروع کیا ہے اور علیحدہ کلاسوں کا مطالبہ کیا ہے۔ روس اور چین جیسے کمیونسٹ ممالک میں بھی اسلام اگر غلبہ حاصل نہ ہوا ہے تو وہ برقرار مزور رہا ہے۔ روسی حکام ایران کے انقلاب سے خوفزدہ ہیں کہ کہیں اس سے آذربائیجان، ترکمان اور مسلمانوں کی آبادی پر مشتمل دوسری ریاستوں میں مسلمان متاثر نہ ہو۔ چین کے صوبے سنکیانگ میں ۵۰ لاکھ مسلمان اپنے مذہبی فرائض ادا کر رہے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات ہیں جدیدے کے مطابق سب سے زیادہ روشن اور ہمہ گیر مذہب ہے جس میں دنیا بھر سے مختلف رنگ و نسل کے مسلمان امیر غریب سب شریک ہو سکتے ہیں۔ نے لکھا ہے کہ اسلام کے احیا کی وجہ استحکام اور تشخص کی تلاش ہے جو مغربی اقدار سے متاثر ہو گئی تھیں اور اس کی وجہ سے اقتصادی اور سماجی برائیاں پیدا ہوئیں ہیں۔

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

محترم المقام! زید مجدکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ افسوس کہ دو گاہک اور گھٹ گئے کیونکہ ہمارے یہاں تبلیغی جماعت کے لوگ۔ عوام۔ نئی دنیا۔ بلٹز۔ نشیمن۔ وحیدالدین خاں صاحب کی تعبیر کی غلطی۔ آن کا رسالہ ردِّ فتنہ۔ الجمیعۃ گھر گھر لوگوں کو پڑھوایا جا رہا ہے۔ وحی سے بھی اسکو سمجھا جا رہا ہے۔ رانچی شہر کے تبلیغی لیڈر ہماری بستی میں کتابیں بیچ رہے ہیں۔ ایسا کیوں؟ خاص وجہ ہے کہ رانچی شہر کیلئے بریاتو کو جماعت کا اڈہ قرار دیا گیا ہے۔ ہمارا درس قرآن لوگوں کو سے روکا جاتا ہے کتاب پڑھنا تو دور کی بات ہے پھر بھی اللہ کا شکر ہے کہ اکثریت ہمارے ساتھ ہے۔ کو تو یہ بہکا لیتے ہیں لیکن پڑھا لکھا طبقہ ہمارے ساتھ ہے۔ دعا کیجئے کہ حق کے لئے اللہ لوگوں کے ذہن

(والسلام۔ محمد امیر الدین خاں۔ بہ:



فسادات

فساد کے معنی

فساد کے معنی ہیں لڑائی جھگڑا۔ ایسا لڑائی جھگڑا جس میں جتھے کے جتھے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں وہ آپس میں زبان بازی بھی کریں۔ یعنی زبانوں سے لڑیں۔ ایک دوسرے کو برا کہیں۔ گالیاں دیں۔ تہمتیں لگائیں وغیرہ۔

اخبار بازی بھی کریں یعنی جھوٹی سچی خبروں کو چھاپ کر ایک دوسرے کے خلاف پروپگنڈا کریں تاکہ لوگوں کی ہمدردی حاصل ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگ ان کے طرفدار ہو جائیں۔ اور آخر میں ہاتھا پائی بھی۔ یہ ہاتھا پائی فساد کی سب سے بڑی علامت ہے۔ ہاتھا پائی میں ہتھیاروں (تلواروں تیروں اور نیزوں) سے لڑنا۔ بندوق اور گولہ بارود وغیرہ سے لڑنا اور پھر آپس میں جنگ برپا ہو جانا سب شامل ہے۔

فساد کی جڑ

ہم آپ اپنے بارے میں سوچیں تو ایک خاص بات ایسی پائیں گے۔ جو ہم سب کے دلوں میں ہوگی۔ یہ کہ جو میں چاہوں، وہی ہو۔ ہم آپ اس کو من مانی کہتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم کسی دباؤ کی وجہ سے من مانی نہ کر سکیں من مانی نہ کرنے میں ہمیں اپنے گھر کے بڑوں کی خفگی کا ڈر ہوتا ہے یہ بھی ڈر ہوتا ہے کہ محلے بستی کے لوگ ہمارے مخالف ہو جائیں گے۔ سپاہی پیادہ، پولیس اور فوج جیل اور قید خانہ اور جان کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ ان رکاوٹوں کی وجہ سے ہم آپ اور تمام انسان پوری طرح من مانی نہیں کرتے۔ جہاں جہاں ان رکاوٹوں میں جتنی کمی ہوتی ہے۔ وہاں وہاں

من مانی کر جاتے ہیں۔ گھر والوں پر اپنا دباؤ ہوتا ہے۔ ہم گھر والوں سے من مانی کرا لیتے ہیں
والے کچھ تو ہماری کمائی، کچھ ہماری خدمات اور کچھ ہمارے اخلاق اور مزاج سے متاثر ہ
لئے مجبور ہیں کہ جو کچھ ہم کہیں، وہ وہی کریں۔

اسی بات کو اور بڑھائیے۔ جس طرح ہمارا دباؤ اپنے گھر پر ہو جاتا ہے اسی طرح اگر ک
اثر چاہے وہ پیسے کے بل پر ہو۔ یا اس کی خدمات کی بنا پر یا علم و اخلاق کی بدولت یا ک
کی وجہ سے۔ محلے بستی پر بھی ہو جاتا ہے جیسے کوئی کسی گاؤں کا مکھیا ہوتا ہے۔ مکھیا اپنے علم او
اور خدمات کی بدولت آپ سے آپ (فطری طور پر) بڑا مان لیا جاتا ہے۔ چاہے دو ووٹ
لوگ اُسے اپنا بزرگ مان لیتے ہیں۔ پھر وہ مکھیا جو کچھ کہتا ہے لوگ کرتے ہیں۔

یہ جو مکھیا والی بات نکل آئی یہ آجکل کے ووٹوں کے ذریعہ مکھیا بننے والی بات نہیں
ووٹوں سے جو شخص مکھیا بنتا ہے۔ وہ دھن، دھونس، دھاندلی، دھوکا وغیرہ سے بنتا
ساتھ زیادہ تر غنڈے اور بدمعاش لوگ ہوتے ہیں۔ پبلک دل سے اس کو مکھیا نہیں ما
سے بچنے کے لئے، اپنی عزت و آبرو بچانے کے لئے مجبوراً اسے مکھیا تسلیم کر لیتی ہے۔
آگے بڑھ کر سوچیے۔

جس طرح کسی کا دباؤ گھر والوں پر ہو جاتا ہے۔ محلے بستی پر ہو جاتا ہے۔ اسی
اور آگے بڑھ کر کام کرے۔ ملکی طور پر اپنی دولت کی بدولت چھا جائے۔ اس کے
کی دھاک لوگوں پر بیٹھ جائے۔ سیاسی طور پر بھی وہ لیڈر تسلیم کر لیا
ملک کے زیادہ سے زیادہ لوگ اس کے طرفدار ہو جائیں تو پھر جیسے انسان اپنے
ہو جاتا ہے۔ گاؤں کا مکھیا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اپنے ملک کا سربراہ بھی ہو جاتا ہے
جاہتا ہے کرتا ہے اور کوئی چوں نہیں کرتا کیونکہ اب ریاست کے سارے محکمے ا
ہوتے ہیں۔ ایسا شخص اگر نیک اور صالح ہوتا ہے تو ملک اور ملک والوں کو ا

پہنچتا ہے۔ لوگ اس کے لئے دعا گو رہتے ہیں لیکن یہی شخص ریاست کا سربراہ ہو کر بڑی باتوں کے لئے من مانی کرنے پہ اتر آتا ہے تو پھر پبلک اس سے پریشان ہونے لگتی ہے۔ پہلے تو چپکے چپکے اس پر ڈکٹیٹری کا الزام لگاتی ہے۔ اس کے بعد کہتی ہے۔ ارے دیکھو تو، یہ تو خدا بن بیٹھا اور سچی بات یہ ہے کہ بڑا سربراہ کچھ اسی طرح اپنے کو بھی سمجھنے بھی لگتا ہے۔ پھر اس سربراہ کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ پرانی کتابوں میں فرعون، شداد، نمرود وغیرہ کے واقعات ہم کو ملتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہیں۔ آج کے بڑے سربراہوں کا انجام ہم نے اور آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ کسی کا نام لینے کی ضرورت نہیں۔

فساد کا پھوٹ پڑنا

اب ہم نے پالیا کہ فساد کی جڑ کیا ہے۔ فساد کی جڑ یہی ہے کہ انسان جب من مانی کرنے پر اس طرح تل جاتا ہے کہ اپنے کو فرعون اور نمرود، کنس اور ہرناکشپ سمجھنے لگتا ہے اُسے کسی کا خوف نہیں رہتا جو اُسے سزا دے سکے۔ اُسے یہ ڈر نہیں رہتا کہ کوئی اسے اس مقام سے ہٹا سکتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ بہرحال انسان ہے اور انسان اور اس کے کام فانی ہیں۔ وہ بھول جاتا ہے کہ انسان سے اوپر بھی کوئی ہے جس کی مٹھی میں اس کی پیشانی کے بال ہیں۔ انسان سے اوپر والا" وہ" جب چاہے اُسے تباہ و برباد کر دے۔

"وہ" سے ہماری مراد ہے "خدائے تعالیٰ" خدائے تعالیٰ کی خدائی میں جب کوئی انسان اپنی خدائی کا ڈنکا پیٹتا ہے۔ من مانی کرتا ہے تو ایسے من مانی کرنے والے اور بھی تو پیدا ہو جاتے ہیں پیدا ہوئے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایک وقت تھا جب سومیریوں اور بابل والوں کا ڈنکا بجا ان کو مصریوں نے چیلنج کیا۔ ان میں نمرود، فرعون اور شداد وغیرہ ہوئے اور انھوں نے خدائی کے ڈنکے بجائے۔ سومیری خداوند ہوں یا بابلی مصری خداوند ہوں یا یونانی۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ وہ خدا ہیں جس نے کائنات بنائی یا جو پانی برساتا ہے یا جس کے ہاتھ میں کائنات کی باگ ڈور ہے انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ زمین پر ہمارا اقتدار ہے جو اسے چیلنج کرے گا تباہ کر دیا جائے گا

لیکن ـــــ جن لوگوں کے دلوں میں اقتدار اور من مانی کا بلا شرکت غیرے جذبہ تھا انھوں نے ان سے ٹکر لی. خود تباہ ہوئے یا انھیں تباہ کیا۔

اسلام زمین پر من مانی کرنے والوں اور خدائی کرنے والوں اور ان کی خدائی کو تسلیم کرنے والوں کو مشرک کہتا ہے. کتنی سچی بات کہتا ہے اسلام. اسی لئے اسلام مشرک کو سب سے بڑا ظالم. سب سے بڑا فسادی اور سب سے بڑی برائی کہتا ہے اور سارے فساد کی جڑ شرک ہی کو قرار دیتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ صاحب اقتدار صرف اللہ تعالیٰ ہے جسے کوئی چیلنج نہیں کرسکتا. جو ظالم، جو فسادی خدا کی خدائی میں خود خدا بن کر بیٹھیں گے اور جو لوگ انھیں زمین کا خدا تسلیم کرلیں گے ان کے کرتوتوں ہی زمین پر فساد برپا ہو جائے گا. زمین کا مطلب صرف خشکی پر ہی نہیں. خشکی پر بھی اور پانی پر بھی نیز فضا میں یہ آپس میں خشکی پر بھی دنگا اور فساد مچائیں گے جنگیں لڑیں گے اور تری میں بھی. فضا میں جہاں جہاں بھی اور پھر وہ فساد پھوٹ پڑے گا جس کا اثر عوام پر بھی پڑے گا اور سب ہی بے چین ہو جائیں

قرآن کی حقانیت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ
بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ قُلْ سِيرُوا فِي
الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلُ كَانَ
أَكْثَرُهُمْ مُشْرِكِينَ ۝ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ
مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ يَوْمَئِذٍ

يَصَّدَّعُونَ ○ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا
فَلِأَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُونَ ○ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
مِنْ فَضْلِهٖ ۚ إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِينَ ○ (سورۂ روم آیت ۴۱ تا ۴۵)

لوگوں کے اپنے کرتوتوں سے خشکی اور تری میں فساد برپا ہوگیا تاکہ ان کو ان کے کچھ کرتوتوں کا مزا چکھائے، شاید کہ وہ باز آئیں۔ (اے نبی) ان سے کہو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو، پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہو چکا ہے۔ ان میں سے اکثر مشرک ہی تھے۔ پس اے نبی! اپنی پوری توجہ اس دینِ قیّم کی طرف لگا دو۔ قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹل جانے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ اس دن لوگ پھٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے جس نے کفر کیا ہے اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے اور جن لوگوں نے نیک عمل کیا ہے وہ اپنے لئے ہی فلاح کا راستہ صاف کر رہے ہیں تاکہ اللہ ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کو اپنے فضل سے جزا دے۔ یقیناً وہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

یہ سورۂ روم کی آیتیں ہیں۔ جس وقت سورۂ روم نازل ہوئی اس وقت بھی زمین پر خدائی کی دعویدار دو حکومتیں تھیں اور یہ دونوں حکومتیں اپنی من مانی کرنے اور اپنا اقتدار جمانے اور بلا شرکت غیرے خدائی کرنے کے لئے اپنی اپنی کوشش میں تھیں۔ اور یہ دلچسپ بات ہے کہ جب اسلام نے یہ نعرہ بلند کیا کہ جس طرح آسمانوں میں اللہ کی حکومت ہے اسی طرح زمین پر بھی اسی کی حکومت قائم ہونا چاہئے کیونکہ سارے کا سارا اقتدار اللہ کے لئے ہے تو اسلام کو ان دونوں حکومتوں

سے ٹکرانا پڑا۔ آج بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ آج بھی دنیا کی دو بڑی حکومتیں ہیں۔ روس اور
دونوں بلا شرکت غیرے زمین پر اپنی اپنی خدائی قائم کرنے کے لئے کوشاں ہیں لیکن
دونوں دشمن ہیں۔ کیونکہ اگر خدا کا اقتدار تسلیم کر لیا تو اپنی اپنی خدائی سے ہاتھ دھونا پڑے
یہ ہے کہ چاہے دونوں حکومتیں باہم ٹکرائیں، چاہے اسلام دشمنی میں اپنے اپنے داؤ
دونوں طرح کے ٹکراؤ میں دنیا والوں کو فساد اور بے امنی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس
خیال میں رکھئے اور ان آیتوں پر غور کیجئے۔ کیسی عمدہ ترتیب کے ساتھ قرآن نے فسا
د نتائج پر تبصرہ فرمایا ہے۔

قرآنی تبصرہ ← سب سے پہلے دنیا والوں کو آگاہ کیا کہ خشکی اور تری میں فساد
اس میں کیا شک ہے۔ ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے۔ خشکی میں بھی اللہ کی نافرمانی ہو
سمندروں میں بھی۔ دونوں جگہ جنگ اور فساد برپا ہے جیسے اس وقت برپا تھا جب
یہ آیتیں نازل ہوئی تھیں۔ اس وقت ایران اور روم فساد برپا کرنے پر تُلے تھے۔
اور روس۔ انہی دونوں حکومتوں اور ان کے پٹھوؤں کے کرتوتوں سے یہ فساد برپا
بھی ڈھیل دے رہا ہے تاکہ یہ دونوں اپنے کرتوتوں کا مزہ چکھ لیں اور ان کی سمجھ میں
پر مح اقتدار کا مالک صرف اللہ ہے۔ اس کی نافرمانی سے باز آجانا چاہیے اور اگر ایسا نہ
قرآن اللہ کے نبی سے کہتا ہے کہ ان سے کہو تم زمین پر چل پھر کر دیکھو۔ تم سے پہلے جن
ایسا ہی کیا۔ ان کا کیا حشر ہوا۔ ان کا جو انجام ہوا۔ اس کے آثار آج بھی پائے جاتے
سبق حاصل کرو۔ تم سے پہلے والے یہ سب اسی لئے برباد کر دئے گئے کیونکہ وہ
شرک میں مبتلا تھے۔ شرک وہ سب سے بڑی برائی ہے کہ جو اس سے باز نہیں آتا
ہو جاتا ہے۔
اس کے بعد قرآن ان لوگوں سے کہتا ہے جو اللہ کا دین قائم کرنے کے لئے جد

ہیں اور ان دونوں حکومتوں سے ان کو سابقہ پڑ رہا ہے کہ اے مسلمانوں! اپنی پوری توجہ دین قیم کی لگادو۔ عنقریب وہ دن آنے والا ہے جب کافر اور مومن الگ الگ چھنٹ کر اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ اس وقت کفر کرنے والے اپنے کرتوتوں کی سزا بھگتیں گے وہ جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ ان کا انجام اس دنیا میں بھی برا ہوگا جب کہ تم نے کئی شخصیتوں کو دیکھ بھی لیا۔ واقعہ یہی ہے اللہ تعالیٰ کافروں کو پسند ہی نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ ان کو پسند کرتا ہے جو اس کے فرماں بردار بندے ہوتے ہیں۔ ان شاء اللہ زمین پر بھی وہ اللہ کی حکومت قائم کریں گے۔ اور آخرت میں جنت کے حقدار ہوں گے۔

آپ یہ مضمون بار بار پڑھئے۔ سورہ روم کی یہ آیتیں تلاوت کیجئے۔ ان کا مطلب سمجھئے۔ آج بھی یہ اسی طرح حق ہیں جس وقت نزول کے وقت تھیں ــــ فساد کون کرتا ہے۔ اس کا کیا ہوتا ہے۔ انجام کار میدان کس کے لئے ہموار ہوتا ہے۔ یہ سب سمجھ میں آجائے گا۔ سمجھدار لوگ کے لئے ان آیتوں میں بڑا سبق ہے۔ اب جو بڑھ کر اس نصیحت کو قبول کرے جو قبول کرے اپنے ہی بھلے کے لئے کرے گا۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

نیکی اور بدی

(ایم۔ اے۔ خیا

دربار نوشیرواں کے دروازے پر دو اشخاص نے باآواز بلند حاضرین دربار کو مخاطب کیا۔

ایک نے کہا۔ برائی نہ کر برائی کی بات نہ سوچ تاکہ تجھے برائی نہ پیش آئے۔

دوسرے نے کہا۔ نیکی کر اور نیکی کی باتیں سوچ تاکہ نیکی ملے۔

نوشیرواں نے پہلے کو دو ہزار اور دوسرے کو ایک ہزار دینار دلوایا۔ مصاحبوں نے استفسار کیا کہ دونوں کی ایک ہی سی کہتی ہیں تو انعام میں یہ امتیاز کیوں؟ ــــ نوشیرواں نے متبسم ہوکر جواب دیا کہ دوسرے نے ... کی ہدایت کی مگر پہلے نے برائی سے روکا جس سے نیکی کا راستہ خود بخود ہموار ہوگیا اس لئے انعام زیادہ ملا

زمانے کی گواہی

جرائم پیشہ لوگوں کی زندگی بڑی پرخطر ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے مال پر ہاتھ صاف کر کے بعض اوقات خوب گلچھرے اُڑاتے ہیں لیکن ان کی یہ عیاشی عارضی ہوتی ہے۔ قانون کی گرفت میں آنے کے بعد سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے اور پھر انہیں قید و بند کی صعوبتیں جھیلنا پڑتی ہیں لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ آنے کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ یعنی ان کے جیل جانے پر ان کے پریوار کے ممبروں کی زندگی بھی برباد ہو جاتی ہے۔

حال ہی میں ایک انگریز مصنف نے ڈاکوؤں اور لٹیروں کی زندگی کا تجزیہ کرنے کے بعد ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے۔ • لٹیرے اور ان کے بدبخت پریوار • مصنف نے نہایت عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ ڈا... اور لٹیرے جب پکڑے جانے پر طویل سز... پاتے ہیں تو ان کے بیوی بچوں پر کیا بیتتی ہ... سلسلہ میں وہ چلتی ٹرین میں ایک ڈاکہ... کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہے۔

۱۵ برس پہلے کی بات ہے گلاسگو... جانے والی ایک مسافر گاڑی کو ۱۵ نقاب... ڈاکوؤں نے جو آتشیں اسلحہ سے لیس تھ... لیا اور تقریباً ۲۶ لاکھ پونڈ کا مال لے کر ... ہو گئے۔ پولیس نے اطلاع پاتے ہی تعا... اور کافی تگ و دو کے بعد وہ لٹیروں کو... کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

ان لٹیروں کا مالِ غنیمت جس قد... سے ہاتھ لگا اسی قدر جلدی میں خرچ ہو...

جو تھوڑا بہت بچا۔ وہ مقدمہ بازی کی نذر ہو گیا۔ انجامِ کار ان سب کو لمبی سزا ہو گئی اور وہ سب جیل کی چار دیواری میں بند ہو گئے
اب ان کے بیوی بچوں کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ ان کی بیویاں چار و ناچار نوکری کر کے یا کسی دیگر گھریلو دستکاری کے ذریعہ اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنے لگیں۔ کئی ایک نے طلاق حاصل کر کے دوسرا بیاہ رچا لیا اور جو زیادہ حساس طبع تھیں ان کا دماغی توازن بگڑ گیا اور وہ در در بھٹکنے لگیں۔

اس طرح ان ٹرین لوٹنے والوں کا نہایت عبرتناک حشر ہوا۔

اسی طرح اس کتاب میں ایک اور نوجوان رہزن ٹومی کا واقعہ ہے ٹومی ایک نامی چور تھا اور کئی بار قید کاٹ چکا تھا ایک بار اس نے ایک متمول بیوہ کے مکان میں نقب لگائی۔ تو بیوہ کی نیند کھل گئی۔ وہ شور مچانے ہی والی تھی کہ ٹومی نے اس کا گلا دبا دیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن لوگوں نے تعاقب کر کے اسے پکڑ کر پولیس کے حوالہ کر دیا۔ قتل ا[ور] رہزنی کے جرم میں ٹومی سزائے موت سے تو بچ گیا۔ پر اس کی بیوی اور بیٹی کے [لئے] روزی روٹی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

رینالڈ کی بیٹی نے سکول جانا محض [اس] لئے چھوڑ دیا کہ کلاس کی کئی لڑکیاں اسے د[اغدار] باپ کی بیٹی کہہ کر پکارتی تھیں۔ یہ ذلت اس[ے] گوارا نہ تھی لہٰذا اس نے اسکول سے اپنا نام کٹوا لیا۔ دریں اثناء اس کی ماں ایک حادثہ میں شدید زخمی ہو گئی ہسپتال میں اس[کی] حالت غیر دیکھ کر رینالڈ کو مطلع کیا گیا تا[کہ] وہ اپنی بیوی سے جو بسترِ مرگ پر پڑی تھی آخر[ی] ملاقات کر سکے لیکن بدقسمتی سے رینالڈ کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کی بیوی نے دم توڑ دیا۔ اپنی ماں کی موت کا غم برداشت نہ کر کے اس کی بیٹی نے آتم ہتیا کر لی اور اس طرح رینالڈ کے برے اعمال کے باعث دو معصوم جانیں تلف ہو گئیں
اس کتاب میں ایک عجیب قسم کے شخص کا واقعہ نہایت سبق آموز پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

برازیل کے جون فریز نامی اس جیب تراش نے ہزاروں افراد کی جیبیں صاف کر کے لاکھوں روپیہ اکٹھا کیا لیکن گناہ کی یہ کمائی جس طرح آئی، اسی طرح نکل گئی۔ انجام کار دو واقعات نے اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اور اس نے اس گھناؤنے دھندے سے توبہ کر لی۔ ایک دفعہ اس کی بیوی بیمار بیٹے کو لے کر ہسپتال گئی۔ ہسپتال سے نسخہ لکھوا کر باہر نکلی کہ بازار سے دوا خریدے۔ راستے میں کسی اور جیب تراش نے دوا کا نسخہ اور پرس میں رکھی ہوئی ساری نقدی نکال لی۔ اسے دوا کے بغیر بلکتے ہوئے بچے کے ساتھ خالی ہاتھ گھر آنا پڑا وہ گھر آ کر بہت روئی اسے روتے دیکھ کر جون فریز نے سوچا کہ جو لوگ میرے ہاتھوں لٹتے ہیں وہ بھی اسی طرح روتے ہوں گے۔ نہ جانے میری وجہ سے کتنے بچے دوا کے بغیر تڑپتے ہوں گے اور کتنی مائیں دوا نہ ملنے کی وجہ سے در بدر بھٹکتی ہوں گی۔"

اس روز جون فریز کو رات بھر نیند نہ آئی اور صبح اٹھ کر اس نے عہد کر لیا کہ آئندہ وہ بھوکا رہ لے گا مگر جیب تراشی نہ کرے گا۔

اگلے روز وہ گھر میں پڑا رہا تو اس کی بیوی نے اسے بتایا کہ بڑا لڑکا پچھلے دو روز سے سکول نہیں جا رہا۔ فریز نے بیٹے کو بلا کر سکول نہ جانے کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ وہ نہیں پڑھے گا۔ اس کا اتنا کہنا تھا کہ فریز نے دو تین تھپڑ رسید کر دیئے۔ بیٹے نے آنسو بھری آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھا اور بڑے دکھ سے کہنے لگا۔ "ڈیڈی اپنے گناہوں کی سزا ہمیں کیوں دیتے ہو؟" یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر بولا۔ گذشتہ روز سکول میں ۲۱ کا جھگڑا ہو گیا تو ایک لڑکے نے طعنہ دیتے ہوئے کہا کہ جیب کترے کے بیٹے ہو کر ہمارے منہ لگتے ہو۔"

بیٹے کے یہ الفاظ فریز کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برسے اس روز کے بعد اس نے جیب تراشی کا دھندہ ترک کر کے توبہ کر لی۔ جون فریز کو یہ دھندہ چھوڑے ۶ برس ہو چکے ہیں اب وہ بیکری کی دوکان کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتا ہے اور شریفانہ زندگی بسر کرتا ہے اس کا کہنا ہے جرائم پیشہ لوگوں کی خانگی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔

بہنا جی کے خطوط

مائل خیرآبادی

(۵)

پروین پیاری خوش رہو! تم نے مجھے خوش کردیا۔ تمہارا خط کئی بار پڑھا۔ ہر بار میری خوشی میں اضافہ ہوا۔ تم نے میرا کہا مان لیا۔ میری تجویز کو پسند کیا۔ تم شادی کرنے اور گھریلو جیون بتانے کے لئے تیار ہوگئیں۔ تم نے اپنی کمزوری محسوس کرلی اور مرد کی برتری کو تسلیم کرلیا۔ اب تم نے جیسا کہ میں نے لکھا تھا۔ مجھ سے شوہر کے انتخاب میں مشورہ چاہا ہے تو یہ بات میں زیادہ نہیں پھر بھی ذرا کھول کر بتانا چاہتی ہوں۔

دیکھو! دنیا میں جو شادیاں ہوئیں۔ ہوتی رہیں۔ ان میں چار باتیں خاص طور سے دیکھی جاتی رہیں اور اب بھی دیکھی جاتی ہیں۔ ان چاروں باتوں کو میں ترتیب کے ساتھ لکھتی ہوں۔ بہت ٹھنڈے مزاج سے ان کو سوچنا۔

(۱) حسب نسب۔ حسب نسب کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مرد ہوں یا عورتیں سب سے پہلے یہ دیکھتی یا دیکھتے ہیں کہ جس سے شادی کرنا ہے اس کا خاندان کیا ہے یعنی ہم اگر سید یا برہمن ہیں تو دوسری طرف کا خاندان بھی سید یا برہمن ہے کہ نہیں۔ ہم اگر پٹھان یا راجپوت ہیں تو دوسری طرف کا خاندان بھی پٹھان یا راجپوت ہے یا نہیں۔ باپ دادا سے جو ہماری نسل چلی آرہی ہے ہم جس ذات اور گوت کے ہیں۔ دوسری طرف بھی اسی ذات اور نسل کے لوگ ہیں یا نہیں اس اعتبار سے میاں بیوی کا جوڑا ٹھیک ٹھیک ہے یا نہیں۔

یہ جوڑ بن جاتا ہے تو پھر چاہے اس جوڑے میں سے ایک شکل و صورت میں کمتر ہو یا غریب یا عادت میں مختلف۔ پرواہ نہیں کی جاتی۔ شادی ہو جاتی ہے۔ شادی کے بعد ایک کی بدصورتی دوسرے کو گوارا ہی کرنی پڑتی ہے۔ عادتیں مختلف ہوتی ہیں تو ان کو بھی برداشت ہی کرنا پڑتا ہے۔ چاہے ہنسی خوشی برداشت کیا جائے چاہے رو دھو کر یا کراہیت کے ساتھ۔

میں نے اس طرح کی شادیوں کے جو نتیجے دیکھے ہیں وہ اچھے نہیں۔ ایک مدت تک میاں بیوی میں کھنچاؤ رہتا ہے۔ اس کھنچاؤ میں ایک نہ ایک کے قدم غلط راہ پر بھی پڑتے ہیں ہیں۔ اگر مرد بدصورت ہے تو بے چاری عورت اپنا دل مار کر کسی نہ کسی طرح قبول کر لیتی ہے اور نباہ لے جاتی ہے لیکن مرد عمر بھر افسوس کرتا رہتا ہے کہ اُسے خوبصورت بیوی نہیں ملی۔ اس حسرت میں اس کی نگاہ بد ہو سکتی ہے اور اس کے دامن پر دھبہ لگ سکتا ہے۔

پیاری بہن! مرد کو بیوی کی صورت پسند نہیں ہوتی اور وہ دوسری عورتوں کی طرف راغب ہو جاتا ہے اور بیوی جان بھی جاتی ہے تو اُسے باز رکھنے کی کوشش تو کرتی ہے لیکن اگر شوہر باز نہ آئے تو وہ کچھ نہیں کر سکتی لیکن اگر بیوی کو شوہر کی صورت پسند نہ آئے اور وہ کسی خوبصورت مرد کی طرف نگاہ بھر کے دیکھ لے تو مرد کسی طرح برداشت نہیں کرتا۔

پروین! دیکھو تو گناہ چاہے مرد کرے چاہے عورت۔ پاپ چاہے عورت کا ہو چاہے مرد کا لیکن میں نے دیکھا ہے کہ سماج بھی مرد کو معافی کے قابل سمجھتا ہے۔ لیکن یہی سماج عورت کو معاف نہیں کرتا۔ اس بے چاری کو سزا ملتی ہے اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ اس غریب کی ناک تک کاٹ لی جاتی ہے کیونکہ اس نے گھر کی ناک کٹوا دی۔ اور پھر مرد کی تو شادی ہو جاتی ہے لیکن غریب عورت کہاں جائے؟ کیا بتاؤں؟ میں نے کہاں جاتے دیکھا ہے۔ تم دیکھنا چاہو تو جنھیں بیسوا کہا جاتا ہے جو اپنے کوٹھوں پر بنی ٹھنی بیٹھی نظر آتی ہے۔ ان میں زیادہ تر ایسی ہی پھٹکاری اور دھتکاری ماری ملیں گی۔ آہ آخر مات کھاتی ہے تو عورت ہی۔ اس لئے میری نظر میں یہ ذات پات اور نسل

وخاندان کی پرکھ کا معیار گھٹ جاتا ہے۔

(۲) مالدار گھرانہ :۔ ذات دیکھنے کے بعد دوسرا نمبر مال و دولت کا ہے۔ لڑکی یا لڑکے والے دیکھتے ہیں کہ جس گھر میں شادی ہوگی وہاں وہ آرام اور سکھ سے رہ سکے گی یا نہیں۔ لڑکی اور لڑکے والے یہ دیکھتے ہیں کہ نئی دلہن اپنے ساتھ کتنا مال لا رہی ہے۔ اس حرص نے خرید و فروخت کا روپ دھارن رلیا ہے۔ مال دار عورت کو دیکھ کر مرد بڑے بھیانک فریب کرتا ہے۔ محبت کے نئے نرالے ڈھونگ رچاتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح پھانسنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مالدار گھرانے کے لڑکے کو حاصل رنے کے لئے لڑکی یا لڑکی والے بڑی بڑی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ دس بیس ہزار ، بات تو معمولی سی ہے۔ لاکھ اور اس سے زیادہ کی بولی بول کر ایسے لڑکے کو خریدا جاتا ہے۔

پروین بانو! میں نے اس سودے بازی میں بھی عورت ہی کو ہارتے دیکھا ہے۔ عورت اگر لدار گھرانے میں جائے تو سوچو، وہاں اُسے دو روٹی اور چند کپڑوں کے سوا کیا ملتا ہے۔ کچھ نہیں ما۔ وہ شوہر کی تجوری تو الگ رہی، اس گھر کے تنکے کو نہیں چھو سکتی لیکن اگر عورت لاکھوں کی مُداد لے کر سسرال جائے تو اس پر اس کی سسرال والوں کا قبضہ ہو جاتا ہے اور وہ بیچاری رُوم ہی رہتی ہے۔ محروم ہی نہیں رہتی۔ اس کے شوہر کی تمنا اور خواہش یہ ہوتی ہے کہ بیوی طرف سے کچھ اور چاہیئے دولت ہمارے گھر کے لئے۔ اگر یہ خواہش پوری ہوتے دکھائی بن دیکھی تو میں نے دیکھا ہے کہ پھر چاہے بیوی اندر پرست کی اپسرا ہو یا جنت کی حور، اُسے سسرال کے لوگ کسی نہ کسی تدبیر سے مار تک ڈالتے ہیں۔ جلا تک دیتے ہیں۔ پروین پیاری ب میں شادی بیاہ میں یہ سودا ہوتے دیکھتی ہوں تو میری روح لرز جاتی، میری آتما کانپ جاتی ہے۔ میں سچ کہتی ہوں کہ اگر میں نے تم کو مال کی بنا پر کسی سے شادی کرتے سنا تو فوراً سے پہلے تمہارے پاس پہنچ کر تمہارا گلا دبا دوں گی اور تم کو روز روز کے مرنے سے بچالوں گی۔ کیونکہ زندگی کا سکھ مال سے خریدا نہیں جا سکتا۔

(۳) حسن و جمال:۔ شادی کرنے کے لڑکی اور لڑکے کی شکل و صورت بھی دیکھی جاتی ہے دیکھنا بھی چاہیے، پیاری شکل و صورت، حسین چہرہ، تندرست جسم کسے اچھا نہیں لگتا۔ لیکن میرا تجربہ بھی ہے اور دیکھا بھی یہی جاتا ہے کہ شکل و صورت کی پوجا کچھ ہی دنوں ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس وقت تک جب تک جسم کا کساؤ، جسم کے اوپر کی ریشمی کھال کی چمک اور چہرے مہرے کا سڈول پن باقی رہتا ہے اسی کو جوانی کہتے ہیں۔ یہ جوانی ڈھلی تو ساری شکل و صورت چلی۔

مرد کی جوانی ڈھل جائے اس کی آنکھیں اور کنپٹیاں دھنسنے لگیں تو عورت پھر بھی اس پر قربان رہتی ہے لیکن اگر بیوی کی جوانی ڈھل جائے تو مرد کو پروا نہیں۔ وہ اس طرح بازاری شعر گنگناتا ہے:

کیف آور شباب کے دن ہیں لغزش بے حساب کے دن ہیں
کبھی اس پر نظر کبھی اس پر! حسن کے انتخاب کے دن ہیں

گویا یہ بدمعاش اس نظربازی کو جائز سمجھتا ہے۔ اپنے لئے تو جائز سمجھتا ہے لیکن بیوی کے لئے؟ تو یہ کردو پر دیں! کوئی اس کی زبان پکڑنے والا نہیں ہوتا۔ مطلب یہ کہ اس ناپ میں بھی عورت ہی بونی دیکھی گئی ہے۔ اس سودے میں بھی گھاٹا عورت ہی کے لئے مقدر ہے۔

(۴) سیرت و کردار:۔ گھوم پھر کے۔ تجربہ کر کے۔ جانچ پرکھ کے۔ لوگوں کی نظر میں آخری کسوٹی سیرت و کردار ہے۔ کہتے ہوئے سنا گیا ہے، تم نے بھی سنا ہوگا کہ سیرت نہ ہو تو صورت لے کر کیا چاٹیں۔ یہ سچی بات سب کہتے ہیں۔ سب جانتے ہیں۔ مگر افسوس ہے۔ شادی بیاہ کرتے وقت خاندان مال، شکل و صورت تو دیکھتے ہیں، نہیں پرکھتے تو سیرت و کردار کو۔ نہیں پرکھتے جب کہ دیکھا گیا ہے کہ چاہے خاندان ہو، چاہے مال، چاہے شکل و صورت ہو یا حسن و جمال۔ اگر ان کے ساتھ سیرت نہیں تو آخر کار یہ سب بیکار ہی ہو جاتا ہے۔ سیرت و کردار کی کمی دراصل عزت میں بٹہ لگاتی

ہے۔ مال پاکر بھی مال سے محروم کر دیتی ہے۔ شکل وصورت اور حسن وجمال کو بھی پیچھے ٹال دیتی ہے۔

تم کہو گی کہ مال اور خاندان اور شکل تو دیکھی جا سکتی ہے لیکن سیرت و کردار ناپنے کا کیا پیمانہ ہے جب شادی بیاہ کی بات چلتی ہے تو لڑکے لڑکی کی عادتوں اور طریقوں کی تعریفیں ہی ہوتی ہیں لیکن پھر وہ شیطان ثابت ہوتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے لیکن کچھ پیمانے ایسے ہیں جن سے ناپ لیا جائے تو پوری ایک سو فیصدی تو نہیں لیکن ستر اسی فیصدی کامیابی یقینی ہے۔ پھر یہ کہ انسان فرشتہ تو ہو نہیں سکتا۔ ایک نہ ایک عیب ہوگا ضرور۔ بے عیب تو خدا کی ذات ہے۔

میں نے جہاں تک دیکھا ہے اور سمجھا ہے تو جس بچے کے ماں باپ اور گھر والے اچھے ہوتے ہیں تو پھر بھی ان کی دیکھا دیکھی اچھا ہو جاتا ہے۔ جو بچہ بچپن سے اچھی تعلیم اور تربیت پالے۔ غیر ممکن ہے کہ اس کا اثر نہ ہو۔ بھلے ہی جوانی میں کبھی قدم ڈگمگا جائے لیکن پھر وہ سنبھل ہی جاتا ہے۔

تم کہو گی کہ اچھی تعلیم اور تربیت کا کیا مطلب ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ اچھی تعلیم اور اچھی تربیت وہ ہوتی ہے جس سے خدا کا خوف پیدا ہو۔ بھگوان کا بھے بڑھے۔ یہ بات دل میں بیٹھ جائے کہ ہمارا خدا ہمیں ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ وہ ہم سے ناراض ہو جائے گا اور وہ سزا دے تو کوئی ہمیں نہیں بچا سکتا۔ یاد رکھو بے خدا زندگی سے کردار نہیں بنتا۔ سوچو ایک جنگل میں ایک مرد اور ایک عورت ہو لیکن وہ دونوں میاں بیوی نہ ہوں۔ دونوں خوبصورت ہوں اور کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔ پولیس کا ڈر نہ ہو۔ تو کون ان کے دامن کو گناہ کے دھبوں سے بچا سکتا ہے؟

میں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں پڑھا ہے کہ جب زلیخا نے، اس زلیخا نے جو ایک رئیس کی بیوی تھی۔ اس زلیخا نے جس سے زیادہ خوبصورت عورت مصر میں نہ تھی۔ اسی زلیخا نے بالکل تنہائی میں یوسفؑ کو پاس بلایا لیکن (کتابوں میں لکھا ہے کہ) اس وقت یوسف علیہ السلام پر خدا کا خوف غالب آگیا اور وہ زلیخا کے للکر بھلانے پر بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ حالانکہ اس کی ان

کو بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ برسوں جیل میں پڑے رہے۔ خدا کے خوف سے ان کا جو کردار تھا اس نے بہت سے ڈاکوؤں، چوروں، بدمعاشوں کو جیل میں متاثر کیا آخر یہی سیرت و کردار رنگ لایا۔ مصر کے بادشاہ نے انھیں خود بلایا اور سلطنت کی کنجی انھیں دے دی۔

پروین! میری رائے ہے کہ تم اپنے لیے جو بَر تلاش کرو تو پہلا نمبر سیرت و کردار کو دو۔ میں نے بہت کچھ کھو کر یہ گُر پایا ہے۔ ایک بہت سچے۔ بہت ہی اچھے سا لیسے سچے جس سے بڑھ کر سچا دنیا میں نہ ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر، بڑی جچی تلی بات کہی ہے۔ سنو میری پیاری اور عمل کرو۔ فرمایا:۔

"لوگ خاندان، ذات پات، نسل و رنگ، مال و دولت، حسن و جمال دیکھ کر شادی کرتے ہیں لیکن تم دیندار سے شادی کرو چاہے وہ لونڈی غلام ہی کیوں نہ ہو"

سوچو گی تو تمہارا دل کہے گا کہ اس سچے نے سچ کہا۔ غور کرو گی تو مان لوگی کہ حق بات یہی ہے پروین! ایسے کو تلاش کرو۔ میں بھی نگاہ میں رکھوں گی۔ غریب بھی ملے تو نہ گھبرانا۔ یہ دنیا ہے۔ آج کوئی غریب ہے کل مالدار ہو جاتا ہے اور مالدار فقیر ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کے دن ان کے درمیان بدلتا رہتا ہے۔

سمجھیں! مجھے جلد جلد خط لکھنا۔ اگر کوئی پسند آجائے تو مجھے بھی دکھانا۔ دنیا اچھوں سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ اچھا، اچھا خدا حافظ۔ تم کو دل و جان سے چاہنے والی تمہاری آپا۔

افواہیں

جہاں گرد کے قلم سے

جہاں گرد چاروں کھونٹ گھومتا ہے۔ افواہیں جمع کرتا ہے اُسے افواہیں جمع کرنے کا جنون ہے یہ، جنون اس لئے ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جنون کے پیچھے ہوش ہوتا ہے۔ افواہوں کے پیچھے تلخ حقیقتیں ہوتی ہیں۔

●

ہندسرکار اس تجویز پر بڑی سنجیدگی سے غور کر رہی ہے کہ ملک بھر کے شاعروں کو راہِ راست پر لایا جائے تاکہ انھیں بھی سماج میں کوئی واضح مقام مل سکے۔

ہندسرکار کے پاس اس قسم کی کئی شکایات پہنچی ہیں کہ بے روزگاری، شاعروں کا... سب سے بڑا پرابلم ہے، بلکہ بہت سے بے روزگار جب روزی نہیں کما سکتے تو شاعر بن جاتے ہیں۔ اعداد وشمار کے مطابق ملک جتنی شاعری کی ضرورت ہے شاعروں کی تعداد اس ضرورت سے سو گنا زیادہ ہے۔ اور یہ صورتِ حال انتہائی خوفناک ہے۔ اس سے دو قسم کے نقصانات ہو رہے ہیں ایک تو یہ کہ ان پڑھ لوگ بھی شاعر بن رہے ہیں اور دوسرے یہ کہ جوں جوں شاعر بڑھ رہے ہیں شاعری کی قدر وقیمت کم ہوتی جا رہی ہے اور اس صورتِ حالات کی واحد وجہ یہ ہے کہ شاعروں کا کوئی سماجی مرتبہ نہیں ہے، ایک بڑھئی، ایک ٹائپسٹ، ایک لوہار حتیٰ کہ ایک نائی کا بھی سماجی مقام ہے۔ لیکن شاعر کی روزی

کا باقاعدہ انتظام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی شاعر بھوک سے تنگ آکر کلرک بن جاتے ہیں منیم بن جاتے ہیں۔ بڑھئی بن جاتے ہیں حتیٰ کہ ایک شاعر کو تو کپڑے کی ایک دکان پر.... سیل انچارج کے طور پر کام کرتے دیکھا گیا ہے۔

لہٰذا شاعروں کو سماجی مقام دلانے اور شاعری کی لاج رکھنے کے لئے سرکار مندرجہ ذیل انتظامات پر غور کر رہی ہے۔

۱۔ ٹیسٹ لے کر شاعروں کو شاعری کے پرمٹ دئے جائیں۔ صرف پرمٹ بردار شاعر ہی شاعری کر سکیں گے ایرا غیرا نہیں۔

۲۔ صرف اسی شاعر کو شاعری کا پرمٹ جاری کیا جائے گا جو نہ صرف ٹیسٹ میں پاس ہو جائے بلکہ شاعری کے علاوہ کسی نہ کسی صنعت میں بھی کام کرنے کے قابل ہو۔

۳۔ تمام پرمٹ یافتہ شاعروں کو سرکار کی طرف سے پانچ پانچ ہزار روپے بطور قرضہ دئے جائیں تاکہ وہ اس روپے کی مدد سے کوئی کاروبار یا سمال سکیل انڈسٹری جاری کر سکیں۔

۴۔ ریڈیو پر، مشاعروں میں، رسائل میں اور جلسوں میں اور فلموں میں صرف پرمٹ یافتہ شاعروں کو مدعو کیا جائے اور ان کے درجہ کے مطابق انہیں معاوضہ دیا جائے۔

۵۔ آئندہ پانچ سال میں نئے شاعروں کی حوصلہ شکنی کی جائے تاکہ شاعری کی وبا کو پھیلنے سے روکا جا سکے۔ اور آئندہ کم سے کم ۱۵ برس تک موجودہ شاعروں کی کھپت سے ہی گزارا کیا جائے۔

سُنا ہے اس انقلابی تجویز کی روشنی میں پرمٹ جاری کرنے والی جو کمشنری مقرر کی جائے گی وہ بلند کردار کے لوگوں پر مشتمل ہوگی۔ تاکہ پرمٹ دیتے وقت کرپشن کا سلسلہ شروع نہ ہو جائے۔ کیونکہ آج تک ہند سرکار کا ہر اچھا منصوبہ کرپشن کا شکار ہو جاتا رہا ہے۔

●

دہلی کے مردِ سماج میں یہ افواہ بڑی تیزی سے گشت کر رہی ہے کہ پچھلے دنوں دہلی کے قریب ایک گھنے جنگل میں دہلی کی تمام [illegible]

عورتوں کی ایک خوفناک میٹنگ منعقد ہوئی اور اس خوفناک میٹنگ میں نہایت افسوس ناک فیصلے کئے گئے، جو قریب قریب سبھی مردوں کے خلاف تھے۔

مثلاً سب سے پہلا فیصلہ یہ کیا گیا کہ مردوں سے سگرٹ نوشی کی عادت قطعاً چھڑا دی جائے۔ پہلے انھیں ایک مہینے کا نوٹس دیا جائے اگر وہ سگرٹ ترک نہ کریں تو ان کا بائیکاٹ کر دیا جائے۔ یعنی کوئی حسین عورت ان سے محبت نہ کرے، انھیں کنکھیوں سے نہ دیکھے ان کی طرف دیکھ کر مسکرائے نہیں، کوئی ناز و ادا دکھائے نہیں، شرمائے نہیں (اس میں شادی شدہ محبت اور کنواری محبت دونوں شامل ہیں)

اس فیصلے سے دہلی کے مردوں میں کھلبلی مچی ہوئی ہے سنا ہے کچھ خاوندوں کو اپنی بیویوں کے تحریری نوٹس موصول بھی ہو چکے ہیں۔ کنواری حسیناؤں کے ترک محبت کے نوٹس جاری کرائے گئے ہیں یا نہیں اس کے متعلق بہاں گرد کو ابھی اطلاع نہیں ملی، کیونکہ یہ نوٹس خفیہ طور پر اور زبانی مسے جا رہے ہوں گے۔ بہرکیف محبت کے ماحول میں تناؤ کی سی ایک کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور مرد حضرات سوچ رہے ہیں کہ حسیناؤں کے اس بائیکاٹ کا مردانہ شان سے ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے اور حسیناؤں کی بجائے بدشکل عورتوں کے ساتھ محبت شروع کر دی جائے۔ اس میں خطرہ صرف یہ ہے کہ بدشکل عورتیں کہیں صورت حالات سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں اور اپنی محبت کا ریٹ کہیں اونچا نہ کر دیں۔

اگر حسیناؤں نے اپنے بائیکاٹ سے دہلی کے مردوں کو چاروں خانے چت گرا دیا تو اس تجربہ کو ہندوستان بھر میں آزمایا جائے گا غرض محبت کی دنیا میں ایک شدید کرائسیس آنے والا ہے۔ ع

دیکھیں کیا بنتی ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

پاکستان سرکار نے اخباروں کو نیشلائز کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ لیکن ہند سرکار اس سے بھی آگے جانے پر غور کر رہی ہے۔

رعایتی اعلان

مکتبہ حجاب رامپور کی طرف سے

مولانا مودودیؒ کی لکھی ہوئی کچھ کتابوں کی قیمت زیادہ ہے۔ ہم ایسے صاحبان کے لئے جو یکمشت نہیں خرید سکتے، ایک رعایتی اعلان شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس اعلان سے اٹھایا جائے گا۔

● ارکان جماعت اسلامی۔ حسب ذیل کتابوں کی قیمت کس طرح قسطوں میں ادا کر سکتے ہیں۔

(۱) تفہیم القرآن۔ ۶ جلدیں۔ موجودہ ہدیہ -/127 ہے۔ اس کا آئندہ ایڈیشن کاغذ کی گرانی کی بنا پر اندازاً -/۱۶۰ ہوگا۔ مکتبہ حجاب سے تفہیم القرآن کا یہ سٹ چھ قسطوں کے وعدے پر حاصل کر لیں۔

(۲) سیرت سرور عالمؐ۔ ۴ جلدوں میں۔ اس وقت صرف ۲ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ دونوں کی قیمت سو روپیہ ہے۔ یہ دونوں جلدیں پانچ قسطوں۔

(۳) رسائل مسائل۔ ۴ حصے۔ موجودہ قیمت -/34 ہے۔ یہ سٹ دو قسطوں میں۔

(۴) محسن انسانیت۔ قیمت 22.50۔ دو قسطوں میں۔

(۵) تفہیمات۔ ۴ حصے۔ موجودہ قیمت 26.50۔ دو قسطوں میں۔

نوٹ ۱۔ ارکان جماعت فہرست ارکان سے اپنا نمبر ضرور لکھیں۔

نوٹ ۲۔ جماعت اسلامی کے ارکان اور غیر ارکان صاحبان نقد مسلم بھیجیں تو محصول ڈاک مکتبہ حجاب کے ذمہ۔ مکتبہ حجاب کی مطبوعات پر -/۱۰۰ یا اس سے زائد کی کتب منگانے پر فی صد 40 کمیشن۔ اس سے کم -/۲۵ کی کتابوں پر 33% اور 25% سے کم منگانے پر -/25۔ محصول ڈاک بذمہ خریدار مکتبہ حجاب کی مطبوعات۔

(منیجر مکتبہ "حجاب" رامپور یوپی۔ ۲۴۴۹۰۱)

[illegible]

کی آدھی زمین وکیل صاحب کو بطور فیس دیدیگا۔

سُنا ہے کہ ایک سابق مغل شہزادہ جو آج کل ایک لانڈری میں کام کرتا ہے اس مقدمے کے نتائج کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہا ہے۔ کہ اگر ہاتھی کو آبائی جائداد مل گئی، تو وہ مغل شہزادہ بھی ہند سرکار پر یہ دعویٰ کر دے گا کہ ساری دہلی کی زمین اس کی آبائی جائداد ہے کیونکہ یہ اس کے مغل اجداد کی راجدھانی تھی۔ اور انھوں نے ساری دہلی پر جو کبھی جنگل تھی، ہاتھیوں، بھیڑیوں، چیتوں، شیروں اور لکڑ بگھوں کو باقاعدہ معاوضہ ادا کر کے حاصل کی تھی۔

(بشکریہ بیسویں صدی)

• رامش انصاری

جسے تو پسند کر لے وہ خطا خطا نہیں ہے
جسے میں پسند کر لوں وہ سزا سزا نہیں ہے
میری بیخودی مسلّم، مگر اتنا جانتا ہوں
مجھے دل نہ دے گواہی وہ تری صدا نہیں ہے
غم زندگی ٹھہر جا، غم یار کو بتا دوں
مرے پاس کیا بچا ہے، مرے پاس کیا نہیں ہے
مری بیخودی تو دیکھو میں اسی کو ڈھونڈتا ہوں
جو دل کی دھڑکنوں سے جو کبھی جدا نہیں ہے
وہ زندگی نہ جانے مجھے کب ملے گی رامش
وہ زندگی وہی ہے جو مرا خدا نہیں ہے

• رامش انصاری

ممکن نہیں کہ بات چڑھے اور ڈھل نہ جائے
نیرنگیٔ حیات اگر چال چل نہ جائے
بکھرا کے زلف جام کو چھلکا تو ساقیا
ذمہ مرا نہیں ہے جو موسم بدل نہ جائے
ممکن نہیں کہ ایک ہی رُخ پر ہوا چلے
دامن سمیٹے کہیں شعلوں سے جل نہ جائے
ساقی کے رنگ ڈھنگ نرالے ہیں ان دنوں
ہوشیار میکشو، کہیں آپس میں چل نہ جائے
رامش، غزل میں آپ جو چاہیں کہیں مگر
بس ایک شرط یہ ہے کہ حسنِ غزل نہ جائے

کایا پلٹ

مائل خیرآبادی

"ارے او بھلنے!"

سعید جاتے جاتے مڑا "جی امی جان!" وہ انوری کے پاس آگیا۔ "کیا بھول گیا میں؟"

"دلہن کی کنڈیا گھر ہی رہ گئی۔ جا۔ جلدی سے لے آ۔ شام تک یہاں ٹھہرنا ہے۔ منے کے کھلنے و چھنے اسی میں ہیں!"

"ابھی لایا امی!" سعید یہ جا وہ جا۔ سائیکل پر بیٹھا اڑن چھو ہو گیا۔ ابھی انوری کے منہ کا پان منہ ہی میں تھا کہ وہ کنڈیا لے کر آگیا۔

"امی اور کچھ؟"

"ہاں! یہ پیسے لے ہنٹر والے بسکٹ لے آ، منے کے لیے!"

سعید پیسے لے کر بازار گیا۔ بسکٹ لے آیا! اب انوری نے اُسے ایک نسخہ تھما دیا اور کہا دوڑ کر جا۔ میرے لئے یہ گولیاں لے آ۔ اب تو تم سعید کو بے چارا ہی کہو گی۔ ہاں وہ بے چارا گیا اور گولیاں بھی لے آیا۔ ماں کو دیں اور منتظر رہا کر ماں اُسے کچھ اور حکم دے۔ میں جل گئی۔ انوری کچھ سوچ رہی تھی کہ میں نے کہا "اب سعید سے دس بیس گھڑے پانی بھی بھروا لے کیا سعید کے پیروں میں بجلی باندھ کر لائی ہے۔ بار بار دوڑا رہی ہے۔ جا بیٹے جا، شکیل کے ساتھ کھیل کود!

پھر میں نے انوری سے کہا، یہ وہی سعید ہے جس سے تو دن رات نالاں رہتی تھی۔ وہ تیری بات اس کان سنتا اور اس کان اڑا دیتا تھا اب کیا جادو کر دیا اس سے زیادہ تو سعید بیٹا کہیں نظر نہیں آتا۔"

یہ جو میں نے انوری سے کہا تو وہ خوش ہونے کے بدلے کسی قدر اداس ہو گئی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے انگلی پھیری تو اس کی انگلی پر قطرے پھیل گئے تھے کہنے لگی یہ

"باجی! وہ جو تمہارے بھولے شاہ تھے نا! اللہ ان کو کروٹ کروٹ سکھ چین بخشے۔ جب تک زندہ رہے بیٹے کو لاڈ پیار میں نکما اور ڈھیٹ بنا دیا تھا۔ تم کو تو سب سنائی رہتی تھی۔ یاد تو ہوگا۔ اس دن دس بجے تک سعید گھر نہ آیا۔ میں بک جھک رہی تھی۔ وہ ہاں باجی! آپ کے بھولے شاہ صاحب تشریف لائے میری بک جھک سن کر سمجھ گئے کہ سعید ابھی تک نہیں آیا ہے۔ بولے کیوں اپنی زبان خراب کرتی ہو۔ ذرا صبر کرو۔ آنے دو نالائق کو آج ہاتھ پیر توڑ کر رکھ دوں گا۔"

باجی ہنسی آتی ہے۔ آپ بھی سنکر ہنسی تھیں اور اسی دن تو انھیں آپ نے بھولے شاہ کا لقب عطا فرمایا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد سعید آیا تو آں حضرت نے سعید کو بلایا۔ بڑے پیار سے پاس بٹھایا۔ ملاحظہ ہو۔ یہ ہاتھ پیر توڑ رہے ہیں۔ اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ فرمایا بیٹے آج بڑی دیر لگا دی۔ تمہاری امی بہت پریشان تھیں۔ بیٹے! تم دیر کرتے ہو تو وہ تمہاری محبت میں پاگل سی ہو جاتی ہیں کہنے لگتی ہیں۔ نہ جانے سعید کو کیا ہو گیا اگر ذرا دیر اور نہ آتے تو مجھے بھیجتیں کہ ڈھونڈ لاؤ۔

سعید ہنس دیا اور جا کر سو رہا۔ تمہارے بھولے شاہ صاحب مجھ سے کہنے لگے۔ "اب جلد آجایا کرے گا۔"

"ہاں! آ تو جایا کرے گا۔ لاڈ پیار میں لونڈے کو خراب کیے دیتے ہو۔ کچھ تو ڈانٹ دیا کرو!"

"اچھا خیر! اب تو وہ سو گیا۔ کل ڈانٹ دوں گا۔ میں نے تو اس خیال سے سخت سست نہیں کہا کہ تم کو دکھ ہوگا۔"

یہ ہوئی ایک بات! اور سنئے، ایک دن نالائق سینما دیکھنے چلا گیا اس دن تو میں نے کنڈی لگا لی اور طے کر لیا کہ نہ کھولوں گی۔ گیارہ بجے آیا باہر کی کنڈی بجائی۔ میں سوتی بن گئی۔ پھر کنڈی بجی۔ پھر بجی۔ میں نہ اٹھی تو حضرت بھولے شاہ چپکے سے اٹھے۔ میں نے کہا "کہاں چلے" بولے "آج ذرا اور ایک ہاتھ جھاڑ دوں گا۔ اب تو اس نے بہت پیر نکالے ہیں۔"

میں بھی پیچھے چلی۔ بھولے شاہ کے چہرے پہ غصے کے آثار رہے ہی تھے۔ میں سوچی۔ کہیں

ایسا ہوا تو ڈھنک کر رکھ دیں۔ میں پیچھے چلی۔
انھوں نے کنڈی کھولی۔ سعید اندر آیا۔ سنتی ہو باجی
تمہارے بھولے میاں نے کیا کہا اس سے بری
بات ہے سینما دیکھنا۔ بس آج ہوگیا۔ اب توبہ
کرو۔ دیکھا آپ نے یہ تھا ان کا لاڈ پیار۔
اس سلسلے میں بہت سے واقعات ہیں۔ ایک
بار تو حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ یاد ہے نا!
اسکول میں اپنے کسی ساتھی پر چاقو نکال لیا تھا
وہ تو کہیے ڈرل ماسٹر نے دوڑ کر چھین لیا
ورنہ خدا جانے کیا ہوتا۔ یہ خبر گھر پہنچی۔ میں
بدحواس ہوگئی۔ وہ کھانا کھا رہے تھے کھانا
بھولے۔ اٹھ کر بھاگے، مجھ سے کہا کہ
آج اس لونڈے کی بوٹیاں اُڑا دوں گا۔
اب سنئے، سنئے گیا۔ آپ بھی تو میرے
گھر آگئی تھیں۔ آپ نے دیکھا تھا کس طرح
سعید کی بوٹیاں اُڑائی تھیں۔ جیسے ہی گھر
آئے۔ آپ کو دیکھا۔ باجی السلام علیکم کہہ کر
بولے۔ "بالکل ناسمجھ ہے" پھر مجھ سے کہا
"وہ جو میں مٹھائی لایا تھا۔ ذرا سعید کو دے
دو۔ بہت بھوکا ہے۔ دیکھو تو چہرہ اترا
اترا لگتا ہے۔"
میں سُن کر رہ گئی۔ باجی تم نے یہی کہا تھا
"حشمت میاں! تم لاڈ پیار میں لونڈے کو
خراب کر دو گے۔"
"باجی آج میں نے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔
اب وہ اسم بامسمیٰ بن جائیگا۔"
"خاک منہ میں! خود تو شیطان بنا رہے ہیں
وہ اسم بامسمیٰ سعید بنے گا۔ گھر میں رہو تو پتہ چلے۔
دن بھر وہ اودھم مچاتا اور بھول جاتا ہے کہ
خدا کی پناہ۔ مر بھی نہیں جاتا کم بخت!"
"توبہ کرو بیگم۔ باجی آپ سعید کی ماں کو سمجھائیں
کیا کلمہ منہ سے نکال دیا۔ توبہ توبہ۔"
اس طرح عمر بھر بیٹے کی طرفداری کرتے
رہے۔ وہ ڈھیٹ ہوتا رہا۔ محلے میں روز
شکائتیں سننے میں آتیں۔ آج اس سے لڑا۔
کل اُسے پیٹا، پرسوں کہیں سے پٹ کر آیا۔ کہیں
کُرتہ پھٹا، کہیں پائجامہ نچوا کر آیا۔ آج ٹوپی
غائب۔ روز روز قلم دوات کاپی کے لیے
پیسوں کا سوال۔ میں تو بیزار ہوگئی۔ کبھی کوئی
کام کر کے نہ دیا۔ حد یہ ہوگئی کہ جب وہ بہار

ہوئے تو بھی اس کی آنکھیں نہ کھلیں۔ حکیم ڈاکٹر سے دوا لینے میں جاتی۔ اُسے کوئی غم ہی نہیں۔ باپ سے کبھی نہ پوچھا کیا حال ہے۔ شائد وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ کبھی مرے گا ہی نہیں لیکن اس بیماری سے باپ نہ اٹھ سکا۔ میں نے لاکھ دوا کی۔ سیکڑوں روپیہ اُٹھا ڈالا۔ ایک دن مجھے پاس بلایا۔ بولے "اب صبر کرو دعا دارو ختم کرو۔ ایسا لگتا ہے کہ آخری وقت ہے۔ سعید کو بلا دو۔"

میرا کلیجہ منھ کو آگیا۔ آنسو پوچھ کر اُٹھی۔ بجمّن کو بلانے بھیجا۔ نالائق۔ نہ جانے کس سے لڑا تھا۔ سارے کپڑے کسی نالی کے گندے پانی سے لت پت آیا۔ پوچھا "کیا ہے کیا؟" "ذرا دیر کے لیے باہر گیا تھا کہ بلا لیا۔" میں نے کہا "بیٹا! کبھی تو آدمی بن جاؤ۔ تمہارے ابا اللہ میاں کے یہاں جارہے ہیں۔ تم کو بلایا ہے۔"

باجی تم بھی تو آگئی تھیں۔ تمہارے سامنے سعید باپ کے پاس اٹھارہ برس میں پہلی بار خاموشی سے آیا۔ انھوں نے دیکھا۔ ہاتھ کے اشارے سے پاس بلایا۔ سانس تقریباً اکھڑ چکی تھی۔ بڑی مشکل سے یہ جملہ نکلا۔ "بیٹا ماں کو ناراض نہ کرنا۔ جنت ماں کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" یہ جملہ پورا نہ ہو سکا اور سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

کہرام پڑ گیا گھر میں۔ وہ پہلا دن تھا کہ سعید کو چپ دیکھا گیا۔ سب ہائے ہائے کر رہے تھے۔ رو رہے تھے۔ آنسو بہا رہے تھے۔ وہ گم صم نہ ہائے وائے۔ نہ آنسو۔ آسمان کی طرف نظر اُٹھ گئی تو ادھر ٹکٹکی بندھ گئی۔ کسی اور طرف دیکھا تو ادھر ہی دیکھتا رہا۔ جنازہ اُٹھا اُسے کچھ خبر نہ ہوئی۔ باجی تم نے ڈانٹا تھا۔ "نالائق! جنازے میں تو شریک ہوئے۔" کچھ کہے بنا چلا گیا۔ پھر واپس آیا۔ آکر اپنی چارپائی پر گرا۔ ایک بار "ہائے" اس کی زبان سے نکلی اور پھر گم صم۔ تم بھی گھبرا گئی تھیں۔ میں بھی اور جو لوگ تھے۔ وہ بھی دوڑ پڑے۔ ڈاکٹر بلا لیا گیا۔ اس نے دیکھا۔

"سخت صدمہ دل پر پہنچا ہے۔ خیر میں تدبیر کرتا ہوں۔" ڈاکٹر نے انجکشن لگایا۔ کچھ گولیاں دے گیا اور فیس لے کر چلا گیا۔ اب ہمیں اور آپ کو سعید کے لالے تھے۔ بڑی دعاؤں کے بعد خیر صبح تک ٹھیک ہو گیا۔

باجی! عالم الغیب تو اللہ ہے۔ میں کچھ نہ کہہ
سکی۔ کیسے کیا ہوا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، میرے
کوٹھے سے کوٹھا ملانے بیٹھا رہتا۔ ہر وقت گھر کا کام
دھام یا پڑھتا لکھتا۔ ابھی بازار سے آٹا لایا۔ ابھی
نمک، بار بار کہیں ڈھونڈا۔ کبھی "نہیں" "نہیں" کی۔
ہر وقت میری نگاہیں دیکھتا رہتا۔ ذرا کسی طرف
اشارہ کیا تیر کی طرح پہنچا۔ ذرا کہیں دیری اور
میری نظروں میں غصہ دیکھا تو توبہ تلا شروع
کر دی۔ امی معاف کر دو۔ اب جلدی آیا کروں
راشن ڈپو پر لائن لگی تھی۔ یوں دیر ہو گئی۔ باجی!
جانے کیسے سعید پیا پیا سعید ہو گیا۔ گھر گھر چرچے
ہونے لگے۔ ارے سعید تو نمازی ہو گیا۔ ارے
سعید نے روزے رکھے۔ ارے واہ! سعید
کیسا سعید بیٹا نکلا۔

اس سال میٹرک میں فرسٹ آیا۔ انعام
لیا۔ اس کے محنتی ہونے، با اخلاق ہونے اور
کام کاجی ہونے کی دھوم مچ گئی۔ انیسویں برس
میں تھا کہ ابھی سے پیغام آنے لگے۔ تم نے
بھی کہا کر بھی دو۔ گھر خالی خالی سا ہے۔ یہ کیا
ویرانی سی ہے۔ اری دلہن! ادھر دیکھو۔ بیٹے کو
سجا دے۔ ذرا اپنی خالہ اور میرے لیے پیا
بنالو۔ اور آج ہی تم نے دیکھ لیا۔ کتنی پیاری
تم کو بھی ترس آ گیا۔ اس سے پوچھا دلہن بتا
ئی کبھی، بہو ننھی، تنگ دلہن کو تمہیں کبھی
اتنا میں نے کہہ دیا تھا۔ سعید اپنی دلہن
بیاہ لائی ہوں۔ مجھے رسوا نہ کرنا۔ تو باجی!
کہتی ہے کہ دلہن تو بیٹے کے ابا ہیں اور میرا
شوہر ہوں۔ روز ایک نہ ایک بات سنا
ہے اور ہنستی ہے۔ بہت خوش ہے۔ با
آپ کی دلہن۔ میرا دل باغ باغ ہے۔

ہاں! اس دن ذرا روئی تھی۔ جب مجھے
بخار آ گیا۔ رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ سعید پر
کی طرح میری چارپائی کے آس پاس گھوم رہا
تھا۔ دلہن میرا سر دبا رہی تھی۔ پھر جب میں
سو گئی تو وہ میرے پیروں کی انگلیاں دبا رہا
تھا۔ نیند لگی تو وہ بھی سو گیا۔ جب میں جاگی
میرا پیر اس کے سینے پر تھا اور اس کے ہاتھ
میں میرے پاؤں کی انگلیاں۔

باجی! میں تو سمجھتی ہوں کہ نصیحت کا
اثر ہوتا ضرور ہے۔ تم انہیں بھولے شاہ کہ

تھیں۔ یہ تو اس سے بڑھ کر بھوا ہو گیا ان کی زندگی میں تو نہ بن سکا۔ وہ تو اللہ کو پیارے ہو گئے اور سعید کو اللہ کا پیارا بنا گئے۔ اور کیا عرض کروں۔ میں تو یہی سمجھ سکی ہوں۔

باجی اکی زبان سے نکلا۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ مجھے وہ یاد آرہے تھے۔ معلوم نہیں یہ آنسو ان کی یاد میں نکلے یا سعید کی سعادت مندی کی خوشی کے تھے۔

دلوں کو مُردہ کرنے والی آٹھ خصلتیں

حضرت ابراہیم بن ادہم سے کہا گیا کیا بات ہے کہ ہم دعائیں کرتے ہیں لیکن قبول نہیں ہوتیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا۔"

حضرت ابراہیم بن ادہم نے کہا تمہاری دعائیں اس لیے قبول نہیں ہوتی ہیں کہ تمہارے دل مُردہ ہو چکے ہیں۔ پوچھا گیا ہمارے دل کیوں مُردہ ہو گئے ہیں۔

حضرت ابراہیم بن ادہم نے کہا آٹھ خصلتیں دلوں کو مُردہ کرتی ہیں۔

۱۔ تم لوگوں نے اللہ کے حق کو پہچان لیا لیکن اسے ادا نہیں کرتے ہو۔

۲۔ تم لوگوں نے قرآن پاک پڑھ لیا ہے لیکن اس کے احکام پر عمل نہیں کرتے ہو۔

۳۔ تم لوگ کہتے ہو کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود سنت پر عمل نہیں کرتے ہو۔

۴۔ تم کہتے ہو ہم موت سے ڈرتے ہیں لیکن اس کے لیے تیاری نہیں کرتے ہو۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ شیطان تمہارا دشمن ہے اسے دشمن ہی بناؤ لیکن گناہ کرنے تم اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہو۔

۶۔ تم کہتے ہو کہ ہم جہنم سے ڈرتے ہیں لیکن اپنے جسموں کو اسی میں ڈال رہے ہیں۔

۷۔ تم کہتے ہو کہ ہم جنت کو پسند کرتے ہیں لیکن اس کے لیے کچھ نہیں کرتے ہیں۔

۸۔ تم جب اپنے بستروں سے اُٹھتے ہو تو اپنے عیوب کو پس پشت ڈال دیتے ہو، لوگوں کے عیوب کو نگاہوں کے سامنے رکھتے ہو۔ اس طرح اپنے رب کو تم خفا کرتے رہتے ہو تو ایسی حالت میں تمہاری دُعا کیسے قبول ہو سکتی ہے۔

اسلام نے کہا!

سب سے بڑی چیز تو بت پرستی تھی، جس کا رواج سیکڑوں برس سے چلا آرہا تھا۔ اسلام نے کہا کہ ان بتوں کو چھوڑ دو۔ شراب، زنا، جوا، چوری اور راہزنی عرب میں عام طور پر رائج تھی۔ اسلام نے کہا کہ ان سب کو ترک کرو۔ عورتیں عرب میں کھلی پھرتی تھیں۔ اسلام نے حکم دیا کہ پردہ کرو۔ عورتوں کو وراثت میں کوئی حصہ نہ دیا جاتا تھا، اسلام نے کہا کہ ان کا بھی وراثت میں حصہ ہے۔ متبنّیٰ کو وہی حیثیت دی جاتی تھی جو صلبی اولاد کی ہوتی ہے۔ اسلام نے کہا وہ صلبی اولاد کی طرح نہیں ہے بلکہ متبنّیٰ اگر اپنی بیوی کو چھوڑ دے تو اس سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ غرض کون سی پرانی رسم ایسی تھی جس کو توڑ دینے کا حکم اسلام نے نہ دیا ہو۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ جو لوگ خدا اور رسولؐ پر ایمان لائے تھے ان کا کیا طرزِ عمل تھا؟ صدیوں سے جن بتوں کو وہ ان کے باپ دادا سجدہ کرتے اور نذریں چڑھایا کرتے تھے، ان کو ان ایمان والوں نے اپنے ہاتھ سے توڑا۔ سیکڑوں برس سے جو خاندانی رسمیں چلی آتی تھیں۔ ان سب کو انھوں نے مٹا کر رکھ دیا۔ جن چیزوں کو وہ مقدس سمجھتے تھے، خدا کا حکم پاکر انھیں پاؤں تلے روند ڈالا۔ جن چیزوں کو وہ مکروہ سمجھتے تھے۔ خدا کا حکم آتے ہی ان کو جائز سمجھنے لگے۔ جو چیزیں صدیوں سے پاک سمجھی جاتی تھیں۔ وہ ایک دم ناپاک ہوگئیں۔ کفر کے جن طریقوں میں لذت اور فائدے کے سامان تھے۔ خدا کا حکم پاتے ہی ان کو چھوڑ دیا گیا اور اسلام کے جن احکام کی پابندی انسان پر شاق گزرتی ہے ان سب کو خوشی خوشی قبول کر لیا گیا ——— اس کا نام ہے ایمان!

(ابوالاعلیٰ مودودی)

بھول کے نقصانات

(فاطمہ نعل)

آلو کی چائے:۔

ایک بار ہماری امی نے صبح صبح اُٹھ کر آلو کے پراٹھے بنانے کو سوچا۔ انھوں نے اس کے ۔
پانی میں آلو ڈال کر آگ پر رکھدئے ۔جب پانی کھولنے لگا تو وہ یہ بھول گیئں کہ وہ آلو اُبال رہ
اس بھول کی وجہ سے پانی میں چائے ڈال دی اور اتار کر رکھدی۔ تھوڑی دیر کے بعد چا
کپ میں ڈالی تو اب آپ بتائیں کہ امی جان کی حالت کیا ہوئی ہوگی؟

مٹھائی کا ڈبہ

ایک بار خالو جان ہمارے یہاں آنے والے تھے لیکن انھوں نے ہمارا گھر نہیں دیکھا تھا پ
پر بتانے والے نے کہا کہ گلی کے سیدھے جانا۔جس گھر میں اونچی سیڑھیاں ہوں وہی ان کا گھر
ہمارے خالو جان بڑے ہی جلد باز اور بھلکڑ ہیں۔ دھیان سے سنے بغیر ہی وہ ایک دو
مکان میں سیڑھیاں دیکھ کر اندر گھس گئے اور وہاں بیٹھی عورت سے ان کا حال پوچھنے لگے م
کا ڈبہ بھی انھیں پکڑا دیا۔ وہ عورت بولی۔ معاف کرنا۔ میں آپ کو پہچان نہیں رہی ہوں
سن کر خالو جان چکرائے۔ اور پھر ہمارے ابو کا نام لے کر پوچھا کہ وہ یہیں رہتے ہیں کیا؟
اس نے عورت نے کہا وہ تو برابر والے مکان میں رہتے ہیں ۔
یہ سنکر خالو جان تیزی سے باہر نکلے اور یہ سوچنے لگے کہ اب مٹھائی لینے بازار جائیں
عورت سے مٹھائی کا ڈبہ واپس مانگیں۔

(فاطمہ زہرا، جامعۃ الصالحات، ملہ ودم)

شادی اور جہیز

شہباز امروہوی

(۱)

پھوٹی کوڑی بھی نہ ہو جیب میں جس مفلس کی   وہ زر و سیم کے انبار کہاں سے لائے
جوڑا بیٹی کا تو کرسکتا ہے بدبخت تلاش   جوڑا شادی کا طلاکار کہاں سے لائے

(۲)

دلہن تو مل گئی لیکن چبھن یہ ہے دل میں   دلہن کے ساتھ مگر، ٹھاٹھ کا جہیز نہیں
شعور، علم، حیا، حسن بھاڑ میں جائیں   کہ صوفہ، ریڈیو، موٹر، سنگھار میز نہیں

(۳)

لالچ سے زر و مال کے جو کرتا ہے شادی   ناری سے بھی بدتر مرے نزدیک وہ نر ہے
عورت کے بہلنے سے ہے دولت کا طلبگار   بیوی کی طرف پشت ہے، ٹی وی پہ نظر ہے

(۴)

فلاحِ قوم و وطن ہے اگر تجھے منظور   نہ لے جہیز کسی سے، نہ دے کسی کو جہیز
نہ کر زمانے کے رسم و رواج کی پروا   "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز"

(۵)

کیوں کر کروں میں دختر و فرزند کا نکاح   ہے جان اک عذاب میں مجھ بدنصیب کی
بیٹا اُسے امیر کا کرتا نہیں پسند   بیٹی اسے قبول نہیں ہے غریب کی

(۶)

جوڑا بی۔ اے اور ایم۔ اے کا ملانا ہے انہیں   دھیان یہ ماں باپ کو اب وقتِ شادی چاہیے
زاغ و طوطی ہم قفس ہو جائیں تو پروا نہیں   علم کے اس دور میں ڈگری کو ڈگری چاہیے

حکمت کی ڈائری

محمد رضی الدین اقبال

• پیپل کی کونپلیں سولہ دن کھانے سے ہر طرح کے دمہ کا دورہ کافور ہو جاتا ہے۔

• ضرورت سے زیادہ نمک کھانے سے معدہ اور پیشاب کی تھیلی کمزور ہو جاتی ہے اور بینائی میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔

• قبض دور کرنے کے لئے سبز ترکاریاں نہائت مفید ہیں۔

• لیموں کے چھلکے سے اگر روزانہ دانت صاف کئے جائیں تو ان میں کیڑا لگنے یا درد ہونے کا خطرہ نہیں رہتا۔ دانت چمکدار ہو جاتے ہیں۔

• گاجر وٹامنز کا خزانہ ہوتا ہے اس میں فولاد، چونا، فاسفورس، نشاستہ، شکر وغیرہ کے علاوہ وٹامن اے، بی، سی، پائے جاتے ہیں اس سے خون بڑھتا ہے۔ رنگ نکھرتا ہے اور صحت کے لیے

• کچھ دنوں تک مولی کا پانی پینے سے گردہ کی پتھری خارج ہو جاتی ہے۔

• جلی ہوئی ہلدی کا منجن دانتوں پر ملنے سے دانت مضبوط ہوتے ہیں۔

• راکھ میں نمک ملا کر شہد کے ساتھ چاٹنا بلغمی کھانسی میں نہائت مفید ہے۔

• امرود کے کچالو نمک اور شکر سے ملا کر بنایئے۔ مزیدار بھی اور قبض کے لئے مفید بھی۔

• ادرک کے ٹکڑوں پر لیموں کا رس اور نمک ڈال کر کھانے سے قبض دور ہوتا ہے۔

• سنترہ وٹامنز کا خزانہ ہے۔ دل و جگر کو طاقت بخشتا ہے۔

• پپیتہ بہترین غذا بھی ہے اور بہترین دوا بھی۔

(محمد رضی الدین اقبال)

(مرزا ریاض احمد)

کرامت

نذیر احمد اپنے ماموں محمد طفیل کے ساتھ کانونٹ سے پڑھ کر واپس آرہا تھا۔ ہفتے کی وجہ سے آج جلدی چھٹی ہوگئی تھی۔ سردیوں کا مہینہ تھا اور کل رات سے آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔ رات کے کسی حصے میں بارش بھی ہوئی تھی۔ جس سے موسم اور بھی سرد ہوگیا تھا۔ ناشتہ کرتے ہوئے نذیر نے اسکول نہ جانے کے لئے ضد کی تھی اور اس ضد کے کچھ اسباب بھی بتائے تھے، ایک تو یہی کہ آج ٹھنڈ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ آج اس کا اپنے بڑے بھائی بشیر احمد سے کیرم بورڈ کا ٹیسٹ میچ ہے جس کے لئے شرط بھی لگائی گئی تھی۔ کینٹین سے ایک پاؤ گاجر کا حلوہ اور آلوؤں بھرے دو عدد سموسے گرما گرم۔

ماں باپ نے بھی اپنے دلائل پیش کئے:

"پھر تو ڈاکٹر کیسے بنے گا؟"

"اسکول سے ناغہ تو نالائق لڑکے کرتے ہیں۔"

"آج تو ویسے بھی ہفتہ ہے آدھی چھٹی سارے ہی"

اس کے بڑے بھائی نے کہا: "میچ تو اسکول کے بعد بھی ہوسکتا ہے اور گرم گرم سموسے کینٹین پر شام ہی کو تیار ہوتے ہیں۔"

وہ ضدی بچہ نہ تھا مان گیا۔ دونوں... بھائیوں میں عمر کا صرف تین سال کا تو فرق تھا اس لئے ان میں دوستانہ بلکہ یارانہ زیادہ تھا۔ بابو عمر دین کی پہلے چار بیٹیاں تھیں اُوپر تلے کی چار بیٹیاں۔ پہلی بیٹی کی پیدائش پر وہ بہت خوش تھا۔ دوسری بیٹی آئی تو خاموش، تیسری بیٹی نے اُسے غمزدہ کر دیا تھا اور چوتھی بیٹی کی پیدائش پر وہ مایوس ہوگیا، مایوس اور ہراساں۔ اس کی پریشانی کی وجہ بالکل واضح تھی اور وہ تھی چار بیٹیوں کی شادیاں۔ ایک ایسا بوجھ جس کے متحمل اس کے کمزور کندھے نہ ہوسکتے تھے۔ وہ ایک کالج میں کلرک تھا قلیل آمدنی اور اتنا بڑا کنبہ، کوئی دوسرا

جائز یا ناجائز وسیلہ بھی نہ تھا جس محکمے میں وہ ملازمت کرتا تھا۔ رشوت کا وہاں تصور تک نہ تھا۔ اور ہوتا بھی، تو وہ اتنا کمینہ اور لالچی نہ تھا۔ وہ ایک دیانتدار، جنتی، اللہ سے ڈرنے والا شخص تھا اس کا دل مطمئن اور اس کا ضمیر دنیوی آلائشوں سے پاک تھا۔ پھر بھی انسان تھا اور انسان ہونے کے ناطے کمزوریوں کا شکار ہو جانا اس کے لئے بھی عین فطری تھا۔ دل کے ایک نامحسوس سے گوشے میں وہ ایک کمزوری کو مسلسل پال رہا تھا کبھی کبھار رات کے تاریک سناٹوں میں اُسے ایک خواہش سرسراتی سنائی دیتی۔ جب رات کے پچھلے پہر اس کی بیوی بصد حسرت و یاس اس کے کان میں سرگوشی کرتی "تمہیں بیٹے کی ضرورت نہ بھی ہو کہ اللہ کی یہی مرضی ہے۔ مگر بہنوں کو تو بھائیوں کا بڑا آسرا ہوتا ہے"

"مگر یہ بھی تو اللہ ہی کی مرضی سے ہوگا" وہ جواب دیتا۔

"اُسی سے مانگ رہی ہوں" وہ بڑے اعتماد سے کہتی "کسی پیر فقیر، تعویذ گنڈے سے نہیں صرف اُسی مولا سے۔ میں اس کے اور اُس کے درمیان کسی اور کو کیوں لاؤں گی؟ خلوص دل سے اُسی سے اپنا حق مانگوں گی" دونوں متوکل تھے۔ دونوں کی شب و روز کی دُعائیں اثر لائیں۔ شادی کے آٹھویں برس میں بشیر احمد پیدا ہوا اور پھر تین برس بعد نذیر احمد۔ غمزدگی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ مایوسیاں چھٹ گئیں، اُمیدیں بحال ہو گئیں۔

نذیر احمد کے پیدا ہونے کی خوشی عجیب تھی بے حد و حساب اس لئے کہ پہلے بیٹے کی وجہ سے وہ ایک بہت بڑے صدمے سے گزرے تھے گزر رہے تھے۔ تین برس کی عمر تک تو اس کے ماں باپ اور بہنوں نے اپنی چاہتوں اور محبتوں سے مجبور، اسے پاؤں بھی زمین پر نہ دھرنے دیا تھا۔ وہ ایک گود سے دوسری گود، ایک کے بازوؤں سے دوسرے کے بازوؤں میں رہا۔ وہ اُسے یوں احتیاط سے اُٹھاتے جیسے شیشے کا کھلونا ہو، ہلکی سی ضرب سے ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ بہنوں میں اس کے لئے تو لڑائیاں بھی ہوتیں یہاں تک کہ جس کا داؤ لگ رہا ہوتا، وہ ری، جھپٹ کے اُسے اُٹھا کے لے جاتی مگر اس

موقع انہیں کم ہی ملتا۔ ابھی تو ماں باپ ہی سیر نہیں ہوئے تھے۔ دفتر سے چھٹی کے بعد وہ باپ کے کندھوں پر رہتا۔ اور اس سے پہلے ماں کی آغوش میں۔ پھر ایک دن انہیں معاً احساس ہوا کہ وہ بڑا ہو گیا ہے۔ اتنا بڑا کہ اب اُسے اپنے قدموں سے چلنا پھرنا چاہیئے۔ اس کی بہنوں نے تو سال ڈیڑھ کی عمر ہی میں چلنا شروع کر دیا تھا بلکہ بھاگنے لگی تھیں، یہاں تک کہ ہمسائیوں نے کہا تھا زینت بہن تیری بیٹیاں تو بڑی تیز ہیں۔

پہلے پہل تو وہ اُسے اپنے لاڈلے بیٹے کی نازبرداریوں کا نتیجہ ہی سمجھتے رہے۔ مگر اب یہ بات تشویش کا باعث بن گئی تھی۔ لوگوں سے مشورے کئے۔ کچھ نے کہا بعض بچے پانچ پانچ سال کے ہو جاتے ہیں پھر کہیں چلنے لگتے ہیں۔ فکر کی بات نہیں۔ چند ایک نے تشویش ظاہر کی۔ ڈاکٹروں کو دکھایا۔ بڑی بڑی فیسیں بھر کر معائنے کئے گئے۔ پھر بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں تک پہنچے جنہوں نے آخر تشخیص کر دی کہ بشیر احمد پولیو کے مرض میں مبتلا ہے اور یہ کہ مرض لاعلاج ہے۔ بشیر احمد کی یہ معذوری عمر بھر رہے گی، وہ زندہ تو رہے گا مگر اپاہج بن کر، زندہ در گور!

عمر دین کے گھرانے کے لئے یہ ایک بہت بڑا حادثہ، بہت بڑا صدمہ تھا۔ مگر وہ مایوس نہ ہوئے۔ اس کا علاج کرتے رہے دن رات اس کی ناکارہ اور بے جان ٹانگوں پر مالشیں کرتے رہتے۔ مگر غم مستقل تھا اور اس غم کا دائرہ ہر لحظہ وسیع ہوتا جاتا تھا اور پھر ایسے وقت میں نذیر احمد آ گیا۔ نذیر احمد جو ہو بہو بھائی کا ہم شکل تھا اور اس نے اس حساس اور رنج زدہ گھرانے کو مایوسیوں کے اندھے غار سے نکال لیا۔ گھر کے لوگوں کی توجہ ایک بڑے غم سے ایک بڑی خوشی کی طرف ہو گئی۔ بشیر بھی سب کے جگر کا ٹکڑا تھا۔ مگر نذیر سب کی نگاہوں کا مرکز اور آرزوؤں کی منزل بن گیا۔ ڈیڑھ برس کی عمر میں جب وہ دوڑنے لگا۔ تو سب نے سکھ کا سانس لیا اور جب وہ پانچ برس سے کچھ کم کا ہوا تو اُسے انگریزی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اور ماں باپ اپنے وہ ارمان جو پہلے پورے نہ کر سکے تھے، اب ان کی تکمیل کا وقت آ گیا تھا۔

اسکول جاتے ہوئے اُسے پانچ چھ برس ہو گئے تھے، مگر اب بھی ہر روز صبح کے قریب یوں لگتا جیسے کوئی بچہ پہلی دفعہ اسکول جا رہا ہو۔ سارا گھر ایک سنسنی خیز مسرت ایک ہوش رُبا خوشی سے ہمکنار ہوتا۔ بہنیں ہیں کہ اس کا یونیفارم استری کر رہی ہیں۔ اس کا منہ دُھلا رہی ہیں۔ جوتے پالش کر رہی ہیں۔ ماں توسوں پر مکھن لگا رہی ہے۔ باپ اس کے لئے پیسے تلاش کر رہا ہے سارا گھر ایک دم الرٹ، تاکہ کوئی کمی نہ رہ جائے۔ یہاں تک کہ بشیر احمد بھی گھسٹ گھسٹ کر اس کی کتابیں بستے میں ڈال رہا ہے، کاپیاں تلاش کر رہا ہے اور اُسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا ہے۔ دونوں کو گویا ایک دوسرے سے عشق سا تھا۔ نذیر احمد اسکول سے واپس آکر بہت کم گھر سے نکلتا۔ بھائی ہی سے کھیلتا رہتا۔ اُسی کی فرمائش پر باپ نے بشیر احمد کو تین پہیوں والا ایک سائیکل لا دیا تھا جس سے اب وہ زیادہ متحرک ہو گیا تھا اور اپنی چھوٹی موٹی ضروریات کے لئے کسی دوسرے کا محتاج نہ رہا تھا چھوٹا اپنی کتابیں اُسے پڑھاتا اور گھر کے افراد نے دیکھا کہ بشیر احمد نے وہ کتابیں بڑی مہارت سے پڑھ لی ہیں۔ یہ احساس جہاں باعثِ خوشی تھا وہاں غم کو بڑھانے والا بھی تھا بشیر احمد ویسے بھی ایک ذہین اور سمجھ دار بچہ تھا۔ اس نے اب تک قرآن مجید کے دس پارے حفظ کر لئے تھے۔ اور گھر کے معاملات میں بڑی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتا تھا۔ مشورے بھی دیتا اور اُس کے مشورے صحیح ہوتے۔ گھر کے لوگ اس سے متاثر تھے۔ اس میں صلاحیتیں تھیں مگر کس کام کی! وہ انہیں کبھی بر روئے کار نہیں لا سکتا تھا۔ وہ ایک ایسا نخل تھا جو کبھی مراد تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ جو کبھی پھل نہ دے سکتا تھا۔ بلکہ آنے والے وقت میں وہ اس مفلس گھرانے پر ایک بوجھ بھی بن سکتا تھا۔ وہ ایک ایسا درخت تھا جسے کوڑھ ہو چکا تھا۔

مگر وہ ایسی باتیں نہ سوچتا تھا منفی سوچیں وہ طفل ضرور تھا، مگر دانا۔ وہ ماں باپ کے کام آنا چاہتا تھا۔ وہ ایک بے کار شے بن کر نہ رہنا چاہتا تھا۔ چھوٹے بھائی کی کتابیں پڑھنے سے اس میں حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اُس نے کتنی

مرتبہ اپنے والدین سے کہا کہ وہ اسے اسکول میں داخل کروادیں۔ اندھے لوگ بھی تو تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس نے نذیر احمد سے بھی سفارش کروائی تھی۔ مگر یہ سب کچھ ناقابلِ عمل سا لگتا تھا۔

اُس روز اسکول جاتے وقت نذیر احمد نے بشیر سے کہا: "اگر ابو نے تمہیں اسکول میں داخل نہ کرایا، تو میں بھی پڑھائی چھوڑ دوں گا۔ آخر اس میں رکاوٹ ہی کیا ہے؟ سائیکل پر میں ماموں کے پیچھے بیٹھ جایا کروں گا اور تم آگے۔ ہمارے ماموں جوان ہیں اور ہم دونوں تو ویسے بھی ہیں دُبلے پتلے۔" بشیر احمد آب دیدہ ہوگیا۔ وہ ہر روز اُسے گھر کے دروازے پر باہر گلی تک چھوڑنے آیا کرتا۔ اور جب تک وہ گلی کا موڑ مُڑ نہ جاتا، بشیر احمد اُسے دیکھتا رہتا اور اس کی واپسی کے وقت گھر کے دروازے پر اس کا انتظار کرتا۔ اور آج جب وہ اُسے وداع کر رہا تھا تو اُس کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ اسے اپنی محرومی کا خیال آرہا تھا یا کوئی اور ہی جذبہ تھا۔!

ہفتے کی وجہ سے جلد ہی چھٹی ہوگئی تھی اور وہ اسے ماموں طفیل کے ساتھ واپس آرہا تھا کہ ایک ٹرک کے ساتھ تصادم ہوگیا۔ رات کی بارش کی وجہ سے پھسلن تھی۔ موڑ مُڑتے ہوئے اچانک سامنے سے ایک تیز رفتار ٹرک آگیا۔ اُسے بھی اسی طرف مُڑنا تھا۔ ٹرک والا اپنے پر قابو نہ رکھ سکا۔ اور ٹرک سائیکل کو روندتا ہوا ایک درخت سے ٹکرا گیا۔ طفیل دور جاگرا مگر نذیر، ٹرک کے بھاری پہیوں تلے کُچلا گیا اور وہیں جاں بحق ہوگیا۔ حادثہ کالج سے چند گز کے فاصلے پر ہوا تھا۔ دھماکے کی آواز سے سارا کالج اس طرف بھاگ نکلا اور پھر دم بخود رہ گیا۔ کچھ لڑکوں کی خوف اور دہشت کے مارے چیخیں نکل گئیں۔

بابو عمر دین کو یہ خبر اس کی میز پر ملی۔ وہ حسبِ معمول اپنے کام میں مستغرق تھا۔ یہاں تک کہ دھماکے کی آواز سے بھی بے خبر رہا۔ طلبہ کا ایک ہجوم اس کے کمرے میں جمع ہوگیا تھا۔ مگر سب کے سب خاموش۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ یہ جانکاہ خبر اس تک پہنچائے۔ "کوئی مسئلہ ہے تمہارا، کوئی پرابلم؟" اس نے اپنی عادت کے [illegible]

کے ساتھ اس کا رویہ ہمیشہ مشفقانہ اور سلوک پدرانہ رہا تھا۔ اسی لئے کالج کے تمام لڑکے اس کی تعظیم کرتے تھے۔

پھر پرنسپل صاحب کمرے میں آگئے۔ وہ خود اس وقت غم سے مغلوب تھے۔ انھوں نے اُسے دلاسا دیا اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں نامکمل سی خبر سُنا دی۔ عمردین گویا منجمد سا ہو گیا وہیں اپنی کُرسی میں دم بخود اور مفلوج سا اور بٹ بٹ سب کی طرف دیکھنے لگا، پاگلوں کی طرح، پھٹی پھٹی نگاہوں اور ایک تھکے ہوئے نڈھال چہرے کے ساتھ۔

"میں لُٹ گیا پرنسپل صاحب، برباد ہو گیا ہم لُٹ گئے، اب کیا ہوگا؟"

"نہیں بابوجی، اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیئے۔ تمہارے دوسرے بچے بھی تو ہیں"۔ اور پھر اس نے طلبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ بھی تو تمہارے ہی بچے ہیں"۔ طلبہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

پولیس نے اپنی کارروائی مکمل کرلی۔ بابو عمردین نے ٹرک ڈرائیور کو معاف کر دیا۔

طفیل کو ہسپتال پہنچا دیا گیا اور نذیر احمد کی مسخ شدہ لاش گھر لے آئے۔

گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ دردناک بین فلک شگاف چیخیں، سینہ کوبی کی وحشت اثر آوازیں، بے قابو صدائیں، بے ضبط فغاں، گویا کہ ایک قیامت بپا تھی۔ کالج بند کر دیا گیا تھا۔ مگر لڑکوں کی بیشتر تعداد گھروں کو جانے کے بجائے بابوجی کے گھر آگئی تھی چند لمحوں میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ وہ سب سوچ رہے تھے۔ بابو عمردین جو پچاس سال کا تھا۔ ایک دم سو برس کا لگنے لگ گیا تھا۔ بہنیں اپنے نہایت پیارے ننھے منے بھائی کی جُدائی کے غم میں نڈھال ہو رہی تھیں۔ عمردین کی توکل اور متدین بیوی اپنے اللہ سے شکوہ کُناں تھی اور اس شکوے میں عجز نہیں تھا، سمجھوتہ بھی نہیں تھا سرکشی تھی، بغاوت تھی۔

ہمارے پیارے نبیؐ کو مولا نے دو بیٹے دیئے اور دونوں واپس لے لئے، تیرے پاس ایک تو ہے۔ عورتیں اُسے سمجھاتیں۔

"مگر وہ پیغمبروں کا صبر و تحمل کہاں سے

لاؤں؟ وہ انھیں جواب دیتی اور ماتم کرنے لگتی مگر کسی کو کہاں ہوش تھا اور کسی کو کہاں علم تھا کہ گھر کے ایک سنسان گوشے میں بشیر احمد پر کیا گزر رہی ہے۔ نذیر احمد اس کا چھوٹا بھائی ہی نہ تھا اس کا دوست، غمگسار، ہمدرد اور سب سے بڑی پناہ تھا۔ بشیر احمد کا رُواں رُواں شدتِ غم سے لرز رہا تھا۔ اس کی شریانوں میں لہو کی گردش بند ہو رہی تھی۔ اس کے سینے میں بار بار درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اتنے بڑے غم کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ کیا کرے۔ وہ جنازے کے ساتھ بھی نہ جا سکا، مگر جنازہ اُٹھنے سے پہلے وہ دیر تک لاش سے لپٹ کے دھاڑیں مار مار کر روتا رہا تھا۔

رات آ گئی، منحوس رات، سنسان اور ویران رات، اندھیری رات، سیاہ اندھیری رات۔ اور ہر لحظہ تاریکی بڑھتی چلی گئی۔ اس زود رنج اور حساس گھرانے کو یوں لگ رہا تھا جیسے انھیں ایک ساتھ ایک قبر میں ڈال دیا گیا ہو۔ اُمید کا اتنا روشن چراغ بجھ گیا تھا۔ گھر کے بلب روشن تھے، مگر اُن میں روشنی نہ تھی۔ گھر میں سب لوگ موجود تھے۔ مگر خالی لگ رہا تھا اور لمحہ لمحہ، لحظہ لحظہ، دم بہ دم یہ خلا بڑھتا جا رہا تھا، پھیلتا جا رہا تھا اور ہر شئے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ کسی نے کچھ کھایا نہ پیا، چُپ چاپ سائے سے اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹ رہے۔ کبھی کبھار کوئی دل خراش چیخ کمرے کے کسی حصے میں سے اُٹھتی اور اس خموشی کو توڑتی خوفزدہ کرتی اور پھر سسکیاں اور آہیں، یوں لگتا جیسے سارے گھر پر نزع کا عالم طاری ہے۔

وقت چنگیز بھی ہے اور مسیحا بھی، ضرب بھی لگاتا ہے اور مرہم بھی۔ رات کے آخری حصے میں بشیر کو لگا جیسے سب کی آنکھ لگ گئی ہے یا پھر اضمحلال کے باعث غنودگی کا عالم ہے صرف وہ جاگ رہا تھا، وہ جس کا نقصان سب سے زیادہ تھا، وہ جس کا المیہ سب سے شدید تھا تمام رات وہ سوچتا رہا ایسی سوچیں جو کبھی تکمیل نہیں پا سکتیں، وہ خواب جو کبھی پورے نہیں ہو سکتے۔ آرزوئیں جو ہمیشہ ادھوری رہیں گی اس نے کتنا کچھ سوچا، کتنے جذبے اس کے دل و دماغ میں بیدار ہوئے، کتنی اُمنگیں جاگیں،

وہ کبھی کسی طور نذیر احمد کی جگہ لے سکتا ہے، نہیں
ہرگز نہیں! تمام رات وہ اپنے غم اور اپنی بے بسی
پر آنسو بہاتا رہا، اپنی بے چارگی پہ روتا رہا۔

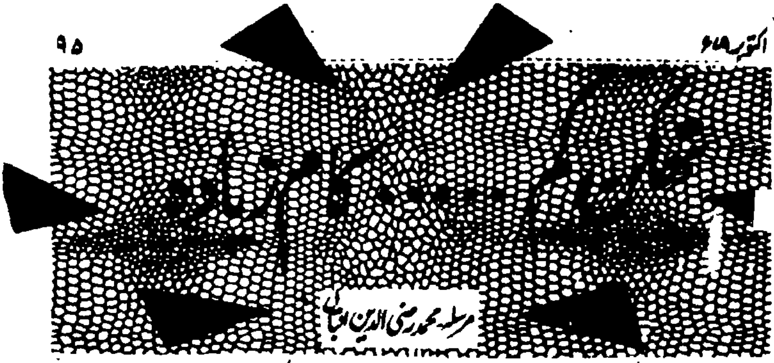
صبح ابھی پورے طور پر نمودار نہ ہوئی تھی
شاید ابھی رات کا پچھلا پہر تھا۔ دروازے پر اُسے
دستک سُنائی دی اور اُسے یوں لگا جیسے نذیر
دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو۔ باہر غضب کی سردی میں
جانے وہ کب سے کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا بشیر
نے یہ سب کچھ پورے ایقان کے ساتھ محسوس کیا
اور فوراً اُٹھ کر دروازے کی سمت فرطِ شوق سے
بھاگا اور کسی توقف کے بغیر دروازہ کھول دیا۔
مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ اُس نے دُور دُور تک پھیلے
ہوئے اندھیرے میں جھانک کر دیکھا مگر سچ مچ
وہاں کوئی نہ تھا۔ مایوس ہو کر اُس نے دروازہ
بند کر کے چٹخنی چڑھا دی اور واپس ہوا تو اُس
نے محسوس کیا جیسے وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو۔
بغیر کسی سہارے کے۔ اُس نے نیچے دیکھا۔ وہ
سچ مچ اپنی ٹانگوں پر کھڑا تھا۔ اُسے ان میں
اپنے سارے جسم میں ایک قوت کا احساس ہوا
جیسے مُردہ رگوں [illegible]

لگا ہو، وہ حقیقت اور خواب، خواہش اور سراب
کے دوراہے پر کھڑا تھا۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ
ابھی گر پڑے گا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے قدم
اُٹھایا تو اپنے قدموں کے نیچے سخت زمین
محسوس کی۔ پھر دوسرا قدم اُٹھایا، تو لڑکھڑاتے
ہوئے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور پھر تیسرا اور
چوتھا قدم....

ایک چیخ اس کے حلق سے نکلی۔ گھر کے لوگ
جاگ اُٹھے وہ اپنے باپ کے سرہانے کھڑا اُسے
جھنجھوڑ رہا تھا۔ وہ لوگ اُٹھے، تو وہ فرطِ مسرت
سے اپنے پاؤں زمین پر مارنے اور چیخنے لگا،
گھر کے لوگ حیرت و استعجاب، ایک ناقابلِ یقین
اور ناقابلِ بیان خوشی سے مبہوت اور دم بخود
رہ گئے۔

"ابو میں چل سکتا ہوں، امی میں چل سکتا
ہوں، میں دوڑ سکتا ہوں۔" وہ کہتا چلا گیا "سچ
مچ چل سکتا ہوں، آپا، باجی دیکھو، مجھے
دیکھو۔"

ابھی کچھ دیر پہلے صبح کی اذان ہوئی تھی
[illegible]



یہ ہر انسان کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ زیادہ کام کرے اور تھکن کم ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے معمولات پر نظرثانی کرے۔ ڈاکٹروں کی رائے میں کھانا کھانے کے بعد آدھا گھنٹہ آنکھیں بند کرکے لیٹ جانے سے اتنا ہی فائدہ ہوتا ہے جتنا سات کو تین گھنٹے سونے سے۔ اگر آپ یہ طریقہ اپنائیں گے تو آپ کو بہت کم نیند کی ضرورت پڑے گی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انھیں بہت کم سونے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسی طرح کچھ دیر آرام کر لیا کرتے ہیں پوری رات سونے سے جتنا فائدہ حاصل ہوتا ہے اتنا مندرجہ ذیل طریقے پر عمل کرکے بھی حاصل کیا جاتا ہے۔ جو شخص رات بھر اپنی معروفیات کی بنا پر سو نہیں سکتا وہ اگر اس طرح آرام کرے تو بھلا چنگا رہ سکتا ہے۔

غیرضروری دباؤ اور تیزی سے کام کرنے سے تھکاوٹ جلد آتی ہے اور کام بھی بہتر نہیں ہوتا۔ بلکہ خود لوگ بیچ بیچ میں آرام کرکے کام کرتے ہیں، گہرے مطالعہ سے علم ہوا ہے کہ وہ تیز رفتار کام کرنے والوں سے زیادہ اچھا کام کرتے ہیں۔

نیز ہر کام خوش دلی اور اطمینان سے کرنا چاہیے۔ بیزاری سے کیا ہوا تھوڑا کام بھی بہتر نہیں ہوتا۔ مزاج میں تھکن اور چڑچڑاپن آجاتا ہے۔ اگر پوری توجہ خوشی سے ڈھیر سا کام بھی کریں تو وہ منٹوں میں تکمیل پا جاتا ہے۔ کوئی تھکن نہیں ہوتی اور اپنے

ذہن ۔۔۔

جب آپ اتنے تھک جائیں تو اُسے فوراً چھوڑ دیجئے۔ کہ بیزاری سے کام کی تکمیل کا بوجھ کرنے سے کام بگڑ جاتا ہے۔

اس کام کے بجائے کچھ آرام کریں۔ باغبانی، کھیل کود، گھر کی آرائش یا اپنے پسندیدہ دوسرے کام میں لگ جایئے۔ تو آپ کو بہت سکون اور آرام حاصل ہوگا۔ کام سے فارغ ہو کر منہ، ہاتھ، پاؤں دھولیں تو طبیعت میں تازگی آجاتی ہے۔

بزرگوں کی یہ بات بھی بڑی سچی ہے کہ کام کی سختی سے گھبرانا، اُس کا خیال ہی کر کے پریشان ہونا اور اس سے بھاگنا زیادہ تھکاوٹ کا باعث ہوتا ہے۔ ہر کام کو اللہ کا نام لے کر پورے یقین اور بھروسے کے ساتھ شروع کریں۔ اگر مشکل کام کو آپ پہلے ہاتھ لگائیں اور پھر آسان کاموں کی طرف توجہ کریں۔ تو سب کام آسان ہو جائیں گے۔

اور اس طرح آپ زیادہ کام کرنے پر بھی بہت کم تھکیں گے۔ شرط یہ ہے کہ ہر کام کا آغاز اللہ کے نام سے ہو۔ اور پورے یقین وانہماک سے جستجو و تکمیل ہوتی رہے۔

قیلولہ

(لبنیٰ۔ ایم۔ اے)

جب انسان محنت کرتا ہے تو خون کا دوران آنتوں کی طرف بہت کم اور ہاتھ پیروں کی طرف بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر لیٹنے سے خون کا بہاؤ تھوڑی دیر کے لیے آنتوں کی طرف زیادہ ہو جاتا ہے جس سے آنتوں میں کھانے کو ہضم کرنے والے رس بہت مناسب مقدار میں پیدا ہو جاتے ہیں اور کھانے کو اچھی طرح ہضم ہونے میں مدد کرتے ہیں۔

جو شخص آدھا پیٹ کھانا اور قیلولہ کا عادی ہو وہ انشاء اللہ کبھی کسی مرض کا مریض نہیں ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ قیلولہ کرنا سنت ہے۔



اللہ کی نعمتیں

یہ معلوماتی مضمون حلقہ حجاب کی بہنیں خاص طور پر پسند کریں گی (م ر)

یوں تو ہندوستان میں بھی کہیں کہیں گرم پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں مگر نیوزی لینڈ کے شمال میں ایک ایسا لمبا چوڑا علاقہ ہے جہاں دھرتی سے ٹھنڈا نہیں بلکہ گرم پانی ہی نکلتا ہے۔ اور گرم بھی اس قدر زیادہ کہ آپ اس پر کھانے پینے کی کوئی بھی چیز نہایت آسانی سے پکا سکتے ہیں۔

میوری لوگ جو کہ نیوزی لینڈ کے قدیم باشندے ہیں اسی پانی کے سہارے جیتے ہیں۔ گرم پانی کے چشموں کی بہتات کے باعث اس علاقہ میں ایک ضلع کا نام ہی ہاٹ سپرنگ ڈسٹرکٹ ہے۔ ان چشموں میں پانی کھولتا رہتا ہے۔ اور کئی جگہ تو چشموں کے کناروں پر کیچڑ تیز حرارت کے باعث یوں اُبلتی ہے جیسے کسی بڑے پتیلے میں دلیا پکایا جا رہا ہو۔

دراصل یہ سارا علاقہ پہاڑی ہے اور یہاں کے پہاڑ بھی آتش فشاں ہیں جن کی تہہ میں لاوا اُبلتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس علاقہ میں آئے دن زلزلے آتے رہتے ہیں۔ تباہی سے بچنے کے لئے لوگ لکڑی کے مکانوں میں رہتے ہیں جن کے گرنے سے پکے مکانوں کی نسبت جانی نقصان کا اندیشہ کم رہتا ہے۔

ایک انگریز مصنف مسٹر براؤن نے اس علاقہ کا دورہ کر کے تمام حالات قلم بند کئے اور پھر ان کو دو جلدوں میں شائع کیا۔

کتاب کے دوسرے حصے میں اپنے سفرنامہ کے حالات بیان کرتے ہوئے وہ یوں رقم طراز ہیں۔ جس روز میں اس علاقہ میں پہنچا اس دن اتوار تھا۔ میوری قبائل کے اس گاؤں میں میری ایک دوست رہتی تھی اس نے میرا استقبال کیا اور بولی: "کیا آپ یہاں کے چشمے دیکھیں گے۔

میں نے کہا۔ "ہاں"۔

اُس نے کہا "آؤ میرے ساتھ!"

وہ مجھے لے کر چلی۔ اور چلتے چلتے ایک قبر کے پاس رُک گئی۔ اور بولی: ۔ "یہ دیکھو، ایک نیا چشمہ! جب میں چند روز پہلے ادھر سے گزری تھی تو اس کا نام و نشان تک نہ تھا۔" میں نے قریب سے دیکھا تو واقعی چشمے سے بھاپ نکل رہی تھی۔ کسی شخص نے اُسے ایک بہت بڑی سِل سے ڈھک دیا تھا مبادا کوئی راہگیر انجانے میں بیچ میں جا پڑے۔ سِل کے نیچے پانی کے کھولنے کی آواز بخوبی سُنائی دے رہی تھی۔

یہاں راتوں رات ایسے چشمے نمو ہیں۔" اس نے آگے چلتے ہوئے کہا۔ "زیر لاوے نے اس سارے علاقے کو کھوکھ رکھا تھا۔" تھوڑی دیر بعد چلتے چلتے بھی یہی محسوس کیا گویا قدموں کے نیچے دھنس رہی ہے اس علاقے کے لوگ کے وقت بہت احتیاط سے چلتے ہیں۔ کسی بھی جگہ کسی بھی وقت کوئی بھی نیا میں آسکتا ہے۔

"کیا ایسے علاقے میں رہائش انتہ خطرناک نہیں۔"؟

"بالکل نہیں۔" میری میزبان نے جوا خاص کر میوری لوگ تو بالکل نہیں۔ وہ تو اس ماحول سے مانوس ہو چکے ہ مکان ان گرم چشموں کے عین کنارے ہیں کیونکہ یہ پانی اُن کے لئے بڑے ان چشموں کی بدولت انہیں باورچی خ ہے نہ غسلخانہ۔ چشموں کے اُبلتے پانی دونوں ضروریات پوری کر لیتے ہیں

کھانے کے بعد ہم لوگوں نے پکنک منانے کے لئے نزدیکی میوری گاؤں واکر دیر یوا جانے کا پروگرام بنایا۔ میوری قبائل اس گاؤں کو واکا کہتے ہیں۔ ہم لوگوں نے چلتے وقت چائے کا پیکٹ اور دیگر رسد اپنے تھیلوں میں ڈال لیں۔ مگر اسے پکانے کا کوئی سامان مثلاً سٹوو وغیرہ ساتھ نہ لیا۔ تھوڑی سی ہی دیر میں ہم واکا جا پہنچے۔ میری میزبان مجھے اپنی ایک واقف کار میوری عورت کے ہاں لے گئی۔ یہ عورت ایک لکڑی کے کھوکھے میں رہتی تھی۔ جو گرم چشمے کے کنارے واقع تھا۔ اس نے ہمارا پُرتپاک استقبال کیا اور منٹوں میں چائے تیار کر کے لے آئی۔ میں حیران رہ گیا کہ مکان میں کوئی باورچی خانہ ہے نہ چولہا آگ نہ گیس، یہ چائے کیسے تیار ہو گئی۔ قبائلی عورت نے میری حیرانی کو بھانپ لیا اور بولی "کہ ہم لوگ کیتلی میں چائے پانی ڈال کر اسے چشمے کے کھولتے پانی پر رکھ دیتے ہیں اور چند سیکنڈ میں چائے تیار ہو جاتی ہے اس نے مزید بتایا کہ صرف چائے ہی نہیں ان.... چشموں میں آپ کھانے کی دیگر چیزیں بھی نہایت آسانی سے پکا سکتے ہیں مثلاً گوشت دال، سبزی، ترکاری اور چاول وغیرہ ہم لوگوں کے پاس ککر نہیں ہیں لیکن ہم ککر کا کام فلیکس کے بنے تھیلوں سے لیتے ہیں۔ ان تھیلوں میں کچی رسد ڈال کر اُبلتے چشمے میں ڈال دی جاتی ہے اور مقررہ وقت پر اُسے باہر نکال لیا جاتا ہے۔ مطلوبہ چیز پک جاتی ہے اور اس کا ذائقہ بھی بڑا لذیذ ہوتا ہے۔ گرم پانی کے ان چشموں کی بدولت میوری قبیلہ ایندھن سے بے نیاز ہے۔ جہاں تک نہانے اور کپڑے وغیرہ دھونے کا تعلق ہے اس کے لئے کچھ چشمے مخصوص ہیں نیم گرم پانی والے چشمے غسلخانہ کا کام دیتے ہیں اور وہیں میوری عورتیں کپڑے لتے دھو لیتی ہیں۔ کپڑوں کو صاف کرنے کے لئے ان لوگوں کو صابن برتنا پڑتا ہے نہ سرف اور نہ ٹینوپال بلکہ کئی ایک چشموں کے پانی میں ایسا تیزابی مادہ پایا جاتا ہے جو میل کو دور کر کے کپڑے کو نکھار دیتا ہے

میری میزبان نے مجھے بتایا کہ کھانا پکانے کپڑے دھونے اور نہانے کے علاوہ ان چشموں کے طبی فائدے بھی ہیں۔ مثال کے طور پر اس علاقے میں

کئی ایک چشمے ایسے ہیں جن کے پانی سے نہا کر بہت
سے جلدی امراض سے نجات ملتی ہے. کئی لوگ
جنہیں خارش، داد، چمبل وغیرہ کا عارضہ لاحق
ہوتا ہے یہاں آکر چند خاص چشموں کے پانی
سے اپنے جسم کے متاثرہ حصوں کو دھو لیتے
ہیں اور دو چار بار کے عمل سے انہیں کافی
افاقہ ہو جاتا ہے کہتے ہیں کہ ان چشموں میں کئی
ایک کے پانی میں گندھک اور سلفر کی آمیزش
ہوتی ہے جن سے چرم ردگوں کا ناش ہوتا ہے

مسٹر براؤن نے سیوری قبائل کے اس علاقے
عجائبات عالم میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے
اس علاقہ کے دورہ سے ان کے تجربات
مشاہدات میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے.
لوگوں کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کسی
کی آب و ہوا جغرافیائی ماحول اور قدرت
طرف سے فراہم کردہ ذرائع کے مطابق
کے لوگوں کی جسمانی و ذہنی ساخت ڈھلتی
انکی یہ ساخت انکے لئے ہر طرح مکمل اور بے احتیاج ہوتی

بُوا کی باتیں

"ہائے ری بوا! یہ کیا لاکر ڈھیر کردیا۔ کون اسے کھائے گا!"

"بی بی! تم کھاؤگی، تمہارے میاں کھائیں گے۔ میں کھاؤں گی!"

"تو اتنا ڈھیر سا کون کھائے گا۔ سارا گوشت پھینک کر جائے گا!"

"تو بی بی! پھینک کر کیوں جائے گا؟ کچھ پڑوس میں بھتو بی کے بھیجدو۔ آٹھ دس ریشے دار بوٹیاں میں نکالے لیتی ہوں۔ صبح کباب بناؤں گی!"

"پکے گوشت کے کباب؟"

"ہاں بی بی! میں نے تمہاری خالہ سے لاکھ کہا کہ بس بس! مگر انھوں نے پتیلی بھر بھیج دیا۔ بی بی! اپوری یکسنا گئی ان کے۔ تو پھر انھوں نے گھر گھر بھجوا دی۔ اور سنو تو! انھوں نے ہی کباب والی بات بتائی۔"

"اچھا تو وہ کیسے؟"

"صبح دیکھنا!"

اور پھر صبح بوا نے پکی ہوئی بوٹیاں پیس ڈالیں۔ دو منٹ میں پیس کر ہری مرچیں اور نمک ملایا، کباب تلے پھر جو ہم نے کھائے تو مزہ آگیا۔

بوا بولیں: "کہو بی بی! کیسے رہے کباب؟"

میں نے کہا، "کم قیمت بالا نشین" اور ہم سب ہنسنے لگے۔ خالہ کے یہاں کہلا بھیجا۔ باسی گوشت ہو تو اور بھیج دیں۔

مکھیاں بھی جاسوسی کرتی ہیں!

فرید احمد مبارکپوری

اکثر کہا جاتا ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ راز کی بات آہستہ کہیئے کہ شائد دیوار کے پیچھے کھڑا کوئی آپ کی بات سن رہا ہو۔ دیوار سے آپ ڈریں نہ ڈریں مگر اب آپ کو مکھیوں سے ڈر کر ضرور رہنا چاہیئے کیونکہ آج کل مکھیوں کے دو عدد کان ہوتے ہیں بلکہ منہ بھی زبان بھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے راز کی بھنک ان کے کانوں تک پہنچ جائے اور پھر یقین کیجئے کہ آپ کی بات آپ کے دشمنوں کے ہاتھ میں ہوگی اور آپ کا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔

یہ کوئی گپ نہیں بلکہ حقیقت ہے مکھیوں کو جاسوسی کے لئے تربیت دینے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ کیلی فورنیا کا ایک سائنسداں جیمس ایونگ مکھیوں پر ایک عجیب و غریب اور بڑا ہی دلچسپ تجربہ کر رہا ہے بلکہ وہ اس تجربہ میں کامیابی بھی حاصل کر چکا ہے۔

اس نے ایک بڑی مکھی کی دم پر ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر جو چاول سے بھی چھوٹا تھا نصب کیا اور پن کے سر برابر مائیکروفون اس سے جوڑ دیا۔ اس نے اس مکھی کو اس کمرے میں چھوڑ دیا جہاں چند آدمی گفتگو کر رہے تھے اور اس نے دیکھا کہ ان کی یہ گفتگو اس کے پاس بالکل صاف اور واضح پہنچ رہی تھی۔ یہ جاسوس مکھی چھ فٹ کی دوری سے بات سن سکتی ہے اور کمرے سے باہر بیس تیس گز تک ٹرانسمٹ کر سکتی ہے۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ امریکہ دوسرے یورپی ملکوں میں دوسروں کے راز کا پتہ لگانے کا عام خبط ہے۔ سرکاری ادارے کاروباری فرمیں وا کمپنیاں کسی نہ کسی قسم کی

ہیں مصروف رہتی ہیں۔ کسی کو کاسہ باری راز معلوم
رنے ہیں تو کسی کو نئے نئے ایٹمی ہتھیاروں کے
بنانے کے طریقوں کی کھوج ہے۔

اسی لئے تمام ترمیں، ایجنسیاں، سرکاری
ادارے خفیہ کانفرنسیں کرتے وقت نہایت
محتاط رہتے ہیں جہاں کانفرنس ہو رہی ہے اس
کا اچھی طرح جائزہ لے لیا جاتا ہے کہ کہیں
کسی جگہ مائیکروفون یا ٹرانسمیٹر وغیرہ تو چھپا
نہیں ہے۔

جاسوسی مکھی ایجاد کرکے سائنسدانوں
اب جاسوسی کو بہت آسان کر دیا ہے بقول
...ن ایونگ کے اب ٹرانسمیٹر اور مائیکروفون
لیس مکھی کو کسی بھی سوراخ، روشن دان
...ڑکی یا تالے کے سوراخ سے اندر داخل کیا
جاتا ہے۔ آلات کو مکھی کی دم سے چپکا دیا
جاتا ہے اس کے بعد مکھی کو ایسے زہر کی ایک
...ے دے کر جس کے اثر سے مکھی چند منٹ
...اتی ہے۔ کمرے میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور
...ا مر کر کسی میز یا کرسی کے نیچے گر جاتی ہے
جاسوسی کا کام شروع ہو جاتا ہے اس

کی دم میں لگا ٹرانسمیٹر چار گھنٹے تک برابر کام کرتا
رہتا ہے۔ اس کے بعد بیٹری کام کرنا بند کر دیتی
ہے۔ بیٹری کے بند ہو جانے سے ٹرانسمیٹر بھی
ختم ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس سے کوئی کام نہیں
لیا جا سکتا۔

اس اہم پروجیکٹ میں مصروف سائنسدانوں
کا خیال ہے کہ جاسوس مکھی کو اور بھی زیادہ مفید
اور اس کی کارکردگی کو بہتر بنایا جا سکتا ہے مثلاً
وہ اس امکان کے بارے میں بھی سوچ رہے ہیں
کہ جاسوس مکھیاں صرف مطلوبہ و مقررہ وقت پر
ہی پہنچیں۔ ان کو انسانی پسینے کی پہچان میں ماہر بنایا
جا سکتا ہے۔ اس سے وہ ہمیشہ نشانے کے قریب
ہی پہنچیں گی۔ سائنسدانوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ جاسوس
مکھی جاسوسی کے دوسرے طریقوں کے مقابلے میں
سستی پڑے گی اور اس کا کام اپنی نوعیت کا نرالا
و انوکھا ہوگا کیونکہ جو کام جاسوس مکھی کر سکے گی وہ
کوئی دوسرا جاسوس نہیں کر پائے گا۔ اس لئے
آپ جہاں بھی کہیں ہوں ہوشیار رہئے اور
مکھیوں سے ڈر کر رہئے۔

حجاب کی نظر میں

• احساس ۔ مجموعہ کلام رئیس رامپوری۔ ناشر چاند پبلی کیشنز رام پور
صفحات ۱۶۰ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ مجلد معہ گرد پوش قیمت سات روپیہ

دس گیارہ برس ہوئے، رام پور کے کچھ مخصوص شعراء کی ایک مختصر سی نشست میں ابوالمجاہد زاہد صاحب کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوا۔ اس نشست میں ایک نوجوان شاعر نے اپنی غزل پڑھی۔ مطلع یہ تھا: ؎

جنابِ شیخ میخانے چلے ہیں بہانہ یہ کہ سمجھانے چلے ہیں

شعر کا مضمون نہایت پامال ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ غریب شیخ کی مٹی پلید کی گئی ہے لیکن جس سلاست سے شعر کہا گیا نیز ایک معمولی ٹکڑے "بہانہ یہ" سے جو بلاغت پیدا کی گئی اس نے بیساختہ میری زبان سے "واہ" نکلوا دی۔

اس مشاعرے میں بہت سے نوجوان شعراء نے حصّہ لیا۔ لیکن رام پور کا پہلا نوجوان شاعر جو مجھے جچا، وہ وہی رہا جس کی غزل کا مندرجہ بالا مطلع پیش کیا گیا۔ یہی نوجوان شاعر "رئیس رامپوری" کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی رئیس رامپوری کا مجموعہ کلام یہ "احساس" ہے۔ اردو اکاڈمی یوپی کی طرف سے اس پر ایک ہزار کا ایوارڈ ملا ہے۔
"احساس" رئیس رامپوری کا پہلا مجموعہ کلام ہے اس کے مطالعہ سے محسوس ہوتا

کہ رئیس رامپوری آج کا نہیں کل کا شاعر ہے جس نے آج کی نہایت لطیف زبان میں اپنے ذاتی احساسات و تجربات ڈھالے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اسی احساس کو ان لفظوں کے ساتھ واضح کیا ہے :-

"اس کی (یعنی رئیس رامپوری کے کلام کی) خوشبو میں وہی کیفیت ہے جو پرانے عطر میں بسے ہوئے کپڑوں کی ہلکی خوشگواری میں ہوتی ہے۔"

میں اپنے اور شمس الرحمٰن فاروقی کے قول کی صداقت واضح کرنے کے لئے "احساس" کے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔ اُمید ہے کہ پڑھنے والے پُرانے عطر کی خوشبو سے آج بھی خوشگواری محسوس کریں گے۔ ساتھ ہی رئیس رامپوری کے احساسات و تجربات سے واقف ہو کر اقرار کریں گے کہ اس مجموعۂ کلام کا نام "احساس" بالکل صحیح رکھا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

پہلا رُخ

- یہ مجھ سے وسعتِ احساس لے لو ۔۔۔ بہت محدود ہو کر رہ گیا ہوں
- محبت نام کے اِک واقعے سے ۔۔۔ نہ جانے کتنے افسانے چلے ہیں
- بعض اوقات نصیحت کا سہارا لیکر ۔۔۔ بعض احباب بڑی دل شکنی کرتے ہیں
- گھر میں بیٹھے رہیں تو جی گھبرائے ۔۔۔ گھر سے نکلیں تو ہم کہاں جائیں
- اس کا تو غم نہیں کہ نشیمن اُجڑ گیا ۔۔۔ اس کا قلق رہے گا کہ دن تھے بہار کے
- کہاں گئی میری زندہ دلی میں کیوں سوچوں ۔۔۔ یہ فرض میرا نہیں دوستو تمہارا ہے
- عمر بھر بیقرار رہنے کو ۔۔۔ چند لمحے قرار میں گزرے
- آج مدت کے بعد اس نے رئیس! ۔۔۔ حال پوچھا تو آنکھ بھر آئی
- قفس نصیب ذرا دیکھنا چمن کی طرف ۔۔۔ وہ دے رہا ہے دھواں کس کا آشیاں ہے تک

- میں چھوڑ دوں گا نشیمن مگر لحاظ رہے — کہ میں نے خون سے سینچا ہے گلستاں اب تک

نیازِ عشق سے نازِ بتاں تک بات جا پہنچی
زمین کا تذکرہ تھا آسماں تک بات جا پہنچی

- وہ ہنس دیتے ہیں جب محفل میں میرا نام آتا ہے — خدا کی دین ہے دیوانہ پن یوں کام آتا ہے
- بہارِ لالہ و گل پر تجھے حق ہو نہ ہو لیکن — چمن کے رہنے والوں میں تو میرا نام آتا ہے
- کل تک یہ پھول روحِ رواں تھے بہار کے — تم نے ابھی ابھی جنہیں پھینکا اُتار کے

وہ چاند سے رُخ پہ پھر کسی کے سیاہ زلفیں بکھر گئی ہیں
وہ نور پھیلا، وہ ابر چھایا، وہ صبح پھر آئی شام لے کر

- مری شگفتہ مزاجی پہ رشک ہے سب کو — کسے خبر ہے کہ تم ہو مری نگاہوں میں
- پھر پھڑانے کو ترستا ہی رہا ہوں صیاد — اس قدر بھی پر پرواز نہ کس اب کے برس
- وہ تو آنسو نکل پڑے ورنہ — میں کہاں شرحِ واقعات کہاں
- ہم کچھ اپنا بھی احتساب کریں — کیوں کہیں کوئی باوفا نہ ملا
- بُرا جو وقت پڑا ہے تو کس وضاحت سے — قدم قدم پہ یہ دنیا سمجھ میں آئی ہے

نہیں ہے عقل سے، ایمان کا دل سے تعلق ہے
خدا محسوس ہوتا ہے، خدا دیکھا نہیں جاتا

دوسرا رُخ

رئیس رامپوری کا یہ ایک طرز کا احساس ہے۔ اس نے اپنے اشعار میں ایک طرح کا اور احساس سمو یا ہے۔ وہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ کہتا ہے۔

قدم قدم پہ ارادے شکست ہوتے ہیں
خدا پہ پھر بھی یقین کیوں نہیں، خدا معلوم

تھی کوئی بات تو گزرے ہوئے انساں پہ نہیں — ورنہ کیوں آج کے انسان پہ ہنسی آتی ہے

اگر ادھر سے کوئی کارواں نہیں گزرا
تو پھر یہ راہ میں کیسا غبار باقی ہے

بدل گیا ہے نمودِ بہار کا مطلب
بہار تو نے چمن میں وہ گل کھلائے ہیں

روشن ہیں چراغوں کی طرح راہِ وفا میں
دنیا کے لئے ایسے بھی کچھ نقشِ قدم ہیں

وہیں کانٹوں کے لئے راستے ہموار ہوئے
زندگی! تو نے جہاں پھولوں پہ چلنا سیکھا

نئے نئے سے جو رہبر نہ آسرا دیتے
کہاں پہنچتا خدا جانے کارواں اب تک

کیا ہو جواب اس کی مشیت کا اے رئیس!
ہم کس کے بس کی بات تھی انساں کو چھوڑ کر

یہ تو کہئے خدا کے ہو نہ سکے
یہ نہ کہئے، ہمیں خدا نہ ملا

اک پرستارِ چمن یوں بھی بہاروں میں رہا
آنکھ پھولوں پہ رہی اور ہاتھ خاروں پہ رہا

اب ہمیں یہ بھی سوچنا ہو گا
سوچتے ہی رہے تو کیا ہو گا

وہ روشنی ہے کہ کچھ بھی نظر نہیں آتا
یہ کیسی صبح ملی ہم کو رات کے بدلے

یہ دو طرح کے اشعار ہیں۔ رئیس رامپوری کے اس مجموعۂ کلام "احساس" میں یہ دوسری طرح کے اشعار بہت ہی کم ہیں بلکہ میں یہ کہوں کہ صرف اتنے ہی ہیں تو درست ہو گا۔ کیا اچھا ہوتا کہ نوجوان شاعر کی رہنمائی ایسے ہی اشعار کہنے کی طرف کی جاتی۔ میں نے ایک بار اپنے دوست جناب محشر عنائتی مرحوم کو مشورہ دیا تھا کہ آپ کے شاگردوں میں رئیس ابھرتا ہوا نوجوان ہے۔ اسے نظام رامپوری کے رنگِ تغزل پر نہ ڈالئے۔ مولانا محمد علی جوہر رامپوری کے فکر و فن کی طرف رہنمائی کیجئے۔ مگر افسوس جب "احساس" چھپ کر برائے تبصرہ میرے پاس آیا تو محشر مرحوم نے شاگردِ رشید کے متعلق جو تعارف نامہ لکھا، اس میں یہ الفاظ نظر سے گزرے۔ مرحوم نے تحریر کیا کہ:

"رئیس کے ایسے متاثرہ اشعار سے اس جگہ کتراتے ہوئے یہ کہوں گا کہ اس نے نظام کو سامنے رکھا۔ ان کی ڈالی ہوئی ڈگر پر

چلتا رہا۔ جب ہی تو اس نے ایسے اشعار کو جنم دیا۔"

کیسے اشعار کو ؟ یعنی پہلی طرز کے اشعار کو۔ حالانکہ مولانا محمد علی جوہرؔ کے فکر وا
پر ہم اہلِ رامپور فخر کریں تو یہ نظام رامپوری پر فخر کرنے سے بدرجہا اولیٰ ہوگا۔
نظام رامپوری بے مثل شاعر اور یگانۂ روزگار استاد تھا۔ ہو سکتا ہے کہ رئیسؔ ا
دس پندرہ برس کے بعد نظامِ ثانی بن جائے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ مولانا
رامپوری اپنے فکر و فن سے فخرِ رامپور ہی نہیں فخرِ ہندوستان تھے۔ اُن کی ڈگر پر چ
رامپور کا ایک بھی سپوت نظر نہیں آتا۔ ضرورت ہے کہ کوئی جوہرِ ثانی بنے۔

اللہ تعالیٰ محشرؔ مرحوم کو کروٹ کروٹ اپنی رحمتوں میں رکھے۔ انھوں نے
رامپوری کے یہ نمونے شاگرد کے سامنے رکھے:۔

- انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ ۔۔۔ دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ
- دینا وہ ان کا ساغر مے یاد ہے نظامؔ ۔۔۔ منہ پھیر کر اُدھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ
- انداز اپنے دیکھتے ہیں آئینے میں وہ ۔۔۔ اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

حالانکہ مولانا جوہرؔ کے یہ شعر شاگرد کے سامنے لائے جاتے تو رئیسؔ رامپوری آج
طرح کا کلام پیش کرتا۔ بطور نمونہ مولانا کے دو تین اشعار ملاحظہ ہوں۔ مولانا جیل
گھر میں بچی بیمار تھی۔ خط گیا کہ لبِ دم ہے تو بچی ہی کو مخاطب کر کے ایک دردناک
اس نظم کا ایک شعر ہے: ؎

تیرا جینا مجھے منظور ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر مجھ کو بھی منظور نہیں

حقیقتِ توحید سے متعلق مولانا کا شعر ہے: ؎

- توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے ۔۔۔ بندہ یہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

ہیں رامپوری کے سخندانوں سے پوچھتا ہوں کہ مولانا کے اشعار میں جو زور اور بیساختگی ہے وہ نظام سے کم نہیں ہے۔ کل کے نظام نے جو کچھ دیا اُسے آج کے شعراء نے چھوڑ دیا اور آج کے مختلف نظاموں کے پیچھے ہو لئے۔

آج کے ایک نظام پر مولانا کی تقلید میں کچھ دیوانے زورِ بیان صرف کر رہے ہیں۔ رئیس رامپوری مولانا کی تقلید میں کاوش کر سکتے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ وہ بقیہ عمرِ عزیز (اللہ تعالےٰ انھیں طویل عمر عطا فرمائے) میں دوسری طرح کا کلام پیش کر کے شعرائے رامپور کو وہ رُخ دیں جو وزنی بھی ہے اور باقی رہنے والا ہے۔

• لفظی بحث اوپر جو کچھ کہا گیا اس سے متاثر ہو کر یہ نہ سمجھا جائے کہ رئیس رامپوری کے کلام پر انگلی نہیں رکھی جا سکتی۔ رئیس رامپوری نے بڑے نازک اور لطیف اور ہلکے پھلکے لفظوں میں شعر کہے ہیں۔ حیرت ہے کہ وہی رئیس نعت میں یہ لہجہ اختیار کر گیا۔ ملاحظہ ہو: ؎

• رئیس اُمید ہے محشر میں رضواں خود صدا دے گا
رسولِ پاک کی اُمت میں جو بھی ہو ادھر آئے

واضح رہے کہ "ادھر آئیے" پیار کا فقرہ نہیں ہے۔

کہیں کہیں رئیس نے بعض الفاظ اس طرح نظم کئے ہیں کہ وہ "غریب ہو گئے" مثلاً ؎

• تو پلٹ کے دیکھ ناصح، میں بتاؤں اگلے جادے
تری زندگی فسانے، مری زندگی ارادے

کہیں بات کسی فعل سے شروع ہوئی اور ختم ہوئی کسی فعل پر، مثلاً:۔

• اہلِ ساحل کو یونہی ساحل پہ ہنستا چھوڑ کر

اس شعر کی نثر کیجئے تو افعال اس طرح تبدیل ہو جائیں گے۔

"زندگی اہلِ ساحل کو ساحل پر یونہی ہنستا چھوڑ کر اس کے قدم چومتی ہے جو دھاروں میں رہتا ہے۔"

اسی طرح مندرجہ ذیل شعر میں ملاحظہ ہو: ؎

• ہم تری راہ میں اُٹھے ہیں بڑے عزم کے ساتھ — گردشِ دہر بھی ٹھہری ہے جو ہم ٹھہرے ہیں

ٹھہرے ہیں کے بجائے ہونا چاہیے "ٹھہریں"۔ مطلب یوں ہوگا چونکہ گردشِ دہر کبھی نہیں ٹھہری ہے اس لئے ہم کیوں ٹھہریں۔ بعض جگہ یقین کے ساتھ بات کہنے کی تھی اسے مشکوک کر دیا۔ احساسؔ کا اچھا شعر ہے۔ رئیس رامپوری نے یوں کہا ہے: ؎

• غم کو اصلِ حیات کہتے ہیں — غم سے گھبرا رہا ہے دیوانے!

کہتے ہیں کہہ کر اچھے خاصے شعر کو مشکوک کر دیا۔ بغرضِ اصلاح نہیں۔ بطور مشورہ عرض کرتا ہوں۔ پہلا مصرع یوں ہوتا تو اچھا تھا۔ "غم ہی اصلِ حیات ہے پیارے!"

ایک اور مشورہ ملاحظہ ہو۔ شعر ہے: ؎

• جن کی خاطر ہوا یہ حال رئیس — آج وہ بھی ہمیں نہ پہچانے

ہمیں کے بدلے مجھے ہونا چاہیے۔

اور اس شعر میں بھی یقینی کیفیت نہیں ہے۔ شعر ہے: ؎

• ملا ہے آپ کا غم کائنات کے بدلے — خوشی ملے گی تو شاید حیات کے بدلے

لفظ شاید کے بدلے ایسا لفظ ہونا چاہیے جو یقین کا تصور دے۔

اور اس شعر میں: ؎

• یہ بات قرینے کی نہیں اے غمِ دوراں — کچھ لوگ تو اب تک مجھے پہچان رہے ہیں

اب تک نہیں ابھی پہچان رہے ہیں یا اب بھی لیکن اب ہم [illegible] کا ادغام ہے۔

اور اس شعر میں "پلٹنا" واپس آنے یا لوٹ آنے کے معنوں میں استعمال کیا ہے :-

- میں گلستاں سے پلٹتا ہوں تو کہیں لوگوں کو — ارتباطِ گل و داماں پہ ہنسی آتی ہے

اور اس شعر میں زلفِ پریشاں کے بدلے گیسوئے غدار نظم کیا ہے :-

- محتاجِ محل رات کی آغوش میں جیسے — وہ رُخ پہ ترے گیسوئے غدار کا عالم

ایک جگہ اور ہے۔ "ان کے گیسو شام ہو کر رہ گئے"

رئیس کے یہاں اکثر اشعار میں ہم مخرج حروف کا ادغام پایا جاتا ہے۔

- شکوہ تو مقدر سے ہے مگر کہہ جاتے ہیں ہم جاتے جاتے
- جام ہم سے چھین لیا کرتے ہیں ہم اے ساقی
- ہم کو تو منظور ہے ہی تا اپنی تسکینِ نظر
- چاک کرنے ہی کو تھا میں دامنِ ہوش و حواس
- دل میں مرے ارمان بہت ہیں
- انھیں اعتماد ہے آپ پر انھیں گیسوؤں کی ہو فکر کیا
- اب کا ہے کو گزرے گی گلستاں کی طرف سے
- وہ ہنس دیتے ہیں جب محفل میں میرا نام آتا ہے

رئیس رامپوری نے خوب کے معنوں میں لفظ بھلے استعمال کیا ہے جو کھٹکتا ہے مثلاً:-

- ان کی زلفوں کے سائے بھلے مل گئے — زندگی کے لیے مشغلے مل گئے
- ان کی فرقت میں تڑپوں کہ ان کی سنوں — عشق میں اک یہ ناصح بھلے مل گئے

واضح رہے کہ یہ بھلے۔ ہندی کا بھلے ہی ہے۔

- یہ اور بات کہ مجھ کو نہ راس آئے ہیں — بہت لطیف ترے گیسوؤں کے سائے ہیں

پہلے مصرع میں "ہیں" زائد ہے۔ دوسرے مصرعہ

• ان کا دامن نہ تھا دور لیکن رئیس ہوش ہی کب رہا ہوش آنے کے بعد

مطلب یہ ہے کہ اے رئیس ان کا دامن دور نہیں تھا لیکن ہوش ہی نہیں رہا کہ دامن تھام لیتا بات پوری ہو گئی۔ اب رہا فقرہ ہوش آنے کے بعد۔ اس کے معنی کیا لئے جائیں ؟

یہ چند مشورے ہیں رئیس رامپوری ان پر غور کریں۔ "احساس" نہایت پاکیزہ اشعار کا مجموعہ ہے۔ مشوروں کی روشنی میں انشاء اللہ پاکیزگی بڑھ جائے گی۔ اس پاکیزہ مجموعے سے آئندہ ایڈیشن میں اس طرح کے اشعار حذف کر دئے جائیں تو اچھا ہے جیسے:۔

• اظہار تمنا پہ وہ ماتھے پہ پسینہ انکار کہوں یا اسے اقرار کا عالم
• آج قبل از وقت جو وہ جاگ اٹھے ہیں رئیس کتنے دل آویز ہیں انگڑائیوں کے سلسلے

کتاب میں کتابت کی غلطیاں بہت ہیں۔ ایسے اشعار کو میں نے قصداً انظر انداز کر دیا ہے۔ آئندہ اڈیشن میں تصحیح وقت نظری کے ساتھ ہونا چاہئے۔ (م)

غزل

اس طرح دل کے داغ دکھانے سے فائدہ اپنے ہی گھر کو آگ لگانے سے فائدہ
ممکن ہے اس کے سینے میں ناسور ہو کوئی پھر اپنے دل کا زخم دکھانے سے فائدہ
تم کو نیا لباس مبارک ہے دوستو! لیکن نیا لباس سلانے سے فائدہ
یوں راکھ ہو گیا کہ مجھے سوچنا پڑا سوکھا ہوا درخت جلانے سے فائدہ

اُن سے دُعا سلام میں نقصان بھی نہیں
پھر دشمنی نظام جتانے سے فائدہ

(نظام الدین نظام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی تعلیم کی روشنی میں زندگی کو خوشگوار و بامقصد بنانے کے لئے۔ نئی نسل کو اسلامی طریق سکھانے کے لئے

مسلم خواتین اور طالبات کے لئے نادر موقع

اسلامی تعلیم خانہ داری وسلائی کڑھائی کورس

جو صرف خواتین کے لئے قائم ہے۔ اگر آپ معمولی اردو لکھ پڑھ سکتی ہیں تو ایک گھنٹہ یومیہ کے مطالعہ سے اس کورس کے ذریعہ ارکان اسلام، تہذیب و حسن سلیقہ و خانہ داری و سلائی کڑھائی میں بذریعہ ڈاک امتحان دے کر سند حاصل کرکے مسلم معاشرے میں ایک مقام حاصل کرسکتی ہیں۔

مکمل معلوماتی کتاب "اسلامی تعلیم خانہ داری کورس" مفت حاصل کریں۔

پتہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

ادارۂ اختری۔ محلہ ابوالبرکات دیوبند۔ ضلع سہارنپور۔ یو۔پی

پن کوڈ ۲۴۷۵۵۴

اسلامی شعور بیدار کرنے والی بے مثل کتابیں

تصانیف: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام اور جاہلیت	۰/۷۵	اسلام کا پیغام	۰/۴۰	تحریک اسلامی دوسری تحریکوں کے مقابلہ میں	۲/۵۰
اسلامی تزکیۂ نفس	۰/۹۰	اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی	۱۰/۰۰	تحریک اسلامی میں کارکنوں کے باہمی تعلقات	۲/۵۰
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۲/۰۰	اسلام کی ابتداء	۰/۲۵	تفہیم القرآن اول	۲۰/۰۰
اسلام کا نظام حیات	۱/۰۰	اسلام کس چیز کا علمبردار ہے	۱/۵۰	" " دوم	۲۲/۰۰
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	۰/۷۵	اسلام اور رہبانیت	۰/۷۰	" " سوم	۲۵/۰۰
اسلام کا نظریۂ سیاسی	۰/۷۵	اسلامی ادب	۰/۵۰	" " چہارم	۲۱/۰۰
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	۰/۷۵	اسلامی فلسفۂ معیشت کے بنیادی اصول	۰/۵۰	" " پنجم	۱۹/۰۰
اسلامی قانون	۱/۵۰	امام ابوحنیفہ اور ان کا کارنامہ	۱/۵۰	" " ششم	۲۰/۰۰
اسلام اور جدید معاشی نظریات	۳/۵۰	ایک نہایت اہم استفتاء	۰/۲۵	تفہیم القرآن سورۂ احزاب	۲/۰۰
اسلامی معیشت کے اصول و مقاصد	۰/۵۰	اہم ہدایتیں	۱/۲۵	" " پلاسٹک کور	۱/۰۰
انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	۱/۰۰	بناؤ بگاڑ	۰/۷۵	" " الناس تا الم نشرح	۳/۰۰
اسلام اور ضبط ولادت	۵/۰۰	تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں	۰/۷۵	" " پارۂ عم	۵/۰۰
اسلامی نظام معیشت	۰/۷۵	تحریک اسلامی کامیابی کے شرائط	۱/۰۰	تنقیحات اول (اضافہ شدہ)	۱۲/۰۰
اسلام کا معاشی نظام	۰/۷۰	تجدید و احیاء دین	۵/۰۰	" دوم	۹/۰۰
اسلامی ریاست (سیاسی کشمکش حصہ سوم)	۶/۰۰	تعلیمات	۳/۲۵	" سوم	۶/۵۰
اسلام کا سرچشمۂ قوت	۲/۰				

ایک نظر ادھر بھی

(۱) اپنے پتہ والی چٹ کو بغور ملاحظہ فرمالیں اور اگر اس میں کوئی غلطی نظر آئے تو ہمیں فوراً مطلع فرما دیں تاکہ آئندہ غلط پتہ کی وجہ سے مجلہ ڈاک میں گم نہ ہو۔

(۲) پتہ والی چٹ سے انفرادی خریدار صاحبان اپنا خریداری نمبر اور ایجنٹ صاحبان اپنا ایجنسی نمبر اپنی پاکٹ بک میں نوٹ فرمالیں اور بوقت خط و کتابت یا منی آرڈر بھیجتے وقت اس کا حوالہ ضرور دیں۔ تاکہ آپ کے حکم کی تعمیل فوراً ہو سکے۔

(۳) منی آرڈر کوپن پر اپنا نام اور پورا پتہ اور ڈاکخانہ کا پن کوڈ نمبر خوشخط لکھیں اور خریداری یا ایجنسی نمبر بھی لکھیں۔

(۴) مجلہ نہ ملنے کی شکایت اسی ماہ کی ۸ تاریخ کو ضرور بھیج دیں۔ زیادہ دنوں کے بعد اطلاع دینے سے ناکامی ہوگی۔ کیونکہ اکثر پرچے ختم ہو جاتے ہیں۔

(۵) مضمون بھیجتے وقت اس کے لئے مناسب ڈاک خرچ ضرور بھیجئے تاکہ مضمون پسند نہ آنے پر واپس کیا جائے۔ ورنہ مضمون پسند نہ آنے پر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے گا۔

(۶) فوراً جواب کے لئے جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۷) اگلا پرچہ "بعنوان اسلامی نظام میں عورت کا مقام اور اس کا حکم" ہوگا۔ ہمارا پچھلا تجربہ ہے کہ مجلہ کے خصوصی نمبر اکثر ڈاک میں گم ہو جاتے ہیں اس لئے سادہ ڈاک سے نہیں بھیجا جائے گا۔ انفرادی خریداروں میں سے جن صاحبان نے رجسٹری کے لئے رقم بھیجدی ہے ان کو رجسٹرڈ بھیجا جائے گا اور جن صاحبان نے رجسٹری کے لئے روپے نہیں بھیجے ہیں ان کی خدمت میں دو روپے کی V.P سے بھیجا جائے گا تاکہ ہر خریدار کو بحفاظت پہنچ جائے۔

(۸) ہر ایجنٹ کو کچھ نہ کچھ روپے کی V.P سے یہ خاص نمبر بھیجا جائے گا۔

(۹) جن خریداروں کے سالانہ چندے اکتوبر ۱۹۸۲ء یا نومبر ۱۹۸۲ء یا دسمبر ۱۹۸۲ء میں ختم ہو رہے ہیں وہ خریدار آج ہی سالانہ چندہ بھیجدیں۔

۱۰- نیچے اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۷۹ء میں ختم ہونے والے خریداروں کے نمبر خریداری لکھے جا رہے ہیں ان میں سے اپنا نمبر خریداری تلاش کریں اور سالانہ چندہ بھیجدیں۔

اکتوبر ۱۹۷۹ء				نومبر ۱۹۷۹ء	دسمبر ۱۹۷۹ء	
365	1987	1849	2162	210	200	.171
653	1988	1850	2166	393	417	.172
766	1989	1852	2224	501	589	.175
895	70/3	1853	2225	1602	727	2176
1241	73/3	1860	2226	1613	775	.179
1392	2007	1867	2227	1621	945	2181
1400	2011	1868	2235	1797	954	2189
1402	2019	1882	2237	1903	968	2192
1404	2020	1883	2142	1989	979	2194
1407	2023	1884	2015	1990	1053	213
1500	2030	1885	2306	1992	1256	2221
1526	2033	1898	2308	1993	1263	2238
1588	2038	1912	1983	2223	1272	2240
1681	2049	1913		2239	1412	2244
1711	2054	1933		2301	1511	2245
1712	2055	1934		1794	1513	2247
1715	2061	1937		2316	1524	2248
1716	2063	1945		1791	1592	2251
1717	2065	1946		1877	1594	2252
1727	2072	1947		1830	1605	2272
17[illegible]	2073	1949			1609	1515
17[illegible]	2078	1961			1679	1977
1741	2079	1975			1738	2267
1754	2081	1984			1751	972
1757	2089	1966			1756	1392
1759	2091	1969			1775	2311
1762	2103	2131			1784	
1763	2106	2139			1785	
1768	2112	2146			1991	
1832	2119	2149			2069	
1985	2124	2151			2169	
1986	1847	2153			2170	

مالک، پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر محمد اسحٰق ... مطبوعہ ... سے چھپوا کر دفتر مقام اشاعت ...

Regd. No. M. R. D. 34

MONTHLY HIJAB RAMPUR U.P.

ضمیمہ ۲

اسلامی نظام میں عورت کا مقام

ایک فطری اور سائنٹیفک جائزہ

ماخذ آ

حجاب
رامپور

ذوالحجہ ۱۳۹۶ھ

صبح کے آثار نظر آتے ہیں

جلد ۹

شمارہ ۱۲

سالانہ /26

V.P سے /30



اسلامی نظام میں عورت کا مقام

/5

اس دائرہ میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ نے حجاب کے لیے جو زر تعاون عنایت [illegible]

آہ! مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم

میں ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو صبح کے وقت حجاب کے اس شمارے کے اوراق کی تصحیح اور ترتیب میں معروف تھا اچانک میرا بچہ رشاد سلمہٗ بدحواسی کے عالم میں بھاگتا ہوا آیا اور حیرانی کے ساتھ بولا "ابا جان! مولانا مودودی صاحب کا انتقال ہوگیا" میں نے پوچھا "تم کو کیسے معلوم ہوا؟" اس نے بتایا "ابھی ابھی ریڈیو پاکستان سے صرف اتنا سنا کہ صدر ضیاء الحق نے عمر فاروق کے نام امریکہ کو تعزیت کا تار بھیجا ہے"

انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر میں جناب مولانا عزیز صاحب صابر المظاہری امیر جماعت اسلامی اڑیسہ کی قیامگاہ کی طرف بھاگا۔ وہاں کچھ رفقاء مجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ سب غمگین اور اداس تھے۔ امیر محترم نے تصدیق فرمائی کہ رات کو ۸ بجے مولانا مودودی کا انتقال ہوگیا۔

اب جو میں گھر کو واپس ہوا تو نہ دل قابو میں تھا اور نہ پاؤں۔ گرتا پڑتا گھر آیا تو رونے کو جی چاہ رہا تھا اسی وقت بھائی شرافت اللہ خاں صاحب میرے گھر آئے۔ انکو دیکھ کر ضبط نہ ہوسکا اور ان سے لپٹ کر دیر تک روتا رہا بھائی صاحب نے دلاسا دیا۔ رونے سے کچھ بخار اس نکلی مگر دن بھر مبہوت سا رہا۔ دوسرے دن بھی دماغ ماؤف سا رہا۔ انیجے کاتب صاحب آگئے اور فہرست مضامین طلب کی صفحات پر نمبر ڈالے۔ کاتب نے جیسے تیسے پرچہ مکمل کردیا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ صفحات کے نمبر اور فہرست صحیح ہے یا نہیں۔ تمام اوراق لفافے میں بند کرکے ڈاک کے سپرد کردئے گئے۔ یقیناً اس شمارے میں بڑی کوتاہیاں اور خامیاں ہونگی۔ قارئین کرام سے معذرت کیساتھ معافی کا خواستگار ہوں ـــ انشاءاللہ حجاب کے آئندہ شماروں سے مولانا مرحوم سے متعلق مضمونوں اور خبروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوجائیگا ارادہ ہے کہ جلد ہی مولانا مرحوم کے متعلق حجاب کا ایسا شمارہ ترتیب دیا جائے جو مولانا کی زندگی اور ان کے کارہائے نمایاں پر روشنی ڈال سکے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ مولانا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

مائل خیرآبادی

ایک نہائت ہی قابل توجہ گرامی نامہ

مدیر حجاب اور حلقہ حجاب کے لیے

بسم اللہ

از سلطان قریشی 756 گلی سوداگران - بلی ماران - دھلی ۲

یکم رمضان المبارک ———————— مطابق ۲۶ر جولائی ۱۹۷۷ء

محترمی و مکرمی جناب مائل خیرآبادی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حجاب ماشاء اللہ ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے بھی اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے بھی بہت مفید ثابت ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسان زبان میں لکھنے کا خاص سلیقہ عنائت فرمایا ہے کیا ہی اچھا ہو کہ ایک ٹیم آپ کو لکھنے والوں کی ایسی میسر آجائے جو مختلف موضوعات پر لکھا کرے جس سے رسالے میں اور زیادہ تنوع اور مضامین میں زیادہ رنگارنگی آجائے۔ انتخاب آپ کو خود ہی کرنا ہوگا میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنے قارئین کو اظہار خیال کے لئے کوئی عنوان ایسی کبھی دیا کیجئے جس پر وہ لکھیں۔ مگر اس میں مختصر لکھنے کی پابندی ہو۔ تاکہ رسالہ رطب و یابس سے نہ بھر جائے۔

علمی، مذہبی اور معلوماتی سوال و جواب کا سلسلہ بھی آپ شروع کر سکتے ہیں لیکن ایک پرچے میں بس اہم قسم کے ایک دو سوالوں کا جواب ہو اور اس میں دو صفحات سے زیادہ صرف نہ ہوں۔

آپ خود بھی کوئی متعین سوال قارئین کو دے سکتے ہیں۔ جس پر وہ لکھیں۔ مثلاً آپ پوچھ سکتے ہیں "کیا آپ کبھی مرتے مرتے بچے ہیں۔ اس وقت آپ نے کیا محسوس کیا؟" یا مثلاً کیا آپ کسی ایسے آدمی کو جانتے ہیں جس نے اپنے کسی دشمن کے ساتھ حسنِ سلوک کیا ہو؟

یہ تو برسبیل تذکرہ میں نے رسالے میں زیادہ تنوع اور رنگارنگی پیدا کرنے اور قارئین کی زیادہ دلچسپی بڑھانے کے لئے بطور مشورہ لکھ دیا۔ ورنہ آپ تو خود ماشاء اللہ اس میدان کے مرد ہیں۔

جب ان نکتوں پر آپ سوچیں گے تو بہت سے شگوفے آپ کے ذہن میں خود پھوٹیں گے۔ قارئینِ حجاب کی رائے جاننے کے لئے آپ اس خط کو شائع بھی کر سکتے ہیں۔ بصورت دیگر مجھے آپ ضرور جواب سے نوازیں گے۔

گزشتہ حجاب میں آپ کا جے پور کا سفر اور اس کی روئیداد اور محترمہ شمیم صاحبہ سے آپ کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ ہلکے پھلکے انداز میں آپ بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ مبارکباد!

والسلام سلطان قریشی۔ 756 گلی سوداگران۔ بلی ماران۔ دہلی ۶

سوال و جواب

لیجئے۔ سب سے پہلے ہم سلطان قریشی صاحب ہی کے دیئے ہوئے سوالوں پر اظہار خیال کی دعوت دیتے ہیں۔ جواب حجاب کے دو صفحات سے زیادہ نہ ہو۔ پسندیدہ جواب حجاب میں شائع ہوگا اور صاحب جواب بہن یا بھائی کی خدمت میں دس روپیہ ہدیۃً پیش کئے جائیں۔

س ۱۔ کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ کی جان پر بن آئی ہو؟ اس وقت آپ نے کیا محسوس کیا؟

س ۲۔ کیا آپ کسی ایسے شخص (مرد یا عورت) کو جانتے ہیں جس نے کسی دشمن کے ساتھ حسن سلوک کیا ہو اس سے آپ نے کیا تاثر لیا اور کیا کبھی عملاً ویسا ہی کیا؟

نوٹ ۱۔ تمام جواب شعبہ سوال و جواب کو ۲۰ رنومبر تک مل جانا چاہئیں۔ اس تاریخ کے بعد وصول ہونے والے جوابات قابل توجہ نہیں ہوں گے۔

نوٹ ۲۔ اسی طرح آپ بھی مدیر حجاب سے ہر ماہ دو سوال کر سکتی یا کر سکتے ہیں۔

نوٹ ۳۔ جس لفافے یا خط کے ذریعہ اپنے سوال یا جواب بھیجیں اس پر پتہ اس طرح لکھیں۔

شعبہ سوال و جواب حلقہ حجاب رامپور۔ یو۔ پی۔ ۲۴۴۹۰۱

آج کی تازہ خبر

شام میں اسلامی اثرات کی تازہ رپورٹ ایک انگریزی جریدے سے ملاحظہ ہو۔ مڈل ایسٹ انٹرنیشنل (برطانیہ) کی نمائندہ مقیم شام ڈورین انگرامس لکھتی ہیں۔

اونچی تعلیم یافتہ عورتیں حیران ہیں کہ ان کی لڑکیوں کو کیا ہوگیا ہے۔ ان کی لڑکیاں صرف باہر ہی نہیں گھر میں بھی ساتر لباس اور سر پہ دوپٹہ اوڑھنے لگی ہیں۔ وہ بناؤ سنگھار کرکے باہر جانا بھی پسند نہیں کرتی ہیں۔ ان لڑکیوں کے بھائی بھی انہی کی مانند مذہب پسند ہوگئے ہیں اور بعض اوقات انھیں اپنے والدین سے بھی شکایت ہوتی ہے کہ وہ مذہب کی کماحقہٗ پابندی نہیں کرتے اور وہ اپنے والدین سے بہت زیادہ معلموں کی تعظیم کرتے ہیں جنھوں نے انھیں دین سے روشناس کرایا۔ شام بالعموم بے دین ملک نہیں ہے۔ اس کی اکثریت آبادی مذہب سے گہرا شغف رکھتی ہے اس کے باوجود شام میں پچھلے دور میں سینما گھروں اور شبینہ کلبوں کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے۔ نوجوانوں کے اندر اسلامی رجحان کو بعض بزرگ تہذیب مغرب سے نفرت کی علامت قرار دیتے ہیں اور بعض کی رائے میں یہ بغاوت جوانی کا فطری خاصہ ہے لیکن عمومی خیال ہے کہ نوجوانوں میں دین کی جانب رغبت اخوان المسلمون کی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔ چونکہ شام میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی ہے اس لئے جو بھی سرگرمی ہوتی ہے وہ مذہبی آڑ میں ہوتی ہے لیکن اس رجحان سے سب کے کان کھڑے ہوگئے ہیں۔ شام کی عیسائی آبادی خصوصاً جو لبنان کی صورت حال سے متاثر ہے۔ اس سے بڑی فکرمند ہے۔

(مڈل ایسٹ انٹرنیشنل ۲۱ مئی ۱۹۸۲ء)

یہ ایک غیر مسلم غیر ملکی کی رپورٹ ہے لیکن اس کے بین السطور سے صاف ظاہر ہے کہ شام

میں بعث کی لادین حکومت کے باوجود دینی رجحان دبایا نہیں جا سکا اور شام میں موجودہ لادینی عناصر غیر مسلم اقلیتیں اس دینی رجحان سے سخت خوفزدہ ہیں۔ ان کو خطرہ ہے کہ اگر عوام میں دینی لہر ابھر آ گئی تو نہ بعث کی ملحد اشتراکی حکومت من مانی کر سکتی ہے اور نہ غیر مسلم اقلیتوں کو کوئی روڑہ اٹکا سکتے ہیں۔

اسی قسم کے خطرات کا احساس مصر کی سادات حکومت میں بھی پایا جاتا ہے۔ مصر کے سادات اور شام کے حافظ الاسد میں پالیسی کے نقطۂ نظر سے بعد المشرقین ہے۔ پھر بھی وہ دینی رجحان کو کچلنے میں متفق الرائے ہیں۔ جدہ سے شائع ہونے والا جریدہ المدینہ مورخہ ۱۸ اپریل ۷۹ء میں اس خفیہ منصوبے کا خاکہ شائع ہوا ہے جو سادات بیگن اور کارٹر کی منظوری سے مصر میں روبعمل لایا جانے والا تھا مگر اس کے فاش ہو جانے سے اب رک گیا۔

"وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ"[1]

(مکرم آثم ابی زیبوی)

یوں تو دنیا میں بہت اہلِ نظر بستے ہیں
عقل و فہم و خرد و ہوش وہ سب رکھتے ہیں
کوئی سمجھا ہی نہیں آپؐ کا رتبہ کیا ہے؟
تھک گئے عقل کے گھوڑے کہ معمہ کیا ہے؟

تذکرہ آپؐ کا کونین کی ہر وادی میں
ہے گواہی یہ مؤذن کی ہر اک بستی میں
ذکرِ اقدس سے ملائک کی زبانیں تر ہیں،
میری نظریں وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ پر ہیں،

[1] (اور ہم نے آپؐ کے ذکر کو بلند کیا)



آخری قسط

مہارانی

ایک دلگداز تاریخی داستان

محمد بن قاسم جب سندھ میں داخل ہوا تو اس نے کیا دیکھا

ابتک کہانی کا خلاصہ

مہاراجہ سندھ کے دو بیٹے تھے۔ داہر اور دھرسنگھ اور ایک بیٹی۔ بیٹی کا نام راجکماری بائی تھا۔ درباری نجومی پنڈت سلاج نے بائی کا زائچہ دیکھ کر بتایا کہ اس کی شادی جس کے ساتھ ہوگی وہی سندھ کا راجہ ہوگا۔ اس پیشین گوئی سے ولی عہد داہر بہت پریشان ہوا۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ سنگھاسن پر بیٹھا مگر اسے سنگھاسن ڈولتا نظر آیا۔ سلاج نے اسے مشورہ دیا کہ بہن کے ساتھ خود شادی کرلے پھر سنگھاسن کون چھینے گا۔ داہر نے یہ سوچ کر بائی سے شادی کرلی۔ لیکن اس سے بیوی کا تعلق قائم نہ کیا۔ یہ بات اس نے سب سے کہدی۔ ریاست کے لوگوں نے بھی سمجھ لیا کہ سلاج نے زائچہ دیکھ کر جو حل پیش کیا ہے وہ ٹھیک ہی ہے لیکن اس وہمی حل کا نتیجہ کیا نکلا وہ اس کہانی کی اس آخری قسط میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ وہ وقت ہے جب کہ خلیفہ عبدالملک کے زمانے میں مسلمان فوجیں فتوحات پر فتوحات کرتی ہوئی ایران سے آگے بڑھ چکی تھیں اور لنکا تک ان کا اثر پہنچ چکا تھا۔

٥ لنکا کا راجہ بھی مسلمان خلیفہ عبدالملک سے دوستی کا تمنائی تھا۔ اسی زمانہ میں لنکا میں آباد ایک مسلمان تاجر نے وفات پائی تو راجہ نے اس کے اہل وعیال کو مع بے شمار تحائف جہاز پر سوار کر دیا اور خلیفہ کو ان ہی کے ذریعہ دوستی کا پیغام بھیجا۔ مگر جوں ہی یہ سندھ کی مشہور بندرگاہ دیبل کے قریب پہنچا تو سندھ کے بحری قزاقوں نے آ کے لوٹ لیا۔ اس وقت مسافروں میں سے کسی عورت نے "المدد اے حجاج بن یوسف" کہا جو عراق کا گورنر تھا اور جس کی سخت گیری مشہور تھی۔ اس نے جوں ہی اس واقعہ کی روداد سنی غصہ سے دیوانہ ہو گیا اور سندھ فتح کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ جس دن حجاج بن یوسف کے سفیروں نے پہلی بار سرزمین سندھ پر قدم رکھا تھا صبح کا وقت تھا۔ سندھ کا تاجدار تخت مرصع پر سونے کا بت بنا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں جانب رانی بائی اور بائیں جانب رانی لاڈلی براجمان تھی۔ سندھ میں سفیروں کی آمد کی خبر مشہور ہو چکی تھی اور دربار میں کسی بھی وقت ان کی آمد متوقع تھی۔ راجہ داہر اور اس کے وزیروں کو اس کا علم تھا۔ ابھی تھوڑی دیر بھی نہ گزری تھی کہ راجہ داہر کا مصاحب کھنور بیر حاضر ہوا اور دست بستہ عرض کیا۔

"عرب سفیر پہنچ گئے ہیں اور مہاراج سے ملنا چاہتے ہیں۔"

یہ سن کر ایک لمحہ کے لئے راجہ داہر کا نشہ ہرن ہو گیا۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے کھنور بیر کو دیکھتا رہا پھر مشورہ طلب نظروں سے موہن داس کو دیکھا، موہن داس ایک لمحہ سوچتا رہا پھر بولا۔

"مہاراج! عرب سفیروں کو باریابی کی اجازت دیجئے۔"

تھوڑی دیر بعد راجہ داہر کے سامنے عرب سفیر موجود تھے۔ انھوں نے حجاج بن یوسف کا خط پیش کیا جس میں درج تھا کہ تم سندھ کے راجہ ہو۔ تمہاری بندرگاہ پر یہ افسوسناک واقعہ پیش آیا ہے۔ اب تمہیں

ا ہے کہ مسلمانوں کو با عزت طور پر واپس کر دو۔"
راجہ داہر نے یہ خط سنا۔ عراق کے گورنر
ا یہ انداز اسے پسند نہ آیا۔ اس نے سفیروں کو
جواب دیا۔

"حجاج بن یوسف سے کہنا یہ کام بحری قزاقوں نے کیا ہے جو میری دسترس سے باہر ہیں لہٰذا میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

یہی وہ جواب تھا جس نے حجاج بن یوسف کو آگ بگولا کر دیا اور ادھر اس نے عبید اللہ بن نبہان کے زیر کمان فوج روانہ کی۔ ادھر راجہ داہر نے سلائج کو حکم دیا کہ عربوں سے مقابلے کا انجام معلوم کرے سلائج نے حسبِ دستور تمام رات تاروں کی چالیں دیکھیں اور عرض کیا۔

"مہاراج! دور دور تک آپ کی شکست کے آثار نظر نہیں آتے۔"

یہ خوش خبری سن کر راجہ داہر جنگی تیاریوں میں مشغول ہو گیا اور جب عبید اللہ بن نبہان میدان میں شہید ہوئے اور مسلمان فوج منتشر ہو گئی تو راجہ داہر کا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ اسے دنیا کی کوئی قوت زیر نہیں کر سکتی۔

حجاج بن یوسف نے دوسری مرتبہ بدیل بن طہفہ کو حکم دیا۔ جو اس وقت عمان میں تھے کہ سندھ میں مسلمان فوج کی قیادت کریں۔ بدیل طہفہ نے حکم کی تعمیل کی۔ اتفاق کی بات تھی کہ وہ بھی شہید ہو گئے مگر اس فوج کی شجاعت نے سندھ کے باشندوں کو مرعوب کر دیا۔

تیسری مرتبہ حجاج بن یوسف نے مکمل ساز و سامان سے آراستہ فوج سندھ کی طرف روانہ کی جس کی کمان اس کے سترہ سالہ بھتیجے اور داماد محمد بن قاسم کے سپرد تھی۔ راجہ داہر کو اس کی اطلاع ملی۔ مسلسل فتح کے نشہ میں سرشار اس نے ساٹھ ہزار فوج محمد بن قاسم کے مقابلہ پر جانے کا حکم دیا۔

وقت کا طائر پرواز کرتا رہا۔ محمد بن قاسم مکران سے ہو کر خشکی کے راستے سندھ آ کر راجہ داہر کی فوج کا مقابلہ کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا اس نے اراببل کو تسخیر کیا، دیبل کی طرف

بڑھا، نیرون کے لوگوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔ مگر راجہ داہر سستا رہا اور فتح کی اُمید میں سرشار اپنے مشاغل میں مست رہا۔ پھر محمد بن قاسم عزم و ہمت کا پیکر علاقے پر علاقے فتح کرتا سیستان پہنچا۔ وہ اپنے کریمانہ اخلاق اور رحم کی ایسی مثالیں قائم کر چکا تھا کہ بھروچ کے باشندے خود ہی آگے بڑھے اور اس سے صلح کر لی۔ وہ جدھر سے گزرا مسلمانوں کو آباد کر کے مسجدیں تعمیر کرتا رہا۔ پہلی مسجد اس نے دیبل میں تعمیر کی۔ سیستان کے نظم و نسق کے دوران وہاں کے باشندوں نے اسے قریب سے دیکھا تو دوستی کے لئے مجبور ہو گئے اور جس وقت وہ سیسم پر چڑھائی کرنے کے لئے تیار ہوا تو سیستان کے ہزاروں باشندے اس کے ہمرکاب ہونے پر فخر کر رہے تھے۔ لیکن اسی دن عراق سے حجاج بن یوسف کا حکم ملا کہ پہلے سندھ کے دارالحکومت کی طرف بڑھو۔ اب تک دن ہفتے اور مہینوں میں بدل بدل کر

سال بیت چکے تھے۔ رانی بائی کا شباب ڈ
رہا تھا۔ وہی ترشا ہوا جسم جو دیکھنے والو
کے جذبات میں ہلچل مچا دیتا تھا۔ ڈھ
پڑ چکا تھا۔ سر میں چاندی کے تار چمکنے
لگے تھے اور چہرے کا حسن ماند پڑ چکا تھا۔ لیـ
اس کے ماتھے پر مہارانی درج تھا۔ ایسے
محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ ہر رکاوٹ اور مختلف
علاقوں کے حکمرانوں کو مطیع کرتا، اپنے گھو
بناتا ہوا راجدھانی کی طرف بڑھا اس کا مق
صرف اتنا تھا کہ راجہ داہر اطاعت قبول کر
اور آئندہ مسلمانوں کے خلاف کوئی کاررو
نہ کرے۔ لہٰذا دریا پار کرنے کے بعد جنگ
قبل اس نے راجہ داہر سے مصالحت کی ض
ضروری سمجھی۔ چنانچہ مسلمانوں کا ایک و
اس کے پاس روانہ ہوا جس کے ساتھ سن
نومسلم مولانا اسلامی بھی تھے۔ راجہ داہر کا در
آراستہ تھا جس کے رعب سے لوگوں کے
دل کانپ رہے تھے۔ موہن داس وزیر ا
سی سا کر وزیر آبنوسی کرسیوں پر براجمان
کہ مسلمان سفیر دربار میں پہنچے۔

سفیروں نے محمد بن قاسم کی طرف سے صلح کی بات کی اور دستور کے مطابق اسلامی تین شرطیں پیش کیں مگر راجہ داہر نے وزیروں سے مشورہ کے بعد کہا۔

"محمد قاسم سے کہہ دو کہ دریا پار کر کے آجائے۔ اب ہماری تلوار ہی اس کی قسمت کا فیصلہ کرے گی۔"

سفیر لوٹ گئے اور راجہ داہر نے پھر سلاچ کو طلب کیا اور کہا۔

"سلاچ! جنگ کی روانگی کے لئے شبھ گھڑی معلوم کرو کس وقت ہم روانہ ہوں کہ عربوں پر فتح پا سکیں۔"

دوسرے دن جب راجہ داہر نے دیکھا کہ محمد بن قاسم کی فوج حرکت میں آچکی ہے تو اس نے بھی اپنی فوج کو ترتیب دیا۔ آج موہن داس کے مشورے سے رانی بائی کو خاص پہرہ میں رکھا گیا تھا جیسے وہ ایک عورت نہیں سندھ کی حکومت تھی جس کی راجہ داہر وقت کے ساتھ زیادہ ہی احتیاط کر رہا تھا۔ ان کی فوج میں نقارے بج رہے تھے۔ کوہ پیکر ہاتھیوں کی فوج سب سے آگے تھی۔ اس صف کے درمیان راجہ داہر کا سفید ہاتھی تھا جس پر راجہ تاج مرصع سر پر رکھے براجمان تھا۔ راجہ کے گرد ہاتھیوں پر بڑے بہادر اور با اختیار ٹھاکر موجود تھے اس وقت راجہ نے حکم دیا۔

"سلاچ کو حاضر کیا جائے۔"

سلاچ حاضر خدمت ہوا اور ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

"مہاراج! میں نے کئی بار ستاروں کی چالیں پڑھی ہیں۔ مگر آپ کی فوج کسی بھی گھڑی میں روانہ ہو، فتح عربوں کی نظر آتی ہے کیوں ستارہ زہرہ مسلمانوں کے عقب میں اور آپ کے بالکل سامنے ہے۔"

راجہ داہر حواس باختہ ہو گیا۔ معزز ٹھاکر اور بہادر سورماؤں کو پسینہ آگیا۔ راجہ داہر نے حکم دیا کہ موہن داس کو حاضر کیا جائے۔

موہن داس حاضر خدمت ہوا اور بہت دیر تک سوچنے کے بعد بولا۔

"مہاراج! عربوں کے مقابلے میں آپ

کی فتح ممکن ہے ستارہ زہرہ آپ کے سامنے اور عربوں کے عقب میں ہے۔ جو بدترین شکست کی علامت ہے لیکن ستارہ زہرہ کی بڑی مورتی بنا کر آپ کے پیچھے رکھی جائے اور وہ تمام جنگ میں آپ کے پیچھے ہی رہے تب وہ مسلسل عربوں کے سامنے رہے گی اور مسلمان فوج ہار جائے گی۔"

راجہ داہر نے ستائش بھرے انداز میں موہن داس نے دیکھا اور ستارہ زہرہ کی مورتی بنانے کا حکم دے دیا اور جب فوج روانہ ہوئی تو راجہ داہر کے عقب میں ایک ہاتھی پہ ستارہ زہرہ کی بڑی مورتی اس طرح رکھی تھی کہ اس کا رُخ عربوں کی جانب تھا اور زہرہ کا مدمقابل آجانا عربوں کی علامت۔ لہٰذا راجہ داہر کو کوئی فکر نہ تھی۔ فتح کی اُمید میں سرشار وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ راجہ داہر اور محمد بن قاسم کی یہ لڑائی ایک روایت کے مطابق یکم رمضان ۹۳ھ اور دوسری روائت کے مطابق سات رمضان المبارک ۹۳ھ کو شروع ہوئی اور تین دن جاری رہی۔ دو دن مقابلہ بڑا سخت تھا تیسری رات راجہ داہر نے اپنے مشیروں کو بلا کر کہا۔

"میرے وفادارو! کل ہم فیصلہ کن جنگ لڑیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ شکست عربوں ہی کی ہوگی کیوں کہ زہرہ کی مورتی کا رُخ مسلسل ان کے سامنے ہے مگر ہم احتیاطاً ایک وصیت کرتے ہیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو رانی بائی کی حفاظت کرنا۔ اگر ہمیں اپنی شکست کا شائبہ بھی ہوتا تو ہم اسے خود موت کے گھاٹ اُتار دیتے لیکن اب تم سب سن لو کہ اگر عرب ہم پر غالب آجائیں تو سب یاد رکھنا کہ رانی بائی کو کسی کے ہاتھ نہ لگنے دینا ان کے ماتھے پر بھگوان نے "مہارانی" درج کیا ہے وہ جسے مل گئیں وہ سندھ کا راجہ بن جائے گا۔"

امیروں، وزیروں اور مشیروں نے وفاداری کا یقین دلایا۔ اس کے اگلے دن دس رمضان المبارک ۹۳ھ کو راجہ داہر نے میدان جنگ میں ہاتھی سے اُتر کر جنگ شروع کی مگر اس کے اقبال کا ستارہ غروب ہو چکا

تھا۔ کیونکہ اس دن وہ میدان جنگ سے واپس نہ گیا بلکہ ایک تلوار نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

راجہ داہر قتل ہو گیا۔ فوج تتر بتر۔ میدان جنگ میں افراتفری کا عالم تھا۔ عرب اور کا قلعہ فتح کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا چکے تھے۔ تلواروں کی جھنکار اور انسانوں کی آہ و بکا سے فضا گونج رہی تھی۔ گو کہ راجہ داہر کی فوج بڑی تعداد۔ قوت اور یقین کے ساتھ میدان میں آئی تھی مگر انھیں اندازہ ہو چکا تھا کہ مد مقابل کون ہے۔ تائید ربانی سے عربوں کو فتح نصیب ہوئی۔

سلایخ نے ہزاروں کے سامنے کہا تھا۔

"میں ستاروں کی چالیں سمجھنے سے قاصر ہوں کیونکہ ستارے محمد بن قاسم کے تابع نظر آتے ہیں۔ وہ جدھر رُخ موڑتا ہے ستارے وہی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔"

سندھ کے سب سے بڑے مدبر اور سب سے بڑے نجومی کی بے چارگی کے باوجود لوگ راجہ داہر کی لاش چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے تاکہ پرجا میں حوصلہ قائم رکھ کر فتح پا سکیں۔

اِدھر یہ سب ہو رہا تھا کہ سردار یکے بعد دیگرے شکست کا اعتراف کر رہے تھے اور محمد بن قاسم کی سنگ باری قلعہ کو ہلائے دے رہی تھی۔ اِدھر قلعہ کے اندر قیامت کا سماں تھا۔ راجہ داہر کے مصاحب اور سندھ کے وفادار چتا تیار کر رہے تھے۔ دھرم کی رُو سے بھی رانی بائی کو ستی ہونا تھا لہٰذا عین اس وقت جب عرب سر دھڑ کی بازی لگائے سنگ باری اور آتش باری سے قلعہ کے بُرج گرانے کے درپے تھے۔ اس وقت قلعہ کے اندر ایک ایسی شاندار چتا تیار کی گئی جو رانی بائی کے شایانِ شان تھی جس میں بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے دور دور سے نظر آ رہے تھے اور جس کی گرمی میں دم گھٹ رہا تھا۔ ایسے میں رانی بائی کی خواصیں اُسے دُلہن بنا رہی تھیں۔ قیمتی زیورات اور نفیس ملبوسات سے آراستہ کر رہی تھیں اور دیکھنے والے

حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ آج سندھ کی حسین رانی نہیں بلکہ ایک تھکے ہوئے جسم اور دہشت زدہ چہرہ والی نڈھال عورت جس کی آنکھوں کے گرد حلقے، جس کے بال سفید اور جس کے چہرے پر برسوں کی محرومی و نامرادی کا عکس تھا اور جس کے چہرے پر برسوں کی اور رونے میں وحشت تھی، آج اپنی خواصوں اور غلاموں کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔

"مجھے چھوڑ دو۔ وہ میرا پتی نہیں تھا۔"

پھر لوگ اسے گھسیٹتے ہوئے چتا کی طرف لے گئے۔ وہ چیختی چلاتی اور لوگوں کو یقین دلاتی رہی کہ راجہ اس کا شوہر نہیں تھا۔ مگر سب بے سود اور جب عرب فوجیں بڑے زبردست حملے کے بعد ارور کے قلعے میں داخل ہونا شروع ہوئیں تو لوگوں نے شور مچاتی دہائی دیتی ہوئی ایک نیم دیوانی عورت کو آگ کے ایک بڑے سے الاؤ میں دھکیل دیا۔ اس کی ایک آخری چیخ گونجی۔

"مجھے چھوڑ دو وہ میرا پتی نہیں تھا۔"

مگر آگ اسے ایک لمحہ میں بھسم کر گئی اور جب سندھ کا نوجوان فاتح اس الاؤ کے قریب کھڑا لوگوں سے پوچھ رہا تھا۔

"یہ آگ کیسی ہے؟"

تو راجہ کے وزیر مشیر اور مصاحب دست بستہ کھڑے عرض کر رہے تھے۔

"جناب! یہ رانی بائی کی چتا ہے جو اپنے پتی کی محبت میں ستی ہو گئیں۔" ●

استدراک

کچھ مورخین کہتے ہیں کہ محمد قاسم ٹھیک اسوقت پہنچا تھا جب بائی کو لوگوں نے پکڑ کر چتا میں پھینکنا چاہا تھا محمد بن قاسم نے اُسے بچالیا اور اس سے شادی کر لی۔ پھر اسی کے مشوروں سے اس نے دوسرے قلعے بھی فتح کئے۔ اس سے محمد بن قاسم کی اولاد ہوئی۔ اسکے بعد جب محمد بن قاسم پر خلیفہ کا عتاب نازل ہوا تو جب اُسے گرفتار کرکے دارالخلافت لیجایا گیا تو رانی بائی اپنے بچوں کیساتھ سندھ ہی میں رہ گئی۔ اسکے بیٹوں میں اُسامہ اور یوسف بہت مشہور ہوئے۔ اُسامہ نے تلوار سنبھالی اور یوسف نے قلم محمد بن قاسم کے جانشینوں کے اخلاق وکردار سے متاثر ہو کر جب یہاں کے غیر مسلموں نے اسکا بت بنا کر پوجنا شروع کر دیا تھا تو یوسف بن محمد نے انکے دشمنوں کی صحیح کی

اسلامی نظام میں عورت کا مقام

ایک فطری اور سائنٹیفک جائزہ

(مائل خیرآبادی)

مکتبہ حجاب رامپور۔ یوپی۔
(۲۴۴۹۰۱)

تعداد اشاعت . . . . دو ہزار

پہلی بار . . . . نومبر سنہ ۶۹ء

قیمت اعلیٰ ایڈیشن . . . . پانچ روپے

مطبوعہ . . . . جے. کے پرنٹرس دہلی

ملنے کا پتہ

ماہنامہ حجاب رامپور۔ یوپی۔ انڈیا۔ ۲۴۴۹۰۱

انتساب

• تحریک اسلامی کی راہ میں

• مردوں کو قوت پہنچانے والی

• عظیم خواتین کے نام .....!

(مائل خیرآبادی)

فہرست عنوانات

تمہید

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کل کی بات ہے، اسلام دشمن تحریکوں نے اپنی سیاسی اور سائنسی ترقی کی بدولت مسلمانوں پر ہر طرح کی برتری حاصل کر لی تھی۔ مسلمان سیاسی اور سائنسی حیثیت ہی سے نہیں، ذہنی اعتبار سے بھی ان سے مرعوب ہو چکے تھے۔ مرعوبیت کا یہ عالم تھا کہ وہ ان کی ایک ایک نامعقول ادا کو بھی پسند کر کے اپنا تے چلے جا رہے تھے۔ انھوں نے ان کی ہاں میں ہاں ملا کر مساوات مرد و زن کا نظریہ بھی مان لیا تھا۔ مسلمان عورت بھی اسلامی اصولوں کو توڑ کر اور پردہ چھوڑ کر زندگی کے میدان میں ننگی اتر آئی تھی۔ شیطان خوش تھا کہ اس کے چیلوں نے میدان مار لیا۔ اب اسلام دنیا میں تھوڑے ہی دنوں کا مہمان ہے۔ عنقریب کوئی اسلام کا نام لیوا بھی نہ رہے گا لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت کو کون پا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان دنوں کو پھیرتا رہتا ہے کبھی کسی کے دن کبھی کسی کے دن (تلک الایام نداولہا بین الناس) نیز اسلام کو اور اپنے قانون کی کتاب کو دنیا میں محفوظ اور قائم رکھنے کی ذمہ داری بھی خود لے رکھی ہے اس لئے اچانک ایسے حالات پیدا کر دیے کہ تحریک اسلامی جو صدیوں سے سوئی پڑی تھی۔ اس نے کروٹ لی۔ جاگی، اٹھی مسلمانوں کو جھنجھوڑا، اسلام دشمن تحریکوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ٹکر ماری تو تحریک اسلامی کے علمبردار جو کل تک یا تو ہتھیار ڈال کر غیر اسلامی تحریکوں کا سامنا کرنے سے بھاگ رہے تھے یا کچھ ٹھہر ٹھہر کر مدافعت کر رہے تھے، آج مدافعت کے بدلے اقدامی مرحلے میں قدم رکھ چکے ہیں۔ آج تحریک اسلامی کے کارکن ہر میدان میں بڑھ بڑھ کر دو ٹوک جواب ہی نہیں دیتے بلکہ ان کے روگوں پر انگلی رکھ رکھ کر بتا رہے ہیں کہ یہ دیکھو، تمہارا بدن یہاں سڑ گیا ہے، یہ دیکھو یہاں سے کوڑھ ٹپکتا ہے، یہ دیکھو بدگوشت ہو گیا ہے۔ ان ساری خرابیوں کی روک تھام اسی وقت ہو سکتی ہے جب تم اسلامی اصولوں کو اپنا لو۔

غیر اسلامی تحریکوں کے پاس تحریک اسلامی کا مقابلہ کرنے کے لئے مکر و فریب اور جھوٹے پروپیگنڈے
ے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ اب وہ اصولوں سے نہیں بلکہ دھن، دھونس، دھاندلی سے کام لے رہی ہیں۔

شیطان کو معلوم تھا کہ دنیا کی دوسری قومیں تو اپنا مذہب چھوڑ کر ترقی کر سکتی ہیں کیونکہ ان کے
س خدا کی طرف سے ہدایت نہیں اور اگر کہیں کچھ ہے بھی تو وہ اصل نہیں لیکن مسلمان وہ قوم ہے
ں کے پاس اللہ کا کلام قرآن مجید موجود ہے۔ جب تک مسلمان اسلام پر قائم رہے گا ترقی کرتا رہے گا۔
جیسے ہی اس نے اسلام کو چھوڑا کہ دھڑام سے نیچے آ گرا۔

شیطان جانتا تھا کہ مسلمان کا سب سے زیادہ مضبوط مورچہ اس کا گھر ہے۔ اس نے اپنے چیلوں
اس طرف اشارہ کیا کہ جب تک اس "گھر" کی گھر والی کو بے گھر نہ کیا جائے گا اس وقت تک کامیابی
یں ہو سکتی۔ اس کے چیلے اسلام دشمن تحریکیں لے کر آئے تھے۔ انھوں نے پہلے عورت کی آزادی کا نعرہ
د کیا۔ پھر آواز لگائی کہ عورت اور مرد دونوں ہر حیثیت سے برابر ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں عورت کو
د کے برابر حقوق ملنا چاہیے۔

چونکہ شیطان اسی داؤں سے مغربی قوموں کے گھروں کو تباہ کر چکا ہے اس نے سوچا تھا کہ عالم
سلام کو بھی اسی داؤں سے چت کر دے گا لیکن اللہ نے فضل فرمایا۔ تحریک اسلامی نے مسلمانوں میں
یسے مفکر اور دانشور پیدا کر دئے جنھوں نے غیر اسلامی تحریکوں کے علمبرداروں کے حملوں کو روکا ہی نہیں
ڑھ کر ٹوکا بھی اور ثابت کیا کہ اسلام نے مسلمان مردوں اور عورتوں کو جو اصول دئے ہیں وہی ٹھیک
ہیں۔ خود تمہارے اصول و نظریات گھناؤنے ہیں۔ وہ فطرت سے جوڑ نہیں کھاتے۔ ہماری طرف دیکھو
ہم بتاتے ہیں، چنانچہ ایک مفکر لکھتا ہے۔

" اسلام نے عورت کے سپرد وہی فرائض کئے ہیں جو فطرت نے اسے دئے ہیں۔ اس
پر وہی ذمہ داریاں ڈالی ہیں جو فطرت نے اس پر ڈالی ہیں۔ اس کے بعد اس کو مردوں

کے ساتھ بالکل برابر کی حیثیت دی ہے۔ ان کے حقوق میں کوئی کمی نہیں کی۔ ان سے تو عزت کا وہی مقام رکھا جو مردوں کے لئے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مسلمان عورتوں کو شکر ادا کرنا چاہئے کہ وہ اس معاشرے میں پیدا ہوئی ہیں جس سے بڑھ کر عورتوں کی عزت دنیا کے کسی معاشرے میں نہیں ہے۔ ذرا جا کر امریکہ میں دیکھئے، عورت کا کیا حال ہے۔ انگلستان میں جا کر دیکھئے، عورت کا کیا حال ہو رہا ہے۔ کیسی مصیبت کی زندگی وہ بسر کر رہی ہے۔ باپ کے اوپر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ بیٹے پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ بھائی پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ ادھر وہ جوان ہوئی ادھر اس کا باپ رخصت کر دیتا ہے کہ جاؤ اور خود کما کر کھاؤ۔ اب اس کے بعد اس سے بحث نہیں ہے کہ وہ کس طرح کما کر کھائے اور کس طرح زندگی بسر کرے۔ مغرب کی عورت اس وقت اس قدر بے کسی اور بے بسی کی زندگی بسر کر رہی ہے کہ اس پر ترس کھانے والا بھی کوئی نہیں۔ وہاں کے رہنے والوں سے پوچھئے کہ وہاں اس کا کیا حال ہو رہا ہے۔ یہاں باپ اپنی بیٹی کی ذمہ داری سے اس وقت بھی سبکدوش نہیں ہوتا جب تک وہ اس کی شادی نہیں کر دیتا۔ شادی کے بعد بھی وہ اس کی اور اس کی اولاد تک کی فکر رکھتا ہے۔ بھائی اپنی بہنوں کے پشت پناہ ہوتے ہیں۔ شوہر اپنی بیویوں کو گھر کی ملکہ بنا کر رکھتے ہیں۔ یہاں آپ کو آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے اور آپ کی عزت کی جاتی ہے۔ وہاں جب تک آپ نیم برہنہ ہو کر مردوں کے سامنے ناچیں نہیں، آپ کے لئے عزت کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اب اگر ہمارے ملک کی عورتیں ان حقوق پر قناعت نہیں کرنا چاہتیں جو اسلام ان کو دیتا ہے اور وہی نتائج دیکھنا چاہتی ہیں جو مغربی ممالک کی عورت دیکھ رہی ہے تو انھیں اس کا اختیار ہے مگر یہ سمجھ لیجئے کہ اس کے بعد پھر پلٹنے کا موقع نہیں ملے گا۔ پھر آپ رجوع بھی کریں گی تو معافی کی امید نہیں ہے۔ ایک معاشرہ جب بگاڑ کے راستے پر چل پڑتا ہے تو اس کی انتہا کو پہنچ

ے

بغیر نہیں رہتا۔

"یہ کہنا کہ اسلامی حدود میں رہ کر عورت جو ہماری آبادی کا نصف حصہ ہے۔ ملک کی ترقی میں معاون بننے کے بجائے رکاوٹ کا باعث ہے۔ اس کے جواب میں میں پوچھتا ہوں کہ ملک کی ترقی میں نئی نسلوں کو پرورش کرنا اور ان کو اچھی تربیت دینا بھی شامل ہے کہ نہیں؟ وہ ملک کیسے ترقی کر سکتا ہے جس میں بچوں کو اول روز سے ماں اور باپ کی محبت نصیب نہ ہو اور پیدا ہوتے ہی وہ کرایے کی پالنے والیوں کے حوالے کر دیئے جائیں؟ باپ بھی نوکری پر گیا ہوا ہے اور ماں بھی نوکری پر گئی ہوئی ہے اور بچوں کو وہ ادارے سنبھال رہے ہیں جن کے کار پرداز بہر حال ماں باپ کی جگہ تو نہیں لے سکتے اور بچوں کو ابتدا ہی سے محبت کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ جن بچوں کو بچپن میں ماں باپ کی محبت نصیب نہیں ہوتی ہے۔ وہ حقیقت میں انسان بن کر نہیں اٹھتے، آج دنیا میں جو ظلم و ستم اور درندگی ہو رہی ہے اور کم سنی کے جرائم نے معاشرے کے لئے ایک پریشان کن مسئلہ پیدا کر دیا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ اب دنیا کی باگیں ان نسلوں کے ہاتھوں میں آ رہی ہیں جنھوں نے ماں باپ کی محبت نہیں دیکھی۔ یہ بچے جب بڑے ہوتے ہیں تو پھر ماں باپ کو بھی ان سے کوئی محبت نہیں ملتی اور جہاں خون کے رشتوں تک میں محبت نہ ہو وہاں انسانی محبت کا کیا سوال؟ ایسے انسان تو پھر خود غرضی کے پتلے اور آدمیت کے احساسات سے خالی ہی ہوں گے۔

وہاں ایک بوڑھی ماں ایک کمرے میں رہتی ہے اور بڑھاپے کی پنشن پر گذر بسر کر رہی ہے، بیٹے اور بیٹیاں سب خوش حال ہیں لیکن اس بڑھیا کا پرسان حال کوئی نہیں۔ بڑھیا مر گئی ہے مگر کسی کو پتہ نہیں۔ وہ تین روز تک جب اس کے دروازے

سے دودھ کی بوتل نہیں اٹھائی گئی تو دودھ والے نے پولیس کو رپورٹ کی کہ فلاں صاحب سے دودھ کی بوتلیں نہیں اٹھی ہیں۔ تب جاکر پولیس نے دروازہ توڑا اور معلوم ہوا کہ تین روز سے اس بڑھیا کی لاش سڑ رہی ہے۔ یہ ان عورتوں کا حال ہے جن کے بیٹے اچھے اچھے منصبوں پر فائز ہیں۔ جو لوگ برسوں سے وہاں رہتے ہیں وہ وہاں کے جو حالات سناتے ہیں ہمیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی تعلق کا وہاں خاتمہ ہو چکا ہے اور باپ کا بیٹے سے بیٹی کا ماں سے اور بھائی کا بھائی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سب کچھ اسی چیز کا نتیجہ ہے کہ ملک کی ترقی کا مفہوم صرف معاشی پیداوار کی ترقی سمجھ لیا گیا اس کے لئے عورتوں اور مردوں سب کو لاکر معاشی میدان میں کھڑا کر دیا گیا اور خاندانی نظام کے برباد ہونے کی کوئی پروا نہیں کی گئی۔ ترقی صرف معاشی پیداوار بڑھانے کا نام نہیں ہے۔ اگر عورتیں گھروں میں نئی نسل کو تربیت دیں، انسانیت سکھائیں۔ ان کے اندر اعلیٰ اخلاق اور خدا ترسی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ تو یہ بھلا ترقی ہی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ ملک کی ترقی کا صرف یہی ایک ذریعہ نہیں ہے کہ عورتیں بھی کارخانوں میں جاکر کام کریں۔ ترقی کا یہ بھی ایک بڑا ذریعہ ہے کہ گھروں میں بچوں کو انسانیت کی تربیت دے کر تیار کیا جائے حتیٰ کہ وہ دنیا میں انسانیت کے رہنما بننے کے قابل بنیں۔

میں نے اوپر کی تحریر میں ایک مفکرِ اسلام کی عبارت کا کچھ اقتباس سمو دیا ہے۔ یہ اقتباس اس مجموعے کے لئے بہترین دیباچہ ہے۔ جو "اسلامی نظام میں عورت کا مقام اور اس کا اصل کام" کے نام سے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس مجموعے کا ہر مضمون فطری اور سائنٹیفک اصولوں کی گواہی دینے والا ہو نیز تاریخ سے بھی مطابقت رکھتا ہو۔

نہیں ہوئیں۔ اور کیا ان کے لیے اللہ نے اور اللہ
کے رسولؐ نے قانون نہیں بنایا۔ کیا انھیں تعزیرات
اسلامی سے بری کر دیا گیا۔

تعزیرات اور قانون کا یہ سب سے بڑا
ثبوت شہادت دیتا ہے کہ محض تربیت انسان
کو انسان بنائے رکھنے کے لیے کافی نہیں ہے
بلکہ قانون کی بھی اہمیت ہے۔ کاش میں بھی ان
لوگوں میں سے ہوتا جو خیالی پلاؤ پکا کر اپنا دل
ٹھنڈا کر لیتے ہیں۔ میں کہ میں تربیت صرف
تربیت کے فوائد پر بہترین نظمیں کہہ سکتا ہوں
اور کہیں بھی۔ میں کہ میں تربیت اور صرف تربیت
کے فوائد پر تعمیری افسانے لکھ سکتا ہوں اور لکھے
بھی۔ میں کہ میں تربیت اور صرف تربیت پر
اعلیٰ درجے کے مضامین لکھ سکتا ہوں اور لکھے
بھی۔ مردوں کے لیے بھی اور عورتوں کے لیے
بھی۔ بوڑھوں کے لیے بھی۔ جوانوں کے لیے
بھی، بچوں کے لیے بھی۔ لیکن میرے لکھے ہوئے
افسانوں، مضمونوں اور نظموں کو پڑھ کر کوئی
ایسا انسان بنا جیسا ان تخلیقات کا تقاضا تھا اور
کیا خود ان تخلیقات کو منظر عام پر لانے والا
اس کا مستحق ہے کہ اُسے قانون سے معاف رکھا
جائے۔ میں دیکھے بھالے سماج کی بات کر رہا
ہوں۔ زندگی کے تجربے بیان کر رہا ہوں مختصرًا
عرض کر رہا ہوں۔ میں اس دائرے کے باہر قدم
نہیں رکھوں گا اور جو بات حق ہے اُسے کوئی
سنے نہ سنے میں سناتے جاؤں گا۔

اسلامی تمدن کی بات اوپر آگئی۔ اب ضرورت
نہ تھی کہ اس سے ہٹ کر مثال دی جاتی لیکن ہمارے
فاضل دوست جناب پوسٹ ماسٹر صاحب اسلامی
تمدن کو قابل اعتنا کب سمجھتے ہیں لہٰذا ان کے لیے
ضرورت ہے کہ ان کے پسندیدہ ماحول اور ان
کے متمدن ملکوں کی مثال پیش کروں۔ ملاحظہ فرمائیں
آج کل کے مہذب اور متمدن ملکوں، امریکہ، روس
اور یورپ میں ایک شخص بچپن سے لے کر جوانی تک
اور بڑھاپے کی عمر تک برابر شراب، گانجا، چرس وغیرہ
سے روکا جاتا ہے۔ اخبارات، رسائل، کتابوں اور
لیکچروں سے وہ شراب کی خرابیاں سنتا ہے، مطالعہ
کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ان نشیلی چیزوں کے برے
نتیجوں کو دیکھتا بھی ہے۔ وہ اچھی طرح دیکھتا ہے
کہ جو لوگ ان نشیلی چیزوں کی بھینٹ چڑھ گئے ان

کے جسم کے اعضاء بگڑ گئے، ان کی صورتیں مسخ ہو گئیں ان کی عقل چکر کھا گئی اور دل و دماغ بیکار ہو گئے۔

مگر ان سب باتوں اور اعلیٰ تربیت کے ہوتے ہوئے پھر وہی شخص مے نوشی پر مٹا ہوا ہے۔ شراب کے لیے اپنے کو وقف کر دیا ہے اور دن پر دن اس عادت میں ترقی ہو رہی ہے حالت یہ ہے کہ اچھی پی لی، خراب پی لی، جیسی پائی شراب پی لی۔ اور اگر کبھی مالی، جسمانی نقصان سامنے آیا تو توبہ کرنے کو جی چاہا مگر کس ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ :-

مری توبہ شکن تو بہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

جناب پوسٹ ماسٹر صاحب! اب بتائیے، تربیت نے کیا تیر مارا اور تہذیب نے کیا اثر دکھایا۔ کیا یہ ایسی محسوس اور دیکھی بھالی دلیلیں نہیں ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ مرد جو عورتوں پر حملہ آور ہے صرف تربیت کے بل بوتے پر رک سکے گا؟ بجائے! چاہے وہ کیسی ہی اعلیٰ درجے کی تربیت ہو مگر جب تک تربیت کے ساتھ کوئی مادی رکاوٹ بھی شامل نہ کی جائے جو آگا کو گندی باتوں میں لت پت ہونے اور خفیہ کی پیروی کرنے سے روک دے۔ اس وقت تک انسان انسان نہیں رہ سکتا۔ مرد کی بات خصوصیت سے اس لیے کہی کہ قدرتی طور پر اس کی بناوٹ اسے سیدھی راہ پر چلنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ بدکرداری میں پھنس کر اگر عورت پر حملہ کرے تو کامیاب ہو سکتا ہے لیکن عورت حملہ کرے تو کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اس بنیاد پر میں کہتا ہوں کہ مسلمان اپنی بیوی کو پردے میں رکھ کر قیدی نہیں بناتا اور نہ اس لیے کہ اسے اپنی بیوی پر بھروسا نہیں ہے بلکہ وہ اسے حملہ آور کمینے مرد کے پنجوں سے بچانے کے لیے ایسا کرتا ہے میں پھر وہی بات کہوں گا کہ عورت کو بہکانا مرد ہی کا کام ہے۔ مسلمان عورت اس لیے نہیں پردے میں رہتی کہ یہ پردہ اس کے لیے ذلیل، حقیر اور اس کے اخلاق پر اعتبار نہ کیے جانے کی علامت ہے بلکہ اس کا یہ پردہ بتا رہا ہے کہ وہ خاتون ایک شریف عورت

ہے۔ عزت والی ہے۔ غیرت دار ہے اور اپنے آپ کو حملہ آور سے بچانے کے لیے دو ہتھیاروں سے آراستہ ہے جن میں سے ایک کا نام فضائل اخلاق ہے اور دوسرا اس کا ظاہری پردہ ہے۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ آپ کے مہذب ملکوں نے یہی دونوں ہتھیار عورت سے چھین لیے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں اب عورت عورت نہیں رہی۔ اب وہاں کے لوگ اس عورت کے لطف سے محروم ہوتے جا رہے ہیں جس کی پلکوں کے پردے میں حیا کے موتی جھلکتے ہیں اور عنقریب وہ زمانہ آ رہا ہے کہ یہ متمدن ملک اس شریف عورت سے ترس جائیں گے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے سکون کے لیے بنایا تھا۔ یہ سب قانون کی اہمیت گھٹ جانے سے ہوگا۔ آپ دیکھتے جائیے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

• ہر سماج اور سوسائٹی کی تاریخ اس بات پر گواہی دیتی ہے کہ عفت و پاکدامنی کی اعلیٰ صفت پر مرد ہی حملہ آور ہوتا ہے اور عورت مدافعت کرتی ہے لہٰذا اس صورت میں یہ بات انصاف کی ہوگی کہ ہم کوئی ایسا ذریعہ تلاش کریں۔ جس کی مدد سے کمزور اور نازک بدن عورت کو سنگدل اور بدچلن مرد کی شرارت سے بچا سکیں۔ اس کے برعکس یہ بات انصاف کے خلاف ہے کہ ہم عورت کو بے حیا مرد کی چالبازیوں کے پنجے سے بچانے کی کچھ بھی تدبیر نہ کریں مگر عورت کو بدچلنی کا الزام دینے کے لیے تیار رہیں۔

جس وقت ہم عورت کو بدچلن کہہ کر بُرا بھلا کہنے کے موڈ میں ہوں تو یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ کمزور مخلوق طاقتور مرد کے شیطانی حیلوں اور مکر و فریب کے جال سے کیونکر بچ سکتی ہے جب کہ خونخوار شیر باوجود جنگلوں میں زندگی بسر کرنے اور اژدہے باوجود تاریک غاروں اور گہرے بلوں میں رہنے کے، اس کے (مرد کے) جال میں پھنس جاتے ہیں۔

پردے پر تین بڑے اعتراض

لوگ کہتے ہیں کہ پردے سے تین بہت ہی بڑے نقصانات ہیں۔ جو عورت پر بے حد بُرے اثر ڈالتے ہیں۔

۱۔ پردہ عورت کی صحت کو برباد کرکے اُسے بیماریوں کا شکار بنا دیتا ہے۔ جس سے اُس کا انگ انگ کمزور ہوجاتا ہے۔ اور پٹھوں کی کمزوری اخلاقی قوتوں میں خلل ڈالنے کا سبب بنتی ہے۔ چنانچہ پردہ نشین عورت اپنی نفسانی خواہشوں کی قید میں گرفتار رہتی ہے کیونکہ اعصاب کی صحت اور درستی انسان کو اپنے جذبات نفسانی پر قابو رکھنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔ اور ان کی کمزوری ہی اس بات کا بڑا سبب ہے کہ انسان اپنی خواہشوں کو روک نہ سکے اور اسیرِ ہوا و حرص ہوجائے۔

۲۔ پردے پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ پردے کی وجہ سے شادی کرنے والا مرد اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھ نہیں سکتا اور یہی بات کثرتِ طلاق اور عورت مرد کی باہمی ناچاقی کا بڑا باعث ہے۔

۳۔ پردے پر تیسرا اعتراض یہ ہے کہ پردہ عورت کو تہذیب اور علم حاصل کرنے سے روکتا ہے۔ اور اُسے حسبِ خواہش مدرسوں اور بورڈنگ ہاؤسوں میں رہ کر اپنی عقلی اور اخلاقی قوتوں کو بڑھانے سے باز رکھتا ہے۔

گئیں کہ اسکو صرف وہی دیکھ سکیں جو مرد اور عورت کی برابری اور آزادی کے چاہنے والے ہیں بلکہ وہ بھی مطالعہ کرسکتے ہیں جو مرد اور عورت کی برابری اور آزادی کو تسلیم نہیں کرتے۔

پروپیگنڈہ

عورت اور مرد کی برابری کے دعوے داروں نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں دو قول پیش کئے ہیں ان میں سے ایک قول پروفیسر فرش لو کا ہے جو فزیالوجی کا پروفیسر اور اٹلی اکاڈمی کا ممبر رہا ہے۔ فرش لو کہتا ہے کہ:۔ میں نے ایک عرصے تک علم ریاضی، اخلاق اور فلسفہ کی تعلیم دی ہے۔ میرے شاگردوں میں ایک بڑی تعداد لڑکیوں کی بھی رہی مگر میں نے ان میں کوئی ایسی کمزوری نہیں پائی جو ان کی تعلیمی ترقی کے لیے روک ہو۔ یہ میری قطعی رائے ہے کہ مرد اور عورت کی دماغی قوتوں میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہے۔

دوسرا قول پروفیسر مے تن جازو کا ہے۔ یہ پروفیسر اپنی کتاب "عورتوں کی فزیالوجی" میں لکھتا ہے کہ:۔

"تشریحی تحقیقات کی رو سے عورت اور مرد میں کسی قسم کا فرق ثابت نہیں ہوتا۔"

کاتا اور لے دوڑی

عورت اور مرد کی برابری چاہنے والے صرف انہی دو پروفیسروں کے قولوں کو اچھالتے پھرتے ہیں اور بالکل اس طرح جیسے ایک بڑھیا نے سنا کہ بازار میں سوت اور تاگے کی مانگ بڑھ گئی ہے بس اس نے جلدی جلدی جیسا تیسا کاتا اور لے دوڑی۔ بالکل اسی طرح یہ لوگ ان دو پروفیسروں کے قولوں کا پروپیگنڈا کرکے اپنا بازار گرم کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ:۔

"علم فزیالوجی کے مشہور اور عظیم علما، جو عورتوں کے جسموں اور ان کے دماغوں پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں اس امر پر ایک رائے ہیں کہ عورت اپنی تمام عقلی طاقتوں میں مرد کے برابر ہے۔"

اس دعوے کے لفظوں میں "مشہور اور عظیم" اور "ایک رائے ہیں" پر میں نے اس لیے خط کھینچ دیا ہے کہ ان ہی کی بدولت پروپیگنڈے میں زور پیدا ہو سکتا ہے اور یہ کہ ہر شخص یہی رائے قائم کرنے

"یورپ کے تمام عظیم اور مشہور علما کسی بات میں عورت کو مرد سے کم نہیں سمجھتے"

انسائیکلوپیڈیا میں عورت پر بحث

ہم کہتے ہیں کہ یہ سراسر دھوکا اور محض فریب ہے جو بے مطالعہ اور معلومات کی کمی ہے جس میں سطحی نظر رکھنے والے پھنس سکتے ہیں۔ اگر ان دو رایوں کے مقابلے میں یورپ کے محقق علما کی رائیں دیکھی جائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ یورپ کا فاضل ترین طبقہ ہرگز اس رائے کو نہیں مانتا۔ ہم ان دو قولوں کے مقابلے میں بیسیوں رائیں پیش کریں گے۔ ہم ان علما کی رائیں پیش کریں گے جو موجودہ یورپ نے تمدن کے بہترین دماغ کہلائے بہترین مصنف تسلیم کر لیے گئے ہیں یعنی جو علم تشریح الابدان، فزیالوجی اور سائیکالوجی کے جلیل القدر مستند علما ہیں ان مستند علما کی رائیں ہم نے کسی اخبار سے نہیں لیں بلکہ انسائیکلوپیڈیا لفظ عورت سے لے کر پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

عورت کا جسم علم تشریح الابدان کی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جسم کے اعتبار سے مرد عورت سے بہت قوی ہے۔ یہ اتنی کھلی ہوئی بات ہے جسے قیاس اور گمان نہیں کہا جا سکتا بلکہ دیکھی اور پرکھی جا چکی ہے اور یقین کے درجے تک پہنچ گئی ہے۔ عورت کی اسی جسمانی کمزوری کی وجہ سے علمائے تشریح آج کی ترقی یافتہ عورت کو آج کے ترقی یافتہ مرد کے برابر درجہ دینے کو تیار نہیں۔

یہ کہہ کر انسائیکلوپیڈیا کا مصنف لفظ "عورت" پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"مرد اور عورت کے چھپے ہوئے انگوں (زیر ناف) اور اعضائے زینت (سینہ، چہرہ اور کمر) کی شکل و صورت اور انکی بناوٹ میں تو فرق کھلا ہوا ہے ہی کہ اس سے مرد اور عورت کے جسم پہچانے جاتے ہیں، ان کے علاوہ عورت کا انگ انگ سر سے پیر تک مرد کے اعضاء (انگوں) کا مثل نہیں ہے یہاں تک کہ وہ اعضاء بھی نہیں جو دیکھنے میں یکساں نظر آتے ہیں جیسے ہاتھ، پیر، ناک کان وغیرہ۔

اس کے بعد (صاحب انسائیکلوپیڈیا) نے علم تشریح کی تحقیقات کو سامنے رکھ کر عورتوں کے اعضاء پر بڑی گہرائی سے بحث کی ہے اور اس بحث کا نتیجہ یہ نکالا ہے:۔

درحقیقت عورت کے جسم کی بناوٹ میں بچے کے جسم کی بناوٹ پائی جاتی ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچے کی طرح ہر بات کا اثر ایک عورت بھی جلد ہی لے لیتی ہے۔ بچے کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی افسوس اور رنج والی بات ہو تو فوراً رونے لگتا ہے اور اگر خوشی کی بات ہو تو اس کا چہرہ کھل اٹھتا ہے۔ قریب قریب یہی حال عورت کا ہے۔ وہ مرد کے مقابلے میں بہت جلد ہر بات کا اثر لیتی ہے۔ کوئی افتاد پڑنے اور کسی خوفناک موقع پر عورت ثابت قدم نہیں رہتی بلکہ وقت پڑنے پر پہلے ہی ہلے میں چت ہو جاتی ہے۔

عورت کا قد

تشریح الابدان کے علمی تجربے سے یہ ثابت ہو چکا ہے اور مرد اور عورت کی جنس کو سامنے رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے کہ عورت کا قد مرد کے قد سے کم ہے اور کم، با ہے علمی تجربے نے عورت اور مرد کا جو تناسب نکالا ہے وہ یہ ہے کہ عورت کے قد کی لمبائی مرد کے قد کی لمبائی سے اوسطاً بارہ سینٹی میٹر کم ہے۔ صاحب انسائیکلو پیڈیا آگے لکھتا ہے کہ یہ فرق کسی خاص ملک اور قوم تک محدود نہیں ہے بلکہ جس طرح ہماری متمدن دنیا میں یہ فرق ہے اسی طرح وہ وحشی قومیں جو فطری زندگی بسر کرتی ہیں۔ ان میں بھی ہے۔ اتنا ہی نہیں یہ فرق بچوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ بلوغ سے پہلے ایک لڑکی اور ایک لڑکے کے قد میں بھی یہ فرق دیکھا جا سکتا ہے۔

وزن

جس طرح مرد اور عورت کے جسم میں فرق ہے اسی طرح دونوں کے جسموں کے وزن میں بھی فرق ہے مرد کے جسم کا وزن اوسط سینتالیس کلو ہے اور عورت کے جسم کے وزن کا اوسط ساڑھے بیالیس کلو یعنی مرد کے جسم کا وزن عورت کے جسم کے وزن سے پانچ کلو سے بھی زیادہ ہے۔

رگ پٹھے

جسم کی لمبائی چوڑائی اور موٹائی اور وزن میں بھی عورت مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور اس جسم کے اندر جو قوت پائی جاتی ہے اس میں بھی وہ مرد کے برابر نہیں ڈاکٹر وو فارینی انسائیکلو پیڈیا میں لکھتا ہے کہ:۔

"عورت اور مرد کے رگ پٹھوں اور ان کی قوتوں کو دیکھا گیا تو دونوں کی رگوں، دونوں کے پٹھوں، دونوں کے ہڈیوں اور ان کی قوتوں میں فرق پایا گیا۔ اعتبار سے قوت کے تین حصوں میں

دو حصے مرد کے حق میں آئے اور ایک حصہ عورت نے پایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت قوت کے اعتبار سے مرد کے مقابلے میں آدھی ہے۔ یہی فرق رگوں اور پٹھوں کے ہلنے اور سکڑنے میں ہے۔ مرد کے انگ عورت کے انگوں سے بہت تیز، بہت مضبوط اور بہت فعال ہیں یعنی جلد کام کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

دل | دل کا حجم، دل کی دھڑکن، دل کا اثر قبول کرنا، دل سے خون کا اچھال، دل کا رگوں کی طرف خون پھینکنا وغیرہ ان سب باتوں کا تجربہ کیا گیا تو ثابت ہوا کہ عورت کا دل مرد کے دل سے تھوڑا سا چھوٹا ہے اور عورت کا دل مرد کے دل سے ضعیف اور کمزور ہے۔ یہ ضعف اور کمزوری دھڑکنوں اور خون کے اچھال اور خون پھینکنے پر بھی اثر ڈالتی ہے۔

سانس کی چال | سرعت تنفس یعنی سانس کی چال میں بھی مرد و عورت ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ سانس کے ذریعہ کاربونک ایسڈ کے جو ذرے باہر آتے ہیں وہ جسم کے اندرونی حصے کی حرارت تپش بنکر سانس میں ملے جلے ہوتے ہیں۔ تجربہ کیا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ مرد ایک گھنٹہ میں لگ بھگ گیارہ گرام کاربونک مقدار جلا دیتا ہے مگر عورت چھ گرام سے کچھ ہی زیادہ جلاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مرد میں تپش و حرارت عورت سے دوگنی ہے۔

دماغ | چونکہ دل اور دماغ کا براہ راست تعلق ہے اور اس تعلق سے دل دماغ کو جو ٹیلیفون کرتا ہے اس میں وقفہ کا تعین اتنا کم ہے کہ سیکنڈوں کے لاکھوں حصے بھی اس وقفہ کو بتا نہیں سکتے تو جب دل اور دماغ کا لگاؤ اتنا قریب ہے تو عورت اور مرد کے دماغ میں بھی وہی فرق پایا گیا جو دونوں کے دلوں میں ہے۔ دل اور دماغ سے آپ سے آپ انسان جو کچھ پاتا ہے اسے وجدان کہتے ہیں۔ عورت اور مرد کے وجدان کے بارے میں مشہور نہلسٹ فلاسفر علامہ پرودھن نے لکھا ہے کہ:

"عورت کا وجدان مرد کے وجدان کے مقابلے میں کمزور ہے اور عقل بھی مرد کی عقل سے ضعیف ہے۔ دماغ اور دل کمزور ہونے سے اور وجدان اور عقل کے ضعف کی وجہ سے

عورت جس بات اور جس چیز کی اچھائی برائی کے بارے میں رائے قائم کرتی ہے وہ مرد کی رائے کے مطابق نہیں کرتی۔ پس عورت اور مرد میں برابری کا نہ ہونا کوئی تعجب اور افسوس کی بات نہیں ہے بلکہ قدرتی ہے اور اس پر دونوں کو راضی ہو جانا چاہیے۔

(علامہ پروڈن کے تجربہ سے ثابت ہوا کہ عورت اخلاقی اعتبار سے بھی مرد سے کمتر ہے اس پر ہم الگ سے مضمون لکھیں گے۔م)

حواس خمسہ یعنی سننے کی طاقت، سونگھنے کی طاقت، چھونے کی طاقت، چکھنے کی طاقت۔ دیکھنے کی طاقت یہ پانچوں طاقتیں کتنی ضروری ہیں۔ یہ سمجھانے کی بات نہیں ہے۔ علامہ نکولس اور علامہ بیلی نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کی یہ پانچوں طاقتیں مرد کے حواس خمسہ سے کمزور ہے۔

• ان دونوں عالموں نے سونگھی جانے والی بہت سی چیزوں سے مرد اور عورت کے سونگھنے کی طاقت کو جانچا۔ عورت کی سونگھنے کی طاقت کو کمزور پایا۔ مثلاً۔

(۱) لیموں کی خوشبو کی ایک خاص مقدار کو ایک خاص فاصلے سے جس قوت کے ساتھ مرد سونگھتا ہے اتنے ہی فاصلے سے سونگھنے کے لیے عورت کو لیموں کی دوگنی مقدار کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۲) بروسک ایسڈ کی بو سونگھنے میں عورت اور مرد کی قوت کا تناسب ..... اور ..... ہے۔ یعنی بروسک ایسڈ سونگھنے میں مرد عورت سے پانچ گنا قوی ہے۔

• ذوق وسمع یعنی سننا اور سننے کی آواز سے لطف اندوز ہونے میں بھی مرد عورت سے قوی ہے یہی وجہ ہے کہ بُرے اور اچھے کھانے پہچاننے والے، آواز کا لطف پرکھنے والے اور گانے اور راگ کا کھرا اور کھوٹا جاننے والے (نقاد) سارے کے سارے مرد ہوئے ہیں۔ آج تک ایک عورت نے بھی ان باتوں میں اپنے کو باکمال ثابت نہیں کیا ہے۔

• علامہ لومبروزا اور سیرجی وغیرہ کی تحقیق کا متفقہ فیصلہ ہے کہ عورت کی چھونے کی طاقت بھی مرد کی چھونے کی طاقت (قوت لامسہ) سے کمزور ہے۔ قوت لامسہ کے ان محققوں نے جو دلیلیں دی ہیں ان میں

صورت درج نیچے لکھی جاتی ہیں۔

(۱) اگر مرد اور عورت ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلیں تو مرد کے چھونے کی طاقت عورت کی چھونے کی طاقت پر غالب آجائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاقی حیثیت سے اگر مرد عورت کو خراب کرنا چاہے تو عورت اپنے کو سپرد کر دیتی ہے لیکن مرد اتنی جلد اپنے کو عورت کے سپرد نہیں کرتا۔

(۲) عورت کے پیٹ میں بچہ ہوتا ہے تو وہ ایک بوجھ ہوتا ہے۔ پھر جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ وقت بھی نہایت کٹھن ہوتا ہے۔ انہی دو اوقات میں دیکھ لیجئے۔ عورت کے حواس کی کمی کا یہ حال ہے۔ ان دونوں مرحلوں سے گذر جاتی ہے۔ ان دونوں تکلیفوں کو سہہ جاتی ہے یہ قدرت کا احسان ہے۔ اس نے عورت میں احساس کی کمی رکھدی۔ اگر مرد کی طرح اس کا احساس قوی ہوتا تو وہ اس دکھ کو ہرگز برداشت نہ کرپاتی۔ انسائیکلو پیڈیا کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ قدرت نے اس کو یعنی عورت کو قوی احساس سے محروم رکھا ہے ورنہ بنی نوع انسان کے نازک و تکلیف دہ فرائض کی انجام دہی ایک غیر ممکن بات ہو جاتی۔"

بھیجا

ہم آپ بولتے ہیں کہ ہم یہ بات پا گئے۔ ہمیں اس کا ادراک ہو گیا۔ ہمیں یہ سوجھ گیا یعنی وقت پر سمجھ میں آگیا تو جو قوت اس میں ہماری مدد کرتی ہے اس کا نام قوت ادراک ہے۔ قوت ادراک کا پاور ہاؤس بھیجا ہے۔ بھیجا چھوٹا ہوگا تو انسان کے ادراک میں، انسان کے وجدان میں، بات پانے میں، سوجھ بوجھ میں کمی اور سستی آئے گی۔ اور اگر بھیجا بڑا ہوگا تو ان سب باتوں میں تیزی ہوگی۔ قوت رسا ہوگی۔ یعنی ہر بات کے سمجھنے میں جلد پہنچ سکیں گے۔ قوت فیصلہ ہوگی یعنی ہر بات کی اچھائی برائی سمجھ کر جلد فیصلہ کرلیں گے۔ وغیرہ۔

سائیکالوجی کے تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ عورت کا بھیجا مرد کے بھیجے سے چھوٹا ہوتا ہے۔ مرد کا بھیجا عورت کے بھیجے سے اوسطاً سو ڈرام بڑا ہے۔ یہ ثابت کرتے ہوئے تجربہ کرنے والوں نے

یہ بات بھی لکھ دی ہے کہ مرد کے بھیجے کی مقدار اس کے بدن کی قوت کی بہ نسبت وہ ہے جو چوالیس اور ایک کی ہے لیکن عورت کے یہاں یہ نسبت ایک اور چوالیس کی ہے۔ اس لیے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کمی زیادتی اس لیے ہے کہ عورت اور مرد کے جسموں میں فرق ہے۔

پیچ اور پرزے

یہ بات بھی تجربے میں آچکی ہے کہ بھیجے کے پیچ اور پرزے بھی عورت اور مرد کے بھیجوں میں کم زیادہ ہوتے ہیں۔ عورت کے بھیجے میں یہ پیچ اور پرزے کم ہوتے ہیں اور مرد کے بھیجے میں زیادہ نیز یہ کہ عورت کے پرزوں کا نظام بھی ناکمل اور ادھورا ہوتا ہے (عورت کو ناقص العقل انہی پرزوں اور پیچوں کی کمی کے باعث ہی کہا گیا ہے اور یہ عورت کی ذلت نہیں ہے بلکہ واقعہ ہے) اسی لیے عورت میں قوت فیصلہ کی کمی ہے۔ اور اسی لیے اس کے بھیجے کے بارے میں طے کر دیا گیا ہے کہ اس میں جوہر سمائی نہیں ہے یعنی وہ لطافت اور نزاکت کہ بات پانے میں حوصلہ اور تیزی دکھا سکے۔

ایک اعتراض

ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ان تمام تشریحات کو ملاحظہ کرکے یہ اعتراض کرے کہ جو دماغی کمی بیشی ثابت کی گئی ہے وہ اس لیے ہے کہ ایک مدت دراز سے عورت کو پست اور گرا اور دبا کر رکھا گیا ہے اور وہ ہزاروں برس سے مرد کے تسلط، مرد کے جبر، مرد کی بے رحمی اور مرد کی غلامی میں رہ رہی ہے۔ آزادانہ پرورش سے محروم رہی ہے۔ اس کو کھلی چھوٹ نہیں ملی ورنہ یہ کمی بیشی نہ ہوتی۔ اگر اتنے ہی دنوں مرد کو دبایا جاتا تو نتیجہ اُلٹا نکلتا۔ پروفیسر دوفارینی نے اس کا جواب دیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ مرد اور عورت کی دماغی قوتوں کا یہ فرق غلامی کی حالت کی وجہ سے ہے تو یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ فزیالوجی اور سائیکالوجی کے علماء نے جو کچھ ثابت کیا ہے، یہ اعتراض اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ پروفیسر اس اعتراض کو ہیچ کہنے کے بعد یہ دلیلیں دیتا ہے۔

(۱) وہ قومیں جو ہزاروں برس سے وحشیانہ زندگی بسر کر رہی ہیں اور جن کا ایک بڑا حصہ دنیا کے مختلف

حصوں میں اب بھی پایا جاتا ہے۔ ان میں تعلیم نہیں ہے۔ تمدن نہیں ہے۔ وہ فطری زندگی بسر کر رہی ہیں۔ ان میں اگر مرد وحشی ہیں تو عورتیں بھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ جسم اور دماغ کا فرق جو ہم مردوں اور عورتوں میں پایا جاتا ہے۔ ان میں بھی وہی فرق ہے۔ کیا افریقہ کی وحشی قوموں نے بھی عورتوں کو تعلیم و تہذیب سے محروم رکھا ہے۔ کیا بونوں نے بھی اپنی عورتوں کو دبا کر رکھا ہے۔ جواب ہے "نہیں" تو پھر جسم کی جسامت۔ بدن کا بھراؤ۔ پٹھوں کا فرق۔ عقل کی کمی بیشی وہاں کیوں ہے؟ سوائے اس کے کوئی جواب نہیں ہے کہ یہ قدرت کا فیصلہ ہے۔

(۲) اگر یہ کہا جائے کہ ہم نے عورت کو سماج کے باہری کاموں میں حصہ لینے سے روک دیا ہے اس لیے اس کا ذہن کند ہو گیا ہے۔ اس کے دماغ اور پٹھے کی بڑھوتری رک گئی ہے تو خط استوا (سخت گرمی کے خطے جو ہمیشہ سورج کی کرن کے سامنے رہتے ہیں) کے خطے میں رہنے والی قوموں کے مرد و زن میں یہ فرق کیوں پایا جاتا ہے جب کہ وہاں عورتیں مرد کے تسلط سے آزاد ہیں۔ کھیتی باڑی اور سینچائی کا کام عورتوں نے سنبھال رکھا ہے۔ گھر کا نظم ان کے ذمے ہے۔ مردوں کی حیثیت نوکروں جیسی ہے۔ پھر یہ کیا لطیفہ ہے کہ وہاں بھی عورت غیر شعوری طور پر مرد سے مرعوب رہتی ہے۔ اور جسم میں، قد میں، حواس خمسہ کی قوتوں میں، پٹھوں کی بناوٹ میں اور بہر طور مرد سے کمتر ہے۔ پروفیسر وو فاریجی پوچھتا ہے:۔

"جس طرح مرد اور عورت کے جسم اور دماغ میں یہاں (یعنی پیرس میں) فرق نظر آتا ہے بالکل یہی فرق امریکہ کی وحشی قوموں اور خط استوا کے باشندوں میں کیوں پایا جاتا ہے؟"

پروفیسر وو فاریجی یہ سوال کر کے ایک پول کھولتا ہے۔ لکھتا ہے کہ:۔

"ایک عجیب بات ہے کہ اُدھر تو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ عورتوں کی پچھلی پرانی اور قدیم وحشت نے ان کی جسمانی اور دماغی طاقتوں کو کمزور کر دیا ہے اور ادھر یورپ کے فاضل مصنفین اور عقلاء و علماء کا یہ فیصلہ ہے کہ تمدن کی ترقی عورت اور مرد کے قدرتی فرق کو ہوا دے رہی ہے۔"

اس کے بعد انسائیکلو پیڈیا کے جامع کی رائے ملاحظہ ہو لکھتا ہے کہ:

"گوری رنگت کے مردوں اور عورتوں میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ کالی رنگت کے حبشیوں مردوں اور عورتوں کے آپسی فرق سے کہیں زیادہ ہے"

دیکھا آپ نے! مرد اور عورت کے جسم اور دل و دماغ میں جو فرق پایا جاتا ہے اس کی تاویل اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی کہ عورت اور مرد کے بنانے میں قدرت (یعنی قادر) کا یہی فیصلہ رہا ہے۔ اس بات کو یوں بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ علم تشریح الابدان، فزیالوجی اور سائیکالوجی کے ان سارے تجربوں اور گہری بحثوں کو سرے سے یکسر غلط مان لیا جائے، اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے جو مخالف کہتا ہے و ... ہے یعنی ہماری عورتوں کو دبا کر رکھا گیا اس لیے وہ بہر طور کمزور ہو گئیں تو مخالف کے پاس نیچے لکھے مشاہدات کی نفی کرنے کا کیا جواب ہوگا۔

حیوانات | حیوانوں یعنی جانوروں، چڑیوں اور رینگنے والے کیڑے مکوڑوں میں دیکھ لو۔ ان میں نر جسم کے اعتبار سے، جسم کے بھراؤ کے اعتبار سے، زور و قوت کے اعتبار سے مادہ سے بڑھ کر ہے۔ ہاتھی ہتھنی سے بڑا ہوتا ہے۔ اونٹ اونٹنی سے اونچا ہوتا ہے۔ کلاں راس گھوڑا کلاں راس گھوڑی سے زیادہ شاندار ہوتا ہے۔ اسی طرح شیر، بھیڑیے، بکرے، بیل، بھینسے وغیرہ مادہ سے قوی ہوتے ہیں۔ چڑیوں میں مرغ کی آن بان، اس کا غرور مرغی کے مقابلے میں دیکھو، نر سارس کی حاکمیت، مادہ سارس پر دیکھو، نر کبوتر کا سینہ اور نر مور کا تاج ملاحظہ کرو۔ کیا یہ آن بان شان مادہ میں ہوتی ہے؟ تم کہوگے کہ نہیں۔ رینگنے والے کیڑے مکوڑوں میں حسین ترین جوڑا پدم کا ہوتا ہے۔ یہ سانپ ایک بالشت کا ہوتا ہے لیکن ذرا اس کے ایک بالشت کے نر اور مادہ پر نظر ڈالو۔ اگر تم مادہ پدم میں جمال اور حسن پاؤگے تو نر میں جلال اور آن بان، مادہ پدم میں انکسار پاؤگے تو نر پدم میں گھمنڈ۔ چھوڑو پدم کو گھر کی چیونٹی کو دیکھو۔ جامن کے درخت پر جھو بجھ بنانے والے سرخ بھتوں اور مکھیوں کو دیکھو۔ کتابیں چاٹ جانے والی دیمک میں نر اور مادہ الگ کر کے دیکھو۔ میں کیوں بتاؤں کہ ان میں کیا تناسب ہے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ دیکھی ہوئی چیز کے مقابلے

میں اس کے متعلق سنی ہوئی بات کا ذکر ہی کیا؟

نباتات | حیوانات میں پھر بھی جان ہوتی ہے۔ نباتات میں نر پودوں اور مادہ پودوں میں فرق ہوتا ہے اور وہاں بھی نر پودہ مادہ پر بھاری کیوں نظر آتا ہے۔ نرسریوں میں جاؤ۔ گھر کے کیلوں اور کھجوروں کے پودوں کو دیکھو۔ تم دور سے دیکھ کر پہچان لو گے کہ ان میں نر کون ہے اور مادہ کون ہے۔ نباتات میں بھی نر اپنی مادہ سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اگریکلچر میں تجربہ کرنے والوں سے پوچھو، وہ بتائیں گے کہ جس طرح مرد اپنی عورت کی حفاظت کرتا ہے، جس طرح نر جانور اپنی مادہ کی حفاظت کرتا ہے، جس طرح نر کیڑا اپنی مادہ کی دیکھ بھال کرتا ہے، بالکل اسی طرح نر پودا اپنی مادہ کی دیکھ بھال میں سرگرم رہتا ہے۔ جب مادہ کو پولن کیسر اور زرد سفوف جس سے بیج بنتا ہے، ملتا ہے تو مادہ پودا حاملہ ہوتا ہے۔ اس وقت نر پودا اس کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ وہ دور کھڑا ہوتا ہے۔ نہیں۔ وہ سپاہی کی طرح مستعد کھڑا ہوا اپنی مادہ کو ایسے دیکھتا رہتا ہے جیسے وہ کوئی ہوں۔ اپنے نام پر ان کے نام کو مقدم سمجھتا ہے۔ مادہ سے زیادہ محنت کرتا ہے۔

لطیفہ:۔ مجھے ایک بار پپیتے کی کاشت کا شوق اٹھا۔ میں نے لٹریچر منگوایا۔ میں نے پڑھا کہ ہر چار مادہ پودوں میں ایک نر پودا ضرور رکھنا چاہیے۔ اگر نر نہیں رکھا جائے گا تو مادہ پودے پھل کم دیں گے اور زیادہ سے زیادہ دو سال دیں گے۔ نر کی موجودگی میں پیداوار زیادہ ہوگی۔ پھل بڑے ہوں گے اور تین سے چار سال تک پیداوار حاصل ہوگی۔ میں نے یہ پڑھا تو مسکرا دیا۔ بیوی دیکھ رہی تھیں پوچھا: کیوں ہنسے۔ میں نے جواب دیا: ایک مرد کو چار بیویاں رکھنے کا جواز پپیتوں کی پیداوار سے مل گیا۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا۔ کیا وہ اسی طرح مذاق میں اڑا دینے کے لائق ہے جس طرح میں نے بیوی سے مذاق میں کہا؟ نہیں یہ سب مشاہدات گواہ ہیں کہ دنیا میں قدرت نے ہر شے جوڑا جوڑا بنائی ہے۔ ان جوڑوں میں نر مادہ سے بہر طور بڑھ کر ہے۔ جو شخص اس مشاہدے کو نہ مانے گا وہ اندھا کہلائے گا یا پھر ہٹ دھرم۔

احمقوں کی دنیا | فزیالوجی کا یہ مانا ہوا اصول ہے کہ عقلمندوں اور احمقوں کے دماغوں میں بہت بڑا فرق

ہوتا ہے۔ بہت سے احمقوں کے بھیجوں کا وزن کیا گیا۔ پھر اتنے ہی عقلمندوں کے بھیجوں کا وزن کیا گیا تو تینتیس ۳۳ اور ساٹھ کا فرق آیا۔ یعنی عقلمندوں کے بھیجوں کا وزن کا اوسط احمقوں کے بھیجوں کے وزن سے لگ بھگ تین گنا۔ پھر یہ کہ عقلمندوں کے بھیجوں کے پیچ کسے کسائے اور پردے محفوظ پائے گا اور احمقوں کے بھیجوں کے پیچ ڈھیلے اور پردے داغدار ملے۔ دماغ کی قوت کی چال دیکھی گئی تو احمقوں کا دل مخمور پایا گیا یعنی جیسے کوئی نیند میں ہو۔ یا تھکا ہوا۔ عقلمندوں کا دماغ شگفتہ اور رواں دواں جیسے ایک شاداب باغ۔

آخری بات

دو سو اٹھتر مردوں کے دماغ تولے گئے پھر دو سو اٹھتر عورتوں کے بھیجے تولے گئے ان کا اوسط نکالا گیا تو ۴۵ اور ۳۱ کی نسبت آئی یعنی مرد کا دماغ وست کے دماغ سے ڈیڑھ گنا سے بھی زیادہ

کیا یہ فرق اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ عورتوں کی عقلوں کی طاقت مردوں کی عقلوں سے بہت ہی کم ہے۔

اوپر جو ہم نے عرض کیا ہے وہ ان لوگوں کے لیے نہیں جو صرف یورپ کے دو علماء کو ہی ملہم سمجھ کر ان کی بربانی کو وحی کا درجہ دیتے ہیں بلکہ ان کے لیے لکھا ہے جو سوچنا سمجھنا اور نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں ان دو کے مقابلے میں ہم نے جو اقوال پیش کئے ہیں وہ ان لوگوں کے ہیں جو آج یورپ میں مشاہیر فلاسفہ مانے جاتے ہیں۔ ہم نے جگہ جگہ انسائیکلو پیڈیا سے سند پیش کی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آج کے علم و فن کا عطر، جوہر اور اس صدی کی رایوں کا خلاصہ ہے۔

نوٹ:۔ عورت میں تمام کمزوریوں کے ساتھ مرد سے زیادہ جو قوت ہے وہ انفعال اور ہیجان کی قوت ہے اور یہی ایک ایسی چیز ہے جس میں عورت کا پلّہ مرد سے بڑھا ہوا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس قوت سے بھی عورت کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی کیونکہ انفعال کی زیادتی (یعنی دوسروں سے متاثر ہو جانا) اور ہیجان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت عقل جلد کھو بیٹھتی ہے اور ناکام ہو جاتی ہے۔ پروفیسر ووفاریئی لکھتا ہے کہ مرد میں سوچنے اور سمجھنے اور ادراک کا مادہ زیادہ ہے اور عورت میں انفعال و ہیجان کا جذبہ بڑھا ہوا ہے۔

عورت کی ایک فطری کمزوری!

حیض

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

• وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ

اے نبیؐ! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں۔ حیض کا کیا حکم ہے؟

• قُلْ هُوَ اَذًى

کہہ دیجئے۔ وہ ایک گندگی اور بیماری ہے!

• فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى الْمَحِيْضِ

جب عورتیں حیض کی حالت میں ہوں تو ان سے الگ رہو!

(یعنی اپنی خواہش پوری کرنے ان کے پاس نہ جاؤ۔ اس حالت میں یہ حرام ہے)

• وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ

اور ان کے پاس نہ جاؤ جب تک وہ پاک صاف نہ ہو جائیں۔

(یعنی حیض سے فارغ ہو کر جب وہ پاک ہو جائیں، نہا دھولیں تو اب ان کے پاس جا سکتے ہو)

——— (سورۂ بقرہ آیت ۲۲۲)

مرد کی برتری

پچھلے صفحات میں یہ بات کھل کر سامنے آچکی ہے کہ مرد اور عورتیں ہر بات میں برابر نہیں ہیں۔ عورتوں کا جسم اور جسم کے تمام اعضاء (انگ) مردوں کے جسموں اور ان کے اعضاء (انگوں) سے نرم ونازک اور کمزور ہیں۔ عورتوں کے دل و دماغ کی قوتیں بھی مردوں کے دل و دماغ کی قوتوں سے کمزور ہیں اور حواس خمسہ (دیکھنے، چکھنے، سننے، چھونے، سونگھنے کی طاقتیں) بھی نیز اس طرح کی دوسری قوتیں یعنی قوت فیصلہ قوت ادراک اور قوت احساس وغیرہ میں بھی عورت مرد کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ عورت اور مرد کی یہ نابرابری قدرتی ہے۔

اس قدرتی نابرابری کو سامنے رکھ کر جب ہم اللہ کے اس فیصلے "الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ" پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ فیصلہ ہمیں بالکل فطری دکھائی دیتا ہے۔ الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ کے معنی یہ ہیں کہ مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ قوام اس شخص کو کہتے ہیں جس پر کسی ایک گھر یا کسی ایک جماعت یا کسی ایک ادارہ یا کسی ایک کام کو ٹھیک کرنے، رکھنے، اُسے ترقی دینے اور اس کی پوری دیکھ بھال کرنے کی ذمہ داری ہو۔ اس شخص کے لیے ضروری ہوگا کہ اس کی نگرانی میں جو گھر یا ادارہ ہے وہ اس کی ترقی کے لیے سوچ بچار اور دوڑ بھاگ کرے۔ محنت مشقت کرے۔ گھر یا ادارے کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لیے ہر آن، ہر لمحہ اور ہر دن تن من سے لگا رہے۔

سوچیے، کیا عورت ہر آن، ہر لمحہ اور ہر دن مرد کی طرح پوری لگن کے ساتھ کام کرسکتی ہے؟ نہیں

کرسکتی۔ عورت چاہے بھی کہ مہینے کے تیسوں دن محنت مشقت سے کام کرے پھر بھی نہیں کرسکتی کیونکہ ہر مہینے میں آٹھ دس دن اور ہر دوسرے تیسرے سال کئی مہینے اس پر ایسے آتے ہیں کہ وہ دوسروں کی محتاج ہوجاتی ہے۔ آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ ہر مہینے آٹھ دس دن اور دوسرے تیسرے سال کئی مہینے کی یاد دلانے سے ان سطروں کے لکھنے والے کا اشارہ کس طرف ہے۔ ان دنوں میں اگر وہ زیادہ مشقت کا کام کرے یا اپنی دیکھ بھال نہ رکھے اور ذرا چوک جائے تو اس کی صحت خطرے میں پڑجائے۔

جب یہ بات ٹھیک ہے تو یہ فیصلہ بھی صحیح ہے کہ مرد کو عورتوں پر قوام ہونا چاہیے۔ گھر کی دیکھ بھال گھر کی دیگر ضروریات اور گھر کے بناؤ بگاڑ کی ساری ذمہ داری مرد پر ہونی چاہیے۔ گھر کے بھاری اور مشقت کے کام مرد کرے اور ہلکے پھلکے کام عورت۔

مرد اور عورت کے اس فرق کو سامنے رکھ کر اللہ کے اشارے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کام کی تقسیم اس طرح فرمائی کہ مرد باہر کے کام کرے یعنی محنت مشقت کرکے کمائے اور عورت پر خرچ کرے۔ کیونکہ وہ جسمانی طور پر اس سے توانا اور مضبوط ہے۔ عورت اس کے مقابلے میں ایک کمزور جان ہے۔ اس کمزور جان کی حفاظت اس پر فرض ہے۔ اس فرض کو پورا نہ کرنے والے کا مرتبہ گھٹ جاتا ہے اور اس فرض کو پورا کرنے والے کا مرتبہ بڑھ جاتا ہے۔ عورت کی فطرت خود مرد کی بڑائی کو تسلیم کرلیتی ہے۔ اللہ تعالے نے مرد کو عورت پر ایک درجہ بڑائی دی ہے۔ فرمایا کہ الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضہم علی بعض و بما انفقوا من اموالہم۔ مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ اس لیے کہ ان میں سے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے اور اس لیے بھی کہ مرد اپنے مال (عورتوں پر) خرچ کرتے ہیں۔

یہ ایک درجہ مرد کی بڑائی عین انصاف ہے۔ اس لیے بھی کہ وہ جسم کے اعتبار سے عورت پر بڑائی رکھتا ہے اور عورت پر اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ اب اگر عورت یہ دعوی کرے کہ وہ ہر طرح مرد کے برابر ہے اور وہ بھی ہر طرح محنت مشقت کرکے کما سکتی ہے اور مرد کو کھلا سکتی ہے تو کہا جائے گا کہ وہ کسی شیطان کے بہکاوے میں آگئی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آج ہمارے یہاں عورت شیطان کے دھوکے میں آکر مرد کے مد مقابل خم ٹھونک کر کھڑی ہونے لگی ہے لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اب وہ دُہری مشقت میں پڑتی چلی جارہی ہے۔ وہ کمائی بھی کرنے لگی ہے۔ اور گھر کے سارے کام بھی۔ ہمارے یہاں تو اس کی ابتدا ہوئی ہے۔ لیکن یہ غلط دعویٰ جہاں سے اُٹھا ہے یعنی مغرب تو وہاں عورت پوری طرح مرد سے مات کھا گئی ہے۔ وہاں کے مردنے عورت کو خوب احمق بنا رکھا ہے۔ وہاں وہ کماتی بھی ہے۔ گھر کی ذمہ دار بھی ہے اور پھر مرد کی دوسری خوشیاں بھی پوری کرتی ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ مغرب کی عورت نے جب مرد کی یہ چالاکی محسوس کی تو اس سے یہ نہ ہوا کہ وہ فطری راہ کی طرف بڑھتی۔ مرد کی ایک درجہ بڑائی کو پہچان لیتی اور گھر کو فطری طریقے سے سنوارنے کی کوشش کرتی۔ اس کے برعکس اس نے کیا یہ کہ اب گھر برباد کرنے کی فکر کر رہی ہے۔ میاں بیوی کے طریقے کو ہی ختم کرنا چاہتی ہے وہ نہیں چاہتی کہ اولاد ہو اور اُسے سنبھالنا پڑے۔ کتنا خطرناک قدم اُٹھا لیا ہے اس نے۔

حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے دنیا کے کاموں کو خود ہی دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ نسل انسانی کو بڑھانا اور اس کی حفاظت کرنا انسانی ضرورت کا پہلا اور ضروری کام ہے۔ یہ کام عورت کے ذمّے کر دیا۔ اس لیے اس کو اسی قسم کے انگ اور اعضاء اور اسی قسم کی جسمانی طاقت دی جو اس ذمّے داری کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ دوسرا کام مرد کے ذمّے کیا گیا اس لیے اسی کے مطابق اسے جسمانی اور دماغی طاقت دی گئی۔ ان دونوں کا الگ الگ کام دنیا مجموعی تمدن قائم رکھتا ہے اور جب اختلاف کے اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے یا ان دونوں میں کوئی گروہ اپنے فرائض سے باہر قدم نکالتا ہے تو تمدن اور معاشرت کے انتظام میں خلل پڑتا ہے اور زندگی کے کاموں میں سیکڑوں الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے عورتوں کو مردوں کے کاموں سے الگ ہی رکھنا چاہیے۔

مرد کی قوّامیت

غلام کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص جو اپنی محنت، شفقت، جسم، توانائی اور ذہانت کسی دوسرے کے بے وقعت کر دے۔

غلام کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زندگی، جس کا کھانا پینا، سونا جاگنا کسی دوسرے کے رحم و کرم پر ہو

غلام کا مطلب یہ ہے کہ جو کسی دوسرے کا ایسا وفادار ہو کہ اسی کی آنکھ سے دیکھے اسی کے کان سے سنے، اسی کی عقل سے سوچے یعنی جو کچھ دوسرا چاہے وہی کرے۔ غلام کے مقابلے میں اس دوسرے کو آقا اور مالک کہتے ہیں۔

جب سے انسان نے گھریلو زندگی شروع کی ہے اس وقت سے اب تک گھر کا بندوبست کرنے اور چلانے والا بھی ایک شخص رہا ہے اور جب تک گھر قائم ہے اس کا سربراہ کوئی نہ کوئی ضرور رہے گا۔ گھر کا نظم چلانے والے کو چاہے جس نام سے یاد کیجئے۔ جیسے کسی ادارے کے چلانے والے کو ناظم یا سکریٹری کہتے ہیں۔ اسی طرح آپ گھر کا نظم چلانے والے کو ناظم یا سکریٹری کہہ سکتے ہیں یا جیسے کسی تحریک کے چلانے والے اور اسے قائم رکھنے والے کو قائد کہتے ہیں اسی طرح آپ گھر کے چلانے والے کو قائد بھی کہہ سکتے ہیں۔

اسی قائد، سکریٹری یا ناظم کو قوام (قیّم) بھی کہتے ہیں۔ قوام کے معنی ہیں وہ ہستی جو اپنے ادارے یا کارخانے یا پارٹی یا گھر کو قائم رکھے، گرنے نہ دے، کھڑا رکھے، ڈھے جانے سے بچائے رکھے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ لفظ (قوام) استعمال کیا ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں "الرجال قوامون علی النساء" مرد عورتوں پر قوام ہیں یعنی مرد وہ ہستی ہے جو عورت کو گرنے سے بچانے والی ہے۔ مرد وہ شخص ہے

جو عورت کو اس کے مقام پر قائم اور برقرار رکھ سکتا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ عورت کے اعزاز کو باقی رکھ سکتا ہے۔

ہم اسی قیم کو گھر کا قوام کہتے ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک عورت کے معنی دراصل "گھر" کے ہیں۔ عورت کے بغیر گھر کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ مرد جب عورت سے شادی کر کے اُسے کہیں جگہ دیتا ہے، چاہے وہ پھوس کا جھونپڑا ہو، چاہے وہ پہاڑ کی کھوہ ہو یا شاندار محل۔ بس وہی جگہ "گھر" ہے۔ اس گھر سے دوسرے "گھر" پیدا ہوتے ہیں اور قوام بنتے جاتے ہیں۔

جناب ناظم صاحب، محترم جنرل سکریٹری صاحب۔ عزت مآب قائد اعظم صاحب، عالی مقام قوام صاحب! دیکھنے میں تو بڑے کٹے پھٹے کے شخص نظر آتے ہیں۔ بڑے بااختیار دکھائی دیتے ہیں۔ مالک و مختار جان پڑتے ہیں لیکن ذرا گہرائی میں اُتر کر ان حضرت کی زندگی کا مطالعہ کیجئے تو صاف نظر آئے گا کہ یہی قوام صاحب اپنے گھر میں اپنے گھر کے سارے افراد سے پہلے صبح کو سو کر اُٹھتے ہیں۔ صبح اُٹھ کر سب سے پہلے اس گھر پر نظر ڈالتے ہیں جو پتھروں، چھتوں اور دیواروں سے بنا ہوتا ہے۔ اسے اپنی جگہ پا کر اس گھر پر نظر ڈالتے ہیں۔ جو بال بچوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔

جناب قوام صاحب بال بچوں والے مجموعہ (گھر) کے لیے کنویں سے پانی لاتے ہیں۔ سب کو جگاتے ہیں اور اس سے پہلے کہ گھر والے اُٹھیں، خود کام کاج شروع کر دیتے ہیں۔ گھر والوں میں ایک ہوتی ہے "گھر والی"! جو عورت ہوتی ہے۔ قوام کی بیوی اور بچوں کی ماں۔ یہ گھر والی اُٹھتے ہی احکام نافذ کرنا شروع کرتی ہے۔ گھر میں یہ نہیں ہے۔ آج یہ آنا ہے یہ آنا ہے۔ یہ آنا ہے۔ آج یہ لانا ہے، یہ لانا ہے، یہ لانا ہے۔ اور جناب قیم صاحب یا حضرت قوام صاحب اس آنا اور لانا کی فہرست لے کر جو گھر سے نکلتے ہیں تو خدا معلوم کس محنت مشقت سے تعمیل حکم کرتے ہیں۔ اچھا پھر گھر آتے ہیں تو جو بیوی کھلادے وہ کھالیں۔ جو بیوی پہنادے وہ پہن لیں۔ جو بیوی بچھادے۔ اسی پر دراز ہو جائیں اور پھر جب یہی بیوی "آنا اور لانا" کی فہرست میں مطلوبہ چیز نہ پائے تو اپنے قوام پر دھاوا بول دے۔ طعنوں سے، تشنوں سے۔ تیوروں سے۔ قوام صاحب معذرت

فرماتے ہیں۔ ارےبھئی بھول گیا۔ فلاں چیز بازار میں ملی ہی نہیں۔ بیوی کے سامنے گھگھیانے لگتے ہیں۔ اس معذرت اور خوشامد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدانخواستہ بیوی اپنے مقام سے گر جائے تو سارا گھر ہی ڈھے جائے۔ بےچارے قوام صاحب دن بھر تھک محنت کر کے بھی دم سادھے رہتے ہیں۔ غلام کی تو ایک قیمت بھی ہوتی ہے۔ یہ قوام صاحب ایسے غلام ہیں جن کی کبھی کوئی قیمت ہی نہ لگی۔ کام کاج کریں تو گھر والوں کے لیے۔ محنت مشقت جھیلیں تو گھر والوں کے لیے۔ جھوٹ سچ حیلے بہانے سے کچھ کمائیں۔ گناہگار ہوں یا پاپی بنیں تو گھر والوں کے لیے۔ دن بھر اپنے کو مٹی میں ملا کر گھر آئیں تو ڈرتے ہوئے کہ کہیں بیوی صاحبہ کسی کوتاہی پر ناخوشی نہ رکھ دیں۔ اب رات ہو تو سب سے بعد قوام صاحب آرام فرمانے جائیں اور جب تک نیند نہ آئے دوسرے دن کا منصوبہ بناتے رہیں۔ اس طرح قوامی کے عہدے پر فائز رہتے ہوئے مر جائیں اور جو کچھ کما کر گھر میں اندوختہ کیا وہ گھر والے بانٹ کھائیں۔

کیسا عزت مآب ہے یہ قیم یا قوام۔ زندگی بھر سب سے خراب کھائے۔ خراب پہنے۔ خود اپنی زندگی گھر والوں کے لیے موت کے داؤں پر لگا دے۔ دوسروں کو اچھا پہنائے اور خوش ہو۔ گھر میں خود اداس ہو لیکن گھر والے ہشاش بشاش ہوں تو شکر ادا کرے۔ خود بیمار ہو اور گھر والے صحت مند ہوں تو ان کی صحت کے لیے دعا کرے۔ ہمیں تو یہ نظر آتا ہے کہ گھر کا یہ قوام تو غلام سے بھی بڑھ کر ایسی ہستی ہے جس کے لیے اب تک لفظ ایجاد نہیں ہوا۔ غلام اپنے مالک کے لیے اپنی زندگی وقف تو کر دیتا ہے لیکن اس میں خلوص نہیں ہوتا ہے۔ قوام میں سپردگی کے ساتھ خلوص بھی ہوتا ہے۔

اس موقع پر دو لطیفے سنئے اور ہنسنے کے بجائے عبرت حاصل کیجیے۔ غلام ہندستان کے لارڈ کرزن (وائسرائے) جب ریٹائر ہو کر انگلینڈ پہنچے تو پریس والوں نے گھیر لیا۔ ان سے پوچھا کہ آپ نے ہندستان میں کیا کیا خاص باتیں دیکھیں۔ لارڈ کرزن نے کہا کہ میں نے ہندوستان کے ہر گھر میں ایک "گدھا" دیکھا ہے۔ سننے والوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ ہر گھر میں گدھا کیوں ہوتا ہے۔ سننے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی جو ہندوستان کی سیر کر چکے تھے انھوں نے لارڈ کرزن کے بیان کی تردید کی تو لارڈ صاحب نے تشریح

کہتے ہوئے فرمایا، ہر گھر کا وہ گدھا دراصل گھر کا وہ مرد ہے جو اپنے کو گھر کا مالک سمجھتا ہے لیکن ہے وہ "گدھا" ہی۔ اس کے بعد لارڈ کرزن نے وہ سب بیان کیا جو ہم نے اوپر لکھا ہے۔

دوسرا لطیفہ ایک قوام صاحب کی تعلیم یافتہ والف صاحبہ کے لفظوں میں سنئے۔ وہ اپنی ہمقوم عورتوں میں تشریف فرما تھیں۔ کسی ایک محترمہ نے پوچھا، کہئے آپ کے قوام صاحب بخیریت ہیں بہن۔ جواب میں والف صاحبہ فرماتی ہیں کہ ہمارے قوام صاحب تو قِوام ہو کر رہ گئے ہیں۔

رقِوام اس چیز کو کہتے ہیں جو اچھی طرح پک کر ایسی چیز بن جائے جس کو اس غرض کے لیے کھایا جائے کہ انسان توانا ہو۔

یہ ہے گھر کے قوام صاحب کی زندگی۔ ایک گدھے کی طرح زندگی بھر دوسرے کی زندگی بنانے کے لیے وہ زندگی بسر کریں یا زندگی ان کو بسر کرے۔ زندگی بھر کے الاؤ کو روشن کرنے کے لیے جلتے بھنتے رہیں یہاں تک کہ قِوام بن جائیں لیکن اگر گھر ہی کو قائم رکھنے کے لیے کبھی "کچھ" کہدے تو غریب بدنام کہ مردوں نے ہمیشہ عورتوں پر ظلم کیا ہے۔ اس کی فطرت ہے کہ عورت کو دبا کر رکھے۔ کاش! آج اس غریب کا ساتھ دینے والا کوئی ہوتا!! سنا ہے کہ دودھاری گائے کی دولاتیں بھی بھلی لگتی ہیں مگر وہ دودھاری گائیں چار ٹانگوں والی ہوتی ہیں دو ٹانگوں والی نہیں۔

اچھا ہم تھوڑی دیر کے لئے مانے لیتے ہیں کہ ساری دنیا نے ایک ساتھ عورت کو مردوں کے کام سنبھالنے کا حقدار قرار دیدیا اور اسے بالکل اس بات کا مجاز بنا دیا کہ تمام مردوں کے کاروبار اپنی گردن پر اٹھالے تو کیا دینِ فطرت (اسلام) کے پابندوں کے لئے بھی یہ بات مناسب ہے کہ وہ اس درجہ تک فطری قانون کے خلاف کریں اور غیر قوموں کی تقلید کو اپنی عادت بنائیں؟ کیا ہم اگر مذہب اور طبیعت اور فطرت کے بنائے ہوئے طریقہ پر عورتوں کی اصلاح حال کا قانون مقرر کریں تو معزز مسلمان خاتون کے دل پر اس کا کوئی ناگوار بوجھ پڑیگا۔ افسوس اب یا ہم پر آتیہ اصلاح کے دروازے ہر طرف سے بند ہوگئے یہاں تک کہ ہم مجبور ہو کر دوسری قوموں کی خبیث بیماریوں میں بھی انکی تقلید کریں؟

عورت کی آزادی

پہلی عالمگیر جنگ جو ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی۔ اس کے بعد ہمارے ملک میں تعلیم اور خیالات کے اعتبار سے دو گروہ پیدا ہوئے۔ ایک گروہ وہ جو پرانی تعلیم کو اپنائے ہوئے ہے اور زین اور دھرم کے گرد گھومتا ہے اور دوسروں کو بھی دین پر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ جو نئی تعلیم (انگریزی) حاصل کر کے مغرب کو اپنا دیوتا مانتا ہے۔ مغرب کا دیوتا نئے گروہ پر جو نازل کرتا ہے اسے وہ بے سمجھے بوجھے (بلکہ اندھا دھند) آکاش بانی سمجھ کر قبول کر لیتا ہے اور اسی کے مطابق اپنی ندگی ڈھالنے لگتا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس نئے گروہ نے ملازم ہو کر حکومت کے کام یں ہاتھ تو بٹایا اس کے علاوہ اور کوئی فائدہ قوم کو نہیں پہنچایا۔ مغرب نے نئے نئے علم و فن ایجاد کرکے ن سے نیا گروہ مرعوب تو ہوا لیکن اس سے یہ نہ ہوا کہ خود ان علوم و فنون کا تجربہ کر کے قوم کو فائدہ پہنچاتا۔

نئے گروہ کی مرعوبیت کا عالم یہ ہے کہ مغرب کی طرف سے جو خیالات اور لٹریچر آتا ہے اس کے خلاف یک لفظ بھی نہیں کہہ سکتا۔ مغرب اگر مشرق کے دھرم پر چوٹ کرتا ہے تو یہ نیا گروہ واہ واہ کرتا ہے مغرب ر عورت کو رونق محفل بنانے کی آواز بلند کرتا ہے تو یہ نیا گروہ کچھ نہیں سوچتا کہ اس میں کیا فائدے اور نقصان یں۔ بس وہی ٹیپ ریکارڈ بجانے لگتا ہے۔

وہ گروہ جو پرانی تعلیم کو سینے سے لگائے ہے وہ مغرب کی طرف سے آئی ہوئی ہر بات اور ہر چیز کو کس نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ سب کچھ دین اور دھرم سے کتنی مطابقت رکھتا ہے اس میں سے جو کچھ دین ور دھرم کے خلاف پاتا ہے تو دھرم ہی کا حوالہ دے کر کہتا ہے کہ اسے ہندوستان کے رہنے والو! یہ نہیں

ہمارے تمہارے دین اور دھرم کے خلاف ہے۔ اس لیے ان سے بچو!

اس پرانے گروہ میں ایک کمی یا خامی یہ ہے کہ جس طرح مغرب اپنی ہر آواز سائنٹیفک دلیلوں کے ساتھ کہتا ہے اس طرح پرانا گروہ نہیں کہہ پاتا۔ وہ نئے رجحانات اور ایسی دلیلوں کو جانتا ہی نہیں جن کے ذریعہ اپنی بات سمجھا سکے۔ اس کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ خدا اور خدا کے رسولوں نے یوں اور اس طرح فرمایا ہے اور نئے گروہ کے لیے خدا اور رسول ہی وہ کانٹا ہے ، جو وہ نکال پھینکنا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھے جیسے دین اور دھرم کا حکم ہے کہ ہر روز سورج نکلنے سے پہلے سو کر اٹھو۔ نہاؤ دھوؤ خدا کو یاد کرو تو اس طرح نئے گروہ کو یہ بات اپیل نہیں کرتی۔ یہی بات جب سائنٹیفک طور پر یوں کہی جاتی ہے کہ صبح کی ہوا میں آکسیجن ہے۔ پودے صحت بخش گیسیں چھوڑتے ہیں اس لیے صبح سویرے اٹھو اور ان سے فائدہ اٹھاؤ، یہ بات نئے گروہ کو اپیل کر جاتی ہے۔ وہ صبح اٹھ کر کھلے میدان میں تفریح کو نکل جائے گا لیکن اس سے یہ نہ ہوگا کہ ذرا دھیان گیان کر لے۔ یا دو رکعت نماز پڑھ لے۔

دوسری مثال لیجئے۔ مذہب کہتا ہے کہ خدا نے سب سے پہلے انسان کا ایک جوڑا (ایک مرد اور ایک عورت) زمین پر بھیجا اور اس سے انسان پھیلا دیے۔ دوسری طرف سے آواز بلند ہوتی کہ نہیں، یہ انسان جانوروں کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس پر دلائل دیتا ہے۔ نیا گروہ اسے تسلیم کر لیتا ہے اور مذہبی بات کو رد کر دیتا ہے۔

یہی بات عورت کے بارے میں ہے۔ خدا کہتا ہے کہ عورت مرد سے کمزور پیدا کی گئی ہے۔ مغرب سے آواز آتی ہے کہ یہ غلط ہے۔ مرد اور عورت ہر طرح برابر ہیں۔ خدا کہتا ہے کہ مرد کو چاہیے وہ عورت کے کھانے کپڑے کا گھر کا انتظام کرے۔ مغرب سے آواز آتی ہے جی نہیں۔ عورت خود کفیل ہے وہ خود کما سکتی ہے۔ وہ مرد کی محتاج نہیں ہے۔ خدا کہتا ہے کہ عورت ایک مرد کی ہو کر رہے گی۔ دوسری طرف سے آواز آتی ہے کہ یہ غلامی ہے۔ ہر شخص آزاد پیدا ہوا ہے۔ سب کو آزاد رہنے کا حق ہے۔ نیا گروہ یہ تسلیم کر لیتا ہے اور خدائی حکموں کو پیچھے ڈال دیتا ہے۔

اس طرح عورتوں کی آزادی کی حمایت میں پچاس برس کے اندر جو ذخیرہ جمع ہو چکا ہے اس کا مطالعہ

ہم ان تینوں اعتراضوں کی تردید کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ پردہ نشین عورتیں نہ مریض ہیں اور نہ اُن کے انگ اور پٹھے کمزور ہیں بلکہ وہ بحیثیت مجموعی بے پردہ عورتوں سے کہیں بڑھ کر تندرست اور قوی ہیں۔ یہ ہم نے وہ بات کہی ہے جو دیکھی جا سکتی ہے۔ پرکھی جا سکتی ہے۔ تولی جا سکتی ہے۔ ہر مشرقی انسان سرسری نظر ڈال کر ہی ہماری بات کی تصدیق کر دے گا۔

تیرہ سو برس سے زیادہ ہو گئے کہ مسلمان عورتیں پردہ کرتی ہیں، اگر پردہ عورتوں میں کوئی کمزوری پیدا کیا کرتا تو یہ ضرور ہوتا کہ ان کی ہر نسل کمزور ہوتی چلی جاتی اور تیرہ سو برس میں اگر ہر سو برس میں ایک انچ اس کا قد کم ہوتا تو اُسے ½ میٹر ضرور کم ہو جانا چاہئے تھا۔ اسی تدریج سے جسمانی طاقت کم ہوتے ہوتے تیرہ سو برس میں مسلمان عورت کو لنج ہو جانا چاہئے تھا۔ بانجھ ہو جانا چاہئے تھا۔ اُسے اندھا ہو جانا چاہئے تھا۔ اس کا دماغی توازن بگڑ جانا چاہئے تھا علم بائی لوجی کا یہی حکم ہے مگر ہم بائی لوجی کے حکم کے خلاف یہ دیکھتے ہیں کہ یہی پردہ نشین مسلمان عورتیں بے پردہ عورتوں کے مقابلے میں صحت مند، تندرست اور قوی بچے پیدا کرتی رہیں۔ پردہ نشین عورتوں کی عمریں بے پردہ عورتوں سے زیادہ ہوتی رہیں۔

اگر آپ اس بات کا ثبوت آج اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں تو مسلمانوں کی سب سے زیادہ غیرت مند قوم روہیلہ، لودی اور پٹھان کو علاقہ روہیل کھنڈ، برن، افغانستان میں جا کر دیکھ لیجئے۔ یہ افغان اور روہیلہ اپنی بیوی کا سایہ بھی نامحرم کو دکھانا پسند نہیں کرتے، لیکن انہی کی عورتوں کو دیکھئے، انہی عورتوں کے بچوں کو دیکھئے۔ ہر بچہ آپ ساڑھے پانچ فٹ سے بڑا یہاں تک کہ چھ فٹ سے بھی اونچا پائیں گے اور ان کی کلائیاں اتنی چوڑی اور موٹی پائیں گے کہ آجکل کی بے پردہ اولاد کے بیٹوں کے پیروں کی پنڈلیاں ان کا مقابلہ نہ کر سکیں گی۔

ان پردہ نشین عورتوں کی اولاد بے پردہ عورتوں کی اولاد سے آج بھی تنومند اور طاقتور بلند حوصلہ، غیرت مند، بہادر، پُرجوش ہے اور فضائلِ اخلاق سے بھرپور نظر آتی ہے۔

یہی خوبی راجپوتوں میں پائی جاتی ہے۔ راجپوت کی عورت ایک مسلمان کی طرح پردے کی بند تو نہیں ہوتی تھی لیکن اس کا یہ کردار ہمیشہ رہا ہے کہ نہ اس نے غیر مرد پر نظر ڈالی اور نہ غیر مرد نے اس کو نظر بھر کے دیکھا۔ جہاں اس اُصول کے خلاف ہوا۔ راجپوتوں نے لڑکر جان دیدی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پردے کے نتائج ان کے اندر پائے جاتے رہے۔ تو آپ نے بیسویں صدی کے شروع میں بھیم کے بھیم راجپوتوں کو ضرور دیکھا ہوگا۔ لیکن پھر انگریز کی صحبت میں پڑ کر جب یہی راجپوت نئی تہذیب کی طرف بڑھے تو آج اُنہیں تازہ بین تو بہت نظر آئیں گے لیکن ارجن جیسا جری، بھیم جیسا تنومند مہاراجہ پرتاپ جیسا غیرت مند ایک بھی نہیں ملے گا۔

ان راجپوتوں کی بہادری کا لوہا سارے ہندوستان نے ہمیشہ مانا اور انھوں نے کس قوم کا لوہا مانا۔ اس قوم کا جس کی عورتیں پردے میں زندگی بسر کرنے والی تھیں۔

ایک مشاہدے کی طرف میں آپ کا دھیان ضرور لے جاؤں گا۔ آپ کسی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو جائیں۔ وہاں برابر کی تعداد میں پردہ نشین اور بے پردہ عورتوں کو نگاہ میں رکھیں پھر زیادہ نہیں صرف اُن کے چہروں کا معائنہ فرمائیں۔ آپ بے پردہ عورتوں میں دو قسم کی عورتیں پائیں گے یا تو ان کے چہرے خشک پیلے گال پچکے ہوئے، آنکھیں دھنسی ہوئی پائیں گے۔ یا پھر ان کا بدن تھل تھل ہوگا لیکن پردہ نشین نقاب پوش عورت کو اس کے برعکس دیکھیں گے۔ یہی مشاہدہ آپ اسپتال میں جاکر کر سکتے ہیں۔ محکمۂ صحت کی طرف سے اَموات کی رپورٹیں شائع ہوتی ہیں ان کو بھی ضرور دیکھئے۔ اور یہ بھی تعداد کھوج کر کے ملاحظہ فرمائیے کہ مسلمانوں کی پردہ نشین عورت نے کتنے بچے جنے اور وہ صحت کے اعتبار سے کیسے بنے۔ اور پردہ نہ کرنے والی عورتوں نے اپنے بعد کتنے بچے چھوڑے، اور ان کی صحت کا کیا حال ہے۔

یہ تو ہوئی آنکھوں دیکھی بات، جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ پردہ نشین عورت کو نہ تازہ ہوا ملتی ہے۔ نہ وہ تفریحاً کو جاتی ہے۔ وہ ٹانگیں توڑے محلوں کی سب سے اندھیری کوٹھری میں بند پڑی رہتی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اعتراض کرنے والوں نے پردہ نشین عورتوں کا رہن سہن دیکھا ہی نہیں۔ انھوں نے اپنے گھروں کی طرح مسلمانوں کے مکانات کی عمارتوں کو تصور کر لیا۔ آپ چل پھر کر دیکھئے۔ مسلمانوں کے مکانات بے پردہ رہنے والے لوگوں کے مکانوں سے زیادہ وسیع ہوتے ہیں مسلمانوں کے مکانوں کا جتنا بڑا صحن ہوتا ہے اتنے میں بے پردہ رہنے والے پورا مکان بنا لیتے ہیں۔ پھر اس پردے کی بدولت تعمیرات میں جو ترقیاں ہوئیں وہ سب مسلمانوں کا طفیل ہے۔ روشنی اور ہوا کی ضرورت کا لحاظ، نکاس، کھڑکی، روشندان، برآمدے، بادکش جھروکے یہ سب مسلمانوں کے ذہنوں نے پیدا کیا۔ پھر یہ کہ پردہ نشین مسلمان عورتیں دن بھر گھر کے کاموں میں مصروف رہتی ہیں صبح اُٹھ کر نماز پڑھنا، کلامِ پاک کی تلاوت کرنا، بچوں کو اُٹھانا، پھر ناشتے کی تیاری، ناشتے کی تیاری کے وقت بچوں کو بزرگوں کے حالات سُنانا، آدابِ طعام بتانا، کھانے سے فراغت کے بعد سینے پرونے کا کام لیکر بیٹھ جانا، دوپہر کو قیلولہ کرنا، ظہر کی نماز پڑھ کر پھر گھر کے نظم میں لگ جانا۔

اس انہماک سے پردہ نشین عورت کے ذہن کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس میں انتشار نہیں پیدا ہوتا۔ وہ سوائے تعمیری اور بناؤ کی بات کے تخریبی کارروائی سوچ ہی نہیں سکتی۔ اس کے پاس تخریبی کارروائیوں کے لئے وقت ہی نہیں ملتا۔ تخریبی کارروائیاں تو وہ عورتیں کرتی ہیں جن کے ذہنوں میں انتشار ہوتا ہے۔ جو نامحرم مرد سے ہنس کر باتیں کرتی ہیں اور اُن کے شوہر نامحرم عورتوں سے پینگ بڑھاتے ہیں۔ آج آپ اس نئی پود کو دیکھ لیجئے۔ جو پردے کی دشمن ہو رہی ہے۔ اس میں غصہ ہے کہ بجھنی جا رہی ہے۔ اس میں نشہ ہے جس کی وجہ سے مستی میں مردوں پر ٹوٹی پڑتی ہے۔ یہی عورت آج پاکٹ مار ہے۔ چور ہے۔ دھوکہ دینے میں شاطر ہے۔ الیکشن، دواؤں، تعویزوں کا پروپیگنڈا

کرنے میں پیش پیش ہے۔ یہی عورت کہتی ہے کہ عصمت بے کار چیز ہے۔

اس کے بعد آپ اس کی صحت ملاحظہ فرمائیے۔ اوّل تو اس کے بچے ہی نہیں ہوتے، اگر ہوں بھی تو ان ذات شریفوں کا جُثہ دیکھئے۔ ان کے رگ پٹھے ٹٹولئے، ان کے قویٰ کا جائزہ لیجئے۔ معلوم ہوگا کہ ان بے پردہ عورتوں نے بیمار جَنا ہے۔

اسی برتے پر یہ دیدہ دلیلی نہیں تو اور کیا ہے کہ پردے کے دشمن کہتے ہیں کہ پردہ کرنے والی عورت نفسانی خواہشوں کی لونڈی ہوتی ہے۔ عجیب بے جوڑ بات ہے۔ علم سائیکالوجی کے کلی قواعد پر ان کا یہ دعویٰ دم بھر کے لئے نہیں ٹھہرتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ نفسانی خواہشوں کا اُبھار اُسی وقت ہوتا ہے جب اس کا موقع و محل ہو۔ اس کے اسباب موجود ہو جائیں۔ یعنی رقص و سرود کی محفلیں ہوں شراب و کباب کی چاٹ ہو۔ فحش کلامی اور عریاں گیتوں سے نغمے ہوں۔ حسین چہرے دعوت نظارہ دیں۔ سنیما کے سین اور عریاں تصویریں آس پاس ہوں۔ یہ ہیں وہ اسباب و لوازمات جو نفسانی خواہشوں کو اُبھارنے والے ہوتے ہیں۔ اب آپ خود انصاف سے کہہ دیجئے کہ ان اسباب کے حصول میں کون "خوش نصیب" ہے اور کون ان سے محروم ہے۔

غریب پردہ نشین مسلمان عورت کو نہ اتنی فرصت ہے کہ ان کے لئے وقت نکال سکے۔ نہ اس کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ ہمت کرسکے۔ نہ اس کی گھریلو مزدوریات اُسے اجازت دیتی ہیں کہ ان مناظر کا رمان کرے۔ یہ سب بے پردہ عورت کے نصیب کا ہے۔ اب آپ دیکھ لیجئے کہ نفسانی خواہشوں کے میدان میں کون پھسکیت ہے۔ اب تو یہ خبریں آنے لگی ہیں کہ عورت مردوں کو اغوا کرنے لگی ہے۔ عورت مرد کو نفسانی خواہش کے لئے پھسلاتی ہے۔

یہ سب آج سورج کی طرح ہمارے سامنے ہے پھر کس مُنہ سے لوگ کہتے ہیں کہ پردہ نشین عورت میں نفسانی خواہشیں زیادہ اُبھرتی ہیں۔ دیکھا جاتا ہے کہ بے حیا آدمی اپنا عیب چھپانے کے لئے دوسرں کو

کا عیب سے مشہور کر دیتا ہے۔ بالکل یہی بات ان مُنہ زوروں کی ہے۔
کتنا پُر لطف اور عبرت ناک وہ لطیفہ ہے جو اکبر الٰہ آبادی نے نظم کیا ہے۔ اُنھوں نے بیٹے کو تعلیم کے لئے یورپ بھیجا۔ پھر جب اس نے یورپین تہذیب اختیار کر لی تو باپ نے ٹوکا کر بیٹا یہ کیا۔ بیٹے نے جواب دیا کہ ابا جان!

در میانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردئی　　　باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

پہلے تو میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر سمندر کی گہرائی میں پھینک دیا، اس کے بعد تاکید یہ ہے کہ کپڑے بھیگنے نہ پائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لطیفہ دلچسپ ہونے سے زیادہ عبرتناک ہے۔

رگ پٹھوں کی کمزوری اور عقل کی کمی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس معاملے میں بھی مغربی ملکوں کی تیتریوں کا نمبر مشرقی عورتوں سے بڑھا ہوا ہے۔ رگ پٹھوں کی کمزوری (ضعف اعصاب) کے اسباب زیادہ تر یہ ہوتے ہیں۔ رنج و غم کی شدّت، غم و غصّے میں جھنجلانا اور کڑھنا۔ کسی کے دُکھ دینے پر انتقام کا جذبہ، مال کی ہوس، عشق و محبت اور اس میں ناکامیاں، شراب، جُوا، شہوت کا بے قابو ہونا، عزت و آبرو ریزی۔ چھپ چھپ کر کام کرنے کی عادت وغیرہ۔
اب میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ بے رحم نقّاد کی طرح مسلمان پردہ نشین عورت کا جائزہ لیں۔ کیا پردہ نشین عورت آپے سے باہر ہو رہی ہے۔ یا بے پردہ عورت بے حیائی کے مارے پھٹی پڑ رہی ہے۔ ارمانوں، حسرتوں، اور تمناؤں کا رنج و غم کسے زیادہ ہے۔ پردہ نشین عورت کو یا اُس بے پردہ عورت کو جو تمناؤں کے مارے اپنی عزت ہتھیلی پر لئے پھرتی ہے۔ وہی ارمانوں کے پورا نہ ہونے پر جھنجلاتی ہے۔ کڑھتی ہے۔ انتقام کی آگ میں جلتی ہے۔ کبھی وہ اپنی سہیلی کا بُوائے فرینڈ پھسلا لاتی ہے۔ اور کبھی اُس کا بُوائے فرینڈ خود اُسے دغا دے جاتا ہے۔ مال کی ہوس میں بھی یہی بے پردہ عورت دیوانی ہو رہی ہے۔ اخبارات اُٹھا کر دیکھ لیجئے۔ یہی عورتیں بہرام ڈاکو اور

سُلطانہ کے کان کاٹنے لگی ہیں۔ عشق و محبت کرنا اُن کا شیوہ، شراب ان کی گھُٹی میں پڑی ہے۔ جُوا اُن کا مشغلہ ہے۔ شہوت کا زور ان میں اتنا ہے کہ ایک ایک بھائے پر کئی کئی فدا ہو رہی ہیں اور آپس میں لڑتی ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے محکمۂ صحت کی رپورٹیں اُٹھا کر دیکھئے۔ یہی خودکشی بھی خوب کرتی ہیں۔ جرائم پیشہ میں ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ریویو آف ریویو جلد ۲۸ میں اٹلی کی سرکاری رپورٹوں سے واضح ہوتا ہے کہ اُنیسویں صدی کے آخر میں جب بے پردہ عورت اتنا آگے نہیں بڑھی تھی تو ۱۸۹۸ء تا ۱۹۰۳ء یعنی پانچ برس میں ۵۶۹ عورتوں نے خودکشی کی اور فرانس میں ۵۸۶۹ عورتوں نے۔ اس نسبت سے اب آپ امریکہ کی عورتوں کے بارے میں سوچ لیجئے۔ ابھی میں نے کل ایک اخبار میں پڑھا۔ مجھے تو غلو معلوم ہوا۔ اخبار کہتا ہے کہ امریکہ میں کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جس دن مجموعی طور پر ایک ہزار خودکشی کے کیس نہ ہوں۔ اس کے مقابلے میں ہمیں کوئی مشرقی عورتوں اور مشرقی عورتوں میں پردہ نشین عورتوں کے اعداد و شمار بتائے کہ اُنھوں نے کتنی تعداد میں پانچ پانچ برس میں پچاس برس میں خودکشی کی؟ جواب سوائے خاموشی کے اور کچھ نہیں۔

دوسرا نقصان پردہ کرنے سے یہ بتایا جاتا ہے کہ اس مرد کو اس عورت کی صورت دیکھنے کا موقع نہیں ملتا جو آئندہ اس کی شریکِ زندگی بنے گی۔ اس کا نقصان آگے چل کر یہ ہوتا ہے کہ پردہ کرنے والی عورتوں کو طلاق دے دی جاتی ہے یا اسی کے ساتھ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ عورتوں کو اس قدر شکایتیں مردوں کی طرف سے پیدا ہوتی ہیں اس کی جڑ یہی بے اصولی (یعنی پردہ) ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ اعتراض بالکل اسی طرح کیا گیا ہے جس طرح ایک اندھا اپنی لاٹھی گھماتا ہے۔ ایک کُبڑی کا ارمان کہ کسی نے کبڑی کو سلام کیا اُس نے دُعا دی کہ تو بھی کُبڑی ہو جا۔

اوّل تو یہ مطالعہ ہی غلط ہے کہ پردے کی وجہ سے عورت اور مرد ایک دوسرے کی صورت سے محروم رہتے ہیں۔ یہ طبقہ قریبی رشتوں میں شادی بیاہ کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ اکثر جگہوں پر شہر کے شہر میں

شادیاں ہوتی رہیں۔ ہمارے رام پور میں آج بھی باہر سے شادیاں نہیں ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں یہ بات غلط ہے کہ ایک مرد ایک عورت سے ناواقف ہو۔ پھر جس جانچ پڑتال، دیکھ بھال کے ساتھ بڑے بوڑھے اور بڑی بوڑھیاں بہنیں اور بھاوجیں زوج اور زوجہ کا انتخاب کرتی ہیں۔ وہ خود قابل تحسین ہوتا ہے۔ پھر بھی ہم یہ اعتراض مانے لیتے ہیں کہ مرد نہ اپنی ہونے والی بیوی کی صورت سے واقف ہوتا ہے اور نہ عورت اپنے ہونے والے میاں سے۔ اس کے بعد ہم کہتے ہیں کہ شکل وصورت کی ناپسندیدگی کی وجہ سے مسلمانوں میں شاذونادر ہی طلاق ہوتی ہے۔ مسلمانوں میں طلاق کی اصل وجہ بدکاری ہے یہ بات مسلمان واقعی نہیں برداشت کر پاتا، لیکن ہمیں بتایا جائے کہ مشرق میں کتنے لوگوں نے اپنی بیوی کو پانچ، دس، بیس سال میں طلاق دی؟۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ ایسی طلاقوں کی تعداد ہے ہی نہیں لیکن ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ یہ تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے مقابلے میں ہم سے سنئے:۔

رسالہ ریویو آف ریویوز جلد ۸ میں اس رسالے کے ایڈیٹر کی خواہش پر مشہور امریکن مضمون نگار اور اہل قلم لوسن نے ایک نقشہ ان طلاقوں کے شمار واعداد کا شائع کیا جو امریکی ملکوں میں دن پر دن سامنے آتی رہی ہیں۔

اس نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک سال میں ۱۱۶۲۲ طلاقوں کی درخواستیں گذریں اور ان میں سے ۱۷۷۰ طلاقیں واقع ہوئیں۔ اس کے بعد اوسط بتایا گیا کہ انیسویں صدی کے آخر تک طلاقوں کی وجہ سے لوگ شادی سے نفرت کرنے لگے چنانچہ سنہ ۱۸۸۷ء میں ۱۰۵ شخصوں میں ایک شادی کا اوسط تھا۔ جو سنہ ۱۸۹۳ء میں ۱۲۲ میں ایک ہوا۔ سنہ ۱۸۶۷ء میں ۲۲۱۹۸ شادیاں ہوئیں اور ۱۸۳۷ طلاقیں۔ لیکن سنہ ۱۸۹۳ء میں ۲۳۸۵۸ شادیاں ہوئیں اور ۱۲۷۵۳ طلاقیں۔

مضمون نگار نے اس جائزے کے بعد لکھا ہے کہ:۔

"اگر امریکی عورت کی زندگی جدید طوفانی موجوں کے تھپیڑوں میں نہ پڑ گئی ہوتی تو اس میں شک نہیں تھا کہ اس وقت "امریکہ" میں ۹۲۲۵۶ گھرانوں سے کم گھرانے نہ ہوتے"۔

مضمون نگار لوسن کے اس گہرے طنزیہ پیراگراف کے بعد ایڈیٹر نے جو کچھ لکھا ہے وہ دیدنی ہے پھر ایڈیٹر لکھتا ہے کہ اب تو اس پر طلاق ہوتی ہے کہ زوجین میں سے ایک سوتے میں خراٹے لیتا ہے۔ اب اس پر طلاق ہوتی ہے کہ زوجین میں سے ایک کے کتے کو دوسرے نے ڈانٹ دیا۔ اب اس پر طلاق ہوتی ہے کہ زوجین میں سے ایک کے فرینڈز پر دوسرے نے اعتراض کیا۔ اب اس پر طلاق ہوتی ہے کہ زوجین میں سے مرد کا بینک بیلنس عورت سے زیادہ کیوں ہے؟۔

ایڈیٹر کے قلم میں یہ لکھتے ہوئے بڑی جولانی اور روانی آگئی ہے اس نے طلاق کے وجوہ کی ایک لمبی فہرست رقم کی ہے اس کے بعد ہنس کر لکھتا ہے کہ امریکہ طلاق کے معاملے میں اتنا کم ظرف ہو گیا ہے کہ ایسی معمولی معمولی باتوں پر وہاں طلاق ہوتی ہے۔

یہی امریکہ اور فرانس کے شاگردانِ رشید مشرق کی پردہ نشین عورتوں کو طلاق سے ڈراتے ہیں۔ اُن کی مثال ان کی سی ہے جن کو دوسروں کی آنکھ کا تنکا تو نظر آتا ہے لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر دکھائی نہیں دیتا۔ ان کی مثال اس چھنال حاملہ سے کم نہیں جو دائی سے پیٹ چھپا رہی ہو۔

خلاصہ یہ کہ اب وہاں طلاق کا رواج حد سے بڑھ گیا ہے۔ اور جو بات بہت ہی بھیانک ہے وہ یہ ہے کہ ۹۰ فیصدی طلاق کی درخواستیں عورتوں کی طرف سے ہوتی ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرد کو نکاح فسخ کرنے میں شرم محسوس ہوتی ہے۔ اور مغربی عورت اس معاملے میں اس سے بازی لے گئی ہے بلکہ "اور بہت سے شوہروں کو اپنی عورتوں کے ان سے طلاق حاصل کر لینے کی

خبری اس وقت ملتی ہے جبکہ وہ عورتیں دوسرے مرد سے شادی کر چکی ہوتی ہیں۔"
مسٹر لوسن نے طلاق کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ پہلی بات انھوں نے یہ لکھی ہے کہ

"عدالتِ عالیہ کے کھلنے پر تین دن برابر مردوں اور عورتوں کا ہجوم لگا رہا یہ سب کے سب طلاق چاہتے تھے۔ چنانچہ ۷۵ طلاقوں کا فیصلہ ہونے پر وجہ یہ معلوم ہوئی کہ مردوں نے اپنی بیویوں کو چھوڑ رکھا تھا۔"

واضح رہے کہ مغربی ملکوں میں مرد اور عورت براہ راست ایک دوسرے کو پسند کر کے شادیاں کرتے ہیں۔

مسٹر لوسن کے ایک لمبے پیراگراف کی چند ادبی سطریں ملاحظہ ہوں۔

"بہرحال اب سوسائٹی اور معاشرت کی چادر میں آگ لگ گئی ہے مگر نہ صرف اس کے دونوں کناروں میں آگ لگی ہے بلکہ یار لوگ اُسے وسط سے بھی جلانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ گھریلو زندگی کو ڈھانے والی نئے زمانے کی عورت ہی ہے۔"

اس کے بعد لوسن نے دوسری وجہ یہ بتائی کہ مرد نان و نفقہ دینے میں غفلت برتتا ہے دوسری عورتوں میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ ایک عجیب و غریب بات لوسن نے ایسی لکھ دی جسے ہم مسلمانوں کو پردے کی حمایت میں لکھنا چاہئے۔ وہ لکھتا ہے۔

"عورت نے حدودِ طبعی کے دائرے سے قدم باہر رکھ دیا تو اس کے کمال کو زوال لاحق ہو گیا وہ تباہی کے غار میں جا گری ہے۔"

اس کے بعد لوسن بڑی حسرت کے ساتھ لکھتا ہے کہ :۔

"ہمارے گھر ٹوٹ چکے۔ ہمارا جوڑا ختم ہو گیا۔ اب نہ ہم کسی کے باپ ہیں نہ بیٹے۔ نہ ہمارا کوئی رشتہ دار ہے۔ رشتہ ہے تو صرف غرض کا۔"

پھر کہتا ہے۔ "ہائے! میری وہ ماں کہاں چلی گئی جس نے مجھے پالا تھا!۔

یہ سب پڑھنے کے بعد جو شخص اس مسئلے پر تحقیق کی دقیق نظر ڈالنا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ مغرب کے اُبھرے ہوئے لفظوں کو اپنا نصب العین بنالے۔ اُسے خود تجربہ ہو جائے گا۔ اس کے برعکس یہی مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ آزمودہ را آزمودن خطاست۔ آزمائی ہوئی بات کو دوبارہ آزمانا حماقت ہے۔ کیونکہ نتیجہ یہی نکلے گا۔

اس جگہ ہمیں بر بنائے انصاف یہ بات مان لینا چاہئے کہ بے شک مسلمانوں میں کبھی کبھی طلاق دینے کی خبر آتی ہے لیکن مسلمانوں میں طلاق اس لئے نہیں ہوتی کہ مردوں کو عورت کی شکل وصورت پسند نہیں آئی تھی بلکہ اس کی وجہ کوئی گھریلو جھگڑا ہوتا ہے۔ دونوں میں سے ایک کی ناقابل برداشت بدمزاجی ہوتی ہے۔ بدمزاجی اور گھریلو جھگڑوں کے علاوہ جو طلاقیں ہوتی ہیں ان کے مرتکب مغرب کے شاگرد ہی ہوتے ہیں۔ جن کی شادی مشرقی عورت سے ہو جاتی ہے اور وہ اس غریب کو چھوڑ کر کسی میم کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ یا پھر ایسے جاہل مسلمان ہوتے ہیں جو اسلام کے بارے میں کچھ نہیں سمجھتے کہ انھیں ان کے دین نے زندگی بسر کرنے کے لئے کیا اصول دئے ہیں۔

اب رہا تیسرا اعتراض کہ پردہ علم حاصل کرنے میں عورتوں کے لئے رکاوٹ بنتا ہے۔ یہ بھی ایک لغو اور بے معنی اعتراض ہے کیونکہ ایک لڑکی سات سال کی عمر سے لے کر بارہ سال کی عمر تک برابر مدرسے میں رہ سکتی ہے اور ان پانچ سال کے عرصے میں بنیادی تعلیم سے فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔ قومی خیر خواہوں اور مصلحوں کے لئے یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے کہ وہ تعلیم نسواں کے ایسے اعلیٰ مدرسے قائم کر دیں جن میں تعلیم وتربیت دینے والی کارکن عورتیں ہی ہوں۔ ایسے مدرسوں میں لڑکیاں

بے نقاب رہ سکتی ہیں۔ گھر سے مدرسے جاتے آتے وقت اپنا چہرہ نقاب سے چھپا سکتی ہیں۔

یہاں پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ایسی لائق پڑھانے والیاں کہاں سے ملیں گی؟ تو یہ خواہ مخواہ کا اعتراض ہے بات کی پچ ہے۔ سخن سازی ہے۔ جسے ہم کبھی نہیں مان سکتے کیوں؟ کیونکہ ہمارا تجربہ ہے کہ: ؎

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد　　　اگر خارے بود گلدستہ گردد

یعنی ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ ہمت اور حوصلے نے کانٹوں کو پھول بنا دیا ہے اور یہ محض مبالغہ نہیں ہے بلکہ ہماری جانکاری میں ہے کہ رام پور، بمبئی، بھٹکل، حیدر آباد، اور دوسری جگہوں پر مسلمانوں نے ایسے مدرسے قائم کئے اور وہ بڑی کامیابی سے منزلیں طے کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد ان مدرسوں سے قابل ترین معلّمات ملنے لگیں گی۔

یہ کیا ضروری ہے کہ ہم ادھر ارادہ کریں اور ادھر کہیں سے ہمارے مطلب کی معلّمائیں مل جائیں۔ یہ کام تو بڑی سے بڑی گورنمنٹ کے بھی بس کا نہیں۔ اسے بھی ٹریننگ دینا پڑتی ہے کام تو بتدریج (دھیرے دھیرے درجہ بدرجہ) ہی ہوتا ہے۔ اور وہ پائیدار ہوتا ہے۔

ان تینوں اعتراضات کا جواب دینے کے بعد ہم کہتے ہیں کہ پردہ صحت کے لئے مضر نہیں بلکہ مفید ہے۔ پردہ عورتوں کے اعصاب (ٹانگ اور پٹھوں) کو کمزور کرنے والا نہیں بلکہ قوت دینے والا ہے۔ پردہ نفسانی خواہشوں کو ابھارنے والا نہیں۔ دبانے والا ہے۔ پردہ بداخلاقیوں کی جڑ نہیں۔ فضائلِ اخلاق کا محافظ ہے۔ پردہ بہت سی خرابیوں کے لئے رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ اس پر اگر یہ اور کہا جائے کہ اگر پردہ کرنے والیاں اسلامی اصول و قواعد کے ساتھ پردہ کریں تو نورٌ علیٰ نور ہو کر ان خرابیوں کو مٹا سکتی ہیں جو نئی تہذیب اور مغربی افکار کے جسم پر کوڑھ بن کر نمایاں ہو گئی ہیں اور صاف دیکھی جاتی ہیں۔ خود مغرب کے اعلیٰ درجہ کے اہل قلم ان کی نشاندہی کر رہے ہیں جنمیں سے کچھ کے اقتباسات ہم نے اپنے اس مضمون میں دئے بھی ہیں۔ ٭٭٭

مسلمان عورت تاریخ کی روشنی میں

مغرب کا غلط پروپیگنڈا

مغرب کے مفکرین اور مؤرخین نے مسلمان عورت کا نہایت بھیانک نقشہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے پورے زورِ بیان کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح یورپ میں قرونِ وسطیٰ میں عورت انتہائی پسماندہ اور مرد کے ظلم و ستم اور ہوس رانیوں کا نشانہ بنی رہی ہے اسی طرح مسلمان عورت بھی مرد کی قید میں رہی ہے اور علم و ادب کی خدم[illegible]ت تو کجا اُسے سورج کی روشنی تک دیکھنا نصیب نہیں ہوئی۔ اس کے بعد مغربی مفکرین اپنا فلسفہ بگھارتے ہیں۔ اور عورت کی پسماندگی کا راز ڈھونڈتے ہیں اور بالآخر اپنی تحقیقات کا ثمرہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان عورت کی پسماندگی اور بے چارگی کا اصل سبب پردہ ہے۔ چنانچہ بیچاری مسلمان عورت بھی اُن کی اس فلسفہ طرازی سے متاثر ہو جاتی ہے اور وہ بھی یہ فرض کر لیتی ہے کہ ٹھیک کہا ہے مغربی مفکروں نے، میں واقعی اپنی پوری تاریخ میں بُری طرح ستم رسیدہ رہی ہوں جہاں مردوں نے تاریخ کی مختلف خدمات انجام دی ہیں وہاں میری کوئی خدمت نظر نہیں آتی اور ہو نہ ہو یورپ کا یہ سُراغ بالکل حقیقت پر مبنی ہے کہ میری مظلومیت کا اصل سبب مرد کے حکم پر چند گز کے مکان میں میرا زندگی بھر بند رہنے پر راضی ہو جانا ہے۔ میں جب گھر ہی میں بیٹھی رہتی ہوں [illegible] کی اسٹیج پر میری اداکا

بلند نہیں ہوتی۔ شعر و ادب کی محفلوں میں میرے نغمے نہیں گونجتے، مردوں کے دوش بدوش سوشل کاموں میں میرا نام نہیں پکارا جاتا، تو تاریخ مجھ سے کس خدمت کی توقع رکھتی ہے ـــــ لہٰذا اگر مجھے تاریخ کی خدمت کرنا ہے اور زندگی کی گاڑی کا متحرک پہیہ بن کر دکھانا ہے تو سب سے پہلے مجھے اس پردے کے بار کو کندھوں سے اُتار پھینکنا چاہئے۔ جب تک یہ میرے سر اور منہ پر چھایا رہے گا بقول مغربی مفکرین میرے اور خدمتِ تاریخ کے درمیان ایک پہاڑ حائل رہے گا ـــــ یہ ہے وہ تاثر جو مسلمان عورت کے دل و دماغ پر مغربی مفکرین کے جھوٹے پروپیگنڈے نے پیدا کیا ہے!!

لیکن کیا مسلمان عورت اپنی پہلی تاریخ میں مظلوم و پسماندہ رہی ہے؟ کیا اس نے تاریخ کی کوئی خدمت سر انجام نہیں دی؟ کیا پردے نے اُسے عضوِ معطل بنا کر رکھ دیا تھا؟

ذیل کے مضمون میں ہم نے انہی سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے اور خود تاریخ کی زبان سے شہادت فراہم کی ہے کہ وہ اپنی تاریخ میں کیا کچھ تھی اور اس نے تاریخ کی کیا خدمات سر انجام دیں؟

یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہم نے جن خواتین کی مختلف سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے وہ دورِ اوّل (یعنی پہلی اور دوسری صدی ہجری) کے بعد کی خواتین ہیں۔ دورِ نبوی ﷺ کی خواتین صحابیات اور تابعیات کی صف میں شمار ہوتی ہیں اور کسی حد تک عام مسلمان ان سے واقف ہیں۔ اس لئے ہم ان کے تذکرے کو سرِ دست اپنے موضوع سے خارج کرتے ہیں اور آئندہ کبھی توفیقِ الٰہی شاملِ حال رہی تو ان کے تذکرے سے بھی آپ کو محظوظ کریں گے۔

حدیث، تفسیر اور فقہ میں خاتونِ اسلام کی خدمات

حدیث و فقہ اور تفسیر میں خاتونِ اسلام نے جو خدمات سر انجام دی ہیں، ان پر اگر سیر حاصل گفتگو کی جائے تو اس کے لئے کئی طبقات درکار ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم خواتین کے ایک بھاری گروہ کو ان علوم

میں منہمک دیکھتے ہیں تو ایک طرف ہماری حیرت سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں کہ مردوں نے دین کی حفاظت و اشاعت میں جس پتہ ماری اور غیر معمولی شغف کا ثبوت دیا ہے۔ عورتوں نے بھی اس فرض سے سبکدوش ہونے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی اور دوسری طرف ہمیں یہ ملال ہوتا ہے کہ جو خاتون اپنی ایسی روشن تاریخ رکھتی ہو وہ نہ صرف خود اپنی تاریخ سے بیگانہ ہے بلکہ اُلٹا دوسروں کے غلط پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اپنے تابناک ماضی کو تاریک خیال کر بیٹھی ہے آپ اندازہ لگائیں کہ تیسری صدی ہجری اور نویں صدی ہجری کے درمیانی عرصہ میں صرف ایک تذکرے میں ۳۷۰ نمایاں محدثات کا ذکر ملتا ہے۔ اگر تمام تذکرے جمع کئے جائیں اور طبقات و رجال کی کتابوں میں ان کی چھان بین کی جائے تو بہت بڑی تعداد سامنے آسکتی ہے۔ عورتوں میں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مؤرخین اور محدثین حدیث و فقہ میں سرِ فہرست رکھتے ہیں اور عام مسلمان بھی عائشہ نامی ایک ہی محدثہ سے واقف ہیں لیکن ہم نے سنہ ۳ھ سے سنہ ۹ھ تک ۵۵ ایسی محدثات کا تذکرہ پڑھا ہے جو عائشہ نام رکھتی ہیں اور ان میں وہ بھی ہیں جن کے سامنے جلیل القدر ائمہ حدیث زانوئے تلمذ طے کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح صرف زینب نام کی ۵۶ محدثات کا ذکر انہی ادوار میں ملتا ہے۔

محدثات کی یہ تعداد راویات کے علاوہ ہے سنہ ۹ھ سے سنہ ۱۹ھ تک ۲۶۵ راویات کے حالات صرف اعلام النساء کے مصنف نے بیان کئے ہیں۔ راویات سے مراد وہ خواتین ہیں جنہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور تقریرات کو خود سُن کر یا دوسری عورتوں یا مردوں سے سُن کر بعد کے لوگوں تک روایت کیا ہو حدیث کا پورا انتظام روایت سے وابستہ ہے چنانچہ جس طرح مرد اس سلسلے کی کڑیاں ہیں اسی طرح عورتیں بھی اس میں شامل ہیں بلکہ بعض بعض احادیث تو وہ ہیں جن کی روایت صرف عورتوں تک محدود ہے۔ روایات کی یہ تعداد جو اُوپر بیان کی گئی ہے یہ آخری تعداد نہیں ہے بلکہ یہ صرف خواتین کے ایک تذکرے کے اعداد و شمار ہیں اس سلسلے کا

یہ عالم ہے کہ عابدہ المدینہ نامی صرف ایک خاتون نے دس ہزار احادیث کی روایت کی ہے (مقری)

محدثات کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ کثیر تعداد ایسی خواتین کی ہے جو بڑے بڑے ائمہ حدیث کے استاد اور شیخ رہی ہیں۔ مثلاً امام سیوطی کے مشائخ میں سے آسیہ بنت جار اللہ، اور خدیجہ بنت احمد بھی ہیں اور ان خواتین نے امام سیوطی کو روایت حدیث کی اجازت دی ہے۔ امام ذہبی مصنف تذکرۃ الحفاظ کا اپنا بیان ہے کہ میں نے حبیبہ بنت عبد الرحمن مقدسیہ سے حدیث کا سماع کیا۔ حافظ ابن حجر کے مشائخ میں زینب بنت عثمان دمشقیہ، زینب بنت محمد بن عثمان الدمشقیہ اور زینب بنت محمد الدمشقیہ بھی ہیں اور انہوں نے حافظ ابن حجر کو سند اجازت دی ہے۔ بلکہ بخاری کے جلیل القدر شارح نے صحیح بخاری کی ایک خواندگی اپنے وقت کی جلیل القدر محدثہ عائشہ بنت عبد الہادی کے سامنے کی تھی اور موصوفہ نے انھیں سند روایت عطا کی تھی حافظ ابن حجر کے بعض شیوخ (اساتذہ) نے جو ہرشیہ بنت احمد الہکاری اور زہرہ بنت عمر سے حدیث پڑھی۔ محدث سمعانی اور ابن عساکر کا بیان ہے کہ خجستہ بنت ابراہیم (پیدائش اصفہان ۴۴۴ھ) سے انھوں نے حدیث سنی ہے اسی نام کی ایک اور خاتون خجستہ بنت ابوالوفا بن عمرو بن ماجہ حدیث میں ابن عساکر کی استاذ رہی ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ عجائب الاسفار میں لکھا ہے کہ جب وہ دمشق گیا تو اس وقت جامع بنی اُمیہ میں مشہور محدثہ زینب بنت احمد المقدسیہ (۶۲۶ھ ۔ ۷۴۴ھ) درس حدیث دیا کرتی تھی۔ ابن بطوطہ اس کے درس میں شریک ہوا اور اس سے حدیث کا سماع کیا مشہور عالم حدیث ابوحامد اسفرائینی اپنے زمانے کی مشہور محدثہ جمعہ بنت احمد المحمیہ کی بہت تعظیم کرتے تھے اور حدیث میں ان کو بہت اونچا درجہ دیتے تھے محدث عبدالرحیم العراقی نے رقیہ بنت عبدالغفار شۃ سے... حدیث کا سماع کیا۔ زینب بنت احمد (۶۴۶ھ ۔ ۷۴۰ھ) کے درس میں دوسری متعدد کتب احادیث کے علاوہ منتقی، الدار قطنی اور استذکار از ابن عبدالبر بھی پڑھائی جاتی تھیں۔ اور بڑے بڑے علما ان کے درس سے استفادہ کرتے تھے۔ علامہ سخاوی نے اپنی کتاب الضوء اللامع میں ایسی خواتین کی ایک

ذیل فہرست دی ہے جن سے موصوف نے حدیث
نی اور پڑھی ہے اور روایت کی اجازت حاصل
کی ہے۔ مثلاً آسیہ بنت جار اللہ، آسیہ بنت
احمد، آمنہ بنت محمد الرشیدی۔ آمنہ بنت موسیٰ
اسماء بنت عبداللہ، خدیجہ بنت فرج وغیرہا یہ آخری
خاتون خدیجہ بنت فرج سوڈان کے ایک مقام
زَیْلَع کی رہنے والی تھیں۔ اور امام مالک کی کتاب
مؤطا جس کی روایت یحییٰ بن یحییٰ مصمودی نے کی ہے
کا درس دیتی تھیں۔

دوسری طرف خواتین نے جن حضرات سے
حدیث وفقہ پڑھی ہے اور ان کی سند لی ہے وہ
بھی بڑے بڑے ائمہ حدیث ہیں۔ مثلاً خدیجہ بنت
ابراہیم (۷۲۰ــــــ ۸۰۳) نے اسحاق آمدی
مؤلف "احکام فی اصول الاحکام" الوانی، دبوسی
مؤلف "تاسیس النظر فی علی الجدل والخلافیات"
ابن سید الناس اور قطب الدین حلبی سے حدیث
پڑھی اور سند لی ہے۔ خدیجہ ام محمد امام احمد بن
حنبل کے درس میں شامل ہوا کرتی تھیں۔ رقیہ
بنت عبدالسلام بصری (۷۲۶ــــ ۸۰۹) کو حافظ
ذہبی، حافظ برازلی، حافظ المزی، ابن سید الناس

زینب بنت الکمال اور قطب الحلبی سند اجازت
دی ہے۔ یہ اجازت گویا استاد کی طرف سے
شاگرد کو ایک سرٹیفکیٹ ملتا تھا جس کی بنا پر
وہ احادیث کو آگے روایت کرنے کا مجاز ہو جاتا
تھا۔ خاتونِ اسلام کی حدیث سے شیفتگی اور محبت
کا اندازہ اس ایک مثال سے لگا سکتے ہیں۔ زینب
بنت یحییٰ بن عز الدین السلمی (۶۴۸ ــــ ۷۳۵)
طبرانی کی المعجم الصغیر کو سماع متصل کے ساتھ روایت
کرنے میں منفرد تھیں۔ حافظ الذہبی ان کے بارے
میں اپنے تذکرے میں رقم طراز ہیں: "اس خاتون
میں نیکی اور عبادت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی
حدیث روایت کرنے کی بڑی دلدادہ تھیں حدیث
سے یہاں تک عشق تھا کہ جس روز اس خاتون کا
انتقال ہوا، اسی روز اس کے سامنے طلباء اور
علماء کی ایک جماعت نے حدیث کے متعدد اجزاء
پڑھے۔ اور اسی درس و تدریس میں دنیا سے
سدھار گئیں"۔ طلبِ حدیث اور اشاعتِ حدیث
کی خاطر طول طویل سفر کرنے کے سلسلے میں بھی
مسلمان خاتون کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ اگر
ہمیں طوالت کا خوف نہ ہوتا تو اس داستان سے ہم

آپ کو کسی قدر محظوظ کرتے لیکن بطور نمونہ آپ
کے سامنے دو ایک مثالیں بیان کرتے ہیں اور اسی
گلستان پر آپ پوری بہار کا قیاس کر لیں۔
زینب بنت عمر احمد (وفات ۷۲۲ھ) نے دمشق
مصر، بیت المقدس اور مدینہ منورہ میں حدیث کا
درس دیا۔ محدثہ جمعہ بنت احمد نیشاپور کی رہنے
والی تھیں۔ وہاں سے طلب حدیث میں بغداد
آئیں اور اس وقت کے ائمہ حدیث سے حدیث
و فقہ کا درس لیا۔

اسی طرح کی مثالیں ہمیں فقہ کے باب میں
بھی دستیاب ہوتی ہیں۔ مثلاً امۃ الواحد بنت
الحسین بن اسماعیل المحاملی مسلک شافعی کی جید
فقیہہ تھیں۔ بلکہ ان کے زمانے میں فقہ شافعی کے
صرف دو ہی مرجع تھے۔ ایک موصوفہ مذکورہ اور
دوسرے ابو علی بن ابو ہریرہ۔ زلیخا بنت اسمٰعیل
بھی فقہ شافعی کی فقیہہ تھیں۔ ان کے ہم عصر فقہا
مستورات کے مسائل میں ان کی جانب رجوع
کرتے تھے۔ زینب سکینہ کی فقاہت کا یہ عالم تھا
کہ انھوں نے چاروں مذہبوں کے مطابق حج
کے مسائل پر ایک کتاب تالیف کی جو ۶۰ اجزاء
پر مشتمل تھی۔ اس کتاب کو پہلی بار مصر کے مشہور ادیب
و عالم حمزہ فتح اللہ نے معلوم کیا ہے اور موصوفہ کی
فقاہت و فضیلت پر غیر معمولی حیرت کا اظہار کیا ہے
فاطمہ بنت احمد یحییٰ درجۂ اجتہاد پر فائز تھیں۔ ان
کے خاوند امام مطہر بھی عالم تھے اور طلبا کو درس
دیتے تھے۔ دوران درس جب وہ کسی مسئلے میں الجھ
جاتے تو گھر آ کر فاطمہ بنت احمد سے اپنی مشکل حل
کرواتے اور جب دوسرے دن طلباء کے سامنے
اس مسئلے کی تشریح کرتے تو طلباء کہتے هذا ليس
منك، هذا من خلف الحجاب) یہ آپ نہیں بول رہے
ہیں بلکہ یہ پردے کے پیچھے سے آواز آ رہی ہے۔)
(ملاحظہ ہو البدر الطالع الشوکانی)

کناس (الجزائر) کی خاتون رحمت بنت
الجنان تفسیر قرآن میں امامت کا درجہ رکھتی تھیں۔
تفسیری مسائل کو بڑی خوش اسلوبی سے حل کرتی
تھیں۔ خود آپ کے ہندوستان میں عبدالرحیم
خان خاناں کی دختر جہاں بیگم کے بارے میں تذکرۃ
الخواتین کے مصنف نے لکھا ہے کہ اس نے قرآن
کریم کی ایک تفسیر بھی لکھی ہے۔ نفیسہ بنت حسن (۱۴۵
۲۰۸) قرآن اور تفسیر قرآن دونوں کی حافظہ تھیں۔

بہرحال یہ چند اشارات ہم نے آپ کے
منے بیان کر دئیے ہیں ان سے یہ اندازہ ہوسکتا
ر خاتونِ اسلام نے مردوں کے دوش
ں حدیث، فقہ اور تفسیر میں کیا کیا کارہائے
ے کئے ہیں۔ ہمارے سامنے تقریباً دو صَد
قابلِ ذکر محدثات وفقیہات ہیں جن سے
سے ہاں کی مسلم خواتین کو لازماً متعارف
جانا ہئے۔

ن عورت اور مختلف علوم وفنون

اب
ے فنون نحو، لغت، عروض، حساب، کتابت
، طب وغیرہ کی جانب آئیے۔ ان علوم میں بھی
ت اُسی سرگرمی سے مرد کے ساتھ شریک
۔ جو سرگرمی اُس نے حدیث و فقہ کے باب
ھائی ہے اس وقت اگر ہم ان فنون کی
تین کا اختصار سے بھی ذکر کرنے لگیں تو
ے شاید رسالے کے پورے صفحات
ا نہ ہوں۔ تاہم مشتے نمونہ از خروارے
! ـ

نحو، عروض، حساب اور خطاطی

حسین بن اسمٰعیل

المحاملی مصری کی بیٹی امۃ الواحد (وفات ۳۷۷ھ) نحو، فرائض اور حساب میں اونچے پیمانے کی دستگاہ رکھتی تھی۔ قاہرہ کے ایک عالم عبداللطیف کی بیٹی امۃ الخالق کے بارے میں مصنف اعلام النساء نے لکھا ہے کہ وہ بڑی فاضلہ تھی۔ نحو کی مشہور کتاب الفیہ ابن مالک اُسے زبانی ازبر تھی۔ دھابنت یحییٰ بن مرتضیٰ نحو، اصول، منطق، نجوم، رمل، سیمیا اور شعر میں یکتائے زمانہ تھی۔ یہ علوم اس نے اپنے بھائی الامام المہدی سے حاصل کئے تھے۔ اس نے اپنے بھائی کی کتاب الازہار کی چار جلدوں میں مفصل شرح لکھی۔ اسی طرح فقہ و فرائض کی کتاب منظومۃ کوفی اور مختصر المنتہیٰ کی شرح لکھی۔ معجم البلدان کی روایت کے مطابق یہ خاتون یمن میں شہر ثلا میں طلباء کو درس دیتی تھی اور اس کا انتقال بھی ۸۳۷ھ میں اسی شہر کے اندر ہوا۔ عبدالرحمٰن ابن غلبون الکاتب اُندلسی کی آزاد کردہ لونڈی الروضیہ نامی اُندلس کی بہت مشہور ادیبہ شمار ہوتی ہے

قرطبہ میں رہتی تھی۔ نحو اور لغت اس نے اپنے مالک عبدالرحمان سے حاصل کی۔ عروض میں خاص مہارت حاصل کی۔ الکامل للمبرد اور النوادر از علی القالی اُسے زبانی حفظ تھی۔ ان دونوں ادبی کتابوں کی شرح بھی اس نے لکھی ہے۔ (وفات ۴۵۰ھ) بنت الکبیری نامی لڑکی کے بارے میں یاقوت حموی کا بیان ہے کہ وہ اپنے دور میں نحو و لغت کی امام تھی ان فنون پر اس نے متعدد تصانیف بھی لکھی ہیں۔

گذشتہ صدی میں مصر میں فاطمہ الازہریہ، عروض اور نحو کی ماہر گزری ہے۔ مصر کی مشہور خاتون عائشہ تیمور نے عروض اسی فاطمہ الازہریہ سے سیکھا تھا۔ امام سیوطی نے طبقات النحویین میں فاطمی خلیفہ مستنصر باللہ کی ایک کاتبہ (سکریٹری) لُبنٰی کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ نحو اور حساب اور عروض میں اپنے زمانے کی یکتا بے مثال تھی اور خلیفہ کے محل میں ان فنون میں اس سے بڑا کوئی عالم داخل نہیں ہوا۔ اسماء بنت عبرت انمارا نامی خاتون قسطنطنیہ کی مشہور خطاطہ تھیں اور اپنے حسنِ خط کی شہرت پورے ملک میں رکھتی تھیں۔ چونکہ اس زمانے میں مشینی طباعت کا انتظام نہیں تھا۔ کتابیں کاتب اپنے قلم سے لکھتے تھے۔ اس لئے اس فن کے ماہرین کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور جو جتنا خوشخط ہوتا تھا اس کی طرف رجوع کرنے والوں کی اتنی ہی کثرت ہوتی تھی۔ اس فن میں جس طرح مردوں نے مہارت دکھائی ہے عورتیں بھی ان سے کسی طرح کم نہیں رہی ہیں۔ حلیمہ بنت صادق (۱۱۶۹ھ) ترکی کی بہترین خطاطہ (کاتبہ) شمار ہوتی تھیں آستانہ کے رئیس الخطاطین محمد راسم نے انھیں باقاعدہ اس فن کا سرٹیفکیٹ دیا تھا۔ بادشاہ خاتون نامی عورت خطِ یاقوتی میں منفرد تھیں اور اس خط میں قرآن لکھا کرتی تھیں۔ مسلمانوں کی جنتِ گم گشتہ غرناطہ — کی ایک خاتون سیّدہ بنت عبدالغنی (ف ۶۴۷ھ) قرآن کی حافظہ تھیں۔ فنِ کتابت میں پوری دسترس رکھتی تھیں۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے امام غزالی کی ضخیم کتاب احیاء العلوم اور دوسری متعدد علمی اور اخلاقی تالیفات کو کئی بار لکھا۔ اپنے حسنِ خط کی بنا پر بارہا شاہی انعامات حاصل کئے۔ موصوفہ کی عادت تھی کہ اُسے جس قدر شاہی انعامات ملتے تھے ان کی رقوم مسلمان قیدیوں

کے نادار اہل و عیال پر خیرات کر دیتی تھیں ۔

صارۃ الحلبیہ جو ایک شامی خاتون تھی اور تونس میں جاکر اقامت پذیر ہو گئی تھی۔ اعلیٰ پائے کی ادیبہ اور طبیبہ تھی۔ متعدد فنون میں مہارت رکھتی تھی۔ بہترین خطاطہ تھی۔ سونے کو کیمیاوی طریقے سے محلول کر کے اس سے قرآن اور دوسری کتابیں لکھتی تھی۔ اور اس میں وہ یکتائے روزگار تھی۔ عبدالملک ابو نصر الکندی کے زمانے کی ایک خاتون فاطمہ بنت حسن اقرع بہترین خطاطہ تھی۔ خط کا اُسلوب مشہور خطاط عرب ابن البواب سے اخذ کیا تھا۔ اس نے ایک بار ابو نصر الکندی کو اپنے خط کا نمونہ دکھانے کے لئے ایک چٹھی لکھی جس پر ابو نصر نے اُسے ایک ہزار دینار انعام میں دیئے بادشاہِ وقت کو جب سلطانِ روم کو صلحنامہ لکھ کر بھیجنا تھا تو اس نے اسی خاتون کی خدمات حاصل کی تھیں۔ یاسمین بو جو پہلے مرزا عسکری والمنانی کی زوجیت میں تھی اور گلبرگہ دکن میں رہتی تھی اور بعد میں دہلی میں آکر اُس نے ایک تیموری امیر سے شادی کر لی۔ خط کی بڑی ماہر تھی خطِ ثلث نسخ، شفیعا، اور نستعلیق میں خوب لکھتی تھی ۔

شاعرہ بھی تھی۔

طب، تصوف، تاریخ

اُخت الحفید ابو بکر فن طب میں ماہرانہ دسترس رکھتی تھی۔ خاص طور پر امراضِ نسواں کی اسپیشلسٹ تھی۔ سلطان مغرب منصور بن یوسف کے حرم کی خواتین اسی کی جانب رجوع کرتی تھیں اسی طرح زینب طبیبہ بنی اُود بھی طب میں قابلِ رشک دستگاہ رکھتی تھی اور امراضِ چشم کی اسپیشلسٹ تھی۔ جراحیات میں پورے عرب میں مشہور تھی۔ مشہور طبیب ابو عبداللہ الکتانی کی ایک جاریہ (ف ۵۵۰) طب، علم، تشخیص اور اپریشن میں بلا کا درک رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ نحو، لغت، عروض، خوشخطی میں بہرہ وافی حاصل تھا جنگی ہتھیاروں کے استعمال کی حیرت انگیز مشق رکھتی تھی۔ پچھلی صدی کی بات ہے کہ مصر میں تاج الاول بنت عبدالجلیل نامی ایک خاتون گزری ہے جو فلسفہ و منطق کے نہایت مشکل اور پیچیدہ مسائل حل کرنے میں ضرب المثل تھی۔ ازہر کے شیوخ اس کی فلسفہ دانی کے نہ صرف معترف تھے بلکہ کہا جاتا ہے اس کی جانب رجوع کرتے رہتے تھے۔ اخلاقیات

میں بھی اسے غیر معمولی بصیرت حاصل تھی۔ حافظ ابن حجر نے الدررالکامنہ میں لکھا ہے کہ عائشہ بنت عبداللہ (ف ۷۷۰ھ) حدیث اور تاریخ میں گہری نظر رکھتی تھی۔ یہ دونوں علوم اس نے اپنے دادا محبّ الدین طبری جو شیخِ حرم اور حافظِ حجاز تھے۔ سے حاصل کئے اور تاریخ ابن طبری پر ایک کتاب بھی تالیف کی ہے جسٹس امیر علی نے اپنی کتاب "اسلام میں عورت کا مقام" میں ایک جگہ پر لکھا ہے کہ طافیہ بنت ابوالفرج تاریخِ اسلامی پر گہری نگاہ رکھتی تھیں اور خاص طور پر حدیثِ نبوی پر بڑے پُرمغز اور عالمانہ لیکچر دیا کرتی تھیں۔ عائشہ بنتِ علی بن محمد (۷۶۱ — ۸۴۰ھ) قاہرہ میں رہتی تھیں جلیل القدر عالمہ تھیں۔ سیرۃ النبیؐ مصنفہ ابن فرات بہار سیار اور سلوان المطاع مؤلفہ ابن ظفر زبانی یاد تھے۔ حافظہ اس درجہ قوی تھا کہ لمبے لمبے قصیدے صرف ایک بار پڑھنے سے حفظ ہو جاتے تھے مختلف شعراء کے بے شمار اشعار اُسے یاد تھے۔ عائشہ الباعونیہ، دمشق کی مشہور شافعی المسلک خاتون تھیں علوم دینی کے علاوہ ادب و شعر کا بہت اونچا ذوق رکھتی تھیں۔ تصوف میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس موضوع پر ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ مثلاً (۱) الفتح الحقی من منح التلقی (۲) الملامح الشریفہ من الآثار المنیفہ (۳) دُرر الغائص فی بحر المعجزات والخصائص یہ تیسری کتاب دراصل اس کا ایک قصیدہ ہے جس میں تصوف کے مقامات بیان کئے ہیں اس کی شرح بھی اس نے لکھی ہے (۴) الاشارات الخفیہ فی المنازل العلیہ یہ بھی ایک منظومہ ہے جس میں موصوفہ نے علامہ ہروی کی منازل السائرین کا اختصار کیا ہے (۵) اسی طرح اس نے محدثِ سخاوی کی کتاب "القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحبیب الشفیع" کی تلخیص بھی لکھی ہے (اس کی وفات قاہرہ میں ۱۵۱۶ء میں ہوئی) مشہور مؤرخ مقریزی کی بیوی سوالی رملہ نکالنے میں بے مثال مہارت رکھتی تھی یہ فن اس نے خود مقریزی سے سیکھا تھا۔ اعلام النساء کے مصنف نے مصر کی ایک خاتون مریم بنت نصر اللہ نحاس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس حروفِ تہجی کی ترتیب پر مشہور تاریخی عورتوں پر معرض النساء کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی جو خدیوی اسماعیل پاشا کی بیوی کے اہتمام

شائع ہوئی۔ یہ صرف ایک جلد تھی۔ دوسری جلد ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ موصوفہ کا (۱۸۵۶ء) میں انتقال ہو گیا۔

اجتماعی اور رفاہی خدمات

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو جو اخلاقی تعلیمات دی ہیں ان میں سے سب سے اہم تعلیم خدمتِ معاشرہ ہے۔ اس خدمت کے کئی پہلو ہیں۔ مثلاً قوم کے اندر علم کی اشاعت کرنا۔ یا اس کی اشاعت کا انتظام کرنا۔ غریبوں اور مسکینوں کی دیکھ بھال کرنا۔ مصیبت زدگان کی امداد کرنا۔ رفاہی ادارے قائم کرنا شفاخانے کھولنا۔ مسلمان عورت نے خدمتِ معاشرہ میں کیا حصّہ لیا ہے؟ اس کا اندازہ ہمارے ذیل کے بیان سے کسی قدر ہو سکتا ہے۔

محدث علم الدین بلقینی کی بیٹی الف خاتون ب نہایت نیک دل اور با علم خاتون تھیں۔ اطراف و دیار سے قرأت، حدیث اور تفسیر کی تعلیم کے لئے ان کے پاس طلبہ آتے رہتے۔ یہ انہیں تعلیم سے مالا مال کرتیں اور ان کے جملہ مصارف، خوراک، پوشاک، رہائش کا بھی خود ہی انتظام کرتیں۔ امام سخاوی نے الضوء اللامع میں اس خاتون کے تذکرے میں لکھا ہے کہ یہ بیواؤں کی تلاش میں رہتی تھیں اور ان کے لئے ہر قسم کا آرام مہیا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتیں

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں ایک شامی عورت کیک خاتون بنت امیر تنغلی کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ ہم اس خاتون کے پاس گئے، اس وقت یہ صحن میں بیٹھی قرآن کریم پڑھ رہی تھیں۔ ان کے ایک طرف دس بوڑھی عورتیں درس سن رہی تھیں اور دوسری طرف بیس نوخیز لڑکیاں بیٹھی کشیدہ کاری کا کام کر رہی تھیں۔ گویا یہ خاتون درس وعظ کے ساتھ خانہ داری کی تعلیم بھی دیتی تھیں۔

مشہور عربی ادیب الحریری کی دختر عائشہ (ف ۱۱۰۵ء) کے بارے میں مذکور ہے کہ اس نے اپنی تمام آمدنی فقرا و مساکین اور قرآن کریم کی تعلیم کے لئے وقف کر دی تھی۔ زینب بنت محمد پاشا (جو عثمانی دور میں مصر کا ترکی حکمران تھا۔) کی سخاوت کا یہ حال تھا کہ صرف آستانہ میں اس نے چار سو غریب خاتونوں کی کفالت اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ غرناطہ کی مشہور خطاطہ کے بارے میں آپ پہلے معلوم

کر چکے ہیں کہ اسے اپنے فن پر جو شاہی کا صلے ملتے تھے
اور تعلیمی خدمات کے معاوضے میں جو کچھ ملتا تھا
اُسے مسلمان قیدیوں کے غریب بال بچوں پر صرف
کر دیتی تھی۔ افریقہ میں جب ۴۲۵ھ میں قحط سال
کی وبا پھوٹی اور اس نے تمام شہروں اور بستیوں
کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو امیر افریقیہ معز بن
بادیس کی حرم زلیخا نے اپنے پاس سے غریبوں
میں ۶۰ ہزار کفن تقسیم کئے۔ جمیلہ بنت ملک ناصر
الدولہ (ف ۱۰۰۳ھ) جب ۳۶۳ھ میں حج تشریف
لے گئیں، تو اس سال تمام حجاج کو برف اور
کھانڈ میں ستو پلائے۔ علاوہ ازیں حجاج کی
خوراک کے لئے اپنے ساتھ غلے اور سبزیوں
کے کئی اونٹ بھر کر لے گئیں۔ بے سہارا حجاج
کے لئے ۵ سو سواریوں کا انتظام۔ کعبہ پر دس
ہزار دینار نچھاور کئے۔ تین سو غلام اور لونڈیاں
آزاد کیں۔ فقرا اور مجاورین کعبہ کی جھولیاں
بھر دیں۔ فاطمی خلیفہ متوکل علی اللہ کی ماں
شجاع بڑی خدمت گزار خاتون تھیں۔ اپنے
ملازمین کے ذریعے سے پوشیدگی کے ساتھ
صدقہ و خیرات کرتی رہتیں۔ ۲۳۶ھ میں

حج پر تشریف لے گئیں، جب راستے میں کوفہ
پہنچیں تو وہاں عباسی خاندان کے ہر فرد کو ایک
ہزار درہم، ہر مہاجر کو پانچ سو درہم ہر ہاشمی
عورت کو پانچ سو درہم دیئے (ف ۲۴۸ھ)
یلقطو بنت بغا جب ۴۲۲ھ میں حج پر گئیں
موصوفہ نے حرمین میں ۴۰ ہزار دینار خیرات کئے
اور راستے میں بھی جہاں سے گزرتی گئیں سونے
کی بارش کرتی گئیں۔ طغاکی اُم تُرک زوجہ سناء
قلاؤون نے اپنی تمام لونڈیوں کو جہیز دیکر آزاد
کر دیا تھا اور اسی طرح ۸۰ غلام آزاد کئے۔ سناء
قلاؤون اس کی پاکبازی سے بہت متاثر تھا
جب حج پر تشریف لے گئیں تو ناصر قلاؤون نے
اس سال اہل مکہ سے چونگی معاف کر دی (ف ۷۴۹ھ)
اسماء بنت موسیٰ الضجاعی (ف ۹۱۴ھ) یمن کے
شہر زبید میں رہتی تھیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں
کو بلا معاوضہ تعلیم دیتیں۔ عورتوں کی مجلس لگا کر
انھیں قرآن اور حدیث پڑھ کر سناتیں۔ امیر افریقیہ
معز بن بادیس کی اتالیق فاطمہ الحاضنہ نے قیروان
کی جامع مسجد عقبہ کے لئے ایک بڑا کتب خانہ وقف کیا۔
جس میں انتہائی نفیس و نایاب تالیفات تھیں ٥

تراشے

ادھر اُدھر سے

…ے فرائض

• پچھلے دنوں مدراس میں خواتین ڈاکٹروں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ کانفرنس میں ڈاکٹر مسز ایچ۔ ایم شرما نے ایک مقالہ پیش کیا جس میں شادی شدہ لیڈی ڈاکٹروں کی سماجی زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی …انھوں نے بتایا کہ شادی شدہ لیڈی ڈاکٹروں کا بنیادی مسئلہ ان کے فرائض کا دوہرا پن ہے۔ ایک …توان کو اپنے پیشے کا انتظام کرنا پڑتا ہے اس میں محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے اور دوسری طرف گھر کے …بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ فرائض کے اس دوہرے پن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ تو اپنی معلومات وسیع …کیلئے وقت دے پاتی ہیں اور نہ گھر کا انتظام ٹھیک ڈھنگ سے ہو پاتا ہے۔ شوہروں پر دھیان نہ دینے …کی وجہ سے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ بچوں کی دیکھ ریکھ، تربیت، ان پر کم دھیان دیے …اور حقیقی پیار کی کمی کی وجہ سے بچے خراب ہو جاتے ہیں اور نقصان دہ گولیوں اور شراب جیسی بری عادتوں …ہو جاتے ہیں اور طرح طرح کی غلط حرکتیں کرتے ہیں۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواتین ڈاکٹر …دباؤ کی شکار ہو جاتی ہیں اور صحیح کام نہیں کر پاتیں۔ (از ہندوستان ٹائمز)

…ی کمزوری

• میاں بیوی میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ غلطی سے شوہر بھی کچھ بڑھ چڑھ کر بول گئے۔ بیوی چراغ پا ہو گئیں: "میں کہتی ہوں، اپنے الفاظ واپس لو۔"

"نہیں لیتا۔" شوہر نے کہا۔

"آخری بار کہتی ہوں، پانچ منٹ کے اندر اپنے الفاظ واپس لو۔" بیوی گرجیں۔

"اور پانچ منٹ کے اندر واپس نہ لئے تو —؟" شوہر نے آنکھیں نکالیں۔

بیوی نرم پڑ گئیں اور کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ "اچھا تمہیں کتنا وقت چاہئے؟" (منوہر لال جالندھر)

تنہا عورت | مشہور اداکارہ اور گلوکارہ جوڈی لیٹ سیر و سیاحت کے لیے اسپین گئی تھی اور وہاں ایک ہوٹل کے وسیع لان میں آفتابی غسل کر رہی تھی۔ کہ ایک کالی قبول صورت اور توانا ہسپانوی آیا۔ اور اس سے دلنواز طریقے سے بات چیت کرنے لگا لیکن ڈوڈی کو اس کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ وہ ہسپانوی زبان بول رہا تھا اور انگریزی نہیں جانتا تھا جب کہ یہ انگریزی بولتی تھی۔ اور ہسپانوی بالکل نہیں جانتی تھی۔ آخر ایک اور شخص ادھر سے گذرا تو ڈوڈی نے اس سے پوچھا۔ یہ صاحب کیا فرما رہے ہیں؟ اس شخص نے اس ہسپانوی کی بات سن کر ڈوڈی کو انگریزی میں بتایا کہ وہ آپ کو چائے کی دعوت دے رہا ہے۔

یہ سمجھ کر یہ ہسپانوی اس کو کسی قریبی ریستوران میں لے جائے گا، وہ انکار نہ کر سکی کیونکہ وہ بہت ہی ملتجی صورت بنائے سامنے کھڑا تھا چنانچہ وہ اس کے ساتھ ہولی لیکن پارک اور پھر کھلے ریستوران سے گزر کر وہ ہسپانوی اسے ایک عمارت میں لے گیا اور پھر اپنے کمرے میں چونکہ یورپ میں کمروں کے اندر کھانے کا رواج ہے اس لیے اب بھی ڈوڈی کو ک شک نہ ہوا۔ مگر جوں ہی وہ کمرے میں اس ہسپانوی نے اندر سے دروازہ بند کر اب ڈوڈی اس کی نیت سمجھی پھر جب مردا کی طرف بڑھا تو ڈوڈی نے مزاحمت کی۔ ناخن اس کی گردن میں گاڑ دیے اس کا کاٹ کر اس وقت لہولہان کر دیا جب کہ اس اس کا منہ چومنے کی کوشش کی اور آخر کار جا کر اس کو پرے دھکیل دیا۔ وہ کہتی ہے کہ حیرت ہوئی کہ اس وقت میرے اندر اتنی طا کہاں سے آگئی؟ اس طرح خود کو چھڑا کر د کھول کمرے سے نکل گئی۔

اس حادثہ کے بعد ڈوڈی کو یقین ہو گ ایک خوبصورت اور جوان لڑکی کو جس کو شہ ملک ملک میں گھومنا ہو، بالکل اکیلے نہیں۔

یہی وہ بات ہے جس کو اسلام اس طر ہے کہ عورت کو محرم کے بغیر سفر کرنا حرام ہے کبھی اس کے خلاف ہوگا وہی تجربہ سا آئے گا جس کی طرف ڈوڈی نے اشارہ کیا

(ایم عبداللہ)

وہ ۴۶ برس تک ایک مرد فوجی ڈاکٹر کے بھیس میں رہی

آج کل فوجی اسپتالوں میں نرسوں کی کمی نہیں۔ لیکن لیڈی ڈاکٹر ان اسپتالوں میں بھی مجبوریہ سمجھی جاتی ہے۔ جنگ چھڑنے پر فوجی اسپتال محاذ کے عقب میں قائم کئے جاتے ہیں۔ وہاں گولوں کے دھماکوں کے ساتھ ایمرجنسی آپریشن بھی کئے جاتے ہیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کی جاتی ہے۔ زیادہ مجروح سپاہی دور کے اسپتالوں میں منتقل کر دئے جاتے ہیں۔ ان اسپتالوں میں کام کرنا مذاق نہیں یہ بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ہندوستان میں لیڈی ڈاکٹروں کی تعداد اچھی خاصی ہے لیکن یہ سب عورتیں شہروں ہی میں پریکٹس کرتی ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں لیڈی ڈاکٹر ایک نایاب چیز ہے۔ وہاں عورتیں ڈاکٹر بننا پسند نہیں کرتیں۔ نزلہ کھانسی کے علاج سے لے کر زچگی کرانے کا کام تک مرد ڈاکٹر ہی کرتے ہیں۔

آج سے ۱۰۰ سال پہلے انگلستان میں ایک بھی لیڈی ڈاکٹر نہیں تھی۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق یہ بات درست ہے۔ لیکن اصل میں یہ بات غلط ہے۔ انگلستان میں نہ صرف ایک لیڈی ڈاکٹر موجود تھی۔ بلکہ وہ فوجی اسپتال میں سرجن کا کام بھی کرتی تھی۔ اس کا نام ڈاکٹر جیمس بیری تھا۔ یہ عورت تمام عمر مردانہ بھیس میں رہی۔ یہ راز اس کی زندگی میں کسی کو نہ معلوم ہو سکا کہ وہ مرد نہیں عورت ہے۔ اس عورت نے ۴۶ سال تک انگریزی فوج میں سرجن کی ملازمت کی۔

جیمس بیری کا اصل نام کسی کو معلوم نہیں اس کی پرورش لڑکوں کی طرح ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ کے متعلق بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ شاہزادہ انگلستان

کی ناجائز بیٹی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی معزز آدمی اس کی پشت پناہ تھا۔ لیکن اس آدمی کا نام آج تک صیغۂ راز میں ہے۔

ڈاکٹر بیری ۱۴ سال کی عمر میں ایڈنبرا یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں داخل ہوئی۔ اس کا قد صرف ۵ فٹ تھا۔ وہ دُبلے پتلے جسم اور سُرخ بالوں والی لڑکی تھی۔ ۱۷ سال کی عمر میں اس نے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانے میں کلورفارم ایجاد نہیں ہوا تھا۔ پنی سیلین اور جراثیم کش دوائیں ابھی منظرِ عام پر نہیں آئی تھیں۔ آپریشن کا کمرہ کسی مقتل سے کم نہ ہوتا تھا۔ کچھ لوگ مریض کو زور سے پکڑ لیتے اور ڈاکٹر آری سے اس کے بیمار عضو کو کاٹتا تھا۔ مریض کی چیخوں سے لوگوں کے دل دہل جاتے تھے۔ بڑے بڑے بہادر آدمی اس منظر کو دیکھ کر لرز جاتے تھے۔ مگر یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ ڈاکٹر بیری ان تمام آزمائشوں میں کامیاب ہوگئی۔

جنوری ۱۸۱۳ میں بیری نے سرجری کا امتحان پاس کیا۔ اسے ایک اسپتال میں اسسٹنٹ سرجن کے عہدہ پر تعینات کیا گیا۔ جب وہ اپنے عہدے کا چارج لینے کے لئے اسپتال پہنچی تو چیف سرجن نے اُسے بچہ سمجھ کر اسپتال میں رکھنے سے انکار کر دیا۔ کچھ ہی دن بعد چیف سرجن کو وزارتِ صحت کی طرف سے مشورہ دیا گیا کہ وہ اس معاملے میں خاموشی اختیار کرے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر بیری کی پشت پناہی کوئی بڑا آدمی کر رہا تھا۔

ڈاکٹر بیری نے دو سال اس اسپتال میں کام کیا۔ اس کے بعد اُسے فوج کے ڈاکٹر کا عہدہ مل گیا۔ اس کا تبادلہ جنوبی افریقہ کے شہر کیپ ٹاؤن میں ہوگیا۔ ڈاکٹر بیری کی عمر اس وقت ۲۱ سال تھی۔ وہ اپنی قامت کا راز چھپانے کے لئے ۳ انچ کی ایڑی والا جوتا پہنتی تھی۔ بہترین وردی زیبِ تن کرتی تھی۔ ایک لمبی تلوار اس کی پیٹی سے لٹکتی رہتی۔ اس تلوار کا سنبھالنا اس کے لئے مشکل ہوتا۔ وہ مردانہ لباس میں سج دھج کر پارٹیوں اور رقص کی محفلوں میں جاتی۔ وہ ہر عورت سے پیار محبت کا کھیل کھیلتی۔ وہ اپنے کوٹ میں روئی کے پیڈ لگا کر جاتی، تاکہ اس کا سینہ چوڑا معلوم ہو۔ ۱۸۲۲ میں اس نے ایک بچہ کو ماں کا پیٹ

کاٹ کر نکالا۔ یہ انگلستان کا سب سے پہلا "سیزرین آپریشن" تھا۔

ڈاکٹر بیری بڑی درشت مزاج عورت تھی۔ اس کی بدمزاجی سارے کیپ ٹاؤن میں مشہور تھی۔ ایک دفعہ وہ گورنر سے ملنے گئی۔ گورنر کے سیکریٹری نے اس سے باہر کے کمرے میں انتظار کرنے کی درخواست کی۔ گورنر اپنے کمرے میں ہالینڈ کی ایک عورت سے گفتگو میں معروف تھا جب گورنر کو باہر آنے میں دیر ہوگئی تو بیری کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اس نے اپنی لمبی ناک سکوڑ کر کہا "یہ اچھی ہالینڈ کی گھوڑی ہے جو گورنر کو پسند آگئی ہے" سیکریٹری یہ سن کر آگ بگولہ ہوگیا۔ اس نے فوراً بیری کی ناک پکڑلی اور کہا "بدمعاش! اپنے الفاظ واپس لے۔" بیری نے الفاظ واپس سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس نے فوراً سیکریٹری کو "ڈوئیل" لڑنے کے لئے للکارا۔ پرانے زمانے میں "ڈوئیل" دو شریف آدمیوں کے درمیان لڑی جاتی تھی۔ اگر ایک رئیس دوسرے کی توہین کرتا تو دوسرا اس سے معافی مانگنے کے لئے کہتا۔ اگر وہ معافی مانگنے سے انکار کرتا تو اُسے دوسرے دن لڑنا پڑتا۔ یہ لڑائی نہایت خاموشی سے شہر سے دور جنگل میں لڑی جاتی۔ دونوں لڑنے والوں کے نائب جگہ اور ہتھیاروں کا انتخاب کرتے۔ ایک ڈاکٹر بھی موقع پر موجود رہتا تھا۔ یہ سب کام نہایت رازداری سے ہوتا تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ لڑنے والے کے بیوی بچے بھی اس سے بے خبر رہتے تھے۔ پہلے یہ جنگ تلواروں سے لڑی جاتی تھی۔ بعد میں پستول سے لڑی جانے لگی۔ دونوں لڑنے والے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ پھر ایک دوسرے کی طرف پشت کرکے ۲۰ قدم چلتے اور فوراً مڑ کر ایک دوسرے پر فائر کرتے۔ انھیں نشانہ لینے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ زخمی ہونے والے کی مرہم پٹی کرکے اُسے خاموشی سے گھر پہنچا دیا جاتا تھا۔ اگر دونوں کا نشانہ خطا ہو جاتا تو دونوں گھر واپس چلے جاتے اور معاملہ وہیں ختم ہو جاتا یہ لڑائی اب غیر قانونی ہے۔ جب بیری نے سیکریٹری کو ڈوئیل کے لئے للکارا تو سیکریٹری نے یہ چیلنج قبول کرلیا۔ دوسرے دن

تشکر ہی یہ ڈوئیل لڑی گئی۔ دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک پستول تھا۔ پستول میں ایک ایک گولی تھی۔ ۲۰ قدم چلنے کے بعد دونوں نے ایک ساتھ فائر کئے۔ بیری زمین پر گر پڑی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سیکریٹری کا نشانہ خطا نہیں گیا۔ ڈاکٹر موقع پر موجود تھا۔ اس نے لپک کر بیری کو سنبھالا اور کہا "کیا آپ کے چوٹ آئی ہے؟" بیری نے فوراً جواب دیا "نہیں، مجھے کوئی چوٹ نہیں آئی"۔ یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ اپنی گاڑی کی طرف چل پڑی۔ لیکن اس کے چلنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے گولی لگی ہے۔ بیری گاڑی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہوگئی۔ وہ کئی دن تک گھر میں رہی اس نے اپنا علاج خود کیا۔ اگر ڈاکٹر اس کا علاج کرتا تو اس کے عورت ہونے کا راز کھل جاتا۔ بعد میں بیری اور اور سیکریٹری بہت اچھے دوست بن گئے۔

بیری جب تک کیپ ٹاؤن میں رہی کسی کو اس کے سامنے دم مارنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کی سخت مزاجی سے اسپتال کا سارا اسٹاف کانپتا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل تک کیپ ٹاؤن کی نرسیں بچوں کو ڈاکٹر بیری کے بھوت کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔ کیپ ٹاؤن کے قیام کے دوران ایک بار اس کی شخصیت کا راز کھلتے کھلتے رہ گیا۔ ایک دن ایک نرس اس کے کمرے میں بغیر دستک دئے گھس گئی اس نے وہاں جو کچھ دیکھا وہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ ڈاکٹر بیری مرد نہیں عورت ہے۔ نرس نے اپنی کچھ ہمجولیوں کو یہ بات بتائی۔ لیکن سب نے اُسے مجذوب کی بڑ سمجھ کر ٹال دیا۔

ڈاکٹر بیری قاعدے قانون کی زیادہ پروا نہیں کرتی تھی۔ ایک دفعہ وہ رخصت کی درخواست دئے بغیر انگلستان روانہ ہوگئی۔ جب وہ انگلستان پہنچی تو فوج کے ڈائرکٹر جنرل نے اُسے بلایا اور چھٹی کی درخواست منظور ہوئے بغیر انگلستان آنے کی وجہ پوچھی۔ ڈاکٹر بیری نے اپنے بالوں میں اُنگلیاں پھیریں اور بڑے اطمینان سے جواب دیا "جناب میں یہاں اپنے بال کٹوانے آیا ہوں"۔ یہ سُنتے ہی غصے کے مارے ڈاکٹر کا بُرا حال ہوگیا۔ لیکن وہ کچھ

نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی بہت بڑا آدمی بیری کی پشت پناہی کر رہا تھا۔

کچھ عرصے بعد ڈاکٹر بیری کو جمیکا بھیج دیا گیا۔ یہ وسط امریکہ میں ایک جزیرہ ہے۔ جمیکا میں اس کے قیام کے دوران وہاں کے رہنے والے سیاہ فام باشندے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت پر اُتر آئے۔ انگریزی فوج نے اس بغاوت کو آسانی سے کچل دیا۔ جنگ میں انگریزوں کا زیادہ جانی نقصان نہیں ہوا۔ لیکن انگریزی کیمپ میں وبا پھیل گئی۔ ملیریا، پیچش اور زرد بخار نے تباہی مچادی۔ ڈاکٹر بیری نے رات دن محنت کی۔ آخر اُس نے ان بیماریوں پر قابو پالیا۔ وہ شراب اور گوشت سے پرہیز کرتی تھی وہ نہایت سادہ زندگی گزارتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے وہ ان بیماریوں سے محفوظ رہی۔

جمیکا سے اُسے سینٹ ہلینا بھیج دیا گیا۔ یہ جزیرہ افریقہ کے ساحل کے قریب واقع ہے۔ یہاں نپولین کو قید کیا گیا تھا۔ اسی جزیرے میں اس کی موت ہوئی تھی۔ ڈاکٹر بیری نے یہاں بھی ورنر سے جھگڑا مول لے لیا۔ اس نے گورنر کے خلاف بالا ہی بالا وزارتِ جنگ کو خط لکھا گورنر کو جب یہ معلوم ہوا تو اُس نے فوج کے جنرل سے شکایت کی۔ ڈاکٹر بیری کا کورٹ مارشل کیا گیا۔ اس فوجی عدالت سے بھی ڈاکٹر بیری باعزت بری ہو گئی۔

سینٹ ہلینا سے بیری کو پھر جمیکا بھیج دیا گیا۔ یہاں اُس کی شخصیت کا راز ایک بار پھر کھلتے کھلتے رہ گیا۔ ڈاکٹر بیری پر بخار کا شدید حملہ ہوا۔ اُس کے جینے کی کوئی اُمید نہ رہی۔ اس نے وصیت کی کہ اُس کو مرنے کے فوراً بعد ملٹری کی وردی میں دفنا دیا جائے۔ جمیکا میں گرمی بہت تھی۔ وہ ہلکے سوتی کپڑے پہنے بستر پر دراز تھی۔ ایک ڈاکٹر جو اس کا ماتحت تھا۔ اس کو دیکھنے چلا آیا۔ اس کے ساتھ ایک سپاہی بھی تھا۔ ڈاکٹر بیری نیم بے ہوشی کی حالت میں کراہ رہی تھی۔ ڈاکٹر خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے بستر پر ایک عورت کو دراز دیکھا۔ اُس نے فوراً سپاہی کو اندر بلایا اور کہا۔ "دیکھو، بیری ایک عورت ہے۔" بیری نے

اُس کی آواز سن لی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کا راز فاش ہو چکا ہے، لیکن اُس نے ہمت نہ ہاری۔ اُس نے ان دونوں کو قریب بُلا کر اُن کو قسم دی کہ وہ یہ راز کسی کو نہ بتائیں گے۔ اُس زمانے میں شرفا کی قسم بہت اہمیت رکھتی تھی۔ شرفا اپنی عزت کی قسم کھاتے تھے اور اُسے نبھاتے تھے۔ ڈاکٹر بیری کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ دونوں نے اپنی زبان بند رکھی۔

ڈاکٹر بیری نے ۴۶ سال فوج میں ملازمت کی ۱۸۵۹ میں وہ فوج سے ریٹائر ہو گئی۔ اُسے جنرل کا عہدہ دیا گیا اور نصف تنخواہ پر ریٹائر کر دیا گیا۔ ۱۸۶۵ میں ڈاکٹر بیری دستوں کی بیماری سے مر گئی۔ اُس کے کفن دفن کا انتظام کرنے کے لئے ایک عورت بُلائی گئی۔ یہ عورت لاش کو تابوت میں رکھنے کے لئے کمرے میں گئی لیکن فوراً ہی چلاتی ہوئی باہر آ گئی اور ڈاکٹر سے بولی۔ "آپ نے مجھے ایک جنرل کی تکفین کے لئے حکم دیا تھا۔ وہ ایک عورت ہے اور عورت بھی وہ جو بچہ پیدا کر چکی ہے۔" اس عورت کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ جب یہ معاملہ فوج کے وکیل کے سامنے آیا تو اُس عورت نے گواہی دی کہ حاملہ عورت کے پیٹ کے نشان پہچانتی تھی خود نو بچوں کی ماں ہے اور اس بات کی قسم کھا سکتی ہے کہ بیری نہ صرف ایک عورت بلکہ ایک بچہ کی ماں بھی بن چکی ہے۔

ڈاکٹر بیری کی موت کے دوسرے دن ایک رئیس کا ملازم اس کے گھر پر آیا اس نے بیری کے سیاہ فام نوکر کو اس کا بقایا تنخواہ اور اس کے واپس جمیکا جانے کا کرایہ دیا۔ اُسے بیری کے گھر سے ایک سیاہ رنگ کا سوٹ کیس ملا۔ وہ اسے لے کر چلتا بنا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس سوٹ کیس میں بیری کی پُراسرار پیدائش کی کہانی چھپی ہوئی تھی

دوسرے دن بیری کو لندن کے ایک قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ ●●

مرد، عورت۔ لباس کے معاملے میں ایک راہ پر

زرینہ زرّین

سولہویں صدی کے ایک ادیب فلپ پیورٹین نے کہا تھا: "جنسِ مخالف سے لباس میں مشابہت اختیار کرنا اپنی جنس کو مسخ کرنا ہے" اُس ادیب نے شوخ رنگ کی بجائے ہلکے رنگ کے کپڑے استعمال کرنے پر عورتوں کو یہ مشورہ دیا تھا لیکن آج وہ تبدیلی (یا مردانہ اور زنانہ پوشاک کی یکسانیت) جو محض لباس کے رنگوں سے شروع ہوئی تھی، اب سرے سے لباس ہی کی تبدیلی (اور نتیجے میں یکسانیت) کا روپ اختیار کر رہی ہے۔

ایک طرف تو عورتیں مردوں کے لباس اپنا رہی ہیں اور دنیا کے تمام ماہرینِ فیشن یہ پیش گوئی کر رہے ہیں کہ عورت اور مرد کا لباس کچھ ہی دنوں میں ایک ہو جائے گا۔ اور دوسری طرف یہ ستم ظریفی ہے کہ مرد اپنے لباس اور وضع قطع کے معاملے میں عورتوں کے انداز اختیار کرنے لگے ہیں۔ موجودہ نسل کے لڑکے شکل و صورت میں بھی زنانہ پن پیدا کرنے پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ برطانیہ میں ایسے لڑکوں کے گروہ کو "ماڈز" کہتے ہیں۔ یہ لڑکے نہ صرف زلفیں رکھتے ہیں بلکہ میک اپ کے سامان کی مدد سے نوک پلک بھی سنوارتے ہیں۔ وہ عورتوں کے بلاؤز سے ملتا جلتا جیکٹ پہنتے ہیں۔ کاندھے پر زنانہ بیگ بھی لٹکائے رہتے ہیں اور حیران کن بات تو یہ ہے کہ یہ تمام نوجوان شریف گھرانوں کے چشم و چراغ، اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم ہوتے ہیں۔

امریکہ میں ملبوسات کے ایک ڈیزائنر

جان وینز نے حال ہی میں ایسے تیار شدہ لباس
مارکیٹ میں پیش کئے ہیں، جنہیں عورت اور
مرد دونوں ہی ایک ساتھ استعمال کر سکتے ہیں
اس ڈیزائنر کا کہنا ہے کہ جب مرد اور عورت
دونوں ایک سی زندگی گزارتے ہیں۔ ایک سے
کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں، ایک سی ملازمتیں اور
کاروبار کرتے ہیں اور عملاً ان کی مصروفیات اور
سرگرمیوں کا فرق یکسر ختم ہو گیا ہے تو اب
لباس کا فرق بھی جلد از جلد ختم ہو جانا چاہئے۔

یورپ کی کئی ملیں اب صرف وہ کپڑا
تیار کرتی ہیں، جسے مرد اور عورت دونوں ہی
استعمال کر سکیں۔ کیونکہ عورتوں کے لئے علیحدہ
ڈیزائن کے کپڑے تیار کرنے کے کام میں اب
زیادہ منافع نہیں ہو رہا ہے۔

یورپ ہی نہیں، آج کل ہندوستان
میں بھی بہت سی لڑکیوں نے لڑکوں کی طرح
بال بنانے کا فیشن اختیار کر رکھا ہے اور مردوں
کی ضروریات کا سامان فروخت کرنے والی دکانوں
پر لڑکیاں اپنے لئے مردانہ ہیٹ، مردانہ جوتے،
مردانہ جیکٹ اور مردانہ قمیضیں خریدتی نظر
آتی ہیں۔ اور تو اور اب تو سپاٹ جوتوں کی
بجائے اونچی سے اونچی ایڑی والے شوز پسند
کئے جانے لگے ہیں۔

اس کے برعکس مرد اپنے سوٹوں پر کڑھائی
کو بھی پسند کرنے لگے ہیں۔ ہیٹ پر سنہری
فیتہ، بیل باٹم اور پھول دار بش شرٹ کا رواج
پروان چڑھ رہا ہے۔ اب مرد بھی اونچی ایڑی
والے جوتے چپل پہنے نظر آتے ہیں۔

ایک سروے کے مطابق ماہرین فیشن
ایک دعوے کی تائید میں نئی نسل کی ان
لڑکیوں کو پیش کرتے ہیں جو لباس سے لیکر
بالوں کی تراش خراش تک کے معاملے میں
مردوں کی نقل کرتی ہیں۔ اُن کا یہ رُجحان
اُس مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جب مرد
اور عورت " من دیگرم تو دیگری " کے قائل
نہیں ہوں گے۔ پتلون مردوں کا لباس تھا
مگر عورتوں نے اُسے بے تکلفی سے اپنا لیا۔
پیرس، لندن اور نیویارک کے حالیہ فیشن شو
میں تو عورتوں نے مردوں کے لئے بنی ہوئی

پتلونیں بھی استعمال کیں۔

آج سے کچھ عرصہ پہلے جبکہ چوڑے پائنچوں کی پتلونیں پہنی جاتی تھیں تو صرف نوجوان طبقہ ہی اس فیشن کو پسند کرتا تھا بوڑھے اور سنجیدہ قسم کے لوگ اس فیشن سے گریز کرتے تھے۔ مگر اب بیل باٹم کے اس دور میں نوجوانوں کے ساتھ ساتھ بوڑھے بھی اس فیشن کو پسند کرنے لگے ہیں اور بیل باٹم کے ساتھ اونچی ایڑی والے جوتے اور نئے نئے شوخ رنگوں کے پرنٹ کی قمیض پہنے سڑکوں پر نظر آتے ہیں۔

سب سے بڑی ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اگر سڑک پر لڑکا اور لڑکی ایک ساتھ چل رہے ہوں تو سب سے پہلے اُن کی شناخت ہی ناممکن ہو جاتی ہے کہ اس میں لڑکا کون ہے اور لڑکی کون۔ لیکن اگر آپ ذرا غور سے دیکھیں تو دیکھ کر آپ کو اور بھی حیرت ہوگی کہ لڑکا لڑکی نظر آتا ہے اور لڑکی لڑکا۔ کیا ایسا فیشن ہمارے دیش کے مردوں اور عورتوں کو زیب دیتا ہے جس سے ان کی جنس ہی بدلی ہوئی نظر آنے لگے؟ تاہم ہمارے آپ کے کہنے سے کچھ نہ ہوگا۔ حالات نے جو رُخ اختیار کیا ہے اُن کے پیشِ نظر یہ پیش گوئی کرنا بہت ہی آسان ہے کہ یورپ کی طرح ہندوستان میں بھی بہت جلد عورتوں اور مردوں کے لباس کا فرق یکسر ختم ہو جائے گا۔ ★★

---

(۱)

اس دور کا ہر نقشہ اُلٹا نظر آتا ہے

مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

(ظریف لکھنوی)

(۲)

اس دور کا ہر نقشہ یکساں نظر آتا ہے

لڑکی ہو کہ لڑکا ہو یکساں نظر آتا ہے

(نامعلوم)

رنگدار عورتیں بے رنگ مرد

شہزادہ گلرنیہ

امریکی سائنس داں ڈاکٹر جے۔ بی۔ رائس کہتے ہیں کہ مرد اور عورت جان داروں کی قسموں میں دو بالکل مختلف انواع سے تعلق رکھتے ہیں اگر دونوں صنفیں اس حقیقت کو ذہن نشین کرلیں تو شوہر بیوی بدرجہا زیادہ باہمی ومطابقت وموافقت کے ساتھ بسر کرسکیں گے۔ اگرچہ یہ کوئی نیا خیال نہیں ہے۔ مگر ڈاکٹر رائس اس حقیقت کو خوردبین اور دوسرے سائنسی آلات کی مدد سے ثابت کرنے کے لئے تیار ہیں۔

ڈاکٹر رائس نے باقاعدہ تفصیلی ریسرچ سے کئی نمایاں فرقوں کو ثابت اور واضح کردیا ہے جن سے اس بات کی بخوبی توجیہہ ہوجاتی ہے کہ طرفین کا اپنی روزانہ زندگی میں ایک ساتھ بسر کرنا اکثر کیوں مشکل ہوجاتا ہے۔

اوّل یہ کہ دونوں صنفوں کے درمیان جسمانی درجۂ تپش میں نہایت اہم اور نمایاں فرق ہے۔ عورتوں کی جلد بدن کے نیچے چربی کی ایک تہہ کے ساتھ پیوست ہوتی ہے جو انھیں سردی سے محفوظ رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنی ٹانگوں پر محض نازک اور مہین گالے نما نائلان رکھ کر سرد آب وہوا کی شدت کو بآسانی برداشت کرسکتی ہیں۔ اگر کوئی مرد ایسا کرے تو اس کی جان کے لالے پڑجائیں۔ اسی سے ان بہت سے ازدواجی جھگڑوں کی وجہ معلوم ہوجاتی ہے، جو بعض معمولی چیزوں مثلاً بستر پر کمبلوں یا رضائیوں وغیرہ کی نوعیت اور تعداد کے متعلق یا رات کو خواب گاہ کی کھڑکیوں یا روشنی کھلی رکھنے یا نہ رکھنے کی بابت آئے دن شوہر اور بیوی کو پیش آتے ہیں۔

ان سیکڑوں تحقیقاتی تجربات کے دوران

ڈاکٹر رائس نے ہزاروں مردوں اور عورتوں کا درجۂ تپش نوٹ کیا ہے۔ انہوں نے اندازہ لگایا ہے کہ معمولی اوسط صحت والی عورت کو کسی بھی تندرست و توانا مرد کے مقابلے میں ۱۲ فی صد کم حرارت کی ضرورت ہوتی ہے، اسی لئے مرد کو، جو غیر محفوظ ہوتا ہے، سردی سے بچاؤ کے لئے زیادہ کپڑوں اور کمبلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ عورت کو مرد کے سرمائی مطلوبات کا اندازہ اپنی حالت سے نہیں کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر رائس نے چھ ماہ کی عمر والے لڑکے اور لڑکیوں کی مثال پیش کر کے بتایا کہ دونوں صنفوں کے درمیان فرق نہایت ابتدائی عمر سے ہی ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ انہوں نے یہ تجربہ کر کے دکھایا ہے کہ جب لڑکیوں کے سامنے رنگ دار چیزیں پیش کی گئیں، تو وہ فوراً ہنس ہنس کر انہیں شوق سے لینے کو آگے بڑھیں۔ مگر جب یہی چیزیں لڑکوں کو پیش کی گئیں تو ان کا رد عمل رنگوں سے اتنی دلچسپی کا نہ تھا اور نہ انہوں نے لڑکیوں کی طرح کسی خاص رنگ کو زیادہ پسند کیا۔ یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا کیونکہ تمام عمروں کے مردوں اور

عورتوں کے رنگ کے امتحانات کرنے سے ظاہر اور ثابت ہو گیا ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں درحقیقت بہت زیادہ رنگ دیکھتی ہیں اور مردوں کی آنکھ رنگ کے معاملے میں اتنی زیادہ حساس نہیں ہوتی۔ عورتیں قدرتی رنگوں کے فرق کو بہت زیادہ باریکی کے ساتھ محسوس کر سکتی ہیں۔ اسی لئے عورتیں اپنے بدن کے کپڑوں اور اپنے گھروں کی آرائشی چیزوں کے رنگوں کے اتار چڑھاؤ میں نہایت نزاکت کے ساتھ توازن اور صحیح مطابقت حاصل کرنے کے لئے زیادہ کوشاں ہوتی ہیں۔

آئے دن کے واقعات اور روزمرہ کی چیزوں سے نبٹنے اور ان کو سمجھنے اور سلجھانے میں عورتیں بیشتر اٹکل پچو اور ڈانواڈول ذہنیت رکھتی ہیں۔ حالانکہ مرد ایسی حالتوں میں اکثر زیادہ سمجھ دار معاملہ فہم باقاعدہ اور بااصول ہوتے ہیں۔ اس کی توجیہہ اس تازہ تحقیق شدہ حقیقت سے بخوبی کی جا سکتی ہے کہ زنانہ دماغ کی ساخت اور بافت مردانہ دماغ کی ساخت سے

بالکل مختلف ہوتی ہے اور دونوں کے تار پود میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق بعض اوقات بہت نمایاں ہو جاتا ہے اور اسی فرق کی بدولت حیرت انگیز باتیں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔

مثال کے طور پر یہ دیکھئے کہ ایک مرد اور ایک عورت ایک ہی رسالہ یا اخبار پڑھنے میں اپنا اپنا مخصوص فطری رنگ ڈھنگ کس طرح ظاہر کرتے ہیں۔ مرد صفحہ بہ صفحہ باقاعدہ طور پر پڑھے گا عورت ہر ورق یا سامنے کے صفحے پر سرسری نظر ڈال کر صفحے اُلٹتی ہوئی فیشن کے حصے کو تلاش کر کے دیکھے گی اور پھر گپ شپ والے کالم وغیرہ پر سے گزرے گی۔ صفحات کو اُلٹ پلٹ کرتی رہے گی۔ یہاں تک کہ اس کی نظر کسی دلچسپ پیراگراف، یا نقشے یا کسی تصویر پر پڑ جائے گی۔

عورت کے مقابلے میں مرد آزمائش یا تجربہ کرنے کا رجحان کم رکھتے ہیں۔ کسی خاص قسم کا صابن یا موزہ حسب پسند مل جانے پر مرد اسی سے چمٹا رہتا ہے۔ لیکن عورتیں ہمیشہ نوبہ نو چیزیں آزماتی رہتی ہیں اور ان سے لطف حاصل کرتی ہیں۔ وہ جہاں تک ممکن ہو اپنی وضع قطع اور بناؤ سنگھار کو بدلتے رہنا پسند کرتی ہیں۔ کیونکہ نئے قسم کا لباس پہننے اور نئی طرز سے بالوں وغیرہ کی آرائش کرنے سے عورت درحقیقت دوسری چیز معلوم ہونے لگتی ہے وہ سمجھتی ہے کہ اس سے اس نے اپنی شخصیت کے کسی دوسرے پہلو کو دریافت کر لیا ہے۔ بہت سی حالتوں میں ہوتا بھی یہی ہے کہ لباس کی تبدیلی سے عورت کی شخصیت کچھ بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس کے برعکس مرد عموماً نئی طرز کے کپڑے پہننا پسند نہیں کرتے، اور نئی وضع قطع اختیار کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک طرح کی خود نمائی ہوگی۔

اس نظریہ کی اثبات میں کہ مرد اور عورت دو جُدا الانواع ہیں۔ ڈاکٹر رائس ان لڑکیوں کی مثالیں پیش کرتے ہیں جن کی تربیت اور پرورش بالکل اسی طرح کی گئی جیسے وہ لڑکے ہیں۔ جب یہ لڑکیاں پختگی کی عمر کو پہنچیں تو خصوصیتیں ظاہر کرنے لگیں جو نسوانی ہیں

ثابت ہو گیا کہ ان کی یہ خصوصیتیں خلقی اور پیدائشی ہیں نہ کہ پرورش اور تربیت کے انداز کا نتیجہ۔

لیکن اس نظریہ کا سب سے زیادہ قوی ثبوت خورد بین سے بتدریج ظاہر ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رائس نے بڑی دقتِ نظر سے یہ پتہ لگالیا ہے کہ عورت کے جسم کے کروڑوں، اربوں خلیوں میں سے تقریباً ہر خلیہ مرد کی جسمانی ساخت کے خلیوں سے مختلف ہوتا ہے۔

ان تمام حقیقی جسمانی اختلافات اور طبعی فروق سے قطع نظر یہ مشہود و معروف حقیقت ہے کہ مردوں اور عورتوں کے خیالات اکثر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ دونوں کے تخیلات میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ غرض دونوں صنفوں کے درمیان ایک وسیع نفسیاتی خلا پایا جاتا ہے جو چند ہی حالتوں میں پُر کی جاتی ہے۔ یعنی ایسی بہت ہی کم یا صرف چند عورتیں ہوں گی جو بالکل مردوں جیسے خیالات رکھتی ہوں یا مردوں کے ہم خیال ہوتی ہوں۔ بڑی اکثریت تو ایسی ہوتی ہے جو صنفِ مقابل کے نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھ کر اس کے ساتھ مفاہمت یا سمجھوتا کر لیتی ہے، جس سے بالآخر ایک گونہ توازن حاصل ہو جاتا ہے۔

اگر ڈاکٹر رائس کے اس نظریہ کو حقیقت پسندی کے ساتھ تسلیم کیا جائے تو اُمید کی جا سکتی ہے کہ زوجین کے درمیان زیادہ مفاہمت پیدا ہو جائے گی اور آئے دن کی "خانہ جنگی" اور طلاقوں کی نوبت نہ آئے گی۔ (ترجمہ در ترجمہ)

اپنی روشن خیالی پر فخر کرنے والی بہنیں اور بھائی برائے خدا غور کریں کہ ہم رجعت پسند اور جمہوریت پرست اس سے زیادہ کچھ بھی کہتے ہیں جتنا اس نامور بھاڑی سائنٹسٹ نے کہہ دیا اور شہادت کوئی ایک ہے؟ کتنی اور شہادتیں کتنی بار انہیں صفحات میں، دوسرے مشاہیر کی ہمیں پیش ہو چکی ہیں۔

پرنٹر، پبلشر، مالک و ایڈیٹر محمد اسحاق مالک نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر ماہنامہ حجاب رامپور سے شائع کیا

Regd. No. M. R. D. 34

MONTHLY HIJAB RAMPUR U.P.

سرورق نائیٹل دہلی آرٹ پریس دہلی میں چھپا

حجاب

المودودی دخل الخلد

۱۳۹۹ھ

Hijab RAMPUR-U.P. 244901 رامپور۔یوپی حجاب

رجحان

آل خیر آبادی

جلد ۹

شمارہ ۱۱۲

دسمبر ۱۹۹۸ء | محرم ۱۴۱۹ھ

ایک شمارہ 3/ | سالانہ چندہ 26/ | V.P سے 30/

حجاب کا آئندہ شمارہ

• آئندہ شمارہ یعنی جنوری ۱۹۸۰ء میں بھی علامہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے متعلق اعلیٰ درجے کے مضامین اور نہایت پُراثر نظمیں شائع کی جائیں گی۔

• "۲۰ دن عروس البلاد بمبئی میں" کے عنوان سے میری روداد سفر ملاحظہ فرمائیں۔

جنوری ۱۹۸۰ء کے بعد شمارہ فروری ۱۹۸۰ء میں ان شاء اللہ خاتون جنت نمبر پیش کیا جائے گا۔

خاتون جنت نمبر کے بعد ہم سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے تعارف اور ان کے کارناموں پر نہایت اہم مضامین کا سلسلہ شروع کریں۔

ہم سب سے پہلے تمثیلات مودودیؒ اور زبان و بیان کے متعلق اظہار کریں گے اور یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ اردو زبان مولانا مودودیؒ کا سہارا پاکر کتنا آگے بڑھ گئی ہے۔ ان شاء اللہ۔

(مائل خیرآبادی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آہ!

ہمارا آج کا اداریہ !!

ہمیں اپنی بے بسی کا اعتراف ہے۔ آج ہم کچھ کہہ نہیں سکتے، کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آج ہمارا قلم بجز انا للہ وانا الیہ راجعون اور کچھ بھی لکھنے سے قاصر ہے اس مردِ خود آگاہ و خدا آگاہ کیلئے لیکن تعزیت کا حق تو ہم شاید عمر بھر بھی ادا نہیں کر سکیں گے لیکن ممکن ہے کل کچھ صبر کی توفیق ملے تو ہم کچھ حقائق قلم بند کر سکیں فی الحال بس یہی کہ وہ جان جو جانِ آفریں کی امانت تھی سرخرو و سرفراز واپس چلی گئی۔

بہرحال

ہم آج پھر عہد کرتے ہیں

کہ

تحریکِ اسلامی کو آگے بڑھاتے رہیں گے۔

یہانتک کہ

ہم کو بھی اللہ اپنے پاس بلالے

وما توفیقی الا باللہ !!

کل من علیہا فان

"کل من علیہا فان" دنیا فانی ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہے۔ وہ سب فانی ہے۔ بقا صرف اللہ کی ذات کے لئے ہے۔ بڑے بڑے باجبروت بادشاہ نہ رہے۔ ذوالقرنین، سکندر، نہ ہے قیصر و دارا۔ مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے بڑے بڑے باحکمت حکیم ارسطو اور افلاطون، جن کے دماغ آسمانوں پہ تھے۔ موت کے گھاٹ اتر گئے۔ مٹی میں مل گئے۔ زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے! بڑے بڑے جلیل القدر پیر اور پیغمبر نہ رہے۔ حضرت آدم بنی نیچے زمین کے چل بسے۔ اور آخری بات یہ کہ افضل الرسل، خاتم الانبیاء حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب ہمارے دل پر جو تازہ گھاؤ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رح کی وفات حسرت آیات سے لگا اس پر میں کسی کو کیسے سمجھاؤں کہ صبر کرو۔ ہائے، ہمارا کلیجہ کٹ گیا تم کہتے ہو کہ صبر کرو۔ میں کسی کو آخر کس برتے پر صبر کی تلقین کروں جب کہ دامن صبر خود میرے ہاتھوں سے چھوٹا جا رہا ہے۔ یہ سطریں لکھتے وقت دل بے قابو ہو رہا ہے۔ اور وہ ہاتھ، جس ہاتھ کی انگلیوں میں قلم تھامے ہوئے لکھ رہا ہوں۔ کانپ رہا ہے۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ دماغ ساتھ نہیں دیتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے بھائیوں کو، تحریک اسلامی کے ساتھیوں کو کن لفظوں میں نصیحت کروں۔ جب کہ سب سے زیادہ نصیحتوں کا مستحق میں خود ہوں۔

آہ! تحریک اسلامی کا عظیم رہنما سید ابوالاعلیٰ مودودی رح وہ، کہ جس نے دہریت کی طرف جانے والے ہم جیسے مسلمانوں کو پھر اسلام کی طرف کھینچا۔

آہ! وہ بانی جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی؛ وہ کہ جس نے اُلجھے ہوئے مسائل، دل کو چھونے والی مثالوں سے سلجھا سلجھا کر، نکھار نکھار کر ہمارے دل و دماغ میں بٹھا بٹھا کر ہمیں اسلام کا شعور دیا۔

آہ! وہ سید ابوالاعلیٰ مودودی، جسے گالیاں دی گئیں، جس کی تحریروں میں تحریف کر کے اُسے بدنام کرنے کی ذلیل حرکتیں کی گئیں۔ اسی ابوالاعلیٰ نے گالیاں دینے والوں اور بدنام کرنے والوں کو دعائیں دیں۔ وہی سید ابوالاعلیٰ مودودی، جس کے مخالف علماء نے اُسے بے وقار کرنے میں اپنے دل و دماغ کی ساری قوتیں لگا دیں اس نے ان کے وقار کو ہر طرح باقی رکھا۔ وہ سید ابوالاعلیٰ مودودی، جس سے ہم نے کہا کہ آپ ان کے خلاف کیوں نہیں لکھتے تو خود ہمیں نصیحت کرنے لگا۔

"دیکھو، مسلمان دین کے معاملے میں علماء پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اگر یہی ایک دوسرے کی تردید کرنے لگیں تو مسلمان کس پر اعتماد کریں گے؟ اس لئے میں بہرحال ان کے خلاف کچھ نہ لکھوں گا۔ اگر میرے بجائے اُنہی کا اعتماد مسلمانوں میں قائم رہے تو زیادہ اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ میں اور وہ لڑ کر دونوں ہی مسلمانوں کا اعتماد ختم کر دیں!"

آہ! یہ بھلا شریف اور نیک دل مربی سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ دہریت سے بچانے والا عظیم رہنما سید ابوالاعلیٰ مودودی، وہ ہمارے دلوں کی گرہیں کھولنے والا مفکر و مفسر سید ابوالاعلیٰ مودودی ۲۲، ۲۳ ستمبر کی درمیانی شب میں ۸ بجے ہم کو چھوڑ کر اپنے رب سے جا ملا۔ ہم سب اپنے رب کے لئے ہیں اور اپنے اسی رب اللہ کی طرف پلٹنے والے ہیں۔

اے ہمارے رب! اب ہم جس مسئلے میں اُلجھیں گے تو کس کے پاس جائیں گے؟ اے ہمارے رب ہمارے قدم ڈگمگائیں گے تو ہمارے قدموں کو جمانے والا کون ہوگا؟ اے ہمارے رب تو نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں ایک ابوالاعلیٰ عطا فرمایا تھا۔ اے اللہ! ہم کو ایسا ہی ایک اور ابوالاعلیٰ عطا فرما۔ اے اللہ! تیرے اختیار میں سب کچھ ہے۔ اے اللہ! تیرے رحیم ہونے میں ذرہ برابر بھی شک نہیں اللہ! ہم پہ رحم فرما۔ اے اللہ! ہم بے سہارا ہو گئے۔ ہمیں سہارا دے۔ اے اللہ! دامن صبر چھوٹا

جارہا ہے۔ ہمیں صبر جمیل عطا فرما۔ اے اللہ! ہمیں وہ توفیق عطا فرما کہ ہم مرحوم سید ابوالاعلیٰ کے مشن کو، دراصل سارے انبیاء علیہم السلام کا مشن رہا۔ آگے بڑھاتے رہیں۔ آگے بڑھاتے رہیں یہاں تک کہ اسی میں ہماری جان کام آجائے۔ اللھم فاطر السموٰت والارض انت ولی فی الدنیا والآخرۃ توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

عالم اسلام کے جلیل القدر عالم اور جماعت اسلامی کے بانی حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی وفات ایک عظیم سانحہ ہے۔ آج پاکستان ہی نہیں، بلکہ پورا عالم اسلام رنج و غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسلامی علوم کے تمام مراکز میں صف ماتم بچھ گئی ہے طلبہ افسردہ ہیں، ادبی، صحافتی اور سیاسی حلقوں میں غم کی گھٹائیں چھا گئی ہیں۔ بوڑھے سوگوار اور نوجوان اشکبار ہیں۔ قوم کا ہر فرد غمگین اور پوری ملت اندوہگین ہے ملت اسلامیہ کے اس غم میں ہم بھی برابر کے شریک ہیں۔

مولانا نے جو دینی خدمات انجام دی ہیں ہماری آنے والی نسلیں ان کی ہمیشہ ممنون احسان رہیں گی۔

خداوند تعالیٰ مولانا کو اپنے جوار رحمت میں بلند مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین

سوگوار

حلقہ "حجاب" رامپور۔ یوپی۔ (انڈیا)

244901

وفات مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

از من سوال کرد دلم ایں چہ تیرگی — گفتم بعشم کہ مہرِ درخشاں غروب شد
دیدم کشادہ زیرِ زمیں روزنِ بہشت — در سینۂ زمیں، مہِ تاباں غروب شد
قلبِ عروجؔ غم زدہ و چشم خوں چکاں
نالہ کناں کہ مردِ مسلماں غروب شد

تبسم کھیلتا لب پر، گلِ افشاں تھے ابوالاعلیٰ — ز سرتا پا گلستاں ہی گلستاں تھے ابوالاعلیٰ
محقق، صاحبِ ایماں و عرفاں تھے ابوالاعلیٰ — مجاہد صاحبِ احساں و ایقاں تھے ابوالاعلیٰ
احادیثِ رسولِ پاکؐ پر ان کی نظر گہری — مفسر، صاحبِ تفہیم قرآں تھے ابوالاعلیٰ
نفاذِ شرعِ اسلامی کا نصب العین رکھتے تھے — جہادِ زندگی میں مردِ میداں تھے ابوالاعلیٰ
بصیرت ان کی راہِ حق میں ایک شمعِ فروزاں تھی — ہر ایک باطل کے سر پر تیغِ براں تھے ابوالاعلیٰ
حقیقت کے چمن کھلتے تھے ان کی نوکِ خامہ سے — ادب کی بزم میں شمعِ فروزاں تھے ابوالاعلیٰ
جلو میں ان کی تحریروں کے چلتا کاروانِ گل — سجاتے تھے چمن، ابرِ بہاراں تھے ابوالاعلیٰ
کوئی ملحد، کوئی مشرک، کوئی کافر، کوئی فاسق — نجانے کتنے بیماروں کے درماں تھے ابوالاعلیٰ
عروجؔ ان سے محبت خالصاً للہ ہے مجھ کو
مری نظروں میں اک مردِ مسلماں تھے ابوالاعلیٰ

عروج قادری، مدیر ماہنامہ "زندگی"
رام پور (یو۔پی)

(حجاب بریلی کے شکریے کے ساتھ)



جو
لڑتا رہا
اندھیروں سے

ماہِ تمام دامنِ رحمت میں چھپ گیا

رخصت ہوا کہ پیکرِ ایماں کہوں جسے
فطرت کا شاہکار نمایاں کہوں جسے
ہاں وہ امینِ رازِ شریعت کہوں جسے
ہاں وہ زعیمِ مکتبِ عزیمت کہوں جسے
ہاں وہ جو اہلِ حق کے دلوں میں اتر گیا
ہر صاحبِ غرور کے دل سے گزر گیا
وہ جو ستمگروں کی قبا چاک کر گیا
ہم بے کسوں کو صاحبِ ادراک کر گیا
جس نے کہ اس خلوص سے نامِ خدا لیا
ہر بوالہوس نے ہاتھ میں پتھر اٹھا لیا
جس کا قلم تھا بحرِ معانی لئے ہوئے
اک انقلابِ نو کی کہانی لئے ہوئے
وہ جو رموزِ دین کی تفسیر بن گیا
تفہیم کہہ کے آپ ہی تفسیر بن گیا
جس کی زباں سے وقت کے شہزادے ڈر گئے
مارے حیا کے موت سے پہلے ہی مر گئے
کل اس کی سادگی پہ تھے سو بانکپن نثار
آج اس کی خامشی پہ ہزاروں سخن نثار
فطرت کا راز پردۂ فطرت میں چھپ گیا
ماہِ تمام دامنِ رحمت میں چھپ گیا

از [illegible] ، سہ ماہی [illegible]

اس وقت

شام کے ۶ بجے تھے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]



نماز جنازہ

آہ!

د سے تیری دل درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے
وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہان بے ثبات
مختلف ہر منزل ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولانگاہ ہے
ہے وہاں بے حاصلی کشت اجل کے واسطے
سازگار آب و ہوا تخم عمل کے واسطے
نور فطرت ظلمت پیکر کا زندانی نہیں
تنگ ایسا حلقۂ افکار انسانی نہیں
ندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
ثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
ا تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(بانگ درا)

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو، منزل آخر فنا
ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام
جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہ حرم، عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق سے نور حیات، عشق سے نار حیات

(بال جبریل)



مائل خیرآبادی

کہاں سے لاؤ گے تم ایسا راہبر لوگو!

چالیس سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے شعر و ادب اور دین و دنیا سے متعلق جو کچھ لکھا جا چکا تھا اور جو کچھ لکھا جا رہا تھا اس کا بیشتر حصہ میں اپنے ذہن میں اتار چکا تھا۔ لیکن اس طرح کہ اس میں کوئی ترتیب نہیں تھی۔ آج ایک کتاب ہاتھ آگئی اُسے پڑھ ڈالا۔ کل اخبار و رسائل مل گئے انھیں دیکھ ڈالا۔ پرسوں کسی لائبریری میں پہنچ گیا اُسے کھنگال ڈالا۔ دماغ میں معلومات کا ایک ڈھیر تو لگ چکا تھا لیکن کوئی ملاحظہ بکلام مطالعہ کے ساتھ اُن جماعتوں اور تحریک میں عملاً حصہ لیا جو بیسویں صدی میں اُبھریں۔ تحریک آزادی، تحریک خلافت، مزدوروں کی تحریک (کمیونزم)، مسلم لیگ، مومن کانفرنس اور آخر میں جماعت تبلیغی ان سب کو دیکھا بھالا ان کے ساتھ مل کر کام بھی کیا۔ لیکن کہیں وہ سرا ہاتھ نہ آیا جس سے دل و دماغ کی اُلجھی ہوئی ڈور سلجھا سکتا۔ زندگی مستقل کرتا اور قول و عمل کا تضاد دور کر سکتا۔ میں کہا کرتا تھا کہ جہاں میں آگ لگ جاتی ہے مائل۔ اگر کچھ ربط ہو قلب و زباں میں اور یہی اپنا رونا تھا کہ

بھٹک کر رہنما ہر رہنما کے ہو لئے پیچھے
ہوا لیکن نہ طے اپنا سفر اول سے آخر تک

اس کے برعکس ہوگیا ہر طرح کے مطلب و یابس کے مطالعہ اور بیسویں صدی کی جماعتوں اور تحریکوں کے مشاہدے نے مجھے یاس میں مبتلا کر دیا۔ اتنا ہی نہیں۔ دہریت سے تو بچا کر کے اللہ کا باغی بنا دیا تھا۔ ہاں مطالعے کا ایک حاصل اور تھا۔

میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کا سب سے بڑا اور عظیم انسان سمجھتا تھا حالانکہ رسالت کے بارے میں تذبذب میں تھا پھر بھی دل کے گوشوں میں حضورؐ کی عظمت موجود تھی۔ حالت یہ تھی کہ مجھے اللہ کی ذات کے خلاف کہنے اور سننے میں ذرا بھی باک نہ تھا۔ لیکن جب محمدؐ کا نام نامی سنتا تو آپ سے آپ سر تسلیم خم ہو جاتا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ شاید نام محمدؐ ہی کی برکت سے اللہ تعالیٰ کو مجھ پر رحم آیا اور اس نے ایسی سبیل نکال دی کہ میں پھر اسلام سے جڑ گیا۔ اسلام کی طرف دوبارہ مائل ہونے کی کہانی بڑی سبق آموز، ایمان افروز، عبرت آمیز اور جذبات انگیز ہونے کے ساتھ بے انتہا دلچسپ اور دلکش ہے۔ میں اسے "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" کے مصداق تو نہیں لیکن اجمالی طور پر عرض کر رہا ہوں

۱۹۳۳ء کی بات ہے۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحؒ کی کتاب "پردہ" میرے ہاتھ آگئی میں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا چلا گیا۔ میں اردو کے تمام اساطین کی کتابیں پڑھ چکا تھا لیکن جب میں نے کتاب "پردہ" پڑھی تو مودودی رحؒ کے قلم کی شائستگی، عبارت کی روانی، فصاحت و بلاغت۔ ان کی تحریر کی رعنائی، فکر و دانائی۔ ان کا حسن بیان۔ ان کے دلائل کی پختگی اور نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت پر دنگ رہ گیا۔ عمر میں پہلی بار خشک عنوان پر ایک نہایت دلکش تخلیق میرے سامنے آئی تھی۔ دل نے کہا۔ دیکھ! اس طرح کہی جاتی ہے ایمان کی بات!

پھر میں نے خطبات، رسالہ دینیات، تفہیمات، سلامتی کا راستہ، دین حق، شہادت حق، اسلام اور جاہلیت۔ الجہاد فی الاسلام۔ تجدید احیاء دین اور مولانا کی دوسری تصانیف ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھیں مولانا کی اردو نے مبیں اور قوت استدلال کا ایسا گرویدہ ہوا۔ کہ اب مولانا کے علاوہ کوئی جچتا ہی نہ تھا میں چالیس سال عمر عزیز کے قریب پہنچ چکا تھا۔ عمر کے ساتھ ذہن میں پختگی پیدا ہونے لگی تھی۔ آخر میں مولانا شبلی رحؒ پر آکر ٹھہرا تھا لیکن مولانا مودودی رحؒ کو پڑھا تو دل میں کہا کہ علامہ شبلی رحؒ کا مضمون تاریخ رہا۔ تاریخ بذات خود دلچسپ مضمون ہے۔ مودودی صاحب نے ایک خشک مضمون اپنایا تھا اس میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دئے۔ بے آب صحرا میں قدم رکھا اور اسے گل و گلزار

بنا دیا۔ ایک سوکھے ہوئے درخت پر نظر ڈالی اور اس میں پھول کھلا دیئے۔ ایسے پھول جو خوشنما بھی اور ان میں وہ مہک جس سے دل و دماغ معطر ہو جائیں۔ نثر میں ایک طرف علامہ شبلی رح خدمت اسلام انجام دے رہے تھے۔ دوسری طرف نظم میں علامہ اقبال رح اسلامی فکر سمو سمو کر فن شاعری کی عظمت بڑھا رہے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کو پڑھ پڑھ کر میری زبان سے "واہ واہ" تو بار بار نکلی لیکن دل مسلمان نہ ہوا۔ مولانا مودودی رح کو پڑھا تو زبان سے داد و ستائش کے ساتھ دل بھی اسلام کی طرف مائل ہونے لگا۔ میرے دل میں اسلامی نظریات کے متعلق جو شکوک پیدا ہو گئے تھے، ان کو مولانا مودودی رح نے رفع کیا۔ میرے دماغ میں تخلیق عالم اور خدا کے بارے میں جو گتھی الجھ گئی تھی اس کو مولانا مودودی رح نے سلجھایا۔

میں نے مولانا مودودی رح کی اس فکر کو اپنا لیا جو انھوں نے قرآن و حدیث سے اخذ کر کے پیش کی تھی۔ اس تحریک کی حمایت پر آمادہ ہو گیا۔ جو دراصل انبیائی تحریک تھی اور جس پر یقین مولانا مودودی رح کے مضبوط دلائل سے ہوا۔

اتنا ہی نہیں، مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میرے اندر کا سویا ہوا مسلمان آدمی بیدار ہونے لئے کروٹیں لینے لگا ہے۔ اب حرام و حلال کے مقامات آئے تو رک کر سوچنے لگا، کدھر جاؤں؟ و باطل کے مرحلے آئے تو غور کرنے لگا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پیروں، پیرزادوں ں، ملحدوں اور علمائے دیوبند نے مولانا مودودی رح کو اعتراضات اور ملامت کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ نے ردِ مودودیت جیسی بہت سی کتابیں پڑھیں۔ مولانا مدنی رح نے مودودی رح کے متعلق جو کچھ ا۔ وہ بھی میری نظر سے گزرا، پیروں، بدعتیوں اور ملحدوں کو تو چھوڑیئے۔ مجھے افسوس علماء کرام نا تھا۔ جو دین و شریعت کی کسوٹی پر مولانا مودودی رح کو پرکھتے تھے لیکن نہایت گھٹیا زبان اور بازاری استعمال کرتے تھے۔ مولانا نے ارکان جماعت کو منع کر رکھا تھا کہ علماء کو کوئی جواب نہ دے۔ ہو سکتا

ہے کہ کوئی نوجوان کسی جماعت ان کے احترام کو برقرار نہ رکھ سکے۔ مولانا مودودی ان تہا کئے گئے اعتراضات کا جواب نہایت شائستگی اور سنجیدگی سے دیتے، علماء کرام کے احترام کو ملحوظ رکھتے۔ میں یہ سب دیکھ رہا، مولانا کے ادب و سلیقے سے متاثر ہوتا رہا۔ مختلف جماعتوں سے وابستہ رہ چکا تھا۔ میں نے ان کو اندر اور باہر سے اچھی طرح دیکھا اور پرکھا تھا سب کو لم یقولون مالا تفعلون کے مصداق پایا تھا۔ افراد جماعت کی کردار سازی اور فکری تربیت کی طرف کہیں باقاعدہ نظم نہ تھا۔ ان تجربوں نے تمام جماعتوں کو میری نظر میں مشکوک کر دیا تھا لیکن مولانا مودودی رح نے تحریک اسلامی کی کامیابی اور افراد کی تربیت کے لئے جماعت کی ضرورت کو اس شدت سے محسوس کرا دیا تھا کہ بالآخر میں جماعت اسلامی کی طرف آپ سے آپ کھنچ گیا۔

سوچا تھا یہ کہ اب نہ ملوں گا کسی سے میں
پر کیا کروں کہ ہو گیا مجبور جی سے میں

تو پھر ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو رام پور پہنچا۔ یہاں جماعت اسلامی کا مرکز تھا۔ ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم کہہ کر جماعت سے وابستہ ہو گیا۔ جماعت اسلامی سے وابستہ ہونے کے بعد یعنی ۱۹۵۳ء سے اب تک مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رح کی پوری تاریخ میرے سامنے کھلی جانے لگی۔ مولانا نے سیاسی بکھیڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ جماعت اسلامی پاکستان نے عملی سیاست میں حصہ لینے کی ٹھان لی تھی۔ پاک حکومت کے سامنے چار نکاتی مطالبہ رکھ کر ملک گیر پیمانے پر اسلامی نظام برپا کرنے کی مہم چلا دی تھی۔ مولانا نے اس مہم کو کامیاب بنانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی اس وقت مولانا اس مہم کی حمایت میں نہایت اہم مضامین لکھ رہے تھے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"چونکہ پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتی

ہے اور پاکستان میں اسلامی نظام برپا کرنے کے لیے ہی مسلمانوں نے جانی و مالی قربانیاں پیش کی تھیں۔ لہٰذا اب قیام پاکستان کے بعد ہر پاکستانی مسلمان، دستور ساز اسمبلی سے مطالبہ کرتا ہے۔ کہ وہ اس بات کا اعلان کرے کہ پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ کے ہے۔"

اس مہم کا آغاز ہونا تھا کہ مولانا مودودی رح اور جماعت اسلامی پاکستان کے سامنے سخت ترین آزمائشوں اور دارورسن کے مرحلوں کا آنا شروع ہو گیا۔ اس موقع پر اس عبقری انسان نے اسلامی کردار سازی کے بے مثل جوہر دکھائے۔ ارکان جماعت کو تلقین کی۔

● خبردار مطلق نہ گھبرانا ● ذرہ برابر کمزوری نہ دکھانا ● پولیس تحقیر آمیز سلوک کرے یا قانون سے بالاتر ہو کر ستانے پر تل جائے تو بھی دل میں غصہ نہ آئے ● کوئی رکن جماعت گرفتاری سے بچنے کی کوشش نہ کرے ● رہا ہونے کے لئے ضمانت یا جرمانہ نہ دے ● (اور آخری بات یہ ہے کہ) جیل کے اندر رہ کر اسوۂ یوسفی کی تقلید کرے۔

اس مہم کے قائد چونکہ مولانا خود تھے۔ انھیں بھی گرفتار کیا گیا اور بیس ماہ کے لئے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اسی زمانے کی ایک گواہی ملاحظہ ہو۔ پاکستان کا سب سے بڑا قانون داں بروہی آواز بلند کرتا ہے

"میں جماعت اسلامی کا رکن نہیں ہوں لیکن مجھے مولانا مودودی سے زبردست عقیدت ہے انھوں نے ایسے کارکنوں کی ایک ٹیم تیار کی ہے جو صرف اصول کی خاطر کام کرتی ہے اور بے غرض اور اخلاقی اصولوں کی پابند ہے۔"

(مو)لانا مودودیؒ کی تاریخ آگے بڑھی۔ مولانا رہا ہوئے۔ پاکستان میں اسلامی دستور کے نفاذ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کمیونسٹ اور قادیانی تھے مولانا نے ان کے خلاف مہم چلادی۔ "قادیانی مسئلہ" ایک پمفلٹ لکھا۔ اس جرم میں مولانا پھر گرفتار کر لئے گئے اور انھیں سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا۔ جماعت اسلامی پاکستان نے اس حکم کو چیلنج کیا اور ایک عالمی احتجاج برپا کر دیا۔ اس عالمی احتجاج سے پاکستان کے سربراہوں کو پاؤں تلے کی زمین کھسکتی نظر آنے لگی۔ اس موقع پر رحم کی درخواست

کے بارے میں اس کوہ گراں کا استقلال ملاحظہ ہو۔ فرمایا۔

• مجھے کسی سے کوئی اپیل نہیں کرنی ہے۔ زندگی اور موت کے فیصلے زمین پر نہیں آسمان پر ہوتے ہیں۔ اگر وہاں میری موت کا فیصلہ ہو چکا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے موت سے نہیں بچا سکتی اور اگر وہاں میری موت کا فیصلہ نہیں ہوا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔

مولانا نے اپنے رفقاء سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

• میں اپیل نہیں کروں گا • میرا کوئی رفیق بھی میری طرف سے اپیل نہ کرے

• نہ میری ماں اپیل کرے نہ میرا بھائی۔ نہ میری بیوی نہ میرے بچے۔

اس پیکر عزیمت نے بیٹے سے کہا:۔

• بیٹا! ذرا نہ گھبرانا۔ اگر میرے پروردگار نے مجھے اپنے پاس بلانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو بندہ بخوشی اپنے رب سے جا ملے گا اور اگر اس کا حکم نہیں ہے تو پھر چاہے یہ لوگ اُلٹے لٹک جائیں مجھے نہیں لٹکا سکتے۔

اور ایسا ہی ہوا۔ صبح کو پھانسی کا حکم چودہ برس کی سزا میں تبدیل ہو گیا اور پھر دو برس کے اندر ہی مولانا جیل سے واپس آ گئے۔ اس کے بعد ۵۹ء میں اسکندر مرزا نے مارشل لا کے نفاذ کے بعد جماعت پر پھر پابندی لگا دی۔ تو مولانا نے تفہیم القرآن کا مواد فراہم کرنے کے لئے ارض القرآن کا قصد کیا۔ اسی سفر میں عربوں کی قوم پرستی کے بت پر جدہ ریڈیو سے ضرب لگائی۔

ابھی آرام نہ کرنے پائے تھے کہ شاہ سعود نے مدینہ منورہ میں اسلامی یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے مشورے چاہے۔ مولانا سے درخواست کی کہ تکلیف کی زحمت گوارا فرمائیں۔ مولانا تشریف لے گئے تو شاہ سعود نے استقبالیہ میں کہا کہ:۔

"ہم نے آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ یونیورسٹی کے قیام کے لئے دین کی صحیح

سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ تیار ہوں اور اسلام کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیں
میں جانتا ہوں کہ آپ دعوت اسلامی کا کام کر رہے ہیں۔ آپ بہت مشغول ہیں لیکن
ہم آپ سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں!

مولانا نے یونیورسٹی کا خاکہ تیار کیا۔ اس عرصے میں جماعت پر سے پابندی ہٹ چکی تھی۔ مولانا نے فوراً آل پاکستان جماعت اسلامی کے اجتماع کا اعلان کر دیا۔ اس اجتماع کو ناکام بنانے کے لئے حکومت نے سازش کی۔ بھرے اجتماع میں مولانا پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ جماعت کا ایک رکن آگے آگیا۔ گولی اس کے لگی اور وہ قربان ہوگیا۔ جماعت کے کیمپ میں آگ لگانے کی کوشش کی گئی۔

مولانا سے عرض کیا گیا کہ آپ بیٹھ جایئے۔ مولانا نے جواب میں فرمایا۔ اگر میں ہی بیٹھ جاؤنگا تو کھڑا کون رہیگا۔ اسکے بعد جماعت کی مجلس شوریٰ کے ممبروں اور مولانا کو پھر گرفتار کر لیا گیا۔ جماعت کے دفتر پر حکومت نے قبضہ کر لیا اور جماعت کو پھر بند کر دیا گیا۔ سنہ ۶۵ء میں سپریم کورٹ نے جماعت کو بحال کیا تو مولانا نے ایک اور بھرپور وار کیا۔ مولانا نے "خلافت و ملوکیت" ایک کتاب لکھی۔ یہ کتاب پاکستان کے ڈکٹیٹروں کے لئے بم سے کم نہ تھی۔

اس طرح تاریخ آگے بڑھتی گئی۔ مسلسل محنت، لگاتار کاوش اور تصنیف و تالیف (جس میں تفہیم القرآن کا بڑا حصہ ہے) اور اجتماعی کاموں میں شرکت سے صحت متاثر ہوگئی۔ پہلے پتھری کا مرض تو ساتھی بنا لیکن پاؤں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ مجبوراً ۳۱ سال جماعت اسلامی کی امارت کر کے مستعفی ہوگئے۔ اب جماعت اسلامی پاکستان کے امیر میاں طفیل محمد صاحب مقرر ہوئے۔ میاں طفیل محمد صاحب نے جوش و خروش کے ساتھ اسلامی نظام کے لئے اقدامات شروع کر دئے۔ ان سارے اقدامات کی روح مولانا مودودی ہی تھے۔ اسی زمانے میں میں نے ایک صاحب سے مولانا کی صحت کے متعلق پوچھا تو ان صاحب نے بڑے فصیح و بلیغ جملوں میں کہا۔

"اس میں شک نہیں کہ مولانا کا جسم کمزور ہو چکا ہے لیکن مولانا کے جسم کے اندر جو مولانا مودودی صاحب ہیں وہ بہت صحت مند اور توانا ہیں۔"

۱۹۷۹ء میں شاہ فیصل ایوارڈ کے لئے مولانا کے نام کا اعلان ہوا۔ چھ لاکھ روپیہ کا ایوارڈ تھا۔ اس
[illegible]ھانے یہ بڑی رقم حکومت پاکستان میں قانون بنانے والی کمیٹی کے نام وقف کردی۔ ایوارڈ کے
[illegible]ب میں مولانا نے جو کچھ فرمایا اس میں یہ جملہ یاد رکھنے کے لائق ہے: میں نے انعام حاصل کرنے
[illegible] لئے کبھی کچھ نہیں لکھا۔"

اب میں تاریخ کو ادھر سمیٹتا ہوں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی
ہے۔ اتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبادیں گے تو ۱۹۷۹ء میں اسلام کا اُبھار یعنی اسلامی نظام کے
[illegible]ہ کی کئی مثالیں تاریخ نے لکھیں۔ تحریک اسلامی اب عالم اسلام کے نوجوانوں کے سینوں میں
[illegible]ئی تھی۔ جاکرتہ سے لے کر بنگلہ دیش ہوتے ہوئے کشمیر، افغانستان، ایران سے گزر کر ٹرکی
[illegible]ن نکل جایئے۔ تاریخ کے صفحات میں اسلام اور غیر اسلام میں عظیم جنگ برپا نظر آتی ہے۔ اللہ کے
[illegible]اروں سپاہیوں کا خون بہتا نظر آتا ہے۔ تاریخ نے لکھا ہے کہ یہ خون رائیگاں نہیں گیا ایران
[illegible]ں پچاس ہزار فدائیان اسلام کے خون کے دریا میں اسلام دشمن رضا شاہ پہلوی کا تخت حکومت
[illegible]ہ گیا۔ پاکستان میں بھٹو صاحب پھانسی پر لٹکا دئے گئے۔ افغانستان میں تحریک اسلامی اور کمیونزم
[illegible]ں گھمسان کا رن پڑا ہے۔ تاریخ زریں حروف میں لکھتی ہے کہ مولانا مودودی رح کی تین بڑی
[illegible]ائیں تھیں وہ پوری ہو چکیں۔

(۱) انھوں نے اپنی زندگی میں تحریک اسلامی کے احیاء کا جو پودا لگایا تھا اُسے پھولتا پھلتا دیکھ لیا
[illegible]ان میں دیکھ لیا کہ اسلامی نظام قائم ہوگیا۔ پاکستان میں اس کا اعلان ہوگیا۔

(۲) مولانا نے تفہیم القرآن کا جو کام شروع کیا تھا اُسے اپنی زندگی میں مکمل کرلیا۔

(۳) آخری خواہش تھی کہ سیرت سرور عالم کو بھی ترتیب دے لیں۔ ماشاء اللہ یہ ترتیب بھی ہوگئی
[illegible]ر اس کی دو جلدیں مولانا کی زندگی میں شائع ہوکر منظر عام پر آگئیں۔

تاریخ ایسی غیر جانبدار اور ایسا تیکھا رُخ رکھنے والی اور دو ٹوک نتائج اخذ کرنے والی ہے

کہ کسی کی رعایت نہیں کرتی۔ تاریخ اس کے بعد ایک اشارہ دینے لگی کہ مودودی صاحب نے جو سوچا تھا وہ تو ہو چکا، اس جملے کے بعد تاریخ نے بقیہ سطر........ نقطے لگا کر چھوڑ دی۔

عالمِ اسلام کے نکتہ دانوں کے دل ان نقطوں سے کھٹکے۔ اس اندیشے کا ثبوت اس طرح سامنے آیا کہ رمضان کے آخر میں مولانا کے پیٹ میں درد شروع ہوا اور انھیں بخار آنے لگا......

اب میں آگے لکھنے سے معذور ہوں۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء سے آج ۱۲ اکتوبر تک بہت رو چکا ہوں۔ عالمِ اسلام رو چکا ہے۔ میں اب کسی کو رلانا نہیں چاہتا۔ آہ! یہ عزم و استقلال کا پیکر۔ آہ یہ ہمت و حوصلہ کا کوہ گراں جس نے کبھی کسی قہار و جبار طاغوت سے ہار نہیں مانی تھی۔ جس کی آواز بندوقوں کی گولیوں کی بارش میں اور مخالفین کی یورشوں میں نہ دب سکی۔ اجل مسمّی آتے ہی خاموش ہو گیا لاتدری نفس بای ارض تموت۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ زمین کے کس خطے میں وفات پائیگا مولانا کی موت امریکہ میں ہونا تھی۔ اس آخری بیماری کے سلسلے میں بفیلو اسپتال لے جائے گئے وہیں ۲۱ اور ۲۲ ستمبر کی درمیانی شب میں نہایت اطمینان سے جان کی امانت، امانت والے کو سونپ دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حفیظ میرٹھی کا شعر ایک لفظ کی ترمیم کے ساتھ سنئے:۔

حیات جس کی امانت تھی اس کو لوٹا دی
وہ آج چین سے سویا ہے پاؤں پھیلا کر

اب رو ؤ، اے رونے والو! مگر کہاں تک روؤ گے؟ تم رو کر مولانا مودودی کو واپس نہیں لا سکتے۔ میں تم کو تمہارے محبوب کا غم کرنے سے نہیں روکتا مگر مجھے بتاؤ! کیا مولانا کی محبت اور مولانا کے احسانات کا تقاضا صرف یہی ہے کہ ہم تم روتے ہی رہیں یا اس کے سوا کچھ اور۔ میرے رفیقو! قرآن اٹھا کر دیکھو۔ صحابہؓ کی روایات میں دیکھو۔ اللہ کے آخری نبی حضورؐ کے انتقال پُر ملال کے موقع پر صدیق اکبرؓ نے کیا کہا تھا۔ میں آج وہی بات یاد دلانا چاہتا ہوں۔ میرے

عزیزو ساتھیو! مولانا مودودی رح کے غم کا ٹھیک ٹھیک حق یہ ہے کہ مولانا نے جس تحریک کے لئے اپنی جان کھپادی۔ وہ تحریک تمہارے دم میں جب تک دم ہے آگے ہی بڑھتی رہے۔ اگر خدانخواستہ اس میں ہم نے تم نے کوتاہی کی تو ہماری اس غفلت سے ایک عظیم نقصان ہوگا یہ کہ جس طرح معین الدین چشتی رح، سید سالار غازی رح، شیخ عبدالقادر جیلانی رح وغیرہ کی قبروں پر ان کی تعلیمات اور تحریکات کے مخالف لوگوں نے قبضہ کرکے نذروں اور چڑھاؤوں کی دوکانیں سجالی ہیں۔ اسی طرح یہی آج کے مودودی دشمن لوگ مولانا مودودی رح کی قبر پہ قبضہ کرلیں گے۔ مجاور بن کر بیٹھ جائیں گے۔ اور مودودی علیہ الرحمۃ کا پروپیگنڈہ کرکے اس ہستی کی قبر کو اپنی کمائی کا ذریعہ بنالیں گے پھر وہی کچھ ہوگا جو ان [illegible] دوسرے بزرگوں کے مزاروں پر ہورہا ہے۔ مودود اللہ شاہ کی قبر پہ درگاہ بنے گی۔ پھر عرس ہوگا۔ قوالی ہوگی۔ سید ابوالاعلیٰ کی یہ کتابیں دریابرد کردی جائیں گی۔ ان کے بدلے ان کراماتوں اور مکاشفوں کے جھوٹے افسانوں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔ بولو! کیا یہ گوارا ہے؟ اللہ تعالیٰ ہم کو تم کو اور مولانا مرحوم کی قبر کو محفوظ و مامون رکھے۔ آمین۔

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر
زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات
حریم ذات ہے اس کا نشیمن ابدی
نہ تیرہ خاک لحد ہے، نہ جلوہ گاہ صفات

خود آگہاں کہ ازیں خاک داں بروں جستند
(ارمغان حجاز)
طلسم مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

(عبدالمجید سرور، ایگلاں)

لاکھوں ملحد، ایک مودودیؒ

[illegible]

مالی گاؤں کے سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والے کیمونسٹ اخبار میں ایک نظم مذکورہ عنوان سے چھپی ہے۔ کتنی سچی بات کہی گئی ہے۔ واقعی ایک مودودی لاکھوں یہودیوں اور کیمونسٹوں پر بھاری ہے کیمونزم کا بانی مبانی کارل مارکس خود ایک یہودی تھا۔ اور یہودی کیمونسٹ ہوں یا غیر یہودی مودودی کے تصور سے لرز جاتے ہیں۔ اسی طرح آگے ایک اور اچھا مصرع کہا گیا کہ "اس کی سانسیں بھی بارودی" ان کے لئے یہ بھی درست بات ہے۔ مودودی اگر سانس بھی لیتا ہے تو کیمونسٹوں اور یہودیوں کے چہرے جھلس جاتے ہیں۔ اگر وہ زور کی پھونک مار دے تو تل ابیب اور ماسکو میں بھونچال آجائے۔ دشمن کتنی ہی گالیاں دے تحریک اسلامی کا بھونچال آکے رہیگا۔ (اکبر نسیم مالی گاؤں)

ایک اکیلا لاکھ پہ بھاری کفر پہ ہے ہذیاں سا طاری
چیخ رہے ہیں، باری، باری مارکس اور لینن کے پجاری
اُف! مودودی ہے مودودی
لاکھوں ملحد، ایک مودودی

وقت کا دھارا طوفانی ہے　　غیض و غضب میں ایرانی ہے
شورِ جہاد افغانی ہے　　باطل کو پھر حیرانی ہے

لہر، لہر مچلی، بہبودی
لاکھوں ملحد، اک مودودی

دینِ نبی سے رشتہ اس کا !!　　حق گوئی ہے شیوہ اس کا
روشن روشن، چہرہ اس کا　　مہر و محبت سایہ اس کا

نرم گھٹائیں، نیلی اودی
لاکھوں ملحد، اک مودودی

وہ باطل اقتدار کا دشمن　　کوسیجن کا زار کا دشمن
کارٹر کے افکار کا دشمن　　زر پیشہ، زردار کا دشمن

حق کے سوا سب راہیں ڈوبی
لاکھوں ملحد، اک مودودی

پتھر اپنوں نے برسائے　　پھانسی کے پھندے لہرائے
الزاموں کے تیر بھی آئے　　زخم سہے اور حرف نہ لائے

نکلے بادل سب یہ دودی
لاکھوں ملحد، اک مودودی

تاریخی کردار دیا ہے !　　دین پہ سب کچھ وار دیا ہے
نقدِ دل و جاں پایا ہے !　　عشق کا وہ معیار دیا ہے

پیشِ نظر رب کی خوشنودی
لاکھوں ملحد، اک مودودی

(مائل خیرآبادی)

مرحبا سیّدی ابوالاعلیٰ مودودیؒ

کفر سے پائمال تھی دنیا ۔ شرک کا ایک جال تھی دنیا
مبتلا بال بال تھی دنیا ۔ رنج و غم سے نڈھال تھی دنیا
دین سے کٹ گئی تھی یہ دنیا ۔ راہ سے ہٹ گئی تھی یہ دنیا
قوموں میں بٹ گئی تھی یہ دنیا ۔ پاپوں سے پٹ گئی تھی یہ دنیا
آف وہ بنتِ عنب کی عُریانی ۔ زندگی میں غضب کی عُریانی
نام کی اور نسب کی عُریانی ۔ علم کی اور ادب کی عُریانی
ساری دنیا میں عام آزادی ۔ تیز رَو، تیز گام آزادی
تھا ترقی کا نام آزادی ۔ تھی بہت بے لگام آزادی
کوئی ذکرِ خدا جو کرتا تھا ۔ تو بہت ہی گراں گزرتا تھا
دل سے غیظ و غضب اُبھرتا تھا ۔ غصّہ اسلام پر اُترتا تھا
کمیونسٹوں کی زد میں تھا اسلام ۔ سوشلسٹوں کی مد میں تھا اسلام
اک عجب ردّ و کد میں تھا اسلام ۔ لم یلد لا و لد، میں تھا اسلام
بادشاہوں کا تھا غلام اسلام ۔ خانقاہوں کا تھا غلام اسلام
نئی راہوں کا تھا غلام اسلام ۔ دل کی چاہوں کا تھا غلام اسلام
کہیں اُس کا نہیں ٹھکانہ تھا ۔ منتشر اس کا تانا بانا تھا!
اعتراضات کا نشانہ تھا ۔ قدم اُس کا مدافعانہ تھا!

اُمتِ مسلمہ، وہ بے چاری   خود کشی اپنے وجود سے عاری
ایک ایک پل غریب پر بھاری   اب گئی، اب گری وہ اب ہاری

ناگہاں ایک عبقری انساں   وہ عزیمت کا ایک کوہ گراں
آگیا لے کے پرچم ایماں   ہاتھ میں اس کے مصحفِ قرآں
مردِ میداں بھی وہ مدبّر بھی   دین اسلام کا مفکّر بھی
اور قرآن کا مفسّر بھی   اس کا طرزِ بیاں موثّر بھی
ادب و علم کا امام بھی وہ   اور مقبولِ خاص وعام بھی وہ
شبلیؒ، اقبالؒ ابوالکلام بھی وہ   اپنے رب کا مگر غلام بھی وہ
مستند مولوی ابوالاعلیٰ   مولوی متقی ابوالاعلیٰ
متقی سیدی ابوالاعلیٰ   سیدی مرشدی ابوالاعلیٰ
نبضِ عالم ٹٹولنے والا   دل کی گرہوں کو کھولنے والا
بہر عنوان بولنے والا   بات کو خوب تولنے والا
اس کے حصّے میں سوجھ بوجھ آئی   اس پہ قربان فکر و دانائی
صاف ستھری زبان بھی پائی   اور اس کے قلم کی رعنائی؟
پھول علم وادب کے برسائے   ایک تازہ بہار لے آئے
ادبستاں کی روح گرمائے   مہکے، صحنِ چمن کو مہکائے
اس نے قرآن کو سامنے رکھ کر   اس نے فرقان کو سامنے رکھ کر
دین و ایماں کو سامنے رکھ کر   اور انساں کو سامنے رکھ کر
چھانٹ کر پاکی اور ناپاکی   فرق نوری و ناری و خاکی

علم و حکمت کی روح یکجا کی — ایک تحریک اس نے برپا کی
اس نے دنیا کو دین سے جوڑا — عالمی فکر کو ادھر موڑا
ملحدانہ طلسم کو توڑا — اس کو پامال کرکے ہی چھوڑا
اپنے مقصد میں شادکام ہوا — قائم اسلام کا نظام ہوا
دین، دنیا کا اب امام ہوا — اونچا اسلام کا نظام ہوا
اے عظیم آدمی ابو الاعلیٰ — مرحبا سیدی ابو الاعلیٰ
مرحبا مولوی ابو الاعلیٰ — مرحبا مرشدی ابو الاعلیٰ

آگے اب اور ہی کہانی ہے — یہ کہانی بہت پرانی ہے
موت برحق ہے، ناگہانی ہے — جو یہاں آیا، اس کو آنی ہے

پڑھ رہا ہے ہر آن سارا جہان
آیۂ کل من علیہا فان

زندگی کیا ہے بہتا پانی ہے — اور اس میں بڑی روانی ہے
یہ روانی بھی آنی جانی ہے — آج بچپن ہے کل جوانی ہے

وقت پیری یہی ہے وردِ زباں
آیۂ کل من علیہا فان

جن کے جھنڈے گڑے تھے دنیا میں — ملک گھیرے پڑے تھے دنیا میں
موت سے جو لڑے تھے دنیا میں — سینہ تانے کھڑے تھے دنیا میں

اب کہاں ہیں؟ کہیں ہے ان کا نشاں
آیۂ کل من علیہا فان

متقی اور پارسا نہ رہے　　پاکباز اور باصفا نہ رہے
حق تو یہ ہے کہ اولیا نہ رہے　　حق تعالیٰ کے انبیا نہ رہے

نہ رہے گا کوئی ہمیشہ یہاں
آیۂ کل من علیہا فان

موت کو کام یہ بھی کرنا تھا　　ابو الاعلیٰ کو بھی تو مرنا تھا
موت کی راہ سے گزرنا تھا　　قبر میں ان کو بھی اترنا تھا

بزم یاراں کو کر گئے ویراں
آیۂ کل من علیہا فان

دوستو! روؤ، کتنا روؤ گے　　ان کو رو رو کے جان کھوؤ گے
دامن اشکوں سے تم بھگوؤ گے　　ایک دن تم بھی یونہی سوؤ گے

تم بھی اس راستے پہ ہو گے رواں
آیۂ کل من علیہا فان

رونے دھونے سے کیا بھلا ہو گا　　رونے سے حق نہیں ادا ہو گا
رونے سے میں بتاؤں کیا ہو گا؟　　پست اپنا ہی حوصلہ ہو گا

سانس جب تک ہے رکھو عزم جواں
آیۂ کل من علیہا فان

ورد کرتے رہو دعائے قنوت　　اپنے ایمان کا دو تم بھی ثبوت
کر دو بڑھ بڑھ کے کفر بالطاغوت　　ابو الاعلیٰ کے تم اگر ہو سپوت

رد کو قانون سازیٔ انساں
آیۂ کل من علیہا فان

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون
موت العالم موت العالم

جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی

وفات سے عالم اسلام کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے اس پر کل جہاں سوگوار ہے اور ہم بھی اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔

مولانا کی وفات سے دنیائے علم و ادب اور سیاست میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ آئندہ صدیوں میں شاید ہی پُر ہو سکے۔ موجودہ اور آئندہ نسلیں ہمیشہ مولانا کی ممنونِ احسان رہیں گی۔

خداوند تعالیٰ مولانا کو جوارِ رحمت میں مقامِ علیٰ عطا فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین

(ظفر اسحاق رشاد)

سید مودودی

مولانا مودودی کی وفات صرف پاکستان ہی نہیں پورے عالم اسلام کیلئے سانحہ

"وہ جواں سال نہ تھا جواں فکر تھا میرا عزیز نہ تھا عزیز جہاں تھا"

تفہیم القرآن کا مطالعہ میرے لئے نعمت تھا۔ تفہیم علم کا سرچشمہ ہے۔ الطاف گوہر کا خراج عقیدت

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

ایک آوازہ تھا شہ کا کعبہ اکر گیا
یوں گرداب سو باکے سے سہارا کر گیا
صبر کی شدت میں جو کہ باندھنا ممکن نہیں
یوں تو اصحاب دل کو پارا پارا کر گیا
حزم و ہمت، حکمت و تبلیغ کا وہ آبشار
زخمی ہوئیں کو تشنہ و تیز دھارا کر گیا

جان تھی نکل جاتی گر راہ کے ہشت پہر کی
جانبِ منزل مگر پھر بھی اشارا کر گیا
ایک سید انتشار و کفر کے کہسار پر
وحدت و توحید کا روشن منارا کر گیا
"الجہاد" و "سود" و "پردہ" "تنقیحات" و "تفہیم" سے
ہر تقاضائے شریعت آشکارا کر گیا

اور ہوتا مجسم جو جفا و ناکی حالت میں
تو ہی تھا ہر زخم، ہنس کا گوارا کر گیا
سلسلۂ مودودیہ کا منکسرہ چہرہ و چراغ
ریت کے ہے ذرہ ذرہ کو ستارہ کر گیا

"آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے"
اوس کے قطروں کو تیرا دم شرارا کر گیا

ڈاکٹر الیاس شاد [illegible] ۲۰، ستمبر

مولانا [illegible]

[illegible]

جمعہ



یقین نہیں آتا

[illegible]

اے اللہ تحریک اسلامی کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی فرما

[illegible]

لوگ غصہ دلاتے مگر مولانا مودودی کو غصہ نہ آتا تھا

جلوس جنازہ میں متعدد افراد شدت غم سے بیہوش ہو گئے ۔ ایک شخص پر دل کا دورہ ۔ ہر آنکھ پُرنم تھی

[illegible] صاحبزادوں حسین فاروق، خالد فاروقی، قریبی ساتھی یوسف خان اور دیگر [illegible]

بیداری

[illegible] تفہیم القرآن [illegible]

[illegible] مودودی [illegible]

مولانا مودودی زندگی کے ہر شعبہ میں شہادت حق کا فریضہ ادا کرتے رہے

سید مودودی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اپنے آپ کو ذمہ داریوں کا کوہِ گراں اٹھانے کیلئے تیار کیجئے

جماعت اسلامی اور تحریک اسلامی کے لیے اس کے بانی مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودی کی وفات بلا شبہ سانحہ عظیم ہے لیکن اس تحریک کو اس سے بھی بڑے سانحات سے سابقہ پیش آتا رہا ہے۔ اس تحریک کے بڑے داعی انبیا علیہم السّلام تھے اور وہ بھی اپنے ساتھیوں کو بلکتا چھوڑ کر دنیا سے اٹھ گئے تھے۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ کہہ کر تسکین دی ہے کہ:

اس قدر بدحواس کیوں ہوتے ہو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسولوں میں سے ایک رسول ہی ہیں، ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر ان کا وصال ہو جائے یا وہ شہید ہو جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ (القرآن)

اگر حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے تو ہمارے رہنما مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ جن کو مرحوم کہتے ہوئے فی الحقیقت دل شق ہوتا ہے، ان کا یہ سانحہ ارتحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سانحہ ارتحال کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے میں تمام وابستگانِ تحریک سے یہی کہوں گا کہ وہ صبر جمیل سے کام لیں اور مولانا محترم کے رخصت ہو جانے سے ان کی ذمہ داریوں میں جو کئی سو گنا اضافہ ہو گیا ہے ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ نیا عزم اور از سرِ نو عہد کریں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ مولانا محترم کو اعلیٰ علیین میں بلند مراتب سے نوازے اور ان کی اولاد کو بھی اور ہم سب پسماندگان کو اس دعوت کا حق ادا کرنے کی مستقل توفیق اور قابلیت عطا فرمائے جس کو مولانا نے پچاس سال سے زائد عرصہ تک اپنے خونِ جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا۔ ہمیں اس بات کا عزم کرنا چاہیے کہ جماعت کے مقاصد کو پورا کریں گے اور ان کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دم لیں گے۔ ان شاء اللہ

سو

خاک

بفیلو میں مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے ہزاروں مسلمانوں نے نماز جنازہ ادا کی

شن

آہ! مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے انتقال سے دنیا میں اسلامی تحریک کو جو نقصان پہنچا ہے مستقبل قریب میں بظاہر اس کی تلافی کا امکان نظر نہیں آتا۔ مولانا مودودیؒ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بلند پایہ مفکر، ممتاز عالم دین اعلیٰ درجے کے متکلم اور صاحب عزیمت قائد و رہنما تھے۔ ان کی ذات میں اتنے اعلیٰ اوصاف اور صلاحیتیں جمع تھیں جو انھیں تحریک اسلامی کی تاریخ میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔ مستقبل میں اسلامی تحریکیں ان کی ہمہ جہتی دینی خدمات سے روشنی حاصل کرتی رہیں گی۔

مولانا مودودیؒ کا اولین کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مغرب کے ہمہ گیر فکری اور سیاسی غلبہ کے دور میں مغربی افکار کے خلاف ایسی بھرپور اور موثر تنقید کی کہ مسلمانوں کے ذہنوں کی مرعوبیت کا خاتمہ ہو گیا اور یہ طلسم ٹوٹ گیا کہ مغرب کے لادینی اور مادی نظریات کی برتری کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا مولانا مودودیؒ نے جس دور میں اپنے علمی کام کا آغاز کیا اس میں برطانوی حکمرانوں کے رائج کردہ نظام تعلیم کے نتیجہ میں مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن مغربی افکار سے مسحور ہو چکے تھے۔ اور صورت حال اس حد تک ابتر ہو گئی تھی کہ بعض مصنفین نے اسلام اور اسلامی تعلیمات کا کھلے عام مضحکہ اُڑانا شروع کر دیا تھا۔ وہ مغربی نظریات کی روشنی میں اسلامی تعلیمات پر جارحانہ انداز میں تنقیدیں کر کے مذہب کو ایک فرسودہ چیز قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو لادینی افکار قبول کرنے کی تلقین کر رہے تھے اسی دور میں اشتراکیت نوجوانوں پر حملہ آور ہوئی اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ پوری طرح ان پر غلبہ

حاصل کرنے کی۔ مسلمانوں کے محدود دینی رہنما اس صورت حال پر بے بسی محسوس کر رہے تھے۔ مغربی افکار و نظریات کے مقابلہ میں ان کا اسلوب و لہجہ اور انداز فکر معذرت خواہانہ تھا۔ اس ماحول میں مولانا مودودیؒ نے اپنے علمی کام کا آغاز کیا اور مغرب زدہ مغربی افکار کے علمبردار بہت جلد دفاعی موقف میں آگئے۔ مولانا مودودیؒ کے لب و لہجہ میں پختگی، تحریر میں علمیت، فکر و نظر کی گہرائی اور استدلال میں ذہنوں کو مسخر کر لینے کی صلاحیت تھی۔ مغربی افکار و نظریات پر مکمل عبور کی وجہ سے ان کی تحریریں مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت جلد مقبول ہوگئیں اور مذہبی حلقوں میں بھی ان کا گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ مغرب کے فکری رعب اور دبدبہ کا یہ خاتمہ مولانا مودودیؒ کی ایک ایسی عظیم دینی خدمت ہے جو اسلامی تحریک کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھی جائے گی۔

مغربی افکار کے ہمہ گیر تسلط کے نتیجے میں مسلمانوں میں دین و دنیا کی تقسیم کا تصور بھی در آیا تھا اور مسلمانوں کے مذہبی حلقے تک اس سے متاثر ہو گئے تھے۔ مولانا مودودیؒ نے اپنی تحریروں میں ایک طرف تو دین و دنیا کی تقسیم کے اس نظریہ پر موثر تنقید کی اور دوسری طرف یہ حقیقت لوگوں کے ذہنوں میں جاگزیں کر دی کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات اور زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ زندگی ایک ناقابل تقسیم کل ہے۔ اسے خانوں میں بانٹا نہیں جا سکتا۔ اسلام انسان کی پوری زندگی کے لئے رہنمائی اور ہدایت دیتا ہے۔ مولانا نے اسلامی نظام حیات کے مختلف پہلوؤں کو موثر طور پر پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ وہ آج بھی پوری طرح قابل عمل ہے اور اسی میں انسانیت کی نجات ہے۔ مولانا نے اسلام کی ان تمام تعلیمات کو جنہیں مغرب زدہ ذہن دور جدید کے لئے فرسودہ قرار دے رہے تھے۔ اتنے مدلل طریقہ پر پیش کیا کہ ان کے لئے کوئی راہ فرار باقی نہیں رہی۔

مولانا مودودیؒ نے صرف علمی طور پر اسلام کو بطور نظام حیات پیش کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے لئے عملی جدوجہد کا بھی آغاز کیا۔ اس میں ان کی عملی استقامت نے صحیح معنوں میں پوری طرح برصغیر میں آئینی اور اسلامی تحریک نے تیز رفتاری کے ساتھ پیش قدمی شروع کر دی۔ انھوں نے خود ... راستوں کے بجائے

کبھی حوصلہ نہیں ہارا اور مخالفتوں کے مقابلہ میں توازن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وہ انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ قیادت کے فرائض انجام دیتے رہے اور انتہائی ناسازگار حالات میں تحریک کے لئے نئی راہیں نکالتے رہے۔

عالم اسلام میں اصحاب فکر، اصحاب تصنیف اور محققین کی کمی نہیں رہی لیکن ایسے اصحاب خال خال ہی گزرے ہیں جنھوں نے فکر بھی پیدا کی اور اس فکر کی بنیاد پر ایک تحریک کو بھی وجود میں لائے جس کی گونج دنیا کے ہر حصے میں پائی جاتی ہے۔

مسلمان خواہ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہوں اسلام کی صداقت پر بھرپور یقین رکھتا ہے۔ ہندوستان کے عام مسلمان جس طرح متاع ایمان کی دولت سے مالامال ہیں یہی حال روس اور مشرقی یورپ کے مجبور و بےکس مسلمانوں کے دلوں کا بھی ہے۔ لیکن مغربی حکمت عملی کی وجہ سے مسلم عوام کی قیادت کو ایسے لوگوں کے سپرد کرنے کی کوشش کی جاتی رہی جو اسلام کے مومن بننے کے بجائے ہر دوسرے ازم پر یقین کرنے والے کارکن تھے۔ عوام اور مسلم رہنماؤں کے تضاد کا یہ مزاج پچھلی صدی میں بہت نمایاں رہا ہے۔ ان رہنماؤں نے غیر اسلام کو اسلام ثابت کرنے کے لئے اپنی کوششوں کا ایک جال بچھا دیا۔ ایسے موقع پر عالم اسلام کو ایک ایسے متکلم کی ضرورت تھی جو اسلام پر ڈالے جانے والے ان نقابوں کو کھرچ کر پھینک دے۔ اور مرعوبیت کے بجائے یقین و اعتماد کے ساتھ دو ٹوک لفظوں میں اسلام کے پیغام کو پیش کرے مولانا مرحوم نے اس ذمہ داری کو اپنے سر لیا اور خدا نے انھیں بصیرت و استدلال کی وہ صلاحیت بھی عطا کی جو اس خدمت کے لئے ضروری تھی۔ خدا نے برصغیر کے اس عالم اور مفکر سے جو خدمات لی ہیں وہ عالم اسلام کا سرمایہ ہیں جن مسلم ملکوں میں اسلامی احیا کی تحریکیں شروع ہوئیں ان کو مولانا کی مساعی سے بڑی خوراک ملی اور یہی وجہ ہے کہ آج اس شخصیت کی جدائی پر مشرق سے مغرب تک ہر دردمند مسلمان ماتم کناں ہے۔

دنیا کی زندگی فانی ہے جو آتا ہے اسے ایک نہ ایک دن مرنا ہوتا ہے۔ یہ دنیا تاجوں [illegible] اور ملکی سربراہوں کی موتیں بھی دیکھتی رہتی ہے جن کی آخری رسوم میں آداب سفارت کے تحت [illegible]

کے سرکردہ نمائندے شرکت کرتے ہیں لیکن مولانا مودودی کی موت ایک ایسے شخص کی موت ہے جس پر دنیا بھر کے مسلم عوام اپنا ذاتی صدمہ محسوس کر رہے ہیں۔ اور یہی ان کا اصلی خراج تحسین ہے کہ دنیا کے ہر حصے کے لوگ ان کی نماز جنازہ میں شرکت کے لئے پاکستان آئے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنے دور کے حاکم وقت کو ایک بار کہا تھا کہ ہم لوگوں کی موت اس امر کا فیصلہ کر دے گی کہ کس کی کیا اہمیت ہے اور یہی صورت حال آج بھی پائی جا رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ابرار و صلحاء میں شامل فرمائے وہ اپنی زندگی کا فرض ادا کر چکے لیکن ان کا فیض جاری ہے اور اگر اس پندرہویں صدی ہجری کو اسلام کی صدی قرار دیا جا سکتا ہے تو اس میں مولانا مودودی کے نقوش مرتسم نظر آئیں گے۔

خدا نے اپنے اس عاجز و مسکین بندے سے یقیناً بہت کام لیا اور اسے یہ موقع بھی دیا کہ وہ اصحاب فکر و عمل کی اس انداز پر تربیت کر جائے کہ یہ دینی خدمت برابر جاری رہے۔ آنے والے جانے کے لئے ہی آتے ہیں اور یقیناً وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو خدا کے دین کے اعلاء اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو غالب بنانے کے لئے تگ و دو کرتے رہیں۔ دنیا جب تک قائم ہے یہ سلسلہ باقی رہے گا۔ اور یہ کام انشاء اللہ انجام پاتے رہیں گے۔ (دعوت)

تدفین و نماز جنازہ

لاہور۔ ۲۶ ستمبر تیسرے پہر جماعت اسلامی کے مؤسس، مفکر اسلام اور دنیائے اسلام کی ممتاز و مایہ ناز شخصیت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے جسد خاکی کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ ریڈیو پاکستان کی ابتدائی خبروں سے معلوم ہوا تھا کہ خانہ کعبہ کے امام [illegible] نماز جنازہ پڑھائیں گے [illegible] قطر یونیورسٹی کے وائس چانسلر یوسف القرضاوی [illegible] نماز جنازہ [illegible]

مولانا مودودی نے جمہوریت مجددیت کے محاذ پر فرقہ بندی کے خلاف [illegible] حسین

[illegible]

ملک بھر کی مساجد میں قرآن خوانی اور اجتماعی دعائیں

[illegible]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اسلام [illegible] پاکستان اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دوست اور بہی خواہ تھے

سید مودودی نے اردو زبان کو ایک موثر اور دلکش اسلوب دیا ہے

لاہور میں سید مودودی کی قیامگاہ پر تعزیت کیلئے آنے والے سوگواروں کا ہجوم

[illegible]

دو شخصیتیں رخصت ہو گئیں

[illegible]

قطعہ تاریخ وفات

موت العالم موت العالم۔ آہ مودودی کی موت
تیرگی ہی تیرگی ہے چھا گیا ہر سو اک خلا
ہاں سنو تو اشعر کیا پس افلاک ہے
مشعل ہدایت آفتاب دین و دانش چھپ گیا

۱۳۹۹ھ

وفا [illegible]



[illegible]

مولانا مودودیؒ کا فکری کارنامہ

مولانا عقیل حامدی صاحب

گزشتہ پچاس سالوں کے اندر عالم اسلام کی دیگر زبانوں کے اندر مولانا سید مودودیؒ کے لٹریچر کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ علاقائی ترجموں کے علاوہ عربی اور انگریزی تراجم نے صرف عرب اور غیر عرب مسلم ممالک کے اندر ہی نہیں مغربی ممالک میں بسنے والے مسلمان بھی ان دونوں زبانوں سے اکثر و بیشتر استفادہ کر رہے ہیں۔ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں جہاں کہیں اسلامی دعوت کے لئے کام ہو رہا ہے وہاں لٹریچر کسی نہ کسی زبان میں پہنچ رہا ہے اور اس کی مانگ روز بروز شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

جماعت اسلامی کے لٹریچر کی مقبولیت کوئی سربستہ راز نہیں ہے۔ چند لفظوں میں اس کی مقبولیت کا راز یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اسلام کی دعوت کو بیرونی افکار و نظریات کی آمیزش سے پاک کر کے خالص اس انداز میں پیش کیا جس انداز میں خود قرآن کریم نے اسے پیش کیا ہے۔

۲۔ اسے پیش کرنے کے لئے وہ اسلوب اختیار کیا جس سے بیسویں صدی کا انسان متاثر ہو سکے۔ اسلامی تاریخ میں جو مصلحین اپنی دعوت و کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے عقلی و فکری پیمانوں کو سامنے رکھ کر انسانوں کو خطاب کیا۔ مولانا مودودی نے بھی جن نظریات و افکار پر تنقید کی ہے اور ان کے مقابلہ میں اسلامی نظریات کو جس اسلوب میں پیش کیا ہے اس سے صاف واضح ہے کہ مصنف کے پیش نظر بیسویں صدی کے انسان کا ذوق ہے۔

۳۔ صرف قوت بیان وسحر بلاغت کو ہی دعوت کی بنیاد نہیں بنایا۔ بلکہ اس کے لئے اس کردار کا بھی

دعوت فراہم کیا جو اسلامی دعوت پیش کرنے کے لئے ناگزیر ہے۔ کسی مصنف کی خوشنما تحریریں ایسی ہی ہوتی ہیں جیسے خوشنما موتیاں۔ لیکن جب مصنف ان کی خاطر اعلیٰ کردار کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ تو ان کی تحریروں کے اندر داخل ہو جاتی ہے اور وہ جامد موتیوں کے بجائے متحرک مشعلیں بن جاتی ہیں۔ یہی بات مولانا مودودی کی تحریروں پر منطبق ہوتی ہے۔

۲۔ مصنف نے اسلام کو محض ایک کامل نظامِ زندگی کی حیثیت سے ہی پیش نہیں کیا بلکہ اسے عملاً برپا کرنے کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا ہے اور ایک جامع تحریک کی بنیاد ڈالی جو آج تک اس دعوت کو غالب کرنے کے لئے انفرادی و اجتماعی، سیاسی و معاشرتی اور تعلیمی و تربیتی غرض ہر پہلو سے جہاد کر رہی ہے۔

اس بات سے کوئی معاند ہی انکار کرسکتا ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں اور جماعت اسلامی کی کوششوں نے عالمِ اسلام پر مختلف النوع اثرات ڈالے ہیں۔ ان اثرات کا حصر ناممکن ہے۔ البتہ ذیل میں چند نمونے بیان کئے جا رہے ہیں۔

جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون میری نظر میں جڑواں بہنیں ہیں۔ دونوں کا دعوتی اور فکری سرچشمہ تقریباً ایک ہی ہے۔ دونوں میں بہت سے پہلوؤں میں ہم آہنگی ہے۔ البتہ دو بڑے فرق یہ ہیں۔

۱۔ اخوان پہلے قائم ہوئی اور نصب العین کا تعین اور فکری پختگی بعد میں۔ جب کہ جماعت اسلامی کا نصب العین اور ہدف اور فکری رخ پہلے واضح ہوا اور تنظیم بعد میں۔

۲۔ اخوان نے اسلام کا مجمل تعارف پیش کرکے اخلاقی و روحانی تربیت پر زور دیا۔ جماعت نے اسلام کو حاضر کی جاہلیت کے سامنے رکھ کر مفصل تصور پیش کیا اور پھر اخلاقی و روحانی تربیت کے ساتھ ساتھ اس کے مختلف پہلو واضح کئے اور اس کے لئے وہ اسلوب اختیار کیا جو بیسویں صدی کی جاہلیت کو رد کرنے کے لئے ضروری تھا۔ اخوان کی دعوت میں آغاز میں یہ بات نہ تھی۔

جماعت اسلامی اور اخوان کے بانی ایک دوسرے سے براہ راست متعارف نہ تھے۔ البتہ ا
گلستہ واسطے ضرور رہے ہیں۔ کویت کے ایک تاجر عبدالعزیز العلی المطوع [illegible] بسلسلہ تجارت
میں مقیم تھے۔ ان کا عربی داں ہندی سکریٹری مولانا مودودی کے مضامین و مقالات کا عربی میں ترجمہ
کرتا تھا اور تاجر موصوف انھیں مصر حسن البنا کو بھیج دیتا تھا۔ اور وہاں سے تحسین و ستائش
مبنی تاثرات پر مشتمل جواب آتا تھا۔

اس پس منظر کے ساتھ میں یہ عرض کروں گا کہ جماعت اسلامی نے فکری پہلو سے دنیا پر مندر
ذیل اثرات ڈالے ہیں۔ اخوان اور غیر اخوان سب ان سے متاثر ہوئے ہیں۔

۱. اگر آج ہر شخص خواہ مخالف ہو یا موافق اسلام کو مکمل ضابطہ حیات قرار دیتا ہے اور یہ تسلیم کر
تا ہے کہ اسلام اپنا الگ فلسفہ، الگ تہذیب اور الگ نظام معاشرت و معیشت رکھتا ہے۔ اور اسلام کو
دوسرے تصورات سے خلط ملط کرنے سے بچانے میں کوئی رول ادا کیا گیا ہے تو اس میں جماعت
کے لٹریچر کا بھی بڑا دخل ہے۔

۲. اسلام اور جاہلیت کا فرق واضح کیا۔ یہ وہ اصطلاح ہے جو انبیاء نے اور آخر میں قرآن کریم نے
استعمال کی ہے۔ یعنی جاہلیت کسی تاریخی دور کا نام نہیں ہے بلکہ انسانوں کی ایک مخصوص حالت کا نام
ہے۔ اور دنیا میں کشمکش اسلام اور جاہلیت کے مابین برپا ہے۔ جاہلیت کے علمبردار مسلمان بھی ہو سکتے
ہیں اور غیر مسلم بھی۔ اس اصول کے تحت مولانا مودودی نے اسلامی تاریخ اور تاریخ مسلمین میں امتیاز
قائم کیا۔

۳. حاکمیت خدا کا نظریہ۔ اس نظریہ کے بموجب مولانا مودودی نے یہ واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ کی تکوینی
حاکمیت کے ساتھ ساتھ اس کی تشریعی حاکمیت تسلیم کیے بغیر ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔ تشریعی حاکمیت
کے نظریہ نے دنیا کے نظریات اور فلسفوں پر ضرب کاری لگائی ہے۔ یہ نظریہ اخوان کے اندر
جماعت اسلامی کے لٹریچر کے ذریعے داخل ہوا۔ اور سید قطب اور محمد قطب نے ان دونوں کو

اس قدر شعور دیا کہ مسلمان کیا کر جاہلیت لڑ نا تھی۔

۴۔ تہذیب کا معرکہ ۔ اسلامی تہذیب پر اعتماد بحال کیا۔ ایک وہ دور تھا کہ بڑے بڑے علماء تہذیب مغرب کے مداح ہو گئے تھے۔ اب یہ حال ہے کہ اسلامی تحریک کا ایک معمولی کارکن مغرب کے اندر مغربی تہذیب کو پاؤں سے ٹھکراتا ہے۔

۵۔ دستوری جنگ کو اسلامی نظام کے قیام کا نقطۂ آغاز قرار دیا۔ انڈونیشیا اور سوڈان کی اسلامی تحریکوں نے اسی طرز کی دستوری جنگ لڑی ہے جو پاکستان میں لڑی گئی۔

۶۔ مذہب و سیاست کی تفریق کا خاتمہ کیا۔ پچھلی صدی سے مستشرقین کی ایک جماعت مسلمان ممالک کے استعماری طاقتوں کے پاؤں مضبوط کرنے کے لیے برابر یہ کوشش کرتی رہی کہ اسلام کے دو حصے کر دیے جائیں۔ ایک مذہبی حصہ اور دوسرا سیاسی حصہ۔ مذہبی حصہ علماء سو کے سپرد کر دیا جائے اور سیاسی حصہ۔ قیصر کے تابع رکھا جائے۔ تاکہ قیصر جس طرح چاہے مسلمانوں کی گردنوں پر کوس حکمرانی بجاتا رہے۔ دین و دنیا کی تفریق کا یہ ذوق مستشرقین نے اس قدر عام کیا کہ مسلمانوں کا ایک اچھا خاصا گروہ اس کا شکار ہو گیا۔ ایک طرف مولانا مودودی نے اٹھ کر یہ اعلان کیا کہ اسلام ایک کل ہے اس کے حصے بخرے نہیں کیے جا سکتے۔ اسے پورا اختیار کرنا ہوگا یا پورا ترک کرنا ہوگا۔ دوسری طرف حسن البنا نے یہ نعرہ لگایا کہ اسلام دین بھی ہے اور سیاست بھی۔

مفتی عتیق الرحمن

عالم اسلام کا سانحہ

۲۳ ستمبر کو مسلم مجلس مشاورت کے کل ہند اجتماع میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب نے فرمایا:۔

مجھے بڑے افسوس کے ساتھ اعلان کرنا پڑتا ہے، مولانا مودودی اس دنیا میں نہیں رہے۔ دنیا اسلام کا ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ کچھ اختلافات کے باوجود اس بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ وہ دنیائے اسلام کی ایک بڑی شخصیت تھے۔ مسلمانوں اور اسلام کے لئے جو کام انھوں نے کئے وہ انتہائی قابل قدر ہیں اپنی جوانی کے دور میں وہ دہلی میں رہے۔ الجمعیۃ کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے انھوں نے خدمات انجام دیں ان کی جدائی سے ہمارے دل محزون ہیں۔ ان کی رحلت دنیائے اسلام کا ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ انھوں نے ابتدائی شعور سے لے کر آخری دم تک اسلام اور مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت انجام دی۔ میں مولانا مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ مجھے آپ کے سامنے آج ایک بات یہ کہنی ہے کہ مولانا مفتی کفایت اللہ مرحوم نے مولانا مودودی صاحب سے کہا کہ اسلام میں مرتد کی سزا کے عنوان سے ایک کتاب لکھیں اور میں اس میں کچھ حذف اور اضافہ کر دوں گا۔ مولانا نے وہ کتاب لکھی اور وہ مولانا کفایت اللہ مرحوم کے نام سے چھپی۔ میں آپ لوگوں کے سامنے شہادت دیتا ہوں کہ وہ کتاب مولانا مودودی ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ آج وہ دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کے کارنامے رہتی دنیا تک باقی رہیں گے۔

کینیا کے قاضی القضاۃ کینیا کے قاضی القضاۃ شیخ صالح فارسی نے مولانا مودودی کی شان میں ایک طویل عربی قصیدہ نظم فرمایا ہے اس میں انھوں نے مولانا مودودی کی اسلامی خدمات کو

خراج تحسین پیش کیا ہے۔

استاذ عصام العطار | استاذ عصام العطار شام کے اخوان کے رہنما ہیں۔ وہ ۱۹۶۴ء سے جرمنی میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی زیر ادارت ایک عربی جریدہ الرائد شائع ہو رہا ہے۔ انھوں نے مولانا مودودی کو ایک نظم میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

یمن کی وزارت تعلیم کے ایک ذمہ دار حسن بن یحییٰ الفزاری نے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے بارے میں کئی نظمیں لکھی ہیں۔

مہ الشیخ مصطفےٰ زرقا سابق وزیر تعلیم شام: | حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی دینی فکر کے لحاظ سے امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہ رح کی صف کے مفکر ہیں۔

امام حرم | امام حرم محمد عبداللہ بن سبیل گذشتہ مارچ میں پاکستان گئے تھے۔ وہ مولانا سے ملاقات کرنے ان کی اقامت گاہ پر گئے۔ انھوں نے مولانا مودودی سے ملاقات کو اپنی خوش نصیبی قرار دیتے ہوئے انھیں پاکستان میں نظام اسلام کے نفاذ پر مبارکباد دی۔ انھوں نے کہا کہ تین سال قبل جب میں پاکستان آیا تھا تو میری دلی خواہش تھی کہ میں آپ کی زیارت کروں لیکن نہایت افسوسناک طریقے سے مجھے آپ کی ملاقات سے روک دیا گیا تھا۔ آج ہمارے لئے کتنی خوشی کا دن ہے ہم آپ سے ملاقات کر رہے ہیں۔ آپ نے اس کے لئے بڑی جدوجہد کی ہے۔ اور تکالیف برداشت کی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ۳۲ سال سے ہم سوچ رہے تھے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے عملی اقدامات کئے جائیں۔ اب ہم اس منزل کی جانب رواں ہو رہے ہیں۔ امام حرم نے کہا کہ جس جدوجہد میں آپ سالہا سال سے لگے ہوئے تھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کے نتائج ظاہر ہونے لگے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کی جدوجہد میں اور زیادہ برکت دے اور جس مشن کے لئے آپ کام کر رہے ہیں وہ آپ کی زندگی میں پورا ہو جائے۔ امام حرم نے مولانا مودودی کو ان کے دوست اور مکہ مکرمہ کے ممتاز عالم دین الشیخ محمد اور رابطہ عالم اسلامی کے سیکرٹری جنرل الشیخ محمد علی الحرکان کا سلام اور پیغام پہنچا دیا۔

مولانا قاری محمد طیب مدار العلوم دیوبند | مولانا مودودی بہترین اسلامی لیڈر ہیں۔ مولانا مودودی نے اسلامی اجتماعیات کے بارے میں نہایت مفید اور قابل قدر ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ اس دور کے غلط اختلاط اور تلبیس واقع ہوں میں جس سلیقہ جگری سے انھوں نے اسلامی اجتماعیت کا تجزیہ و تنقیح کرکے جامع مسائل کو صاف کیا ہے۔ وہ انھیں کا حصہ ہے۔ میں انھیں اسلامی اجتماعیت کا ایک بہترین اسلامی لیڈر مان کر ان کی تقریروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

سید بہاء الامیری | عالم اسلام کے ممتاز رہنما اور مراکش کے کلیۃ حدیث کے سربراہ الشیخ بہاء الامیری نے جو ایک سو سے زائد کتب کے مصنف ہیں۔ گذشتہ مارچ میں لاہور میں مولانا مودودی سے ملاقات کی تھی۔ انھوں نے مولانا مودودی کو اپنی تصانیف پیش کیں۔ کراچی میں ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مجھے پاکستان آنے کی کئی لحاظ سے خوشی ہے۔ ایک وجہ تو اس وقت پاکستان میں موجودگی کی سعادت ہے۔ جب یہاں اسلامی شریعت کے نفاذ کا اعلان کیا گیا ہے۔ اور دوسری مولانا مودودی کی زیارت تھی۔ وہ میری محبوب ہستی ہیں۔ اور ان سے ملاقات کا شوق مجھے پاکستان لے آیا۔ انھوں نے کہا کہ میرے اور عرب نوجوانوں کے اذہان کی تعمیر میں سید مودودی کے نور معرفت اور تعلیم کا بڑا حصہ ہے۔ وہ دور جدید میں علمی اور دینی جہاد میں مصروف ہیں۔ ان کے منور چہرے کی زیارت کرنا میرے لئے بڑی سعادت ہے۔ سید بہاء الامیری پاکستان میں شام کے سفیر بھی رہ چکے ہیں۔

ڈاکٹر دوالیبی | گذشتہ مارچ میں سعودی عرب کے شاہ خالد کے مشیر ڈاکٹر دوالیبی نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ان کی رہائش گاہ واقع اچھرہ میں ملاقات کی وہ تقریباً ایک گھنٹے تک مولانا مودودی کے پاس رہے۔ ڈاکٹر دوالیبی نے مولانا مودودی کو مبارکباد دی کہ ان کی جدوجہد کے نتائج ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں اور پاکستان میں اسلامی قوانین کا نفاذ شروع ہو گیا ہے۔ انھوں نے مولانا مودودی کو شاہ فیصل ایوارڈ پر بھی مبارکباد دی اور کہا کہ آپ بجا طور پر اس کے مستحق تھے۔ ڈاکٹر دوالیبی نے مولانا مودودی سے عشر اور زکوٰۃ کے نظام پر تبادلہ خیال کیا۔

سید محمد قطب | اخوان المسلمین کے رہنما سید قطب شہید کے بھائی اور ملک عبدالعزیز یونیورسٹی مکہ کے پروفیسر جناب محمد قطب صاحب نے مولانا سے لاہور میں ملاقات کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا مودودی نے اسلام کے نظریات کو غیر اسلامی ملاوٹوں سے پاک کر کے اس طرح پیش کیا ہے کہ دنیا میں ہر جگہ مسلمان ان سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اور نوجوانوں نسل ان سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ آپ کی یہ عظیم خدمت اسلامی تاریخ کا گراں قدر سرمایہ ہے۔

علامہ محمد البشیر الابراہیمی | علامہ محمد البشیر الابراہیمی الجزائر کے نامور عالم دین اور نڈر مجاہد تھے۔ ۱۹۵۳ء میں جب مولانا مودودی کو سزائے موت سنائی گئی تو عالم اسلام میں اس پر شدید احتجاج ہوا۔ اس موقع پر علامہ ابراہیمی نے پاکستان کے اس وقت کے گورنر جنرل کو جو احتجاجی تار بھیجا اس میں کہا گیا تھا کہ "مولانا مودودی کو سزائے موت دے کر تم ایک شخص کو ختم نہیں کرو گے بلکہ اسلام کی تلواروں میں سے ایک تلوار کو توڑ دو گے۔ اسلام کی ایک گرجدار آواز کو دبا دو گے۔ اسلام کے ایک روشن باب کا خاتمہ کر دو گے۔ اس سے اعدائے اسلام کے سوا کسی کو خوشی نہ ہوگی۔"

بیگم مودودی

مولانا کی اہلیہ محترمہ نے اپنے شریک حیات کی وفات کی خبر کو بڑے تحمل اور صبر کے ساتھ سنا جو خواتین بفیلو میں رہنے والے مسلمان گھرانوں سے آئیں انکو خود تسلی دی۔ تعزیت کرنے والی خواتین کو قرآن کی آیات اور احادیث پڑھ کر سنائیں۔ مولانا کی وفات سے ایک گھنٹہ قبل اہلیہ محترمہ نے ہسپتال میں مولانا کے پاس بیٹھ کر سورۃ یاسین، سورۃ اخلاص وغیرہ کی تلاوت کی اور مولانا کو اللہ تعالیٰ کی امان میں دے کر گزارش۔

آہ! یہ دعوت نامہ

لاہور ۲۴ ستمبر (نمائندہ جسارت) آج جب لاہور میں مولانا مودودی کے جسد خاکی کا انتظار ہو رہا تھا اور متعلقین کے استقبال کی آخری شکل دی جا رہی تھی۔ اسی دوران آج صبح مولانا مودودی کے نام رابطہ عالم اسلامی کا ایک خط موصول ہوا جس میں مولانا مودودی سے رابطہ کے ایک پروگرام میں شرکت کی استدعا کی گئی ہے جب یہ خط پڑھا گیا تو

قارئین اور حاضرین

زار و قطار رونے لگے!

سینے کے داغوں میں ایک اور اضافہ

• مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب

۲۴ ستمبر کو مسلم مجلس مشاورت کے کل ہند اجتماع میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رح کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا۔

حضرات مجھے بہت دشوار اور ناخوشگوار فریضہ انجام دینا ہے لیکن بہرحال ایسے فریضے بڑے لوگوں کے سلسلے میں انجام دینا ہی ہوتے ہیں۔ میں اس معاملہ میں بڑا بدقسمت ہوں کہ مجھے اس فریضہ کو انجام دینے اور آنسو بہانے کے بہت موقعے ملے۔ تقریر سے زیادہ تحریر میں۔ اس سانحہ پر مجھے علامہ اقبال رح کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

میں کہ میری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ

میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

میں نے ایک کتاب "پرانے چراغ" کے عنوان سے لکھی ہے اور اس میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جن سے میں نے بلاواسطہ یا بالواسطہ فیض اٹھایا ہے۔ اب اسی کتاب کو میں نے "سینے کے داغ" کے عنوان سے مرتب کیا ہے اور جسے میں پورا کر کے ابھی ابھی فارغ ہوا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان سینے کے داغوں میں ایک اور اضافہ ہوگا۔ یہ سینے کا داغ ہے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا انتقال لیکن مولانا مرحوم اسلام کے ایک چراغ تھے۔ مجھ پر اس سانحہ کا بڑا اثر ہے۔ مجھے آج وہ وقت اور کیفیت یاد آتی ہے جب مئی ۱۹۵۳ء میں رائے بریلی میں ایک تقریب میں جا رہا تھا تو کسی نے انگریزی اخبار کے حوالے سے خبر سنائی کہ پاکستان کی فوجی عدالت نے مولانا مودودی کو سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا۔

ہے۔ مجھ پر اس واقعہ سے اتنا اثر ہوا کہ دل پر اتنی چوٹ لگی کہ میں اس تقریب میں نہ بیٹھ سکا۔ وہ وقت اور کیفیت آج بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے انھیں اس وقت بچالیا۔ اس سانحہ کے بارے میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ برصغیر کا حادثہ نہیں ہے بلکہ عالم اسلام کا حادثہ ہے مجھے باہر جانے کے اکثر مواقع ملتے رہتے ہیں مجھے آپ حضرات سے زیادہ معلوم ہے کہ عالم اسلام اور خاص طور پر نوجوانوں پر مولانا نے کتنا گہرا اثر ڈالا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن سے اور کام لے گا۔ مولانا نے پردہ اور حقوق الزوجین جیسی معرکۃ الآرا کتابیں لکھی ہیں۔ میں آپ کے سامنے کھلے دل سے شہادت دیتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ کے بعد شاید کسی نے بھی جدید ذہن پر اتنا گہرا اثر نہیں ڈالا جتنا کہ مولانا مودودی۔ نے اثر ڈالا۔ فیصل ایوارڈ بھی انھیں ملا۔ اگرچہ فیصل ایوارڈ کو میں بہت بڑی چیز نہیں سمجھتا۔ مولانا نے جدید نسل کے ذہن اور دل میں یہ اعتماد پیدا کیا کہ اسلام ایک عقلی دین ہے اور دور حاضر کے مسائل حل کر سکتا ہے۔ جن لوگوں نے نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کا اعتماد بحال کیا ان میں جمال الدین افغانی، رشید رضا مصری صاحب، مولانا آزاد، علامہ اقبالؒ اور حسن بنا شہید کے ساتھ ساتھ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ بھی ہیں۔ ان کے اندر دو خوبیاں تھیں۔

۱۔ انھوں نے جدید نسل کو اسلام کے آستانے پر لاکر ڈال دیا۔

۲۔ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو پہچانا اور نشانہ پر لگا دیا۔ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو نیلام نہیں چڑھایا انھوں نے علم فروشی نہیں کی۔ ادب فروشی نہیں کی۔ یہ حادثہ ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔ ایسے شخص کا اُٹھ جانا اور ایسے قلم کا فیض بند ہو جانا بہت بڑا خسارہ ہے۔ یہ حادثہ ایسا ہے کہ ہم سب کو متاثر ہونا ہی چاہیے۔

● **سلامت علی مہدی** ۔ اخبار بنیاد دہلی میں اس طرح رقمطراز ہیں۔

امریکہ کے شہر بفلو سے جو نیویارک کے نزدیک ہے یہ خبر آئی کہ مولانا مودودی کا انتقال ہو گیا۔ یہ خبر ضیاء الحق کے اعصاب پر یہ خبر بجلی بن کر گری اور ان کو دن میں تارے نظر آنے لگے کیونکہ ان کو

پوری امید تھی کہ جب بھی ان پر کوئی بُرا وقت پڑے گا مولانا مودودی ان کا ساتھ دیں گے۔ جنرل ذ
مرحوم مولانا مودودی کے بہت قریب تھے اور ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ خبروں کے مطابق
موت سے قبل مولانا مودودی نے اپنی نجی محفلوں میں جنرل ضیاء الحق پر سخت تنقید کی تھی اور ان کے
حاکمانہ انداز پر اپنی سخت ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ جنرل ضیاء الحق اکثر مولانا مودودی سے ملنے جایا کرتے
تھے اور مرحوم بھٹو بھی اپنے دورِ اقتدار میں وقتاً فوقتاً مولانا مودودی مرحوم سے ملاقات کرنا اپنا فرض
سمجھتے تھے۔

• پروفیسر عبد المغنی۔ نوائے وقت ۲۳ ستمبر ۱۹۷۹ء

پچھلے دنوں غیر منقسم ہندوستان کی جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کو دورِ حاضر
میں اسلام کی خدمت کے لئے جو شاہ فیصل ایوارڈ دیا گیا وہ بیسویں صدی کے اس عظیم ترین مفکرِ اسلام
کی بے مثل دینی بصیرت و علمیت اور ان کے عظیم الشان تاریخی کارنامے کا ایک معمولی سا
اعتراف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا مودودی نے دین کی جو تعبیر پیش کی ہے وہ ایک
طرف تو بالکل قرآن و حدیث کے مسلّمہ معیار پر پوری اترنے والی اور سلف صالحین کے معروف
مسلک کے عین مطابق ہے۔ جب کہ دوسری طرف اسلام کو ایک کلی نظریۂ حیات اور جامع
زندگی کی حیثیت سے دورِ جدید کے تمام فکری تقاضوں کا بہترین جواب اور عملی مسئلوں کا واحد
حل ثابت کرتی ہے۔ مولانا مودودی کی اس دینی تعبیر کو اتنا قبولِ عام حاصل ہو چکا ہے کہ ان کی
بیشتر تصنیفات دنیا کی اکثر زبانوں میں ترجمہ کی جا چکی ہیں اور ہاتھوں ہاتھ لی جا رہی ہیں اور
آج جو مسلمان بھی اسلام کے متعلق اظہارِ خیال کرتا ہے وہ انہی اصطلاحوں اور محاوروں میں گفتگو
کرتا ہے جو مولانا مودودی نے دین کی تفہیم کے لئے استعمال کئے ہیں۔

• عوام۔ دہلی۔

نئی دہلی۔ نمائندہ عوام) ریڈیو پاکستان کی ایک اطلاع کے مطابق ۲۲ ستمبر کو صبح سات اور آٹھ

ے درمیان انتقال ہوگیا (انا للہ وانا الیہ راجعون) مولانا مودودی کے معدے میں دو آپریشن کئے گئے تھے۔
رگوان پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے حالت سدھرنے لگی۔ ا۲ اور ۲۲ ستمبر کی درمیانی
بں ان کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ وہ اپنے صاحبزادے ڈاکٹر فاروق مودودی کی نگرانی میں گذشتہ
ن ماہ سے امریکہ میں زیر علاج تھے۔ مولانا مرحوم کی عمر ۷۶ سال تھی۔

مولانا مودودی مرحوم شائستگی اور سلیقہ میں مرحوم دہلی اور حیدرآباد دکن کی تہذیب وثقافت کی ایک
بتالی حسین وجمیل اور نادر روزگار یادگار تھے۔ وہ جماعت اسلامی کے بانی تھے اور ایک مصنف کی حیثیت
ے دنیا بھر میں مشہور ومعروف تھے۔ ان کی بے شمار کتابوں کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا
.. وہ بڑی سیر چشمی کے ساتھ اہل پاکستان کی بے لوث خدمت کرتے رہے۔ دنیا کے نقشے پر ابھرنے
ے اس ملک کی سیاسی قیادت میں بھی انھیں ممتاز مقام حاصل رہا۔

مولانا مودودی مرحوم ۱۹۰۳ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۴۷ء میں ہجرت کرکے
پہلے گئے تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کی جو تفسیر لکھی وہ ترجمان القرآن کے نام سے نہ صرف مسلم ممالک
نیا کے دوسرے ممالک کے علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اسلامی ادب کے سلسلے میں پہلا
ں ایوارڈ مولانا مودودی مرحوم ہی کو دیا گیا تھا۔ مولانا مرحوم کا دہلی سے بھی گہرا تعلق رہا، وہ اخبار
معتہ کے ابتدائی دور میں چیف ایڈیٹر رہے۔ جبکہ مولانا محمد عثمان فارقلیط اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔

۲۳ ستمبر کی رات کو جامع مسجد میں مولانا مودودی مرحوم کے جنازے کی نماز غائبانہ ادا کی گئی جس میں ہزاروں
ں نے شرکت کی۔ مولانا مرحوم کی میت ہوائی جہاز کے ذریعہ منگل کے دن پاکستان لائی گئی۔ جنرل ضیاء
صوبوں کے گورنروں، جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد اور پاکستان کے دیگر لوگوں نے ڈاکٹر
مودودی کو تعزیتی پیغامات بھیجے۔ ہند کی کئی ممتاز شخصیتوں نے بھی اپنے پیغامات میں مولانا مودودی
کے پسماندگان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا ہے۔

ا کا نام تفہیم القرآن ہے۔ (م)

حاصل مطالعہ

اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے

میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے مسلمانوں کو حریت کی فضا کی ضرورت ہے اور یہ قرآن جس طرح نزول کے وقت صحیح تھا آج بھی صحیح ہے اور قیامت تک صحیح رہے گا۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر (الحج)

(ترجمہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں۔

آپ خیال کیجئے کہ معروف و منکر کے لئے قرآن مجید اور حدیث میں امر و نہی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ استدعا اور درخواست کے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے ہیں۔ عربی زبان ایسی تنگ زبان نہیں ہے کہ اس کے صرف امر و نہی کے الفاظ ہوں اور دوسرے الفاظ نہ ہوں جن میں تواضع ہے خوشامد ہے۔ جن میں استدعا ہے جن میں مطالبہ ہے۔ بلکہ اس کے لئے جہاں کہیں بھی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ امر و نہی کے ہیں۔ تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔ اور امر و نہی طاقت چاہتے ہیں۔ امر و نہی وہ مقام چاہتے ہیں جہاں سے ہم اعتماد کے ساتھ اور جرأت کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ یہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ امر و نہی درخواست کے معنی میں نہیں۔ امر و نہی یعنی حکم دینا اور روکنا اس کے لئے آدمی کے اندر قوت چاہئے۔ ایسا مقام اور ایسی بلندی چاہئے۔ ایسا اعتماد چاہئے اور اس کی ایسی قوت ہو دلوں میں کہ وہ امر کر سکے اور نہی کر سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو قوت کی ضرورت ہے

اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے کہ ہمیشہ وہ یہی نہ کہے کہ اگر ایسا کر لیا جاتا تو اچھا تھا ہماری درخواست ہے اور ہم آپ کو ترغیب دیتے ہیں۔ ہم تبلیغ کرتے ہیں۔ اپنی جگہ یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن قرآن جو معیار و میزان ہے۔ اس میں لفظ امر و نہی کے ہیں جن میں مسلمانوں کو وہ طاقت حاصل کرنی چاہئے کہ جس مقام پر زمانہ سجھے کو وہ حکم دے سکیں اور روک سکیں اس لئے کہ فطرت انسانی تعریف تو کر دیتی ہے اور وہ خوش بھی ہو جاتی ہے لیکن انسانی نسل کی پوری اصلاح اس کے بغیر نہیں ہو سکتی جس کے نتیجہ میں اقیموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ امر بالمعروف نہی عن المنکر کے الفاظ آتے ہیں۔

ماخوذ از ایک تقریر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جو موصوف نے ۱۰ر جولائی ۱۹۷۸ء کو اسلام آباد (پاکستان) میں اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے منعقد شدہ ایک اجتماع میں ارشاد فرمایا۔

(از مجلہ الحق ماہنامہ پاکستان اشاعت مئی ۱۹۷۹ء۔ مرسلہ مولانا حکیم مختار احمد صاحب بھدوہی)

اپنا نمبر خریداری تلاش کیجئے

نیچے دسمبر ۱۹۷۹ء کے حجاب کے ساتھ ختم ہونے والے خریداروں کے نمبر خریداری درج ہیں اس میں اپنا نمبر خریداری تلاش کریں۔

2311	2247	2194	2175	1991	1751	1605	1513	1263	954	200
2278/a	2248	2213	2176	2069	1756	1609	1515	1272	968	417
2238/b	2251	2238	2179	2169	1775	1609	1524	1312	972	589
2178/b	2252	2240	2181	2170	1784	1609	1592	1407	979	727
	2267	2244	2189	2171	1785	1679	1594	1412	1053	775
	2272	2245	2192	2172	1977	1738	1603	1511	1256	945

[illegible] دسمبر

تعزیت کا نیا انداز

بیگم ڈاکٹر حسام الدین سندھری

لیڈر کی موت ہوتی ہے قوموں کی زندگی

ساتھ مکان پر کال بیل (Call Bell) بجی میں دروازے پر گئی جہاں ناظم طلبہ سید محمود صاحب موجود تھے۔ یہ خبر دی کہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب رحلت فرما گئے۔ شاید یہ الم ناک دردناک حیرت ناک خبر سننے کے لئے پہلے سے اپنے آپ کو تیار کر رکھی تھی۔ اس خبر کے بعد محمود صاحب نے کیا کہا معلوم نہ ہو سکا باورچی خانہ سے چائے لے کر اپنے شوہر ڈاکٹر سید حسام الدین صاحب کے پاس گئی تو وہ باہر جانے کے لئے کپڑے بدل رہے تھے۔ جوں ہی اُن پر نظر پڑی وہ مجھے نیم تصویر نظر آنے لگے۔ وہ مولانا کے اتنے مداح تھے دنیا کے زندوں میں کسی سے محبت تھی کسی سے دلچسپی تھی کسی کی تعریف کسی کا ذکر ہوتا تھا تو وہ مولانا مودودی پر ختم۔ ان کے لٹریچر اور ان کے نظریہ کے قائل، ان کے طریقۂ کار پر مائل، ان کی تحریک میں شامل تھے کس کی سیاسی بصیرت پر ناز تھا، کس کے علم کو فوقیت حاصل تھی۔ کس سے کچھ حاصل کیا تھا۔ کس کے قلم کے زور سے وہ انسان بے شعوری مسلمان ہوئے تھے وہ مولانا مودودی تھے۔ آج جس شخصیت سے انھیں عشق تھا آج وہ مرحوم ہوئے وہ اپنے سفید کپڑوں میں ملبوس کفن پہنے ہوئے نظر آنے لگے۔

یہ خبر انھیں میں کس طرح کس زبان سے کس منہ سے کن الفاظ میں سناؤں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ہونٹ کانپ رہے تھے۔ چہرہ متغیر تھا۔ ہاتھ تھرتھرا رہے تھے۔ میری کیفیت کو دیکھ کر انھوں نے کہا۔ کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟ یہ کیسی عجیب سی صورت بنا رکھی ہے۔ ابھی وہ کچھ کہنے ہی والے تھے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے یک لخت میں نے کہا مولانا مودودی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ یہ سننا تھا کہ تھوڑی دیر

خاموش رہے ایک لمبی سانس لی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ اور حسبنا اللہ ونعم الوکیل جیسے ایمان پرور کلمات ٹھنڈی سانس کے ساتھ جاری ہوئے۔ اس کے بعد ان کا چہرہ تمتما اٹھا وہ ہشاش بشاش نظر آنے لگے جیسے ساری خوشیاں اُن کے دامن میں سمیٹ دی گئی ہوں۔ غیر متوقع کیفیت کو دیکھ کر میرا غم بھی ہلکا ہوا۔ شاید یہ میرا پہلا موقع تھا۔ انھوں نے کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

مرنا تو برحق ہے عزیز کی موت پر ہر شخص نے جذبات کا مظاہرہ کیا حضرت ابوبکر نے اُن کے بیان کو حقیقت کی طرف اشارہ کرتے کیا۔ جس شخص نے کسی کی موت پر اپنے رفتار کی مزاج بنایا ہو۔ کیا اسی کی موت پر ہم غم زدہ ہوں؟ اس مجاہد اسلام کو آج فرصت ملی۔ آج وہ اللہ کے دامن رحمت میں سکون کی نیند سو رہے ہیں۔ کیا کوئی شخص اپنے محبوب سے ملنے کی تمنا کرتے ہوئے اپنے حقیقی مالک سے ملے تو اس سے بڑی خوشی کیا ہو سکتی ہے۔ ان کی آرزو و تمنا کا یہی تقاضا تھا۔ وہ اپنے آقا کی طرح جلدی کر آخری لمحہ تک اُسی کے دین کی خدمت کرتے رہے جیسا کہ مولانا کی آرزو بھی جس کا اظہار انھوں نے زندگی میں بار بار کیا ہے۔ یہ موقع خوشی کا ہے۔ رنج کا نہیں۔ یہ موقع اُن کی دینی خدمات پیہم جدوجہد اور استقامت کے دیکھنے کا ہے۔ اُن کے پیش کردہ پیغام کو جاننے اور ماننے ان کی روشن کردہ شمع جو رہتی دنیا تک ایک روشن مینار بن کر راہ حق کے مسافر کے لیے وہ نقوش دیتی ہے جن پر چل کر ہی ہم کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے جو نصب العین دیا۔ اسی نصب العین میں اللہ کی رضا و آخرت کی فلاح مضمر ہے۔ آج ہمیں اسی نصب العین کو اپنانا ہے۔ اسی نصب العین کی خاطر جینے اور مرنے کا عزم و ارادہ کرنا ہے۔ وہ جس جوش و جذبہ کے ساتھ کہے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کہ کوئی آبشار بڑی اونچی چٹان پر سے گرتے ہوئے اپنے وجود کو کھو کر ایک ایک قطرہ کو موتی بنا بنا کر اپنے نئے وجود کے لئے نیچے گرا رہا ہے۔

پھر نئے وجود کے ساتھ بل کھاتا ہوا مستحکم و منظم ہو کر انگڑائی لیتے ہوئے تیزی سے

تعزیت کا نیا انداز

بیگم ڈاکٹر حسام الدین سندھوی

لیڈر کی موت ہوتی ہے قوموں کی زندگی

تے مکان پر کال بیل (Call Bell) بجی میں دروازے پر گئی جہاں ناظم طبیہ سید محمود صاحب موجود تھے۔ یہ خبر دی کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب رحلت فرما گئے۔ شاید یہ المناک دردناک حیرت ناک خبر سننے کے لئے پہلے سے اپنے آپ کو تیار کر رکھی تھی۔ اس خبر کے بعد محمود صاحب نے کیا کہا معلوم نہ ہو سکا اور میں باورچی خانہ سے چائے لے کر اپنے شوہر ڈاکٹر سید حسام الدین صاحب کے پاس گئی تو وہ باہر جانے کے لئے کپڑے بدل رہے تھے۔ جوں ہی ان پر نظر پڑی وہ مجھے یتیم نظر آنے لگے۔ وہ مولانا کے اتنے مداح تھے کہ دنیا کے زندوں میں کسی سے محبت تھی کسی سے لگاؤ تھا کسی کی تعریف کسی کا ذکر ہوتا تھا تو وہ بس مولانا مودودی ہی تھے۔ ان کے لٹریچر اور ان کے نظریہ کے قائل، ان کے طریقہ کار پر مائل، ان کی تحریک میں شامل تھے کس کی سیاسی بصیرت پر ناز تھا، کس کے علم کو فوقیت حاصل تھی۔ کس سے کچھ حاصل کیا تھا۔ کس کے قلم کے ذریعے وہ انسان سے شعوری مسلمان ہوئے تھے وہ مولانا مودودیؒ تھے۔ آج جس شخصیت سے انہیں عشق تھا آج وہ مرحوم ہوئے وہ اپنے سفید کپڑوں میں ملبوس کفن پہنے ہوئے نظر آنے لگے۔

یہ خبر انہیں میں کس طرح کس زبان سے کس منہ سے کن الفاظ میں سناؤں سمجھ میں نہیں آرہا تھا ہونٹ کانپ رہے تھے۔ چہرہ متغیر تھا۔ ہاتھ تھرتھرا رہے تھے۔ میری کیفیت کو دیکھ کر انہوں نے کہا، کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟ یہ بجھی بجھی سی صورت کیوں ہے؟ ابھی وہ کچھ کہنے ہی والے تھے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے یک لخت میں نے کہا مولانا صاحب کا انتقال ہو گیا۔ یہ سننا تھا کہ تھوڑی دیر

خاموش رہے ایک لمبی سانس لی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ اور حسبنا اللہ ونعم الوکیل جیسے ایمان پرور کلمات ٹھنڈی سانس کے ساتھ جاری ہوئے۔ اس کے بعد ان کا چہرہ تمتما اٹھا وہ ہشاش بشاش نظر آنے لگے جیسے ساری خوشیاں اُن کے دامن میں سمیٹ آئی ہو۔ غیر متوقع کیفیت کو دیکھ کر میرا غم بھی ہلکا ہوا۔ شاید یہ میرا پہلا موقع تھا۔ انھوں نے کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

مرنا تو برحق ہے حضور کی موت پر عمرؓ نے جس جذبات کا مظاہرہ کیا حضرت ابوبکرؓ نے اُن کے جذبہ ایمانی کو حقیقت کی طرف اشارہ کر کے ٹھنڈا کیا۔ جس شخص نے کسی کی موت پر اپنے رفقار کا اسلامی مزاج بنایا ہو۔ کیا اسی کی موت پر ہم فریاد کریں۔ اس مجاہد اسلام کو آج فرصت ملی۔ آج وہ اپنے مولا کے دامن رحمت میں سکون کی نیند سو گیا ہے۔ کیا کوئی شخص اپنے محبوب سے ملنے کی خواہش و تمنا کھتے ہوئے اپنے حقیقی مالک سے جا ملے تو اس سے بڑی خوشی کیا ہوسکتی ہے یہ تو مرحوم کی آرزو و تمنا کا یوم تھا۔ وہ اپنے آقا سے اس طرح جا ملے کہ آخری لمحہ تک اُسی کے دین کی خدمت کرتے رہے جیسا کہ مولانا کی آرزو تھی جس کا اظہار انھوں نے زندگی میں بار بار کیا ہے یہ موقع خوشی کا ہے۔ رنج کا نہیں۔ یہ موقع اُن کی بیکراں خدمات پیہم جد وجہد اور استقامت کے دیکھنے کا کا ہے۔ اُن کے پیش کردہ پیغام کو جاننے اور ماننے ان کی روشن کردہ شمع جو رہتی دنیا تک ایک روشن مینار بن کر راہ حق کے مسافر کے لیے وہ نقوش دیتی ہے جس پر چل کر ہی ہم کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوسکتے ہیں۔ انھوں نے جو نصب العین دیا۔ اسی نصب العین میں اللہ کی رضا و آخرت کی فلاح مضمر ہے۔ آج ہمیں اس نصب العین کو اپنانا ہے۔ اسی نصب العین کی خاطر جینے اور مرنے کا عزم و ارادہ کرنا ہے۔ وہ جس جوش و جذبہ کے ساتھ کہے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کہ کوئی آبشار بڑی اونچی چٹان پر سے گرتے ہوئے اپنے وجود کو کھو کر ایک ایک قطرہ کو موتی بنا بنا کر اپنے نئے وجود کے لئے نیچے گرا رہا ہے۔

پھر نئے وجود کے ساتھ بل کھاتا ہوا مستحکم و منظم ہو کر انگڑائی لیتے ہوئے تیزی سے

چل دیے۔

پھر فرمایا شہید کی موت اصل میں قوم کی حیات ہے۔ یہ کہتے ہوئے محمد علی جوہر کا وہ شعر

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد

ہے ابتداء ہماری تیری انتہاء کے بعد

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

گنگناتے ہوئے تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گئے۔ یوں ایک تاریخ ساز انجمن ساز کردار ساز شخصیت میں ڈوب گئی۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین۔

اقبال اور سوشلزم

از جسٹس ایس اے رحمان (ریٹائرڈ چیف جسٹس آف پاکستان)

علامہ اقبال محض ایک شاعر نہ تھے بلکہ وہ ایک گہرے فکر کے حامل مفکر بھی تھے ان کے پاس اسلام کا ایک زندہ پیغام تھا جس پر وہ پورا بھروسہ رکھتے تھے علامہ کی شخصیت نہایت جامع تھی۔ انہوں نے انسانی و ملی مسائل کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اور عصرِ حاضر کی تحریکوں کا بھی مطالعہ کیا پھر اپنے غور و فکر کے نتائج غیر مبہم انداز میں پیش کیے۔ پھر بھی بعض حلقوں کی طرف سے علامہ کے خیالات کو غلط انداز میں پیش کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔ اپنی کتاب "اقبال اور سوشلزم" میں لائق مصنف نے موضوع سے متعلق تمام ضروری پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ اس کتاب میں سوشلزم کے سیاسی نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے اور پھر علامہ کی نثری تحریروں اور ان کی شعری تخلیقات کی روشنی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اس سلسلے میں فی الواقع علامہ کا موقف کیا ہے۔ وہ معاشرہ کی کس طرح تشکیل چاہتے ہیں اور دنیا کو وہ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ کتاب فکری و علمی ہونے کے باوجود نہایت دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کسی قیمتی دستاویز سے کم نہیں۔

آفسٹ کی عمدہ طباعت ★ سفید کاغذ ★ سائز $\frac{22\times 33}{16}$

قیمت صرف ۶ روپے (محصول ڈاک علاوہ)

چالیس حدیث

از امام نووی

چالیس حدیث دراصل مستند احادیث کا وہ قیمتی انتخاب ہے جو ساتویں صدی ہجری کے مشہور و معروف محدث امام نوویؒ نے مرتب کیا۔ علماء نے مختلف انداز میں چہل حدیث مرتب کی ہے۔ بعض نے اصولِ دین کو پیشِ نظر رکھا اور بعض نے فروع کو۔ بعض نے جہاد سے متعلق احادیث اپنے سامنے رکھیں تو بعض نے آداب و اخلاق سے متعلق احادیث کو اہمیت دی ہے۔ امام نوویؒ کا انتخاب اس لحاظ سے نہایت جامع ہے کہ اس میں دین کے مختلف شعبوں سے متعلق احادیث آ گئی ہیں۔ احادیث ... علیہ وسلم ... مصنف کی کتاب ریاض الصالحین ... ان کی علمی عظمت کی روشن دلیل ہے۔ امید ہے ... یہ جامع انتخاب بھی آپ پسند کریں گے اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ اس کتاب میں احادیث کے ترجمہ کی زبان بھی آسان رکھی گئی ہے تاکہ اس سے ہر عام و خاص شخص فائدہ اٹھا سکے۔ عربی کے علاوہ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔ غرض سے اردو ترجمہ کے ساتھ انگریزی ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

عمدہ کتابت ★ آفسٹ کی پاکیزہ معیاری طباعت

سائز $\frac{22\times 33}{16}$ ★ سفید کاغذ ★ قیمت صرف ۸ روپے (علاوہ محصول)

(دونوں کتابیں مکتبہ حماد سے طلب فرمائیں)

(محمد ابراہیم بھیونڈی)

پندرھویں صدی میں

محمد ابراہیم صاحب نے ایک طویل مضمون عنایت فرمایا ہے اس کا آخری حصہ آج دیا جا رہا ہے (م)

تحریک اسلامی کے مخلص اور جانباز خادموں کی مسلسل سعی بالآخر خدا کے فضل و کرم سے کامیاب ہوکر رہی۔ آج اسلام کا غلبہ دنیا پر چھا رہا ہے۔ پاکستان اور ایران میں اسلامی قوانین نافذ کئے جا رہے ہیں۔ افغانستان میں بھی انشاء اللہ فتح اسلام کی ہوگی۔ غیر مسلم ممالک جو مختلف ازموں کو آزما کر ناکام ہو چکے ہیں۔ اسلام کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ وہ بھی آخر کار اسلام کو آزمائیں گے۔ انشاء اللہ پندرھویں صدی ہجری اسلام کی سربلندی کی صدی ہوگی۔ آج اس کے آثار ہمیں سپیدہ سحر کی طرح صاف نظر آرہے ہیں اور یہ نشانیاں اسلام دشمن عناصر کو بوکھلا ہوئے ہیں۔ یہ لب مرگ قوتیں کھسیا کھسیا کر پنجے مار رہی ہیں اور اسلام کی چٹانوں میں شگاف ڈالنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ انھیں پہچاننے کی ضرورت ہے۔ یہ طرح طرح کے روپ میں اپنی سازشیں عمل میں لا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ترقی پسندی کا پرچم ہوتا ہے۔ زبان پر سوشلزم کا نعرہ اور ذہن میں وطن پرستی کی عصبیت۔

اسلام کے پیرو انھیں سب سے زیادہ کمزور ہندوستان میں ہی نظر آرہے ہیں۔ لہٰذا انھیں ہمارے درمیان پھوٹ ڈالنے اور آپس میں لڑانے کے مواقع آسانی سے مل جاتے ہیں۔

صد حیف! کہ پچھلے دنوں ہمیں اس قدر ذلت میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ ہم نے اپنے صالحین پر ہی ہاتھ اٹھا دیا۔ ہم نے اپنے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپاہیوں کی مقدس داڑھیوں پر ہاتھ ڈال دیا۔ ہم نے اپنے ذلیل ہاتھوں سے قرآن پاک اور احادیث

شریعت کی عظیم کتابیں جلا دیں۔ ہمارا کشمیر پہلا
اس کے علاوہ بھی اگر آپ غور کریں تو ملوث
دوسرے میدانوں میں بھی کی جا رہی ہے ہمارے تعلیمی
اداروں پر نظر ڈالیے۔ علی گڑھ سے بمبئی تک۔
یونیورسٹی ہوں کالج ہوں یا پولی ٹیکنک۔ جہاں
جہاں وائس چانسلر یا پرنسپل حضرات نے اسلام
سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا وہاں اخبار
کے تیر چلنے لگے اور سازشیں پنپنے لگیں کبھی ٹیچروں
کو ورغلایا گیا کبھی طلباء کو آلۂ کار بنایا۔ یہی نہیں
بلکہ حکومتوں کو ان عظیم المرتبت تعلیمی اداروں کے
خلاف جھوٹی شکایتیں کی جانے لگیں۔ ان سے
ہمیں ہمہ وقت چوکنا رہنا چاہیے کیونکہ یہ لڑنے
والے لوگ نہیں ہیں۔ یہ صرف شب خون میں یقین
رکھتے ہیں۔ کیونکہ مسلمان کی جانبازی سے یہ
بخوبی واقف ہیں۔ مسلمان اپنی بے سروسامانی
کے باوجود سپاہی، دلیر اور جانباز ہے۔ مسلمان کی
ایک کمزور لڑکی، ایک ننھا جوان اسلام کے لئے
ذرا سے اشتعال پر جان قربان کرنے کے لئے
تیار رہتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ یہ قوم زندگی سے زیادہ موت سے
پیار کرنے کی وجہ سے ہی زندہ ہے۔

اپنے تاق سے باطل پرست گروہ نہتا
مسلمانوں پر ایک شب خون مارنے میں کامیاب ہو گیا
ہے لیکن آئندہ انشاء اللہ ہم غافل نہیں رہیں گے
کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آج جو وار انھوں نے
جماعت اسلامی پر کیا ہے۔ کل وہ وار ہماری
دوسری تنظیموں پر بھی ہو سکتا ہے۔ ہم جب جب
اس قول آقاؐ سے غافل ہوئے ہیں کہ تمام مسلمان
ایک جسدِ انسانی کی طرح ہیں کسی بھی حصہ پر
چوٹ لگے اور سارا جسم تلملا اٹھے تو تب تب
انھوں نے ہمیں ریوڑ سے بچھڑی ہوئی بھیڑ سمجھ
ذبح کرنا چاہا۔

اسلام مسلمانوں کے پاس خدا کی جاگیر نہیں
بلکہ اس کی امانت ہے۔ اور ہمارا فرض ہے کہ یہ
امانت دنیا کے ہر انسان تک پہنچانے کی کوشش
کریں اور یہ فرض جو بھی انجام دے رہا ہو اس کی تقویت
اور حفاظت ہمارے لئے لازم ہے۔ جان دیکر
بھی، مال لٹا کر بھی اور اپنے بیٹوں کے سر کٹا کر
بھی۔ کیوں کہ یہ سب اللہ کی امانت ہے اور
اسی کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے ہے۔

اسلام میں سوگ کی حیثیت

سعودی عرب بلکہ عالم اسلام کے ممتاز حق پسند اور حق گو عالم اور دار الافتاء کے سربراہ شیخ عبدالعزیز بن باز نے سربراہوں کی موت پر سوگ منانے کے مسئلے پر جو رائے دی ہے اُسے عام استفادے کے لئے شائع کیا جا رہا ہے۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد انھوں نے لکھا ہے:

عصر حاضر میں ممالکِ اسلامیہ میں یہ رواج چل پڑا ہے کہ بادشاہوں اور لیڈروں کی وفات پر تین یا اس سے زیادہ دنوں کے لئے سوگ منانے کا اعلان کیا جاتا ہے دفاتر بند اور جھنڈے سرنگوں کر دئے جاتے ہیں۔ یہ عمل شریعتِ محمدیہ کے بالکل خلاف اور دشمنانِ اسلام کے ساتھ مشابہت ہے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں بیوی کے علاوہ دوسروں کے لئے کسی کی موت پر غم منانا ممنوع ثابت ہے بیوی کے لئے اپنے شوہر کی وفات پر چار ماہ اور دس دن تک سوگ منانا جائز ہے اس طرح اللہ کے رسول نے صرف عورت کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنے کسی رشتہ دار کی وفات پر تین دن یا اس سے کم مدت کے لئے سوگ منائے۔ ان دو حالتوں کے علاوہ سوگ منانے کی کوئی بھی صورت شرعی طور پر جائز نہیں۔ اسلامی شریعت میں کسی بادشاہ لیڈر یا کسی اور ہستی کی موت پر سوگ منانا جائز نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ان کے بیٹے ابراہیم، تین بیٹیاں اور دوسری کئی عزیز ہستیاں اللہ کو پیاری ہوئیں لیکن آپ نے ان کا سوگ نہیں منایا۔ غزوۂ موتہ میں اسلامی فوج کے تین قائدین زید بن حارث جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ کو

پچے بعد دیگرے شہادت نصیب ہوئی۔ اور آپ نے ان کا سوگ نہ منایا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا جو اشرف المخلوقات تمام نبیوں میں افضل اور اولادِ آدم کے سردار تھے۔ ان کی وفات پوری انسانیت کے لئے مصیبتِ عظمیٰ تھی۔ لیکن صحابہ کرام نے آپ کا بھی سوگ نہ منایا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا جو سب سے افضل صحابی اور انبیاء کے بعد سب سے زیادہ لائقِ احترام تھے۔ لیکن ان کا بھی سوگ نہ منایا گیا۔ حضرت عمر، حضرت عثمان، اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کو شہادت ملی جن کا مقام انبیاء اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد سب سے اونچا تھا لیکن ان کا بھی غم نہیں منایا گیا اسی طرح تمام صحابہ کرام کی وفات ہوئی لیکن تابعین نے ان کا بھی سوگ نہ منایا۔ تابعین کے زمانے میں بڑی بڑی ہستیاں اللہ کو پیاری ہوئیں۔ سعید بن مسیب، علی زین العابدین بن الحسین ان کے بیٹے محمد بن علی، عمر بن عبد العزیز، امام زہری، امام ابو حنیفہ ان کے

دونوں ساتھی (ابو یوسف و محمد) امام مالک انس، اوزاعی، ثوری، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور ان کے علاوہ بہت سے ائمہ اسلام کی وفات ہوئی لیکن مسلمانوں نے ان میں سے کسی کا سوگ نہ منایا۔

اگر یہ کام اچھا ہوتا تو ہمارے اسلاف پیش پیش ہوتے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمام بھلائیاں ان کی اتباع میں اور تمام برائیاں ان کی مخالفت میں ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے اوپر رسولِ پاک کی جو حدیث نقل کی ہے کہ شوہر کے علاوہ کسی دوسرے کا غم منانا درست نہیں اس لئے بادشاہوں اور لیڈروں کی موت کا غم منانا بھی اسلامی شریعت کے بالکل منافی ہے۔ پھر اس میں پوری قوم کا دنیوی نقصان بھی ہوتا ہے کاروبارِ معیشت ٹھپ ہو جاتا ہے۔ دفاتر بند ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ اس میں دشمنانِ اسلام کے ساتھ مشابہت بھی ہوتی ہے۔ اس لئے مسلمان قائدین کا یہ فرض ہے کہ امرِ ممنوع سے ترک اختیار کریں، اور صحابۂ کرام اور ان کے تابعین کے نقشِ قدم پر

اور علمائے کرام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عوام الناس کو اس غلطی سے آگاہ کریں۔

اور میں نے یہ مختصر تحریر اس لئے شائع کی ہے کہ اللہ نے اپنے لئے، اپنی کتاب کے لئے اپنے رسول کے لئے اور مسلمانوں کے سربراہوں اور تمام مسلمانوں کے لئے خیر خواہی کو واجب قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ہمارے قائدین اور تمام مسلمانوں کو اپنی خوشنودی کے کاموں اور شریعت کے قوانین کی پابندی کی توفیق دے اور ہمارے دلوں کی اصلاح کرے۔ وہی دعاؤں کا سننے والا ہے۔ وصلی اللہ علی نبینا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

تعلیم القرآن

(مولانا محمد اویس ندوی مرحوم)

غم منانے کا ادب | وَاِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرہ)

• اور جب ان کو کوئی مصیبت پیش آئے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔

آدمی پر کوئی مصیبت آئے، کسی کا انتقال ہو جائے تو صبر سے کام لینا چاہیے، خدا سے دعا کرنا چاہیے، رنج کی وجہ سے آنسو نکل آئیں تو کوئی حرج نہیں ہے، مگر چیخ چیخ کر رونا، کپڑے پھاڑنا اور اسی قسم کی دوسری باتیں دین کے خلاف ہیں۔

• رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص گریبان پھاڑتا ہے اور گالوں پر تماچے مارتا اور جاہلیت کی طرح چیختا اور چلاتا ہے وہ میری امت میں سے نہیں ہے۔

حضرت جعفرؓ سے حضورؐ کو بڑی محبت تھی، ان کی شہادت کی خبر آئی تو ان کی عورتوں نے نوحہ کرنا شروع کر دیا، آپؐ نے منع کرا بھیجا وہ باز نہ آئیں، دوبارہ روکا پھر نہ مانیں تو آپؐ نے فرمایا کہ ان کے منہ میں خاک۔

جب کسی مسلمان کے گھر میں کوئی موت ہو تو مناسب ہے کہ عزیز دوست، یا محلہ کے لوگ اس کے یہاں کھانا بھیجیں، حضرت جعفرؓ کی شہادت کے موقع پر رسول اللہؐ نے ان کے گھر کھانا بھجوایا تھا اور فرمایا تھا کہ ان کے گھر کے لوگوں کو آج کھانا پکانے کا موقع نہ ملے گا۔ (البقرہ بلاغ ملت)

مولانا مودودیؒ

علماء اور دانشوروں کی نظر میں

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی دینی خدمات اور علمی کارناموں کے بارے میں مختلف اوقات پر علمائے کرام اور مفکرین نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کے اقتباسات ذیل میں دئے جارہے ہیں

علامہ اقبالؒ | مولانا نے کبھی معذرت خواہانہ لہجہ اختیار نہیں کیا۔

حیدرآباد سے ایک بڑا اچھا رسالہ "ترجمان القرآن" نکل رہا ہے۔ مودودی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں۔ میں نے اُن کے مضامین پڑھے ہیں۔ دین کے ساتھ مسائل حاضرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب "الجہاد فی الاسلام" مجھے بہت پسند آئی ہے۔ آپ کیوں نہ انھیں دارالسلام آنے کی دعوت دیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ دعوت قبول کرلیں گے۔

اس الجہاد فی الاسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ جنگ و جہاد کے متعلق اسلام کے جو نظریات ہیں انھیں کسی تاویل یا تغیر کے بغیر بڑے جرأت سے پیش کیا ہے۔ اسلام کے نظریہ جہاد اور اس کے قانون صلح و جنگ پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "الجہاد فی الاسلام" ایک بہترین تصنیف ہے۔ میں ہر ذی علم کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس کا مطالعہ کرے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ | میں اس وقت ایک نوجوان لیکن ایک بحر زخار کا تعارف آپ حضرات کے سامنے کرانے کھڑا ہوا ہوں۔ مولانا مودودی صاحب سے پوری علمی دنیا پوری طرح متعارف

ہے اور یہ حقیقت ہے کہ آپ اس دور کے حکیم اسلام اور ایک بلند پایہ عالم دین ہیں۔ یورپ سے الحاد و دہریت کا سیلاب جو ہندوستان میں آیا تھا قدرت نے اس کے سامنے بند باندھنے کا انتظام بھی ایسے ہی مقدس اور پاک طینت ہاتھوں سے کرایا جو خود یورپ کے قدیم و جدید حالات سے نہایت اعلیٰ طور پر کما حقہ واقفیت رکھتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی قرآن و سنت کا اتنا گہرا اور راسخ علم رکھتا ہے کہ موجودہ دور کے تمام مسائل پر تسلی بخش طور پر گفتگو کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ملحد اور دہریوں نے اس شخص کے دلائل کے سامنے ڈگیں ڈال دی ہیں۔ اور یہ بات واضح طور پر کہی جا سکتی ہے کہ مودودی صاحب سے ہندوستان اور عالم اسلام کے مسلمانوں کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

<u>سید بشیر الابراہیمی الجزائری</u> آپ (مولانا مودودی) ایسی شخصیت کے مالک ہیں کہ میں نے کم ہی ایسے باکمال دیکھے ہیں بلکہ آپ چند ممتاز خصوصیات کے لحاظ سے وہ فرد واحد ہیں جس کی نظیر میں زمانے کے علماء میں نہیں پاتا۔ مثلاً حق کے معاملہ میں نہایت سخت، مداہنت سے کوسوں دور اور راہ حق میں ابتلا و محن کے وقت صبر و ثبات کے پیکر مجسم، حکام وقت کے تقرب سے متنفر، خوشامد و تملق تو دور کی بات ہے۔ آپ قرآن و حدیث پر کامل عبور اور کتب دینیہ میں ماہرانہ دستگاہ اور تطبیق و استنباط پر قدرت تامہ رکھتے ہیں۔ موجودہ تہذیب کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کا بہترین تجزیہ کرتے ہیں اور میزان عدل پر موازنہ کرتے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ تنگ نظر نہیں کہ ان کے فوائد سے منکر ہوں۔ و علم یا سطحی معلومات کے حامل نہیں کہ ان کی ظلمتوں اور فریب کاریوں میں مبتلا ہو جائیں اس معاملہ میں آپ کا موقف اور مطمح نظر نہایت ہوشمندانہ ہے۔ ہم اس کے اظہار پر مجبور ہیں کہ مودودی ہی کی وہ واحد شخصیت ہے جو ملت اسلامیہ میں مطلوبہ اسلامی دستور کے وضع و ترتیب پر قدرت رکھتی ہے۔ اور وہ ہی اتنی دسترس اور مہارت رکھتے ہیں کہ اسلامی دستور کو کتاب و سنت، شریعت کے مقتضا، تشریع اسلامی کے مقاصد عامہ اور امت کے متفق علیہ اصولوں سے ضبط اور منطبق کر سکیں۔ مودودی کی شخصیت کسی ایک ملک اور کسی ایک خطہ زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ دنیا کے سارے مسلمانوں کی فیض رسانی کے لئے

م اسلام کی ایک امانت ہیں۔

لانا عبدالماجد دریابادیؒ | صاحب ترجمان القرآن کا تعارف ناظرین سے کرانا تحصیل حاصل ہے۔ ان
. وسعت نظر، نکتہ سنجی بہترین خدمت دین کا ذکر بار بار آچکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دور حاضر کے فتنوں
ے سدباب میں ابوالاعلیٰ صاحب کا سینہ خاص طور پر کھول دیا ہے اور تجدد زدہ گروہ کے حق میں
ن کے قلم کی ایک ایک سطر آبِ حیات ہے۔ طبقہ علماء میں مولانا کی ذات اس حیثیت سے بہت
ں ممتاز و بلند ہے۔ وہ صحیح معنوں میں مفکر ملت ہیں۔"

ڑ مصطفےٰ السباعی مرحوم | ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی مرحوم شام میں اخوان المسلمین کے مرشد عام تھے وہ نہایت
ن القدر اور وسیع النظر عالم تھے کئی علمی اور تحریکی کتابوں کے مصنف تھے۔ ۱۹۶۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا
۱۹۶۴ء میں جب جماعت اسلامی پاکستان پر پابندی عائد کی گئی تو اس کی خبر سن کر انہوں نے "حضارة
سلام" میں ایک زبردست اداریہ لکھا جس کا عنوان تھا۔ اے پاکستان کے حکمرانو! جماعت اسلامی اور
لانا مودودی پر تمہارے الزامات غلط ہیں مولانا مودودی نے ایک مشہور حدیث "السلطان ظل اللہ"
. جو تشریح کی ہے۔ شیخ السباعی اس سے اتنے متاثر تھے کہ ان کا کہنا تھا کہ اگر مولانا مرحوم یہ مجھے عنایت
رما دیں اور اس کے عوض مجھ سے میری تصنیف السنة و مکانتہا فی التشریع الاسلامی لے لیں تو میری
ڑی خوش قسمتی ہوگی۔"

مولانا مودودی کے اُستاد

مولانا شریف اللہ خان مرحوم

یکم ستمبر کی صبح فرشتۂ اجل نے پاک وہند کی ایک عظیم شخصیت کا چراغ ہستی ہمیشہ کے لیے بجھا دیا، یہ شخصیت مولانا شریف اللہ خان کی تھی جن کے علم کی روشنی نصف صدی تک پاک وہند کے طول وعرض میں اجالے بکھیرتی رہی۔ جن کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک تھی اور جو اب پورے برصغیر میں دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ مولانا ابوبکر غزنوی مرحوم جیسے جید عالم اور دانشور نے تمام دینی تعلیم انہی سے حاصل کی تھی۔ ممتاز عالم دین مولانا غلام اللہ خان اور صوبہ سرحد کی جماعت اسلامی کے امیر مولانا غلام حقانی بھی ان کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ مولانا شریف اللہ مرحوم کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسے شہرۂ آفاق اور تاریخ ساز عالم دین کے استاد تھے۔ راقم الحروف نے مولانا شریف اللہ مرحوم کی خواہش پر اکتوبر ۲۰۰۰ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ان کی ملاقات کا اہتمام بھی کیا تھا۔ مولانا مودودی اپنے ایک خاص نمائندے کے ذریعے ہر ماہ اپنے استاد المکرم کی خیریت بھی دریافت کیا کرتے تھے اور یہ سلسلہ مولانا شریف اللہ کی زندگی کے آخری لمحے تک جاری رہا۔ افضل جاوید صاحب نے کچھ عرصہ قبل مولانا شریف اللہ مرحوم سے ایک انٹرویو لیا تھا۔ جو ان کی زندگی کا پہلا اور آخری انٹرویو ثابت ہوا۔ ذیل میں ان سے ہونے والی گفتگو قارئین کے لیے پیش کی جا رہی ہے۔ (افضل جاوید صاحب)

لاہور راوی روڈ پر کریم پارک میں مشہور دینی درسگاہ جامع مدینہ میں میری مولانا شریف اللہ خان

سے پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ اس وقت درس حدیث دے رہے تھے۔ علیک سلیک کے بعد میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ تو فرمانے لگے کہ میرے انٹرویو سے لوگوں کو بھلا کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ میں کبھی لوگوں کی توجہ بننے کا خواہشمند نہیں رہا ہوں۔ اس لئے یہ انٹرویو والا معاملہ رہنے ہی دیں۔ آخر کچھ بحث وتمحیص کے بعد انھوں نے انٹرویو کے لئے دوسرے دن کا وقت دے دیا۔ جب میں مقررہ وقت پر ان کے ہاں پہنچا تو وہ اس وقت بھی طلبہ کو پڑھا رہے تھے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد انھوں نے مجھے بلا لیا اور میں نے ان سے پہلا سوال کیا کہ مولانا اپنی اب تک کی زندگی کے بارے میں کچھ اظہار فرمائیں کہنے لگے۔ میں جنوری ۱۹۰۰ء میں ریاست سوات کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ بچپن میں والدین کی شفقت سے محروم ہو گیا۔ میرے ماموں ریاست رامپور ہندوستان میں رہتے تھے اور ایک بڑے عالم دین تھے۔ وہ سوات آئے تو مجھے واپسی پر رامپور اپنے ساتھ لے گئے اور مدرسہ عالیہ میں داخل کرا دیا۔ جہاں میں نے پندرہ سال کی عمر تک اپنی تعلیم کا ایک بڑا حصہ مکمل کر لیا۔ بعدازاں مدرسہ عالیہ کے پرنسپل مولانا فضل حق رامپوری اور نائب پرنسپل مولانا محمد امین سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ مشہور محدث مولانا منور علی سے حدیث کا دورہ کیا اور پھر دیوبند میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ سے احادیث کا استفادہ کیا اور ان سے احادیث پڑھانے کی باقاعدہ اجازت ملی۔ میں نے تدریس کا آغاز احادیث، تفسیر اور علم دین سے مدرسہ ارشاد حسین رامپور میں کیا۔ وہاں دو سال تک پڑھایا، پھر امروہہ میں مدرسہ رکنیہ میں چار سال تک پڑھایا۔ بعدازاں ایک طویل عرصہ تک دہلی میں بھی تدریسی فرائض انجام دیئے۔ مدرسہ عالیہ میں ایک کمیٹی کا نائب صدر بھی بنا۔ شہید ملت لیاقت علی خاں اس کے صدر تھے۔ بعدازاں انھوں نے اس کا صدر نامزد کر دیا۔

میرا اگلا سوال تھا۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی سے آپ کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی اور آپ نے ان کو پڑھانے کا سلسلہ کیسے شروع کیا؟

مولانا شریف اللہ نے فرمایا جس زمانے میں مفتی کفایت اللہ جمعیت العلمائے ہند کے ترجمان

اور جیسے انسانوں کی ایک جماعت ہو۔ وہ قائد جو اپنے اخراجات کے لئے دوسروں کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا ہو۔ کم ہی آزادی اپنے خوشی اور خودداری سے کام کرسکتا ہے۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے سب سے پہلے اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے رزق حلال کا باعزت انتظام کیا۔ کتابوں کی تصنیف واشاعت کے ذریعے شروع میں بس اتنا میسر آگیا کہ تنگی ترشی سے بسر ہوسکے۔ خاصی طویل مدت تک یہی عالم رہا۔ مولانا کے کپڑوں پر بسا اوقات پیوند لگے ہوتے۔ پھر اپنی آمدنی کا کثیر حصہ جماعت اسلامی کے لیے وقف کر دیا۔ دعوت حق کی خاطر وہ جس ایثار کا مطالبہ دوسروں سے کرتے تھے سب سے پہلے اُس ایثار کا نمونہ خود قائم کیا۔ برسوں جیل میں رہے لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی کہ اُن کا گھر کس حال میں ہے۔ جاں نثار رفقاء نے از خود اُن کے معاملات میں دلچسپی لی، مگر اُن کی طرف سے بھی تقاضا نہ ہوا۔

خود ساہیوں قدر کہ حکومت سے کبھی کوئی درخواست نہ کی۔ جیل کے حکام نے بتایا کہ ہم نے مولانا کی زبان سے کبھی کوئی حرف شکایت نہ سنا۔ خدا کے سوا کسی اور سے التجا کرنا یا اس کے آگے ہاتھ پھیلانا اُن کے تصورات ہی سے خارج تھا۔ جب وہ پہلی بار جیل گئے تو اپنے مضبوط کیرکٹر کے ان مٹ نقوش چھوڑ کر آئے۔ اُس زمانے کا ایک سینئر وارڈن مجھ سے ملا۔ اُس نے بتایا کہ مولانا کو جیل خانے میں جو کمرہ دیا گیا وہ بڑا ہی گرم تھا۔ سخت گرمیوں میں بالکل تندور کی مانند تپنے لگتا۔ مولانا نے اُف تک نہ کی اور پنکھے کا مطالبہ بھی نہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد انھیں ٹیبل فین فراہم کیا گیا مگر وہ چلتا کم اور شور زیادہ کرتا تھا مگر وہ عذاب بھی خندہ پیشانی سے برداشت کر گئے اُن کی پیشانی پر کوئی بل تھا نہ کوئی عکس ملال۔ وہ تو رضائے الٰہی کی لذتوں سے سرشار تھے۔

مولانا نے دعا کی قبولیت کے زیر عنوان تفہیم القرآن میں اپنا ایک واقعہ درج فرمایا ہے اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی اور موت کے نازک ترین لمحات میں بھی اپنی عزت نفس کے کس حد تک پاسدار رہتے اور

زندگی دینی مدارس میں پڑھانے میں گزری ہے۔ اس لئے میں ان کی تصانیف کا گہرا مطالعہ تو نہیں کر سکا البتہ تب کا سرسری مطالعہ ضرور کیا ہے۔

مولانا مودودی نے اسلام کا جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے بارے میں مولانا شریعت اللہ کی رائے دریافت نھوں نے فرمایا۔ مجھے ان کے نظریات سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات۔ وہ دینی معاملات میں رہنمائی کرتا ہے۔ اور بنیادی مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے۔

مولانا۔ قیام پاکستان کے بعد مولانا مودودی سے آپ کے تعلقات کی نوعیت کیا رہی؟ فرمایا۔ مجھے اس بات کا دکھ ضرور ہوا کہ مولانا مودودی جو مجھ سے پہلے لاہور میں مقیم تھے ان سے میرا کوئی رابطہ قائم نہ ہو سکا اور ہو سکتا ہے کہ انہیں بھی پاکستان میں میری آمد کا علم نہ ہوا۔

قیام پاکستان کے کئی سال بعد ہزارہ سے میرے ایک شاگرد مولوی موسیٰ خان میرے پاس آئے و نا مودودی کے بڑے عقیدت مند تھے اور مولانا سے ملنے کے بڑے خواہش مند تھے۔ چنانچہ میں ان کے راہ اچھرہ گیا اور مولانا مودودی سے ملاقات کی۔ انھوں نے میری عزت و تکریم میں کوئی کسر باقی نہ رکھی مہمان نوازی کا بہترین نمونہ پیش کیا اور پھر ان کی خواہش پر میں نے نماز عصر کی امامت کرائی۔

مولانا۔ پاکستان کے لئے آپ کس نظام کو بہتر سمجھتے ہیں؟ حیران ہو کر بولے، جو لوگ یہ طے کر لگے ہوئے ہیں کہ پاکستان میں کس نظام کو نافذ کرنا چاہئے۔ ان کی کم عقلی کا ماتم کرنا چاہئے۔ بھلا یہ بھی کوئی مسئلہ ہے اس میں بھی کوئی لڑائی جھگڑے کا پہلو ہے۔ پاکستان ایک عظیم مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا لاکھوں جانوں کی قربانیاں دی گئیں، مال و اثاثے تباہ ہوئے اور مسلمان محض اس لئے ہجرت کر کے آئے کہ پاکستان میں اسلامی نظام حکومت کے تحت زندگی گزارنے کو اپنا جزو ایمان سمجھتے ہیں اور اللہ کی بتائی ہوئی راہ پر چلنا چاہتے ہیں۔

اب پاکستان میں جو لوگ اسلام سے بھاگتے ہیں وہ خود کو مسلمان کہنا چھوڑ دیں۔ جب ہم اپنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ میں اللہ کے احکامات کی پوری پابندی کرنے پر مجبور ہیں تو پھر بنیادی مع

میں اس کے احکامات سے سرکشی کیوں؟ اسلام تو تمام معاملات میں انسان کی مکمل رہنمائی کرتا ہے اور وہ بلا امتیاز غریبوں اور امیروں کا خیر خواہ نظام ہے۔ اسلام کے مقرر کردہ قوانین کے سامنے انسانی قوانین کی کوئی حیثیت نہیں۔ پاکستان کی سالمیت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ یہاں اسلامی نظام حکومت کا قیام عمل میں آئے اور اس میں ایک دن کی تاخیر بھی نہیں ہونی چاہیے۔ (ایضاً)

غزل

طالب کھیڑوی فارن آباد (یو۔پی)

جل اٹھی ہے شمع اب　ظلمتوں سے مت الجھو　تم بجھا نہیں سکتے
روشنی کے دیوانے　سرکٹا تو سکتے ہیں　سر جھکا نہیں سکتے
خوں رلا رہا ہوگا !!　ہائے ان کو خود اپنی　بے بسی کا نظارہ
کتنے بے گناہوں کے　خوں سے سرخ دامن ہے　اب چھپا نہیں سکتے
قوم و ملک کی حالت　مجھ سے پوچھتے کیا ہو　خود ہی فیصلہ کر لو
کون کس کا قاتل ہے　آپ سن نہیں سکتے!　ہم سنا نہیں سکتے
ہر کلی ہے لرزیدہ　گل ہیں سبھی پژمردہ　باغباں ہے خوابیدہ
قہر بن کے اب بجلیں　چھا گیا گلستاں پر　لب ہلا نہیں سکتے
ہر طرف جہالت ہے　قوم کی جو حالت ہے　باعثِ قیامت ہے
ہو چکا یقیں سب کو　دیس سے غریبی کو　تم ہٹا نہیں سکتے
یہ ایلکشنی وعدے　احمقوں کی جنت کے　کچھ حسیں مناظر ہیں
عقل کا تقاضا ہے　آزما چکے جن کو !　آزما نہیں سکتے
ہر طرف یہ شہرہ ہے　سبز انقلابوں کی　طالب آمد آمد ہے
چھا گئی اداسی کیوں　آج سرخ نگری پر　کچھ بتا نہیں سکتے

حالاتِ زندگی ایک نظر میں!

۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء ولادت اورنگ آباد ضلع حیدرآباد دکن۔

۱۹۱۴ء ۱۱ سال کی عمر میں مولوی کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۱۸ء ۱۵ سال کی عمر میں اخبار مدینہ بجنور سے صحافت کا آغاز۔

۱۹۱۹ء تحریک خلافت میں سرگرم اور مجلس اعانت نظربندان اسلام کے رکن فعال رہے۔

۱۹۲۰ء والد صاحب کا انتقال۔ روزنامہ "تاج" جبل پور کی ادارت سنبھالی۔

۱۹۲۱ء دہلی آ گئے۔ اسلامیات کی تکمیل اور انگریزی کا مطالعہ۔

۱۹۲۳ء "مسلم" بند ہونے کے بعد بھوپال میں قیام۔ وسیع و عمیق مطالعہ میں معروف۔

۱۹۲۴ء مولانا محمد علی صاحب نے "ہمدرد" اور مولانا احمد سعید صاحب نے "الجمعیۃ" کی ادارت پیش کی۔

۱۹۲۵ء الجمعیۃ کی ادارت ۱۹۲۸ء تک جاری رہی۔

۱۹۲۷ء ۲۴ سال کی عمر میں اسلام کے قانونِ صلح و جنگ پر معرکۃ الآرا کتاب "الجہاد فی الاسلام" کی تصنیف۔

۱۹۲۸ء حیدرآباد واپسی۔ تصنیف و تالیف میں مشغولیت۔ رسالہ دینیات کی اشاعت۔

۱۹۳۲ء ماہنامہ "ترجمان القرآن" کا حیدرآباد سے اجراء۔

۱۹۳۲ء اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی کی تصنیف۔

۱۹۳۴ء دعوت اسلامی کو عام کرنے کی دعوت۔ ذریعہ ماہنامہ ترجمان القرآن۔

۱۹۳۷ء علامہ اقبالؒ سے مراسلت کا آغاز۔ مسلم

یورسٹی کے استفسار پر جامع تعلیمی خاکہ کی تدوین۔

۱۹۳۷ء لاہور میں علامہ اقبالؒ سے ملاقات

مہ کی طرف سے مولانا کو پنجاب منتقل کا مشورہ

لمان اور موجودہ سیاسی کش مکش ہو کے مضامین

اشاعت۔

۸ مارچ ۱۹۳۸ء حیدرآباد سے پنجاب منتقلی

اسلام پٹھان کوٹ کی تشکیل۔ مسئلہ قومیت،

عنوان سے معرکہ آرا مقالے کی اشاعت۔

۱۹۳۹ء تجدید و احیائے دین، اسلامی عبادات

قی نظر اور دیگر بنیادی کتب منظر عام پر آئیں۔

۱۹۴۰ء اسلامی نظام حکومت کا خاکہ تیار

نے کے لئے مسلم لیگ کی کمیٹی میں رکن نامزد۔

۲۶ ستمبر ۱۹۴۱ء لاہور میں ۷۵ افراد کا تاسیسی

ع اور جماعت اسلامی کی تشکیل۔

۱۹۴۲ء تفہیم القرآن کا آغاز۔ ۲۸ اگست

ء تقسیم ہند کے بعد لاہور میں منتقلی۔ مہاجرین

کے اقدامات میں مصروف۔

۶ جنوری ۱۹۴۸ء پاکستان میں اسلامی نظام

ذ کی جدوجہد کا پر زور آغاز۔

۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء مطالبہ اسلامی نظام کی [illegible]

مقبولیت۔ مولانا اور ان کے رفقاء کی گرفتاری

۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء جماعت اسلامی کی مہم سے

مجبور ہو کر حکومت پاکستان نے قرارداد مقاصد منظور کی

۲۸ مئی ۱۹۵۰ء ۲۰ ماہ کے بعد مولانا کی رہائی۔

۱۰ مئی ۱۹۵۰ء پاکستان حکومت کے غیر اسلامی

دستوری سفارشات پر زبردست تنقید۔

۱۹۵۱ء کراچی میں مختلف مکاتیب فکر کے

۳۱ علماء کا تاریخی اجلاس اسلامی نفاذ کے سلسلہ میں

۲۲ نکاتی دستاویز کی باتفاق منظوری۔

۱۹۵۲ء دستور ساز اسمبلی کے لئے ۴ نکاتی مطالبہ

اسلامی دستور کے لئے ملک گیر مہم۔

۱۹۵۳ء قادیانی مسئلہ کی اشاعت ۲۸ مارچ

کو مارشل لاء کے تحت گرفتاری۔

فوجی عدالت سے سزائے موت۔ پورے عالم اسلام

میں غم و غصہ۔ ہڑتالیں۔ جلسے جلوس۔ رہائی کا مطالبہ

سرکار نے مجبور ہو کر سزائے موت کو عمر قید میں بدلا۔

۲۹ اپریل ۱۹۵۵ء خالص قانونی سقم کی وجہ

سے عدالت کے حکم پر ۲۵ ماہ بعد رہائی۔

۱۹۵۶ء اسلامی دستور کے حق میں مطالبہ کی

مہم۔ مشرقی پاکستان و عرب ممالک کا دورہ۔

۱۹۵۹ء "تفہیم القرآن" کے سلسلہ میں ارض القرآن کا طویل دورہ۔ عالم اسلام کے اتحاد کی کوشش۔

مئی ۱۹۶۲ء مکہ معظمہ میں عالمی اسلامی کانفرنس میں شرکت۔ رابطہ عالم اسلامی کی تشکیل۔ مجلس تاسیس کے رکن منتخب۔

۱۹۶۳ء جماعت کے کل پاکستان اجتماع کو ناکام کرنے کے لئے حکومت کی سازش۔ مولانا پر قاتلانہ حملہ۔ ایک کارکن شہید۔ کیمپ کو آگ لگا دینے کی کوشش۔ مولانا و مجلس شوریٰ کے ارکان کی گرفتاری۔ جماعت کے دفتر پر حکومت کا قبضہ۔ جماعت کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔

۲۵ ستمبر ۱۹۶۴ء مقدمہ میں سپریم کورٹ نے جماعت کی بحالی اور تمام گرفتاران کی رہائی کا حکم دیا۔ ڈکٹیٹر شپ کے خلاف عوامی مہم۔

۱۹۶۷ء جمہوریت کی بحالی کے لئے دوسری جماعتوں سے اتحاد۔ مولانا کی گرفتاری۔

۱۹۶۸ء لندن کا سفر۔ مسلمانان برطانیہ کی طرف سے ملٹن ہوٹل میں یادگار استقبالیہ۔

۱۹۶۹ء آئینی مطالبات منوانے کے لئے سیاسی رہنماؤں کی گول میز کانفرنس میں شرکت

مراکش میں اسلامی یونیورسٹی کی تاسیس میں شرکت۔

۱۹۷۰ء انتخابات۔ پلٹن میدان کے جلسے پر غنڈوں کا حملہ۔ علاقائیت میں کامیاب کرنے پر پاکستان کو سخت کے بارے میں مولانا کا انتباہ۔

یکم نومبر ۱۹۷۲ء ۳۱ سال تک کی رہنمائی کے بعد بوجہ خرابی صحت جماعت کی امارت سے سبکدوش۔

۱۹۷۸ء پاکستان میں اسلامی نظام کے لئے اقدامات۔

۱۹۷۹ء شاہ فیصل ایوارڈ کے لئے نام کا انتخاب۔ عالم اسلام میں پہلا پچاس سالہ خدمات کا اعتراف۔

۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء امریکہ میں بفیلو کے مقام پر فرما گئے۔

۲۶ ستمبر ۱۹۷۹ء کو بمقام لاہور دفن ہوئے۔ یوسف القرضاوی (قطر) نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اندازہ کے مطابق جنازہ میں دس لاکھ افراد نے شرکت

إنّا للّٰہ وانّا الیہ راجعون!

یہ رسالے، یہ کتابیں

(۱) **علماء کے لیے لمحۂ فکریہ**۔ مصنف۔ ڈاکٹر سید انور علی۔ ناشر ادارۂ شہادت حق۔ ۱۰۸ چھتہ شیخ منگو دہلی (جامع مسجد دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶) صفحات ۲۴۔ آفسٹ کی طباعت۔ قیمت 75 پیسے

آج بعض طبقوں میں اسلام اور علماء سے جو عام نفرت پائی جاتی ہے اس میں بڑی حد تک دخل علماء کی اس روش کو ہے جو انھوں نے چھوٹے چھوٹے فروعی مسائل میں اپنے سے مخالف رائے رکھنے والوں کے حق میں اختیار کر رکھی ہے۔ ان مسائل میں ان کا رویّہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی عالم ان کی رائے سے اختلاف ظاہر کرتا ہے تو گو وہ اختلاف کتنے ہی معقول دلائل پر مبنی کیوں نہ ہو مگر یہ حضرات اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور جب تک اس کو اسلام کے وسیع دائرے سے نکال کر پھینک نہ ڈالیں، چین کی نداگھیں نہیں آتی۔

"لمحۂ فکریہ" کتاب مندرجہ بالا تمہید کے ساتھ شروع کی گئی ہے۔ پھر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے خلاف تین علماء کی تنقیدات پر بحث کی گئی ہے۔ ان میں ایک بزرگ حضرت شیخ الحدیث حضرت محمد زکریا صاحب ہیں۔ ان بزرگ نے ایک کتاب "فتنۂ مودودیت" کبھی لکھی تھی۔ اس کتاب کو ایمرجنسی کے زمانے میں دوبارہ شائع کیا گیا جب کہ جماعت اسلامی کے اکابرین جیلوں میں تھے اور کوئی اس موقف میں نہ تھا کہ "فتنۂ مودودیت" کا رد لکھتا۔

دوسرے بزرگ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی ہیں۔ ان کی تازہ ترین کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا محترم نے سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "قرآن

کی چار بنیادی اصلاحیں، کی خامیاں ظاہر کر کے "لمحۂ فکریہ" میں ان خامیوں کا تنقیدی جائزہ ہے۔ پھر ایک واقعہ کا تذکرہ ہے۔ کسی نے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب سے پوچھا کہ علی میاں نے آپ کی کتاب میں یہ یہ کیڑے نکالے ہیں۔ آپ جواب کیوں نہیں دیتے؟ اس کے جواب میں ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا کہ میں بہرحال ان کے خلاف کچھ نہیں لکھوں گا۔ اگر میرے بجائے انہی کا اعتماد لوگوں پر ہے تو یہ زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ میں اور وہ لڑ کر دونوں ہی اعتماد کھو بیٹھیں۔

"لمحۂ فکریہ" میں ایک اور تیسرے صاحب مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی کی ایک عبارت کی طرف اشارہ دیا گیا ہے۔ "لمحۂ فکریہ" سے معلوم ہوا کہ یہ عبارت آج سے چوبیس برس پہلے رسالہ الفرقان میں چھپ چکی ہے اور دوبارہ یہی خدمت جون ۱۹۷۶ء میں انجام دی گئی جب کہ ایمرجنسی کے زمانہ میں جماعت اسلامی ہند کے اکابرین جیلوں میں تھے۔

ان تینوں صاحبان کی کتابوں کا آج پھر منظر عام پر آنا طرح طرح کے وسوسے پیدا کرتا ہے۔ مصنف "لمحۂ فکریہ" نے لکھا ہے: "اس وقت جب کہ دنیا میں تحریک اسلامی شباب پر ہے۔ کیا تو نہیں کہ کسی سازش کے تحت یہ کارنمایاں انجام دیا جا رہا ہو۔"

"صاحب لمحۂ فکریہ" درخواست کرتے ہیں کہ اس وقت علماء کے لئے آپس میں لڑنے کا نہیں ہے بلکہ مل کر تحریک اسلامی کو آگے بڑھانے کا ہے۔

تبصرہ نگار بھی ڈاکٹر سید انور علی صاحب مصنف "لمحۂ فکریہ" کی اس رائے سے متفق ہے اور دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ عوام کی صحیح رہنمائی کے لئے ہمارے علماء پر رحم فرمائے۔ (م)

(۴)

تحفظ گائے اور ہندوستانی مسلمان : مصنف الحاج عبدالکریم پاریکھ۔ ناشر مکتبہ ذکری رامپور۔ یو۔ پی۔ صفحات ۴۲۔ آفسٹ کی طباعت۔ کتابی سائز۔ قیمت ایک روپیہ۔

کتاب "تحفظ گائے" دراصل مصنف کی ایک تقریر ہے جو انہوں نے ستمبر ۱۹۸۲ء میں شہ…

تاگپور کے اندر اہم ہندو شخصیتوں کے سامنے کی تھی۔ تقریر بہت مدلل ہے۔ کتاب اس قابل ہے کہ زیادہ سے زیادہ پڑھی جائے۔ قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔ (م)

---

(۳) نماز ایک معجزہ :۔ مرتبہ: امینہ خاتون۔ ناشر حلقہ طلبائے اسلامی بہلہ سلطان گنج پٹنہ۔ صفحات ۴۸ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔ آفسٹ کی طباعت۔

اللہ تعالیٰ بعض ہستیوں کو ایسی صلاحیت عطا فرماتا ہے کہ وہ ایک ڈھیر میں سے معرکے کی چیزیں الگ کر لیتی ہیں اور پھر انھیں ترتیب دے کر دنیا کے سامنے پیش کرتی ہیں تو وہ بڑے کام کی چیز ہو جاتی ہے۔ محترمہ امینہ خاتون نے محترم ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب کی مختلف تقریروں سے نماز سے متعلق مواد اکٹھا کر کے ترتیب دیا تو وہ "نماز ایک معجزہ" بن گئی۔ زندگی کے ہر گوشے میں نماز کی کارفرمائیاں ڈاکٹر صاحب نے ایسے دلکش اور مدلل انداز سے پیش کی ہیں کہ دل و دماغ دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ جو لوگ سائنٹیفک طور پر نماز کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کتاب کو توجہ سے پڑھیں۔ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے یہ کتاب قابل اطمینان جواب دیتی ہے۔ خوب پڑھنا اور پڑھوانا چاہیے۔ (م)

---

(۴) ریاض عقیدت :۔ مرتبہ۔ رئیس نعمانی۔ شائع کردہ گلستان۔ اصطبل۔ چارباغ لکھنؤ۔ ڈیمائی سائز۔ صفحات ۴۸۔ قیمت تین روپیہ پچاس پیسے

اس کتاب میں رئیس نعمانی نے حمد و نعت اور مدح صحابہ سے متعلق کچھ شعراء کی نظمیں جمع کر دی ہیں لیکن کئی صفحوں کی لمبی نظمیں نظر سے گذریں۔ حمد و نعت وغیرہ کے ایسے مجموعوں کی سخت ضرورت ہے جن میں کم شعر والی نظمیں ہوں۔ اور وہ اچھی پر تاثیر ہوں کہ تیر بن کر دل پر لگیں اور یاد ہو جائیں۔ رئیس نعمانی صاحب نے جلدی میں یہ کام کیا۔ پہلا مشورہ یہ ہے کہ وہ ذرا وقت دیکر محنت سے یہ کام کریں تو بہت کامیاب ہونگے۔ (م)

(الطاف حسن قریشی)

پیارے مولانا

عظمتوں اور محبتوں میں رچا بسا صدی کا انسان تو رخصت ہوا۔ مگر کتنی صدیوں کے مقدر سنوار گیا۔

مجھے قلم تھامے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ مگر ایک حرف بھی نہ ٹپکا۔ شاید صدمے کے سارے الفاظ اور مطالب آنسوؤں میں بہہ نکلے ہیں۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ انسان ناتواں کیوں ہے؛ وہ اپنی بات زبان سے بیان کیوں نہیں کر دیتا؟ مگر اب معلوم ہوا کہ الفاظ تو جذبات کا ساتھ دیتے ہی نہیں، حالِ دل سناتے ہی نہیں، گہرائیوں میں اترتے ہی نہیں، بلکہ نازک لمحوں میں وہ حجابِ دعا اور نقابِ نگاہ بن جاتے ہیں۔

میرے چاروں طرف الفاظ بکھرے ہوئے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اس ہنگامہ ہائے ہو میں قلم ٹھہر گیا ہے۔ منجمد ہو گیا ہے۔ کون جانے وہ کیا سوچ رہا ہے!

عمر کی دبیز تہوں سے ایک ننھی سی روشنی اُبھری ہے اور پھر یہ روشنی ایک لڑی بنتی چلی گئی ہے۔ ایک طویل سلسلۂ سفر اور ایک طویل کہانی آنسوؤں کی زبانی مرتب ہو گئی ہے۔ صاف اور شفاف سرچشمہ ہر نوع کی آلائشوں سے پاک فرازِ دل سے اُمڈا ہے اور چپکے چپکے بہتا چلا جا رہا ہے۔ چاہت کی پہلی منزل ہو یا آخری — آنسوؤں کے بغیر سر نہیں ہوتی اور پھر ایک مقام یہ بھی آتا ہے —

سُرخیٔ اشک میں ہے قوسِ قزح کی سرخی
اک نئے رنگ سے ہم خونِ جگر پیتے ہیں!

ٹپ — ٹپ — ٹپ؟ یہ جھڑی کیسی ہے کہ تھمتی ہی نہیں؟ یہ آگ کچھ ایسی لگی ہے کہ تھمتی ہی نہیں — بجھے بھی تو کیسے؟ وہ بجھ گئی تو زندگی

مشتِ خاک اور غبارِ راہ کے سوا اور کیا ہوگی ـــ بجھ جائے گی ـــ منتشر ہو جائے گی۔ آتشِ عشق ہی سے تو روشنی ہے، حرارت ہے، زندگی ہے اور عظیم تر زندگی کے لئے جذبۂ سرفروشی ہے۔ وہی جذبہ سرد پڑ گیا تو پھر جینے کے لئے کیا رہا۔ پھر یہ جہانِ رنگ و بو کس کام کا!

٭

ہائے! یہ منظر کیسا ہے، پاکیزہ روح کا جسدِ خاکی ہمارے سامنے رکھا ہے۔ کیا سچ مچ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ وفات پا گئے؟ کیا اب ہم ان سے باتیں نہ کر سکیں گے! اُف یہ کیا ہو گیا کوئی کلیجہ پہ آری چلا رہا ہے۔ سینے میں شدید جلن ہے جیسے کسی نے گرم گرم سلاخ دل میں گھونپ دی ہو۔ یہ سب کچھ کون کر رہا ہے؟ درد کی یہ نئی لہر پھر کیوں آ گئی ہے؟ جسم کا انگ انگ انگارہ سا کیوں بن گیا ہے؟ مرنے والے کی ذات سے ہمارا یہ تعلق کس نوعیت کا ہے؟ کہ اپنا سب کچھ اُجڑتا نظر آتا ہے اور یہ کیفیت مجھ ہی پر نہیں لاکھوں اور کروڑوں انسانوں پر طاری ہے۔ ایک لمحے کی بات نہیں، ایک عہد سوگوار ہے۔ قریہ قریہ سے آہوں اور کا دھواں اُٹھ رہا ہے۔ اور پھیلتا چلا گیا۔ ہر شخص اس احساس سے نڈھال ہے کہ اس کی سب قیمتی متاع لٹ گئی۔ اپنائیت کا یہ شعور بے کراں ہے بے پایاں ہے اور یہی نقدِ دل و جاں ہے۔

لاہور کا قذافی اسٹیڈیم انسانوں سے کھچا کھچ بھرا ہے شاید چشمِ فلک نے اتنا عظیم ہجوم اس میدان میں پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ سینوں میں جس قدر اضطراب، صفوں میں اسی قدر ارتباط۔ کلمہ شہادت کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ دعائیں بے تابانہ ہونٹوں پر آ گئی ہیں۔ دل کی گہرائیوں سے صدائیں اٹھتی ہیں کہ عہدِ حاضر کا یہ امام اپنے رب کے حضور سرخرو ہو جائے اور ابدی سکون پائے اور اسے خدا کی رضا میسر آ جائے۔ جس کا حصول ہی اس کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔

ان دعاؤں اور صداؤں میں ذرہ برابر بھی تصنع اور دکھاوا نہیں۔ مشتاقانِ جمال خود بے اختیار آئے ہیں۔ ان میں وہ خوش نصیب بھی ہیں جنھوں نے نمازِ جنازہ میں شریک ہونے کے لئے ہزاروں میل کی مسافت طے کی ہے۔ وہ بھی ہیں جو اندرونِ ملک سے کئی کئی راتیں سو

ـکے اور وہ بھی جو اپنے محبوب کے انتقال کی خبر
سنتے ہی گھر بار چھوڑ دیوانہ وار نکل آئے۔ اس
ہار وان شوق میں جسمانی طور پر اپاہج بھی دکھائی
ـے۔ ہمان کا عزم اور خلوص قابلِ دید تھا
چشمِ تاریخ نے ان کی جبینِ شوق بار بار چومی۔
در جذبوں نے بلائیں لیں۔ روح و دل کے
اس عظیم الشان اجتماع میں بناوٹ کی گنجائش
ہاں؟ یہاں تو وہی آئے جن کو جاہ و منصب
سے زیادہ ایک اعلیٰ و ارفع مقصد سے تعلق
تھا۔ اس دعوت سے تعلق تھا جو رنگ و نسل
اور بولی اور علاقوں میں کوئی تمیز نہیں کرتی
در انسانوں کو تقوے کے پیمانے سے ناپتی
ہے۔ وہ ذاتِ عالی مقام جو فنا کے مرحلے
میں داخل ہو چکی تھی۔ پھر حکومتوں سے
برسر پیکار رہی تھی۔ بے نیاز ہی رہی۔ مولانا
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ خود تو گلزار کہکشاں تھے
ان کے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہ
تھی۔ ان کی نمازِ جنازہ میں سفیر بھی تھے اور
وزیر بھی اور سربراہِ ملک بھی۔ مگر سچ یہ ہے
اصل پونجی تو ان جوانوں اور جاں نثاروں

سے قائم ہوئی جنھوں نے سخت آزمائشوں کے
عہد میں مولانا کے پہلو بہ پہلو سینوں پر زخم کھائے
تھے۔ وہ نڈھال بن گئے تھے، بے مثال ہو گئے تھے۔

لاہور کی تاریخ میں سید مودودی کا جنازہ
سب سے بڑا تھا۔ سارے پاکستان سے راہروان
راہِ محبت کشاں کشاں کھنچے چلے آئے تھے لاکھوں
عقیدت مندوں نے آہوں اور اشکوں کے
لب و لہجے میں سلام کیا۔ یہ مولانائے محترم کی
سیرت و کردار کی مقناطیسی کشش تھی کہ نمازِ جنازہ
میں اُن احباب نے بھی شرکت کی جو زندگی میں اُن
سے اختلاف کرتے رہے تھے۔ اُن کے جذبات
میں بھی خلوص تھا۔ اُن کی آنکھوں سے بھی
خاموش آنسو جھانک رہے تھے۔ اور کچھ کہہ
بھی رہے تھے۔ مگر سننے والا آگے جا چکا تھا۔

۲۶ ستمبر کو چڑھتے ہوئے سورج نے
دیکھا کہ دلوں پر حکومت کرنے والے اور
گردنوں پر سوار ہو جانے والوں میں کتنا
بڑا فرق ہے۔ ایک طرف جذبۂ بے اختیار
اور دوسری طرف ہوس بے لگام۔ مولانا
کو آخری بار سلام کرنے دل کے قافلے آئے

تھے۔ خود سپردگی کا عجب عالم تھا۔ لوگوں نے اپنے آپ کو فراموش کر دیا تھا اور وہ ایک عظیم قوت میں تحلیل ہو گئے تھے۔ اہلِ نظر نے سے اخلاق اور نظریاتی قوت سے تعبیر کیا تھا۔

☆

مولانا کا اس جہانِ فانی سے کوچ ایک فطری واقعہ ہونے کے باوجود بہت بڑا سانحہ اور ناقابلِ تلافی المیہ محسوس ہوتا ہے۔ ان ایسی بصیرت اور قد و قامت کی شخصیتیں عالمِ اسلام میں کبھی ڈھونڈے سے نہ ملیں گی۔ مولانا کے افکار جس درجہ مربوط اور ہمہ گیر تھے اور اُن کے پیرایۂ بیان میں جو سحر تھا اور اُن کی زندگی نے جو انقلاب برپا کیا تھا اس کی مثال کئی صدیوں تک نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی دنیا نے ان سے بڑے پیمانے پر استفادہ کیا اور اُن کی کتابیں ذوق و شوق سے پڑھی جانے لگیں۔ اسی پس منظر میں حضرت مولانا کی وفات سے اسلامی افکار میں زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے اور جید علماء نے غم آگیں آواز میں کہا کہ ہمارے امام رخصت ہو گئے۔

پاکستان آج بڑے ہی نازک مسائل میں اُلجھا ہوا ہے۔ مولانا کی فراست اس پر آشوب میں قوم کی فکری اور سیاسی رہنمائی کر سکتی تھی۔ یوں لگتا ہے کہ اب اُن کے بغیر یہ دونوں محاذ سونے پڑے ہیں۔

اس مہیب اور وسیع نقصان کے تصور ہی سے پژمردگی سی طاری ہو جاتی ہے اور قوی جواب دے جاتے ہیں۔ مگر اسلام نے شخصیتوں سے زیادہ اصولوں سے منسلک ہونا سکھایا ہے۔ اور یہی تعلیم غمگساروں کو زندہ رہنے اور جد و جہد کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ سید مودودی نے اپنے پیروکاروں کو نظم و ضبط کے قابلِ رشک سانچوں میں ڈھال دیا تھا — انہیں ایمان کے تقاضے بھی اچھی طرح سمجھا دئے تھے اور خدا کی وحدانیت پر ہر طرح کی وفاداریاں قربانیاں کر دینے کی تربیت دی تھی۔ چنانچہ اسی لئے لاکھوں آنکھیں اشکبار ہونے کے باوجود احساسِ فرض سے دمک رہی تھیں۔ اَن گنت لوگ شدتِ غم سے نڈھال اور بے ہوش ہو گئے

انھیں اپنے نصب العین کا پورا پورا ہوش تھا۔
بے خودی میں بھی ہشیاری کا رنگ تھا۔ سادگی
میں بھی ایک پُرکاری تھی۔ لاتعداد افراد صبر و
استقامت کا پیکر بنے خاموشی سے آنسو کے
ساغر پی گئے۔ اور انھیں آنکھوں سے چھلکنے
نہ دیا۔ بے شمار لوگ ایسے تھے کہ آہ کو انھوں
نے رسمِ وفا کے خلاف جانا اور تسلیم و رضا کی تصویر
بن گئے۔ شعور و آگہی سے معمور ہزاروں افراد
نے بیساختہ کہا کہ ہمیں مولانا کے جسم سے زیادہ
مشن عزیز ہے۔ اور ہم ہر قیمت پر اس مشن کو
زندہ اور تازہ رکھیں گے۔ اصولوں اور
شخصیت سے محبتوں کے مابین اس قدر
حسین توازن دراصل سید مودودیؒ کے اٹھائے
ہوئے ذہنی انقلاب کا شاہکار ہے

مولانا سے میرا تعلق بڑا ہی گہرا اور بڑا
ہی خاموش تھا۔ مجھے ان سے عقیدت بھی
تھی اور محبت بھی۔ مگر ان عقیدتوں اور محبتوں
سے یکسر مختلف جن کا عام طور پر اظہار ہوتا
ہے انھوں نے اپنی تحریروں میں ہمیں ایک
نیا معیار عطا کیا تھا۔ وہ یہ کہ محبت اور عقیدت
میں اندھے نہ ہو جاؤ بلکہ ہر بات کو حق اور سچائی کی کسوٹی
پر پرکھو اور شعور سے کام لو۔ اس معیار نے مجھے یہ
جرأت بھی عطا کی کہ مولانا سے ان کی خلوت میں علمی
پر کھل کر گفتگو ہوتی اور اختلاف تک نوبت پہنچ
جاتی۔ وہ ساری بات بڑے غور اور سنجیدگی سے
سنتے رہتے اور آخر میں اپنا نقطہ نظر پیش کر دیتے
دراصل وہ بڑے سلیقے سے تربیت کرتے جاتے تھے

مجھے اس حقیقت میں بڑی خوشی محسوس
ہوتی ہے کہ میں جو کچھ ہوں مولانا کے فیضِ علم
کی بدولت ہوں۔ میں نے اُن کی کتابیں پڑھ کر
پہلے سوچنا اور پھر اچھا بُرا لکھنا سیکھا اور یہ
آرزو ہی رہی کہ اُن جیسے دو جملے ہی لکھ سکوں
مگر یہ تمنا حسرت میں تبدیل ہو گئی۔ اُن کے
اسلوب کی شان ہی کچھ اور ہے۔ اسلام کو ایک
نظامِ زندگی کی حیثیت سے میں نے مولانا کی تحریروں
کے ذریعے پہچانا اور پھر اپنے طور پر بھی مطالعہ کیا۔
سچ یہ ہے کہ اگر ان کی کتابوں سے بچپن ہی میں
تعلق پیدا نہ ہو جاتا تو کیا خبر الحاد کے جنگلوں
میں کتنی ٹھوکریں کھانا پڑتیں اور پھر پاکستان
کی عظمت اور اہمیت کا بھرپور شعور بھی مولانا

کا سیاسی جدوجہد کا سبق دلایا اور دستور اور
قانون کی بعض نزاکتیں اُن کی تقریروں یا تحریروں
سے معلوم ہوئیں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں
نے نقد و جرح کا ایک ذوق عطا کیا اور تحریری
انداز تحریر کی آبیاری فرمائی اور طاغوت اور
ظلم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی راہ دکھائی۔

میری ذات پر ان کے احسانات اتنے زیادہ
ہیں کہ آج اپنے آپ کو تنہا تنہا اور نامکمل سا محسوس
کرنے لگا ہوں جیسے کسی بھی وقت بکھر جاؤں
گا، پاش پاش ہو جاؤں گا۔

مگر مجھے تو ابھی اُن کا مشن آگے بڑھانا
ہے —— وہی مشن جس کا سراغ انھوں نے قرآن
حکیم کے مطالعے اور انبیاء اور صلحاء اور شہداء
کی عظیم الشان جدوجہد سے لگایا تھا۔ اور وہ یہ
ہے کہ انسان پر انسانوں کی حکومت کے بجائے
خدا کی حکومت قائم کی جائے تاکہ ہمارا کرۂ ارض
عدل و انصاف اور مساوات و حریت کا گہوارا
بن جائے۔ اس مشن میں بے پناہ جان اور توانائی
ہے اور اس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینے
والے کبھی بھٹکتے نہیں، کبھی ٹوٹتے نہیں
کبھی بکھرتے نہیں۔ میں اسی شجر سے وابستہ رہنا
چاہتا ہوں۔

*

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، جن پر ہمیشہ اللہ
کی رحمتوں کی بارش ہوتی رہے گی۔ اسلام کے
بڑے بہادر سپاہی تھے۔ انھوں نے
احیائے دین کے سلسلے میں وہ کارنامے انجام
دیے جن پر اسلامی تاریخ صدیوں فخر کرے
اور جوں جوں وقت گزرے گا اُن کی دعوت،
عزیمت کا شعور اور زیادہ اجاگر ہوگا۔ ابھی تو
بیشتر مسلمانوں کو معلوم ہی نہیں کہ مولانا اپنی
مختصر سی زندگی میں کیا کچھ کر گزرے ہیں۔ معاصرانہ
رقابتوں اور چشمکوں نے اُن کا صحیح مقام متعین
ہونے دیا ہی نہیں۔ ہر عہد میں یوں ہی ہوتا
آیا ہے کہ اسلام کے سچے خادم کو سب سے زیادہ
مزاحمت کا سامنا اپنے ہی لوگوں کی طرف سے
کرنا پڑا۔ کفر کے فتووں سے لے کر جلاد کے
کوڑوں تک نوبت آئی۔ مگر امام احمد بن حنبلؒ
خندہ پیشانی سے احیائے دین میں لگے رہے
امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ جراتِ آزمائشوں

ا سے گزرے۔ امام حسینؑ علیہ السلام اسلام کے شورائی نظام کی حفاظت کے لیے نکلے تو ان کے اور ان کے جاں نثار رفقاء کے سینے تیروں سے چھلنی کر دئے گئے۔ یہ داستان عزیمت بڑی طویل ہے اور اب اس میں کوئی شک نہیں کہ سید مودودیؒ اُسی قافلے کے ایک فرد اور اسی عظیم سلسلے کی ایک اہم کڑی تھے۔ ان کے مخالفین نے اس نوع کے الزام بھی لگائے کہ مودودی مجدد ہونے کا دعویٰ کرنے والے ہیں۔ اور اپنا ایک الگ فرقہ تیار کرنے والے ہیں۔ مگر مولانا مرحوم نے شعوری طور پر اپنا دامن ہر طرح کے ادعا سے پاک صاف رکھا۔ وہ تو بس کام کرتے رہے اور اسلامی مورخ اُن کے کاموں ہی سے اُن کا مقام اور مرتبہ متعین کرے گا اور جب تعصب کا غبار بیٹھ جائے گا اور وقت کی کسوٹی پر نکو اور ناخوب کو جدا جدا کر دے گی تو مولانا پر سب و شتم کے پتھر پھینکنے والے اپنے افعال پر یقیناً شرمندہ ہوں گے۔ مگر اُس لمحے کوئی تلافی نہ ہو سکے گی۔

سید مودودیؒ نے اسلام کے لیئے اتنے محاذوں پر جنگ لڑی ہے اور ایسے ایسے پہلوئ میں اُسے سربلند رکھنے کی جدوجہد کی ہے کہ اس کا احاطہ کسی ایک مضمون میں شاید ہی ہو سکے۔ وہ مسلسل ساٹھ برس جاہلیت اور طغیان کے خلاف جہاد کرتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ مثبت قوتوں کی تنظیم اور تربیت میں ہمہ وقت مستعد نظر آئے۔ اور خدا کے فضل و کرم سے اُن کی مساعی برگ و بار لائیں۔ اسلامی قوتیں جو نصف صدی پہلے ہر محاذ پر شکست کھا رہی تھیں آج انسانیت کے مستقبل کی اُمید بن گئی ہیں۔ اس عظیم تغیر میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا تاریخی کردار بڑا ہی کلیدی اور صد درجہ منفرد ہے۔

انھوں نے اسلامی نظام کی تشریح و تعبیر میں لاکھوں صفحات قلمبند کئے ہیں اور ان کی ضخیم کتابوں کی تعداد ساٹھ سے متجاوز ہے اور چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی تعداد خاصی بڑی ہے یہ کتابیں اردو زبان میں لکھی گئیں اور اُن کا ترجمہ دنیا کی ہر بڑی زبان میں ہو چکا یا ہو رہا ہے اس کرۂ ارض پر جہاں کہیں اسلامی تحریک اٹھی ہے وہاں مولانا کے لٹریچر کی پیاس محسوس

ہوئی ہے۔ آج یہ عالم ہے کہ اسلام کے موضوع پر جو بھی کانفرنس ہوتی ہے اس میں مولانا کی کتابیں حوالے کے طور پر پیش کی جاتی ہیں اور اُن کی رائے کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا جو بہار آفریں منظر اُبھرا ہے اس میں بھی اُنہی جیسی بزرگ ہستیوں کا خون اور عرق شامل ہے۔

*

سید مودودیؒ مرحوم و مغفور نے اپنی طرف سے کوئی اچھوتا نظریہ اور کوئی نیا فکر پیش نہیں کیا۔ انھیں امامت اور قیادت کا شوق نہ تھا اُن کی یہ آرزو بھی نہ تھی کہ تاریخ میں اُن کا نام ایک نئے دبستانِ فکر کے بانی کی حیثیت سے آئے۔ وہ تو فقط اسلام کو اُس کی خالص شکل میں دنیا کے سامنے رکھ دینا چاہتے تھے۔

اوہام اور رسوم و رواج کی آلائشوں سے پاک صاف اسلام۔ نئی اور پرانی جاہلیتوں سے منزّہ اور پاکیزہ اسلام — زندہ متحرک اور انقلاب آفریں اسلام — ایک نظام ایک تہذیب اور ایک تمدن کی صورت میں اسلام — دلوں میں اُتر جانے والا اور ذہنوں کو مسخر کر دینے والا اسلام — نوجوانوں میں امید و یقین اور عمل کی صلاحیتیں بیدار کر دینے والا اسلام — غالب اور کارفرما — ترقی و تعمیر کی ہر امکانی صورت سے بھی آگے اسلام —

سید ذی وقار نے اسلام کا نیا ایڈیشن تیار نہیں کیا، جیسا کہ اس عہد میں ہوتا رہا ہے بلکہ خالق کائنات کے درمیان جو پردے حائل کر دیے گئے تھے انہیں چاک کر ڈالا۔ فرسودہ تصورات نے جو پیچ در پیچ جالے تن رکھے تھے۔ انھیں چاک کر ڈالا — تار تار کیا اور جمود کے سارے ہی بت پاش پاش کر دیے۔ یہ کام کچھ سہل نہ تھا، مگر بڑے آدمی تو ہاتھ ہی بڑے کاموں میں ڈالتے ہیں اور جنگل کے جنگل صاف کر کے شاہراہیں بنا لیتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید مودودیؒ نے اسلام کو پورے شعور کے ساتھ قبول کیا تھا۔ اور غالباً قبولیت کا یہ عمل برسوں جاری رہا ہوگا۔ وہ خود بتایا کرتے کہ نوجوانی کے دنوں میں اُن کا ذہن قرآن اور حدیث کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات

۔ اُمڈ رہا تھا اور وہ تمام سوالات اُٹھ رہے تھے
غربی علوم و تہذیب کی یلغار نے بالعموم مسلم
انوں میں پیدا کر دیے تھے پھر وہ تلاشِ حق
نکلے اور ہر مذہب کا لٹریچر پڑھ ڈالا۔ مغرب
جلا علوم کا غور سے مطالعہ کیا۔ تاریخ کے
ہم کھنگال ڈالے۔ اسلام کے عروج و زوال
استان پر بہ سوال غور و فکر کیا۔ قانون، منطق
یات، اخلاقیات، معاشی رجحانات اور علمی
ریوں اور تحریکوں پر دسترس حاصل کی اور
و قرآن کے مطالعہ میں گم ہو گئے۔ ایک
مقام پر مہینوں غور کرتے رہے اور جب تک
مئن اور سیر لب نہ ہو گیا آگے نہ بڑھے۔ اسی
سے احادیث کا مطالعہ کیا اور پھر پورے
لٹریچر کو سامنے رکھ کر اسلام کی ایک مکمل
بنا ڈالی۔ امام غزالی جو گیارہ برس حقیقت
کرتے رہے تھے اُن پر بھی بے یقینی
ت و شبہات کا ایک دور آیا تھا اور جب
دور سے عین الیقین کی طرف آئے۔
کے منصب پر فائز ہوئے۔ کچھ ایسی کیفیت
مودودیؒ پر گزری۔ اُن کا عہدِ شباب
نسبتاً مختصر تھا اور جب دل اور ذہن کو یکسوئی حاصل
ہو گئی، تو پوری قوت سے اسلام کی حمایت میں
نکل آئے اور دشمنوں پر وہ تابڑ توڑ حملے کیے
کہ انھیں بالآخر پسپا ہونا پڑا۔ اسلام کی
آواز اور اس کے اثرات پہلے سے کہیں زیادہ
پھیل گئے۔

مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کو ایک مکمل نظامِ حیات کی حیثیت سے پیش کیا۔ نظامِ زندگی کے حوالے سے کم مفکرین کے ہاں پہلے بھی موجود تھے۔ مگر وہ مختصر اشارے ہی تھے۔ اُن کی تحریروں سے مکمل نظامِ حیات کا واضح نقشہ مرتب نہ ہوتا تھا۔ سید مودودیؒ نے بے پناہ ریاض اور کاوش سے کام لے کر قرآن و حدیث کے حوالے سے ایک جامع نظام تیار کیا جس میں نظامِ عقائد، نظامِ عبادات، نظامِ اخلاق، نظامِ قانون، نظامِ معیشت اور نظامِ حکومت باہم مربوط اور ایک دوسرے سے پیوست نظر آتے ہیں۔ ایک درخت کی مانند جس میں جڑ اور کونپلوں کے درمیان گہرا تعلق ہوتا ہے
اس واضح نقشے نے تعلیم یافتہ نوجوانوں

کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ غیر مسلم اہل قلم نے اسلام کے خلاف مسلسل یہ زہریلا پروپیگنڈہ کیا تھا۔ کہ اسلام چند منتشر اور فرسودہ تعلیمات کا نام ہے اس میں کوئی ادارہ نہیں ہے، نہ کوئی نظام معاشیات کے اصول ہیں نہ دستور سازی کے امکانات، وہاں تو غلام ہیں، لونڈیاں، خونی جنگیں ہیں۔

بدقسمتی سے مغرب کا یہ پروپیگنڈہ مسلم ذہنوں پر بھی اثر کر گیا اور انھوں نے بھی اسلام میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیے۔ اور بعض بدبخت اس حد تک جا پہنچے کہ انھوں نے اسلام کا ایک ایسا ایڈیشن تیار کر لیا جس کا مقصد فرنگی حکمرانوں کو خوش کرنا اور ملت اسلامیہ کی قوت کو توڑ دینا تھا۔ ہمارے بعض اچھے اچھے دماغ مغربی علوم و فنون سے اس درجہ مرعوب ہوئے کہ انھوں نے قرآن کی اصطلاحات کو عجیب عجیب معنی پہنا دیئے۔ ان کی تحریروں سے اسلام کے لیے کوئی ولولہ اور جوش اور اعتماد پیدا ہونے کے بجائے ایک طرح کی ندامت اور ایک قسم کی شکست کا احساس پیدا ہوتا تھا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی رح نے ایک طرف مغربی تہذیب سے پیدا ہونے والی تباہ کاریوں سے پردہ اٹھایا اور مغربی علوم کی لغزشوں پر گرفت کی اور دوسری طرف اسلام کے اصل نظام کی ہیئت ترکیبی پر روشنی ڈالی اور دلائل سے یہ ثابت کیا کہ انسانیت کے دکھوں کا علاج صرف اسلامی زندگی میں ہے۔ ان کی باتیں روایتی کی سی نہ تھیں بلکہ اعلیٰ درجے کی تحقیق سے مزین ہوتی تھیں۔ انھوں نے قطعیت کے ساتھ بتایا کہ اسلام کے اندر اقتدار اعلیٰ کا تصور کیا ہے حکومت کی نوعیت کیا ہے۔ حکمرانوں اور عام شہریوں کے حقوق و فرائض کس انداز کے ہیں۔ مشاورت کی جدید شکلیں کیا ہو سکتی ہیں۔ بنیادی حقوق کا مسئلہ کیا ہے۔ حکومت فرد کی آزادی پر کیا کیا قدغن لگا سکتی ہے۔ اور فرد حکومت پر کہاں تک تنقید کر سکتا ہے۔ اسی طرح اسلام کے معاشی اصول جدید زندگی میں کیا انقلاب لائیں گے۔ محنت کا اجر کیا ملے گا۔ سرمایے کو کس حد تک پروان چڑھنے کی اجازت ہوگی۔ آجر اور اجیر کا باہمی رشتہ کیا ہوگا، دولت کی تقسیم کس بنیاد پر ہوگی۔ پیداوار میں کس کس کا حصہ ہوگا۔ نجی ملکیت کی اجازت

کس حد تک ہوئی۔ اور اجتماعی مسائل اور معاملات کا کہاں تک خیال رکھا جانے لگا۔ چونکہ مولانا نے ان مباحث میں جدید اصطلاحات استعمال کیں اور جدید ترین معاشی نظریات اور تکنیک پر کاری نظر ڈالی۔ اس لئے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو اُن کی باتیں سمجھنے میں کم دقت محسوس ہوئی اور وہ بھی اسلام کی عظمت پر کامل شعور کے ساتھ ایمان لاتا چلا گیا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ایک طرف مغربی تہذیب سے پیدا ہونے والی تباہ کاریوں پر سے پردہ اٹھایا اور مغربی علوم کی تحریفوں قرآن فہمی کا ایسے معنوں میں ذوق و شوق پیدا کیا قرآن حکیم جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا سب سے مستند اور محفوظ سرچشمہ ہے۔ ہم اُسی سے غافل ہو گئے تھے — ہمارے بعض علماء نے قرآن سے زندگی کے معاملات میں رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے اُسے جھاڑ پھونک تک محدود کر لیا۔ اُدھر مستشرقین نے ایسے ایسے رکیک حملے کئے کہ ہمارے تجدد پسند اسکالر ڈگمگا گئے اور انھوں نے بعض مقامات پر الفاظ کے معانی یکسر بدل ڈالے۔ پھر یہ بھی ہوا کہ بعض مفسرین نے تفسیر و تشریح کے ضمن میں ایسے ایسے مباحث چھیڑ دیئے جن کا قرآن سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ قرآن سے بیشتر مسلم اُکتا گئے اور روٹھ گئے کہ اللہ تعالیٰ کا مدعا سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔

مولانا نے اس میدان میں اس قدر عظیم الشان کام کیا ہے کہ لاکھوں سینوں سے ان کے لئے ہر وقت دعائیں نکلتی ہیں۔ تفہیم القرآن نے زبردست ذہنی انقلاب برپا کیا۔ لوگوں کا قرآن حکیم سے شغف بڑھتا جا رہا ہے اور انھیں اللہ کی کتاب کے مطالعے میں لذت آنے لگی ہے۔ اردو زبان میں قرآن کی ترجمانی اتنے عمدہ انداز میں ہوئی ہے کہ زبان پر چھوٹے چھوٹے جملے از خود رواں ہو جاتے ہیں۔ اور تاثیر کے نشتر بن کر سینے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ آسمانی کتاب کا زورِ بلاغت اور حسنِ فصاحت جوں کا توں اردو زبان میں منتقل تو نہ ہو سکتا تھا لیکن مولانا نے ترجمانی کے لئے جو زبان استعمال کی ہے اُس سے بہتر زبان شاید ہی اس دور میں

کھی جاسکے۔ عام فہم اتنی کہ سہل ممتنع بھی جھلک کہے اور رواں دواں ایسی کہ موجوں کی روانی ٹھہر ٹھہر جائے۔ جلال بھی ہے اور جمال بھی، بوندوں کی پھوار بھی ہے اور بجلی کا کڑکا بھی۔ جیسے جیسے مضامین بیان ہوتے ہیں۔ الفاظ انہی کیفیات میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔

زبان میں قوت اور تاثیر کے علاوہ تفہیم القرآن میں اس امر کا خاص طور سے اہتمام کیا گیا ہے کہ اسلام کا نظام حیات مربوط انداز میں قاری کے سامنے رہے۔ تفہیم القرآن کی چھ جلدیں میں اتنی وسعتیں سمٹی ہوئی ہیں کہ حیرت بھی ہوتی ہے اور خوشی بھی۔ قرآن کے مطالعے سے اگر اس نظام زندگی کا اس کا بنیادی ڈھانچہ نہیں ملتا جسے قائم کرنے کے لیے یہ کتاب اتاری گئی اور خدا کا رسول بھیجا گیا تو پھر مقصد پورا نہیں ہوتا۔ سید ابوالاعلیٰ نے اس نظام حیات کا پورا نقشہ اور مکمل عمارت فراہم کردی ہے اور اس محسن انسانیت کی ساری زندگی بھی سامنے آگئی ہے۔ جس نے تیس برسوں میں بنیادوں کے مطابق عمارت مکمل کی تھی۔

تفہیم القرآن کی یہ خصوصیت بڑی ہی منفرد ہے کہ آپ اسے جوں جوں پڑھتے جائیں، تو آپ اپنے اندر اسلامی تحریک میں حصہ لینے کی آمادگی پائیں گے۔ آپ کا جی چاہے گا کہ خیر و شر اور حق و باطل کی کشمکش میں کود پڑیں اور اللہ کا منشا زمین پر نافذ کر کے ہی دم لیں۔ قرآن حکیم ایک مسلمان کی زندگی میں جو انقلابی روح پھونک دینا چاہتا ہے تفہیم القرآن میں اس کا بڑی حد تک سامان موجود ہے۔ قلوب و اذہان کو مسخر کرنے والی اس تفسیر کو مختلف زبانوں میں منتقل ہونے دیکھئے اور پھر دیکھیے کہ انقلابی جذبوں کی فراوانی کا عالم کیا ہوتا ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی ؒ نے مسلمانوں پر ایک عظیم احسان یہ کیا کہ انھیں احساس کمتری اور معذرت خواہانہ رویوں اور شکست خوردہ ذہنیت سے بڑی حد تک نجات دلا دی۔ اسلام کے حق میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی بڑی ہی مہلک ثابت ہوئیں۔ مسلمان مفکر اور سائنسدان عہد زوال میں تحقیق و جستجو سے دور ہوتے گئے اور یورپ میں احیائے علوم کی

ی تحریک نے علم و ہنر کے نئے نئے راستے کھول دیے ہمارے زیادہ تر علماء فقہی اور فروعی بحثوں میں اُلجھے رہے اور علم و فنون کی نئی یلغار سے دامن بچاتے بچاتے خانقاہوں اور مدرسوں میں محدود ہو گئے۔ زندگی کے حقیقی میدان میں مغربی مفکروں دانش وروں اور ہنرمندوں کا غلبہ ہو گیا، اور انھوں نے بے رحمی اور سفاکی اور بددیانتی سے اسلامی تہذیب و تمدن کے نقوش مٹانے شروع کیے اور اسلام کے خلاف جرائد و کتب کا سیلاب سا اُمڈ آیا جس میں یہ تاثر دیا گیا کہ مسلمان جلاد ہیں اور ہر آن تلواریں سونتے انسانی بستیوں پر ٹوٹ پڑنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔ پادری مستشرقین کے روپ میں نمودار ہوئے انھوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مطہر پر نازیبا حملے کیے اور ان کی مقدس زندگی کے اردگرد بہت سے رومانی افسانے تراش لیے۔ اس خونخوار مہم کا عالم اسلام پر گہرا اثر پڑا اور اسلام سے عام بیزاری اور بے تعلقی بڑھتی گئی۔ سب سے پہلے علامہ اقبالؒ نے مغربی علوم کے سمندر پی لینے کے بعد مغربی مفکروں کو چیلنج کیا اور اسلام کی صحیح اور سچی تصویر بڑی چابک دستی سے پیش کی۔ اُن کی فلسفیانہ تحریروں نے مغرب کے ممتاز مفکروں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ دوسری طرف اُن کی شاعری نے مسلمانوں میں فرنگی تہذیب کے خلاف شورش سی برپا کر دی اور اُن کے اندر کسی حد تک خودی کا شعور بیدار ہوا۔ علامہ اقبال ۳۸ء میں رحلت فرما گئے اور اُن کا عہد آفریں کام سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جاری رکھا۔ دراصل وہ علامہ ہی کی دعوت پر پنجاب منتقل ہوئے تھے۔

مولانا کا اپنا اسلوب جداگانہ تھا انھوں نے فلسفیانہ لب و لہجہ اختیار کرنے کے بجائے سادہ، طاقت ور اور دلنشین طرز اختیار کی۔ علمی شان و وجاہت کے ساتھ مغربی تہذیب کے بخیے ادھیڑ ڈالے اور فکری بالادستی کا سحر توڑ ڈالا اور آگے بڑھ کر اس قدر جارحانہ حملے کیے اور فکری محاذ میں کھلبلی سی مچ گئی۔ اُن کی زندہ جاوید کتاب "الجہاد فی الاسلام" نے علامہ اقبالؒ کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"کتاب الجہاد فی الاسلام" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار نہیں کیا بلکہ جنگ اور جہاد سے متعلق اسلام کے جو نظریات ہیں انھیں کسی تاویل یا تغیر کے بغیر بڑے کرّوفر سے پیش کیا ہے۔ اسلام کے نظریۂ جہاد اور اس کے قانونِ صلح و جنگ پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتاب الجہاد فی الاسلام ایک بہترین تصنیف ہے۔ میں ہر ذی علم آدمی کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس کا مطالعہ کرے۔"

وہ اسلام کی صداقتوں اور قدروں کو پورے اعتماد کے ساتھ اُجاگر کرتے ہیں اور ان صداقتوں کو ماننے والوں میں زبردست جوش و خروش اور بے پایاں عزم و یقین پیدا کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں کو احساسِ ہزیمت سے نکال کر زندگی آزادی کی جدوجہد سے روشناس کرا دینا اور ایک غالب و کارفرما تہذیب و تمدن کا شعور بخش دینا اور حکمرانی کے اسلامی اصولوں کو دنیا بھر کے لیے ایک چیلنج بنا دینا درحقیقت ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جس پر موجودہ و نسل اور آنے والی نسلیں فخر کریں گی۔

☆

اور اُن کا یہ تجدیدی کام بھی کسی اعتبار سے کم نہیں کہ انھوں نے اسلامی تاریخ کو مسلمانوں کی تاریخ سے ممیز کیا۔ اُن کا تاریخی شعور نہایت درجہ مستحکم اور صدرجہ لطیف تھا۔ انھوں نے سیاسی مصلحتوں سے بالا ہو کر اسلامی تحریک اور اسلامی تہذیب کے عروج و زوال کا ناقدانہ جائزہ لیا اور جو نتائج مرتب ہوئے انھیں بے کم و کاست قلمبند کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی معاشرے میں جو انقلاب برپا کیا تھا اور وہ جس قوت سے آگے پھیلا تھا اور بعد میں جو طاقتیں مزاحم ہوئی تھیں اُن کو اسباب و علل کے اصولوں پر اچھی طرح پرکھا اور انسانوں کو انسانی سطح پر رکھتے ہوئے اُن کی خوبیوں اور کمزوریوں کی نشان دہی کی۔ یہ جرح و تنقید "خلافت و ملوکیت" میں اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ "تجدید و احیائے دین" میں بھی اسی قسم کا تنقیدی عمل موجود ہے۔ ہمارے علما کی اچھی خاصی تعداد ان دونوں کتابوں سے برہم دکھائی دیتی ہے اور ان ہی نے مخلف مواد

مخالفت کے طوفان بھی اٹھائے۔ اور مسلمانوں کو
حرام اور عقیدت کے نام پر طرح طرح سے اکسایا
بی یہ روش آج بھی قائم ہے۔ دراصل دینی مدارس
تربیت یافتہ حضرات بالعموم تاریخی علوم اور
تاریخی اصول اور تاریخی شعور سے کم ہی آشنا
۔ وہ کسی تہذیب اور کسی انقلاب کے عروج
زوال میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ انھوں نے بزرگ
ہستیوں کے اردگرد تقدس کے ہالے بنا رکھے
اور وہ صحابۂ کرام اور اولیائے عظام کو
غلطیوں اور خطاؤں سے بلند تر سمجھتے ہیں اور
پر قانع ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اس انقلاب
دوبارہ زندہ کرنا چاہتا ہے جو قرآن حکیم نے عرب
سرزمین میں برپا کیا تھا تو وہ اسلامی تاریخ میں
کر یہ معلوم کرنا چاہے کہ اسلامی تہذیب کو زوال
کن کن عوامل نے کیا، کیا کیا فتنے اٹھے اور
کس سے کیا کیا لغزش ہوئی۔ اس بے لاگ
یے کے بغیر احیائے دین کی کوئی بھی کوشش
کامیاب نہیں ہو سکتی۔ دو رستوں میں سے
ہی رستہ اختیار کیا جا سکتا یا تاریخ کو سرے
نظر انداز کیا جائے اور اسلام کو سرنگوں

بھی رکھا جائے یا پھر واقعات و عوامل کی چیر پھاڑ کر
لی جائے اور اسلامی انقلاب کو ماضی کی غلطیوں سے
محفوظ رکھتے ہوئے ایک زندہ قوت بنا دیا جائے
مولانا نے اپنے لیے دوسرا راستہ منتخب کیا اور
پامردی سے ہر مخالفت کا وار سہا اور اپنا مشن
جاری رکھا روح عصر سے واقف انسان کا
یہی شیوہ رہا ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک طرف
تاریخی واقعات کا بے لاگ محاکمہ کیا اور دوسری
طرف اُن اداروں۔ اُن شعبوں اور اُن تحریکوں
کا بھی حکیمانہ جائزہ لیا جو مسلمانوں کے انحطاط
اور زوال کا باعث بنی ہوئی تھیں۔ انھوں
نے اصول تفسیر، علوم حدیث۔ اصول فقہ۔
علم کلام۔ نظام تصوف اور فلسفہ و منطق کے
مختلف دبستانوں پر دینی اور تاریخی پس منظر
میں شرح و بسط کے ساتھ لکھا اور کسی رو رعایت
کے بغیر امراض کی نشان دہی کر دی۔ مگر جہاں
جہاں نشتر اترا ایک ہنگامہ اٹھتا چلا گیا دین
اور مذہب کے نام پر صدیوں سے چلا آ رہا

قائم تھیں۔ ان کے مجاور سخت طیش میں آگئے اور
اربابِ دانش بھی بل کھانے لگے۔ جو صوفیہ
کا لیبل لگا کر مسلمانوں کو دین سے بیزار اور بے
تعلق کر رہے تھے۔ مولانا کا محکم استدلال یہ تھا
کہ اسلام ایک زندہ متحرک اور روزمرہ کے معاملات
میں رہنمائی بہم پہنچانے والا دین ہے۔ اس
کے مزاج کا اولین تقاضا یہ ہے کہ غور و فکر
اور سوچ بچار کا عمل جاری و ساری رہے اور اس
کی فطری نشو و نما پر جمود طاری ہونے نہ پائے۔
اس مقصد کے لیے استنباط، استخراج اور اجتہاد
کی اشد ضرورت ہے۔ مگر ہمارے ہاں جو مذہبی
مدرسے اور دارالعلوم قائم ہیں، وہ طالب علموں
میں وہ نگاہ اور بصیرت پیدا نہیں کرتے، جو
مزاج شناسِ رسول ہو اور دورِ حاضر کے مسائل
اسلام کی روشنی میں حل کر سکتی ہو، اس لیے ہمیں
ایک ایسا نظامِ تعلیم قائم کرنا ہوگا جو قرآن و سنت
کا صحیح فہم عطا کرے اور جدید علوم کو اسلامی نقطہ
نظر کے تابع کر دے۔ اس کے علاوہ مولانا نے
تصوف کے موجودہ نظام پر بھی تنقید کی کہ اس
نے مسلمانوں کو زندگی کی جدوجہد سے الگ

تھلگ کر دیا ہے اور خانقاہوں میں
کے سوا اور کچھ نہیں رہا جب کہ اسلام
سب سے بڑا انقلابی مذہب ہے
مسلسل عمل اور پیہم جدوجہد کا تقاضا کرتا
مولانا کی ان تنقیحات نے بعض
پسند علماء کے اندر بے حد اضطراب پ
انھوں نے حقیقتِ حال پر ٹھنڈے دل
دماغ سے سوچنے اور اصلاحی تجاویز پ
کرنے کے بجائے نئی آواز کو دبانا چاہا
الزام تراشیوں اور بہتان طرازیوں کا ط
اٹھا دیا۔ مولانا غیر معمولی صبر و تحمل سے کام
ہوئے اُن کی بے سر و پا باتیں سنتے رہے
خاموشی سے ذہنوں کا آپریشن کرتے چلے گئے
دوسری طرف تجدد پسند طبقہ اُن کا بہت
زیادہ مخالف ہو گیا۔ انگریزوں کے زیرِ اثر مسلمانو
میں ایسا ذہن بھی پیدا ہو گیا تھا جو اسلام کے اندر
سے اس کی روح نکال دینا چاہتا تھا۔ کسی نے
کہا، اب جہاد حرام ہو چکا ہے۔ دوسرے نے
کہا اب احادیث کا ذخیرہ ناقابلِ اعتبار ہے اس
لیے قرآن ہی سب کچھ ہے اور حضرت محمد

یت (خاکم بدہن) ایک ہرکاست یا ایک ڈھیلی
سی ہے۔ کہیں سے آواز بلند ہوئی کہ اجتہاد
کے ذریعے، نئے زمانے سے ہم آہنگ ایک نیا
نظام وضع نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کسی نے فتویٰ دیا کہ
سود کی موجودہ صورت کسی بھی طور حرام نہیں۔
بعض نفس ساماؤں نے یہ شوشہ بھی چھوڑا کہ قرآن
میں شراب کی تحریم کا حکم ہے ہی نہیں اور
ایک گروہ نے یہ تاویل بھی پیش کی کہ انگریز کی
اطاعت قرآن کی رو سے لازم قرار پائی ہے
مغربی علوم و فنون کی آب و تاب سے خیرہ
ہو جانے والے بعض دماغوں نے رد قرآن
اور اسلام کی اصلاح بھی وضع کی اور مسلمانوں
کے ذہنی انتشار میں اضافہ کیا۔

سید ابوالاعلیٰ نے ان تمام غلط اور گمراہ کن
رجحانات اور تحریکات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور
اپنے قلم سے جو خداداد قوتوں اور صلاحیتوں
سے آراستہ تھا، شب و روز کام لیا اور شکوک
شبہات کے سارے ہی کانٹے صاف کر دیئے
ابھرنے والے فتنوں کا وہ سدباب کیا کہ نوجوان
ذہنوں کی کایا ہی پلٹ گئی۔ مولانا نے اسلام کے
تاریخی تسلسل اور عظیم روایات کے درمیان مضبوط
رشتہ قائم رکھا اور اجتہاد کا حق فقط ان اصحاب کو
دیا جو قرآن و سنت اور پورے اسلامی لٹریچر پر کامل
دسترس رکھتے ہوں جن کی سیرت و کردار اسلام کے
سانچے میں ڈھلی ہو اور جو نئے مسائل کا ادراک
اور حل تلاش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ان
حدود و قیود نے تجدد پسند حضرات کے سارے
ہی عزائم خاک میں ملا دیے۔ اس طرح اسلام کے
اندر پاپائیت کے لئے بھی کوئی گنجائش نہ رہی۔
اور دین کی قیود سے آزاد ہو کر من مانی کرنے کا حق
بھی نہ ملا۔ پھر مولانا نے پردہ کی حمایت میں ایک
ایسی معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کی کہ اسلام کا مکمل
معاشرتی اور تہذیبی نظام بھی سامنے آگیا۔ اور
مغربی تہذیب کی ہولناکیاں اور ہوس رانیاں بھی
بے نقاب ہوگئیں۔ اس کے علاوہ جب سود کے
موضوع پر قلم اٹھایا تو دنیا بھر کے معاشی تصورات
کے اچھے اور برے پہلو اس طرح اجاگر کئے کہ
اسلام کا اقتصادی نظام، عدل و توازن کا شاہکار
نظر آنے لگا۔ پھر قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں
اس طور قلم بند کیں کہ قرآن کا ربانی نظام گویا سمیٹ

کر دینا ہر مسلمان کے لئے لازم قرار پایا اور طاغوت سے ٹکرا جانا جہاد کا اہم حصہ ٹھہرا اور عالمی سطح پر ایک عادلانہ نظام کا قیام قرآن کو منتہائے مقصود بنکر سامنے آیا۔

اس علمی جہاد نے تجدد پسند گروہوں کو مولانا کا بدترین دشمن بنا دیا۔ دین کو اپنی مرضی کے تابع رکھنے والے حضرت سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو رجعت پسند اور اکثر ملّا اور انتہا پسند مجنوں کے خطابات سے نوازتے رہے اور قدامت پسند علماء کا ایک طبقہ انہیں گستاخِ رسول قرار دیتا رہا۔ دونوں طبقے اپنے اپنے مفادات کے لئے شعلے بھڑکاتے رہے، لیکن اس سے بڑی اور کوئی حقیقت نہیں ہو سکتی کہ سید مودودیؒ نے سیرتِ رسولؐ جس انداز سے مرتب کی اور نبوت کا صحیح مقام جس قوت، جس بصیرت اور جس عشق و محبت سے اپنی تحریروں، تقریروں اور عملی جدوجہد میں واضح کیا اس کی مثال ان حلقوں میں شاید ہی مل سکے گی جو میلے سجانے اور محفلیں منعقد کرنے سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اطاعتِ رسولؐ کا حق ادا ہو گیا۔

اور اسی طرح یہ حقیقت بھی ناقابلِ تردید ہے کہ مولانا اپنے عہد کے بڑے ہی روشن خیال اور بڑے ہی معتدل مزاج اور بڑے ہی جدید ذہن کے انسان تھے۔ انھوں نے دینی معاملات کی تشریح اور تعبیر میں حیاتیاتی، نفسیاتی، معاشی، عائلی اور بین الاقوامی تقاضے جس عمدگی اور حسن و خوبی سے جذب کئے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ اسی لئے ان کے ہاں شدت نہیں، وہ انسانی فطرت کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں اور دین میں بے جا سختی اور تنگی پیدا کرنے کے زبردست مخالف انسانی جذبوں اور داعیوں کے وہ زبردست نبض شناس تھے۔ اسی لئے انھوں نے مسائل و مسائل میں غیر معمولی حکمت، میانہ روی اور حقیقت پسندی سے کام لیا۔ ان جیسا بالغ النظر اور وسیع النظر دینی رہنما خدا جانے کب پیدا ہو۔

✣

سید ابوالاعلیٰ مودودی بیسویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوئے۔ یہ عہد بڑا ہی پُر فتن تھا۔ یورپ میں خدا اور مذہب کے خلاف عام بغاوت

سی بھی۔ فلسفی، مورخ، ادیب اور سائنس داں اور سیاسی مفکرین نت نئے نظریات پیش کر رہے تھے۔ سب نے مل جل کر ایک ہی تاثر دیا۔ کہ دنیاوی زندگی ہی سب کچھ ہے اور انسان تخلیق کے سبب سے ایک حیوان ہی تو ہے۔ اس لئے حیوانی خواہشات کی تکمیل میں وہ پوری طرح آزاد اور خود مختار ہے اور خدا کا کہیں وجود نہیں۔

ان افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت بڑے پیمانے پر ہوئی اور علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں جو نئی نئی دریافتیں اور انکشافات ہو رہے تھے۔ انہیں مذہب اور خدا کے خلاف استعمال کیا گیا۔ ایک دنیا مبہوت ہو گئی اور الحاد اور دہریت کا ایک طوفان سا اُمڈ آیا۔ خدا سے بیزاری ایک فیشن سا بن گیا۔

اسی زمانے میں ڈاروِن کا طوطی بولنے لگا اور پھر کارل مارکس کے اقتصادی نظریات سامنے آئے اور اُدھر فرائڈ نے جنسی بے راہ روی کے سارے دروازے کھول دیے۔ ہر حق اور ہر اصول طوفان کی زد میں تھا۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ مسلمان اپنی میراث شاید ہی محفوظ رکھ سکیں۔

ہندوستان کی سرزمین سے سب سے پہلے علامہ اقبالؒ نے کفر و الحاد کی تحریکوں اور اُن کے اساسی نظریات کو چیلنج کیا اور علمی انداز میں یورپ کے مفکرین و محققین کی فکری لغزشیں بے نقاب کیں۔ اسلام کے نظریات، عقائد اور اخلاق اور سیاسی نظام انہی کے اسلوب اور انہی کے پیرائے میں پیش کئے۔ اُن کی کاوشوں سے مسلمانوں میں اعتماد پیدا ہوا۔

علامہ اقبالؒ کی تحریریں بہت گہری اور دقیق تھیں۔ انہیں سمجھنے کے لئے علمی ذہنی صلاحیتوں کی ضرورت تھی۔ اُن کے چھ خطبات جس قدر بلند پایہ ہیں، اسی قدر کم سمجھے گئے ہیں۔ اسی طرح اُن کی شاعری نے ذہنی استعماریت کے خلاف جذبات میں طوفان سا اٹھا دیا۔ اور ملت اسلامیہ کو اپنی ذات کا شعور بخشا اور اُس کے اندر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا رس بھر دیا۔ مگر شاعری ایک مفصل نظامِ فکر و عمل تخلیق نہ کر سکتی تھی، اس میں تو بلیغ اشارے اور رمز و کنایے ہی ممکن تھے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اُن اشاروں

اور کتابوں سے آگے بڑھ کر مستقل کتابیں تصنیف کیں۔ پہلے مغربی علوم کا برسوں مطالعہ کیا۔ ایک ایک دریافت اور ایک ایک نظریے کی حقیقت سمجھی۔ تاریخ کے سارے ہی زیر و بم دیکھے۔ فلسفیوں اور مفکروں کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ ادب اور لٹریچر پر ناقدانہ نظر ڈالی۔ یورپ میں کلیسا نے کیا کیا گل کھلائے تھے۔ اُن کا تفصیلی جائزہ لیا اور پھر قرآن و سنت کے مطالعے سے جو نورِ بصیرت حاصل ہوا اور اُن پر عمل کرنے سے جو شرحِ صدر میسر آیا، اس سے بھرپور کام لیتے ہوئے مولانا نے دہریت، الحاد، سرمایہ داری، اشتراکیت اور قومیت کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیا۔ اُن کی تنقید اس قدر جامع، مدلل اور سائنٹیفک ہوتی کہ دوسری طرف سے اُن کا معقول جواب کم ہی بن پڑتا ہے۔ خدا کے وجود اور یومِ آخرت کے جواز میں انھوں نے ایسی ایسی دلیلیں فراہم کیں کہ ہر ذی علم انہیں ماننے پر مجبور تھا۔ اُن کے علم کلام میں سادگی سلاست اور تاثیر تھی۔ اُن کا زورِ بیان اور تفسیرِ موضوع ان کی کامل دسترس عقل و فکر کو تسخیر کرتی ہوئی دل و جگر میں اُتر جاتی تھی۔ مولانا کی "تفہیمات" اور "تنقیحات" کا باوقار اور جاندار لہجہ دیکھنے کی چیز ہے وہ تمام شبہے بھی جن میں یورپ کی مادہ پرستانہ تہذیب مبتلا تھی۔ مولانا کا نشترِ قلم اُن کے اندر پیوست ہو گیا۔ انھوں نے خالص تحقیقی اور سائنٹفک زبان میں اُن تصورات پر کاری ضرب لگائی: مادیت، الحاد اور اشتراکیت کی بنیاد بنے ہوئے تھے۔ ان حملوں سے اہلِ یورپ گھبرا گئے اور دوسری طرف مسلم نوجوانوں میں بلا کا جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ مولانا کے لٹریچر نے جس جوان نسل کو سیراب کیا، وہ دین و اخلاق اور مذہب کی طرف پلٹی اور خود مغرب اور مشرق میں روحانیت اور اخلاقیات کی پیاس بڑی ہی شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ آج سے چالیس پچاس برس پہلے مولانا ابوالکلام آزاد بے اختیار کہہ اٹھے تھے:

"مولانا گلشنِ حق کے اُن لالہ و نسترن میں سے ہیں جن کی خوشبو سدا بہار، ہمیشہ متعفن باطل کو مغلوب کر کے طالبانِ حق کے دل و دماغ کو معطر کرتی رہتی ہے اور جسے فنا نہیں۔"

اور علامہ شیخ مصطفےٰ زرقا جو شام کے جید علماء میں شامل ہوتے تھے۔ مولانا مودودیؒ کے

فکر کی کاٹ اور قوت کو محسوس کرتے ہوئے فرمایا:

"حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی دینی فکر کے اعتبار سے امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ کی صف کے مفکر ہیں۔"

اور علامہ سید سلیمان ندوی ان کو بر سرِ کار دیکھتے ہوئے پکار اٹھتے ہیں۔

"مولانا مودودی صاحب سے علمی دنیا پورے طور پر واقف ہو چکی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ آپ اس دور کے متکلمِ اسلام اور ایک بلند پایہ عالمِ دین ہیں۔ یورپ سے الحاد و دہریت کا جو سیلاب ہندوستان میں آیا تھا، قدرت نے اس کے سامنے بند باندھنے کا انتظام بھی ایسے ہی مقدس اور پاک طینت ہاتھوں سے کرایا ہے جو خود یورپ کے قدیم و جدید خیالات سے نہایت اعلیٰ طور پر کما حقہ واقفیت رکھتا ہے اور پھر اس کے ساتھ قرآن و سنت کا اتنا گہرا اور واضح علم رکھتا ہے کہ موجودہ دور کے تمام مسائل پر اس کی روشنی میں تسلی بخش طور پر گفتگو کر سکتا ہے۔"

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اسلام کا نظامِ فکر و عمل مجموعی حیثیت سے واضح کرنے، مسلمانوں کو جاہلانہ اور مشرکانہ رسوم و رواج سے بلند تر کر دینے، گروہ بندیوں اور فرقہ پرستیوں سے نجات دلانے اور الحاد و مادیت کی یلغار کی روک تھام کے لئے نہایت جلیل القدر کتابیں تصنیف کیں اور سعید اور پاکیزہ روحوں کو یکجا کر کے اسلامی انقلاب کے لئے جہاں گسل کشمکش کی بنا ڈالی۔ مگر وہ ایک بار بھی اپنی خدمات اور احسانات کا ذکر زبان پر نہ لائے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ سب سے الگ اور سب سے جدا چلنے کے بجائے، ہمیشہ اپنے آپ کو اسلامی تحریکوں کا ایک فرد اور ایک خادم جانا اور دنیا بھر کے تمام علماء اور صلحاء کو مشترکہ پلیٹ فارم پر اکٹھا کر کے ان کے پہلو بہ پہلو چلنے کی سعادت حاصل کی۔

وہ انفرادیت سے زیادہ اجتماعیت کے قائل تھے۔ امام خمینی ہوں یا قطب شہید مرحوم یا حسن البنا ہوں یا عبدالقادر عودہؒ سبھی کے معترف اور سبھی کے ہم سفر تھے۔ اسلام پر اچھی کتاب جہاں کہیں شائع ہوئی انھوں نے اسے اپنی متاعِ گراں مایہ سمجھا اور پھر مختلف زبانوں میں منتقل کرانے

کا خاص طور سے اہتمام کرایا۔ ان روئیوں سے یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی ذات، اپنی شہرت یا اپنی مقبولیت کے بجائے اسلام کے فروغ اور اسے غالب کرنے کے آرزومند تھے۔ نام و نمود کے ہر رنگ سے گریزاں اور ذاتی نمائش کے ہر پہلو سے بالاتر۔ جانتے تھے کہ ماضی میں مسلمانوں کی بڑی تحریکیں کسی ایک فرد کی انا پر قربان ہوگئیں یا پھر معتقدین کے والہانہ پن نے قائد کو فریبِ نفس میں مبتلا کردیا اور ہزاروں فتنے جاگ اٹھے۔ مولانا نے اپنی ذات نہ کسی پر مسلط کی اور نہ اسے مرکزِ پرستش بننے دیا۔ حزم و احتیاط کا یہ عالم کم کم ہی دکھائی دیتا ہے اور جہاں ہے، وہاں حقیقی عظمت بھی ہے۔

٭

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے قلمی جہاد جس ... ہی اور عرق ریزی سے کیا، اس سے بڑا جہاد تھا کہ سیرت و کردار میں عظیم انقلاب پیدا کردیا۔ ... ن کتابیں انھوں نے اس طرح تصنیف کیں ... ت کے وقت لکھنے بیٹھتے اور صبح ہونے ... مکمل کرکے اٹھتے۔ ایک بار دورانِ گفتگو فرمایا ... زمانے میں خیالات و افکار یوں امڈ امڈ

کے آتے تھے کہ انھیں سمیٹ لینا دشوار ہو جاتا۔ پر خدا کا یہ ہمیشہ ہی خاص فضل رہا کہ لکھنے سے پہلے کسی موضوع پر کچھ سوچنے کی ضرورت محسوس ہی نہ ہوئی تھی۔ بایں ہمہ اُن کی خداداد صلاحیتوں اور توانائیوں نے جو کچھ تخلیق اور تصنیف کردیا ہے اور اُسے جو شہرتِ دوام حاصل ہوئی ہے، وہ کام دُنیا کے بڑے سے بڑے ادارے اور بڑے سے بڑے دماغ نہیں کرسکتے۔ یہی کارنامہ کچھ کم شاندار تھا کہ انھوں نے سیرت سازی کا دشوار تر فریضہ اپنے ذمے لے لیا۔ اور یہاں بھی انھوں نے ابتدا اپنی ذات ہی سے کی۔

پہلے اپنی زندگی کو خدا اور رسولؐ کی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کا بیڑا اٹھایا اور مصنوعی طور طریق اختیار کرنے کے بجائے فطری اور شعوری راستہ اپنایا۔ اُن کی آرزو تھی کہ ہر نوع کی تبدیلی قلب و ذہن کی کامل آمادگی کے ساتھ آنی چاہیے، لہٰذا ذہن کو تیار کرتے رہے۔ داڑھی رکھنے سے متعلق مولانا نے ذہنی کش مکش کی ایک رات ساری روداد سنائی:

احادیث کے مطالعے سے مجھ پر یہ ظاہر ہوچکا

تھا کہ داڑھی رکھنا سنّت کے درجے میں ہے؟ چنانچہ روزانہ شیو کرتے وقت یہ بات ذہن میں ڈالتا گیا، اور داڑھی مونڈنے کے خلاف دل میں نفرت بٹھاتا رہا۔ یہ عمل خاصی مدّت اسی صورت میں جاری رہا۔ پھر ایک صبح دل نے شیو بنانے سے انکار کر دیا اور میرا ہاتھ وہیں رُک گیا۔ وہ دن اور آج کا دن اس کے بعد ڈاڑھی پر کوئی آنچ نہ آئی۔"

یہ تھا مولانا کا مخصوص طریقہ۔ وہ کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے جسم کی پوری قوتوں کو اپنا ہمنوا بناتے اور پھر جب قدم اُٹھ جاتا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے واپس نہ لا سکتی تھی۔ پھر کوئی خوف لاحق ہوتا نہ ملال، کوئی پریشانی، نہ کسی قسم کی پشیمانی۔ یکسوئی کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے۔

مولانا کے ذی شان مقام نے سیرت و کردار کے سلسلے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کو سامنے رکھا اور اسی کے اتباع کو زندگی کا ماحصل اور آخرت کا زادِ راہ سمجھا اور اپنے اندر وہ تمام بنیادی صفات پیدا کر لیں جو اسلامی تہذیب کے بھرپور اظہار کے لئے ناگزیر تھیں۔

رحمت دو عالم کی حیات طیبہ کا نمایاں پہلو اُن کی حق پرستی اور صداقت شعاری ہے۔ مولانا نے اس آئیڈیل تک پہنچنے کے لیے مسلسل جد و جہد کی اور حق شناسی اور حق گوئی کو اپنا شعار بنا لیا۔ قرآن اور حدیث سے جو بات ثابت ہوئی، کمال آمادگی سے اپنالی۔ پھر اس کی حمایت اور اشاعت میں زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف کر دیا۔ وہ عمر بھر حق کا بول بالا کرنے کے لیے اذیتیں جھیلتے اور مصیبتیں اٹھاتے رہے۔ اپنوں کے وار بھی سہے اور غیروں کے زخم بھی، لیکن صراطِ مستقیم پر ڈٹے رہے۔ سچ بات کے اظہار میں ذرہ برابر مصلحت سے کام نہ لیا اور مخالفتوں اور مزاحمتوں کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ بعض مقامات پر دوستوں نے انھیں خاموش رہنے یا سکوت فرمانے کا مشورہ بھی دیا مگر انھوں نے ان مشوروں کے علی الرغم سچی بات کہی اور نتائج سے بے نیاز ہو کر کہی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ رسولؐ خدا کی غلامی کا دعویٰ کرنے کے بعد یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان حق سے دست بردار ہو جائے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لے۔ چنانچہ انھوں نے داعیِ حق کی حیثیت سے باطل کی قوتوں کا

کا خاص طور سے اہتمام کرایا۔ الاصدیوں سے یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی ذات، اپنی شہرت یا اپنی مقبولیت کے بجائے اسلام کے فروغ اور اسے غالب کرنے کے آرزومند تھے۔ نام ونمود کے ہر رنگ سے گریزاں اور مذاقِ نمائش کے ہر پہلو سے بالاتر۔ جانتے تھے کہ ماضی میں مسلمانوں کی بڑی تحریکیں کسی ایک فرد کی انا پر قربان ہو گئیں یا پھر معتقدین کے والہانہ پن نے قائد کو فریبِ نفس میں مبتلا کر دیا اور ہزاروں فتنے جاگ اٹھے۔ مولانا نے اپنی ذات نہ کسی پر مسلط کی اور نہ اُسے مرکزِ پرستش بننے دیا۔ حزم واحتیاط کا یہ عالم کم کم ہی دکھائی دیتا ہے اور جہاں ہے، وہاں حقیقی عظمت بھی ہے۔

❖

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے قلمی جہاد جس تندہی اور عرق ریزی سے کیا۔ اس سے بڑا جہاد تھا کہ سیرت وکردار میں عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔ [illegible]ن کتابیں انھوں نے اس طرح تصنیف کیں [illegible]ات کے وقت لکھنے بیٹھتے اور صبح ہونے [illegible]مکمل کر کے اُٹھتے۔ ایک بار دورانِ گفتگو فرمایا زمانے میں خیالات وافکار اُمڈ اُمڈ کے آتے تھے کہ انھیں سمیٹ لینا دشوار ہو جاتا۔ مجھ پر خدا کا یہ ہمیشہ ہی خاص فضل رہا کہ لکھنے سے پہلے کسی موضوع پر کچھ سوچنے کی ضرورت محسوس ہی نہ ہوئی۔“ بلاشبہ اُن کی خداداد صلاحیتوں اور توانائیوں نے جو کچھ تخلیق اور تصنیف کر دیا ہے اور اُسے جو شہرتِ دوام حاصل ہوئی ہے، وہ کام دنیا کے بڑے سے بڑے ادارے اور بڑے سے بڑے دماغ نہیں کر سکتے۔ یہی کارنامہ کچھ [illegible] تھا کہ انھوں نے سیرت سازی کا دشوار تر فریضہ اپنے ذمے لے لیا۔ اور یہاں بھی انھوں نے ابتدا اپنی ذات ہی سے کی۔

پہلے اپنی زندگی کو خدا اور رسولؐ کی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کا بیڑا اُٹھایا اور مصنوعی طور طریق اختیار کرنے کے بجائے فطری اور شعوری راستہ اپنایا۔ اُن کی آرزو تھی کہ ہر نوع کی تبدیلی قلب وذہن کی کامل آمادگی کے ساتھ آنی چاہیے لہٰذا ذہن کو تیار کرتے رہے۔ ڈاڑھی رکھنے سے متعلق مولانا نے ذہنی کشمکش کی ایک رات کی روداد سنائی:

احادیث کے مطالعے سے مجھ پر یہ ظاہر ہو چکا

تھا کہ داڑھی رکھنا سنت کے درجے میں ہے؛ چنانچہ روزانہ شیو کرتے وقت یہ بات ذہن میں ڈالتا گیا، اور داڑھی مونڈنے کے خلاف دل میں نفرت بٹھاتا رہا۔ یہ عمل خاصی مدت اسی صورت میں جاری رہا۔ پھر ایک صبح دل نے شیو بنانے سے انکار کر دیا اور میرا ہاتھ وہیں رُک گیا۔ وہ دن اور آج کا دن اس کے بعد ڈاڑھی پر کوئی آنچ نہ آئی۔

یہ تھا مولانا کا مخصوص طریقہ۔ وہ کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے جسم کی پوری قوتوں کو اپنا ہمنوا بناتے اور پھر جب قدم اُٹھ جاتا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے واپس نہ لا سکتی تھی۔ پھر کوئی خوف لاحق ہوتا نہ ملال، کوئی پریشانی، نہ کسی قسم کی پشیمانی۔ یکسوئی کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے۔

مولانا کے ذی شان مقام نے سیرت و کردار کے سلسلے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کو سامنے رکھا اور اسی کے اتباع کو زندگی کا ماحصل اور آخرت کا زادِ راہ سمجھا اور اپنے اندر وہ تمام بنیادی صفات پیدا کر لیں جو اسلامی تہذیب کے بہترین معیار کے لئے ناگزیر ہیں۔

رحمت دو عالم کی حیاتِ طیبہ کا نمایاں پہلو اُن کی حق پرستی اور صداقت شعاری ہے۔ مولانا نے اس آئیڈیل تک پہنچنے کے لیے مسلسل جدوجہد کی اور حق شناسی اور حق گوئی کو اپنا شعار بنا لیا۔ قرآن اور حدیث سے جو بات ثابت ہو گئی، کمال آمادگی سے اپنا لی۔ پھر اس کی حمایت اور اشاعت میں زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف کر دیا۔ وہ عمر بھر حق کا بول بالا کرنے کے لیے اذیتیں جھیلتے اور مصیبتیں اٹھاتے رہے۔ دشمنوں کے وار بھی سہے اور غیروں کے زخم بھی، لیکن صراطِ مستقیم پر ڈٹے رہے۔ سچی بات کے اظہار میں ذرہ برابر مصلحت سے کام نہ لیا اور مخالفتوں اور مزاحمتوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ بعض مقامات پر دوستوں نے انھیں خاموش رہنے یا سکوت فرمانے کا مشورہ بھی دیا مگر انھوں نے ان مشوروں کے علی الرغم سچی بات کہی اور نتائج سے بے نیاز ہو کر کہی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ رسولِ خدا کی غلامی کا دعویٰ کرنے کے بعد یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان حق سے دست بردار ہو جائے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لے۔ چنانچہ انھوں نے داعیِ حق کی حیثیت سے باطل کی قوتوں کا

ش کو مقابلہ کیا اور جسم و جان کی ساری توانائیاں
اس مقصد عظیم میں کھپا دیں اور بس یہی آرزو رکھی
کہ اللہ تعالیٰ میری سعی اور میری تگ و دو کو قبول
فرمائے اور میری لغزشوں اور کوتاہیوں سے
صرف نظر کرے۔ حق کے راستے پر چلنے کے
سارے ہی عواقب و نتائج اُن کے سامنے
تھے۔ چنانچہ اُن کی تحریروں اور اُن کی تقریروں
میں واضح اشارے اور نقشے ملتے ہیں۔ ایک
موقع پر اُن کے الفاظ یہ تھے:

• حق کے متعلق یہ بات اچھی طرح سمجھ
لیجئے کہ وہ بجائے خود حق ہے۔ وہ ایسی مستقل
اقدار کا نام ہے جو سراسر صحیح اور صادق ہیں
ر تمام دنیا اس سے منحرف ہو جائے تب بھی وہ
تا ہی ہے۔ مصائب حق پر نہیں اہل حق پر
تے ہیں لیکن جو لوگ سوچ سمجھ کر کامل قلبی
نان کے ساتھ یہ فیصلہ کر چکے ہوں کہ انہیں
ً حق ہی پر قائم رہنا ہے اور اسی کا بول
نے کے لئے اپنا سارا سرمایۂ حیات لگا
، وہ مصائب میں مبتلا ضرور ہونے
ن ناکام کبھی نہیں ہو سکتے۔"

مولانا کو اپنے مقصد کی سچائی، اللہ تعالیٰ
کی تائید و حمایت اور حق و صداقت پر قائم رہنے
والوں کی کامیابی پر اس قدر پختہ یقین تھا
کہ بدترین حالات میں بھی وہ گھبراتے نہ تھے
کیا کیا وقت نہیں گزرا اُن پر۔ حکومت
شدید مخالف، عوام سخت برہم اور حق پرستوں
کی مٹھی بھر جماعت۔ راہ چلتے لوگ کاٹنے
کو دوڑتے۔ یہ عہد طویل تر تھا مگر مولانا یہی
فرماتے رہے کہ ہم حق پر ہیں اور ایک دن
قوم اپنی غلطی محسوس کرے گی۔ حق کے لئے
یہ استقامت دامنِ رسول ﷺ کے دبستان
ہی میں پیدا ہو سکتی ہے۔

٭

سیرتِ رسول ﷺ میں رزقِ حلال، حمیت
اور عزتِ نفس کو غیر معمولی مقام حاصل ہے
مولانا نے اپنی زندگی میں ان تینوں باتوں
کا خاص طور پر خیال فرمایا۔ وہ تاریخ کے حوالے
سے اس حقیقت تک پہنچ گئے تھے کہ دعوتِ حق
وہی شخص لے کر اٹھ سکتا ہے اور اسے آبرومندی
سے آگے بڑھا سکتا ہے جس کے پاس جائز وسا

...چھے انسانوں کی ایک جماعت ہو۔ وہ قائد جو
...احتیاجات کے لیے دوسروں کے ہاتھوں
...طرف دیکھتا ہو۔ کم ہی آزادی بے خوفی اور
...داری سے کام کرسکتا ہے۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ
...مودودی ہونے سب سے پہلے اپنے لیے اور
...نے خاندان کے لیے رزقِ حلال کا باعزت
...انتظام کیا۔ کتابوں کی تصنیف و اشاعت کے
...لیے شروع میں بس اتنا میسر آگیا کہ تنگی ترشی
...سے بسر ہوسکے۔ خاصی طویل مدت تک یہی
...رہا۔ مولانا کے کپڑوں پر بسا اوقات پیوند
...ہوتے۔ پھر اپنی آمدنی کا کثیر حصہ جماعت
...ی کے لیے وقف کردیا۔ دعوتِ حق کی
...مرحلہ جب ایثار کا مطالبہ دوسروں سے
...تے تھے سب سے پہلے اُس ایثار کا نمونہ
...قائم کیا۔ برسوں جیل میں رہے لیکن کسی کو
...ں کان خبر نہ ہونے دی کہ اُن کا گھر کس حال
...ہے۔ جاں نثار رفقا نے ازخود اُن کے
...حالات میں دلچسپی لی، مگر اُن کی طرف سے
...ی تقاضا نہ ہوا۔
...لکھا ایسی تحریر کہ حکومت سے کبھی کوئی

درخواست کی۔ جیل کے حکام نے بتایا کہ ہم نے مولانا
کی زبان سے کبھی کوئی حرفِ شکایت نہ سنا۔ خدا کے
سوا کسی اور سے التجا کرنا یا اس کے آگے ہاتھ
پھیلانا اُن کے تصورات ہی سے خارج تھا۔
جب وہ پہلی بار جیل گئے تو اپنے مضبوط کیرکٹر
کے ان مٹ نقوش چھوڑ کر آئے۔ اُس زمانے
کا ایک سینئر وارڈن مجھ سے ملا۔ اُس نے بتایا
کہ مولانا کو جیل خانے میں جو کمرہ دیا گیا وہ بڑا ہی
گرم تھا۔ سخت گرمیوں میں بالکل تندور کی مانند
تپنے لگتا۔ مولانا نے اُف تک نہ کی اور پنکھے کا
مطالبہ بھی نہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد انھیں ٹیبل فین
فراہم کیا گیا مگر وہ چلتا کم اور شور زیادہ کرتا تھا۔
وہ عذاب بھی خندہ پیشانی سے برداشت کر گئے
اُن کی پیشانی پر کوئی بل تھا نہ کوئی عکسِ ملال۔
وہ تو رضائے الٰہی کی لذتوں سے سرشار تھے۔
مولانا نے دعا کی قبولیت کے زیرِ عنوان
تفہیم القرآن میں اپنا ایک واقعہ درج فرمایا ہے
اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی
اور موت کے نازک ترین لمحات میں بھی اپنی
عزتِ نفس کے کس حد تک پاسدار تھے اور

موت اللہ تعالیٰ ہی کے آگے حرفِ مدعا بیان فرماتے تھے۔ تفہیم القرآن کی چھٹی جلد میں صفحہ نمبر: ۵۶ پر ایک عجیب و غریب حاشیہ درج ہے۔

"۱۹۴۸ء میں جب مجھے نظر بند کیا گیا تو چند روز بعد ایک پتھری میرے مثانے میں آکر اڑ گئی اور سولہ گھنٹے تک پیشاب بند رہا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میں ظالموں سے علاج کی درخواست نہیں کرنا چاہتا تو ہی میرا علاج فرما دے۔ چنانچہ وہ پتھری پیشاب کے راستے سے ہٹ گئی اور بیس برس تک ہٹی رہی یہاں تک کہ ۱۹۶۸ء میں اس نے پھر تکلیف دی اور اُسے آپریشن کر کے نکالا گیا۔"

چند ہی سال بعد ۱۹۵۳ء میں قادیانیوں کے خلاف تحریک چلی۔ مولانا نے قادیانی مسئلہ کے عنوان سے ایک فکر انگیز پمفلٹ لکھا۔ اُن دنوں لاہور میں مارشل لا نافذ تھا — نئے ضابطوں کے تحت یہ پمفلٹ فوجی حکام کو پیش کر دیا گیا۔ مارشل لا کے ذمہ دار افراد نے پمفلٹ پر تو پابندی عائد نہ کی البتہ مولانا اور اُن کے رفقاء گرفتار کر لیے گئے پھر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا۔ میں نے عدالت کی کارروائی سنی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ پہلے ہی کوئی فیصلہ ہو چکا ہے اور جلد ہی ہم نے یہ خبر بھی سن لی کہ مولانا کو سزائے موت سنا دی ہے۔ میں ان دنوں پنجاب یونیورسٹی میں ایم علوم اسلامیہ کا طالب علم تھا۔ مولانا کی سزائے موت کی خبر سنتے ہی دل کا بُرا حال ہو گیا تھا۔ اتفاق سے اسی روز ہمارے شعبہ میں کوئی تقریب تھی۔ میں نے اُستادِ محترم علامہ علاؤ الدین صدیقی صاحب کو فون کیا کہ آپ یہ تقریب ملتوی کر دیجیے کہ آج مقتلِ غم ہے۔ وہ بولے، یہ تو نہ ہو سکے گا۔ مجھے شدید جھٹکا سا لگا اور میں دیر تک جذبات کی لہروں پر ہچکولے کھاتا رہا۔ ذہن نے کیا کیا سوچا اب کچھ یاد نہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ سزائے موت کے خلاف ایک طوفان سا اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پاکستان کے اندر شدید ہیجان تھا اور باہر شدید اضطراب، مگر مولانا جیل کی سلاخوں کے پیچھے پرسکون اور باوقار رہے۔ پھر فوجی حکام کی طرف سے رحم کی اپیل کا تقاضا اٹھا اور جب پسِ دیوارِ زنداں مولانا کو یہ پیغام دیا گیا

تو ان کا چہرہ انگارے کی مانند تمتما اٹھا اور ان کی طرف سے گرجدار آواز میں یہ الفاظ سنائی دیے۔

"میں کسی سے رحم کی اپیل نہ کروں گا اور اپنا معاملہ اپنے خدا کے حوالے کرتا ہوں۔ زندگی اور موت کے فیصلے زمین پر نہیں آسمان پر ہوتے ہیں۔ اگر وہاں میری موت کا فیصلہ ہو چکا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے موت سے نہیں بچا سکتی، اور اگر وہاں سے میری موت کا فیصلہ نہیں ہوا تو دنیا کی کوئی طاقت میرا بال بیکا بھی نہیں کر سکتی۔"

خدا کی ذات پر غیر متزلزل یقین صرف اسی شخص کے اندر پیدا ہو سکتا ہے جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہو اور آخرت کو اس دنیا پر ترجیح دے چکا ہو اور مخلوق کے آگے اپنی گردن جھکانے کو تیار نہ ہو۔ مولانا نے جب اپیل کی پیش کش کو پائے استحقار سے ٹھکرا دی تو اس کے بعد کیا کچھ وقوع پذیر ہوا وہ تو ایک لمبی داستان ہے۔ مگر یہاں فقط یہ بتانا مقصود ہے کہ مولانائے ذی شان اس مقام پر بھی چٹان کی طرح جمے رہے جہاں انسان کا پیراہن وجود لرزا اٹھتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ان کے اس دلیرانہ اور شجاعت مندانہ طرز عمل نے جہاں لاکھوں انسانوں کے دلوں میں جگہ بنا لی وہاں انسان کی عظمت میں بھی غیر معمولی اضافہ کر دیا۔

اس واقعے کے بعد سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۲۶ سال اور زندہ رہے اور اس پورے عرصے میں ایک بار بھی انھوں نے دست طمع دراز نہیں کیا۔ کوئی موقع ایسا یاد نہیں آتا۔ جب انھوں نے کسی صاحب اقتدار سے ملنے کی خواہش کی ہو یا اپنے لئے کچھ طلب فرمایا ہو، حالانکہ اکثر حکمراں اس انتظار ہی میں رہے کہ مولانا کی طرف سے کوئی اشارہ ہی ہو جائے۔ (باقی آئندہ)

کے چہروں کو چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ اس لیے ہوگا کہ اللہ ہر متنفس کو اس کے کیے کا بدلہ دے۔ اللہ کو حساب لیتے ذرا دیر نہیں لگتی۔

یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لیے، مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے انھیں خبردار کر دیا جائے اور وہ اس حقیقت کو اچھی طرح) جان لیں کہ اللہ بس ایک ہی ہے اور اہلِ عقل (ایسا وقت آنے سے پہلے) ہوش میں آجائیں۔ (ابراہیم۔ ۴۱-۲)

غزل

(رشی پٹیالوی)

(مرسلہ۔ دیدار جالندھری)

تمہارے آتے ہی زندگی کے چمن میں کیا کیا بہار چھائی
ترستی آنکھوں کے بھاگ جاگے تڑپتے دل کی کلی کھل آئی

میں تم کو دیکھوں کہ دیکھوں ہر سو بہار ساماں خوشی کا عالم
اُدھر اُدھر ہے سلونا منظر جدھر جدھر بھی نظر اٹھائی

ذرا سا تم سے جدا ہوئے تھے عجب عجب حادثوں سے گزرے
کسی خوشی نے ہمیں دبوچا کہیں بھی راحت نظر نہ آئی

جہاں جہاں بھی قدم تمہارے جمال ارزانیاں کریں گے
وہاں وہاں رنگ و نور بن کر بہار ہوگی سجی سجائی

ہزار جاں سوز ہے جدائی ہوا ہے محسوس لیکن ایسا
صبا تمہارا سلام لائی سحر تمہارا پیام لائی

عطائے صہبائے بے خودی ہے تمام گم گشتگی کا عالم
طوافِ منزل میں آگہی بھی فریب حیرت سے کم نہ پائی

مشاہدہ بھی ہے تجربہ بھی نصیب اپنا مقام اپنا
ہماری نظروں میں ایک تم ہو تمہاری نظروں میں کج ادائی

اُجڑنا دیکھے کوئی ہمارا شعور و خود آگہی کے ہاتھوں
نہ پھر ہمیں اپنی یاد آئی تمہاری یاد اس ادا سے آئی

رشیؔ سے پوچھو تو یہ حقیقت کھلی حقیقت سے کم نہیں آئی
تمہارا دیدار زندگی ہے قضا کا پیغام ہے جدائی

کے سرپرست تھے۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب اس کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ مفتی صاحب اور مولانا مودودی صاحب کے آپس میں بڑے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ اور میرے بھی مفتی صاحب سے اسی نوعیت کے تعلقات تھے۔ انھوں نے مجھے خط لکھا کہ ابو الاعلیٰ صاحب تفاسیر اور احادیث وغیرہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ آپ ان کے لئے کچھ وقت نکالیے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ اس مقصد کے لئے عصر اور مغرب کا درمیانی وقت مناسب رہے گا لیکن مفتی کفایت اللہ صاحب نے اپنے جوابی خط میں لکھا کہ ان اوقات میں تو ابو الاعلیٰ صاحب سیر و تفریح کرتے ہیں چنانچہ مغرب اور عشاء کا درمیانی وقت طے ہوا۔ میرا مکان دہلی میں محلہ نیاریوں میں اور مولانا مودودی صاحب کا کوچہ پنڈت میں تھا اور دونوں محلے قریب قریب تھے۔ اس لئے میرا ان کے گھر جاکر پڑھانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ چنانچہ لالٹین کی روشنی میں میں نے انھیں پڑھانے کا آغاز کیا۔

تقریباً ایک سال میں انھوں نے مجھ سے تفسیر میں بیضاوی، حدیث میں ترمذی اور معانی و بلاغت میں مطول پڑھی۔ بعد ازاں مولانا مودودی حیدر آباد دکن چلے گئے۔ اور ہمارا کوئی رابطہ نہ رہا۔ البتہ کچھ عرصہ کے بعد حکیم اجمل خاں کے طبیہ کالج دہلی کے چند طلبہ فیس معاف کروانے کے لئے اپنے مستحق ہونے کی تصدیق مجھ سے کروانے آئے تو میں نے ان کے ہاتھوں میں مولانا مودودی کی کچھ کتابیں اور رسالے دیکھے جس سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ پنجاب میں منتقل ہو چکے ہیں۔

میں نے مولانا شریف اللہ خاں سے سوال کیا کہ مولانا آپ نے مولانا مودودی کے بارے میں ایک استاد ہونے کی حیثیت سے کیا رائے قائم کی تھی؟ فرمانے لگے مولانا مودودی بلا کے ذہین اور محنتی تھے۔ میں انھیں روزانہ جو سبق پڑھاتا تھا۔ دوسرے روز اسے سننے کی ضرورت کبھی محسوس نہ کی اور اگلا سبق شروع کر دیتا تھا۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں مولانا مودودی کے تعلقات بڑے بڑے علماء کرام سے تھے اور ان کی علماء دوستی مشہور تھی۔

مولانا۔ یہ بتلائیے کہ آپ نے سید مودودی کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے؟ فرمانے لگے۔ میری

افواہ ہے کہ ہند سرکار تمام اخباروں کو قطعی طور پر بند کر رہی ہے۔ کیونکہ ماہرین کی رائے ہے کہ اخبارات ہی ملک میں انتشار، بدنظمی، بغاوت اور بے چینی پھیلاتے رہتے ہیں اور ہر صبح گھر گھر میں پہنچ کر عوام کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ اگر اخبارات بند کر دیئے جائیں تو ممکن ہے قوم سکھ اور چین کی زندگی گزارنے لگے۔

چنانچہ تجویز کیا گیا ہے کہ اخبارات روزانہ کی بجائے ماہانہ شائع ہوا کریں، جن میں مہینہ بھر کی خبروں کا خلاصہ شائع کیا کریں۔ ریڈیو پر سے بھی مہینہ بھر میں صرف ایک بار خبریں نشر کی جایا کریں۔ ان خبروں میں لیڈروں کے بیانات بالکل شائع نہ کئے جائیں۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ لوگ بالکل اخباروں سے نجات پاکر کچھ تعمیری کاموں کی طرف وقت اور توجہ دے سکیں گے۔

اگر اس تجویز پر عمل شروع ہو گیا تو خیال کیا جاتا ہے کہ ننانوے فیصدی لیڈر اپنی لیڈری ترک کر دیں گے اور صرف پانچ فی صدی لیڈر بچ جائیں گے جو صحیح معنوں میں عوام کی خدمت کیا کریں گے۔ اور ننانوے فی صدی لیڈر اخبارات کی چھلنی میں سے چھن کر باہر نکل جائیں گے۔

پچھلے دنوں ایک ہاتھی نے سپریم کورٹ میں درخواست دائر کی جس میں مطالبہ کیا تھا کہ ہند سرکار نے اس کی آبائی جگہ پر جو ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ اسے واپس دلایا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بہت بڑے وکیل کی شہہ پر ہاتھی نے یہ دعویٰ دائر کیا ہے۔ دعویٰ کی رو سے جہاں آجکل ہند پارلیمنٹ بنی ہوئی ہے کسی زمانہ میں یہاں ایک گھنا جنگل تھا اور اس جنگل میں ایک پہاڑی کی کھوہ میں مدعی ہاتھی کے آباؤ اجداد رہا کرتے تھے۔ اور اگر آج بھی پارلیمنٹ کی بلڈنگ کے نیچے کھدائی کی جائے تو وہ کھوہ نظر آ جائے گی اور ہاتھیوں کی رہائش کے آثار بھی مل جائیں گے۔ ہاتھی کے وکیل کو یقین ہے کہ قانون اور انصاف کی رو سے ہاتھی کے مقدمے جیتنے کے امکانات بہت روشن ہیں وکیل مذکور اور ہاتھی میں شاید ایک خفیہ معاہدہ ہو چکا ہے کہ اگر ہاتھی مقدمہ جیت گیا تو پارلیمنٹ

بیشتر جماعتیں سماج کے زیادہ عظیم کام ہے جو بطور فرضِ کفایہ اس جماعت نے پوری ملت مسلمہ کی جانب سے انجام دیا اور دے رہی ہے۔ ریاست بہار کی ۱۹۶۳ء کی قحط سالی ہو یا ہیڈر اوڑکیلا، جمشید پور اور گجرات کے فرقہ وارانہ فسادات ہوں یا آندھرا کا قیامت خیز طوفان ہر جگہ اور ہر کہیں یہ اللہ کے نیک بندے انسانوں کی خدمت کے لئے دوڑ پڑے۔ ان کی بے غرضی، جذبات کے روشن نشانات ملک کے ہر حصے میں ابھرے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں مسلمان نوجوانوں کے درمیان اسلام کا شعور پیدا کرنا، ان میں خدمت اور تعمیری جذبہ پیدا کرنا، ان کی تعلیمی پسماندگی کو دور اور ان کے اندر دینی اخلاق و کردار کو ابھارنا یہ ایسے کارنامے ہیں جنہیں یہ ملت فراموش نہیں کر سکتی اور یہی تو وہ جرم ہے جسے کمیونسٹ اور اندرا کانگریس کے ایجنٹ برداشت نہ کر سکے۔ اور ان کے جھوٹے اور غلط پروپیگنڈے کی ہماری سادہ ملت شکار ہو گئی۔ مومن ایک سوراخ سے دوبارہ ڈسا نہیں جاتا۔ اور اس کو زیادہ دنوں تک دھوکے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ امتِ مسلمہ کے تقریباً تمام ہی ذی شعور طبقے کی آنکھیں کھل گئیں ہیں۔ اور اس صیہونی اور اشتراکی سازش کا پردہ چاک ہو گیا ہے۔ ہماری ملت نے ان چہروں کو اچھی طرح پہچان لیا ہے۔ اب وہ ان کے دام فریب میں نہ آئے گی۔ اسلام کے احیاء کی جو کوششیں آج سارے عالم اسلام میں ہو رہی ہیں اس کی تیز کرنیں ہمارے ملک پر بھی پڑیں گی اور باطل و جھوٹ کی تاریکیاں چھٹیں گی اور حق کی روشنی ہمارے وطنِ عزیز پر بھی ان شاء اللہ پھیل کر رہے گی۔

انفلوئنزا کا علاج

انفلوئنزا سے محفوظ رہنے کے لئے جب آپ چائے پکائیں اور پانی کھول جائے تو اس میں ادرک اور چینی ڈال کر بعد میں چائے کی پتی ڈالئے۔ یعنی ادرک اور چینی چائے میں ڈالنے سے انفلوئنزا سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ (محمود ساجد)

سبب بن رہی ہیں۔ معاشی اعتبار سے ہم کمزور سے کمزور تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے کھیت اور جائدادیں فروخت ہو رہی ہیں۔ سودی قرضے ہمارے سر پر سوار ہو رہے ہیں۔ جوان اور بے زبان بیٹیاں ہمارے کاندھے کا بوجھ بنی ہوئی ہیں۔ اور بسا اوقات گناہ اور بدکاری کا شکار ہو کر خاندان اور معاشرہ کی ذلت و رسوائی کا سبب بن رہی ہیں۔ کیا ان باطل اور ناجائز رسموں کو اختیار کر کے ہم اپنی آخرت اور دنیا دونوں برباد نہیں کر رہے ہیں؟ اور خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق نہیں بن گئے ہیں؟ کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ ہم ان برائیوں کو اپنے سماج سے مٹانے کا عزم کریں؟ اور اپنی بہو بیٹیوں کی عصمت و عفت کی حفاظت کا عہد کریں۔؟

پانی ابھی سر سے اونچا نہیں ہوا ہے بس ہمت و ارادہ کی ضرورت ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اکثر علاقوں میں درد مند حضرات نے کمر ہمت باندھ لی ہے کہ معاشرہ سے ان بری رسموں کو اکھاڑ پھینکیں گے اور شادی بیاہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت اور سنت کو رواج دیں گے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ذمہ داری ہمارے غیر شادی شدہ نوجوانوں کی ہے۔ وہ اس کا عزم کریں کہ اپنی شادی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو ہی اختیار کریں گے اور پوری ثابت قدمی کے ساتھ خود بھی اس پر قائم رہیں گے اور دوسروں کو بھی اس کا شوق دلائیں گے۔ یہ دین و ملت کی خدمت کی راہ ہے۔ اور اس میں ماں باپ اور اہل خاندان، احباب و معاشرہ کسی کے دباؤ کو قبول نہ کرنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے آگے سب کی ناراضگی بھی گوارا کرنی پڑے گی۔

معاشرہ کی اصلاح اور اس کے اندر سے برائیوں کو مٹانے کے لئے درحقیقت حکومت کے قوانین اور خارجی دباؤ سے کہیں زیادہ دلوں کے مضبوط ارادے اور نیتوں کے اخلاص کی ضرورت ہے۔ ہم اپنے تمام بھائیوں سے بالعموم اور نوجوانوں سے بالخصوص اسی عزم و اخلاص کی توقع رکھتے ہیں۔ ●